DUE DATE

Cl. No. ____________ *Acc. No.* ____________

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

ایک خصوصی شمارہ

شاعر

عالمی
اردو قلمکار خواتین
کا ادب

شاعر کا یہ خصوصی شمارہ

"عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب"

ہندوپاک (دوستی)

کے نام معنون کیا جارہا ہے

*

خدا کرے کہ ۲۰/فروری ۱۹۹۹ء کا یادگار تاریخی دن مستقبل میں بھی روشن رہے

---

۷۰ سالہ ماہنامہ شاعر کے بانی علامہ سیماب اکبر آبادی اور مدیر قبلہ اعجاز صدیقی صاحبان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ شعر وادب ۔
حوالے سے ہندوپاک کے درمیان تعلقات کو خوشگوار رکھنے میں معاونت کی جائے کیوں کہ امن عالم کے لئے یہ ناگزیر ہے۔ ماضی میں
دونوں بزرگوں نے اپنی اپنی سطح پر 'خوشگوار تعلقات' کے لئے بہت کام کیا تھا۔ ہماری بھی یہی خواہش اور کاوش رہی ہے کہ رسالہ شا
ہندوپاک کے مابین محبتوں کی خوشبو بکھیرتا رہے۔ اس خوب سیرت سوچ کا عملی روپ اردو کی نئی بستیاں (اردو کی ان نئی بستیوں کے بڑ
قلم کار پاکستانی ہیں) جیسا خوبصورت اور بامعنی نام ہم نے دیا ہے۔ شاعر کے کئی خصوصی شمارے اسی عنوان سے ترتیب دیے ہیں۔ شر
کے اس تازہ خصوصی شمارے میں خاصی تعداد پاکستانی خواتین اور اردو کی نئی بستیوں میں بسی ہوئی پاکستانی قلم کاروں کی ہے۔ حال ہی:
شاعر کا تاریخی ادبی کارنامہ بعنوان ہم عصر اردو ادب نمبر (اردو، شعر و ادب کا عالمی گاؤں۔ جلد اوّل) آزادیٔ ہندوپاک کی پچاسویں سا
کے موقع پر شائع ہوا ہے۔ اس میں پاکستانی ادبا و شعرا کی بڑی تعداد شامل ہے۔ یہ ضخیم خاص نمبر امن عالم اور دونوں ممالک میں د
دوستی کو فروغ دینے کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ مذکورہ خصوصی شمارہ اور ہم عصر اردو ادب نمبر شاعر [افتخار امام صدیقی] اردو اور ہندوستا
کے بے شمار قلم کاروں اور فن کاروں کی جانب سے پاکستان کے تمام قلم کاروں، فن کاروں اور سیاستدانوں کے لئے ہدیۂ محبت ہے۔

کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو
ہزار رشتوں میں تم سے بندھا ہوا ہوں میں

*

امن عالم اور سیاسی سرحدوں میں دوستی
کے لئے دعا گو

افتخار امام صدیقی
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

فکر امروز

رنگین تیتری
(عورت)

راتیں بسانے والی ، دن جگمگانے والی
تکلیف سہنے والی اور مسکرانے والی
مخصوص رنگ و بو پر قربان ہونے والی
اپنے ہی رنگ و بو سے حیران ہونے والی
عصمت کے گل کدے میں پابندِ دست محرم
اڑنے لگے تو نکہت ، گرنے لگے تو شبنم
دامانِ گل سے مستی بن کر الجھنے والی
اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی
نازک سی موجِ رقصاں رنگیں سی ایک بجلی
مہکا ہوا سا شعلہ دہکی ہوئی سی مستی
لرزاں سا اک ستارہ ، رخشاں سا ایک جگنو
پربستہ ایک کویل ، محرومِ رم اک آہو
جذبات کی فضاء میں اک ذرۂ پریدہ
رنگوں کے ارتقاء میں اک نقشِ برگزیدہ
کاہیدہ سا ترنم ، خوابیدہ سا ترانہ
پرجوش کیف بادہ ، خاموش اک فسانہ
صد رنگ پھول جس میں مردوں کی زندگی ہے
'عورت' اسی چمن کی رنگین تیتری ہے

(کارِ امروز جولائی ۱۹۴۳ء بار دوم)

سیماب اکبرآبادی

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۰واں
سال

شاعر

علمی ادبی
وتہذیبی
ماہنامہ

جلد ــــ ۷۰
شمارہ ــــ ۱

فون: 3829904

12/1999

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۱۲ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۲۰۰ روپے
تاعمر خریداری	معاونین سے
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۳۰ ڈالر

20.1.77

مکرمی تسلیم۔

دونوں گاؤں میں سے کسی ایک کا تو ایک خط ملا۔ لیکن لکھنا شروع کی ہے دو چار دن
[redacted]
میں ہو جائے گی تو آپ کو بھیج دوں گی۔ یہاں [illegible] بیٹھ
ہمیں وقت نہیں ملتا۔ مگر جب کام کر لیتی ہوں۔ مسودہ جلد ہی
تیار رہا ہے۔

زیادہ آداب

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی بنام اعجاز صدیقی

۲۸؍جنوری ۱۹۷۷ء کا یہ خط عصمت چغتائی [پ: ۲۱؍اگست ۱۹۱۵ء۔ م: ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۱ء] نے علی گڑھ سے تحریر کیا تھا اور جس کہانی کی طرف اشارہ ہے اس کا نام تھا ’بے کنڈے کی پیالی‘ جو شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر [۱۹۷۷ء] میں شائع ہوئی تھی۔ [ادارہ]

آپ نے لکھا ہے میری کتاب ”پرانی“ کہ کیوں قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔
تمام عمر تاریکیوں سے لڑتی رہی ہوں۔ یہ تو بڑا کام ہے؟ [illegible]
ہیں؟ تمام تاریکیوں کو مصنف کے تجربات سے الگ رکھنا چاہیے
نہ کہ اس کی شخصی افراد سے تعلق۔ [illegible]
میں اپنی [illegible] رہنے پائے گی۔ تجربات پڑھنے کو جی چاہتا
ہے؟ ہمارے شخص کے [illegible] ہے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] 1932 میں شائع ہوا۔ دار الاشاعت
پنجاب سے۔
امید ہے [illegible]
[illegible]

Lahore. [illegible] Dec 77

حجاب امتیاز علی بنام مرزا حامد بیگ

مشہور افسانہ نگار حجاب امتیاز علی [پ: ۱۹۰۳ء۔ حیدر آباد دکن] امتیاز علی تاج [مشہور ڈرامہ انارکلی کے [illegible]] [illegible]
ناول، ناولٹ، ڈرامے، تراجم، نثر لطیف، روزنامچے، مضامین وغیرہ کی ۲۲ کتابیں شائع ہو چکیں۔ [بشکریہ مرزا حامد بیگ، [illegible]]

عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب

[حصہ اوّل]

عالمی اردو خواتین کا شعر و ادب

شرکاء

نظمیں

مکالمہ

قرۃ العین حیدر سے ایک مکالمہ

کہانیاں

غزلیں

[illegible]

[illegible]

سرورق

حامد اقبال صدیقی

عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب

[۱]

شاعر کی یہ مشترکہ خصوصی اشاعت عالمی اردو قلم کار خواتین کے شعر و ادب کے بارے میں ایک نئے ادبی مکالمے کی تعمیر کا آغاز ہے۔ ایک ادھورا سا اشاریہ ہے، اس زیرِ ترتیب خاص نمبر کا جس کا عنوان ہے "عالمی اردو قلم کار خواتین ادب نمبر" جس کا بہت پہلے اعلان کیا جا چکا ہے۔ شاعر کے کئی ضخیم نمبر اور خصوصی شمارے زیرِ غور ہیں۔ رسالہ شاعر کے لئے ہمارے ڈھیر سارے خواب ہیں جنھیں ہم تعبیر آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم ہر خواب کو تعبیر مل جائے گی، یہ ضروری تو نہیں چنانچہ جو بھی ہمارے خواب ہیں، ان کے ادھورے خاکے اور اشاریے شاعر کے عام شماروں میں گاہے گاہے پیش کئے جاتے رہیں گے۔ ایسے ہی خوابوں میں سے ایک زیرِ تعبیر خواب "عالمی اردو قلم کار خواتین ادب نمبر" کا ایک بہت ادھورا سا اشاریہ شاعر کا یہ مشترکہ خصوصی شمارہ ہے جو ہماری بے ترتیب، مگر خوب سیرت سوچ کا اظہار ہے۔

معاصر اردو قلم کار خواتین پر کسی ضخیم خاص نمبر کے لئے ہم خاصہ واضح، مثبت اور Strong جواز رکھتے ہیں۔ یہاں کسی تنقیدی و تحقیقی مباحث کی گنجائش نہیں ہے، صرف چند بنیادی امور کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ جب بھی مجوزہ نمبر شائع ہوگا، تمام تنقیدی و تحقیقی لوازمہ از خود اس میں آجائے گا۔

علامہ سیماب اکبر آبادی نے تعلیم نسواں کے لئے اپنے قلم سے نثر و نظم میں بہت اہم کام کیا ہے۔ نثر و نظم کی کئی کتابیں اور کتابچے موجود ہیں۔ وہ خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی اصلاح کے زبردست حامی تھے۔ ان کے تلامذہ کی فہرست میں کئی خواتین کے نام آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہونے والے خواتین کے تمام اہم رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ خواتین کے لئے علامہ کی کئی کتابیں گھروں گھر نہ صرف یہ کہ پڑھی جاتی تھیں بلکہ شادی بیاہ کے موقع پر جہیز میں یا پھر تحفے میں دی جاتی تھیں۔ رسالہ شاعر میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات نثر و نظم کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ 'ثریا' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ مگر خواتین کا ایک ادبی رسالہ شائع کرنے کے بھی خواہش مند تھے۔

محترم اعجاز صدیقی نے علامہ کے کار و افکار کی توسیع کرتے ہوئے شاعر کا خواتین افسانہ نگار نمبر [اکتوبر، نومبر ۱۹۴۵ء] شائع کیا تھا۔ ان افسانہ نگاروں میں بیشتر وہ قلم کار تھیں جنھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے اعتبار حاصل ہوا ہے۔ اعجاز صاحب 'عمرانی' کے نام سے خواتین کا رسالہ اور خواتین ادب نمبر شائع کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے اسلاف کے ...



ادا جعفری

ہے درد ابھی جادو اثر ، ٹھہرو ذرا
ویراں نہ ہو جائے یہ گھر ٹھہرو ذرا
سوچو ذرا ، شاید کوئی ہے منتظر
کیوں خواب ہوں نامعتبر ٹھہرو ذرا
شاید کوئی پہچان لے ، اپنا کہے
ہیں بے صدا آنکھیں ، مگر ٹھہرو ذرا
ممکن نہیں ہے بھولنا جس راہ کو
اس راہ میں بار دگر ٹھہرو ذرا
تسکیں ملے ، احوال جاں تم سے کہیں
ہے داستاں بھی مختصر ، ٹھہرو ذرا
دیکھو کہ اب ہیں کرچیاں بکھری ہوئی
کچھ لوگ تھے آئینہ گر ، ٹھہرو ذرا
بیگانگی کی آنچ میں جھلسے ہوئے
موسم بدل جائیں ، اگر ٹھہرو ذرا
مانا کہ یوں ہم بھی یہاں خوش تو نہیں
روشن مگر ہے ایک در ٹھہرو ذرا
بے چارگی کو چارہ گر بھی دیکھ لو
گزرو نہ تم یوں بے خبر ٹھہرو ذرا
منزل وہی ہے تم جسے منزل کہو
پلٹے شام و سحر ٹھہرو ذرا

● ۸/۳۳، بی۔ بلاک ۶،
پی ای سی ایچ سوسائٹی۔ کراچی۔ ۲۹ (پاکستان)



ساجدہ زیدی

وہ خواب معدوم ہو گئے ہیں

عظیم تر تھی نظر کی دنیا
حسین تھیں آرزو کی راہیں
علامتِ زندگی تھی خوابوں کی کہکشاں
زادِ راہ تھیں
حسرتیں۔ وفائیں
لرزتے احساس
کانپتے ذہن
فکرِ فردا کی جوت سے
مضطرب نگاہیں
وہ رنگ وصوت وصدا کے وقفے
وہ جان وتن کی حکایتیں
قلب وروح کے دلکشا مناظر
وہ سب جو اک عمر کی کمائی تھے
کیسے اک بے کنار کہرے میں چھپ گئے ہیں؟
کہ آسماں سے مہیب شعلے برس رہے ہیں
ہوائیں مسموم ہو گئی ہیں
فضاؤں سے خون ٹپک رہا ہے
زمیں کی چھاتی کو چیر کر
نفرتوں کا لاوا ابل پڑا ہے
ہر ایک ذی روح کے بدن پر
اک ان کہے خوف کی ردا ہے
وہ خواب جو......
حیرتوں، وفاؤں نے
حوصلوں اور آرزوؤں نے
معنویت کی جستجو نے
دلوں کی کھیتی میں بوئے تھے
آج حرف معدوم ہو گئے ہیں

● گل برگ، مدودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ (یوپی)



شاہدہ حسن

سبب کیا ہے کبھی سمجھی نہیں میں
کہ ٹوٹی تو بہت ، بکھری نہیں میں

رکھی ہے گفتگو اس سے ہر اک پل
سخن جس سے کبھی رکھتی نہیں میں

یہ ضرب اپنے ہی ہاتھوں سے لگائی
کسی کے وار سے زخمی نہیں میں

کروں کیوں یاد تیرے خال و خط اب
شکستہ آئینے چنتی نہیں میں

عجب تھی رہ گزر بھی ہم رہی کی
قدم رکھ کر کبھی پلٹی نہیں میں

جو پہنچی ساحلوں پر تب کھلا ہے
کہ اب وہ تشنگی رکھتی نہیں میں

● 308-ل۔ روفی لیک ڈرائیو، بلاک ۔۱۸
گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

عالمی اردو خواتین کا شعر و ادب

(ادبی فیچر)

ادبی مذاکرے کے لئے ذیل کے چند مختصر اقتباسات فوری مطالعے کا عکس ہیں جو بغیر کسی کاوش کے ترتیب میں آگئے ہیں۔ (ادارہ)

مقصود الٰہی شیخ

برابری اور صنفی مساوات کے اس دور میں فن افسانہ نگاری کی بات کرتے ہوئے یہ تخصیص کرنا میرے نزدیک جائز نہیں کہ کوئی مرد افسانہ نگار ہے یا خاتون افسانہ نگار۔ ایک افسانہ نگار کے لئے یہ بڑی صفت ہے کہ وہ افسانہ نگار ہے۔ البتہ افسانوں کا معیار جانچنے کا موقع ہو، فن تنقید کے تحت پرکھ کی جارہی ہو تو افسانہ نگار کے اچھا یا خراب افسانہ نگار ہونے میں فرق کیا جاسکتا ہے۔

اب جو تولتا ہوں تو کہنا پڑتا ہے کہ ستارہ لطیف خانم ایک اچھی افسانہ نگار ہیں۔ میں ان کو ایک اچھا افسانہ نگار سمجھتا ہوں۔ یہ اچھی اور اچھا کہہ کر میں صنفی تخصیص ختم تو کر سکتا ہوں لیکن مت بھولیئے برطانیہ میں ہمارا اپنا ایشیائی سماج اس سطح پر ابھی نہیں آیا کہ افسانہ نگاروں کی بات کرتے ہوئے بے رحمی سے ان کی صنف کو بھلایا جاسکے گویا نئے زمانے میں پرانی قدروں کو یکسر نظرانداز کرنا ہنوز بعید از قیاس ہے! اب میں کہوں گا کہ ستارہ لطیف خانم ہی نہیں برطانیہ کی تمام خواتین افسانہ نگاروں کا یہ "پلس پوائنٹ" ہے کہ وہ صنف نازک سے تعلق رکھتی ہیں اور جس نزاکت سے وہ افسانوں میں عریاں حقیقت کی پردہ کشائی میں مہارت دکھاتی ہیں وہ ان کا "اسٹرانگ پوائنٹ" ہے۔

برطانیہ کی اردو دنیا کی خواتین افسانہ نگار، ایک ایسا موضوع تھا جس پر گہرائی میں اتر کر اور محنت سے مطالعہ کے بعد حوالوں سے لکھنا مناسب تھا لیکن میرے سر پر "کم وقت" کی تلوار لٹکا دی گئی جس کا سبب بھی ہو گیا ہے اس لئے میں فرار اختیار کرنے کے خلاف ہوں۔ شروع سے میرا اصول رہا ہے کہ آپ کنوں کو ٹھیس نہیں لگنی چاہئے اس لئے میں اپنی یادداشت پر بھروسہ کروں گا اور افسانہ نگاروں میں ستارہ لطیف خانم کے مقام و کردار کا تعین کرنے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کروں گا۔ ایسا کرنے کا حق مجھے یوں پہنچتا ہے کہ یہاں کی اکثر و بیشتر خواتین افسانہ نگاروں کا "راوی" سے کسی نہ کسی وقت کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔ اردو ادب میں افسانے کی جو اہمیت ہے، میرے نزدیک، اردو افسانے میں اتنی ہی خواتین لکھنے والیوں کی اہمیت ہے۔ برصغیر میں میرے لیسے اردو کے پروردہ طالب علم کی یاد میں جو نام ابھرتے ہیں ان میں نذر سجاد حیدر۔ رشید جہاں اور مسز عبدالقادر پھر عصمت چغتائی۔ ممتاز شیریں۔ قرۃ العین حیدر۔ ہاجرہ مسرور۔ خدیجہ مستور اور ان کے درمیان ایک مضبوط کڑی حجاب امتیاز علی تاج کی دیکھی جاسکتی ہے۔ الطاف فاطمہ۔ اے آر خاتون۔ زبیدہ خاتون۔ سیدہ حنا اور رضیہ بٹ کا بھی کنٹری بیوشن ہے اور ہمارے اردو ادب میں ان سب خواتین کا ناقابل فراموش کردار اور مقام ہے۔ اس حوالے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ نیا زمانہ ہو یا درمیانی یا اس سے بھی پرانا، اسی دور کے مرد افسانہ نگاروں کی صفوں میں گھس گھس کر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا خواتین کا قلم معقف صنفی امتیاز کو اٹھا کر پرے رکھ دیتا ہے اور یہ اپنے وقت کے مرد افسانہ نگاروں کی ہم پلہ نظر آتی ہیں۔ اب پچھلے پچاس سال میں اردو لکھنے والوں کا دائرہ اور پھیلاؤ کرۂ ارض کے اکثر گوشوں تک پہنچ چکا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ اور قابل توجہ بات ہے مگر یہاں صرف برطانیہ میں اردو لکھنے والیوں کی بات ہو رہی ہے۔

اوپر اٹھائے گئے نکتہ کی مدد سے میں کہوں گا اور ان خواتین کی بات کروں گا جن کے طبع زاد افسانے زیور طباعت و اشاعت کے مرہون منت ہو چکے ہیں۔ کچھ خواتین پاکستان کے ادبی حلقوں کی سند و شہرت لے کر یہاں آئیں اور لکھنا جاری رکھا اور کچھ نے یہاں قلم اٹھایا پھر وہ ہیں جنہوں نے پاکستان میں لکھنا شروع نہیں کیا تھا مگر جب لکھا تو اپنی ہمعصر خواتین کی ریت و روایت کو پیش نظر رکھا پھر وہ نام بھی ابھرتے ہیں جو یہاں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے کے باوجود اردو کے جادو سے نہ بچ سکے۔ کیا یہ پر لطف موڑ نہیں کہ ایسی لڑکیاں انگریزی پر عبور رکھتی ہیں پھر بھی ان پر اردو میں "نزول" ہوتا ہے!!

میں کم وقت کا حوالہ دیتے ہوئے اور اپنی یادداشت کو سولی پر لٹکاتے ہوئے کہوں گا کہ میں اب جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں اس میں بھول چوک سے درگزر کی طلب پیشگی ہے ایک طرف محسنہ جیلانی۔ صفیہ صدیقی۔ فیروزہ جعفر۔ پروین مرزا اور حلیمہ خان ہیں تو دوسری طرف صبیحہ علوی۔ نجمہ عثمان۔ فیروز مکرجی۔ شاہدہ احمد۔ ذکیہ فاطمہ۔ حمیدہ معین رضوی اور بانو احمد ہیں۔ ادھر نارتھ میں پہلی صف میں طلعت سلیم۔ انیس صدیقی ہیں تو دوسری صف کی نئی نسل میں یاسمین کومل اور صبوحی کی درمیانی مضبوط کڑی ستارہ لطیف خانم کہی جائیں گی جن کے فن میں پرانی روایت اور نئے (ایشیائی) ماحول کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے۔ جذبات و احساسات کی صداقت اور اس صداقت کو جس کمال، کمال ہی نہیں، نازک نازک۔ کن من، کن من اور گن گن کرتے انداز میں کہنے کا ملکہ خاتون افسانہ نگاروں کو ہے اس کی گرد تک پہنچنے کے لئے لہو رگوں میں دوڑ پھر کر ہی آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔

میں اردو ادب کو اتنا مالا مال سمجھتا ہوں کہ انگریزی حوالوں سے حتی الامکان "پرہیز" کرتا ہوں۔ اس کی ایک وجہ میری طبیعت کا انکسار ہے۔ یوں بھی کبھی کسی پر رعب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر یہاں رہتے ہوئے انگریزی ادب شجر ممنوعہ تو نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہماری رگوں سے دور غلامی کا چھپا اور دبا خوف بھی

٩

تو تقریباً تقریباً نچڑ ہی چکا ہے! چنانچہ ایک غیر اردو حوالہ دینے میں مضائقہ نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ ستارہ لطیف کی تحریروں میں مستقبل کی شارلٹ برانٹے کی روح جھلکتی دکھائی دیتی ہے جو لکھنے سے پہلے سوچتی تھی۔ اس کے یہاں سوچ کی رو اس وقت بھی جاری رہتی تھی جب وہ دوسرے امور میں مصروف ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس کی تحریر کا ہر لفظ دستاہوا نگینہ بن جاتا تھا۔ (برطانیہ کی اردو افسانہ نگار خواتین)

'RAVI HOUSE' UNIT E-1. LEGRANS LANE, BRADFORD BD7 INS (U.K)

سکینہ ساجد نیاں

تضادات سے بنی اس دنیا کا ہر رنگ دوسرے رنگ کو اجاگر کرتا ہے جیسے رات اور دن، شام اور صبح، دکھ اور سکھ، اور جس نے غم کا ذائقہ ہی نہ چکھا ہو وہ خوشی کی قدر بھی نہیں کر سکتا۔ شام اور صبح کی طرح رات اور دن کی طرح دکھ اور سکھ کی طرح عورت اور مرد بھی زندگی کے دو رنگ، دو مختلف روپ ہی تو ہیں۔ زندگی اندھیرے اجالے کے تانے بانے سے بنی ہوئی ہے۔ سیاہ و سفید کی اس دنیا میں سیاہی کے بغیر سفیدی اور سفیدی کے بغیر سیاہی اپنی کوئی پہچان نہیں رکھتی۔ تضاد کے بغیر امتیاز کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ ایک موسم دوسرے موسم سے ایک پھول دوسرے پھول سے اور ایک انسان دوسرے انسان سے کئی بنیادی تضاد و اختلاف کی وجہ سے مختلف، مخصوص اور ممتاز ہوتا ہے۔ میر، غالب اور اقبال کی شاعری میں جو فرق ہے اس کی ایک وجہ ان کے زاویۂ فکر و نظر کا فرق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ فرق عہد اور زمانے کا فرق تھا تو یہ بھی درست ہے لیکن کیا ہم عصر شعراء اور ان کی شاعری میں فرق نہیں ہوتا؟ یقیناً ہوتا ہے۔ جب ایک ہی عہد کے دو شاعروں کا زاویۂ نگاہ مختلف ہوتا ہے تو یہ فرق شعور کی سطح کا بھی ہو سکتا ہے اور کائنات میں اس شخص کے اپنے مقام اور حیثیت کی وجہ سے بھی ممکن ہے۔ کسی کارخانے کے مالک اور مزدور کے زاویۂ نگاہ میں ممکن ہے اس حد تک فرق ہو کہ کسی شام کوئی گلاب کے پھول کی تلاش میں ہو اور کوئی گوبھی کے پھول کے لئے سرگرداں۔ ایک بادشاہ اور ایک فقیر نے کیا اس دنیا کو بالکل مختلف زاویوں سے نہیں دیکھا ہوگا؟ پھر جب اس تمام فرق سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے تو یقیناً شاعر اور شاعرہ کے نقطۂ فکر و نظر کے مختلف اور مخصوص ہونے سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اور اس دنیا میں جو حسن و رعنائی ہے، سب حسن تضاد ہی کی عطا ہے۔ اسی شاعر کو منفرد شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے جو دیگر شعراء سے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے اور انفرادیت کے بغیر کوئی شاعر بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔ اس لحاظ سے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری میں بلکہ ہر زبان کی شاعری میں اس زبان کی شاعرات کی انفرادیت اور اہمیت مسلم ہے۔

مردوں کے اس معاشرے میں جہاں عورت کی ذات کے ہر پہلو کو اکثر و بیشتر نظر انداز کیا گیا ہے وہاں اس کی فنکارانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند رکھی گئیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں بھی شاعرات کے بہت زیادہ اور بہت بڑے نام نہیں ملتے اور اردو شاعری کی تاریخ کی کتابوں میں تو اب تک کسی شاعرہ کا نام نہیں جس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کی اس صنف کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ زمین و زر کے ساتھ شمار کر کے جاگیر تصور کیا جاتا رہا ہے اور ساری توجہ ہمیشہ اس طرف ہی رہی کہ گناہوں کی طرح اس آلۂ گناہ کو کس طرح چھپایا اور محفوظ رکھا جائے یا پھر ایسے تمام رویے کو صنفی تعصب کا نام دیا جا سکتا ہے جو اس صنف کے ساتھ صدیوں روا رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب انسانی کی بیس روشن صدیاں بھی عورتوں کے مقصد کی سیاہیاں نہیں مٹا سکیں لیکن اس کے باوجود ان کے حوصلے پست نہیں بلکہ اپنے اپنے معاشروں کی تمام شرمناک بدسلوکیوں کے باوجود خواتین اپنی تمام تر صلاحیتوں کو زندہ رکھنے اور بروئے کار لاتے رہنے کی ہر ممکن کوشش میں کوشاں ہیں، نظر انداز کئے جانے کی اس جنگ میں خاموشی سے سرگرم جہاد ہیں اور جہاں زیادہ تر نام شہید ہو چکے ہیں وہاں چند غازیوں کے نام بھی موجود ہیں اور "بیسویں صدی میں خواتین کی اردو شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ایسے ہی ناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک کوشش ہے جنہیں آنے والی صدیوں میں بھی زندہ رہنا ہے۔

اکثر لوگوں کو میرے اس موضوع پر اعتراض تھا۔ کئی بار مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے یہ موضوع کیوں چنا؟ خواتین نے اردو شاعری کو دیا ہی کیا ہے؟؟ اور میں جواباً عرض کرتی رہی کہ یہ کیا کم ہے کہ خواتین کے یہاں اردو شاعری نے ایک نئے زاویۂ نظر سے حیات و کائنات کا جائزہ لیا ہے اور شاعری خود ایک مخصوص فکر، جذبے اور احساس سے روشناس ہوئی ہے۔ لیکن میرے اس جواب کو یوں رد کر دیا جاتا تھا کہ یہ کام تو ہندی شاعری میں مرد شعراء کرتے ہی رہے ہیں اور اسی کے زیر اثر اردو میں بھی عورتوں کے جذبات کے اظہار کے لئے ان کی طرف سے ان ہی کی زبان اور لہجے میں ریختی اور گیت لکھے جاتے رہے ہیں۔

اس قسم کی دل برداشتہ کر دینے والی باتوں نے خواتین کی اردو شاعری پر لکھنے کی خواہش کو اتنی ہوا دی بلکہ آکسیجن فراہم کی کہ ایک ننھی سی چنگاری سورج بن کر میرے وجود میں طلوع ہو گئی اور سورج طلوع ہو جائے تو روشنیاں بند آنکھوں پر بھی دستکیں دینے لگتی ہیں اور یہی روشنیاں میرے اندر سوئے ہوئے ان احساسات کو بیدار کرنے لگیں کہ کہاں وہ شاعری جو مرد حضرات خواتین کی طرف سے کریں اور کہاں وہ شاعری جو خواتین خود کرب و احساس کی بھٹی میں تپ کر تخلیق کریں یہ تو زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ سونے اور تانبے کا فرق جس پر صرف ملمع کاری کی گئی ہو۔

افلاطون نے شاعری کو نقل کی نقل یا تیسرے درجے کی نقالی کہہ کر رد کر دیا تھا لیکن یہاں تو نقل در نقل یا چوتھے درجے کی نقالی کو بھی خواتین کے سچے اور کھرے اظہار پر فوقیت دی جاتی رہی ہے جبکہ دوسری طرف نثری نظم کی چند شاعرات کے متعلق یہ اعلان کر دیا گیا کہ انہوں نے "غالب کے پوئٹک بیریئر کو کراس کر لیا ہے"۔ گویا اس دنیا میں عورتوں کو جس طرح بیویوں اور لونڈیوں کی آخری انتہاؤں پر رکھا گیا ہے اسی طرح ان کی شاعری بھی افراط و تفریط کی زد میں ہے اور عورتوں کی طرح عورتوں کی شاعری بھی ایک منصفانہ اور متوازن رویے سے محروم ہے۔ اس صورت حال میں خواتین کی شاعری پر لکھنے کے شوق کی وہ ننھی سی کرن جو سورج بن

کر میرے وجود میں طلوع ہوئی تھی رفتہ رفتہ اس کی تپش اتنی بڑھ گئی کہ خواتین کی شاعری کے ہرے بھرے جنگل کی سمت نکل جانے ہی میں جان کی امان تھی، ورنہ یہ سورج مجھے جلا کر راکھ کر دیتا۔

خواتین کی شاعری کیا ہے اسی سوال کا سیر حاصل جواب اس مقالے میں دینے کی کوشش کی گئی ہے اور مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواتین کی شاعری اس آدھی دنیا کو بھی حقیقت کی دھوپ اور سچائیوں کی روشنی میں لارہی ہے جو مردوں کی نظروں سے او جھل اور ان کی شاعری کی پہنچ سے دور تھی اور یہ اس شاعری کا بہت بڑا احسان ہے ورنہ صدیوں سے تاریکی میں رہنے والی آدھی دنیا کی سڑاند بڑھتے بڑھتے باقی آدھی دنیا کو بھی اور ساری انسانیت کو ایسی گندی بیماری میں مبتلا کر دیتی کہ جس کا علاج آنے والے وقتوں کے حکماء کے پاس بھی نہ ہوتا۔

اور شاعری تو ایک سفر ہے مسلسل سفر جو نہ کسی ایک شاعر کی ذات سے شروع ہوتا ہے اور نہ کسی ایک شاعر کی شاعری پر ختم ہو سکتا ہے۔ ہر عہد میں شاعر پیدا ہوتے ہیں اس سفر میں شریک ہوتے ہیں کوئی بہت آگے نکل جاتا ہے کوئی ذرا پیچھے رہ جاتا ہے اور شاعرات بھی اپنے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اس سفر میں قافلہ در قافلہ شرکت کرتی رہی ہیں اور نظر انداز کی جاتی رہی ہیں اور تمام شاعرات دکھوں کی ایک ناقابلِ شکست اکائی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خواتین کی اردو شاعری جیسے ایک ہی دل کی دھڑکنیں ہوں اور ایک ہی ذہن کی سوچیں اور ان میں جو انفرادیت کی رنگارنگی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے دھنک کا ایک رنگ دوسرے رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔

عورتوں کی شاعری کی تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک خود عورت ہی کو ایک معمہ سمجھا جاتا رہے گا لہٰذا عورتوں کی شاعری کے مطالعے سے پہلے خود عورتوں ہی کا مطالعہ ضروری ہے اس لئے کہ آج تک یہی طے نہیں ہو سکا ہے کہ عورت شیطان ہے یا فرشتہ، ناقص العقل ہے یا انتہائی چالاک، زمین وزر کی طرح جاگیر ہے یا دوسرے انسانوں کی طرح خود مختار و آزاد انسان۔ یہ مطالعہ بہت دلچسپ ہے اور اس کے بغیر خواتین کی شاعری کو نہ سمجھا اور نہ سمجھایا جاسکتا تھا۔ لہٰذا پہلے باب کے حصہ الف میں پس منظر کے طور پر مختلف تہذیب و تمدن اور معاشروں میں عورت کی حیثیت اور حالت زار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے تاکہ ابواب میں ان عورتوں کو بحیثیت شاعرات بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔ اسی حوالے سے اس باب کے حصہ ب میں عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کا بیان ہے کیونکہ عورت کی تخلیقی صلاحیت کو صرف بقائے نسل تک محدود تصور کر لیا گیا ہے اور اسی تصور کو رد کرنے کی خاطر مختلف زبانوں کی شاعرات کا سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کا موضوع اگرچہ "بیسویں صدی میں خواتین کی اردو شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ہے تاہم تکمیل و تسلسل کی خاطر "پس منظر" کے اسی پہلے باب کے حصہ ج میں بیسویں صدی سے قبل کی شاعرات کو بھی مطالعے میں شامل کر لیا گیا ہے، یوں بیسویں صدی کی شاعرات کا مطالعہ دوسرے باب سے شروع ہوتا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت یہ مطالعہ آگے بڑھتا ہے۔ اس مقالے کے باب چہارم میں ہندوستان میں خواتین کی اردو شاعری اور وہاں کی بیشتر شاعرات کا جائزہ لینے کے بعد اسی باب کے حصہ ج میں اہم ہندوستانی شاعرات کی شاعری کا مفصل مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح پاکستان کی تمام اہم شاعرات کیلئے بھی خصوصی ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جوان نسل شاعرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اس خیال سے کہ یہی شاعرات خواتین کی اردو شاعری کے مستقبل کی امین ہیں چنانچہ ایک الگ باب میں ان شاعرات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے اور اس مقالے کے آخری باب میں خواتین کی اردو شاعری کی قدر و قیمت اور اس کے امکانات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شاعروں پر رائے زنی کرنا صرف شاعروں کا کام ہے اور ہر شاعر کا کام نہیں صرف بہترین شاعروں کا۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خواتین کی شاعری پر لکھنے کے لئے صرف بہترین شاعر ہونا ہی کافی نہیں بلکہ یہ ذمہ داری بہترین اور کہنہ مشق شاعرات کی ہے کہ وہ خواتین کی شاعری پر لکھیں، جب تک شاعرات خود خواتین کی شاعری پر لکھنا شروع نہیں کریں گی یہ شاعری اپنے حقوق سے محروم ہی رہے گی۔ جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔ اسی احساس کے تحت ایک حقیر سی کوشش اس مقالے کی صورت میں پیش خدمت ہے۔

اس موضوع سے میری وابستگی صرف سند حاصل کرنے تک محدود نہیں۔ اگر یہ پی ایچ ڈی کیلئے میرے مقالے کا موضوع نہ ہوتا پھر بھی اس موضوع پر مجھے لکھنا ہی تھا اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مقالے میں جو کچھ لکھا ہے گداز دل اور تپاک جان کے ساتھ لکھا ہے اور اس کا مقصد محض خامہ فرسائی یا جیسے تیسے مقالہ مکمل کر کے صرف سند حاصل کر لینا نہیں ہے بلکہ یہ میری ذات پر صدیوں کا شاید کوئی قرض تھا جسے بہرحال چکانا ہی تھا اور زندگی رہی تو انشاءاللہ خواتین کی شاعری کے حوالے سے مختلف موضوعات پر آئندہ بھی اس وقت تک لکھتی رہوں گی جب تک اردو شاعری کی تاریخ میں شاعرات کے نام شامل نہ ہو جائیں اور یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ خواتین کی شاعری نے اردو شاعری کو اتنا مالا مال کر دیا ہے کہ جس کا تصور بھی شاید شاعری نے کبھی نہیں کیا تھا۔ (زیر طبع کتاب "بیسویں صدی میں خواتین کی اردو شاعری کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ" کا مقدمہ)

1752, ALPINE DR. CARROLLTON TX 75007 (U.S.A.)

ادا جعفری

یہ معاشرہ مرد کا ہے اور مرد نے عورت کو زنجیریں پہنادی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری، ردِ عمل کی شاعری ہے اور اس میں وہ انتہا تک پہنچ گئی ہیں لیکن میں شاعری میں نسائیت کی دکان سجانا پسند نہیں کرتی۔ شاعری کے اندر شخصیت ضرور آتی ہے لیکن بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ جو شعر کہا گیا ہے اس میں شعریت ہے یا نہیں۔ میں نے مردوں کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول نہیں کیا بلکہ میں نے ان پابندیوں کو قبول کیا جو میرے ذہن نے مجھ پر عائد کی ہیں۔ سمجھتی ہوں کہ بات کو بین السطور میں کہنا زیادہ مناسب ہے کیوں کہ رمز و کنایہ بھی تو شاعری کا حسن ہے۔

43/8-B, P.E.C.H. SOCIETY, KARACHI (PAK)

بانو قدسیہ

عورتوں میں دو قسم کی لکھنے والیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو زندگی سے وابستہ ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو صرف رومانس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ پہلی قسم میں خواہ قرۃ العین حیدر ہوں یا جمیلہ ہاشمی، ان کے افسانوں میں زندگی کے ٹھوس حقائق ملتے ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کی افسانہ نگار خواتین ڈائجسٹ اور پاکیزہ ڈائجسٹ میں لکھتی ہیں اور ان کا زندگی کی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

● 121 - MODEL TOWN, LAHORE (PAK)

خالدہ حسین

ایک خاتون لکھنے والی کی شخصیت اور معاشرے میں ایک فرد کی حیثیت سے اس کی شخصیت میں ہمیشہ تصادم رہتا ہے۔ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ کیا ایک لکھنے والی محض لکھنے والی ہے یا وہ معاشرے کی ایک ذمہ دار فرد بھی ہے؟ ایک ہاؤس وائف بھی ہے یا یہ سب تصورات ہیں جو زندگی کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی عورت کے کردار کو ایک عنوان ملنا چاہیے۔ میں سوچتی ہوں کہ مجھے لکھنے والی ہونا چاہیے یا نہیں؟ کیا میں معاشرے کی ذمہ دار فرد بن جاؤں اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض ادا کروں؟ کیا ایک رائٹر کو بہت سی چیزیں چھوڑ دینی چاہئیں؟ لکھنے کو ہر چیز پر ترجیح دینی چاہیے؟ ان سارے تضادات سے، سوالات سے مجھے مسلسل اذیت ہوتی ہے۔ شاید افسانہ بھی لکھا اس وقت جاتا ہے جب یہ تضاد اپنی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ کم از کم میں اسی اذیت کی وجہ سے لکھتی ہوں۔

(مندرجہ بالا اقتباسات طاہر مسعود کے انٹرویو کی کتاب "یہ صورت گر کچھ خوابوں سے" [دوسرا ایڈیشن، مطبوعہ: ستمبر ۱۹۸۵ء] سے لئے گئے ہیں۔ ادارہ)

● 220, STREET NO. 33 G-2/8, ISLAMABAD (PAK)

کشور ناہید

میری عمر ۱۹ برس تھی اور کتاب کا نام "لب گویا" تھا۔ کتاب چھپنے سے پہلے مجھے بہت سے ذہنی کچوکے برداشت کرنا پڑے تھے۔ مجھ پر بہت سے اعتراض کئے گئے۔ اس ماحول میں میرا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ میرے ارد گرد ایسی عورتیں بھی نہیں تھیں جو میری طرح لکھتی تھیں۔ میں خوف زدہ تھی۔ ہر شخص میری ذات اور میری شاعری پر حملے کرتا۔ وہ مجھے اندر سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ اس دور میں صرف عابد علی عابد نے میری حوصلہ افزائی کی۔ میرے خاندان نے کبھی مجھے پسند نہیں کیا۔ وہ آج بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف مجھے برداشت کرتے ہیں وہ مجھ پر فخر نہیں کرتے، بلکہ وہ شرمندہ ہیں۔ ان کے خیال میں سید خاندان کی عورت کو ایسے کام نہیں کرنے چاہئیں جو میں کرتی ہوں۔ (ایک انٹرویو سے اقتباس۔ "پگڈنڈیوں پر چلنے والے مسافر"۔ خالد سہیل۔ ص ۲۲۹)

خیرالنساء مہدی

جب میں قرۃ العین حیدر کے ناول پڑھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ ان کے یہاں جاگیرداری کا جو NOSTALGIA ہے وہ اسی لئے ہے کہ عورت تعلیم اور معاشی آزادی حاصل کرنے کے باوجود وہ مرکزیت حاصل نہیں کر سکی ہے جو ہمیشہ سے اس کا حق تھا ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ "میرے بھی صنم خانے" سے "آخر شب کے ہم سفر" کی ہیروئن مرکزی کردار ہوتے ہوئے بھی ماحول اور مردوں کے بنائے ہوئے سرابوں میں مبتلا رہتی ہے۔ کشور ناہید نے اپنی کتاب 'عورت، خواب اور خاک کے درمیان' میں عورت پر کئے جانے والے مظالم کی پوری داستان لکھی ہے۔ کشور ایک سرکاری افسر ہوتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے کی سرکش خاتون ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ سب سے بڑی ذمہ داری مشترکہ خاندان میں عورت کے سر پر آپڑتی ہے۔ ایک طرف اسے نوکری کرنی پڑتی ہے یعنی دفتر میں جاکر اپنے اعلیٰ افسروں کو خوش کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف اپنے شوہر کو خوش آمدید کہنا پڑتا ہے۔ تیسری طرف بچوں کو صبح اسکول بھیج کر اور شام کو ان کا ہوم ورک کروانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ میزبانی کے فرائض الگ۔ شاید اسی لئے کشور ناہید اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں عورت کو اس قید خانے سے نکالنے کی کوشش کرتی ہیں جس میں وہ خود اب تک قید ہیں۔
(مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ ص: ۶۹،۷۰)

● E-1, RAVI DARSHAN, OFF CARTER ROAD, BANDRA (W) BOMBAY - 400050

بقیہ صفحہ ۱۲ سے آگے: برجو

کلہاڑا اٹھایا۔ بیٹے کو کاندھے پر لادا۔ بیوی کی بانہہ تھامی اور چپ چاپ کوٹھریا سے نکل کھڑا ہوا۔

رات بھر چلنے کے بعد پو پھٹے دور بہت دور ایک نئی بستی کے نئے جنگل میں پہونچ کر بیوی کی بانہہ چھوڑی۔ بیٹے کو کاندھے سے اتارا۔ رگڑ رگڑ کر کلہاڑے کی دھار کو چمکایا اور جنگل کے وسط میں پہنچ کر فرط جوش سے اپنی بانہیں اس طرح وا کر دیں جیسے تمام جنگل کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتا ہو...

رہ گیا رزق کا معاملہ۔ برجو نے سوچا۔ اس کے بیٹے کے بڑے ہوتے ہوتے اگر جنگل ختم بھی ہو گئے تو اسے رزق دینے والا اس کی طرح اس کے بیٹے کو بھی کسی نہ کسی صورت میں رزق مہیا کر ہی دے گا.....

اور دوسرے ہی لمحے اس کے کلہاڑے کی کھٹ کھٹ سے تمام جنگل گونج اٹھا اور تناور سے تناور پیڑ بھی دہل کر اس کے آگے سرنگوں ہو گئے۔

حمیرا رحمان

کوئی ستارہ گرا آسمانِ خلقت سے
گمان پھیل گئے ہر طرح کی وحشت سے

تلاش کرنے کسی مہربان لفظ کی چھاؤں
کوئی چراغ بڑھا ہے صفِ علامت سے

اکھڑ گئے ہیں مرے دائروں کے سارے شجر
مقابلہ ہے نئے سورجوں کی حدت سے

یہ جال پھیل رہا ہے مری ہتھیلی پر
کہ ہجرتوں کا حوالہ ہے میری قسمت سے

سفر میں ایک ہی سچ تھا کہ گھر ہمارا ہے
گھروں کی شکل بجھی لوٹنے کی عادت سے

تعلقات کھلے آسمان جیسے ہیں
نہ قربتیں ہیں، نہ ملنے کی آس شدت سے

حمیرا لوگ تذبذب کی کشتیوں پہ رواں
ڈرے ہوئے ہیں کسی لہر کی شرارت سے

● 3-Young Enclave, Yonkers,
NY, 10710, (U.S.A.)

فاطمہ حسن

جاتا ہے جو گھروں کو وہ رستہ بدل دیا
آندھی نے میرے شہر کا نقشہ بدل دیا

جن سے شناخت تھی وہ حوالے مٹا دیئے
اس نے کتابِ ذات کا صفحہ بدل دیا

کتنا عجیب ہے وہ مصور کہ غور سے
دیکھے جو خدوخال تو چہرہ بدل دیا

وہ کھیل تھا مذاق تھا یا خوف تھا کوئی
اک چال چل کے اس نے جو مہرہ بدل دیا

کرتا رہا اسیری کے احساس کو شدید
زنجیر کھول دی کبھی پہرہ بدل دیا

● D-41,Block-7 ، گلشن اقبال،
کراچی۔ ۷۵۳۰۰ (پاکستان)

رفیعہ شبنم عابدی

عمر بھر ذہن کے گم نام جزیروں میں رہ
بے گناہوں کی طرح میں بھی اسیروں میں رہ
میرے قدموں تلے جنت ہوئی تعمیر مگ
میری قسمت ترے ہاتھوں کی لکیروں میں رہ
اگلے وقتوں نے مجھے اس لئے معتوب ک
کیوں کہ میں بھی نئی دنیا کے سفیروں میں رہ
میرے کردار کو کیا قتل کرے گی د
میں جہاں بھی رہی، بیدار ضمیروں میں رہ
وہ صداقت ہوں جو دریاؤں پہ تحریر ہو
نوکِ نیزہ پہ بھی، ظلم کے تیروں میں رہ
کربلا! تجھ سے مرا خون کا رشتہ تو نہیں
کیوں یہ اک پیاس سی دونوں کے خمیروں میں رہ
میری تخیئل کو تشہیر کے تاجر نہ
وہ کہاں فن کے خریدار امیروں میں رہ
مابدولت کا تعلق ہی وفا سے کیا
یہ وہ دولت ہے جو ہم جیسے فقیروں میں رہ
سرفروشی مجھے ورثے میں ملی ہے
وہ بہن ہوں کہ جو بچپن ہی سے ویروں میں رہ

● 307,Saurabhi-C ، سات بنگلہ،
اندھیری (ویسٹ) ممبئی 400058

دولت کا زوال

رعنا حیدری

لبوں پر نام انکا جب بھی آیا
دھو گئے احساس پاکیزہ کے جھرنے سارے جذبوں کو
روح میں ہلچل مچی
شہرِ الفت کا سماں بندھنے لگا
دونوں آنکھوں میں سمندر سے کھلے
چپے چپے پر کھلے پھولوں سے دامن بھر گیا دل کا
مرتعش ہیں انگلیاں
نام لکھنے کی تمنا میں مچلتی ہیں
ہوا کے دوش پر اوراق سادہ یوں چلے آتے ہیں جیسے
کوئی طالب شہادت کا
سوئے محشر رواں ہو
دھڑکنوں میں نام اک کھلنے لگا پھر
بند ھا رختِ سفر بے شکل سوچوں کا
کہ شہر جسم و جاں میں
ہو کے کرنوں پر سوار اک سرو قد آیا
آہٹ اس کی بربط و نئے میں ڈھلی
فضائیں جلترنگ ہیں
خوشی کے رنگ بکھرے ہیں خلا میں
جسم و جاں میں روشنی ہی روشنی ہے
نور کی کرنیں لبوں کو چوم کر ٹھہری ہوئی ہیں
منتظر ہیں
کہ لب پھر نام دہرائیں
تو وہ لفظوں میں گھل جائیں
خود اپنے آپ کو پالیں

● اجنتا کلنک، جے سنگھ پورہ۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

نسیم سیّد

گزرِ اوقات

شمع کے ساتھ یونہی رات پگھلتی جائے
ایک ایک پل ——
میرے احساس کے کشکول میں
گرتا جائے
آج خیرات پہ مائل ہے
محبت کی نظر
آج یہ کاسۂ امید
چھلک جانے دو
کل یہ خیرات برے وقت میں کام آئے گی
پھر اگائیں گے
دھریں گے
یہی گزرا ہوا وقت
گزرِ اوقات کی صورت تو نکل آئے گی

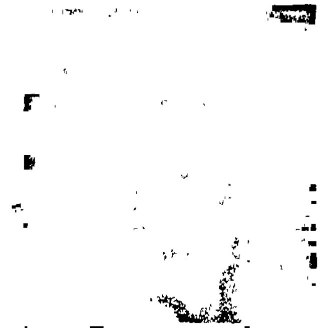
115-Hillcrest AVE, 2214 Apts. Mississauga. ●
ONT. L56 379, Canada

سلطانہ مہر

ایک نظم

خانۂ کعبہ میں
سفید احرام میں
لپٹے لپٹائے اجسام
پاکیزہ، نکھرے نکھرے
ان کو دیکھ کے لگتا تھا جیسے
ابھی ابھی
آسماں سے اترے ہوں
پر پھیلائے، معصوم فرشتے
جو اپنے رب کی ثناء میں ہیں مصروف
اور وہ مستورات
جو تھیں اپنے اپنے محرم کے ساتھ
ان کے چہرے
نرگس کے کھلتے پھولوں کی طرح تھے
اور وہ تھیں سر بسجود
بارگاہِ عزو جل میں
پر میں
اور میری دوست تاج شکور
ہم تھے کیسے تنہا تنہا
اپنی عبادت میں مصروف
تنہائی کے زہر کو
جرعہ جرعہ پیتے
اپنے دل کو تسلی دیتے
کہ ......
اپنا رب بھی تو 'واحد' ہے

20873, East Walnut Canyan ●
Road, CA-91789 (U.S.A.)



آمنہ ابوالحسن

D-108، کرزن روڈ اپارٹمنٹ، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی۔۱

برجو

برجو سخت ناخوش تھا۔ اس کے ساتھی اس کی نادانی پر ہنس رہے تھے اس کا مذاق اڑا رہے تھے اسے سمجھا منا رہے تھے کہ پکی کوٹھریا ہر ایک کو یونہی نہیں مل جاتی یہ تو اس کے لئے ایک اعزاز ہے مگر برجو کی اپنی ایک ہی رٹ تھی۔

"نہیں نہیں نہیں۔ نہیں چاہیے مجھے پکی کوٹھریا، مجھے میری کچی کوٹھریا ہی پسند ہے۔"

سمجھانے منانے والوں نے تھک کر سوچا۔ جائے جہنم میں۔ ہماری بلا سے عجیب احمق شخص ہے۔ لوگ سہولتوں کے حصول کی خاطر عمریں بتا دیتے ہیں اور ایک یہ برجو ہے کہ سہولتوں کو خاطر میں ہی نہیں لانا چاہتا۔ کم نصیب بے چارا.....

اس کے ایک آرام پسند ساتھی نے کھیج کر کہا۔ "یار برجو ایسا کرو نا کہ اپنی قسمت مجھ سے بدل لو۔" برجو فوراً راضی ہو گیا مگر قسمتیں اگر ایسی آسانی سے بدلی جا سکتیں تو جانے کتنے امیر غریب اور کتنے غریب امیر بن جاتے۔

یہ اسی وقت کی بات ہے جب جنگل ابھی قائم تھے۔ بستیوں میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ شہروں میں جو کچھ بھی ہوتا ہو مگر گاؤں میں چھوٹے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں کی حکمرانی تھی اور برجو ایک گاؤں کا لکڑہارا تھا۔ محنت ابتدا ہی سے اس کی سرشت تھی۔ بچپن ختم کر کے جیسے ہی ہوش سنبھالا اپنے باپ کے ساتھ جنگل جانے لگا۔ پہلے باپ لکڑیاں توڑتا تھا اور برجو پیچھے کھڑا انہیں چن چن کر ان کے گٹھر بنایا کرتا تھا پھر جب باپ گذر گیا تو باپ کا کام برجو خود کرنے لگا۔

ہر صبح منہ اندھیرے وہ پابندی سے جنگل کا رخ کرتا۔ دوپہر تک لکڑیاں توڑتا۔ سہ پہر کو پیڑوں سے اتر کر ٹوٹی ہوئی لکڑیاں سمیٹ کر ان کا گٹھر بناتا اور گاؤں کے بازار کی راہ لیتا۔ وہاں اپنا بوجھ اتار کر شام پڑے ہلکا پھلکا ہو کر اپنے ٹھکانے کو لوٹتے ہوئے ایک بوتل کچی شراب اور ایک پیکٹ بیڑی خریدنا کبھی نہیں بھولتا۔ بستی کے سرے پر بانسوں کے جھنگے پر تاڑ کے پتوں سے منڈھی اس کی کچی کوٹھریا تھی جہاں اس کی بیوی، اس کا کمسن بیٹا، گرما گرم روٹی اور کٹوری بھر ساگ ہر شام اس کا منتظر رہتا تھا۔

اتنی بڑی دنیا میں برجو کو اپنی یہ چھوٹی سی کوٹھریا بہت عزیز تھی۔ اس نے امیروں کی کوٹھیاں دیکھی تھیں نہ امیرانہ ٹھاٹ باٹ۔ بچپن ہی سے اس کے پیش نظر گھنے جنگل رہے تھے۔ ان میں ہمکتی ڈولتی تر و تازہ ہوائیں، جنگلی پھول پودوں کی مخصوص مہک، آزاد پرندوں کی چہکاریں اور وہ گمبھیر سناٹا جس کی آواز کوئی سمجھے نہ سمجھے برجو ضرور سمجھتا تھا۔ جنگل کا سبزہ اس کا بستر تھا۔ جھومتے لہراتے ہوئے پیڑ اس کا روزگار اور سناٹا اس کا رفیق۔

جنگل میں اس نے کئی طرح کی آوازیں سنی تھیں مگر جو آواز اسے سب سے زیادہ پسند تھی وہ کلہاڑے کی کھٹ کھٹ تھی جو اس کے ہاتھوں میں تھا جب پیڑوں کی ٹہنیوں پر پڑتا تو مضبوط سے مضبوط پیڑ بھی لرز لرز جاتے اور برجو مسکرا مسکرا کر بڑے فخر سے پسینے کی اُن بوندوں کو دیکھا کرتا جو کام کے دوران اس کے بدن سے ٹپک ٹپک کر زمین کا حصہ بنتے رہتے اور جب کلہاڑا تھم جاتا تو برجو کو لگتا کوئی بہت میٹھا گیت گونجتے گونجتے یک لخت تھم گیا ہے۔

بچپن کی راتوں میں جب اس کی ماں اسے سلانے کے لئے لوریاں گنگناتی تھی تو وہ لوریاں بھی برجو کے ذہن میں کلہاڑے کی کھٹ کھٹ بن جاتی تھی جنہیں سنتے سنتے وہ مطمئن مطمئن سو جایا کرتا تھا۔

بچپن بیتا تو ننھا سا کلہاڑا تھام کر وہ اپنے باپ کے ساتھ جنگل جانے لگا اور وہاں ننھے ننھے درختوں پر زور آزمائی کرنے لگا پھر اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اس کے کلہاڑے کے سائز بھی بدلنے لگے اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب اس کے طاقتور باپ کی بانہیں بڑھاپے سے نڈھال ہو گئیں تو ان کا سہارا بننے کے لئے برجو نے ان کا کلہاڑا اٹھا لیا جو اس وقت سے اب تک اس کے سکھ کا بہترین ساتھی تھا۔

برجو کو دوست احباب کی یاری سے بھی زیادہ مطلب نہیں ہوتا تھا۔ کام کرتے کرتے تھک کر جب وہ ایک دو بیڑیاں پھونکنے درخت سے اترتا تبھی اپنے ساتھیوں سے ذرا ہنس بول لیتا ورنہ وہ تھا اور اس کا کام۔

اس کی بیوی، اس کا بیٹا۔ بقیہ دنیا سے نہ اس کا کوئی واسطہ تھا نہ ناطہ۔

ایک بار اس کے ایک ایسے ساتھی نے جو جنگل چھوڑ کر بہتر روزگار کی تلاش میں شہر چلا گیا تھا برجو کو مشورہ دیا۔ "کب تک جنگل میں زندگی گنواتا رہے گا۔ میرے ساتھ چل۔ میں شہر میں تجھے کسی بڑی کوٹھی کی چوکیداری دلوا دوں گا تب تو بھی میری طرح ٹھاٹ سے رہنا۔"

مگر برجو کو یہ مشورہ پسند نہ آیا۔

"مجھے چوکیداری نہیں کرنا۔ نہ ہی شہر جانا ہے۔ میں جیسا بھی ہوں۔ یہیں خوش ہوں۔ جنگل ہی میری دنیا میری خوشی ہے۔"

برجو بولا تو اس کا یہ ٹکا سا جواب اس کے شہری ساتھی کو بہت برا لگا اس نے برجو پر لعنت بھیجی اور اپنے راستے ہو لیا۔

کچھ روز بعد اس کے دوسرے ساتھی نے کہا۔

"تمہیں شہر نہیں جانا تھا نہیں گئے برجو نہ سہی مگر اپنے گاؤں کے زمین دار صاحب کے فارم ہاؤس کی نگرانی تو کر ہی سکتے ہو۔ وہ شریف اور غریب پرور ہیں اپنے ملازموں کا خیال رکھتے ہیں۔ اچھی تنخواہیں دیتے ہیں۔ نہ ظلم کرتے ہیں نہ مفت کی بیگار لیتے ہیں۔ اپنا نہ سہی اپنے بیٹے کی بہتری کا خیال کرو۔ آج تم چوکیداری کرو گے تو کل تمہارا بیٹا بڑا ہو کر تمہاری جگہ سنبھال سکے گا۔ بے فکری کی زندگی گزار سکے گا۔ لکڑیاں توڑنے بیچنے میں کیا رکھا ہے اور جس حساب سے آبادی بڑھ رہی ہے، رہنے کے ٹھکانے کم ہوتے جا رہے ہیں کیا پتہ زیادہ گھر بنانے کے لئے کب سرکار جنگلوں کا رخ کرے تب کیا کرو گے؟"

یہ ایسی بات تھی جس نے برجو کو چونکا دیا۔ واقعی۔ اس نے سوچا اگر جنگل نہ ہوئے تو اس کا بیٹا کیا کرے گا۔ اگر معاملہ صرف اس کا اپنا ہوتا تو برجو کبھی حامی نہ بھرتا مگر بیٹے کی خاطر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چوکیدار ضرور بنے گا چنانچہ اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے وہ چوکیدار بن گیا۔ فارم ہاؤس بہت بڑا تھا جس میں کھیت ہی کھیت تھے۔ چاول کے، ہرے چنے کے، اور سبزیوں ترکاریوں کے کھیت۔ کلہاڑا ہاتھ سے رکھ کر اب برجو نے زمین دار صاحب کا دیا ہوا ڈنڈا اٹھا لیا تھا جس کے ایک سرے پر لوہے کا خول منڈھا ہوا تھا تاکہ اس ڈنڈے سے وہ اپنی حفاظت بھی کر سکے اور جانوروں کا مقابلہ بھی کر سکے۔

برجو کے علاوہ زمین دار صاحب کے پاس اور بھی چوکیدار ملازم تھے جن کی ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ وہ سب باری باری کبھی دن کی شفٹ کرتے تو کبھی رات کی۔

جنگل چھوڑ دینے کے باوجود برجو جنگل سے جدا نہیں ہوا تھا۔ جن دنوں اس کی رات کی ڈیوٹی ہوتی صبح اپنی کوٹھریا جا کر سونے سے پہلے وہ جنگل کے ایک دو چکر ضرور لگاتا۔ درختوں کے تنوں پر ہاتھ پھیرتا اور سبزے پر یونہیں لکا کر سوچتا۔ کیا اس سے اچھا بھی کوئی بستر ہو سکتا ہے؟

ایسا کرتے ہوئے برجو کو بڑی طمانیت محسوس ہوتی۔ اسے لگتا جنگل اس سے چھٹا نہیں ہے اب بھی اس کے اندر بسا ہوا ہے۔ وہ جب جی چاہے اس کی آوازیں سن سکتا اس کی مہک سونگھ سکتا اور وسعت محسوس کر سکتا ہے....

اور وہ اساڑھ کی بھیانک کالی رات تھی جب برجو اپنی ڈیوٹی پر ڈنڈا سنبھالے وقتاً فوقتاً ڈنڈا بجاتا ہوا کھیتوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ تھوڑا تھوڑا آرام لے کر وہ پورے فارم ہاؤس کا ایک چکر لگاتا اور مطمئن ہو کر اپنی جگہ واپس آ جاتا۔ کھیتوں کے اطراف جنگلا بھی لگا ہوا تھا مگر طاقتور جانور اکثر اس جنگلے کو توڑ کر کھیتوں میں گھس آتے تھے چنانچہ اس رات بھی آرام کے ایک وقفے میں کسی چوپائے کے بھاری قدموں کی آہٹ سن کر برجو کھیتوں کی طرف دوڑا اور یہ دیکھ کر کہ ایک سانڈ کھیت میں گھس آیا ہے، اس نے ڈنڈا بجاتے ہوئے زوردار نعرہ لگایا اور ڈنڈا گھماتے ہوئے سانڈ کے سر پر جا پہنچا۔ یوں سانڈ کی اور برجو کی ٹھن گئی۔ برجو کا موٹا ڈنڈا سانڈ کی پیٹھ پر پڑا تو سانڈ نے برجو کو دوسرے وار کا موقع دیے بغیر اپنی سینگوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا مگر سانڈ سے ہار جانا اپنی توہین مان کر برجو جوں توں سنبھل کر اٹھا تو اسے لگا کہ اس کے ہاتھ میں لٹھ نہیں کلہاڑا ہے لہٰذا سخت تکلیف کے باوجود اس نے سانڈ پر اتنے متواتر ڈنڈے برسائے کہ سانڈ کو بھاگتے ہی بنی تب برجو درد سے بے حال ہو کر کھیت میں گر گیا۔

صبح جب ساری بات سب کے اور زمین دار کے علم میں آئی تو زمین دار نے نہ صرف فوراً برجو کو اسپتال بھجوا کر مرہم پٹی کروائی بلکہ اس کی بہادری کی توصیف میں برجو کو انعام اکرام اور ایک پکی کوٹھریا بھی بخش دی۔ برجو نے پیسہ بیوی کے حوالے کیا اور چند دنوں تک پکی کوٹھریا میں رہا بھی مگر جلد ہی اس کی پختہ دیواروں سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کوٹھریا میں نہ جی بھر تازہ ہوا آتی تھی نہ دھوپ۔ اور یہ سوچ بھی اسے لاحق تھی کہ کلہاڑا چلانے کی محنت اور عادت کی وجہ سے وہ سانڈ سے بچ گیا لیکن کیا ضروری ہے کہ اس کا بیٹا بھی ایسے کسی حادثے سے بچ ہی جائے۔ اگر کہیں وہ لنگڑا لولا ہو گیا یا جان ہار گیا تو؟

اگر وہ خود مر گیا تو اس کے بیٹے کو کون بڑا کرے گا یہ ایسا ہیبت ناک خیال تھا کہ وہ بیٹے کے مستقبل کا خیال ہی بھول گیا۔ بیٹے کی زندگی کے آگے اس کے لئے کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور جس کام میں جان کی گھات ہو وہ کام وہ اپنے بیٹے کے لیے کیسے قبول کر لیتا۔ جب بیٹا بڑا ہو گا تب دیکھا جائے گا۔

یہی بات جب اس نے سب سے کہی تو سب اس پر ہنسے، اسے نادان ٹھہرانے، اس کا مذاق اڑانے لگے، چنانچہ ایک رات کو جب سارے گاؤں پر نیند کی حکمرانی تھی برجو نے آہستگی سے کونے میں رکھا ہوا اپنا

[بقیہ صفحہ - ۸ پر]

عشرت آفریں

نہی کسی کے دھیان میں اپنے آپ میں گاتی دوپہریں
م ، گلابی جاڑوں والی بال سکھاتی دوپہریں
ارے گھر میں شام گئے تک کھیل وہ دھوپ اور چھاؤں کا
لپے پتے کچے آنگن میں لوٹ لگاتی دوپہریں
رے میں حیران کھڑے آئینہ جیسے ہنستے دن
دو سے لڑ کر گوریا سی شور مچاتی دوپہریں
یوں ڈور کے پیچھے حیراں ، بھاگتی ٹولی بچوں کی
یوں گلیوں ننگے پاؤں دھول اڑاتی دوپہریں
رگوشی کرتے پردے کنڈی کھٹکا تانت کھٹ دن
بے دبے قدموں سے تپتی چھت پر جاتی دوپہریں
م تلے وہ کچے دھاتے رنگتی ہوئی پرانی یاد
یرا ڈالے چھوٹی چھوٹی ہاتھ بٹاتی دوپہریں
ہی مضافاتوں کے بھید بھرے سناٹے والے دن
ڑیوں کے لب سی کران کا بیاہ رچاتی دوپہریں
وائی سے لڑتے کتنے ورق پرانی یادوں کے
غاتوں کے صندوقوں کو دھوپ دکھاتی دوپہریں
ڑکی کے ٹوٹے شیشوں پر ایک کہانی لکھتی ہیں
نڈھے ہوئے پیلے کاغذ سے چھن کر آتی دوپہریں
ھتی آنکھیں ، زخمی پوریں ، الجھے دھاگوں جیسے دن
دل جیسی اوڑھنیوں پر پھول کھلاتی دوپہریں
ہٹی پرانی گٹھری اوڑھے دھوپ سینکتے بوڑھے دن
یشانی تک پلو کھینچے ؛ چلم بناتی دوپہریں
ڑھنیوں کے اڑتے بادل رنگوں کے بازاروں میں
وڑی کی دوکانوں سے وہ ہمیں بلاتی دوپہریں
نتے ہیں اب ان گلیوں میں پھول شرارے کھلتے ہیں
دن کی ہولی کھیل رہی ہیں رنگ نہاتی دوپہریں
، تو میرا شہر نہیں ہے یہ تو میرے خواب نہیں
س جانب سے آنکلی ہیں یہ گہناتی دوپہریں

15310, Camino Delsol ●
Houston TX.77081 (USA)



زریں یسین

خاک ہوجائیں کہ جینا چاہیے
زندگی تجھ کو تماشہ چاہیے
اک صدائے گل کی طرح سے ہمیں
تیرے کوچے سے گزرنا چاہیے
اجنبی لوگوں کی کالی بھیڑ میں
اِک سخن آثار چہرہ چاہیے
وہ ذہن کی سوچ کیا سمجھے بھلا
اُس کو تو بس ایک گڑیا چاہیے
دوستو عرضِ ہنر دشوار ہے
بات کرنے کا سلیقہ چاہیے
خواب کے قیدی ہیں چلنے کے لیے
گہرے جنگل میں تو رستہ چاہیے
دل کو بھی اب تو دھڑکنے کے لیے
ہر گھڑی اک زخم تازہ چاہیے
ہم فقط اک کھیل کے کردار ہیں
پردہ اٹھنے کا اشارہ چاہیے
جس میں ظالم، بھوک ہو نہ پیاس ہو
ہم کو زریں ایسی دنیا چاہیے

241-Jeff Street, ●
Metuchen,NJ-08840 (U.S.A.)

اسنیٰ بدر زبیری

محبتوں کے نئے باب دیکھنا چاہوں
میں اس زمین پہ مہتاب دیکھنا چاہوں

وہ ہے تو اس کی نفی کیوں کروں کسی کے لئے
پرائی آنکھ کے سب خواب دیکھنا چاہوں

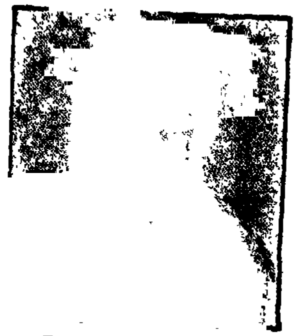
نہ جانے کون سا پل ہے کہ لاجونتی بدن
ذرا سی دیر کو بے آب دیکھنا چاہوں

یہ میں بھی کیا ہوں کہ بے اعتبار آنکھوں میں
نہ پیاس رکھوں نہ سیلاب دیکھنا چاہوں

ہواؤں میں جو جلایا چراغ خوشبوؔ نے
میں اس چراغ میں تیزاب دیکھنا چاہوں

(خوشبو پروین شاکر کا اصطلاحی نام ہے)

● B-1/88، سیکٹر G، علی گنج، لکھنؤ ۔۵



ملکہ نسیم

جھوٹ

ہماری الجھنیں اور مسئلے
سب ایک جیسے ہیں
ہماری مامتائیں اور بچپن
ایک جیسے ہیں
ہمارے خواب
جن میں الفتوں کے رنگ
شامل ہیں
یہ سب بھی ایک جیسے ہیں
مگر کیوں؟

آج یہ سچائیاں
سب جھوٹ لگتی ہیں
ہماری ابتدا اور انتہا
سب جھوٹ لگتی ہے

● 3543۔ہیروں کی گلی، موتی کٹلا روڈ،
جے پور (راجستھان)

سیّدہ نزہت صدیقی

بوزنیا

بوزنیا تیرے آنگن مقتل،
تیری گلیاں، خون کی ندیاں،
تیرے رستے، آگ کے دریا،
تیرے جنگل، موت کے آسیبوں کے مسکن،
برقِ شقاوت خرمن خرمن،
لاشوں کے اتنے انبار
کہ تنگیٔ داماں پر شرمندہ تیرے میداں، تیرے گلشن،
قریہ قریہ تیرے کنٹریل بیٹوں کے بے کتبہ مدفن
تیری ماؤں کی آنکھوں سے مریم کے آنسو بہتے ہیں
بوزنیا تیرے چوراہوں میں عیسیٰ پھر مطلوب ہوا ہے

2-Dallington Dr. Willowdale ●
ONT. M2J - 2G3 Toronto (Canada)

نیر جہاں

نظم نظم ستارے

تنہائی میں دھیان اُس کا
کچھ ایسے چھن سے آجائے
جیسے توے پر روٹی ڈالوں
اور چوڑی بج جائے

پہلے محکول والدین کے تھے
پھر شریکِ حیات کا ڈر تھا
آج ہیں تابعدار بچوں کے

ساری یادیں تھیں جس سے تابندہ
اُس کو پہچان بھی نہیں پائی
ایک مدّت کے بعد جب دیکھا

شادی میرے بیٹے کی تھی
جانے کیوں ہمسائے کی بیٹی
شادی کے دن پھوٹ پھوٹ کر روئی

721-Hill Street, Suite III, ●
Santa Monica, CA 90405 (U.S.A.)



قرۃ العین حیدر

ایک ادبی مکالمہ

مکالمہ نگار ○ جاوید ناصر ——— تحریر ○ مشتاق مومن

اردو کی منفرد اور بے مثال دانشور فن کارہ محترمہ قرۃ العین حیدر کا ایک پرانا ریڈیائی مکالمہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔ دس سال قبل کا یہ مکالمہ اس لئے اہم ہے کہ یہ قرۃ العین حیدر سے مکالمہ ہے اور ہنوز غیرمطبوعہ ہے۔ عینی صاحبہ اپنے حرف و لفظ میں اب اتنی معتبر ہوگئی ہیں کہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان کے لفظ روشن تر ہیں۔ آکاش وانی (بمبئی) کے 'بزم اردو' پروگرام کے لئے جدید شاعر جاوید ناصر نے عینی صاحبہ کا خیرمقدم کیا تھا اور جدید افسانہ نگار مشتاق مومن نے اسے ۷ردسمبر ۱۹۹۱ء کو تحریر کیا تھا۔ [ادارہ]

ج: سامعین کرام جاوید آداب عرض کرتا ہے، بزم اردو کی اس خصوصی نشست میں آج ہماری مہمان ہیں اردو کی ممتاز ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر تو آیئے اپنی امیدیں، اپنے حوصلے، اپنے شکوک اور اپنے شبہات اپنے اندیشے اور اپنے سوالات ان کے سامنے رکھیں تاکہ ہماری رہنمائی ہو۔ عینی آپا آداب عرض ہے۔

ق: آداب عرض۔

ج: فن کے بنیادی وظیفے آرٹ کے Basic functions سے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں خاص طور سے آپ کے تخلیقی عمل کی روشنی میں کہ فن کا بنیادی وظیفہ کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے افہام و تفہیم کے لیے۔

ق: صاحب، فن کا بنیادی وظیفہ، مقصد میرے خیال میں تو یہ ہے کہ ایک انسان جس میں کوئی بھی تخلیقی صلاحیت ہے یعنی وہ پینٹنگ کرتا ہے یا وہ گاتا ہے یا وہ لکھتا ہے افسانہ، شعر، ناول یا پھر کوئی خوبصورت مکان بناتا ہے کوئی بھی خوبصورت چیز جس کی کوئی افادیت ہے۔ اور اس کو جو زندگی کے اس contacts میں جہاں پہ وہ خود کو موجود پاتا ہے اور اپنے آس پاس کی دنیا کو موجود پاتا ہے جس طریقے سے وہ دیکھتا ہے دنیا کو اور زندگی کو بھی اس کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، کن الفاظ میں یا کن سروں میں یا کن رنگوں میں یا بہ حیثیت ایک آرکی ٹیکٹ کس انداز سے، وہ فن کا اس کا گویا contribution ہے زندگی کو بہتر بنانے اس کو سمجھنے کی کوشش میں اس کا ایک حصہ ہے۔ میں سمجھتی ہوں میں بتا چکی اپنے آپ کو۔ اچھا اب یہ بہت پرانی بحث ہے کہ Art for art sake ہو یا Art for life sake تو صاحب Art for art sake اور Art for life sake دونوں ہو سکتا ہے ایک ساتھ کیوں کہ art الا ئف سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اور زندگی جو ہے وہ art سے الگ کوئی چیز نہیں ہے جب آپ کوئی چیز خوبصورت بناتے ہیں تو وہاں پہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ It can be putty pretty پھر وہ چیز جو ہے وہ زندگی کی نمائندگی نہیں کرے گی بلکہ ایک طرح سے وہ اس کا idealisation ہوگا تو وہ صحیح نہیں ہوگا پھر یہ ہے کہ زندگی آپ کو جس طرح نظر آرہی ہے آپ ویسے ہی پیش کردیں تو یہ بڑی بھیانک چیز بھی ہو سکتی ہے جس چیز سے کہ ہماری پوری ماڈرن آرٹ کی تحریک نکلی یعنی پہلے انیسویں صدی تک جو ہمارے آرٹسٹ تھے، فن کار تھے وہ زندگی کو مشرق میں idealise کرکے پیش کرتے تھے اور مغرب میں کیوں کہ زندگی زیادہ متحرک تھی اور وہ بھی جامد جو آرٹ تھا اس کے برخلاف وہ پیدا ہوا renaissance (نشاۃ الثانیہ) کے بعد جب کہ انھوں نے دیکھا کہ صرف ایک ہی رخ نہیں ہے زندگی کا چاروں رخ ہیں اس سے light اینڈ شیڈ کا concept پیدا ہوا جو کہ محض آرٹ میں ہی نہیں بلکہ وہ لٹریچر میں بھی آتا ہے وہ ہمارے یہاں نہیں آیا ہمارے یہاں یک رخی تصویریں ہیں، ہمارے یہاں لٹریچر بھی یک رخا رہا، ہمارے یہاں ہر چیز جو تھی وہ خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کا تصور رہا مشرق میں، اچھا مغرب میں Industerlisation کے ساتھ اور بھی زیادہ زندگی کے جتنے بھی بھیانک پہلو جو سامنے آئے! دنیا کے سامنے وہ لوگوں نے پیش کرنے شروع کیے آرٹ میں بھی اور لٹریچر میں بھی اسی سے ناول پیدا ہوا، اسی سے مختصر افسانہ پیدا ہوا اور اسی سے جدید شاعری پیدا ہوئی اور وہی چیز ہمارے یہاں آگئی انیسویں صدی کے آخر آخر تک جو بحث شروع ہوئی تھی Art for art sake اور Art for life sake وہ بحثیں وہاں بہت رہیں۔ اور اس سے لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور اس سے ایک بہت بڑا کہنا چاہیے کہ زبردست پکچر گیلری تیار ہوگئی زندگی کی جس میں آپ ہر چیز ہر پہلو سے دیکھ سکتے تھے نظر آتی تھی

وہ ہمارے یہاں اس صدی میں آخری یعنی تیسویں دہائی کے بعد ہمارے یہاں وہ چیز آئی آرٹ میں بھی اور لٹریچر میں بھی لہذا یہ کہنا کہ ادب Art for art sake بھی ہو سکتا ہے اور for life sake بھی ہو سکتا ہے اور دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں لہذا میرے خیال میں ادب کا مقصد یہ ہے کہ جو چیز آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ دیانت داری سے پیش کیجئے اس میں آپ زندگی کی خوب صورتی بھی دکھایئے اور زندگی میں جو بد صورتی ہے وہ بھی دکھایئے لیکن اس طرح سے نہیں کہ اس سے آپ کو زندگی سے ایسی نفرت نہ پیدا ہو کہ آپ اس سے Morbidity کی طرف جائیں بلکہ اس سے آپ کچھ بہتری پیدا کرنے کی کوشش کریں اس کو آپ کہیں گے کہ یہ تو بالکل پروپیگنڈے والی بات ہوئی مگر میرا خیال ہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ میرا خیال ہے گریک ٹریجڈی Greek Tragedy پڑھیے یعنی ٹریجڈی جو ہے اس کے آگے کوئی چیز نہیں ہے Tragedy is the end لیکن اس کو پڑھ کے آپ کے اندر کیا ہوتا ہے آپ کے اندر زندگی سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ آرٹ کا مقصد یہی ہونا چاہیے۔

ج: یعنی باطنی طاقت پیدا ہونی چاہیے۔

ق: باطنی طاقت پیدا ہونا چاہیے۔

ج: اچھا ایک اور بات ذہن میں ہے، خاص طور سے یہ بات اس لئے بھی ذہن میں آئی کہ آج کل آپ کے افسانوں کے تعلق سے ایک بات کہی جاتی ہے کہ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی زندگی کے تجربات کم ہو گئے ہیں آپ کے ہاں، اس لیے آپ تاریخ سے یا دیگر علوم سے زیادہ مدد لیتی ہیں تو میں یہ سوچتا ہوں کہ فن کار جس ماحول کا پروردہ ہے، اور جن روایات کا امین ہے، جن تعلیمات سے آراستہ ہے، جن تہذیبی خصوصیات کا حامل ہے، تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کی تخلیقات میں ان تمام چیزوں کا اظہار ہو، ان سے گریز بھی ممکن ہے اور اگر اظہار ناگزیر ہے تو وہ لا شخصی بھی ہو سکتا ہے تو ان تمام تفصیلات کے ساتھ علاحدگی احساس اور لا شخصی اظہار کی اصطلاحیں کیا آپ کے لیے قابلِ قبول ہیں؟

ق: دیکھیے جب آپ نے تاریخ کی بات کی نہ تو یہ بہت اہم معاملہ ہے، بہت اہم نکتہ ہے جہاں تک میرا سوال ہے جب آپ نے یہ کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ میں زندگی سے الگ ہوں کیا کہ وہ...............

ج: چلتی پھرتی جیتی جاگتی زندگی.......

ق: دیکھیے ہر شخص کا اپروچ Approach ایک نہیں ہے اگر میرا اپروچ تاریخ کا ہے تو وہ رہے گا۔ تاریخ میرے خیال میں ایک بنیادی حقیقت ہے جس سے کہ آپ انسان کی زندگی کے پہلو اور انسان کے کردار کی خصوصیات ہیں یا اس کی جو نفسیاتی الجھنیں ہیں اس کے شخصی مسائل ہیں یا اس کے سماج کے مسائل ہیں وہ تاریخ سے الگ ہو کے آپ دیکھ ہی نہیں سکتے تو میرے خیال میں یہ جو بات ہے وہ میری سمجھ میں آئی نہیں اس لیے کہ جب میں ایک کیریکٹر لیتی ہوں تو میں اس کو تاریخ کے چوکھٹے میں رکھ کے دیکھتی ہوں اور اس سے مجھے پوری جو اس کی بیک گراؤنڈ ہے عمرانی جو اس کا پس منظر ہے اس کا جو نفسیاتی پس منظر ہے اس کا جو تہذیبی پس منظر ہے اس سے الگ رہ کر میں دیکھ ہی نہیں سکتی لہذا جب میں لکھوں گی تو وہ زیادہ rounded کیریکٹر ہوگا کیوں کہ میں نے اس کو تاریخ کے چوکھٹے میں رکھ کے دیکھا ہے چاہے وہ کوئی ایک شخص ہو، کوئی سچویشن ہو، کوئی واقعہ ہو، کوئی ماحول ہو، کوئی خاص فضا ہو وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے ہم اور آپ تاریخ کا ایک حصہ ہیں تاریخ سے الگ نہیں ہیں لہذا جب میں کوئی بھی چیز لکھتی ہوں جب میں نے شروع میں لکھنا شروع کیا ظاہر ہے کہ میں نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کیا تھا اس وقت مجھے یہ سب باتیں نہیں معلوم تھیں لیکن مجھے تاریخ کا شوق پیدا ہوا اور تاریخ سے میں اتنی Involved ہوں آپ تاریخ سے الگ نہیں ہیں ہم جو سب یہاں بیٹھے ہیں وہ تاریخ کی ایک خاص سچویشن کا ایک حصہ ہیں اس سے الگ ہو ہی نہیں سکتے بلکہ میں تو بعض وقت سوچتی ہوں کہ لوگ بغیر تاریخ کے متعلق سوچے ہوئے کس طرح بات کر لیتے ہیں کس طرح لکھ لیتے ہیں اور اسی لیے میں جب بھی بات کرتی ہوں تو فوراً پہنچ جاتی ہوں بالکل ہزاروں میل دور، ہزاروں لاکھوں برس پہلے پہنچ جاتی ہوں حالانکہ اس سے بات نہیں بن جاتی ہے مثلاً آپ نے سوال کیا تھا کہ فن کا بنیادی مقصد کیا ہے تو فوراً میں پہنچ گئی Greek Tragedy پر اور میں پہنچ گئی Renaissance میں اس کے بغیر میں سوچ ہی نہیں سکتی یعنی جو بات کرتی ہوں میرے ذہن میں اس کا پورا ایک پس منظر ہوتا ہے یا اس کا.....

ج: تہذیبی ارتقاء نظر میں رکھتی ہیں.....

ق: تہذیبی نہیں ہوتا وہ، صرف وہ تہذیبی کے علاوہ ایک قسم کا Metaphysical بھی ہوتا ہے دیکھیے تاریخ کا ایک Metaphysical element پہلو ہے جو بہت اہم ہے اور وہ آپ سمجھ سکتے ہیں اسی وقت جب آپ تاریخ کا بہت زیادہ گہرا....

ج: شعور ہو۔

ق: شعور تو خیر بہت بڑی بات ہے ممکن ہے شعور نہ ہو، دلچسپی ہو تو مجھے دلچسپی ہے میں کوئی افلاطون تو ہوں نہیں میں تاریخ کی ایک طالب علم ہوں اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میں دیکھتی ہوں کہ جب میں یہاں پہ بات کروں گی ایک چیز کی تو اس کے پیچھے کتنی زیادہ Racial اس کے پیچھے نسلی الجھنیں ہیں، اس کے پیچھے زبان کی الجھنیں ہیں، اس کے پیچھے نفسیات کی الجھنیں ہیں، کلچر کی ہیں انسان اکیلا نہیں ہے ایک اکائی تو وہ ہے ہی نہیں وہ بندھا ہوا ہے وہ بندھا ہوا ہے پورے ماحول سے پورے ماضی سے بندھا ہوا ہے اور ماضی سے الگ ہو کے کہیں جا نہیں سکتا اس لیے ماضی میرے لئے بہت Important ہے۔

ج: ایک طالب علمانہ تجسس کے تحت جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی کس تخلیق پر نادم ہیں اور کس تخلیق پر نازاں اور کس تخلیق سے مطمئن؟

ق: آہا! صاحب دیکھیے نادم تو میں شاید نہیں ہوں کسی تخلیق سے بھی لیکن یہ

ہے کہ جو چیزیں میں نے بچپن میں لکھی تھیں لڑکپن میں Teenager اب میں نے وہ پڑھاتیں نے مثال کے طور پر میں نے افسانے پڑھے تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ باتیں میں نے کیسے محسوس کرلیں غالباً اب میں ان چیزوں کو نہیں محسوس کرپاؤں گی تو شروع کے افسانوں سے ممکن ہے مجھے کچھ جھینپ آئے کہ میں نے کیا لکھا تھا لیکن بھئی وہ تو ایک ارتقاء ہوتا ہے انسان کا—— آج آپ شعر کہہ رہے ہیں آج سے بیس سال کے بعد آپ اور زیادہ اچھے شعر کہیں گے۔ تو یہ بات ہے کہ میں نادم تو نہیں ہوں لیکن میں.... کیا فرمایا تھا آپ نے پھر سے بتایئے گا۔

ج: کس تخلیق پر ناز......

ق: ناز وناز تو کسی تخلیق پر نہیں ہر خود غلط کسی تخلیق پر نہیں لیکن صاحب میں جو لکھتی ہوں بڑی Sincerity سے لکھتی ہوں بڑی دیانت داری سے لکھتی ہوں اور اب محنت سے لکھتی ہوں۔

ج: اب دیانت داری پر ایک بات یاد آگئی ہے کہ آج کل اردو میں اور خاص طور سے افسانوں میں ایک مابعد الطبیعاتی فضا خلق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے بالکل نئے لکھنے والوں اور ان کے پیش رو کی بات کررہا ہوں ایک عجیب وغریب قسم کی سطریت اور ثنویت قائم کی جاتی ہے قول محال وغیرہ کی جو اصطلاحیں غالب کے زمانے میں تھیں اس سے غیر ضروری استفادہ کیا جاتا ہے، مجرد مصرعوں کا انبار لگایا جاتا ہے اس سے کوئی فضا بنتی ہو تو بنتی ہو لیکن یہ احساس قطعاً نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار کی زد میں ایسا کوئی موضوع ہے جو بلاغت کا مطالبہ کرتا ہے یا جس کا کوئی حل نہیں ہے جو لاینحل نظر آتا ہے تو کیا یہ تقلید ہے یا ان لکھنے والوں کی کم مائگی؟

ق: دیکھیے یہاں پر آپ کو میں ایک مثال پیش کرتی ہوں وہ مثال ہے ماڈرن آرٹ کی میں یہاں پر کسی نئے لکھنے والوں کا پرانے لکھنے والوں کا نام نہیں لوں گی۔ آپ کسی ماڈرن آرٹ کی گیلری میں چلے جایئے وہاں پہ آپ دیکھیں گے کہ کینواس لگے ہوں گے ایک لائن میں ہزاروں۔ کسی بڑی گیلری میں چلے جایئے۔ دلّی میں یا باہر یا بمبئی میں بھی اور اس میں آپ کو اس قدر بے تکی چیزیں نظر آئیں گی بعض جگہ کینواس پورا خالی ہوگا ایک جگہ صرف ایک نقطہ لگا ہوگا، کہیں پہ چکر ہوں گے کہیں پہ...... میں آپ کو یہ بتادینا چاہتی ہوں کہ میں خود پینٹ کرتی رہی ہوں اور میں نے ماڈرن آرٹ بھی بنایا ہے تو اس میں بعض چیزیں آپ کو Visually اپیل کریں گی چاہے آپ کی سمجھ میں نہ آئے کہ آرٹسٹ نے کیا کہا ہے، اچھا آرٹسٹ نے کیا کہا ہے یہ میں خود بھی نہیں جانتی اس لیے کہ آرٹسٹ غالباً خود بھی نہیں جانتا وہ ایک فیشن کو follow کررہا ہے۔ یا سوچتا ہے کہ اس وقت میں جدید دنیا کا ایک فرد ہوں اور دنیا اتنی مشکل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی لہذا میں فقط چاند اور چڑیاں اور درخت نہیں بناؤں گا اور میں کشتی میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نہیں بناؤں گا، ستار بجاتی ہوئی، میں ایک بھیانک بھتنی بناؤں گا اس سے میں بتاؤں گا کہ ہمارے اندر کتنی قہرناکی ہے، کتنا اندھیرا ہے زندگی میں اور ہم کتنے تنہا ہیں اور زندگی کتنی مشکل ہے وغیرہ وغیرہ وہ ان کو express کرنے کی کوشش کرے گا ان بھیانک اجزا سے یا ان مشکل سمجھ میں نہ آنے والی تصویروں سے یا رنگوں سے تصویروں سے یا محض چند لکیروں سے یا وہ آج کل کولاج کی تکنیک ہے کہ آپ نے مختلف چیزیں رکھ دیں ٹوتھ برش رکھ دیا یا تین چار پتھر رکھ دیے اس کے اوپر آپ نے ایک جھاڑن رکھ دیا اس سے آپ نے ایک کولاج بنالیا اب آپ اس سے پوچھیے کہ آپ نے یہ کیا کیا ہے تو وہ نہیں سمجھاپائے گا وہ اس کا کوئی نام رکھ دے گا، اس کا نام رکھ دے گا ففتھ سمفنی Fifth Symphony اس سے لوگ کہیں گے ففتھ سمفنی ہے یہ؟ تو یہاں یہ مسئلہ آجاتا ہے Communication کا وہی پرانی بات کہ اس آرٹسٹ نے ففتھ سمفنی بنائی ہے ایک ٹوتھ برش، ایک جھاڑن اور چار پتھر رکھ کے میرے خیال میں وہ سمفنی نہیں ہے بکواس ہے یا محض ایک فراڈ ہے وہ۔ سمجھ گئے آپ اسی طریقے سے آرٹ میں جو ہوتا ہے اسی طریقے سے لٹریچر میں بھی ہورہا ہے اور ہوچکا ہے میں آپ کو بڑے مزے کی بات بتاؤں کہ کہیں پہ میں نے پڑھا تھا خود ایلیٹ Eliot نے لکھا ہے کہ میں نے ویسٹ لینڈ Waste Land میں چند چیزیں ایسی لکھیں نہیں ویسٹ لینڈ میں، نہیں چند اور اس کی نظمیں تھیں اس میں چند چیزیں اس نے لکھیں اس نے کہا کہ میں نے یہ محض تفریحاً لکھ دی تھیں اور بعد میں نقادوں نے اس کی اتنی تاویلات کی ہیں اتنی تاویلات کی ہیں کہ خود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں میں تو انہیں لکھ گیا تھا۔ اچھا ایسے ہی ایذراپاؤنڈ Ezra Pound کی کچھ نظمیں ہیں جس میں اس نے Chinese کے کچھ لفظ استعمال کیے ہیں اس میں اس نے کچھ چائنیز کیریکٹر Chinese Character کچھ اٹالین پوئیٹری Itelian Poetry استعمال کی تو صاحب اس کو پڑھنے کے لیے تو آپ کو کوئی Super genious وہ ہونا چاہیے وہی دماغ ہونا چاہیے جو ایذراپاؤنڈ یا ایلیٹ کا تھا۔ ظاہر ہے آپ اور میں تو اس Chinese Character کا مطلب نہیں جانتے۔ اچھا ایذراپاؤنڈ نے وہ کیوں لکھے؟ وہ کینٹوس (Cuntos) کیوں لکھے؟ وہ تو بڑا شاعر ہے۔ دیوزاد ہے وہ شاعری کا، ایلیٹ کی طرح تو کیوں لکھے اس نے؟ اچھا اس نے لکھا وہ لکھ گیا آپ یا میں اگر اپنے افسانے میں چینی کردار لکھوں تو میں لوگوں کو صرف مرعوب کررہی ہوں بے وقوف بنارہی ہوں تو یہاں پر یہ مسئلہ آجاتا ہے کہ کہاں تک آپ دیانت داری سے ایک چیز پیش کررہے ہیں یہ جو آپ فضا Creat کررہے ہیں مابعد الطبیعاتی Whatever you may call it یا کسی نقاد نے کہہ دیا کہ افسانہ جو ہے وہ شاعری کا ایک پہلو ہے بھائی لوگ سب اس پہ لگ پڑے حالانکہ اگر آپ دیکھیے کہ اچھی نثر آپ نے لکھی تو لامحالہ وہ شاعری کے قریب ہوگی تو اس طرح آپ کوشش کرکے

ایک چیز بنائیں تو ٹھیک ہے بعض میں اس کو کامیابی ہوگی اگر وہ اچھا ہوگا، اور اگر وہ اچھا نہیں ہوگا، اور اگر آپ محض تقلید کے طور سے آپ کریں گے تو وہ فیل ہو جائے گا۔ بڑی آسان بات ہے۔

ج: لیکن یہ جو اور لکھنے والے ہیں....

ق: میں نے اپنا مطلب کچھ واضح کر دیا یا نہیں؟

ج: جی ہاں! یہ جو اور لکھنے والے ہیں بلونت سنگھ ہیں، بلونت سنگھ کافی سینئر ہیں انور عظیم ہیں اور یہ بھی سینئر ہیں۔

ق: سب سینئر ہیں ان میں نیا کوئی نہیں ہے۔

ج: خالدہ اصغر ہیں۔

ق: خالدہ اصغر بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج: سریندر پرکاش ہیں، مین را، جوگندر پال، رام لعل، غیاث احمد گدی، انور سجاد، انتظار حسین اور دیگر، تو ان کے افسانے یقیناً آپ نے پڑھے ہوں گے کیا ان لوگوں نے اردو ادب میں اپنا کوئی کردار ادا کیا ہے یا یہ محض جانے جاتے ہیں۔

ق: نہیں نہیں ان میں سے بعض بہت اچھے ہیں ان میں سے کم از کم ہر ایک نے ایک دو چیزیں بہت اچھی لکھی ہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بلونت سنگھ کا ناول رات، چور اور چاند پنجاب کے بارے میں بہت اچھا ناول ہے، اچھا خالدہ اصغر افسوس کہ انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا دو تین کہانیاں انھوں نے بہت اچھی لکھی ہیں... اصل میں انتظار حسین کا لاہور میں باقاعدہ ایک اسکول قائم ہو گیا ان کے کچھ چیلے ہیں کچھ مرید ہیں ان میں ایک خالدہ اصغر بھی ہیں جو انھیں کے اسٹائل میں لکھ رہی تھیں انتظار حسین نے جو ایک داستانوں کو نکال کے ایک پرانی ان کی بازیافت ہے پرانی اس کی تلمیحات ہیں، پرانا ماحول ہے اس کے ساتھ جو اصطلاحی اساطیر ہیں ان کو انھوں نے جوڑ تا ہے اس سے انھوں نے بہت سے لوگوں کو inspire کیا وہاں پر ان میں سے ایک خالدہ اصغر بھی ہیں۔ ان کے دو تین افسانے بڑے اچھے ہیں۔

ج: سواری، شہر پناہ وغیرہ۔

ق: سواری کو تو میں نے انگریزی ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ اچھا ان لوگوں میں رام لعل کو کہانی کہنے کا طریقہ آتا ہے۔

ج: کہانی کہنا جانتے ہیں۔

ق: جانتے ہیں اور بھی لوگ ہیں۔

ج: انتظار حسین.....

ق: انتظار حسین کا تو خیر میں ذکر کر چکی ہوں وہ تو خیر بہت اچھے ہیں۔ سب اچھے ہیں دیکھیے اس میں یہ آپ gradation ادب میں نہ کیا کیجیے۔

ج: نہیں گریڈیشن کی بات نہیں ہے۔

ق: اصل میں ہر ایک ذرہ جو ہے اپنی جگہ آفتاب ہے اگر آپ نے ایک ہی چیز لکھی اور لکھ کے چھوڑ دی تو وہ یادر ہے گی اگر اس کا impact رہے گا۔

ج: جیسے اشفاق احمد کا گڈریا۔

ق: اشفاق احمد کا گڈریا۔ ابھی ابھی ایک کہانی میں نے پڑھی انور عظیم کی، پرسوں نرسوں باقر مہدی کے رسالے اظہار میں مجھے اس کا عنوان یاد نہیں رہا (گورستان سے پرے) اچھی کہانی ہے پاؤر فل کہانی ہے۔

ج: اچھا تو اردو کے بالکل نئے جو لکھنے والے ہیں ۷۰ء کے بعد جو منظر عام پر آئے جن میں انور خان ہیں، سلام بن رزاق ہیں، شوکت حیات، شفق ہیں قمر احسن اور مشتاق مومن انور قمر اور ساجد رشید تو ان سے آپ واقف ہیں یا کہ یہ نام آپ کے لئے اجنبی ہیں۔

ق: جی ہاں پڑھا ہے میں نے ان کو ان میں سے کافی کو پڑھا ہے اور یہ سب اپنا راستہ بنا رہے ہیں بس یہ ان کو چاہیے کہ یہ ایک Cult میں نہ شامل ہو جائیں، تقلید میں نہ شامل ہو جائیں اپنی اپنی انفرادیت ان کو رکھنا چاہیے یہ بہت ضروری ہے۔

ج: اچھا اردو کی نئی تنقید سے پتہ نہیں آپ مطمئن ہیں یا نہیں۔

ق: صاحب دیکھیے تنقید جو ہے وہ بہت ٹھوس چیز ہے اور مجھ میں اتنی عقل نہیں ہے جو میں اس کو سمجھ سکوں۔ تنقید اچھی ہے آج کل بہت اچھی ہے (طنزیہ ہنسی)

ج: تنقید میں شمس الرحمٰن فاروقی...

ق: دیکھیے شمس الرحمٰن فاروقی بہت اور یجنل باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن بعض دفعہ وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں کہ لگتا ہے وہ محض Sensation پیدا کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں مثال کے طور پر ایک دفعہ انہوں نے کہا کسی شاعر کے بارے میں ہمارے آج کل کے Contemporary بہت مشہور شاعر ہیں کہ وہ اردو کا پہلا اور آخری ڈرامانگار ہے اب اس طرح کا جو اسٹیٹ منٹ ہے وہ میرے خیال سے ایک قسم کی سنجیدہ بات نہیں ہے یعنی اس طرح کا Statement کیسے دے سکتے ہیں کہ فلاں شاعر اردو کا پہلا اور آخری ڈرامانگار ہے تو اس طرح کی تنقید میری سمجھ میں نہیں آتی ویسے تو بڑے قابل لوگ ہیں بہت لکھتے ہیں بہت پڑھتے ہیں۔

ج: اور یہ آج کل وارث علوی کا بہت نام ہے۔

ق: وارث علوی میں بہت صلاحیت ہے اچھا لکھتے ہیں وارث علوی اور یجنل بات کرتے ہیں لیکن wording بہت ہے۔

ج: wording تو ہے۔

ق: وارث علوی بہت طویل لکھتے ہیں اگر اسی کو وہ Short کر دیں تو کتنا اچھا ہے اور یہ کہ ذرا وہ بعض دفعہ کچھ....

ج: جارحیت....

ق: غیر مہذب الفاظ استعمال کر لیتے ہیں جارحیت تو ہونی چاہیے جو بھی آپ اگر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں یا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو نقاد میں تو جارحیت ہوتی ہے۔

ج: سلیم احمد جو ہیں نئی نظم اور پورا آدمی جن کی کتاب ہے۔

ق: ہاں یہ جو attitude ہے نا اس قسم کی تھوڑی فقرہ بازی کرنا اور جملے یہ

سب انھیں حضرت کی شروع کی ہوئی ہے اور یہ عسکری کے چیلے تھے۔

ج: عسکری صاحب کے چیلے تھے۔

ق: عسکری صاحب کے چیلے تھے ـــ مرحوم کے تو انھوں نے یہ شروع کیا کہ حالی کا مظہر اور یہ کہ پاکستانی کلچر بمع جمعے اسلامی ناچوں کے رنگین، تو یہ ان کے ایک مضمون کا عنوان تھا۔

ج: حالی اور مظہر.....

ق: حالی اور مظہر تو انھوں نے اس طرح کی چیز شروع کی جو کہ اس قسم کی سنجیدہ تنقید تھی اس سے مختلف intresting - It was readable لیکن اس میں یہ ہوا کہ اس میں کچھ سنجیدگی نہیں رہی۔

ج: کچھ جملے بازی تک محدود رہی۔

ق: جملے بازی.....

ج: فقرے لکھنا یا جملے لکھنا اپنے طور پر اس کے صحیح معنوں میں تو بے حد مشکل کام ہے۔

ق: نہیں سلیم احمد بھی اور بجنل باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن بہہ جاتے ہیں۔

ج: اچھا آج عام طور پر بحث کی جاتی ہے آپ کی نئی کتاب 'کار جہاں دراز ہے' کہ آیا یہ ناول ہے یا سوانحی ناول ہے یا ایک کتاب ہے۔

ق: دیکھیے صاحب ناول تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ ناول کا اگر آپ یہ مطلب نکالیں کہ ناول فکشن ہوتا ہے تو ناول نہیں ہے لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ سوانحی ناول ہے، بائیوگرافیکل ناول ہے تو وہ ہے اس لیے کہ ناول میں فرضی خیال کردار ہوتے ہیں اس میں سب اصلی کردار ہیں ساری جو اس کی بیک گراؤنڈ ہے وہ اصلی ہے تو اس کو آپ کیا کہیے گا اس کو آپ ناول نہ کہیے داستان کہہ لیجیے کیا کہیے گا آپ مجھے بتایئے میرے خیال سے سوانحی ناول کے علاوہ اور کچھ آیا نہیں تھا میری سمجھ میں کہ اور اس کو کیا کہوں؟ اس کو آپ ساگا (Saga) نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ساگا لفظ اردو کا ہے نہیں سوانحی ناول آپ کہہ سکتے ہیں کہ ناول جو ہوتا ہے وہ اصلی کیریکٹرز کو لے کر بھی لکھا جاسکتا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے کوئی قانون تو ہے نہیں کسی مذہبی صحیفے میں تو آیا نہیں ہے کہ ناول کے لیے بھی ایک defination ہے اس کے آگے آپ بڑھ نہیں سکتے صاحب ہم نے اسے سوانحی ناول کہا ہے تو اسے سوانحی ناول ہی کہیں گے آپ اسے کچھ اور کہہ لیجیے تو کوئی قانون نہیں ہے۔

ج: کلیہ تو بہرحال بنا نہیں سکتے۔

ق: کلیہ بنا نہیں سکتے۔

ج: تو عینی آپا قلتِ وقت کے باعث اس سلسلے کو منقطع کرتے ہیں میں ممنون ہوں کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور شرمندہ ہوں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔

ق: نہیں صاحب، بہت اچھا ڈسکشن رہا۔

قرۃ العین حیدر : J-140 سیکٹر 25 نوئیڈا (یوپی)

جاوید ناصر : اسٹیشن ڈائرکٹر، دوردرشن کیندر، احمد آباد (گجرات)

مشتاق مومن : 298/19۔ میورج مینشن، شاسٹری نگر، کرلا ممبئی۔ ۷۰

بقیہ صفحہ ۳۲ افعی

سنجر نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔

ابے ملا بھاگ کا دم دبا کے۔ ایک نے تالی بجائی۔ جائے گا کہاں ؟ ۔ پاکستان ؟

کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ سنجر جم کر کھڑا ہو گیا

یہ کیا برا تھا کہ مسلمانوں میں شنڈ نہیں ہوتے ؟ کوئی چمار کی مسلمان ہو جائے تو شادی کرے گا ؟ یا جھوٹے مرے کا جھانسہ دیتا ہے ان لوگوں کو ؟"

سنجر کے جواب دینے سے قبل کوئی بول اٹھا۔ ہاں چوٹی میں چار کی بھی چلے گی۔ اسے تو پیار کرنا ہی ورنہ پینتیس[۳۵] بچے کہاں سے پیدا کرے گا اکثریت پر غالب کیسے آئے گا۔

سنجر حیران پریشان پوری کوشش کر رہا تھا کہ زبان پر قابو رکھے۔ وہ فرسٹ ئیر تھا اور اس کی پوزیشن ابھی کمزور تھی۔ گھر والوں نے سمجھا کر بھیجا تھا کسی سے الجھنا نہیں۔

"بولتا کیوں نہیں ؟ اچھا بتا۔ چھ دسمبر کو رو دیا تھا ؟ "

"نہیں۔ اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔ حادثے افراد کے ساتھ ہی نہیں قوموں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں۔"

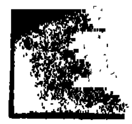
"نہیں رو دیا تھا۔ ابے کیسا ملا ہے تو۔ اب رلائیں کیا۔ ؟"

"چھوڑ دے یار چھوڑ دے۔ متھرا اور کاشی کے بعد تو ضرور روئے گا۔ ابھی تو فلاسفی چھانٹ رہا ہے۔

"ضروری نہیں کہ تب بھی رو دوں۔ ہو سکتا ہے..." اس نے بات ادھوری چھوڑ کر دانتوں سے ہونٹ کاٹ لیے۔

سگریٹ پینے والی لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ سنجر کی آنکھوں میں الاؤ سا سلگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے[۱۴] لڑکی کے خوش و خرم دکھائی دینے والے چہرے پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئیں۔ یہ زہر۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ آخر سنجر کو اسی درسگاہ میں رہنا ہے۔

وہ پھر آگے چل پڑی۔



صغریٰ عالم

ہزاروں کوششوں کے بعد بھی منظر وہی ہوگا
بدلتے جائیں گے قاتل مگر اک سر وہی ہوگا

اُسے پہچاننا ہے نت نئی سازش کی صورت میں
شکار اپنا بدل دے گا مگر خنجر وہی ہوگا

ہمارے خون کی سرخی اسی کو ڈھونڈ لائے گی
کہاں جائے گا بچ بچ کے لہو میں تر وہی ہوگا

کہاں ممکن ہمارے سر کی جو قیمت لگانی ہے
ستونِ دار پہ ہوگا مگر بہتر وہی ہوگا

وطن چھوڑیں گے ہم صغریٰ نہ ہی ہجرت کریں گے ہم
ہماری بستیاں ہوں گی ہمارا گھر وہی ہوگا

● عالم بلڈنگ، شاہ بازار، گلبرگہ (کرناٹک)

عذرا نقوی

آدھی جاگی آدھی سوئی رات تھی کچھ گہنائی سی
آنکھ کھلی تو در پہ کھڑی تھی صبح بھی کچھ کمہلائی سی

دن بھر پیٹھ پہ ڈھویا سورج چہرے پر تھی گرد جمی
ساتھ میں دفتر سے گھر لوٹی شام بھی کچھ اکتائی سی

شاہ بلوط، چنار، صنوبر، انسانوں کی نذر ہوئے
دامنِ کوہ میں سمٹ رہی ہیں جھیلیں بھی گھبرائی سی

سوکھے سوکھے جمناتٹ پر پیلا پیلا تاج محل
صبح بنارس دھندلی دھندلی گنگا جی گدلائی سی

اندیشوں کی انگلی تھامے سال گذرتے رہتے ہیں
کبھی کبھی لگنے لگتی ہے اپنی عمر پرائی سی

لوٹ کے جانا ممکن ہے آگے منظر دھندلے ہیں
بڑھتے قدموں میں حائل ہے خوف کی گہری کھائی سی

● معرفت: ڈاکٹر پرویز احمد، پوسٹ بکس نمبر
51178 ریاض (سعودی عربیہ)

ریحانہ روحی

اور تو اس کے سوا اب ہمیں کیا پوچھنا ہے
تجھ سے مل کر کبھی احوال ترا پوچھنا ہے

شہر میں دشمنی بڑھ جائے تو پھر دوستوں سے
جو خطا کی ہی نہیں ہے وہ خطا پوچھنا ہے

کس قیامت سے گزرتے ہوئے پہنچے ہو یہاں
صبح تک جلتے چراغوں سے ذرا پوچھنا ہے

مصلحت کوش گواہوں کی عدالت سے کبھی
اپنی ناکردہ گناہی کی سزا پوچھنا ہے

جس کو معلوم نہیں اس سے بھلا کیا پوچھیں
جس کو معلوم ہے اس شخص سے کیا پوچھنا ہے

کسی پہنچے ہوئے درویش کے در سے روحیؔ
جو کبھی رد نہ ہو وہ حرف دعا پوچھنا ہے

● معرفت: آصف علی ہاشمی، کمرشیل ڈویژن،
پوسٹ بکس 102 دمام-3141 (سعودی عربیہ)



آشا پربھات

اکیسویں صدی

ایک دن
عمارت کی بلندیوں پر
وہ اترے گا
اور جلا کر
خاک کر جائے گا
کھڑکیوں... دروازوں کے مخملی پردے
اٹھا کر لے جائے گا،
معصوم آنکھوں کے سارے سپنے۔
پھر شہر کے اس کنارے پر
بجی دھجی کوٹھیوں کے اندھیرے
کونے میں
گونجیں گی کرگس کی چیخیں
سرد آگ کے قریب
ہاتھوں میں کٹورے لئے
معصوم سہمی آنکھیں
ڈھونڈ رہی ہوں گی
ہانڈیوں میں دانے
ماں کی چھاتیوں کا سمندر
ختم ہو چکا ہوگا
باپ کے ناموں کی طرح....

● کوٹ بازار، وارڈ نمبر۔۱۹،
بیتا مڑھی 843302 (بہار)

رخسانہ صبا

پتھر

کبھی میں وقت کی دہلیز پر رکھا ہوا خوش رنگ پتھر تھی
اگر اہلِ زمانہ چاہتے تو زندگی کی اس عمارت میں
مجھے بھی نصب کر دیتے
کہ اس کی دلربائی میں اضافہ ہو
مگر سب لوگ شاید اپنی ہی رفتار میں گم تھے
لہٰذا سب نے مجھ کو ٹھوکروں کی زد پہ ہی رکھا
اور اب میں ریزہ ریزہ ہوں
مگر اہلِ زمانہ سے مجھے اتنا تو کہنا ہے
مجھے تو آخرش مٹنا ہی تھا لیکن
زیاں اس کھیل میں کس کا ہوا ہے یہ تو بتلاؤ

● G-132، صنوبر کاٹیج۔ نارتھ کراچی۔ کراچی



غوثیہ سلطانہ

موسم سرما کی ٹھٹھری ہوئی نظمیں

بچے بڑے ہو گئے
ہم کچھ بھی نہیں رہے اب
بیکار ہو گئے

O

وقت کیا ہے؟
وقت وقت سے کہہ رہا ہے
وقت کی بات کر

O

زندگی کیا ہے
دولت کے ترازو میں
لٹکا ہوا کانٹا ہے۔

O

آدمی کیا ہے
حقیقت میں حادثے کا
ایک نشان

● 4140 Bayside Dr. Hanover
Park, IL, 60103 U.S.A



نعیمہ ضیاء الدین

AM-Kalbakopf-1, 63263-Neu-Isenburg, Germany

پیک دان

ممانی رشیدہ اور ماموں احسان ادھیڑ عمری کو پہنچتے پہنچتے دونوں کے دونوں بہرے ہو چکے تھے اور آلۂ سماعت استعمال کرتے تھے۔ نتیجہ جس کا یہ تھا کہ دونوں ہی اونچا بولنے لگے تھے۔ پتہ نہیں وہ آلہ کس حد تک مؤثر تھا یا پھر انہیں اونچا سننے کی عادت ہو گئی تھی اور اس عادت کے باعث وہ بولتے بھی زور سے تھے گویا وہ دونوں نہیں، بقیہ ساری دنیا ہی بہری ہو گئی ہو۔

چند وجوہ کے تحت ہمیں نقل مکانی کے سبب اُن کے ہاں کچھ روز قیام کرنا پڑا۔ ملنساری اور خوش اخلاقی میں دونوں میاں بیوی اپنی مثال آپ تھے۔

"میں نے کہا بیگم آج وہ مغلئی دال تو پکا کر کھلا ہی دو۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہاں اجوائن کا بگھار دینا مت بھولنا ....

ممانی رشیدہ شرماتے شرماتے انکساری کے ساتھ حامی بھر لیتیں اس طرح کہ ان کی ہلکی ہلکی سی جھریاں اور سرخ ہو کر لرز لرز اٹھتیں۔

"بھئی مغلئی دال بیگم پر ختم ہے .... غایت درجہ مسرور و متفاخر ماموں احسان اعلان فرماتے۔ اور بہت سی چیزیں بیگم یعنی ممانی رشیدہ پر ختم تھیں۔ پہلے پہل تو ماموں کے اندازِ بیان سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید مذکورہ اشیاء اُن کے باورچی خانہ میں موجود نہیں، ختم ہو گئیں ہیں۔ لیکن بعد میں یہ ماجرا کھلا کہ یہ اُن اشیاء کے ذائقے اور ممانی رشیدہ کے ہاتھ و پکوان کی تعریف کی نوعیت تھی۔ رفتہ رفتہ ممانی کے اور بھی جوہر نمایاں ہوتے چلے گئے۔ تقریباً پچاس کا سن۔ بوٹا سا قد اور لمبی گھٹنوں کو چھوتی ہوئی پراندے کے بغیر بالوں کی چٹیا۔ جو اس عمر میں بھی بھلی لگتی تھی۔ خاص طور پر جب وہ چلتے ہوئے قدم، قدم پہ اُن کے دائیں بائیں پشت پر رقص کیا کرتی۔

رات کا کھانا بالعموم ہم سب ایک ساتھ کھاتے۔ صاحبزادیاں دونوں بیاہ کر اپنے اپنے گھروں کی ہو گئی تھیں۔ تینوں صاحبزادے اور ماموں احسان کام سے لوٹ آتے تو میں اور میرے شوہر یا پھر کوئی گھر آیا مہمان رات کے دسترخوان پر شریک ہو جایا کرتے۔

"بھئی واہ .... کیا عمدہ کھانا تھا .... رشیدہ ذرا گلوری تو لانا ....

چمکتے دمکتے چاندی کے پاندان کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے نہایت نزاکت بھرے انداز سے سرخ مرطوب کپڑا سرکا کر ممانی انہیں سبز ذائقہ دار پان پیش کرتیں۔ اور اس کے بعد کھانے کے برتن سمیٹتے و دیگر اشیاء سنبھالتے ہوئے میرے کان ماموں احسان کی آواز پہ لگے رہتے۔

"وا ... وا .... وا .... مزا آ گیا ... لانا بھئی پیک دان تو لانا اس جملے پر میں گھر بھر میں جہاں کہیں بھی ہوتی لپک کر ماموں احسان کے حضور ضرور جا پہنچتی۔ وہ نشے میں چور ہو کر لال لال ڈورں والی آنکھوں سے پیک دان کو دونوں ہاتھوں میں یوں تھامتے گویا لطف سے مغلوب بلکہ سر تک اس میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ پھر وہ پیک اُگل کر اس سے اگلے لطف کو سُڑکنے چل دیتے۔

"یہ بھی اتفاق تھا کہ دونوں کی حِسّ سماعت متاثر ہو چکی تھی۔ دونوں ہی آلہ استعمال کرتے تھے اور اس ناشنوائی کے باعث اونچا بولنے کی عادتِ قبیح کا شکار ہو چکے تھے۔ اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ہمیں جو کمرہ بطور رہائش عطا ہوا وہ ان کی خواب گاہ سے ملحق تھا۔ دونوں کی دیوار جُڑی تھی اور بیچ میں ایک دروازہ تھا جو حالتِ ضرورت کے تحت بند کر لیا جاتا تھا۔ بس مقام تاسف و طیش یہ تھا کہ آوازیں بند نہیں کی جا سکتیں نہ اُن کے کواڑ ہوتے ہیں جو بوقتِ ضرورت بھیڑ دیئے جائیں۔ وہ تو رات کے کسی بھی سمے پریشان کر سکتی تھیں دوسرا توجہ طلب بلکہ مایوس کن اَمر یہ تھا کہ وہ دونوں بہرے تھے اس بنا پہ اونچا بولنے کی عادت کا شکار ہو چکے تھے اور یہ ملحقہ کمرہ دراصل

اُن کے دو عدد صاحبزادوں کی ملکیت تھا جو ہماری مہانداری والی دخل در معقولات کے سبب ان دونوں بیٹھک میں شب بسری کرنے پر مجبور تھے لیکن ان عوامل سے قطع نظر اُن کی آوازوں کی آمد و رفت سے میں ایسی ہراساں اور خفت زدہ ہوگئی کہ اُن دو عدد صاحبزادوں سے نگاہ ملانے کی ہمت نہ رہی۔ بس باقی تمام عرصہ اُن سے نگاہیں چرایا کرتی۔

کچھ مدت کے بعد ہمیں بھی اُن کے ہی علاقے میں ایک کرائے کا مکان دستیاب ہوگیا اور ہم اُدھر اٹھ گئے۔ البتہ آنا جانا برقرار رہا۔ بالخصوص رات کا کھانا اکثر دوسرے تیسرے ان کے یا ہمارے ہاں ساتھ ہی کھایا جاتا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا ممانی رشیدہ دیکھنے میں کچھ ماندی سی نظر آنے لگیں گویا سئے کے آگے ڈھے سے گئی ہوں اُن میں اب وہ چستی پھرتی نہ رہی تھی حد درجہ بجھی بجھی سی رہنے لگیں۔ احباب نے مشورہ دیا کہ اب گھر میں بہو لے آئیں ساری ذمہ داریاں اُن اکیلی کے بس کا روگ نہیں ہیں۔ کچھ وقت اور گزرا تو میں نے غور کیا کہ اب وہ ماموں احسان کے سامنے آنے یا بیٹھنے سے کترانے لگی تھیں۔ ان کے گھر میں گزارنے والے اوقات میں زیادہ تر وہ باورچی خانے میں برتنوں کے ڈھیر کے پیچھے یا غسل خانے میں کپڑوں کی میلی دیوار کے عقب میں پائی جاتیں۔ مگر ماموں احسان بھی بڑے کائیاں تھے پل بھر میں اُدھر جا پہنچتے۔

" ارے بھئی کہاں ہو....؟ اچھا.... اچھا یہاں بیٹھی تھیں۔ ذرا ادھر تو آنا.... میرا مطلب ہے.... وہ... وہ" ممانی رشیدہ اس پرنچی چڑیا کی مانند ناچار پیچھے پیچھے چل پڑتیں۔ جیسے باز دبوچنے ہی والا ہو۔ رات کے سمے تو ان کی حالت دیدنی ہوتی.. ہراساں۔ غیر حاضر بس یونہی اِدھر سے اُدھر نکلنے کو مصروف ملتیں صاف ستھری اور اُجلی دھوئی سی ممانی رشیدہ اب خاصی میلی کچیلی بلکہ گندی مندی سی الی کھلی رہنے لگی تھیں۔ اے بیٹی... تم ابھی یہ بات نہیں جان سکو گی...." ایک بار میرے بہت اصرار پر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

یہ تپتی دوپہر کے ذرا بعد کا سمے تھا۔ چھوٹے سے پختہ صحن کا فرش نل سے دھو کر پیڈسٹل فین چلا دیا گیا، تو ہم اس ملحق لوہے کے جالی دار برآمدے میں آن بیٹھے یہاں ڈائننگ ٹیبل رکھا تھا جہاں سہ پہر کی چائے لگا کر گہرے نیوی بلیو پردے ہٹا دیئے گئے پیڈسٹل فین کی ہوا گیلے صحن پر سے ہو کر آتی ہوئی اس کی نمی بھی ہمراہ لے آئی تھی جب انہوں نے ٹھنڈی طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔

تم ابھی یہ بات نہیں جان سکو گی۔ "کون سی بات....؟" میں نے قدرے اشتیاق اور قدرے خفت بھرے انداز سے پوچھا۔ بڑی بوڑھیاں اس عمر تک پہنچتے پہنچتے خاصی بے تکلف بلکہ بے شرم سی ہو جاتی ہیں اور ہر حیا، بے حیائی ان کے لئے ایک سے معانی رکھنے لگتی ہے۔ اب بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کچھ ایسا ویسا ہی معاملہ ہے۔ "یہی.... ہماری عمر کی عورتوں کا جان چھڑانا.... یا کنی کترانا.... وہ بے زاری اور راز داری کے ملے جلے انداز میں کہہ رہی تھیں، آپ کا مطلب ہے ... شوہر سے....؟ میں نے بے وقوفی سے دریافت کیا۔ ماموں تو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ گھر آتے ہی آپ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے...."

" یہی تو.... " وہ جل کر بولیں، " شباب کے دور میں تو اپنے ساتھی کا شباب بہت پرکشش ہوتا ہے۔ لوہے اور مقناطیس کی طرح دونوں ایک دوسرے کی جانب لپکتے ہیں.. ضرورتیں بار بار دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں۔ مگر بڑھاپے میں...." اب کے ان کی سرد آہ کچھ زیادہ ہی طویل تھی۔

" یہی وہ بات ہے بیٹی کہ جسے تم ابھی نہیں بلکہ بڑھاپے میں جا کر سمجھو گی.... دراصل عورت مرد کی چاہت میں ایک اہم اور بنیادی فرق ہے۔ عورت کو ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے ایسا ساتھی جو ہر قدم اور ہر موڑ پر اپنی رفاقت پیش کرتا رہے۔ جب کہ مرد صرف ایک جسم کا طلب گار رہتا ہے۔ اس کی دنیا ہی بس ایک جسم تک محدود ہے نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد.... اور مشکل مرحلہ یہ ہے کہ بوڑھا ہو کر وہ اس واحد ضرورت کا کچھ زیادہ ہی شکار ہو جاتا ہے اُس کی ہوس بھی گویا عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

" ممانی رشیدہ کی آنکھیں شعلوں سے گزر کر برسات تک آنے لگی تھیں۔ اور مجھے وہ تمام راتیں ایک ایک کر کے یاد آگئیں جو ہم نے ان کے گھر ان کی خواب گاہ سے متصل گزاری تھیں۔ جہاں بوقت ضرورت دروازہ تو بھیڑ دیا جاتا تھا مگر آوازیں کھلی رہتی تھیں اور اِدھر سے اُدھر اُڑی اُڑی پھرتی تھیں۔

" رشیدہ.... " ماموں احسان کی گھگھیاتی، لجلجی سی چپکتی ہوئی آواز...." دیکھو تمہیں میری قسم" اور بھاگتی ڈرتی ممانی رشیدہ کی چھپتی پھرتی آواز۔ کبھی کبھی وہ خود بھی اس کے ہمراہ دروازے سے اِدھر آ نکلتیں.... تو ہم جان بوجھ کر سوتے بن جاتے۔

پھر تو یہ ہوا کہ وہ باقاعدہ ماموں احسان سے بھاگنے لگیں،

انہیں اگر کوئی سیلانی ٹوپی میسر ہوجاتی تو وہ ماموں احسان کی بھوکی نگاہوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضرور اسے اوڑھ لیتیں۔ " بس بیٹی...." چلہ دل کے چھچھولے پھوڑنے کو انہوں نے میرے اور اپنے درمیان عمر کی تکلفانہ حد کو گرادیا تھا۔ لہٰذا اب ہر ملاقات ان کے دکھڑے رونے کا بہانہ بن کر رہ گئی تھی۔

"عورت جلدی ختم ہوجاتی ہے.... خود صحیفوں میں درج ہے کہ سنّ یاس کو پہنچنے والی عورت کا پردہ ختم کرادو۔ وہ بنجر کھیتی ہے اب اس میں کچھ نہیں.... پرمرد.... " انہوں نے آنکھیں پھیلا کر کانوں کو ہاتھ لگائے.... " مرد کی تو نیت کبھی بھرتی ہی نہیں نہ اُس کا لطف ہی ختم ہوتا ہے۔ بھوک کا ذائقہ مٹ کے نہیں دیتا... یوں تڑپ تڑپ کر کے کھانے کو ہر پل تیار ہوگا۔ سب مردوں کی طرح تیرے ماموں کو بھی کھانے کا بہت شوق ہے.... ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ جدھر کچھ کھانے کو نظر آیا۔ وہیں رال ٹپک پڑی۔ یہ بڑے بڑے نوالے.... اوتاولے ہو ہو کر نگلے جاتے ہیں۔ کبھی قمیض پر گر رہا ہے تو کبھی ٹھوڑی پہ.... پھر بھی بھوک نہیں مٹتی...... اور اس کے بعد تم جانو.. پان کھا کر پیک دان تو طلب کرنا ہی ہے.... ان موئے بڈھوں کو تو یہی ایک طلب رہ جاتی ہے.... " وہ بولتے بولتے میرے بہت قریب ہوگئیں اور کان میں جیسے سرگوشی سی کرنے لگیں۔

" عورت کو اس عمر میں مرد سے کراہیت آنے لگتی ہے.. اُس کے ہاتھ کی انگلیاں، چھپکلیاں بن کر رینگتی محسوس ہوتی ہیں۔ اور بس نہیں چلتا کہ وہ انہیں جھٹک کر چلاتی ہوئی دور بھاگ جائے " یکایک باہر کا دروازہ کھلا اور شام کو لوٹ آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک بیٹا۔ پھر دوسرا۔ اور پھر ماموں جان....

اے بھئی بیگم.... کیا پکایا ہے آج.... " وہ چہکتے ہوئے اپنی آنکھوں کی اداسی ہوس زدہ رال سمیت اندر تشریف لے آئے تھے۔ ممانی نے لوٹا سنبھالا اور بیت الخلا کی راہ لی۔ بڑے میاں "تاپتے پھریں" وہ کچھ دیر کو نجات پاگئی تھیں۔

پھر فیض الرحمٰن کی شادی ہوگئی اور خواب گاہ جوان جوڑے کو الاٹ ہوگئی۔ ممانی نے بہو کی آڑ میں پوشیدہ ہونا شروع کردیا۔ اور اگلے قدم پر پوتا آن موجود ہوا تو وہ اُس کے پیچھے ہو بیٹھیں " اسے ہے ننھے ننھے ہیں۔ سو ارمان ہوں گے.... میرا کیا ہے ویسے ہی نیند نہیں آتی.... میں اسے سنبھال لوں گی.... " وہ اُس کے ساتھ شب بسری پہ تل گئیں۔ لیکن ایسا کب تک ہوسکتا تھا کہ وہ سامنے موجود بھی ہوں۔ ایک ہی چھت کے تلے رہیں بھی اور اس پر بھی مُصر ہوں کہ.... " میں نہیں ہوں۔ مجھے مت دیکھو.... مت چھوؤ... میں سنّ یاس میں ہوں.... اس لئے تمہاری چھپکلیوں سے گھِن آنے لگی ہے.... کیوں نہیں اب تم بھی بوڑھے ہوجاتے.... کیوں... عورت کا اور جسم کا چسکہ تمہاری جان نہیں بخشتا.... بوڑھے ہوکر تم کیوں اور بھی ہوس زدہ اور حریص سے بن گئے ہو.... کیوں... کیوں... ؟..

ماموں احسان ریٹائرڈ کیا ہوئے ایک عذاب بن کر بیٹھ رہے سارا سارا دن گھر پر اُن کی آنکھیں ننگی جونک کی مانند سفر کیا کرتیں یہاں جسم میں سوراخ بنا کر رہنے لگیں گی۔ " یہ بڈھے.... " ممانی رشیدہ جل ککڑی بنی ملتیں۔ " شکل سے اپنے بزرگوں جیسے دکھنے لگے ہیں۔ ماموں چاچے۔ بابے۔ ڈھلکے ہوئے پیٹ، گھٹنیا مارے۔ نہ ہلا جائے نہ چلا جائے جھریوں بھرے چٹی داڑھی، پر ہوس کے کارنامے...." وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگاتیں... توبہ میری توبہ.... " میں غور، غور سے ماموں احسان کو دیکھا کرتی.... انجائنا کے مریض۔ جو اکثر اپنا بایاں کندھا اپنے ہی داہنے ہاتھ سے دباتے ملا کرتے تھے... دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نظروں میں سو سو روپ دھارنے لگتے۔

" رشیدہ.... بھئی وہ تو لانا... ذرا پیک دان....." اوہو.... ہو.... ہو... بڑا... لطف آیا.... " بھئی کیا کھانا تھا.... کیا نشہ دیتا ہے.... یہ تمباکو... گلوری بڑی زبردست تھی۔ لانا۔ ذرا پیک دان... ممانی کراہیت سے اُن کے وجود کو گھورتیں اور مجھے جھرجھری سی آنے لگتی۔ چپڑ چپڑ کھاتے یا بیت الخلا میں بھاگتے ماموں احسان، کھاتے ہوئے ہر شے قمیض پر، میز پر یا دسترخوان پر تبرک کا چھاڑا کرتے۔ گدلی رال ٹپکاتی، آنکھیں بے قراری سے بھوک کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتیں.... دائیں سے بائیں... اوپر سے نیچے.... کبھی کسی بڈھے کی آنکھیں ایک جگہ ٹکی ہوئی نہیں پائی جاتیں۔ بس گھومے جاتی ہیں۔ تلاش اور ہوس کی بے پناہ بے قراری انہیں مبتلائے آزار رکھتی ہے۔

" بالآخر ایک روز ان ڈگر ڈگر کرتی رال بہاتی آنکھوں کے تابڑ توڑ حملوں سے نجات کی خاطر ممانی رشیدہ نے اپنا بستر چپکے سے اسٹور روم کے تخت پر جا لیا۔ یہ فالتو کاٹھ کباڑ کو ایک کمرہ تھا اور ممانی خود کو بھی اب بہت شدت کے ساتھ فالتو سمجھنے اور منوانے پر تل گئی تھیں

مگر یہ کلیہ ماموں احسان کے حلق سے قطعاً نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ پہلے تو وہ گھر بھر میں جلالی کیفیت کے باعث توڑ پھوڑ اور ہنگامہ کرتے پھرے اس کے بعد سیدھے سعیدہ کے ہاں جا پہنچے۔ وہ ممانی رشیدہ کی بڑی بہن تھیں جوانی میں بیوہ ہو جانے کے باعث ساری عمر بھائیوں کی چوکھٹ پر گزار دی۔

ایسی الوکھی اور کھسیاہٹ و شرمندگی میں مبتلا کر دینے والی بہن کی شکایت پر پہلے تو جوانی کی بیوہ پسینے پسینے ہو گئی پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے شام کو بہن کے ہاں چلی آئی۔ لوہ لینے کی خاطر جب اُس نے بڑھ کر اسٹور روم میں جھانکا تو وہاں درحقیقت ایک شب بسری کا ٹھکانہ موجود پایا ممانی رشیدہ الگ چور سی دکھائی دیں۔

" یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں ... " وہ بہن کو شانے سے تھام کر ایک جانب لے چلیں۔ " شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے اور اُس کے احکام کی پیروی نہ کرنا کھلی نافرمانی بلکہ گناہ ہے ... یہ تو کیا کر رہی ہے رشو ...؟"

" اوہ .... آپا .... " ممانی رشیدہ پہلے سرخ اور پھر پیلی پڑ گئیں " تو وہ آپ تک بھی جا پہنچے بس بازار میں کنستر بجا کر ڈھنڈورا پیٹنے کی کسر رہ گئی کہ میری بیوی مجھے .... " وہ تلملا کر خاموش ہو رہیں۔ " پر اُس نے کوئی غلط بھی تو نہیں کہا .... " سعیدہ نے نرمی کے ساتھ بہن کو سمجھانا چاہا .... " یہ تو اس کا حق ہے .... " " تم نہیں جانتیں آپا .... " ممانی رشیدہ رنج اور طیش کے ملے جلے عالم میں گویا ہوئیں " یہ رشتہ ہی کا بڑا بے بنیاد ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ .... جسمانی تعلق پر قائم ہوا .... اور اُس کے نہ ہونے سے چھوٹ گیا۔ سوچو تو ذرا کوئی اور رشتہ کوئی اور تعلق ایسا بودا ایسا کمزور ہوتا ہے جو صرف عمر کے ایک خاص اسٹیج کے لئے ہی ہو۔ بس سارا کھیل جوانی تک کا ہے۔ پھر اُس عالم میں اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ تعلیمی دلچسپیاں پھر بعد میں کاروباری مسابقت۔ دوست احباب سو ہنگامے سو کام اِدھر اُدھر کے قصے۔ وقت ہی نہیں ملتا کہ ڈھنگ سے کچھ سوچا جائے سب بڑھ کر کم عمری میں انسان کے اندر ایک حجاب سا بیٹھا رہتا ہے جو پیڑی سے آہستہ آہستہ بڑھ کر مقام لیتا ہے۔ مگر بڑھاپا .... وہ رک کر خلاء میں گھورنے لگیں ایک جاہد سارنگ ان کی پتلیوں پر تیر رہا تھا۔

" بوڑھا مرد نہ صرف بیہودہ بلکہ چوبیس گھنٹے کا پیر تسمہ پا ملتا ہے۔ کہیں اور کوئی دلچسپی ہی نہیں رہتی نہ ہمت نہ شوق بس ... " انہوں نے ... کر گھٹنوں ... دیا تھا۔ ایک خاموشی سی دونوں بہنوں کے درمیان

تن گئی۔ بڑی کے پاس ایسا کوئی تجربہ نہ تھا پھر بھی اس کی دلی خواہش تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے اور کہیں کوئی جگ ہنسائی نہ ہو۔ اور پھر معاملہ یہ بھی کیا تھا۔ جس اوکھلی میں ساری عمر جان پھنسائے رکھی اب اُس سے کیا کترانا۔

مگر ممانی رشیدہ اس حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اُس قربانی کی گائے کی مانند جو گھیر گھار کر چھری تلے لانا پڑتی ہے۔ جوان بیٹے اور بہو کی موجودگی اُن کی اس سرکشی کو برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ اُن کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو بڑھاپے میں ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ بڈھا مرد مزید خرانٹ مزید ہٹ دھرم اور ڈھیٹ سا ہو جاتا ہے۔ ممانی رشیدہ کو شکستِ فاش عطا کرنے سے کچھ یہی کیفیت ماموں احسان کی بھی تھی۔ وہ اُس مرغ کی مانند کلغی پھلائے پھر رہے تھے جس کی حرم سرا میں ایک نئی مرغی کا نزول ہو گیا ہو۔ ممانی چپ چاپ بستر واپس لے آئی تھیں۔ اُس روز صبح ہی صبح ماموں احسان نہا دھو کر منجھلے صاحبزادے کے ساتھ چل دیئے۔ انہیں بھی پنشن کے سلسلے میں اُسی سمت جانا تھا۔ جدھر منجھلے بیٹے کا دفتر تھا۔ دونوں نے ایک ہی رکشہ رکوائی اور اُس میں بیٹھ گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد فون کی گھنٹی بجی تو بہو نے ریسیور اُٹھایا۔

" ہائے میرے اللہ ..... " وہ چیخ مار کر وہیں بیٹھ گئی۔

" سنو بھابھی سنو .... " دوسری طرف سے منجھلے دیور کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ " خود کو سنبھالو .... میں لاش لے کر گھر پہنچ رہا ہوں۔ بھائی جان کو فون کر دیا ہے .... " حقیقت یہ تھی کہ اس روز رکشہ میں بیٹھتے ہی ماموں احسان پر دل کا دورہ پڑا جو کچھ ہی دیر میں خطرناک نوعیت اختیار کرتا چلا گیا۔ عقب میں آنے والی گاڑی کے افراد نے جو صورت حال کو بگڑتے دیکھا تو دونوں باپ بیٹے کو رکشہ سے اپنی کار میں منتقل کر لیا اور آناً فاناً ان کو ہسپتال لے گئے۔ وہاں آخری الفاظ جو ماموں احسان کے لبوں سے ادا ہوئے وہ یہ تھے۔ " بھئی ذرا گلوری تو لانا .... " منجھلے نے ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور باپ کے تھیلے میں سے ڈبیا کے اندر رکھا ہوا پان انہیں پیش کر دیا۔ تمباکو کی تیز دھار دار کاٹ نے انہیں آج جیسے زندگی بھر سے بڑھ کر سرور و لذت مہیا کر دی تھی۔ ان کی آنکھیں اس انوکھے کیف کی سرشاری سے بند ہونے لگیں تو قریب کھڑے ڈاکٹر نے چہرے کو چادر سے ڈھانک دیا۔

"مجھے افسوس ہے .... " وہ منجھلے سے کہنے لگا کہ " آپ کے والد حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے ہیں۔"

شام کو گھر لوگوں سے بھر گیا۔ درمیان میں سفید کفن لپیٹے ماموں احسان کی میت رکھی تھی۔ ممانی رشیدہ باؤلی سی ہو کر کبھی لاش کو اور کبھی لوگوں کے چہروں کی جانب دیکھنے لگتیں۔ آنے جانے والی خواتین کے بین فضا میں تیرتے پھر رہے تھے۔

" اے بہن تیری بادشاہت ختم ہوئی۔ سر کا تاج ہی چل دیا تو کیا بادشاہی .... ؟ ایک لے گھومتی ہوئی ان سے ٹکرائی ... " اے بہن ... عورت کی زندگی تو میاں کے دم سے ہے .... وہ گیا تو زندگی گئی ایک مجازی خدا۔ سو دکھوں کا دارو .... " دوسری آواز نے ہاتھ ملتے ملتے پہلی صدا کے ساتھ سنگت کی۔ رشیدہ ممانی ٹکر ٹکر سب آوازوں کی بازگشت سماعت میں گھولتی رہیں۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھیں موت تو ویسے ہی اپنی دہشت کے سبب کلیجہ نکال لینے والی کالی بلا ہے اور پھر ایسی ناگہانی موت کہ ابھی گھنٹہ بھر پہلے ماموں اچھے خاصے ہنستے بولتے ناشتہ کر کے اور نہا دھو کر نکلے تھے اور واپسی میں اُن کی میت چلی آئی۔

قل اور سوئم کے بعد ہجوم کچھ کم ہو گیا۔ بہو نے زبردستی ممانی کو نہلانے بھیج دیا۔ بڑے عرصے کے بعد کسی ہاتھ نے نرمی اور ملائمت سے اُن کے بال سنوارے اور محبت سے لٹا کر ماتھے پر مساج کیا۔

ممانی رشیدہ کی اس اثنا میں آنکھ لگ گئی تو بہو چپکے سے اٹھ کر چل دی۔ وہ ابھی کچھ دیر ہی سوئی ہوں گی کہ یکایک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ " ارے بھئی کہاں ہو .... کوئی زور سے پکارا تھا۔ ممانی رشیدہ بے چاری بہری تھیں نا اس لیے مخاطب کو قدرے چلا کر پکارنا پڑتا تھا۔ " ذرا اِدھر تو آنا .... وہ .... وہ .... تم سے کچھ کہنا ہے .... پان بھی لیتی آنا اور پیک دان بھی .... " آواز کی بازگشت کمرے میں چاروں جانب سے چلی آرہی تھی۔ وہ چونک چونک کر ہر سمت دیکھا کیں۔ تبھی اُن پر اس روح فرسا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اب وہ آواز اور آواز والا اس دنیا میں نہیں ہے ممانی رشیدہ کے دل پر جیسے کسی نے گھونسا سا مار دیا ہو۔ ساری زندگی اُسی ایک محور کے گرد گھومتے گزری تھی۔ اب وہی مرکزی نکتہ بڑھ کر گویا تاریک خلا کا روپ دھارے چاروں جانب پھیلنے لگا جہاں وہ نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھیں کوئی ہاتھ انہیں بڑھ کر تھامنے والا نہیں رہا تھا۔ نہ کوئی پرسانِ حال۔ بیگم .... اب طبیعت کیسی ہے .... رات ٹھیک سے تو سو گئی تھیں۔ رات تو کھانسی بھی کم ہی آئی

لگتا ہے یہ دوا اثر رہی ہے .... وہ خود ہی سوچتی اور خود ہی جواب دیتی رہیں۔ اب کوئی اس طور کو، یا ہر آن پرسشِ حال کو موجود نہیں ملیگا "کمر کا درد اب کچھ زیادہ تو نہیں .... " پھر قریب سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ " لاؤ میں دبا دوں .... اونہوں .... ذرا زور سے دبانے دو .... تمہیں درد میں ضرور افاقہ محسوس ہوگا .... " یکایک ان کے باریک لکیر کی صورت جھریوں میں سے پھسلتے آنسو تھم گئے اور حواس چوکنے ہو کر کان کھڑے کرنے لگے۔ ہاتھوں کی انگلیاں آہستہ آہستہ چھپکلیوں کا روپ دھارنے لگی تھیں۔ میلی گدلی آنکھیں اپنی ہیئت تبدیل کرتی جا رہی تھیں۔ مونہہ کھل کر نیچے کی جانب جھکا اور خد و خال بدلنے لگے۔ ممانی رشیدہ جھرجھری سی لے کر رہ گئیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طور اس منظر نامے سے غائب ہو جائیں اور ان رینگتی چھپکلیوں کی جنبش سے اپنا کمزور و بے بس جسم آزاد کروا سکیں .... کہیں دور بھاگ جائیں۔

اور دور بھاگ جانے پر اُن کے ذہن نے انہیں یاد دلایا کہ اب یہ دوری اُن کے مقدر میں اس ظالم اور اچانک حملہ آور ہونے والی موت نے لکھ دی ہے۔

قریب تھا کہ چہرے کی جھریوں میں تسلسل سے راستہ بنانے والی اشکوں کی پتلی سی لکیر دوبارہ جاری ہو جاتی کہ اُن کے تنے ہوئے جسم نے اور چوکنے ہو جانے والے اعصاب نے ڈھیلا پڑنا شروع کر دیا۔ ہاتھوں کی وہ رینگتی ہوئی تکلیف دہ جنبش اب انہیں کبھی نہیں چھو سکتی نہ چھپکلی کا کھٹکا .... نہ کسی عذاب کا دھڑکا۔ ممانی رشیدہ کی آنکھیں اشک بہاتے بہاتے رک کر مندنے لگیں .... غنودگی ان پر غالب آتی جا رہی تھی کچھ دیر بعد بہو نے دروازے کو ہلکا سا کھول کر دیکھا وہ بے فکری سے پلنگ پر پھیل کر لیٹی تھیں اور ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں ادھر ادھر چاروں جانب گھومتے پھر رہے تھے۔ ان کا جسم اور ان کی نیند اب کامل طور پر اُن کے اپنے اختیار میں واپس آ گئے تھے۔ اک زمانے کے بعد وہ آزاد تھیں مکمل آزاد اور یہ زبردست حقیقت ہر روح فرسا حقیقت پر حاوی ہو جانے کی حامل تھی۔ سوئی ہوئی ممانی رشیدہ کے لاشعوری جسمانی نظام نے انہیں "سب ٹھیک ہے .... " کی اطلاع سنائی اور گہری نیند کا روحانی سکون سر سے پاؤں تک لہو میں پھیلنے لگا۔

داراب بانو وفا

پنی بیتی ہوئی رنگین جوانی دے گا
مجھ کو تصویر بھی دے گا تو پرانی دے گا

ادتیں ملتی ہیں سورج سے بہت کچھ اس کی
وقتِ رخصت بھی وہ اک شام سہانی دے گا

یرے ماتھے کی لکیروں میں اضافہ کرکے
وہ بھی ماضی کی طرح اپنی نشانی دے گا

رف ہوجائے گا جب میرے لہو کا دریا
تب کہیں جاکے وہ موجوں کو روانی دے گا

ں نے یہ سوچ کے بوئے نہیں خوابوں کے درخت
کون جنگل میں لگے پیڑ کو پانی دے گا

لکھنؤ (یوپی)

یاسمین حمید

ہم سب خود کو تنہا کہنا چاہتے ہیں
جھوٹے ہوکر سچا کہنا چاہتے ہیں

اپنے خدّوخال کی ہر کمزوری کو
اور کسی کا چہرہ کہنا چاہتے ہیں

ڈرتے رہتے ہیں جن کی بے مہری سے
ان لوگوں کو اچھا کہنا چاہتے ہیں

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والے
اجنبیوں کو اپنا کہنا چاہتے ہیں

دل جس سے منسوب کیا ہے ہم اس کو
اپنے قد سے اونچا کہنا چاہتے ہیں

C-48, PHASE-1, L.C.C.H.S., Lahore Cantt, Lahore (Pak)

شہناز نور

اب یہاں چراغوں کا سلسلہ نہیں کوئی
روشنی کے بارے میں سوچتا نہیں کوئی

ٹوٹ پھوٹ کی زد میں روز و شب گزرتے ہیں
سانحہ یہ سب کا ہے ، مانتا نہیں کوئی

بس مجھے سمندر کا حوصلہ پرکھنا ہے
ورنہ کیا کنارے پر ڈوبتا نہیں کوئی

ہر جگہ نظر آئیں قد سے اونچی دیواریں
جیسے شہر میں اپنا اب رہا نہیں کوئی

اور کیا سفر کرنا ، اب اسی کو گھر کرنا
دشت سے نکلنے کا راستہ نہیں کوئی

آزما رہا ہے کیوں اب مجھے مقدر نور
میرے لب پہ مدت سے جب دعا نہیں کوئی

B-54، بلاک N، نارتھ ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

رضیہ شمع

اشک میرے تھے اور تمہاری رات
مل کے دونوں نے یوں سنواری رات

جب یہ سوچا کہ بھول جاؤں اسے
بہہ گئی آنسوؤں میں ساری رات

بھولی بسری سی اس کی باتوں نے
چھین لی مجھ سے میری ساری رات

کس قدر مہرباں تھی اس پر
وہ جو مجھ پر تھی کتنی بھاری رات

خواہشوں کے ہرے درختوں پر
جیسے چلتی تھی کوئی آری رات

21-G, Model Town Extention, Lahore (Pakistan)

تبسم صدیقی

وہ داستانیں سناتی آنکھیں وہ جسم نازک کہ خواب جیسا
نگاہ کے سامنے ہے ہر دم کسی کا چہرا کتاب جیسا

وہ اور ہوں گے سفر وفا کا جنہیں عذاب سفر ہوا ہے
تری رفاقت میں خار بھی ہے میرے لئے تو گلاب جیسا

سی کے پرتو سے ہیں منور یہ میری آنکھیں یہ میرا چہرا
جو شب کو ہے ماہتاب جیسا جو دن کو ہے آفتاب جیسا

ستارۂ شام غم کو اپنا میں ہمسفر مان لوں تو کیسے
وہ آسماں کی پناہ میں ہے میرا سفر ہے عذاب جیسا

سب اُس کے صحراؤں میں بھٹک کر گھروں کو لوٹ آئے ہیں تبسم
بجھا سکا پیاس کب کسی کی وہ ایک دریا سراب جیسا

کراچی (پاکستان)

فوقیہ مشتاق

تیری آنکھوں میں جلے خواب میں شرمندہ ہوں　　مٹ گئے وصل کے سب باب میں شرمندہ ہوں
میں سمندر ہوں سمندر کی طرح پیاسی ہوں　　کیا کروں گی تمہیں سیراب میں شرمندہ ہوں
دل میں حسرت ہی رہی کاش کبھی تم کہتے　　اے مری گوہر نایاب میں شرمندہ ہوں
آج تک سنگ ہی کھائے ہیں محبت میں تری　　اب نہیں مجھ میں تب و تاب میں شرمندہ ہوں
اس نے مانا بھی تو کیا اور کہاں پر مجھ سے　　فوقیہ دشت میں اور آب میں شرمندہ ہوں

○ 49۔نور پلازہ بلاک"M" نارتھ ناظم آباد۔کراچی۔(پاکستان)

سیّدہ شانِ معراج

ماضی کو بھول آئے ہم صورتِ حال کے سبب　　چہرہ غبار ہوگیا گردِ ملال کے سبب
روز طلوعِ مہر سے پھوٹی اُمید کی کرن　　روز ہی آئی شامِ غم اس کے زوال کے سبب
ربِّ کریم کو بھی کیا میری دعا سے بیر تھا　　ہجر نصیب کردیا شوقِ وصال کے سبب
یہ بھی ہوا ہے بارہا بھول گئے ہیں راستا　　چھوٹ گئی ہیں منزلیں اس کے خیال کے سبب
اس نے کچھ اس ادا سے آج پوچھ لیا مرا مزاج　　اشک پلک تک آگئے پرسشِ حال کے سبب

○ تارین گلی، شاہجہاں پور 242001(یوپی)

نفیس بانو شمع

قہقہوں کی گود میں ہی سسکیاں رکھی گئیں　　ہر خوشی میں درد کی پرچھائیں رکھی گئیں
ہر کسی کو مل رہی تھی نیک نامی کی سند　　میری خاطر شہر میں رسوائیاں رکھی گئیں
لوگ کس لالچ میں آتے ساحلِ دل پر مرے　　جس پہ امیدوں کی خالی سیپیاں رکھی گئیں
دے دیا پہلے تو مجھ کو ایک مٹی کا دیا　　اور مری دہلیز پر پھر آندھیاں رکھی گئیں
قربتوں کی بٹ چکی سوغات جب تمّع تو پھر　　میرے حصّے میں وہی تنہائیاں رکھی گئیں

○ E-62 ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر۔نئی دہلی۔۲۵

اوشا بھدوریا

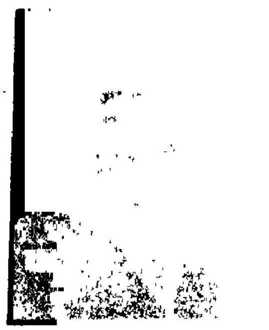
رنگوں کو خوشبو پہناتے　　جب بھی مجھ کو پاس بلاتے
تو ہم کو آواز تو دیتا　　ہم تیرا سایا بن جاتے
کیا سے کیا ہو جاتے ہم بھی　　جب بھی تیری قربت پاتے
کاش کسی دن تجھ کو چھوکر　　بجھے ہوئے لمحے جل جاتے
اُن کو پل پل میں جی لیتی　　اوشا پاس کبھی وہ آتے

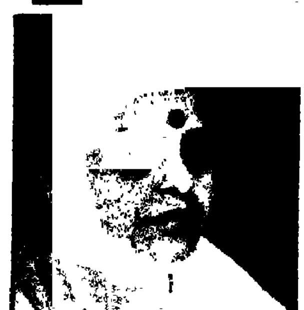
House No.2, 29/30 N-3, Piplani. Bhel, Bhopal-462021 ○

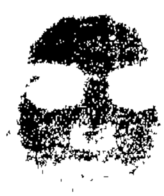
شگفتہ طلعت سیما

سرکش خواہش طاری رکھ　　دل میں بھی بیداری رکھ
چٹھی لکھ یا باتیں کر　　لفظوں میں دل داری رکھ
بول، مگر کچھ سوچ کے بول　　باتوں میں تہہ داری رکھ
بکتے ہیں نقّاد یہاں　　اب تیور بازاری رکھ
دشمن کو کمزور نہ جان　　ضرب ہمیشہ کاری رکھ

○ 89/5 رپن اسٹریٹ، کلکتہ 700016(مغربی بنگال)







ذکیہ مشہدی
12-A 160, Officers Flat Bailey Road,
Patna - 800001 (Bihar)

افعی

انجینئرنگ کالج میں داخلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ داخلے کے امتحان میں کامیاب طلبا کو انتظامیہ کی طرف سے خط جاری کر دیئے گئے تھے۔ پندرہ دن کے اندر انہیں داخلے لینا تھا۔ اکیڈیمک سیکشن میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ ہر سال کا معمول تھا۔ تعلیمی سال شروع ہوا اور فریشرز آئے۔ کچھ سال پہلے کسی ستم ظریف نے ان کے لئے "فچے" کی اصطلاح وضع کی تھی۔ فچے یعنی فریشر بچے۔ اصطلاح نہایت مقبول ہوئی۔ اکیڈمک سیکشن کے کلرک تک اب نئے آنے والے طلبا کے لئے نہایت روانی سے فچے اور فچی استعمال کرتے تھے۔

زیادہ تر فچوں کے ساتھ ان کے والدین یا سرپرست بھی آیا کرتے تھے۔ سب کے چہروں پر خوشی کی ایک چمک ہوتی تھی۔ ایڈیشن انچارج دھن راج ورما کی اس چمک سے بھی پرانی جان پہچان تھی۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونا آسان نہیں ہے۔ ہزاروں طلبا بیٹھتے ہیں۔ منتخب تو بس تین سو ہوتے ہیں۔

کافی طویل و عریض کمرہ تھا۔ اس میں کئی کلرک تھے۔ ایک جگہ سرٹیفکٹ جمع کیجئے۔ دوسری جگہ سے فارم لیجئے۔ تیسری جگہ خانہ پری کے بعد اسے جمع کیجئے۔ چوتھی جگہ . . . . . .

کمرے کے باہر وسیع کاریڈور۔ دھن راج نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ سات آٹھ طلبا کا ایک گروپ ڈولتا نظر آیا ان کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ یہ سب سینئرز تھے۔ ان کی پشت پر ایک مشہور کمپنی کے قیمتی بیگ تھے۔ پیروں میں اس سے کہیں قیمتی جوتے اور وہ نہایت عمدہ اور دور سے ہی شاندار لگنے والی جینز اور ٹی شرٹس میں ملبوس تھے۔ دھن راج مسکرایا۔ وہ سب کے سب چیونگم چبا رہے تھے اور ہونٹوں پر دبی دبی شیطانی مسکراہٹ لئے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ سارے شکار کی تلاش میں ہیں۔ دھن راج نے پیار سے زیر لب گالی دی اور رجسٹر میں خانہ پری کرتے کرتے سوچنے لگا۔ پچھلے سال ان سب حرامزادوں کی ریگنگ RAGGING ہوئی تھی۔ وہ بھول گئے۔ نئے آنے والوں کو تنگ کرنے پہونچے ہوئے ہیں ابھی ان غریبوں کے ایڈمشن کی کارروائی تک پوری نہیں ہوئی ہے اتنا صبر نہیں کہ ایڈمشن لے کے یہ کلاس تو شروع کریں۔

اکاؤنٹنٹ انصاری بڑا سخت مشہور تھا۔ اس سے لڑکوں کا سابقہ بھی زیادہ پڑتا تھا وہ باہر نکل آیا اور اس نے سینئر طلبا کو ڈانٹا۔ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ تشریف لے جائیے فی الحال۔

کیا گرو! آپ کو کیا پریشانی ہو رہی ہے عبدالواحد انصاری سر! ایک لڑکے نے انصاری کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے۔

" میاں۔ یہاں بھیڑ کیوں بڑھائے ہوتے ہو۔ جاؤ آگے بڑھو۔ کلاس چھوڑ کر بھاگے ہوئے ہو۔ "

نہیں سر! ایسا ہو سکتا ہے سر! برجیش نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ اس کی آواز میں ہنسی کی کھنک تھی۔

بھاگ لو۔ ورنہ انصاری سر پیٹ بھی دیا کرتے ہیں۔ سمیت نے کہا اور آگے والے لڑکے کو دھکا دیا۔

انصاری نے مصنوعی قہر آلود نگاہ ان پر پھینکی اور نئے لڑکوں سے کہا۔ بیٹا آپ لوگ اندر رہئے۔ ورنہ ابھی یہیں ریگنگ شروع ہو جائے گی۔ یہ سب بدمعاش لڑکوں کا گینگ ہے فچوں کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

اگلے سال شاید میرا بیٹا بھی یہاں آئے۔ انصاری نے دوبارہ رجسٹر پر جھک کر سوچا۔

ہندی میڈیم سے پڑھا ہوا لڑکا ہے۔ صوبائی بورڈ سے آئی۔ ایس سی کیا ہے۔ اوسط درجے کی ذہانت ہے۔ صوبائی اداروں میں اوسط اور غبی بچے بالکل ہی ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اچھے انگریزی اسکول میں پڑھایا جائے تو معمولی درجے کے ذہین بچوں کی صلاحیتوں پر بھی ایسی جلا آتی ہے کہ وہ بڑے تکنیکی اور پروفیشنل کالجوں میں داخلہ پانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سالوں میں یہ رجحان بہت ابھر کر سامنے آیا ہے۔ پہلے ورناکیولر اسکولوں کے پڑھے ہوئے طلبا کسی خاصی تعداد میں دکھائی دیتے تھے۔ اب تو زیادہ تر انگریزی بولنے والے اجنبز اور مہنگے اسپورٹس شوز میں ملبوس اسمارٹ بچے ہی آتے ہیں لڑکیاں بھی خاصی آنے لگی ہیں۔ پوچھو بھلا تمہیں انجینئر بن کے کیا کرنا ہے۔ لڑکوں کا حق کیوں مار رہی ہو۔ انہیں تو کنبہ پالنا ہے۔ روزی روٹی چلانی ہے۔ بیوی بنا کر تمہیں ڈھونا ہے۔ تم اپنی تنخواہ سے مہنگا میک اپ خریدو گی۔ شوہر کے منہ کو آؤ گی کہ تم اس کے برابر تنخواہ لاتی ہو۔ انصاری کو محسوس ہوا جیسے اس کے بیٹے کی جگہ کوئی لڑکی ہی ایک سیٹ پر قابض ہونے والی ہے۔

کوری ڈور سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور پھر آواز دور ہوتی چلی گئی۔ انصاری کی سرزنش کے بعد سارے سینئر بابا کرتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

سامنے سبز اور وسیع میدان تھا۔ پیڑوں کے ایک جھرمٹ سے وانی نمودار ہوئی۔ ساتھ میں شلپا بھی تھی۔ سمیت کی نظر پڑی تو اس نے دور ہی سے ہانک لگائی وار۔نی۔ای۔اکا۔ ارے رک ذرا میری اماں۔

وانی اور شلپا ہنستی ہوئی قریب آئیں۔ سمیت نے آستینیں چڑھائیں اور آنکھیں نکال کر وانی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیوں بے یہ کیا بدتمیزی ہے؟“

کیا؟ وانی نے بے خبری کا مظاہرہ کیا

”دیکھ اگر معصوم بنے گی تو پیٹ کے دھر دوں گا۔ ودیا سے کیا لگائی بجھائی کی ہے تو نے۔“

شلپا مارے ہنسی کے کھڑی کھڑی ہلنے لگی۔

”میں کیوں کرنے لگی لگائی بجھائی۔؟ تمہارا آپس کا معاملہ ہے LOVERS QUARREL میں اس میں کہاں؟ کہو تو ودیا کو سمجھاؤں؟“

وانی بہت سنجیدہ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں تتلیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ دراصل وانی بے حد شریر لڑکی تھی۔ جھگڑے لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ودیا اور سمیت کی گہری دوستی اب کچھ کچھ جذباتی رنگ پکڑنے لگی تھی۔ بس وانی نے جا کے کہہ دیا کہ سمیت کی تو بچپن کی سوئیٹ ہارٹ اس کے وطن میں موجود ہے۔ شادی تو اسی سے کرے گا۔ یہاں بورڈنگ میں تفریح کر رہا ہے۔ سمیت کی بچپن کی سوئیٹ ہارٹ ایجاد کر کے اس کا ایک نام بھی تجویز کر دیا تھا۔ شمپا۔ پھر ایک اور چکر چلایا۔ ایم تھری (منیش موہن اگروال کو منیش موہن مراد آبادی اور اس کا مخفف ایم تھری وانی نے ہی دیا تھا اور یہ مخفف منیش سے پوری طرح چپک کیا گیا تھا) سے جا کے کہہ دیا کہ ودیا تو تیرے اوپر فلیٹ ہے۔ سمیت سے تو اس کا باقاعدہ جھگڑا ہو چکا ہے۔ ایم تھری جو ایک مراد آبادی برتنے تیار کرنے والی فیکٹری کے مالک کا بیٹا اور لڑکیوں کے معاملے میں خاصہ بے وقوف تھا۔ ودیا کے چاروں طرف منڈلانے لگا۔ ودیا نے سمیت سے گہری دوستی کے باوجود کسی قسم کے عہد و پیماں ابھی تک نہیں کئے تھے پھر شمپا کی دریافت اور سب سے بڑی بات یہ کہ صنف مخالف کی توجہ تو سب کو اچھی لگتی ہے اس لئے وہ ایم تھری کی خصوصی عنایتوں سے خاصی خوش ہو لیا کرتی تھی ویسے بھی یہ سب آج کل کی نوعمر لڑکیاں تھیں اور لڑکوں سے شرما کر اوئی اللہ کہہ کر منہ چھپانے اور جوتی چھوڑ کر بھاگ نکلنے کے واقعات ان کی اماں نہیں بلکہ نانی دادی کے وقتوں کے ہو چکے تھے بہر حال سچویشن خاصی گڈمڈ ہو رہی تھی اور وانی کوشش کر رہی تھی کہ سمیت سنگھ اسے جیسے وہ سمیت بارہ سنگھا کہا کرتی تھی دور ہی رہے مگر آج بارہ سنگھے نے اسے دھر ہی لیا تھا۔

”ودیا کو کیا سمجھائے گی۔ خبردار جو ودیا کے پاس بھی گئی ہے تو۔“ سمیت نے پھر آنکھیں نکالیں۔

لو جی۔ ودیا تمہاری بیاہتا ہے کیا جو پابندی لگاؤ گے کہ کون اس سے ملے، کون نہ ملے۔

اب کی شلپا سے نہیں رہا گیا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ قہہ قہہ قہہ۔ خاصہ مردانہ قہقہہ تھا پھر دونوں وہاں سے بھاگ نکلیں وانی نے پلٹ کر انہیں دیکھا اس کا چہرہ شرارت سے گلزار تھا۔

یہ عورتیں۔ شتروگھن نے دانت پیسے۔ یہ کبھی نہیں سدھریں گی سمجھتی ہیں برابر کا حق چاہئے۔ ارے سر پہ چڑھی بیٹھی ہو پہلے سے

اب کون سی برابری چاہیئے۔ جتنی ہیں ساتھ ہیں یہ سب تمہاری ناک کاٹ کر ہتھیلی پر دھر دیں اور تم خود ان کو ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پاؤ۔ اچانک وہ چلایا۔ ارے یار دیکھ ... دیکھ۔ معلوم ہوا کہ شکاری کو ہرنوں کی ڈار دکھائی دے گئی وہ چھپتے جا رہے ہیں پڑا بنا کے۔ سالے فارم وارم بھر کے نکلے ہیں۔ تھوڑی تفریح ابھی ہی ہو جائے۔

انہوں نے ایک لڑکے کو جا پکڑا۔ سمیت بارہ سنگھے نے سیدھے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا۔

کیوں بے نام کیا ہے؟

امیت کھنہ۔ بڑی مسکین آواز میں لڑکے نے جواب دیا

" باپ کا نام۔؟

" باپ کے نطفے سے ہے بھی یا نہیں؟ کسی نے لقمہ دیا اور باقی ہو ہو ہو کر کے ہنس پڑے۔ لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

" اچھا خیر جسے باپ کہتا ہے مطلب جس سے اس کی اماں نے شادی رچائی اس کا کیا نام ہے؟ "

" نیک چند کھنہ!

بڑا بدتمیز ہے۔ باپ کہتا ہے اور نام یوں ہی لے دیتا ہے بغیر آگے پیچھے کچھ لگائے ہوئے۔ ابے باپ ہے یا تیرا نوکر۔ برجیش نے امیت کھنہ کو کس کے ایک تھپڑ لگایا۔ اس کے کان جلنے لگے۔ دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔ دو بہنوں کے بعد ہوا تھا اس لئے ماں باپ کا زیادہ ہی لاڈلا تھا۔ گھر پر کسی نے پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا۔ ایک ہی تھپڑ میں بسورنے لگا۔

ابے بول پھر سے۔ باپ کا کیا نام ہے؟

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا شری نیک چند کھنہ صاحب!

واہ واہ۔ ذرا صاحب کی اولاد کو تو دیکھو۔ ابے نیک چند کھنہ لاٹ صاحب کیوں نہیں کہا۔ ایک دھول اور پڑی۔ چو پدی چو پدی کا شور رہا۔ بیٹا تمہاری سزا یہ ہے کہ یہاں کھڑے رہو سارا دن اور جتنی لڑکیاں یہاں سے گذریں ان میں سے ہر ایک کے پاس جاؤ اور کہو تو میری اماں تو میری بہن۔

اسی وقت ہر پریت وہاں آنکلا۔ ہر پریت کو شلپا نے بھائی بنا رکھا تھا۔ دونوں ایک ہی شہر کے تھے اور اتفاق سے دونوں ایک ہی انجینیرنگ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ شلپا بچپن سے اسے راکھی باندھتی آئی تھی۔ کلاس کے لڑکوں کو یہ بات معلوم تھی۔ برجیش نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک جھاپڑ ہر پریت کو بھی رسید کر دیا۔

کیا بات ہے تاؤ۔ دھول دھپا کس لئے؟ میں بھی تو پوچھوں کیا؟۔

تیری بہن ابھی بدتمیزی کر گئی ہے ہم لوگوں سے۔ وہ ٹھہری لڑکی۔ اسے تو مار نہیں سکتا اس لئے تجھے مارا۔ وہ سب ہو ہو ہو کر کے پھر ہنسے کہ زندگی ابھی محض ہنسی ہی ہنسی تھی۔

ان چھو کو کیوں پکڑ رکھا ہے۔ ذرا اطمینان سے پالو کچھ کھلی سانس کرو۔ پھر دیکھیں گے۔ پھنسے ہیں سالے جائیں گے کہاں ہر پریت نے کہا۔

تجھ پہ کیا مصیبت ٹوٹ رہی ہے۔ تیرے سالے لگتے ہیں یہ۔ سمیت بولا۔

یار میری فیس نہیں جمع ہوئی ہے۔ ٹرمینل کا رزلٹ رک جائے گا۔ چل ذرا آفس۔ ہر پریت نے پرس لہرایا۔

تیرا باپ موٹا منی آرڈر بھیجتا ہے۔ فیس کیوں رکی؟

پی گیا ہوگا سالا۔ یوتھ فیسٹیول کے دوران مسلسل ٹلی ہوا ہوا تھا۔

اور وہ جو لڑکی سے لونڈیا آئی تھی اسے ہفتے بھر شلپا یا پھر نے۔ شلپا... تو اسے بھابھی بولنے لگی تھی۔ ابے چلتے وقت انگوٹھی پہنائی اسے؟

ایسی پنچ نہیں پاتے ما بدولت۔ ہر پریت ہنسنے لگا۔ شلپا کی کئی بھابھیاں ہیں۔ اتنے میں ایک لڑکی ادھر سے گذری۔ لا بنی چھریری۔ معلوم ہو کہ ہوا پہ تیر رہی ہے۔

ابے دوڑ۔ سمیت اور برجیش ایک ساتھ چلائے۔

امیت با دلِ نخواستہ جگہ سے ہلا۔ ابے دوڑ۔ لڑکے پھر بولے۔ پکڑ اسے۔ جا کہہ۔ تو میری اماں، تو میری بہن۔ امیت لڑکی کے پاس جا کر ہکلانے لگا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بڑی مبہم، آنکھوں میں اتری اور ہونٹوں پہ ہلکی۔ امیت کو وہ بہت خوبصورت لگی۔ اس نے جھک کر لڑکی کے پیر چھوئے۔ وہ باقاعدہ ہنس پڑی۔ اس وقت تک غول پاس آ گیا تھا۔

کیا کہا اس نے ؟

ابھی تک تو کچھ نہیں کہا ۔ لڑکی نے جواب دیا ۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھی کیوں نہیں کہا ۔ ؟ تین چار دھولیں ایک ساتھ امیت کھنہ کے سر پہ پڑیں ۔ وہ تقریباً رکوع میں چلا گیا اور تو ، میری اماں تو ، میری بہن کی تکرار شروع کی تو طوطے کی طرح بولتا ہی رہا ۔

ایسی خوبصورت لڑکی کی یہ تو ہین ۔ کوئی جوان پٹھا اس سے کہے تو میری اماں ... لڑکے چلائے اور پھر گھونسے تانے ۔

جانے دو جانے دو ۔ لڑکی نے دخل اندازی کی ۔ ایسے چڑی مار کی تو ماں بہن بننے میں ہی عافیت ہے ۔ آئی ایم شیور ۔ اس کی اماں اسے پیدا کر کے خاصی شرمندہ ہوئی ہوگی ۔

وہ سب قہقہہ لگا کر ہنسے لڑکی انہیں ٹا ٹا کرتی ہوئی نکل گئی ۔

یہ لڑکیاں کیسی کیسی باتیں کرنے لگی ہیں ۔ امیت چھوٹے شہر سے آیا تھا ۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ تو دہلانے والا تھا ہی ۔ اب یہ لڑکی ۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اپنی بہنیں کسی لڑکے سے اس طرح بات کر سکتی ہیں ۔

تاؤ ! کھڑے رہو یہاں ۔ خبردار جو ہلے ہو ۔ ہم آگے چیک کر کے یہاں نہ پائے گئے تو اُسے استرے سے حجامت بنا دیں گے ۔ غول آگے بڑھا ۔

سامنے سے ایک اور فریشر چلا آ رہا تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سینئر لڑکی بھی تھی ۔ فریشر نے سرخ رنگ کی اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی اور پھیکی آسمانی جینز ۔

کیوں بیٹے ۔ یہ کیا پہن رکھا ہے ؟

ابے یہ انجینئرنگ کالج ہے یا پونا فلم انسٹی ٹیوٹ ؟

" سالا ۔ " لڑکی نے اطمینان سے یہ سوچے بغیر کہا کہ رشتے میں کوئی اس کا سالا کیسے ہو سکتا ہے پھر اس نے بیگ سے سگریٹ کی ڈبیا برآمد کی ۔ " یہ رنگ تو میں اپنے پھیروں کے دن بھی نہ پہنوں " اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ۔ " پھیروں میں تو تو ماتمی رنگ پہنیو ... ایک سینئر ہنسا ۔ جس سے بیاہ ہوگا وہ سالا دوسرے ہی دن مریں ..... "

لڑکی نے ایسا کہنے والے ہم جماعت کو ایک لات ماری ۔ نہایت لانبی پتلی ، سڈول لات ۔

امیت کی تو گھگھی بندھ گئی ۔ ابھی اس سے بھی کہنا ہوگا تو میری اماں ۔ تو میری بہن ۔ نہ جانے کیا سلوک کرے ۔ اب کیا لڑکیوں کی لاتیں بھی کھانی ہوں گی ۔ لیکن سینئرز کی توجہ ۔ اب اس سرخ اسپورٹس شرٹ والے لڑکے کی طرف ہو گئی تھی ۔

" نام کیا ہے بے ؟ بے کے آگے ایک موٹی سی گالی تھی ۔ لڑکا ذرا کا ذرا ہل گیا ۔

" سنجر ۔ ! "

ابے سنجر کے آگے پیچھے کچھ نہیں ۔ خالی سنجر ؟

شنڈ ہوگا سالا ۔ (شنڈ دلی کے کچھ تعلیمی اداروں میں شیڈیول کاسٹ کے مخفف کے طور پر استعمال ہونے والا Slang ہے)

لڑکی نے کہا یہ لوگ آج کل سر نیم نہیں لگا رہے ۔

ہم مسلمان ہیں ۔ ہمارے یہاں شیڈیول کاسٹ ہوتی ہی نہیں ہے ۔

کیا کہا ؟ سالا ملا ہے ۔ ایک لڑکا بولا ۔

ابے یہ ملا سنجر نام کب سے رکھنے لگے ؟ دوسرے نے کہا ۔

سنجر میں اتنی پیشانی ہوئی کہ نام تک بدلنے لگے دھوکے باز کیا پتہ جھوٹ بول رہا ہو ۔ پاجامہ کھلوا اؤ پاجامہ ۔

اور جو کٹوانا بھی بند کر دیا ہو تو ۔ ہا ہا ہا ۔ ایک فلک شگاف قہقہہ گونجا ۔

لڑکے کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔ ہمارا نام سنجر علی سید ہے سنجر نام ہمارے یہاں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے ۔ سنجر نہیں ، سنجر ۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ۔ کوشش کی کہ جھنجھلاہٹ اور غصہ آواز سے عیاں نہ ہو ۔ ہم اپنی شناخت چھپاتے نہیں ہیں ۔

بڑا ڈھیٹ ہے یار ۔ اب کیا اپنی شناخت دکھا دے گا ۔

اس کی پوری قوم ڈھیٹ ہے یار ۔

یارا ۔ یہ تم لوگوں نے کیا شروع کر دیا ۔ لڑکی نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا ۔ ان باتوں کی کیا تک ہے ۔ یار ذرا ڈیسنسی برتو ۔

ہا ہا ہا APPEASEMENT کون سے دل کی ہے یار ؟ ایک لڑکے نے کہا ۔

" اس کا باپ جے ۔ این ۔ یو میں ریڈر ہے ۔ سوڈو انٹیلکچوئلز کا گروہ " دوسرے نے لقمہ دیا ۔

بھاڑ میں جاؤ ۔ لڑکی چہرے سگریٹ کے سوٹے لگاتی ہوئی آگے بڑھ گئی ۔ بدتمیز کہیں کے اس نے زیر لب کہا ۔

فکرِ امروز

سایۂ زہرا میں

فطرتاً جذباتِ حسن و عشق میں ہے ارتباط
ہے زمیں سے تا فلک ان کی بساطِ انبساط
جھومتا ہے عشق دل بن کر فضائے شوق میں
اپنی دھن میں چھیڑتا ہے حسن جب سازِ نشاط
زحمتِ زنجیر ہے پائے محبت میں فضول !
قیدِ ظاہر سے ہے بالاتر یہ ربط و اختلاط
ختم ہوسکتی نہیں ان کی یہ جنگِ زرگری
شوق صرف برہمی و عقل محوِ انضباط
رسم و آئینِ تمدن کو ہوئی آخر شکست
سب نے جرأت آزمائی کی ہموار بساط
عالمِ اجسام پہ طاری ہوں کتنے ہی حجاب
روح کی دنیا نہیں پابندِ حزم و احتیاط
نیند کی غفلت سے جب اہلِ جہاں بے ہوش تھے
سایۂ زہرا میں حسن و عشق ہم آغوش تھے

(کارِ امروز۔ بارِ دوم: جولائی ۱۹۴۷ء)

سیماب اکبرآبادی

شاعر

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ـــــ ۷۰
شمارہ ـــــ ۲

فون: 3829904

فروری ۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ـ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ◆ امریکہ ۲۵ ڈالر ◆ برطانیہ ۱۵ پونڈ ◆ خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004



SALIHA ABID HUSAIN
Jamia Nagar, New Delhi-25
Phone : 63 24 66

صالحہ عابد حسین
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۷ مئی ۷۶ء

برادر محترم تسلیم

عنایت نامہ ملا۔ حسب الحکم تصویر کا نیگیٹو حاضر
نہ ہو سکا ورنہ ارسال کر رہی ہوں۔ مگر آپ کی فرمائش
نے ذرا چھوٹا بنا دیا ہے فوٹوگرافر نے مگر
آپ کے مقصد کے لئے کافی ہو گا۔

آپ کا نوٹس۔ ان نہ ہیں ملا ہے دیکھے اور
جب آپ ارشاد فرماتے ہیں تو بھی
عنوان قسمت نے مجھے سوال نامہ دیا۔ اللہ ذلیل کیا
وعدہ کیا کہ تین چار دن میں مکمل کر کے بھیجوں گا
اور اب تین ہفتے سے منہ چھپا رکھا ہے۔
حالانکہ یہ گوشہ خالص ان کی خواہش
اور کوشش تھی ورنہ میں تو ایسی چیزوں سے
ذرا گھبراتی ہوں۔ مگر اصرار کر کے انہوں
نے رضامند کیا اور پھر آپ کی عنایت اور
فراخدلی کو دیکھ کر منظور کیا۔ اب یہ آپ
رسالہ میں چھپنے گئے اور وہ وقت
خدا جانے کس چکر میں ہیں

صالحہ عابد حسین بنام اعجاز صدیقی

صالحہ عابد حسین [مصداق فاطمہ۔ پ: ۸ر اگست ۱۹۱۳ء م: ۸ر جنوری ۱۹۸۸ء] کے فن و شخصیت پر ۱۹۷۶ء کے شاعر میں ایک گوشہ شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ہونے والی مراسلت میں سے یہ ایک اہم خط ہے۔ قبلہ اعجاز صدیقی نے ۱۹۷۰ء سے شاعر میں گوشوں کی اشاعت کا آغاز کیا تھا اور پہلا گوشہ راجندر سنگھ بیدی پر تھا۔ [ادارہ]

ترتیب

عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب

[حصہ دوم]

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

[illegible]

[illegible]

عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب

[۲]

اردو کی قلم کار خواتین کے کار و افکار کا سلسلہ نیا نہیں ہے لیکن بیسویں صدی کی خواتین نے نثر و نظم میں بہت کام کیا ہے۔ رواں صدی کے نصف آخر میں تو غیر معمولی شعر و ادب تخلیق ہوا ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ تنقیدی و تحقیقی کام بھی وزن و وقار رکھتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ماضی میں لکھے جانے والے تذکروں اور اردو ادب کی تاریخوں میں اردو خواتین کو "برسبیلِ تذکرہ" سے آگے اہمیت نہیں دی گئی۔ عموماً شعرا کے تذکرے ہی لکھے گئے اور ان میں شاعرات کو جگہ نہیں دی گئی۔ جن شاعرات کا خال خال ذکر ہوا بھی ہے ان میں سے بیشتر کو طوائفیں تصور کیا گیا۔ آج جبکہ یہی قلم کار خواتین کی بہت بڑی تعداد مضامینِ نثر و نظم میں اضافہ کر رہی ہے لیکن یہ خواتین شکوک و شبہات سے کبھی بھی بالاتر نہیں ہو سکیں۔ ہمیشہ یہی رہا کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" زیب النساء مخفی سے پروین شاکر تک (ثروت حسین اور پروین شاکر کے عشق کی داستان کا احوال، ثروت حسین پر زاہد حسین بھٹی کی کتاب "کاندھے پہ دھرے ساز" میں موجود ہے۔) اور اس کے بعد بھی (نوشی گیلانی وغیرہ) یہی مصرعہ مردوں کی زبان پر رہا ہے۔ حالانکہ شاعر اور غیر شاعر یا متشاعر میں امتیاز کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ہندوستانی مشاعروں میں شریک ہونے والی متشاعرات کی تحریریں دیکھ لیجئے اور گفتگو سن لیجئے۔ اس غلط مفروضے نے بہت ساری ذہانتوں کو یا تو ضائع کر دیا ہے یا انھیں ان کے تخلیقی قد ہی میں دفن کر دیا ہے۔

تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ شاعرات کی طرح نثر نگار خواتین کا بھی کوئی تذکرہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ شاعرات کے کچھ تذکرے ضرور ہیں۔ 'شمیم سخن' اور 'تذکرۃ الخواتین' کے بعد تذکرہ شاعراتِ اردو (محمد جمیل احمد بریلوی۔ مطبوعہ: ۱۹۴۴ء۔ ضخامت: ۸۳۲ صفحات) آج کی شاعرات (سلطانہ مہر۔ مطبوعہ: ۱۹۷۳ء) یا کتب و رسائل میں ضمناً خواتین کا تذکرہ آ جاتا ہے۔ کچھ خواتین پر انفرادی نوعیت کا کام ضرور ہوا ہے۔

بہر حال! شاعر کا مجوزہ "عالمی اردو قلم کار خواتین ادب نمبر" ماضی کے تحقیقی و تنقیدی سرمائے کا بھرپور جائزہ اور خواتین کے حالیہ شعر و ادب کو پوری طرح اجاگر کرے گا۔ ایک ایسا خاص نمبر جو تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی، تاریخی، سوانحی، تذکروں اور اشاریوں پر مشتمل ایک دستاویز ہوگا۔

شاعر کے اس تازہ مشترکہ خصوصی شمارے کے مشمولات ہماری بے ترتیب سوچ کا تخلیقی اظہار ہیں۔ چونکہ یہ کوئی طے شدہ شمارہ نہیں ہے لہذا بہت سارے ناموں کی شمولیت ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ دفتر میں جو تخلیقات جمع تھیں اور جو شاعر کے زیرِ ترتیب شماروں کے لئے منتخب ہونے والی تھیں ان ہی میں سے نثر و نظم کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ صفحات بھی محدود ہیں تاہم محدود صفحات میں اتنے سارے لوازمے کی سمائی بھی کہاں آسان تھی۔ یہ سو صفحات سے زیادہ کا مواد ہے۔ ایک مشکل مرحلہ نئے پرانے قلم کاروں کو یہاں وہاں ٹانکنا بھی تھا۔ اسے ہم نے کولاج کی شکل دی ہے۔ اتنی ساری خواتین، ان کی معیاری تخلیقات، تصاویر، پتے۔ اپنی نوعیت کا یہ اولین شمارہ ہے۔ یہ خصوصی شمارہ آپ کو کیسا لگا؟

آپ کے مشوروں اور خطوں کا انتظار رہے گا۔

افتخار امام

فہمیدہ ریاض

خزانہ

اچانک راہ چلتے اک خزانہ ہاتھ آتا ہے
بہت حیران ہو جاتے ہیں ہم، اور بے قرار
زمیں ششدر
سمیٹیں گے اسے کیوں کر
اسے سب سے چھپا کر گھر ہی لاتا ہے
کسی تاریک تہہ خانے میں اس کو دفن کر دیں گے
ہمیشہ نصف شب کے بعد تہہ خانے میں جانا ہے
ہم اپنا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ چھپاتے ہیں
اسے چھوتے ہیں اپنی انگلیوں سے بار بار
مگر آتا نہیں اعتبار
خزانے پاس جب جائیں
خزانے کے نہ ہونے کا زمانہ ساتھ جاتا ہے
یونہی آنکھوں میں رہ رہ کر چمک اٹھتے ہیں آنسو
بہت افسردہ ہو جاتے ہیں وہ اور اشک بار
وہ جن کو خوش نصیبی سے
کسی ویران کھائی میں
اچانک راہ چلتے اک خزانہ ہاتھ آتا ہے

● 297۔ کیمپ آفس، قائد اعظم اکاڈمی
ایم۔ اے۔ جناح روڈ، کراچی (پاکستان)



گلنار آفریں

صدائے صحرا

دکھ کے گہرے سناٹے میں
بندوقوں کا شور
گونج رہا ہے چاروں جانب
آہوں، چیخوں، فریادوں کا شور
گلیوں، کوچوں، بازاروں میں
ویرانی سی ویرانی ہے
گھر گھر وحشت ناچ رہی ہے
نفرت کے در کھول رہی ہے
خالی ہاتھوں مرنے والے
زخم رسیدہ، جسم بریدہ
آنکھ پہ پٹی، ہاتھ بندھے ہیں
سینے پر بندوق رکھی ہے
گلیوں، کوچوں، بازاروں میں
موت کے ٹھیکیدار کھڑے ہیں
اور میداں میں خوف سے سہمے سہمے لوگ
کلاشنکوف کی زد پر بوڑھے اور جواں
بے بس، بے کس اور مجبور انساں
ظلم، تشدد، جبر، اذیت جھیل رہے ہیں
طاقت کے نشے میں آمر
خون کی ہولی کھیل رہے ہیں
کڑیل بیٹوں کی لاشوں پر
غم سے بوجھل بیٹھی جائیں
ہم سے پرسہ مانگ رہی ہیں

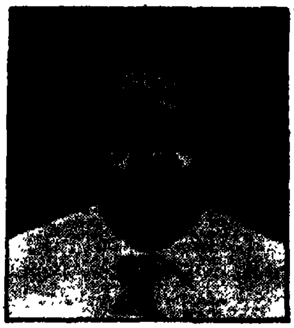
● B-117/13-D,Gulshan-e-
Iqbal - Karachi (Pak)

شاہین مفتی

کنارے تو نہیں ہیں ہم

کنارے تو نہیں ہیں ہم
مگر اک بحر خاموشی
ہمارے بیچ بہتا ہے
کبھی جب اجنبی جھونکے
وجودِ بحر کو چھو کر گزرتے ہیں
تو لگتا ہے
کسی نے گفتگو کی ہے
مگر ہم جان لیتے ہیں
ہواؤں کے تکلم کے کوئی معنی نہیں ہوتے
یہ بس گرداب بنتی ہیں
اور اس میں ڈوب جاتی ہیں

● پرنسپل: گورنمنٹ کالج برائے خواتین
جلال پور جٹاں، گجرات (پاکستان)



ریاض صدیقی

7-J, Block-6, P.E.C.H.Society Karachi-76400 (Pak.)

فیمنسٹ ادب کا مسئلہ

" ادب ، تاریخ ، تنقید ، علوم ، سائنس و ٹیکنالوجی ، کلچر ، سیاست اور اقتصادیات ہوں یا تعلیمی نصابات اور تحقیقی و فکری ادارے ، یہ سب ہی ہمیشہ مردوں ہی کی گرفت میں رہے ہیں ۔ میں نے جن اساتذہ اور نقادوں سے ادب سیکھا مرد تھے ۔ انہوں نے ورڈ سورتھ کا قول " جو کچھ بہترین سوچ اور تحریروں کی دین ہے ، وہی بہترین ادب ہے " ہم عورتوں کے ذہنوں میں ڈال دیا ۔ وہ جن تخلیقات کو عالمگیر ، اعلیٰ اور شاہکار بتاتے رہے وہ سب مردوں ہی کی تخلیقات ہیں ۔ اب جاکر ہماری سمجھ میں آیا کہ عورتوں کو ادب و تنقید کی تعلیم دینے والے مردوں کا رویہ کس قدر متصبانہ ہوتا ہے ۔ وہ جن تخلیقات اور متون کو عالمگیر اعلیٰ اور شاہکار بتاتے ہیں ادھوری ہیں کیونکہ اس میں ہم خواتین کہیں نظر ہی نہیں آتی ہیں ۔"

[ایلسا سسکن آسٹرائیکر Alica Suskin Ostraiker ۱۹۸۶ء]

*

یورپ کے ملکوں اور امریکہ میں خواتین اہل الرائے کے خاصے بڑے حلقے نے اپنی فیمنسٹ تنظیموں اور تحریکات کو مرد معاشرے سے علیحدہ کر کے ایک خود مختار شعبہ بنالیا تھا اور اس قسم کی بلند آہنگ آوازیں جو آسٹرائیکر کے زیر نظر اقتباس میں سنائی دیتی ہیں، ہر سُو گونجتی تھیں۔ ان سخت گیر اور انتہا پسند آوازوں کا شور ہمارے یہاں کی اردو قلمرو کے لئے تکلیف کا باعث ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ یہ خواتین جس اقتصادی و سیاسی اور کاروباری نظام کے تناظر میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتی ہیں وہاں کے نچلے اور متوسط طبقے کے مردوں کو بھی اسی قسم کے مسائل کا سامنا ہے، وہ بھی اتنا ہی مظلوم ہے۔ سرمایہ دارانہ کاروباری کلچر میں ڈھلی ہوئی آزاد عورتیں مردوں کا جی بھر کے استحصال کرتی ہیں۔ وہاں مونیکا اور جونز جیسی عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ فیمنسٹ تحریکات اس نظام کے خلاف مزاحمت کرتے رہنے کے باوجود آخر کار بری طرح ناکام ہوئیں اور ان کی تحریکات کے غباروں سے ہوا نکل گئی۔ ترقی پسند دانشوروں نے اسی وجہ سے عورتوں کی علیحدہ چلائی جانے والی ان تحریکات کی مخالفت کی تھی۔ یورپ اور امریکہ کی خواتین نے جن مسائل کی فہرست تیار کی تھی ان کی صداقت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر ان کا حتمی حل صرف اسی صورت میں ممکن ہو تا جب رائج سرمایہ دارانہ پدری نظام کو سرے سے ختم کر کے اس کی جگہ ایک اجتماعی جمہوری نظام لایا جاتا۔ اس موضوع پر فیمنسٹ تحریک کے مختلف دھڑے اختلاف اور کنفیوژن کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اصلاحات کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل ڈھونڈا۔ اجتماعی جمہوری نظام سے ان کے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ رائج سرمایہ دارانہ و کاروباری نظام نے ان تحریکات کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا اور خواتین کو محض وعدوں پر ٹرخاتے رہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دار قوتوں نے ان تحریکات کے اندر ایک اپنا دھڑا بھی بنادیا جو خواتین کو مادر پدر آزادی اور فحاشی کے سرمایہ دارانہ کلچر کی طرف راغب کرتا رہا اور سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

یہ تو بہت آگے کی باتیں ہیں اصل بات تو یہ ہے اردو قلمرو سے تعلق رکھنے والی عورتیں یہاں فیمنسٹ تحریک اور شعور سے زیادہ مانوس ہی نہیں ہیں اور نہ فیمنسٹ فکر و نظر کی کم و بیش سو سالہ تاریخ اور اس عرصے میں پیدا ہونے والے علمی و ادبی تاریخی و تنقیدی اور شعری سرمائے کا انہوں نے گہرا اور مکمل مطالعہ کیا ہے۔ ستر کی دہائی کے بعد جب بھولے بھٹکے دو ایک خواتین شاعرات نے عورت ذات کے جنسی مسائل، بدن کی فطری پکار، اور اندر جبر کی بھٹی میں سلگتے ہوئے جنوئین مسائل کو موضوع بنایا تو مرد معاشرے کو مذمت کرنا ہی تھی سو اس نے کی، اور خوب کی، مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فیشن پسند خواتین نے بھی ان پر اسی طرح تھو تھو کی۔ ان کی مخالفت تو ترقی پسند اہل الرائے نے بھی کی مگر اس بنیاد پر نہیں کہ ان کے یہ مسائل جنوئین نہیں تھے۔ وہ اپنی جگہ جنوئین تھے اور ہیں۔ ان کی مخالفت کی دو وجوہ تھیں اوّل کہ جنسی مسائل کے حل کا مسئلہ بھی اقتصادی و سیاسی اور سماجی نظام میں انقلاب برپا کرنے سے مشروط ہے چنانچہ ترجیح نظام کی تبدیلی کے موضوع کو دی جانی چاہیے جیسا کہ ساحر لدھیانوی کے یہاں نظر آتا ہے اور دوم کہ روٹی روزگار کی طرح

جنسی مسئلہ اس سطح کا سماجی مسئلہ نہیں ہے۔ جنسی محرومی اور فرسٹریشن سے موت واقع نہیں ہوتی ہے جبکہ روٹی روزی سے محرومی کا انجام موت ہوتی ہے۔ روٹی روزی از سر تا پا سماجی مسئلہ ہے جبکہ جنس بڑی حد تک ذاتی اور رازدارانہ مسئلہ ہے نہ کہ سماجی۔ ذاتی اور رازدارانہ حدود میں جنسی محرومی اور فرسٹریشن سے نجات حاصل کرنے کے راستے موجود ہیں جن کو بعض اہل الرائے غیر فطری قرار دیتے ہیں مگر بھوک سے نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے روٹی کا ملنا۔ روٹی کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ موجودہ دور میں بھی خواتین شاعرات کی اکثریت جنسی حسیت کے اظہار میں بہت زیادہ محتاط ہے۔ نئی جواں سال شاعرات کی فہرست میں اب رخسانہ نازی کا نام سننے میں آرہا ہے۔ جنہوں نے جنس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور سر منڈاتے ہی ان پر اولے بھی برسے اور وہ خاصی اسکینڈلائیز بھی ہوئیں مگر شاید وہ اپنے اس اسکینڈلائیزیشن ہی کو اپنی شہرت اور مقبولیت تصور کرتی ہیں اور اس صورت حال پر مطمئن بھی ہیں۔ ایک اور نئی جواں سال شاعرہ نزہت انیس کے یہاں بھی شعروں میں جنسی حسیت کی آنچ ہے مگر بہت ہی سلیقے کے ساتھ اپنے اجتماعی رویوں کے اعتبار سے بھی وہ رخسانہ نازی کے برعکس قدامت پسند ہیں۔ موجودہ دور کی پڑھی لکھی عورت کو جس حد تک بے باک، آزاد، حوصلہ مند اور مردوں کے ساتھ برابری اور بے تکلفی کو برتنا چاہئے وہ اس سے بہت دور ہیں۔ ایلیا سنگن کی آرا کے سخت گیر اور انتہا پسندانہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں تاریخی صداقت نہیں ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ معاشرے کے پدرسری نظام نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنی گرفت اور اپنے اختیار کو قائم رکھا ہے ان کی آرا ہوں یا فیمنسٹ فکر و نظر دونوں کا اطلاق اردو شعر و ادب اور سماج و ثقافت پر آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے تذکرہ نگاروں اور بعد کے ادبی مورخوں نے جو بھی سرمایہ یکجا کر کے مرتب کیا ہے اس میں خواتین تخلیق کاروں کا ماضی شامل نہیں ہے اگر خواتین کو کل آبادی کے تناسب میں دیکھئے تو امریکہ کے خواتین رسالے موٹیو (Motive) مطبوعہ ۱۹۶۹ء کا نعرہ کہ "اقتدار خواتین کو ملنا چاہئے کیونکہ وہ کل مرد آبادی میں نصف سے زیادہ ہیں" حق بہ جانب ہے اور امریکی و یورپی جمہوریت کے عین مطابق بھی ہے۔

مغرب میں فیمنسٹ تحریک جو مختلف اور متضاد دھاروں میں بٹی ہوئی ہے مثلاً جدید، بعد جدید، ترقی پسند یا مارکسی، سرمایہ دارانہ، نفسیاتی اور ساختیاتی وغیرہ اس نے اپنی ادبی تاریخ قلمبند کی ہے۔ ماضی کی خواتین لکھاریوں کا تمام کھویا ہوا اور نظر انداز کیا گیا سرمایہ یکجا کیا ہے اور درجنوں ایسی مستند کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ابتدائی زمانوں سے لے کر اب تک کی خواتین تخلیقات کے مطالعے شامل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ کیٹ چوپن (Kate Chopin) کی ناول "دی اویکننگ" ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی مگر ۱۹۶۸ء تک یہ پردۂ گمنامی میں رہی۔ ۱۹۶۹ء میں لوئی سیانا اسٹیٹ پریس نے اسے ستر سال گذرنے کے بعد شائع کیا اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ اب یونیورسٹیوں کے نصابات میں شامل ہے۔ فیمنسٹ تنقید، فکشن، شاعری اور نفسیات پر مستند کتابوں کی تعداد ہزاروں سے کہیں زیادہ ہے۔

اردو اور برصغیر کی زبانوں کے حوالے سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فیمنسٹ حسیت کی کوئی تاریخ سرے سے موجود نہیں ہے۔ قدیم ہندی، اردو اور علاقائی زبانوں کی شاعری میں فیمنسٹ حسیت کا رنگ خاصا گہرا ہے بلکہ اس میں تخاطب کا کردار بھی عورت ہی ادا کرتی ہے مگر اس حسیت کی ترجمانی عورتوں نے نہیں مرد شاعروں نے کی ہے۔ اس مجموعی المیئے سے قطع نظر اردو کی ادبی تاریخ میں بھی ایسے مرد اہل نظر مل جاتے ہیں جنہوں نے خواتین کے سچے اور چھپے جذبوں کی ترجمانی کی ہے۔ داستانوں اور لوک کہانیوں کا مطالعہ کیجئے تو نظر آتا ہے کہ جن عورتوں نے پدرسری سماج کے جبر اور ان کے اخلاقی نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خودکشی کی ہے اس کے پیچھے "آزادیٔ انتخاب" اور اپنی ذات کی خود مختاری ہی کا مطالبہ کار فرما تھا۔ پرانے وقتوں میں عدق کا تصور من تو شدی تو من شدم کا تھا یعنی اس منزل تک پہنچ جانا جہاں سے آزادی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اردو کے اکثر کلاسیکی شعرا نے عشق کی اسی تہذیب کو سربلند کیا ہے ؎

مقام عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ — جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی (قابل اجمیری)

شاہ عبداللطیف نے اپنی ایک داستان میں یہ تصور پیش کیا ہے کہ جب من تو شدی تو من شدی کی حالت ہی موجود نہ ہو تو محض نکاح کر لینے سے بھی ازدواجی رشتہ جائز نہیں ہوگا اور بہ صورت دیگر نکاح نہ ہونے کی صورت میں بھی ازدواجی رشتہ جائز ہوگا کیونکہ اصل مسئلہ سپردگی کے ساتھ ایک دوسرے کو قبول کرنا ہے اور جب یہ حالت پیدا ہو جائے تو رشتوں کے درمیان آزادی اور مساوات کی صورت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو میں فیمنسٹ شعور کی بہترین ترجمانی مرزا رسوا نے اپنی ناول امراؤ جان ادا میں کی ہے حالانکہ نہ وہ فیمنسٹ تحریک سے واقف تھے اور نہ علم نفسیات سے۔ اس مرد ناول نگار نے سماج کے ان ظالم رویوں کو بے نقاب کیا جو وہ عورتوں کے معاملے میں برتتا ہے اور حالات کا جبر ایک شریف عورت کو چادر اور چہار دیواری سے کھینچ کر اسے کوٹھے پر بٹھا دیتا ہے۔ موجودہ دور کے سرمایہ دارانہ اور کاروباری کلچر نے اس رویئے کو جدید تہذیب کا نام دے کر عورتوں کو مادر پدر آزادی کی طرف دھکیل دیا ہے بقول فیض ؎

حریفاں شمع محفل کو سر بازار لے آئے — کہ لیلائے وطن کے بیسوا ہونے کا وقت آیا

اور وہ کلچر جس کی نشاندہی بھی انہوں نے کی ہے ختم ہو گیا۔

جو چلے تو کوہ گراں تھے ہم جو رکے تو جاں سے گذر گئے   رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنادیا

امراؤ جان ادا سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں خواتین نہ صرف اعلیٰ شعری و ادبی ذوق رکھتی تھیں بلکہ شعر بھی خوب کہتی تھیں۔ حالی نے اپنی نظم "اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں" میں خواتین کے اعلیٰ منصب اور ان کے حقوق کا اعتراف کیا ہے حالانکہ ان کے محرک و سرپرست سر سید احمد خاں عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ اقبال نے بھی ان کے موقف ہی کی تائید کی ہے۔ نیاز فتح پوری نے ۱۹۱۹ء میں خواتین کے موضوع پر "گہوارۂ تمدن" کے نام سے پہلی کتاب لکھی تھی۔ فیمنسٹ نقادوں اور نظریہ سازوں کا ایک ہی لاٹھی سے تمام مردوں کو ہانکنا یقیناً غلط اندازِ نظر ہے۔ جبکہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

آسٹرائیکر نے اپنی کتاب "اسٹیلنگ دی لینگویج" (بیکن پریس بوسٹن ۱۹۸۶ء) میں نسوانی زبان، شعری لفظیات، متھ اور استعاروں کی جوت جگاتے ہوئے ان تمام اجزائے ترکیبی کو مردوں سے چھین لینے اور اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی ترغیب دی ہے۔ انہوں نے مردوں کی ادبی زبان پر بھی تنقید کی ہے۔ جس میں بہت کچھ صحیح بھی ہے اور کچھ غلط بھی ہے۔ ان کی اس بحث نے مغربی فیمنسٹ فکر و نظر کو ایک موضوع دے دیا۔ میگی ہیوم (Maggie Humm) نے بھی ۱۹۹۴ء میں اس موضوع کا احاطہ اپنی کتاب "کانٹمپریری فیمنسٹ کرٹسزم" (ہاویسٹر وہیٹ شیف لندن) میں کیا ہے۔ ورجینا ولف کے یہاں بھی یہ سوال دکھائی دیتا ہے۔ اس بحث کی بھی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے کیونکہ عورتیں اگر اپنی زبان اور اپنے محاوروں میں لکھیں بھی تو مرد نقاد ان کو منع نہیں کریں گے۔ اردو میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد ہی کو لے لیجئے، انہوں نے بھی عورتوں کی زبان لکھی ہے۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، اور کئی دوسری خواتین اردو لکھاریوں نے بھی نسوانی زبان استعمال کی ہے۔ دراصل طرز بیان، طرز بیان ہوتا ہے اسے مردوں اور عورتوں کے خانوں میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر ماضی میں مرد لکھاریوں نے زبانوں، لفظوں، متھ اور استعاروں وغیرہ کو عورتوں کے مفاد میں استعمال نہیں کیا اور عورتیں اب ان کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتی ہیں تو کریں اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد یہاں کی خواتین اہل نظر کا جھکاؤ خارجی سطح پر روایتی اخلاقیات ہی کی طرف رہا۔ چند جدیدیت پسند شاعرات کے یہاں جنسی گھٹن اور محرومی کے خلاف جو ردعمل رونما بھی ہوا اس کے پیچھے مغرب کے سرمایہ دارانہ کلچر کا سیکس رجحان کارفرما تھا، اس کلچر نے جمہوری آزادی کا جو تصور دیا ہے اس کے اثرات ان شاعرات پر مرتب ہوئے۔ اس کلچر اور آزادی میں حسن اور عشق فکرِ دو عالم سے آزاد منڈی کا مال ہوتے ہیں، ان کو خریدا بھی جاسکتا ہے، بدلا بھی جاسکتا ہے، سیکنڈ ہینڈ مال کی طرح دوبارہ بھی بیچا جاسکتا ہے اور ردّی ہو جانے کے بعد اسے پھینکا بھی جاسکتا ہے۔ کشور ناہید، سعیدہ گذدر اور اسی قبیلے کی خواتین شاعرات کے یہاں فیمنسٹ شعور کا اظہار سلیقے سے ہوا ہے مگر ان میں سے کسی نے کوئی فیمنسٹ مومنٹ یا تنظیم نہیں پیدا کی کیونکہ ان کا جھکاؤ ترقی پسند فکر و نظر کی طرف رہا جو مرد اور عورت کی طبقاتی تقسیم اور علیحدہ درجہ بندی کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اس قسم کی حد بندی کی بھی نہیں جاسکتی ہے، کیونکہ عورت اور مرد کا تعلق لازم و ملزوم ہوتا ہے۔ پاکستان میں تو اب تک فیمنسٹ مکتبہ فکر اور اس کی تنظیمیں قائم ہی نہیں ہوئی ہیں حالانکہ ہندوستان، جنوبی امریکہ، افریقی ممالک، مصر اور فلسطین میں یہ تحریکات خاصی نمایاں رہیں اور انہوں نے تحریک کو بعد نو آبادیاتی سامراجیت کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بھی بنایا۔ ہندوستان میں ورزن شیوا، میدھا پاٹکر، سشی تا، الکاشی گنگولی ٹھکرال، جیو موتری دیوی، مہاسوت اور ارن دھتی رائے نے مزاحمتی شعور کے دھارے کو خاصا تیز کیا ہے۔ اس منظر نامے کے برعکس جب ہم پاکستان کی آزاد خیال اور سنجیدہ فکر کا اظہار کرنے والی خواتین کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نامساعد فضا اور اس کے خوف کی وجہ سے انہوں نے پیچھے کی طرف سفر شروع کر دیا ہے۔ ان کے یہاں عجیب تضاد یہ ہے کہ ہماری روایت اور اخلاقیات کے جو بہترین پہلو ہیں ان کو تو ان خواتین نے ترک کر دیا ہے اور مغرب کے سرمایہ دارانہ کلچر کی جدیدیت کو ترقی یافتہ ہونے کا معیار سمجھ کر قبول کر لیا ہے مگر جب وہ اجتماع سے رابطے میں آتی ہیں تو اپنے عمل کے ذریعے روایت و اخلاقیات کے پرانے اور بے جان رجحانات کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم سماج میں چلنے والی گلتی سڑتی ہوئی قدروں کو واقعی ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا بلکہ جن رجحانات اور نظریات کو ہم پیش کر رہے ہیں ان پر عمل کر کے بھی دکھانا ہوگا۔ بے عملی اور خوف کا رویہ تو ہمیں اس انتہا پر بھی لاسکتا ہے جہاں اس وقت افغانستان کی عورتیں آگئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پردہ داری کا یہ تصور قطعی غیر اسلامی ہے۔ برقعہ دار پردہ اسلام کا نہیں قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرے کا لازمی جز ہے۔ اسلام نے پردے کا جو تصور دیا ہے اور جس کے مظاہر ظہور اسلام کے بعد ملوکیت کے قیام سے پہلے تک موجود تھے۔ عورتوں کی آزادی اور مساوات کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھا اور سماجی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھیں حتیٰ کہ حضرت خدیجہ باقاعدہ تجارت کرتی تھیں۔ عورتیں اگر مردوں کے ساتھ مساوی سطح پر کوئی رابطہ رکھتی ہیں یا کسی منتخب شخص کو اپنا دوست سمجھتی ہیں اور اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرتی ہیں تو اس میں اعتراض کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس قسم کے دوستانہ روابط اور موجودہ سرمایہ دارانہ کلچر کے تصور گرل فرینڈ شپ میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ دوستی کا یہ کون سا انداز ہے کہ "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور

سبھی گویا انسان کا فطری جذبہ محبت بھی ایک کاروبار ہے۔ اس حوالے سے اردو کے ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی کی شاعری دورِ حاضر کی مغرب نواز نسل کے لئے ایک نمونہ ہے بشرطیکہ جواں سال اس کے اصل مقاصد کا ادراک کریں۔

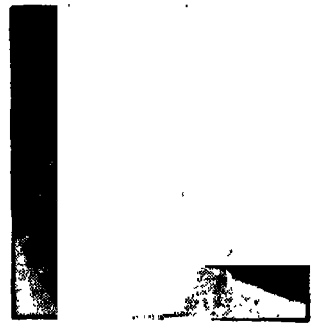
ترقی پسند فیمنزم مرد اور عورت کے درمیان فرق نہیں کرتی ہے، مگر وہ مغرب کے بالائی کلچر کو جو سرمایہ دارانہ جمہوریت واقتصادیات اور کاروباریت وسیاست کی بنیادی ضرورت ہوتا ہے، رد کرتی ہے۔ اس مکتبۂ فکر نے نہ صرف مغرب کی خواتین کے ایک حلقے میں جاگرتی پیدا کی بلکہ ان کے انداز نظر کو بھی بدلا ہے۔ اس قبیل کی خواتین اپنی حسی، خود مختار اور حیاتی وجود پر مرد کی یک طرفہ اجارہ داری کو تسلیم نہیں کرتی ہیں اور ان سے توقع رکھتی ہیں کہ انہیں محض لذت و مسرت کشید کرنے کے لئے بطور معروض استعمال نہ کیا جائے۔ ان کے نقطۂ نظر کی رو سے یہ شعر اور اس قسم کے رجحانات صحیح نہیں ہو سکتے کہ۔

یہ کیا کہ ایک طور ہی گذرے تمام عمر　　جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو　(ناصر کاظمی)

اس قسم کا تاثر اگر کوئی خاتون شاعرہ پیش کردے تو اس کے خلاف قیامت برپا ہو جائے گی۔ فرانس کی معروف فیمنسٹ ہیلن سی زس (Helene Cixous) نے اپنی کتاب "نیو فرنچ فیمنزم" (شوکن بکس نیویارک ۱۹۸۸ء) میں لکھا ہے کہ "(Logocentric) نظام فلسفہ اور ورلڈ آرڈر کے منصوبوں کو مالی تعاون اس لئے فراہم کیا جاتا ہے کہ مرد جنسیت اور مرد مرکز یعنی پدرسری سماج کو تازہ خون ملتا رہے۔" بقول فیمنسٹوں کے مردانہ عضو کو طاقت و ہیبت کا ایسا استعارہ بنا دیا گیا ہے جو فتح حاصل کرنے کا بھی اختیار رکھتا ہے اور سزا دینے کا بھی۔ عضو مرکز تھیوری اسی نقطۂ نظر کو تقویت دیتی ہے جسے اصطلاح میں (Phallocentricism) کہتے ہیں۔ فیمنزم کو مکمل طور پر رد کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تحریک کے تانے بانے میں خواتین کا وہ حلقہ بھی شامل رہا ہے جس نے مغرب زدگی، فیشن پرستی، مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے آرائش و زیبائش کا خصوصی اہتمام اور مادر پدر آزاد طرز زندگی کے سرمایہ دارانہ کلچر کے خلاف رائے عامہ ہموار کی ہے۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے پڑھا لکھا بالائی اور متوسط طبقہ اسی کلچر کے رنگارنگ مظاہر کو جدیدیت اور ترقی کا نمونہ سمجھتا ہے۔ ہمارا الکٹرانی اور پرنٹ میڈیا اس کلچر کے منظرنامے کو برسرِ عام لانے میں پیش پیش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دس سالوں کے دوران شعری و ادبی لسانی و تہذیبی اور تاریخی و سماجی نظام کا قوامی ڈھانچہ ہی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہے اور اس کی جگہ انگریزی زبان، مغرب کے سرمایہ دارانہ فحش و بے لگام کلچر، اس کے شو بزنس، رقص اور اس کی موسیقی نے پر کیا ہے۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ وہ اہلِ نظر جن کی پہنچ الکٹرانی اور پرنٹ میڈیا تک ہے اس کی ترغیبات پر تنقید نہیں کرتے ہیں۔ فیمنسٹ تحریک کے ترقی پسند دھڑوں نے کم سے کم اس صورت حال کے خلاف مزاحمتی شعور تو پیدا کیا۔ اس قبیل کی خواتین کے لہجے میں یقیناً تکراؤ (Violence) اور جارحیت کا رجحان نظر آتا ہے لیکن یہ ان کی مجبوری ہے۔

ہماری خواتین کو اس حوالے سے باربرا اشمر مان کے مقالے "بیوٹی، ڈیماکریسی اینڈ دی متھ" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے جو اس کی کتاب (مطبوعہ پولی پریس ۱۹۸۷ء) میں شامل ہے۔ اس نے دنیا بھر کے مردوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ خواتین پر حیاتیاتی بلکہ (Ovarian) تھیوری کا اطلاق کرتے ہیں جو تاریخی اور بشریاتی حوالوں کے علاوہ سائنسی حوالوں سے بھی غلط ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ سائنس و ٹیکنالوجی کی تحقیقات اور ان کے نتائج کی تعبیر و تشریح کا اختیار ہمیشہ مردوں ہی کے پاس رہا ہے اس لئے انہوں نے حقائق و نتائج کی تعبیر و تشریح میں بھی مرد سماج کے مفادات کو ترجیح دی ہے۔ حکمراں اور مراعات یافتہ طبقے نے بھی پدری معاشرے کو دفاعی حصار فراہم کرنے کے لئے ان ہی نظریات کو اچھالا اور اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ خواتین کے لئے یہ مسئلہ ہمہ وقت موجود ہے کہ (What is your excuse)۔ شمر مان نے مجموعی صورت حال کو مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوری روایات کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ جمہوریت ہی نے نیو ورلڈ آرڈر کا عقیدہ وضع کیا ہے جسے جے سی بروک (J.C.Brook) نے مغربی بنیاد پرستی کہا ہے اور انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (IMF) انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ ازم سے منسوب کیا ہے۔ (نیو اسٹیٹسمین اینڈ سوسائٹی نیویارک ۲۹ نومبر ۱۹۹۳ء)۔ اس نظام میں بقول مصنفہ کوئی عورت باوقار اور آزاد و شریفانہ زندگی گذار ہی نہیں سکتی ہے۔ کتنی ہی حساس خواتین نے اس جبر کا علاج خودکشی کر کے کیا۔ اس نے مارلین منرو (Marline Manero) اور سلویا پلاتھ (Salyia Plath) کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ منرو کی معاصر اداکار ڈزنے اپنی ذات کے حوالے سے لکھا کہ "خوش گوار اور دائمی گھریلو زندگی گذارنے کے لئے میں اپنا کیریر چھوڑنے کو تیار ہوں۔ اس خواہش اور کھوج میں اپنی پوری زندگی گنوا دی کہ کوئی باوفا دوست یا ساتھی مل جائے جس سے محبت کی جائے اور وہ بھی جواب میں محبت دے، جس کے لئے کھانا پکایا جائے، گھر بنایا جائے اسے سنوارا جائے کیونکہ وہ ہر روز اور ہر لمحہ میرا ہوگا مگر ایسا کوئی مرد مجھے نہیں ملا۔ میرا جو سیکسی امیج بنایا گیا اس کی وجہ سے یہ تاثر عام ہوا کہ یہی میری نجی زندگی بھی ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ ایسا نہیں ہے۔ میری ذاتی زندگی بالکل مختلف اور سادہ محدود اور تنہا ہے۔ میں بے حد شرمیلی ہوں اور میرا رہن سہن دیہاتی لڑکیوں جیسا ہے۔" شمر مان نے بیٹی فرائیڈن کی کتاب دی فیمنسٹ مسٹک (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) پر بھی سخت تنقید کی ہے جس نے مغرب کی خواتین کو راستے سے بھٹکا کر آوارہ خرامی اور بے راہ روی کی سمت میں موڑ دیا۔ وہ خواتین جو آزادی اور عشق کی اقدار کو تو مسترد نہیں

[باقی صفحہ ۲۹ پر]



شبنم شکیل

سامنے اِک بے رحم حقیقت ننگی ہو کر ناچتی ہے
اُس کی آنکھوں سے اب میری موت کی خواہش جھانکتی ہے

جسم کا جادو اس دنیا میں سر چڑھ کر جب بولتا ہے
روح مری شرمندہ ہو کر اپنا چہرہ ڈھانپتی ہے

اُس کی جھولی میں سب کھوٹے سکّے ڈالے جائیں گے
جانتی ہے یہ اندھی بھکارن پھر بھی دن بھر مانگتی ہے

میرا خون پیا تو اُس کو تازہ لہُو کی چاٹ لگی
اب وہ ناگن اپنی زباں سے اپنا لہو بھی چاٹتی ہے

اب کی بار اسے بُزدل قسمت کھل کر میرے سامنے آ
کیوں اک دھچکا روز لگا کر باقی کل پر ٹالتی ہے

ماضی کی تربت سے نکل آتی ہے کسی کی یاد کی لاش
میری سوچ مری دشمن ہے روز مصیبت ڈالتی ہے

صحرا کا بادل دو بوندیں برسا کر اُڑ جاتا ہے
پیاسی، بنجر، بانجھ زمیں کچھ اور زیادہ ہانپتی ہے

اب تک سوئی ہوئی تھی وہ آسائش کے گہوارے میں
انگڑائی سی لے کر شبنم آج اتنا کیوں جاگتی ہے

● مکان 9، اسٹریٹ 2، ایف 7/3
اسلام آباد (پاکستان)



بلقیس ظفیر الحسن

کھو گیا جو، اس کی دھن میں جان تو کھوئی نہیں
ہاں مگر جو زندگی ہوتی تھی اب ہوتی نہیں

پھول پھل سب دوسروں کے نام، خالی ہاتھ ہم!
اس زمیں میں اب کوئی محنت ہمیں بوئی نہیں

صبح ہونے تک ستاروں سے دیئے لے کر چلیں
تیرگی میں بیٹھ کر یہ رات اب کھوئی نہیں

آنسوؤں میں ڈوب کر اُبھرے تو نکھرے اور ہم
دل کی جو حالت ہو، اپنی شکل تو روئی نہیں

بس یہی نا! اپنے اندر گھٹ کے مر جائیں گے ہم
اس کے آگے رکھ کے کوئی بات اب کھوئی نہیں

ایک ہی جھٹکے میں ہو جائے نہ بالکل تار تار
اپنی چادر ہے تو میلی ہی، مگر دھوئی نہیں

شل ہوئے بلقیس کاندھے زندگی کے بوجھ سے
ہم کہاں پھینکیں اسے، یہ لاش اب ڈھوئی نہیں

● H-2-B-6، پوساپارٹمنٹ، سیکٹر-15،
روہنی- نئی دہلی 110085

رشیدہ عیاں

جھانک کر مجھ میں یہ دلداری سے دیکھا کس نے
ہیں مری ذات میں تنہائی کے صحرا کتنے

اشک آنکھوں سے جو ٹپکا وہ لہو رنگ سا تھا
زخمِ دل آج مرے ہو گئے رسوا کتنے

چھوڑ جاتے ہیں وہ نم ریت پہ لہروں کے نشاں
راستے خود ہی بدل لیتے ہیں دریا کتنے

تیری دزدیدہ نگاہی نے جو بخشا تھا وہ زخم
مندمل ہو نہ سکا، آئے مسیحا کتنے

ہم وہ پیراک، تھکے اور نہ کبھی غرق ہوئے
حادثوں کے تھے بچھے راہ میں دریا کتنے

نئی منزل کی طرف اڑنے لگے جب سے طیور
گھر کے گنجان شجر ہو گئے تنہا کتنے

خلوتِ دل سے وہ اک بار پکارے تو مجھے
شوق میں اپنے سنواروں گی سراپا کتنے

● 88-GLENRIDGE AVE, GLEN RIDGE,
NEW JERSEY - 07028 (USA)



عذرا پروین

شرعی سرکس

کل تک
ضرور مجھے یقین تھا کہ
بہر حال قاضی کی مدد سے
ایک شرعی
اور انتہائی محفوظ ترین لو اسٹوری
شروع کی جاسکتی ہے
اور میرے اس یقین نے آخر مجھے
میری زندگی کے سب سے بڑے ایڈوینچر سے دوچار کردیا
اور آج
اک خطرناک رسّی پر نٹنی کی طرح چلتے چلتے
میں گا رہی ہوں
یارب! یہ شرعی عشق تو سچ مچ
اک سرکس کی طرح ہے
جس میں دو جسم چاہے ان چاہے
نام نہاد "وفا" کی رسّی پر
سرکسانہ مشاقی سے چلتے آرہے ہیں
صدیوں سے
اور اب خوابوں میں بھی ہنسنے کے سب رستے
اک قاضی بند کرکے چلا گیا ہے!

● پوسٹ بکس نمبر 32، ہیڈ پوسٹ آفس،
چوک، لکھنؤ۔ ۳



منصورہ احمد

مختصر نظمیں

مرے مالک!

مرے مالک!
تجھے تو علم ہی ہوگا
جو بچپن سے بڑھاپے میں چلے جاتے ہیں
ان سب کی جوانی کون جیتا ہے؟

نظمیں رستہ بھول گئی ہیں

نظمیں رستہ بھول گئی ہیں
جیسے چڑیا
بھولے سے کمرے میں آئے
اور باہر کی راہ نہ پاکر
چونچ کو شیشوں سے ٹکرائے

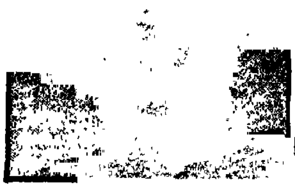
یہی سب کچھ تو ہونا تھا

یہی سب کچھ تو ہونا تھا
بھنور بے بادباں کشتی میں طے ہونے لگیں
تو ڈوبنا مقسوم ہوتا ہے

بے موسم

آج مسکرائی تو میں خود کو اجنبی لگی
جیسے دوشِ سنگ پر
خزاں کی سرد گود میں
کھل اٹھی ہو اک کلی

● A-45، مزنگ روڈ، لاہور (پاکستان)



شہناز نبی

ایکو سسٹم

سر پہ آنچل رکھتے
بدن چراتے
نگاہیں جھکاتے
ہنسی کو سینے میں گھونٹتے
عمر کا ایک بیش قیمت حصہ کھونے ہی والا تھا کہ
میں نے بون سائی ہونے سے انکار کردیا
مجھے چند مخصوص فارمولوں کے تحت
ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ ایبل بنانے کی
ناکام کوششیں کی گئیں
میں نے مجھ کو گھیرنے والے سارے سانچے
توڑ پھوڑ ڈالے
مٹی بکھر دی
ڈرائنگ روم کی تہذیب سے پہلا انکار
مجھے راس آیا ہے یا نہیں
میں نہیں جانتی
میں تو بس اتنا جانتی ہوں
کہ زمین کے کشادہ سینے میں
میری جڑیں دور تک اتر گئی ہیں
میری شاخیں فصیلوں کے باہر پھیل گئی ہیں
چاہو تو تراشو، قلم بناؤ
جابجا لگاؤ
زمیں کی بقا کے لئے شجرکاری کی مہم تیز کرو۔

● A-78، [illegible] کلکتہ-700016 (مغربی بنگال)



شکیلہ رفیق

1 Velma Dr. Toronto-Ont M8Z-2N2 Canada

شریف + مرد = ؟

بات صرف اتنی سی ہے کہ میرا دوست گلزار کئی روز سے مجھ سے ایک ہی سوال کئے جا رہا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں ابھی تک اسے کوئی جواب نہیں دے پایا ہوں، اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے ۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہیں ؟ اگر ہاں ـــــ تو پھر میں آپ کو اس کی کہانی سنا سکتا ہوں ۔

بات شروع اس دن سے ہوتی ہے ۔ جب اس پہلے روز، وہ یہ سمجھا کہ اس نے غلطی سے جنت میں قدم رکھ دیا ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درحقیقت ایسا تھا نہیں ـــــ دراصل وہ ڈیفنس سوسائٹی کا ایک بہت بڑا اور خوبصورت بنگلہ تھا جہاں پاؤں دھرتے ہوئے اک ساعت کے لئے اسے شبہ سا ہوا تھا کہ وہ غلطی سے کہیں جنت میں تو نہیں آ گیا ؟

ظاہر ہے اورنگی ٹاؤن کی جھونپڑی میں رہنے والے ایک مفلوک الحال شخص کو اگر ایسا شبہ ہو بھی جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں

پھر جب اس کی ملاقات اپنے مالکان سے ہوئی تھی اس بنگلے کے جنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ ـــــ وہ دونوں جنت کے حور و غلماں سے کسی طور کم جو نہ تھے ، ۔ ۔ ۔ مسز نزہت ، نے اس سے پوچھا تھا

"کیا تم جانتے ہو کہ اس ملازمت کے لئے میں نے تمہیں کیوں منتخب کیا ہے ؟ جب کہ تمہارے علاوہ نو افراد اور بھی انٹرویو کے لئے آئے تھے ؟" ـــــ

"نہیں جی !"

"صرف اس لئے کہ تم شکل صورت سے ایک ذمہ دار آدمی نظر آئے اور ساتھ ہی شریف بھی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ان ہی دو خوبیوں کی تلاش تھی ۔"

"مہربانی جی !"

"کام تمہارے لئے بہت زیادہ نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری ذمہ داری صرف بقیہ ملازمین کی نگرانی کرنا ہے ۔"

"نہیں جی ؟"

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نگاہیں اوپر کیں

"میرا مطلب یہ ہے کہ تمہاری حیثیت اس گھر میں ایک سپروائزر کی سی ہو گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دراصل ہم دونوں مصروف بہت رہتے ہیں"

انہوں نے صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ جو یوں تائیداً سر ہلا رہے تھے جیسے تردید کی تو کافر ہو جائیں گے ۔

"اور ہم لوگوں کی اس مصروفیت کا یہ سارے ملازم ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ ۔ سب کے سب کام چور اور کاہل ہو گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک ایسا شخص یہاں موجود رہے جو ان کے فرائض کی کڑی نگرانی کر سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ ہر کام مکمل اور بروقت ہو اور صحیح طور پر انجام پا سکے"

"سمجھ گئے نا ؟"

"ہاں جی"

اس نے جواب تو دے دیا تھا جب کہ وہ اب بھی کچھ نہ سمجھ سکا تھا پھر جب ، ۔ ۔ ۔ اس نے دو چار روز وہاں گزار لئے تب ۔ ۔ ۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ دراصل خانساماں سے لے کر مالی تک سب ہی اپنے کام میں حد درجہ لاپروا اور غیر ذمہ دار تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی بنیادی وجہ گلزار کی سمجھ میں ایک ہی آئی تھی یعنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں مالکان کی گھر سے دن بھر کے لئے غیر حاضری ۔ ۔ ۔ بہرحال ! اب ان سب کو "حلال" کھلانا اس کی ذمہ داری بنا دی گئی تھی اور ، ۔ ۔ ۔ ۔ اسے تو یہ کام قطعاً دشوار محسوس نہ ہوا ، ۔ ۔ ۔ بقول بیگم صاحبہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سر انجام دے رہا تھا ۔

اورنگی ٹاؤن کی جس جھونپڑی میں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہا کرتا تھا ، اس کے گرد کانٹوں کی باڑھ کھنچی ہوئی تھی ۔ اس نے کئی جگہ کام کیا ، بہتر نوکری کی تلاش کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی تھی اور اب وہ بی ۔ اے کے آخری سال کی تیاری کر رہا تھا کہ یہ ملازمت مل گئی ۔ جو اس کے لئے

کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔

والدین نے تو جانے کس خیال کے تحت اس کا نام گلزار رکھا ہوگا مگر اپنی راہ حیات کی ہر ڈگر اور راہ پر اسے اپنی جھونپڑی کے گرد کھنچی کانٹوں کی باڑھ کی مانند ہمیشہ خار ہی خار نظر آتے رہے تھے پر اب، اس ملازمت کے حصول کے بعد یوں محسوس ہونے لگا کہ چند پھول بھی راہ میں کھل گئے ہیں۔

اس کی مالکن، یعنی مسز ندرت، جس کے چہرے پہ گلاب کھلے رہتے تھے اور جس کے کسے ہوئے بدن پر تنگ اور ڈھیلے دونوں طرح کے لباس سجتے تھے، جو بڑی خوش خلق و خوش اندام ہونے کے ساتھ مہربان بھی تھی۔ بلکہ اس پر تو کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔۔ مالک بھی آج کل کی زبان میں اسمارٹ بندہ تھا — ان دونوں میں بنتی بھی خوب تھی — بیگم صاحبہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتی تھی اور ان کی اس غیر حاضری میں ملازمت قسم کی کوئی چیز حائل نہ تھی بلکہ ان کے مشاغل کچھ اور تھے مثلاً — ایک کلب کی ممبر تھیں، ایک انجمن کی صدر، کسی فورم سے بھی تعلق تھا علاوہ ازیں دیگر سماجی تقریبات میں بھی شرکت کرتی رہتی تھیں۔

شاید یہی اسباب تھے جو انہیں ایک ایسے مددگار کی ضرورت محسوس ہوئی، جو کچھ پڑھا لکھا بھی ہو اور ساتھ ہی دیگر کاموں کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔"

وہ غالباً ان کے معیار پر پورا اترا تھا، غالباً بلکہ یقیناً وہی — بقول مسز ندرت یہ ملازمت قبول کر کے اس نے ان کا بہت بڑا بوجھ کم کر دیا تھا وہ اس کا بے حد خیال رکھتی تھیں، اسے ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ جب چاہے فریج سے کچھ بھی نکال کر کھا لیتا تھا — ٹی۔ وی۔ وی سی آر بھی دیکھنے کی اجازت تھی بلکہ ٹی وی تو وہ بیشتر ان لوگوں کے ساتھ ہی دیکھتا تھا اسے گھر کے ہر کمرے میں آنے جانے کی اجازت تھی، غرض یہ کہ وہ خود کو ملازم تصور ہی نہ کرتا تھا یعنی اسے محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ، وہاں ملازم ہے۔

ابتدائی چند روز تو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے اور کام ترتیب دینے میں گزر گئے، لہٰذا اس کا دھیان کسی اور جانب گیا ہی نہیں مگر، چند روز بیت گئے تب، یوں محسوس ہوا جیسے وہ کام کی بجائے مالکن کی خدمت خود کرنے لگا ہے۔

پھر کچھ روز اور گزر گئے

اب وہ کبھی کبھی نظر بچا کر انہیں دیکھ بھی لیا کرتا تھا —

اول تو وہ چیز بھی دیکھنے کی تھیں، دوئم ان کے انداز — پھر یوں ہونے لگا کہ وہ نظر بچا کر نہیں نظر چرا کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ — تمام ملازمین کی گھر میں موجودگی سے بے پروا، سارا وقت بغیر دوپٹے ہی کے گھوما کرتیں — سلیولیس اور بلاؤز میں آستینیں عموماً غائب ہوتیں، گلے اتنے نیچے اور بڑے ہوتے کہ آزمائش کے سارے مراحل ایک ساتھ ہی سامنے آجاتے — البتہ ان کے رات کے لباس میں آستینیں ہوتی تھیں مگر — وہ اتنا باریک ہوتا تھا کہ ۔۔ ۔ ادھر کی کسر ادھر نکل جاتی تھی — بعد ازیں یوں ہونے لگا کہ اب وہ بس انھیں دیکھے ہی جاتا، نہ نظر بچا کر، نہ چرا کر بلکہ جما کر۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ ساری آزمائش گلزار کی ہی کیوں تھیں —

بات اصل میں یہ ہے کہ اس کے امتحانی پرچے یوں زیادہ تھے کہ اسے بیگم صاحبہ کی حاضری میں اس وقت تک رہنا ہوتا تھا جب تک وہ نیند کے مرحلے میں داخل نہ ہو جاتیں، جب کہ، بقیہ ملازم رات کے کھانے کے بعد فارغ ہو جاتے تھے۔

اس طرح صبح آنکھ کھلنے سے لیکر رات سونے کے وقت تک اس کی نگاہوں کے سامنے وہ گلاب چہرہ اور ترشا ہوا جسم رہتا تھا۔ جسے شاید "سامنے والے" کے بشر ہونے کا احساس ہی نہ تھا اور جس پر اسے اب ایک بے جان مجسمے کا گمان ہونے لگا تھا پر وہ خود تو مجسمہ نہ تھا! وہ شریف آدمی جس کا جی اب کبھی کبھی یہ بھی چاہنے لگا تھا کہ انھیں چھو کر تو دیکھے

مسز ندرت کا روزانہ کا تقریباً ایک ہی معمول تھا — صبح کے دس بجتے ہی وہ گلزار کو آواز دیتیں — وہ کمرے میں پہنچتا، انتہائی قیمتی لباس میں ملبوس، جس کی قمیض کی آستینیں حسب معمول غائب ہوتیں اور گہرے گلے کے ساتھ کوئی قیمتی زنجیر یا لاکٹ جھول رہا ہوتا۔ خوشبو کے جھونکے اتنے تیز ہوتے کہ اس کا پورا وجود لپیٹ میں لے لیتے مگر وہ اس سب سے بے نیاز بڑے اطمینان سے اس سے کہتیں۔

"دیکھو گلزار! میں ذرا کلب تک جا رہی ہوں، وہاں جلسہ ہے۔۔۔۔ واپس آؤں تو، کام معمول کے مطابق اور درست ہونا چاہیئے"

"بہت بہتر"

اس کا بھی روزانہ ایک ہی جواب ہوتا — کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اسے ہدایت دیتے دیتے اچانک ہی جھک کر قالین کا کونہ ٹھیک کرنے لگتیں یا کوئی اور ایسا ہی کام اور وہ لمحہ — اس کے ایمان کی مضبوطی کا امتحان کا سب سے کڑا پرچہ ہوتا، ناقابل عمل خواہش، کرنٹ بن کر انگلیوں کی پوروں تک میں سرایت کر جاتی، تب اس کا جی چاہتا کہ وہ اس پرچے کو حل کرنے کے بجائے ان کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کرے مگر۔۔۔۔۔

ایک شریف ملازم سرعت سے نگاہیں جھکانے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟

مسز ندرت! جنھیں اب اس کا دل، مالکن سمجھنے اور ملازم کی نظر سے دیکھنے کا روادار ہی نہ تھا۔ خواہش — اب اتنی شدت اختیار کر گئی تھی

کہ، تنہائی میں اپنے اس فعل ناکردہ پر وہ باقاعدہ توبہ کرتا مگر، جب وہ سامنے ہوتیں تھیں تب، ان کی کوئی مخصوص ادا یا حرکت اس توبہ کو توڑ ڈالنے پر مصر ہوتی، مگر..... مگر اس کے اختیار میں تھا کیا؟ وہ کی جبریہ نگاہیں جھکا لینے کا اک اقدام ——— اور بس!

وہ ——— ان امتحانی پرچوں میں ناکام ہونے ہی والا تھا کہ شاید..... قدرت کو اس پر رحم آگیا اب، بیگم صاحبہ، بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزارنے لگی تھیں ——— کچھ کام ہوتا تو گھنٹی بجا کر اسے بلا لیتیں ——— چند روز گزرے تو صاحب نے اسے بتایا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ ان کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتے ——— مالک نے اسے گنوار یا نادان سمجھ کر بات ڈھکے چھپے انداز میں کہی تھی مگر...... وہ "نادان" جان گیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہیں...... اس کے لئے یہ خبر بہر حال اس لحاظ سے خوش کن تھی کہ اب مالکن کے قیامت خیز وجود کا سامنا پہلے کی نسبت کم ہوگا۔

اور، ہوا بھی یہی، کبھی سامنا ہوتا بھی تو یوں کہ وہ چادر لپیٹے بستر پر دراز ہوتیں اور وہیں سے احکامات جاری کیا کرتیں۔ دن اچھے ہو گئے تھے اور راتیں شانت۔

"کل میں نے ایک میگزین میں پڑھا ہے کہ بریسٹ کینسر ان خواتین کو ہو جاتا ہے جو اپنے بچوں کو فیڈ ——— نہیں کرتیں۔ اللہ! سرفراز: یہ پڑھ کر مجھے اتنا ڈر لگا، میں تو اپنے بچے کو خود ہی فیڈ کروں گی"

رات سونے سے قبل وہ بیگم صاحبہ کو گرم دودھ کا گلاس دینے جا رہا تھا کہ اک روز اس کے کان میں مکالمہ اترا ——— اسے دل ہی دل میں ہنسی آگئی۔ موت کیسی ظالم شئے ہے بڑوں بڑوں کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب ——— یہ بچے کی محبت نہیں بول رہی، اپنی زندگی کی فکر بول رہی ہے بہر حال! ہنسی کو ہونٹوں میں داب کر دودھ کا گلاس ان کے سرہانے رکھ کر وہ اپنے کوارٹر میں واپس آگیا ———

پر ——— لگو کے یہ مختصر دن بہت جلد بیت گئے۔ اب، بیگم صاحبہ ایک خوبصورت بیٹے کی ماں بن گئی تھیں اس کے ساتھ ہی اس کی تنخواہ میں دو سو روپے کا اضافہ بھی ہو گیا تھا کہ کام جو بڑھ گیا تھا۔

مگر ——— تنخواہ میں اس بھاری اضافے کی بجائے وہ بجائے خوش ہونے کے بچوں کی طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔

آپ جانتے ہیں کیوں؟

کیونکہ یہ دو سو روپے اس کے لئے دو سو دکھتے ہوئے انگارے ثابت ہونے والے تھے کہ۔ بیگم صاحبہ اب پہلے سے کہیں زیادہ بے حس ہو چکی تھیں ——— انھوں نے میگزین میں جو کچھ پڑھا تھا اب، پوری طرح اس پر عمل پیرا تھیں ——— یوں اب اس کے لئے تو امتحان کی بار دوبارہ کھل گئی تھی اور وہ، ان میں ایک ایک کر کے گزرتے ہوئے اپنی ہمت پست ہوتی محسوس کر رہا تھا کیوں کہ اب وہ اسے اس وقت بھی آواز دے لیتی تھیں جب وہ اپنے بچے کی بھوک مٹا رہی ہوتیں ——— اور ان کی بات سن کر وہ یوں زنانے کمرے سے باہر آتا جیسے ایک سکنڈ بھی وہاں اور رکا تو مسز ندرت کو کینسر ہو یا نہ ہو اسے ضرور ہو جائے گا۔

نہ جانے وہ اس بات کو کیوں محسوس نہ کرتی تھیں کہ اپنی نادانستہ حرکتوں سے وہ کسی اور کی بھوک میں اضافے کا سبب بن رہی ہیں

وہ دن رات اس ایڈیٹر کو گالیاں دیا کرتا تھا جس نے ایسا مضمون شائع کیا تھا ——— یوں تو دوسرے ملازم بھی ان میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور، یہ بات وہ ابتداء میں ہی جان گیا تھا ——— وہ تمام کے تمام تنہائی میں بیٹھے ہوتے تب اپنے مالکن کی ہر ادا، انداز، چال ڈھال اور گفتگو کی نقل کرتے پھر پیلے پیلے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیتے اور بس! کہ اس سے زیادہ ان کے ذہن کی رسائی تھی نہ ہمت پھر ان کے جذبات کی تسکین اس طرح کی چٹخارے دار باتیں کر کے ہی ہو جاتی تھی مگر وہ۔

اس کے دل کی امنگ شدت کی انتہا کو چھو کر روز بہ روز سورج کی طرح جوان ہوتی تھی اور اب...... اسے یوں لگنے لگا تھا کہ وہ اس امتحان کے ہر پرچے میں بری طرح فیل ہونے والا ہے۔

ایک روز جب کہ صبح کے گیارہ بجے تھے ——— وہ معمول کے مطابق چکن سوپ لے کر کمرے میں پہنچا، وہ کوئی میگزین پڑھ رہی تھیں ——— انھیں مصروف پا کر اس نے پیالہ ملحق میز پر رکھ دیا اور پھر وہ ——— وہاں سے واپس نہ گیا اور بلا ارادہ وہیں وہاں کھڑا ہو گیا ——— انھیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اک سوالی کی صورت ساکت کھڑا وہ انھیں تک رہا تھا ——— اچانک ہی مسز ندرت نے سر اوپر کیا اور...... اس کی نگاہیں بھیک منگی بن چکی تھیں

اسے یوں اپنی جانب کسی فاقہ زدہ کی طرح تکتے پا کر ان کا پورا وجود غصے سے انگارہ بن کر دہکنے لگا ——— وہ اٹھیں اسے دھتکار دیا اور دھاڑ کر بولیں "نکل جاؤ یہاں سے!!!"

وہ بلا تاخیر اسی وقت کھڑے کھڑے ملازمت سے نکال دیا گیا

ان کا آخری جملہ یہ تھا:

"تم مجھے صورت سے ایک شریف آدمی نظر آئے تھے، گنوار اور،

[بقیہ صفحہ ۱۴۰ پر دیکھئے]



سعدیہ روشن صدیقی

ایک ہم ہیں کہ دل شکستہ ہیں
ورنہ خوش باش سب نشستہ ہیں

چہرے مہرے بنے ہیں آئینے
رنگ بے رنگ بھی سرشتہ ہیں

جب افق بھر گیا پرندوں سے
اک ہمارے ہی پر شکستہ ہیں

"ڈسک" میں بات کیا نہیں آئی
حال احوال سب نوشتہ ہیں

آج تاریخ کس طرح لکھیں
سانحے واقعے گزشتہ ہیں

بے خطا ہم نے کب کہا خود کو
سعدیہ ہم کوئی فرشتہ ہیں ؟

● پوسٹ بکس نمبر 26555، ابو ظہبی (عرب امارات)

پنہاں

روکھی سوکھی پھانک رہی ہوں
تن کی سَیّا ہانک رہی ہوں

سندرتا کی جوت جگانے
مکھ پر بندیا ٹانک رہی ہوں

درپن نے کیا پوچھ لیا ہے
حیرت سے منہ تاک رہی ہوں

چھ گز لمبی ساری سے میں
سارے گھاؤ ڈھانک رہی ہوں

ان کے ہی تو پاؤں کی جوتی
جن لوگوں کی ناک رہی ہوں

دنیا کیا ہے تم بتلاؤ
موندے اپنی آنکھ رہی ہوں

ایک نرالا جگ ہے پنہاں
من کے اندر جھانک رہی ہوں

● 1752,Alpine Dr. Carrollton,
TX 75007 (U.S.A)



ماہ طلعت زاہدی

ہوگئے کتنے زمانے افسوس
گردشِ دہر نہ مانے افسوس

شہر کے شہر لہو میں ڈوبے
لبِ غافل پہ ترانے افسوس

رات کو خواب جو اُتریں گے انہیں
دن لگادے گا ٹھکانے افسوس

بات کرتے ہوئے جی ڈرتا ہے
نہیں پچھلے وہ زمانے افسوس

خلق کی چشمِ تماشہ کے لئے
ظلم گھڑتا ہے فسانے افسوس

دل پھٹا جاتا ہے اندیشوں سے
کوئی یہ درد نہ جانے افسوس

زندگی کے سبھی رستے محدود
موت کے لاکھ بہانے افسوس

● 1784-Stree-10,I-10/2,
Islamabad (Pak)

شبنم عشائی

نسبت کی انگوٹھی

تم جو یوں
میرے ہاتھ میں
چمک رہی ہو
مجھے اندر سے بجھا رہی ہو
تمہاری چمک میں چھپی کرنوں کو
میں کیسے چُن لوں
میں نے اپنی ساری روشنی
اُسی پل کھو دی تھی
جب تم نے
میرے ہاتھ کی ایک انگلی میں دمکنے کے لیے
اس میں پہنا پیتل اتار دیا تھا

● عشائی منزل، تارپٹن۔ 193121 (کشمیر)



قمر قدیر ارم

تضـــاد

پتہ نہیں تم میرے شعور و آگہی پر
آسان ہو کہ مشکل ہو
میں برق رفتار زندگی کی رہی ہوں قائل
جبکہ تم کب سے
زمین کے ایک ساکت سے
ٹکڑے پر بیٹھے ہوئے ہو!
جذبوں کے اظہار کو ہمیشہ میں نے
اہم ہے جانا
اور ایک تم ہو
کہ کشتِ جاں میں تمام جذبے دبائے رکھنا ہنر تمہارا
محبتوں میں
میں جسم کی شمولیت کو گناہ سمجھوں
تم بے الفاظ وحشتوں کو
لذتوں کے بس ایک نقطۂ انجماد میں ہی
اپنے سارے گونگے جذبوں کا
سچا اظہار سمجھو!
مگر یہ سچ ہے کہ ہم پھر بھی
برقی متضاد تاروں کی طرح
ہمیشہ رہے ہیں یکجا
پتہ نہیں تم میرے شعور و آگہی پر
آسان ہو کہ مشکل ہو!

● بارہ دری، مرادآباد۔ ۲۴۴۰۰۱ (یوپی)

کہکشاں تبسم

زندگی

زندگی تو سلگتی ہوئی ریت پر
اک مسلسل سفر ہے
سر پہ تپتا ہوا لال سورج لئے۔
دائیں بائیں
دہکتی ہوئی گرم وحشی ہوا کا چٹختا بدن
اور لبوں پر اٹھائے ہوئے تشنگی کا گراں بار کرب
ان گنت خواہشوں کے لہو کا
زباں پر عجب ذائقہ
نگاہوں کی جلتی ہوئی سطح پر
چند بے نام خوابوں کے پگھلے ہوئے
نرم و نازک بدن کو اٹھائے ہوئے
زندگی!
مدتوں سے یوں ہی گامزن ہے
آگے پھیلا ہوا بے کراں دشت ہے
پیچھے
اپنے ہی قدموں کے جھلسے ہوئے
پھوٹ پڑتے ہوئے
آبلوں کے بلکتے نشاں
نہ تو آغاز ہی خوش نما تھا
نہ تو انجام پیشِ نظر ہے
زندگی تو سلگتی ہوئی ریت پر
اک مسلسل سفر ہے ـــــــ!

● معرفت: زیڈ۔ آئی۔ رضوی، شعبہ اردو،
صابور کالج، صابور، بھاگل پور (بہار)



شہناز کنول

4/10-D, Dar-ul-uns Compound,
Civil Lines, Aligarh - 202001 (U.P)

پیغمبر

وہ سب ایک ہی راہ کے مسافر تھے، لیکن انہیں صاف اور سیدھی راہ پر چلنا پسند نہیں تھا۔ خستہ اور تنگ و تاریک راہوں سے گزر کر منزل تک پہنچنے کی کوشش میں وہ اپنے ہم نواؤں کو بھی بھٹکاتے تھے اور خود بھی بھٹکتے پھر رہے تھے۔

وہ انسان تھے مگر سب کے رنگ الگ الگ تھے مزاج اور شخصیتیں بھی الگ تھیں۔ یہ لوگ ظالم، خودغرض اور بدکلام بھی تھے۔ منفی جذبات کے مارے ہوئے یہ لوگ آپس میں بھی ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اپنی ساری قوت صرف کرتے مگر پھر بھی ساتھ ہی رہتے ساتھ ہی چلتے۔

ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا اور بولا "تم اتنے لال کیوں ہو؟"

"نہیں تو۔ انسان تو ایسے ہی ہوتے ہیں" لال رنگ کے انسان نے اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ اسے یہ اعتراض پسند نہیں آیا تھا اس لئے اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"مجھ سے پوچھو، یہ لال رنگ کا کیوں ہے۔" دوسرے نے لال انسان کی خون کبوتر جلد اور لال انگارہ آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے خون خرابہ بہت پسند ہے اور ظلم و بربریت اس کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ خون بہانا اس کا محبوب مشغلہ ہے اس کی سفاکی اور چالاکی سے میں خوب واقف ہوں۔"

"تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" لال انسان نے پیلے انسان کو گھورا جو اس کے اوصاف بتا رہا تھا۔

"الزام نہیں، تمہارے کارنامے بیان کر رہا ہوں۔"

"لال انسان نے اقرار میں سر ہلایا اور مسکرا کر بولا۔"

تب ٹھیک ہے۔ دراصل میں دودھ اور پانی الگ کر دیتا ہوں۔ بعض لوگ اپنی بقا کے لئے فریب اور چالبازی سے کام لیتے ہیں خودغرض بن کر صرف اپنے لئے جیتے ہیں۔ ان کی مکاری سے میں فائدہ اٹھا لیتا ہوں۔ کیا تم اسے میری حکمتِ عملی نہیں کہو گے"؟

"حکمت عملی۔" دوسرے نے مضحکہ خیز انداز سے کہا۔ "بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہو۔"

"یہ کام تم بھی کرتے ہو۔ تم اپنے رنگ سے بے وقوف بناتے ہو، میں اپنے اصولوں پر چلتا ہوں" پیلے انسان نے لال کی طرف ذرا تیکھی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "یہ دنیا کم عقلوں سے خالی تھوڑی ہے یہ کہو کہ تمہارا خمیر ہی ظلم اور جبر سے بنا ہے۔ لاشوں پر اپنا محل تعمیر کرتے ہو۔ مجبور اور کمزوروں کے کاندھوں پر چڑھ کر اپنا قد بڑھاتے ہو۔ اپنی ناموری کے لئے انسانیت کی عمارت کو ڈھاتے ہو"

"تم لال انسان پر خوب تبصرہ کر چکے کچھ اپنے بارے میں بھی سننا پسند کرو گے۔" نیلے انسان نے پیلے پر چوٹ کی تو وہ بولتے بولتے چونک سا گیا۔ اس طرح ٹوکا جانا اسے پسند نہیں آیا،

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بولا، "دنیا کے خرخشوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں یکسو اور تنہائی پسند ہوں۔ اپنی دنیا کا باسی ہوں۔"

"یقیناً۔ کہتے تو تم یہی ہو، لیکن یہ بات کون نہیں جانتا کہ تم ظاہر اور باطن الگ رکھتے ہو۔ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔ تم نے دنیا کو ہمیشہ منفی نظر سے دیکھا ہے اور دوسروں سے بھی یہی چاہتے ہو کہ وہ بھی اس طرح دیکھیں۔"

"تمہارا اندازہ غلط ہے۔" پیلے انسان نے نیلے انسان کی بات کاٹی۔ "میں نے ہمیشہ معاشرے کو یہ بتایا ہے کہ یہ دنیا ایک سراب ہے

اس میں پھنس گئے تو اس طرح الجھ جاؤ گے جیسے مکڑی کے جالے میں مکھی پھنستی ہے کہ جتنا ہاتھ پیر مارتی ہے اور الجھتی جاتی ہے اور اس کا انجام صرف فنا ہے اس لئے دنیا کی محبت سے دور رہو۔"

"کہہ لو جو کہہ سکتے ہو۔ نیلے نے مذاقاً کہا۔ تم نے کہا تو یہی ہے کہ یہ دنیا محبت کے قابل نہیں۔ اور تمہیں بھی اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے یہ دنیا فریب نظر ہے اور اس سے دل لگانا انسان کی سب سے بڑی بھول، لیکن کیا حقیقتاً تم ایسا ہی سمجھتے ہو۔؟"

"ہاں ۔ بالکل۔"

"غلط۔ تم نے دنیا کو اپنے چاروں طرف لگا رکھا ہے ۔ گلے گلے اس میں ڈوبے ہو۔ تمہارا لباس تمہاری غذا تمہاری رہائش دنیا سے بیزار لوگوں جیسی نہیں ہیں۔ تمہاری نصیحتیں دوسروں کے لئے ہیں اور خود دنیا کو ثابت نگلنے کی فکر میں لگے رہتے ہو۔"

نیلے انسان کی اس بات کو سن کر ہرا انسان خوب ہنسا خوب ہنسا۔ اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے ۔ گدلے اور چپ چپے ۔ مگرمچھ کے آنسوؤں سے مشابہہ پیلا انسان جھنجلا گیا۔ بگڑ کر بولا۔ "بڑے حاسد اور بدزبان ہو۔ میری سرداری اور عزت سے جلتے ہو۔ میرا اپدیش ان لوگوں کے لئے ہے جو دنیا میں ناکام ہو گئے ہیں اور نامراد رہ گئے ہیں ۔"

"انہیں ناکام اور نامراد بھی تم جیسے ہی بناتے ہیں تم نہیں چاہتے کہ سب تمہاری طرح کامیاب ہو جائیں ۔ تم انہیں کمتر دیکھنا چاہتے ہو تاکہ تمہاری سرداری برقرار رہے ۔ حاسد تو تم ہو کہ دوسروں کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے ۔ نیلا انسان طنزیہ انداز سے بولا ۔ "آئینہ دیکھ کر گھبرا گئے اپنی اصلی شکل تو تم نے آج ہی دیکھی، نامرادوں کے بیچ ہی تمہاری مرادوں کی دنیا آباد ہے۔ ان کی کم عقلی میں تمہاری کامرانی چھپی ہے ۔ ان کو تاریک راہوں سے گزارتے ہو تاکہ وہ تمہاری مکروہ شکل نہ دیکھ سکیں۔ لیکن مجھ سے کیا چھپا ہے تم دنیا کی رنگینی میں سرتاپا غرق ہو اس کی محبت میں دیوانے بنے پھرتے ہو دنیا سراب ہو یا فریب تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ تم بھی مکر و دنیا کے پتلے ہو، دونوں ہاتھ سے سمیٹ رہے ہو۔ دنیا سے بیزاری کا جو لبادہ اوڑھے پھرتے ہو اس میں چھپی تمہاری اصلیت مجھے صاف نظر آرہی ہے ۔"

لال انسان مستقل مسکرا رہا تھا جیسے نیلے انسان کی اس نرائے سے لطف لے رہا ہو، ہرے انسان نے دیکھا لال انسان جب ہنستا ہے تو اس کے سامنے کے دو تیز اور نوکیلے دانت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ہرے انسان نے اس کے حیوانی چہرے پر نظر ڈالی اور جھرجھری سی لے کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

لال انسان نے اس کی یہ بات محسوس کر لی اور زور سے ہنس پڑا پھر بولا، یہ ہرا انسان مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ اس لئے کہ بے عمل اور بزدل ہے ۔"

"شرافت کو ظالموں نے ہمیشہ بزدلی کہا ہے ۔" ہرا انسان ناگواری سے بولا، میں صلح جو اور امن پسند ہوں۔"

"لال انسان نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ خوب کہا، صلح جو اور امن پسند، یہ کیوں نہیں کہتے کہ مصلحتوں کی پوٹ ہو۔ خوشامد اور ابن الوقتی سے تمہارا بہت قریبی رشتہ ہے ۔ تمہاری کمزوری تمہارے چہرے سے عیاں ہے اور اس وقت بھی تم مجھ سے خوف زدہ ہو۔"

"ہاں ضرور ہوں ۔ ہرے انسان نے اقرار کیا مگر تم انسان ہو کب؟ تمہارا چہرہ مہرہ اور حرکتیں قطعی طور پر حیوانوں جیسی ہیں بلکہ درندوں جیسی ۔ اور درندوں کی شکل دیکھ کر وحشت تو ہوتی ہی ہے ۔"

"خوب خوب ۔ لال انسان مسکرایا۔ اسے کہتے ہیں چھوٹا منہ بڑی بات۔ کس منہ سے مجھے درندہ کہہ رہے ہو۔ میں نہ ہوں تو تم سب چند دن میں فنا ہو جاؤ۔ تمہاری غذا تو میں ہی فراہم کرتا ہوں اور تم ۔؟ ہر بازار میں بک جاتے ہو۔ ہر قیمت پر خود کو فروخت کر دیتے ہو، مصلحت پسند بن کر اپنا سودا کرتے ہو۔ تم نیلام گھر کے رہنے والے ہو جہاں ہر چیز کی بولی لگتی ہے ۔ تمہیں تو کوئی بھی استعمال کر لے ...

ہرا انسان، لال کی لن ترانی پر چراغ پا ہو گیا۔ "زبان سنبھال کر بات کرو، دور اندیشی اور صلح جوئی کو تم کیا جانو، میں تمہاری طرح بدباطن نہیں۔ کہ دوسروں کو ٹھوکر مار کر ہٹایا اور قدرا دھمکا کر اپنی دکان جمالی۔ تمہارے خوفناک منصوبوں نے کتنے ہی لوگوں کو زمرۂ انسانیت سے خارج کیا وہ بھی تمہارے جیسے حیوان بن گئے تمہارے ہم نوا تمہاری ہی طرح بے حمیت ہیں۔

لال انسان نے نیلے کی طرف دیکھا اور نیلا کیا کہتے ہو؟

"ہرے کی بات میں وزن تو ضرور ہے لیکن خود ہرا بھی دودھ کا

دھلا نہیں ہے یہ خود جو جو حرکتیں کرتا ہے اگر اس کے ہمنواؤں کو معلوم ہو جائیں تو وہ لوگ اس کی تکہ بوٹی کر دیں۔ مصلحت کہہ کر منافقت کرتا ہے۔ یعنی سب کو بے وقوف بناتا ہے۔ اس کی دور اندیشی صرف اپنی ذات کے لئے ہے یعنی ہمیں تو لوگ مجرم سمجھیں ظالم اور بدقماش کہیں اور یہ پاک دامنی کے جھنڈے لہراتا رہے۔"

"تم کس منہ سے بول رہے ہو۔ پیلے نے نیلے انسان کو گھورا تمہارا تو اپنا دامن بھی تر ہے۔ ذرا دیکھ تو لو کہ کتنے پانی میں ہو۔"

نیلا انسان بولتے بولتے رک گیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ سب ہی آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں نہ کوئی کسی کا برا تھا نہ چھوٹا۔ نیلا انسان کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا "میرا دامن نہ کل تر تھا نہ آج ہے میں تو ازل سے منصف مزاج ہوں۔ دکھی انسانیت کی خدمت میرا مشن ہے اور یہ کام میں کرتا رہوں گا۔"

پیلا انسان یہ سن کر ہنس پڑا۔ "سچ کہتے ہو بالکل ہی سچ کہتے ہو۔ تم دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہو مگر پہلے اسے دکھی بھی تم ہی بناتے ہو۔ تمہاری تخریب کاری کی عادت بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنے تم خود پرانے ہو۔ ہر کمزور کو تختۂ مشق بناتے ہو۔ آگ لگا کر پانی ڈالتے ہو تاکہ دنیا واہ واہ کرے کہ دیکھو کتنا ہمدرد ہے خیر خواہ ہے یہ نیلا انسان، میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ تم نے جس کو ذرا کمزور جانا اسی کو ہدف بنا لیا۔ اس لئے تمہاری ہمدردی میرے نزدیک ایک دھوکا ہے۔"

نیلا انسان ذرا کھسیا کر بولا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس تخریب کاری میں تم میرے شریک ہو۔ اگر تم نے مجھے آگ لگاتے دیکھا تھا تو بڑھ کر روکا کیوں نہیں۔ اگر کسی کمزور پر ظلم کرتے دیکھا تو بولے کیوں نہیں۔ اگر میں کسی کو ہدف بنا رہا تھا تو آگے بڑھ کر میرا پردہ فاش کیوں نہ کیا۔ تم تو سب کے ہمدرد تھے پھر خاموش کیوں رہے۔ تماش بین کیوں بنے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری تخریب سے تمہارا مفاد بھی وابستہ تھا، تم بھی وہی ہو جو میں ہوں۔ مقصد ایک ہے البتہ طریقۂ کار مختلف ہیں۔"

"تم پیلے انسان انتہائی زہریلے ہو۔ ہرے نے کراہت سے کہا۔ تمہارا کاٹا پانی نہیں مانگتا اس کا تڑپنا پھڑکنا تمہیں تسکین دیتا ہے۔ تم اذیت پسند ہو، بے رحم ہو، مطلب پرست ہو۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں میں زہریلا ہوں، اذیت پسند ہوں، بے رحم ہوں، مطلب پرست ہوں مگر تم بھی مان لو کہ تم سب میرے شریک کار ہو۔ ورنہ اب تک الگ ہو گئے ہوتے۔ لیکن مجھے معلوم ہے تم مصلحت پسند بن کر صلح جو بن کر میرا ساتھ دیتے ہو۔ مجھے پہچانتے ہو مگر تمہاری ہمت نہیں کہ میرے خلاف آواز بلند کر سکو۔ مجھ سے نفرت بھی کرتے ہو اور خوشامد بھی کرتے ہو۔ آخر کیوں۔؟ میں بُرا ہوں تو تم کون ہو؟ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے میرے ساتھی وہی ہوں گے جو میری فطرت سے میل کھائیں گے۔ جب منزل اور مقصد ایک ہوتا ہے تو پھر کسی کی بھی زبان سے امن، سادگی، انسانیت، بہی خواہی، بے غرضی جیسے الفاظ مسخرہ پن لگتے ہیں ہم ایک دوسرے کا ہی عکس ہیں۔"

تب ہی انھوں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک اور انسان آ رہا تھا میانہ قد و قامت، چھریرہ جسم، گندمی رنگت، روشن آنکھیں، چمکتی پیشانی اور مسکراتا چہرہ۔

"ارے تم۔؟ ان سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔ ان کے چہروں پر سختی اور خشونت چھا گئی۔ نیلے، پیلے، سرخ و سفید کھائے پیئے پالے ہوئے جسم زرد پڑنے لگے۔ آنکھوں میں ناگواری کے سائے گہرے ہو گئے۔ آنے والے انسان نے ان سب پر گہری نظر ڈالی اور جرأت و ہمت سے بلند آواز میں بولا۔

"ہاں میں! تمہاری بد خلقی اور خود غرضی حدوں کو پار کر چکی ہے۔ تمہاری نفسانی خواہش بے لگام ہو رہی ہے۔ تم انسانی فطرت کے خلاف چل رہے ہو، ہر دور میں تم نے رنگ بدل بدل کر انسانیت کو رسوا کیا ہے، زمین پر فساد پھیلایا ہے اور مصلحت کی آڑ میں لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور ہر دور میں حق پرستی، حق گوئی اور انصاف پسندی لے کر میں آتا رہا ہوں۔" ❁

بقیہ صفحہ ۲۴ خواب آنکھیں

بقیہ صفحہ ۲۴

وہ تصویر پاس بنائے گھورتا رہا اور دیر تک اسی ایک سوال کے گرد چکر کاٹتا رہا۔

وہ آج بھی اپنے باپ اور صاحب کے درمیان ظلم کو تول رہا تھا کہ کون کتنا ظالم ہے، مگر مجبوری اور بے بسی تو آج بھی اس کا مقدر تھی، کسی پتنگ کی طرح۔ ڈور تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ ❁



ثمینہ راجہ

ہم اپنی صورتوں سے مماثل نہیں رہے
اک عمر آئینے کے مقابل نہیں رہے

اب وقت نے پڑھائے تو پڑھنے پڑے تمام
اسباق جو نصاب میں شامل نہیں رہے

بے چہرگی کا دکھ بھی بہت ہے مگر یہ رنج
ہم تیری اک نگاہ کے قابل نہیں رہے

عمر رواں کے موڑ پہ کچھ خواب، میرے خواب
کھوئے گئے ہیں ایسے کہ اب مل نہیں رہے

اپنے لئے ہمیں کبھی فرصت نہ مل سکی
اس کو گلہ کہ ہم اسے حاصل نہیں رہے

3/24-III,10,Ramna 3/10, Islamabad (Pakistan) ○



فرحت زاہد

خشک آنگن میں تھی نمی لڑکی
عمر بھر سوچتی رہی لڑکی !

اس کی سیرت پہ کوئی بھی نہ گیا
صورتاً سانولی سی تھی لڑکی

کچے رستوں سے آشنا کب تھی
بارشوں میں دھلی ہوئی لڑکی

وہ جو سب کو فریب دیتا تھا
اس کو پھر مل گئی نئی لڑکی

دیکھ لینا یہ وقت بدلے گا
خود کو منوائے گی یہی لڑکی

1030, Lake Side Place, Baldwin, NY 11510 (USA) ○

پروین راجہ

تمہارے در پہ آکر سو گیا کون
ذرا معلوم تو ہو کھو گیا کون

لہو کا رنگ اب کے برف کا تھا
پہاڑوں پر یہ لاشیں بو گیا کون

مجھے ظلمات نے بے حد ڈرایا
ستاروں کو لیے گم ہو گیا کون

چناروں سے لپکتے ہیں جو شعلے
مرے چشموں سے دامن دھو گیا کون

پگھل جاؤں میں مورت برف کی ہوں
کڑی ہے دھوپ آنسو رو گیا کون

○ مدہ ملو، باراں پتھر، سری نگر-190001 (کشمیر)

کنیز فاطمہ کرن

ظلمتوں سے جنگ اپنا کام بن کر رہ گئی
یہ عبادت شغلِ صبح و شام بن کر رہ گئی

قافلے آتے رہے پرچم اٹھائے درد کے
دل کی وادی شاہراہِ عام بن کر رہ گئی

ان سے ملنے کی تمنا اور بچھڑنے کا ملال
فصلِ گل اب تو خیالِ خام بن کر رہ گئی

عشق کے آداب، پاسِ بزم اور دل کی پکار
ہوش مندی، بندشوں کا نام بن کر رہ گئی

سطح پر ابھرے تو تھے اک پل کو رنگین بلبلے
زندگی پھر تلخیوں کا جام بن کر رہ گئی

21-Baulkham Hills Road, Baulkham Hills, N.S.W. 2153 Australia ○

زرینہ زرین

صداقت مانگ لفظوں میں خدا سے
چلا فن کو ملے گی اس نوا سے

تو چسپاں کر لبوں پہ بجلیاں اب
کہ سب کچھ مل نہیں سکتا دعا سے

رہ تجدید پتھریلی بہت ہے
چلیں گے ! ہو لہو پانی، بلا سے

یہ میرے ہاتھ پتھریلے ہیں شاید
نہ ہوں گے سرخ یہ رنگ حنا سے

غزل میں تجربہ اپنے عہد کا
سمویا ہے اسے اپنی ادا سے

○ 30-A، آغا مہدی اسٹریٹ، کلکتہ-16

کوثر جہاں کوثر

گردشِ کہن

ازل ابد کے فاصلے
کشاں کشاں
دھواں دھواں
متاعِ جستجو لئے
سحر کی گردشِ کہن
امیں شکست و رخت کی
خموشیوں کی رازداں
جھلستے ریگ زار سے
ابلتے سیلِ آب سے
لہو لہو نشان پا
بھٹک رہی ہے
کو بہ کو
حدِ نگاہ رواں دواں
بہار ہو
کہ ہو خزاں
اداس شام کا فسوں
کہ دن ہو کوئی خونچکاں
اٹھائے وقت کی کتاب
سفر ازل
سفر ابد
سحر کی گردشِ کہن
ازل ابد کے فاصلوں میں
حسرتوں کی پاسباں

● S.N.5 ۔ چار بنگلہ روڈ، سول لائنز،
بھوپال 462002

وضاحت نسیم

شاخِ سبز کے لئے

سر دہ ساعت ہمارے حصے میں جب بھی آئی
ہم نے سوچا کہ وہ تو خوش ہے
یہاں کی رنگین وسعتوں میں
حیات افروز راحتوں میں
ہواؤں میں، رنگوں میں، تتلیوں میں
ہمارے دل سے دعا یہ نکلی
خدا اسے شادماں ہی رکھے
خدا کرے اب اسے
کوئی غم نہ چھو کے گزرے
ہمیشہ اس کی رو پہلی نیندوں میں
جگنوؤں جیسے خواب کھیلیں
اور اپنی تنہائی میں سمٹ کر
ہم اس دعا کا عذاب جھیلیں

● A-891, Block-H, North
Nazimabad, Karachi (Pak)

ناہید قمر

پرانی بات

محبت کی کہانی میں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کوئی کردار قصے کو اچانک درمیاں سے چھوڑ کر
رستہ بدل کر
ممکنہ انجام سے پہلے کہانی کا سرا ہی موڑ دیتا ہے
تو پھر امید کے موسم میں ناامید ہونے کی صلیبوں
پر لٹکتا دوسرا کردار
قصے میں کئی صفحات خالی چھوڑ دیتا ہے
اگرچہ بعد بھی اس کے کہانی چلتی رہتی ہے
مگر اس کی عبارت سننے والوں کو،
بعید از فہم لگتی ہے
سمجھ میں آئے بھی کیسے
کہانی میں جہاں صفحات خالی رہ گئے
شاید
وہاں پر وصل کا اک باب آنا تھا
کسی کو منتظر رہنا،
کسی کو لوٹ آنا تھا

● 260 ۔ بی ون یونٹ کالونی، بہاولپور (پاکستان)

قمر جہاں

Bhikapur, Hattia, Bhagalpur 812001 (Bihar)

خواب آنکھیں

پتنگ کی رنگین ڈور ان کے ہاتھوں میں تھی اور نگاہیں تا حدِ نگاہ پھیلے ہوئے نیلے آسمان کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی پتنگ پر . . . سبک سبک سی پتنگ کسی ننھی سی جان کی طرح لامحدود وسعتوں میں ڈانواں ڈول ہو رہی تھی، اس نحیف سی جان کی اتنی بلند قوتِ پرواز پر حیران تھے اور ساتھ ہی ایک خطرہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ کہیں مدِ مقابل آتی ہوئی ڈور ان کی پتنگ کی قاتل نہ بن جائے.... اگرچہ وہ ان سے دور بہت دور تھی مگر اس بات سے بڑی طمانیت مل رہی تھی کہ وہ بہر حال ان کی گرفت میں تو ہے۔ اختیار کا یہ احساس بھی کسی قدر فرحت بخش ہوتا ہے۔

"پاپا دیجیے نا مجھے!...." ان کے سامنے کھڑے دس سالہ معصوم لڑکے نے مچلتے ہوئے اپنے پاپا کے ہاتھ سے اچکا اچک لینا چاہا۔

"شی! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ پتنگ ابھی لامحدود فضاؤں میں ہے۔ ذرا سی غفلت سے توازن کھو دے گی اور تم اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤ گے...." پاپا نے ترنگ کے ساتھ اپنا جملہ مکمل کیا۔

"ارے میاں! پتنگ بازی کے لیے بھی اندازِ شہنشاہی چاہیے...."

"مگر پاپا!"

"پیارے پاپا کچھ نہیں، جو میں کروں وہ دیکھتے رہو...." پاپا کی آواز ایک حکمراں کی آواز تھی وہ اس وقت مطلق العنان بنے سب پر حاوی تھے۔ کھلی فضا میں پتنگ کسی سبک خرام حسینہ کی طرح مچل رہی تھی اور ان کی نگاہ اس کی معمولی حرکت اور جنبش کو ترل رہی تھی ڈر تھا کہ کہیں گرفت کمزور ہو جائے اور یہ خوبصورت حسینہ ان کے بس سے باہر ہو جائے۔ بچے نے حسرت سے دور کھلے آسمان میں رنگ برنگی پتنگ کی طرف دیکھا۔ کوئی گلابی، کوئی نیلی، کوئی سبز، کوئی سرخ، کسی کے دم لگی ہوئی کوئی بڑی اور کوئی نازک کمانی۔ میں اٹھلاتی ہوئی بلندی کی طرف پرواز کرتی ہوئی۔ مگر پاپا ذرا بھی خود کھیل میں مست تھے۔ ان کی نظر اپنے بچے پر کہاں تھی، وہ تو کھلے آسمان میں اپنی مشاقی دکھانے میں مصروف تھے۔ اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ پتنگ نیچے کی طرف گرتی آ رہی ہے اور عنقریب وہ کسی مکان کی چھت پر یا کسی غیر کے آنگن میں جا گرے گی، اس لمحے میں انھوں نے ایک شاطر کھلاڑی کی طرح پتنگ کو اپنے قریب کھینچ لینا چاہا مگر توازن بگڑ چکا تھا ان کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی اور دیکھتے دیکھتے وہ خالی ہاتھ ہو چکے تھے۔ صرف ننھی سی ڈور سلامت تھی جو گمشدہ پتنگ کا احساس دلا رہی تھی۔

تقریباً سو گز کے فاصلے پر کسی غیر کے آنگن تیلنگ جا گری تبھی اس کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہی ملازم بچہ نہایت پھرتی سے اس کے تعاقب میں دوڑا۔ سڑک کے دوسرے معمولی بچے بھی پتنگ کی تاک میں لگے ہوئے تھے کہ کوئی بھی پتنگ گرے اور وہ اس کے ساتھ ڈور کھسوٹ کا برتاؤ شروع کر دیں۔ اس نعمت غیر مترقبہ کو لوٹنے کی آرزو لیے بہت سارے ننھے منے بچے اس آنگن میں آدھمکے تھے مگر ملازم بچہ بھی جائے وقوع پر پہنچ چکا تھا اور مالک کے رشتے سے پتنگ پر اپنا اختیار جتائے ہوئے زبردستی ان کے ہاتھوں سے اچک کر لے بھاگا لیکن نصف راستے میں ہی اس نے اپنے عزیز دوست راجو کے ہاتھ میں پتنگ تھما دی اور خالی ہاتھ صاحب کے پاس جا کھڑا ہوا۔

صاحب کے لڑکے نے روہانسے ہو کر کہا "پاپا! آخر آپ نے میری پتنگ ...." اس معمولی سی پتنگ کے غم میں بچہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔ مگر پاپا نے کافی رعونت سے جواب دیا۔ "ذرا صبر کرو میرے بچے! تیرے پاپا کی جیب سلامت ہے تو دوسری پتنگ بھی آ سکتی ہے۔" انھوں نے فوراً اپنی جیب سے پانچ کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے ملازم بچے کو حکم دیا۔ "اس سے بھی خوبصورت پتنگ لے آؤ میرے بچے کے لیے۔" اور واقعی تھوڑی ہی دیر میں دوسری نہایت خوبصورت گلابی رنگ کی نازک کمانی والی پتنگ آ گئی۔ ہم عمر ملازم بچہ جو ابھی ابھی بازار سے اپنے صاحب کے بچے کے لیے پتنگ خرید کر لایا تھا، دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا۔

"اے اللہ! یہ پتنگ بھی اسی طرح ہم غریبوں کے حصے میں آ جائے۔"

اس کے دل میں ایک خطرناک گیہوتی سانپ سا پھنکار رہا تھا۔

بات تو یہ تھی کہ ادھر وہ مانجھا تیار کرتا تو اس کی شعوری کوشش یہی رہتی کہ دھاگہ مضبوط نہ ہونے پائے۔۔۔۔ اس نے اپنے دوسرے غلام ساتھیوں کو بھی نہایت رازداری کے ساتھ یہ ترکیب بتائی تھی کہ دھاگے کو کمزور رکھو تاکہ پتنگ آسانی کے ساتھ ہماری مقدر کی ساتھی بن سکے۔ ورنہ ہم غریب بچوں کو بھلا کون۔۔۔۔؟

۔۔۔ وہ بچے جو اس کے طبقے سے متعلق تھے، کسی کو وہ بھائی کہتا اور ان میں سے کوئی اسے بھیا جی کہہ کر مخاطب کرتا ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں دور رہ کر بھی وہ شریک ہوتے۔ اس بھائی چارگی کے احساس نے اسے ان دنوں اپنے کام کی طرف سے بے ایمان بنا دیا تھا اور اب اس کے کام میں وہ اگلے دنوں کی سی چستی اور دیانت نہیں تھی جو وہ چند دنوں پہلے تک کرتا تھا جب اس کا ذہن آج سے کہیں زیادہ معصوم تھا۔ ایک دن مالک نے ٹوکا بھی:۔ " ابے سالے! کیسا مانجھا کرتا ہے، ہر دن ڈور ٹوٹ جاتی ہے، کیا دانتوں سے کُتر دیتا ہے دھاگے کو۔۔۔؟"

" نہیں حضور! آج کل دھاگا ہی کمزور ملنے لگا ہے۔" وہ برجستہ جواب دیتا اور اپنی حاضر جوابی پہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

" دھاگا کیا کمزور ہوگا رے! تو ہی کام چور ہوگیا ہے۔" صاحب سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے۔ " آج کل تو کوئی بھی کام ٹھیک سے کیوں نہیں کرتا؟ کلو؟"

" من نہیں لگتا جی!" اس کا دل چاہتا وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے مگر صاحب کی مارکے خوف سے وہ اپنے اندر کی بات کو اندر ہی اتار لیتا۔ لیکن کچھ دیر تک اپنی اس تبدیلی کے بارے میں خود ہی سوچتا کہ آخر وہ وفاشعاری اور نمک خواری کے جذبات کو کیوں بھولتا جا رہا ہے جو اس گھر میں قدم رکھتے وقت اپنا ہیں تھے پتہ نہیں قصور کس کا تھا مگر یہ سچ تھا کہ اس کے اندر مالک اور ملازم کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا اور اس فرق کے ساتھ ساتھ دوری کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے دونوں کا سرا ایک دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا نہ ہو۔ صاحب کی آواز نے اس کی سوچ کے سلسلے کو بکھیر دیا وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہے تھے۔

" ارے میاں! کھیل میں دلچسپی رکھتے ہو تو کبھی خود بھی ان کاموں کو انجام دو سب کچھ اس چھوکرے پر کیوں چھوڑ دیتے ہو، پتنگ وہی لائے، دھاگا بھی وہی خریدے، مانجھا وہی کرے" اور وہ دل میں سوچتا " اور صرف کھیلے مالک کا بیٹا۔۔۔ اونھ کیا شان ہے ان بڑے لوگوں کی بھی۔۔۔۔ اللہ کتنا مہربان ہے ان لوگوں پر سارے ٹھاٹ باٹ تو ان کے قدموں میں ڈال دیئے۔۔۔ اور ایک وہ نصیب جلا ہے، بچپن ہی میں ماں مرگئی، بھوک مری سے تنگ آکر باپ نے شہر لاکر مجھ ایک طرح سے ان کے ہاتھوں بیچ ہی دیا۔ کبھی بھول کر بھی نہیں آتا۔۔۔ بس اس کی کمائی پر اس کا حق ہے، ہر ماہ ڈاک سے دو رسالہ اس کو پہنچ جانا چاہیئے"

کیا ان غریب باپوں کو اپنے خون کی بو بھی نہیں تڑپاتی۔۔۔۔؟"

اس کے ننھے سے دل میں اکثر یہ سوال اٹھتا اور جواب میں سوتیلی ماں کا قہر بھرا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا۔۔ اچانک مالک کی گرجدار آواز نے ماں اور باپ دونوں کی شبیہہ کو گڈمڈ کر دیا اور صرف مالک ہی مالک نظر آنے لگا۔

" ابے حرامی کے پلّے! تو کھڑے کھڑے اونگھ کیا رہا ہے، چل پتنگ کو پیچ دے۔۔۔" اور وہ منٹوں میں ماضی سے حال میں چلا آتا ہے، اور پتنگ لے کر دوڑتا ہوا چھت کے آخری چھور تک چلا جاتا ہے پھر پتنگ اوپر اور اوپر ہوتی جاتی ہے اور پتنگ کی اڑان کے ساتھ ساتھ اسے بھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ بھی اوپر کھلی فضاؤں میں اڑتا چلا جائے، کاش! اس میں بھی کوئی اڑان بھر دیتا۔۔۔۔ اس نیلے آسمان میں کیسی سندر تا ہے۔ کتنا بھلا لگتا ہے۔۔۔۔ وہ حسرت سے اوپر نیلے آسمان کی طرف تکتا اور پھر زمین کو دیکھتا جس میں وہ دھنستا ہی جا رہا تھا۔ مانو زمین کوئی دل دل کا میدان ہو جہاں اس کے کمزور پاؤں کو ٹھوس پن کا احساس ہی نہیں تھا۔

اچانک اسے لوٹی ہوئی پتنگ کا خیال آیا۔ جو وہ راجو بھیا کے ہاتھ میں تھما کر آیا تھا۔ کہیں راجو بھیا اس زخمی پتنگ کی مرہم پٹی کر کے کھیلتے کھیلتے اسے ادھورا نہ کر دیں، آخر وہ بھی تو کبھی کھیلنا چاہتا ہے، بلا سے سالم پتنگ اس کا نصیبہ نہ سہی مگر لوٹ کے مال پر تو اس کا حق ہے۔ وہ اکثر کٹی پھٹی پتنگ پر پتلے پتلے کاغذ تراش کر لئی سے چپکاتا۔ ان میں دم بالا لگاتا، کمانی درست کرتا اور دھوپ میں کچھ دیر سکھا کر تر و تازہ کر کے انہیں فضاؤں میں پرواز بھرنے کے لئے ہواؤں کے دوش پر چھوڑ دیتا۔۔۔ مگر ذرا ہی دیر میں پتنگ نیچے آجاتی دراصل اس کے پاس اچکا تھا کہاں جو پتنگ کو دور کھلے آکاش میں پہنچنے میں مدد دے۔۔ ایک بار اس نے کچھ پیسے جمع بھی کئے تو مالکن نے وہ ڈانٹ پلائی کہ وہ اچکا خریدنے کے خیال ہی کو بھلا بیٹھا۔

اور کیا کرے گا بن کر بابو دن بھر گڈی بازی کرے گا، مفت خورہ حرام خور اور نہ جانے کیا کیا کہا۔۔"

پتنگ اڑانا تو واقعی اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ مگر ایک رات نیند میں اس نے بڑی شان سے پتنگ ضرور اڑائی تھی، اس کی پتنگ اوپر بہت اوپر جا رہی تھی۔ وہ خوشی میں نعرہ زور سے اچکا گھما رہا تھا۔ اور وارفتگی کے عالم میں بلند ہوتی ہوئی پتنگ کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کی پتنگ کاٹ دی۔ وہ سسک کر واقعی رونے لگا تھا۔ آنگن میں مالکن کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ اسے جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھیں۔

" ارے کتنا سپنے ہوگئی، اب جلدی سے اٹھ بھی جا۔۔۔" آنکھ کھلی

تو اس نے دیکھا وہ پتنگ نہیں اڑا رہا ہے بلکہ اس کی حیثیت تو خود ایک پتنگ کی سی ہے، کمزور ناتواں، .... ہواؤں میں ڈولتی بے سہارا....

کچھ روز پہلے ایک سنسان دوپہر میں اس نے اپنے ساتھی راجو سے پوچھا تھا۔

"یہ پتنگ بازی کا کھیل تجھے کیسا لگتا ہے راجو.... ؟"

"بڑا اچھا لگتا ہے کہ جیسا ہم کھلا آکاش میں اڑتے چلے جا رہے ہیں"۔ اس نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔" ہاں کبھی تو مجھے بھی بڑا اچھا لگتا تھا... محض اشاروں اشاروں میں کھلی فضا میں پتنگ کو نچانا واقعی بڑا دلچسپ کھیل ہے مگر جیسے جیسے میں بڑا ہوتا جا رہا ہوں مجھے اس بظاہر معمولی کھیل کے اندر ایک اور عجیب کھیل نظر آنے لگا ہے....." اس نے خاصے فلسفیانہ انداز میں اپنی گفتگو مکمل کی، راجو حیران تھا کہ وہ صاحب لوگ کی صحبت کے اثر سے کتنی جلد اتنی اچھی طرح باتیں کرنا سیکھ گیا ہے، وہ کچھ دیر تک حیرت اور معصومیت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے گھورتا رہا، پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

"یار! آج کل تم بہت اول فول بکتے ہو، کھیل کھیل ہے میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں۔"

"بس صرف اتنا ہی جانتے ہو۔ ؟ کلو کے لہجے میں طنز تھا گویا وہ کہہ رہا ہو تم واقعی بالکل بدھو ہو اور جب تک ہم تم اسی طرح بدھو بنے رہیں گے نہ ہمیں پتنگ ملے گی اور نہ ہمارے اختیار میں اچکا آئے گا۔" پھر اس نے دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی" راجو! تیرا دل کبھی یہ چاہتا ہے کہ بڑے صاحب کے بیٹے کی طرح تیرے ہاتھ میں بھی رنگین اچکا ہو رنگ برنگی پتنگ ہو۔ ؟؟"

"میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں، بھلا صاحب سے بھی کوئی مقابلہ کرتا ہے۔ ؟"

"کیوں؟ صاحب بھی تو ہماری اور تمہاری طرح ہیں دو آنکھیں دو ہاتھ پیر کے مالک ہیں، دیکھنے میں تو تو صاحب کے لڑکے سے بھی زیادہ پہلوان ہے۔ پھر.... پھر.... ؟"

"تم پر آج پھر پاگل پن طاری ہے۔ میں چلا بابا اپنے گھر...."

اس نے زبردستی بڑھ کر راجو کو دبوچ لیا "نہیں میں تمہیں جانے نہیں دوں گا پہلے تم میری بات کا جواب دو...." اس نے غصے سے کہا۔ "میرے پاس تمہاری بات کا کیا جواب ہے۔ بھلا تم بڑے صاحب کے ملازم...."

اس بات پر اسے شدید غصہ چڑھ آیا تھا اور اس نے ایک زوردار طمانچہ راجو کے گال پر رسید کر دیا۔" یہ تم بار بار مجھے صاحب کا ملازم کہہ کر طیش کیوں دلاتے ہو۔"

"اس میں طیش میں آنے کی کیا بات۔ ؟ کیا تم صاحب کے ملازم نہیں ہو؟.... کہہ دو میں غلط بول رہا ہوں....؟؟"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے تھے پھر کلو نے سر اٹھا کر افسردگی سے کہا:۔

"نہیں تم ٹھیک بول رہے ہو، واقعی میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میرا باپ مجھے ایسی جگہ کیوں ڈال گیا جہاں میرے اندر کے تمام گھاؤ ہرے ہو رہے ہیں۔ میرے باپ کو صرف پیسہ چاہیے نا.... ؟ وہ بچوں کی طرح سسکنے لگا۔" راجو! تم نہیں سمجھو گے صاحب کا ملازم بن کر میں کتنا دکھ جھیل رہا ہوں، ہر لمحہ میرے بھیتر کوئی آگ کوئی جوالا مکھی کھولتا رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا راجو کہ ان بڑے آدمیوں سے الجھوں۔ مگر بڑے آدمی کی کوئی بھی بات مجھے اچھی نہیں لگتی...."

".... مگر ہمارے کنبے کے لوگ تو تم پر رشک کرتے ہیں کہ تم اتنی اچھی نوکری کرتے ہو، اتنا اچھا کپڑا پہنتے ہو.... اچھا کھاتے ہو، بڑے سے گھر میں رہتے ہو...."

"مگر یہ سب میرا اپنا تو نہیں ناراجو!.... ان سب پر تو اس مالک اور مالک کے بچے کی چھاپ ہوتی ہے.... اپنا تو کچھ بھی نہیں، اندر بھی خالی، باہر بھی خالی.... اور وہ ننھے بچے کی طرح سسک سسک کر بولتا رہا...." میرا سوتیلا باپ.... میری آزادی جس نے چھین لی.... تمہیں دیکھ کر مجھے بچپن یاد آتا ہے جب میں گائے اور بھینس پر بیٹھ کر ہرے بھرے میدانوں میں گھوما کرتا تھا اور اپنا پسندیدہ گیت کس شان سے گاتا تھا.... میری بھینس کو ڈنڈا کیوں ملا.... اور آج میں خود ڈنڈے کھاتا ہوں، صبح سے گئی رات تک مشین بنا کام کرتا رہتا ہوں گر پھر بھی ڈنڈے کھاتا ہوں۔ صبح سے رات تک کام.... کام.... بس کام.... کبھی کبھار کھلی فضا میں آتا ہوں تو اس ڈری سہمی سی پتنگ کی طرح جس کی ڈور کسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

"تو تم بھاگ کیوں نہیں جاتے.... ؟" "ہاں میں بھاگنے کے لئے اکثر سوچتا ہوں مگر تمہیں کیا بتاؤں یہ صاحب لوگ بہت ہوشیار ہو گئے ہیں۔ ہماری فوٹو پہلے دن ہی لے کر اپنے پاس رکھ چکے ہیں ان کا کہنا ہے" ادھر تم بھاگے ادھر میں پولیس کو رپورٹ کروں گا۔ اور یار میں نے اپنے بھاگے ہوئے ساتھی کا حشر دیکھا ہے.... یہ صاحب لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں راجو!" "کیا تمہارے باپ سے بھی زیادہ ظالم ہیں جس نے تمہیں جان بوجھ کر اس پنجرے میں بند کیا؟" راجو کے اس آخری سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

[باقی صفحہ [illegible] پر ملاحظہ کیجئے]

رخسانہ شمیم

آئے وہ آکر ہر اندیشہ وہم و خواب بناڈالے
دل پہ پڑے اس بوجھ کو آکر سبک سحاب بناڈالے

یارب دے وہ کمالِ سخن جو دل پہ لگے سب زخموں کو
لالہ و گل یا جوہی ، سوسن ، سمن یا گلاب بناڈالے

ساتھ نہ دینا ہو تو بچھڑ جا، لیکن کوئی فیصلہ کر
حیلہ جو ! تونے تو میرے دن رات عذاب بناڈالے

میرے عناصر کی ہیئت آکے بدل کر ، کون ہے وہ
خونِ جگر سے آنکھ میں جو تصویرِ آب بناڈالے

رنگ فضا ہے ، رنگ تمہاری آنکھوں کا رخسانہ شمیم
موسمی چڑیا دیکھے تو اس کو سرخاب بناڈالے

Institute of Ethnology Free University Drossel Weg-1/3, 14195 Berlin (Germany)

رشمی بادشاہ

مری سوچ کے کئی زاویے تھے جنہیں سکوڑ کے رکھ دیا
عبث ایک طرفہ خیال سے مجھے اس نے توڑ کے رکھ دیا

ترے نیک و بد کا حساب ہے، مرا چہرہ تیری کتاب ہے
یہ کوئی پرانا ورق نہیں کہ کسی نے موڑ کے رکھ دیا

ترے ہجر میں ترے پاس ہوں، تری قربتوں میں اداس ہوں
اسی انوکھے ہجر و وصال نے تو مجھے نچوڑ کے رکھ دیا

ذرا دیکھ جا مرا حال بد، مرے زرد زرد سے خال و خد
تری چاہتوں کے طلسم نے تو یہ جسم توڑ کے رکھ دیا

وہ جو رشمی تیرا ہوا نہیں ، ترا کوئی اس کے سوا نہیں
تو نے اپنی آس کی ڈور کو بھی اسی سے جوڑ کے رکھ دیا

بوک ریسٹورینٹ۔ فیج گنی

تسنیم فاطمہ

آنے جانے میں اختتام ہوا
آنکھ جھپکی سفر تمام ہوا

دونوں جلتے رہیں گے بجھنے تک
میں ہوئی یا چراغ شام ہوا

گردشیں ختم ہوں تو سوچوں گی
کہاں ٹھہری کہاں قیام ہوا

وہ ہوا یوں میری حیات کا جزو
جیسے تسبیح میں امام ہوا

خود بخود جانے کیا ہوا تسنیم
میرا حرف حرف اس کے نام ہوا

106۔چوتھا منزلہ، دلکشا چیمبرز،Mariston Road، کراچی(پاکستان)

شاہدہ نسیم سالک

یاد آئی ہے کوئی بات بہت
ہم پہ بھاری ہے آج رات بہت

لوگ لکھتے ہیں دل کی تختی پر
ایک جیسے ہی واقعات بہت

کوئی بستی میں اب نہیں باقی
کرچکے لوگ واردات بہت

رُت بدلنے کا پھر سے امکاں ہے
آج چپ چپ ہے کائنات بہت

برگِ گل ہو کہ برگِ ریزہ ہو
دل کو لازم ہے احتیاط بہت

8904-Saxton Drive Westchester, OHIO 45069 (U.S.A)

فاطمہ تاج

جنھیں لوگ "اہلِ سخن" بولتے ہیں
ہم اُس کو بھی دیوانہ پن بولتے ہیں

زمانہ ستمگر ہے کتنا ، یہ سوچو
یہ لوگوں کے زخمی بدن بولتے ہیں

لہو آستینوں کا بولے نہ بولے
یہ سچ ہے کہ دار و رسن بولتے ہیں

جلیں کتنی لاشیں ہواؤں سے پوچھو
کٹے کتنے سر ، یہ کفن بولتے ہیں

بہاریں تو آئی ہیں اب کے برس بھی
یہ پوچھو کہ کیا کیا چمن بولتے ہیں

مکان نمبر:22-3-339، میر چوک،حیدر آباد۔500002

ناصرہ زبیری

محبتیں تھیں کبھی اپنے درمیاں کتنی
بچھا گئی ہے انا ہم میں دوریاں کتنی

سحاب، رنگ، دھنک، چاندنی، گھٹا، خوشبو
وہ اک خیال دکھاتا ہے جھلکیاں کتنی

کچھ احترام بھی ہے اور تھوڑی بندش بھی
وگرنہ چیخ میں ڈھل جائیں سسکیاں کتنی

نئی جفا کبھی گوارہ مگر خبر تو ملے
کہ جھیلتی ہیں ہمیں اور سختیاں کتنی

دلوں کی راہ کے اک سمت میں نہ ہونے سے
بدل گئی ہیں اذیت میں شادیاں کتنی

○ ۱۳۴۔ گلی نمبر ۶۵، ایف۔۱۰/۳، اسلام آباد (پاکستان)

نور جہاں نوری

میرے لئے سلام کہ دشنام، کچھ بھی ہو
دستِ صبا سے بھیجئے، پیغام کچھ بھی ہو

خوشبو ہے، جلترنگ ہے، شعلہ ہے، برق ہے
مجھ کو نہیں غرض کہ ترا نام کچھ بھی ہو

میں رہ نوردِ شوق ہوں، چلتی ہی جاؤں گی
منزل ملے، نہ مل سکے، انجام کچھ بھی ہو

رنگوں میں ایک رنگ، محبت کا رنگ ہے
رنگوں کے امتزاج پہ الزام کچھ بھی ہو

زہر آب ڈال کر بھی پلادے وہ پیار سے
پی لوں گی میں خوشی سے تہہ جام کچھ بھی ہو

4-Lender Court, North Acre Graham Park, London NW9 5GQ (U.K.) ○

ریحانہ قمر

وہ شخص جزو اگرچہ مری ہی ذات کا ہے
بتاؤں کیا کہ مجھے دکھ اسی کی بات کا ہے

رکھا تھا اس نے مری آنکھ پر ہتھیلی کو
اب انتظار نظر کو اسی کے ہاتھ کا ہے

سفر طویل نہیں تیرے گھر تلک لیکن
سفر یہی تو مری جان پل صراط کا ہے

گراں نہ گزرے تری جان پر صف آرائی
سمجھ نہ یہ کہ ہمیں خوف اپنی مات کا ہے

ملیں تو کیسے ملیں شمس اور قمر جاناں
کہ ایک دن کا مسافر، تو ایک رات کا ہے

8928, Mesa Oak DR. River Side, C.A 92508 (U.S.A.) ○

غزالہ خاکوانی

طویل ظلمت جو ہم نے کاٹی اسے بھی تم مختصر کہو گے
عذابِ جاں کے سوا یہاں پر تم اور کس کو ثمر کہو گے

شروع ہم نے سفر جہاں سے کیا تھا اب بھی وہیں کھڑے ہیں
ذرا بتاؤ کہ زندگانی میں اور کس کو بھنور کہو گے

خدائی صفتوں کے مدعی سیکڑوں ہی پھرتے ہیں اس جہاں میں
خدا کی بستی میں اب یہ سوچو کہ اور کس کو بشر کہو گے

تمام عالم تڑپ کے جاگا ہے اب ہر اک بوند پر لہو کی
سکوتِ شب میں وفا ہماری کا اور کس کو ثمر کہو گے

جو شاعرہ ہو، نئے معنی کی کوئی تشبیہہ تو بتاؤ
نہیں گر آنکھوں میں آرزو کی چمک تو کس کو قمر کہو گے

○ 126-J/2، گلشن کالونی، بہاولپور روڈ، ملتان (پاکستان)

رضیہ پروین

کسے خبر تھی مجھے لازوال کردے گا
مرا ہی درد مجھے اک مثال کردے گا

مری ہی آنکھوں سے ابھرے گا اک نیا سورج
مرا ہی عکس کبھی یہ کمال کردے گا

جواب دے نہ سکیں گے یہ ہونٹ پتھر کے
کبھی جو مجھ سے زمانہ سوال کردے گا

فلک سے آکے زمیں پر بکھر گئی ہوں میں
مرا وجود کوئی کیا بحال کردے گا؟

سفر حیات کا کتنا طویل لگتا ہے
یہ اک خیال مرا جینا محال کردے گا

○ امام منزل، سرائے، بھاگل پور، ۸۱۲۰۰۲ (بہار)

قمر جمالی

Flat No.117-C, A.G.Colony,
P.O.Yousuf guda, Hyderabad - 500045 (A.P.)

الاؤ

"باش ـــــ اُمّ ...... "

کوڑھی نے آخری لکڑی آگ میں پھینکتے ہوئے مضبوطی سے اپنے ہونٹ جکڑلئے۔ اب ہرطرف آگ کے سرخ شعلے رقص کر رہے تھے، اور کوڑھی بڑا مسرور نظر آتا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلتے تو لپکے مزید سُرخ ہوجاتے اور کوڑھی آنکھوں میں ایک شناسا چمک جاگ اُٹھتی ـــ

سرخی.....

قدِ آدم سرخی ـ

اس کی آنکھوں میں رچی بسی تھی یہ سرخی۔

اس کی اپنی بیوی کے آنچل کی سرخی ـ

الاؤ بھڑک اُٹھتا، تو اُسے ہرطرف سُرخی ہی سُرخی دکھائی دینے لگتی۔ جمالیات کے تجربے میں یہی تو ہوتا ہے۔ نظارگی میں نظر غائب ہوجاتی ہے اور باقی رہ جاتا ہے منظر ـــ !

"آگئیں ـــــ !!"

خوشی سے اس کی باچھیں پھیل جاتیں، وہ اُٹھنے کی ناکام کوشش کرتا اور دوبارہ اپنی بچھی بچھائی چار پائی پر گر پڑتا۔ مارے خوشی کے اس کے حلق سے مختلف آوازیں نکلنے لگتیں۔

پھر ـــــ وہ بدمست ہوجاتا۔

اپنے ٹونٹھے سے ہاتھ ہوا میں لہرا کر ناچنے لگتا۔ ایک بے ہنگم سا ناچ ـــ ! بے معنی سا۔

غیر کھائی صورت، گول گول اُبلی ہوئی سُرخ آنکھیں، ناک کے نام پر رخساروں کے بیچ دو پتلی سُرنگیں، اور ٹونٹھے سے ہاتھ۔ جب وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرانے لگتا تو انسان نہیں بلکہ کالا ناگ معلوم ہوتا۔ اِچھا دھاری ناگ جو اپنی منی کی روشنی میں آپ ہی بدمست ناچ رہا ہو۔

"آچھنا ـــــ میری دُولھن !! "

آنچ کے لپکے مدہم ہونے لگتے تو وہ انھیں بھڑکاتا اور اپنی باہیں پھیلا کر لپکوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کوشش کرتا۔

"آؤ ـــــ سما جاؤ مجھ میں۔ یا پھر..... مجھے سمیٹ لو اپنے آپ میں۔.. " عشق کی اس منزل سے کوڑھی اچھی طرح واقف تھا۔ بظاہر اس کا شکستہ جسم اس کے جذبات سے میل نہیں کھاتا تھا مگر اس نے اس کا تصور بھی کیا تھا ـــ !

وہ جنم سے کوڑھی پیدا تو نہیں ہوا تھا ـــ !!

اس کا ذہن بالکل جوان اور تازہ رہ گیا تھا اتنا ہی جتنا آج سے تیس برس پہلے تھا۔ جذبات سے امڈتی اس کی جوانی کو جانے کس کم بخت کی نظر کھا گئی تھی ـــ !

زندگی سے بھرپور تھا وہ۔

انگ انگ سے نشہ پھوٹتا تھا۔

ٹوٹے جسم اور جھڑتے بدن کے ساتھ ثابت انسانوں کے بیچ جینا کتنا مشکل ہے۔ ! یہ تو صرف وہی جان سکتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے وہ اس شکستہ جسم کے ساتھ حیات کی تیس منزلیں جی گیا ـــ ! ناچتے ناچتے وہ تھک گیا تھا۔ پسینے سے شرابور، نڈھال ہوگیا تھا۔

نفرت ہوگئی تھی اسے۔ خود سے ـــــ اپنے وجود سے ـــ سڑے گوشت کی بدبو سے۔ اور ـــــ بدن سے اٹھنے والی سڑاندسے ـــــ وہ مرنا چاہتا تھا۔

موت ـــــــــ ؟

کیسی ہوگی ـــــ ؟! آئینے سے رشتہ ٹوٹے زمانہ گزر گیا تھا۔ "نہیں ـــ یہ معمولی داغ نہیں ہیں۔ کوڑھ ہے۔ مرض بُری طرح پھیل گیا ہے۔ اب اس اسٹیج پر ہڈیاں موم کی طرح گھلنے لگتی ہیں ـ" ڈاکٹر نے اعلان کیا۔

بس آخری بار .....

ہاں۔ اُس دن اُس نے آخری بار آئینہ دیکھا تھا۔ اُس دن اُس نے اچانک محسوس کیا کہ ناک کی ہڈی پنا بنیاد کی چھت کی طرح بیٹھنے لگی ہے۔ وہ دیکھتا رہا..... دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا اُس کی صورت خوف ناک ہونے لگی ہے۔ اَب ناک کی جگہ صرف دو سوراخ باقی رہ گئے ہیں۔

غیض و غضب سے وہ پھنکارنے لگا۔ اور ——— آئینہ چٹخ گیا۔ اس کی صورت کرچیوں میں بکھر گئی۔ ہر عضو کے کئی ٹکڑے ہوئے۔ اب اس میں اپنی کرچیں شبیہ دیکھنے کی تاب نہیں رہی تھی نہ ہی کوئی آرزو اسے اپنی شبیہ دیکھنے پر اکساتی تھی۔

اُس دن ....

آخری بار۔ اُس نے بیوی کے سرخ آنچل کو قدموں تک کھینچ کر دلھن کی طرح اسے سمٹی سمٹائی دیکھا تھا۔

اس دن.......

اُس نے دیکھا ——— بیوی کے سفید رخساروں پر آنچل کی سرخی دہک اٹھی تھی۔ اُسے لگا اس کی بیوی کے چہرے سے آنچ کی لپٹیں اُٹھنے لگی تھیں۔ وہ گھبرا گیا اور مارے وحشت کے آنچل سر سے الٹ دیا۔ ہر طرف شہابی رنگ بکھر گیا۔ اُس کی آنکھیں سرخی پی گئیں تھیں۔ وہ اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنی بیوی کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکل گئی کیونکہ اسے لگا کہ اُس نے ایک الاؤ نگل لیا ——

اب کچھ نہیں بچا تھا اُس کے پاس۔ بس رہ گئی تھی سرخی، ایک منظر بن کر اپنی خواب گاہ میں دو بستروں کے بیچ فاصلہ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ حیات تاوان وصول کر رہی ہے۔ قسط در قسط۔

پھر ———

یہ فاصلہ بڑھتا رہا۔

خواب گاہ میں اب صرف ایک کھاٹ رہ گئی۔

بیوی سے صرف بول چال کا رشتہ باقی رہ گیا۔ وہ خود چاند سورج کی رفتار سے گھٹتی رہی۔ اس کے چہرے پر سہاگن کے نام پر صرف سیندور کی بندی رہ گئی۔ اُس کے جیتے جی تھا دودھ پیا یتیم خانے میں بھرتی کر دیا گیا۔

ایک دن.....

اس کے کمرے سے مین باہر دالان میں بچھی اس کی بیوی کی دری بھی اُٹھ گئی۔

پھر ———

گھر سمٹ کر ایک مربع فٹ کی چار پہیوں والی ہتھ بنڈی میں مجسّم ہو گیا۔ گھر ——— !

چار پہیوں والی ہتھ بنڈی —— ! !

گھر ———

بنڈی . . .

گھر ——— بنڈی. . . .

" ہاشں ——— اُمّ . . . . . "

غم کی شدت سے وہ بے قابو ہو گیا اور بازو رکھا المونیم کا بگونہ اٹھا کر آگ کے ڈھیر پر دے مارا۔ چنگاریاں چٹ پٹانے لگیں۔

" چیختی ہو؟ بے وفا — ! ابھی کچھ دیر میں سرد پڑ جاؤ گی۔ یا پھر..... " ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا اور چنگاریوں کو اپنے دوش پر بہت دور اڑا لے گیا۔ " دیکھا — ! میں نہ کہتا تھا — ! وہ آئے گا۔ تمہارا یار ——— عاشق اور تم اُس کے ساتھ بھاگ جاؤ گی۔ "

ایک اور طوفانی جھونکا چلا۔ راکھ کے انبار میں دبی چنگاریاں لمحہ بھر کو جی اُٹھیں۔ سفید راکھ میں سرخ نقطے نمودار ہوئے اور — پھر — سے اڑ گئے۔ " میں نہ کہتا تھا — ٹھہر — اے! جاتا کدھر ہے؟ بے رحم —— ! "

اُس نے بازو پڑی چپلیں اپنے ٹونٹھ سے ہاتھوں میں پہنیں، زمین پر ہتّے مارتا ہوا تیز تیز دوڑنے لگا۔ اُس پر وحشت سوار ہو گئی تھی۔ اس کا رقیب تھا ہوا کا جھونکا۔ ہمیشہ راکھ میں دبی چنگاریوں کو دور فضا کر اڑا لے جاتا تھا۔ "جان سے مار دوں گا — سُنا تم نے؟"

" کیسے —— کیسے جان سے مار دو گے بابا —— ؟ "

اُسے محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ سنسان میدان سے نکل کر آبادی میں چلا آیا —— !

اُس نے رُک کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔

ہاں۔ کیسے —— ؟ کس کو مارنے گا وہ ؟ ؟ اور... کس کو جواب دیتا ! وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔

بہت تھک گیا تھا وہ اپنے اندر والے اُس تنا ناور سے جو بار بار باہر والے کرم خوردہ بدن سے مات کھا جاتا تھا۔ وہ بہ مشکل کوشش

کرتا مگر پھر بھی جانے کیسے وہ بار بار جی اٹھتا۔ اُسے اپنے ان محسوسات پر غصہ بھی آتا اور پیار بھی۔ جسم و ذہن کے یہ رشتے اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئے۔

وہ انھیں جتنا دباتا ——— اتنے ہی انگیختہ ہو جاتے۔ اسے آج اس کی شدت سے یاد آنے لگی تھی جس کے ساتھ اُس نے زندگی کا پہلا سبق پڑھا تھا۔ شاید یہ اُس کا فطری تقاضہ تھا۔ وہ جانتا تھا۔

مگر . . . . .

مگر . . . مگر ——— مگر ——— پھر بھی مگر !!

یہ لفظ ——— لفظ نہیں۔ بے چارگی کی علامت ہے۔

یہی تو وہ لفظ ہے جو ایک تارِ عنکبوت کی طرح اُس کی زندگی کے اطراف لپٹ گیا ہے۔ اسے نفرت ہے اِس لفظ سے۔ پھر بھی قدم قدم پر اس کے سامنے ایک سنگِ میل کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کی بے بسی کی طوالت کی توسیع کر جاتا ہے۔

وہ رونا چاہتا ہے۔

مگر . . . . .

نہیں۔ وہ ہنسنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ جینا چاہتا ہے۔

مگر . . . . .

شاید ——— وہ اُسے اپنی باہوں میں بھر لینا چاہتا ہے جو سُرخ گھونگھٹ کے بیچ حیران سی کھُلی کھُلی بڑی آنکھوں سے ایک نہیں کئی جام قناعت پینا چاہتا ہے۔ میٹھے پانی کا کنواں تھی وہ،

مگر . . . .

وہ تو رہ گیا اوپر ——— پھوٹے ڈول کی طرح۔

اور رسّی ؟

کُشتے روگ چاٹ گیا اُسے۔

بس رہ گیا ایک سرا جو بجائے کٹ کر گر جانے کے، فراپ سے اُلٹا اندر چلا گیا، اُس کے وجود کے اندر۔ شاید یہی سرا رہ رہ کر اُس کے اندر ہل چل کرتا رہتا ہے۔

"میں جینا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ۔ سنتی ہو؟ تمہارے آنچل کی ٹھنڈک میں دیکھو! بظاہر میں بڑا خوف ناک لگتا ہوں مگر...

پھر وہی مگر . . . ایک تارِ عنکبوت جس کے اندر وہ ایک ادھ مری چیونٹی کی طرح تڑپ رہا ہے۔

میں اس عفریت سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ چار دیواروں کے بیچ، جسے گھر کہتے ہیں۔

"بابا! کبھی تمہارا بھی تو گھر رہا ہوگا ——— ؟"

اپنے آپ کو مکڑی کے جال سے آزاد کرانے کے لئے زمین پر اوندھے منہ گرا دائیں بائیں پلٹیاں کھاتا دیکھ کر اُس نے آج پھر اُسے ٹھوکا دیا۔

"گھر ——— ؟؟" اُس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔

"ہاں گھر ——— کبھی تم بھی تو گھر والے رہے ہو گے ؟"

"گھر ——— گھر والا ؟ ہاں ہاں میں جینا چاہتا ہوں۔ گھر والا بن کر ثابت بدن لوگوں کے بیچ۔ تمہاری طرح۔"

وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ صرف وہ تھا اور اُس کا ٹوٹتا وجود، جو مسلسل ٹوٹ رہا تھا۔ نس نس، ریشہ ریشہ۔ باہر سے بھی ——— اور اندر سے بھی۔

اب وہ پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ تیز رفتار۔ اپنی پناہ گاہ کی طرف جہاں اُس نے ایک دنیا بسا رکھی تھی۔ گھاس پھوس کا انبار، ٹوٹے جوتے اور پلاسٹک کے ناکارہ برتن۔

وہ دوڑ رہا تھا۔

بے تحاشہ ——— چار پہیوں اور ——— دو ہاتھوں پر۔

ہوا کے جھونکوں نے اُس جگہ کو بالکل صاف کر دیا تھا جہاں کچھ دیر قبل اُس نے الاؤ جلایا تھا۔ جھکڑ راکھ تک اڑا لے گئے تھے۔ صرف ایک احساس باقی رہ گیا تھا۔ زندگی کا ——— لمسِ انسانی کا ——— ایک سفید دھبّہ۔

اس نے دوبارہ اُس دھبّے کو آباد کر دیا۔ گھاس پھوس، ٹوٹے جوتے اور پلاسٹک کے ناکارہ برتنوں سے۔

"اب یہاں ناچ ہوگا ——— سرخ شعلوں کا ناچ۔ وہ آئے گی اَپچھرا۔ شعلہ بدن، سرخ آنچل ——— میری محبوبہ ——— ! میں ناچوں گا۔ تمہارے ساتھ۔ تمہارے آنچل کے سائے میں مجھے ضرورت ہے۔ تمہاری ——— تمہاری حرارت کی ——— آخر تم میری ضرورت ہو ——— میری اردھانگنی ہو ——— اپنیشدوں میں بھی یہی لکھا ہے ——— " وہ زور زور سے چلانے لگا۔ اُس پر وحشت طاری ہو گئی ———

"ہاشی ——— اُم . . . ."

کوڑھی نے جھولی سے ماچس نکالی اور جلتی ہوئی تیلی کچرے کے ڈھیر پر ڈال دی۔ آگ کے سرخ شعلے رقص کرنے لگے

وہ مسرور ہوتا رہا۔ اُس کے جسم میں حرارت پیدا ہونے لگی۔ چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔

کوڑھی بدمست ہوگیا۔

اُس کی سرخ گول گول آنکھیں پھیل کر وحشتناک ہوگئیں۔

وہ ہتھ بنڈی سے اٹھ کر کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔۔

اور آخر تھک ہار کر اسی میں پسر گیا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا۔

کوڑھی کے جسم پر بے شمار مکڑیاں رینگنے لگیں۔

چنگاریاں پکارنے لگیں۔

کوڑھی تلملا اُٹھا۔

نہیں آج یہ نہیں ہوگا۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ کم از کم آج تم اپنے عاشق کے ساتھ نہیں جاسکتیں۔

کیونکہ ——————

آج میں تمہاری ذات میں مدغم ہوجانا چاہتا ہوں۔ گھل مل جانا چاہتا ہوں۔ آخر تم میری ضرورت ہو۔ میرے بدن کی حرارت ہو تم ——— !

" ہاشن ————— اُم۔۔۔۔۔ "

کوڑھی نے ایک ماہر خلا باز کی طرح اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا دیئے۔

اور ————

فضاء میں جلتے گوشت کی چرائند پھیل گئی۔

بقیہ صفحہ ۱۳ شریف + مرد = ؟

اور اسی لئے میں نے بغیر کچھ سوچے اُنہیں ملازم رکھ لیا تھا ——— محترم۔۔۔۔"

اور میں ——— آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ایک شریف آدمی ہے مگر اس کے باوجود، میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ——— وہ روز مجھ سے یہی کہہ رہا ہے۔

" میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ میری وہ خطا شریفانہ تھی یا غیر شریفانہ۔ میرا سوال تو صرف یہ ہے کہ، مسز ندرت جیسی خواتین یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ گھروں میں کام کرنے والے ——— "شریف" "ملازم" "مرد" بھی ہوتے ہیں۔

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات " شاعر " بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت : بمبئی

پرنٹر و پبلشر : ناظر نعمان صدیقی

پتہ : دینا ناتھ بلڈنگ، تیسرا منزلہ، بی بی مارگ، بمبئی۔ ۴

ایڈیٹر : افتخار امام صدیقی قومیت : ہندوستانی

وقفہ اشاعت : ماہنامہ

ملکیت : ناظر نعمان صدیقی

قومیت : ہندوستانی۔ میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط : ناظر نعمان صدیقی ۲۸ فروری ۹۹ء۔

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے : فیمنسٹ ادب کا مسئلہ

کرتی تھیں مگر سماجی و ثقافتی اقدار اور آداب کے ڈھانچے کو توڑنے اور ختم کرنے کے حق میں نہیں تھیں اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد سماجی و ثقافتی اقدار اور آداب سے بغاوت پر آمادہ ہو گئیں۔

اس مجموعی تناظر میں جب ہم اپنے سماج کا جو طبقات سے بنا ہوا ہے، اور اس کے حوالوں سے اپنی علمی و ادبی معیار کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو بڑی بڑی کھوکھلے کڑی نظر آتی ہے اور جان منکرے کا موقف یاد آتا ہے کہ "ایسی نسلیں بلکہ کبھی کبھار ایسی صدیاں بھی ہوتی ہیں جب زندگی کو سمجھ [illegible] ہوتا ہے، [illegible] بہت کافی ہوتا ہے۔" (ترجمہ سلیم الرحمٰن۔ سویرا۔ لاہور۔ شمارہ ۲۵)۔ [illegible] معاشرہ نمبر ۵ کے ای [illegible]

سیما عابدی

پچھلا پہر!

پہر کا چاند
کھلے دریچے سے
ہے
اختیار
من۔ میری آنکھیں
رنے لگتی ہیں
پنے ہاتھ
لئے اٹھ جاتے ہیں

میں نے سنا ہے
مانگی ہوئی دعائیں قبول ہوتی ہیں

● 2715-W.Summer Dale (Gard)
Chicago IL 60625 (U.S.A.)

رخسانہ رخسار

بھنور

یادوں کے بھنور میں تو
تڑپ بھی ہوگی اور
جلن بھی

انصاف تو یہ ہے کہ سزا بھی ہوگی
خواب جس کے حصے میں آئیں گے
وہ بھی آسودہ ہی رہیں گے
کیونکہ
خواب ہی سے ہر وقت
نیا واقعہ نکلتا ہے،
یاد بن جاتا ہے
اور سزا کا حقدار بھی

● H No.7-831، نہرو گنج،
گول چوک، گلبرگہ 585104

درخشاں

ایک نظم

نکال دو اپنے ذہن و دل سے
اس راستے کو
جدھر تمہیں جانا نہیں
تمہاری خواہشیں ہوتے ہوئے بھی
یہاں نہ راستے نہ منزلیں
ملتی ہیں مرضی سے
یہاں تو منزلیں آواز دیتی ہیں
اپنے اپنے مسافر کو
پھر چل پڑتے ہیں وہ
انجان راستوں پر
اور پالیتی ہیں منزلیں
اپنے مسافر کو

● 178-A، سیکنڈ فلور، پی سی کالونی
کنکر باغ، پٹنہ۔ 800020 (بہار)

زہرہ منیر

سوغات

یہ بارش کے ننھے قطرے
کتنے پاکیزہ ہیں
میرے پیار کی طرح

یہ ٹھنڈی ہوا
کتنی شریر ہے
میرے آنچل کی طرح

یہ پھول
کتنے نازک ہیں
میرے دل کی طرح

یہ سمندر
کتنا وسیع ہے
تیرے پیار کی طرح

ہر دن
کتنا حسین ہے
ہر پل کی طرح

● Munir Ahmad,
... Doha
... A.G.

مہ جبیں قیصر
45-C, Billy's Home, Gulistane-Hijri,
Main university Road, Karachi - 75270 (Pakistan)



حصار

یہ تقریباً ڈیڑھ دو سو گھروں پر مشتمل بستی تھی جو خوبصورت مکانوں، سرسبز لانوں اور رنگ برنگی کیاریوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگ بڑے ملنسار اور مہذب تھے۔ اندرونی پریشانیاں، خوشیاں اور متعدد مسائل کو آپس میں میل جول اور سمجھوتوں سے حل کر لیا کرتے تھے۔ ان مسائل کے حل کے لئے ایک پنچایتی کمیٹی بنائی ہوئی تھی۔ جس کے سرکردہ لیڈر انصار احمد تھے۔ خوبصورت اسمارٹ اور ہردل عزیز شخصیت تھے۔ وہ اپنی عزت کروانا خوب جانتے تھے، خوشدلی اور انکساری ان کے مزاج کا خاصہ تھی گفتگو بہت دھیمے لہجے میں کرتے ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے بستی کے تمام مرد عورتیں اور بچے سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ بستی کی تمام عورتوں کو اپنی بہنوں کی ہی طرح سمجھتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ہر عورت کا دل انصار احمد کی ایک نگاہ پر دھڑک اٹھتا تھا۔ تمام عورتیں ہی اپنے شوہروں سے بچ بچا کر ان کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتی تھیں: "ہائے اللہ کتنے اچھے ہیں بھائی انصار" "واہ بھائی اللہ سب کو ایسا میاں دے" یہ کہتے ہوئے ان کی آہیں سرد ہو جایا کرتی تھیں۔

انصار احمد بھی اپنی ذمہ داریاں بخوبی نباہ رہے تھے۔ وہ دفتر کے بعد سارا وقت بستی کی فلاح و بہبود میں صرف کرتے تھے اور پورے دو سو گھروں کی خبر رکھتے تھے۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے بچے ہوا ہو، کسی کے یہاں شادی کی تقریب ہو، انصار احمد آگے آگے ہوتے اگر کوئی دم آخر ہوتا تو وہ آخری سانسوں تک ... سخت پریشان ... ایسا لگتا تھا جیسے تمام مصیبتیں انھیں پر ... تمام ... کے علاوہ ... [illegible]

انصار احمد بھی یہ بات بخوبی جانتے تھے مگر جو بات ان کے بس میں نہ تھی وہ اس کے لئے زیادہ تردد کا شکار نہیں تھے۔ وہ ایک ... گھریلو زندگی گزار رہے تھے بیوی کو وہ پسند کرتے تھے یا نہیں یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا مگر بظاہر جو رویہ تھا وہ سب پر ظاہر تھا۔ ان پر نوازشیں بھی کرتے تھے اور اپنے ساتھ ہر جگہ فرنٹ سیٹ پر بٹھائے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ اور انہی اسباب کی بنا پر بستی کی عورتوں کا مشترکہ خیال تھا کہ یہ بھی احساس کمتری کی ایک شکل ہے۔ اور اسی لئے سب خواتین کو ان کی بیوی صد درجہ مکروہ نظر آیا کرتی تھی۔

ان کی بیوی بھی اپنے بارے میں خود آگاہ تھی چنانچہ اسی لئے انھوں نے بازوؤں کا گھیرا انصار احمد کے گرد مضبوطی سے ... ہوا تھا۔ یوں تو وہ ان کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھیں مگر پھر وہ عورت تھیں اور عورت کے بطون میں اگر شک کا پھندا نہ ہو تو وہ عورت کہلانے کی مستحق نہیں۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ مرد کے ... میں کچھ دیر نہیں لگتی گو کہ وہ زیادہ قصور وار عورتوں ہی کو ... تھیں ان کا خیال تھا کہ عورت کو آزاد نہیں ہونا چاہئے۔ ... اپنی ناز و ادا سے کسی بھی مرد کو ورغلا سکتی ہے۔ انھیں ... مردوں سے ان کا میل جول سخت ناپسند تھا۔ اور آج کل کی لڑکیاں۔ اللہ توبہ! وہ اکثر اس بات کو دہراتی رہتی ... سے وہ ہر وقت بھی سنوری نظر آیا کرتی تھیں ... اور ... میک اپ کے ذریعہ ہی انھوں نے انصار احمد پر ... کیا ہوا تھا۔ وہ شام سے ان کا انتظار کرتیں ... پھر ... میں ... شام ... [illegible]

[illegible]

[illegible] ان کے وجود میں بھی وہی جوہر تھا اور ان
[illegible] اور حسن کی پرکھ بھی موجود تھی۔ یہی وہ اقوال
[illegible] ہم تو آج تک ان کے ذہن
[illegible] اسی خواب کو پورا ہوتا دیکھ رہے تھے۔ جس کا عالم
[illegible] بہت کا خاص اثر ان پر تھا یہ وہ دور تھا
[illegible] دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ مگر
[illegible] اس جذبہ کو شکست دے کر دل کے نہاں خانے میں
[illegible] اور اس کوشش میں وہ کسی حد تک کام
[illegible] زندگی کی شاہراہ پر کبھی کہیں مل گیا تو؟
[illegible] بھی ہوشیار رہ سکتا ہے وہ اکثر پریشان
[illegible] یہ سب خدا کا ظہور تو ہے عشق تو
[illegible] اپنے پیغمبروں کے یہاں بھی تو موجود تھا اسی
[illegible] باقاعدہ گفتگوں سے پارسا
[illegible] جو اس کے در پہ جانا چاہتے
[illegible] عشق کا قتل کر رہا تھا۔ ان کا
[illegible] محبوب کے خیال کی
[illegible] اس [illegible] شاعر
[illegible]

مکتبۂ قصر الادب

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری
شدہ
۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۰واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

شاعر

جلد ـــــ ۷۰
شمارہ ـــــ ۳

فون: 3829904

مارچ ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری	معاونین سے
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۲ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکر امروز

دراصل شاعری، جس کی تحلیل اس مختصر سے خطبے میں ممکن نہیں، بہت ہی اہم اور مشکل ترین فن ہے جو ظنیات کو علیحدہ کر کے صرف شاعر کے باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر جس جس روحانی منزل سے گزرتا جائے گا، اس کی شاعری بھی اتنی ہی ترقی کرتی جائے گی۔ غزل، جو روحانیت کے بلند ترین تخیل کے مقابلے میں بہت بڑی حد تک مادّی یعنی مجازی دنیا سے تعلق رکھتی ہے، اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ شاعر کی روح سوزِ محبت سے خاکستر ہو چکی ہو۔ اس کے بعد وہ جس جس طرح محبت اور اس کے ارتقاء کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اس کی شاعری بھی بلند ہوتی جائے گی اور اس بلندی کے ساتھ ساتھ تصوف، توحید اور دوسرے مسائل کی جھلک اس کے کلام میں نظر آتی جائے گی۔

حقیقی شاعر اپنے تغزل میں ان مدارج و مراتب پر پہنچ کر ایسا لطیف چھینٹا دیتا ہے کہ سارا عالم محسوس اس کے رنگ کا پر تو معلوم ہونے لگتا ہے۔

(مشاعرہ بزمِ ادب کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، منعقدہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کے خطبۂ صدارت سے ایک اقتباس)

سیماب اکبرآبادی

سرورق
حامد اقبال صدیقی

✻

ہم عصر اردو ادب نمبر
ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں
[قارئین و قلمکار]
۴۰

شمارہ ۳ [مارچ ۱۹۹۹ء] جلد ۷۰

غزل : ۲۱ ویں صدی میں

اردو چینل کے حوالے سے 'غزل' کے بارے میں 'جرعات' کے تحت خاصی گفتگو کی جاچکی ہے۔ اس پر کئی طرح کے ردِّ عمل آچکے ہیں۔ مجموعی طور پر آج اردو والوں کا جو مزاج ہے، اردو اور غزل، دونوں ہی اس خطرناک مزاج کی زد میں ہیں اور مسلسل ہیں۔ احساس کمتری کے مظاہر اور اردو کے نام پر جو جہاں جس طرح ٹکا ہوا ہے، اس میں کسی طرح کی تبدیلی کا یا تو وہ خواہاں نہیں یا پھر خوف زدہ ہے کہ روٹی روزی کے راستے اور شہرتوں کے سلسلے بند ہو جائیں گے۔ کوئی کچھ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں! شکایتوں اور ایک دوسرے کے خلاف بولنے کے لئے ہر شخص آمادہ ہے۔ نہ تو ہم نے اردو رسم الخط کے لئے کوئی ہندوستان گیر منصوبہ بنایا اور نہ ہی 'غزل' کو اپنا فخر۔ جو ہے بھی ہے وہ سب رسمی، وقتی اور میکانیکی ہے۔ اردو رسم الخط کی مخالفت کرنے والے 'اہلِ اردو' اور صنف غزل سے الرجک، اردو شعرا۔ جب خود اردو والوں ہی میں 'دشمن' موجود ہوں تو 'اردو باہر' مخالفین سے کیسا مکالمہ اور کیسی جنگ۔ بزرگوں کے بے ضرر 'وقتی بیانات' سے کچھ دیر کے لئے اخبارات میں شاہ سرخیاں تھوڑی بہت ہلچل ضرور پیدا کر دیتی ہیں لیکن پھر وہی روایتی خاموشی اور سناٹا پھیل جاتا ہے۔ 'اردو اور غزل' کے لئے نیا کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

اب اردو غزل، ۲۱ویں صدی میں اپنی ایک اور صدی کا آغاز کرنے والی ہے چنانچہ غزل پر کسی علمی و ادبی اور فنی بحث کے بجائے ان امور پر غور کیا جانا چاہیے اور انھیں خطوط پر کام ہونا چاہیے جو غزل نے ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں کو عطا کیا ہے۔ ۲۱ویں صدی مکمل طور پر الیکٹرانک میڈیا کے تابع رہے گی۔ گھر گھر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا چلن ہوگا اور فنون لطیفہ کی جو بھی صورت ہوگی وہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہی کے ذریعے سے بنے گی اور 'غزل' ہر جگہ موجود رہے گی۔ یہ مفروضہ اپنے آپ میں کئی دلائل رکھتا ہے:

ہندوستان کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں 'غزل' تخلیقی اظہار کا ذریعہ بن رہی ہے۔ غزل کا رشتہ، ہندوستان کے مشترکہ تہذیب و تمدن اور ہندوستانی عوام سے بہت اٹوٹ اور گہرا ہے بلکہ 'غزل' تو ہندوستانی عوام کی مجموعی جمالیات کا خوب سیرت اظہار ہے۔ ہندوستانی فلمیں، ہندوستانی موسیقی اور تمام کلچرل سرگرمیوں میں ہر طرف ہر جگہ غزل موجود ہے۔ ہندوستان کی فضاؤں میں ہمہ وقت بکھرتی ہوئی، گونجتی ہوئی موسیقی میں، آوازوں میں، گیتوں، نغموں میں اردو لفظیات اور غزل کا آہنگ موجود ہے۔ کیا اس حقیقت کا اطلاق ممکن ہے کہ غزل نے نہ صرف اردو کو بلکہ ہندی کو بھی فروغ دیا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ عوام سے ہندی کا تعلق، اردو غزل سے ہی استوار ہوا ہے۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہونے والے ہزاروں لاکھوں افراد (بیشتر ہندی رسم الخط کے پروردہ) کوی سمیلنوں میں شریک ہونے والے اردو شعراء (معمولی سے معمولی اردو شاعر اور ناشاعر بھی کامیاب رہتا ہے۔) فلم اور ٹی وی کی مجموعی زبان۔ دوسری زبانوں کا شعر و ادب، ہر جگہ غزل ہی کی کارفرمائیاں ہیں۔ صنف غزل کا دائرہ ہندوستان سے باہر پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں میں بھی پھیل گیا ہے۔ اردو اور غزل، لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں اردو ہے وہاں غزل بھی ہے۔ مشاعرے اور غزل گائیکی کے پروگرام تواتر سے ہوتے رہتے ہیں۔ عوام و خواص کی مجالس ہوں یا روزمرہ گفتگو، غزل کے شعر ہر جگہ موجود ہیں۔ غزل نے ہندوپاک کے فنون لطیفہ کو متاثر کیا ہے۔ غزل کا رنگ و آہنگ اب لوک گیتوں میں ابھر رہا ہے۔ غزل تو زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ اگر سوچا جائے اور محسوس کیا جائے تو غزل ہی ہندوستان ہے۔ ۲۱ویں صدی کی مقبول ترین صنف سخن 'غزل' ہی ہوگی۔ نئی صدی میں آدمی کے پاس وقت ہی کہاں ہوگا کہ وہ کتابوں، رسالوں کو پڑھے گا۔ یا ان میں شامل فلسفہ زدہ، غیر موسیقی آمیز، بے روح اور بے رس شاعری کو وقت دے سکے گا۔ طویل طویل، الجھی ہوئی بے معنی نظموں میں اپنا سر کھپا سکے گا۔ غزل کے دفاع میں نظم کی دیگر اصناف یا ہیئتوں کے خلاف تو نہیں جیسا کہ غزل مخالف شعرا کا طرز عمل رہا ہے لیکن غزل کو اب کاغذ کے باہر بھی دیکھنا اور سوچنا ہے کہ یہ جادوگری، صدی در صدی سفر در سفر کیوں ہے؟ ہزار مخالفتوں کے باوجود۔ مشینوں میں تبدیل ہوتے ہوئے، ختم ہوتے ہوئے آدمی کے پاس صرف آوازیں رہ جائیں گی یا آوازوں کا ایک بے ہنگم شور۔ اور اس شور میں غزل کے شعر بہر حال سنائی دیں گے فرض کیجئے کہ آدمی مکمل مشین بن جائے یا کلوننگ کا چلن عام ہو جائے اور آدمی کا وجدان ہی ختم ہو جائے تب بھی غزل کا ایک آدھ شعر کہیں نہ کہیں حرف اختتام کے طور پر موجود رہے گا۔

آج عالمی سطح پر فنونِ لطیفہ میں بہت تیزی سے تبدیلیاں آئی ہیں۔ کل جو معیارات تھے وہ آج نہیں رہے۔ آج مجموعی ذہنی گونج کچھ اور ہے۔ اجتماعی اور انفرادی لاشعور اور وجدان کچھ اور ہوتا جا رہا ہے۔ وزن و آہنگ سے مکمل آزادی کی طرف بڑھتی ہوئی دنیا میں، چھوٹی بڑی زبانوں کی شاعری اب محض خیال اور لفظ میں تخلیق ہو رہی ہے۔ لفظ بھی اب کم ہوتے جا رہے ہیں اور جو ہیں وہ کمزور تر ہیں۔ اب شاید ۲۱ویں صدی کی زبان اور اسلوب ہتھیاروں، بموں اور کیمیاوی ہتھیاروں سے عبارت ہوگا اور بچے ہوئے آدمی کم سے کم لفظوں میں بولنا پسند کریں گے۔ اور غزل کا ایک شعر یا ایک مصرع اس کی مثال بنے گا۔ کتاب زدہ اور کتابی باتیں کرنے والے بے عمل غزل مخالفین اپنے آس پاس سے باہر نکل کر 'مستقبل' کے بارے میں غور کریں اور سوچیں کہ وہ کن فکری مغالطوں اور مبالغوں میں مبتلا ہو کر غزل کی مخالفت کر رہے ہیں۔ غزل کو اس کے فطری بہاؤ اور اس کی طویل ترین عمر کے تناظر میں دیکھیں تاکہ اردو زبان کے لئے مسلسل دفاع کرنے والی اس صنف کو ہندوستان کے لئے، اس کی قومی یک جہتی کے لئے مزید کارآمد بنایا جاسکے۔ ان تمام مفروضوں اور مباحث سے قطع نظر جو غزل کے فنی اور معیاری مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔

اردو اور غزل تو ہندوستان کا مزاج ہیں، ہندوستان کی بہت بڑی قوت ہیں۔ ہندوستان سے باہر، ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہیں ہندوستان کی اگر کوئی تعریف ہو سکتی ہے تو وہ اردو اور غزل ہی میں ہے۔ ہم اردو والوں نے اب تک اس راز کو سمجھا ہی نہیں کہ اردو اور غزل کو اپنے لئے کس طرح کارآمد اور موثر بنایا جائے۔ حیرت ہے کہ ایک تیز و طرار اور چالاک شخص، تنہا سیاسی پارٹی بنا کر ایوانِ حکومت میں بیٹھ سکتا ہے، شور مچا سکتا ہے، دھمکا سکتا ہے لیکن لاکھوں، کروڑوں اردو والے ایک آواز اور ایک طاقت نہیں بن سکتے، غزل کو اپنی ڈھال اپنی آواز نہیں بنا سکتے۔؟؟

غزل

مطرب وہ کباب اب بزمِ طرب تکلیف رہِ پرخار اٹھا
ساقی یہ زمانِ عیش نہیں شیشہ نہ اٹھا تلوار اٹھا

زنداں میں تو مجھکو ڈال دیا اے حاکمِ زنداں تو نے مگر
پرواز کو میری روک سکے ایسی بھی کوئی دیوار اٹھا

یہ عہدِ خرد ہے عہدِ خرد یاں عشق و جنوں کا ذکر ہی کیا
اے واعظِ ناداں ہوش میں آ تقریر نہ کر دستار اٹھا

کیا جانئے کیا ہے اس کی طلب کھلتا ہی نہیں کچھ اس کا سبب
ہر بزم سے دل مسموم اٹھا مغموم اٹھا بیزار اٹھا

یہ بزم گہِ ہستی ہے جگر یاں عشق کی صحت لازم ہے
کیا اس کی حیات و مرگ کہ جو بیمار جیا بیمار اٹھا

شاعر کو فضا جس کا انداز نہ ہو فتنہ بھی آخر کار اٹھا
اس عصر میں جب ظلم بڑھا اک شعلہ عشق میں ہر دار اٹھا

جگر مرادآبادی کی ایک غزل

جگر مرادآبادی [پ: ٦ر اپریل ١٨٩٠ء (مرادآباد)۔ م: ٩ ستمبر ١٩٦٠ء (گونڈہ)] کی ایک غزل جس پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ ١٦ر اپریل ١٩٥٦ء کو انھوں نے دہلی میں سنائی تھی اور نثار احمد فاروقی نے اپنے قلم سے لکھ کر جگر مرحوم سے دستخط کرا لیے تھے۔

جگر مرادآبادی پر تحقیقی کام تو ہوا نہیں، لیکن اب ضرورت ہے کہ صحتِ متن کے ساتھ ان کا کلیات مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ شائقینِ جگر غزل کو ایک نئے، صاف ستھرے، معنوی اور خوبصورت شعری متن کا انتظار ہے۔ [ادارہ]



کالی داس گپتا رضا

ذہنِ مثبت نے کچھ آرام نہ پایا ہوگا
در کھلا تھا کوئی مہمان تو آیا ہوگا

کوئی چھپّر، کوئی کھڑکی، کوئی دیوار نہیں
یہ نگر بادِ مخالف نے بسایا ہوگا

چلتے میں تم نے لیا ہوگا گلوں کا بوسہ
بوئے پابستہ کو یوں آگے بڑھایا ہوگا

اب بھٹکتا ہے غم و درد کے سناٹوں میں
آنسوؤں میں یہ زمانہ نہ سمایا ہوگا

ہر قدم کہتا ہے دل، دشتِ جفا کے اس پار
گلستاں ہو کہ نہ ہو، پیڑ کا سایا ہوگا

لاکھ جی چاہے گا، دستک پہ یقیں مت کرنا
گھر وہی آئے گا جو خواب میں آیا ہوگا

کسی موسم میں نہ تھا، باغ پنپنے والا
بیتے لمحوں ہی نے یہ رنگ جمایا ہوگا

اے رضاؔ راہ پہ ہیں حسنِ نظر کے راہی
ہو نہ ہو پیار کے موسم نے بلایا ہوگا

● A-2، جل درشن، A-43، چوتھا منزلہ،
نیپنسی روڈ ممبئی۔۴۰۰۰۳۶



ضیاء جالندھری

مجھے تو اس تغیرِ عجیب کا گماں نہ تھا
ہرے بھرے درخت پر صلیب کا گماں نہ تھا

نہیں کہ آفتاب کے زوال کی خبر نہ تھی
خبر تو تھی پہ اس شبِ مہیب کا گماں نہ تھا

سرِ بساط ایک ایک چال تھی نگاہ میں
پسِ بساط سازشِ نصیب کا گماں نہ تھا

قدم قدم نمود و بود کا وہی ہے سلسلہ
امیر کا یقیں تو تھا غریب کا گماں نہ تھا

سب اہلِ بزم ایک دوسرے کے غم شناس تھے
وہ کون تھا کہ جس پہ شبِ رقیب کا گماں نہ تھا

● نمبر ۱۰۱/۷، اسٹریٹ نمبر ۱۳، F-7/2،
اسلام آباد (پاکستان)



شہــــریــــار

شکوہ کوئی دریا کی روانی سے نہیں ہے
رشتہ ہی مری پیاس کا پانی سے نہیں ہے

کل یوں تھا کہ یہ قیدِ زمانی سے تھے بیزار
فرصت جنھیں اب سیرِ مکانی سے نہیں ہے

چاہا تو یقیں آئے نہ سچائی پہ اس کی
خائف کوئی گل عہدِ خزانی سے نہیں ہے

دہرا تا نہیں میں بھی گئے لوگوں کی باتیں
اس دور کو نسبت بھی کہانی سے نہیں ہے

کہتے ہیں مرے حق میں سخن فہم بس اتنا
شعروں میں جو خوبی ہے معانی میں نہیں ہے

● A-4/81/، کبیر کالونی، جمال پور،
علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲ (یوپی)

گفتگو بے ادب نہیں کرنی

ادبی فیچر

گذشتہ کئی شماروں سے شاعر میں دیئے جانے والے ادبی فیچر کو قارئین پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں ۔ اس "ادبی فیچر" میں شامل خطوط کے مباحث پر توجہ کی جارہی ہے ۔ شاعر کی نئی ترتیب و تہذیب کے لئے "ادبی فیچر" کی یہ ابتدائی شکل ہے ۔ اسے ابھی اور گہرا اور تخلیقی ہونا ہے ۔ فی الحال تو سارے مباحث شاعر کے مندرجات پر مبنی ہیں تاہم گزارش یہ بھی ہے کہ قارئین شاعر " ادبی فیچر" کو اور زیادہ علمی و ادبی اور معلوماتی بنانے کی سعی فرمائیں ۔ شاعر کے مندرجات پر کسی بھی ادبی مکالمے کو مزید روشن کیا جاسکتا ہے یا ان مندرجات کے حوالے سے نئے مباحث و مکالمے قائم کئے جاسکتے ہیں ۔ نئے مسائل پر گفتگو ہوسکتی ہے ۔ نئے ادبی مخاطبہ (Discourse) میں قاری کی شمولیت بہت ضروری ہے۔ اظہار و تکّلم سے ابھرنے والی روشنی سے فن پاروں کی پرکھ ہوتی ہے ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مصنف اور قاری اپنے مطالعے ، مشاہدے اور تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کرے ۔ ہمیں ۲۱ ویں صدی میں نئی ادبی تاریخ کو سچّائی اور ایمانداری کے ساتھ رقم کرنے کی پرخلوص کاوش کرنی ہے جبکہ ۲۰ ویں صدی کے نصفِ آخر میں ذاتی پسند ناپسند ، ذہنی تعصبات اور ذاتی منصب داریوں کی کارگزاریاں بہت ہوئی ہیں ۔ آج غیرادبی سرگرمیاں اور کارگزاریاں پہلے سے تیز تر ہیں۔ ہر طرح کی احتیاط کے باوجود رسالہ شاعر بھی "چلن" اور "دستور زمانہ" کی زد میں آہی جاتا ہے ۔ ذاتیات سے اجتناب کیجئے اور صرف اور صرف زندگی آمیز شعر وادب کی بات کیجئے ۔
(ادارہ)

انوار محسن

مابعد جدیدیت پر ایک مکالمہ

آپ کے خطوط اکساتے ہیں، حوصلہ بڑھاتے ہیں اور متحرک کرتے ہیں۔ ادھر نارنگ صاحب کی کتاب "اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ" منظر عام پر آئی ہے، زیر مطالعہ ہے۔ کتاب میں موجود نظریاتی مباحث اُن ہی بنیادوں پر استوار نظر آتے ہیں جن کا اجمالی خاکہ میرے مضمون "نئی نسل نئے جہان معنی کی تلاش میں" میں دیکھا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ مضمون لگ بھگ تین برسوں کے بعد شائع ہوا۔ نوٹ میں آپ کی صراحت سے بات واضح ہوگئی ہے۔ آپ اتفاق کریں گے کہ ۹۵ء تک مابعد جدیدیت (جسے میں نے اپنے مضمون میں "انضمامیت" کہا ہے۔) کا تصور واضح طور پر ابھر کر سامنے نہیں آیا تھا۔ ویسے "مابعد جدیدیت" کی اصطلاح پر مجھے کلام ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم Post- Modernism کا سیدھا سادا لفظی ترجمہ ادبی رجحان کے نام پر خود پر مسلط کرلیں۔ دوسری طرف مابعد جدیدیت کے بعد کیا؟ کیا مابعد، مابعد جدیدیت۔ پھر مابعد، مابعد، مابعد جدیدیت۔ پھر۔ پھر۔ غور کیجئے کیسی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ دوبات کی ایک بات یہ کہ جب ہم جدیدیت سے انحراف کی بات کررہے ہیں تو اسی تحریک سے اصطلاح مستعار کیسے لے سکتے ہیں؟ اردو کے لسانیاتی مزاج پر غور کریں تو مابعد جدیدیت کی اصطلاح ادھوری معلوم ہوگی، مابعد جدیدیت، یعنی جدیدیت کے بعد؟ سوال یہ ہے کہ جدیدیت کے بعد کیا؟ آم یا الی؟ "انضمامیت" ایک ایسی اصطلاح ہے جو نئے ادبی رجحان کی نمائندگی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ آج نظریات سے فرار نہیں بلکہ ہر طرح کے نظریات کے Synthesis کی باتیں ہورہی ہیں۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالے کی ضرورت ہے جس کا خاکہ میرے ذہن میں بن رہا ہے۔

مابعد جدیدیت کے تعلق سے چند ایک باتیں غور طلب ہیں۔ مابعد جدیدیت کن بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کررہی ہے؟ جدیدیت کا رشتہ وجودیت اور تجریدیت سے کافی گہرا رہا ہے۔ ہر طرح کے نظریات سے انحراف کا فلسفہ جدیدیت کی دین ہے۔ اس نے علامت، اساطیر، تمثیل اور داستانوں کا استعمال ذریعۂ اظہار کے طور پر کیا۔ معنی کی جگہ ہیئت کو مقدم جانا۔ عام قاری یا Readership کی اہمیت سے انکار کیا۔ تو کیا آج ان تمام چیزوں سے انحراف کیا جارہا ہے اور کیا یہ انحراف ممکن ہے؟ افسانے میں کہانی پن کی واپسی، تجریدیت کی جگہ بیانیہ کا چلن، خلاء سے سطح پر اتر آنے کی باتیں وغیرہ وغیرہ۔ چلئے تسلیم کہ اس طرح ہم جدیدیت سے منحرف ہوگئے لیکن اس روّیے کو مابعد جدیدیت کی دین ثابت کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ کیوں کہ جدیدیت سے پہلے فنکار یہی سب کچھ تو کررہے تھے تو پھر آپ کی انفرادیت کیا ہوئی یا آپ انفرادیت کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں؟ نارنگ صاحب مابعد جدیدیت کو ایک پس ساختیاتی روّیہ مانتے ہیں۔ اس میں قباحت یہ ہے کہ پس ساختیات ادبی متن کے مطالعے سے متعلق ایک لسانی رتنقیدی طریقۂ کار ہے۔ یہ Means ہے end نہیں یعنی یہ کوئی مربوط فلسفۂ حیات نہیں جیسا کہ مثال کے طور پر مارکسزم یا سارترے کی Being and Nothingness میں پیش کردہ وجودیت۔ ایک لسانی رتنقیدی طریقۂ کار کے بطن سے کسی اہم ادبی تحریک کے لوازمے کی پیدائش تاریخ ادب میں

ایک حیرت ناک واقعہ قرار پائے گا۔

۷۰ء یا ۸۰ء کے بعد وہ کون سے عوامل اور محرکات تھے جن سے بہرہ مند ہو کر ہم مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہو گئے، آخر اس طلسم کا در کھلا کیسے؟۔ Information technology, Internet, information super highway, Global village, Economic liberalisation، سرد جنگ کا خاتمہ، بین الاقوامی کمپنیوں کی آمد وغیرہ نے معاشرے اور فرد کے چہرے کو یکسر مختلف کر دیا جیسا کہ وہ جدیدیت کی نظر میں تھا۔ کون کافر اس بات سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ سماج بدلا، فرد بدلا، تاریخی نظر بدلی، نفسیاتی مسائل مختلف ہو گئے۔ نئی گتھیاں، نئے موضوعات پیدا ہوئے لیکن فنکار کہاں بدلا؟ اس تبدیل شدہ صورت حال کی بازگشت اس کے فن میں کہاں ہے؟ اصل مسئلہ یہی ہے۔ باتیں بنانا اور بات ہے کہ اس میں دماغ کے تیل کی ضرورت نہیں پڑتی ورنہ حق تو یہ ہے کہ ہمارے فنکار سطحی تجربات سے بلند ہو کر کسی بڑے تجربے کا تخلیقی استعمال کرنے لائق نہ مشاہدہ رکھتے ہیں نہ ہی ان کا محدود علم انہیں اس کی اجازت دیتا ہے۔ ہمارے بیشتر فنکار، نقادوں کے کثرت مطالعہ کے بوجھ کے نیچے دبے حلقہ بگوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ نہ تو ترقی پسند اور نہ ہی جدیدیت پسند، اقبال کے معیار کا کوئی شاعر پیدا کر پائے۔ غالب یا میر آج بھی ہمارے لئے relevant ہیں جبکہ ایک ترقی پسند شاعر جدیدیت کے پرستاروں کے لئے غیر ضروری ہو جاتا ہے اور جدید شاعر مابعد جدیدیت کے لئے irrelevant ہو رہا ہے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیشتر فنکاروں کی کوتاہ علمی اور بند ذہنیت انہیں نقادوں کی تقلید و تائید کی گمراہ راہ پر ڈال دیتی ہے۔ نقاد سطح زمین دکھا کر کہتا ہے۔ "دیکھو یہاں ایک کنواں ہے جس کی گہرائی کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔" ہمارا فنکار کہتا ہے۔ "جناب! میں صاف صاف دیکھ رہا ہوں۔"

کچھ یہی حال ہمارے آج کے فنکاروں کا ہے۔ مابعد جدیدیت کی اگلی صف میں کھڑے ہونے کے لئے ہائے توبہ مچانے والے بیشتر لوگ معاشرے کے روایتی پس منظر سے ہی نابلد ہیں۔ چہ جائیکہ ان سے یہ توقع کریں کہ وہ مابعد جدید معاشرہ اور فرد کے رشتوں کی گتھیوں اور نئی صورت حال کا تخلیقی اظہار کریں گے۔ یہ بات سبھی فنکاروں پر لاگو نہیں ہوتی کہ اس آباد خرابے میں کچھ بیدار مغز فنکار موجود ہیں۔ صلاح الدین پرویز، شموئل احمد، شاہد جمیل، ساجد رشید، انور خاں، آصف فرخی، عبد الصمد، خالد عبادی، حسین الحق، سید محمد اشرف، شوکت حیات، انور امام، مشرف عالم ذوقی، بیگ احساس، سلام بن رزاق، بدر عالم خلش، خورشید اکبر، سرور ساجد، جمال اویسی، شاہد کلیم، ترنم ریاض، نعمان شوق، فخر الدین عارفی اور صغیر رحمانی وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ اور اہم نام چھوٹ گئے ہوں لیکن عمومی طور پر بہت کم فنکار ہیں جو نئی صورت حال سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ آج کتنے فنکار ہیں جو Strategic Marketing سے واقف ہیں؟ فاؤنٹین پین کو بال پوائنٹ پین نے Out of date کر دیا۔ لکھنے کی جمالیات بدل گئی، ایسی تبدیلیوں کو کتنے فنکار تخلیقیت کا حصہ بناپاتے ہیں؟ Genetics نے تبدیلیٔ جنس کو ایک کھیل بنادیا، ہمارے یہاں فنکار اس المیے سے واقف ہی نہیں (تخلیقی سطح پر)۔ آج Future Industry کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایسی مصنوعات پر ریسرچ کی جارہی ہے جن کا وجود نہیں اور جن کے متعلق خریداروں کو بھی یہ علم نہیں کہ اُسے ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ Advertising کی دنیا ہمیں خوابوں کا کوہ قاف دکھا رہی ہے۔ Market Economy کی وکالت کرنے والے اپنے خوابوں کو بکھرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ساری دنیا مندی کے دور سے گزر رہی ہے۔ امرتیہ سین جیسے ماہر معاشیات کو نوبل انعام سے نوازا جارہا ہے جو Market Economy نہیں بلکہ Welfare Economy کی بات کرتے ہیں۔ اردو میں حالیہ تخلیقات ان موضوعات سے خالی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس میں کلام نہیں دنیا بدلی ہے اور ضرور بدلی ہے لیکن اس بدلی ہوئی دنیا کو آپ کی تخلیقات میں نظر آنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ مابعد جدیدیت کا حصہ نہیں بن سکتے۔

● M/2, 284، نیو رانی کودر سلوپ کدما، جمشید پور۔ 5

حیدر طباطبائی

بات میں کچھ دلیل بھی رکھنا

نومبر ۹۸ء کے شاعر میں کاوش بدری صاحب نے جو خط وارث کرمانی کے ایماء و اصرار پر لکھا ہے اس میں سردار جعفری کے فن پر (وارث کرمانی کے مانند) تو کوئی اعتراض نہیں کیا ہے۔ تاہم ذاتی چوٹوں اور شخصی اختلافات سے سردار جعفری کے خلاف دل کے پھپھولے پھوڑنے کی مشق سخن ضرور کی گئی ہے۔ خود ان دونوں حضرات کو سردار جعفری بحیثیت نثر و نظم نگار کے کیوں نہیں پسند ہیں اس کی کوئی دلیل اس طرح سے نہیں دی گئی ہے جس طرح رشید احمد صدیقی نے فانی، حسرت، اصغر اور جگر کو اردو غزل کے چہار ستون کہہ کر شاد عظیم آبادی۔ یگانہ۔ صفی۔ آرزو اور عزیز و ثاقب کو بغیر کسی دلیل کے رد کر دیا۔ یہ دشمنی کیوں ہے۔ اس کا جواب سردار جعفری کے ضمن میں وارث کرمانی اور کاوش بدری صاحبان ہی دے سکتے ہیں۔

یہ علی گڑھ کے "ایک پروفیسر شاعر" کا نام وارث کرمانی یا کاوش بدری کیوں نہیں لیتے؟ اس سے کون سا نکاح ٹوٹ جائے گا یا کون سی چیز ساقط ہو جائے گی؟۔ نیاز حیدر کی کلاسیکی شاعری اگر سردار جعفری سے اعلیٰ ہے تو مثالوں کے ساتھ بات کریں، تقابلی مطالعہ پیش کریں۔ یہ لوگ جس طرح مشاعروں میں مترنم غزلی شعرا کے دو لخت عشقیہ اشعار پر واہ واہ کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ اسی طرح ادبی جرائد میں خطوط بھی لکھ دیتے ہیں۔ میں کاوش بدری صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ نیاز حیدر اور سردار جعفری کا تقابلی موازنہ پیش کریں۔ ادب کی بھی خدمت ہو گی اور کسی ایک شاعر کے جوہر کھل کر سامنے آئیں گے۔ فقط زبانی جمع خرچ یا چٹکلوں کے طور

• [redacted] ۰۰۰۹

پر خط لکھ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن میں جانتاہوں کہ۔ ایں کار از تو آید مرداں چنین کنند؟

ایک اور خط دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور اس کے راقم ہیں رام پرکاش کپور صاحب جو فقط یہ اطلاعیہ پیش فرماتے ہیں کہ وہ کیفی اعظمی کو بہت پسند کرتے ہیں اور عرصۂ دراز سے ان کے مداح ہیں اور قیصر تمکین صاحب نے ان کی دل شکنی کی ہے۔ للخ۔ کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

.پھر لطیف احمد سبحانی نامی جن صاحب کے مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے، اگر ان کا تعارف بھی ہو جاتا تو اچھا ہوتا۔ قارئین شاعر کو یہ معلوم ہو جاتا کہ لطیف صاحب خود کیا ہیں۔ ایک پہاڑ پر کسی ٹیلے کی رائے کی وقعت کیا ہے۔ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین

پھر شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور باقر مہدی کے حوالے ثبت کیے ہیں۔ ایک بلند قامت شخص پر مختلف الخیال لوگوں کی اچھی بری آراء سے وہ بلند قامت کبھی ختم نہ ہوگا۔ پھر ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی اور ف۔ س اعجاز صاحبان کی ذاتی رائے جو بھی ہو۔ پنڈت آنند نرائن ملا صاحب اردو کے اہم شاعر تھے، مجاہد اردو زبان بھی تھے بلکہ محسن اردو کہنا چاہئے۔ تمام ادبی حلقوں میں ان کی بڑی عزت ہے۔ لیکن وہی ملا صاحب میر تقی میرؔ کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے تھے، تو کیا ملا صاحب کی شخصیت پر کسی نے کیچڑ اچھالی؟ اسی طرح قیصر تمکین صاحب کا اپنا نظریہ ہے۔ اب یہ علمی اور تحقیقی بات ہوگی اگر رام پرکاش کپور صاحب کیفی اعظمی کو بڑا شاعر تسلیم کرانے کے لیے ایک مفصل مضمون قلمبند کر کے شاعر کو ارسال کر دیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔ رہ گیا سردار جعفری پر قیصر تمکین کا مقالہ تو پہلے افکار (کراچی) کا "سردار جعفری نمبر" دیکھ لیں۔ ماہنامہ شاعر (ممبئی) کا "گوشۂ سردار جعفری" پڑھ لیں، کافی مثبت ادبی و فکری مواد موجود ہے۔

افسوس چشم شوخ تو، گوہر شناس نیست۔

●10-B Britania Road Ilford, Essex IGI 2EQ

سارق جمال

یہ کس طرح کے وزن و ارکان ہیں۔؟



دنیائے شاعری میں انیس بحروں کا تذکرہ عام ہے۔ لیکن یہ انیس بحریں اپنے بنیادی ارکان کے ساتھ مستعمل نہیں۔ چند سالم مفرد بحریں ہی مروّج ہیں۔ اور ان کے ساتھ کچھ مزاحف بحریں جن میں بھرپور شعری آہنگ تھا، رواج پا سکیں۔

سالم ارکان والی بحروں میں بحر متدارک، بحر متقارب، بحر کامل اور بحر رجز ہی اردو شاعری میں مستعمل ہیں۔ بحر رجز جس کے بنیادی اور سالم ارکان ہیں۔

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

ان مثمن ارکان میں شعرائے اردو نے کافی طبع آزمائی کی ہے۔ مربع اور مسدس بحروں کا رواج اردو شاعری میں کم رہا ہے۔ لیکن مثمن بحر (ایک مصرع میں چار رکن) میں ہی زیادہ تر شعرائے اردو نے اشعار کی تخلیق کی ہے۔

۔ مربع ارکانِ بحر میں گو کم کیا گیا ہے۔ پھر بھی کسی نہ کسی شاعر کے اشعار مطالعے میں کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ جیسے ظفر ہاشمی نے غزل کہی ہے۔ جس کا مطلع ہے

صحرا کی بھی پاگل ہوا — مستفعلن مستفعلن
گلشن کی بھی بے کل ہوا — مستفعلن مستفعلن — توازن سلسلہ۔ ۱۰۔ ص ۹۹

مسدس ارکان میں بھی کم کہا گیا ہے۔ لیکن کتابوں میں کچھ اشعار غزل مل جاتے ہیں۔ جیسے جوہر مراد آبادی کا ایک شعر ہے۔

تشریف گاہے لائیے اے دل رُبا — مستفعلن مستفعلن مستفعلن
لطف و کرم فرمائیے اے مہ لقا — ،، ،، ،، — جوہر العروض۔ ص ۸۸

مثمن وزن میں کافی اشعار شعرا کے مل جاتے ہیں۔ مثلاً علامہ نادمؔ بلخی کا ایک مطلع ہے۔

ناشاد کو جب حوصلہ مندی کی دولت مل گئی — مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن
محسوس یہ اس کو ہوا، دوزخ میں جنت مل گئی — ،، ،، ،، ،، — دوپہر کا دائرہ۔ ص ۴۷

اسی بحر رجز کے مثمن ارکان میں ماہنامہ شاعر ممبئی۔ دسمبر ۹۸ء کے شمارے میں نظام الدین نظام کی ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

سوچو تو اپنے آپ کی ہم کو خبر کچھ بھی نہیں
دیکھو تو اپنے سامنے، سب کچھ ہے، پر کچھ بھی نہیں

اس مطلع کے علاوہ اور جتنے اشعار شاملِ غزل ہیں۔ ان ارکان بحر میں نہیں۔ تمام اشعار میں پہلے رکن افاعیل مستفعلن کا مس یعنی ایک سببِ خفیف کم ہے۔ مطلع کے علاوہ باقی مصرعوں میں جب تک ایک سببِ خفیف کے وزن کا کوئی لفظ شامل نہیں کیا جاتا۔ پورے اشعار مذکورہ بحر میں نہیں آتے اور مطلع کے ہم وزن نہیں ہوتے۔

اگر شاعر نے مطلع میں سے بھی ایک سبب شروع میں حذف کر کے پوری غزل کہی ہوتی تو تمام اشعار کو ایک بحر میں سمجھ لیا جاتا۔ رکن سالم مستفعلن سے ایک سبب کم کرنے کا قاعدہ بھی موجود ہے۔ زحاف رفع سے ایک سبب کم کرنے پر رکن افاعیل مستفعلن کی صورت (مس۔ تف۔ علن = تف علن) تفعلن کی رہ جاتی ہے۔ جسے اس کے متبادل ہم وزن لفظ فاعلن سے بدل دیا جاتا ہے۔ رکن مزاحف کو مرفوع کہا جاتا ہے۔

اگر نظام صاحب نے مطلع سے بھی ایک سبب کم کیا ہوتا۔ تو پوری غزل ایک بحر میں ہو جاتی۔ اگر مطلع کو یوں کیا جاتا ۔

سوچو اپنے آپ کی ہم کو خبر کچھ بھی نہیں
دیکھو اپنے سامنے، سب کچھ ہے، پر کچھ بھی نہیں

اب اس مطلع کو باقی شعروں کے ساتھ تقطیع میں ایک بحر و وزن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک شعر اور مطلع کو تقطیع میں ملاحظہ فرمائیں ۔

فا	علن	مس	تف	علن	مس	تف	علن	مس	تف	علن
سو	چ اَپ	نے	"	پ کی	ہم	کو	خبر	کچ	بی	نہی
دے	ک اپ	نے	سا	م نے	سب	کچ	ہ پَ	کچ	بی	نہی
سو	چ تا	با	تو	پ رس	کی	لو	رشب	ہ	جا	گ نا
اُس	ک اپ	نی	نی	دے	اس	پر	اثر	کچ	بی	نہی

اس طرح یہ ایک اختراعی وزن کی غزل کہلاتی۔

نظام الدین نظام برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی کہنہ مشقی کا زمانہ بھی قریب ہے۔ لیکن مذکورہ غزل اور اس کے وزن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ اس طرح کی غلطی کیسے ہوئی۔ اگر شاعر نے عروضی بصیرت نہ ہونے پر غلطی کی تو اسے شاعر کے شمارے میں شریک نہیں ہونا تھا۔

ان دنوں صابر آفاقی کا کلام ہند و پاک کے جرائد میں شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۹۷ء کے ایک انتخاب شاعری 'ایوان' میں ڈاکٹر مناظر عاشق نے ان کی ایک غزل بھی شامل کی ہے۔ ان کی ایک غزل شاعر کے مذکورہ شمارے میں شائع کی گئی ہے۔ جو بحر متقارب کے ارکان میں ہے۔ جس کا مطلع اس کے ارکان کے ساتھ ذیل میں درج کر رہا ہوں ۔

جو بھی جیب میں مال نہیں رکھتا فعلن فاع فعول فعولن فع
شہر میں اچھا حال نہیں رکھتا فاع فعولن فاع فعولن فع

صابر آفاقی صاحب کا یہ مطلع بحر متقارب اثلم۔ اثرم۔ مقبوض۔ ابتر۔ معشر میں ہے۔ جب مطلع کے دونوں مصرع بحر متقارب معشر (ایک مصرع میں پانچ رکن) میں ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ باقی تمام مصاریع بھی اسی معشر ارکان میں ہی ہونا تھے لیکن ایسا نہیں ہے۔ مطلع اور باقی اشعار کے ثانی مصرعے ہی پانچ رکن والے ہیں۔ مطلع کے علاوہ جو اشعار ہیں ان کے مصرع اولیٰ پانچ رکنی معشر نہیں۔ یہ سب چار رکنی ہیں۔ اسے تقطیع میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ارکان ۔ فاع فعول فعولن فعلن

تقطیع	فا	ع	فعو	ل		لن	فع	لن
۱۔	اس	ک	شا	ل	کہا	سے	لا	ئے

ارکان ۔ فعلن فعلن فعلن فعلن

تقطیع	فع	لن	فع	لن	فع	لن	فع	لن
۲۔	در	تی	دو	زرخ	بن	جا	ئے	گی

ارکان ۔ فاع فعولن فعلن فعلن

تقطیع	فا	ع	فعو	لن	فع	لن	فع	لن
۳۔	وق	ت	کسی	کو	اک	من	سب	پہ

ارکان ۔ فعلن فعلن فعلن فعلن

تقطیع	فع	لن	فع	لن	فع	لن	فع	لن
۴۔	اج	چا	ان	سا	سن	لے	تا	ہے

ارکان ۔ فاع فعولن فاع فعولن

تقطیع	فا	ع	فعو	لن	فا	ع	فعو	لن
۵۔	ان	گ	جڑے	کو	اش	ک	م بر	لو

ارکان۔ فعلن فاع فعول فعولن

تقطیع فع لن فا ع فعو ل فعو لن

۶۔ ج سے ہو ش کہا ت ن کی جے

ارکان۔ فعلن فعلن فعلن فعلن

تقطیع فع لن فع لن فع لن فع لن

۷۔ رک تا ہو دل سو زی صا بر

تقطیع میں دیئے ہوئے مصرع اولی یہ ہیں۔

۱۔ اس کی مثال کہاں سے لائیں
۲۔ دھرتی دوزخ بن جائے گی
۳۔ وقت کسی کو اک منصب پر
۴۔ اچھا انساں سن لیتا ہے
۵۔ رنگ جو دیکھوں اشک میں بھر لوں
۶۔ مجھ سے ہوش کی بات نہ کیجیے
۷۔ رکھتا ہوں دل سوزی صابر

مذکورہ غزل کی بحر میں مطلع اور دوسرے اشعار کے مصرعوں کے ارکان بدل بدل کر وزن قائم کیا گیا ہے۔ ان اوزان میں بحث نہیں کہ یہ اپنی جگہ درست بھی ہیں۔ جیسے عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں) کے اس مطلع میں رکن کی تبدیلی ہے۔ جو بحر متقارب کے ارکان ہی میں ہے۔ لیکن ہر مصرع میں ۶ رکن رکھ کر غزل کہی گئی ہے۔ مطلع ہے۔

جن کے دل بے سوز نہیں ، دردیلے ہیں — فعلن فعلن فاع فعولن فعلن فع
ان لوگوں کے چہرے بھی چکیلے ہیں — فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

(مطبوعہ۔ تعمیر ہریانہ۔ چنڈی گڑھ)

ان مصرعوں میں بھی رکن کی تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ ان ارکان کا اور صابر آفاقی کی غزل کے ارکان کا اجتماع جائز بھی ہے۔ لیکن ہر مصرع میں برابر برابر ارکان ہیں۔ چار، پانچ رکن یا ۵۔۶ رکن نہیں۔ چاہئے بھی یہی کہ ایک شعر کے دونوں مصرع بلکہ غزل کے تمام مصرع ہی برابر برابر ارکان کے ہوں۔ ورنہ ایسا شعر جس میں ایک مصرع میں چار رکن اور دوسرے مصرع میں پانچ رکن ہونے سے آزاد غزل کا شعر ہو جائے گا۔ صابر آفاقی کی غزل مذکورہ آزاد غزل کے باب میں بھی نہیں۔

تعجب ہے کہ اس بات کا دھیان شاعر کو بھی نہیں کہ کم زیادہ ارکان کے مصرع غزل کا خاصہ نہیں۔ ایسی غلطیاں عروضی علم کا وقوف نہ رکھنے والے شاعر ہی کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا وزن کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔ کہ یہ کسی طرح درست نہیں۔ اس لئے شاعر کو علم عروض کا جاننا ضروری ہے۔

میری یہ تحریر ادھوری رہ جائے گی اگر میں صابر آفاقی کی غزل کے مطلع کے علاوہ شعروں کے ثانی مصرع کو بھی ان کے ارکان کے ساتھ نہ لکھوں۔ ذیل میں مصرع ثانی اور اس کے ارکان بھی ملاحظہ فرمائیں۔

وہ تو کوئی مثال نہیں رکھتا — فعلن فاع فعول فعولن فع
انساں اس کا خیال نہیں رکھتا — فعلن فاع فعول فعولن فع
کچھ ہو جائے بحال نہیں رکھتا — فعلن فاع فعول فعولن فع
لب پر قیل و قال نہیں رکھتا — فعلن فعلن فاع فعولن فع
قرض کبھی میں تال نہیں رکھتا — فاع فعولن فاع فعولن فع
ہوش میں اب کے سال نہیں رکھتا — فاع فعولن فاع فعولن فع
اور تو کوئی کمال نہیں رکھتا — فاع فعول فعول فعولن فع

صابر آفاقی نے بھی جس طرح کی ارکان کی تبدیلی اپنی غزل میں کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی غزلوں کا انھیں کافی مطالعہ رہا ہے اور مذکورہ غزل ایک عرصے کی مشق سخن کا نتیجہ ہے۔ اور اس طرح کی تبدیلیٔ ارکان سے کسی حد تک واقف ہیں۔ اس کے باوجود مثمن و مختصر ارکان میں غزل کہی ہے اور غالباً انھیں اس طرح کے ارکان پر اطمینان بھی تھا۔ اس لئے شاعر جیسے جریدے میں اشاعت کے لئے غزل بھیجی اور چھپ بھی گئی۔ کیا صابر آفاقی اور نظام الدین نظام صاحبان اس طرح کے وزن کی کوئی سند بھی رکھتے ہیں؟؟؟ ● تکیہ معصوم شاہ، مومن پورہ، ناگپور۔ ۱۸ (مہاراشٹر)

مٹھی بھر غزلیں



بشیر بدر

نام، اُسی کا نام، سویرے شام لکھا
شعر لکھا، یا خط اس کو گمنام لکھا

اُس دن پہلا پھول کھلا جب پت جھڑ نے
پتی پتی جوڑ کے تیرا نام لکھا

اس بچے کی کاپی اکثر پڑھتا ہوں
سورج کے ماتھے پر جس نے شام لکھا

کیسے دونوں وقت گلے ملتے ہیں روز
یہ منظر میں نے دشمن کے نام لکھا

سات زمینیں، ایک ستارہ، نیا نیا
صدیوں بعد، غزل نے کوئی نام لکھا

میر، کبیر، بشیر اسی مکتب کے ہیں
آ! دل کے مکتب میں اپنا نام لکھا

◆

کتابیں، رسالے، نہ اخبار پڑھنا
مگر دل کو ہر رات، اک بار پڑھنا

سیاست کی اپنی الگ اک زباں ہے
لکھا ہو جو اقرار، انکار پڑھنا

علامت نئے شہر کی ہے سلامت
ہزاروں برس کی یہ دیوار پڑھنا

کتابیں، کتابیں، کتابیں، کتابیں
کبھی تو وہ آنکھیں، وہ رخسار پڑھنا

میں کاغذ کی تقدیر پہچانتا ہوں
سپاہی کو آتا ہے تلوار پڑھنا

بڑی پُرسکوں دھوپ جیسی وہ آنکھیں
کسی شام جھیلوں کے اُس پار پڑھنا

زبانوں کی[1] یہ خوبصورت اکائی
غزل کے پرندوں کا اشعار پڑھنا

[1] عربی، فارسی سے گجراتی تک

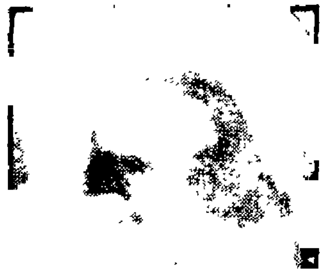
◆

صدیوں کی گٹھری سر پر لے جاتی ہے
دنیا بچّی بن کر واپس آتی ہے
میں دنیا کی حد سے باہر رہتا ہوں
گھر میرا چھوٹا ہے لیکن ذاتی ہے
دنیا بھر کے شہروں کا کلچر یکساں
آبادی، تنہائی بنتی جاتی ہے
میں شیشے کے گھر میں پتھر کی مچھلی
دریا کی خوشبو، مجھ میں کیوں آتی ہے
پتھر بدلا؟ پانی بدلا؟ بدلا کیا؟
انساں تو جذباتی تھا، جذباتی ہے
کاغذ کی کشتی، جگنو جھلمل جھلمل
شہرت کیا ہے۔ اک ندیا برساتی ہے

◆

ہے عجیب شہر کی زندگی، نہ سفر رہا نہ قیام ہے
کہیں کاروبار سی دوپہر، کہیں بدمزاج سی شام ہے
کہاں اب دعاؤں کی برکتیں، وہ نصیحتیں، وہ ہدایتیں
یہ ضرورتوں کا خلوص ہے، یہ مطالبوں کا سلام ہے
یونہی روز ملنے کی آرزو، بڑی رکھ رکھاؤ کی گفتگو
یہ شرافتیں نہیں بے غرض، اسے آپ سے کوئی کام ہے
وہ دلوں میں آگ لگائے گا میں دلوں کی آگ بجھاؤں گا
اسے اپنے کام سے کام ہے مجھے اپنے کام سے کام ہے
نہ اداس ہو، نہ ملال کر، کسی بات کا نہ خیال کر
کئی سال بعد ملے ہیں ہم، ترے نام آج کی شام ہے
کوئی نغمہ، دھوپ کے گاؤں سا، کوئی نغمہ شام کی چھاؤں سا
ذرا ان پرندوں سے پوچھنا، یہ کلام کس کا کلام ہے

● ریحانہ کالونی، بھوپال (ایم پی)



انیس رفیع
Director: Dourdarshan, Dibrugarh, 786003(Assam)

قبائلی

زالونی فیملی کے بلاوے پر مہمان ہوں۔ جہاں ہوں وہ ڈلیا جان کہلاتا ہے۔ کبھی گھنا اور ہیبت ناک جنگل تھا۔ اب رونق بیز شہر ہے۔ زالونی تیل کے کنویں کے سرداروں کی فیملی ہے۔ ان کا ایک کلب ہے۔ زالونی کلب۔ ہر نئے سال پر ایک تقریب منعقد ہوتی ہے۔ Zaloni Meet کہتے ہیں اسے۔ Zaloni Meet تیل، چائے اور جنگلات کے سرداروں کا سالانہ اجتماع ہے۔ اس اجتماع میں مہمان ہونے کے لئے کڑی شرطیں ہیں۔ اگر مہمان ہوگئے تو فخر کی بات ہے۔ افسوس کہ میں کسی بات پر فخر نہیں کرتا۔ تم اچھی طرح واقف ہو، ہاں فخر کلب کی عمارت کو ضرور ہے۔ اس کے ماتھے پر جھومر کی طرح آویزاں ہے ایک لفظ "India" اور اس کے نیچے —— What Not !

مسٹر سچدیوا جنہیں میری میزبانی پر مامور کیا گیا ہے بڑی اونچی ہستی ہیں۔ تمہیں بتاؤں Confidential رکھنا۔ یہی میرے لئے فخر کی بات ہے۔ میرا میزبانِ خاص سچدیوا تیل کمپنی میں Geo-Physicist ہے۔ سائنسداں، نرم رو، خوش گفتار۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ سائے کی طرح نہیں لگا رہتا میرے ساتھ۔ کبھی الگ۔ کبھی ساتھ۔ مہمان کو بوریت سے بچانے کا فن اسے آتا ہے۔ باخبر بھی ہے۔ اس نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ زالونی کسی بستی یا فصل کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ریت کی ایک قسم ہے۔ زالونی، کتنی موسیقیت ہے اس نام میں۔ مگر ہے بالو۔ دانتوں کے نیچے آجائے تو کرکری۔

لو وہ سچدیوا جی آگئے۔ اب جو آئے ہیں تو ان کے ساتھ ۲۵،۳۰ برس کی ایک خاتون بھی ہے۔ پہلی ملاقات ہے۔ مگر اجنبی نہیں لگی۔ تعارف ہوا۔ نام مس برگوھائیں ہے۔ مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ وہ Music Lover ہے۔ میں اسے Telents اور آرٹسٹ کا Promoter۔ ماڈرن سانگ اور Pop کی دلدادہ۔ زالونی میٹ نام ہے جنگل میں منگل کا۔ رقص، موسیقی، شباب اور کباب اس Meet کے پیمانے میں۔ شب کے گیارہ بج رہے ہیں۔ ایک جنگلی رقص فلور پر جاری ہے۔ برگوھائیں نے اپنے آدھے کپڑے فلور پر گرا دیئے ہیں۔ تھرکتی چال سے آہستہ آہستہ میرے قریب آتی ہے۔ بازوں سے پکڑ کر فلور پر گھسیٹ لیتی ہے۔ ایک Pop دھن پر میرے سامنے جسم کو Twist کر رہی ہے۔ میں بھونچکا ہوں، کیا کروں، تم ہی کہو۔ ایسے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے۔ دیہاتی آدمی ہوں۔ کھانا کھانے اور پانی پینے کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہیں۔ بغلیں جھانکنے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔ میں ادھیڑ بن میں تھا ہی کہ سچدیوا آگیا میری مدد کو۔ مس برگوھائیں اور وہ Couple Formation میں جٹ گئے۔ میں آہستہ آہستہ فلور کے کنارے پر واپس آگیا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے پیوست محور قص ہیں۔ میں اور بھی پیچھے کھسک آیا ہوں۔ فلور سے الگ۔ بیٹھ گیا ہوں آکر اپنی پرانی جگہ پر۔ سارا شور ایک طرف۔ میں ایک طرف۔ خاموش، تنہا، بے وجہ۔

ڈبروگڑھ کے ضلع مجسٹریٹ راماسوامی میری طرف لپکے آرہے ہیں۔ انہیں عودالصلیب کی کوالیٹی والی لکڑیاں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اپنے احاطے میں ایک گودام بنوا رکھا ہے۔ خاص کر ایسی ہی منتخب لکڑیوں کے لئے۔ حالانکہ گھر اور دفتر میں سارے فرنیچر بید کے ہیں۔ ایک زمانہ تھا ان بڑے افسروں کے ہاتھوں میں بید کے ہنٹر ہوا کرتے تھے۔ تم نے پرانے ناولوں اور افسانوں میں ضرور پڑھا ہوگا۔ مگر آج یہ بید فرنیچر میں سامانِ آرائش۔ راماسوامی پہنچ گئے ہیں میرے پاس۔ ازراو اخلاق میرے اکیلے پن پر اظہار تاسف کرتے ہیں اور بتاتے ہیں۔

"معلوم نہیں آپ نے اس صوفے کو پکڑ رکھا ہے یا صوفے نے آپ کو۔ بہت سارے اسپاٹس (Spots) ہیں۔ Enjoy Yourself- Take a round" میں ان سے پوچھ رہا ہوں کیسے؟ اس سوال پر وہ بھی چونک گئے ہیں۔ کیسے؟! انہیں حیرت ہے۔ اس خنک رات میں چاروں طرف الاؤ دھدھک رہے ہیں۔ لکڑیاں آتش دانوں میں چیخ رہی ہیں اور میں ایک سوال لئے بیٹھا ہوں۔ کیسے؟ مس برگوھائیں، سچدیوا پکڑ کر لے گئے تھے۔ مگر وہاں بھی یہی سوال آڑے آیا۔ راماسوامی صاحب کی حیرت بجا نہیں ہے۔ ایک ذرا توقف کے بعد وہ پھر بولے۔

"آپ کے دفتر میں جو Agitation (ایجیٹیشن) چل رہا ہے اس میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ بتائیے دھمکاتا ہوں۔" شاید راماسوامی دفتر کی بات چھیڑ کر جس دلدل میں نہیں ڈوبا ہوں اس سے باہر لانا چاہتے ہیں مجھے!۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ جس دلدل سے بھاگ کر زالونی میٹ میں آیا ہوں وہ مجھے پھر اسی دلدل میں اتارنا چاہتے ہیں۔ یہ زالونی میٹ ہم افسروں، سرداروں کا سالانہ Escape ہے۔ جائے فرار۔ میں نے ان سے دست بستہ عرض کیا۔

"دفتر سے بھاگ کر ہی یہاں آیا ہوں۔" میرا جواب سن کر انہوں نے وہسکی کا گلاس ہونٹوں سے لگالیا ہے۔ ممکن ہے اب کہنے کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔ چند ساعتوں کے لئے ہی وہ صوفے پر لگے ہوں گے کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ایک ٹھہاکہ لگاتے ہیں زوردار۔

"Who Cares !" دوسرا جملہ ہے "! I have lost my wife"

اس جملے نے جیسے ایڑ لگادی ہو۔ گھوڑی کی ایک جست جیسی چھلانگ لگائی اور غائب ہو گئے راماسوامی۔

میں ہوں تو خاموش مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے یہ سب؟ میں اپنی اس مسکراہٹ پر حیران ہوں۔ کون نشانہ ہے اس معنی خیز مسکراہٹ کا۔ ضلع مجسٹریٹ، بیچارہ، مس برگوھائیں، تم بھی جانتی ہو۔ میں بھی جانتا ہوں میرے کڑوے ہونٹ پر بے معنی مسکراہٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ اب میرا جی چاہتا ہے کسی سے یونہی الجھ جاؤں۔ اپنی مشکوک مسکراہٹ کا بیج جان لوں۔ پر میں بے تکا سا اس بے نہار محفل میں۔ کوئی نکیل ہی نہیں جسے پکڑ کر کھینچ لوں۔ اب خیال آتا ہے کہ اپنی اس مسکراہٹ کو لے کر کیوں پریشان ہوا جائے۔ لہذا P.R.O (پی آر او) بر کا کوئی کو Locate کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس بھیڑ میں سب کھوئے ہوئے لوگ ہیں۔ اس میں کسی کا ملنا گلو کے پھول دیکھنے جیسا ہے۔ پھر بھی۔

رات اپنی سہ پہر میں داخل ہو چکی ہے۔ MTDC کے ایرکنڈیشنڈ تحویل میں بند ہوں۔ جدید ترین مہمان خانے کا یہ بند کمرہ تحویل جیسا ہی لگا مجھے۔ زمین پہ چلنا۔ تم سے لڑنا، محبت کرنا سب کچھ بھولتا جارہا ہوں یہاں۔ نہ جانے کتنے تالوں میں بند کر دیا گیا ہوں۔ میری Security میری حفاظت فرض کی طرح مجھ پر عائد کر دی گئی ہیں۔ تمہیں یہ خوب خوب معلوم ہے کہ میرے اندر ایک قبائلی پوشیدہ ہے۔ اور یہ قبائلی جب جب مجھ پر غالب ہوا ہے مجھے کسی نہ کسی سانحے سے گذرنا پڑا ہے۔ خون کے رشتے زد میں آئے ہیں۔ میرے لئے موت سانحہ نہیں ہے۔ موت سے اس رشتے کا کتنا سانحہ ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ میرے لئے سانحہ وہ بھی ہے جب میری قبائلی خصلتیں اپنوں کو دکھ پہنچاتی ہیں۔ دکھ پہنچانا میرا منشا یا میری مراد نہیں۔ بس وہ ایک لمحہ ہوتا ہے جب وہ قبائلی سر پر سوار ہو کر ناچنے لگتا ہے۔ پھر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہیں تو اچھی طرح یاد ہوگا۔ کیسے کیسے طوفان اٹھائے ہیں میں نے۔ مگر تم اس سے بھی واقف ہو کہ میرے اندر کا قبائلی طوفان تب ہی اٹھتا جب اسے کوئی ٹھیس پہنچاتا ہے، اس ٹھیس کی کڑواہٹ برسوں اس کے ہونٹوں پر قائم رہتی ہے اور میں سانحات سے گذرتا رہتا ہوں۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ ایک مخمل لالہ زار سے لوٹا آدمی یکایک سانحات پر کیوں اتر آیا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے تو وہ وجہ تم ہو۔ یاد کرو پچھلی گفتگو۔ کتنی Artificial تھی تم اس گفتگو میں۔ جب ہونٹوں سے من کی جگہ زبان بولے تو میرے اندر کا قبائلی چھلانگ لگا کر باہر آجاتا ہے۔ مسلط ہو جاتا ہے مجھ پر۔ اور میں فوراً کھونٹے نوچ ڈالنے پر اُتارو ہو جاتا ہوں۔ اچھا ہوا تم اس دن روبرو نہ تھیں فون پر تھیں۔ ورنہ تمہارے نقلی شبد محل کو میرا قبائلی مسمار کر دیتا۔ شاید تمہیں بھی۔ اور میں ایک بار پھر ایک بے بدل رشتے کے کٹ جانے کے سانحے سے دوچار ہو جاتا۔ خیر۔ اپنے اس قبائلی کو دبائے رکھنے کی کوشش میں ہی زالونی میٹ میں آگیا ہوں۔ مہمان خانے کی بھیانک تنہائی میں مس برگوھائیں کا رقص کے لئے بلاوا گدگدانے لگا ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ کف افسوس ملنے کے سوا۔ کف افسوس ملتے ملتے مجھے جھپکی سی آنے لگی ہے شاید نہ آنے والی نیند مجھے سونے کا سگنل دے رہی ہے۔ مجھے لگا کہ میں سو گیا ہوں۔ مگر میں سویا نہیں جگا دیا گیا ہوں۔

تمہیں حیرت ہوگی یہ جان کر۔ میری تحویل کے تالے کھل گئے ہیں۔ دروازہ کھل گیا ہے۔ میرے سرہانے کھڑی ہے قبائلی لڑکی مس برگوھائیں۔ چہرے پر جلال و تمکنت۔ تم کیا کیا سوچ رہی ہوگی۔ رات کا آخری پہر۔ کمرے میں نیم عریاں بدمست قبائلی خاتون۔ آنکھ لگنے سے قبل اس کے لئے جاگی ہوئی شہوت۔ کہا جاتا ہے کہ برگوھائیں کا تعلق اس آھوم قبیلے سے ہے جس نے تقریباً سات سو سال تک اس شمال مشرقی خطے پر حکومت کی تھی۔

مس برگوھائیں! مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس سے میری ملاقات پہلی نہیں ہے۔ اس نئی پوسٹنگ پر جوائن کئے ہوئے چند روز ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ میرے دفتر آئی تھی۔ ہاں ایکدم یاد آگیا۔ وہ ایک دست خواں کے روپ میں آئی تھی میرے پاس۔ ہاتھ کی لکیر پڑھنے والی۔ حالانکہ میں ان توہمات پر یقین نہیں رکھتا ہوں پھر بھی انجانے ہی میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دھر دیا کہ لو پڑھو۔ وہ بہت دیر تک میرے ہاتھ کی ریکھاؤں سے کھیلتی رہی پھر اس نے بتایا "آپ کے ہاتھ میں باغی لکیریں ہیں" پہلی بار میں ایک دست خواں کی Reading پر چونکا تھا۔ لکیروں کے نیچے دبی لکیروں کو اس نے کیسے پڑھ لیا۔ اس نے مجھ سے دست خوانی کی فیس طلب نہیں کی۔ میں نے اسے اپنے لنچ میں شامل کر لیا۔ میرے عملے بھی حیران تھے کہ یہ پہلی Visitor ہے جسے صاحب نے چائے کی جگہ لنچ کھلایا۔ مجھے

حیرت ہے اس بات پر کہ اس نے لنچ کے بعد بھی مجھ سے کوئی Favour نہیں چاہا۔ جب کہ میرا قیاس تھا کہ دست خوانی کے بہانے لڑکیاں صنف مخالف کی ہتھیلیاں اس لئے سہلاتی ہیں کہ انہیں ان سے کوئی Favour چاہئے۔ ہاں مجھے یاد آرہا ہے۔ لنچ کے دوران اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ آموم قبیلے کی "سوکاپھا" ہے۔ "سوکاپھا" جس نے اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے وحشی درندوں سے لے کر شہری لٹیروں تک سے ٹکر لی تھی۔ دراصل یہ "سوکاپھا" سات صدیوں کے ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ جب جب رعایا درد سے کراہتی ہے تب تب "سوکاپھا" وارد ہوتی ہے۔ میں نے اس وقت برگوھائیں کی باتوں کو Ethinic برتری کی لن ترانی پر محمول کیا تھا۔

میرے سرہانے وہی برگوھائیں، وہی سوکاپھا، تن کر کھڑی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے یہ برگوھائیں نہیں ہے بلکہ وہ ملکہ ہے جسے اپنی رعایا کے دکھوں کا علم ہو گیا ہے اور اپنے تاج و تخت کی واپسی کا اعلان کر رہی ہے۔ مگر اس کو مجھ سے کیا ملنے والا ہے۔ میں ادنیٰ سا ملازم۔ میرے پاس نہ اس کا تخت ہے نہ تاج۔ پھر بھی وہ میرے بستر کی طرف بڑھ رہی ہے سرہانے سے سرک کر۔ میرے جسم میں گدگدی تیز ہوتی جارہی ہے۔ کچھ سوچ کر اپنی موٹی رضائی سے باہر نکل رہا ہوں۔

"ناچ ختم ہو گیا مس برگوھائیں" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ختم ہو گیا" جواب میں تلخی تھی۔ ہاتھ بھی جھٹک دیا۔ پھر میں نے ہمت بٹورتے ہوئے کہا "رات گذارنے کا مسئلہ ہے؟"

"نہیں مسئلہ یہ ہے کہ باہر سخت ٹھنڈک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم مر نہ جاؤ۔ میں تمہیں زندہ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں لے جانے کے لئے آئی ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔"

"مس برگوھائیں!" میں اس سے ملتجی نظروں کے ساتھ مخاطب ہوا۔

"Come on you bastard!" پھر بولا Take him.۔

میں نے مس برگوھائیں کا یہ جملہ سنا ہے۔ تیر و تفنگ دیکھ رہا ہوں۔ حرامزادے جیسے زیور سے آراستہ کئے جانے کے بعد بھیگی بلی جیسی چھینک بھی نکالنے سے قاصر ہوں۔ خاموش قدموں سے ان کے ساتھ چلنے لگا ہوں۔ دروازے سے باہر Corridor۔ پھر انتظار زمانہ۔ مین گیٹ پھر لان سے باہر۔ اب انجان قدموں کی منزل ہی میری منزل ہے۔ ایک پڑاؤ آیا تھا۔ وہیں سے لکھ رہا ہوں۔ تم خوش ہونا میری اس سزا پر۔ میں اپنی اس سزا اور تمہاری خوشی کو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ میں بھی مزاحمت کی ہمت تھی۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کہ میرے اندر بھی ایک قبائلی ہے۔

✱✱

بہ خطِ شاعر

سرشار صدیقی



حرارت

کچی کلیاں
جن کو میری موجِ تنفس
بادِ صبا ہے
جن کے نمو کی راہ میں حائل
اک بے نام سا بندِ قبا ہے
جن کے سینوں کے پاتال میں
اَن جانے سرکش جذبوں پر
خواب آلودہ برف جمی ہے
جن کے بندِ قبا کھلنے میں
اک خودسر جھونکے کی کمی ہے

شام سے
میرے لمس کی حدت کے موسم میں
یہ کلیاں، یہ پیاسی کلیاں
اپنی تشنگیوں میں سمیٹے
خواہش کا منہ زور سمندر
میرے لہو کی شبنم پی کر
صبح سے پہلے کھل جاتی ہیں

● D-16, Rufi Heights Phase -1
Gulshan-e-Iqbal, Block - 17

زبیر رضوی



لب و دل سمیٹ لو

لب و دل سمیٹ لو
یہ موسمِ بہار کی آخری بہار ہے
یہ چاند جس کو
شاہراہِ شب کی سب خبر ہے
درد کا شجر ہے
اس کی ساری چاندنی سمیٹ لو
یہ عارضوں کی سرخیاں
لبوں کی یہ گلابیاں
یہ شب کا آخری پہر ہے
اس میں جو بھی بچ گیا
وہ لمحۂ وصال تم سمیٹ لو
نہ غم کرو کہ تم ستارہ بخت ہو
گزرتی رات
تم پہ مہرباں ہے
تمہارا رازداں ہے
نہ غم کرو
یہ موسمِ وصال کی آخری بہار ہے

● Flat 7,137-B Lane 12، ذاکر نگر، نئی دہلی - 110025

صادق



پہاڑ کا سپنا

سویا ہوا پہاڑ
سپنا دیکھتا ہے
کہ اس نے پوری طاقت لگا کر
زمین سے چھڑا لی ہیں
اپنی جڑیں
اور انھیں پیروں کی شکل دے کر
بے تحاشا
دوڑتا پھر رہا ہے جنگلوں میں

دریا پھلانگتے ہوئے
اچانک اس کا پاؤں
الجھ جاتا ہے پل سے
وہ پھر زور لگاتا ہے
پوری قوت کے ساتھ

نیند ٹوٹنے پر
حیران ہو کر
دیکھتا ہے پہاڑ
کہ وہ گرا پڑا ہے
دریا کے قریب
اور ٹوٹا ہوا پل
بیساکھی کی مانند نظر آ رہا ہے۔

● AG-1/47C، وکاس پوری، نئی دہلی - 110018



محمود شیخ

۵۹۲، نیا محلہ، مرزا غالب مارگ، جبل پور 482002

تصوف اور نفسیاتِ ادب

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا ۔ خط پڑھ کر مختصر افسانے جیسا لطف آگیا ۔ آپ کے عنوانات نہایت Relevent ہیں ۔ مجھے سب ہی عنوانات پسند آئے ۔ خاص طور پر 'نئی نسل نئی شعری نفسیات اور نئی شعری جمالیات" بہت خوب ہیں ۔ انشاء اللہ ضرور لکھوں گا ۔

ایک مضمون بعنوان "تصوف اور نفسیات ادب" بغرض اشاعت ارسال خدمت ہے ۔ میرا خیال ہے یہ ایک Unique Subject ہے ۔ ۲۱ ویں صدی کے مسائل کو سمجھنے کے لئے اپنے ماضی کا صحیح شعوری ادراک ضروری ہے ۔ گذشتہ دو برس سے اس مسئلہ پر لکھ رہا ہوں ۔ غالباً آپ کی بھی نظر پڑی ہوگی ۔ میں سوچتا ہوں ، محض خوش فہمیوں میں جینے سے کیا فائدہ ؟ ہم لوگ نہ تو مغرب کے برابر ہوسکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے ۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقتدار کی اس جنگ میں ہمارا ادب بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے ۔ اور ہمیں زبردستی غلامی کی طرف مراجعت کے لئے مجبور کیا جارہا ہے ۔ کیا ہم اس قدر بے بس ہوگئے کہ میرؔ، غالبؔ ، اقبال، فیض ، فراق ، ناصر ، پریم چند، منٹو ، کرشن چندر، بیدی ، قرۃ العین حیدر ، انتظار حسین کا فن جانچنے ، پرکھنے ، تولنے کے لئے مغربی کسوٹی اور ترازوؤں کو درآمد کیا جانا ضروری ہے ؟ حالی ، شبلی کی محنت کیا یونہی رائیگاں چلی جائے گی ؟ ہمارا کوئی دبستان ادب ہے کہ نہیں ہے ؟

غالب کے لئے گوئٹے کی کیا ضرورت ہے ؟ اقبال کے لئے نطشے ، بیدی کے لئے چیخوف اور کرشن چندر کے لئے موپاساں کو درمیان میں کیوں لایا جاتا ہے ؟ قرۃ العین حیدر کے سامنے ورجیناوولف اور جیمس جوائس کو پیش کیا جانا ضروری ہے ؟ ناقدین ادب کی طرح اردو کا عام قاری بھی مغربی ادباء شعراء سے واقف ہے یا نہیں ؟ اگر نہیں تو یہ تنقید کس کے لئے ہے ؟ ناقد اور قاری کے درمیان بھی کوئی رشتہ ہے یا نہیں ؟ حیرت ہوتی ہے ، جب ژاں پال سارتر ناول کے نام پر Anti Novel کا ادھورا تصور ادب پیش کرتا ہے اور سب اس کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں ۔ کسی میں جرأت اظہار نہیں کہ پوچھے کہ بھائی آخر یہ Anti Novel ہے کیا بلا ؟ ناقدین ادب کی اس کمزوری کا خمیازہ فنکار آخر کب تک بھوگتا رہے گا ؟ کیا یہ ہمارا احساس کمتری نہیں ؟ ۲۱ ویں صدی میں جانے سے قبل ہماری اس فکری محکومیت کا انت ہوگا یا نہیں ؟ (م ش)

ادب، سائنس اور فلسفہ تاریخ کے ہر دور میں حکومت اور سیاست کے ماتحت رہے۔ دنیا کی عظیم رزمیہ نظموں کا موضوع قومی تفاخر اور شاہوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ عالی نسب، انصاف پسند حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کا جوہر کردار رزم و بزم کے بیان میں رفتہ رفتہ کھلتا ہے۔ اساطیر اور داستانوں میں بھی حکمراں طبقے کا بیان ہی سر فہرست ہوتا ہے۔ تاجر اور سوداگر متمول اساطین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے ادباء اور شعراء نے شاہوں کی انصاف پروری، اولوالعزمی اور فیاضی کے بیان میں دریا بہادیے ہیں۔ لیکن وہ بادشاہوں کو رعیت پروری اور خدمت خلق کی تلقین بھی کرتے رہے تاکہ عوام میں ان کے لئے جذبۂ وفاداری برقرار رہ سکے۔ منظوم اور نثری داستانوں میں ظالم کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔ فوق الفطرت، واقعات، شہزادے شہزادیوں کے معاشقے، تحیر اور استعجالی کیفیات جن و پری اور دیو، داستانوں کو دلچسپ اور رنگین بناتے ہیں۔ جس سے عوام کے ذوق و شعور کو تسکین ملتی ہے لیکن رزمیہ کا مقصد قوموں کے اندر نسلی تفاخر اور برتری کا احساس زندہ رکھنا ہے تاکہ ان کا جوش اور جذبۂ وحشت و بربریت تہذیبی سرگرمیوں میں کہیں سرد نہ ہوجائے۔ مضبوط، قوی بازو، گرم جوش اور سخت کوش جیالوں کا لہو، حدود سلطنت کی توسیع اور سیاسی وقار اور دبدبے کے قیام و ثبات کا ضامن ہوتا ہے۔ تہذیب کے ابتدائی ادوار میں یہی عوامل کارفرما تھے جنہیں نظام ملوکیت کی حمایت حاصل تھی۔

بعض جلیل القدر پیغمبر فاتح عالم بھی ہوئے۔ ان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام سر فہرست ہے۔ چرند پرند یہاں تک کہ حشرات الارض بھی آپ سے کلام

کرتے۔ حضرت شمعون علیہ السلام کو اللہ نے بے پناہ قوت اور طاقت عطا کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو خاص لحن داؤدی سے سرفراز کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن و جمال اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضاء اور عصائے کلیمی عطا کیا۔ اسی طرح انبیاء اور مرسلین کو مبعوث کر کے اللہ نے وحی اور الہام کے ذریعے بنی آدم کے ذہن و دل کی تالیف و تربیت فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کے خلاف عقلی دلائل و شواہد پیش کئے اور اللہ کی وحدانیت کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور لوگوں کو عفو و درگذر کی تعلیم دی۔ ان کے دکھ و درد دور کئے۔ دردمند اور بے سہارا لوگوں کی اشک سوئی کی اور انہیں خدا کی رحمتوں کا مژدہ سنایا۔ اپنے معجزات دکھا کر لوگوں کو اللہ کی اطاعت کا پیغام دیا۔

انبیائے کرام کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے پیغمبر، دنیا میں ایک ایسے نظام حکومت کے داعی تھے۔ جو نظام حیات کے سبھی شعبوں پر وحدہٗ لاشریک کی بالادستی قبول کرتا ہو۔ کوئی انسان، کون و مکاں کا خدا نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ فرعون اور نمرود کی طرح چیرہ دست اور طاقتور حکمراں کیوں نہ ہو۔ تکبر اور نخوت انسان کو بے رحم اور بے حس بناتے ہیں اور فہم و فراست کی تباہی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ جس کے سبب عوام الناس کو مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خدا رحیم و کریم ہے۔ اسی کی حکومت کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ذرہ ذرہ اس کی رحمتوں کا محتاج ہے۔ وہی خالق اور مالک ہے۔ اسی کی اطاعت ہر انسان پر فرض ہے۔ خواہ وہ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب سب انسان اس کی نظر میں برابر ہیں اور ایک دن سب کو اس کے سامنے جواب دہی کے لئے حاضر ہونا ہے۔

شہنشاہوں کے لئے پیغمبروں کی تعلیمات پر عمل کرنا دشوار تھا۔ وہ خود کو عام انسانوں سے برتر سمجھتے تھے۔ تکبر نے انہیں نفسانی خواہشات کا غلام بنا رکھا تھا۔ ان کا نفس سرکش و چالاک تھا۔ وہ پیغمبروں کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ بادشاہ حکومت کا مطلق العنان حاکم تھا۔ جس کی تابعداری عوام پر فرض تھی۔ اس سے بازپرس کا اختیار کسی کو نہ تھا۔ پیغمبروں کی پاکیزہ سیرت عوام کے لئے سرچشمۂ ہدایت تھی۔ ان کی تعلیمات سادہ اور آسان تھیں۔ لہٰذا انہیں بہت جلد عوامی مقبولیت حاصل ہو جاتی تھی۔ غریب اور نادار انسان انہیں اپنا ہادی اور رہبر سمجھتے تھے۔ جس سے شاہوں کی انا کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ ان سے متنفر ہو کر یا تو جلاوطنی کر دیتے یا پھر مختلف طریقوں سے تکالیف پہنچا کر انہیں ہراساں کیا جاتا۔

شاہوں کی روش سے تنگ آ کر اور روحانی ارتقاء کے لئے بھی یہودی اور نصاریٰ مبلغین نے اپنی دنیا الگ بسائی اور تارک الدنیا ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ لوگ خدا کی عبادت و ریاضت میں ہمہ وقت مشغول رہتے۔ انہیں دنیاوی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس درمیان کئی تہذیبیں وجود میں آئیں اور فنا ہو گئیں لیکن ملوکانہ روش نہیں بدلی۔ باپ کے بعد بیٹا ہی گدی کا وارث ہوا کرتا یا پھر خاندان کے دوسرے افراد ایک دوسرے کو قتل کر کے بادشاہت پر قبضہ جما لیا کرتے تھے۔ بادشاہت شاہی خاندان کے افراد کا موروثی حق تھا۔ خواہ وہ اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

آخر ش نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا اور بادشاہی کی جگہ مجلس شوریٰ نے لے لی۔ عوام کو اپنے 'امیر' سے ذاتی اور سماجی مشکلات کے بیان میں پوری آزادی حاصل تھی۔ امراء اور بااثر شخصیتوں سے انہیں کوئی خوف نہ تھا۔ حق اور انصاف ان کے دروازوں پر دستک دیتے تھے۔ حسب نسب کی برتری موقوف کر دی گئی۔ بجز تقویٰ اور پرہیزگاری کے گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہ تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ جس کو اس کے علم نے پیچھے چھوڑ دیا، اسے اس کا نسب آگے نہیں لا سکتا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک نیا نظام معیشت وجود میں آیا جس میں سود لینا اور دینا دونوں حرام ٹھہرائے گئے۔ چوری، رہزنی، شراب خوری، بدکاری اور قمار بازی کے لئے سخت سزائیں مقرر کی گئیں۔ معاشرتی فلاح و بہبود کے پرانے قوانین منسوخ کر دئے گئے۔ تاریخ میں پہلی بار عورت کی آئینی حیثیت کو تسلیم کیا گیا اور اسے وراثت میں حصہ دیا جانے لگا۔ کمزور اور معذور انسانوں کے وظیفے مقرر کئے گئے۔ امیر عوام کا خادم اور نگہبان تھا۔ حکومت خدا کی تھی۔ لیکن انسانی تاریخ کا یہ زریں دور بھی ملوکانہ ذہنیت کی نذر ہو گیا۔ بادشاہت نے ایک بار پھر مطلق العنانی اختیار کر لی۔

بعثت ختم المرسلینؐ سے قبل طبقاتی کشمکش اور معاشی جبر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسلام نے اس ناہمواری کو ختم کرنے کے لئے ایک جامع اور واضح لائحہ عمل پیش کیا اور اپنی تعلیمات میں میانہ روی اختیار کی تھی۔ اس نے بتایا کہ عابد و زاہد کے لئے گوشہ نشینی ضروری نہیں۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، بچے، اقرباء اور پڑوسیوں کے حقوق بھی ہوتے ہیں۔ تقویٰ اور پرہیزگاری یہ ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں کشادگی اختیار کی جائے۔ اس طرح اسلام نے انسان کو صحت مند مجلسی زندگی کی ترغیب دی اور رہبانیت اختیار کرنے سے روک دیا۔ لیکن مجلس شوریٰ کے خاتمے اور ملوکیت کے واپس آتے ہی معاشرے کے بہترین افراد منتشر ہو گئے۔ کچھ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی کچھ اپنی حق نوائی کے سبب شہید ہوئے اور کچھ کو بادشاہت نے دربار کی زینت بنا لیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی آنکھوں نے رسول اللہؐ کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا اور کانوں نے آپ کی مبارک آواز میں قرآن سنا تھا۔ سینکڑوں، ہزاروں احادیث انہیں ازبر تھیں۔ ان میں وہ اتقیا بھی تھے جنہیں اصحاب صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے سینے قرآنی آیات سے معمور تھے۔ انہیں نفسانی خواہشات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ خدا کے ان برگزیدہ بندوں کا مقصد زندگی رضائے الٰہی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ ملوکیت کا مقصد فرد واحد کی حکومت اور کسی مخصوص طبقے کی بالادستی، عوام الناس پر مسلط کرنا تھی۔ فاتح قوم کا مرتبہ محکوم عوام سے بلند سمجھا گیا۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی نظر میں فاتح اور مفتوح کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ان کا پیغام تمام بنی نوع انسانی کے لئے تھا۔ وہ انسانوں کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بندہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تعلیمات سے اخلاقی اور نظریاتی اختلاف پیدا ہوتا اور بادشاہ کی حیثیت ثانوی ہو جاتی تھی۔ امراء اور وزراء بھی ان کی اخلاقی اور افرادی قوت سے خوف زدہ رہتے اور کسی مناسب موقعہ پر بادشاہ کو ان کے خلاف سخت کارروائی کے لئے مجبور کر دیتے۔ زہاد کے خلاف ان کا یہی طرز عمل برقرار رہا۔ رفتہ رفتہ اہل اللہ کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی۔ یہ لوگ اکثر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر جاتے اور خدا کا پیغام دور دراز کے لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ ان کے اس طرز عمل سے انتظامیہ متقی اور

پرہیزگار انسانوں سے خالی ہو رہا تھا۔ بادشاہ اور امراء خواہشات کی دنیا میں آزاد تھے۔ ان سے بازپرس کی جرات کسی میں نہ تھی۔

ایک زمانے تک یہ خاصان خدا لوگوں کے درمیان اپنے کردار اور گفتار سے تالیف قلوب و اذہان کرتے رہے۔ اجنبی زمینوں پر انہوں نے خدا کا پیغام پہنچایا اور ظالم حکمرانوں کے سامنے دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ خانقاہ اور مَدرسوں کا قیام عمل میں آتے ہی ارباب نظر کے درس و تدریس کا دائرہ بھی وسیع ہو تا گیا اور شیخ جنید بغدادیؒ کی تالیفات کے عام ہوتے ہی طلباء کی کثیر تعداد ان مدرسوں میں آنے لگی جہاں اہل علم بہ نفس نفیس ان کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے تھے۔ خدا رسیدہ بزرگوں کی تعلیمات سے بے شمار اہل قلم حضرات نے فیض اٹھایا اور اولیاء کرام کی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی تعلیمات کو اپنی تصانیف کے ذریعہ عوام تک پہنچادیا۔ جس سے قوم مسلم کے اندر زبردست نظریاتی انقلاب آگیا۔

صوفیائے کرام نے استغناء اور قناعت پر اس لئے زور دیا کہ حریت فکر کے لئے اہل دول سے کنارہ کشی لازمی ہے۔ ضرورتیں جتنی کم ہوں گی سالک اتنا ہی آزاد ہوگا۔ 'کلوا واشربوا ولا تسرفوا' کے فرمان الٰہی کا مقصد یہی ہے کہ نعائم فطرت سے متمتع ہونے میں میانہ روی اختیار کی جائے۔ سادہ زندگی فکر و عمل کی آزادی کی ضامن ہوتی ہے۔

از بال و پر غبار تمنا فشاندہ ایم　　بر شاخ گل گراں نہ بود آشیان ما

صوفیا تو ملوک اور ارباب حکومت سے بے نیاز تھے مگر حکمراں طبقے کو صوفیاء سے ہدایت کی ضرورت تھی۔ اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی مکمل ادائیگی ہی کو تقرب الٰہی کا اصل ذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا نظام شوریٰ (حقیقی جمہوریت) کو صوفی منش مگر دنیادار انسان کی ضرورت تھی۔ اسلام نے جس میانہ روی کی تعلیم دی تھی اسے انتہاؤں میں تلاش کیا جارہا تھا۔ حقوق اللہ کے ساتھ، حقوق العباد کا ادا کرنا بھی فرض ہے۔ چوری، رشوت ستانی، جمع خوری اور سود جیسی لعنتوں پر اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں ان کا مقصد حقوق العباد کی حفاظت ہے۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ لہٰذا انسان کی عوامی فطرت اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس نے فرائض کی ادائیگی میں عورت اور مرد کو برابری کا درجہ دیا لیکن معاشرتی معاملات میں حجاب کو لازمی قرار دینے کا مقصد نسائیت کا وقار قائم رکھنا اور اس کا تحفظ ہے۔ محرم اور نامحرم کا فرق جنسی نفسیات کو معاشرتی اخلاق کا پابند بناتا ہے۔ صوفیائے کرام کی زندگی ذہنی انتشار اور حرص و ہوس کی دنیا نہ تھی۔ ان کا ذہن و دل یقین کامل کی دولت سے مالامال تھا۔ جنسی اور دنیاوی خواہشات سے شعور صرف ایک حد تک ہی سروکار رکھتا تھا۔ وہ اپنی خلوت اور جلوت میں خدائی احکامات کو پیش نظر رکھتے تھے۔ خدا کا خوف ہر وقت ان کے دلوں میں جاگزیں تھا اور اس کا جلوہ انہیں اپنی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوتا تھا۔ وہ نفس کی حقیقت جانتے تھے۔ نفس مطمئنہ۔ نفس لوامہ اور نفس امارہ پر قدرت رکھتا تھا۔ عوام کے سامنے صوفیا کا کردار نفس مطمئنہ کی جیتی جاگتی مثال تھا۔ سکون قلب کے لئے خدا کی اطاعت اور اس کے احکامات کی پابندی لازمی ہے۔ دنیاوی آرام و آسائش کی بے جا طلب انسان میں کبر و نفاق، ظلم اور انتشار کو راہ دیتی ہے۔ عوامی ذہن بھی ان حقائق سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا اعتدال پسند ذہنوں میں جنسی اور نفسیاتی انتشار نہ تھا ان کے نزدیک جنسی تعلقات کا مقصد افزائش نسل سے زیادہ نہ تھا۔

جنسی انتشار (Sexual Coplex) اور جنسی دباؤ (Sexual Repression) سے پیدا ہونے والی ذہنی بیماریاں نہ تھیں۔ مشرقی معاشرہ بھلے ہی جنسی انارکیت سے کلیتہً خالی نہ ہو مگر یہ قوموں کا مزاج تو ہرگز نہ تھا۔ مشرقی ادب میں خصوصاً داستان اور رزمیہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں Abnormal کردار تو ضرور ملتے ہیں لیکن ان کا موازنہ موجودہ دور کی Abnormal شخصیتوں سے کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مثلاً لیلیٰ کے لئے مجنوں کی صحرا نوردی سی۔ جی۔ ژونگ (C.G. Jung) کے مطابق Complex ہی سمجھی جائے گی۔ لیکن ہمارے خیال میں محبت کامپلکس نہیں فطرت ہے۔ ہاں، عصری دور میں محبتیں کومپلکس بھی ہو سکتی ہیں۔ آج محبت کا معیار انسان کی مادّی ضرورت مثلاً روپیہ پیسہ اور جنسی خواہش کی تکمیل تک محدود ہو گیا ہے۔ اکثر نوجوان لڑکے، لڑکیاں سوسائٹی میں اپنے وقار (Status) کے مطابق ایک دوسرے سے تعلقات قائم کرتے ہیں اور اسے محبت کے رشتے استوار کرنے کا عمل جانتے ہیں۔ کبھی کبھی دولت اور شہرت کی خواہش اور جنسی لذت کا حصول بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔ جنسی تعلقات کی استواری کے بعد ان میں جذباتی عمل کی شدت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ترقی یافتہ نفسیاتی شعور انسانی، جنسی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی زبردست خواہش رکھتا ہے۔ لیکن معاشرتی قوانین اسے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ نتیجتاً شعور (Conscious) اپنی مدد کے لئے لاشعور (Un conscious) کا تعاون چاہتا ہے تاکہ ضمیر (Conscience) جسے معاشرتی قدروں کا تعاون حاصل ہے، اسے خواہشات کے راستے سے ہٹایا جاسکے۔ (واضح رہے کہ فرائڈ، ژونگ اور ایڈلر کا نظریہ ہمارے نظریے سے مختلف ہے) شراب اور نشہ آور ادویات سے اعصاب عمل کی شدت میں کمی واقع ہوتی ہے اور شعور پر ضمیر کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ضمیر سے آزاد ہونے کا خبط (Obsession) رفتہ رفتہ شعور کو غیر مستقیم (Abnormal) عمل کا عادی بنادیتا ہے۔ اس مشکل گھڑی میں اپنے عمل کو درست ثابت کرنے کے لئے شعور ایسے دلائل تلاش کرتا ہے جس سے ضمیر کو شکست دے کر انا (Ego) کو تسکین پہنچائی جائے تاکہ وہ شعور کا دفاع کر سکے۔ پے در پے حملوں سے تنگ آکر ضمیر اپنی مدافعت میں دل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ دل اسے جذباتی ہتھیار اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح ضمیر اور شعور کے تصادم سے ذہنی انتشار (Edementia) پیدا ہوتا ہے۔ ادھر ضمیر کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر لاشعوری غلاظت اور ہوسناک جذبوں کو شعوری افعال میں جذب ہونے کی راہ مل جاتی ہے اور ضمیر کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ذاتی خواہشات کی دنیا میں جنسی قوت محرکہ (Libido) یا نفس امارہ کا غلام کب ہو گیا؟

صوفیانہ اصطلاح کے مطابق نفس امارہ، جدید نفسیاتی فلاسفہ کی نظر میں Libido خود اپنی ذات کا محور ہوتا ہے۔ جس کی حرکت و توانائی انسان کی جسمانی بلوغیت

کے ساتھ ساتھ خود بخود پروان چڑھتی ہے۔ اور یہی قوت اضافی، لاشعوری نہاں خانوں میں منتقل ہو کر اس میں غیر مرئی مادی قوتوں کا جوش پیدا کرتی ہے۔ جس کے آگے ہواؤں کی تیزی اور دریاؤں کی غضبناک موجوں کی روانی بھی ہیچ ہے۔

نفسیاتی معماروں کے نزدیک انسانی وجود اموبا (Emoeba) کے بتدریج ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ اس کی شخصیت اور جسمانی ساخت لاکھوں کروڑوں سال گذرنے کے بعد عالم وجود میں آئی۔ دیگر سائنسی مفروضات کی طرح یہ خیال بھی ایک مفروضہ ہے۔ جس پر یقین کرنے کے بعد ہی فرائڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نفسیاتی معمے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک انسانی وجود اموبا (Emeoba) کے ارتقاء کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ اپنی موجودہ حالت میں روز اوّل سے قائم ہے۔ اشیاء کا وجود مٹی سے ہے۔ لیکن مٹی کا وجود اشیاء کا مرہون منت نہیں۔ اس کے باوجود مادہ کے جدلیاتی عمل سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ ایک کائناتی حقیقت (Universal Truth) ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ گردش میں ہے۔ لیکن مادہ کا جدلیاتی عمل کائنات کے فطرح شعور کا رہین منت ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ بھی ہے۔ سب کا ایک نظام عمل مقرر ہے۔ زمین کی گردش کے سبب موسم کا وجود ہے اور موسم، چرند، پرند اور انسان کے علاوہ پیڑ، پودے یہاں تک کہ حشرات الارض کے لئے بھی باعث رحمت ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو کل کائنات اپنے نظام فطری کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اور یہ نظام فطرت مادہ کی خصوصیت نہیں بلکہ مادیاتی ارتقاء نظام فطرت کے ماتحت ہے۔ لہٰذا انسانی شعور بھی فطرت کے عائلی قوانین کا تابعدار ہے اور فطرت کبھی ظالم نہیں ہو سکتی کیونکہ فطرت اگر ظالم ہوتی تو اس کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا۔ انسان نہ ہوتا۔ پیڑ، پودے، چرند، پرند، زمین، آسمان، سمندر، پہاڑ، دریا، صحرا کچھ بھی نہ ہوتا۔ نظام فطرت کا مقصد کائنات کا تعمیر ہے، تخریب نہیں ہے۔ فطرت بھلا چاہتی ہے، برا نہیں چاہتی۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ لاشعور (Un Concicusness) میں دبی ہوئی خواہشات محض، جنسی (Sexual) اور مادی (Materialistic) نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا انہیں نفس کی خوراک بنانے کی بجائے انسانیت کی فلاح و بہبود میں صرف کیا جانا چاہیے اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ایک دن یہ دنیا محض پاگل اور مخبوط الحواس انسانوں کی دنیا ہی رہ جائے گی اور انسان ایک بار پھر پتھروں کے یگ میں پہنچ جائے گا۔

ایک بار کسی نے آئن اسٹائن سے دریافت کیا "تیسری جنگ عظیم کس طرح لڑی جائے گی" آئن اسٹائن نے جواب دیا "تیسری جنگ عظیم کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں، ہاں چوتھی جنگ عظیم پتھروں سے لڑی جائے گی۔

قوت و حرکت کے قوانین فطرت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جدلیاتی قوانین کو بہتر بنایا جائے اور ایک نیا جدلیاتی متوازن نظریہ انسانیت وضع کیا جائے۔ کیونکہ ضرورت ہی اختراعات اور ایجادات کو پیدا کرتی ہے۔ نیوٹن اور آئن اسٹائن کے درمیان ۲۳۷ برس کا فاصلہ ظاہر کرتا ہے کہ کشش ثقل کا قانون تقریباً ڈھائی سو برس تک دنیا کو مادہ کی حقیقت سمجھنے میں تعاون دیتا رہا لیکن جیسے ہی یہ تلاش عروج پر پہنچی آئن اسٹائن نے اسے ایک نیا رخ دے کر فکر و عمل کے نئے دروازے کھول دیئے۔ تمام ذہنی توانائیاں خلائی جستجو کی طرف منتقل ہو گئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دور اپنی ضرورت کے مطابق خیال اور نظریات کو جنم دے کر ایک نئے باب کی شروعات کرتا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق فرائڈ کا نفسیاتی دور بھی اپنے شعور کی ضرورت سمجھا جانا چاہیئے۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ کا صنعتی انقلاب تمام دنیا کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ شہروں میں کل کارخانے لگائے جا رہے تھے۔ عورت اور مرد روزی روٹی کی تلاش میں شہروں کی طرف مراجعت کر رہے تھے۔ مرد و زن کا اختلاط بڑھ رہا تھا۔ جنسی اخلاق کے معاشرتی قوانین میں خود بخود تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں یورپ اور امریکہ میں شراب کا استعمال بے تحاشا بڑھ رہا تھا۔ قحبہ خانوں میں فاضل دولت لٹائی جا رہی تھی۔ امریکہ یورپی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھا، جہاں بڑی بڑی صنعتیں فروغ پا رہی تھیں۔ شہری آبادی کا اضافہ اونچی اونچی عمارتوں کی تعمیر کے لئے سرمایہ داروں کو عمارت سازی کے فن کو نئی وسعتیں دینے کے لئے نفسیاتی ترغیب دے رہا تھا۔ ایسی عمارتیں جنہیں انسانی تاریخ نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں۔ ان میں جنسی نفسیاتی قدریں بھی تھیں۔ ان کے ٹوٹتے ہی انسانی زندگی میں زبردست انقلاب آگیا۔ جمہوریت اور اشتراکیت نے عورت کو گھر سے باہر آنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اسے جدید نفسیاتی شعور کے ذریعے صدیوں پرانی مذہبی اخلاقی قدروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترغیب دی جا رہی تھی۔ سرمایہ داری کے سامنے مذہب بہت بے بس ہو چکا تھا۔ سائنس، سرمایہ داری، اور سیاست نے ایک نئی تثلیث کو جنم دیا تھا۔ جس سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ کلیسائی نظام زندگی کے پاس متصوفانہ فکر و عمل کی پائیدار بنیادیں بھی نہ تھیں۔ جو کچھ فکری اثاثہ تھا اسے حرص و ہوس کا سیلاب بہائے لئے جا رہا تھا۔ اخلاقی شکست و ریخت کے اس عمل میں ایک نئے جنسی اور نفسیاتی نظریے کی تخلیق بھی انسانی فطرت کے عین مطابق ضروری تھی۔ جس کا اثر ذہنی اقدار پر پڑنا لازمی تھا۔ ادب و شاعری، فلسفہ و سائنس اس نئی سرمایہ اور انہ جمہوریت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے تھے۔ جس نے دنیا کی تمام دولت اور عورت کی عصمت و عفت ان کے قدموں میں ڈھیر کر دی تھی۔

جب حالات اس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہے ہوں اور معاشرتی، معاشی، سیاسی، صنعتی، مذہبی، ادبی اور شہری علوم میں تبدیلیاں آ رہی ہوں تو نفسیاتی شعور کا بدل جانا کوئی انہونی اور انوکھی بات نہیں۔ فرائڈ چونکہ خود ایک ڈاکٹر تھا لہٰذا مریضوں نے جدید ذہن کے مطالعے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس کی تلاش و تحقیق کا دائرہ کار نیوٹن اور آئن اسٹائن کے دور تک ہی محدود تھا لیکن اس نے کمال خوبی کے ساتھ اپنے نفسیاتی مفروضات کو ساری انسانی تاریخ اور تحقیق پر مسلط کر دیا۔ یہی غلطی کارل مارکس اور چارلس ڈارون نے بھی کی تھی۔ ایک نے معیشت کو زندگی کا محور اور دوسرے نے انسان کو ایک اموبا (Emeoba) قرار دے کر سارا نظام فکر و عمل اپنی دلیلوں میں سمیٹ لیا تھا۔

سیاسی نظام اپنے دوام کے لئے ادبی استحکام چاہتا ہے۔ سرمایہ دار جمہوریت کا سب سے بڑا حریف بھی ہے حلیف بھی۔ دونوں ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں۔ سرمایہ

دار جب چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے، جمہوریت کا استعمال کر سکتا ہے۔ جہاں کہیں اختلافات ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار، فلسفہ اور ادب کو ہتھیار بنا کر اپنی پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے، ہراول دستہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل، انسانی ذہن کا نازک ترین پہلو ہے۔ لہٰذا نفس امارہ کو ابھارا جاتا ہے تاکہ عوام کی ہوسناک مادّی وفاداریوں کو سیاست اور سرمائے کے مفاد میں استعمال کیا جاسکے۔ اسی طرح جہاں ایک طرف مخالفین کو خاموش کیا جاتا ہے۔ وہیں دوسری جانب انسانی ذہن کو سرمائے کی گرفت سے آزاد ہونے بھی نہیں دیا جاتا۔ مشرقی متصوفانہ قدریں مغرب کے سرمایہ دارانہ اخلاق کی زبردست مخالف ہیں۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً انہیں بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تاکہ مذہبی اخلاقی قوتیں مجتمع نہ ہو سکیں۔ مثلاً شیطانک ورسیز (Satanic Verses) نہ تو کوئی روایتی ناول ہے اور نہ ہی انٹی ناول (Anti Novel) رودشعور (Stream of consiousness) کا عمل بھی اس میں مفقود ہے۔ ایک صحافی کی طرح مصنف واقعات کی حقیقی ترتیب بدل کر ایک بدہیئت ذہنی تصویر بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے ایک بڑا تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ دراصل یہ ایک انفرادیت پرست آدمی کے جنونی (Abnormal) ذہن کی پیداوار ہے۔ پھر بھی اسے انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور اس کی اخلاقی قدروں کو ناشائستہ زبان میں حرف ملامت بنایا گیا ہے تاکہ شہوت پرست سرمایہ دارانہ طرز فکر اور طرز زندگی کا راستہ ہموار کیا جاسکے۔ یہ کوئی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ انہوں نے تو دین مسیح کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حق وصداقت کے جن راستوں پر چلنے کی ہدایت کی تھی۔ جمہوریت پرست سرمایہ دار نے ان تمام راستوں پر ادب و فلسفہ سیاست وصحافت کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ جن سے گذر جانا بہت مشکل ہے۔

موپاساں کی ایک بہت مشہور کہانی کا خلاصہ یوں ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک بار پھر دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور گرجا کے صدر دروازے پر کھڑے ہو کر دعا کے بعد واپس جاتے لوگوں سے کہتے ہیں۔ "دیکھو، میں ہی جیسس (Jesus) ہوں اور تمہاری رہنمائی کے لئے ایک بار پھر دنیا میں آیا ہوں۔ "لوگ دیوانے کی بات سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آخر میں گرجا کا پادری دروازہ بند کرنے کے لئے آتا ہے۔ وہ اسے بھی اپنے جیسس ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں۔ پادری انہیں پہچان کر کہتا ہے "تم جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔ ورنہ اس بار میں تمہیں صلیب پر لٹکوا دونگا۔"

یہ آدمی تاریخ کے ہر دور میں نظر آتا ہے یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں بھی اسے پہچانا جاسکتا ہے۔ دراصل، تکبر، غرور، شہرت، اقتدار، دولت، حرص وہوس اور انانیت کے بے مہار جذبات خواہشات کی دنیا میں آباد ہوتے ہیں اور اپنی بقائے نفس کے لئے اس قدر ذہنی دباؤ (Repression) پیدا کرتے ہیں کہ انسان ایک اموبا (Emoeba) کی طرح خواہشات کی پیروی کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

فرائڈ، ژونگ اور ایڈلر کی تمام نفسیاتی اصطلاحیں صوفیائے کرام کی تعلیمات کی روشنی میں نفس امارہ سے متعلق نظر آتی ہیں۔ مثلاً انا (Ego) فوق انا (Super Ego) ذات اسفل (Id) شہوانیت، نفس لامہ (Libido) سبھی طرح کے مادیاتی، جنسی انتشار (Complex) جذباتی اختلافات (Ambivilence) جنسی دباؤ (Repression) غیر متوازن (Abnormal) جنسی کشش (Sex Appeal) جنسی کجروی (Sexual Perversion) سادیت (Sadism) مساکیت (Masochism) جنسی جبریت (Sexual Determinism) مادیت (Materialism) جنسی انارکیت (Sexual Anorchy) جنسی ارتفاع (Sublimation) اپنی ذات کا احساس (Self Assertion) جبریت (Determinison) وغیرہ۔ نفسیات، چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء (Theory of Evolution) پر یقین رکھتی ہے۔ جس نے مادیاتی ارتقاء اور حکمراں مادیاتی قوت و نظریات کے تحت انسان کو ایک اموبا (Emoeba) ثابت کیا ہے۔ لیکن صوفیاء کے نزدیک انسان اشرف المخلوقات ہے اور روز اول سے انسانی شکل میں ہے۔ نفس کی پیروی انسان کو راہ راست سے برگشتہ کرنے والی ہے۔ عشق ہی حقیقت ہے اور خدا تک پہنچنے کا راستہ بھی۔ نفسیات خدا پر نہیں، خواہشات پر یقین رکھتی ہے۔ اس کی نگاہ انسانی ذہن پر ہے لہٰذا خیال کی اہمیت ہے۔ عشق اس کے نزدیک ایک الجھن (Complex) ہے۔ صوفیائے کرام کے یہاں عشق ہی حقیقت ہے۔ جس کا نور انسان کے ذہن میں نہیں قلب میں ٹھہرتا ہے۔ قلب انسانی ہی شخصیت کا مرکز ہے۔ نفسیات ذہن انسانی کو مرکز سمجھتی ہے۔ اور غیر مستقیم (Abnormal) لوگوں سے واسطہ رکھتی ہے۔ تصوف، مستقیم (Normal) فطرت انسانوں کا مذہب ہے۔ نفسیات کا منتہائے نظر جنس (Sex) اور مادہ ہے۔ تصوف کا منتہائے نظر 'عشق' ہے اور عشق میں کوئی انا (Ego) نہیں ہوتی۔ اپنی ذات کا احساس (Self Assertion) نہیں ہوتا۔ اس لئے حکمراں مادی قوت کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ "فقط خودی ہے، خودی کی نگاہ کا مقصود"

فلسفہ نفسیات میں، زندگی کے صرف Abnormal پہلوؤں پر ہی غور و خوض کیا جاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کی جاتی کہ انسان کی Normal حالت کون سی ہے؟ وہ کون سے فکری اجزاء ہیں جو انسان کی غیر متوازن شخصیت (Abnormal Personality) میں توازن پیدا کرتے ہیں؟ نفسیاتی ادب کے ماہرین اپنی مثالوں میں پروفیسر، انجینئر، ڈاکٹر، پادری، تجارت پیشہ افراد، سرمایہ دار، ملازمین غرض یہ کہ شہری اور صنعتی زندگی کی تعمیر میں مصروف افراد کی ذہنی بیماریوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان بیماریوں کے اسباب و علل کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ان کا تجزیہ کمال ہوشیاری کے ساتھ فرد کے ذاتی معاملات یا معاشرتی افعال کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ عام زندگی سے متعلق ایسی سینکڑوں مثالیں نفسیاتی ادب میں نظر آتی ہیں۔ جن کی پس پشت ہم مشرقیوں کو جنسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی انحطاط صاف دکھائی دیتا ہے۔ لیکن فرائڈ اور اس کے ہمنوا اسے جبر، دباؤ اور کامپلکس (Complex) سے پیدا شدہ لاشعوری مظہر قرار دیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تصوف اور نفسیات دریا کے دو کنارے ہیں۔ ایک طرف انسان پانی پیتے ہیں اور دوسری طرف جانور!

ذہن انسانی کا سابقہ زندگی کے عام معاملات میں فطرت کے مادّی مظاہر سے ہوتا ہے۔ گھر بنانا، پیڑ کاٹنا، دریاؤں پر بند باندھنا، پہاڑوں کو توڑنا، کھیتوں میں اناج اگانا

، غرض یہ کہ ایسے ہزاروں کام ہیں جن کے لئے مادّی قوت درکار ہوتی ہے۔ دنیا کے خارجی معاملات میں متصوفانہ شعور انسان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اسے مادّی سائنس کی طرف رجوع ہونا ہی پڑتا ہے۔ جن کے پاس یہ علم ہے وہ اپنے اخلاق بھی سائنسی فلسفے کے نام پر ان کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اس طرح مغرب کا جنسی اور نفسیاتی انتشار ایک متعدی بیماری کی طرح قوموں کے درمیان پھیلتا جاتا ہے اور کسی کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ سب نئے سائنسی فلسفے کے فروغ کے لئے کیا جا رہا ہے۔

تصوف پر سینکڑوں معرکتہ الآراء تصانیف دستیاب ہیں۔ ان میں معاشرتی مسائل کے داخلی پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مادے کی بے ثباتی اس کے خارجی پہلوؤں پر غور و خوض کرنے سے روکتی ہے۔ مادیاتی فکر و فہم کی داخل حقیقت نہ ہونے کے سبب اسے ہدف تنقید و ملامت بنایا گیا ہے۔ مولانا رومؒ اور شیخ سعدیؒ نے دین و دنیا کے معاشرتی مسائل کو تماثیل اور حکایات کے ذریعے نہایت موثر پیرایۂ اظہار عطا کیا اور انسان کے اوصاف حمیدہ اس کے کردار میں تلاش کئے۔ متصوفانہ ادب خصوصاً شاعری میں قضاوقدر کے مسائل، دنیا کی بے ثباتی اور ارباب اقتدار کے عملی تضاد کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ شاعری اعلیٰ انسانی اوصاف کی حامل ہے۔ جس میں انسان کی عظمت اور دنیا میں اس کے اعلیٰ مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ متصوفانہ فکر و نظر میں عشق کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ عشق مجازی کے پردے میں عشق حقیقی کے جلوے ہزار صورتوں میں جلوہ گر ہیں۔ اللہ کی محبت اور کائنات کے ذرّے ذرّے میں اس کے وجود کا ادراک، ایمان و یقین کی معراج ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ اور جدید مادی افکار سے بہرہ ور ذہن بھی صوفیانہ صداقت کا معترف نظر آتا ہے۔

- عقل عیار ہے ، سو بھیس بنالیتی ہے، عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم (اقبالؔ)
- ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے ناصحو ، پند گرو ، راہ گذر تو دیکھو (فیضؔ)
- ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی (فراقؔ)

جدید تعلیم یافتہ ادیب اور افسانہ نگار بھی پیچھے نہیں۔ ان کے یہاں بھی متصوفانہ شعور و فکر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' میں شعور ذات، لاشعور کے ہاتھوں بے بس نہیں ہوتا۔ انتظار حسین 'بستی' میں علامتوں کا مایا جال بچھا کر بھی۔ متصوفانہ شعور فکر کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں معاشرتی شعور وہی ہے جسے فرائڈ نے Phylogenetic Unconscious کا نام دیا ہے۔ بہت کوششوں کے باوجود، جیمس جوائس، ورجینا وولف، کافکا، ارنسٹ ہمنگوے کا لاشعوری عمل مشرقی زبانوں میں ناپید ہے۔ شاید ہمارا لاشعوری نظام، ہمارے شعوری نظام سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ ہم لوگ معاشرتی زندگی کے قائل ہیں اور اجتماعیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ معاشرہ سے جدا ہو کر انفرادیت کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہمارے شعور کی طرح، لاشعور بھی معاشرتی اخلاقی اقدار کا پروردہ ہے۔ ہم مغربی انا (Ego) کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کی اپنی ایک انا بھی ہوتی ہے جو اگر کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہ ہو تو ایٹم کی طرح خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ آگ کو کھلا چھوڑنے کا مطلب تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ خواہشات پر معاشرتی کنٹرول ضروری ہے۔ انفرادیت پسند معاشرے کو محض قانون کی موٹی موٹی کتابوں اور کمپیوٹر سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ فرد کے لئے معاشرتی Eye Watch ضروری ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ معاشرہ ہی اجتماعی وحدت ہے اور وہی انسانی شعور و لاشعور کا محرک بھی۔ پیڑ (دماغ) کا وجود اس کی شاخوں (شعور، لاشعور) سے نہیں، تنا (معاشرہ) سے لیا جاتا ہے۔ شاخ کے ٹوٹنے پر بھی پیڑ کا وجود برقرار رہتا ہے۔ ہم اس کی شاخوں کو تنے سے جدا کر دیں تو ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور پیڑ بھی بے ثمر (ارتقاء) ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچئے، ایک جنگل (دنیا) کے سارے درختوں کی شاخیں کاٹ کر پیڑوں کے اطراف رکھ دی جائیں تو جنگل کس قدر بے رونق ہو جائے گا۔ ہواؤں کی ٹھنڈک اور نمی ختم ہو جائے گی۔ پرندے اور جانور بے سہارا ہو جائیں گے۔ دھوپ سبزہ سکھا دے گی۔ پانی سطح زمین سے نیچے چلا جائے گا۔ چٹانیں ٹوٹ کر زمین میں دھنس جائیں گی اور ایک دن سرسبز وادی لق ودق صحرا میں تبدیل ہو جائے گی۔

> اجتماعی زندگی کی تاریخ پرانی ہے۔ انسان کی حسی و قلبی استعدادیں قوت سے فعل میں آئیں اور اس نے معاشرتی زندگی کا آغاز کیا تو اس پر اجتماعی زندگی کی ذمہ داریاں عائد ہوئیں اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے حدود کا تعین، اس کی ذمے داریوں اور فرد و قوم کے حقوق و آزادی کے مسائل پیدا ہوئے۔ انسان حسیّ و قلبی تقاضے رکھنے کے ساتھ چونکہ ارادہ و اختیار بھی رکھتا ہے اس لئے افراد معاشرے میں نظری و عملی تضادات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا اور انہیں دور کر کے معاشرے میں وحدت فکر و عمل پیدا کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ یہ امن و سلامتی کی ایک لازمی شرط ہے۔ علاوہ بریں انسان اپنی ذات میں ایک صاحب ارادہ و اختیار نامیاتی کل یا نفس ہے۔ نفس کی ایک اپنی آزاد و خود مختار دنیا ہے جس میں اس کے اپنے ہم نفس آباد ہیں۔ مثلاً (الف) نفس امارہ، نفس لوامہ وغیرہ (ب) حواس خمسہ : سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ (ج) دل : جبلتیں، جیسے جنس، صیانت ذات، محبت، خوف، نفرت، غصہ و انتقام، بخل و اکتناز، غیرت و حمیت، تکاثر و خود نمائی وغیرہ (د) دماغ : عقل و فکر، وہم و خیال، ظن و تصور، حافظہ، ضمیر وغیرہ (ہ) روح: آرزوئے الہٰ (ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، پیغمبر اعظم و آخر، ص ۱۰۱۔ ۱۰۰)

ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ جب ایک ایسے بچے کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی، جسے بھیڑیوں نے پالا تھا۔ انسان ہونے کے باوجود اس کی تمام عادتیں بھیڑیوں جیسی تھیں۔ وہ بھیڑیوں کی طرح غراتا تھا، دوڑتا اور جھپٹتا تھا۔ اس کی کوئی ایک عادت بھی انسانوں جیسی نہ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی شعور و لاشعور، فکر و عمل، معاشرے کا مرہون منت ہے اور انسانی ذہن ایسا آرگن ہے جس کے تمام سُر معاشرتی ہواؤں سے کھلتے ہیں۔ اس بچے کی غیر انسانی عادتیں اس بات کی علامت ہیں کہ انسان روز اول سے انسان ہی ہے۔ امویا (Emoeba) نہیں۔ وہ بچہ اگر امویا کی ترقی یافتہ شکل میں تھا تو اس کا انسانی شعور کہاں گیا؟ اس کے شعور

علی احمد جلیلی

ہ جو اک رشتہ ترے نام کا تھا
سچ تو یہ ہے کہ بڑے کام کا تھا

نو ترے کرب میں گزرا اے دوست
ہی لمحہ بڑے آرام کا تھا

وشنی کے لیے گھر جلتے تھے
وب منظر وہ بھری شام کا تھا

ن لی ہار ہمیں نے ، ورنہ
اصلہ زحمتِ یک گام کا تھا

وں تھے دفن زمیں میں لیکن
ر میں سودا ہوسِ خام کا تھا

ر تھے قاتل وہی بن بیٹھے گواہ
سئلہ قتل کے الزام کا تھا

ہتے ہیں سب علی احمد جس کو
یک شاعر کوئی بے نام کا تھا

● 22-1-733/1، سلطانپورہ،
حیدر آباد۔ ۲۴



کرامت علی کرامت

وہ سچ کے چہرے پہ ایسا نقاب چھوڑ گیا
رخِ حیات پہ جیسے عذاب چھوڑ گیا

نتیجہ کوششِ پیہم کا یوں ہوا الٹا
میں آسمان پہ موجِ سراب* چھوڑ گیا

وہ کون تھا جو مری زندگی کے دفتر سے
حروف لے گیا ، خالی کتاب چھوڑ گیا

بہار بن کے وہ آیا، گیا بھی شان کے ساتھ
کہ زرد پتوں پہ رنگِ گلاب چھوڑ گیا

مرے لہو میں جو آیا تھا میہماں بن کر
مری رگوں میں وہ اک آفتاب چھوڑ گیا

گیا تو ساتھ وہ لیتا گیا ہر اک نغمہ
خلا کی گود میں ٹوٹا رباب چھوڑ گیا

ملا نہ جذبۂ تشکیک کو لباس کوئی
وہ ہر سوال کا ایسا جواب چھوڑ گیا

بکھیرتا ہے کرامتؔ یہ درد کی کرنیں
جو خواب ذہن میں اک ماہتاب چھوڑ گیا

*سرد ممالک میں عکسِ سراب الٹا ہوتا ہے۔ غالباً اردو غزل میں پہلی بار اس خیال کو باندھا گیا ہے۔ (ک۔ع۔ک)

● رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک (اڑیسہ)



غوث محمد غوثی

(ایک سعی)

اس کی رفاقت پہ ناز آٹھوں پہر ہے
یار کا غم خود بہ خود شریکِ سفر ہے
شرط ہے جوہرشناس ہونا کسی کا
شیشہ نہیں وہ تو آبدار گہر ہے
کیسے نہ ہو رنگ پاش رقص ہمارا
موجِ نظارہ غضب کی کیف اثر ہے
اب کے برس جاگیں فتنے سوچ سمجھ کر
چاروں طرف دور دور سب کی نظر ہے
مکر و ریا ، کارِ خیر و شر ہے گویا
ان کی نظر میں یہ عیب ان کا ہنر ہے
اب بھی یقیں ہے انھیں کے قول و قسم پر
آگ میں کیا جل بجھا یہ تم کو خبر ہے ؟
کچھ تو کھلے ، کیوں ہیں پھول رنگ پریدہ
گوشۂ رنگینیٔ بہار کدھر ہے
حق کے لئے ، کارزارِ فکر و عمل میں
وہ ، اکیلا سر بکف بہ سینہ سپر ہے
گرم ہے رُت زندگی کی ملیے ، اسی سے
ایک طرح سے وہ ، سایہ دار شجر ہے
وجہِ سکوں ، اپنی خوش روی ہے عزیزو
اپنے لئے ہی دماغ نقد و نظر ہے
اہلِ ہمم پر یہ قولِ طنز ہے غوثیؔ
فیصلۂ دل ، مقدرات ہی پر ہے

● سرائے رحمٰن، علی گڑھ (یوپی)

دیپک بڈکی
G.P.O. Complex, Residency Rd, Srinagar-190001

رشتوں کا درد

اپنی بیوی کی ارتھی میں نے کئی بار اٹھائی ہے۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ پہلی بار میں نے شادی کے چوتھے دن ہی اس کی ارتھی کو کاندھا دیا تھا۔ مرتے دم اس کی آنکھیں ایسے لگ رہی تھیں جیسے کسی خواب پریشان میں محو ہوں۔ میں نے بے نیازی سے اُن آنکھوں کے کواڑ بند کیے تھے۔

شمشان گھاٹ پہنچتے ہی میں نے اپنے کاندھوں کا بوجھ ہلکا کر دیا اور اس کی لاش کو جلدی جلدی چتا پر لٹادیا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ شاید زندگی بھر لوگوں کی نندا کرتے کرتے تھک چکی تھی اور اب قوت گویائی بھی کھو چکی تھی۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے چتا کو نذر آتش کر دیا۔ اور خود سامنے منہ لٹکائے ہوئے پوری لاش کے بھسم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کتنا بھاری بھرکم بوجھ تھا جو میں اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ مگر آج تو اس کی لاش بہت ہی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔

اور پھر میں مطمئن ہو کر گھر لوٹ آیا۔

وہ تو گھر میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ جس گھر کو میں کچھ گھنٹے پہلے عالم ماتم میں چھوڑ کر گیا تھا وہاں پر ہر طرف سکون چھایا ہوا تھا۔ ماحول دیکھ کر کسی پر اس بات کا شک بھی نہ گزرتا کہ اس گھر سے کبھی کوئی ارتھی اٹھ چکی تھی۔ ہندو عورت ہونے کے ناتے وہ بار بار جنم لیتی ہے اور میرے ہی گھر میں آ ٹپکتی ہے۔ مجھے آواگون کے چکر پر اب پورا بھروسہ ہونے لگا ہے۔

آج تک اس کی موت کئی بار واقع ہوئی تھی۔ وہ مر جاتی اور میں اس کی لاش کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر مرگھٹ پہنچا دیتا۔ مگر وہ پھر سے زندہ ہو جاتی اور مسان کا آسیب بن کر میرا پیچھا کرتی۔

پہلی مرتبہ جب اس کا پنر جنم ہوا تو میرے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اس نے میرے عقیدوں، ارادوں اور عبادتوں کا خون کیا۔ مفلسی کے بدبودار پیراہن کو اتار پھینکنے کے کوشاں تو ہم دونوں ہی تھے مگر اس نے بہت ہی عجلت سے کام لیا۔ وہ انسانیت کے سبھی تقاضوں کو بھول گئی۔

چوہوں کی اس دوڑ میں ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں منہمک ہو گئے۔ میں نے اسٹاک ایکسچینج کے انڈیکس سے اپنی ساری امیدیں اور خوشیاں وابستہ کر دیں۔ کیسی مسرت ہوئی تھی مجھے جب ہر شد مہتہ کی پیٹھ پر سوار ہو کر میں آسمانوں پر اڑنے لگا تھا۔ میری اڑان میں اور کوئی شریک نہیں ہو سکا۔ میری رفیقۂ حیات بھی نہیں۔ شادی کے پھیرے لگاتے ہوئے ہم نے جو اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں، دونوں بھول چکے تھے۔

کون کس کے لئے جیتا یا مرتا ہے؟ ہو سکتا ہے ستیہ یگ میں کوئی عورت اپنی مرضی سے ستی ہو چکی ہو، مگر اب تو زمانہ ہی بدل چکا ہے۔ اور پھر ایسی تو کوئی بھی مثال نہیں ملتی ہے جب کسی مرد نے عورت کی چتا پر چڑھ کر اپنے آپ کو شعلوں کے حوالے کر دیا ہو۔

وہ حسد کی آگ میں جلنے لگی تھی۔ یا ہو سکتا ہے کہ میں ہی اس کو دیکھ کر جل بھن چکا تھا۔ یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں اس آگ کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ اس نے اپنی اڑان کی نشاندہی کی تھی۔

وہ جھوٹ، مکر و فریب اور جرائم کی بیساکھیوں کے سہارے ترقی کے زینے طے کرتی رہی۔ ریلیف دفاتر میں کئی بے نامی کھاتے کھول کر وہ دو دو ہاتھوں سے روپیہ بٹورنے لگی۔ اور اسی سرمائے سے اس نے اپنے مستقبل کی مسکان خرید لی۔ اس لوٹ میں میرے نام کو بھی گھسیٹا گیا۔ میرے اثر و رسوخ سے کھاتے کھلتے رہے اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اب تک تو شاید میرے نام کی دھجیاں بھی اڑ چکی ہوں گی۔

کیسی ظالم ہوتی ہے عورت کی مسکراہٹ؟ دیکھنے والے تو اپنا وجود بھی بھول جاتے ہیں۔ پھر دستور اور قاعدے قانون کیا معنی رکھتے ہیں۔ اور ایک دن وہ سینہ تان کر میرے روبرو کھڑی ہو گئی اور اپنا موازنہ مجھ سے کرنے لگی۔ مجھے فزکس ٹیچر کی وہ بات اب سمجھ میں آ گئی جب وہ آئی نسٹائین کی تھیوری آف ریلیٹوٹی سمجھا رہا تھا۔

اس نے بلیک بورڈ پر ایک خط کھینچا تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا

تھا اس خط کے سائز کو بنا مٹائے کم کر دو۔ میں حیرانگی سے دیکھتا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے خود ہی ایک اور خط پہلے والے خط کے متوازی کھینچا جو اس سے کہیں زیادہ لمبا تھا۔ پہلا والا خط چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

آج ویسا ہی خط میری بیوی میرے سامنے کھینچ چکی تھی۔ وہ میری پہنچ سے بالکل باہر چلی گئی تھی۔ اس کو پکڑنے کے لیے مجھے گرزوں پر کمند ڈالنے کی ضرورت تھی۔ نظریۂ اضافیت رس رس کر میرے ذہن میں اتر تا جا رہا تھا۔

آخر وہ اتنی اونچائی پر کیسے پہنچ گئی؟ زمین سے آسماں تک کا یہ سفر اس نے کیسے طے کر لیا تھا؟ مجھے یاد ہے کہ جب وہ میری شرن میں آئی تھی تو کچھ بھی نہ تھی۔ اپنے عریاں وجود کو ڈھانپنے کے لیے اس کے بدن کے چیتھڑے کافی نہ تھے۔ وہ ان ہی دنوں کالج سے گریجویشن کر کے نکلی تھی اور اس کے بھائی نے اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے اسے میرے سر تھوپ دیا تھا۔ میں نے خندہ پیشانی سے اس کی تقدیم کی تھی۔ اپنا ہمدم اور ہم قدم بنایا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں ایسے سپنے جگائے کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے اس کو کئی داستانیں سنائیں۔ علی بابا چالیس چور کی کہانی۔ پریوں کی کہانیاں۔ شہزادوں کی کہانیاں۔ شہزادیوں کی کہانیاں۔ چاند تاروں کی کہانیاں۔ من میں بھی امنگیں جاگ اٹھیں۔ وہ زرپری کے ساتھ آسمانوں میں اڑنے لگی۔ اپنی منزلیں تلاشتی رہی۔

نہ جانے کیوں ہم دوسروں کو اپنی ناتمام خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اپنے خواب ان میں منتقل کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ہماری کٹھ پتلیاں بنی رہیں۔ خاص کر جب وہ ہمارے اپنے ہوں۔ اپنے بچے، اپنی بیوی، اپنے بھائی بہن.... آخر ان کے بھی اپنے ارماں ہوتے ہیں۔ اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ پھر وہ ہماری کٹھ پتلیاں بننا کیوں پسند کریں گے۔ منزل کی تلاش میں کہیں نہ کہیں وہ ہمارے معین کئے ہوئے راستے سے بھٹکنے کی کوشش ضرور کریں گے اور جب ہم اپنے خوابوں کے مینار گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔

پہلی بار جب اس نے بادلوں کے ساتھ اپنی سیڑھی سٹا کر اس پر چڑھنے کی کوشش کی تھی تو میں بے حد مضطرب ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گر کر اپنی ہڈی پسلی نہ توڑ دے اور پھر بے موت ماری جائے۔ مجھے اس کی ارتھی اٹھانی پڑے گی جس کے لئے میں اس وقت قطعی تیار نہ تھا۔ میں نے سیڑھی کے ساتھ پیٹھ لگا کر اس کو سہارا دیا اور وہ ایک ایک زینہ چڑھتی گئی۔ مجھے بہت احتیاط برتنی پڑی۔ پیر پھسل جاتا تو دھڑام سے زمین پر گر جانے کا احتمال تھا۔ اور پھر اس گرنے کی ضرب بھی تو شدید اور دائمی ہوتی ہے۔ میں نے سیڑھی کا سارا بوجھ اپنے مردانہ جسم پر اٹھالیا۔ وہ قدم بقدم چڑھتی رہی۔ میں شاباشیاں دیتا رہا۔ گاہ بہ گاہ وہ نیچے جھک کر دیکھتی اور پھر مسکرا دیتی۔ اس کے چہرے کی تمازت کو دیکھ کر مجھے فخر محسوس ہوتا۔

جونہی وہ سیڑھی کے اوپری سرے پر پہنچی، آسمان پر تیرتا ہوا سفید بادلوں کا ٹکڑا اس کے قریب آگیا۔ پورے اطمینان کے ساتھ اس نے اپنے دونوں پیر بادل کے ٹکڑے پر رکھ دئے اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ تیرنے لگی۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ گڑبڑاہٹ میں سیڑھی میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر میرے ہی اوپر آگری۔ میرا سارا بدن لہو لہان ہو گیا۔

انسانی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ خود غرضی اور ابن الوقتی کا مرکب! میں ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں کیونکہ مجھے انسان کے اس گھناؤنے روپ سے سخت نفرت ہے۔ اس لئے میں عمر بھر انسانوں کو کھرچتا رہا، کریدتا رہا۔ اُن کی ایک ایک پرت ادھیڑتا رہا۔ ان کی حقیقت تک پہنچ گیا اور پھر مایوس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ساری عمر کوئی بھی شخص میرا دوست نہ بن سکا۔

شادی کر کے میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ آخر بیوی بھی تو دوست کے مانند ہی ہوتی ہے۔ جب مجھے دوستی ہی پر بھروسہ نہیں تھا پھر بیوی پر کیسے رہتا۔ میں شادی کو ایک لازمی بھول چوک سمجھ بیٹھا تھا۔ نعمہ ہستی سے آدمی کتنا مسرور ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میری بیوی بادلوں میں کھو گئی۔ اس کے فنا ہونے کا کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ بس کافور ہو گئی تھی وہ۔ کوئی ارتھی اٹھی نہ چتا جلی اور میں اس روز بھی اکیلا ہی گھر لوٹا تھا۔

اور پھر اس کا ایک اور جنم ہوا تھا۔ جنتا پارٹی کے ایک پر اثر اور مقبول ترین نوجوان لیڈر سے اس کی اچانک ملاقات ہو گئی۔ شاید 'ماتر بھومی' کے لئے اس کا انٹرویو لینے کی غرض سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ فری لانس جرنلزم اس کی ہابی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے مکھوٹے پہن رکھے تھے۔ وہ اپنے مکھوٹے کو میرے ہی وارڈروب میں چھپا کر رکھتی تھی۔

آدرش، سماج واد اور انسانیت سے ہمدردی!

مشرقی پاکیزگی، روایت پسندی اور نیشنلزم!

دونوں اپنے اپنے مکھوٹوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سیاسی رہنما بہت ہی متاثر ہوا۔ ایسی باوقار، بولڈ اور بیوٹی فل عورت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ممکن ہے دیکھی بھی ہو مگر اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ انہوں نے آپس میں شادی کرنے کی ٹھان لی۔ راستے کی رکاوٹ صرف میں تھا۔ اور کوئی نہیں۔

ابھے سنگھ نے اس کو بنا شادی کے اپنے پاس رکھنے کی پیش کش کی۔ وہ نہیں مانی۔ وہ باقاعدہ شادی کے بندھن میں بندھنا چاہتی تھی تاکہ اسے کوئی رکھیل نہ کہے۔ اور اس کے بچے حرامی نہ کہلائیں۔

ابھے سنگھ اس بات پر بھی راضی ہو گیا۔ مگر راستے کی رکاوٹ.؟

مجھے راستے سے ہٹانے کے کئی منصوبے بنائے گئے۔

کورٹ! لالچ..! اغوا...! تالا....!

سپاری..! [باقی صفحہ ۳۴ پر دیکھئے]



علیم اللہ حالی

سمجھوتہ

نہ جانے کیا ہے کہ وہ سلاسل
ابھی تلک جان پر گراں ہیں
نہ جانے کیوں یہ اسیر کہنہ
نوائے زنداں سے ہی گریزاں
نہ جانے صدیوں کے پاش پاش آئینے میں کیا ہے
یہ کیسی طفلانہ آرزو ہے
کہ چھوٹے چھوٹے شکستہ ٹکڑوں
سے پھر وہ نقش و نگار مانگے
وہ رنگِ لیل و نہار مانگے
جو کب کے اصنامِ وقت کی نذر ہو چکے ہیں
اب ایسی شب تار منزلوں میں
مسافتوں کے مہیب و دلدوز مرحلوں میں
کہاں یہ امکاں
کہ منظر گم شدہ پھر آئے
یہاں تو ڈر ہے
کہ جو بچا ہے
کسی بھی لمحے وہ کھو نہ جائے

● وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا (بہار)



علی ظہیر

ایک پلٹتا ہوا منظر

جب جنازہ جا رہا تھا
رات کی خاموش باہوں کی طرف
اور زمیں کا ایک حصہ
اپنا منہ کھولے ہوئے تھا منتظر
میں بھی تھا پیچھے تمہارے
ساتھ سب کے

اور جدا سب سے
میں اکیلا لوٹ کر آیا تھا گھر
اب بھی اکثر
لوٹتا ہوں میں اکیلا
ساتھ سب کے
اور جدا سب سے

● سازا پارٹمنٹ، روڈ نمبر ۱۰، بنجارہ ہلز،
حیدر آباد۔ 800034 (آندھرا پردیش)



قمر نقوی

خون گشتہ

شہرِ جاں۔ آتش بہ تن۔!
کوئی نغمہ۔ کوئی دھڑکن ہے نہ چیخ
سرحدِ موت و خبر کے سائے میں
کرب کی سہمی ہوئی خاموشیاں
اور ہوا۔؟
سوختہ سامانیوں کے حبس میں
سسکیاں لیتی ہوئی۔!
بے بسی۔ ٹوٹے ہوئے بازو لئے
دم بخود، مضطر، پریشاں۔!
بیگناہی۔ اپنے زخموں سے نڈھال
مضطرب۔ گریہ کناں۔!
ناشگفتہ غنچے۔ نکہت بیز گل
خونِ ناحق کی ردا اوڑھے ہوئے
اور۔ اک بے اعتقادی کی فضا
جیسے خوں گشتہ جگر کے رنگ میں
زندگانی۔ منتشر ہوتی ہوئی
اس ہوا۔ بے اعتقادی۔ کرب کے ماحول میں
شمع تسکیں کیسے ہوگی ضوفشاں
خوں کے یہ داغہائے تابناک
صفحۂ تاریخ سے
کیسے مٹائے جائیں گے۔!

● 7 S. Indiana Polis, Tulsa,
OK-74136 (U.S.A.)



جرمن : ہربرٹ ہیکمن
ترجمہ : منیر الدین احمد
Am Sportplatz 13, 25495 Kummerfeld Germany

مہنگا سودا

Herbert Heckmann جرمن ادب میں بہت اہم نام رکھتا ہے ۔ اکاڈمی ادبیات کا پچھلے سال تک صدر تھا۔ اس کے افسانے اختصار اور اسلوب کے اعتبار سے خاصے کی شے ہیں ۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کے اسلوب کو اردو ترجمے میں قائم رکھوں جس کے سبب نامانوس فقرے وجود میں آسکتے ہیں ۔ میں جرمن کہانیوں کو اردو اسلوب میں ڈھالنے کے خلاف ہوں ۔ اس لئے اگر کہیں زبان پر اعتراض پیدا ہو تو درگزر کریں ۔ (م ۔ الف)

ہر سال جب گڈ فرائی ڈے کے روز گاؤں کے لڑکے بالے جھنجھنے بجا کر دوپہر ہونے کا اعلان کرتے ہیں، تو یوہاں کلے مینس ایک بھیڑ کو اپنے رکسیک میں ڈالتا، لانگ بوٹ پہنتا، بالوں کو برش سے دائیں بائیں سنوارتا اور اپنی بیتی سے کہتا تھا: "لو میں چلا"۔

دروازے سے باہر بھیگی ٹھہرتی صبح میں قدم دھرتا، ار کبرگ کی چوٹی پر بادلوں کی ٹوپی کو دیکھتا، ہاتھوں کو پتلون پر رگڑ کر گرم کرتا اور کیچڑ میں چل دیتا تھا۔ اس کے نقش ہائے قدم میں پانی رسنے لگتا تھا۔

اس کی بہن روسہاخ میں بیاہی گئی تھی، اگرچہ وہ اپنے وقت میں بڑی کراری شے تھی اور اس کو اس سے بہتر رشتہ مل سکتا تھا۔ اسے ایک ایسا خاوند ملا تھا، جس نے پہلی جنگ میں ایک بازو اور کوئی اچھا سا پیشہ اختیار کرنے کی ہمت کھو دی تھی۔ ریلوے میں ملازمت کرلی تھی۔ ٹکٹ چیک کرتا تھا اور سنیچر کے روز شراب کا ایک جام، پھر ایک جام پیتا تھا۔ بعض اوقات جھگڑنے لگتا تھا، جب الفاظ ساتھ نہ دیتے تھے۔ مگر جیسا کہ ہمسائے یقین دلاتے تھے وہ ایک بیباک آدمی تھا، جو ایک کے بعد دوسرا بچہ جنتا چلا گیا، کیونکہ اسے زندگی سے آخر کچھ تو مزا لینا تھا۔ بالآخر گلن ہاوسن میں مال بردار گاڑی کے پہیوں کے نیچے آگیا اور اپنی بیتی کو پانچ بچوں سمیت پیچھے چھوڑ گیا۔ چھٹا ہونے والا تھا۔

یوہان کلے مینس، جسے نہ تو ملٹری سروس اور نہ والڈ یورن کی زیارت نے بچوں کی نعمت سے نوازا تھا اس حادثے کے وقت سے اپنی بہن کی مدد کرتا تھا، جس قدر وہ اپنی مختصر زمینداری سے کر سکتا تھا، جو اس کو اور اس کی بیتی کو سات خنزیروں، تین بھیڑوں اور اکیس مرغیوں کو رزق دیتی تھی۔

یوں ہر سال وہ گڈ فرائی ڈے کو ایک موٹی سی بھیڑ حالیہ جھوٹ میں سے چنتا، اس کے پاؤں کو باندھتا اور براستہ بوشل اشٹائن کاربرگ اور کرکلبرگ کے پاس سے گذرتا ہوا روسہاخ جاتا تھا۔ پیٹھ پر ممیاتی ہوئی بھیڑ کو اٹھائے ہوئے، جسے ایسٹر کے روز ایک دیگچے میں اپنی قسمت میں لکھا ہوا پورا کرنا ہوتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب ہٹلر اپنی زندگی کے ۵۶ سال پورے کرنے والا تھا.... یہاں پر البتہ صرف گڈ فرائی ڈے اور صرف اس بھیڑ کا ذکر ہوگا.. یوہاں کلے مینس نے اپنے پاؤں بستر سے باہر نکالے اور سوچنے لگا کہ کیا ان برے وقتوں میں بہن سے ملنے کے لئے جانا ٹھیک بات ہے۔ اسے گٹھیا کی تکلیف تھی۔ اس کی ٹانگیں کچھ ایسی تندرست نہ تھیں۔ اگرچہ وہ ان کے گردیلی کی کھال لپیٹتا تھا۔ مگر وہ اپنے آپ کو اور اپنی بیتی کو اور دوسرے سب لوگوں کو، جو سننا چاہتے تھے، کہا کرتا تھا کہ بڑھاپے کا مقابلہ صرف خوش مزاجی کر سکتی ہے ۔ پیسہ یوں بھی اپنی قیمت کھو دے گا، کیونکہ امریکی ہیوخست کے سامنے کھڑے ہیں، جو ایک گھنٹے سے بھی کم فاصلے پر ہے، اور اپنی ڈالروں والی بھاری بھرکم توپوں سے رائش مارک بلکے جرمن سپاہیوں پر گولے برسا رہے ہیں۔ مگر آخر یوہاں کلے مینس نے ہانا وور اولانن میں ۱۹۰۸ء میں ملٹری سروس کی تھی، ۱۹۱۴ء کو مازورین جھیلوں کے پاس مورچے میں پڑا رہا تھا، ہوا میں اور روسیوں پر گولیاں چلائی تھیں، ٹائیفائڈ بخار سے بیمار پڑا تھا، وحشت ناک چیزوں کے خواب دیکھے تھے، فریب خیال کی مار سے اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ بعد میں بغیر صحیح طور پر جنگ میں لڑنے کے ایسی خستہ حالت میں تھا، جیسے ہنڈنبرگ کے پہلو میں کھڑا رہا ہو۔ یوہان کلے مینس کو خوابوں پر اعتماد تھا۔ اٹھنے سے قبل اس نے

خواب میں دیکھا تھا کہ اس کا گھر جل گیا ہے۔ مگر خیراتی جمعرات اور گڈ فرائی ڈے کی درمیانی رات کو اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ بالکل کچھ نہیں۔ جس کا مطلب بہت کچھ ہو سکتا تھا یا کچھ بھی نہیں۔

وہ اس طرح قدم جما کے چلا کہ اس کے جوتے چرچرانے لگے۔ سوئے سیب کے درختوں پر گھبرائے ہوئے بیٹھے تھے۔ دباغی چکی کی کھڑکیوں کے پٹ بند تھے اور گیٹ مقفل تھا۔ ارکبرگ کے پیچھے توپیں بھونک رہی تھیں۔

اکثر کسان اپنی سات چیزیں، پیٹیاں، دخانی دم پخت اور بھاری اوور کوٹ، مرغیاں اور خرگوش ٹوکریوں میں بند کر کے چھکڑوں پر لاد کر کاسل کر چھوڑ گئے تھے۔ وہ جنگل میں دنیا کی تباہی کا انتظار کرنا چاہتے تھے، مگر اس وقت تک انسان کو جینا تھا.... آخری آدمی تک۔ چرچ کا گھڑیال، جو عام طور سے دن کے کاموں پر حکم چلاتا تھا، رک گیا تھا۔ مرغ باد نما مشرق کی طرف رخ موڑے ہوئے تھا۔ کلے شپس کی نظر گدلے سرخ چھتوں پر پڑی۔

کہیں کوئی دھواں نہیں، صرف اس کی چمنی سے اٹھ رہا تھا اور ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ "یسوع مسیح، مریم اور یوسف" اس کی پتنی نے کہا تھا "ایسے وقتوں میں انسان کو دروازے سے باہر قدم نہیں دھرنا چاہئے۔" مگر یوہان کلے شپس دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

"جو کوئی مرد ہے، وہ خطرے کا سامنا کرتا ہے۔" اس نے عرصے سے اخبار نہیں پڑھا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ صرف جھوٹ بولا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا نیا مرغ لال سرخ کلغی رکھتا تھا، مگر مرغیوں کے معاملے میں اس کا وار خطا جاتا تھا۔ ایسے وقتوں میں، اس نے سوچا، انسان سچ پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی ہیر پھیر ہوتا ہے۔ گستاف حجام نے اسے آخری حجامت بناتے ہوئے قینچی اور کنگھی کے درمیان کہا تھا: "یہ آخری بار ہے کہ میں تمہارے بال کاٹ رہا ہوں۔ روسی پومرینیا بعید سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں پر پایا جاتا ہے؟"

"صرف نقشے پر"۔

"ایسٹ سی تک پہنچ گئے ہیں، ڈانزیگ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اوڈر سے وہ برلن کی طرف مارچ کر رہے ہیں، جو تمہیں پتہ ہے ہمارا دارالسلطنت ہے۔ جب دل ساتھ نہیں دیتا، تو انگلیاں ٹھٹھر جاتی ہیں۔ اور برلن میں ہمارا فیوہرر بیٹھا ہے اور گوشت نہیں کھاتا اور شراب نہیں پیتا۔ اور امریکی ریماگن سے ہالٹن کے راستے سے، تم جانتے ہو کہاں پر واقع ہے، براؤن شوائیگ کی طرف نریرے ماینز کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اگر تم اپنے کان کھولو، تو ان کو سن سکتے ہو، وم وم۔ اور برلن میں ہمارا فیوہرر بیٹھا ہے اور گوشت نہیں کھاتا اور شراب نہیں پیتا۔ اس کا نتیجہ برا ہوگا"۔

گستاف حجام کو سنانے میں مزا آتا تھا، ہر لفظ ایک بال۔ اسے بہت کچھ پتہ تھا اور اس طرح یہ ماجرا ہوا کہ یوہان کلے شپس کا سر منڈھ گیا؛ اگرچہ بہار کا موسم ابھی عارضی طور پر شروع ہوا تھا۔ یوہان کلے شپس نے اپنی رفتار کو تیز کر دیا۔ راستے کو ایک کیچڑ بھرے کھیت میں سے شارٹ کٹ کیا۔ اچانک اس نے گاجروں کے کھیت کی باڑ پر پانچ جرمن فوجیوں کو دیکھا، جو اسلحہ کے بغیر کیچڑ سے لتھڑے ہوئے لانگ بوٹ پہنے اور کالر کھولے ہوئے گذر رہے تھے۔

"یہ چیز ان وقتوں میں نہیں ہوتی تھی"۔

یوہان کلے شپس بھیڑ کی گرم گیلی سانس کو اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا۔ یونیفارموں کو دیکھ کر اس نے عادت کے مطابق دائیاں ہاتھ چربیلی ٹوپی کی طرف اٹھایا، رک گیا اور مضطرب بھیڑ کو پیٹھ پر اٹھائے ہوئے ابھی ایڑیاں جوڑے کھڑا تھا، جب فوجی قریب پہنچے۔ "ارے، باباجی" کہا اس نے جو فر لگا ہوا اوور کوٹ اور گھوڑ سواری کے بوٹ پہنے ہوئے تھا "ابھی تک جنگ میں؟ بارہ بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔ جرمن فوج چھٹی کر رہی ہے"۔

یوہان کلے شپس جو اپنے فوج کے دنوں سے جانتا تھا کہ کسی افسر کی باتوں کا بے تکلفانہ انداز اچھی بات کا پیش خیمہ نہیں ہوتا، تب بھی خاموش رہا اور اردگرد تکتا رہا، جب اس کی بھیڑ نے ممیانا شروع کیا اور سپاہی ہنسنے لگے۔

"یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ہم غریبوں کو یاد کیا ہے، کیونکہ ہم لوگ، جیسے جرمن بولی میں کہتے ہیں، بھوکے ہیں.... اور پھر ایک سالم بھیڑ۔ حد درجہ مروت۔ ہم لوگ تو گاجریں کھانے لگے تھے۔ کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں، باباجی؟"

یوہان کلے شپس نے اپنا دائیاں پاؤں آگے رکھا اور جب کہ وہ چہروں کا جائزہ لے رہا تھا، اس نے کہا: "درحقیقت کپتان صاحب یہ بھیڑ میری بہن کی ملکیت ہے، جو روساخ میں رہتی ہے اور جسے چھ معدے بھرنے ہوتے ہیں۔"

"آج کل ہم سب ایک ہی کشتی میں بیٹھے ہیں"۔

"جیسے آپ کی مرضی کپتان صاحب" یوہان کلے شپس نے اپنی ٹانگ بدلی۔ اس کا منڈھا ہوا سر ٹھٹھر رہا تھا، اسے اعصاب میں کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ اپنی پتنی کی نصیحت کے خلاف گھر سے باہر نکلا تھا۔ کیا عورتوں کی ہر بات درست نکلنی چاہیئے!

مگر اوور کوٹ اسے پسند آیا، کمر پر ناپ لے کر کاٹا گیا اور فر سے سجا ہوا۔ مجھے پورا ہوگا۔ "آپ کا اوور کوٹ خوبصورت ہے کپتان صاحب" اس نے کہا اور ہاتھوں کو ڈھیلا کیا، ان کو لمحہ بھر کے لئے پتلون کی کریز پر رکھا، پھر جلدی سے باہر کو ابھری ہوئی جیبوں میں ڈال لیا۔ اس طرح کہ اس کی پتلون ناف سے نیچے کھسک گئی۔

"کیا آپ کو پسند ہے؟" افسر نے پوچھا اور آنکھیں جھپکانے لگا، ایسے میں کہ اس نے اوور کوٹ کے بٹن کھولے اور پھیلا دیا۔ "عمدہ مال ہے۔" یوہان کلے شمیس نے زبان سے چٹخارا لیا۔ ایک ایسے اوور کوٹ سے تو اس کی شان بن سکتی ہے۔ اس نے قیمت کا اندازہ لگایا۔ کوٹ کم و بیش دو تین سو مارک کا تو ہوگا۔ اتنی رقم میں مجھے خنزیر مل سکتا ہے۔ میرا ناپ اور افسروں والی کوالٹی۔ اس نے مونچھوں کی نوکوں کو مروڑا، جو نیم بھوری منہ کے سروں پر لٹک رہی تھیں۔

"برا نہ مانیں کپتان صاحب، آپ کا اوور کوٹ کتنے کا ہوگا؟" ابھی اس نے یہ بات کہی ہی تھی کہ اسے سوال پر افسوس ہونے لگا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اوور کوٹ فی الواقعہ بہت خوبصورت ہے۔ درزی اپنے کام کا ماہر تھا۔"

اس کو پتہ ہی نہ چلا کہ کس طرح افسر ہنسی کے مارے آنکھیں بھینچ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سپاہیوں میں سے ایک ہاتھ رگڑ رہا تھا۔ اس کو صرف اوور کوٹ دکھائی دے رہا تھا، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ملکیت کی خواہش نے اس بات کو کہ اوور کوٹ ابھی اس کی ملکیت نہ تھا، ایک طرف دھکیل دیا تھا۔ اور یوہان کلے شمیس گھبرا گیا، جب افسر نے اشارے سے سمجھایا کہ اسے اوور کوٹ فقط ایک بھیڑ اور شاید اس کے ساتھ مانچسٹر کوٹ کے بدلے میں مل سکتا ہے۔ ان کا قد بت، جیسا کہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے، ایک جیسا ہے۔ "پتلون بھی مجھے یقیناً پوری آئے گی"۔

"جو بات آپ کہہ رہے ہیں، کیا آپ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" یوہان کلے شمیس بڑبڑایا اور اس نے بے اعتباری سے اپنے کوٹ اور اپنی پتلون پر نگاہ ڈالی۔

"بالکل یہی بات ہے۔" افسر نے جواب دیا۔

یوہان کلے شمیس نے بہن کو بھلا دیا، اپنی پتنی کو بھلا دیا، اپنی عمر کو بھلا دیا، جنگ کو بھلا دیا اور خنزیر کی قیمتوں کو۔ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے بوٹوں کو کھولا۔ دشواری کے ساتھ پتلون میں سے نکلا اور کوٹ کو اتارا۔

"کیا قمیص بھی؟" اس نے ہولے سے پوچھا اور اپریل کی ہوا میں کانپنے لگا۔ بالآخر وہ جانگئے میں، جو اس کے ٹخنوں تک جاتا تھا، اور رفو شدہ بنیان میں سپاہیوں کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے دانت بج رہے تھے۔ اس کو اوور کوٹ ملا اور یونیفارم۔ گرم پتلون میں گھسا، بازو لہراتے ہوئے قمیض پہنی، کوٹ کے بٹن بند کیے، جو اس کے کندھوں پر لٹک رہا تھا اور اس کے اوپر اوور کوٹ کو ڈال لیا۔

"جیسے سائز پر بنا ہو۔ ایک نیا انسان!" افسر نے پکار کر کہا۔ وہ کسان کے سامنے نیم ننگا کھڑا تھا۔ زمینی بیک گراونڈ کے سامنے مفلسانہ سفید چمڑی۔ اس کی ٹھوڑی کی نوک پر داڑھی نیلی چمک دے رہی تھی۔ پتلون کو اس نے فاخرانہ انداز سے پہنا اور اپنا توازن قائم رکھنے میں اسے مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آدم" اس نے آہ بھری۔ پتلون کے بٹن بند کیے اور کراہت کے ایک ہلکے سے اشارے کے ساتھ قمیص کو پہنا۔ "اب کپتان صاحب، آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے کسان سے پوچھا، جو اس کے سامنے اکڑا ہوا کھڑا تھا اور سانس تک لینے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

گھوڑوں کی بو باس اور شراب کی اور جکڑی ہوئی کمر۔ "اگر اس سے کام نہیں چلتا، تو ہم پتلون کو پھر اوپر کھینچ لیں گے۔"

"کپتان صاحب" اس نے کہا اور ایڑیوں کو کھٹ سے مارا، جتنا اس گیلی نرم زمین پر ممکن تھا اور جھوما: "کپتان صاحب، مجھے نہیں سوجھ رہا کہ مجھے کیا کہنا چاہیئے۔ کیا میں بانکا لگتا ہوں؟"

"جیسے ایک استرا" نئے کپڑوں میں ملبوس افسر نے کہا اور اس نے اپنی سابقہ یونیفارم پر ایک نگاہ ڈالی۔ "اب ہم نے اپنے کرداروں کو بدل لیا ہے۔" وہ مسکرایا، فوجی انداز میں سلیوٹ کیا اور اس نے آہ بھرتے ہوئے ہاتھوں کو جیبوں میں ڈال لیا۔

"اور بھیڑ؟"

"دراصل یہ چیز، اگر مجھے کہنے کی اجازت ہو، ممنوع ہے"۔

"آج کل ہر چیز جائز ہے۔ آدمی کو صرف پکڑے جانے سے بچنا چاہیئے۔"

یوہان کلے شمیس نے بھیڑ کو رسیک سے آزاد کیا، چپٹے ہاتھ سے اسے ایک ضرب لگائی کہ وہ کھیت کی سیاڑوں پر لڑکھڑانے لگی، اور فوجیوں کو خیرباد کہا۔ "جنگل کے بیچوں بیچ، پھر تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا"۔ اس نے ہاتھ سے شمال کی طرف اشارہ کیا اور لہراتے ہوئے اوور کوٹ کے ساتھ واپسی کے راستے پہ چل دیا، جس کو وہ بمشکل طے کر کے آیا تھا۔ بھیڑ فوجیوں کی ٹانگوں کے درمیان کود رہی تھی۔

یوہان کلے شمیس نے نہ دیکھا کہ شنقل کی چکی کے پاس تین ٹینک کھیتوں میں گھسٹ رہے تھے۔ اس نے امریکیوں کی آوازیں بھی نہ سنیں، جو جھکے ہوئے ٹینک کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس نے اوور کوٹ کے فر کے استر پر ہاتھ پھیرا، اپنے قدموں کو بڑھایا، جسم کو اکڑایا اور وسل بجانے لگا، جب اچانک بندوق کی گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کو چھلنی کر دیا اور زمین پر دے مارا، جہاں پر وہ کھلے ہوئے اوور کوٹ کے ساتھ چت پڑا تھا۔

"That's a general" ایک امریکی نے پکار کر کہا، جب وہ بے جان جسم پر جھکا اور اس کو اپنے بوٹ کی نوک سے پلٹایا۔ خون بہتے ہوئے اوور کوٹ میں سے رس رہا تھا اور چمکتے ہوئے بٹنوں کو لتھڑ رہا تھا۔

✱ ✱

عشرت ظفر

ں اک نمودِ شررِ اشتعال ہے اس کا
راس کے بعد ہے وہ اور زوال ہے اس کا

، روشنی جو مرے ذرۂ وجود میں ہے
ی تو آئینہ خط و خال ہے اس کا

، جانے کس لیے زندگی کتاب ہوں میں
ی اگر صدف ماہ و سال ہے اس کا

زاروں نقش قدم سبزۂ سکوت پہ ہیں
سی کے ہاتھوں چمن پائمال ہے اس کا

پرت پرت مری مٹی میں جذب ہوتا ہوا
یہ بوند بوند سراب وصال ہے اس کا

سیاہی وقت کی عشرت مجھے ڈرائے گی کیا
کہ میرے ہاتھوں میں روشن جمال ہے اس کا

● 88/413، ہمایوں باغ،
کانپور۔ 208001 (یوپی)



جعفر شیرازی

فلک میرا نہ یہ میری زمیں میرے علاوہ
میں کہتا ہوں میرا کچھ بھی نہیں میرے علاوہ

میں گر ٹوٹا نہیں تو ان شکستہ آئینوں میں
یہ بکھرا کون ہے جب میں نہیں میرے علاوہ

میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو خالی ہاتھ آیا
زمانے میں نہ تھا کچھ بھی کہیں میرے علاوہ

یہ کس کے عکس ہیں آنکھوں میں، دل میں، آئینے میں
کوئی تو ہے میرے گھر میں مکیں میرے علاوہ

میری سانسوں میں کس کی سانس کی مہکار سی ہے
یہ اتنا کون ہے میرے قریں، میرے علاوہ

یہاں میرے علاوہ پوچھتا ہے کون کس کو
کہ ہے دنیا کی دنیا خوشہ چیں میرے علاوہ

اب اپنے آپ ہی کو رہنما کرنا ہے جعفر
کہ میرے ساتھ اب کوئی نہیں میرے علاوہ

● K-554، فرید ٹاؤن، ساہیوال (پاکستان)



عشرت قادری

وہ کونسا گل ہے کہ گلستاں میں نہیں ہے
خوشبو ترے آنگن سی بہاراں میں نہیں ہے

کیا نجد کے صحراء کی روایت کریں تازہ
اک تار بھی تو جیب و گریباں میں نہیں ہے

لرزیدہ تھے جس نغمے سے زنداں کے در و بام
وہ سوز کسی سازِ رگِ جاں میں نہیں ہے

لکھنا تھا، بہت لکھدیا احوالِ زمانہ
گنجائش اب اوراقِ پریشاں میں نہیں ہے

نازاں ہے ملاحت پہ وہ اپنی اسے کیا غم
اک چٹکی نمک بھی جو نمکداں میں نہیں ہے

بیگانہ روی نے مری رکھی اس دور میں عزت
خوش ہوں کہ شمار اپنا ستمداں میں نہیں ہے

پازیب کی جھنکار، کہ مطرب کی نوا ہو
آہنگ اس آواز کا امکاں میں نہیں ہے

عشرت! کبھی اہلِ حرم و دیر سے پوچھیں
گیتا میں ہے جو کیا وہی قرآں میں نہیں ہے

● قادری لائبریری، ایم۔ ایل۔ بی کالج روڈ،
بھوپال (ایم پی)

پرویز یداللہ مہدی
'B' Bldg, Flat-4, 4th Fl. Pump House,
Hanjar Nagar, Andheri (E) Bombay - 400093



ہوئے تم دوست جس کے

عیادت اور مزاج پرسی کبھی اخلاقی فریضہ ہوا کرتی تھی، باہمی میل ملاپ اور یکجہتی کا مظہر ہوا کرتی تھی، بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے کسی زمانے میں شہر حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے بلدی حدود میں ایک ہمسایہ دوسرے ہمسائے کے دکھ درد میں اس حد تک شریک ہوا کرتا تھا کہ پڑوسی کو اگر غلطی سے بھی ڈبل روٹی گھر لے جاتے ہوئے دیکھ لیتا تو اس کے پیچھے پیچھے، مزاج پرسی کی غرض سے پڑوسی کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا کہ اس زمانے میں حیدر آبادیوں کے گھر ڈبل روٹی صرف اسی وقت جایا کرتی تھی جب افرادِ خانہ میں سے کوئی نہ کوئی بیمار ہوا کرتا تھا۔ لیکن افسوس، برا ہو زمانے کے تغیرات کا، ان تغیرات نے جہاں اگلے وقتوں کی بیشتر مثبت اقدار کو ناقدری کی صلیب پر ٹانک دیا وہیں مزاج پرسی اور عیادت جیسے ہمدردانہ فعل کو خوف ہراس اور مایوسی کی انتہا پر پہنچادیا۔ ان دنوں مریض کی عیادت کرنا خود مرض بلکہ وباء کی شکل اختیار کر گیا ہے بلکہ فی زمانہ سب سے آسان دو ہی امور ہیں، عیادت کرنا اور غلط مشورہ دینا۔ آج کا ترقی یافتہ انسان اس قدر کاروباری ہو گیا ہے کہ ہر بات ہر عمل میں منفعت بخش پہلو تلاش کرنے لگا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مزاج پرسی بھی پیشہ بن گئی ہے۔ جس طرح نئی نئی پریکٹس کرنے والے وکیل، چرب زبان اور چلتا پرزہ قسم کے پیروکاروں کی مدد سے معقول کمیشن کے عوض موکلوں کو پھانستے ہیں بالکل انہی خطوط پر اب تازہ کار ڈاکٹر بھی اپنے ایجنٹوں کے توسط سے مریضوں کو پھانسنے لگے ہیں۔ یہ ایجنٹ بڑے ہجونچے ہوئے 'مزاج پرس' ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے "مطب" اور اپنے مطلب "کو چمکانے کے لیے اس خوبصورتی سے مزاج پرسی کا جال بنتے ہیں کہ مریضوں کے ساتھ غیر مریض بھی اس میں بری طرح پھنس جاتے ہیں اور یوں گھن کے ساتھ گیہوں بھی پس جاتا ہے۔!

ایسا نہیں ہے کہ ان پیشہ ور مزاج پرس ایجنٹوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں، یہ آپ کی ہماری طرح کے نارمل انسان ہوتے ہیں چنانچہ ہمیشہ دوستوں، بہی خواہوں اور شبھ چنتکوں کے روپ میں ہم سے ٹکراتے ہیں اور یوں اچانک حملہ آور ہوتے ہیں۔ "کیا بات ہے؟ آپ کچھ سست دکھائی دے رہے ہیں، چہرا بھی اترا ہوا ہے، آنکھیں بھی پیلی پڑ گئی ہیں، کل تک تو اچھے خاصے بھلے چنگے تھے، لگتا ہے اندر ہی اندر کوئی بیماری آپ کو گھن کی طرح کھائے چلی جارہی ہے، آثار اچھے نہیں ہے۔ کس کے زیر علاج ہیں۔ ؟"

جواب میں پنڈ چھڑانے کے لیے آپ متعلقہ ڈاکٹر کا نام لیتے ہیں، نام سنتے ہی تشویشناک لہجے میں اگلا وار یوں کیا جاتا ہے۔ "ارے رے رے، کہاں موت کے منہ میں پھنس گئے جاکر۔ فوراً ڈاکٹر بدل لئے جناب وہ کم بخت ڈاکٹر نہیں ملک الموت کا پی۔اے ہے دوا کے نام پر زہر دیتا ہے ظالم اور جو سخت جان مریض اس کی دوا سے نہیں مرتا، اس کا بل دیکھ کر دم چھوڑ دیتا ہے۔"

بے چارے ڈاکٹر کی مٹی پلید کرنے کے بعد اصل مطلب پر آجاتے ہیں۔ 'میری مانیئے تو فوراً طوطا رام مینالال سے ملیے انشاء اللہ ایک ہی خوراک میں طوطے کی طرح چہکنے اور مینا کی طرح پھدکنے نہ لگیں تو خدا کی قسم میں اپنی یہ پلی پلائی مونچھیں مونڈ ڈالوں گا۔!"

اب آپ سے کیا چھپانا حال ہی میں ہمارا پالا ایک ایسے ہی پیشہ ور عیادت باز سے پڑ چکا ہے، موسمی تبدیلی کی وجہ سے معمولی سا زکام ہو گیا تھا بس اسی کو رائی کا پربت بنادیا، فرمایا۔ "دو دن سے دیکھ رہا ہوں دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز لگتی ہے، ناک سے برابر استاد بسم اللہ خاں کی شہنائی بجائے چلے جارہے ہو۔ "موصوف کی یہ خاصیت ہے ہمیشہ دشمنوں کی طبیعت کے حوالے سے اپنے شناساؤں کے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک کرتے ہیں اس مخصوص تمہید کے بعد ہمارے معمولی زکام کے یوں بخیئے ادھیڑنے لگے۔ "لوگ عموماً زکام کو وہ مقام نہیں دیتے جس کا یہ مستحق ہے۔"

ہم نے فوراً ازراہ مذاق کہا۔ "جناب والا آپ زکام کے مقام کے بارے میں اس طرح فرما رہے ہیں جیسے زکام نہ ہو کوئی ادبی شہ پارہ ہو۔!"

جھنجھلا کر بولے۔ "تم ادیبوں، شاعروں کے ساتھ یہی تو مصیبت ہے، ہر بات کو ادب کی کسوٹی پر پرکھتے ہو، ہر چیز کو ادبی چشمہ لگا کر دیکھتے ہو! برادر میری بات کو گرہ میں باندھ لو، جس طرح شراب کو بزرگوں نے ام الخبائث کہا ہے، اسی طرح زکام کو بھی ابوالامراض یعنی کہ تمام امراض کا

والدِ بزرگوار کہتا ہوں۔"

موصوف کی اس عجیب و غریب زکامی تشریح پر ہماری ناک میں ایک یخ بستہ لہر دوڑ گئی جس کے نتیجے میں ایک عدد زوردار چھینک ہمارے حلق سے آزاد ہوئی، پھر کیا تھا موصوف کو بات میں سے بات نکالنے، چراغ سے چراغ جلانے اور بیماری سے بیماری کی کڑیاں ملانے کا نادر موقع مل گیا، بولے۔ "بقول آپ کے اب تک جو معمولی ساز کام تھا، آہستہ آہستہ پر پرزے نکالنے لگا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ چھینکیں شروع ہو گئی ہیں، پھر چھینکتے چھینکتے انشاءاللہ آپ کی آنتوں میں سوزش ہونے لگے گی جس سے آپ کے پھیپھڑے متاثر ہوں گے جو براہِ راست جگر کے فعل کو متاثر کریں گے اور اس قدر متاثر کریں گے کہ آپ فوراً یہ گانا گانے لگیں گے۔

جانے کہاں میرا جگر گیا جی
ابھی ابھی یہیں تھا کدھر گیا جی

اور پھر نوبت بہ ایں جا رسید اس سارے چکر کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دل کے نظام العمل میں خلل واقع ہو گا اور بالآخر معمولی زکام آپ کی جواں جہاں بیوی کو بیوہ اور ہنستے کھیلتے بچوں کو سوکھا میوہ بنا دے گا۔" زکام کے اس اجمال پر ملال کی تفصیل سن کر ہم تھر تھر کانپنے لگے تو وہ دلاسہ دیتے ہوئے بولے "اب بھی کچھ نہیں بگڑا فوراً حکیم ناسوری سے رجوع ہو جائیے ایسا طبیب حاذق کرہ ارض پر فی الحال دوسرا نہیں ہے ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ہمارے ایک دوسرے عزیز کے گردے میں پتھری آ گئی تھی، بڑے بڑے ماہر سرجنوں کو دکھلایا سبھوں کی ڈاکٹری ہمارے عزیز کی پتھری سے ٹکرا کر لہولہان ہو گئی لیکن حکیم ناسوری نے ایک ہی ہفتے میں اس موذی پتھری کو پانی پانی کر دیا۔ میں تو کہتا ہوں حکیم صاحب کے اس سینہ بہ سینہ نسخے کو اگر ہمالہ پہاڑ پر آزمایا جائے تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جائے۔!!"

ہم نے پوچھا "اب آپ کے وہ عزیز کیسے ہیں؟"

افسوس ناک لہجے میں بولے۔ کچھ روز اور حیات لکھا کر لایا ہوتا تو یقیناً مزے میں ہوتا۔!!"

"کیا مطلب۔؟" ہم بری طرح گڑبڑا گئے۔

بولے۔ 'غریب کو پتھری سے تو نجات مل گئی لیکن موت کا وقت چونکہ معین ہو چکا تھا اس لئے پتھری کے ساتھ گردہ بھی پانی پانی ہو کر بہہ گیا۔ یوں بھی گردے میں پتھری اسی وقت آتی ہے جب اوپر والا کسی کو اندر سے 'سنگسار' کرنا شروع کرتا ہے۔!"

ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "صاف کہیے کہ حکیم صاحب کے علاج نے اس کی جان لے لی۔!"

فوراً بولے۔ "ایسا نہیں کہتے برادر! موت کی گھڑی اور سہرے کی لڑی کب اچانک سر پر پہنچ جائے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ آج کے ملاوٹی دور میں حکیم ناسوری ان ولایتی معالجوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو علاج تو پیٹ کے درد کا کرتے ہیں اور مریض کی موت ہارٹ فیل سے واقع ہوتی ہے جبکہ حکیم صاحب ان خاندانی حکما میں سے ہیں جن کے مریض شرطیہ اس بیماری سے مرتے ہیں جس کے علاج کے سلسلہ میں حکیم صاحب سے رجوع ہوتے ہیں، تم اپنے اس موذی زکام کے سلسلے میں بلا خوف و خطر حکیم صاحب سے علاج کروا کے دیکھو انشاءاللہ تمہاری موت زکام سے ہی واقع ہو گی۔!!"

ہم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "اگر خدانخواستہ مجھے کسی مہلک بیماری نے آگھیرا تو یقیناً آپ کے ناسوری صاحب ہی سے علاج کرواؤں گا۔ فی الحال زکام جیسے حقیر فقیر مرض سے مرنا نہیں چاہتا اس لیے معاف فرمائیے گا۔ اتنا کہہ کر ہم فوراً وہاں سے نکل لیے اور حکیم صاحب کے ایجنٹ چلاتے رہ گئے

سچ پوچھئے تو ان دونوں مزاج پرسی اور بہ الفاظ دیگر عیادت اور تعزیت، میں وہی شرعی فرق رہ گیا ہے جو 'حلال' اور 'جھٹکے' میں پایا جاتا ہے۔ عیادت باز چاہے شوقیہ ہو یا پیشہ ور، مریض کو ملک الموت کی پیشی میں پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔ مزاج پرسی کا حلالی روپ آپ ملاحظہ فرما چکے اب ذرا عیادتی جھٹکے سے بھی گزر کر دیکھئے۔ قصہ یوں ہے کہ ہمارے پڑوسی علامہ نچوڑ ہمدانی پر اچانک نقاد بننے کی دھن سوار ہو گئی چنانچہ موصوف نے بڑے جوش کے ساتھ اپنا پہلا تنقیدی مقالہ بعنوان 'جوش کی شاعری میں ہوش' قلمبند کرنا شروع کیا ہی تھا کہ ان کے سینے میں ایک 'جوشیلی ہوک' اٹھی اور وہ اپنے ہوش کھو بیٹھے، نتیجتاً بے ہوش علامہ کو جوش کے شکنجے سے چھڑا کر دوبارہ ہوش میں لانے کے لیے بڑے اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں بر وقت طبی امداد علامہ کو از سر نو ہوش و حواس میں لے آئی۔ موصوف کے ہوش میں آنے کی خبر سنتے ہی ہم نے ان کی عیادت کا پروگرام بنایا اتفاق سے طوطیٔ پڑوس، خاقانیٔ بس، میر محلہ پروفیسر بیش بہا خاں صاحب بہا ہمارے ساتھ ہو لیے، پروفیسر صاحب اردو میں خود کو ب۔ ب۔ خان اور انگریزی میں بی۔ بی خان کہلانا پسند فرماتے ہیں اور پروفیسر شپ کے علاوہ زندگی کے بیشتر شعبہ جات سے بھی قریب قریب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، علاوہ ازیں پروفیسر صاحب خود کو علامہ نچوڑ کا ہمعصر ہی نہیں بلکہ ہم نوالہ ہم پیالہ و ہم دوشالہ گردانتے ہیں اسی سلسلے میں ہم نے بھی ادھر ادھر سے اڑتی اڑتی سنی ہے کہ ایام جوانی میں ہر دو حضرات امداد باہمی کے اصولوں پر نہ صرف مشق سخن فرماتے تھے بلکہ عشق کے معاملے میں بھی انہی اصولوں پر سختی سے کاربند رہا کرتے تھے۔ بہر حال پروفیسر صاحب کی ہم رکابی پر ہم خاصے مطمئن تھے کیونکہ ان کی موجودگی ہمارے لیے عیادت کا مرحلہ آسان بنا سکتی تھی۔ ایک تو پروفیسر موصوف علامہ کے یار غار دوسرے پیشہ ور عیادت باز، عیادت کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سچ پوچھئے تو عیادت اور قیادت موصوف کے ہمہ وقتی اور مرغوب ترین مشاغل ہیں ایک بار جس کی

عیادت فرمانے کا شرف حاصل کر لیتے ہیں پھر اس کے جنازے کی قیادت بھی شرطیہ آپ ہی فرماتے ہیں۔ بہر حال علامہ کی مزاج پرسی کو جاتے ہوئے ہم نے راستے میں قاعدے کے مطابق ایک عدد تازہ گلدستہ خریدنے کی کوشش کی تو پروفیسر موصوف نے فوراً ٹوک دیا۔ "پھول کس لیے خرید رہے ہو۔؟"

عرض کیا۔ "مریض کی خدمت میں پھول پیش کرنا اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔"

موصوف نے جھٹ سے اپنا فلسفہ جھاڑا۔ "برخوردار، یہ طریقہ صرف گوری قوم کو زیب دیتا ہے، ہمارے ہاں قبروں کی زیارت کو جاتے ہوئے پھول لے جانے کا رواج ہے اور اس وقت ہم علامہ کے موت کے منہ میں سے واپس لوٹنے کی خوشی میں ان کی عیادت کے لیے جا رہے ہیں ان پر فاتحہ پڑھنے نہیں۔"

پروفیسر موصوف کی اس انوکھی فلسفہ طرازی پر ہم نے پھول خریدنے کا ارادہ ترک کر کے کچھ موسمی پھل خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے پھر اپنے فلسفے کی دال بگھاری۔ "یہ کیا حماقتوں پر حماقتیں کر رہے ہو برخوردار! شاید تمہاری معلومات عامہ کا دائرہ بڑا محدود ہے۔ میاں جاپان کے لوگ جب اپنے پرکھوں کی قبروں پر جاتے ہیں تو پھل ساتھ لے جاتے ہیں ادھر میرا پیارا دوست اردو کا پہلا اور آخری پیدائشی علامہ موت و زیست کی کشمکش سے گزر کر ابھی ابھی واپس لوٹا ہے اور تم بد شگونی پھیلانا چاہتے ہو۔!" موصوف کی اس عجیب و غریب ڈانٹ پھٹکار پر ہم جی مسوس کر رہ گئے اور بالآخر خالی ہاتھ اسپتال پہنچنا پڑا۔

علامہ کو دیکھتے ہی ہمارا دل بھر آیا، خاصے کمزور ہو گئے تھے بے چارے، لگتا تھا جیسے دل کے دورے نے علامہ نچوڑ کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہے، اس سے پہلے کہ ہم تسلی و تشفی کے چند کلمات کہہ کر ان کی ڈھارس بندھاتے پروفیسر صاحب سلام کلام پر بات کو بالائے بام رکھ کر تیر کی طرح علامہ کی طرف لپکے اور پھر ان سے بغل گیر ہونے کی کوشش میں ان پر اچھے خاصے لیٹ گئے کیونکہ علامہ بے چارے پہلے ہی بستر پر لیٹے ہوئے تھے پھر اسی طرح ان پر لدے لدے انہیں اس طرح گھورنے لگے جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ آیا علامہ سراپا دل بیتاب ہیں یا بیتابی دل کا تماشا ہیں، پھر روہانسے لہجے میں اپنے "کلام عیادت نظام" کا باضابطہ آغاز فرمایا۔ "فانی مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔!"

پھر اپنی شعر خوانی کا ردعمل مریض کے چہرے پر دیکھے بغیر کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے مزید بولے "نہ کوئی ڈاکٹر ہے تمہارے کمرے میں نہ کوئی خوبصورت نرس نگہبانی کو، کس قدر تن تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے میرے یار کو کم بختوں نے، خوب یاد آیا ایسے ہی کسی موقع کے لیے غالب مرحوم فرما گئے ہیں۔ ۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ شعر سن کر علامہ کا زرد چہرہ اور پیلا پڑ گیا لیکن پروفیسر صاحب ان کے چہرے کی زردی کو بڑی بے دردی سے نظر انداز کر کے آگے بولے۔" حوصلہ رکھو میرے دوست، ڈر اور خوف کو اپنے پاس پھٹکنے بھی مت دو۔ ایک اور مرحوم شاعر نے کیا خدا لگتی کہی ہے ۔

مرنا تو ایک دن ہے ڈرنے سے فائدہ کیا
شکوا گلہ کسی کا کرنے سے فائدہ کیا

ویسے بھی موت کا ایک دن معین ہے اور بقول شیکسپیئر مرحوم موت سے پہلے صرف بزدل ہی مرتے ہیں میرے یار، غالب مرحوم نے ایک بار پھر کیا خوب فرمایا ہے ۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ۔

اگر ان تمام وسوسوں سے شرطیہ نجات پانا چاہتے ہو تو اللہ اللہ کرو دوست، اس کے باوجود اگر کچھ ڈراؤنی صورتیں وغیرہ نظر آئیں تو پھر لاحول پڑھو، کہتے ہیں لاحول پڑھنے سے بدروحیں پاس بھی نہیں پھٹکتیں البتہ ملک الموت کو مٹانے کا کوئی نسخہ کسی نے ایجاد نہیں کیا آج تک، اسی لیے موت کو برحق کہتے ہیں لیکن موت موت میں بڑا فرق ہوتا ہے، کسی مرحوم شاعر نے اس سلسلے میں بڑے پتے کا شعر نکالا ہے۔ ۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

تمہاری تسلی کے لیے ایک اور مرحوم شاعر کے حوالے سے اتنا ہی کہوں گا

موت سے کس کو رستگاری ہے
کل کا سکہ آج ریزگاری ہے
یعنی آج تم کل ہماری باری ہے

پروفیسر صاحب کے آخری تین مصرعے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے، علامہ کا زرد چہرہ ایک دم سرد ہو گیا کیونکہ اب ان کے بچے کچے خون میں مزید زرد ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ہم نے مریض کی غیر کیفیت کو بھانپتے ہی پروفیسر صاحب کو جھنجھوڑتے ہوئے ڈانٹ پلائی۔

"آپ یہاں عیادت کی غرض سے آئے ہیں یا تعزیت کرنے۔؟" اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب جواب میں کچھ کہتے علامہ بے ہوش ہو چکے تھے، ہم نے فوراً ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو آواز دی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسپتال کا سارا عملہ علامہ کے گرد جمع ہو گیا اور پھر بروقت طبی امداد مل جانے سے علامہ ایک بار پھر موت اور پروفیسر صاحب دونوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے یوں عیادت، تعزیت میں، مزاج پرسی پرسے میں تبدیل

ہونے سے بال بال بچ گئی۔!

علامہ کو دوبارہ ہوش میں دیکھ کر پروفیسر صاحب اپنی قاتلانہ عیادت کے دوسرے راؤنڈ کا آغاز کیا ہی چاہتے تھے کہ ہم انھیں تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے اور انھی کے انداز میں ان پر برس پڑے "آپ کو بے موقع، بے محل شعر سنانے کا بڑا خبط ہے، چلتے چلتے میں ایک شعر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں گرہ میں باندھ لیجئے۔ آپ جیسے عیادت بازوں کے تعلق سے کسی مرحوم شاعر نے کہا ہے۔

عیادت کو آئے بلا بن گئے　　　عیادت ہماری قضا بن گئی

صاحبو! وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم نے کبھی کسی کی عیادت کی حماقت نہیں کی بلکہ یقین مانیے ہم ایک ایسی وصیت مرتب کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں جس کی رو سے اپنے ورثاء کو اس بات کا پابند کردیں گے کہ چاہے ہم پر کیسی ہی آفت کیوں نہ ٹوٹ پڑے کسی موذی مرض میں مبتلا ہو کر اس قدر فریش ہو جائیں کہ فرش ہی کا ایک حصہ کیوں نہ بن جائیں لیکن کسی عیادت باز کو ہماری بیماری کی ہوا بھی نہ لگنے دی جائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ خدانخواستہ اگر ہماری موت واقع ہو جائے تو موت کے سرٹی فیکٹ میں خانہ پری کے وقت موت کے اسباب کے کالم میں کسی خطرناک بیماری کی جگہ فقط لفظ "عیادت" لکھا ہو۔

✱✱

بقیہ صفحہ ۲۵ : رشتوں کا درد

ان منصوبوں میں وہ پوری طرح شریک تھی۔ لیکن میری قسمت اچھی تھی کہ میرے کانوں میں ان اسکیموں کی بھنک پڑی۔ میں نے خبر پاتے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ آخر ابھے سنگھ سے کون بھڑ جاتا۔

وہ جاچکی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار مجھے اس کی ارتھی کو کاندھا نہیں دینا پڑا۔ میں خوش تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ وہ بھی خوش تھی جس کا اندازہ اس کی آنکھوں کی چمک سے لگایا جاسکتا تھا۔ وہ پھر آسمان چھونے والی تھی۔ فرطِ مسرت سے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اسے یقین تھا کہ ابھے سنگھ کے ساتھ شادی کر کے اس کی ترقی کے مزید امکانات کھل جائیں گے۔

آدمی جتنا اوپر چڑھتا ہے اتنا ہی تنہا ہو جاتا ہے اور جب چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو تن تنہا ہوتا ہے۔ اس کی تنہائی اس کو کاٹ کھارہی تھی۔ وہ ولایتی شرابوں میں سکون ڈھونڈنے لگی مگر وہ بھی اس کی تنہائی کا مداوانہ بن سکیں۔ اس کی شخصیت میں چڑچڑاپن، غرور اور احساس برتری گھر کر چکے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ابھے سنگھ سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ لیکن ابھے سنگھ کی رگوں میں ٹھاکروں کا خون تھا جو اپنی ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ میری طرح کمزور برا ہمن نہیں تھا۔

رات کے اندھیرے میں نشے میں چور ابھے سنگھ اور اس کے ساتھی اس کو اٹھا کر لے گئے اور کیریسل ہوٹل کے باورچی خانے کے تنور میں اس کے زندہ جسم کو دہکتے شعلوں کی نذر کردیا۔ باورچی خانہ دس منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ قیاس یہی تھا کہ جل کر راکھ ہو جائے گی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو گی۔

مگر اس روز ہوا کا رخ کچھ الٹا رہا۔ سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ جلتی رہی اور جلتے بدن کی بدبو وردی پوشوں کے نتھنوں میں سوراخ کرنے لگی۔

دوسری صبح جلے ہوئے بدن کا کوئلہ اخباروں کی سرخیوں میں بدل گیا۔ یہ اس کی آخری موت تھی۔ اس بار اس کے لاشے کو اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھا سکا وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ اس کا نام کسی نہ کسی بہانے روشن ہو۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہو۔ آخر کار وہ اپنی جان دے کر اخباروں کی سرخیوں میں امر ہو گئی۔

ابھے سنگھ نے اپنے آپ کو نردوش ثابت کردیا۔ انگشتِ جرم میری طرف اٹھائی گئی اور میری کسی نے بھی نہ سنی۔

جیل کی یہ کوٹھری بہت ہی آرام دہ ہے۔ ✱✱

بقیہ صفحہ ۲۲ : تصوف اور نفسیاتِ ادب

میں بھیڑیوں کی جبلت کا پیدا ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ معاشرہ میں انسانی دماغ کا شعور متحرک ہے۔

نوبل پرائز یافتہ سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام نے ۹ مئی ۱۹۷۹ء کو پیرس میں آئن اسٹائن کے جشن ولادت کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

آئن اسٹائن نے اگر کسی ترقی پذیر ملک میں جنم لیا ہوتا تو ضائع ہو جاتا۔

سلام صاحب کے اس قول کی روشنی میں، ہم اب تک یہی سمجھتے رہے کہ ترقی پذیر ملکوں کی معاشرتی پسماندگی میں نابغۂ روزگار شخصیتیں ضائع ہو جاتی ہیں مگر ہمارا ایسا سوچنا غلط تھا۔ کیونکہ یہ معاشرہ ہے، جو کسی کو آئن اسٹائن تو کسی کو اقبال بناتا ہے۔

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں　　　لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

(پہلے بیماری پھیلائی جاتی ہے، پھر اس کا تدارک پیش کیا جاتا ہے۔)

✱✱



یعقوب راہی

کبھی کچھ تو

کبھی تو
کوئی دن
مجبور۔ کچلے لوگ
صبر و ضبط کی برسوں کی عادت چھوڑ کر
ہمت جُٹائیں
حاکمانِ وقت کو للکارتے نکلیں
فصیل حکمرانی.... ڈھا کے یوں رکھ دیں
کہ پھر اُس کے ابھرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ ہو
—— گھمسان کا رن ہو
اسی رن سے اُبھرتے معتبر آفاق دیکھوں
اور اُن آفاق میں.... خوابوں کی تعبیریں
کبھی تو۔ کوئی دن
کچھ تو........ O

● 101۔ رین بلار منٹ، کلشی پارک ہاؤسنگ کو مپلکس،
نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ) ضلع تھانے ۔ ۴۰۱۱۰۷ (ایم۔ ایس)

ڈر

تم تو
کہہ رہے تھے
جیت چکے ہو لڑائی
چُن چُن کر
صفایا کر چکے ہو دشمنوں کا
پھر یہ آہٹ آہٹ
ڈرتے کیوں ہو؟ O

آنکھیں تو کھولو

پتہ نہیں
کیا گزر رہی ہے تم پر؟
اس اندھیرے میں
کیا سوچتے ہو؟ کیا دیکھتے ہو تم؟
مجھے تو دُور دُور تک
جگنو ہی جگنو دکھائی دے رہے ہیں
آنکھیں تو کھولو
شاید تم بھی دیکھ سکو
جگہ جگہ —— دور دور تک
جگنو ہی جگنو.....
آنکھیں تو کھولو O

آج پھر

سنو
آج پھر
زخمی پرندوں کو
اڑتا سکھا رہا ہوں
سن رہے ہو؟ O

سیلابِ نو

اب تو
کالے گھنے بادلوں کو
آکاش پہ چھا جانا ہی چاہیے
کھل کر
جم کر —— برسنا ہی چاہیے
دھوپ سہتی۔ یہ سوکھتی دھرتی
کب سے ترس رہی ہے
سیلابِ نو کے لیے؟ O

پچھلے پہر

پچھلے پہر
اُبھرتی رہتی ہے دستک
کھل جاتی ہے نیند
بولنے لگتے ہیں سناٹے
کھلنے لگتی ہیں تنہائیاں
دھڑکنے لگتا ہے دل۔ اچھلنے لگتا ہے لہو
اور پھر
سنورنے لگتا ہے آنکھوں میں.... کھلا کھلا سا اک چہرہ
گونجنے لگتی ہے کانوں میں.... مدھر مدھر سی اک آواز
پچھلے پہر.... O

آنکھ کھلے تو

سونے کو تو
سو جاؤں گھپ اندھیرے میں
لیکن صبح جب آنکھ کھلے
دور دور تک دیکھوں۔ لہکتی بیلیں،
مہکتے پھول دمکتے چہرے
دور دور.... O

فاروق راہب
Shantipuri, Motihari - 845461 (Bihar)



ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی!

شناخت کی سرحدوں پر جھولتی سانسوں کی کربناکی میں پھنسی زندگی کی ان گنت، ان کہی داستانوں کا قصہ گو ابتدا سے پہلے ہی انجام پر ہے کہ درد کی لکیریں نہ مٹتی ہیں اور نہ گھٹتی ہیں۔ بس بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں!

"آپ دیکھ رہے ہیں نا، بھائی جان!"

یہ میری بھانجی پروین ہے!

اس کے بھائی جان کہنے پر میری دونوں چھوٹی بہنوں، سونی اور مونی کا آنکھ لال پیلا کرنا لازمی ہے۔ لیکن اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت انہی کے بیچ ہوئی ہے، اس لئے وہ سب سمبندھ جوان کے ہیں، وہی اس کے ہیں۔ لیکن نا سمجھی میں تینوں اکثر جھگڑتی رہتی ہیں۔

"دیکھئے بھائی جان! اپنی بہنوں کو۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔ تم بس ڈٹی رہو۔"

"کیا بھائی جان آپ بھی، آپ ہی نے اس کو اور سر چڑھالیا ہے۔" سونی چڑ کر بولتی ہے۔

"کہیں بھی جاتے ہیں تو بے عزتی ہماری ہوتی ہے۔" مونی غراتی ہے۔ "ہر جگہ یہ آپ کو بھائی جان ہی کہتی ہے۔"

"میں آپ کو بھائی جان کہتی ہوں تو آپ کو بھی اچھا لگتا ہے نا!"

"ہاں جی۔"

"لیکن یہ دونوں کیسے مجھ پر آنکھیں گڑائے ہوئی ہیں، جیسے کچا ہی چبا جائیں گی۔"

"چپ موٹی! تیرا گوشت کون کھائے گا، بچے گا بھی۔" دونوں نے ایک ساتھ جملہ کسا ہے اور تینوں ہنسنے لگتی ہیں۔

رشتوں کے کینواس پر جب پیار سے بھری صورتیں ابھرتی ہیں تو نفرت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور تب کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں!

سنگھرش کی بنیاد مضبوط ہو تو بٹوارے کی دیوار نہیں کھڑی ہو سکتی!

"لیجئے بھائی جان! آپ کے لئے گرما گرم چائے لائی ہوں۔"

"پہنچ گئی بھائی جان کی چمچہ گیری میں۔"

"آپ کی یہ دونوں بہنیں ہیں نہ، مجھ سے بری طرح جلتی ہیں۔"

"کیوں، کیوں۔"

"آپ مجھ کو زیادہ مانتے ہیں نہ، اسی لئے۔"

"ہاں، یہ بات تم نے سوا سولہ آنے صحیح کہی ہے۔"

"آپ کے اس جملہ میں کچھ گھپلا لگ رہا ہے۔"

"چلو اچھا ہے، گھوٹالا نہ ہوا۔"

بے غرض لمحوں کے ہمراہ اپنے وجود میں چھپی خوشبوؤں کی تلاش میں کتنا مزہ آتا ہے! بہاروں کا ایک طویل سلسلہ گلوں کی رنگ برنگی کیاریوں کو چھوتا چلا جاتا ہے اور ہم بدمست ہواؤں کی دیوانگی میں محصور ہو جاتے ہیں!

اس وقت تینوں، تمام شرارتیں اور نوک جھونک بھول کر ڈرائنگ روم میں صوفے میں دھنسی خاموش بیٹھی ہیں اور گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے، ہتھیلیوں میں گالوں کو رکھے ایک ٹک ڈاکٹر ارن کو دیکھ رہی ہیں۔!

ڈاکٹر ارن منشی سنگھ کالج کے شعبۂ ہندی سے منسلک ہیں۔ اردو سے گہرا لگاؤ ہے اور کلاسیکل میوزک سے شوق کے سبب اردو کی بے شمار غزلیں انہیں یاد ہیں۔ دوستوں کی محفلوں میں اکثر اپنی جادوئی آواز بکھیرتے رہتے ہیں اور جب میرے یہاں آتے ہیں تو تینوں لڑکیاں انہیں بخشتی نہیں ہیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ سنا کر ہی جانا پڑتا ہے۔ آج بھی وہ ان کی فرمائش پوری کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ارن کی پرکشش آواز نے سماں باندھ دیا ہے۔ ہر شئے ٹھہری سی، رکی رکی سی لگ رہی ہے۔ جیسے پرسکون جھیل کی چھاتی پر کوئی کشتی، انجانی دشاؤں کے سفر کے لئے تیر اوی گئی ہو!

لیکن اچانک یہ تسلسل تینوں کی چیخ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے۔

"بھائی جان۔!!"

تینوں [illegible]

طرف مڑتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی ہیں اور انگلیاں دروازے کی سمت اٹھی ہوئی ہیں۔ جہاں وہ بوڑھے توانا درخت کی مانند سیدھا تنا ہوا کھڑا ہے!

ہم بھی اسے دیکھ کر سہم گئے ہیں۔ اس کا حلیہ بھی بڑا عجیب ہے۔ گھٹنوں تک کالا کرتا اور کالی تہبند۔ گلے میں سونے کی موٹی چین، انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں، ایک ہاتھ میں چھڑی اور ایک کاندھے سے لمبا چرمی تھیلا لٹکا ہوا ہے۔ چہرے پر ادھ پکی گھنی داڑھی، مونچھیں بڑی بڑی اور اوپر کو اٹھی ہوئی اور بال گردن تک جھولتے ہوئے سے۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر سپاٹ اور چہرہ بھی جذبات سے عاری۔!

عرصہ سے یہ شہر میں دیکھا جا رہا ہے۔ ایک دن اچانک ہی نمودار ہوا تھا اور متعدد افواہیں اس کے ساتھ گشت کرنے لگی تھیں۔ کسی نے پاگل کہا، کوئی اسے پہنچا ہوا فقیر سمجھ رہا تھا۔ اسے پاکستانی جاسوس اور دہشت گرد کے شک میں پولس بھی پکڑ لے گئی تھی۔ لیکن اسے فوراً ہی رہا کر دیا گیا۔ اسے اتنی جلدی کیوں چھوڑا گیا آج بھی معمہ بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بھی۔!

"کیا اندر آنے کو نہ کہو گے؟" اس کی جھنجھناتی آواز گونجتے ہی ہم ہوش میں آ گئے ہیں۔

"جج۔ جی، تشریف لائیے۔" اٹک اٹک کر میں نے الفاظ ادا کئے ہیں۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر ازن سے وہ مخاطب ہوتا ہے۔

"جناب! آپ کیا پڑھ رہے تھے۔

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

اپنے دونوں ہاتھ چھڑی کے سرے پر رکھتا ہے اور آنکھیں بند کر کھوئے ہوئے انداز میں کہتا ہے۔

"اسے ایک بار اور گنگنانے کی زحمت گوارا کیجئے۔"

ڈاکٹر ازن اسے پھر گنگناتے ہیں۔ اور وہ پھر گذارش کرتا ہے۔

ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات۔ اور سات پر ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ چھلک پڑتے ہیں۔

"کیا بات ہے؟ آپ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں! یہ میرا کلام بھی نہیں ہے اور نہ میں شاعر ہوں۔ یہ تو اردو کے معروف شاعر ناصر کاظمی کی ایک خوبصورت غزل کا عمدہ اور دل کو چھو لینے والا شعر ہے۔"

ڈاکٹر ازن کے مزید کچھ بولنے سے قبل وہ ہاتھ جوڑ لیتا ہے۔

"مجھے راحت مل رہی ہے بھائی! آرام محسوس ہو رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں اور وہ ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر زور زور سے سسکنے لگا ہے۔ تینوں لڑکیوں کا رنگ اب تک اڑا ہوا ہے اور ہم دونوں بونقوں کی طرح کبھی اس کو اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ غبار جب کچھ دھلا تو وہ بھیگا چہرہ اٹھاتا ہوا بھرائے لہجے میں کہتا ہے۔

"وہ کھڑکی میں ہی ہوں میرے بھائی! انتظار کی کھڑکی۔ بے چینی واضطراب کی کھڑکی! شہر بھوپال کا نام کون نہیں جانتا! وہاں کا میں بڑا تاجر تھا، مگر اب صفر بھی نہیں ہوں! بھوپال کا وہ خونی گیس حادثہ، ناقابل بیان پر وحشت المیہ۔ وہ منحوس رات! میں تجارت کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا اور جب لوٹا تو سب ختم ہو چکا تھا۔ حویلی کا ایک بھی فرد زندہ نہیں بچا۔ سب سوئے کے سوئے رہ گئے۔ نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ کھڑا ہو کر خلا میں گھورتا ہوا بڑبڑاتا ہے۔

"قدرت اتنا بڑا ستم مجھ پر نہیں ڈھا سکتی۔ خدا اتنا نامہربان کیسے ہو سکتا ہے! وہ صرف قہار تو نہیں ہے! کوئی نہ کوئی ضرور بچا ہو گا، میری طرح۔ اس لئے میں برسوں سے دربدر کی خاک چھان رہا ہوں۔ امید کی موت نہیں ہوتی! کوئی نہ کوئی ضرور ملے گا۔ کہیں نہ کہیں ملے گا۔ کھڑکی کھلی ہے ابھی۔ کھڑکی کھلی ہے ابھی۔ ضرور ملے گا۔"

گنگناتے ماحول کو سوگوار بنا، وہ جا چکا ہے۔ اس کے بعد بکی ہوا بھی شانت ہو گئی ہے۔ مگر تینوں لڑکیاں اب بھی ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی ہیں اور ہم ہراساں چہرے کے ساتھ ذہن کے تیزابی سناٹے میں جانے کیا ڈھونڈ رہے ہیں!

٭٭

قمر رضا شہزاد

تری گفتگو ترا دھیان چھوڑنا چاہیے
ہمیں اب یہ خستہ مکان چھوڑنا چاہیے

یہ ہماری خاک نجانے کب سے ہے بے نشاں
یہاں اپنا کوئی نشان چھوڑنا چاہیے

یہاں کوئی ہم سا نہیں رہا سو ہمیں بھی اب
یہ خراب حال جہان چھوڑنا چاہیے

یہی ایک عشق تو عمر بھر کی کمائی ہے
اسے سوچ کر مری جان چھوڑنا چاہیے

یہ زمانہ سچ کے خلاف ہے تو قمر رضا
تجھے اپنا رنگِ بیان چھوڑنا چاہیے

● معرفت-K-554، فرید ٹاؤن، ساہیوال (پاکستان)



لطیف

اک تنہا شجر ، خواب ترا
اک اور ثمر خواب ترا

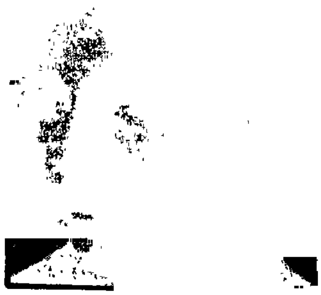
کیوں ریت میں گم یاد تری
صحرا میں سفر ، خواب ترا

کیوں خواب میں تھا قتل ترا
تھا دل میں مگر خواب ترا

کیوں خواب میں تھی سچ بات تری
سچ بات کا ڈر خواب ترا

پتھر میں تھے سب خواب ترے
تھا آگ میں گھر خواب ترا

● 4-870، مخدوم پورہ، صندل گلی،
گلبرگہ (کرناٹک)



عالم خورشید

بڑے آرام سے ہم ہیں فضائے آہ وزاری میں
سنائی کچھ نہیں دیتا ہمیں اب شہر یاری میں

جزیروں کو ڈبوتا ہے کبھی صحرا اگاتا ہے
سمندر خوش نہیں لگتا فصیلِ بے کناری میں

یہ غفلت کا نتیجہ ہے کہ موسم کی کوئی سازش
اُگی ہے فصل کانٹوں کی گلوں کی ہر کیاری میں

مری مٹی کو بس پت جھڑ کا ہی موسم راس آتا ہے
بدن پہ زخم کھلتے ہیں یہاں فصلِ بہاری میں

ہمیں اپنی طرح کوتاہ قد اب وہ سمجھتے ہیں
کمی کچھ آگئی شاید ہماری انکساری میں

ہمیشہ انتہا کی سرحدوں پر ہم رہے عالم
دیارِ دھوپ سے آئے ہیں گم برف باری میں

Office of the D.A.(P) Exhibition Road, ●
Patna - 800001 (Bihar)



عزیز پری ہار

جد میں لائے جو موسم وہ ہنر تیرا ہے
روز بارش میں جو بھیگے وہ شجر تیرا ہے

فظ تو ایک ہے، اس لفظ کے کتنے پیکر
فظ کی سیپ میں پوشیدہ گہر تیرا ہے

ایک تحریر جنم لیتی ہے دل میں ہر روز
پیکرِ نور، صحیفہ سحر تیرا ہے

رونقیں تیری ہیں، خاموش فضا بھی تیری
رقص کرتے ہوئے لمحوں کا سفر تیرا ہے

راحتیں تیری، جنوں خیز تلاطم تیرا
کل کے ادراک کا انمول ثمر تیرا ہے

کھڑکھڑاہٹ سی یہ پتوں کی بدن کے اندر
اک عجب شور سے آباد یہ گھر تیرا ہے

● 176-HJ-ہاؤسنگ بورڈ کالونی، فیروز پور روڈ،
لدھیانہ-١٤١٠٠١ (پنجاب)



ہیرانند سوز

پہلے تو خواب ذہن میں تشکیل ہو گیا
پھر سیل وقت میں کہیں تحلیل ہو گیا

بے نور راستوں میں جو بھٹکے ہوئے تھے لوگ
جگنو بھی ان کے واسطے قندیل ہو گیا

کنکر ملامتوں کے گراتا ہے مثلِ سنگ
مجھ میں کوئی پرند ابابیل ہو گیا

وقت طلوع آیا گہن آفتاب پر
دن چڑھ رہا تھا رات میں تبدیل ہو گیا

تھا جس غنی کے پاس خزینہ علم و فن
وہ عہدِ نو کے ہاتھ میں زنبیل ہو گیا

اپنے گھروں کے کردیئے آنگن لہو لہو
ہر شخص میرے شہر کا قابیل ہو گیا

لوحِ جبیں پہ وقت نے وہ حرف لکھ دیئے
چہرہ غمِ حیات کی تفصیل ہو گیا

صد شکر سوز میرے خیالات کے لئے
میرا قلم وسیلۂ ترسیل ہو گیا

● مکان نمبر 271، سیکٹر A-7، فرید آباد-١٢١٠٠٦ (ہریانہ)

عاصم شہنواز شبلی

کون کہتا ہے کہ ہوں آج میں تنہا گھر میں
کیا نہیں ساتھ مرے درد کا سایہ گھر میں
ڈگریاں پھاڑ دیں میں نے تو خفا ہیں وہ بھی
آس کب تک بھلا کس کس کو دلاتا گھر میں
تتلیاں خوابوں کی آنکھوں کو میسر تھیں کبھی
اب درندے ہی بسا کرتے ہیں سپنا گھر میں
کاٹ سے لہجے کی الفاظ کی یورش سے بچوں
ڈھونڈنا پڑتا ہے ایسا بھی علاقہ گھر میں
بے دلی، تیرہ شبی، نالہ کشی، دل سوزی
ہے یہی کچھ در و دیوار پہ لکھا گھر میں
وقتِ رخصت وہ بھری آنکھ سے کہتا ہی رہا
ایک دن لوٹ کے آئے گا پرندہ گھر میں
دھڑکنیں تیز ہوئیں دل کی جو پتہ کھڑکا
اب کہاں جینے کی مانند ہے جینا گھر میں
آسماں ہو کہ زمیں، مشرق و مغرب سب کچھ
اب سمٹ آئی ہے پھیلی ہوئی دنیا گھر میں
گھر سے باہر تھا تو کچھ اور تھا عاصم لیکن
اس کو بدلا ہوا کچھ اور ہی پایا گھر میں

● 89/5، ربن اسٹریٹ، (شبلی ہاؤس) کلکتہ-٧٠٠٠١٦

ہم عصر اردو ادب نمبر

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

[جلد اوّل]

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ——— **جگن ناتھ آزاد**

اس خاص نمبر کی تحسین آمیز گونج علمی و ادبی دنیا میں تادیر سنائی دیتی رہے گی ——— **مظہر حسین صدیقی**

شاعر کا یہ نمبر واقعی ایک تحقیقی کارنامہ ہے ——— **نثار احمد فاروقی**

آپ کے اہتمام اور جاں فشانی کی بہ ہر طور داد دیتا ہوں ——— **رشید حسن خاں**

اس نمبر کی حوالہ جاتی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا ——— **اسلوب احمد انصاری**

یہ کام کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا ——— **سید محمد عقیل**

مندرجات پر نظر پڑی، دنگ رہ گیا ——— **گوپی چند نارنگ**

آپ نے یہ نمبر بڑی ذہانت اور روشن سے ترتیب دیا ہے ——— **جوگندر پال**

اردو ادبی صحافت کی تاریخ میں اس کی حیثیت مستقل اہمیت کی حامل ہوگی ——— **مظہر امام**

آپ نے واقعی بڑی محنت کی ہے ——— **شمیم حنفی**

پرچہ دیکھ کر میرا جی چاہا کہ اس نمبر کو تو خریدنا ہی چاہیے ——— **زبیر رضوی**

واقعی یہ نمبر یادگار رہے گا ——— **منیر الدین احمد**

واقعی! واقعی! آپ نے تاریخ مرتب کی ہے ——— **مقصود الہی شیخ**

فہرست دیکھنے ہی میں آدھا گھنٹہ لگ گیا ——— **محبوب الرحمن فاروقی**

اسے دیکھنے کے بعد میرے دل و دماغ میں ایک دھماکہ سا محسوس ہوا ہے ——— **یعقوب مرزا**

اس نمبر نے شاعر کے پچھلے تمام نمبروں کا ریکارڈ توڑ دیا ——— **اویس احمد دوراں**

میری دانست میں یہ اردو ادب کا 'شاہنامہ' کی حیثیت رکھتا ہے ——— **سلطان سبحانی**

ادبی پرچوں کے خاص نمبر تو نکلتے ہی رہتے ہیں یہ مگر مختلف ہے ——— **پیرزادہ قاسم**

الحمد اللہ ! شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر [جلد اوّل] شائع ہوگیا ہے ۔ کئی ہزار جلدوں کی نکاسی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے ۔ عالمی سطح پر بہت سارے رفیقانِ شاعر اور سخن فہم شاعر نوازوں تک خاص نمبر پہنچ گیا ہے مگر اب بھی بے شمار ادب دوست باقی ہیں ۔ جلد بہ دیر انہیں بھی خاص نمبر مل ہی جائے گا ۔ اس ضمن میں ہم سے رابطہ قائم کیجئے۔

خاص نمبر کی وصولیابی کے خط ، فون کال اور مبارکبادی کے تار مل رہے ہیں ۔ ہم ان سب خواتین و حضرات کے شکر گزار ہیں اور اب ان کی گرانقدر رائے کے بھی منتظر ہیں۔ ابھی تو خاص نمبر زیر مطالعہ ہی ہوگا۔

جو خطوط و تار موصول ہورہے ہیں ان میں سے چند ایک کے اقتباسات ذیل میں دیئے جارہے ہیں ۔ واضح رہے کہ یہ بہت ابتدائی ، فوری اور سرسری تاثرات ہیں ۔ ہر نوع کی تنقید کا ہم خیرمقدم کریں گے ، تاہم گزارش ہے کہ کسی بھی طرح کی تنقیدی رائے قائم کرنے سے قبل 'ہم عصر اردو ادب نمبر' کو پوری طرح ملاحظہ کیجئے ۔ اس کی روح کو محسوس کیجئے ۔ اس کے تخلیقی روپ سروپ کو اپنے آپ میں جذب کرنے کی سعی کیجئے اس کے بعد ہی کوئی نیا علمی و ادبی مکالمہ قائم کیجئے گا ۔ کیوں کہ ہم نے ۱۹۸۰ء سے جس نئے ادبی Discourse کی ابتدا کی تھی ، یہ خاص نمبر اس کا بہت واضح اظہار ہے اور اگلی دونوں جلدیں اس کا نقطۂ عروج ہوں گی ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد کی ادبی صورت گری اور طے شدہ لفظ و معنی سے اختلاف و انحراف کے ساتھ اپنی علمی و ادبی روایت کی بازیافت کی ایک صاف ستھری او غیرجانبدارانہ کاوش بھی ہے کیوں کہ روایت کا بھی ایک طے شدہ متن ہمارے سامنے آرہا ہے اور ادبی تاریخ لکھی جارہی ہے ۔ شعر و ادب کی

ساتھ ہماری وابستگی ہمیشہ ہی غیر مشروط رہی ہے لہذا خاص نمبر کو بھی کھلے ذہن کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ذہن میں رکھیئے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل بہ لحاظ حروفِ تہجی 'الف تا سین' ہے اور یہ تہذیب صرف تخلیق کاروں کی حد تک ہے ۔ خاص نمبر کے ہر باب کے ادارتی شذرات کو بغور ملاحظہ کیجئے اس کے بعد ہی ہمارے تسامحات ، اغلاط خامیوں اور کمیوں کی نشاندہی کیجئے گا۔ آپ کے مفید اور صائب مشوروں کی روشنی میں خاص نمبر کی اگلی دونوں جلدوں کو سنوارا ، سجایا جائے گا۔

رسالہ شاعر کو اپنی "داد و تحسین" سے آگے لے جایئے۔

شاعر اور خاص نمبر سے متعلق آپ سے ہمارا مکالمہ جاری رہے گا۔ (ادارہ)

جگن ناتھ آزاد

ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کا ہم عصر اردو ادب نمبر دیکھ کر

'شاعر' کہ ماہنامہ عالی مقام ہے
اہل نظر نے جس کو ہمیشہ کیا پسند
نکلا ہے اس کا خاص شمارہ کچھ اس طرح
اردو ادب کا نام ہوا اور بھی بلند
اے افتخار ! اس کے سوا اور کیا کہوں
"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

(۸/ فروری ۱۹۹۹ء)

● A-25، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر جموں 180004

مظہر حسین صدیقی ابن سیماب

شاعر کے ضخیم خاص نمبر کی ورق گردانی کرتے ہوئے تمہارے لئے دل سے بے اختیار دعائیں نکل گئیں۔ کتنی محنت، کتنی جانفشانی اور کس قدر دیدہ ریزی کرنا پڑی ہوگی تم دونوں بھائیوں کو۔ حقیقتاً شاعر کے پچھلے تمام یادگار بلکہ تاریخی نمبروں پر زیر نظر نمبر سبقت لے گیا۔ شاعر کی ۶۹ سالہ زندگی میں 'ہم عصر اردو ادب نمبر' ہر لحاظ سے باعثِ تحسین ہے۔ اس خاص نمبر کی تحسین آمیز گونج علمی و ادبی دنیا میں تادیر سنائی دیتی رہے گی۔ یہ نمبر تمہاری ذہانت، مہارت، محنت، بہترین تربیت اور وسیع تر تعلقات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کی ترتیب میں تمہاری جدت پسند طبیعت کا بھرپور عکس نظر آیا۔ رب العزت تمہاری اس برسوں کی کاوش کو کاروباری اعتبار سے بھی منفعت بخش بنائے۔ امید تو یہی ہے کہ شاعر کا یہ نمبر قبولیت کا ایک یادگار ریکارڈ ثابت ہوگا۔

اردو ادب نمبر کی اشاعت پر یقیناً آپا جی اور اعجاز بھائی کی ارواح خوش ہوئی ہوں گی۔ رب کریم تمہیں ایسے بے شمار مواقع عطا فرمائے۔ یہ سب کچھ تمہاری امی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔

● R-126, Sector 11-C-3, North Karachi, Karachi (Pak)

نثار احمد فاروقی

شاعر کا خاص نمبر ملا، جس کی طرف مدت سے آنکھیں لگ رہی تھیں۔ "دیر آید درست آید" کا صحیح مصداق ہے۔ عموماً ضخیم نمبروں کو دیکھ کر کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ مدیر نے لکھنے والوں اور کاتبوں کے درمیان صرف پوسٹ مین کا کام کیا ہے۔ لیکن شاعر کا یہ نمبر واقعی ایک تحقیقی کارنامہ ہے، بلکہ اسے آپ نے اپنی نظم و غزل کی طرح ایک "تخلیق" بنادیا ہے۔ اس سے شاعر کی اہمیت اور انفرادیت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ سرسری طور پر دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے اس پر کتنی محنت کی ہوگی۔

آپ کی صحت و سلامتی اور طویل کار آمد زندگی کے لیے دل سے دعائیں۔

● پوسٹ بکس نمبر 9723، نئی دہلی-110025

رشید حسن خاں

خاص نمبر بہ حفاظت مل گیا تھا۔ میز پر رکھا ہوا ہے، اسے پڑھ لوں تب رائے لکھ سکوں گا۔ اس کی ضخامت اصل وجہ تاخیر کی۔ بغیر پڑھے کچھ لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بس ذرا سی فرصت و فراغت کا متلاشی ہوں آپ کے اہتمام اور جاں فشانی کی بہ طور داد دیتا ہوں۔

● 167, Baroozai-II, Shajahanpur-242001 (U.P)

اسلوب احمد انصاری

اس ضخیم نمبر کی اشاعت پر مبارکباد قبول کریں۔ اس کی غیر معمولی ضخامت اور اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تیاری میں آپ نے کتنی محنت اور توجہ کی ہے۔ اس نمبر کی حوالہ جاتی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آپ نے بڑی تفصیل اور جانکاری کے ساتھ ہم عصر ادیبوں کی نگارشات پر مشتمل یہ نمبر تیار کیا ہے۔ اور خود آپ کے نوٹس بھی خاصے کی چیز ہیں۔

● گلفشاں، سول لائنز، دودھ پور، علی گڑھ

سید محمد عقیل

حضرت سلامت۔ شاعر کا جہازی نمبر ملا۔ شکریہ۔ حضرت! آپ انسان نہیں، یقیناً جنات ہیں۔ یہ کام کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں واقعی سخت متحیر ہوں کہ آپ نے کہاں کہاں سے اور کس طرح اتنا مسالہ اس ضخیم نمبر کے لئے فراہم کیا ہوگا جس میں نہ صرف قیمتی آراء تنقیدی اشارے، خطوط، سوانحات اور جانے کیا کیا درج کر ڈالا اور پھر تخلیقی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ جب آپ کے اعلانات اس نمبر کے لئے دیکھتا تھا اور عام شاعر نمبر کی لاغری بھی تو یہی سمجھتا تھا کہ بھلا اتنا Ambitious کام کیا ہو سکے گا۔ بس اب شاعر کا بھی شاید 'چل کوچ' ہے مگر جب نمبر ملا تو اقبال کا مصرعہ بے اختیار زبان پر آیا

؎ "ایں چہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بہ خواب"

ابھی تو رسالہ بس ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوں۔ پھر بھی افسانے تقریباً پڑھ لئے۔ آغا بابر کا 'روزبہ' اظہر لشکر، جیلانی بانو، انیس رفیع، جوگندر پال، رتن سنگھ، ساجد رشید، سعید انجم اور رضاء الجبار کے افسانے اچھے لگے۔ بقیہ ابھی پڑھ رہا ہوں، پھر اپنی رائے لکھوں گا۔ اردو افسانوں کے محاکے کا جو خاکہ آپ نے بنایا ہے، جس کا نمونہ یہ تین جلد ہے اگر تکمیل تک پہنچ گیا تو اردو افسانے کی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ ہوگا۔ خدا کرے کہ آپ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔

● محمود منزل، دریا آباد، الہ آباد (یو پی)

گوپی چند نارنگ

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) ابھی ابھی موصول ہوا۔ مندرجات پر نظر پڑی ہو تو دنگ رہ گیا۔ آپ نے کیا ہفت خواں طے کیا ہوگا۔ اس کے تو پورا طرح پڑھنے اور جذب ہونے کو بھی مدت چاہیے۔ جواب نہیں۔ آپ نے کس قدر محنت و سعی کی ہوگی، مرحبا،

سال ایسے بھاری بھر کم نمبر کے ساتھ شروع ہوا، مبارکباد! حالیہ شماروں کے مباحث بھی دیکھ رہا ہوں۔ ۷۰ ویں سالگرہ مبارک ہو۔ کیونکہ رسالہ مدیر سے الگ نہیں ہو تا ہر چند کہ اس میں آپ کے والد محترم اور دادا کی عمریں بھی لگی ہیں۔

● D-252، سرودیہ انکلیو، نئی دہلی-110017

جوگندر پال

آپ نے یہ نمبر بڑی ذہانت اور ویژن سے ترتیب دیا ہے۔ اس نوعیت کی غیر معمولی اشاعتوں کی بدولت نہ صرف عصری ادب سے بڑے قریب سے روشناس ہو پانے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے بلکہ نئے تقاضوں کی روشنی میں ماضی کے ادب کی Re-evaluation کی گنجائشوں میں وسعت بھی واقع ہونے لگتی ہے، جس سے ادبی روایتوں کے بعض ازکار رفتہ عناصر کی مناسب کاٹ چھانٹ کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور یوں ادب کی عصری تحلیت پر حرف نہیں آتا۔ میں آپ کا یہ ضخیم نمبر بڑے مزے سے "گھونٹ گھونٹ" پڑھ رہا ہوں۔ اپنے اس نہایت اہم کام پر میری مبارکباد قبول کیجئے۔

● 204، مندا کنی، نئی دہلی-19

مظہر امام

'ہم عصر اردو ادب نمبر' کی پہلی جلد بہت تاخیر سے آئی، جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، لیکن آپ کے خوبصورت اداریے "ایک ناممکن تخلیقی خواب کی داستان" سے تفصیلات کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ ہوئی تاخیر تو کچھ (ہی نہیں، بہت کچھ) باعث تاخیر بھی تھا ان حالات میں اتنا ضخیم، اتنا شاندار، اتنا جامع خاص نمبر شائع کرنا غیر معمولی ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔ اردو ادبی صحافت کی تاریخ میں اس کی حیثیت مستقل اہمیت کی حامل ہو گی۔ اتنے بڑے نمبر کے مشملات پر رائے دینا چند الفاظ میں ممکن نہیں۔ بہت کچھ پڑھ گیا ہوں، مگر پورا نمبر پڑھنے کے لیے مزید وقت درکار ہے۔ اگرہ اسکول کا جواب نہیں۔ آپ کی تخلیقی نظر اور کاوش پورے رسالے سے نمایاں ہے۔ آپ کی اس جہت کا علم نہ تھا۔

آپ کو خود اندازہ ہے کہ اتنے بڑے پروجیکٹ میں کچھ نہ کچھ غلطیاں در آیا ہی جاتی ہیں۔ یہ ناگزیر ہے۔ ہر چند زیر نظر جلد اول الف تا سین کے تحت ہے، لیکن بعض مباحث سے متعلق تنقیدی مضامین میں ش، ع، م وغیرہ سے شروع ہونے والے نام بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر د تخلصوں اور رتبوں پر بھی پڑا ہے۔ کارٹونوں کے سلسلے میں تو خیر اس کا لحاظ رکھا ہی نہیں گیا۔

یہ شمارہ مئی تا دسمبر ۹۷ء کا ہے اور اس کے نیچے ۹۷۔۹۸ء بھی درج ہے۔ ایک محقق آج سے کئی سال بعد اسے کب کا شمارہ قرار دے گا؟ اس کی اشاعت ۹۸ء کے اواخر میں ہوئی ہے۔

●176-B, Pocket, I Mayur Vihar,
Phase I, Delhi - 110091

شمیم حنفی

شاعر کے ضخیم نمبر کی پہلی جلد ملی، شکر گزار ہوں۔ آپ نے واقعی بڑی محنت کی ہے۔ ورق گردانی کرلوں تو اس کے بارے میں لکھوں۔ انشاء اللہ 'جامعہ' میں تبصرہ شائع ہو جائے گا۔

● B/114، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

زبیر رضوی

اس خاص نمبر میں پڑھنے اور محفوظ کرنے لائق کافی کچھ ہے، آپ نے اس بار اس نمبر پر اپنی سوچ اور تحریر کی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ سلیقے اور محنت کے ساتھ گوشے بنائے ہیں اور مباحث کے در کھولے ہیں، سارے پرچے پر رائے دینے میں دیر لگے گی فی الحال یہ "برجستہ داد" کی صورت میں خط لکھ رہا ہوں۔ پرچہ دیکھ کر میرا جی چاہا کہ اس نمبر کو تو خریدنا ہی چاہیے۔ چیک قبول فرمائیں۔ پھر ایک بار اس حوصلہ مندی کے لیے مبارکباد۔

● پوسٹ بکس نمبر 9789، نئی دہلی - 110025

منیرالدین احمد

شاعر کا 'ہم عصر اردو ادب نمبر' ملے بہت دن ہو گئے ہیں اور میں وقت نکال کر ہر روز اس کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھتا ہوں۔ ابھی مجھے بہت دن اس کے مطالعے کے لئے درکار ہوں گے۔ تاہم ابھی سے میرا تاثر سن لیں۔ یوں تو میں آپ کی مدیرانہ صلاحیت کا پہلے سے قائل تھا، اب اس پر ایمان لا چکا ہوں۔ جس طرح آپ نے اس نمبر کے ایک ایک حصے پر نظر رکھی ہے اور اس کو سنوارا ہے، وہ لائق صد تحسین ہے۔ واقعی یہ نمبر یادگار رہے گا۔ مفصل رائے کا اظہار تو خیر میں رسالہ پڑھنے کے بعد کروں گا۔ مگر ابھی سے میری طرف سے مبارکباد قبول کریں اور اپنے ساتھیوں تک پہنچادیں۔ آپ نے اس نمبر کی تیاری پر جو برس لگائے ہیں، وہ یقیناً بہت کار آمد ثابت ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ دوسری اور تیسری جلدیں بھی اسی معیار کو قائم رکھ سکیں گی۔

●Am Sportlatz 13, 25495
Kummerfeld, Germany

مقصود الٰہی شیخ - فریدہ شیخ

آج دوپہر کی ڈاک سے ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر کا پہلا ایڈیشن اور نومبر کا شاعر اور اس میں آپ کا خط ملا۔ میں حجم دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ "راوی" کے عید نمبر کی آخری کاپیوں میں جتا ہوا تھا۔ اس لئے تار یا فون کے ذریعے مبارکباد پیش کرنے سے قاصر رہا آجکل تار کا رواج ہی نہیں رہا۔ یہاں فون لے کر (غالباً) وہاں فون پر لکھوا دیا جاتا ہے اور خط بذریعہ پوسٹ دوسرے دن ڈلیور ہوتا ہے۔ اس لئے چپ رہا۔ کام ختم کیا۔ روزہ افطار کیا اور اب ورق ورق دیکھ رہا ہوں۔ مطالعہ کے لئے تو ہفتوں، مہینوں کا وقت درکار ہو گا مگر آپ نے جس عرق ریزی سے یہ کام انجام دیا ہے وہ ایک کارنامہ ہے۔

میری اور فریدہ کی طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ کی کاوشوں کی یہ پہلی جھلک ہے۔ مثبت اثر تو یہ ہوا کہ خوشگوار حیرت میں ڈوب ڈوب گیا اور دوسرا اثر (اسے بھی منفی نہ کہوں گا) یہ ہوا کہ فریدہ سے کہا یہ ہم کیا بھاڑ جھونک رہے ہیں کام تو یہ ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے اور کیسے لوگ کرپاتے ہیں۔ جناب افتخار امام صدیقی ایسے۔ مبارک صد مبارک صد ہزار مبارک۔ سخت تھکا ہوا ہوں۔ لکھنے میں جی نہیں بلکہ قلم لڑھکتا ہے۔ لیکن جی میں آپ کے لئے دعائیں اور داد ہے۔ واقعی، واقعی آپ نے تاریخ مرتب کی ہے۔ آپ نے اردو کی صحیح مثبت اور مستقل پائدار خدمت کی ہے۔ یہ یادگار نمبر ہے۔

●Ravi House Unit E I, Legrams
Lane Bradford, BD7 INH (U.K)

(محترم مقصود الٰہی شیخ صاحب نے ہفت روزہ 'راوی' (لندن) میں گزشتہ دو تین سالوں کے دوران گلہے گ بے شاعر اور اس کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں نہ صرف اپنے اداریوں میں لکھتے رہے ہیں بلکہ خاص نمبر کے اعلانات

ور اس کی تفصیلات سے اردو کی نئی بستیوں ے شاعر نوازوں ، قلم کاروں اور سخن فہم ارئین کو مطلع کرتے رہے ہیں . ہم عصر ردوادب نمبر کے لئے ایک ادبی ایوارڈ کا بھی علان کیا تھا اور اب 'راوی' کی ایک حالیہ اشاعت ورخہ ۲۳/جنوری ۱۹۹۹ء کا ایک پورا جہازی سائز صفحہ رسالہ شاعر اور خاص نمبر کے لئے قف کیا گیا تھا۔ ہم ۲۶ سالہ 'راوی' اور اس کے جاہد اردو مدیر مقصود الٰہی شیخ اور مدیرہ ریدہ شیخ کے شکر گزار اور ممنون ہی نہیں بلکہ احسان مند بھی ہیں . ادارہ)

محبوب الرحمن فاروقی

فضیلتوں سے بھرپور اس ماہ مبارک میں جناب کا مسرتوں سے بھرپور تحفہ ملا۔ اب اسے کیا کہوں اس متبرک مہینہ کا انعام و اکرام یا انوار رحمت بہر حال ماہ تو ہے ہی متبرک، رسالہ بھی بہت خوب، اس قدر جامع بھرپور خوبصورت، دیدہ زیب اور ضخیم اتنا کہ چھ ماہ پڑھنے میں لگیں ۔ فہرست دیکھنے میں ہی آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ کیا ترتیب ہے، کیا تہذیب ہے۔ کیا کیا عنوانات ہیں۔ ابھی اسے صرف رسید سمجھئے۔

● آج کل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ، پٹیالہ ہاؤس ، نئی دہلی۔110001

محمد یعقوب مرزا

تعجب کی بات یہ ہے کہ "ہم عصر اردو ادب نمبر" بھی آخر کار وصول ہو گیا ہے۔ گزشتہ تین برس سے جس بات پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ آج اچانک بحال ہو گیا ہے۔ آپ کی اس بے مثال مستقل مزاجی کے بغیر اس ضخیم ادبی نمبر کی اشاعت ممکن بھی نہیں تھی۔ ناممکن اگرچہ مشکل ہوتا ہے لیکن آپ جیسے لوگ بھی تو جیتے ہیں جہاں میں ۔ میرے دل کی تنہائیوں سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

"عصری ادب نمبر" کا مطالعہ باقی ہے ابھی لیکن اسے دیکھنے کے بعد میرے دل و دماغ میں ایک دھاکہ سا محسوس ہوا ہے۔ مبارکباد باقی پھر کبھی۔

●19, Harrington Drive. Lenton Sands Nottingham. NG7 IJQ. (U.K)

اویس احمد دوراں

میجر (جمال اویسی) شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر خرید کر لائے، دیکھ کر مارے خوشی کے دل باغ باغ ہو گیا۔ اگر آپ ہوتے تو میں آپ کی اس پیشانی اور ان انگلیوں کو چوم لیتا جن کی وجہ سے اتنا وقیع و عظیم الشان نمبر شائع ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نمبر نے شاعر کے پچھلے تمام ضخیم نمبروں کا ریکارڈ توڑ دیا۔ مبارکباد، ہزاروں ہزار مبارکباد۔ میں نے جو کاپی مانگ بھیجی ہے، وہ آپ وی پی سے ضرور بھجوا دیجئے میں چھڑا لوں گا۔

● محلہ فیض اللہ خان، دربھنگہ (بہار)

سلطان سبحانی

شاعر کا 'ہم عصر اردو ادب نمبر' ابھی ابھی موصول ہوا۔ انتہائی زبردست، اتنا وقیع، اتنا ضخیم و عظیم اور خوبصورت کہ میری دانست میں یہ اردو ادب کے 'شاہنامہ' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نمبر یقیناً عصری اردو ادب کی نئی تاریخ مرتب کرے گا۔ اس بے مثال، اعلیٰ و باکمال کارنامے پر آپ کو بے شمار مبارکباد اور دعائیں۔ یہ خط محض بطور رسید روانہ کر رہا ہوں ۔ تفصیلی خط مطالعے کے بعد جلد ہی لکھوں گا۔ مزید یہ تحریر ہے کہ آپ اپنی کوششوں میں اس حد تک کامیاب ہیں کہ جو بھی اس نمبر کو دیکھے گا، نعرۂ تحسین بلند کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پوری اردو دنیا آپ کے اس کام کی تعریف کرے گی۔

ایک ضروری بات: اس نمبر میں 'مذاکرے' عنوان کے تحت جو سرورق ہے وہ 'صبا اکبر سبحانی' کا ہے جبکہ فہرست میں شگفتہ سبحانی تحریر ہے۔

پیرزادہ قاسم

شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اول دیکھی، ایک جھلک ہی سہی، کمال کیا ہے آپ نے۔ اتنی محنت اور اس سلیقے کے ساتھ اتوقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ افتخار امام صدیقی زندہ باد ! ۔ ادبی پرچوں کے خاص نمبر نکلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کچھ مختلف ہے۔ اور آپ نے کئی جہتوں سے اسے خاص الخاص بنا دیا ہے ۔ دلی مبارکباد۔

●A-13, Staff Town, Karachi University, Karachi (Pak)

مختصر مختصر...

● شاعر کی اس عظیم کاوش پر مبارکباد ، بہت بہت مبارکباد۔ گلزار (ممبئی)

● Unbelievable Exemplery.
(تار) نعیم کوثر (بھوپال)

● اردو شعر و ادب کا یہ عالمی 'نشیمن' جسے آپ نے گاؤں لکھا ہے، اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھل گئی ہیں۔ زندہ باد!۔ یوسف عارفی (بنگلور)

● سچ یہ ہے کہ سیماب صاحب کے بعد آپ نے History بنائی ہے۔ ظفر ہاشمی (جمشید پور)

● آپ نے اپنی مٹھی سی جان پر بہت بڑا بوجھ اٹھا لیا ہے، مبارکباد۔ عشرت قادری (بھوپال)

● یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے جو علامہ سیماب کے دبستان اور قصر الادب کی طرح پیش کش ہے۔
سعید روشن (کویت)

● خاص نمبر میں آپ کی سخت محنت اور Pains کیسے کیسے نظر آ رہے ہیں۔ کاوش عباسی (ریاض)

● شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر واقعی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس محنت پر دلی مبارکباد قبول کیجئے۔
افتخار نسیم (امریکہ)

● ہم عصر اردو ادب نمبر پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ آپ کے جنون کو برقرار رکھے۔
انجم تاج (امریکہ)

● آپ کی محنت و کاوش قابل داد ہے۔ سرسری طور پر اتنا کہہ سکتی ہوں کہ افسانوں کی پیش کش بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔ سیدہ حنا (پاکستان)

● ہم عصر اردو ادب نمبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہو گی۔ فیصل ہاشمی (ناروے)

● خدا کا فضل و کرم ہے کہ آپ کو خوابوں کی تعبیر حاصل ہوئی اور اردو شعر و ادب کا عالمی گاؤں منظر پر آ گیا۔ لوگ عجیب عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے منہ بند ہو جائیں گے۔ ساحر شیوی (انگلینڈ)

● شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر نہایت زبردست ہے۔ اتنا ضخیم اور شاندار کہ بس دیکھتے ہی رہو۔
سعدیہ روشن صدیقی (عرب امارات)

اوم کرشن راحت

نہ منزلوں کی طرف ہیں نہ سوئے جادہ ہیں — قدم جو ہم نے اٹھائے ہیں بے ارادہ ہیں
کچھ اس کی رحمتیں ہم سے ادھار لے لیجے — ہمارے پاس ضرورت سے کچھ زیادہ ہیں
لو آئینہ ہی بتانے سے اب جھجکتا ہے — کچھ ہم نے اوڑھ رکھا ہے کہ بے لبادہ ہیں
انہیں سے سیکھا ہے ہم نے یہ دوستی کا طریق — جو اپنے یار نہ چالاک ہیں نہ سادہ ہیں
ہماری سوچ میں وسعت کہاں سے آئیگی — نہ اپنے ذہن کشادہ نہ دل کشادہ ہیں

4, Melody Street, Toongabbie, NSW-2146, Sydney (Australia)

شمس تبریزی

کوئی موسم ہو ، ہوا اس کا بھی پانا مشکل — پہلے حالات نہ تھے ، اب کے زمانہ مشکل
چپ جو رہتا ہوں تو زخموں کا پتہ ملتا ہے — آہ کرتا ہوں تو پھر ظرف چھپانا مشکل
کیا کہوں اس کو، وہ خوشبو ہے ہوا ہے کیا ہے؟ — دیکھنا بھی جسے مشکل ہے دکھانا مشکل
زندگی ہے گزر جائے گی جو بھی گزرے — اک قصیدہ نیا ہر روز سنانا مشکل
ہم وہ فنکار جو مٹی کی محبت میں لٹے — اپنی تعریف میں تاریخ بتانا مشکل

ہریانہ اردو اکادمی، ۵۱۶ سیکٹر ۱۲، پنچکولہ (ہریانہ)

نذیر آزاد

زباں بریدہ ہیں سب، عرض حال کیسے کریں — کئی جواب ہیں باقی ، سوال کیسے کریں
سمندروں کو ہوا میں اچھال کر دیکھا — جبینِ ارض پہ ان کو بحال کیسے کریں
جو منفرد ہیں وہ اپنی مثال کب دیکھیں — وہ اپنی طرح سبھی بے مثال کیسے کریں
شکست ہو بھی گئی، جسم و جاں بھی سالم ہیں — دلوں کے زخم کا ہم اندمال کیسے کریں
وہ جو بھی عقل و ہنر اور دعا کے پالے ہیں — زوال ان کا مقدر کمال کیسے کریں

Azad Manzil, Koil, Palwama - 192301 (Kashmir)

افتخار شفیع

سب ممکنہ حالات کو امکان میں رکھا — ہر لحہ اسے سوچ میں وجدان میں رکھا
ہجرت کی گھڑی ہم نے ترے خط کے علاوہ — بوسیدہ کتابوں کو بھی سامان میں رکھا
مجھ کو مری قامت کے مطابق بھی جگہ دی؟ — یہ پھول اٹھاکر کبھی گلدان میں رکھا ؟
اک عمر گزاری نئے آہنگ سے لیکن — اجداد کی اقدار کو بھی دھیان میں رکھا
اک روز سیہ رات ہتھیلی پہ سجا کر — صحرا نے قدم خطۂ گنجان میں رکھا

Al-Firdos, Fazelabad, Shar-e-rashid, Multan - Pakistan

ساحر کلیم

اب خود کو دیکھنے کے لیے زاویے تھے اور — چہرے تو سب وہی تھے مگر آئینے تھے اور
یوں تیرگی پہ ہوتی تھی غالب یہ روشنی — بجھتے دیوں کے پیچھے بھی جلتے دیئے تھے اور
منزل جسے سمجھتے تھے راہوں کی دھول تھی — منزل پہ پہنچ کے ابھی مرحلے تھے اور
مردہ پرست لوگوں میں رہ کر میں مر گیا — پھر اس کے بعد میرے لئے مرتبے تھے اور
گلشن بنی تھی آگ میرے واسطے کلیم — دریا کے بیچ میرے لئے راستے تھے اور

انڈیا گیس ورکس، سلوڑ 431112۔ ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹر)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

نقد و نظر کا کالم دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ کئی ناگزیر وجوہ سے شاعر کا یہ تاریخی کالم روک دیا گیا تھا۔ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل میں کئی سوکتابوں پر تبصرے شامل ہونا تھے لیکن صفحات کی کمی کے سبب اب یہ تبصرے جلد دوم میں شامل کئے جائیں گے مگر اب عام شماروں میں بھی تبصرے شائع ہوں گے۔ ہم ان تمام مصنفین سے معذرت خواہ ہیں جنھوں نے اپنی کتابیں تبصرے کے لئے ارسال کیں اور طویل انتظار سے گزرے۔ تبصروں کی موجودہ صورت گری سے ہم مطمئن تو نہیں ہیں اور اس کالم کو نیا تخلیقی روپ دینے کی بابت غور کررہے ہیں۔ آپ کے ذہن میں کوئی نیا خیال، کوئی نئی بات، کوئی مشورہ یا تجویز ہو تو فوراً ہمیں لکھ بھیجئے۔ نقد و نظر کی نئی ترتیب و تہذیب میں آپ کے گرانقدر مشورے ہماری رہنمائی کریں گے۔ تبصرہ نگاری کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ادبی رسائل میں عمومی یا پھر مقالہ نما تبصروں کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ اردو میں نظم و نثر کتابوں کی اشاعت بہت ہوتی ہے۔ اس بھیڑ میں بعض اوقات، اہم اور غیر معمولی کتابیں بھی گم ہوجاتی ہیں۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ تبصرہ نگاری کی اب نئی روایت کیا ہو۔ ؟ [ادارہ]

٭

شہکارِ عروض وبلاغت

انور مینائی

انور مینائی ایک خوش گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں عروض سے بھی ان کو دلچسپی رہی ہے۔ انھوں نے ایک سوال نامہ مرتب کرکے اقبال کے ایک شعر کے آہنگ کے بارے میں عروض نگاروں سے استفسار کیے تھے۔ عروض سے ان کا شغف بڑھتا رہا اور انھوں نے مختلف تصنیفوں، تالیفوں کو چھان پھٹک کر عروض اور بلاغت پر ایک کتاب لکھی۔ شہکار عروض وبلاغت، جو اس وقت پیش نظر ہے۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ایم اے (اردو) کے نصاب کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

کتابیات (حواشی) میں ۲۸ کتابوں کو ماخذ کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ ان میں اہم کتابیں ہیں: معیار الاشعار کا ترجمہ زر کامل عیار، حدائق البلاغت، قواعد العروض، ختمی العروض اور بحر الفصاحت۔ عروض شہر کے کئی جہلائے مطلق کی کتابوں کا بھی ذکر ہے۔ خوشی کی بات ہے اور اطمینان کی بات ہے کہ ان عطائیوں کی نان خطائیاں شہکار عروض وبلاغت کے صفحات پر نہیں ہیں۔ انور مینائی نے رطب ویابس، سب پڑھا۔ جو غلط تھا اسے مسترد کیا اور جو درست تھا اس کو منتخب کیا۔ یہ ان کے علم اور ان کے ذوق کی سلامتی کی دلیل ہے۔

آہنگ اور عروض ان کے سامنے رہی ہے اور انہوں نے نہ صرف کسی جھجک کے بغیر بلکہ تیقن اور ثابت قدمی سے دو نکات پر زور دیا ہے۔ ایک یہ کہ مزاحف پر زحاف نہیں لگانا چاہیے۔ مرکب زحاف میں شامل سارے مفرد زحاف، یکے بعد دیگرے نہیں ایک ساتھ رکن سالم پر لگانا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ فاعلاتن (رمل) میں نئے زحاف قلع سے اگر درمیان کا وتد مجموع (علا) تو اس سے وہ بے قاعدگیاں دور ہو جاتی ہیں جو اب تک چلی آتی رہیں۔

عروض کے طلبہ کو ان نامطابقتوں کی وجہ سے الجھن ہوتی ہے، جو زحافات کے نظام میں پائی جاتی ہیں۔ انور مینائی نے اس پر خاص طور سے توجہ دی ہے اور اس کی وجہ سے ان کی کتاب شہکار عروض وبلاغت زیادہ مفید ہی نہیں زیادہ قابل فہم بھی ہو گئی ہے۔ طلبہ اب اس مضمون سے بھاگیں گے نہیں بلکہ دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ص ۱۳۳ پر انور سے ایک تسامح ہوا ہے اور چونکہ ایک ایسی بات مجھ حقیر سے منسوب ہو گئی ہے جو خلاف واقعہ ہے اس لئے معروضات پیش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ انور جیسے محتاط مصنف سے یہ تسامح ہونا تعجب کی بات ہے۔ لکھتے ہیں:

"کمال احمد صدیقی نے رکن مفعولاتن کا دوبارہ احیاء کیا ہے۔ رکن ترفیل متفاعلاتن ایجاد کیا ہے جس میں الف ساکن کو ساقط کرنے سے متفاعلتن حاصل ہوتا ہے۔" (ملاحظہ ہو آہنگ اور عروض)

انور مینائی تحقیق کے آداب سے واقف ہیں ممکن ہے کتاب کے لیے جو یادداشتیں تیار کیں، ان کے کارڈوں کی ترتیب میں فرق آگیا ہو۔ مفعولاتن کے احیاء کی کوشش کسی اور نے کی تھی۔ میں نے مضمون میں (آہنگ اور عروض میں نہیں) یہ لکھا تھا کہ ایک ہی جز کی تکرار جس رکن میں ہو وہ کسی بحر کا سالم رکن اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اجزا کو گھمانے سے رکن وہی رہتا ہے، جبکہ اصول یہ ہے کہ اجزا گھمانے سے اتنے ہی افاعیل سامنے آئیں جتنے اجزا ہیں۔ شاید مینائی ہشت حرفی افاعیل کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ اور جو یادداشتیں انہوں نے تیار کیں، وہ ادھر ادھر ہو گئیں۔ معیار الاشعار میں خواجہ نصیر الدین محقق طوسی نے مفاعلاتن (ہشت حرفی) کو اصول میں سے بتایا ہے۔ آہنگ اور عروض میں ثمانی افاعیل کے دو دائرے وضع کیے گئے ہیں:

ا۔ دائرہ طوسیہ۔ دو اوتاد (مجموع) اور ایک سبب (خفیف)

۱) بحر جمیل: مفاعلاتن ۲) بحر ظلیل: معف تولفن ۴)

تقطیع: مفاعلن فعلن

۲۔ دائرۂ ابراہیمہ۔ وتد مجموع+سبب خفیف+وتد مفروق

۱) مفاعی لات ۲) بحر کثیر = مس تفع لتن ۳) بحر اہل: مفت علاتن

مزاحف کے جدول بھی بنا دیے گئے ہیں اور آہنگوں کی نشاندہی کر کے مثال میں شعر بھی لکھ دیے گئے ہیں۔

شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں کتابت کی غلطیاں نہ ہوں۔ شہکار عروض و بلاغت میں بھی ہیں۔ کچھ غلطیاں ان کے علاوہ بھی ہیں۔ مثال کے طور پر مفعولات کو ص ۲۸ پر مجموعی ارکان کے تحت رکھا گیا ہے۔ مفعولات میں آخری جزو وتد مفروق ہے، اور یہ مفروقی ارکان میں سے ہے۔ اگلے ایڈیشن میں یہ غلطی درست کی جانا چاہیے۔ ص ۳۳ اور ۳۴ پر ہائے مخلوط اور نون مخلوط کے بارے میں عبارتوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ انور مینائی نے ص ۵۶ پر لکھا ہے: "جس پر پہلے زحاف کا عمل ہو چکا ہے، اس پر دوبارہ عمل زحاف کرنا اصول عروض کی خلاف ورزی ہے۔" یہ ایک سنہرا اور بنیادی اصول عروض کا ہے۔ جس سے معدودے چند ہی عروضی اس عہد میں واقف ہیں۔ ایک رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر نیم حکیم جو خود کو ڈاکٹر لکھتے ہیں خواہ مخواہ عروض میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ انھوں نے تو اعلانیہ کہا ہے کہ مزاحف پر زحاف لگانا عین جائز ہے۔ انور بالغ نظر عروضی ہیں اور انھوں نے واضح طور سے مزاحف پر زحاف نہ لگانے کی بات لکھ کر طلبہ کے لیے عروض کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔

آخر میں ایک چھوٹی سی بات۔ مجھ حقیر کے ۲۲ شعر آہنگوں کی مثالوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ دو کا انتساب میرے نام سے: دو کا دوسروں سے اور ۱۸ قوسین میں نامعلوم شاعر کے۔ مجھے شکایت نہیں۔ یہ سعادت میرے لیے کم نہیں کہ شعر مفید پائے گئے۔ یہاں میں ان کی نشاندہی نہیں کروں گا۔ کتاب عروض و بلاغت کے موضوع پر ہے اور اہمیت آہنگوں کی ہے۔

———— **(کمال احمد صدیقی)**

ضخامت: ۱۶۰ صفحات ○ قیمت: چالیس روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۵ء ○ پتہ: انور مینائی۔ الامین ایجوکیشنل کامپلکس، درگاہ محلہ، کولار۔ 563101 (کرناٹک)

ٹیلی وژن نشریات

(تاریخ، تحریر، تکنیک)

انجم عثمانی

انجم عثمانی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیلی وژن سے بھی منسلک ہیں۔ اس فن میں وہ فلم اینڈ ٹی وی انسٹی ٹیوٹ، پونے کے تربیت یافتہ ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کا خیال بھی انہیں وہیں آیا جب انہوں نے دیکھا کہ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں ٹی وی سے متعلق اردو میں کوئی کتاب نہیں ہے۔ چنانچہ اس فن سے متعلق اپنا سارا علم اور تجربہ انہوں نے اس کتاب میں کئی سال کی محنت کے بعد پیش کر دیا ہے۔ ہندوستان میں ٹیلی وژن کی آمد، ترقی اور توسیع کی تاریخ اور اعداد و شمار دیے ہیں۔ ٹی وی میں خاص طور پر اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں عام طور پر اردو کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے، خواہ اسے اردو کا نام نہ دیا جاتا ہو۔ ٹی وی کے لئے الگ الگ اصناف مثلاً دستاویزی فلم، ٹی وی ڈراما، ٹیلی فلم، ٹی وی سیریلز، شارٹ فلم اور ٹی وی اشتہارات وغیرہ کے لئے اسکرپٹ لکھنے کے اصول بتائے ہیں۔ تکنیک کے عنوان کے تحت انتظامیہ، پروگرام پلاننگ، فلور مینجمنٹ، اور مختلف طرح کے پروگراموں کی نشریات کے طریقے سمجھائے ہیں۔ آخر میں ٹی وی سے متعلق تمام اصطلاحات کی تشریح کر دی ہے۔

ادھر ادھر کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں: "....کونسا ایسا مقبول سیریئل ہے جس میں اردو کے مکالموں (ادب) کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔" اصولی طور پر فلموں یا ٹی وی سیریملز کے لئے لکھے گئے مکالموں کا ادب میں شمار نہیں ہوتا۔ فلموں اور ٹی وی سیریملز کے لئے لکھے گئے منظرنامے اور مکالمے ادب سے الگ صنف سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق صرف زبان سے ہوتا ہے۔ ادب سے بس اتنا ہی رشتہ ہوتا ہے کہ کوئی فلم یا ٹی وی ڈراما یا سیریئل کسی ادبی ناول، افسانے یا ڈرامے پر مبنی ہو سکتا ہے۔

صفحہ ۱۵۹ پر لکھا ہے: "کٹنگ کاپی، فلم کا وہ پرنٹ جس پر ایڈیٹر کام کرے۔ یہ عموماً رش پرنٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ جب یہ تیار ہو جاتا ہے تو اس سے نگیٹیو بنائے جاتے ہیں۔" بجائے اس کے یہ لکھا جانا چاہیے تھا کہ جب یہ تیار ہو جاتا ہے تو بعینہٖ اس کے مطابق نگیٹیو کاٹے اور جوڑے جاتے ہیں جن سے فائنل پازیٹیو پرنٹ تیار کیا جاتا ہے۔ پازیٹیو سے نگیٹیو بنانے کا جو طریقہ ہے اسے ڈیوپ (Dupe) کرنا کہتے ہیں۔ بہر حال اس فلمی اصطلاح کا ٹی وی سے تعلق نہیں اس لئے ویڈیو کی اصطلاحات میں اس کا شمار نہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسی کئی اور اصطلاحیں درج ہو گئی ہیں جن کا ٹی وی سے تعلق نہیں مثلاً فلم اسپیڈ، فلم اسٹاک، لیڈر، موشن پکچر (جس کے معنی "سینمائی فلم" دیے ہیں۔ جبکہ وہ "متحرک فلم" ہونا چاہیے۔) ٹی وی سے متعلق چند اصطلاحات سہواً رہ گئی ہیں جیسے Live recording anchorman Library shot- وغیرہ۔ Diaphram کے ہجے اور تلفظ دونوں غلط دیے گئے ہیں۔ ایک تربیت یافتہ مولف ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ کاتب صاحب کی اصلاح لگتی ہے۔ ایک اصطلاح Dissolve کی تشریحات میں لکھا ہے کہ پردے پر بیک وقت کئی چیزیں دکھانی ہوں تو بھی اس ڈزالو کی تکنیک کا استعمال کام میں آتا ہے۔ یہ بات گنجلک ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ تاثر فلم میں لیبورٹری کے آپٹیکل پروسس سے اور ویڈیو میں خاص طور پر اس کے لئے بنائے گئے کمپیوٹر کی مدد سے کیا جاتا ہے۔

اردو میں ٹیکنیکل موضوعات پر کتابوں کی افسوسناک کمی ہے۔ ایسے میں انجم عثمانی نے ٹیلی وژن کے بارے میں یہ کتاب لکھ کر ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ پوری کتاب نہایت ہی سلیس انداز میں لکھی گئی ہے اور ہر بات کی اس طرح صراحت کر دی ہے کہ وہ ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ٹیلی وژن سے تعلق رکھنے والے اردو داں حضرات کے لئے بھی یہ کتاب کارآمد ہے اور جو اردو داں اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پڑھنا چاہیں ان کے لئے بھی۔

کتابت اور بہتر ہو سکتی تھی۔ مجموعی طور پر گٹ اپ اچھا ہے۔ قیمت مناسب ہے۔

———— **(محافظ حیدر)**

ضخامت: ۱۸۸ صفحات ○ قیمت: ۹۰ روپے ○ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۴ء ○ پتہ: انجم عثمانی، 557، لکشمی بائی نگر۔ نئی دہلی - 110023

بکتو بات

مظہر الزماں خاں

آپ نے شاعر میں "بات جب نکلی ہے" (ادبی فیچر نومبر ۹۸ء) کا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے لیکن بھائی ان دنوں جھوٹوں اور چاپلوسوں کا بازار بہت گرم ہے بس انھیں لوگوں کی دکانیں چل رہی ہیں اور معصوم نا سمجھ گاہک یعنی قارئین سارے ناقص مال انہی کی دکان سے خرید رہے ہیں۔ اگر کوئی ادیب اونچے عہدے پر ہے اور اس سے پرچہ کو کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ اس کے تعلق سے تمام عمدہ لکھنے والے تخلیق کاروں کی بہترین تخلیقات کو پیچھے دھکیل دیتے ہیں اور اگر کوئی نامعقول لکھنے والا کوئی اردو کا رسالہ نکالتا ہے تو عمدہ لکھنے والے بھی اس نامعقول مدیر کے نامعقول پرچے میں چھپنے کے لیے کاسہ بدست دوڑنے لگتے ہیں اور اس کند ذہن مدیر کی خوشامد میں زمین آسمان کو ملا دیتے ہیں اور اس کی گھٹیا سے گھٹیا چیز بھی چھاپ دیتے ہیں اس سے ہٹ کر کسی ادیب کی دوستی کسی ناقد سے ہے تو وہ اس کے ادبی کارناموں کے گن گانے لگتا ہے اور اگر مخالفت ہے تو وہ اس کے ادبی کارناموں کے ساتھ اس کے گھر کے سامان کو بھی بازار بنا دیتا ہے۔ اور یہ تک نہیں سوچتا کہ آنے والا دور اس کا کیا حشر کرے گا ذوق جیسے شاعر کے ساتھ مرنے کے بعد کیا ہوا۔ جبکہ ذوق کے آگے تو آجکل بہت سے دودھ پیتے ہیں، اس سے ہٹ کر ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کی ہوا بھی زوردار چل رہی ہے ہر علاقے کا لکھنے والا اپنے علاقے کے کمزور سے کمزور ادیب کو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا دیتا ہے۔ کیا ایسے لوگ اپنے فن کے ساتھ یا کسی بھی چیز کے ساتھ ایماندار ہو سکتے ہیں اور کیا آنے والے دور میں یہ زندہ رہ سکتے ہیں؟ افتخار امام صاحب آپ نے بہت سچی اور اچھی آواز اٹھائی ہے اور سبھوں کے سامنے آئینہ رکھ دیا ہے۔ اب دیکھیں کہ وہ اس آئینے میں اپنی شکلیں دیکھ کر خود کو پہچانتے ہیں کہ نہیں کیونکہ آپ نے جو آئینہ رکھا ہے اس میں سب کے سب اپنے اپنے چہرے دیکھیں گے پتہ نہیں کتنوں کے چہرے مسخ شدہ دکھائی دیں گے اور کتنوں کے شفاف نظر آئیں گے۔ افتخار امام صاحب یہ دور بلاخیز ہے اس میں تقریباً سبھوں کے اندر کے چراغ بجھ چکے ہیں۔ حباب پر کائی جم چکی ہے البتہ دھوبیوں کی بھٹی میں ابلے ہوئے لباس ہی سبھوں کے جسموں پر چڑھے ہوئے ہیں اور وہ سب کے سب انھیں لباسوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ کمزوریوں سے تو کوئی بھی مبرا نہیں ہے لیکن ایسی کمزوریاں جو جان بوجھ کر اپنے ضمیر پر خاک ڈال کر کی جائیں وہ قابل جرم ہیں اور اس جرم کی سزا وقت ضرور دیتا ہے کہ

وقت تو سب سے بڑا منصف ہے

اتنا ہی کیوں آپ صرف شاعر میں یہ اعلان کر دیجئے کہ ہم شاعر کا ایک ایسا شمارہ شائع کر رہے ہیں جس میں ہر ادیب اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کھل کر کرے اور آج کے ان ناقدین کے تعلق سے یا شعراء، افسانہ نگار کے متعلق اپنے اپنے دل کی بات کریں تو آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی اپنے ضمیر کی آواز پر قلم نہیں اٹھائے گا (صرف چند ایک کو چھوڑ کر) سب کے سب اپنے اپنے پیاروں کے لباس دھوتا دکھائی دے گا بلکہ اس کے لباسوں سے نکلے ہوئے میل کو جوس کی طرح استعمال کرتا دکھائی دے گا۔ کیا ایسے لکھنے والے، ایسے فنکار وقت سے آنکھ ملا سکتے ہیں؟ اگر کل کوئی بال ٹھاکرے یہ اعلان کر دے کہ وہ اردو کے ہر اچھے لکھنے والے کو جو اپنے ہم عصروں کے خلاف کھل کر لکھے گا میں اسے نہ صرف بال ٹھاکرے انعام دوں گا بلکہ وہ میرا مہمان بھی رہے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر لکھنے والا گھٹیا اور اچھا دونوں ایک دوسرے پر ایسے ایسے رکیک حملے کرے گا اور بال ٹھاکرے کی خوشامد میں اپنی آنکھیں رکھ دے گا کہ شیطان بھی اپنی انگلی دانتوں میں دبا لے گا۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں۔ لیکن آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے یہ آواز تو اٹھائی۔ ہو سکتا ہے کہ اس آواز سے کچھ ادیبوں کا ضمیر بیدار ہو جائے۔ امکان تو کم ہے پھر بھی دیکھیں کیا ہوتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ اچھا پھر۔

● 256, SPL, S.I.B, Kachiguda,
Hyderabad, (A.P)

عاصم صدیقی

بات جب نکلی ہے (ادبی فیچر) میں کاوش بدری کے چند جملے متاثر کرتے ہیں اور بعض مرتبہ ایک جملہ بھی پورے ادبی پرچے پر بھاری ہوتا ہے۔

"جب ناقص شاعر، ناقص ادب پیش کرتا ہے تو ناقص قارئین اس کی مدد کرتے ہیں۔"

یہ جملہ میری نظامت میں کام آئے گا۔ "غزل اکاڈمی کیوں نہیں ہے" یہ ایک ایسا سوال ہے جو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ غزل پر ایک نیا مکالمہ قائم ہونا چاہیے۔ اس شمارے سے معلوم ہوا کہ ہم عصر اردو ادب نمبر شائع ہو گیا ہے لیکن میں اس خاص نمبر سے محروم ہوں۔

●R/5, Sect, 14/B, St.8 North Karachi (Pak)

[جی ہاں! ہم عصر اردو ادب نمبر شائع ہوگیا ہے۔ پاکستان میں قارئین شاعر درج ذیل پتے پر خاص نمبر کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال کردیں اور ہمیں اطلاع دیں ہم انہیں رجسٹری سے خاص نمبر ارسال کردیں گے۔

Suryya Ayub Khan,
61, Waheedabad, Opp,Hilal Masjid,
Gulbahar, Karachi - 74600 (Pak)

ادارہ]

سیدہ حنا

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہو گیا ہے۔ اس میں آپ نے میری تصویر اور میرے نام سے کسی اور کا افسانہ شائع کر دیا ہے جو افسوسناک ہے۔ محترم میں ایسے افسانے نہیں لکھا کرتی براہ کرم فوراً اس کی تردید نمایاں طور پر شائع فرما کر شکریے کا موقع دیں۔

● Al-Hina, 69-B, ASC Clonony,
Nowsehra (Pakistan)

[ادارہ شاعر کو بے حد ملال ہے کہ نومبر ۹۸ء کے شمارے میں شامل کہانی "گرہ" محترمہ عذرا اصغر (مدیرہ تجدید نو پوسٹ بکس 2986، جی پی او، اسلام آباد) کی تخلیق ہے

جو محترمہ سیدہ حنا کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ ادارہ ان دونوں معزز خواتین سے معذرت خواہ ہے کہ رسالہ شاعر کی طویل ترین عمر میں پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ اسی شمارے میں صفحہ نمبر ۱۷ پر 'بخط شاعر' کے تحت شمیم فاروقی اور حسن عباس رضا کی غزلوں پر دنوں معتبر شعرا کی تصویریں، دستخط اور پتے دائیں سے بائیں ہونے کی بجائے بائیں سے دائیں کی طرف Paist ہوگئے ہیں ہم ان شعرا سے بھی معذرت خواہ ہیں۔ محترم ساحل احمد کی نظم کے ساتھ پتہ غلط ہے۔ ان کا صحیح پتہ یہ ہے۔ لٹریری بک سینٹر۔ ۱۲۶، چک، الہ آباد ۲۱۱۰۰۲ (یوپی) قارئین شاعر سے گزارش ہے کہ وہ ان اغلاط کی تصحیح کرلیں۔ ادارہ]

نظیر صدیقی ———

ادھر چند برسوں سے 'شاعر' باقاعدگی سے مل رہا ہے جس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے 'شاعر' کے ایک شمارے میں قوی صاحب کے خاکوں سے متعلق کتاب پر میرا ایک مضمون ایک پاکستانی رسالے سے نقل کیا تھا۔ اس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس طرح آپ نے میرا ایک مضمون ہندوستانی قارئین تک پہنچادیا۔ میں اس بات کا قائل رہا ہوں کہ اگر ایک مضمون پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے رسالوں میں چھپے تو پڑھنے والوں کے لئے یہ بات مفید ہوگی کیونکہ دونوں ملکوں کا کوئی بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جو دونوں ملکوں کے بیشتر قارئین کی نظر سے گزرتا ہو۔ مگر آپ مدیران رسائل کی بھاری اکثریت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ ایک مضمون دونوں ملکوں کے رسالوں میں شائع ہو۔

مارچ ۱۹۹۹ء کے 'قومی زبان' کراچی (جو مارچ کے آخر تک شائع ہوگا) اس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی مرحوم کے شخصی خاکوں کے دس بارہ مجموعوں پر میرا مضمون ہوگا۔ آپ اسے ضرور دیکھیں اور اگر پسند آئے تو 'شاعر' میں جگہ دیں۔ میرے نزدیک ڈاکٹر عبادت کی خاکہ نگاری ان کی تنقید نگاری سے بھی اہم تر شے ہے۔

آپ کے رسالے کی قیمت (۶ روپے) کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ آج کل تو چھ روپے میں زہر کی پڑیا بھی نہیں ملتی۔ آپ چھ روپے میں فکر و نظر (یعنی زندگی) کی اتنی نعمتیں یکجا کر فراہم کردیتے ہیں۔

'شاعر' کے تازہ شمارے میں ہمدم دیرینہ باقر مہدی کا مضمون 'منظور ہے گزارش احوال واقعی' مزہ دے گیا۔ بہت عرصے کے بعد ایک دل چسپ تنقیدی مضمون جو معلومات سے لبریز اور کہیں کہیں بصیرت سے آراستہ ہے پڑھنے کا موقع ملا۔ ان سے فون پر کہئے کہ اگر ممکن ہو تو اپنی کتاب 'تنقیدی کشمکش' کی ایک جلد میرے پاس بھیج دیں۔ انھیں میرا پتا ٹھیک سے لکھوادیں۔

آپ کے رسالے کے شروع میں کسی ادیب یا شاعر کے خط میں اس کا خط ہوتا ہے اس کا سلسلہ دل چسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ یہ سلسلہ حافظے کو تازہ کرنے اور تازہ رکھنے میں معاون ہے۔ اگر ممکن ہو تو آپ وقار عظیم کا وہ مقالہ 'شاعر' میں شائع کردیں جس کا ذکر پروفیسر احتشام حسین نے کیا ہے۔

●House No.1915, Street -10, I-10/2,
Islamabad - 44800 (Pak)

شاعر نوازی کا شکریہ۔ آپ نے شاعر میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون کے حوالے سے ایک اہم مسئلے کو قائم کیا ہے۔ اس ضمن میں ہندوپاک کے بیشتر قلم کار ہم سے استفسارات کرتے رہتے ہیں اور اپنے دلائل سے یہ باور کرانے کی سعی کرتے رہتے ہیں کہ کوئی تحریر بہ یک وقت ہندوپاک کے ادبی رسائل میں شائع ہوجائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ہمیں اس بات سے کوئی بحث نہیں کرنی کہ ہر ادبی رسالے کا اپنا مزاج و معیار اور اپنی پالیسی ہوتی ہے۔ کسے کیا پسند ہے اور کیا نہیں اس سے قطع نظر ہم صرف اور صرف شاعر کے حوالے سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مضمون ہمیں عبدالقوی ضیاء صاحب نے اپنی کتاب کے ساتھ یا بعد میں اشاعت کے لئے براہ راست بھجوایا تھا۔ ہم نے پاکستان کے کسی ادبی رسالے سے مستعار نہیں لیا ورنہ تو ادبی صحافت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ رسالۂ مذکور کا حوالہ دیا جاتا۔ شاعر پر غیرمطبوعہ مضامین نثر و نظم کا زبردست دباؤ رہتا ہے اس لئے تخلیقات کی اشاعت میں غیرمعمولی تاخیر کا احتمال رہتا ہے۔ قلم کاروں کو انتظار برداشت نہیں ہوتا اور بغیر اطلاع کے اپنی تخلیقات کسی اور رسالے کو ارسال کردیتے ہیں۔ ہندوپاک کے ادبی رسائل میں شائع شدہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کی معیاری تخلیقات پوری اردو دنیا تک پہنچنی چاہیے، ایسا کم کم ہوتا ہے کیونکہ ادبی رسائل کی تعداد اشاعت بہت کم ہوتی ہے اور تمام ادبی حلقوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ شاعر کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی اپنی لامحدود گلوبل ریڈر شپ ہے۔ پاکستان کے تقریباً ادبی حلقوں تک رسالہ شاعر کی رسائی ہے۔ پھر مانگ کر پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ قارئین شاعر کو ان تحریروں کی اشاعت پر اعتراض ہوتا ہے جو وہ شاعر کے علاوہ بھی کہیں اور مطالعہ کرچکے ہوتے ہیں۔ بہرحال! اعلیٰ درجے کی مطبوعہ تخلیقات کی بابت ہم الگ سے ایک منصوبہ بنارہے ہیں تاکہ سال بہ سال کا بہترین ادب ہندوپاک ہی نہیں اردو کی نئی بستیوں کے شائقین شعروادب کو بھی مطالعے کے لیے میسر ہوسکے۔ [ادارہ]

جمال اویسی ———

دسمبر ۹۸ء کا شمارہ کل ہی بک اسٹال سے خریدا ہے۔ میں شاعر کا ہر شمارہ اپنے بک اسٹال سے خریدتا ہوں۔ پہلے 'ہم عصر اردو ادب نمبر' اور اب عام شمارہ۔ مجھے مفت خوروں میں نہیں شمار کیجئے گا۔ کاش میری لائبریری میں شاعر کے نمبرات کا پورا سیٹ ہوتا۔ لہٰذا (اویس احمد دوراں) نے بہت سے نمبر اپنے کالج کی لائبریری کو دے دئے۔ میں شاعر کے علاوہ 'شب خون' 'سوغات' 'جامعہ' 'ذہن جدید' 'نیا ورق' 'جہات' 'اثبات و نفی' 'آج کل' 'ایوان اردو' 'زبان و ادب' 'فکر و تحقیق' اور 'اردو دنیا' وغیرہ خرید کر پڑھتا ہوں۔ تازہ شمارے میں باقر مہدی کی بندوق سے گولی دعا کے در نہیں نکلی ہے۔ وارث علوی کی تحریر کے دعا کے کا جواب دے پانے کی اہلیت ان میں نہیں ہے۔ ان کی نثر مجرہ بیان کا شکار ہے۔

● محلہ فیض اللہ خان، دربھنگہ (بہار)

فکر امروز

سادگی کے ساتھ مناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ شعرا جن کی زبان اور خیال کمزور اور بے جان ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ ان کو پیچھے ڈھکیل رہا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ ان کی ترقی کے امکانات مسدود ہوتے جا رہے ہیں کیوں کہ وہ اپنے اندر لسانی و ذہنی انقلاب کے متوازن انقلاب پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ یاد رکھیے! زبان کی بلند پائیگی و متانت، الفاظ کی مناسب شوکت، خیالات کی بلندی، تراکیب کی چستی اور جذبات کا اچھوتا پن ہی ادب کی جان اور شاعری کی روح ہے۔

غزل کا ایک شعر تو یہ ہے:

آئے گا نہ تو رات کو، کب مجھ کو یقیں تھا
شاید کہ ترا وعدۂ وصل اور کہیں تھا

اور ایک شعر یہ ہے:

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

(۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ایک خطبہ صدارت سے)

سیماب اکبرآبادی

مکتبہ قصر الادب

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۷۰
شمارہ — ۴

فون: 3829904

اپریل ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری	**معاونین سے**
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۱۱ جون ۵۵ء

حضرت محترم - تسلیم

نامۂ گرامی باعث افتخار ہوا - جہاں تک مجھے علم ہے مانی صاحب حضرت عزیز مرحوم کے شاگرد نہیں ہیں جوش البتہ ہیں مگر یہ کبھی ٹال جاتے ہیں کہ کچھ دن مشورۂ سخن کیا تھا۔ حالانکہ اُن کے والد بزرگوار بشیر محمد خاں بھی حضرت عزیز کے شاگرد تھے - میرا عقیدہ ہے کہ یہ حضرت عزیز کی حضرت صفی کی شاگردی سے انکار کی پاداش ہے - حضرت صفی مرحوم نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

تھے اور بھی صفیؔ مرے جتنے تلامذہ   نکلے وفا شعار سب اُن میں، مگر عزیزؔ

مانی صاحب نے اپنے تلمذ کی طرح اپنی عمر بھی نہیں بتائی لیکن اس کا پتہ اُن کے فرمودات سے چل جاتا ہے - فوٹو کا صفحہ ملاحظہ فرمائیے - سنہ ۱۹۲۱ء میں رفیقۂ حیات نے بیس سال کا ساتھ چھوڑا - شادی پندرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی - ۱۹۲۱ سے ۲۰+۱۵=۳۵ نکال دیجئے تو ۱۸۸۶ رہتے ہیں سنہ ولادت ہوا - عورت کی طرح شاعر بھی اپنی اصلی عمر نہیں بتاتا لہٰذا میری رائے میں ۱۸۸۶ سے پانچ چھ برس اور منہا کر دیجئے - میں بھی شاید یہی طرز عمل اختیار کرتا مگر مشکل یہ آپڑی کہ اسکول میں عمر کا اندراج، کالج میں اندراج، ملازمت سرکاری میں اندراج اس قدر جکڑا ہوا تھا کہ تغیر تبدل کی گنجائش نہیں نکلی -

جس غزل کا شعر آپ کو پسند آیا اُس کے بعض دیگر اشعار بھی سنانے کو دل چاہتا ہے:

آیا دیکھ کے تری چشم سیاہ سے   مستی خراب بادۂ نشیلی نگاہ سے
تھی رات اُن کے عارض تاباں کی گفتگو   جیسے کسی نے کھینچ لیا نور ماہ سے
یہ شرم ناکسی ہے کہ رہتا ہے یہ ہراس   مجھکو نہ دیکھ لے کوئی میری نگاہ سے

الجمعیۃ میری نظر سے نہیں گزرتا - خبر نہیں کہ نثار سلمہ کے مضامین کس نوعیت کے ہوتے ہیں، خود انھوں نے کبھی مطلع نہیں کیا -

آپ کا خادم اثر

اثر لکھنوی بنام مولانا نسیم احمد فریدی

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی [پ: ۱۲ر جولائی ۱۸۸۸ء، لکھنو۔ م: ۶ر جون ۱۹۶۷ء] تلمیذ: محمد ہادی عزیز لکھنوی [پ: ۱۴ر مارچ ۱۸۸۲ء۔ م: ۳۰ر جولائی ۱۹۳۵ء] کا یہ خط مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی [متوفی: ۱۰ر اکتوبر ۱۹۸۸ء] کے نام ہے۔ اس میں ایک ایسے تحقیقی موضوع کی طرف اشارے ہیں جو اساتذہ اور ان کے تلامذہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ [ادارہ]

بشکریہ نثار احمد فاروقی (دہلی)

شمارہ۔۴ [اپریل/ ۱۹۹۹ء] جلد۔۷۰

غزل اور فنونِ لطیفہ

کتب و رسائل سے باہر غزل کے عوامی و ثقافتی کردار، الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کے حوالے سے شاعر میں کئی اہم اداریے لکھے گئے ہیں اور غزل کو اسی تناظر میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے جو ۲۱ویں صدی کی غزل ہو گی اور اردو کی موجودہ صورت حال میں مستقبل کی اردو زبان کو غزل کا یہ کردار کیا رول ادا کر سکتا ہے، اس کے متعلق اشارے کئے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر اردو سماج کے ٹھہرے ہوئے میکانیکی طرزِ عمل کے لئے ہماری یہ بحث ابھی کوئی تحریک نہیں بن سکی ہے۔ لیکن ہمیں تو اپنی بات کہنی ہے تاکہ ۲۱ویں صدی کے نصف آخر اور ۲۲ویں صدی کے اردو والے یہ نہ کہہ سکیں کہ غزل جیسی زندہ، متحرک اور جادو اثر صنفِ سخن کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے لئے غزل کے اس کردار سے کوئی کام نہیں لیا۔ اسے تحریک نہیں بنایا۔ آج کی گفتگو میں غزل کے کچھ اور پہلوؤں کی طرف اشارے کئے جا رہے ہیں جو عوام و خواص کے مشترکہ کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندوستانی شاعری کی کونسی اصناف الیکٹرانک میڈیا کی ضرورت بن سکی ہیں؟ (مذہبی شاعری کو چھوڑ کر) غزل انٹرنیٹ پر آ گئی ہے۔ کلکتہ کی ایک سندھی خاتون جوان دنوں امریکہ میں مقیم ہیں، انھوں نے انٹرنیٹ پر اردو شاعری کو پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اور یہ شاعری آپ کی آزاد اور نثری نظم نہیں بلکہ غزل کی شاعری ہے۔ انٹرنیٹ تو بیسویں صدی کا ایک عجوبہ ہے۔ اردو اور غزل، غزل اور اردو، لازم و ملزوم ہیں۔

غزل نے اردو کا دفاع کیا ہے (رسم الخط کا نہیں) کیوں کہ غزل کے ذکر کے ساتھ اردو کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جبکہ غزل، ہندوستان کی تقریباً تمام چھوٹی بڑی زبانوں میں یا تو منتقل ہو رہی ہے یا ان زبانوں کے شعراء غزل کے فارم کو اپنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ پر جو غزل آ رہی ہے وہ رومن رسم الخط میں ہے اور یورپ و امریکہ میں ایک بار پھر رومن رسم الخط کی لہر چل پڑی ہے۔ گم ہوتے ہوئے اردو رسم الخط سے ہندی کو فائدہ ہو گا جیسا کہ عوامی سطح پر بول چال کی زبان اردو یا ہندوستانی کے بجائے ہندی کو کریڈٹ مل رہا ہے۔

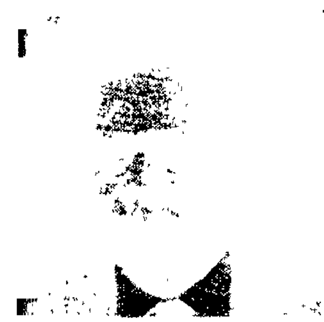
غزل کا جمالیاتی نظام، غنائیت (لَفَظی) سے عبارت ہے۔ اسے آپ "تغزل" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی تغزل عوام و خواص کو باندھے رکھنے کا کام کرتا ہے۔ شاعری پڑھنے سے زیادہ سننے اور گانے کی چیز ہے اور غزل بطور خاص۔ غزل کا ایک شعر اسلوب و معانی کی ہم آہنگی سے سنگیت بن جاتا ہے۔ ایک غیر معمولی رچا بسا شعر، سنگیت بھی بن جاتا ہے۔ غزل تو ہلکی پھلکی موسیقی کی روح ہے۔ کتب و رسائل میں صنفِ غزل کے خلاف کچھ بھی لکھا جائے اس کے اثرات غزل پر ہرگز نہیں پڑیں گے۔ کیوں کہ یہ ساری بحثیں نقادوں اور تخلیق کاروں کے درمیان کی ہیں۔ اس میں قاری اور سامع کی شمولیت بے معنی ہے۔ آج غزل کتنی ہی غیر معیاری ہو جائے، غزل کا کلاسیکی سرمایہ اتنا وافر، معیاری، جاندار اور متحرک ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو شعرا غزل نہ بھی تخلیق کریں تب بھی صنفِ غزل باقی رہے گی کیوں کہ عوام و خواص کے درمیان جو غزل موجود ہے وہ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی غزل سے زیادہ کلاسیکی یا پھر روایت کے شعور کے ساتھ تخلیق ہونے والی معاصر غزل میں سے کچھ فیصد ہے۔

غزل اور موسیقی کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ غزل گائیکی، شاعر کے ایک مجوزہ خاص نمبر کا موضوع ہے لیکن غزل نے تو فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ مصوری کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو ہندو پاک کے بیشتر مصوروں نے غزل کے اشعار کو اپنے اپنے فنی اظہار سے کینوس پر مکرر تخلیق کیا ہے۔ برش و رنگ، پنسل، چاقو، بلیڈ، نرسل، قلم، انگلیاں، چاک (کھریا)، کپڑا، ہر فن کار نے اپنے اپنے اسلوب سے غزل کے اشعار کو مصور کیا ہے۔ غزل تو رقص کا موضوع بھی بنی ہے۔ کسی شعر کے خیال کو، اس کے مختلف Shades کو جسم کے آؤ بھاؤ کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ جسم کی اپنی زبان ہوتی ہے جسے سیکھنا اور سمجھنا پڑتا ہے اور جب اس زبان پر دسترس حاصل ہو جاتی ہے تو پھر خیال و جسم کے اتصال سے تصویریں بنتی ہیں اور ان تصویروں میں ناظر، سرگوشیاں اور گونج کو سمو کر شعر کی تفہیم کرتا ہے۔ رقص کی کوئی شیلی ہو، غزل اس کا ساتھ دے سکتی ہے۔ ٹھمری یا بھجن، رقص کا عنوان بن سکتے ہیں، شاعری (طویل رزمیہ نظمیں بھی) اور موسیقی تو ترتیہ سے جڑے ہوئے ہیں کیوں کہ رقص کے لئے بول یا بندشیں اور انکی تکرار تو ہوتی ہی ہے۔ فلموں میں گانے اور گانوں کے ساتھ مختلف النوع رقص کا سلسلہ تو نصف صدی سے جاری ہے۔ فلمی گانوں پر غزل کے، اس کی لفظیات کے واضح اثرات ہیں۔ رقص میں پورا جسم اپنے اپنے مقام سے بولتا ہے۔ اداکاری کے ذیل میں جسم کے حرکات و سکنات کو رکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی رقص کی اپنی اپنی تکنیک ہے اور غزل ہر تکنیک کا بھرپور ساتھ دے سکتی ہے۔ کتھک نرتیہ اس کی بہترین مثال ہے۔

غزل کے مصرعے یا شعر تصویروں کے عنوان بنتے ہیں۔ گائیکی اور رقص کے علاوہ وہ فنون جو شکلوں، تصویروں، آوازوں اور مختلف النوع اشیاء سے تعلق رکھتے ہیں اور جو "خیال" سے ابھرتے ہیں ان میں غزل کے اشعار لوازمہ بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں۔ غزل اور فنونِ لطیفہ ایک وسیع تر موضوع ہے اور یہاں صرف اس موضوع کی طرف ہلکا سا اشارہ ہی مقصود ہے تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ اردو غزل آپ کے کتب و رسائل سے باہر اردو کا کس طرح دفاع کر رہی ہے، ہندوستانی ثقافت اور اس کی جمالیات کے ساتھ کس طرح جڑی ہوئی ہے۔ ہندوستانی عوام کی سائیکی کا کس طرح ایک اٹوٹ حصہ بنی ہوئی ہے۔

آج ہمیں اردو کے مستقبل کے لئے غزل کے اس بہت اہم کردار کو اپنے عمل کی روح بنانا پڑے گا، ورنہ......

[illegible]



شان الحق حقی

شعلہ سا جیسے ساغرِ مے سے لپک اٹھا
بھڑکی وہ دل کی پیاس کہ پیالہ چھلک اٹھا

نظریں پڑیں تو رخ پہ پسینہ دمک اٹھا
گلرنگ سے افق پہ ستارا چمک اٹھا

یوں دل میں جھلملائی فضا اس دیار کی
نظروں میں جیسے تیرا ہی آنچل جھلک اٹھا

کیا خونِ ناب کی سی روانی ہے ساز میں
اک رندِ خوشنوا تھا کہ پی کر چہک اٹھا

اس طرح آئی جھوم کے اک موج پر خروش
حدِ نگاہ تک خطِ ساحل لچک اٹھا

کافر ہوں گر کلام تری دوستی میں ہو
اتنی ہی بس خلش ہے کہ کیوں دل میں شک اٹھا

نظروں کو میری اس گل خوبی کی ہے تلاش
ہر صبح جس کی یاد میں گلشن مہک اٹھا

اپنے ہی ذوقِ نغمہ کا پھونکا ہوا ہے دل
بجھ کر کسی کی یاد کا شعلہ بھڑک اٹھا

● 341, Frontenac Drive, D.D.O, Qc
H9G 1R4, Canada

سلطان اختر

دل کو قابو میں جو کرتا ہوں تو سر گھومتا ہے
میں بھنور میں ہوں کہ اب مجھ میں بھنور گھومتا ہے

کیسی گردش میں ہے کیوں شام و سحر گھومتا ہے
اپنے سائے کے تعاقب میں شجر گھومتا ہے

بے سبب کوچہ و بازار اڑاتے ہیں مذاق
کون اس شہر میں اب بارِ دگر گھومتا ہے

کچھ بھی گردش میں نہیں ثابت و سالم سب ہیں
در و دیوار ہی چلتے ہیں نہ گھر گھومتا ہے

کوئی سر لائقِ تعظیم میسر ہی نہیں
دربدر لے کے وہ دستارِ ہنر گھومتا ہے

ڈھونڈتی پھرتی ہے مجھ کو میری منزل، یعنی
اب مرے چاروں طرف میرا سفر گھومتا ہے

موت کا وقت مقرر ہے یہ ہم جانتے ہیں
خیمۂ جاں میں کوئی خوف مگر گھومتا ہے

خاک ہونے لگے اختر خس و خاشاکِ طلب
جسم و جاں میں مرے یہ کیسا شرر گھومتا ہے

● ہارون کالونی، سکریٹریل یونٹ، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

محمود شام

(نذرِ ہندوپاک)

ہر نظر پیار تو ہر لب پہ ہنسی مانگتے ہیں
ہم تو ہر مانگ ستاروں سے بھری مانگتے ہیں

پھول تو خوب ہی لگتے ہیں جہاں چاہیں کھلیں
ہم تو سرحد بھی گلابوں سے لدی مانگتے ہیں

ہم بھی کیا لوگ ہیں نفرت کے شجر بو بو کر
آسمانوں سے محبت کی جھڑی مانگتے ہیں

ان کی رہ تکتی ہے تاریخ بھی بے چینی سے
سربلندی کو جو نیزے کی انی مانگتے ہیں

غیر اڑنے کو بھی کرتے ہیں فضا تازہ تلاش
ہم کہ رہنے کو بھی اک اندھی گلی مانگتے ہیں

سب کو سلطانیٔ جمہور کا دعویٰ ہے مگر
اختیارات بہ اندازِ شہی مانگتے ہیں

ق

یہاں گلیوں نے مری ماں سے دعائیں چھینیں
واں محلے مری بہنوں سے خوشی مانگتے ہیں

یہاں دریا مرے پرکھوں کے لہو سے کھیلے
واں سمندر مرے بچوں کی بلی مانگتے ہیں

● ایڈیٹر: روزنامہ جنگ، کراچی (پاکستان)

ہمارے لئے تو دعائیں بہت ہیں

گیان چند بنام ....

(ادبی فیچر)

ذیل میں ڈاکٹر گیان چند جین کے تین حالیہ مکاتیب نذرِ قارئین ہیں ۔ یہ خط 'ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کے حوالے سے تحریر کئے گئے ہیں اور ہمارے لئے ازحد قیمتی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے حقیر کام کی جو پذیرائی کی ہے اور حوصلہ افزائی فرمائی ہے وہ کسی بڑے انعام یا ایوارڈ سے کم نہیں ۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مکاتیب کو بنیاد کرتے ہوئے جو طویل ادارتی خط لکھا ہے اس کے مخاطب بہ ظاہر گیان چند صاحب ہی ہیں تاہم ہمارا تخاطب شعر و ادب کے ان بے شمار قارئین سے ہے جو 'ہم عصر اردو ادب نمبر' کا مطالعہ کررہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب تو ہمارے بے انتہا قابل قدر عالم اور ادیب ہیں ۔ ان سے ہزار اختلاف کے باوجود یوں کھلے عام انہیں مخاطب کرنا شاید بدتہذیبی میں شمار ہو ۔ ہم نے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ نہایت ہی عاجزی و انکساری کے ساتھ لکھا ہے ۔ دراصل پوری اردو دنیا میں ہم عصر اردو ادب نمبر کو حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھا جارہا ہے ۔ پسند کیا جارہا ہے تاہم ابھی خاص نمبر ، اپنے قارئین پر پوری طرح منکشف نہیں ہوسکا ہے ۔ فوری ردّ عمل کے طور پر جو تاثرات ابھررہے ہیں اور جو سوال بنائے جارہے ہیں وہ عادتِ ذہنی کا نتیجہ ہیں ۔ ادبی رسائل کے روایتی ضخیم نمبروں اور طے شدہ سانچوں ، ڈھانچوں سے باہر خاص نمبر کو دیکھنے اور سمجھنے کی گذارش ہے ۔ گیان چند صاحب چونکہ اردو کے چند بڑے ادیبوں میں سے ایک ہیں اور ان کی تحریروں کو مستند و معتبر ماخذ کے طور پر لیا جاتا ہے لہذا ان کے ذریعے سے بعض ان باتوں اور سوالوں کی وضاحت و صراحت کو ضروری سمجھا گیا جو یہاں وہاں ابھر رہے ہیں یا ہم سے پوچھے جارہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کے مکاتیب کے ساتھ ہماری معمولی سی تحریر بھی توجہ طلب ہوجائے گی ۔ اس طرح ہم اپنی بات کو بے شمار لوگوں تک پہنچاسکیں گے ۔

بہت شکریہ گیان چند صاحب ! بہت بہت شکریہ ۔ [ادارہ]

(۱)

انگلستان کے ہفتے وار راوی سے معلوم ہوا کہ شاعر کا خصوصی نمبر جلد اوّل شائع ہو گیا ہے۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ فی الحال اس کی کوئی صورت نہیں۔ اگر اس میں میرا مضمون مالک کا بے حد مفید و بے حد غلط تذکرہ ماہِ سال چھپا ہو، تب، اور صرف تب، مجھے رسالے کی جلد کا استحقاق ہے لیکن استحقاق ہو کہ نہ ہو، میں جانتا ہوں کہ پرچہ مجھے نہیں بھیجا جا سکتا۔ ہوائی ڈاک سے تقریباً ۵۰۰ روپے محصول لگے گا اور سطحی ڈاک (Surface Mail) سے میرے خیال میں سو روپے کے لگ بھگ لگیں گے اور پرچہ دو تین ماہ میں پہنچے گا۔ اس لیے فی الحال اس کا بھیجنا موقوف۔

میرے ایک کرم فرما رحمٰن واگلے ساز ۱۹ اردسمبر کو اپنے وطن بمبئی بھی گئے تھے۔ ایک ڈیڑھ مہینے میں واپسی تھی۔ ان کا فون نمبر میرے پاس نہیں لکھا۔ یوں بھی جب تک یہ خط پہنچے گا، تب تک وہ بمبئی چھوڑ چکے ہوں گے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند JNU، جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے مشترکہ غالب سیمینار میں شرکت کے لیے فروری کے وسط میں دلّی جائیں گے۔ معلوم نہیں آپ انھیں ان کے حصے کا پرچہ دے سکیں گے کہ نہیں۔ وہ امریکہ میں مجھ سے بہت دور کی ریاست میں رہتے ہیں۔

میں جلد دسمبر ۹۷ء کے آخر میں لکھنؤ سے امریکہ کے لیے چلا تو میرا ایک بیگ چوری ہو گیا۔ اس میں میری ڈاک پتے اور فون کی ڈائری بھی تھی۔ اس کے جانے سے میں بے دست و پا ہو گیا۔ آپ کا پتا بھی جاتا رہا۔ بعد میں راوی ہی سے آپ کا پتا ملا۔ میں بشرطِ حیات اگست ۹۹ء میں دو تین ماہ کے لیے ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اپنے سب عزیزوں اور دوستوں سے مل سکوں۔ اس وقت بمبئی بھی آؤں گا۔

راوی میں دی ہوئی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ فرصت ملے تو ایک ایروگرام پر لکھیے کہ کیا اس پرچے میں میری کوئی تحریر بھی

شامل ہے؟امید کرتا ہوں کہ آپ بخیر ہوں گے۔(۳۰ر جنوری ۱۹۹۹ء) مخلص۔ گیان چند

(۲)

کل بالکل خلاف توقع شاعر کا نمبر مل گیا۔ آپ نے ۸ار فروری کو بھیجا اور یہ کل ۲۴ر فروری کو آگیا۔ امریکہ میں رجسٹری کا رواج نہیں کیونکہ یہاں ڈاک گم نہیں ہوتی۔ شمارہ دوسرے خطوط کے ساتھ لیٹر بکس میں رکھا ہوا تھا۔ اس پر ۷۴ ۳ روپے کا محصول دیکھ کر میں کانپ گیا۔ میں ہرگز یہ مطالبہ یا توقع نہیں کرتا تھا کہ آپ اسے ہوائی ڈاک سے بھیجیں۔ شکاگو سے افتخار نسیم نے مجھے فون پر کہا تھا کہ ان کے پاس پرچہ آگیا ہے، وہ ہندوستان سے واپس آکر اسے پڑھ کر اپنی کاپی مجھے دے دیں گے۔

میں بہر حال محصول ڈاک کی تلافی کے ۳۵۰ روپے دے دوں گا۔ کسی طرح بھیجنے کا انتظام کروں گا۔ کالی داس گپتا کو لکھوں گا کہ وہ آپ کو دے دیں۔ ۲۴۷ روپے میں معاوضے کے نام پر ضبط کرلوں گا۔ جب آپ نے مضمون کو عرصے تک نہیں چھاپا تو میں نے اسے یوپی اکادمی کے رسالہ اکادمی میں چھپنے کے لیے دے دیا۔ آپ کا خط آیا کہ میں اور کہیں نہ چھپواؤں۔ میں نے کئی ماہ کے بعد 'اکادمی' سے واپس لے لیا وہ مجھے اس کا معاوضہ ۵۰۰ روپے دیتے۔ نیا دور لکھنؤ مجھے مضمون کے پانسو روپے دیتا تھا، پھر ایک ہزار روپے دینے لگے۔ نیا دور فراق نمبر (فراق صدی کی آواز) میں مجھے مضمون کے ۱۵۰۰ (ڈیڑھ ہزار روپے) دے کر میرا دماغ خراب کر دیا۔

میں نے پرچے کا ہر صفحہ الٹ کر دیکھ لیا ہے۔ فرصت میں اپنی دلچسپی کی تحریروں کو دیکھوں گا۔ آپ نے کام غیر معمولی کیا ہے۔ اس میں حوالے کا اتنا مواد ہے کہ مالک رام کے تذکرۂ ماہ و سال کی طرح ہمیشہ دیکھتے رہنے کی ضرورت ہوگی۔ آخری حصے میں آپ نے جو سوانحی لغت اور انگریزی میں پتوں کی ڈائرکٹری دی ہے وہ مستقل افادیت کی امین ہے۔ اس میں ص ۱۱۸۵ پر میری تاریخ ولادت ۲۰ر ستمبر ۱۹۲۳ء لکھی ہے، صحیح ۱۹ر ستمبر ہے جو میں نے تذکرۂ ماہ و سال کے مضمون میں بھی ص ۱۰۳۸ پر لکھی ہے۔ آپ نے اشک کی تاریخ وفات ص ۶۹۱ پر دسمبر ۱۹۹۶ء لکھی ہے۔ حد کر دی مبالغے کی۔ وہ ۱۹ر جنوری ۱۹۹۶ء کو فوت ہوئے۔ اس طرح آپ نے عمر ایک سال بڑھا دی۔

پرچہ آپ نے غیر معمولی نکالا ہے۔ اتنی محنت کی کیا ضرورت تھی۔ اب دوسری تیسری جلدیں تو آپ کے لیے کمر شکن بار ہو جائیں گی۔ میں غور کرتا ہوں تو یاد نہیں آتا کہ اردو میں کسی رسالے کے خاص نمبر میں اتنا زیادہ مفید مواد آیا ہو جتنا اس میں ہے۔ کمی دو ہیں ایک کاغذ بہت اچھا نہیں۔ دوسرے رسالوں کے خاص نمبر نفیس کاغذ پر ہوتے ہیں مثلاً نقوش کو دیکھیے۔ یہ ضرور ہے کہ کاغذ کا معیار بہتر کرنے میں اخراجات بہت بڑھ جاتے۔ دوسری اس سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس خاص نمبر کا کوئی ایک خاص رنگ نہیں۔ بھانت بھانت کے متفرقات کو ملا جلا کر پیش کر دیا ہے۔ رسالوں کے خاص نمبر عموماً کسی متعینہ موضوع پر ہوتے ہیں مثلاً غالب نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، غزل نمبر، اصناف سخن نمبر، ادبی معرکے نمبر۔ طرح طرح کے موضوعات کو ملا دینے سے اس شمارے کا کوئی تشخص نہیں بن پایا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اس ایک بڑے نمبر کو بانٹ کر تین چار نمبر بنا دیتے۔

شاعری کا حصہ غیر ضروری طور پر بہت پھیلا ہوا ہے۔ نثر نگاروں کی شاعری کی طرف آپ نے توجہ دلائی یہ خوب ہے مثلاً تنویر علوی اور حنیف نقوی کی شاعری کتنی بلند ہے۔ ان کی تحقیق نے ان کے شاعرانہ پہلو پر کئی حجاب ڈال دیے۔

آپ کے یہاں آنے کی خبر پڑھی تھی۔ بین الاقوامی مشاعرے میں آپ مشرقی امریکہ میں شامل ہوئے۔ مغربی ساحل پر امریکہ نہ آسکے۔ لاس اینجلس کے مشاعرے میں میں بھی موجود تھا۔ میں یہاں بھی لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ آج کل قاضی عبدالودود پر ایک کتاب لکھنے میں مستغرق ہوں۔ بشرط حیات میں اگست ستمبر ۱۹۹۹ء میں ہندوستان آؤں گا، بمبئی بھی۔ اس کتاب کے لیے مواد دیکھنا ہے۔ جب آؤں گا تو پیشتر آپ کو مطلع کر دوں گا۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے۔

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر　　　　پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر　(ذوق)

ہوائی ڈاک میں محصول بہت لگتا ہے اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ مجھے شاعر کا شمارہ بھیجنے کی زحمت نہ کیجیے۔ کبھی کوئی مضمون ممکن ہوا تو میں ضرور بھیجوں گا۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔(۲۵ر فروری ۱۹۹۹ء)

(۳)

تذکرۂ ماہ و سال پر میرے مضمون میں کالی داس گپتا صاحب نے جو تصحیحات کی ہیں ان کی روشنی میں ایک ترمیم نامہ ملفوف کر رہا ہوں۔ براہ کرم شاعر کے کسی بھی شمارے میں چھاپ دیجیے۔ میرے پاس وہ شمارہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میرے مضمون کے علاوہ دو تحقیقی مضمون اور ہیں۔ دونوں اعلیٰ درجے کے ہیں۔ رشید حسن خاں کا مضمون خوب ہے لیکن تین حصوں میں سے صرف ایک حصہ ہے۔ تینوں حصے ایک ساتھ ہوتے تب ان کی قیمت کھل کر سامنے آتی۔ کالی داس گپتا صاحب نے یہ بہت اچھا کیا کہ میر پر لکھا۔ غالب پر بہت لکھا جا چکا ہے، ہندو پاک میں میریات کی تحقیق کا کوئی بھی ماہر نہیں۔ میر کی تنقید شمس الرحمٰن فاروقی نے سنبھال لی، میر کی تحقیق مع تدوین کو کالی داس صاحب سنگوالیں تو بہت اچھا ہو۔ انھوں نے توقیتِ میر دی وہ مستند ہونی چاہیے لیکن بعد میں آبِ حیات کی جو غیر مصدقہ کمزور روایات درج کر دی ہیں، ان سے احتراز کرتے تو بہتر ہوتا۔ آزاد مرحوم شاہی کو ہمیشہ مجروح کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میر آصف الدولہ سے ایسے گستاخانہ کلمات کہہ سکتے۔

آپ نے آگرہ اسکول جو قائم کرنا چاہا ہے وہ سعی مشکور نہ ہو سکے گا۔ کسی جگہ بہت سے ادیبوں کا اکٹھا ہونا اس مقام کو ادبی مرکز تو بنا سکتا ہے کسی دبستان کا اڈا نہیں۔

دبستان کے لیے کچھ ادبی رجحانات اور نظریوں کا مشترک اور ممیز ہونا ضروری ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں کچھ خصوصیات تھیں۔ مجھے تو دبستان دلّی بھی ایک غیر حقیقی مفروضہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کی کتاب کا نام ہے دبستانِ گولکنڈہ۔ ڈاکٹر انور سدید کی 'اردو ادب کی مختصر تاریخ' میں یہ دبستان بھی ہیں۔ دبستانِ لاہور، لاہور کا دبستانِ تحقیق، کراچی کا دبستانِ تحقیق، اردو تنقید کلاسیکی دبستان، دبستان حسن عسکری، ایک منفرد تنقیدی دبستان (وزیر آغا)۔ ترقی پسند تنقید کا دبستان۔

ان میں سے بہتوں کا دبستان ہونا مشکوک ہے۔ تحقیق میں بھی دبستان ہونے لگے۔ دبستان، تحریک اور رجحان میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ بہر حال میری رائے میں آگرہ دبستان نہیں ہے۔

اس شمارے میں تنقید کے کئی زمرے اور خصوصی گوشے اچھے ہیں۔ شاعری سے نثر کی طرف اور نثر سے شاعری کی طرف آپ نے انوکھے اور دل پسند موضوعات سوچے۔ افسانہ پر مقالے اور تخلیقات قابلِ قدر ہیں۔ معاصر اردو شاعری پر مقالے بھی نظر افروز ہیں لیکن شاعری کے نمونے بہت زیادہ ہیں۔ 'ترقی پسندی سے جدیدیت' 'نئی نسل اور مابعد جدیدیت اور قاری اساس شعر و ادب کے تینوں مذاکرے تفہیم ادب میں مد ہوں گے۔ سوانحی لغت اور شاعر ڈائرکٹری مفید ہیں لیکن نہایت تشنہ۔ مجھے جس کا پتا جاننے کی ضرورت ہوئی آپ کے دونوں زمروں میں نہ ملا۔ دستخطوں کا انبوہ بھی دلچسپ خیال ہے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے غیر معمولی مشقت کی ہے۔ اس شمارے کی اہمیت ہنگامی نہیں، مستقل ہے۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ (۱۰ر مارچ ۱۹۹۹ء)

خیر اندیش۔ گیان چند

(۴)

میرے مضمون تذکرۂ ماہ وسال میں ترمیمات

رسالہ شاعر ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اوّل ۹۸۔۱۹۹۷ء میں میرا مضمون "مالک رام کا بے حد مفید د بے حد غلط تذکرہ ماہ و سال" شائع ہوا ہے۔ میں نے ادارے کو لکھا تھا کہ مضمون کا لی داس گپتا رضا کی نظر سے گزار لیں۔ رضا صاحب نے مطبوعہ متن میں کہیں کہیں مفید تصحیحات تجویز کی ہیں۔ ان کا مشکور ہوں۔ ان میں سے زیادہ اہم ذیل میں درج کرتا ہوں۔ قارئین انھیں مضمون میں سمولیں۔ واضح ہو کہ مجھے اپنے کسی اندراج کی قطعی صحت پر اصرار نہیں۔

ص ۱۱ بشن نراین در سے متعلق تصحیح خارج کر دی جائے۔
ص ۴۰ و ۶۵ آزاد مارہروی۔ فوت ۷ر محرّم ۱۳۴۳ھ ر ۸ یا ۹۔ اگست ۱۹۲۴ء
ص ۵۸ اوج یعقوبی۔ فوت ۱۳ر اگست ۱۹۸۳ء
ص ۷۹ غلام جیلانی برق۔ ولادت میں ۱۹۰۱ء کو ترجیح
ص ۱۱۷ جلال کی ولادت۔ رضا کے مطابق ۱۲۴۷ھ
ص ۱۲۳ ماہ لقا چندا۔ وفات ۱۲۳۹ھ ر ۲۴۔۱۸۲۳ء
ص ۱۵۴ فقیہ دردمند۔ وفات بقولِ رضا ۱۱۷۶ھ
ص ۱۵۷ ذکاءاللہ۔ ولادت رضا کے مطابق ۲ر اپریل ۱۸۳۲ء
ص ۱۹۱ سراج الدین عثمان۔ ولادت ۵۸۔۱۳۵۷ء
ص ۱۹۴ سرشار۔ وفات خم خانۂ جاوید کے مطابق بھی ۱۹۰۳ء
ص ۲۳۱ غلام امام شہید۔ وفات مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے میں ۲۷ر اکتوبر ۱۸۷۹ء۔ رضا اس سے متفق
ص ۲۵۱ طپاں کی وفات سے متعلق تصحیح خارج کر دی جائے۔
ص ۲۵۸ کلیان سنگھ عاشق کی وفات رضا کی رائے میں مالک رام کے اندراج کو ترجیح
ص ۲۶۴ فلک پیا کی ولادت سے متعلق ملک حسن اختر کی تاریخ مشکوک
ص ۲۶۵ قاضی عبد الغفار کی ولادت دسمبر ۱۸۸۵ء (قومی زبان کراچی مارچ ۹۴ء)
ص ۲۷۹ علی عباس حسینی کی ولادت کا نوٹ خارج کر دیا جائے
ص ۲۸۲ عندلیب شادانی مقامِ ولادت سنبھل کو ترجیح
ص ۲۸۲ شاعر میں نام نذر علی عیش چھپا ہے۔ صحیح نذر علی عیش۔ یہ جملہ نکال دیا جائے 'معلوم ہوتا ہے مولف نے انھیں دو شخص سمجھا ہے۔ بقول رضا پہلا کارڈ ضائع کرنا بھول گئے۔
ص ۲۸۳ عیشی۔ یہاں بھی یہ جملہ نکال دیا جائے کہ مولف انھیں دو شخص سمجھے۔ دراصل پہلا کارڈ ضائع کرنا بھول گئے۔
ص ۲۸۹ غلام یزدانی۔ رضا کے مطابق ص ۳۱۶ کے بیان کو ترجیح

ص ۲۹۵ فرحت اللہ بیگ۔ وفات ۱۹۴۷ء صحیح

ص ۳۰۲ رضا کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ دو اشخاص ہیں۔ پہلا فیاض علی، دوسرا فیاض احمد خاں۔ اول الذکر سابق اٹارنی جنرل پاکستان ہیں اور انور اور شمیم ناولوں کے مصنف ہیں۔

ص ۳۱۹ کوثر چاند پوری سے متعلق نوٹ خارج کر دیا جائے۔

ص ۳۵۹ مضمون کی وفات حیدری کے گلشن ہند کے مطابق ۱۱۵۷ھ

ص ۳۷۰ مہدی افادی کی وفات رضا کے مطابق ۲۱ر نومبر کو نہیں، ۲۲ر نومبر کو۔

ص ۳۸۷ دیا شنکر نسیم کی وفات عاشق لکھنوی کی تاریخ ع کشیدہ آہ و بگفتہ "نسیم باغ جناں" ۱۲۶۷۔ آہ کے ۶ سے بھی ۱۲۶۱ھ

●23 Nevada Irvine , CA - 92606 (U.S.A) Phone : 001 - 949-559-6012 -Email : Gianchand @ aol.com

عرض ہے کہ ...

آپ کے تینوں عنایت نامے مل گئے ہیں۔ ۳۰ر جنوری کے خط کا جواب میں نے تحریر کر دیا تھا جو آپ کو مل گیا ہے۔ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) کے حوالے سے آپ کے گرانقدر خطوط ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کی صاف ستھری، سچی اور معصوم طبیعت کے غماز اور آپ کے تبحرِ علم کا مظہر ہیں۔ مجھ ایسے طالب علموں کے لئے یہ خطوط انمول ہیں۔ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اس خاکسار کو شفقتوں سے نوازا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان خطوں سے کچھ اقتباسات 'مکتوبات' کے کالم میں دے دئے جاتے کہ ان میں سے بعض مندرجات قطعی ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آپ کے خطوں کا ایک ایک لفظ قارئین شاعر تک پہنچنا چاہیے تاکہ ادب کے قارئین و طلبا آپ سے استفادہ کر سکیں۔ آپ ہندوستان میں نہیں ہیں لیکن امریکہ میں بھی تحقیق و تنقید کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے شعر و ادب کو وزن و وقار اور معیار عطا کر رہے ہیں تاہم مجھے یہ محسوس ہوتا ہے گویا ہندوستان سے اردو کا ایک مثالی دانشور کم ہو گیا ہے۔ بزرگ ادیب و شاعر کالی داس گپتا رضا صاحب سے اکثر آپ کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے اور اختتام اسی تاسف پر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جو چند گنے چنے ادیب و دانشور رہ گئے ہیں ان میں سے ایک آپ ہیں مگر اب اردو کی نئی بستیوں میں جا بسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دے، صحت دے تاکہ آپ اردو ادب میں اپنی تحریروں سے اضافے کرتے رہیں۔ ہم ایسے طلبائے ادب کی سرپرستی اور رہنمائی کرتے رہیں۔

سب سے پہلے تو بے حد معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کو خط نہیں لکھ سکا، رسالہ شاعر آپ کے نام جاری نہیں کر سکا۔ آپ نے پہل کی اور خاکسار کو یاد کیا، گرامی نامے سے نوازا۔ مجھ پر کرم کیا۔ ممنون ہوں۔

جی ہاں! ہم عصر اردو ادب نمبر پر آپ کا استحقاق تو بنتا ہے اگر آپ کا تحقیقی مقالہ اس میں شامل نہ ہوتا تب بھی، جیسا کہ شاعر کے نایاب 'اقبال نمبر' کے ساتھ ہوا تھا۔ مذکورہ خاص نمبر ہم نے ایک طرح سے ادیبوں اور شاعروں میں مفت تقسیم کر دیا تھا۔ کسی سے کچھ بھی طلب نہیں کیا تھا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے بھی ہم نے یہی سوچ رکھا تھا کہ 'اقبال نمبر' کی طرح اسے بھی نہایت ہی کم قیمت پر ادیبوں اور شاعروں میں تقسیم کر دیں گے۔ یوں بھی شاعر ایک نہایت ہی غیر تجارتی ادبی رسالہ ہے جو محض سیماب روایت اور ہمارے جنون کے سبب زندہ ہے۔ ہمارے پاس وسائل ہوں تو ہم شاعر کو برائے نام قیمت پر پوری اردو دنیا میں پھیلا دیں (اب بھی شاعر کے عام شمارے کی قیمت تمام ادبی رسائل میں سب سے کم ہے۔) مگر افسوس کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کو ادیبوں اور شاعروں میں (کچھ ایک کے استحقاق کے باوجود) مفت تقسیم نہیں کر سکے۔ بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے ہمارے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور خاص نمبر کو قیمتاً لیا لیکن ایسے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں جنھوں نے ہمارے اس رویے کو یا تو ناپسند کیا اور طرح طرح کے خطابات سے نوازا یا پھر چپ سادھ لی گویا ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت کوئی بہت معمولی واقعہ ہو کہ اردو ادب میں اس نوع کے معمولی واقعے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے ہزاروں اردو قلم کاروں (اردو داں اور قارئین الگ ہیں) میں خاص نمبر کی پانچ ہزار جلدیں ایک ہی دن میں فروخت ہو جاتیں۔ مگر افسوس کہ اردو سماج میں قارئین کی کم ہوتی ہوئی تعداد میں مفت خوروں کا تناسب زیادہ ہے۔ اور ہر ادیب و شاعر یہ سمجھتا ہے کہ سارے ادبی رسائل و جرائد اسے اعزازی ارسال کئے جائیں کیوں کہ یہ اس کا حق ہے۔ آپ نے پھر بھی خاص نمبر کے لئے اپنی للک کا، اپنے اشتیاق کا موثر اظہار کیا اور طویل ترین فاصلوں سے ان امکانات و مسائل پر بات کی جو ہمیں درپیش ہیں۔

ہم آپ کو خاص نمبر ارسال کرنا چاہتے تھے اور سوچ رہے تھے کہ بھاری ڈاک خرچ کو کس کھاتے میں رکھا جائے کہ اتنی بڑی رقم بوجھ نہ معلوم ہو۔ اردو کی نئی بستیوں کے لئے ہم عصر اردو ادب نمبر خاصی بڑی تعداد میں ارسال کیا گیا ہے اور قارئین شاعر نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے ورنہ یہ ممکن نہ ہوتا۔ خاص نمبر کی کوئی جلد اگر کسی کو رقم کی وصولیابی کے بغیر ارسال کی گئی ہے تو اس کے ساتھ ایک خط بھی منسلک کیا گیا ہے اور درخواست کی گئی ہے کہ خاص نمبر کی قیمت عنایت کی جائے۔ (اس کے نتائج پر آئندہ کبھی شاعر میں تفصیل سے لکھا جائے گا) ہم لوگ کاروباری ذہن کے نہیں ہیں لہٰذا بالکل اناڑی ہیں۔ اگر خاص نمبر کے لئے بہت زیادہ مقروض نہ ہوتے تو شاید 'اقبال نمبر' کی طرح ہم عصر اردو ادب نمبر کی ہزاروں جلدیں اب تک تقسیم ہو چکی ہوتیں۔ آپ کو ہم عصر اردو ادب نمبر بھاری ڈاک خرچ کے

ساتھ ارسال کیا گیا تھا اور اب آپ کے خط کی اشاعت سے ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں کے ان قارئین شاعر کے لئے جواز رہے گا جو اب بھی اس انتظار میں ہیں کہ ''ہم عصر اردو ادب نمبر'' انھیں اعزازی دیا جائے گا۔ اسی لئے آپ کے خط کی اشاعت اور اپنی صراحت کو ضروری سمجھا گیا۔ ہندوستان میں آپ کے چاہنے والوں، عقیدت مندوں اور دوستوں کی کمی نہیں۔ خود کالی داس گپتا رضا صاحب (جنہوں نے خاص نمبر کی کئی جلدیں خریدی ہیں) آپ کے لئے کہہ چکے تھے۔ اگر ہم خاص نمبر آپ کو نہ بھجواتے تو رضا صاحب بھجوا دیتے۔ آپ نے خط میں جس حادثے کا ذکر کیا ہے اور اب اگست ۹۹ء میں آپ ہندوستان آرہے ہیں تو یہ دونوں اطلاعات بے شمار قارئین شاعر کے لئے ہیں۔ لوگوں کے علم میں یہ بات آجائے کہ آپ تشریف لا رہے ہیں۔ طلبائے زبان و ادب آپ سے استفادے کے لئے قبل از وقت اپنا پروگرام بنا سکیں گے۔

اب میں آپ کے دوسرے خط محررہ ۵ر فروری ۹۹ء کے بعض دیگر امور کے حوالے سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ شاعر پر یہ آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے اپنا مالی نقصان برداشت کرتے ہوئے 'تذکرۂ ماہ و سال' پر اپنا گرانقدر مقالہ مرحمت فرمایا اور اس کی اشاعت کا صبر آزما طویل انتظار بھی برداشت کیا۔ اس سے قبل بھی آپ اپنے خطوں میں سرکاری ادبی رسائل سے ملنے والے معاوضے کا ذکر کر چکے ہیں۔ سرکاری ادبی رسائل سے ہزار دیڑھ ہزار کا معاوضہ بھی بہت معمولی ہے، کم از کم آپ ایسے نہایت ہی معتبر اور قابلِ قدر ادیب کے لئے سرکاری مدیرانِ رسائل کی 'جیب خاص' سے تو یہ معاوضہ جاتا نہیں۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور پوری اردو دنیا جانتی ہے کہ غیر تجارتی ذاتی نوعیت کے خالص ادبی رسائل کا شائع ہونا بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔ کم از کم رسالہ شاعر کے لئے تو یہ کہا ہی جا سکتا ہے۔ آپ نے مکرر ایک پرانی بات کا اعادہ کیا ہے اور پورے حساب کتاب کے ساتھ کیا ہے تو اندازہ ہو رہا ہے کہ 'ہم عصر اردو ادب نمبر' میں مضمون کی اشاعت سے خوشی کم اور ملال زیادہ ہے کہ آپ اپنے مضمون کا بھرپور معاوضہ حاصل نہیں کر سکے حالانکہ اب اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ خاص نمبر کے لئے آپ کا اشتیاق اور ہماری خواہش کے تقاضے کچھ اور تھے۔ بصد ادب و احترام عرض ہے کہ اگر آپ اب بھی معاوضے کے ملال میں ہیں تو 'ہم عصر اردو ادب نمبر' کے لئے کسی قیمت وغیرہ کا انتظام نہ کیجئے گا۔ اپنے حساب کتاب کے جس خانے میں بھی آپ خاص نمبر کو جگہ دینا چاہیں، دیجئے گا۔ ہم فقیروں کے لئے آپ کی دعائیں ہی کافی ہیں جو آپ نے خاص نمبر کو دیکھنے کے بعد بے اختیار ہمیں دی ہیں۔

آپ کے خط کا جو تھا پیراگراف بحث طلب ہے۔ اسے آپ کی 'ذاتی رائے' کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اس پر مکالمہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ آپ کے ایک فقرے 'اتنی محنت کی کیا ضرورت تھی' کو عنوان دے کر ایک بھرپور مضمون لکھا جا سکتا ہے کیوں کہ آج بغیر محنت کئے ہی بہت سارے ادیب و شاعر اور نقاد حضرات کامیاب ہیں۔ آج اردو والوں کا جو مزاج بن گیا ہے اس میں کسی بڑے، نئے، مختلف، منفرد اور انوکھے کام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بدترین ادبی صورتِ حال میں واقعی اتنی محنت کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ مگر آپ کے سوال کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ شاعر کی اپنی ستر سالہ روایت بن گئی ہے اور ہمیں اپنی اس روایت کو کہیں بھی کمزور نہیں ہونے دینا ہے۔ اس روایت کی تاریخ کو مسلسل روشن کئے رکھنا ہے۔ ہم اب اپنی آئندہ نسلوں کیلئے جواب دہ ہیں۔ اپنے اسلاف کے امین ہیں ہم۔ تو کیا بغیر محنت کئے کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں؟ آپ ہی کی طرح کچھ اور لوگوں نے بھی یہی سوال کیا ہے کہ ہم نے اتنی محنت کیوں کی۔ ہمیں آپ کے یا کسی اور کے اس سوال پر کوئی حیرت نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف نے غیر معمولی محنت کی تھی اور ہم اپنے اسلاف کے پیروکار ہیں۔ ان ہی کے اسم سے روشن ہیں۔ محنت ہمارا مزاج ہے۔ لوگ اگر سمجھیں تو بہت کچھ اور نہ سمجھیں تو کچھ بھی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ:

رائیگاں ہوتے ہوئے پل رائیگاں ہوتا ہوا میں

ادبی رسائل کے خاص نمبروں کی اپنی ایک بندھی ٹکی روایت رہی ہے۔ سیدھے سیدھے تخلیقات کی جمع آوری کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ محض اپنی ضخامت سے مرعوب کرنے والے نمبروں کی میکانکی ترتیب و تہذیب کو شاعر کے خاص نمبروں کی تخلیقی ترتیب و تہذیب سے توڑنے اور بکھیرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر میں بھانت بھانت کا ایسا مواد نہیں ہے کہ اس کا کوئی تشخص ہی نہ بن پائے جبکہ ہر باب اپنے آپ میں ایک مکمل کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ شاعر کے موضوعاتی خاص نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ کرشن چندر نمبر، ناولٹ نمبر، ڈرامہ نمبر، افسانہ نمبر، غالب نمبر، گاندھی نمبر، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر، ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام، قومی یکجہتی نمبر، جمہوریت نمبر، اقبال نمبر وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے خاص نمبر آپ کے علم میں ہوں گے۔ اب اور بھی کئی موضوعاتی ضخیم خاص نمبر زیر غور ہیں (۲۰ویں صدی کا اردو ادب وغیرہ) ہم تجربہ پسند ہیں۔ شاعر کے عام شماروں میں نت نئے تخلیقی تجربے بکھرے پڑے ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر بتدریج ہی اپنے قاری پر منکشف ہوگا اور مکالمہ کرے گا۔ آپ کے خطوں کا تسلسل بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آپ اپنے میں کسی معیاری لائبریری سے کم نہیں۔ خاص نمبر ابھی آپ کے مطالعے میں ہے، اور اسے بہ نظر اصلاح ہی دیکھنا ہے۔ خاص نمبر کا کاغذ اعلیٰ درجے کا ہو سکتا تھا اگر تعداد اشاعت پانچسو، سات سو ہوتی۔ نمبر میں جو کاغذ استعمال ہوا ہے وہ بھی ہمارے بجٹ سے باہر کا ہے۔ آرٹ پیپر کے دام ہمارے وسائل میں نہیں آتے۔ رسالہ ضخیم ہو گیا ہے اس کا ہمیں احساس ہے۔ اگلی دو جلدوں کی ضخامت جلد اوّل سے کم ہوگی۔ جلد اول کی کئی جلدیں بن سکتی تھیں۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے کمال ہنر مندی سے جلد اول کے کئی حصے بنا لئے ہیں۔ مگر یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہم اگر ایسا کرتے تو کام بہت بڑھ جاتا اور شاید اب تک سمت بھی نہیں پاتا۔ دعا کیجئے گا کہ اگلی دونوں جلدیں صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے جلد اول کے مقابلے زیادہ معیاری اور وقیع ہوں اور ہم اپنی محنتوں میں سرخرو ہو سکیں۔

میں نے آگرہ اسکول قائم نہیں کیا ہے کہ اس کے ستی مشکور ہونے نہ ہونے کے بارے میں سوچا جائے۔ آگرہ اسکول کے قیام کو تو ایک صدی ہوا چاہتی ہے۔ اسے

علامہ سیماب نے قائم کیا تھا۔ شاعر اس کا نمائندہ ہے اور اپنی عمر کے سترویں سال میں ہے۔ سیماب نے اپنے ادبی رجحانات و نظریوں کا اپنی نثر و نظم کے ذریعے مسلسل اظہار کیا ہے۔ ان کے خطبات، ان کے مضامین، ان کی اصلاحیں۔ بہ حیثیت ایک شخص کے اگر انھوں نے کسی دبستان کا تصور دیا ہے تو اس کے لئے کوششیں بھی کی ہیں۔ اپنے ادبی رسائل جاری کئے ہیں۔ اپنے تلامذہ کی اپنے 'نصب العین' کے تحت تربیت کی ہے۔ ماہنامہ شاعر، سیماب کے نصب العین کا آئینہ دار ہے۔ قبلہ اعجاز صدیقی نے ۱۹۷۷ء (م: ۱۹۷۸ء) تک اسی نصب العین کے تحت شاعر کو جاری رکھا اور اب تیسری نسل سیماب و اعجاز کے کاروافکار کو ۲۱ویں صدی میں لے جارہی ہے۔ راقم الحروف نے اپنی معمولی شاعری کو سیماب کے شعری و فنی معیارات میں تخلیق کرنے کی سعی کی ہے۔ برادر خورد حامد اقبال صدیقی نے بھی اپنی کلاسکی روایت کے ساتھ سیماب و اعجاز ہی کو اپنا فنی معیار بنایا ہے۔ علامہ کے بے شمار تلامذہ سے حامد اقبال صدیقی تک اور ان کے بعد بھی ذہنوں کی آبیاری کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ دہلی اور لکھنو کے دبستانوں کی طرح یہ کوئی مفروضہ دبستان نہیں ہے۔ یہ وہ عملی روپ ہے جس پر نہ جانے کیوں توجہ نہیں کی گئی، بحث نہیں کی گئی۔ آپ بتائیے کہ کوئی دبستان کس طرح تشکیل پاتا ہے اور نام حاصل کرتا ہے؟ آپ کو دبستانِ دہلی ایک غیر حقیقی مفروضہ معلوم ہوتا ہے مگر یہی بات 'دبستانِ لکھنو' کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے۔ علامہ سیماب کے کاروافکار کا بھرپور تنقیدی و تحقیقی جائزہ ہی کب لیا گیا کہ اگر و اسکول یا دبستانِ سیماب پر کوئی مکالمہ ہو سکے۔ ویسے اب سیماب کی بازیافت ہو رہی ہے اور سب کچھ فطری طور پر ہو رہا ہے۔ ابھی ذرا وقت لگے گا کیوں کہ ایسے ناقدین و محققین کی کمی نہیں جو بہت آسانی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شاعر سب سے بڑا ہے، فلاں ادیب عظیم ہے۔ فلاں شاعر، فلاں شاعر کے بعد سب سے بڑا ہے۔ ابھی اردو کے بقراطی نقاد اور محققین اس نوع کے غیر معیاری جملوں سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

دہلی یا لکھنو کے دبستان ہوں یا آج کا کوئی نیا مفروضہ دبستان، کسی فرد واحد نے شعوری طور پر اتنا اور ایسا وقیع کام اسکول یا دبستان کے قیام کے لئے نہیں کیا جیسا کہ سیماب نے کیا۔ اس پر بحث ہونی چاہیے تاکہ جو لوگ اپنے آپ میں واقعی انجمن ہیں، نابغہ روزگار ہیں، اپنے کاروافکار سے نسلوں کو متاثر کر رہے ہیں، اپنے اثرات مرتب کر رہے ہیں، ان کو اسکول یا دبستان کہا جاسکے۔ جو دو مفروضہ ادبی اسکول ہیں وہ یا تو سرے سے رد ہو جائیں یا مفروضہ نہ رہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کی دوسری جلد میں دبستان سیماب پر کچھ اور مباحث شامل کئے جارہے ہیں۔ فی الحال اس طویل جوابیہ میں کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ آپ سے مکرر التماس ہے کہ 'اسکول یا دبستان' کو موضوع بناتے ہوئے دلائل کے ساتھ کوئی مقالہ یا کتاب لکھیے تاکہ اردو میں بھی دوسری زبانوں اور فنون کی طرح اسکول یا دبستانوں کا تصور بن سکے۔

سوانحی لغت اور شاعر ڈائرکٹری ایک مستقل نوعیت کا جاری کام ہے۔ خاص نمبر کی اگلی دو جلدوں میں بھی یہ باب شامل رہیں گے اور علاحدہ سے سوانحی لغت اور شاعر ڈائرکٹری بھی شائع کی جائے گی۔ شاعر ڈائرکٹری کے ضمن میں بعض لوگوں کو مغالطہ ہو رہا ہے۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے جبکہ مذکورہ باب کے اوراق شذرات میں واضح کر دیا گیا ہے کہ شاعر ڈائرکٹری میں صرف ان ہی قلم کاروں کے پتے اور فون نمبر شامل کئے گئے ہیں جو پہلی جلد میں شریک ہیں۔ دوسری اور تیسری جلد میں بھی یہی التزام رہے گا۔ جب یہ ڈائرکٹری مکمل شائع ہو گی تو تینوں جلدوں کے قلم کاروں کے ساتھ پوری اردو دنیا کے ان قلم کاروں کی سمائی بھی ممکن ہو سکے گی جو خاص نمبر کی تینوں جلدوں میں شامل ہونے سے رہ جائیں گے۔ اس وقت مکمل ڈائرکٹری پر ہر طرح کی بحث ممکن ہو سکے گی۔ اب معلوم نہیں کہ آپ کو کس کا پتہ درکار تھا؟ وہ 'الف تا س' کے تحت تھا یا نہیں اور یہ کہ اس کی کوئی تخلیق خاص نمبر میں شامل تھی بھی یا نہیں کیا آپ مجھے بتانے کی زحمت فرمائیں گے؟ یقیناً شاعر ڈائرکٹری تمام اردو قلم کاروں کی بنیادی ضرورت ہے اور ہم یہ کام جلد مکمل کریں گے جبکہ یہ کام اداروں اور اشخاص کے کرنے کے ہیں۔ ہم نے مگر کام کا آغاز کر دیا ہے اس کا عملی روپ ہم عصر اردو ادب نمبر میں ہے اور دوسری جلد کے بعد مکمل ڈائرکٹری بھی آجائے گی۔

آنجہانی مالک رام کا تذکرہ ماہ و سال یقیناً ایک غیر معمولی تحقیقی کام ہے جس میں بہت ساری اغلاط راہ پاگئی ہیں۔ اس میں ترمیمات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ محترم کالی داس گپتا رضا صاحب کی ترمیمات میں سے زیادہ اہم کو قارئین شاعر کے لئے علاحدہ کر دیا۔ رضا صاحب ہوں محمد اسلم، آپ یا کوئی اور، ترمیمات و اضافوں کا عمل جاری ہے۔ اب بھی کچھ لوگوں نے اتنی ساری ترمیمات کے باوجود یہ بتایا ہے کہ ابھی اس میں بہت ساری اغلاط باقی ہیں۔ گویا تمام کام از سر نو ترتیب چاہتا ہے۔ ہم نے بھی 'سوانحی لغت' کا کام شروع کیا ہے اور کوشش ہے کہ شاعر کی تینوں جلدوں سے الگ ایک مکمل سوانحی لغت شائع کی جائے جس میں مالک رام صاحب کے کام کو بھی سمیٹ لیا جائے۔ کرنے کے کام تو بہت ہیں، مگر کون کرے۔ تذکرہ ماہ و سال کی اشاعت کو اتنے سال ہو گئے لیکن اس کا تصحیح شدہ ایڈیشن اب تک شائع نہیں ہوا۔ صوبوں صوبوں اردو اکاڈمی اور اردو اداروں نے اپنے اپنے صوبے کی حد تک بھی اس طرح کے حوالہ جاتی کام نہیں کئے۔ بہر حال! ہم بساط بھر اپنا کام کر رہے ہیں اور ہمیں آپ ایسے دانشور بزرگوں کی رہنمائی اور دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آج ادبی رسائل کی کوئی قدر و منزلت نہیں اور شاعر کے کتنے ہی اہم اور بڑے خاص نمبر شائع ہو جائیں، شاعر کسی انعام یا اعزاز کا مستحق نہیں ٹھہرے گا ورنہ تو شاعر کے اقبال نمبر کو جہاں عوامی پذیرائی حاصل ہوئی تھی وہیں خواص کی 'داد' کا عملی روپ کچھ اور ہی تھا۔ البتہ پاکستان کے ادبی حلقوں سے یہ آواز ضرور ابھری تھی کہ "حکومتِ پاکستان کو چاہیے کہ افتخار امام کو ستارۂ امتیاز تفویض کیا جائے۔" ظاہر ہے کہ شاعر ایک رسالہ ہی تو ہے کوئی شخصیت یا کتاب نہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کو عوامی پذیرائی مل رہی ہے خواص بھی پسند کر رہے ہیں لیکن یہ خاص نمبر اگر واقعی کوئی ادبی و تاریخی کارنامہ ہے تو پھر داد و پسند کا اسلوب بھی غیر معمولی اور انوکھا ہونا چاہیے۔ ایسا ہو گا یا نہیں اس سے قطع نظر ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے اور کئے جانا ہے۔

اور آخر میں نہایت ہی بصد احترام کہ مجھے اپنی کسی بات پر اصرار نہیں اور آپ کی کسی بھی بات سے اختلاف نہیں۔ کہیں کوئی جملہ آپ کے مزاج کے خلاف ہو تو معاف فرمائیے گا۔ من آنم کہ من دانم۔ ——— افتخار امام صدیقی



اردو غزل۔ بہ حیثیت صنف؟

ڈاکٹر [illegible]

"شاعر" بمبئی شارہ نومبر ۱۹۹۸ء کے اداریہ میں "غزل اکادمی" کے تعلق سے جو اہم تجاویز پیش کی گئی ہیں، وہ نمائشی کاغذی، تقریری اور کچھ علمی سطح پر جوش و خروش کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں اور اُن کا لائحہ عمل شرمندہ ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ خواب پورے ہو سکیں گے۔ "تری زلف کے سر ہونے" کا مسئلہ ہے۔ قطع نظر اس سے، غزل پر صنف کی حیثیت سے بحث کرنا، ماضی کے بجائے حال اور مستقبل کو ذہن میں رکھ کر سوچنا کہ ہم غزل میں کیا کہہ رہے ہیں؟ اور غزل نے زبان کا کیا د فائع کیا ہے؟ وغیرہ پر صاف صاف بات ہونی چاہیے۔ غزل کی صنف کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ فارسی روایت کے تحت وہی منفرد موضوعات پر شعر، دو مصرعے، ردیف و قوافی، مطلع، مقطع اور تخلص۔ ان کے علاوہ غزل کی صنفی حیثیت مزید کیا ہے؟ اور اس کے کیا مسائل ہو سکتے ہیں؟۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ غزلوں کی بحور پر ہندی وغیرہ اوزان کو لے کر آپ زبردستی کچھ بحث کر لیجئے۔ لیکن اردو غزل کے بنیادی مزاج سے یہ ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں۔

ماضی سے بے تعلق ہو کر حال اور مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچنا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟۔ اداریہ کا یہ جملہ معنی خیز بھی ہے، پیچیدہ بھی اور گھوم پھر کر ہمارے ذہن کو غزل کی صنفی قیود سے ہٹ کر پھر غزل کی اندرونی اور اشاراتی معنویت پر مرکوز کر رہا ہے۔ ماضی کی غزل سے روگردانی کیوں؟۔ کیا آج کا نقاد جس نے ماضی کی فارسی اور اُردو غزل کے معیاری اور کلاسیکی شعراء کے کلام کو جذب کیا ہے، اگر کسی موجودہ غزل گو شاعر پر تنقیدی مضمون لکھنا چاہتا ہے، تو اپنے اندر کے تمام ماضی کے محسوساتی مواد کو بالکل کھرچ کر پھینک دے اور قطعیً "صاف ستھرا" ہو کر حال کے شاعر کی غزل پر "حال" ہی کی روشنی میں بحث کرے؟۔ علاوہ بریں "ماضی" کا تعین کیونکر ہوگا؟۔ آپ ماضی کسے کہیں گے؟ ایک سال، ایک دہائی، ایک صدی، ایک قرن۔ ماضی کی حدیں کہاں تک قائم ہوں گی؟۔ ایلیٹ کے علاوہ ہمارے بہت سے مفکرین نے حال کے اندر ماضی کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین، اختر الایمان، اختر انصاری، جوش، فراق، وزیر آغا اور آج کے اہم نمائندہ ادیبوں اور شاعروں میں کون ماضی سے بیگانہ ہے؟۔ سب کے ادب میں "حال" کے اندر ماضی موجود ہے۔ تو تنقید نگار یا بحث کرنے والا "غزل" کے ماضی سے قطعی الگ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ شعور کی رَو میں حال اور ماضی متوازی چلتے ہیں۔ پریم چند تک نے اپنے افسانوں کے کرداروں کی ذہنی کیفیات کو ماضی کے واقعات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ آج کا شاعر غزل میں "کیا" کہہ رہا ہے؟ اس کی منفرد قدر متعین کرنے میں نقاد کو یہ تو دیکھنا ہی ہوگا کہ اس سے پیشتر زمانے میں کوئی موضوع کس طرح بیان کیا گیا ہے اور "حال" کے شاعر نے کس انداز میں کہا ہے؟

ایک ایک صدی کے بعد ہمیں میر یا غالب وغیرہ کی غزل کیوں یاد آتی ہے؟ ہمارے اکثر نظم گوئی کے دلدادہ تنقید نگار غزل کو ادھوری اور چھوٹی شاعری کہتے ہیں اور نظم کی شاعری کو عظیم سمجھتے ہیں۔ جب اُن سے پوچھا جائے کہ حافظ شیرازی اور غالب کی شاعرانہ عظمت "غزل" کے علاوہ کہاں ہے؟ اور ہم اُنھیں بڑا شاعر تسلیم کرنے پر کیوں مجبور ہیں؟ تو جواب میں خاموشی۔ ابھی چند ماہ پہلے لندن میں "جوش ملیح آبادی سیمینار" منعقد کیا گیا تھا، وہ انگلستان، جس کے متعلق جوش نے اپنی مشہور باغیانہ نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" شائع کی اور انگریزوں کا عتاب سہا۔ اس لندن میں برصغیر اور دیگر ملکوں کے نمائندہ ادیب، شاعر اور دانش ور اپنے اپنے علاقوں سے "اپنے سفر خرچ" سے اردو کی خدمت کے لئے جمع ہوئے (یہ خبر ایک معتبر ادبی پرچے میں شائع ہوئی ہے) "جوش سیمینار" میں جوش کے حوالے سے "غزل" کو برا بھلا کہا گیا اور نظم کو آسمان پر چڑھایا گیا اور ایک محترم نقاد نے (شائع شدہ خبر کے مطابق) اپنی تقریر میں جوش ہی کا ایک لطیفہ کچھ اس طرح بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ جوش کے ایک قریبی شناسا اُن سے ملنے گئے۔ دوران گفتگو جوش اُن سے بے ربط جملوں میں باتیں کرنے لگے۔ اُن کے دوست نے حیران ہو کر کہا حضرت! آج آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں؟ تو جوش نے جواب دیا۔ ارے بھئی، میں "غزل" کہہ رہا ہوں۔ اس لطیفے کا خیر مقدم لندن کے سیمینار مذکور میں تالیوں اور قہقہوں سے کیا گیا!۔ تو یہ ہے ہماری اردو غزل کی قدر و قیمت۔! اور اُس کی "صف" کا حال۔ نقطۂ عروج یہ ہے کہ اسی نمائشی اجتماع میں تالیوں کے درمیان "غزل" کا مشاعرہ بھی ہوا۔ شیکسپیئر کے فن شعر گوئی اور ادبیت کے کمال کو سمجھنے کے لئے شیکسپیئر ہی کے ملک میں تالیوں سے محظوظ ہونے کی جرأت آج بھی وہاں کے لوگوں کو نہ ہوگی۔!! اسٹیج پر تقریر، بحث و مباحثہ یا تماشا (ڈرامہ) ہی ہو سکتا ہے۔ علم و ادب کی تفہیم نہیں۔ یہ مطالعہ اور تحریر کی محتاج ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ اردو غزل کی صنف کے دو متوازن وزن والے مصرعوں میں کمی بیشی کرنے کے تجربات ہمارے شاعروں کے بس میں نہ رہے ہوں۔ انھوں نے "آزاد غزل" کی اصطلاح وضع کی اور ببانگ دُہل آزاد غزلوں کا انبار لگا کر دکھا دیا۔ اُس کے ڈھیر سے شعری مجموعے سامنے آگئے۔ لیکن جب آزاد غزل کی مثبت قدرً سوال اُٹھا، تو وزن بھی غائب، اور آزاد غزل کے موضوعات بھی بے آہنگ ثابت ہوئے۔ "شاعر" بمبئی ہی نے خصوصی نمبر شائع کیا اور اس سے واضح بھی ہو گیا کہ "غزل" کے اشعار چھوٹے بڑے مصرعوں کی بے ترتیب روش کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن آزاد غزل کے موجد اور اس تجربے کو مقبولیت کے درجے تک پہنچانے کے لئے آج بھی درپردہ کچھ شعراء کوشش میں مصروف ہیں۔ نام کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں یہاں ایک ادبی پرچے کے مطبوعہ انٹرویو سے ایک سوال اور اسُ جواب پیش کر رہا ہوں جو دو ادیبوں کے درمیان کا ہے۔

سوال۔ آج آزاد غزل مقبولیت کے زینے پھلانگتی جا رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آزاد غزلوں کے کتنے ہی مجموعے آگئے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ شعراء نے اب تک اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ دو یونیورسٹیوں میں آزاد غزل پر پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹریشن بھی ہو چکا ہے۔ اس صنف کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔ آپ نے ابھی تک آزاد غزل میں تجربہ کیوں نہیں کیا؟

جواب۔ آزاد غزل کے بارے میں میری رائے کو آپ "شاعر" کے خاص شمارے "نثری نظم اور آزاد غزل نمبر" میں پڑھ چکے ہوں گے۔ میں اپنے موقف پر قائم ہوں اور پابند غزل کے موجودہ معیار اور نئے آہنگ و حسن کے سامنے آزاد غزل کے وجود کا کوئی جواز مجھے نظر نہیں آتا۔ دوسری چیزوں کے مثل ادب میں بھی حجم کی نہیں، وزن کی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو میں "سانیٹ" کو کیا درجہ دیا ہے؟ اور آج اس صنف کے کتنے پیروکار ہیں؟ جبکہ اس پر تحقیقی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ آزاد غزلوں کے سیکڑوں مجموعے محض حجم ہیں۔ ذرا وقت گزر جانے دیجئے۔ جب صاحبانِ نظر آزاد غزلوں کا "وزن" تلاش کریں گے تو خود بخود اس کی حیثیت مسلّم ہو جائے گی۔ رہا آپ کے سوال کا آخری حصہ کہ میں نے آزاد غزل میں تجربہ کیوں نہیں کیا؟ تو عرض ہے کہ جس دن واقعی میں اپنے داخلی محسوسات کو پیمانۂ غزل سے باہر سمجھوں گا تو میں نظم کہوں گا۔ آزاد غزل ہی کیوں؟ محض تجربہ کرنے کا مجھے شوق نہیں ہے۔" (مطبوعہ "جدید ادب" کراچی ۱۹۸۶ء)

ج بارہ تیرہ سال کے بعد آزاد غزل کہاں ہے؟۔ اہل ادب اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غزل کی خارجی ہیئت کے پیشِ نظر آپ طویل غزل گوئی اور غزلِ مسلسل پر بحث کر سکتے ں۔ فراقؔ وغیرہ چند شعراء نے طویل غزلیں کہیں۔ جوش ملیح آبادی جنھوں نے اپنے لطیفے میں غزل کا مذاق اڑایا، اکثر اپنی نظمیں غزل کی پابند شکل میں برابر کہتے رہے۔

ماضی کی غزل سے ہٹ کر آج غزل میں کیا کہا جا رہا ہے اور غزل نے اردو زبان کا کس طرح دفاع کیا ہے؟۔ اس پر وضاحت کے ساتھ بات ہو سکتی ہے۔ ادھر دو ہائیوں کے اندر ہند و پاک کے ادبی رسائل میں جو غزلیں ہمارے سامنے آئی ہیں اُن کے موضوعات پر اگر ہم ایمانداری اور سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو صاف معلوم ز گا کہ غزل کا دو تہائی حصہ نہایت پھیکا بے رنگ و روح اور محض یکسانیت اور تکرار سے پُر ہے۔ عموماً شعراء بسیار نویسی میں مبتلا ہیں۔ غزل کی صنف میں سب سے بڑی رابی یہی ہے کہ معمولی شاعر بھی چند بندھے ٹکے زمانے کے حالیہ اور مروّجہ موضوعات کے سہارے ردیف اور قوافی کی تبدیلیوں سے بہت کم وقت میں "غزل" بنا لیتا ہے۔ آپ ان غزلوں کے اشعار کو پڑھتے جائیے۔ کہیں ذہن اور نظر میں لفظوں کے پیچھے کسی "فکر" کا عنصر نہیں جھلکتا۔ کوئی استعارہ، رمزیہ کیفیت اور اشاراتی بلاغت ر دور نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کا یہ غزل گو شاعر ہمیں "اخباری اطلاعات" یا واقعاتی بیانات سنا رہا ہے۔ غزلیت اور تغزل کا فقدان ہے۔ جمالیات سے ذہن زار ہے۔ علم، مشاہدہ اور احساس کے دائرے سکڑے ہوئے ہیں۔ بس ایک طرح کے الفاظ کی بھرمار ہے جو شاعر کی ذہنی کم مائیگی کی غماز نظر آتی ہے۔ سیکڑوں موسمی سالے طلوع ہوتے ہیں، ڈوبتے ہیں۔ معیاری رسائل کے مدیر حضرات عاجز ہیں کہ اس نئی نسل کی غزل گوئی کے سیلاب کو کہاں سمیٹیں۔ کیا انتخاب کریں۔ ہر شاعر بہ عم خود اعلیٰ غزل گوئی کا دعوے دار ہے۔ اس طوفان میں سنجیدہ اور معیاری غزل غوطے کھا رہی ہے اور نظر انداز ہوتی جاتی ہے۔ ٹھیٹھ ہندی اور علاقائی بولیوں اور لوک بان کے عوامی الفاظ کو محض نئے پن کی خاطر اوپری سطح پر برتا جا رہا ہے۔ آج کا معمولی شاعر اپنی "انا" کے اظہار میں بیتاب ہے۔ "بونے" انسانوں کی بستی میں اسے اپنے قد" کو بلند ثابت کرنے کی فکر ہے۔ امیر شہر اور دستار فضیلت کا ذکر ہے۔ وغیرہ۔ مستند اور نئے معیاری غزل گو شعراء تک اپنی غزلوں میں اچھے خاصے اشعار کے رمیان ایک دو شعر ایسے کہنے کو مضطرب رہتے ہیں جن سے ظاہر ہو کہ موصوف کی غزل بہت انوکھی ہے۔ کچھ جدید شاعر اشعار کے بعد پرانی روش کے انداز میں قطعہ ند اشعار کہنے کے شوقین معلوم ہوتے ہیں، جن میں بے ثباتیٔ دنیا وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے یا موت اور فنا کے موضوعات ہوتے ہیں۔ کچھ اشعار اسلامی تصورات کو کسی لامتی یا استعاراتی زاویوں کے بغیر نہایت سادہ زبان میں غزل کا حصہ بناتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ غرضیکہ موجودہ غزل اپنی صنفی اور معنوی تلاش میں اصل جمالیاتی اور مزیہ طریقۂ کار کو بھولتی جا رہی ہے۔ شاید فی زمانہ دس فیصدی شعراء اس کا خیال رکھتے ہوں۔

اردو غزل نے "زبان" کا کیا دفاع کیا ہے؟۔ اس پر کچھ کہنے سے پہلے ہمیں اپنے ذہن میں یہ ضرور رکھنا ہوگا کہ "ادب کی تخلیقی زبان" اور عام کاروباری اور گلی وچوں کی زبان میں کیا فرق ہے؟۔ اور اردو غزل نے بقول مولانا حالی موسیقی (جسے آجکل "گائیکی" کی اصطلاح میں عام کر دیا گیا ہے) کی آمیزش سے طوائفوں، قوالوں ذر سماع کی محفلوں میں جو جادو جگائے گئے ہیں اور اب فلمی گانوں اور ٹی۔ وی وغیرہ پر جو زبان ہماری نئی نسل کے ذہنوں میں گھر کرتی جا رہی ہے۔ اس میں غزل کی معنویت حقیقی کمال کس حد تک ہے اور محض "چہرۂ زیبا" کی نمائش، اداکاری، اور خوش الحانی کی کرامت کہاں تک ہے؟۔ اب اس عمل سے اردو غزل جس "زبان" کا دفاع کرتی معلوم ہوتی ہے اس کی بنیاد ادبی معنویت پر قائم ہے یا نغمے، موسیقی، اداکاری اور چہروں کی خوبصورتی پر۔ اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اقبال کی اس مشہور غزل کو۔ "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں ——— کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں" بھی جب فلمی موسیقار حسین و نوجوان عورتوں پر مشتمل قوالی کی "موسیقی" میں پیش کر کے سامعین اور ناظرین کو محظوظ کر سکتے ہیں، تو اس غزل سے "زبان" کا کتنا دفاع ہوگا؟ یہ مسئلہ بہت اہم ہے "حقیقتِ منتظر" "لباسِ مجاز" "سجدے" "جبینِ نیاز" "غزنوی کی تڑپ" "زلفِ ایاز کا خم" "صنم آشنا" وغیرہ غزلیہ الفاظ کے پس پردہ معنوی اور شعری علامتوں کو کتنا سمجھا جا سکتا ہے؟ اور لون سمجھتا ہے؟ اور غزل کے ذریعہ کس "زبان" کا دفاع ہو سکتا ہے، یہ سوال اپنی جگہ قائم رہے گا!۔ "تصوف" کی آڑ میں ہمارے مشائخ نے وجد و رقص کے معاملات سے خسروؔ کی غزل "سکھی! پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں برہ کی رتیاں" وغیرہ کے ذریعہ اس اردو ہندیت کی زبان کا کتنا دفاع کیا ہے؟ یہ بھی غور طلب ہے!

● Near Old City Post Office Pakaria, Pilibhit - 262001 (U.P.)

○ غزل اکاڈمی یا غزل سے متعلق ہمارے اداریوں پر جو مکالمہ قائم ہو رہا ہے اس سے بیشتر حضرات ہم سے متفق تو ہیں لیکن عمومی طور پر گھوم پھر کر تمام بحثیں وہی روایتی، کتابی اور علمی و ادبی نوعیت کی ہو رہی ہیں جبکہ ہمارا عندیہ ہرگز یہ نہیں ہے۔ ہماری گفتگو کا تعلق ان مباحث سے ہے ہی نہیں جو اردو غزل کی ایک صدی کی تنقید ہے۔ معاصر اردو غزل کے بارے میں "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تحت شاعری میں طویل ترین بحثیں ہو چکی ہیں اور اب ہم عصر اردو ادب نمبر کی دوسری جلد میں اس طویل تاریخی بحث کو ایک نیا موڑ دیا جائے گا۔ ہمارے اداریوں کا عندیہ تو کاغذ سے باہر اس صورتِ حال سے متعلق ہے جو ہندوستان کی ثقافتی اور عوامی سطحوں سے ابھر رہی ہے۔ کاغذ پر آپ اردو زبان کے لئے صنفِ غزل کے لئے چاہے جس طرح کی بحثیں کر لیں۔ اپنے موقف میں کتنے ہی منطقی اور بقراطی ہو جائیں اس سے ہماری مشترکہ ثقافت اور اس کے عوامی اسلوب پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ادب کی تخلیقی زبان، معیاری زبان، معیاری غزل، کلاسیکی شاعری، غزل کی معنویت کا حقیقی کمال وغیرہ ان تمام مباحث کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ۔ غزل پر علمی و ادبی مکالمہ بھی ختم نہیں ہوگا۔ مکالمہ قائم ہوتے رہنا چاہیے۔ اس کے لئے نقادوں کی کمی نہیں، رسائل و جرائد بھی ہیں۔ ہم تو غزل کی اس حیثیت پر گفتگو کر رہے ہیں جو الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے فلم، ٹی وی، غزل گائیکی، آڈیو، ویڈیو، سی ڈی سے جڑی ہوئی ہے۔ عوامی سطح پر اردو اور غزل یا غزل اور اردو کا جو رشتہ ابھی باقی ہے اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا ہے اس کا استعمال کرنا ہے۔ اسی کو تحریک بنانا ہے۔ اب تو انٹرنیٹ پر پوری دنیا سمٹ آئی ہے۔ زندگی کا ہر عملی شعبہ انٹرنیٹ سے جڑ گیا ہے۔ فنونِ لطیفہ بھی انٹرنیٹ سے جڑ گیا ہے۔ مذاہب عالم کی ساری سرگرمیاں انٹرنیٹ پر آگئی ہیں تو اس انٹرنیٹ سے اردو اور غزل کے لئے بھی موثر کام لیا جا سکتا ہے۔ موسیقی سے جڑی ہوئی غزل تو اب پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ یہاں تو رسم الخط کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور ہم کتابی بحثوں میں بقراطی ہوئے جا رہے ہیں۔ مجال کیا کہ آسمانی سطح کے معیار سے ایک سو بھی ادھر ادھر ہو جائیں۔ یہ جو اردو اور غزل کا عوام و خواص سے رشتہ رہ گیا ہے یہ بھی غنیمت ہے اور اسی غنیمت کو ہمیں غنیمت جان کر غزل کو بنیاد بناتے ہوئے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے لئے کام کرنا ہے۔ معیار کے چکر میں اردو اور غزل کی موجودہ عوامی حیثیت کو بھی اگر ہم نے گم کر دیا تو....

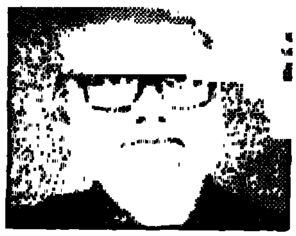
کتابوں رسالوں سے باہر اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں غزل اور عوامی سطح پر غزل جس روپ میں بھی رواں دواں ہے اسے تو قبول کرنا ہی پڑے گا۔ (الف الف) ●

بقیہ صفحہ ۳۳: ردّ مابعد جدیدیت

ہیں جن کے بغیر اردو شعر و ادب کی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ کیا آج اٹھارہ سالوں بعد (۸۰ء کے بعد) بھی مابعد جدیدیت کے نام پر ہر صنف سے صرف پانچ شاعروں / افسانہ نگاروں / ڈرامانگاروں / ادیبوں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں جنھوں نے کم از کم اپنے آپ کو صرف معروف ہی کرایا ہو؟ ترقی پسندوں کے علاوہ جدیدیت، وجودیت، تجریدیت یا لایعنیت وغیرہ کی تعریفیں سب کو معلوم ہیں جو نسبتاً بہت کم عرصے میں متعین کی جا چکی تھیں لیکن اٹھارہ سالوں کی طویل مدت کے باوجود مابعد جدیدیت کی تعریف کس کو معلوم ہے؟ تب شاید یہ کہا جائے کہ مابعد جدیدیت ابھی پیدا ہی ہو رہی ہے، لیکن خاکسار عرض کیا چاہتا ہے کہ مابعد جدیدیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ اگر جدیدیت کے بعد کوئی چیز پیدا ہو سکتی ہے تو وہ صرف خود افکاریت و خود شعاریت ہے جو جدیدیت سے پہلے بھی پیدا ہوتی رہی ہے اور ہمیشہ پیدا ہوتی رہے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ فنکار کا خود افکار ہونا یا خود شعار ہونا۔ خود آہنگ یا خود اسلوب ہونا کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ نہ یہ چیز عیار ادبی سیاست پیدا کر سکتی ہے، نہ یہ گنتی کے دنوں میں پیدا ہوتی ہے، نہ یہ نقچیوں کے ہاتھ آتی ہے اور نہ ہی یہ ڈھنڈورچیوں کے سر میں سماپاتی ہے۔ کبھی کبھی خالص خود شعاریت سے گھبرا کر کچھ لوگ بوکھلاہٹ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہماری پہچان یہ ہے کہ ہم ترقی پسند بھی ہیں اور جدیدیے بھی۔ یعنی روایت کی ٹوپی، ترقی پسندوں کی قمیض اور جدیدیوں کا پاجامہ پہن کر کچھ لوگ "مابعد جدید" ہوا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کے لئے اطلاعاً عرض ہے کہ ان سے پہلے ہی یہ کام بھی بہت ہو چکا ہے، حقیقت پسندوں کے عہد میں، ترقی پسندوں کے درمیان اور خود جدیدیوں کے بیچ بھی بہت سے ایسے ادباء و شعراء موجود رہے ہیں، جن کے یہاں کسی خاص پکوان کی بجائے یہی ملی جلی کھچڑی خوب خوب پکائی جاتی رہی ہے۔ سو مابعد جدیدیوں کے یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ وجود کی سطح پر مابعد جدیدیت بے اصل و بے حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ ایسے میں خود افکاریت و خود شعاریت کے سوا نو واردانِ ادب کے پاس دوسرا کوئی بدل نہیں جس کے ذریعے وہ خود کو مختلف و منفرد ثابت کر سکیں۔ مگر خود افکاریت و خود شعاریت کے بارے میں پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ شئے سہل الحصول نہیں ہے۔ اس کی بحث میں اپنے ایک دوسرے مقالے میں اٹھاؤں گا۔ فی الوقت اپنے ہم عصروں کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ اپنی شناخت یا اپنے مرتبہ و مقام کے لئے صرف منفرد ہونا ہی شرط نہیں ہے۔ یہ اتفاقی چیز ہے یا اس کی اپنی اہمیت ہے اور بس! ورنہ وہ لوگ جنھوں نے ادبی سیاست، گروپ بندی یا خیمہ سازی سے الگ رہ کر سنجیدگی کے ساتھ ادبی خدمات انجام دیں یا بہترین ادب تخلیق کیا تو کیا وہ لوگ صنفِ اوّل کے تخلیق کاروں میں شمار نہیں کئے جاتے؟ کیا یہ قلم کار بڑے مرتبہ و مقام کے حامل نہیں ہیں؟ کیا وہ لیجنڈ نہیں ہیں؟ آج اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم لوگ نادانستہ یا غیر شعوری طور پر کسی اور کا لقمہ تو نہیں بن رہے ہیں؟؟ ●

بہ خطِ شاعر







نئی بارش کی رم جھم میں لباسِ غم تو بدلے گا
وہی رسمِ چمن ہوگی، مگر موسم تو بدلے گا

وہ مہرِ شاہِ خاور ہو کہ زیرِ بادِ صرصر ہو
کسی صورت مزاجِ نازکِ شبنم تو بدلے گا

مسیحاؤ سنو کچھ تازہ دوائیں لا کے رکھی ہیں
نئے زخم آئیں گے اب بھی مگر مرہم تو بدلے گا

کفن ریشم کے مقتولوں کو اب پہنائے جائیں گے
عزاداروں کا طرزِ گریہ و ماتم تو بدلے گا

نئی سازش گری کا جشنِ فیاضی مبارک ہو
وہی ہوں گے ایاغ و جام، لیکن سَم تو بدلے گا

نئی ناوک زنی ہوگی مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ جس عالم میں ہم رہتے ہیں وہ عالم تو بدلے گا

● ۷۶ اے۔ بی پاکٹ۔ ا، میور وہار، فیز۔ ا، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۱
منظر امام

بیچ میں پیڑ کا احساں نہیں ہوتا کہ نہ ہو
آدمی اصل میں انساں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

باندھ رکھی ہے بس اک بات گرہ میں ورنہ
دشت میں قیس پریشاں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

شیشۂ جاں میں ہے اب ریت ذرا سی باقی
دل میں اب کوئی ارماں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

وہ الگ دیکھ رہے ہیں عشق نمایاں جس سے
بوالہوس چاک گریباں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

اور کچھ ہو کہ نہ ہو عشق میں لیکن زیاں
تلفِ جاں، ضررِ جاں، نہیں ہوتا کہ نہ ہو

● ۷۔ شوکت علی روڈ، اٹالا، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳
سہیل احمد زیدی

خواب آتے ہی نہ تھے آنکھوں میں چاہت ہی نہ تھی
ذہن ناآسودہ اتنا تھا تمازت ہی نہ تھی

رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا نہ ہوتا غم مجھے
جسم آنکھیں کھیلیں ایسی بصارت ہی نہ تھی

سب کے سینوں میں ضمیرِ بے ریا موجود تھا
میرے پرکھوں کے زمانے میں عدالت ہی نہ تھی

پھول کی پتی پہ اپنے شعر لکھ سکتا تھا میں
زندگی کے سات رنگوں میں جہالت ہی نہ تھی

میرے سینے میں نہاں تھا دفترِ خوف و ہراس
جستجو کی راہ میں کوئی بشارت ہی نہ تھی

کس قدر وسعت رساں منزل تھی زیرِ آرزو
سینۂ افلاس میں لیکن طراوت ہی نہ تھی

● ۱۱۲۹، ۲۶ "A" مین، ۹واں بلاک، جیا نگر، بنگلور۔ ۵۶۰۰۶۹
حمید الماس

جیتندر بلو
6, Corfton Lodge, Corfton Road, Ealing,
London W5 2HU (U.K.)



بــــــازار

ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں کے معروف افسانہ نگار جیتندر بلوؔ کا ایک ایسا فکرانگیز افسانہ شایع کیاجارہا ہے جس میں برطانیہ میں بسے ہوئے تارکینِ وطن کی پہلی دو نسلوں کی طرز زندگی ، ان کے ذہنی فاصلے ، اور مختلف معاشی رویے نمایاں ہوتے ہیں ۔ تاریخی تناظر میں دیکھا گیا یہ افسانہ سماجی حقیقت نگاری کی ایک زندہ اور عمدہ مثال ہے ۔ جیتندر بلوؔ نے تارکین وطن کے مسائل پر کئی عمدہ افسانے تخلیق کئے ہیں ۔ [ادارہ]

"ہر فرد سے بازار جُڑا ہوتا ہے اور بازار خود اجتماعی زندگی ہے۔"(ج۔ب)

بازار سال بہ سال لمبا ہوتا جارہا تھا۔ میں جب کبھی اس علاقے کے قریب ہوتا یا اُس علاقے سے گزرتا تو میرا وہاں جانا ضروری تھا کہ سبزی، گوشت اور مسالے خریدنا مجھ پر لازم تھے۔ اس لئے کہ ان نایاب اشیاء کا پردیس میں ملنا نہایت دشوار تھا۔ ایک وقت تھا کہ بازار میں بیرون ممالک سے آئے ہوئے باشندوں کی دوکانیں گنتی کی ہوا کرتی تھیں۔ اپنے لوگ بھی وہاں خال خال نظر آیا کرتے تھے۔ لیکن انہیں دیکھ کر خوشی ہوا کرتی کہ اپنا رنگ مقناطیسی کشش رکھتا ہے ، قریب سے گزرنے پر ہم اپنے ہونے کا ثبوت مسکرا کر دیا کرتے تھے۔ وہاں کا سبزی فروش، قصاب اور پنساری مجھے اس حد تک جاننے لگے تھے کہ ہمیشہ تازہ مال فراہم کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے انہیں میری بزرگی کا پاس رہا ہو یا وہ اپنے لوگوں کے درمیان تجارتی پُل بنانے کے خواہاں رہے ہوں ؟ میں خوشی خوشی اپنا دل پسند مال خرید کر گھر چلا آیا کرتا۔ میری بیگم فاصلے سے ہی تھیلوں کو دیکھ کر جان لیا کرتی کہ آج میں کس علاقے سے ہو کر آیا ہوں۔ تھیلوں کو میرے ہاتھوں سے لے کر ، اپنی رہی سہی محبت کا اظہار اس انداز سے کرتی کہ کچھ دیر کے لئے عمر کا تصور میرے ذہن سے غائب ہو جاتا اور وہ رات ہم یقیناً جنت میں بسر کیا کرتے۔

ہم اکیلے رہ گئے تھے ، یکسر تنہا۔ گو ہم صاحبِ اولاد تھے ، چار مرتبہ بیگم نے اولاد کا مبارک منہ بھی دکھلایا تھا اور ہم پاک پروردگار کے شکر گزار ہی نہیں ، احسان مند بھی تھے۔ مگر بچوں کا بالغ ہونے پر ، اور ان کا بیرونی معاشرے میں نشو و نما پانے پر (جہاں ہم روزِ اوّل سے اجنبی تھے ، مگر وہ اس کا اٹوٹ حصہ بن چکے تھے) یکے بعد دیگرے پرندوں کی مانند اپنی اپنی سمت میں پرواز کر گئے۔ لیکن نہ تو مجھے کوئی گلہ تھا اور نہ ہی میری شریکِ حیات کو۔ ہم جانتے تھے کہ اب وہ خود صاحبِ اولاد ہیں ، خود مختار ہیں ، ان کے اپنے مسائل بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ مگر ان کا ہمارے ساتھ رابطہ احتراماً قائم تھا اور موقع بے موقع ہماری خیر خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد کئی امیر ملکوں کو اپنی صنعتیں ، کارخانے ، فیکٹریاں ، ملیں ، ہسپتال اور ٹرانسپورٹ چلانے کی خاطر مزدوروں کے علاوہ تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی ضرورت پڑی۔ انہوں نے چند شرائط کے ساتھ غریب ملکوں کے مزدوروں کو لبیک کہا۔ بس پھر کیا تھا ، انگریزوں کی سابق نو آبادیوں کے باشندے ، جوق در جوق اپنے سابق آقاؤں کے ملک میں آکر آباد ہونے لگے۔ ان میں زیادہ تر برصغیر ہند کے افراد تھے۔ خاص طور پر راجدھانی کے مختلف علاقوں میں وہ اتنی وافر تعداد میں بس گئے کہ وہ علاقے ان کے نام سے ہی منسوب ہونے لگے۔ مقامی شہریوں کا تہذیبی صدمے سے دوچار ہونا فطری عمل تھا۔ وہ ان علاقوں کو چھوڑ کر دوسری جگہوں پہ منتقل ہو گئے۔ انہیں تارکین وطن کی محنت مزدوری تو پسند تھی ، مگر ان کا رہن سہن ، کھانا پینا اور رنگ قطعاً پسند نہ تھا۔ لہٰذا ان علاقوں میں نو وارد لوگوں کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں ۔ چونکہ وہ اپنی تہذیب ، رسم و رواج ، اقدار ، عادات ، خورد و نوش اور اپنے مذاہب تک ساتھ لے کر آئے تھے ، جن کے بغیر

سانس لینا ان کے لئے دوبھر تھا، پھر ضرورت تو ایجاد کی ماں قرار دی گئی ہے ۔ نئے نئے کاروبار ، دکانیں ، ادارے وجود میں آنے لگے ۔ دیرینہ دوکانوں کے ساتھ مٹھائی ، زیور ، کپڑا لتا ، برتن ، ڈھابے ، ریستوراں ، شراب ، کباب ، پان ، کتب و رسائل کی نئی دوکانیں اور چھوٹی بڑی سپر مارکٹیں بھی دکھائی دینے لگیں ۔ پھر موسیقی کے بغیر تو زندگی بے رس ہو کر رہ جاتی ہے ۔ دنوں میں اس کا بھی سیلاب اُمڈ آیا ۔ فٹ پاتھ پر جگہ جگہ سجے سجائے باکڑوں کے ٹیپ ریکارڈوں سے گیت ، غزلیں ، بھجن اور قوالیاں گونجنے لگیں ۔ میٹھے سر ، سریلی آوازیں اور اونچی تانیں فضا میں گونجتی ، کانوں میں رس گھول دیا کرتی تھیں ۔ بارہا ہاں کے نظارے دیکھ کر لگا کرتا کہ میں اپنے وطنِ عزیز ، اپنی تہذیب ، اپنے ماحول اور اپنے ہی لوگوں کے درمیان کھڑا سانس لے رہا ہوں ۔ بارونق بازار اور نت نئی دوکانوں کو دیکھ کر معروف مصنف غلام عباس کی شہرہ آفاق کہانی "آنندی" کے اوراق اپنے آپ میرے ذہن میں کھل جایا کرتے تھے ۔

اُسی بازار میں مجھے کرتار سنگھ مان سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔ وہ میرے پرانے دوستوں میں سے تھا ۔ اگر دوست نہیں تھا تو گہرا شناسا ضرور تھا ۔ ہم دونوں شہر جالندھر کی بستی شیخاں کے رہنے والے تھے ۔ جوانی کے دنوں میں اکٹھے ہی بھرتی ہو کر لام پر گئے تھے ۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہم اٹلی کے محاذ ماؤنٹ کینو پر لڑے تھے ۔ میں سپلائی لائن میں تھا ، جبکہ کرتارا فرنٹ لائن پر توپوں ، بموں کی گھن گرج آوازوں میں گھرا ، بلا خوف و خطر مشین گن کی لبلبی اتنی تیزی سے چلایا کرتا کہ صاحب بہادر بھی اس کی شجاعت کے قدرداں تھے ۔ لمبا تڑنگا ، چھ فٹ سے اوپر کو نکلتا ہوا قد ، کسی ہوئی پگڑی کے ساتھ اور وہ بھی اونچا دکھائی دیا کرتا تھا ۔ ڈنڈ پیلا ہوا بدن ، اعضا سے تھرکتی مچھلیاں اور اس پر فوجی پوشاک ۔ وہ کسی سکھ ریاست کا خوبرو شہزادہ لگا کرتا تھا ۔ طبیعت بڑی رنگین پائی تھی اور ذوق بھی فطرتاً بلند نصیب ہوا تھا ۔ دو چار رم کے پی لیتا تو خوب چہکتا ۔ بڑھ چڑھ کر بھونڈے مذاق ، فحش لطیفے سنایا کرتا ۔ پھر اچانک سنجیدہ ہو کر ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں ، کان پہ ہاتھ دھرے ماہیے ، ٹپے ، لوک گیت ، جگنی گا کر سماں باندھ دیا کرتا ۔ زیادہ ترنگ میں آجاتا تو اس کی دردناک آواز میں وارث شاہ کی المناک ہیر سُن کر آنکھیں نمناک ہو جاتیں ۔ اور ہم تمام ، اس کے سنگی ساتھی سات سمندر پار اپنے گھروں ، شہروں ، قصبوں اور گاؤں میں پہنچ جایا کرتے ۔ ایک بار وہ فرنٹ لائن پر گولیوں کی زد میں آگیا تھا ۔ بری طرح سے گھائل ہوا تھا ۔ مگر اس کا ساتھی رحیم خان اپنی جان ہتھیلی پہ رکھے ، اسے پھٹتے ، اُچھلتے بارود کے دہانے سے بچا کر زندہ لے آیا تھا ۔ بس یہ ایک معجزہ تھا ۔ کئی ماہ تک وہ زیر علاج رہا ، اس کی بائیں ٹانگ بھی قدرے متاثر ہوئی تھی ۔ بقول اس کے فوجی ہسپتال میں ایک نرس اس پر عاشق ہو گئی تھی ۔ وہ راتوں کو چوری چوری اس کے پاس چلی آیا کرتی تھی ۔ وہ اس کے مردانہ حسن اور قوت مردی پر مر مٹی تھی ۔ جنگ کے بعد اس سے بیاہ رچانے کا ارادہ بھی رکھتی تھی ۔ مگر کرتار ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول کر اسے ٹال دیا کرتا تھا ۔ پھر اسی کرتارے کو کئی سالوں کے وقفے کے بعد اچانک بازار میں دیکھا ۔ بدن ساتھ چھوڑتا ہوا ، کمر میں ہلکا سا خم ، ڈھیلی ڈھالی پگڑی ، بال پیچھے سے جھانکتے ہوئے ، چھدری چھدری دودھیا داڑھی ، ہاتھ میں چھڑی ، آنکھوں پہ موٹا سا چشمہ ۔ وہ سبزی کی دوکان سے تھیلا پکڑے نکلا تھا ۔ فٹ پاتھ کے کنارے کچھ دیر خاموش کھڑا ، آتی جاتی مخلوق کو دیکھ رہا تھا ۔ چشم زدن میں وہ اور میں شہر جالندھر ، بستی شیخاں اور اٹلی کے محاذ پر کھڑے تھے ۔ ان گنت یادیں ، واقعات اور حادثات ذہن میں گھوم کر رہ گئے ۔ مجھ سے رہا نہ گیا ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے ؟ کہاں کا رہنے والا ہے ؟ اور کیا اس کا نام کرتار سنگھ مان ہے ؟ وہ مسلسل میرا گنجا سر ، تراشیدہ داڑھی ، شلوار قمیض اور آنکھوں میں اتر کر ، مجھے پہچاننے کی شعوری کوشش کرتا رہا ۔ پھر میرے قد کاٹھ کا بھرپور جائزہ لے کر ، اس کی نگاہیں میری ناک اور بائیں گال کے پیدائشی مسے پر ٹھہر گئیں ۔ تھیلا اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا کپکپاتا ہاتھ میرے شانے پر گھپ کر رہ گیا ۔ اعتماد کے ساتھ گویا ہوا :

"ہو نہ ہو ، تم غیاث احمد ہو ۔ بستی شیخاں والے ۔"

میں بے اختیار ، پوری شدت کے ساتھ اس سے لپٹ گیا ۔ اس لئے نہیں کہ بچھڑے ہوئے طول طویل عرصے کے بعد مل رہے تھے بلکہ میں اس کے ڈھلتے بدن اور قابل رحم حالت کو دیکھ کر اندر باہر سے ہل گیا تھا اور میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ "وقت" آدمی کو کیا سے کیا بنا ڈالتا ہے ۔

وہ بازار سے کچھ فاصلے پر اولڈ پیپلز ہوم (بزرگوں کا رین بسیرا) کے ایک نیم کشادہ کمرے میں مقیم تھا ۔ اسی کے اصرار پر میں اس کی رہائش گاہ پر چلا آیا تھا ۔ کمرے کی دیواریں اس کے خاندان ، جوانی اور فوجی زمانے کی تصویروں سے بھری پڑی تھیں ۔ ان میں فیروز پور رجمنٹ کے چند سپاہیوں کا ایک گروپ فوٹو بھی موجود تھا ، جسے جنگی سفر کے دوران مصر کی پورٹ سعید پر اتارا گیا تھا ۔ اسے غور سے دیکھ کر مجھے پرانے ساتھی اور جنگی زمانہ یاد آنے لگا ۔

"غیاث احمد اسے دھیان سے دیکھنا ۔ ۔ اس میں تم بھی کہیں کھڑے ہو ۔ ۔ خود کو پہچان لینا ۔ ورنہ مجھ سے پوچھ لینا ۔ ۔ ۔ میں بتادوں گا ۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ فوٹو میرے پاس بھی موجود ہے ۔ ۔ ۔ تقسیم کے دوران فساد کے دنوں میں جب ہمارا کنبہ لاہور کی طرف بھاگ رہا تھا تو ابو نے یہ تصویر گٹھری میں باندھ لی تھی ۔"

"اچھا کیا تیرے ابو نے ۔ پرانی چیزوں کے ساتھ ہمارے دکھ سکھ جڑے ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور وہ موت تک ہمارے ساتھ رہتے ہیں ۔"

یہ کہہ کر اس نے بستر سے تکیہ اٹھایا، نیچے سے وائٹ ہارس کی بوتل نکالی۔ دو گلاس جاندار مقدار میں تیار کئے۔ ایک کو میری طرف بڑھا کر صدقِ دل سے گوش گزار ہوا:

"یار غیاثے، تو بچپن سے بڑا سیانا رہا ہے۔ میری ایک بات کا جواب تو دے؟"

میں پر تجسس اسے دیکھتا رہا۔

"ہماری زبان ایک تھی، لباس ایک تھا، کچھ تہوار بھی سانجھے تھے۔ کھانا پینا بھی ایک سا تھا۔ عادتیں، مشغلے، شوق، گانا بجانا، بولیاں بھی ایک سی تھیں ہاں مذہب ضرور الگ الگ تھے۔ پھر اس کی خاطر ملک کا بٹوارہ کر دینا..؟ بات سمجھ میں نہیں آئی آج تک۔"

"کرتارے" گلاس میز پر رکھ کر اور قدرے سوچ بچار کے بعد میں گویا ہوا "سیاست کا دوسرا نام حسین الفاظ سے عوام کو گمراہ کرنا ہے۔ اسلئے سیدھے وعدوں کا یقین دلا کر جھوٹ بولنا ہے اور معصوم عوام کو بیوقوف بنا کر دھوکہ دینا ہے۔ سیاست کو سمجھنا اتنا آسان نہیں؟ مار گولی اسے... یہ بتا تیرے بال بچے اور ہماری بھابھی؟"

"بچے سب یہاں ہیں.. اپنی اپنی اولاد کے ساتھ مست ہیں... وقت ملے تو باپ کو پوچھ لیتے ہیں ورنہ..." اس نے رک رک کر اور سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ "چھوٹی بیٹی روپ کور ضرور فکر کرتی ہے۔ واہے گورو خوش رکھے اسے... فون کرتی رہتی ہے.. ملنے آتی ہے تو کئی روز کا کھانا چھوڑ جاتی ہے.. پر اس کا گھر والا اس بات سے خوش نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ روپ کور سے کہتا رہتا ہے کہ اب تمہارے باپ کی ذمہ داری سٹیٹ (State) کی ہے، سوشل سیکورٹی کی ہے، تمہاری بہنیں؟... بیٹے بھی گھما پھرا کر یہی کہتے ہیں کہ میری دیکھ بھال اب گورنمنٹ کے ذمے ہے۔ وہی میری ہر ضرورت پوری کرے گی۔"

اس کا گلا رندھ سا گیا تھا۔ میں خوش نصیب تھا کہ میری آل اولاد اس طرح کی سوچ اور رویوں سے دور تھی، اپنے والدین کا واجب احترام کرتی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہم رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق بنتے جا رہے ہیں۔ ان کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بھی بدلتا جا رہا ہے اور ہمارے ساتھ برابر کا قدم شاید ہی وہ اٹھا پائیں، مستقبل قریب میں؟ ہم محتاط، مختصر گھونٹ بھرتے رہے۔ اس نے اپنی آل اولاد کی بابت بڑی واضح صورت بیان کی تھی۔ لیکن اسے بذاتِ خود اکیلا پا کر، میرا تجسس اس کی شریکِ حیات کے متعلق جاننے کا برقرار رہا۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا تو سوال داغ ڈالا: "کرتارے... بھابی؟"

گلاس کو فراموش کئے، وہ اپنی چھدری داڑھی کو کھجاتا رہا۔ پھر نیند سے بھری آنکھوں کو کھول کر بولا:

"وہ میرے بعد میں چلی جاتی تو ٹھیک تھا... کوئی بچہ گھر لے جا کر اس کی خدمت ضرور کرتا۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے... مگر واہے گرو کو منظور کچھ اور تھا... وہ مجھ سے پہلے چلی گئی۔ یہی افسوس ہے آج تک۔"

میں اس کے اکیلے پن کو محسوس کرتا، اپنے ساتھ اس کا موازنہ کر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کئی انقلاب آئے تھے۔ وہ جانے کتنے دردناک ادوار سے گزرا تھا۔ اچانک مجھے اردو نثر کے بادشاہ منشی پریم چند جی کے چند جملے یاد آگئے۔ "بڑھاپے میں کسی کی بیوی کا دیہانت ہو جائے تو اس کا انت بھی ویسا ہوتا ہے جیسے کسی غریب آدمی کا جھونپڑا بھری برسات میں گر جائے اور وہ چیختا چلاتا، بازو آکاش کی طرف اٹھائے کہے کہ اے پربھو، تم ہو یا نہیں ہو؟"

میں اس کا فون نمبر لے کر اسے اپنے گھر پہ آنے کی دعوت دے کر چلا آیا پُر زور اصرار کے بعد وہ موسم گرما کی ایک چمکدار دوپہر کو میرے ہاں تشریف لایا تھا۔ بلقیس اس سے مل کر بڑی خوش ہوئی تھی۔ اس کی باتیں سن کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ کرتارے نے جنگ کے کئی قصے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کئے، ان میں میرا ذکر بھی کہیں کہیں شامل تھا۔ پھر اس نے اپنی عشقیہ داستان بھی سنا ڈالی۔ کہنے لگا "کیا بتاؤں بلقیس بہن... وہ بال کٹی اینا میرے ترلے کرتی تھی، شادی کر کے میں اس کے ملک میں آباد ہو جاؤں۔ پر مجھے اپنے بہن بھائی، ماں باپ، یار دوست اور واقف کاروں سے دور رہنا منظور نہ تھا... مگر تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے... بٹوارے کے بعد روزی روٹی کی خاطر اسی ملک میں آ کر مزدوری کرنی پڑی۔"

"کتنے سخت دن تھے وہ۔ سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں... محنت مزدوری، بھاگ دوڑ، اوور ٹائم، دن رات کام کام۔"

"مجبوری تھی مجبوری... بچوں کو بھی تو پالنا تھا... مگر اب سب جھنجٹ ختم ہو گئے ہیں۔ اب تو اپنا چل چلاؤ ہے۔ کسی روز بھی چلا جاؤں گا۔"

"ایسا مت کہیں بھائی صاحب۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ ہم آپ کی صحت کے لئے دعاگو ہیں۔"

وہ بلقیس کی بہن نوازی اور اخلاقی رکھ رکھاؤ سے بڑا خوش ہوا تھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ بلقیس کی پیدائش شہر بٹالہ، ضلع گورداس پور کی ہے، جہاں گورو نانک دیو جی کا سسرال رہا تھا تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ اٹھایا ہوا لقمہ پلیٹ میں رکھ کر بولا:

"بلے بلے... قربان جاواں۔ ہالیاں نے ہل ڈک لئے .... ہم ننکانہ صاحب (گورو نانک دیو جی کی جائے پیدائش۔ اسے تلونڈی بھی کہتے ہیں۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔) کی مقدس زمین کو سلام کرتے ہیں اور شہر بٹالہ کی بھی قدر کرتے ہیں کہ وہاں ماتا سلکھنی پیدا ہوئی تھیں۔"

کھانا کھا کر ہم دیر تک کچھ 'ذاتی' کچھ دنیاوی اور گھریلو باتیں کرتے رہے۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا، معمولی تعلیم یافتہ شخص کے تجربات، مشاہدات اور مختلف معاشروں اور تہذیبوں سے اخذ کردہ علم کتنا گہرا کتنا وسیع ہے۔ بلکہ مستند حیثیت کا درجہ رکھتا ہے۔ میں واقعی دنگ رہ گیا وہ باتیں کرتے کرتے اچانک سو گیا تھا اور متواتر خراٹے بھرنے لگا۔ میں اور بلقیس اس نتیجے پر پہنچے کہ مہمان مکمل آزادی کا حقدار ہوا کرتا ہے، اس کے قیلولے میں مداخلت کرنا زیادتی ہوگی، بلکہ مجھے تو خوشی ہو رہی تھی کہ میرا یار بیلی میرے گھر پہ آرام فرما رہا ہے۔ مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں، اپنی پگڑی کو درست کیا جو گردن کے ڈھلکنے پر سرک گئی تھی۔ ادھر ادھر اچٹتی سی نگاہ دوڑا کر تاسف سے بولا۔

"اب نیند بس میں نہیں رہی۔۔۔ وہ آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھتی۔ رات رات بھر غائب رہتی ہے۔۔۔ اور کبھی کھڑے کھڑے میں سو جاتا ہوں۔ اب شریر کے ساتھ اس کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔" پھر وہ ایک طویل سانس بھر کر دوبارہ سو گیا۔

سہ پہر کو چلتے وقت اس نے بلقیس کی ہتھیلی پر چند پونڈ رکھنا چاہے وہ انہیں قبول کرنے سے ہچکچاتی رہی، پھر یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔

"بھائی صاحب، میں آپ کا برادرانہ نذرانہ ضرور قبول کرتی، اگر آپ بھی سرکاری پنشن کے سہارے نہ ہوتے۔ ہماری طرح آپ کی گزران بھی مشکل سے ہوتی ہوگی؟"

مگر وہ اپنی جگہ اٹل تھا۔ بلقیس متواتر انکار کرتی رہی۔ اس پر میں بول اٹھا۔

"بلقیس لے لو۔ انکار مت کرو۔۔۔ کرتارا موت کے منہ سے کئی بار بچ کر نکلا ہے۔ اپنے پرائے، دکھ سکھ، زندگی موت کے فلسفے کو قریب سے جان چکا ہے۔۔۔ تمہیں پہلی بار دیکھنے پر اپنا فرض نبھا رہا ہے اور اپنا دھرم بھی۔۔ دوسری بات، ہم گنگا جمنی تہذیب کے مارے ہوئے ہیں۔۔۔ اور تم سے یہ بھی کہتا چلوں کہ ہمارے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے دونوں طرف۔۔۔۔ اور انجام کار مکمل بربادی۔"

بازار مزید لمبا ہو گیا تھا۔ ایسے ادارے بھی کھل گئے تھے، جن کے متعلق لوگوں کو علم تک نہ تھا۔ مگر ان کا وجود میں آنا ناگزیر تھا کہ ان کے بغیر جیون کا دائرہ مکمل نہیں ہوا کرتا۔ انشورنس، جنم، موت، بیاہ شادی، پرائیویٹ پنشن، رفاہی، نصیحتی بورڈ، امدادی بورڈ وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز موسم صبح سے ہی آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ کبھی برسات، کبھی دھوپ، کبھی بادل۔ بازار ابھی پوری طرح سے کھلا بھی نہ تھا کہ میں وہاں موجود تھا۔ شام کو ہمارے ہاں، وطن عزیز سے وارد چند مہمان کھانے پر مدعو تھے اور مجھے بازار سے کھانے پینے کا سامان خریدنا تھا۔ بوندا باندی جاری تھی۔ میں چھتری کا سہارا لئے خود کو پانی سے بچاتا آگے بڑھ رہا تھا کہ کرتارے کو فیونرل ڈائریکٹرز (تجہیز و تکفین کا ادارہ) کے دفتر سے نکلتا دیکھ کر، میرے پیروں کے ساتھ دل بھی چند ثانیوں کے لیے تھم سا گیا۔ وہ بے دھیانا ادھر ادھر دیکھتا، گرد و پیش میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے جا لیا۔ "کرتارے، خیریت؟ صبح صبح تم فیونرل ڈائریکٹرز کے دفتر میں؟ بال بچے سب ٹھیک ہیں نا؟"

"ٹھیک ہی ہوں گے۔۔۔۔ میں تو اپنی خاطر یہاں آیا تھا؟"

"اپنی خاطر؟"

"ہاں۔"

اس کا دبی زبان میں کہا ہوا مختصر سا "ہاں" شرطیہ اپنے ساتھ کچھ سوال لئے ہوئے تھا، بلکہ مجھے اس کے 'ہاں' میں کچھ تہہ داریاں بھی دکھائی دیں۔ میں نے وضاحت چاہی۔

"ذرا کھل کر بات کر۔۔۔۔ اپنوں سے بھید رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا؟"

مگر وہ خاموش رہا۔ پانی مسلسل برس رہا تھا اور وہ چہرے سے پانی کو بدستور صاف کر رہا تھا۔ میں نے چھتری بڑھا کر اسے مزید بھیگنے سے بچا لیا۔ مگر اس کی خاموشی پریشان کن تھی۔ میں دوبارہ اپنے لب وا کر ہی رہا تھا کہ اس نے چھتری سے آزاد ہو کر اور قدم بڑھا کر کہا:

"میں یہاں اپنی موت کے سلسلے میں قسط بھرنے آیا تھا۔"

"موت؟ قسط؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"مرنے کے بعد میرے جنازے کا بندوبست یہی دفتر کرے گا۔"

اگلا قدم میرے ساتھ نہ تھا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ فطری ردِ عمل تھا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ ہر تاثر سے بے نیاز، آکاش کو دیکھ کر جانے وہاں کیا تلاش کر رہا تھا؟

"کرتارے، تمہارے سبھی بال بچے یہاں موجود ہیں۔۔۔ تم اس طرح کا تردد کیوں کرتے ہو؟"

"مجبور ہوں۔۔۔ میرا آخری وقت قریب ہے۔ بیٹوں پہ بوجھ بنوں، یہ مجھے منظور نہیں۔ میں نہیں چاہتا میرے کفن دفن کا خرچہ وہ کریں۔"

"مگر وہ تیری اولاد ہیں۔ تیرے آخری سفر پہ خرچ کر بھی لیا تو یہ کون سی بڑی بات ہوگی؟ یہ تو ان کا فرض ہوگا۔"

"او غیانے۔۔۔ تو بچپن سے بڑا سیانا رہا ہے۔ اسکول میں ماسٹر صاحبان بھی تجھے اگلی سیٹ پر بٹھایا کرتے تھے۔۔۔ لیکن کیا تو نہیں جانتا، آج آدمی کی سوچ کیا سے کیا ہو چکی ہے؟ ہر کوئی اپنی خاطر سانس لیتا ہے۔۔۔ اپنے فائدے کے بغیر نہ کسی کو دیکھتا ہے، نہ اس پر خرچ کرتا ہے۔۔۔ کل کلاں میرے کفن دفن پہ میرے بیٹے سوچیں کہ ان کا باپ ان کو پیسے کی چوٹ دے گیا ہے تو میں کیسے میں بند تڑپتا رہوں گا۔۔۔ میری آتما سوچتی رہے گی کہ اس کا چھوڑا ہوا بدن پوتر اگنی کو چھوئے گا یا نہیں؟"

[باقی صفحہ ۲۵۰ پر دیکھئے]



ظفر گورکھپوری

دوہے

یہ ہو تا نہ شریر میں، کب کے جاتے ٹوٹ
ماں کا دودھ ہی ستیہ ہے باقی سب کچھ جھوٹ

•

کون بستی دھو گئی ندی میں اپنے گال
تٹ خوشبو سے بھر گیا سارا پانی لال

•

ہارا رو کر، چیخ کر، دیا نہ اس نے دھیان
بھائی ایک اپائے ہے کر کوئی نقصان

•

وہی گھڑی ٹک ٹک وہی، وہی بھور اور شام
اک بدلاؤ تو چاہیے آگے جو انجام

•

تنکے چن چن گھر کیا، دن جانا نہ رین
جانے پیڑ نے کیا کہا گوریا بے چین

•

لے دے کر دو راستے، جائے کہاں انسان
یا سمجھوتہ کیجئے یا سہئے نقصان

•

ساجن کو جلدی سکھی، من ہے کہ اڑا آئے
کانٹا سے کے پاؤں میں کاش کوئی چبھ جائے

•

جا کر بیٹھیں چار پل، کن پیڑوں کے پاس
ظفر ہمارے بھاگ میں شہروں کا بن باس

● A/302, Florida Shantinagar,
Andheri (w) Bombay - 400 053



اقبال متین

چاندنی پیکر

میں تجھ کو سوچتا رہتا ہوں
تو میرے ذہن و دل کی آبرو ہے
تجھے معلوم ہی کچھ بھی نہیں ہے
مرے دن، میری راتیں سب تری ہیں

تجھے میں نے خیالوں میں تراشا ہے
میں زلفیں اوڑھ کر سویا ہوں تیری
مرے ہر ہر نفس کا لمس تیرا ہے
بدن کی آنچ تیری ہے
تو روحِ جسم و جاں میری

ترے اندر ہی اندر اتر کر ڈھونڈتا پھرتا ہوں تجھ کو
تو مجھ کو مل بھی جاتی ہے
تو مل کر بھی نہیں ملتی
میں جب چاہوں تجھے اپنا بنا لوں
میں جب چاہوں لبوں کا انگبیں پی لوں
میں جب چاہوں ترے اعضا کے ہر موئے معطر کو
سمجھ لوں اپنی پلکیں
اور ان پلکوں کی چلمن میں
ترا عکسِ بدن یوں جھانکتا چھپتا ہوا دیکھوں
کہ تو میرے ہی اندر سے نکل کر
مرے باہر ہی باہر بچھ گئی ہے
چاندنی بن کر

● کہانی' 7-11-24/8، کتاب نگر،
نظام آباد 503001



خلیل تنویر

برسوں کی سوچتے رہے پل کی خبر نہ
کیسے نظر شناس کہ خود پہ نظر نہ

اپنا سفر کٹھن تھا، ذرا پیچ دار
چاروں طرف پہاڑ، کوئی رہگذر نہ

ہم اپنی غفلتوں پہ پشیمان کیوں نہ :
جھپکی جو آنکھ ہاتھ میں شاخِ ثمر نہ

لوگوں کو کھینچتا تھا تری گفتگو کا ر
سچ تو یہ ہے کہ بات بہت معتبر نہ

اڑنے کو بے قرار پرندے تھے شام
موسم تھا ہجرتوں کا مگر آنکھ تر نہ

● کیوریٹر، گورنمنٹ میوزیم، اودے پور
313001(راجستھان)

نیر مسعود

'Adabistan' Dindayal Road, Lucknow - 226003 (U.P.)

تخلیقی عمل

(ایک سوالنامے کے جواب)

ا۔ کیا آپ عالمِ غفلت میں بھی تخلیقی عمل سے دوچار ہوتے ہیں؟

← اس گفتگو میں تخلیقی عمل سے افسانہ نگاری مراد ہوگی۔ جواب نفی میں ہے۔ البتہ اگر نیند کو عالمِ غفلت میں شمار کیا جائے تو کبھی کبھی خواب میں کوئی منظر یا واقعہ یا مکالمہ ایسا مل جاتا ہے جس کو کسی افسانے میں استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن تخلیقی عمل ان عناصر کو افسانے میں استعمال کرنا ہے نہ کہ خواب میں ان سے دوچار ہونا۔

۲۔ کیا آپ تخلیقی عمل میں جنون سے دوچار ہوتے ہیں؟ (وہ) جنون کی کون سی قسم ہوتی ہے، الجھن، اضطراب، غصہ، فرسٹریشن، جذب یا حال، مراقبت، پاگل پن، یا کوئی اور قسم؟

← دوسرے کاموں کی طرح لکھنے میں بھی جب خاطر خواہ کامیابی نہیں ملتی تو الجھن ضرور محسوس ہوتی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ اس کو جنون کی کوئی قسم قرار دیا جائے، البتہ غیر متوازن تخیل کو اگر آپ جنون کی قسم سمجھتے ہوں تو اسی سلسلے میں اپنے چوتھے سوال کا جواب ملاحظہ کریں، لیکن غیر متوازن تخیل تخلیقی عمل کا نتیجہ نہیں، سبب ہوتا ہے۔

۳۔ کیا حالتِ بے ہوشی میں آپ سے تخلیقی عمل کا صدور ممکن ہے؟

← "حالتِ بے ہوشی" سے ظاہرا آپ کی مراد پہلے سوال والے "عالمِ غفلت" سے کوئی مختلف اور شدید تر کیفیت ہے۔ بے ہوشی کی باتیں ہوش آنے پر یاد نہیں رہتیں، اور بے ہوش ہونے کا اتفاق بھی مجھے صرف ایک بار، وہ بھی بہت کم سنی میں، پیش آیا ہے، تاہم یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بے ہوشی کی حالت میں پلاٹ اور الفاظ کی ترتیب وغیرہ مجھ سے ممکن نہ ہوگی۔

۴۔ آپ کے تخلیقی عمل میں تخیل متوازن رہتا ہے یا غیر متوازن؟

← متوازن تخیل تحقیق و تنقید، تاریخ و صحافت وغیرہ کے کام کی چیز ہے۔ ادبی تخلیق کی اساس غیر متوازن تخیل پر ہوتی ہے۔ اپنے تخیل کے توازن یا عدمِ توازن کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، صرف یہ قیاس کرسکتا ہوں کہ میری تحریروں کے کم زور حصے وہی ہوں گے جن میں تخیل غیر متوازن ہونے سے قاصر رہا ہے۔

۵۔ کیا آپ کے تخلیقی عمل پر اقدارِ حیات اثر انداز ہوتی ہیں؟ یعنی معاشی، اخلاقی اور تمدنی قدریں۔

← یقیناً اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی فرقے یا افراد کی تذلیل، فحش نگاری وغیرہ سے گریز اسی کا نتیجہ ہے۔ معاشی قدروں کو استثنا سمجھیے اس لیے کہ اردو میں ابھی تک تخلیق کا رشتہ معاشیات کے ساتھ استوار نہیں ہوا ہے۔

۶۔ کیا آپ کا تخلیقی عمل ہمیشہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو جاتا ہے؟

← ابھی تک تو ایک بار بھی نہیں ہوا، "ہمیشہ" کا کیا ذکر۔

۷۔ کیا آپ کے تخلیقی عمل میں جمالیاتی پیکروں کی آمد تحت الشعور سے اچانک ہوتی ہے یا کبھی کبھی اس کے لیے شعور کی ضرورت ہوتی ہے؟

← "جمالیاتی" کا تودا ہٹا کر صرف پیکروں کی بات کیجیے تو کہہ سکتا ہوں کہ پیکر سازی کے لیے ذہن پر طرح طرح سے زور دے کر تصور اور تخیل کو متحرک کرنا ہوتا ہے۔ کبھی پیکر مشکل سے اور دیر میں اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں بن کر مکمل ہوتا ہے۔ کبھی آنِ واحد میں بنا بنایا سامنے آجاتا ہے۔ لیکن "کبھی کبھی" یہ دوسری (اچانک والی) صورت پیش آتی ہے نہ کہ وہ پہلی (بہ تدریج بننے والی) صورت۔ مجھ کو یہ دونوں صورتیں ایک ہی شعور کی سست اور تیز کار فرمائیاں معلوم ہوتی ہیں، انھیں شعور اور تحت الشعور کے خانوں میں رکھنا ماہرینِ نفسیات کا مسئلہ ہے، لکھنے والے کا نہیں، وہ بے چارہ تو خود ہی کسی حد تک نفسیاتی مریض ہوتا ہے (خصوصاً اپنے غیر متوازی تخیل کی وجہ سے)۔

۸۔ کیا آپ تخلیقی عمل میں ریاضت اور انہماک ضروری سمجھتے ہیں؟

← جی ہاں۔ قلم برداشتہ ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت، جو ہزاروں لکھنے والوں میں شاید ایک آدھ کو ودیعت ہوتی ہو، مجھ میں نہیں ہے۔

۹۔ کیا آپ کی تخلیقات شائع ہونے سے پہلے کسی بھی ردّ و بدل کا شکار نہیں ہوتیں؟

← ہر قسم کے ردّ و بدل سے گذرتی ہیں۔ "شکار" کا لفظ آپ نے بے محل استعمال کیا۔ یہ ردّ و بدل (جو آپ کے آٹھویں سوال والی "ریاضت اور انہماک" کی ایک صورت ہے) تخلیق کو سنوارتا ہے، شکار نہیں بناتا۔

[باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھیے]



اختر ضیائی

جلوۂ حسن چار سو کیا ہے
پھر نگاہوں میں جستجو کیا ہے

اہل حرص و ہوا کو کیا معلوم!
لذتِ زخم آرزو کیا ہے

جز محبت ہم اہل دل کے لئے
اور موضوعِ گفتگو کیا ہے ؟

معجزہ ہے صدف نشینی کا
ورنہ قطرے کی آبرو کیا ہے

جو نہ ظاہر ہو وہ حقیقت کیا
رنگ لائے نہ جو لہو کیا ہے

پتّی پتّی میں رنگ بھرتی ہوئی
مستقل خواہش نمو کیا ہے

چشم ساقی کو کچھ خبر ہی نہیں
میکدے میں یہ ہاؤ ہو کیا ہے

13 Hoe Street London
E17 4SD (U.K.)



زبیر شفائی

دل کہ ہے نہ اشنائے قہر کس کو دیجئے
یہ حسیں لوگوں سے خالی شہر کس کو دیجئے

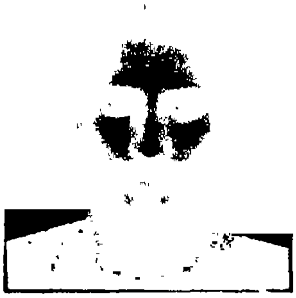
گھر سے قبرستان تک بھارت سے پاکستان تک
مانگنے والے بہت ہیں زہر کس کو دیجئے

دیکھتا ہوں میں ہوا کی شکل اڑتی خاک میں
یہ خزاں کی نامیابی لہر کس کو دیجئے

پتھروں کے بیچ سرگرم عمل فرہاد ہے
دودھ کی بہتی ہوئی یہ نہر کس کو دیجئے

کس کے آگے کھولئے یہ بند مٹھی اے زبیر
پھر یہ کوہ نور جیسا دہر کس کو دیجئے

41/9. White Colony, Juhi, Kanpur
- 208014 (U.P.)



مہدی پرتاپ گڑھی

کوئی انگلی لمحوں کی تھام کے مرے ساتھ لگ کے کھڑا تو ہے
میں ہوں مطمئن کہ اندھیری رات میں کوئی راہ نما تو ہے

وہ تسلیوں کے دیے کی لو کو بڑھانے والی چلی گئی
مری ماں نہیں ہے تو کیا ہوا، مرے ساتھ اس کی دعا تو ہے

ابھی ناامید نہیں ہوں میں کہ نہ آئے گی کبھی فصل گل
ابھی ایک شاخ ہری تو ہے، ابھی ایک پھول کھلا تو ہے

میں تماشا گاہ حیات میں ہوں کھلونا پھر بھی ہوں مطمئن
کبھی دستِ شوق مری طرف، کسی آرزو سے بڑھا تو ہے

کہیں کچھ تو بدلا ضرور ہے، کہ گلوں کے چہرے اتر گئے
مگر اب بھی کہتا ہے باغباں وہی پہلی آب و ہوا تو ہے

نہ تو رابطے کا ہی پل کوئی نہ تو صلح جوئی کا سلسلہ
کہ مزاحمت کا علم لئے پسِ پردہ اس کی انا تو ہے

میں رہین درد حیات ہوں بھی تو مہدی کوئی گلہ نہیں
میں بنوں نہ شکر گذار کیوں، کہ خدا کی یہ بھی عطا تو ہے

۲۸۔اسکول وارڈ، پرتاپ گڈھ ۲۳۰۰۰۱ (یوپی)



علی امام نقوی

54/103, Naya Nagar, Mira Road (East)
401107, Dist Thane (M.S)

موسم

ماں اور بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے باپ کے دماغ میں کئی روز سے بھڑکتے غیظ کے شعلے ماند پڑنے لگے، اسے اپنی بدلتی ہوئی کیفیت پر خود بھی حیرت ہوئی، اس نے سوچا، حیرت بھی عجیب جذبہ ہے، دل میں امنڈتا ہے تو ذہن کی ہر ہر نس میں طوفان برپا کردیا کرتا ہے اور جب برسنے پر آتا ہے تو بھڑکتے غصے کے شعلوں کو بجھادیتا ہے۔ اور اپنی دنیا بھی عجیب دنیا ہے، کسی پر مہربان ہوگی تو دوسروں کی خوبیاں بھی اس کی نذر کردے گی اور جب اس سے منھ موڑے گی.....

خود اس کے اپنے دماغ میں طیش کی آگ خوش گوار ازدواجی زندگی کے بدلتے موسم کی وجہ سے بھڑکی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں خوش گواری کا تصور سو فیصد موزوں نہ تھا۔ کیونکہ اس کا ذہن تو بہت چھوٹی سی عمر ہی سے سوچنے کے مرض میں مبتلا ہوگیا تھا اور اس کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر نے نہیں وقت نے کیا تھا۔ وہ جانتا تھا زندگی میں سب کچھ بہتر ہی بہتر نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ رہتی ہے۔ جو بڑھے تو بد سے بدتر ہوکر رشتوں کو توڑے بغیر نہیں رہتی، لیکن اگر ذہن خود ہی سوال قائم کرنے کے بعد اوروں سے اس کے جواب کی فوراً اور من چاہی خواہش نہ کرے تو رشتے ٹوٹتے نہیں، نبھائے جاتے ہیں۔ اس کی اپنی ازدواجی زندگی دریا تو نہیں تھی، دریا سے نکلی نہر بھی نہ تھی، نہ ہی لہر سے نکلے رجبہا سمان تھی۔ اس نے تو جب بھی اس مسئلے پر سوچا تو اسے یاد آئے قابل کاشت زمین کے وہ چک جن کی خاطر پانی ضروری ہوتا ہے اور ان تک پانی رج بہے سے یونہی نہیں پہنچتا۔ کسان آپسی سمجھوتوں کے بعد اپنی اپنی زمینوں میں ڈولی بناتے ہیں۔ ادھر ادھر ڈول بنے تو نالی کے وجود کو ترکرتا پانی وار، وار، چکوں کو سیراب کرتا ہے۔ کسانوں کے باہمی سمجھوتے جب متاثر ہوتے ہیں تو یگانگت کے موسم بدل جاتے ہیں۔

اڑتیس برسوں کی ازدواجی زندگی میں موسم کی تبدیلی کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ پریشان سا ہوگیا اور جب اطمینان بخش جواب اسے نہ سوجھا تو پہلے تو اس کے ذہن میں اتھل پتھل ہوئی اور جب وہ بڑھی تو اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ پیدا ہوگئی، اس کے اثرات گھر کے ہر فرد پر پڑنے لگے۔ پہلے ان کے ذہنوں میں سوالوں کے دیے جلے، ردعمل کی ہوا چلی تو وہ بجھ گئے، رشتے کی نزاکت کے کارن بچے صرف منھ بنا کے رہ گئے، پر وہ جو زندگی کی شریک تھی اس نے اپنا ردعمل چہرے کے تاثرات کے ساتھ زبان سے بھی ظاہر کرنا شروع کردیا۔ اس نے سوچا یہ تبدیلی کیسے آگئی، پہلے تو وہ خاموش رہا کرتی تھی، اس کے چپ نے تو گھر کی چار دیواری میں سوتیلی ساس، نندوں، جٹھانی، دیورانی کو بھی ہرا لیا ہے۔ خود اس کے اپنے گھر میں تو سب ہی اس کے اپنے ہیں۔ دو بیٹیاں، جن کے کفو کا اسی کی طرح وہ بھی انتظار کررہی ہے۔ بڑی بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی دو بیٹے ہیں۔ بیٹے بھی ایسے ویسے نہیں، سعادت مند بیٹے جو باپ اور ماں کے اشاروں کو جانتے پہچانتے ہی نہیں اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں۔ اور تمام بچے بھی ماں کے بدلے ہوئے رویے پر حیران ہیں۔ ایک بیٹے نے تو خود اس کے سامنے ہی ماں سے دبے لفظوں میں شکوہ بھی کیا مگر ماں کی ایک ہی گھڑکی پر بیٹے نے چپ سادھ لی۔ اور باپ نے محسوس کیا، خود بیٹے کے ذہن میں سوال روشن ہونے لگے ہیں۔ ایک آدھ بار بیٹے نے اس مسئلے پر باپ سے بات کرنا چاہی پر کامیاب نہ ہوا اور بس منھ بنا کر رہ گیا۔ شائد اس کے دماغ کے کسی گوشے میں سکڑے، سمٹے خوف نے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کردئے ہوں۔ اس کے چہرے پر ابھرتے تاثر کو باپ دیکھ رہا تھا، اور انہیں سمجھنے کے باوجود بھی جانے کیوں اپنے حق میں بہتر نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کے اپنے ذہن میں تو بس ایک سوال روشن تھا، یہ تبدیلی کیوں آئی ہے؟ میں اپنے فرائض سے غافل تو نہیں ہوا ہوں، ابھی تو ملازمت سے سبکدوش ہونے میں بھی کافی وقت ہے۔ ذہن کو ایک جواب سوجھا۔

وقت۔ اس نے سوچا، وہ تو کبھی کسی پر ایک سا نہیں رہتا، ایسا ہونے لگے تو آدمی اکتانے لگے، اس کی تبدیلی تو ہمارے سامنے امنگوں، حوصلوں، عزائم اور عمل کی اتنی صورتوں میں سامنے آتی ہے کہ منصوبے شرمانے لگتے ہیں۔ بیوی کیا منصوبے بنا رہی ہے؟ اڑتیس برسوں کے گرہست جیون میں اس کا وجود امنگ، عزم، حوصلے اور عمل کے جواہر سے آراستہ ہی نہیں ہوا۔ خود اس کی اپنی ذات ہی شوہر کے منصوبوں کی

تخیل میں حوصلہ بنتی رہی ہے۔اسے یاد آیا،نامساعد حالات میں بیوی نے ایک نہیں کئی باراس سے کہا۔

"چھوٹی سی زندگی میں دیکھا،دنیامیں دو آدمی کبھی سیر نہیں ہوتے۔"

"دو آدمی؟تم جانتی ہوانہیں؟"

"ہاں جانتی ہوں"

"کبھی ملی ہوان سے؟"

اسے یاد آیا،سوال کرنے سے پہلے اور سوال کرتے ہوئے اس کے دماغ کی کسی نس میں کچھ سر سرایا تھا۔اور بیوی کا جواب سن کر سر سراہٹ معدوم ہو گئی تھی۔

"میں کیا جی،ان سے تو سب ہی ملتے ہیں۔"

"سب.... تم... تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"اجی!حیران کیوں ہو رہے ہیں آپ؟"

"کمال ہے یار!جس کا مجھے پتہ نہیں،تم اس پر اتنے یقین سے کہہ رہی ہو،اور مزے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک تمہاری زبان سے کچھ نکلا بھی نہیں۔"

"اچھا تو ایک بات بتائیں،ابھی ابھی آپ نے کہا جس کا مجھے پتہ نہیں۔کہانا؟یہ... یہ پتہ کیا ہوتا ہے جی؟"

"پتہ!!"

"ہاں پتہ پر ایڈرس نہیں۔پتہ۔"

"علم"

اسے یاد ہے اس کے لہجے کے تحیّر پر بیوی نے مسکراتے ہوئے پلکیں میچ کر اثبات میں سر ہلایا تھااور اس پل اسے اس کا انداز بڑا ہی پیارا لگا تھا۔

"مجھے ان کے بارے میں بتا ہی دو۔"اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا تھاتو اس نے پلٹ کر پھر پوچھا۔

"ضرور،پر پہلے آپ یہ بتائیں کہ ہمیں جس چیز کا پتہ ہے،وہ مکمل ہوتا ہے؟

اسے اچھی طرح یاد ہے۔وہ پھر حیرت میں پڑ گیا تھا۔اور سوچنے لگا۔وہ آج کیسی باتیں کر رہی ہے؟اسے اچھی طرح یاد ہے اس روز اس نے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے سائے اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کی حیرت دور کر دی تھی۔

"اجی حضرت!جن کی بات میں کر رہی ہوں ان سے آپ بھی ملتے ہی رہتے ہیں اور آپ ہی کیا،ہر آدمی کہیں نہ کہیں ان سے مل ہی لیتا ہے۔اور...وہ...وہ اور کوئی نہیں ہمارے ہی جیسے ہوتے ہیں۔

"مگر وہ ہیں کون؟"

"ایک تو وہ جو دولت چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو سب کچھ جان لینا چاہتا ہے۔"

آج وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوی آخر کیا جان چکی ہے؟یا،کیا جان لینا چاہتی ہے؟آخر ہماری اٹھائیس برسوں کی زندگی پر گھٹا سی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ہوا ابھی تو نہیں چل رہی۔حبس کا عالم ہے اور دل و دماغ کے دریچے تازہ ہوا کے ایک جھونکے کا انتظار کر رہے ہیں۔دریچے کے دونوں ہی پٹ کھلے ہوئے ہیں۔اور... گھٹن ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔اسی گھٹن کی وجہ سے وہ چڑچڑا ہونے لگا تھا،اس کا اثر بھی پورے گھر پر پڑ رہا تھا۔

بچوں کی خاموشی،ان کے تاثرات کو وہ خود کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا اور یہ کیفیت اُس دن تک پورے گھر کو اپنی گرفت میں جکڑے رہی جس روز ان کی بڑی بیٹی اپنی سسرال سے میکے آئی،ماں سے ملنے کا اس کا والہانہ پن خود اسے بھی اچھا لگا،اس کے بعد جب اُس نے باپ کو اپنے سے لپٹایا تو پل بھر کی خاطر اس نے محسوس کیا،تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا ہے۔کچھ دیر رسمی گفتگو رہی،ماں اپنی سمدھن اور بچی کی نندوں کے احوال دریافت کرتی رہی،داماد کو پوچھا،خود اس کے اپنے بچے کے بارے میں معلوم کیا،پھر تینوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر بیڈ روم میں جا بیٹھی۔

شام کب ہوئی،رات کب دبے پاؤں چلی آئی؟اسے پتہ ہی نہ چلا،بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن پر اکتاہٹ سوار ہوئی تو اسے اپنا ایک دوست یاد آیا،اس نے سوچا میرے یار نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟وہ خیریت سے تو ہے نا؟ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر خود اسی سے کیوں نہ پوچھوں،وہ اپنی جگہ سے اٹھا،چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے وہ جوں ہی بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے آنے والی آواز نے اس کے قدم روک کے۔ماں اور بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے باپ کے دماغ میں کئی روز سے بھڑکتے غیظ کے شعلے ماند پڑنے لگے۔اسے اپنی بدلتی ہوئی کیفیت پر خود بھی حیرت ہوئی۔اس نے سوچا،حیرت بھی عجیب جذبہ ہے،دل میں امنڈتا ہے تو ذہن کی ہر ہر نس میں طوفان برپا کر دیا کرتا ہے اور جب برسنے پر آتا ہے تو بھڑکتے غصے کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے اور اپنی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔کسی پر مہربان ہو گی تو دوسروں کی خوبیاں بھی اس کی نذر کر دے گی اور جب اس سے منہ موڑے گی تو اس سے،اس کی ذاتی خوبیاں بھی چھین لے گی۔

"تم پوچھتی ہو میری نگاہ میں تمہارے ڈیڈی کا پہلا والا مرتبہ کیوں نہیں رہا؟"

"کیا غلط پوچھ رہی ہوں؟بڑی بیٹی کا استفہامیہ انداز بتا رہا تھا کہ بہنوں نے اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔بیٹی کے سوال پر کچھ دیر تک ماں چپ رہی پھر اس سے کہا۔

"نہیں،تمہارا سوال ٹھیک ہے۔پر چندا،ایک بات غور سے سن اور سمجھ،میری نظر میں ان کی جگہ وہی ہے پر... پر،اب ان کی وہ اہمیت نہیں رہی۔"

"کیوں؟"بیٹی کے لہجے کی کرختگی اُس کی حیرت کا اعلان تھی۔

"کیونکہ میرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں اب .... اب وہ میرے مضبوط سہارے ہیں۔"

باپ نے اک ذرا سے کھلے ہوئے دروازے کی درز سے آنکھ لگائی، دیکھا، بڑی بچی گڑ کی بات سن لینے کے بعد ماں کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اور وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتی جا رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا، جن کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے ان کی جگہ زمین کے پانچ چھ فٹ اندر ہوتی ہے، زمین کے اوپر نہیں۔ دل سے گرنے والا تو اٹھ بیٹھتا ہے۔ پر نظر سے گرنے والا تو گرا پڑا ہو کر رہ جاتا ہے۔

وہ خود فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس انکشاف کے بعد وہ بیوی کے دل سے گرا، یا، نظروں سے؟ اس نے محسوس کیا وہ زمین میں دھنستا ہی جا رہا ہے۔ بس اک ذرا سا ڈگمگایا تھا کہ بیٹی کی آواز نے سہارا دیا۔ وہ ماں سے اسی لہجہ میں کہہ رہی تھی۔

"جن سہاروں کی تم بات کر رہی ہو وہ کب تک اپنے کو تمہاری خاطر مضبوط رکھ پائیں گے؟ میرا مطلب ہے، کل کلاں ان سہاروں کی ضرورت اس گھر میں آنے والی دو بہوؤں کو بھی تو ہو گی۔ ایک دن وہ بھی تو ماں بنیں گی پھر کیا ہو گا؟ ☆☆

بقیہ ۱۹ : بازار

میں نے اس کی بابت جو اپنا ذہن بنا رکھا تھا، وہ اس سے کہیں آگے کی باتیں کر رہا تھا جو میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھیں۔ مجھے علامہ اقبال کے شعر کا ایک مصرعہ یاد آ گیا۔ 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔' خیال آیا کہ آدمی کی سوچ، سمجھ اور اڑان کا کوئی انت نہیں۔ خواہ وہ ناخواندہ کیوں نہ ہو؟ نئے نئے افق کھل کر میرے سامنے آ رہے تھے اور میں ششدر خود میں ڈوبا محسوس کر رہا تھا کہ برسوں بعد مجھے گہرا اشنا سا ہی نہیں ملا بلکہ صحیح معنوں میں یار بیلی نصیب ہوا ہے جو میری خاطر اپنا دل برملا اگل رہا ہے۔ کئی الٹے سیدھے خیال، کوندے بنے میرے ذہن میں لپکے۔ اگر میری موت پہ میرے بیٹوں نے بھی اسی تناظر میں سوچنا شروع کر دیا تو میرا انجام کیا ہو گا؟ میں تو چادر میں ملفوف، تابوت میں بند ان کے رحم و کرم پہ ہوں گا؟ میرا سرا بدن تو مزید سرد ہو کر رہ جائے گا؟ چھتری خود بخود میرے سر سے ہٹ کر نیچے آ گئی۔ پانی برابر برس رہا تھا۔ چھتری کو بند کر کے میں نے آسمان کو دیکھا، پھر خالی بازار کو۔

"غیاث احمد۔ مت بھول آج پیسے کا درجہ خدا سے بڑھ گیا ہے... اولاد کا رشتہ وہ نہیں رہا جو تیرا میرا اپنے باپ کے ساتھ تھا.... میری مان، تو بھی اپنا بندوبست کر لے.... موت کہہ کر نہیں آیا کرتی؟"

بازار، تا حدِ نظر منجمد ہو کر رہ گیا، سوائے فیونرل ڈائریکٹرز کا دفتر اور اس کا فون نمبر، جسے میں اپنے دل پر رقم کر رہا تھا۔ ●●

بقیہ ۲۱ : تخلیقی عمل

۱۰۔ کیا آپ اپنی کسی تخلیق کی اشاعت کے بعد افسوس، مایوسی اور اضمحلال کا شکار بھی ہوئے ہیں؟

← افسوس اور مایوسی کتابت کی غلطیوں اور بری طباعت وغیرہ پر ہوتی ہے، لیکن اس سے آپ کے سوال کا تعلق شاید نہیں ہے۔

۱۱۔ کیا تخلیقی عمل پر نسبی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں؟

← یہ بھی ماہرین کا موضوع ہے۔

۱۲۔ آپ کے خیال میں مردہ ضمیر سے کس حد تک تخلیقی عمل ممکن ہے؟

← بہ خوبی ممکن ہے۔ مردہ ضمیر والا انسان دروغ گوئی، منافقت اور بے باکی کی مختلف قسموں میں درجہ کمال پر پہنچا ہوا ہو سکتا ہے اور بات کو بڑے دل نشیں انداز میں کہہ سکتا ہے۔ انھیں صلاحیتوں کو وہ تخلیقی عمل میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس کا تعلق سلیقے سے ہے اور سلیقے کا تعلق ضمیر کے مردہ یا زندہ ہونے سے نہیں ہے۔

۱۳۔ کیا آپ کے تخلیقی عمل میں کسی نظریے کا ابلاغ بھی مضمر رہتا ہے؟

← جی ہاں، کبھی کبھی، خصوصاً بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں میں۔

۱۴۔ اس کے علاوہ بھی تخلیقی عمل کے بارے میں اگر آپ کچھ کہنا چاہیں؟

← پھر کبھی شکریہ

(سوالنامہ۔ مرتبہ: طارق سعید)

645, Urdu Bagh Purani Sabzimandi,
Faizabad - 224001 (U.P)

بقیہ ۳۸ : غیر ضروری آدمی کی آخری شاپنگ

بیوی کے سامنے کھڑا جیسے گھگھیا رہا تھا۔

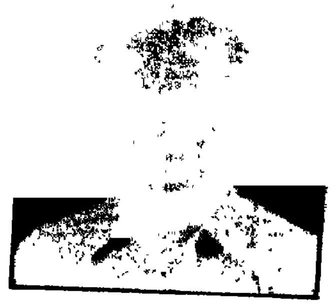
"آخر اس عمر میں تمھیں آوارہ گردی کرنے کی کیا سوجھی تھی"

بیوی نے اسے پھٹکارنے کے انداز میں پوچھا۔

"آوارہ گردی؟! کیا بک رہی ہو تم! میں تو شاپنگ کیلئے نکلا تھا۔"

"شاپنگ!" بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "خالی جیب ہی شاپنگ کو چلے تھے۔"

"خالی جیب نہیں بلکہ نوٹوں سے بھری جیب!" اس نے بھری پری جیب تھپتھپائی اور بڑے اطمینان کے ساتھ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یہ دیکھ کر سخت ندامت ہوئی کہ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل نہیں بلکہ ریٹائرمنٹ کے کاغذات کا پلندہ کانپ رہا تھا۔



علقمہ شبلی

ایک سورج

ایک سورج
روزنِ اخلاص سے
میرے کمرے میں در آیا ایک دن
جگمگا اٹھے دلوں میں قمقمے
کلبۂ تاریک میرا آئینہ خانہ ہوا
تیرگی نے اپنے رخ پر ڈال لی روشن نقاب

ایک سورج
جس سے روشن ہر نظر
منبر و محراب و در
یہ نگر اور وہ نگر
دیدۂ دانش وراں، چشمِ جنوں

ایک سورج
بجھتی آنکھوں کی بصارت بن گیا
انبساطِ زندگانی کی بشارت بن گیا

آج وہ سورج بھی لیکن
غرق آخر ہو گیا
قلزمِ ظلمات میں

● ۵/۸۹، ربن اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶



سید احمد شمیم

صبح ہونے کے بعد

مجھ پر اتنی خزاؤں نے
سفر کیا ہے
کہ میری آنکھوں سے
بہاروں کے خواب
کھو چکے ہیں......
اور اب
میری آنکھیں بند ہوتی ہیں
تو میں خود کو
بے کراں بھیانک سناٹے کے صحرا میں
پاتا ہوں
ایک ناگن
میرا پیچھا کرتی ہے
اور مجھے اپنی سخت
زہریلی پکڑ میں جکڑ لیتی ہے
میں ڈر اور دہشت سے
چیخ اٹھتا ہوں......

اور تب
دن کا زرد مدقوق سورج
دانت نکوس رہا ہوتا ہے —— !!

● J.K.S. Colony, Pardih, P.O.
Kapali Mango, Jamshedpur



سعید الظفر چغتائی

شجرِ ممنوعہ

ایک شجر
پھولوں کی خوشبو
بھینی بھینی
شہد کے پھل
روشن آنکھیں
چڑھی کمانیں
طوبیٰ کی ڈالی
متوالی

ہاتھ بڑھایا
میرا قد چھوٹا تھا
چاہا بڑھ جائے
ہونٹوں پر دل
خونِ مژہ تک
کھنچ آیا

آنکھیں پھاڑیں
منہ کھولا
رک گئیں سانسیں
پلٹا شجر
آنکھوں سے اوجھل
دل پر بوجھ

پھر بھی خیالوں میں آتا ہے
خالی ہاتھ بھڑک اٹھتے ہیں
خونِ جگر کھنچ آتا ہے

● کبیر کالونی، جمال پور،
علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

سیّد مجیب الرحمٰن
92 - Nehru Kunj Colony, Gulbarga - 585104 (Karnataka)

جمالیات : ادب و فن

جمالیات، فلسفہ کا وہ حصہ ہے جس کی اہمیت پر تو لوگ رطب اللسان ہیں مگر اس کی فلسفیانہ توضیح میں بہت کم ترقی کی ہے۔ خود سقراط نے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا ہے کہ جمالیات کا احساس حسن کے روپ میں ملتا ہے۔ سینٹ آگسٹین، ساری کائنات کو حسن کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ کانٹ نے البتہ اور وضاحت کی کہ عقل اور ارادہ کے بیچ میں جمالیاتی حسن ایک کڑی کا کام کرتی ہے۔ شلر نے کانٹ کی داخلی تصوریت سے اختلاف کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ حسن محض ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ نظامِ قدرت میں موجود ہے۔ سارترے کہتا ہے کہ حقیقی شے جو فطرت میں ملتی ہے حسین نہیں ہو سکتی۔ حسن ایک ایسی قدر ہے جو تخیل سے ہی وابستہ ہو سکتی ہے۔ جو دنیا کی بنیادی ساخت کی نفی سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ تخیل کے لئے شعور کو حقیقی دنیا سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے۔ ہیگل نے کہا کہ کوئی شے از خود حسین نہیں ہے بلکہ واہمہ کی پیداوار ہے۔ اور یہ کہ جمالیاتی عمل مظاہر اور اس کے سرچشمہ یعنی تصوراتی ماڈل کے درمیان عدم مطابقت کو پاٹنے کا نام ہے۔ اسی خیال کو ہیگل نے ایک باضابطہ تصوری فلسفے کی شکل دے دی۔ فرانسیسی مفکر ٹائن (Taine) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جمالیات کا کوئی مطلق معیار نہیں ہو سکتا اور آخر میں چارنیشف کی (N.G.C. Chernyshevsky 1889-1928) نے یہ بات کہی ہے کہ حسین شے وہ ہے جو ہماری زندگی سے قریب ترین رشتہ رکھتی ہے۔

غالبًا یہ سارے مفکر اپنی اپنی جگہ درست تھے۔ پھر بھی ان سب کو پڑھ کر ہم جمالیات کی کوئی صحیح تعریف نہیں کر سکتے۔ جب ہم کو جمالیات کا حرکی نظام باضابطہ شکل میں مل جائے تو ہمیں ان سارے مفکروں کی توجیہہ مل سکے گی۔

ہندوستان کے قدیم سنسکرت ادب میں جمالیات کیلئے 'رس' کا نام دیا گیا ہے۔ جس کی فلسفیانہ تعریف یہ ہے کہ جو چیز مظاہر میں ہم آہنگی اور دلکشی پیدا کرے وہ چیز جمالیاتی قدر والی ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت ادب میں اس کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جیسے شرنگار رس (اروٹک حسن) شانت رس (سکون والا حسن) ویر رس (بہادری کا حسن) وات سلیہ رس (ماں باپ اور اولاد کے بیچ محبت والا حسن) بھگتی رس (عقیدت کا حسن) وغیرہ۔ اس کے علاوہ قدیم سنسکرت ادب میں بدصورتی کو کراہتوں کی قدر عطا کرنے کے فن کو رس بی بھتس کا نام دیا گیا ہے۔

قدرت کا جمالیاتی قانون ایک بے ساختہ عمل ہے۔ وہ جس طرح زبان کے ذائقے کو جسم کی غذائی ضرورت کی تکمیل کے لئے اکساتا ہے اسی طرح مخصوص جسمانی ظاہری وضع قطع اور پیچ و خم کی دل کشی میں وہ مخصوص کرداری خصوصیات کے حصول کی ضمانت دیتا ہے۔ گویا جسمانی ہیئت صرف جلد تک محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی دوڑ حیاتیاتی خلیوں، رگوں و ریشوں اور انسانی مخصوص کردار تک ہوتی ہے۔ اور مخصوص لوگوں کی ایسی مخصوص پسندیدگی کو ہم جمالیاتی پسندیدگی کہتے ہیں۔ گویا جمالیات جسمانی اور روحانی کشش ثقل کے نظام کا دوسرا نام ہے۔

جمالیات کو فلسفے کے درجے تک لے جانے میں علم خط و خال (Physiognomy) کا بڑا اہم رول ہے۔ یونانی مفکر تھیوفریٹس جو افلاطون کا شاگرد تھا کہتا ہے کہ سارے انسان کردار کے اعتبار سے دو قسم کے ہیں۔ ایک درون بین (Introvert) اور دوسرا بیرون بین (Extrovert) اور یہ کہ سارے درون بین چھریرے بدن کے ہوتے ہیں اور بیرون بین بھاری بھر کم۔

یونانی ماہر امراض ہپاقریطس نے انسانی جسم کی ہیئت کی بنیاد کو دو واضح خانوں میں ظاہر کیا ہے۔ گول چہرہ اور چربیلے جسم کے انسان کو اس نے پکنک (Pyknic) کا نام دیا اور دبلے پتلے یا لمبوترے جسم والے کو لپٹوسم (Leptosome) کہا۔ پکنک کی خصوصیات کے بارے میں اس نے یہ بتایا کہ ایسے افراد خون کے دباؤ کی بیماریوں کے شکار ہوتے ہیں اور دماغی بیماری کی حالت میں وہ جنون اور طبیعت کی پستی (Manic Depression) کے شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ پھرتیلے اور جذبات کا اظہار کرنے والے ہوتے ہیں۔ درمیانی عمر میں ان کا پیٹ بڑھ جاتا ہے اور سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف لمبوترے جسم والے لپٹوسم لوگ دبلے پتلے ہوتے ہیں اور لمبوترے نظر آتے ہیں ان کے گال پچکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ

جسمانی طور پر بیمار ہوں تو زیادہ تر دل کی بیماریوں کے شکار ہوتے ہیں۔ اور دماغی طور پر بیمار ہوں تو Schizophrania شزوفرینیا کے شکار ہوتے ہیں۔ خاموش خاموش آہیں بھرنے والے۔ وہ غیر حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے کٹے ہوئے رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس صدی کے تیسرے دہے میں جرمن ماہر نفسیات ڈاکٹر کرشمر نے ہپا قریطس کی بنیادی تقسیم کو مان کران کی مزید ذیلی تقسیم کی ہے۔

اس کے بعد میری تحقیق آتی ہے۔ میں نے پہلی بار یہ بات بتائی کہ جمالیاتی احساس ایک جبلت ہے۔ اور اس کا تعلق دماغ سے ہے۔ جس طرح مارکٹ میں بکنے والی اشیاء کی قدر کا تعین سونے کی بنیادی قدر سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری ساری جبلتوں کو کیفیاتی مقام کی جمالیاتی جبلت کے ذریعہ ملتا ہے۔ اگر ساری جبلتوں کی تکمیل ہو بھی جائے اور جمالیاتی جبلت تسکین نہ ہو تو وہ آدمی ادھورا اور ٹوٹا پھوٹا سا ہو جاتا ہے۔ پھر میں نے ہپا قریطس کی جسمانی اور کرداری تقسیم کو قبول کرتے ہوئے یہ ضابطہ بھی دریافت کیا کہ جس طرح ہومیوپیتھی کے علاج میں مماثل بیماری کو ٹھیک کرنے کے لئے اسی کے مماثل بیماری کے زہر سے ٹھیک کیا جاتا ہے اسی طرح مماثلت رکھنے والے اجسام ایک دوسرے کیلئے کشش رکھتے ہیں۔ پکنک آدمی پکنک آدمی کو پسند کرتا ہے اور لپٹوسم آدمی لپٹوسم کو۔ انہیں اپنی ہی نوع میں دلکشی نظر آتی ہے۔ اور یہ دلکشی اس وقت تک اس نوع میں قائم رہتی ہے جب تک کہ اس نوع کے کردار کی خصوصیات اسے عزیز ہوں۔ ایک صاف گو آدمی گول منول آدمی کو پسند کرتا ہے اور ایک آدمی جو ہر بات کو راز میں رکھتا ہے اسے دبلے پتلے چھریرے لوگ دلکش لگتے ہیں۔ جب جمالیات علم خط و خال (Physiognomy) سے آگے بڑھ کر فلسفیانہ مقام تک پہنچ جاتا ہے تو وہ یوگ اور تصوف کا ایک دوسرا روپ جیسا لگتا ہے۔

اصولاً چونکہ ہر آدمی کا مرکز اس کا اپنا دماغ ہے۔ اس لئے اس کا قریب ترین آدمی بھی اس کے لئے دوری والا ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ہم نوع کی دلکشی بھی اضافی نوعیت کی ہی ہو سکتی ہے۔ مطلق نوعیت کی نہیں۔ البتہ ہمارے دماغ کا جو وجودی ماخذ ہوتا ہے وہی اس کے ساتھ مطلق مماثلت رکھ سکتا ہے مگر وہ جسم کی شکل میں نہیں بلکہ اس کے تصور کی شکل میں ہوگا۔ اسی تصور میں ہمارے سارے جمالیاتی رشتے امکانی طور پر گندھے ہوئے ہیں۔ جب احساس، آگہی کے درجہ تک جاگ جاتا ہے تو ایک جمالیاتی سالک اپنے اس ماخذ کو ہی اپنی منزل کی طرح پہچان لیتا ہے اور جب شناخت کی یہ منزل پوری ہو جائے تو سالک کے تصور کا آئیڈیل پیکر ایسے تصور کو حقیقت سے مجاز کی شکل میں بدل دیتا ہے۔ اس طرح ایک آئیڈیل جمالیاتی پیکر ایک تصور بھی ہے اور ایک مادی حقیقت بھی مگر وہ حقیقت جو محض فطرت کے عام قاعدے کے مطابق قابل حصول نہیں ہے بلکہ جمالیاتی آگہی سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ غالباً علامہ اقبال نے بھی اسی احساس اور آگہی کی بات کو اس شعر میں بیان کیا ہے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں　　　کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

احساس کے اس درجہ جاگنے کے بعد ہمیں جو چیزیں حسین پیکر کی طرح نظر آتی ہیں انہیں جمالیاتی سالک اپنی منزل نہیں سمجھتا۔ بلکہ منزل کے نشانِ راہ۔ آخر میں ادب اور فن میں جمالیات کے انطباق کا مسئلہ آتا ہے۔ ہر نشیب کو اس کے امکانی فراز سے جوڑنا اور فراز کو اس کے نشیب سے مربوط کرنے سے ادب اور فن میں جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک پینٹر ایک زبردست بلند درخت کی شاخوں کو اس کے وزنی پھلوں کے ساتھ زمین تک جھولتے ہوئے دکھائے تو وہ حسین ہوگا اور جیسے ایک ناول نگار اپنی عظمت کی بلندیوں کو چھونے والے کردار کے اس روپ کو بھی دکھائے کہ وہ چھوٹے بچوں کی طرح سیدھا سادا ہے اور اس میں انکساری بے حد ہے۔ اس کے برخلاف ایک ایسا بڑا آدمی بھی ہے جو اپنی بڑائی کے ڈنکے خود ہی پیٹتا ہے۔ جمالیاتی کیفیت اس میں اس بات سے پیدا ہوگی کہ اس بڑے آدمی کے چھوٹے پن کو دکھایا جائے۔ نشیب کو فراز کے رشتے سے جوڑنا اور فراز کو نشیب سے، ہم فنکارانہ دنیا میں روز ہی دیکھتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کے ضابطوں سے واقف نہیں ہیں اس لئے جمالیاتی عمل سے ناواقف ہیں۔ مثلاً آج کل ٹی وی پر دو منٹ کا ایک تعلیمی فیچر دکھایا جاتا ہے۔ دو لڑکیاں آپس میں بات کرتی ہیں۔ امیر لڑکی اپنا نام منجو بتاتی ہے۔ غریب لڑکی بھی کہتی ہے اس کا نام منجو ہے۔ دونوں بھی ایک دوسرے کو بتاتے ہیں کہ ان کا بھائی اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔ جب امیر لڑکی یہ کہتی ہے کہ وہ یہاں پڑھنے کے بعد ڈاکٹر بنے گی۔ تب غریب لڑکی کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ہمت کر کے حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ چونکہ وہ غریب ہے اور اسے کام کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ نہیں پڑھ سکتی۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے غریب لڑکی کلائمکس پر نظر آتی ہے۔ اس فیچر میں وہی محبوب کردار نظر آتی ہے۔ اس وضاحت کے بعد سقراط، آگسٹن، کانٹ، شلر، سارترے، ہیگل اور چرنیشف کی اور سنسکرت ادب میں بتائے گئے 'رس' کے نظریے قابل فہم بن جاتے ہیں۔ ○○

شاعر کے قارئین سے

- زرسالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے میں اپنا تعاون دیجئے۔
- منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف صاف انگریزی میں ضرور درج کیجئے۔
- زرسالانہ بھیجتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنے مستقل خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔



شائق مظفر پوری

دوستی کی فضا ابھی نہیں ہے
عکس ریز آئینہ ابھی نہیں ہے

آسماں پر نظر نہیں کسی کی
سر پہ سورج چڑھا ابھی نہیں ہے

بجلیاں ہیں بھری ہوئی رگوں میں
خون پانی ہوا ابھی نہیں ہے

دبنے کا لگا ہوا ہے کھٹکا
خدا کا خدا ابھی نہیں ہے

ل گلشن سمجھ چکے فضا کو
ناخ پر فاختہ ابھی نہیں ہے

ر کس پر کریں ابھی بھروسہ
ہنما ، رہنما ابھی نہیں ہے

زلوں کے سمٹ گئے ہیں رستے
ر شائق تھکا ابھی نہیں ہے

۱۱۱۹، اولڈ پردلیہ روڈ، ذاکر نگر۔ جمشید پور (بہار)



محبوب راہی

دولت، عزت، شہرت جانے کیا کیا میرے پیچھے
میں آگے آگے ہوں ساری دنیا میرے پیچھے

آگے آگے سچائی کی نوکیلی چٹانیں
گلشن ایک مہکتا سا خوابوں کا میرے پیچھے

جب چلنا ہی ٹھہرا تو بالآخر میں کیوں دیکھوں
کیا کیا میرے آگے ہے اور کیا کیا میرے پیچھے

تنہا لگتا ہوں میں لیکن تنہا کب رہتا ہوں
ساتھ لگا رہتا ہے میرا سایہ میرے پیچھے

جانا ہے تو اپنے چاہنے والوں کے گھر جائے
پڑی ہوئی ہے کیوں یہ آخر دنیا میرے پیچھے

جتنے بھی ہیں سارے جیتے جی کے یارانے ہیں
مجھے پتہ ہے کوئی نہیں آئے گا میرے پیچھے

جن کے آگے رکھ دیتا ہوں میں اکثر آئینہ
کیسے کہیں گے آخر مجھ کو اچھا میرے پیچھے

جیسے جیسے منزل کی جانب بڑھتا ہوں راہی
ویسے ویسے پڑجاتا ہے رستہ میرے پیچھے

● بارسی ٹاکلی 444401، ڈسٹرکٹ آکولہ (مہاراشٹر)

اندر سروپ سری واستوا

مضطرب ، مضمحل ، بے قرار آدمی
سب کے دکھ درد سے ہمکنار آدمی

اس کی تنہایاں انجمن ، انجمن
ایک ہی ذات میں بے شمار آدمی

اور جلوے ابھی عام ہونے کو ہیں
اور کرتا رہے انتظار آدمی

ہر طرف بھاگتی ، دوڑتی زندگی
ایک پھیلا ہوا کاروبار آدمی

ختم ہوکر رہا زندگی کا سفر
ہوگیا بڑھتے بڑھتے غبار آدمی

آستینوں میں خنجر چھپائے ہوئے
آدمی کے لئے بے قرار آدمی

ہے بہاروں کے موسم میں بھی مضمحل
ہے خزاں میں بھی باغ و بہار آدمی

راستہ مجھ کو ملتا نہیں ہے سروپ
میرے چاروں طرف بے شمار آدمی

● ۷۶۰، سوانی، فتح پور (یوپی)

خالد سہیل
PENT HOUSE NO.16, 100-WHITE OAKS CRT.
WHITBY ONT CANADA - LIP 187



ایک موڑ

ایک دن وہ دونوں دوست اداس اور غمگین تھے اور شام کی چائے پینے جمع ہوئے تھے۔ دونوں نے اپنے افسردہ دل ایک دوسرے کے سامنے پیش کر دیے۔

وہ کہنے لگی "تم میرے واحد ہمدرد دوست ہو۔ کاش میرا خاوند بھی میرا دوست ہوتا۔ میں نے ساری عمر اسے اپنے دل کا حال سنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ کسی اور ہی دنیا کا باشندہ لگتا ہے۔

ہم ایک دوسرے کی زندگی کے واقعات تو جانتے ہیں دل کے رازوں سے واقف نہیں۔

ہم ایک دوسرے کو دن کا حال تو سناتے ہیں راتوں کے خواب نہیں بتاتے۔

ہم ایک دوسرے کے جسم تو گلے لگاتے ہیں لیکن روح کو نہیں چھوپاتے۔

وہ شریک حیات تو میرا ہے لیکن شامیں غیر عورتوں کے ساتھ گزارتا ہے۔

آخر آج میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور میں اسے چھوڑ کر چلی آئی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جذباتی ہو گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

اس کے دوست نے اسے تسلی دی اس کے آنسو پونچھے اور پھر کہنے لگا: "تم بھی میری واحد ہمدرد دوست ہو کاش میری بیوی بھی میری دوست ہوتی اور میرے خوابوں کی تعبیر بن سکتی میں نے ایک طویل عمر اس کے ساتھ گزاری ہے لیکن ہم دریا کے دو کناروں کی طرح ہی سفر کرتے رہے ہیں۔ آج وہ کہنے لگی "میرا تمہارا گزارہ بہت مشکل ہے۔ تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو میں حقیقت کی دنیا میں رہنا چاہتی ہوں۔ تمہاری زندگی کا مقصد فن، ادب، اور موسیقی کے پودوں کو سینچنا ہے اور میری زندگی کا مقصد گھربار اور خاندان کی ذمہ داریاں اٹھانا ہے۔ میں تمہارے ناز و نعم اٹھا اٹھا کر تھک چکی ہوں اب اجازت چاہتی ہوں" یہ کہہ کر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس کے دوست نے اسے تسلی دی اور اس کے آنسو پونچھے۔

اس کے بعد وہ دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر اچانک دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما، ایک دوسرے کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور آپس میں یوں بغلگیر ہو گئے جیسے وہ صدیوں سے اسی لمحے کا انتظار کر رہے ہوں۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر وہ دونوں چڑیوں کی طرح چہچہا رہے تھے۔ ●●

غزلیں



ارتضیٰ نشاط

کوئی تک ہے ، خدا کوئی نہیں ہے
کسی شے میں خلاء کوئی نہیں ہے
ہزاروں راستے ایسے کھلے ہیں
ابھی جن پر چلا کوئی نہیں ہے
کہاں تک رال ٹپکاتے پھروگے
کہ اس کو چاٹتا کوئی نہیں ہے
کہا دل نے کہ ہوسکتا ہے کوئی
نگاہوں نے کہا ، کوئی نہیں ہے
بچھی ہے پیڑ کے نیچے وہی بینچ
مگر بیٹھا ہوا ۔کوئی نہیں ہے
ستاؤ ، میں طلب نا آشنا ہوں
مجھے چھوڑو ، مرا کوئی نہیں ہے
غزل میں ارتضیٰ یوں جوجھتے ہو
تمہارے بعد کیا کوئی نہیں ہے

◆

کہاں موضوع کوئی کائناتی
کثافت کم نہیں ماحولیاتی
کسی کا ہوچکا پہلی نظر میں
یہ میرا دل ، میرا احساس ، ذاتی
گڑے مردے اکھیڑو اور دیکھو
لکھا ہے ہڈیوں پر بے ثباتی
نمایاں ہوکے جینے کی امنگیں
ملیں پژمردگی کے ساتھ جاتی
بڑی مایوس ، پژمردہ سی غمگیں
رہی ، جینے کی قوت نامیاتی
ذرا دیکھو ستارے اور جگنو
کوئی شے ان میں آتی اور جاتی
سنے ہیں شعر جب سے ارتضیٰ کے
ہماری سوچ سوتی ، بڑبڑاتی

◆

روز فکرِ وصال میں رہنا
آنسوؤں کا رمال میں رہنا
کس نے دیکھی جمال کی تکمیل
کون سمجھا جلال میں رہنا
خود کو بھگوان بن کے دکھلاؤ
ورنہ پوجا کے تھال میں رہنا
ہے نفی سے ثبات کا اصرار
مستقل قیل و قال میں رہنا
یوں تھرکنا کہ کائنات ہلے
مجھ سے ملتے ہی تال میں رہنا
ہے ہنر کی یہی غرض ، غایت
بے غرض ، باکمال میں رہنا
سخت حیرت کی بات شاعر جی
قول کا یوں محال میں رہنا
موت پر ارتضیٰ کی لوگوں کا
ہر جگہ ایک حال میں رہنا

◆

صادق آتے ہیں باب میں میرے
پھول تیری کتاب میں میرے
جان پر کھیل کر بچا لوں گا
جتنے غم ہیں حساب میں میرے
کیسے کیسے سجے ، سنہرے دن !!
میکدے میں ، شراب میں میرے
تجھ کو کیسے معاف کردوں میں
ہے خدا احتساب میں میرے
میں بغاوت میں پیش پیش رہا
سر ابھرتے ہیں خواب میں میرے
یہ سنی ان سنی کا دور عجب
زہر بھردے خطاب میں میرے
کھول گھوڑے سخن سرائی کے
پاؤں جڑ دے رکاب میں میرے
شعر ہی تھے جو کام آئے نشاط
ہر نئے انقلاب میں میرے

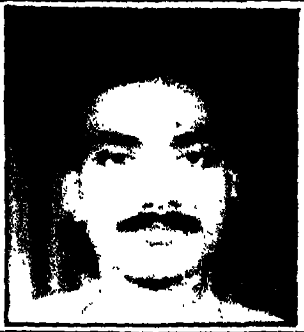
◆

جس قدر ہیں سب ادھوری کوششیں
کرچکے ہیں لوگ پوری کوششیں
دھوکا دے جاتا ہے اکثر لاشعور
لاشعوری ہیں ، شعوری کوششیں
میری تیرہ بختیوں کا واسطہ
آپ کی کچھ اور نوری کوششیں
ہمکلامی کا شرف بخشا گیا !!
حضرتِ موسیٰ کی طوری کوششیں
میں کہاں ، مسجد کا دروازہ کہاں
غیب سے ابھریں حضوری کوششیں
زندہ رہنے کی ضرورت کے طفیل
اور ہی کچھ ہیں ضروری کوششیں
یہ سیاست ، عامل و معمول سی
یعنی جمہوری ، جموری کوششیں
بے دلی ، بے چہرگی ، بے رونقی
رنگ لے ہی آئیں صوری کوششیں
پھر غزل کو اک نیا رخ چاہیے
ارتضیٰ جی ، پھر عبوری کوششیں

◆

کرچکا میں پیش بندی پوچھیے
یعنی مجھ سے آپ جو بھی پوچھیے
ڈوبنے والے سمندر پی گئے
مچھلیوں نے لاش کھالی ، پوچھیے
میں نہیں تو کون ہے آسودہ حال
صبر کی سنیئے ، سکوں کی پوچھیے
ہیں عمل کرنے میں کتنے مستعد
دھمکیاں دینے کے عادی پوچھیے
کیمیا کیا چیز ہے ، کندن ہے کون
گھس رہی ہے میری مٹی ، پوچھیے
ہوگئے چودہ طبق روشن جناب
اور آگے روشنی کی پوچھیے
رہ گیا ہے آپ کا اب ایک ہاتھ
کیسے بج سکتی ہے تالی پوچھیے
کس طرح جنگل میں چلتی ہے ہوا
کتنے پانی میں ہے بستی ، پوچھیے
دوسرا دن ، دوسرا دن ہے نشاط
آج تو بس آج ہی کی پوچھیے

معرفت: روزنامہ انقلاب، ۱۵۶۔ڈی، جے دادا جی روڈ، تاڑدیو، ممبئی ۳۴



مُبین صدیقی
قلعہ گھاٹ کالونی، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

ردِ مابعد جدیدیت

مابعد جدیدیت کی ترکیب جیسا کہ اُس کی لفظیات سے ظاہر ہے، جدیدیت سے مستعار ہے، جبکہ جدیدیت اپنی اصطلاح میں خود فکر و خود شعار واقع ہوئی ہے۔ اس نے موضوعاتی اور تکنیکی دونوں سطحوں پر اپنی دنیا علیحدہ تعمیر کی ہے۔ اس کے اپنے نظام و قوانین ہیں۔ چنانچہ ہر زاویے سے ماقبل جدیدیت اور جدیدیت میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ جدیدیت ایک رجحان ہوتے ہوئے بھی اردو ادب کی اہم تحریکوں کے بالمقابل خاصی انقلاب انگیز رہی ہے۔ جدیدیت نے تمام رائج رنگوں میں اپنی الگ شناخت قائم کرتے ہوئے اور تمام قائم آوازوں میں اپنا منفرد آہنگ، ثابت کرتے ہوئے اردو ادب کی اہم اصناف مثلاً غزل، نظم، افسانہ، ناول، ڈرامہ وغیرہ میں نمایاں طور پر عہد ساز تخلیقی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جہاں تک ترقی پسندی کا تعلق ہے یہ اردو ادب کی واحد ایسی تحریک رہی ہے جس کا باضابطہ مینی فیسٹو رہا ہے اور جس نے ایک عرصے تک اپنے آئینی ادب کے ذریعے زمینی مسائل اور سماجی سروکار سے اردو ادب کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ بہت حد تک مستفیض بھی کیا ہے۔ موضوع کی مختلف سطحوں پر مثلاً انگریزوں کی ظالم حکومت، جاگیرداروں کے استحصالی نظام، قدروں کی شکست و ریخت اور معاشی سماجی ناہمواری کی داستانیں ترقی پسند ادب کے اعلان سے قبل بھی حقیقت پسندی (Realism) اور تعقل پسندی (Rationalism) کے ناموں سے پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے بعد ہی ترقی پسندوں کا غلغلہ عام ہوا اگرچہ کہ ترقی پسندوں کا یہ بہت بڑا امتیاز ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں نسبتاً زیادہ طنطنہ و طمطراق کے ساتھ اپنی الگ تاریخ لکھی۔ لیکن چونکہ یہ تاریخ کئی اعتبار سے حقیقت پسندوں کی تیار کی ہوئی زمین پر لکھی گئی چنانچہ دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک بھی پایا جاتا ہے۔ اس معنی میں ترقی پسندی کو حقیقت پسندی کی توسیع کہنا چاہئے۔ البتہ بعض زمینی اور مسائلی موضوعات ترقی پسندوں نے از خود دریافت کئے اور انہیں ایک نئے ضابطے کی شکل بھی عطا کی۔ انہوں نے عام لوگوں بالخصوص مزدوروں اور غریبوں کے نئے مسائلی گوشے ہی دریافت نہیں کئے بلکہ انہیں الگ الگ ضابطوں کے تحت نئے قوانین بھی سکھائے۔ ان کے تحفظات کا یقین کیا اور عملی طور پر ان کی مورچہ بندی بھی کی۔ ترقی پسندوں نے حقیقت پسندوں کے مقابلے میں اپنے مسائل کو زیادہ شدت، احتجاج اور اشتعال کے ساتھ پیش کیا۔ یعنی تخیل پسندی، رومانویت اور انشاپردازی کی کمزوریوں سے بالعموم اپنے ادب کو بچایا اور اس کا تعلق براہ راست اپنے مافی الضمیر یا اظہار انقلاب سے وابستہ رکھا جبکہ حقیقت پسندوں نے مقصدیت کے ساتھ تخیل پسندی، رومانویت اور انشاپردازی کے جادو بھی جگائے اور اخلاقیات و دینیات پر بھی زور دیا۔ یہ لوگ شدید احتجاج اور براہ راست اشتعال سے خود کو بچاتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اسلوب میں وضع داری، ملائمیت، شفقت اور شرافت جیسے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نظم جدید اور تنقید کا ابتدائیہ لکھنے والے الطاف حسین حالی، اردو ناول کی ابتدا کرنے والے ڈپٹی نذیر احمد، تاریخ (زبان و ادب) کو اعتبار و وقار بخشنے والے علامہ شبلی نعمانی اور مضمون نویسی کو قلب و جگر عطا کرنے والے سر سید احمد خاں وغیرہ کے اسالیب کا ایک مشترکہ امتیاز یہ تھا کہ یہ تلخ ترین صداقتوں کو بھی اشتعال و احتجاج کی شدت کے بجائے ایسی نرمی، محبت اور بزرگی کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ قارئین و سامعین اپنے سر خم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ بزرگ آپس میں نظریاتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے رفیق اور جاں نشیں ہوا کرتے۔ اپنے بزرگوں، ہم عصروں اور عزیزوں کا پاس و لحاظ جانتے اور موقع و محل کے مطابق ان کے حقوق ادا کرتے رہتے تھے۔ ترقی پسندوں تک آتے آتے یہ تہذیبی خصوصیات کم ہوتی چلی گئیں۔ جدیدیوں تک بہت کم اور آج تو خیر۔! اصلاح پسندوں کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف مثبت (Positive) اور تعمیری (Constructive) ادب کے پروردہ و دلدادہ تھے بلکہ عملی طور پر (محض زبانی یا ادبی نہیں) بہترین یادگاریں بھی قائم کرتے رہتے تھے۔ سر سید احمد خاں یا علامہ شبلی نعمانی وغیرہ نے عظیم و عہد ساز درس گاہیں قائم کیں تو مولانا ابوالکلام آزاد نے جنگ آزادی کے اہم دنوں میں اردو کی تاریخ ساز نمائندگی کی اور اپنی صحافتی خدمات کے ذریعے ماحول کو ہر طرح ساز گار بنایا۔ ترقی پسندوں میں ایسے عملی نمونے نسبتاً کم پائے جاتے ہیں۔ (بغاوت و سرکشی کی طرف زیادہ جھکاؤ کے سبب) اور جدیدیوں میں بہت ہی کم (انفرادیت و داخلیت کی شدت کے سبب) اور آج کے لوگ تو خیر ان عملی مجاہدوں یا تعمیری خوبیوں کو پرانی، فرسودگی یا ثانوی چیزوں کے زمرے میں رکھیں گے۔ چونکہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے منفی نتائج ان پر زیادہ مسلط ہیں چنانچہ او چھی تخریب پسندی انہیں

خوب خوب مرغوب ہو گی۔ایسے میں علامہ اقبال کی عظیم شاعری انہیں اکہری یا سطحی معلوم ہو یا آزاد کی نثر انہیں جذباتی لگے تو کچھ حیرانی کی بات نہیں۔ البتہ افسوس یہ ہے کہ کواجب مور کی چال چلنے کی بھول کرنے لگتا ہے تو اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔جدیدیوں کو تراش خراش میں جو مہارت حاصل تھی اور جس خود داری کے ساتھ تخلیقیت کی تمام سطحوں پر انہوں نے خود کو منفرد و مختلف جتانے کی کوشش کی، آج (۱۹۹۹ء) نو وار دانِ ادب میں دور دور تک اس کا شائبہ بھی نہیں ہے۔اور نہ ہو سکتا ہے۔کیونکہ ان میں سے بیشتر تیسرے درجے کا ادب تخلیق کر رہے ہیں یا اپنے مستقبل سے خائف ہونے کے سبب تخلیقیت کی بجائے عیار ادبی سیاست پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں۔ آج کا شاعر شاعری سے زیادہ سیاست، ریاضت سے زیادہ نمائش، خود انکاریت سے زیادہ تقلید اور عدل سے زیادہ آمریت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔اس کی ساری جستجو کا حاصل بھی ہے کہ کسی طرح خود کو کچھ نہ کچھ منوالیا جائے خواہ "مابعد جدیدیت" جیسی بے حقیقت اصطلاح کی امامت ہی کیوں نہ ہو۔ایسا لگتا ہے کہ اس وقت فکری و فنی دریافت و بازیافت کا معیار زوال آمادہ ہو چکا ہے اور تخلیق کار شدید قسم کے کنفیوژن اور ادبی سیاستوں کے بحران کا شکار ہو چکے ہیں۔فرض کیجئے کہ "مابعد جدیدیت" جیسی کوئی چیز ان معنی میں موجود ہے کہ گذشتہ ۱۸ سالوں سے (جیسا کہ کہا جاتا ہے ۸۰ء کے بعد) اس میں طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے تو بعض بنیادی سوال اصولی طور پر قائم ہوتے ہیں (جن کے جواب بہت دماغ سوزی کے بعد بھی شاید کسی کے پاس نہ ہوں) مثلاً۔

(۱) کہ اگر گذشتہ اٹھارہ برسوں کے طویل عرصے میں "مابعد جدیدیت" نے مختلف اصناف ادب میں نہ صرف خود کو متعارف کرا دیا ہے (جبکہ ابھی سنگ بنیاد ہی کا پتہ نہیں چلتا) بلکہ فکری / موضوعاتی / فنی / ہیئتی / تکنیکی سطحوں پر بھی اس نے نئی دریافت و بازیافت کے ذریعے خود کو جدیدیت اور ماقبل جدیدیت سے مختلف کر دکھایا ہے (جیسا کہ ان پر واجب ہے یا جیسا کہ ان کے پیش رووں نے اپنے پیش رووں سے خود کو مختلف ثابت کیا)۔ تو اس کی مثالیں کہاں ہیں؟

(۲) کیا گذشتہ اٹھارہ سالوں کی طویل مدت میں "مابعد جدیدیت" کے اثرات ادب کے ساتھ ساتھ سماجیات و سیاسیات پر بھی اثر انداز ہو سکے ہیں؟ (جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے)

(۳) ہر نئے ادب کی اپنی خاص لفظیات، معنیات، تشریحات، اصطلاحات اور ترجیحات موجود ہیں۔اس ضمن میں "مابعد جدیدیت" کے پاس اپنا سرمایہ و ذخیرہ کیا ہے؟

(۴) ہر نیا ادب اپنے موضوعات کے ساتھ ساتھ اپنی ہیئتیں بھی وضع کرتا ہے۔ "مابعد جدیدیت" نے صنف ڈراما، ناول، افسانہ، غزل یا نظم وغیرہ میں ہیئتی طور پر کیا کیا اضافے کئے ہیں؟

ان کے علاوہ بھی سوال ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں یہی سوال بہت ہیں کہ ان کے جواب تلاشنا بھی آسان کب ہے۔جواب ہوں تو کوئی ادبی مکالمہ بھی ہو۔مجھے یقین ہے کہ "مابعد جدیدیت" کے خوشہ چیں مذکورہ سوالوں کے صحیح جواب نہیں دے سکیں گے۔شاید اس لئے کہ وہ جن ترقی پسندوں یا جدیدیوں کو قصۂ پارینہ سمجھانا چاہتے ہیں۔دراصل انہیں کے سمجھائے اور بتائے ہوئے انداز میں بتانے یا سمجھانے کے قائل ہوا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ انہیں کی زبان میں بولنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔اس نقل میں انہیں کتنی کامیابی مل سکے گی یہ کہنا مشکل ہے۔کسی حد تک مل بھی جائے تو بھی حیثیت نقل کی ہی ہو گی، اصل کا تو سوال نہیں اٹھتا۔ "مابعد جدیدیت" کے وجود کی دراصل کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔یہ بے اصل و بے حقیقت ہے یا کچھ کنفیوژڈ لوگوں کی خام خیالی اس کے اپنے کوئی اصول و قوانین نہیں۔یہ ایسے لوگوں کا محض جذباتی ردِ عمل ہے جنھیں جدیدیوں یا ترقی پسندوں سے کسی نہ کسی سطح پر حسد ہے۔یا انھیں ترقی پسندوں اور جدیدیوں میں کوئی جگہ نہیں مل سکی ہے۔افسوس کہ بعض ذہین و باصلاحیت شعراء و ادباء بھی اس مکر جال میں پھنس کر اس کا لقمہ بنتے جا رہے ہیں۔

"مابعد جدیدیت" والے کہتے ہیں کہ انہوں نے تقریباً اٹھارہ سال گذار لئے پھر بھی انھیں تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے۔میں یہ دیکھتا ہوں کہ آج بھی جو ادب لکھا جا رہا ہے وہ ترقی پسندوں یا جدیدیوں کے دائرۂ کار سے باہر نہیں ہے۔یعنی پیش رووں کی فکری و فنی رہ نمائی کے بغیر لقمہ نہیں ٹوٹتا۔مثال میں ۸۰ء کے بعد کے کسی ڈراما، ناول، افسانہ، نظم یا غزل کا حوالہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو اسلوب و آہنگ یا ہیئت و موضوع کی سطح پر جدیدیوں یا ترقی پسندوں سے مختلف ہو یا جن کی تخلیق و تقلید میں بزرگوں کا اسلوب و آہنگ اختیار نہ کیا گیا ہو۔اس کے باوجود کوئی خود کو مختلف سمجھنے یا سمجھانے کی ضد کرے تو اسے سوائے لاعلمی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ "مابعد جدیدیت" کے خوشہ چیں یہ بھی بھول لیتے ہیں کہ اٹھارہ سالوں میں بھی (بقول انہیں کے) اپنا سنگ بنیاد رکھنے میں وہ اب تک ناکام ہیں جبکہ جدیدیوں یا ترقی پسندوں نے اس سے بھی کم عرصے میں نہ صرف اپنا اپنا فیسٹو ادب و زندگی پر حاوی کر دیا تھا بلکہ اپنا الگ اسلوب و آہنگ تراشنے کے علاوہ اپنی خاص لفظیات، معنیات، تشریحات و اصطلاحات بھی جاری و ساری کر چکے تھے۔جدیدیوں نے بھی بہت کم وقت میں ترقی پسندوں ہی کی طرح خود کو منوالیا تھا۔فرض کہ ان اٹھارہ سالوں میں ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے ہر صنف میں بیسوں ایسی دیو قامت یا لیجنڈ شخصیتیں دی



پرکاش تیواری

ماہیے

گنگا بھی ہے جمنا بھی
پھر بھی یہاں صاحب
قطرے کو زباں ترسی

•

انساں کی دعا سے اب
زندگی شہروں میں
چلتی ہے دوا سے اب

•

دنیا کو کہے فانی
زندہ ہے صدیوں سے
مانے نہ مگر گیانی

•

دکھ درد بھرا جیون
یار کی کرپا سے
وردان ہوا جیون

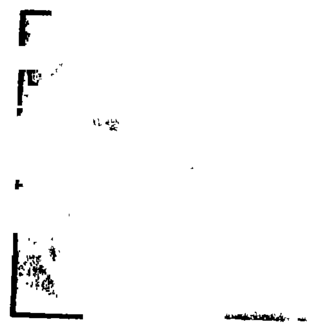
•

سینے میں چلے لو سی
ٹھنڈ پڑے گوری
چاٹی کی پلا لسی

•

کیا پیار نبھاتا ہے
درد جگر دے کر
اب پلا چھڑاتا ہے

• B-4، سیکٹر - 14 (ایکسٹینشن)
روہنی نئی دہلی - 110085



سلیم شہزاد

عکس

ہ کو دیوار گریہ کے پیچھے سے ہنسنے کی آواز آئی
ں اس بھید کو جاننے کے لیے
نا گنت سیڑھیاں چڑھ کے
ب آسمانی بلندی پہ پہنچا
وہ (دوسری سمت) صوفوں پہ بیٹھے ہوئے
یری جانب کے ماتم گساروں پہ
ل کھول کر خندہ زن تھے
بھی ان میں سے ایک عینک لگائے ہوئے شخص نے
پنی مجلس میں آنے کا مجھ کو اشارہ کیا
ر جب اس کی دعوت پہ لبیک کہتے ہوئے
میں نے دیوار پر پاؤں رکھا
تو اس پر گڑے کانچ کے تیز ٹکڑے
مرے پاؤں میں دھنس گئے
خون دیوار کے دونوں اطراف بہنے لگا
میں کہ ہنسنے کی آواز کا بھید لینے کی دھن میں
یہاں کانچ کے تیز ٹکڑوں پہ
اک پاؤں رکھے کھڑا ہوں
ادھر اپنی جانب سے بھی قہقہوں کی صدا سن رہا ہوں

• 302، مگلو اردو رڈ مالیگاؤں 423203 (مہاراشٹر)

حبیب حق

تروینیاں

نہیں جاؤں گا میں وہاں
قندیلیں جلا کرتی ہیں جہاں
گھر کی تاریکی سمیٹے گا پھر کون؟

•

نہیں ہے وہ اور بھی کچھ
سوائے خاردار گلاب کی ٹہنی کے
عاشقان اب کانٹوں کو برداشت کرتے ہیں کب

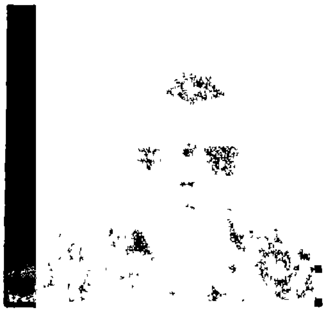
•

رات گئے پریاں اترا کرتی ہیں تاریک آسماں سے میرے صحن کے درمیاں
جگ مگ کرتیں نت نئے رنگوں والی آنکھیں ہرنوں جیسی پریشاں
ببول کے نیچے بیٹھا مجنوں ڈھونڈے کب تک لیلیٰ کے نشاں

•

شاخ بریدہ آسماں چھوتا شجر کھڑا ہے ایسے جیسے
کسی دیوتا نے ایک دیو کو گاڑ دیا ہو جیسے ویسے
کوئی نہیں جو جا کر پوچھے ٹانگیں گئیں کتنی اندر زمیں کے

Dep. of Biochemistry, Rajendra •
gricultural Univercity-Pusa-848125(Bihar)



یوسف عارفی
B-5, 4th Cross, Anubhan Nagar, Nagarbhavi
Main Road, Banglore - 560072 (Karnatak)

غیر ضروری آدمی کی آخری شاپنگ

دفتر کے گھٹن آلود کمروں سے آزاد ہو کر شہر کے معروف ترین علاقے میں داخل ہونے والا وہ خود کو پہلا شخص تصور کر رہا تھا کہ اس کی عمر کے اٹھاون سال گزرے صرف دو دن ہوئے تھے۔

پچھلے دو دن سے اس نے کبھی سرکاری بسوں میں بیٹھ کر اور کبھی پیدل چل کر سارا شہر دیکھنے میں گذار دئے تھے۔ دو دن کی اس لگاتار مسافت کے بعد اب وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ مزید گھومنے کی خواہش جیسے جواب دے چکی تھی۔

"جینے کے لئے خواہشوں کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اٹھاون سال کے بعد آنے والا تیسرا دن اس کے لئے بھاری پڑ جائے گا۔" شہر کے وسیع و عریض درختوں والے باغ کے کنج میں بیٹھ کر اس نے اپنی ہی آواز اپنے کانوں میں سنی اور تھکے ہارے قدموں سے چل کر اس سڑک پر نکل آیا جس کی ایک جانب سرسبز شاداب گھاس کی مخملیں چادر بچھی تھی اور دوسری جانب ____ حیرت کے کے عالم میں اس کی آنکھیں پھٹتے پھٹتے رہ گئیں کہ دوسری جانب شاپنگ سنٹرز کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی اور ان کے شوکیسوں میں وہ تمام اشیاء قرینے سے سجا کر رکھی گئی تھیں جن کو پانے کے لئے وہ زندگی بھر جدوجہد کرتا رہا تھا۔

اس نے اپنی جیب میں رکھی نقدی ٹٹولی اور سوچنے لگا۔ اس نقدی کا صحیح استعمال اب ہوگا، تب دوستوں، رشتہ داروں اور گھر کے افراد کو یہ شکایت نہ رہے گی کہ اس نے آسائشوں سے بھری دنیا کا فائدہ نہ اٹھایا۔

اس سے قبل کہ وہ پہلے شاپنگ سنٹر میں گھس پڑتا اس نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے چل کر کسی ریستوران میں ناشتہ کر لینا چاہیے کہ خالی پیٹ رہنے سے اب اسے چکر سے آنے لگے تھے۔

"اکیلے ہی ناشتہ کرو گے؟" رسوئی گھر کی کھڑکی سے چھلانگ لگاتی کسی بلی کی طرح اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔

"ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے ڈیڈی!" کسی اونچی جگہ سے گر کر بے ڈھنگا شور مچاتے برتنوں کی طرح اس کے بچے بھی شور کرتے سنائی دیے۔

اس نے جھلا کر ناشتہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پہلے شاپنگ سنٹر میں داخل ہو گیا۔ شاپنگ سنٹر کا کاؤنٹر کلرک حد درجہ معروف تھا۔ کاؤنٹر کے کونے میں کھڑے ایک وردی پوش نوجوان نے ایک لمبا سا کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔

"مطلوبہ اشیاء کی فہرست!"

"مطلوبہ اشیاء کی فہرست سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں اس سے پوچھا۔

"اُن اشیاء کی فہرست جو اس شاپنگ سنٹر میں دستیاب ہیں۔ مثلاً... چاول، گیہوں، دالیں، گھی، مسالہ، خشک میوے، ہلدی، پھٹکری اور..."

اس نے ہاتھ اٹھا کر وردی پوش نوجوان کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور جیب میں رکھی نقدی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور لمحہ بھر کے لئے سوچا۔

"شاپنگ سینٹر میں دستیاب شدہ یہ ساری چیزیں اب میرے لئے بے مزہ ہو چکی ہیں کہ ان کو پانے اور انہیں استعمال کرنے کے دن گزر گئے ہیں۔"

وہ تیزی سے گھوما اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا شاپنگ سینٹر سے نکل پڑا۔

کسی بھی شاپنگ سینٹر میں داخل ہو کر کچھ خریدے بغیر یوں ہی خالی ہاتھ نکل آنا یہ شاپنگ سینٹر کی نہیں بلکہ اس کی اپنی بھی توہین ہے۔ یہ سوچتے ہوئے، اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے اپنے تمتماتے چہرے کو رومال سے صاف کیا اور فیصلہ کرنے لگا کہ آنے والے شاپنگ سینٹر سے اسے کچھ نہ کچھ خرید ہی لینا چاہیے۔

"یہ گرم کوٹ اور مفلر آپ ضرور خرید لیں کہ اس سے آپ کا دبلا پتلا جسم چھپ جائے گا اور پھر آجکل کی کڑکڑاتی سردیوں سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔"

"یہ گرم اونی لحاف۔"

"اس کلاتھ ہاؤس میں آپ کی پسند کی ہر چیز نہایت واجبی داموں میں ملے گی۔" چاروں طرف سے اُبھرنے والی کان پڑی آوازوں سے وہ گھبرا اٹھا اور اچانک سیلزمین سے پوچھ بیٹھا۔

"واجبی داموں سے تمہاری کیا مراد ہے۔" اس نے ہینگر پر جھولتے

Jeans Pant کو دیکھا اور اپنے بڑے لڑکے کو یاد کرنے لگا جو اکثر کالج جاتے ہوئے اس قسم کی پینٹ کا تقاضا کرتا رہا تھا۔

"یہ آپ کو یکدم فٹ آئے گا صاحب! صرف کمر کا سائز قدرے بڑا ہے۔ اس کی تلافی کے لئے یہ امپورٹڈ بیلٹ حاضر ہے۔"

"امپورٹڈ۔ یعنی کہ بدیسی مال کی قدر و قیمت اب بھی باقی ہے!"

"وہ تو رہے گی صاحب۔ اگر آپ پسند کریں تو ایک عدد ساڑی بھی پیک کردوں۔ نیا مال ہے، اصلی ریشم بھی شرما جائے گا۔"

"گویا اصلی ریشم کو بھی شرمانے والے مال بنانے لگے ہو!" اسے اپنے تن بدن میں آگ لگتی محسوس ہوئی۔ جیب میں رکھی نقدی پر اس کی گرفت ویسے بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی تھی اور وہ یہ فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

"آرڈر دیجئے صاحب!"

"اگر میں آرڈر نہ دوں تب!!" اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"تب آپ جس طرح اپنی گردن اٹھا کر یہاں چلے آئے تھے اسی طرح اپنی گردن جھکا کر یہاں سے نکل جایئے۔ یعنی کہ گیٹ آؤٹ!"

کلاتھ ہاؤس سے باہر نکلا تو اسے اپنی کان کی لوئیں سرخ ہوتی محسوس ہوئیں۔ پھر اس نے سوچا۔ "غلطی تو میری ہی تھی کہ اس کلاتھ ہاؤس سے میں نے کچھ نہیں خریدا۔ مگر اس نامعقول کا لہجہ قطعی تجارتی تھا۔ انسانی نرم گفتاری نہ جانے کہاں کھو گئی ہے اور پھر اس نے کیا کچھ کہہ ڈالا کہ کچھ خریدنے کی خواہش ہی سرد پڑ گئی۔" اس سے قبل کہ مزید کچھ سوچ کر وہ جھلا اٹھتا۔ اس نے خود کو ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا پایا اور اپنے سامنے اپنا ہی دبلا پتلا سراپا دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے لرز کر رہ گیا۔

"تصویر اچھی آئے گی صاحب، اندر تشریف لایئے۔" قاتل مسکراہٹ کے ساتھ ایک قبول صورت لڑکی نے سر جھکا کر اس کا خیر مقدم کیا اور وہ دوسرے ہی پل فوٹو اسٹوڈیو کے اندر تھا۔ اسٹوڈیو کی دیواروں پر نقش کردہ بڑے بڑے قدرتی مناظر اسے بے حد پُرکشش اور دلفریب لگے۔

"کشمیر کی ڈل جھیل کا یہ قدرتی منظر تو اب ناپید ہو گیا ہے۔ صرف اس شکارے کے قریب کھڑے ہو جایئے، تصویر اتنی لاجواب اُترے گی کہ دیکھنے والے کشمیر کے دل فریب مناظر کے بارے میں آپ سے بے شمار باتیں پوچھیں گے۔"

"منظر ناپید ہو گیا ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

"اگر آپ چاہیں تو دنیا کی ان مشہور ہستیوں کے ساتھ اپنی تصویر کھنچوا سکتے ہیں۔ جے۔ ایف۔ کنڈی، پنڈت نہرو، ہیلو نز وولیار ستم زماں۔"

"مشہور ترین ہستیوں کے ساتھ اس چند کی تصویر!" اس کے لبوں پر کڑوی سی مسکراہٹ ابھری۔

"شاید دنیا کی ان مشہور ہستیوں کے ساتھ آپ کو اپنا ربط ضبط مضحکہ خیز لگے۔ چلئے اس آئیفل ٹاور یا تاج محل کے سائے میں بیٹھ کر تصویر کھنچوائیں۔" اس بار اس نے قبول صورت اور مہکتے بدن والی لڑکی کو اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانے کا آرزو مند ہے۔

"یہ مارلین منرو چلے گی۔!" اس نے یک بیک سامنے آویزاں تصویر کا پردہ الٹ دیا اور کہا۔ "سنا ہے بڑی لاجواب اور چلبلی قسم کی اداکارہ تھی۔ یہ مدھو بالا اور اس کی قاتل مسکراہٹ کے ساتھ تو ہر کوئی چاہے گا کہ ایک تصویر ایسی بھی ہو جائے۔ یا آپ چاہیں تو ایک تصویر ایسی بنائی جائے جو نہ صرف نایاب ہو گی بلکہ دنیا کے کسی بھی اسٹوڈیو نے بنائی نہ ہو گی۔"

اس بار اس نے لڑکی کو متجب نظروں سے دیکھا۔

"گاہک کو پھنسانے کا تمہارا یہ آخری حربہ قدرے دلچسپ اور چونکا دینے والا ضرور ہے مگر تم وہ تصویر ہرگز مہیا نہیں کر سکو گی جس کے پہلو میں کھڑے ہو کر میں اپنی تصویر کھنچوانے کا آرزو مند ہوں۔"

"آپ اس تصویر کی تفصیل تو بتائے فوری تعمیل ہو گی۔"

"اس تصویر کی تفصیل ______" اس نے گہری لمبی سانس لی اور لڑکی کی متوالی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"تم مجھے میری اٹھائیس برس پرانی تصویر مہیا کر سکو گی جس کے پہلو میں کھڑے ہو کر آج میں اپنی تصویر کھنچوانے کے لئے بے قرار ہوں۔ کہ اس نوجوان کے دل میں ارمانوں، آرزوؤں اور خواہشوں کے دریا امڈتے تھے جو اس عذاب گزیدہ دنیا کے ہر جھمیلے سے آزاد تھا۔ میری اس عمر نے مجھے بتایا ہے کہ آج اس نوجوان کا ساتھ ہو جائے تو علم و عمل کا، تدبیر اور ہنر مندی کا، فتح اور شکست کا، آسودگی اور ناآسودگی کا، سچ اور جھوٹ کا، ایمانداری اور بے ایمانی کا، محبت اور نفرت کا ہر تجربہ اسے پیش کردوں، تاکہ اسے اس دور کا کامیاب ترین اور آسودہ حال آدمی بننے کا حوصلہ ملے اور اپنی عمر کے اٹھاون سال پورے کرنے کے بعد میری طرح۔ میری طرح ______"

"شاید آپ کچھ زیادہ ہی بھٹکے ہوئے آدمی لگتے ہیں۔ چلئے ایک بھٹکے ہوئے آدمی کی تصویر ہی ہو جائے جو ہمارے اسٹوڈیو کے لئے معرکے کی چیز ہو گی۔"

"گویا اٹھاون سال کے بعد آدمی کوئی معرکے کی چیز بن جاتا ہے؟" اس نے غصے کے عالم میں اپنے نقلی دانتوں کو پیس ڈالا اور باہر نکل پڑا۔

باہر کولتار کی چکنی سڑک پر دوپہر کی چلچلاتی دھوپ ہانپ رہی تھی۔ ٹریفک کا ہجوم، شور شرابا، دھواں، گرد و غبار ___ اس نے نظر اٹھا کر، سڑک کی دوسری جانب پھیلی سرسبز و شاداب گھاس کی مخملی چادر کو دیکھا اور اسے لگا گھاس کی مخملی چادر کی ٹھنڈک اس کی بجھتی آنکھوں کو فرحت

بخش رہی ہے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا۔ دوڑتے بھاگتے ٹریفک کی پرواہ کئے بغیر آنکھ بند کر کے سڑک پار کرلے اور سر سبز و شاداب ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ملائم گھاس پر لوٹتا چلا جائے۔

"آگے بڑھو!" پیچھے سے کسی نے اسے دھکا دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ سر پر وزنی سامان اٹھائے، پسینے سے شرابور ایک مزدور ہانپتا ہوا اسے گھور رہا تھا۔

"اتنا بھاری بوجھ اٹھانے کے باوجود تمہیں وہ چیزیں میسر نہیں جو اس بازار کی زینت بنی ہوئی ہیں۔" اس نے اپنی جیب میں رکھی نقدی ٹٹولی اور پرے کھسک کر مزدور کے آگے اس طرح چلنے لگا جیسے مزدور کے سر پر دھرے سامان کا وہ خود ہی مالک ہے۔

"کسی خوش فہمی میں خود کو مبتلا کرنا بھی ایک قسم کی خوش بختی ہے کہ ایسے زرین مواقع بدبخت آدمی کو کبھی کبھار ہی میسر آتے ہیں۔" اردو ناول کا ایک بے حد پرانا جملہ اسے یاد آگیا۔ پھر اس نے عمداً رک کر مزدور کے لئے راستہ چھوڑ دیا اور یہ فیصلہ نہیں کرپایا کہ اب اسے آگے جاکر کس قسم کے شاپنگ سینٹر میں داخل ہونا چاہیے۔ شاپنگ سینٹر کے خیال سے اب وہ جیسے اکتانے لگا تھا اور اس الجھن میں گرفتار تھا کہ اب تک کے دیکھے بھالے شاپنگ سینٹرز کی کوئی چیز وہ خرید کیوں نہیں پایا ہے۔ کم آمدنی کا خوف تو برسوں سے دامن گیر تھا مگر اب جبکہ ایک کثیر رقم اس کی جیب میں دھری ہے اور بھرے پرے شاپنگ سینٹرز اس کے سامنے کھلے پڑے ہیں۔

بک سینٹر کے شوکیس میں سجی نئی اور تازہ "New Arrivals" کتابوں نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

"اُمراؤ جان ادا۔ نیا ایڈیشن" اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سیکولرازم کا سبق۔" "نہرو اور جناح" "اصول پرستی کے چند متوازی پہلو"۔ ان سب میں "سیاست کا مفہوم" کتاب قدرے ضخیم تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے عینک اتار لی اور شیشے صاف کر کے دوبارہ لگالی۔ کتاب کے مصنف کا نام باریک حرفوں میں لکھا گیا تھا۔ "یہ کتاب کسی سیاسی آدمی نے ہرگز نہیں لکھی ہوگی کہ آدمی جب سیاسی اقتدار پالیتا ہے تو اسے اپنی ہی سیاست سے فرصت نہیں ملتی۔"

اس نے بک سینٹر کے اندر جھانک کر دیکھا۔ وسیع و عریض ہال میں رکھے مختلف بک شیلف میں تازہ وارد کتابیں قرینے سے سجا کر رکھی گئی تھیں اور کوئی معمر آدمی سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا اور پورے ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سوچا۔ الیکٹرک میڈیا اور آڈیو ویڈیو کی دھماکہ خیز آوازوں اور پرکشش جنسی منظروں نے لوگوں سے مطالعے کا شوق چھین لیا ہے یا ـــــ

"اندر تشریف لایئے" بک سینٹر کے مالک نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے نہایت ہی شائستگی سے کہا۔

وہ چپ چاپ بک سینٹر میں داخل ہوگیا۔

"آپ کا پسندیدہ موضوع؟"

"اٹھاون سال گزارنے کے بعد پسندیدگی کے جذبے معدوم ہونے لگتے ہیں اور پھر کتابوں کے مطالعے کے بعد لاحاصلی کا وہ خوف کہ سب کچھ پڑھا پڑھایا دھرا رہ جائے گا۔"

"بالکل ہلکی پھلکی تحریریں آپ ضرور پڑھتے رہیں۔ فرصت کے لمحات نہایت مزے سے گزر جائیں گے۔ لیجئے۔ یہ نیا ناول۔ اس ناول کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ شہر کے مختلف بک سیلرز نے ہزاروں کی تعداد میں اسے فروخت کردیا ہے۔

"وجہ؟" اس نے ناول کے دیدہ زیب رنگوں کے پس منظر میں ابھرتی نیم عریاں حسیناؤں کی تصویریں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس صاحب ایک ذرا اس کی وجہ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے کہ ہم کتب فروش آم کھانے سے مطلب رکھتے ہیں۔ مگر سنا ہے اس ناول میں چوما چاٹی کی باتیں قدرے کھل کر بیان ہوئی ہیں۔

"چوما چاٹی؟ ـــــ" اس نے زیر لب دہرایا۔ "یعنی پیار و محبت، عشق و عاشقی!"

"نہیں!۔ ان کے ہلکے پھلکے حوالوں سے بھی آگے کی باتیں۔" اس بار کتب فروش کے لہجے میں گاہک کو پھانسنے کی پوری مٹھاس اتر آئی تھی۔

"ایسی نامعقول کتاب پر پابندی نہیں لگائی گئی؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"زمانے کے ساتھ ساتھ پابندیوں کی حدود بھی بدلتی رہتی ہیں۔" کتب فروش نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"مگر میں نے اپنی پابندیوں کی حدود آج تک نہیں بدلیں کہ ان حدود کے اس پار اخلاقی اور تہذیبی پستی کی لامحدود حدیں شروع ہونے لگتی ہیں۔" اس نے اچانک محسوس کیا کہ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی ہے اور وہ سر تاپا کانپنے لگا ہے۔ اس نے اپنی دھواں دھواں ہوتی آنکھوں سے کتب فروش کو دیکھنا چاہا۔

"آپ اس پنکھے کے نیچے کچھ دیر آرام سے بیٹھ جایئے۔" اس نے محسوس کیا بہت میٹھی اور ہمدردانہ آواز اس کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اس نے بدقت تمام اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ وہ ایک میڈیکل اسٹور کے وسیع و عریض ہال میں بچھے نرم و ملائم صوفے پر نیم دراز ہے۔ چھت پر لگے برقی پنکھے بڑی تیزی سے گھوم رہے ہیں اور ہلکی نرم ہوا میں مختلف دوائیوں کی بو رچی ہوئی ہے۔

"شاید پہلی بار آپ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ ورنہ آدمی کو سنبھلنے میں قدرے تاخیر ہو جاتی ہے۔"

"نروس بریک ڈاؤن جیسے لفظ سے میں اب تک نا آشنا رہا ہوں آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔" وہ چپ رہ کر بھی جیسے بول رہا تھا۔

"ہماری صلاح ہے کہ آپ اپنا میڈیکل چیک اپ ضرور کروالیں۔ عمر کی اس منزل میں اچھا بھلا آدمی کسی نہ کسی مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنا نام، عمر اور پتہ لکھوائیے۔"

"نام، عمر اور پتہ؟" اس نے سامنے کھڑی نکھری ستھری اور بے حد نازک اندام نوخیز لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر چٹکتی کلیوں کی مسکان تھی۔ اس کا ایک بیک جی چاہا کہ کہہ دے۔

"اپنا نام، عمر اور پتہ میں نے اس وقت سے بتانا شروع کر دیا تھا جب میں نے پہلی بار ملازمت کے لئے درخواست دی تھی۔ پھر بینک والوں نے، انشورنس والوں نے، ڈرائیونگ لائسنس دینے والوں نے، زمین الاٹ کرنے والوں نے، قرض دینے والوں نے اور سڑک پر کسی حادثے کا شکار ہو کر فوت ہونے پر دو لاکھ دینے والوں نے اور پھر بیوی بچوں کا علاج کرنے سے قبل ہسپتال والوں نے اور اب تم نے۔ آخر یہ نام، عمر اور پتہ کون سی ایسی ضروری چیزیں ہیں کہ ایک غیر ضروری آدمی کے ساتھ چسپاں کرنی لازم ہیں۔"

"فی الحال یہ چوسنے کی گولی آپ کے لئے لازمی ہے، صرف چوستے رہیئے۔ نگلیئے گا نہیں۔ اس سے آپ کی بے اعتدال سانسوں میں اعتدال آجائے گا۔ اور ہاں آپ کے ہمراہ کوئی ہو تو بلوا لیجئے۔"

"آدمی اکیلا آیا ہے اور اکیلا ہی چلا جائے گا۔" ایک مضحکہ خیز جملہ اس نے اپنے بارے میں سوچا اور میڈیکل اسٹور سے باہر نکل آیا۔

"اس آخری عمر میں مرنے کا جینا جی رہا ہوں" پچھلے برس جب وہ بیمار پڑا تھا تو عیادت کے لئے آئے ہوئے دوستوں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا اور بڑی بے دلی سے یہی جملہ اس نے کہا تھا تب سے دوستوں نے اس سے لاتعلقی برتنی شروع کر دی تھی۔ اور اب یہ لڑکی پوچھتی ہے۔ عمر اور پتہ۔

میڈیکل اسٹور سے وہ باہر نکلا تو ہوا میں قدرے ٹھنڈک تھی۔ ڈوبتے سورج کی نرم و نازک دھوپ اسے بڑی بھلی لگی۔ اس نے محسوس کیا اب اس کا حلق خشک ہونے لگا ہے اور آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا ہے۔ نقاہت کے عالم میں اس نے چاروں طرف دیکھا۔ شہر کی جگ مگ کرتی روشنیوں میں ٹریفک رواں دواں تھا۔ شاید اس لڑکی نے درست ہی کہا تھا کہ۔

"کولڈ ڈرنک لیں گے یا ٹھنڈی بیئر۔؟" پب کے کاؤنٹر پر اس کی کہنیاں ٹکی ہوئی تھیں اور وہ ہانپتا کانپتا کاؤنٹر پر کھڑے لمبے قد، گھنی مونچھوں اور ورزشی بدن والے نوجوان کے سوال کو سنی ان سنی کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ راہ بھٹک کر تھک جانے والے آدمی کے لئے کون سی چیز بہتر ہو گی۔

"ایک گلاس ٹھنڈا پانی دے سکو گے؟" اس کے چہرے پر بھک منگوں جیسی خجالت اُبھر آئی۔

"صرف ٹھنڈا پانی!" نوجوان نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"دراصل میں ان چیزوں سے بہت دور رہا ہوں، میں نے زندگی میں کبھی ان مکروہات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔" اس نے شوکیس میں بجی مختلف بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تب تو آپ اس عہد کے بڑے بدبخت آدمی ہیں۔!" اسے لگا کہ کاؤنٹر پر کھڑے نوجوان نے اسے ایک گندی گالی دی ہے۔ اس سے قبل کہ وہ وہاں سے کھسکتا پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ دفتر کا ایک بہت پرانا اور آوارہ مزاج ساتھی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"راہ بھٹک کر ادھر نکل آئے ہو یا کسی ضروری کام سے۔؟" اس نے پرانے ساتھی کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں!" آوارہ مزاج ساتھی کا تضحیک آمیز تخاطب اسے پل بھر کے لئے اداس کر گیا۔

"غیر مخلصانہ جملے کہنے کی عادت آج بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہے۔!"

"ایک دوسری عادت بھی میرے ساتھ چل رہی ہے۔" کاؤنٹر پر رکھے شراب سے بھرے گلاس کو اس نے ایک لمبا گھونٹ لے کر آدھا خالی کر دیا اور رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کرنے لگا۔

"ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی نے تمہیں کچھ سکھایا بھی ہے یا یوں ہی بھٹک رہے ہو؟"

"یہ پوچھو کہ ریٹائرمنٹ سے قبل کی زندگی نے مجھے کیا سکھایا تھا۔ تم ٹھہرے پیدائشی سادہ لوح آدمی، مگر میں پارہ صفت۔ اونچی اڑانوں کے خواب دیکھنے والا۔ خود کو آگے لے جانے کی کوشش میں کتنے ہاتھوں کا کھلونا بننے پر مجبور ہوا یہ میری گزری ہوئی زندگی کے ورق ورق پر نقش ہے۔ شراب پیتا دیکھ کر تم مجھ سے جتنی نفرت کرنے کی سوچتے ہو، یہ تمہارا حق ہے۔ مگر میں تمہارے بارے میں یہ جاننے کے لئے سخت بے چین ہوں کہ اٹھاون سال کے بعد گذرنے والے دن کتنے سکون بخش ہیں۔"

اس نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی کہ اٹھاون سال کے بعد ۵۹ ویں سال کے تیسرے دن کی شام ہو رہی تھی اور پورا شہر برقی قمقموں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ اس نے پب کی سیڑھیوں سے سنبھل سنبھل کر اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اسے لگا اس کا بڑھا ہوا پہلا قدم لڑکھڑا سا گیا ہے۔

"میں نے راہ چلتے راہ گیروں سے، ٹیکسی والوں سے اور رکشا والوں سے بہت بہت کہا کہ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دو مگر یار۔ کسی نے میری جانب نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔" وہ اپنی ڈھلتی عمر اور سمٹی سمٹائی

[بقیہ صفحہ ۱۲۵ پر]



یسین افضال

لمس

شیشوں کی طرف بہتے ہوئے پانی کی لہریں
ریت پر تحریریں تجرید ہو کر
قہر تھا سیلاب کا ریلا
مری مٹی بہا کر لے گیا تھا
کچھ نہ چھوڑا تھا تہوں میں
سنگریزوں کے علاوہ پانیوں نے
ریزہ ریزہ کھل رہا تھا میرے اندر
ڈھ رہا تھا میں

مجھے سورج نے باہر سے پیا ہے
مجھ میں کوئی لمس نہیں ہے اپنی مٹی کا

جو مجھ کو جوڑ کر رکھے
مرے یہ ڈھیر سارے بکھرے بکھرے ذرات
باہم دیکھنے کے ہیں
انہیں چھیڑو تو آپس میں الگ ہیں
میں انہیں ذرّوں کا پر اسرار
اک انبار

اپنے آپ پر ہوں

ریت پر لکھی ہوئی ہے
میری مٹی کی روانی
ایک تجریدی کہانی

● C-2, Ashfaqe Plaza, Fatima Jinha
Colony, Karachi (Pak)

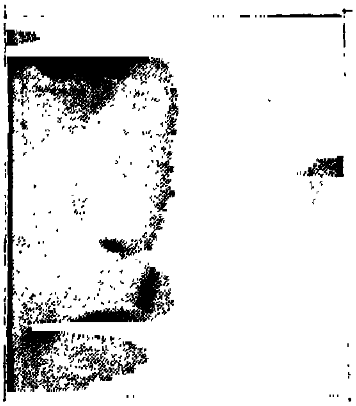


وویک وشال

گمشدہ تاریخ

فضا میں
بے تحاشا اڑان بھرتی
ایک تمنا
جس نے نا سمجھی میں
سورج کو چھو لینے کی
ٹھان لی ہے
کاش!
کوئی اسے بتا دیتا
کہ انجانے ہی میں وہ
کتنی خطرناک سازش کا
شکار ہوئی جا رہی ہے
ایک ایسی سازش
جس کا تاریخ کے صفحوں میں
کوئی حساب نہیں ہوتا

● زرنگ ٹیکسٹائل، اسٹیشن روڈ،
جگسلائی، جمشید پور (بہار)



انجم سلیمی

ایک گمشدہ محبت کی بازیافت

"تم وہی تو نہیں! تم وہی تو نہیں؟؟"
تیز سانسوں کے وقفے میں کیا پوچھ بیٹھا ہے تو؟!
میں نے پہلو میں لیٹے ہوئے اجنبی شخص کے چشم و لب چوم کر
اپنی چہروں بھری آنکھ میں اک پرانی ملاقات کا عکس روشن کیا
اور لہو میں شناسائی کے پھول سے کھل اٹھے

ایک ہی پل میں ہم ـــــــ
پہلے سے کس قدر مختلف ہو گئے
ایک بے چہرہ خواہش مجسم ہوئی
ایک دوجے پہ ہم منکشف ہو گئے

میں کہ حیران ہوں!!!
اتنے برسوں مرے لمس کو تو نے محفوظ کیسے رکھا؟
اس قدر بھیڑ میں ــــ میں تجھے یاد کیسے رہا؟
تیری آنکھیں، یہ بازو، یہ لب
کس طرح بھول بیٹھا تھا میں؟!!
تیز سانسوں کے وقفے میں، میں سوچتا ہوں
یہ کیسی خوشی کی گھڑی ہے؟
رگوں میں اداسی اترتی چلی جا رہی ہے!

● ۲۷۔ جناح کالونی، فیصل آباد (پاکستان)

خورشید طلب



دن خوف زدہ ، سہمی ہوئی رات ہماری
بدلی ہے کہاں صورت حالات ہماری

گرتے ہیں کہاں کٹ کے دعاؤں سے بھرے ہاتھ
ہوتی ہے کہاں ختم مناجات ہماری

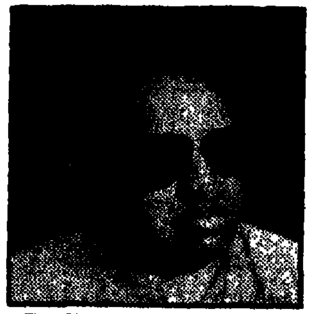
اک دھند کی دیوار ہے اطراف ہمارے
تشکیک کی زد میں ہے ابھی ذات ہماری

اب اوس کی بوندوں کا سہارا بھی نہیں ہے
کب ہم کو دغا دے گئی برسات ہماری

یہ جنگ بھی ہم اپنے اصولوں سے لڑیں گے
ہوتی ہے تو ہوجائے طلب مات ہماری

○ پرسنل سیکشن، جی۔ایم آفس کارگلی، بیر مو، بوکارو۔ ۸۲۹۱۰۴ (بہار)

حفیظ انجم



خیال و فکر کے ہوتے ہیں فلسفے بھی نئے
نئی غزل کیلئے ہیں یہ قافلے بھی نئے

دل و دماغ اندھیروں میں سانس لیتے ہیں
لگا رہے ہیں مزاروں پہ قمقمے بھی نئے

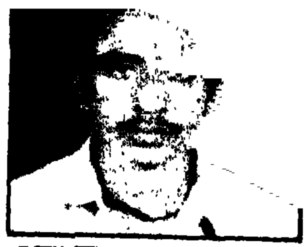
جدید زخموں کی کس کو یہاں ضرورت ہے
پرانے زخم جو دینے لگے مزے بھی نئے

نئی اڑان پہ نکلے ہو بال و پر ہی نہیں
یوں لگ رہا ہے مجھے تم ہو سر پھرے بھی نئے

میں کس کی بات سناؤں میں کسکا ذکر کروں
محاسبے بھی نئے ہیں مباحثے بھی نئے

○ 7-2-775، کشمیر گڑھ، کریم نگر 505002 (A.P.)

قربان آتش



سیاہ رات نہ تھی دن میں ڈر گئے کیسے
ہمیں خبر نہیں ہم اپنے گھر گئے کیسے

ابھی تو چہرہ بھی اچھی طرح نہ دیکھا تھا
نشاط و کیف کے لمحے گذر گئے کیسے

اگر ہوا نہ کسی آدمی کا قتل کہیں
تو پھر لہو سے ندی نالے بھر گئے کیسے

نہ ان کے آنے کی آہٹ ملی نہ شور ہوا
زمیں پہ قہر کے بادل اتر گئے کیسے

نہ ان کے ہاتھ میں قینچی نہ کوئی خنجر تھا
وہ طائروں کے پروں کو کتر گئے کیسے

○ کھیتاری محلہ، آرہ -802301 (بہار)

عبدالرب صدا



بے گھروں کو یہی انعام سفر لگتا ہے
سایہ مل جائے درختوں کا تو گھر لگتا ہے

حادثے اتنے تعاقب میں نکل پڑتے ہیں
جس طرف جایئے ، ہجرت کا سفر لگتا ہے

اب تو حالات نے قدریں ہی بدل ڈالی ہیں
عیب یوں سامنے آتا ہے ، ہنر لگتا ہے

جس طرف جاتا ہوں، نفرت کی دکاں ملتی ہے
اے محبت ترا بازار کدھر لگتا ہے

خون دل سینچنا پڑتا ہے بصد حسن خلوص
تب کہیں جاکے محبت کا شجر لگتا ہے

○ بدھوای بازار، سیونی - 480661 (ایم پی)

محمد شاهد پٹهان



تری یادوں میں ہر شب کو لٹائے ہیں گہر میں نے
غمِ فرقت میں رکھی عمر بھر ہی چشم تر میں نے

کبھی انساں کی بدحالی ، کبھی قدروں کی پامالی
ذرا سی عمر میں دیکھے ہیں کیا کیا شور و شر میں نے

خودی والوں میں تو عنقا ہے دنیا کی خبر گیری
رکھی ہے بے خودی میں بھی زمانے کی خبر میں نے

یہ کیسا شہر ہے یارب ، یہ کیسی شہریاری ہے
تحفظ میں بھی دیکھے ہیں شکستہ بام و در میں نے

تغافل سے نہیں انکار ، لیکن یہ حقیقت ہے
نگاہ حسن میں دیکھا ہے عشق معتبر میں نے

○ شعبہ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور (راجستھان)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۲)

احمد ندیم قاسمی

"شاعر" کا "اردو ادب نمبر" ملا۔ ممنون ہوں۔ اس کی ایک جھلک امریکہ میں بھی دیکھی تھی۔ آپ نے بڑی کاوش سے اتنا ضخیم اور کار آمد نمبر مرتب کیا ہے جو آئندہ ایک اہم "ریفرنس بک" کا کام بھی دے گا اور دورِ حاضر کے اہلِ قلم کے بارے میں مستقبل کے محققین کی رہنمائی بھی کرے گا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

●45/A, Mozang Road, Lahore.

محمد حسن

آپ نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ تعریف و تحسین کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ہر مضمون تو درجۂ اوّل کا نہیں ہے مگر آپ کا سلیقہ اور ان مضامین کو مناسب تقسیم اور ان کے ہر منطقے پر آپ کا تفصیلی نوٹ۔ میں تو حیران ہوں کہ اس قدر محنت اور دل سوزی بلکہ جاں سوزی کیوں کر ممکن ہو سکی۔ آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ سے اتفاق ممکن نہیں، خصوصاً نظم والے سیکشن میں میرا نام لئے بغیر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ پھر باقر مہدی کا نام لے کر آپ نے جو لکھا ہے وہ بھی معروضی تنقید کے مطابق نہیں۔ دراصل آپ میرے بارے میں ترقی پسندی کی اصطلاح سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے یا جاننا نہیں چاہتے کہ مجھے کچھ آج سے نہیں ہمیشہ سے ہر دائرے میں رہ کر مضبوط اور صحت مند نقطۂ نظر سے لگاؤ رہا ہے اسی لئے سردار جعفری کے نقطۂ نظر کی ہمیشہ تنقید کرتا رہا ہوں۔ پھر یہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کی بحث ہی لاحاصل اور نامناسب ہے خاص طور پر میرے مضمون کے سلسلے میں۔ جبکہ میرا نقطۂ نظر نظم کی کیت اور Totality کی فکری اور جذباتی تصور سے ہے۔ یہ آج مفقود ہے تقریباً۔ خیر! پھر بھی آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ بددل نہ ہوں، حوصلہ رکھیں، یہ عظیم الشان تاج محل آپ نے بنایا ہے۔

●D-7, Model Town, Delhi - 110009

محمد عظیم فیروز آبادی

اردو داں مفت خور ہوتے ہیں عام طور پر اس لئے انھیں دو سو پچاس روپے کا خصوصی نمبر گراں نظر آتا ہے۔ میں انھیں سمجھاتا ہوں کہ فن اور شخصیت کے شمارے ہزار ہزار روپے میں آ رہے ہیں اور وہ بدنامِ زمانہ کتاب شیطانی آیات کی قیمت ترکی میں 8500 روپے ہے۔ ۱۲۵۰ صفحات کے شاعر پر لاگت ہی ۲۵۰ روپے آئی ہو گی۔ دیکھئے کتنے خریدار ملتے ہیں۔

●Nadir Bux & Co, Firozabad - (U.P.)

حامدی کاشمیری

شاعر کا خاص نمبر موصول ہوا۔ نمبر کو دیکھ کر طویل انتظار کی ساری کوفت دور ہوئی۔ آنکھیں روشن اور دل شاد ہوا۔ یہ خاص نمبر عہدِ حاضر کا ایک اہم ادبی وقوعہ ہے۔ آپ نے عملی طور پر ادیبوں اور شاعروں کا ایک عالمی گاؤں آباد کیا ہے۔ مبارکباد۔ خاص نمبر کے ہر صفحے سے آپ کی عرق ریزی، ذوقِ لطیف اور جمالیاتی احساس نمایاں ہے۔ یہ چند سطور رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ تفصیلی رائے پھر لکھوں گا۔

●Masood Manzil, Shalimar, Srinagar, (Kashmir)

بلراج کومل

ہم عصر اردو ادب نمبر تاریخی کارنامہ ہے۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ اس خاص نمبر کی حوالہ جاتی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ شاعر کی ادبی خدمات اپنے آپ میں ایک لیجنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

●E-139, Kalkaji, New Delhi -110019

عبدالقوی دسنوی

اس قدر ضخیم نمبر دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی، البتہ اس کی ترتیب سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر حال! آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ خدا آپ کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ اس دور میں اردو کے ایسے نمبر شائع کرنا آسان بات نہیں ہے۔ ابھی تو دو اور نمبر شائع ہونے کو باقی ہیں۔ خدا کرے کہ ان کو پیش کرنے میں بھی آپ کو آسانی ہو۔

●2-Prince Colony, Nemat Pura, Idgah Hills, Bhopal

پرکاش فکری

میں اس استطاعت سے محروم ہوں کہ شاعر کے خاص نمبر بلکہ تاریخی خاص نمبر کی جلدیں خرید سکوں۔ مگر ان نمبروں کی پہلی جلد مجھے عاریتاً مل گئی ہے۔ آپ نے واقعی ایک ہمالیائی کام کیا ہے اور اردو ادب کے آئندہ کے مورخین کے لئے ایک ایسا سامان فراہم کر دیا ہے کہ جس کے فیض سے وہ کبھی انکار نہیں کر سکیں گے۔ میری دلی مبارکباد قبول کریں۔ سچ پوچھیے تو آپ کی ہمت اور لگن کی داد کے لئے نہ صرف میرے پاس بلکہ بہتوں کے پاس شاید ہی کوئی مناسب لفظ ہو۔ کمال تو یہ ہے کہ اس عظیم کارنامے کی تکمیل میں شب و روز مصروف رہنے کے باوجود شاعر کے عام شمارے بھی آپ پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔ اس دیوانگی کو کیا کہا جائے؟

●Pras Toli, Doranda, Rahchi - 834002

رشیدہ عیاں

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر نظر نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ آپ کی یہ عظیم کاوش یقیناً اردو ادب میں نادر ہے۔ کم از کم میری معلومات میں ایسا عظیم الشان کارنامہ اس سے قبل کسی نے انجام نہیں دیا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ نے جس طرح تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے وہ غیر معمولی اور لائقِ تحسین ہے دو ماہ اس کے مطالعہ میں گزر گئے آپ کو خط بھی نہ لکھ سکی کہ وصولیابی کی رسید آپ کو مل جاتی۔ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں تو اس میں گم ہو کر رہ گئی۔ کس کس چیز کی تعریف کی جائے۔ زندہ جاوید ہستیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ اہلِ قلم کی ہمت افزائی اور ان

کی ستائش کا اعتراف جس طرح آپ فرمارہے ہیں ایسا انداز شاذ ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو صحت اور عمر طویل عطا فرمائے۔ زندگی لوگوں کو نوازتی ہے۔ آپ زندگی کو نواز رہے ہیں۔

●88-Glenridge Ave, Glen Ridge NJ. 07028 (U.S.A.)

آمنہ ابوالحسن

شاعر کے خصوصی نمبر کی پہلی جلد ملی۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ فی الحال تو اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ایسے شاندار اور جاندار رسالے کو دیکھ کر طویل انتظار کی تمام کوفت یکلخت کافور ہو گئی۔ بلاشبہ آپ کی ہمت و کاوش کی داد دینی پڑتی ہے کہ اتنا صبر آزما کام آخر کار آپ نے کر ہی ڈالا۔ میری ڈھیروں مبارکباد وصول کر لیجئے۔ صرف ایک شکایت ہے کہ میرے بارے میں مختلف آراء چھاپتے ہوئے آپ نے خود کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ بھی شامل ہوتی تو میری مسرت اور بڑھ جاتی۔ ایک کامیاب مدیر اور نقاد۔ ان معنوں میں کہ رسالے کے لئے جو مواد آپ نے اکٹھا کیا ہے وہ کوئی معمولی ذہانت کا آدمی کبھی نہیں کر سکتا تھا لہذا خود کو انڈر اسٹیمیٹ کرنے کی وجہ کم از کم میری سمجھ سے تو باہر ہے۔

●D-108, Curzen Road Apts, Kasturba Gandhi Marg New Delhi - 110001

انل ٹھکر

آپ بھائیوں کی محنت اور کاوشوں نے تراشا ہوا، بزرگوں کی دعاؤں نے سجایا ہوا اور اہل خانہ کی خاموش قربانیوں سے رنگا ہوا شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر ملا۔ شکریہ۔

خاص نمبر ہاتھ میں لیتے ہی نظریں منجمد ہو گئیں۔ زبان کی منڈیر سے جیسے لفظوں کے پرند اڑ گئے۔ کچھ دیر بعد جب وہ پرندے منڈیر پر لوٹے تو منہ سے نکلا۔ چشم بددور! منجمد نظروں میں جنبش ہوئی تو آنکھوں سے برسوں کے انتظار کا کرب ڈھل گیا۔ گلے شکوے مٹ گئے اور خاص نمبر کو سینے سے لگالیا جیسے آپ دونوں بھائیوں کو مبارکباد دینے گلے لگالیا ہو۔ خاص نمبر مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔ میں شاعر اور آپ لوگوں کی لمبی عمر کے لئے دعا کرتے ہوئے اللہ سے استدعا کرتا ہوں۔ یا اللہ، میری دعا میں بامر

کی دعا کا اثر پیدا کر دے۔ آمین۔

●A-1, Shambhu Apts, 38-Adarsh Nagar, Hubli - 580032

شارق جمال

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ آپ کی محنت ٹھکانے لگی۔ ابھی صرف آگرہ اسکول سے متعلق آپ کی تحریر پڑھ سکا ہوں۔ یوں تو تمام ابواب پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ ہر باب اپنی جگہ خوب ہے۔ آگرہ اسکول سے متعلق ابھی اور بھی باتیں ہیں۔ افسوس کہ اب وہ رسائل ہی میری تحویل میں نہیں اور نہ وہ بزرگ اشخاص ہی اب اس دنیا میں ہیں جن سے اور بھی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ ساغر نظامی، مختار صدیقی، جگر مراد آبادی ایسے کئی اور بھی نام تھے۔ جن کو سامنے لایا جاسکتا تھا۔ ایک 'بادۂ مشرق' ہی نہیں نشتر بلگرامی کا 'نشتر کدہ' بھی ہے۔ افسر احمد نگری کا مجموعہ بھی ہے جو سیمابی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ پھر ایسا مجموعہ ان شاعروں نے بھی کہاں پیش کیا۔ علامہ کے تلامذہ میں غالباً شفا گوالیاری کا نام سہواً رہ گیا ہے۔

آج زمانہ سیماب اکبر آبادی کو بھول رہا ہے۔ اگر اسی طرح علامہ کے سلسلے میں شروع ہی سے لکھا جاتا یا لکھوایا جاتا تو آج کا قاری علامہ کو بھی میر، مومن اور غالب کی طرح یاد رکھتا۔ حیرت ہے کہ علامہ کا اشہبِ قلم تمام ادبی و مذہبی موضوعات پر یکساں دوڑا ہے۔ خیر! تاخیر ہی سے سہی اب اس سلسلے کو شاعر میں جاری رکھیے۔ امید ہے کہ کئی اہم باتیں سامنے آئیں گی۔

● تکیہ معصوشاہ، مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)

پرویز یداللہ مہدی

ہمعصر نمبر کا پہلا حصہ نظر سے گزرا۔ بڑا ہی جناتی کام تم نے کیا ہے۔ یقیناً کئی عدد موکل تمہارے تابع ہوں گے تب ہی یہ کام تم پورا کر سکے۔ لیکن یہ کام پورا ہو کر بھی چونکہ ادھورا ہے یعنی اس کے دو حصے اور منظر عام پر آنے باقی ہیں جو یقیناً انہی موکلوں کی مدد سے تم پورے کروالو گے۔ نمبر کے فوری بعد عام شمارے وہ بھی دو دو شائع کر کے تم نے اردو دنیا میں ضرور تہلکہ مچا دیا۔ مری طرف سے نمبر کی اشاعت اور تمہارے ہمت مردانہ کی مبارکباد۔

●'B' Bldg, 4th Fl, Flat No.4, Hunjar Naga, Andheri, Mumbai - 93

عباس خان

مجھے شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر مل گیا ہے۔ جب سے یہ ملا ہے اس کے سحر میں گرفتار ہوں۔ آپ نے علم و ادب کی دنیا میں وہ کارنامہ سر انجام دیا ہے جو آپ کا اسم گرامی قدر ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ یہ میرے سرہانے موجود رہتا ہے۔ اس وقت بھی میرے سامنے ہے۔ میں اس کی ورق گردانی کرتا رہتا ہوں۔ اس کی ترتیب کو مکمل طور پر ذہن میں لانے کے لئے اس کے مندرجات کا اندازہ کرنے کے لئے اور اس میں جگہ پانے والوں کی خوش قسمتی پر رشک کرنے کے لئے۔ آپ جیسے عظیم انسان ہی اس طرح کا کام کر سکتے ہیں۔ میں کھڑے ہو کر آپ کو اس پر سلام کرتا ہوں، مبارک پیش کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مسرتوں سے بھرپور عمر خضرؑ عطا فرمائے۔ آمین

●85-Garden Town Multan (Pak)

سید احمد قادری

یہ نمبر ہر اعتبار سے وقیع اور اہم ہے۔ جس محنت، لگن اور جگر سوزی سے مرتب کیا گیا ہے، یہ امر لائق مبارکباد ہے۔ اس نمبر کی ترتیب میں نہ جانے کتنی راتوں کی نیندیں حرام کرنا پڑی ہوں گی۔ اردو ادب کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی اصناف پر یہ نمبر ایک مکمل دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اتنے سارے اہم اور معیاری مضامین اور تخلیقات کے سمندر میں کسے پہلے پڑھا جائے، یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ ویسے چونکہ صنف افسانہ سے تعلق ہے میرا، اس لئے ایسا لگتا ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں اردو افسانہ جن نشیب و فراز سے گزرا ہے، اس کا بہت اچھا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نمبر دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے انتظار میں جو وقت گزرا، وہ بہت کم تھا۔

●New Karim Ganj, Gaya - 823001 (Bihar)

نظام صدیقی

آپ کا محبت نامہ ہدست ہوا۔ دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ سب سے پہلے محبت آگیں حکم کی تعمیل میں فوری تاثر نامہ بارگاہِ بصیرت میں ارسال خدمت ہے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ آپ واقعتاً دھرتی کا نمک ہیں۔ You are the salt of the earth. یہ فرانسیسی Vous ete la sel de la جملہ کا ترجمہ ہے۔

! terre "شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر" ابدیت کے صفحہ پر خدا کی دستخط ہے ۔ یہ آب رواں پر انسانی دستخط کے مترادف نہیں ہے جو ہو بھی نہیں پاتی کہ مٹ جاتی ہے۔ ہر عظیم تر کام میں فضلِ ربی عمل آرا ہوتی ہے۔ وہ ہی اس یادگار حسیاتی اور معنویاتی انسائیکلوپیڈیک (قاموسی) شعری، ادبی اور تنقیدی سیسموگراف کی پاتالی گہرائی اور وجدانی اونچائی کی ہماری (ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی) پر حسن آرا اور معنی آرا ہے ۔ اس امانت خداوندی کے بار عظیم کو اٹھانے کے شرف کا افتخار ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔ اس کیلئے خدا کسی نیک دل، خوش فکر اور خوش اسلوب افتخار امام صدیقی کو منتخب کرتا ہے جس کے جینس (Genes) میں 'وحی منظوم' اور 'الہام منظوم' کار فرما ہو تو ہی وہ کسی عظیم تر نصب العین کی ذمہ داری کے کانٹوں کے تاج کا اہل ہو سکتا ہے اور بیک وقت اس بنیادی وجودی اور عرفانی آزادی کا امین بھی ہو سکتا ہے جو نئے عہد کی تخلیقیت کے خوابِ عرفان (Vision) میں مستغرق ہونے کے بعد اس کو ایک ٹھوس آفاقی ہیکل عطا کر سکے ۔ یہ آفاقی (Universal) نومعبد فکر و فن آگرہ اسکول کی مقامی (Local) افقی اساس پر پوری بیسویں صدی کی شاعری کے نثری تخلیقیت اور نثر سے شعری تخلیقیت کے عمودی اطراف کی طرف آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہوا "تنقید کے جہانِ دیگر" کی نشاندہی کرتا ہوا معاصر شعر، افسانہ اور مختلف شخصی اور تحقیقی گوشوں کی ایکسرائی تجربہ کشی اور زلزلہ پیما نقد کی تیز تر ریڈیائی اور راز داری روشنی کی شاہدانہ آگہی اور بیباکی میں "ترقی پسندی سے جدیدیت اور نئی دانشوری" "نئی نسل اور مابعد جدیدیت کے مسائل" اور "قاری اساس ادب" کا اپنے دیسی اور قومی تناظر میں نہایت ژرف نگاہی اور خوش سلیقگی سے احاطہ کرتا ہوا اپنے بین السطور میں نئے صعودی آفاق اور فکریاتی انوار کی طرف سمت نما ہے کہ نت نئے تخلیقیت افروز فکر و فن کا تجلی اعظم ہر لحہ وسعت پذیر بیکراں اور بے کنار ہے۔ جو قدر اولی اور حسن اولی کی بنیادی ساخت اور بحر معنی ہے۔ تخلیقیت کل ہے۔ تخلیقیت حرف اول اور حرف آخر ہے۔ تخلیقیت جوہر اصل ہے۔ تخلیقیت حیرت تمام اور رحمت تمام ہے۔ مابعد جدیدیت تناظر کے تخلیقیت افروز معاشرہ اور ثقافت میں نئی اضافی تخلیقیت، نئی اضافی ہم عصری معنویت اور نئی اضافی غنیمت ناگزیر ہے۔ اس فانی دنیا میں دولت وحشمت ہو یا جاہ و مرتبہ سب ناپائیدار ہیں۔ صرف تخلیقیت افروز تحریر کو بقائے دوام حاصل ہے (Literera Scripta Manet) جو (There is only creative writing immortal) مافی الضمیری، اسلوبی، ساختی اور بین سطوری اختلاف (Difference) اور التوا (Deferment) کے جدلیاتی عمل سے گزر کر اکبری تحریر (Arch Writing) بننے کی اہل ہو۔ وہ ہمیشہ غیب (Absence) اور خاموشی (Silence) کی تلاش مدام تلاش میں بیک وقت ہمہ مستغرق اور ہمہ بیدار ہوتی ہے۔ وہ تخلیق اور باز تخلیق کے جہانِ دیگر میں کمالِ محبت اور کمال بصیرت کا اعجاز آگیں نوا قداری اور نو جمالیاتی مظہر ہوتی ہے ۔ "شاعر کا ہم عصر نمبر" تخلیقیت آگیں شعری، نثری، تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کا نگار خانۂ رقصاں ہے۔ اردو ادب کی تواریخ میں اس کی جاودانی معنویت و اہمیت مسلم الثبوت ہے۔ اس پر آشوب دور میں اس یادگاری نمبر کو دیکھ کر دوسری اور تیسری جلدوں کی تمنا ہے۔ افتخار ذہن میں عود کر آئی ہے اور محترمہ سعدیہ روشن صدیقی کے یہ اشعار یاد دہانی اور یقین دہانی کے طور پر بار بار منڈراتے ہیں ۔

سانس لینے کا کب محل ہے یہاں
سانس لینا تو ایک جدل ہے یہاں
اس کو ایک بار اور دیں آواز
ایک زندہ ابھی رجل ہے یہاں (شاعر)

یہ خورشید نیمروزی حقیقت ہے کہ افتخار امام صدیقی نے "ایک ناممکن تخلیقی خواب کی داستان" کو عملی طور پر ممکن کر دکھایا ہے ۔ اپنے "ذہنی فردوس" کو تخلیقیت نواز "حقیقت زار" میں بدل دیا ہے ۔ اردو کی ادبی صحافت کی تواریخ میں یہ نیا اور انوکھا ادبی معجزہ ہے جو عظیم تر نابغۂ شعری علامہ سیماب اکبر آبادی اور بابائے اردو صحافت محترم اعجاز صدیقی کی رفیع تر ادبی روایتوں اور وراثتوں کے حقیقی ادبی وارث افتخار امام صدیقی کے نام اور کام کو ہمیشہ زندہ، تابندہ اور پائندہ رکھے گا۔ ان کی جامع تہہ دار شخصیت، فکر اور فن فی زمانہ نئے عہد کی تخلیقیت کی امین ہے۔ مابعد جدید تناظرات میں نئے عہد کی تخلیقیت مستقبل کی جانب سفر مدام سفر ہے۔

بہت پیارے بھائی! آپ نے اس صدی کے رائج آخر میں سب سے بڑا ادبی نیوکلیائی دھماکا کر دیا ہے۔ عالمی جشن مرگ کے بعد صحیح معنوں میں نئے عہد کی تخلیقیت کی شروعات "شاعر" سے ہو رہی ہے۔ "شاعر" زندہ روایت کی ناقابل تسخیر ایقانی چٹان ہونے کے ساتھ نئی تخلیقیت کا منبع نور تخلیق ہے۔ ● ۲۷ الف، بہادر گنج، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

مختصر مختصر...

● یہ ایک تاریخی دستاویز کی طرح سنبھال کر رکھا جائے گا اور اس کی قدر و منزلت لائبریری میں نایاب ریفرنس مینوئیل کی سی ہوگی۔ ستیہ پال آنند (امریکہ)

● ضخیم بھی ہے، عظیم بھی اور ہر پہلو سے مکمل بھی۔ اسے دراصل اردو زبان و ادب کی مکمل دستاویز کہنا چاہیے۔ آپ نے واقعی کمال کیا ہے کہ کوئی گوشہ، کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ میں نے شاید اس سے بہتر اور پر شکوہ نمبر پہلے کبھی نہیں دیکھا حالانکہ گذشتہ چند برسوں میں اردو کے اکثر ادبی جرائد نے ضخیم نمبر شائع کئے ہیں۔ آپ بلاشبہ سب سے بازی لے گئے ہیں۔ مبارکباد۔ ش۔ صغیر ادیب (لندن)

● اتنا مکمل اور وقیع خصوصی نمبر شائع کر کے آپ نے بلاشبہ سیماب گھرانے کے قابل قدر ادبی آثار میں ایک اور تاریخی اور یادگار کارنامے کا اضافہ کیا ہے جو ذاتِ باری کی خصوصی رعایت اور اکرامِ سلسلہ ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اختر ضیائی (لندن)

● آپ نے تو ایک ادبی دستاویز تیار کی ہے ۔ آپ تحسین کے لائق ہیں۔ صفیہ صدیقی (لندن)

● شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر ملا، جی خوش ہو گیا۔ آنکھیں روشن ہو گئیں۔ آپ دونوں بھائیوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ بہت بہت مبارک۔ شاہد علی خاں (دہلی)

● اتنا ضخیم اور معنی آفریں کیا بلکہ ہمہ ساز نمبر آپ نے کس طرح نکال لیا ہے۔ حیرت ہے آپ کے اس جنونِ بے پایاں کی سعی کامرانی پر۔ اس نمبر پر آپ کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ مصور سبزواری (سنبھل ضلع مراد آباد)

● ہم عصر اردو ادب نمبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کے اداریے بہت معلوماتی اور دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ فیصل ہاشمی (ناروے)

زاھد جعفری

آنکھوں نے آنکھوں سے کہیں کتنی غضب کہانیاں؟
پانی پہ ہیں لکھی ہوئی تشنہ بہ لب کہانیاں!

کرتا ہوں شرح و ترجمہ لکھتا ہوں لوح وقت پر
سنتا ہوں کائنات سے جو روز و شب کہانیاں!

پاگل کی طرح چاندنی روتی ہے رات رات بھر
سورج نے موج موج پر لکھ دیں عجب کہانیاں!

بہتے ہوئے چناب سے کچا گھڑا یہ کہہ گیا
روحوں کا اتصال ہو، بنتی ہیں تب کہانیاں!

فرصت ملے تو جعفری! مٹی کو غور سے پڑھو
ساری حقیقتیں ہیں چپ باقی ہیں اب کہانیاں!

○ جعفری باغ، پوسٹ، جلال پور، ڈسٹرکٹ، امبیڈکر نگر۔۲۲۴۱۴۹(یوپی)

جاوید ھمایوں

آسماں کے رنگ بے حد بے شمار
اور سب فکر و نظر کا انتشار

منتظر ہے شام سے میرا وجود
نیند کو ہے کس پہر کا انتظار

رنگ کیسا ہے در و دیوار پر
یہ دھواں ہے یا مرے غم کا غبار

جسم کو کردے نہ خاکستر کہیں
آگہی کی تخم ریزی کا شرار

سرخ آندھی سے ہوا جنگل شہید
ہے گلہری کو بہ کو ماتم گزار

○ ۱۲۔درگاہ روڈ پارک سرکس۔ کلکتہ - 700017

ھدایت کاشف

منزل تھی میرے ساتھ سفر میرے ساتھ تھا
میں گھر سے جب چلا تھا تو گھر میرے ساتھ تھا

روپوش ہو گیا ہے وہ سورج کے خوف سے
جو اک ستارہ تابہ سحر میرے ساتھ تھا

منزل کے راستے بھی ضیاء پار ہوگئے
کل شب سفر میں رشکِ قمر میرے ساتھ تھا

سب اہل قافلہ میں ہی تقسیم کردیا
جتنا بھی میرا رخت سفر میرے ساتھ تھا

میں ان کے در پہ کتنی تمنائیں لے گیا
لوٹا تو صرف دردِ جگر میرے ساتھ تھا

○ آدم والی، ضلع رحیم یار خاں (پاکستان)

نوشاد احمد کریمی

فکر کے ہمراہ جب بھی ذہن رنجیدہ ہوا
مسئلہ افسردگی کا اور پیچیدہ ہوا

مجھ کو جلنا تھا، جلا، اک عمر ٹھنڈی آگ میں
تب کہیں جاکر شعورِ عشق بالیدہ ہوا

گردشِ حالات نے بخشا سلیقہ زیست کا
ٹھوکریں کھاکر زمانے کی جہاں دیدہ ہوا

میں نے بارش کی دعا مانگی، ہوئی بارش مگر
گھر جو خستہ حال تھا، وہ اور بوسیدہ ہوا

منکشف جب زندگی کے راز اس پر ہوگئے
تب نگاہِ دہر سے نوشاد پوشیدہ ہوا

○ گنج نمبر۔۱، بتیا۔845438(بہار)

سھیل اختر

کسی کے دل میں جو عشقِ خانہ خراب اترے
تو اس کی ہستی پہ اک مسلسل عذاب اترے

وہ تیرا معصوم سا سراپا، وہ تیرا چہرہ
یہ میری آنکھیں کہ جن میں بے رحم خواب اترے

مرے لبوں پہ مچلتی رنگین خواہشوں کا
تری نگاہوں میں ایک دن تو جواب اترے

عجیب رہبر ہیں اس وطن کے کہ جن کے باعث
کٹھن مسافت میں چار جانب سراب اترے

اسی تمنا میں کتنی صدیاں گزر گئی ہیں
کتابِ غم پہ کوئی مسرت کا باب اترے

○ ۵۹۔بی، سٹیلائٹ ٹاؤن، بہاولپور (پاکستان)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

نعت رنگ

کتابی سلسلہ ○ صبیح رحمانی

پیغمبر اعظم آخر صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کا آخری نقطۂ عروج اور دائمی سمت نما ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی انسانیت پر آپ کے بے پناہ معنوی احسانات اور ذاتی اوصاف کا مبارک تذکرہ ہماری زندگیوں کا قبلہ درست کرتا اور اس کارگہِ شیشہ گری میں سانس لینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔

مگر یہ المیہ بلکہ بدقسمتی ہے کہ مرثیوں، قصیدوں اور عام لوگوں کی مدح و منقبت میں لکھے گئے اشعار کو تو ادب تسلیم کیا گیا ہے لیکن تاریخ ادب کے مرتبین اور ناقدین نعت جیسی پاکیزہ صنف سخن کو شعر عقیدت کہہ کر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ اس کی تخلیقی حیثیت اور فنی پہلوؤں پر تو گفتگو ہی نہیں ہوئی ہے۔

جناب صبیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کے کتابی سلسلہ کے ذریعہ اس صورتِ حال کو بدلنے اور اردو داں طبقہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ عصر جدید میں نعتیہ ادب بھی اتنا ہی زندہ، متحرک اور بامعنی ہے جتنا دوسرا ادب۔

آج کے نعت گو کو عصری آگہی حاصل ہے۔ وہ کربِ ذات سے مسائل کائنات تک غور کرتا اور اپنے غور و فکر کے نتیجے کو تخلیقی پیرایہ میں بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ایک قسم کا ادبی جہاد ہے۔

اب تک کتابی سلسلہ میں مختلف شعراء کے نعتیہ کلام کے انتخاب اور صنف نعت سے متعلق فکر انگیز مضامین جمع کر دیئے ہیں جس میں اس کے مدیر جناب صبیح رحمانی کی حسن عقیدت اور مذہبی شعور کے ساتھ ادبی سلیقہ بھی جھلکتا ہے۔

انشاء اللہ یہ کتابی سلسلہ شاعروں، ادیبوں کے گناہ بخشوانے کے کام آئے گا۔ اس کا استقبال ہونا چاہیے۔

——(شمیم طارق)

ضخامت: ۳۵۲ صفحات ○ قیمت: ۱۵۰ روپے ○ مطبوعہ: دسمبر ۹۵ء تا مئی ۹۷ء، تین کتابیں ○ پتہ: صبیح رحمانی:
E-25, Phase-5, Tnt Flats, Shaman No.2, North Karachi, Karachi (Pak)

سلمیٰ کا مقدمہ

نسرین پرویز

اس کتاب کو پڑھنا ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب بڑے جذباتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ مصنفہ نے ایک خاتون سلمیٰ اور خود ان پر بیتے ہوئے واقعات کا بڑے جذباتی انداز میں ذکر کیا ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ یہ ایک فکشن کی کتاب ہے تو ہم پر اس کا ایسا اثر مرتب نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے بارے میں مصنفہ کا کہنا ہے کہ یہ تمام سچے واقعات ہیں انھیں پڑھنے کے بعد ہمارا دکھی ہونا یقینی ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ کتاب اگر سیدھے بیانیہ انداز میں ایک رپورٹ کی طرح لکھی جاتی تو اس کا تاثر اور بھرپور ہوتا۔ ایک اور پیچیدگی اس میں یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اس میں ایک کردار مصنفہ کے محبِ وطن والد کا بھی ہے۔ اس طرح تمام کردار سفید و سیاہ میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

بھٹو اور بے نظیر کی سیاست اس کتاب کا موضوع ہے ساتھ ہی ساتھ بیوروکریسی کا مصاحبانہ کردار اس میں کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں گزشتہ پچاس سال میں جو کچھ ہوا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ بھٹو کی مبہم جوبانہ سیاست نے پاکستان کو کتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی سیاست نے سندھ میں وڈیروں کی طاقت کو اتنا مضبوط کیا کہ آج کسی بھی سیاست داں کے لیے اس سے ٹکرانا آسان نہیں۔ وڈیرے پاکستان میں قدامت پرستی کے گڑھ ہیں جو کسی بھی قیمت پر ملک کو ایک جدید صنعتی ملک بننے نہیں دیتے۔ ان کے پیچھے ایسے جاہل عوام کی تابعداری ہے جنھیں علم کی روشنی سے ہمیشہ دور رکھا جاتا ہے۔ بھٹو کی موقع پرستانہ سیاست کو بے نظیر نے اس بے طرح ہوا دی کہ عوام اسلام کو بھول کر علاقہ پرستی کے جنون میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایک طرف ملٹری ہے جو ملک کی سیاست میں اپنے اختیار سے بے دخل ہونا نہیں چاہتی۔ اس فضا میں جمہوریت کیسے پنپے؟ یہی اصل پرابلم ہے عوام جس کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایک ایماندار سول سرونٹ، ایک دیانتدار صحافی، ایک باضمیر انسان ایسے ماحول میں کیسے کام کرے؟ یہی دراصل نسرین پرویز کا مسئلہ ہے جو انہوں نے بڑے خوش اسلوبی سے لیکن قدرے جذباتی انداز میں اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

دراصل تیسری دنیا کے تمام ممالک اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ اس صورت حال نے کہیں دہشت پسندوں کو جنم دیا ہے، کہیں بنیاد پرست اسلام کی روشنی میں اسے سمجھنا چاہتے ہیں۔ کہیں بے باک، دیانتدار صحافی اپنی جان پر کھیل کر ان ہزاروں عوام پر کیے گئے مظالم ہمارے سامنے لاتے ہیں جہاں دن دھاڑے یا رات میں دروازے پر دستک دے کر وردی پوش لے جاتے ہیں اور پھر وہ لوگ کبھی ہمیں نظر نہیں آتے۔

نسرین پرویز کی کتاب "سلمیٰ کا مقدمہ" ایک سنگین صورتِ حال کو ہمارے سامنے لاتی ہے اور اس پر غور کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔ لیکن کاش اس کتاب کو سیدھے سادے انداز میں محض حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہوتا۔ تب اس کتاب کی اہمیت ہی کچھ اور ہوتی۔ یہ کتاب ایک اہم دستاویز بن جاتی۔

——(انور خان)

ضخامت: ۴۱۶ صفحات ○ قیمت: تین سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۴ اگست ۱۹۹۶ء ○ پتہ: قومی پریس، ۵۔ لوئر مال، لاہور (پاکستان)

آسماں میں کمین گاہیں

انگریزی نظمیں: شیو۔ کے۔ کمار

مترجم: یوسف کمال

شیو، کے، کمار عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور انگریزی میں شاعری کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ناول، ڈرامے، کہانیاں اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی شاعری کے پانچویں مجموعے Trapfalls in the sky کا جسے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ۱۹۸۷ء میں انگریزی ادبیات کے زمرے میں قومی ایوارڈ دیا تھا، اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ ڈاکٹر یوسف کمال نے کیا ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ جمادیات میں لکچرر ہیں۔ سائنس کے استاد کے ادبیات سے دلچسپی رکھنا، اور تخلیق نہ سہی ترجمے ہی کرنا قابل ستائش ہے۔ (آج کل وہ منتخب اردو افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں اور ان کی ایک انتھولوجی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔) یہ ترجمے سبھی معیاری ہیں۔ شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر نظمیں یہ ہیں: "سورج گہن کے سائے لہو میں" "تلاش" "آگ کا چشمہ" "ڈل جھیل سری نگر" "اے دہلی"۔

کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ کتابت طباعت اعلا درجے کی ہے۔ سرورق دلکش ہے۔

———— **(محافظ حیدر)**

ضخامت: ۱۳۹ صفحات ○ قیمت: ۴۰ روپے ○ ناشر: ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، ۳۵ فیروز شاہ مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ ○ ملنے کا پتہ: سواتی، مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ ○ سن اشاعت: ۱۹۹۱ء

مطلع

حسین الحق

حسین الحق کے افسانوں کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ وہ افسانہ نگار ہے جس کا افسانہ کسی پلاٹ کی زمین پر تعمیر نہیں ہوتا۔ صرف ایک نکتہ ہوتا ہے جس کو محور بنا کر وہ اپنے فن کی پرکار سے ایک دائرہ بنا دیتا ہے جس کے طلسم میں قاری تحیر و تحسین کے ساتھ مقید ہو جاتا ہے۔ ایک معمولی کردار، ایک معمولی بات، ایک معمولی واقعے کے اردگرد وہ الفاظ کا ایک جال بن کر اسے اس طرح غیر معمولی بنا دیتا ہے کہ افسانہ غور و فکر پر مجبور کر دینے والی تخلیق بن جاتا ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ یہ افسانے فلسفیانہ ہوتے ہیں یا ان سے جمالیاتی حظ حاصل کرنے کے لئے ایک دانش ور کی سمجھ چاہیے بلکہ ان میں اجتماعی یا انفرادی زندگی کے کسی پوشیدہ گوشے پر ہمیں روشنی جگمگاتی ملتی ہے اور ایسا Sharp Focus ملتا ہے جو قاری کی بصیرت کو منور کر دیتا ہے۔ یقین نہ ہو تو "وہ بات" "درد نہ جانے کوئی" "کلوزپ" "تاریک ہتھیلیاں" "اور زخمی پرندہ" جیسے نمائندہ افسانے پڑھ کر دیکھ لیجئے۔

یہ مجموعہ بہار اردو اکاڈمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ کتابت، طباعت غنیمت ہے۔

———— **(محافظ حیدر)**

ضخامت: ۱۲۰ صفحات ○ قیمت: ۵۰ روپے ○ ناشر: قاضی علی حق اکیڈمی، آمداری ہاؤس، شاہ ہارون، سہسرام، بہار ○ سن اشاعت: ۱۹۹۶ء

تنقیدی مباحث

شارب ردولوی

یہ کتاب شارب ردولوی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اندرون و بیرون ہند سیمناروں اور کانفرنسوں میں پیش کیے۔ شارب ردولوی کا شمار اردو کے معروف ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "معاصر اردو تنقید" "مطالعۂ ولی" "افکار سودا" اور "مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "جدید اردو تنقید۔ اصول و نظریات" کے جو پہلی بار ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی، اب تک چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں اور فی زمانہ اردو کتابوں کی فروخت کی نازک صورت کے پیش نظر اسے ایک امتیاز ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

شارب ردولوی کی فکر سلجھی ہوئی ہے اور ان کی تحریریں تنقید نگاروں کے عمومی طور پر پیچیدہ، اصطلاحوں سے جڑے ہوئے اور کبھی تو ناقابل فہم اسلوب سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈی ایچ لارنس نے کہا ہے، اور عقل سلیم بھی یہی کہتی ہے کہ تنقید ایسی ہونی چاہیے جو سمجھ میں آسکے شارب ردولوی کے اسلوب میں یہی خوبی ہے۔

اس کتاب کا پہلا مقالہ بہ عنوان "ہم عصر اردو تنقید' چند مسائل" ہے جس میں انہوں نے ادبی تنقید میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان سے پیدا ہونے والے سوالوں پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"یہ سوالات ایک طرف دنیا کے سیاسی نقشے میں زبردست تبدیلی، انتزاع سوویت یونین اور مارکسزم کے زوال نے ..." وغیرہ وغیرہ۔ یہاں مبصر کی جانب سے ایک وضاحت ضروری ہو جاتی ہے انتزاع سوویت یونین اور مارکسزم دو علاحدہ چیزیں ہیں۔ آج دنیا کا سب سے بڑا ملک چین، اور اس کے علاوہ شمالی کوریا، ویت نام اور کیوبا جیسے کیونسٹ ممالک کا وجود، روس کی پارلیمان ڈیوما میں کیونسٹ اراکین کی غیر معمولی تعداد اور مشرقی یورپ کے چند ممالک کی مخلوط حکومتوں میں کیونسٹوں کی شمولیت یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مارکسزم کا زوال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسمانی حدوں کو چھونے والی امریکن ٹیکنولوجی کی بالادستی کے، جو نیوکلیائی تباہ کاری سے جست لگا کر Star Wars کی بلندی تک پہنچ گئی ہے، نتیجے اور مقابلے میں کیونزم کی تشکیل نو روبہ عمل ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ سوویت روس اور اردو کی ترقی پسند تحریک میں اس کے چند اندھے اور کٹر مقلدین نے مارکسزم کو ایک Dogma کی جو حیثیت دیدی تھی وہ ختم ہو گئی اور مارکسزم ضرورت اور حالات کے تحت لچکدار روپ میں نمودار ہو رہا ہے۔

اس مجموعے میں اٹھارہ مقالات ہیں۔ "ترقی پسند تحریک اور اردو تنقید" ایک اہم جائزہ ہے۔ دوسرے اہم مضامین میں "نو تنقید" "فراق، ایک تخلیقی نقاد" "جدید غزل میں علامت نگاری" اور "اقبال اور اردو کی اعلیٰ شعری روایات" ہیں۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی (لکھنو) کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ کتابت طباعت اور سرورق عمدہ ہے۔

———— **(محافظ حیدر)**

ضخامت: ۲۲۴ صفحات ○ قیمت: ۸۰ روپے ○ ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶ ○ سن اشاعت: ۱۹۹۵ء

مکتوبات

دسمبر ۹۸ء

گوپی چند نارنگ

باقر مہدی کا کھلا خط "منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی" (شاعر دسمبر ۹۸ء) حضرت وارث علوی کے نام دسمبر ۹۸ء کے شاعر میں نظر سے گزرا۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس کی بہت سی باتیں قابل غور ہیں۔ باقر مہدی سے کئی امور میں اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اُن کے انکار کے حق کی میں نے ہمیشہ تائید کی ہے کیونکہ ایسا نہ کرنا ادب کی آزادانہ فضا کی نفی کرنا ہے اور یہ ایک ایسا ادبی جرم ہے جس کا ارتکاب ادھر بعض معاصرین نے ڈھٹائی سے کیا ہے۔ اس طرح گویا انھوں نے خود کو Expose کیا ہے۔

ادبی اختلافات کو ادبی سطح پر دلائل اور حقائق کی طاقت سے پیش کرنے کے لیے علم کی بھی ضرورت ہے اور حوصلے کی بھی اور ان دونوں کی کمی ہے۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ ہم ادبی اختلاف کو ذاتی رنگ دے دیتے ہیں اور طنز و تمسخر پر اتر آتے ہیں۔ اس کا احساس کم لوگوں کو ہے کہ طنز و تمسخر کمزور شخص کے ہتھیار ہیں۔ اس میں وقتی واہ واہ تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ باقر مہدی چونکہ ایک دوست سے خطاب کر رہے ہیں، خط کے فریم ورک کا ذاتی ہونا فطری ہے، لیکن انھوں نے علمی حوالے بھی دیے ہیں اور دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ اس طرح بالواسطہ جو مسائل زیر بحث آئے ہیں وہ زیادہ تر ادب اور آرٹ سے متعلق ہیں۔

انھوں نے ریکارڈ کی درستی کے لیے بار بار لکھا ہے کہ وارث علوی سے سہو نہیں ہوا بلکہ ان کے حافظے نے بھول کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حافظے کی یہ بھول خود باقر مہدی سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سیمینار کے موقع پر رات کے مشاعرے میں انھوں نے ایک وزیر کی تقریر میں "مداخلت" کی تھی۔ بیشک میں نے انھیں "متوحش" نظروں سے دیکھا تھا (ٹوکا نہیں تھا) لیکن اس لیے نہیں کہ بقول ان کے میں "اس وقت تک پروفیسر نہیں بنا تھا"۔ یہاں باقر مہدی کے حافظے نے ان کو دھوکا دیا ہے۔ پروفیسر تو میں ۱۹۷۴ء میں بن چکا تھا۔ اور یہ واقعہ نو برس بعد ۱۹۸۳ء کا ہے۔ اس پر باقر مہدی کی حاشیہ آرائی کہ "ترقی کرنے کے لیے کتنے مصائب سہنے پڑے ہوں گے۔" نہ صرف غلط در غلط بلکہ قدرے غیر ذمہ دارانہ بھی ہے۔ دراصل باقر مہدی اس اعتبار سے ہمدردی کے مستحق ہیں کہ انھیں غیر ضروری طور پر خود نمائی کی عادت ہے۔ پندرہ برس بعد پوچھے جانے پر بھی میں نے صرف ایک لفظ کہا" جامعہ" جس کو انھوں نے شاید ان سنا کر دیا۔ میری مراد فقط یہ تھی کہ اگر کوئی تماشا ہو جاتا تو خواہ مخواہ جامعہ کی بدنامی ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ تماشا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب باقر صاحب نے ذکر چھیڑا ہے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۹۷۰ء میں جب میں وسکانسن یونیورسٹی سے لوٹا تھا تو پروفیسر تو تبھی ہو چکا تھا اور وہاں کی تنخواہ یہاں کی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں کچھ نہیں تو پندرہ بیس گنا زیادہ تھی۔ سب جانتے ہیں کہ دوسری بار کے بعد معذرت کر کے میں دہلی واپس آگیا۔ عہدوں کے پیچھے بھاگتا تو اور بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ پروفیسر شپ تو یوں بھی کوئی بہت بڑا اعزاز نہیں۔ اور اب تو گدھا گھوڑا سب برابر ہے۔ یہ چند سطریں فقط اس لیے لکھ دیں کہ غلط فہمی نہ ہو اور ریکارڈ کی درستی ہو جائے۔

●D-252, Sarvudaya Enclavc, New Delhi - 1100170

طہور منصوری نگاہ

مشمولات میں محترم باقر مہدی صاحب کا طویل خط بڑا ہی دلچسپ، معلوماتی اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے باقر مہدی ہوں یا وارث علوی یہ حضرات علم و ادب کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں ان کے قلم سے نکلا حرف حرف ہم جیسے شعر و ادب کے طالب علموں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر وارث علوی کا خط بنام زبیر رضوی بھی ساتھ میں شائع ہوتا۔ غزلوں کا حصہ بھی کافی زوردار ہے کہنہ مشق شعراء میں اگر محترم اختر سعید خان اپنے منجھے ہوئے لب و لہجے سے متاثر کرتے ہیں تو شہزاد احمد کی غزل بھی کافی خوبصورت بن پڑی ہے۔ یہ شعر پڑھتے ہی دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

کس لئے اپنی خموشی میں سمٹ کر رہ جائے
کس طرح دشت وہ چاہے جو بکھرنا چاہتا ہے

غزل کے روایتی Symbol میں کس طرح نئی جان ڈالی جاتی ہے یہ شعر اس کا مظہر ہے۔ دوسرے غزل گو حضرات بھی اپنے اپنے مخصوص لب و لہجے اسلوب اور فکر و احساس سے متاثر کرتے ہیں۔ افسانوں میں نشتر اور بھائی جی خوب خوب ہیں لیکن چھوٹی سی بحث میں افسانہ نگار مصلحت اور مصالحت کے شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ مکتوبات میں جناب انجم عثمانی اور جناب خلیل تنویر صاحبان نے بڑی معلوماتی اور کار آمد باتیں لکھی ہیں۔ خلیل تنویر نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ سنسکرت میں دوہے نہیں لکھے جاتے تھے۔ سنسکرت میں دوہے نہیں بلکہ اشلوک لکھنے کا رواج رہا ہے۔ ڈاکٹر منوہر شرما کا یہ جملہ کہ "دوہا ہندی راجستھانی اور گجراتی میں کافی پرانے وقت سے مقبول ہے" تاریخی اعتبار سے یہاں ہندی کو شامل کرنا درست نہیں ہے دراصل یہاں برج بھاشا اور اودھی کہنا چاہیے تھا ہندی آج جس روپ میں رائج ہے اس کو تو پیدا ہوئے ابھی مشکل سے سو برس ہوئے ہیں۔ بہر حال شاعر کا ہر شمارہ اپنے آپ میں محض شاعری نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک افسانہ نگار ایک انشاء پرداز اور ایک بیدار مغز نقاد بھی ہوتا ہے اور وہ سب بھی ہوتا ہے جس کا ایک زندہ اور متحرک زبان تقاضہ کرتی ہے۔

●P.O. Box No. 30, Rewa - 486001 (M.P.)

جنوری / فروری ۹۹ء

بلراج کومل

خواتین قلم کار نمبر نئی صلاحیتوں کی دریافت کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

●E-139, Kalkaji, New Delhi - 19

مناظر عاشق ہرگانوی

شاعر کا تازہ شمارہ اردو قلم کار خواتین پر مخصوص کر کے آپ نے جدت سے کام لیا ہے۔ اس خصوصی شمارے کے لئے مبارکباد قبول کریں۔ دونوں شماروں میں خواتین کے ادب پر بہت مواد ہے جس سے اکثر استفادہ کیا

جائے گا۔ آپ بھی کہاں کہاں کی سوچتے رہتے ہیں۔

● 'Kohsar', Barahpura, Bhagalpur (Bihar)

اندر پرتاپ نیئر

۔ جس طرف دیکھا نہیں تھا اس طرف دیکھا تو ہے

عالمی اردو قلمکار خواتین کا ادب نمبر ہاتھ آیا فرحت ہے۔ میرا منصب تو نہیں کہ میں اتنی اعلیٰ تحریروں پر رائے کا اظہار کروں یا تنقید کروں بس اس خط کا مقصد تو آپ کو مبارکباد دینا ہے۔ اس عرصۂ پر آشوب میں شاعر کا ادبی معیار بلند سے بلند تر ہونا معجزے سے کم نہیں۔ بے شک یہ آپ سب بھائیوں کی انتھک لگن، بے مثل قربانیوں اور محترمہ امی جان کی دعاؤں کا بھی اثر ہے۔

شاہین مفتی، عذرا پروین، منصورہ احمد، کوثر جہاں، ساجدہ زیدی، ملکہ نسیم کی آزاد نظمیں دل کو چھوتی ہیں اور شاہدہ حسن، رفیعہ شبنم، رشمی بادشاہ اور تسنیم فاطمہ کی غزلیں بھی استادانہ مہارت کی ہیں لیکن ان کی شاعری صرف ذاتی رومانس کے گرد ہی گھوم رہی ہے اور حصار ذات سے اوپر نہیں ابھر رہی اور سوائے عذرا پروین کے زندگی کے اہم مسائل سے ہم آہنگ نہیں ہو رہی۔ بقول فیض دل میں درد جگا لینے اور اس کی محرومی کا رونا رونے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان کو محرم غم انساں کیا جائے آپ کی محبت سارے زمانے کو محیط کر لے۔ آج سماج میں زخم ہی زخم ہیں۔ سپنے ٹوٹ گئے ہیں امیدیں بیٹھ گئی ہیں اور جواں آرزوں کو دیمک چاٹ گئی ہے مگر ہماری شاعرات ابھی تک پیاس اور سراب کے گرداب (ص ۲۰۶) میں پھنسی ہوئی ہیں اور

"... کہ شیر جسم و جاں میں
ہو کے کرنوں پر سوار اک سرو قد آیا..." (رعنا حیدری)

گنگنا رہی ہیں۔ آخر سماج میں بڑھ رہی فرقہ پرستی، کرپشن، بد اخلاقی کے بازو مروڑنے کی ذمہ داری کس پر ہے۔ کاش یہ ذمہ دار دانشور طبقہ اپنے فرض کا احساس کرے اور اپنے انفرادی کرب کو اجتماعی اور افادی رنگ دے تاکہ قاری محسوس کرے کہ یہ اس کے دل کی ہی ترجمانی ہو رہی ہے۔

کہانیوں میں نعیمہ ضیاء الدین کی پیک دان سر فہرست ہے۔ انہوں نے بوڑھے آدمی کی حیوانی اور سفلی خصوصیات کی بڑی دلکش منظر کشی کی ہے۔ قمر جمالی کی کہانی الاؤ میں ہوسناکی کی انتہا دیکھئے جو ایک کوڑھی تک کو لرزاں و ترساں کر دیتی ہے اور برف کی قاش بھڑک کر شعلہ جوالہ بن جاتی ہے۔ مہ جبیں قیصر کی کہانی حصار کا اختتام حیرت میں ڈالتا ہے۔ شکیلہ رفیق شریف، ثمر وہ میں دل اور دماغ کو چھو لانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ بحیثیت مجموعی یہ نمبر امتیازی حیثیت کا حامل ہے اور قابل قدر دستاویز۔

●5-A, Major Shivdev Singh Marg,
Civil Lines, Ludhiana - 141001

شفیقہ فرحت

'عالمی خواتین نمبر' میں چند بلکہ بہت سے اہم نام نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ اس کا کوئی جواز، جواب ہے تمہارے پاس؟ تم نے اسے "بے ترتیب سوچ کا تخلیقی اظہار" کہا ہے اور آگے یہ لکھا ہے کہ 'یہ کوئی طے شدہ شمارہ نہیں ہے لہذا بہت سارے ناموں کی شمولیت ممکن نہیں ہو سکی ہے۔' اگر کوئی اہم کام سلیقے سے کرنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں تو اس کا بیڑا اٹھایا کیوں۔؟

یہ سراسر بے ایمانی اور مدیرانہ گھٹیا پن ہے۔ اس شمارے میں تمہاری تنگ نظری کی بنا پر جو خواتین شامل نہیں ہو سکیں ان کے متعلق قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ وہ اس قابل نہیں تھیں۔ اور ادبی تاریخ غلط، نامکمل اور ناکارہ ثابت ہوگی۔ ایک ادارہ جو اپنے آپ کو ذمہ دار کہتا ہے اسے ایسی غلط تاریخ ادبی دنیا کو دینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ خدا کے لئے اس قسم کی 'خدمت' سے باز آ جاؤ۔

(فی الحال اس خط پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے۔ ادارہ)

●24, Tapti Apt, T.T Nagar,
Bhopal - 462003

نامی انصاری

شاعر کا تازہ شمارہ جو خواتین قلم کاروں سے متعلق ہے، موصول ہوا۔ پڑھنے سے ملک اور بیرون ملک کی خواتین کی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوا۔ ادا جعفری کی یہ بات مجھے پسند آئی کہ 'میں شاعری میں نسائیت کی دکان سجانا پسند نہیں کرتی۔'

●93/295, Nala Road, Chaman Ganj,
Kanpoor (U.P.)

شارق جمال

خواتین اہل قلم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی عصری ادب تخلیق کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اس شمارے میں خواتین کی عمدہ تخلیقات نظم و نثر ہیں۔ فنی، لسانی تسامحات سے قطع نظر حصہ نظم خوب ہے۔

Takia Masoom Shah, Mominpura
Nagpur - (M.S.)

سلیم شہزاد

کیا آپ نے طے کر رکھا ہے کہ شاعر کا ہر شمارہ منفرد ہی ہوگا؟ داد دینی پڑتی ہے آپ کی فکر اور حوصلے کی اور نئی راہ تلاش کرنے کی۔

●323 - Man Galwar Ward,
Malegaon - 423203 (M.S.)

قمر صدیقی

شاعر کا خواتین نمبر نظر نواز ہوا، واقعی آپ نے ایک اہم کام کیا ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد بہت قلیل عرصے میں ایک اور نمبر۔ یہ تو صرف آپ ہی کے بس کی بات ہے کہ آپ کے پاس اتنا تجربہ اور مضبوط خاندانی Back Ground ہے۔ ہاں! اسی شمارے میں معاونین میں حامد اقبال صدیقی کا نام دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ حامد بھائی سے میرے تعلقات بڑے کھٹے میٹھے قسم کے ہیں اور ان کی کامیابی پر دل سے دعا نکلتی ہے۔ سر ورق پر حامد بھائی کا بنایا ہوا اسکیچ نہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ تو تخلیقی اعتبار سے زرخیز شخص ہیں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ وہ اگر اس موضوع پر اسکیچ بناتے تو یقینی شاندار ہوتا اب شاعر کی ٹیم میں حامد اقبال صدیقی کی شمولیت سے اس میں مزید نکھار آئے گا۔ (مذکورہ شمارے کا سرورق حامد اقبال صدیقی ہی کا بنایا ہوا ہے۔ ادارہ)

:7/3121, Gajanan Colony Gawandi,
Bombay - 43

شکیل احمد

شاعر کا عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب نمبر موصول ہوا۔ ہند و پاک دوستی کے نام کیا گیا ہے یہ شمارہ۔ بہت اچھی کوشش ہے۔ اور کب دوستی کے لئے کام نہیں کیا ہے ہمارے ادب نے، ہماری شاعری نے۔ ہمیشہ ہی سماج و ملک کے لئے ہماری شاعری آگے آئی ہے۔ جنگ آزادی سے لے کر آزاد ہندوستان تک۔ آزاد ہندوستان میں بھی اکثر ایسے حالات ہوئے ہیں جن کو غلام ملک والے حالات سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ ہمیشہ ہی ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے ہوئی سیاست کو رد کیا ہے۔ موجودہ ہند و پاک دوستی کا پیغام بھی ہندوستان ہی کی طرف سے دیا گیا ہے۔

فکر امروز

جس شعر کے سننے سے طبیعت میں اتنا غلغلہ کشاد پیدا ہو کہ سامع کو بے اختیار ہنسی آ جائے وہ غزل کا شعر نہیں ریختی کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے۔ شعر وہ ہے جو سماعت میں کیف اور دل میں اہتزاز پیدا کر دے۔ شعر وہ ہے جس کے سمجھنے کے بعد روح میں ایک روشنی اور معلومات میں ایک اضافہ محسوس ہو۔ شعر وہ ہے جو باوجود کوشش جاہل یا کم علم موزوں طبع شخص نہ کہہ سکے۔ اور شعر وہ ہے جو زبان سے زیادہ کاغذ پر موثر ثابت ہو۔

آج اردو شاعری خراب افراط ہے۔ اس میں تفریق کی بہر حال ضرورت ہے۔ اہل کمال اور کم علم لوگوں کی شاعری میں کوئی وجہ تفریق ہونی چاہیے۔ ردیف اور قافیہ اور بحر کی پابندی کے ساتھ ایک خیال موزوں کر لینا کوئی معجزہ نہیں۔ ہر موزوں طبع بہر حال شعر کہہ سکتا ہے لیکن کاغذ اور اذہان پر صدیوں باقی رہنے والے شعر دماغ کی جودت اور روح کی قوت سے کہے جاتے ہیں۔ صرف بحر اور قافیہ و ردیف کے ہوتے پر نہیں کہے جاتے۔

(۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء۔ کانپور)

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

شاعر

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ـــ ۷۰

شمارہ ـــ ۵

فون: 3829804

مئی ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۱۰۰ روپے	۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری	**معاونین سے**
۵۰۰۰ روپے	۲۰۰ روپے

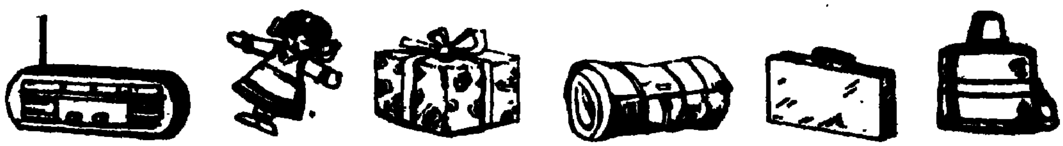
پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۳۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

[redacted]

Death comes in strange disguises..



Stop!

Never touch/pick up any unidentified object or unclaimed luggage at Railway Stations or inside trains. They can contain lethal bombs that can kill you & your co-passengers, besides wounding many others.

- *Be alert and Vigilant : look around you for unclaimed objects, watch for passengers who get off at stations, leaving behind their luggage.*
- *Your vigilance can save the lives of many.*
- *Always check under your seats before sitting down or storing your luggage etc.*
- *Also check the top berths for small objects like dolls, toys, gift wrapped items etc.*



If you find an unidentified bag or object, do not touch it. Alert everyone around and inform the Railway Protection Force (RPF) or Railway Staff on duty. Help us to help you.

NORTHERN RAILWAY

سرورق
حامد اقبال صدیقی

*

ہم عصر اردو ادب نمبر
ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں
[قارئین و قلمکار]
۳۹

مکتوبات

شمارہ ۔ ۵ [مئی / ۱۹۹۹ء] جلد ۔ ۷۰

غزل : غزل کار اور ناقد

گزشتہ اداریوں میں معاصر اردو غزل کے جس کردار کو موضوع بنایا گیا ہے وہ ایسے حقائق پر مبنی ہے جنھیں سوچا نہیں جا رہا ہے۔ غزل کے اس غیر معمولی عملی کردار کی جادوگری کو سمجھا نہیں جا رہا ہے بلکہ غزل پر کوئی ایسا مکالمہ قائم نہیں کیا جا رہا ہے جو نئی غزل کو زیادہ تخلیقی بنا سکے۔ معیاری غزل اور اچھی غزل کا کوئی نیا تصور بہت ضروری ہے کیوں کہ ترقی پسند ادب میں نظم کو غزل پر ترجیح دی گئی اور جدیدیوں نے غزل کو بے روح اور بے رس بنانے کی زیادہ سعی کی اور ایسی شاعری کتب و رسائل میں بھری جانے لگی جس کا تعلق وجدان سے کم اور عقل سے زیادہ رہا۔ کتب و رسائل میں غزل کتنی معیاری اور کتنی غیر معیاری ہو گئی ہے اس پر بحث سے گریز کرتے ہوئے غزل کو اس کے سماجی، سیاسی اور عملی زندگی کے تناظر میں دیکھا گیا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ صنفِ سخن محض اردو یا اپنے آپ میں صرف ایک فارم یا ہیئت نہیں بلکہ ہندوستان کے عوام و خواص کی مشترکہ پسند بھی ہے۔ بنا تخصیص مذہب و ملت یا لسانی تعصب کے۔ غزل کے اشعار ہر جگہ موجود ہیں۔

مگر معاصر اردو غزل کے تعلق سے یہ بحث بھی کہاں ہوئی ہے کہ اگر غزل غیر معیاری ہو گئی ہے تو اس کی وجوہ کیا ہیں؟ اچھی اور بڑی شاعری کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ کتب و رسائل میں شائع ہونے والی غزلیہ شاعری گو ہمارے اداریوں کا موضوع نہیں تاہم قارئین شاعر کا یہ بھی اصرار ہے کہ غزل کو الیکٹرانک میڈیا کے مسائل کے ساتھ خالص ادبی صورت حال کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے لہٰذا چند اہم اور بنیادی اشارے فوری ردِ عمل کے طور پر تحریر کئے جا رہے ہیں۔

کیا غزل کا ایک اچھا اور معیاری شعر کہنا آسان ہے؟ غزلیہ شاعری کی بھرمار سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شعر کہنا بہت آسان کام ہے اور ہر موزوں طبع شخص غزل کہہ سکتا ہے بلکہ یہی ہو رہا ہے کہ جسے ذرا بھی محسوس ہوا کہ وہ شعر موزوں کر سکتا ہے، غزل کہنے لگتا ہے اور چند ہی ماہ میں وہ اس خواہش کا بھی اسیر ہو جاتا ہے کہ اب اس کی شاعری چھپی روشنائی میں بھی نظر آنے لگے۔ ایک آدھ سال میں وہ بڑے ادبی رسائل کے مدیران کو نہایت ہی جرأت مندی کے ساتھ خط لکھنے لگتا ہے کہ اس کا کلام نہ صرف یہ کہ شائع کیا جائے بلکہ نمایاں طور پر شائع کیا جائے۔ اور پھر چند سال بعد تو وہ صاحبِ طرز، منفرد، اہم، معتبر اور اردو شاعری میں اضافہ کرنے والا شاعر بن جاتا ہے۔

ہمارے نقادوں نے غزل کی تنقید مغربی معیارات کے تحت لکھی جبکہ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے کہ اس کی اپنی ایک الگ تنقیدی نہج ہونی چاہیے تھی۔ آزاد نظم اور نثری نظموں پر تو مغربی تنقیدی معیارات کے تحت تنقید کسی حد تک قابل قبول ہو سکتی ہے لیکن غزل کی تنقید ایک علاحدہ مزاج و معیار کی متقاضی تھی اور ایسا نہیں ہوا کیوں کہ غزل کو اردو زبان کے لئے اور اپنے لئے عالمی سطح پر فخر نہیں بنایا گیا اور مغربی یا مشرقی شاعری کے جو تنقیدی معیارات ہیں، غزل کو بھی صرف اور صرف انھیں معیارات کے تحت دیکھا اور سمجھا گیا، سمجھایا گیا۔ یہ تنقیدی سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ غزل کو آج تک اس تنقید اور نقادوں کا انتظار ہے جو غزل کو خالص غزل کے روپ میں دیکھتے ہوئے تنقید لکھتے اور نئی نسل کی رہنمائی کرتے تاکہ معیاری غزل تخلیق ہو پاتی۔

ہماری معیاری کلاسیکی شاعری میں بڑی شاعری زیادہ تخلیق ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ کیا کبھی اس موضوع پر سیمینارز ہوئے ہیں۔ اچھی اور بڑی شاعری (غزل) پر کہاں سیمینار ہوئے۔ نئی نسل کے شعرا سے اچھی اور معیاری غزل کے تعارف کا اہتمام بھی کہاں ہوا۔ غزل کیا ہے اور کیا نہیں کے عنوان سے ورکشاپ منعقد نہیں کئے گئے۔ نئے شعرا کے لئے غزل ورکشاپ بہت اہم ہو سکتے تھے۔ کسی نے بھی غزل کے لئے کوئی بہت خصوصی کام نہیں کیا جس سے یہ صنفِ سخن زیادہ سے زیادہ زرخیز اور معیاری ہوتی ہندوستان کا فخر بنتی۔

ہمارے اساتذہ نے اپنے تلامذہ کی جو تربیت کی تھی اس سے اچھی اور بڑی شاعری کے وافر نمونے کلاسیکی غزل میں موجود ہیں۔ مشقِ سخن، مطالعہ اور ریاضت کی مسلسل تلقین کرنے والے اساتذہ نے ماضی میں جو علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ عصر حاضر میں خال خال نظر آتی ہیں۔ اب نہ وہ اساتذہ ہیں اور نہ ہی تلامذہ۔ دبستانوں کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ ہر شاعر اپنے آپ میں ایک نام نہاد استاد ہے اور 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' کے گمان میں رہتا ہے۔ سیکھنے اور سکھانے کا چلن ختم ہو گیا ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری کے زوال کا ایک بڑا اور بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ ہر موزوں طبع جو کچھ بھی لکھ رہا ہے اسی کو شاعری سمجھے ہوئے ہے۔ استادی شاگردی کی روایت کو ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے ختم کر دیا اور جو چند نام رہ گئے یا جن اساتذہ نے اس روایت کو باقی رکھنے کی سعی کی وہ "استادِ محض" ہو کر رہ گئے یا پھر معتوب ہوئے۔ غزل تو اپنے تخلیق کار سے ہر بار اس کی روح کا مطالبہ کرتی ہے۔ غزل کے ہر اچھے شعر میں تخلیق کار کو بار بار خلق ہونا پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور خود بھی اسی کسوٹی پر پرکھے گئے کہ جب تک اساتذہ کے پانچ ہزار اچھے اشعار ازبر نہ ہوں، شعر گوئی کی اجازت نہیں۔ ہم سے تو پڑھوائے جاتے، معیاری اور غیر معمولی اشعار سنانے کی خواہش کی گئی تھی۔ 'بیت بازی' کا رواج سیکھنے اور سکھانے ہی کا ایک خوب سیرت طریقہ تھا۔ اب یہ رواج بھی کمزور پڑ گیا ہے۔ اچھی، سچی اور بڑی غزلیہ شاعری کی تخلیق کے لئے اساتذۂ کرام، تخلیق کار، ناقدینِ شعر اور مدیران رسائل کو از سر نو غور کرنا ہو گا کہ ۲۱ویں صدی میں انھیں صنفِ غزل کے لئے کیا کرنا ہے۔

5

Zoë Ansari

ظ انصاری

reside : 32. shirin, colaba post office, bombay 400 005 ● dial : 214453
office : university club house, b. road, bombay 400 020 ● dial : 297292

17.3.1980.
Moscow.

مسنو برادر،

میں نے شاعر کا عصری ادب نمبر بمبئی سے منگوایا اور ایک صاحب کو دیا۔ مشورہ بھی نذر کیجیے
اردو کے جدید ادب پر ۳ تھیسس لکھے جا رہے ہیں ان میں کلام آئے گا۔ ایک تھیسس میں غنیمت ہے۔
(اگر بھیج سکیں وہ غنیمت کے گوشے والا شمارہ بھیج دیجئے ڈاک سے)

ایک بات پوچھتے ہیں:

یسینن روس کا ایک جوان مرگ شاعر گزرا ہے۔ زمانہ ۱۹۲۵-۱۸۹۵۔ تیس برس جیا۔ (S. yesenin)
دو ضخیم مجموعے اس کے کلام کے نکلے۔ اسے آپ روس کا مجاز سمجھیے۔ مقبول وہ مجاز سے زیادہ ہے۔
میں نے کبھی اس کی سات نظمیں اردو میں ڈھالی تھیں۔ اب جو لکھنے بیٹھا اس پر مضامین پڑھے، اور آگے گیا۔ نظمیں اور کر ڈالیں۔ کل ملا کر ۵۰ سے اوپر ہو گئے۔ اکثر ان میں کے اچھے ہیں۔
اگر یسینن پر ایک مضمون کے ساتھ یہ نظمیں شائع کریں تو تیار کر کے، یعنی ٹائپ کرا کے بھیج دوں۔ پڑھنے والے شاید پسند کریں۔ مگر جواب جلد دیجئے گا۔ اور اگر نہیں تو میں چپ ہو رہوں گا۔

جولائی کے شروع میں بمبئی پہنچنے کا اصلی واپسی کا ارادہ ہے۔ ابھی آپ کے تینوں مجموعوں پر جو تبصرے کرنے دیے گئے تھے، تبصرہ کروں گا مضمون کی شکل میں۔ اور یوں اپنا فرض ادا کر دوں گا۔

کوئی خدمت میرے لائق ہو تو لکھنا۔

فقط ظ

ظ انصاری بنام افتخار امام

ظ انصاری (ظل حسین انصاری۔ پ: ۶/ فروری ۱۹۲۵ء۔ م: ۳۱/ جنوری ۱۹۹۱ء) کے کار و افکار پر تحقیقی کام کی گونج سے آگے اب تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی جو اس صاحب طرز ادیب کی شخصیت و فن کا مجموعی جائزہ پیش کر سکے۔ ظ انصاری کے مکاتیب کا اسلوب اور ان کا ڈکشن بہت مختلف اور منفرد ہے۔ خطوط کی یکجائی بھی ایک اہم علمی و تحقیقی کام ہے۔ ظ صاحب نے اپنی شخصیت و فن پر بہت سارا ذخیرہ 'فن و شخصیت' کے مدیر صابر دت کو 'ظ انصاری نمبر' کے لئے دیا تھا۔ دونوں حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سارا لوازمہ اب کہاں ہوگا؟ اس کا انجام معلوم۔ بہر حال! ظ انصاری اردو ادب کا ایک اہم نام ہے۔ (ادارہ)



مخمور سعیدی

آجائے لبوں تک اگر اک جام، بہت ہے
تھوڑا سا اُجالا بھی سرِشام بہت ہے

تسکیں کے لئے، اذنِ ملاقات سے پہلے
یہ رابطۂ نامہ و پیغام، بہت ہے

آجائے اچانک وہ کسی روز، تو کیا ہو!
اب اس کے نہ آنے کی خبر عام بہت ہے

سنتے ہیں، کہ سنسان ہیں سب کوچہ و بازار
کہتے ہیں مگر شہر میں کہرام بہت ہے

کیا عکس ہو روشن ابھی تقدیرِ بشر کا
دھندلا ابھی آئینۂ ایام، بہت ہے

کم کم ہی فروزاں ہے کہیں مشعل اور اک
دنیا ابھی سرگشتۂ اوہام بہت ہے

پل بھر میں بکھر جائے نہ یہ سارا تماشا
کمزور، طلسمِ سحر و شام بہت ہے

زندہ ہیں پس ترکِ تعلق ہم ابھی تک
تکلیف ہے تھوڑی مگر آرام بہت ہے

مخمور! بس اب بادۂ عشرت کی ہوس کیا
پینا ہو تو تلخابۂ آلام بہت ہے

● J-3 /14IC, K.K.Ext,
Lakshmi Nagar, Delhi - 92



غلام مرتضیٰ راہی

چنگاری کو شعلہ کرکے بیٹھ گئے
ہم تو اور اندھیرا کرکے بیٹھ گئے

چل نہ سکے تو میل کا پتھر بن کر ہم
اس کی سمت اشارہ کرکے بیٹھ گئے

دل نے تمنا کی تھی جس کی برسوں تک
ایسے زخم کو اچھا کرکے بیٹھ گئے

پیار کے امکانات پہ کرنی تھی تقریر
نفرت کا اندازہ کرکے بیٹھ گئے

آئینوں سے ہم ایسے بیزار ہوئے
اپنے آپ سے پردہ کرکے بیٹھ گئے

رسوائی کے ڈر سے ہم نکلے نہ کبھی
گھر میں، گھر کا سودا کرکے بیٹھ گئے

اس کی محفل کے اک کونے میں راہیؔ
ہم بھی ایک اضافہ کرکے بیٹھ گئے

● Mohalla Panni,
Fatehpur - 212601



احتشام اختر

سر چھپانے کو سائبان کہاں
اب مرے سر پہ آسمان کہاں

ساری گرمی تھی ایک کے دم سے
بال و پر ہیں مگر اڑان کہاں

یوں تو کہنے کو گھر میں رہتے ہیں
وہ ہمارا مگر مکان کہاں

چل پڑی ناؤ جن سہاروں پر
اڑ گئے ہیں وہ بادبان کہاں

پیڑ پر یاد جم گئی تھی کبھی
اس کے باقی ہیں اب نشان کہاں

ہم بلندی کو چھونے والے تھے
سر پہ آ کر گری چٹان کہاں

● معرفت ڈی ایس یادو،
آدرش کالونی کھیڑلی پھاٹک کوٹہ ۳۲۴۰۰۱

یہ کل کی باتیں تو کل بھی ہوں گی

ادبی فیچر

ادبی فیچر کے تحت علامہ شارق جمال کے "عروض معروض" کو خاصہ پسند کیا جارہا ہے ۔ شاعر میں شائع ہونے والی منظومات میں فنّی اغلاط یا عروضی تسامحات کے حوالے سے اس سلسلے کو ہم خود بھی اہم سمجھتے ہیں ۔ معاصر اردو غزل اگر غیرمعیاری ہورہی ہے تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ترقی پسندوں اور پھر جدیدیوں نے اپنے اپنے مقاصد کو اردو شاعری کی روایت ، ادبی دبستانوں اور اساتذۂ فن پر ترجیح دی ۔ اس موضوع پر شاعر کا نیا اداریہ ملاحظہ کیجئے جو غزل سیریز کے تحت ہے ۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے جو ادبی مذاکرات ہوئے تھے ان میں سے 'الف تا سین' کے تحت جلد اوّل میں دیئے گئے ہیں ۔ ابھی بہت سارے جوابات جلد دوم میں شامل ہوں گے لیکن بعض قلم کاروں نے اپنے جوابات پر نظرثانی کی گزارش کی ہے جو صحیح بھی ہے لیکن بعض قلم کاروں نے اب سے چند سال قبل جو شذرات بطور جواب ارسال کئے تھے وہ آج بھی روشن ہیں اور کل بھی روشن رہیں گے کہ یہ وہ سچائیاں ہیں جو ہر روز اور ہر عہد میں تخلیقی ادب کے ساتھ یا اس کے آس پاس رہتی ہی ہیں ۔ محترمہ شکیلہ رفیق نے مذاکرہ ترقی پسندی سے جدیدیت اور نئی دانشوری کے تحت کئی سال قبل اپنے جواب ارسال کئے تھے۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۹ء شاعر کے خاص و علم شماروں پر مختصر خطوں کے علاوہ طویل طویل مکاتیب بھی موصول ہوتے رہے ہیں جو محض اپنی طوالت کے سبب شاعر کے 'مکتوبات' میں شامل نہیں ہوسکے ہیں ۔ ایسی اہم تحریروں کا اگر انتخاب کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب کی جاسکتی ہے ۔ برادر منظر اعجاز نے شاعر کے ایک خصوصی شمارے 'نئی شاعری ۔ نئے استعارے' (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) سے متعلق ایک طویل خط تحریر کیا تھا ۔ ادبی فیچر' کے تحت ایسی زندہ تحریروں کو ہم منظرِعلم پر لانا چاہتے ہیں تاکہ نقادانِ ادب کو معلوم ہو کہ رسالہ شاعر نے ۱۹۸۰ء کے بعد ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش ، سے الجھے بغیر مابعد جدیدیت (مغربی اصطلاحوں سے قطع نظر) کے سوال بنائے تھے ۔ ان ۱۸ ، ۱۹ برسوں میں ہم نے شاعر کو غیرجانبدارانہ تخلیقی ادب سے زرخیز کرنے کے ساتھ نقادوں کی برتری سے بھی محفوظ رکھا ۔ (ادارہ)

شارق جمال

یہ پہلی کوشش نہیں ۔!



خلیل ابن احمد نے اور بعد کے عروضیوں نے زحاف کی مدد سے بے شمار بحریں ایجاد کی ہیں ۔ لیکن ہر ملک میں ہر زبان کے لوگوں میں یہ تمام بحریں رواج نہ پا سکیں ۔ اپنی اپنی زبان اور ملکی مزاج کے مطابق مذکورہ بحور میں سے چند بحریں ہی طبع آزمائی کے لئے شعراء منتخب کرکے اشعار کی تخلیق کا عمل انجام دیتے رہے ۔ اور آج بھی اسی طرح اپنی زبان کے مزاج کے مطابق آہنگ شعر کو سمجھ کر چند بحور ہی میں سخن سازی کا عمل جاری رکھا گیا ہے ۔

اہلِ عرب نے عروضی قاعدے کے مطابق اختراع کی ہوئی بحروں میں سے بحر وافر ۔ بحر کامل ۔ بحر بسیط ۔ بحر طویل ۔ بحر مدید ہی میں طبع آزمائی خوب خوب کی ہے ۔ اہلِ فارس نے اپنے لئے بحر جدید ۔ بحر قریب ۔ بحر مشاکل کا انتخاب کیا ۔ لیکن بحر سریع ، بحر مقتضب ، بحر مجتث ، بحر ہزج ، بحر رجز ، بحر رمل ، بحر متدارک ، بحر متقارب ، بحر خفیف ، بحر منسرح ، بحر مضارع دونوں زبانوں کی شاعری کے لئے مشترک رہی ۔

اردو شعراء نے اپنی زبان کے مزاج اور آہنگ کے مطابق ۔ بحر متقارب ، بحر متدارک ، بحر ہزج ، بحر رمل ، بحر رجز ، بحر خفیف ، بحر مضارع ، بحر مجتث ، بحر ان میں کافی طبع آزمائی کی ہے اور یہی بحریں کثرت سے اردو شاعری میں مروّج ہیں ۔

مطالعے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی غیر مروّجہ بحر و اوزان میں بھی شعرائے اردو نے اشعار کی تخلیق کی ہے اور اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھایا ہے ۔ جیسے علامہ سیمابؔ نے دائرۂ مختلفہ کی بحر عریض سالم میں پوری غزل کہہ کر اپنے مجموعہ کلام کلیم عجم میں شامل کیا ہے ۔ جس کے ارکان مطلع کے ساتھ درج ذیل ہیں ۔

ارکان　　مفاعیلن　　فعولن　　مفاعیلن　　فعولن

مطلع ۔　　دل اک قطرہ لہو ہے، نہ ہے اس کے سوا کیا؟

پھر اس کی آرزو کیا؟ پھر اس کا مدعا کیا؟ ص ۵۷

امہ سیمابؔ (۱۸۸۰ء ، ۱۹۵۱ء) نے اس طرح کی اور بھی تخلیق شعر کی سعی کی ہے ۔ آپ کے مجموعہ کلام کے مطالعے سے ا[illegible] کی تخلیقی کوششوں کا پتہ چل سکتا ہے

غالب (۱۷۹۷ء ، ۱۸۶۹ء) نے بھی دائرہ مشتبہ کی بحر مجتث مخبون مثمن میں دو غزلیں کہیں۔ جو دیوان غالب میں موجود ہیں۔ ایک غزل کا شعر ارکان بحر کے ساتھ درج ذیل ہے۔

ارکان۔ مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلاتن
شعر۔ تم اپنے شکوے کی باتیں، نہ کھود کھود کے پوچھو!
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے — مرقع غالب ص۹۵

اور اسی بحر میں علامہ سیمابؔ نے بھی اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کا ایک مطلع ہے۔

خفا نہ ہو جو مجھے عشق میں قرار نہیں ہے
قرار و صبر پہ انساں کو اختیار نہیں ہے — کلیم عجم ص۱۶۰

شعرائے اردو نے اس طرح کے اور دیگر ارکان میں نیز غیر مروّجہ بحروں میں اشعار کی تخلیق کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح کی ایک اور کوشش غوث محمد غوثی (علی گڑھ) نے بھی کی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

اس کی رفاقت پہ ناز آٹھوں پہر ہے
یار کا غم خود بخود شریک سفر ہے (ماہنامہ شاعر بمبئی مارچ ۱۹۹۶ء ص ۴۳)

اس غزل کے اشعار کو دو بحروں میں تقطیع کر سکتے ہیں۔ اور وہ دو بحریں اور ارکان یہ ہیں۔

۱۔ بحر بسیط : مطوی مذال احذ مثمن ۔ ارکان : مفتعلن فاعلاتن مفتعلن فع
۲۔ بحر منسرح : مطوی۔ منور۔ مثمن ۔ ارکان : مفتعلن فاعلات مفتعلن فع

اس بات سے قطع نظر کہ ارکان عروضی مزاحف قاعدے کے مطابق اپنی جگہ درست ہیں یا نہیں۔ غوثی صاحب کی غزل کی تقطیع بحر منسرح کے ارکان میں کر سکتے ہیں۔ تین شعر کی تقطیع ملاحظہ فرمائیں۔

ارکان۔	مف	ت	ع	لن	فا	علا	ت	مف	ت	ع	لن	فع
۱۔	اس	ک	ر	فا	قت	پہ نا	ز	آ	ٹھ	پہ	ہر	ہے
	یا	ر	کَ	غم	خد	ب خد	ش	ری	ک	س	فر	ہے
۲۔	حق	ک	ل	ئے	کا	رزا	ر	مکب	ر	ع	مل	ہے
	وہ	ا	ک	لا	سر	بکف	ہ	ی	ن	س	پہ	ہے
	لو	ل	ہ	م	پہ	ی قو	ل	طن	ز	ا	غو	ثی
	فے	ص	ل	ئے	دل	مقد	د	را	ت	و	پہ	ہے

اس غزل کی پیشانی پر شاعر نے لکھا ہے "ایک سعی" یعنی وہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ یہ ان کی اپنی پہلی کوشش ہے۔ اس طرح کے غیر مروّجہ وزن میں غزل کے شعر کہنے کی۔ یہ ان کی اپنی پہلی سعی نہیں اسی بحر اور اسی ارکان میں علامہ سیمابؔ نے آج سے بہت پہلے اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں اسی بحر میں ۱۴ شعر کی ایک غزل کہی ہے۔ جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

آ کہ نہ آ تیرا انتظار نہیں ہے
اب مجھے خود اپنا اعتبار نہیں ہے — سدرۃ المنتہیٰ ص۱۷۴

علامہ کے ایک مصرع کی تقطیع بھی پیش ہے۔

ارکان	مف	ت	ع	لن	فا	علا	ت	مف	ت	ع	لن	فع
	آ	ک	ن	آ	تے	راِن	ت	ظا	ر	ن	ہی	ہے

اسی بحر و ارکان میں غالب کی بھی غزل موجود ہے۔ اور صرف سیمابؔ و غالب ہی کی غزل اس بحر میں نہیں۔ انشا (۱۷۵۶ء ، ۱۸۱۸ء) کی بھی غزل اسی بحر میں ہے۔ ذیل میں سیمابؔ، غالب اور انشاء کی غزل کے تین تین شعر بھی اس تحریر کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ ان تینوں شاعروں کی غزلیں گو زبان زد عام نہیں ہیں۔ پھر بھی ان غزلوں کے اشعار اپنی تخلیقیت کے جوہر کو نمایاں کئے ہوئے ہیں۔ پہلے غوثی کی غزل کے تین شعر اور بعد میں ان تینوں شاعروں کے اشعار نقل کروں گا۔

(۱) اس کی رفاقت پہ ناز آٹھوں پہر ہے — یار کا غم خود بخود شریک سفر ہے
حق کے لئے کار زار فکر و عمل میں — وہ اکیلا سر بکف ہے، سینہ سپر ہے
اہل ہم پر یہ قول طنز ہے غوثی — فیصلۂ دل مقدرات ہی پر ہے (شاعر بمبئی مارچ ۱۹۹۶ء)

(۲) آ کہ نہ آ تیرا انتظار نہیں ہے | اب مجھے خود اپنا اختیار نہیں ہے
ختم کروں یہ رواج جبر محبت | کیا مجھے اتنا بھی اختیار نہیں ہے
فطرت سیماب سے جو نہیں ہیں واقف | کہتے ہیں سیماب بے قرار نہیں ہے (سدرۃ المنتہیٰ ص ۱۴)

(۳) آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے | طاقت بیداد انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے | نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب | تری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے (بحر الفصاحت ص ۲۳)

(۴) کوئی نہیں آس پاس، خوف نہیں کچھ | ہوتے ہو کیوں بے حواس، خوف نہیں کچھ
یہ نہیں فتنے کا عطر، جس سے کہ ڈر ہو | آتی ہے پھولوں کی باس، خوف نہیں کچھ
باندھیو انشا نہ دھیان، آگ دھویں کا | پھولے ہوئی ہیں پلاس، خوف نہیں کچھ (بحر الفصاحت ص ۲۳)

ان چاروں غزلوں کے اشعار پڑھیں۔ ان میں کافی نمایاں تخلیقی فرق نظر آئے گا۔ غوثی صاحب نے ایک مفہوم اور لفظ کو لے کر ارکان کے پیچھے رکھ دیا ہے۔ جو سراسر آورد کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ آمد کا کہیں پتہ نہیں۔ مصرعوں میں شعری آہنگ موجود نہیں۔ عام قاری اسے تحت اللفظ میں بھی درست وزن کے ساتھ نہیں پڑھ سکے گا۔

آٹھویں شعر (نقل شدہ درمیانی شعر) میں الفاظ کی ترتیب میں ایک لفظ اکیلا ہے۔ اس لفظ میں دو حروف علت ہیں۔ ی اور الف۔ ہندی زبان کے اس لفظ اکیلا کا الف تو گرا کر وزن قائم کیا جا سکتا ہے لیکن درمیانی حرف ی کو کسی بھی قاعدے سے دبانا درست نہیں۔ یہ ایک لسانی عیب ہے۔ شاعر نے اس ی کو گرا کر وزن پورا کیا ہے۔

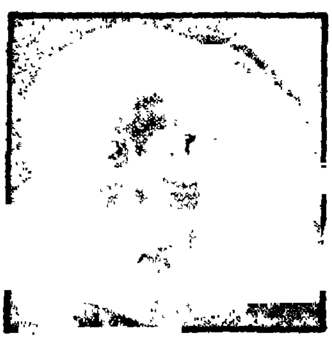
اس کے برعکس علامہ سیمابؔ۔ غالب اور انشا کے شعر پڑھیں۔ اسے قاری پورے شعری آہنگ کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ شعر میں مفہوم کے اعتبار سے ان تینوں شاعروں نے جو لفظوں کے ٹکڑے دئے ہیں ان میں شعری آہنگ بھی ہے اور غنائی کیفیت بھی۔ یہ بحر مروّجہ بحور میں شامل نہیں پھر بھی ان شاعروں کی زود گوئی اور فطری صلاحیتیں ان کی تخلیق میں بھرپور ہیں۔ ان اشعار پر آمد کا ہی گمان ہوتا ہے کہ بڑے رواں دواں شعر کہے ہیں۔

غوثی صاحب بے شک بحر و ارکان کے مطابق شعر کہنے کا وقوف ضرور رکھتے ہیں۔ اسی لئے ایسی غیر مروّجہ بحر میں اشعار کہے جس میں مبتدی کو چھوڑئے دیرمشق شاعر بھی شعر کہنے کی جسارت نہیں کرتا۔

دوسری ایک بات غوثی صاحب کی تخلیق سے متعلق یہ بھی ہے کہ ایک لفظ کا ایک حرف آخر رکن کے ختم ہونے پر دوسرے رکن کے شروع میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن رکن کے حرف آخر میں کسی لفظ کے پہلے حرف کو لانے والا عمل کسی طرح مرغوب و مطبوع نہیں۔ اس طرح کا عمل بھی غوثی صاحب کے شعر میں ہوا ہے۔ اس سے شعر کی غنائیت مجروح ہوئی ہے۔ بہر حال غوثی صاحب کی یہ سعی ان کی اپنی پہلی کوشش نہیں۔ ہمارے بزرگ پہلے ہی اس طرح کی کوشش کر چکے ہیں۔

● Takia Masoom Shah, MominPura, Nagpur (M.S.)

سکندر رضوی



کچھ معاصر شعر و ادب کے بارے میں

جوابات کے لئے مختصر کی شرط رکھ کر آپ نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ کیوں کہ کچھ سوال ایسے ہیں جن کا مختصر جواب ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی حکم کی پابندی تو کرنی ہے اس لئے تشنگی کی شکایت کے آپ حقدار نہ ہوں گے۔

جو مصنف کسی تحریک یا نظریے سے وابستہ ہو کر لکھتا ہے اس پہ تو زوال آتا ہی ہے۔ میرے خیال کے مطابق ادب نظریے یا تحریک کا پابند نہیں ہوتا۔ ادب تو انسان کے اندر سے پھوٹتا ہے۔ میں نے کبھی کسی نظریے کا پابند ہو کر نہیں لکھا کہ تحریکوں پہ زوال آ جاتا ہے، نظریے بکھر جاتے ہیں مگر ادیب نہیں بکھرتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بڑے بڑے لکھنے والے اب خاموش ہو گئے ہیں اور کچھ نہیں لکھ رہے کیوں؟ ظاہر ہے ترقی پسندی کے موضوع پہ اب آگے کہنے کو کیا رہ گیا ہے؟ جب وہ تحریک ہی ختم ہو گئی، تب کہنے کو بھی کچھ نہیں رہا۔ وہ جو کچھ لکھ چکے ہیں اب ان سے کثیر المصنفان کے لئے آزمائش ہے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والی نئی نسل اب کیا کرے؟ یہ بتانے والے ہم کون؟ اگر وہ باشعور، حساس اور روشن خیال ہے تو اپنے راستے خود منتخب کرے، میں نہیں سمجھتی کہ اسے کوئی دشواری ہوگی۔ رہ گئی نئی عصری جدلیت کے امکان کی بات تو ایسا امکان ہے اور بالکل ہے۔ اگر ذہن خلاقانہ ہو اور نظر میں وسعت ہو تو بڑے امکانات ہیں۔ اقبال نے اب سے ستاون برس پہلے کہا تھا۔

ملتِ کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ | تو اگر چاہے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہ ایک بڑے شاعر کی یا ادیب کی پہچان ہے کہ وہ اگلی صدیوں تک پہ نظر رکھتا ہے۔

بڑی گھٹن ہے اور کشمکش بھی بہت ہے۔ فی زمانہ جو ادیب و شاعر ہیں (جن میں سے بیشتر خود ساختہ ہیں بلکہ خود کو اپنے طور پر ہی بین الاقوامی درجے پر بھی فائز کر چکے ہیں) وہ راتوں رات عزت و شہرت کے اس معیار پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک پہنچنے کے لئے کئی دہائیاں صرف ہوتی ہیں۔ راتوں رات شہرت کی تمنا رکھنے والے خود آگہی کا شعور نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی ذات تک محدود ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے افراد کی بہت سی اقسام ہیں۔ ان میں سے کچھ ہیں جو کوئی سیمینار، مشاعرہ یا کانفرنس منعقد کر کے خود کو اخبار کی "خبر" تو بنا لیتے ہیں مگر وہ ادب کی کوئی "خبر" نہیں بن پاتے۔ وقتی واہ واہ کو آب حیات سمجھ کر ایک ہی گھونٹ میں پی جاتے ہیں نہیں جانتے کہ یہ ایسا زہر ہے جو انہیں بہت جلد ختم کر دے گا۔ ایک اور گروپ، جو سسکتی ہوئی جدیدیت کو ابھی تک سینے سے لگائے بیٹھا ہے اور قاری کو سب سے آخری درجے پر رکھ کر صرف اپنے لئے لکھتا ہے۔

آپ ہی بتایئے۔ ایسے ماحول اور فضاء میں گھرا ہوا انسان گھٹن اور کشمکش کا شکار ہے تو تعجب کیوں؟

جو تحریر آج لکھی گئی ہے۔ اس کا صحیح فیصلہ میں اور آپ نہیں آنے والا وقت کرے گا۔ کہ بہترین تخلیق وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں 'امراؤ جان ادا' کا حوالہ ہر ادیب کے لئے لازمی تھا پھر وقت کے ساتھ دوسری کتابیں حوالوں کے لئے آ گئیں۔

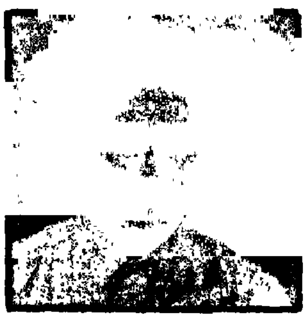
میں نئے اور پرانے کی منطق کو ہی نہیں مانتی۔ نئے پرانے کی بحث بے کار ہے۔ غالب و میر کو آپ پرانا کہہ سکتے ہیں؟ وہ آج پہلے سے بھی زیادہ نئے ہیں اور بہت سے نئے لکھنے والے پرانے ہو چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو تخلیق کار محنت کرے گا اور 'مقدار' کے بجائے 'معیار' کو اولیت دے گا (آج کل کئی کئی کتابوں کا مصنف ہونا کمال سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ بعض اوقات کتاب کی اشاعت سے لکھنے والے کا بھرم بھی ٹوٹ جاتا ہے) اور وقتی واہ واہ اور شہرت کے 'ہوکے' سے بچ کر نکل جائے گا وہی مستقبل کے ادبی دور میں معتبر و مستند قرار پائے گا۔

ایسا ادبی رسالہ جس میں حقیقتاً معیاری ادب شائع ہوتا ہو۔ میرا مطلب ہے وہ پرچہ جو ان اچھا لکھنے والوں کی تحریریں بھی شائع کرتا ہو جو اس کے سالانہ یا تاحیات خریدار نہیں ہیں۔ اور غیر معیاری تحریر کو شائع کرنے سے انکاری ہو جاتا ہو، خواہ اس کا لکھنے والا اس پرچے کا تاحیات خریدار ہی کیوں نہ ہو۔

● 1, Velma Drive, Toronto, ONT M82 2N2

مسعود اعجاز

تخلیق، سائنس، کائنات اور تخلیق



یہ خط شاعر کے حالیہ شمارے کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ "نئی شاعری" اور "نئے استعارے" کے انتخاب میں صفحات کی پیشانی پر چھوٹے چھوٹے جملے ٹانک کر آپ نے نہ صرف شمارے کے صوری حسن کی نئی ترتیب قائم کی ہے بلکہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے معنوی حدود میں توسیع بھی کی ہے۔ میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ یہ انتخاب کئی نئے سوال بنائے گا۔ پرانے سوال رد کرے گا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا چکر ختم ہوا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسندی سے یہاں آپ کی مراد "ترقی پسند تحریک" ہی ہے۔ جس کا باضابطہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا اور ۱۹۵۵ء تک کھینچ تان کر یہ تحریک زندہ رہ سکی۔ اس کے بعد جدیدیت کا دور آیا اور ادبی تحریک کی حیثیت سے یہ بھی دو دہائی سے کم ہی زندہ رہ سکی۔ اس نے وضع علامات کے زعم میں ادب کو ابہام کا مرقع بنانے کی کوشش کی اور ایک سے ایک کتنی کتنی ہی بدعتوں کو جنم دیا۔

لیکن زندگی کا رویہ ہمیشہ ترقی پسند رہا ہے اور ارتقا کا خاصہ تجدید بھی ہے۔ یہ ہمیشہ نئی راہیں اور نئے میدان کار کی جستجو میں رہی ہے۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے تو یہ روسی اشتراکی نظام یا کارل مارکس کے مادّی جدلیت کے فلسفے پر مبنی تھی۔ اس نے تاریخ کی مادّی توجیہہ پیش کی۔ یہ انیسویں صدی کے نصف اوّل کا زمانہ تھا۔ جب حکمتیں بھی عروج پر تھیں اور سائنس میں میکانکی قطعیت پسندی کا دور دورہ تھا۔ اس نے انسانی معاشرے کو بھی لازمی طور پر متاثر کیا جس کے نتیجے میں ادب بھی حسیت پسند ہو گیا۔ لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں مادّے کی تختی بکھرنے لگی یہاں تک کہ مادہ خیال ثابت ہو گیا۔ اور حقیقت سیال لہروں میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح مادی جبریت کا میکانکی تصور خام ثابت ہو گیا یعنی کے حقیقت کی Solid Validity پٹ گئی اور یہ حقیقت کے تصور میں ایک بڑا انقلاب ثابت ہوا۔

مغرب سے جو فکر کی لہریں اٹھتی تھیں، ہندوستان میں پہنچتے پہنچتے پہنچتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ کارل مارکس کا مادی جدلیت کا فلسفہ کوئی تین ربع بعد ہندوستانی دانشوروں کے ذہن میں کسی حد تک سما سکا۔ جبکہ اس سے قبل ہی خود مغرب ہی میں یہ تصور ناقص قرار پا چکا تھا۔ ہندوستان میں اس کے پہنچنے کی ایک سیاسی مصلحت بھی تھی جس کا کسی حد تک فائدہ بھی ہوا لیکن اس کا نقصان زیادہ ہوا۔

ہندوستانی ادب بالخصوص اردو ادب میں جدیدیت نے ترقی پسند تحریک کی کوکھ سے ہی جنم لیا۔ لیکن اس کا محرک حقیقت کا نیا تصور تھا جو Atom کے بدلتے ہوئے Concept کے ساتھ ابھرا تھا۔ اگر یہ نیا تصور بروقت ہندوستانی اذہان میں سما گیا ہوتا تو ترقی پسند تحریک ہندوستان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ بہر حال

ہندوستان کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کی سیاسی تناظر میں بھی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ فکری طور پر تو یہ فلسفہ پہلے ہی ناقص قرار پاچکا تھا۔ آزادی کے بعد ملک جس بحران کا شکار ہوا اس نے کلچرل ہائینڈ کی کاوا کی کا بھرم کھول کر رکھ دیا۔ اور اس کے نتیجے میں ادب شدید طور پر ناسٹالجیائی میلان کا شکار ہو گیا۔ اس کے شدید غلبے نے ادب کو بوالعجبی عطا کی۔ رفتہ رفتہ اس میں اعتدال پیدا ہو تا گیا۔ اس طرح جدیدیت ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے دو دہائی سے کچھ کم ہی زندہ رہ سکی۔

بہر حال! آپ نے مذکورہ شمارے کے ص ۲۸ کی پیشانی پر جو سرخی لگائی تھی اس کا ایک حصہ آپ ہی کے لفظوں میں اس طرح ہے: اب تو ہر تخلیق کا نقطۂ آغاز انتشار سے شروع ہوگا۔ انتشار ہی پر ختم ہوگا۔ "یہاں 'ہر تخلیق کا نقطۂ آغاز' جس قدر معنی خیز وسیع اور بلیغ ہے اسی قدر پیچیدہ بھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر حرف میں معنی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اگر 'تخلیق' بھی اپنے وسیع ترین معنوی تناظر میں دیکھی جائے تو اس میں انسان کی زندگی اور اس کا فن بھی شامل ہو جائے گا۔

زندگی کا ایک رخ تو حدود زمان و مکان کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جس پر ہر لمحہ آیدروزگار کی دستکیں پڑتی رہتی ہیں اور زندگی کا دوسرا رخ ہمیشہ آنکھوں سے اوجھل اور حواس سے پرے رہتا ہے۔ حسی تعبیر کی حیثیت سے ہم جس کا ادراک حاصل کرتے ہیں وہ حیات کے یا حقیقت کے ظہور یا خلق کی سطح ہے۔ اس خارجی اعتبار سے زندگی کیا ہے؟ اس تناظر میں پنڈت برج نرائن چکبست سوال اٹھاتے ہیں اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں اور موت پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　　موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

ظہور یا خلق کی سطح پر زندگی اور موت کا یہ مفروضہ حکیمانہ اور فلسفیانہ تناظر میں بھی تجربی اور تسلیم شدہ ہے۔ لیکن زندگی کا دوسرا پہلو جو حواس سے پرے ہے اور اس کا ادراک بربنائے وجدان ہی ممکن ہے اور جسے ہم حیات مسلسل سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس میں نہ تو انتشار ہے نہ ابہام۔ وہ مسلسل اور رواں دواں ہے، اس کی حرکت دائمی ہے۔

تمام عمر چلوں اور رہگذر میں رہوں　　　سفر طویل ہے کب تک میں اس سفر میں رہوں

حیات کا سفر بے نہایت ہے اور حیات کے اس بے نہایت سفر میں حرکت دائمی ہے، مقاصد عبوری ہیں چنانچہ ہمارے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے۔ اس طرح کی تبدیلی آپ کے تنقیدی مکالمات میں بھی نظر آتی ہے بہر حال! میں آپ کی توجہ انتشار و ترتیب کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ظہور یا خلق کی سطح پر کسی بھی تخلیق کا نقطۂ آغاز انتشار کی بجائے ترتیب و تنظیم سے یا اتحاد سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ پنڈت برج نرائن چکبست کے شعر سے واضح ہوتا ہے۔ سائنسی علوم کے تناظر میں یہ حقیقت تسلیم کی جاچکی ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مالی کیولس جب مخصوص مقدار میں ملتے ہیں تو پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جب یہ اختصاص ختم ہو جاتا ہے یعنی اس مقدار میں کمی بیشی ہوتی ہے تو دوسری چیزیں بن جاتی ہیں۔

سائنس کے مطابق سورج سیال تھا، کوئی سیارہ جو اس سے ایک مخصوص فاصلے پر متعین تھا، حادثاتی یا اتفاقی طور پر سورج کے قریب آگیا جس کی وجہ سے Atraction Pull High ہو گیا، توازن اور تناسب کے نظام میں خلل پیدا ہوا جس کے نتیجے میں سورج کی سیالیت بہت آلودگیوں کا شکار ہوئی اور اس کی سیالیت ختم ہونے لگی اور اس میں سختی پیدا ہونے لگی۔ یہ سختی اس قدر بڑھی کہ اس میں حجریت آگئی اور ایک دن سورج پھٹ پڑا۔ اس کے ذرات بکھر گئے۔ انہیں بکھرے ہوئے ذرات میں ایک ذرہ یہ کرۂ ارض ہے جس پر حیات کا امکان، بہت زمانہ بعد رونما ہوا۔ شروع میں یہ دھرتی کافی گرم تھی، جیسے جیسے اس میں اعتدال آتا گیا اور یہ ٹھنڈی ہوتی گئی ویسے ویسے زرخیز ہوتی گئی اور اس میں حیات کی فصلیں اگنے لگیں۔ بقیہ دوسرے کرّے (Planets) آج تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ ان پر نمودِ حیات کا معجزہ ظہور پذیر ہو سکے۔

حیات کب تک اندھی جبلت کا شکار رہی، یہ کہنا مشکل ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں شعور کا نقطہ کب روشن ہوا۔ لیکن جب شعور کا نقطہ روشن ہوا تو انفرادیت کا احساس بھی پیدا ہوا۔ یہ بھی احساس ہوا کہ اپنا چہرہ ہے اور تب آئینے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ حالانکہ تسکین و آسودگی کے حصار میں شگاف بھی پڑتے رہے۔ غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے　　　آئنہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

ظاہر ہے کہ یہاں بھی انتشار ہی کی کیفیت ہے۔ اگر شاعری بالخصوص زندگی کے ادراک کا وسیلہ ہے اور یہ زندگی کی ہی ترجمان ہے تو زندگی کے بنیادی رویے سے دور نہیں جاسکتی۔ آپ کا یہ جملہ کہ "اب تو ہر تخلیق کا نقطۂ آغاز انتشار سے شروع ہوگا، انتشار ہی پر ختم ہوگا۔" تکوین کے فلسفیانہ زاویے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی لئے طبیعت اس قدر تفصیل کی طرف مائل ہوگئی۔ اگرچہ یہ نہایت ہی دقیق علمی مسئلہ ہے، ادب کی تنقید میں اس بحث کو لانا میرے خیال میں بہت ہی ضروری ہے۔ ادب کے تخلیقی رجحانات میں اس کے بہت سارے جواز موجود ہیں۔

تخلیق فن، جگر کاوی اور خونِ جگر کے صرف کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ عام اور روایتی خیال ہے۔ اس کو فکری منہاج دینے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا ایک شعر ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر　　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

خونِ جگر تابکار ہوتا ہے تب تخلیق ہوتی ہے۔ غالب اور جگر کا ایک ایک شعر بالترتیب ملاحظہ فرمائیں۔

بیٹیم از گداز دل در جگری آتش چوں سہل　　　غالب اگر دمِ سخن رہ بہ خبر منبری

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے　　　اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

[باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے]

بہ خطِ شاعر



نشتر خانقاہی

(دورانِ علالت)

کی دھوپ، سے تنفس کی تشنگی عجیب
الیہ نہ تھی، خستہ حالی عجیب

ی چھوٹی سی لغزش سے اتنی خفا
ری ! تیری نازک مزاجی عجیب

ہمت یا لگے نہ دوا، مسرور سے
یر خواہوں کی تیمارداری عجیب

پ اپنا عیادت کی مجبوریاں
سب اور عالم کی پرسش عجیب

بہ سب بے خواب کہ خواب آور دوا
ریاں کی نا مہربانی عجیب

کھ جیسے ہیتا ہوں، چھتی سینی
پہ کرو دنیا نے وہ رسیاہی عجیب

ا ہے ہیں تو تم تے آرہی ہیا
ب ہی شغل ہے، خانقاہی عجیب

محلہ جاٹان، بجنور (یوپی)



عقیل شاداب

آگے پیچھے پانی کھڑا بیچ میں میں تھا
آئینہ ہر طرف جڑا تھا بیچ میں میں تھا

گھرا ہوا تھا میں سایوں کے جنگل میں
ہر اک سایا مجھ سے بڑا تھا بیچ میں میں تھا

اندر باہر سناٹے ہی سناٹے تھے
آوازوں کا کال پڑا تھا بیچ میں میں تھا

کوکھ سے باہر چھوڑ گئی تھی کنتی دنیا
کوروں پانڈوؤں میں جھگڑا بیچ میں میں تھا

چڑھا ہوا دریا تھا ہم دونوں کے بیچ میں
بھرا ہوا پاپوں کا گھڑا تھا بیچ میں میں تھا

سب کردار کہانی کے تھے دست و گریباں
دشت بلا میں وقت کھڑا تھا بیچ میں میں تھا

ملک نہیں آپس میں دل تقسیم ہوئے تھے
دونوں طرف ایک اک ٹکڑا تھا بیچ میں میں تھا

شعر و سخن کی ایک بزم شاداب سجی تھی
ہر اک شاعر مجھ سے بڑا تھا بیچ میں میں تھا

● برج راج پورہ، کوٹا۔ ۳۲۴۰۰۲



مختار شمیم

یوں تو آئینۂ احساس جمال اچھا ہے
جتنا سوچوں ہوں اسے کم کا خیال اچھا ہے

خوب رویوں کو تو ضد ہے کہ گلال اچھا ہے
زندگی رُخ پہ ترے رنگ ملال اچھا ہے

طائرِ فکر کہاں، وسعتِ امکاں کہاں
اس کو تو ایک ترا دامِ خیال اچھا ہے

زندگی خوش ہو کہ ناکامِ تمنا آسے
شیشۂ دل میں جو پڑ جائے تو بال اچھا ہے

کون آئینۂ ادراک میں تھا میری طرح!
کون کہتا ہے یہ مجھ سے کہ سوال اچھا ہے

گھر سے اک اور نیا چہرا لگا کر نکلو
کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ حال اچھا ہے

● ایف ۲۔ گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجوئٹ کالج کیمپس، اندور۔ ۴۵۲۰۰۲

سلیمان اطہر جاوید

9-4-134/11, Aruna Colony, Toli Chowki, Hyderabad-500008



ناشاعری

اقبال کا شعر ہے ؎

حدیث بے خبراں ہے تو بہ زمانہ بساز　　زمانہ تو بہ نہ سازد تو بہ زمانہ ستیز

فنکار کو یہی کردار ادا کرنا چاہیئے۔ زندگی اور زمانہ ہر دور میں انتشار و اختلال، بحران اور اقدار کے زوال سے دوچار رہتے ہیں، ادب میں بھی اور تہذیب میں بھی لیکن فنکار، شاعر اور ادیب کا فرض ہے کہ وہ ایسے میں خراب کے مقابلے میں خوب، ظلمت کے مقابلہ میں نور، منفی کے مقابلہ میں مثبت، برائی کے مقابلہ میں اچھائی اور بدی کے مقابلہ میں نیکی کا ساتھ دے اور نیکی اور اثباتی قوتوں کے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے میں معاون ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور بدی اور منفی قوتوں کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ نہ ادب کے تئیں اور نہ زندگی کے تعلق سے اپنا حق ادا کر سکتا ہے۔ شعر و ادب کو زندگی کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ زندگی کی نشو و نما اور اس کے فروغ کے لئے۔ لیکن سانحہ یہ ہے کہ ہر دور میں ایسے ادیب اور شاعر بھی رہے ہیں جنھوں نے انتشار و اختلال اور اقدار کے زوال کی حمایت کی بلکہ اُن کے لئے راہیں ہموار کیں۔ ان کا نتیجہ خواہ کچھ نکلا ہو، ایسی طاقتیں رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

نئی اصناف کو اختیار کرنا، خواہ وہ کسی زبان کی ہوں، انسب بات ہے نئے روّیوں اور میلانات وغیرہ کو اختیار کرنا بھی چاہیئے۔ شعر و ادب کی توسیع و ترقی اور اس کے سرمائے کو وافر کرنے کے لئے ایسی کوششوں کی ہمت افزائی ہونی چاہیئے لیکن اگر یہ کوششیں منفی نوعیت کی ہیں، ہمارے ادبی اور تہذیبی سرمائے سے ہم آہنگ نہیں، باعث زیاں ہو رہی ہیں اور غلط فہمیوں کا باعث بھی تو ان کی ہمت شکنی ضروری ہو جاتی ہے کہ یہ ہمارے شعر و ادب کو زنگ آلود اور کھوکھلا کرنا چاہتی ہیں۔ ایسا، اصناف میں بھی ہوتا ہے۔ موضوعات میں بھی اور اسالیب کے تعلق سے بھی۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں بھی ایسی باتیں مل جائیں گی۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی ایسا ہوا اور جدیدیت میں بھی ایسے گل کھلائے گئے۔

میں ان کرتب بازیوں کو زندگی اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا عکس قرار دیتا ہوں۔ معاشرتی انتشار، اخلاقی بحران، معاشی ابتری، کساد بازاری، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، مفاد پرستی، رشوت ستانی، ذات پات کے اختلافات، لسانی تنازعات، فرقہ پرستی، علاقائی جھگڑے، مذہب کا منفی مقاصد کے لئے استعمال، خود غرض قیادت، سیاسی قائدین کی بوالعجبیاں۔ غرض ہر سمت، ہر جہت، ہر طرف بکھراؤ، بکھراؤ اور بکھراؤ کے سوائے کچھ اور نہیں۔ شعر و ادب میں بھی ان کا ردِ عمل ہونا چاہیئے لیکن تعمیری انداز میں۔ ایسا ہوا بھی اور نہیں بھی۔ اور ایسا جو نہیں ہوا اس کا اظہار جن اصناف شعر و ادب میں ہوا ہے ان میں نثر میں بڑی حد تک پلاٹ لس اور اینٹی افسانے میں تو شاعر شاعری میں 'ناشاعری' میں!

ایسا نہیں ہے کہ صرف اردو ہی میں 'ناشاعری' ہو رہی ہے کیونکہ صرف ہمارا ملک ہی اقداری بحران سے دوچار نہیں بلکہ عالمی منظر نامہ ہی ایسا ہے۔ روس ہو کہ فلسطین، امریکہ ہو کہ افغانستان، یوگوسلاویہ ہو کہ برما یا انڈونیشیا۔ ہر ملک کے اپنے مسائل ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کسی ملک کو متاثر کر رہی ہے تو کسی ملک کی سیاست بین الاقوامی منظر نامہ پر اثر انداز ہے۔ مالیاتی اور معاشی بحران سے ہر ملک اپنے حسب حیثیت متاثر ہے۔ یہ اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا ہو لیکن ہر ملک مقدر جان کر اس کو قبول کر رہا ہے۔

'ناشاعری' ('ناشاعری' میں 'ناغزل' کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے "باغیانہ غزل" پروفیسر گیان چند جین نے "لایعنی غزل" اور خلیل الرحمن اعظمی نے "منفی غزل" سے موسوم کیا ہے۔) دیگر زبانوں میں بھی ملتی ہے۔ ہندی میں "اکویتا" کے نام سے تو پولش زبان میں **Anti Poetic** کے نام سے اور انگریزی میں اس کو **Anti Poetry** بھی کہا گیا اور ایسی نظموں کو **Un Poems** بھی۔ پولش زبان میں اس کو کچھ زیادہ ہی بڑھاوا ملا کہ پولش کے ایک ممتاز شاعر تادیوز روزیویک (پیدائش: ۱۹۲۱ء) کو پولینڈ میں **Anti Poetry Group** کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

اردو میں 'ناشاعری' کے تعلق سے شاید ناسخ کا یہ شعر پیش کیا جائے ؎

ٹوٹی دریا کی کلائی، موج الجھی بام میں　　مورچہ مخمل میں دیکھا، آدمی بادام میں

نیز انشاء، مصحفی اور رند وغیرہ کے ہاں بھی چند ایک اشعار ایسے مل سکتے ہیں تاہم انھیں استثنائی صورتوں ہی میں شمار کیا جائے گا۔

جہاں تک عصر حاضر کا تعلق ہے پروفیسر گیان چند جین نے اس کو جدیدیوں کے ذہن کی ریزش قرار دیا ہے۔ عبادت بریلوی کے خیال میں یہ تہذیب اور کلچر سے دوری کی علامت ہے اور بعض کے بقول 'ناشاعری' مستقبلیت (Fiturism) کا اثر بھی ہے جو فاشزم اور نراجیت کو ہوا دیتی ہے۔ بہرکیف کچھ ہو، ناشاعری کے ابتدائی نقوش ادھر ہمیں ظفر اقبال، عادل منصوری اور باقر مہدی وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں جبکہ جمیل جالبی اپنی کتاب 'نئی تنقید' میں اس کے آغاز کا سہرا سلیم احمد کے سر باندھتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "۱۹۶۲ء میں انہوں (سلیم احمد) نے باغیانہ غزل (اینٹی غزل) کی بنیاد رکھی جس کا اثر بہت سے شاعروں نے قبول کیا۔ آگے چل کر ڈاکٹر جمیل جالبی نے سلیم احمد کی ایسی غزلوں کے بارے میں تحریر کیا ہے ۔

"ان غزلوں میں غم و غصہ، طنز و مزاح، روتے روتے ہنس پڑنا یا ہنستے ہنستے رو پڑنے کی کیفیت ملتی ہے۔ یہ غزل ذہن کو بری طرح جھنجھوڑتی ہے اور شدید ردِ عمل پیدا کرتی ہے۔ زر پرست معاشرے کی منافقت، ریاکاری، بے حسی، جھوٹی رقت پسندی وغیرہ کی رسمی تصویریں ان غزلوں میں عام ہیں۔" (جمیل جالبی۔ نئی تنقید۔ ص ۳۶۱)

بات اگر یہی یا ایسی ہوتی تو مناسب تھی۔ اس نوع کے جو بھی اشعار ہیں انھیں یقیناً باغیانہ (یا احتجاجی) غزل کے اشعار کہا جا سکتا ہے لیکن سلیم احمد کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد نسبتاً کم ہے اور ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جیسے ۔

آ کے اب جنگل میں یہ عقدہ کھلا　　　　بھیڑیئے پڑھتے نہیں ہیں فلسفہ
جنھیں کل عشق بننا تھا وہ جذبے　　　　نظر کی رشوتوں پر پل رہے ہیں
زچگی فکر کے گھر میں ہو تو دایہ نہ ملے　　　　فصد جذبات کے کھلوائیں تو نشتر کھٹل
بال ادراک کے بڑھ جائیں تو حجام کا کال　　　　کپڑے احساس کے پھٹ جائیں تو سوزن میں خلل

ظاہر ہے یہ غزلیں نہ تو ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور نہ کوئی شدید ردِ عمل پیدا کرتی ہیں بلکہ یہ تو بقول کسے ادبی منافقت، ادبی ریاکاری اور ادبی بے حسی کے سوائے کچھ اور نہیں۔ بشیر بدر نے 'اینٹی غزل' کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے:

"میرے خیال میں جدید بے تکلف غزل یا اینٹی غزل کی ابتداء لاہور اور کراچی کے وہ نوجوان شعراء کرتے ہیں جن کو اپنی انفرادی آواز تلاش کرنے کی دھن ہے۔ عباس اطہر جو نظم کے اچھے شاعر ثابت ہوئے ان کی غزل جس کی ردیف "لڑکیاں" تھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔" (آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ۔ ص ۱۶۲)

مخفی مباد کہ خود بشیر بدر کے ہاں اس قبیل کے اشعار مل جاتے ہیں مثلاً ۔

شیشے کی سلائی میں کالے بھوت کا چڑھنا　　　　بام کاٹھ کا گھوڑا نیم کانچ کی گولی

بعض نے ناشاعری کا رشتہ یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی سے ملایا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یگانہ کے ہاں احتجاجی کیفیت ہے، باغیانہ لہجہ ہے اور شاد عارفی نے بے تکلفی سے کام لیا ہے لیکن ناشاعری کی شروعات یا اس کی پرچھائیں بھی ان کے پاس نہیں۔ یہ تو دراصل یگانہ اور شاد عارفی کے کہیں بعد کی بات ہے ۔ یہ ان شاعروں کی اختراع ہے جنھوں نے اپنی انفرادیت کی سعی کی اور چونکا دینے والے راستوں کا انتخاب کیا۔ اس خصوص میں ماہنامہ "کتاب" لکھنو کے شمارہ مئی ۱۹۶۷ء صفحہ ۷۱، ۷۲ پر تلخ، تند، شیریں کے تحت صلاح الدین پرویز کا یہ خط قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب ظفر اقبال کے کلام پر ناصر کاظمی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ فتح محمد ملک وغیرہ نے ظفر اقبال اور احمد مشتاق کو ناصر کاظمی ہی کا خوشہ چیں لکھا تھا۔ خود ظفر اقبال کو اس کا احساس ہوا کہ انھیں ناصر کے اثر سے آزاد ہونا ہے تو اول انہوں نے میر پسندی اور ناصر کی ادا ہی کے خلاف خطوط اور مضامین لکھے اور اپنے گمشدہ ماضی کی بازیافت کے لئے قدیم شعراء سے رشتہ جوڑا۔ نصرت ہی میں ان کی ایک اینٹی غزل شائع ہوئی جو اختر احسن کی زین (Zen) غزلوں کا جواب تھا جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا "اختر احسن کی عین غین غزلیں" ۔ اور اس میں یہ شعر بھی تھا ۔ چھاپیں گے کہاں رسالے والے : لے آئے گا پوسٹ مین غزلیں۔"

اس سے قطع نظر کہ اینٹی غزل گوئی کے آغاز کا سہرا کس کے سر ہے، اس پس منظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کے آس پاس اس نوعیت کی "شاعری" کی ابتداء ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ 'ناشاعری' کیوں؟ اگر اس کا جواز یہ ہے کہ 'یہ ہمارے معاصر معاشرے کی عکاسی ہے جس میں عقیدے پاش پاش ہو رہے ہیں، روایت شکنی عام ہے، تہذیب و تمدن سے بے راہ روی کا زور ہے، معیشت تتر بتر ہے اور اخلاقی بحران ہے۔ یہ بات شاید تسلیم بھی کر لی جاتی بشرطیکہ ناشاعری اس صورت حال کا ردِ عمل ہوتی لیکن ایسا نہیں بلکہ یہ تو ایک ارادی اور خود سرانہ عمل ہے جیسا کہ Great American Poets میں مشمولہ W.H. Nusbaum اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:

یہ ناشاعری کادور ہے / بے قافیہ مصرعے / بے وزن اشعار / بے ربط اظہار

ہمارے ہاں صورت حال اس سے زیادہ خراب ہے۔ ظفر اقبال نے جن کو ان کی "ناشاعری" کی وجہ سے "ناشاعر" ہی کہنا چاہئے۔ "گلافتاب" کے "حرف آغاز" میں لکھا ہے:

"پنکچوایشن یکسر آزادی ہے کہ معنی کو محدود اور پابند کرتی ہے۔ اضافت سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ گرائمری گھٹن بھی اب ویسی نہیں رہی۔ میں اب سانس لے سکتا ہوں۔"

یہی نہیں انہوں نے اردو شاعری کی اقدار، صحت مند روایات اور زبان و بیان، قواعد، لہجہ و اسلوب اور فن سے ایک طرح کھلواڑ کی ہے۔ حروف ربط کو محذوف کر دیا ہے، معقد کو غیر معقد اور غیر معقد کو معقد کر دیا ہے، حروف اضافت سے نجات حاصل کی ہے اور حروف صفت کا عدم استعمال کیا ہے۔

ضرورت شعری کے تحت ہمارے شاعروں نے کہیں کہیں ایسا فائدہ اٹھالیا ہے لیکن شاذونادر اور بصورت مجبوری ہی۔ جب کہ کوئی شاعر بالارادہ اور کمر کس کر اس طرف توجہ دیتا ہے تو یہ عمل صرف تخریبی عمل ہوگا۔ ظفر اقبال کی غزلوں سے یہ چند اشعار ۔

تن توڑ، نقب ناز، خبر خام، طفل ترش — جسم جوڑ، کفر قفل، قلم رنگ، ظفر واں
فصیح فراست، عزائم بلیغ، عنقا میں — کدام خاک، اڈائیم دشت دریا میں
لہو، للکار، لک، لشکر، لرزاں — دمک ہوٹن، گہر، گفتار نے کا
شکر ہے لاہوری — اس لئے یہ شکو
چڑ گئی لکڑی کگڑ — ککڑی تھی یا ککڑ
جنگل میں جاگنے گی خشبوئی خواب کی — کیا آتشیں گلاب کھلا آسمان پر

جہاں تک قافیوں کا تعلق ہے ہمارے اساتذہ نے بھی قوافی کو صوتی حیثیت سے استعمال کیا لیکن بعض اوقات ہی اور اس وضاحت کے ساتھ کہ ضرورت شعری کے تحت ایسا کیا جا رہا ہے تاہم یہ رویہ سند کا درجہ آج تک حاصل نہ کر سکا۔ ظفر اقبال نے کمال کر دیا وہ پشواز، الفاظ اور ناراض کو بطور قافیہ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اشعار ۔

خنجر کی چمک تھی اس بدن میں — دراصل نیام تھی وہ پشواز
اک عمر سے منتظر کھڑا ہوں — منہ سے کچھ پھوٹتے نہیں الفاظ
ہو جائے ظفر یہ قافیہ بھی — ہولیں کچھ اور بھی ناراض

مقطع سے ظاہر ہے کہ ظفر اقبال کی یہ سعی ارادی ہے اور وہ اس کا احساس رکھتے ہیں کہ اس کا رد عمل اچھا نہیں ہوگا۔ ظفر اقبال کے بعض اور قافیے بھی "دلچسپ ہیں ۔

اب چاہئے بیٹھ کر شرافت — ترمال تو لے اُڑے لفنٹے
جب شیر نے دم دیئے سر شام — جنگل سے نکل گئے ہرنٹے

اور یہ دو شعر بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

رنگت ہی بدل گئی بدن کی — جب سانپ نے پہلی بار ڈسا
پانی اتنا ملا کہ اُس نے — لسی کو بنا دیا ہے لسا

ظفر اقبال کو اپنی اس کرتب بازی کا اندازہ ہے اور اس کا بھی کہ ان کے مجموعہ کلام "آب رواں" کی شاعری اپنا وقار رکھتی ہے۔ چنانچہ "آب رواں" کے پس منظر میں اپنی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کہتے ہیں ۔

ویسے تو کہہ ہی لیتا ہے اچھی غزل ظفر — ہوتے ہیں بعض شعر مگر بور بہت

اسے اگر وہ لسانی تشکیل جدید کہتے ہیں، اجتہاد اور انفرادیت کی سعی کہتے ہیں تو یہ حقیقت سے انحراف ہے، خود فریبی ہے، بدمذاقی ہے۔ متروک، مبتذل، کرخت، کریہہ الصوت، ثقیل، بھاری بھرکم، بے ہنگم، نامانوس اور اجنبی الفاظ کا استعمال، عجیب و غریب قافیے، ہیجان انگیز محاورے اور استعارے، لفظوں کا داؤ پیچ، ژولیدہ اسلوب اور منطقی ربط سے انحراف، لسانی تشکیل جدید نہیں، لسانی توڑ پھوڑ، کج روی اور ادبی جمناسٹک ہے۔ یہ اجتہاد نہیں، تخلیقی کم مائیگی، غیر ذمہ دارانہ شعری رویہ اور بشیر بدر کے الفاظ میں تخلیقی عمل کی تھکاوٹ اور بوریت کا لمحاتی رد عمل ہے۔ اسی طرح یہ انفرادیت کی بھی سعی نہیں، یہ پریشاں نظری اور فکری انتشار ہے جس کو آپ نہایت بچکانہ اور ناتجربہ کارانہ انداز میں بے ڈھنگے مصرعوں کا روپ دے رہے ہیں۔ ناشاعری کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا

ہے کہ زندگی، زبان، اسلوب اور فن کیا ہے؟ شاعر ان سے واقف ہی نہیں۔ اس کے فہم و ادراک کی کیفیات اس کے مشاہدات اور تجربات کو گرفت میں لانے سے عاجز ہیں گویا اس نے ہر زاویے سے شکست مان لی ہے۔ یہ شاعری نہیں شاعری پر تہمت ہے، الزام ہے۔ یہ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ۔

پھول، تشدد، خوف میں غرق حرارت ڈوب ابھرتی چٹان
کینچلی اترے تو بات بنے۔ یہ کہہ دوں؟ کہ کر گزروں
اعصاب تشنج پھیلتی بے رخ باتوں کی تردید، قیامت کر بھی چکو (افتخار جالب: "چو متاپانی بیانی بیانی")
کیونکہ نیلے رنگ کی نیند آرام اور وہم کے درمیان شاید ایک ناک ہوتی ہے میں نے کبھی ناک نہیں پیا (احمد ہمیش: تجدید ۲)

سیہ پیڑوں پر خون میں بھیگی ہوئی تصویریں ابھرتی ہیں
درختوں سے لٹکتی ہیں، اُبلتی ہوئی وحشت سے بھری آنکھیں (عباس اطہر: اس کے لئے موت ہے)

انان تغریب برمجیدن تلاج اجہر بلل اجنہ تشری حہیکاہ
تنگ آسلی لیاہی نقال ابریق ایر ناقد (عادل منصوری)

لام خالی ہے اسے مت چھیڑو نون کے پیٹ میں تو نقطہ ہے (پرکاش فکری)
مکھی کی دم کی سوچ میں، میں جھومتا رہا مکھی اگرچہ ہاتھ ہلاتی رہی تو کیا (حبیب منذر)

یہ تو چند مثالیں تھیں ورنہ اس ناشاعری کا انتخاب بھی کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ 'ناشاعری' کا مقصد کیا ہے؟ کس چیز کا اظہار ہیں یہ آڑھی ترچھی سطریں، بے معنی مصرعے۔ کوئی شاید انھیں ترسیل کی ناکامی کا المیہ کہے۔ لیکن ترسیل ہے ہی کیا؟ کس چیز کی؟ یہاں تو لفظ "ترسیل" کا استعمال ہی زاید اور بے جا معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو صرف ناکامی ہے۔ ناکامی کا المیہ! اس ناکامی کا، اس المیہ کا اعتراف، ان اور ایسے کئی شاعروں کو ہے۔ ظفر اقبال کا شعر (ویسے تو کہہ لیتا۔ الخ) تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ دیگر کئی شاعروں نے بھی اس بے معنویت، لایعنیت، لغویت اور مجہولیت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ اشعار، یہ شاعر ۔

مفہوم اگرچہ کچھ نہ ہوگا بنڈی کو لکھیں گے ہم بھی بنڈے (ماجد الباقری)
ٹیڈی تہذیب ٹیڈی فکر و نظر ٹیڈی غزلیں سنا رہے ہیں ہم (بشیر بدر)
علوی غزل تو کہنے چلے ہو نئی مگر رکھ دو نہ تم خیال کے بخیے ادھیڑ کے (محمد علوی)
توڑ کر نکلا ہوں ساری بندشیں لوگ بولے فن نہیں کرتب ہوا (کمار پاشی)
غزل کی روایت ہوئی ریزہ ریزہ اڑے رنگ لالہ رخاں کیسے کیسے (باقر مہدی)

بندشوں کو توڑیئے اور ضروری نہیں کہ غزل کی روایت کا ایسا احترام بھی کریں لیکن زندگی، معاشرت زبان و بیان اور فن کی قدروں کو یکسر مسترد بلکہ پامال کرتے ہوئے آپ اچھے ادب (بلکہ صرف ادب) کی تخلیق کیسے کر سکتے ہیں۔ روایت سے بغاوت ہونی چاہئے۔ لیکن اس وقت جب کہ ہم زندگی اور ادب کو کچھ دے سکتے ہوں۔ تغزل، غزل کا وصفِ خاص ہے، جزو لاینفک ہے۔ چلئے، روایتی تغزل سے بھی آپ انحراف کر لیں، لیکن غزل میں کچھ تو ہو اور نظم بھی کسی زاویے سے معنویت کی حامل رہے۔ اس کے برعکس اگر ہمارے اشعار بری شاعری کی اچھی مثالیں ہوئے جا رہے ہیں تو عصر حاضر کا اس سے فزوں شعری و ادبی سانحہ نہیں ہو سکتا۔

"ناشاعری" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہمارا معاشرہ مروجہ لفظیات، تراکیب، استعارات، تشبیہات اشارات اور اسالیب سے بیزار ہو چکا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس میں قباحت کیا ہے؟ کچھ اور تراکیب، استعارات، تشبیہات، اشارات اور اسالیب سے کام لیجئے۔ ہر دور کے بڑے اور اچھے شاعروں نے ایسا کیا ہے۔ یوں زبان و بیان کو بگاڑنے اور اپنا مذاق آپ اڑانے کی ضرورت کیا ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جاتا ہے کہ 'ناشاعری' میں موجودہ دور کی لغویت کو موضوع بنایا گیا ہے اور زبان و بیان میں کتاب کی بجائے روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تو عرض کرنا یہ ہے کہ "موجودہ دور کی لغویت" کو موضوع بنانے کے لئے لہجہ و اسلوب کی اس لغویت کی کیا ضرورت ہے۔ اردو غزل اور شاعری کا اپنا ایک مزاج ہے اس مزاج کو ملحوظ رکھئے، اس مزاج میں صحت مند تبدیلی کیجئے، نئی راہیں وا کیجئے، نئے افق کی سمت پرواز کیجئے۔ خارجی اور غیر رمزیاتی انداز اپنائے لیکن ایسا نہیں کہ بدمزگی اور برہنہ گفتاری کی نوبت آئے۔ غزل کہئے، غزل کے کارٹون مت اتاریئے۔ معاشرے کے زبان و بیان اور اسالیب کے خلاف اپنی برہمی و برگشتگی کا اظہار خوشگوار انداز میں کیجئے ورنہ شاعری یا غزل کا تو کیا بگڑے گا ان شاعروں کے فن پر بن آئے گی اور یوں ان کا نام ادبی تاریخ میں "محفوظ" رہے گا۔ ◇◇



حکیم منظور

یہ غلط ہے باتیں وہ کیں میں نے وہ سمجھا نہیں
ورنہ وہ کیوں چپ رہا، اک لفظ بھی بولا نہیں

اپنے اپنے طور پر دونوں کی تھی اک اپنی بات
اس نے کچھ پوچھا نہیں، میں نے بھی کچھ مانگا نہیں

اس نے افسانے سنائے اور پھر رو کر کہا
اس سرائے شب میں کوئی شخص سچ سنتا نہیں

کیا کھلے دل لوگ تھے، در بھی کھلے رکھتے تھے وہ
ب صدائیں بھی دے کوئی، در کوئی کھلتا نہیں

اغ میں پھولوں کی ہے اپنی ہی چھب اپنی ادا
ں سے کیا کہیے یہ جو آنکھ ہی رکھتا نہیں

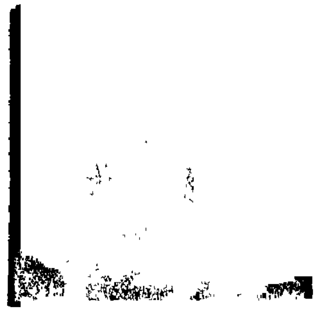
ں دیارِ رنگ میں اب تک یہی دیکھا گیا
ات بھی سوئی نہیں اور دن کبھی جاگا نہیں

امنے سنتا نہیں، کیا صورت احوال ہے
ں کو لکھ کر بھیجتے لیکن وہ خط پڑھتا نہیں

ں کو شبنم کی طمانیت کا ہوا احساس کیا
ں نے دریا کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہیں

ـ حساب دل کہ ہے مخصوص چند احباب سے
وا، منظور اس کے دل میں کچھ رکھا نہیں

● 10, Pratap Park, Press Enclave
Srinagar - 190001



مہتاب حیدر نقوی

سبب کچھ بھی نہیں پر اب کے ہنگامے زیادہ ہیں
اسی باعث تو ان شہروں میں ویرانے زیادہ ہیں

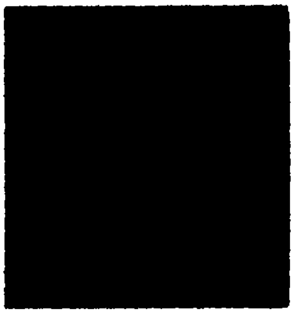
اداسی کی مہک پھیلی ہوئی ہے ساری دنیا میں
کہ یوں ہے درد کم اور درد کے سائے زیادہ ہیں

کسی نے میرے گھر کا اس طرح نقشہ بنایا ہے
کہ دیواریں بہت کم اور دروازے زیادہ ہیں

کھلی آنکھوں سے دنیا کو کبھی دیکھا نہیں ہم نے
اسی باعث جو بھگتے ہیں وہ خمیازے زیادہ ہیں

فراق و وصل کی سب صورتیں ہیں ایک سی لیکن
ہمارے دل کو منظر ہجر کے بھاتے زیادہ ہیں

● 4/219, Hasan Villa, Sahab Bagh,
Anoop Shahar Rd. A.M.U. Aligarh (U.P.)



حامد اقبال صدیقی

جذب کی سب انتہاؤں کا تماشہ ہر طرف
تم کہاں تھے تم نہیں تھے، میں ہی میں تھا ہر طرف

یہ مرے دل میں سمٹ آئے گی اک دن دیکھنا
تم نے کس عالم میں پھیلائی تھی دنیا ہر طرف

دشت میں بھی آملے تھے کائناتی سلسلے
وحشتوں نے کر دیا تھا میرا چرچا ہر طرف

تم نے میرے در پہ لا چھوڑا اسے، اچھا کیا
ورنہ یوں ہی بے سبب یہ غم بھٹکتا ہر طرف

میرے حق میں تو ہر اک موسم خزاں آثار تھا
کس کی مناعی نے گل منظر سجایا ہر طرف

● 202 - 228, Dinath Bldg.
3rd Fl. No. 12, P.B. Marg.
Mumbai - 400004

م۔ ناگ
Daily Urdu Times, 243-Maulana Azad Rd, Mumbai - 400008

نصاب



پہلا سبق : پانڈو گھر دیکھ

پانڈو گھر دیکھ۔ عالیشان فلیٹ دیکھ، اُجاڑ کر بنائے گئے گھر دیکھ۔ جس مزدور نے ان عمارتوں کو بنایا اس کا ان پر کوئی حق نہیں۔ فلیٹ دیکھ فلیٹ دیکھ، گھر دیکھ گھر دیکھ۔ تصور میں دیکھ، تصویر میں دیکھ۔ نیویارک سے بھی مہنگے فلیٹ دیکھ۔ فسادات کے بعد مہنگے فلیٹ دیکھ۔ ہندوؤں کی بستیاں دیکھ، مسلمانوں کی کالونیاں دیکھ۔ تو کتنی بھی کوشش کرلے تب بھی ایسے فلیٹ نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ تیرے پاس دو نمبر کا دھندا نہیں اور نہ بلیک منی ہے۔ اس لئے پانڈو صرف فلیٹ دیکھ کر سادھان کرلے!

"بچو! پہلے سبق میں ہم نے پانڈو کو صرف گھر دیکھنے اور گھر دیکھ کر سادھان کرنے پر گویا محمول کیا۔ تھالی میں چاند دکھانے پر وہ بہت غصہ ہوا اور اینگری ینگ مین بن گیا۔ پھر اس نے قسم کھائی کہ زندگی میں اگر ایسے شاندار دو چار فلیٹ نہیں لئے تو میرا نام پانڈو نہیں۔ اور وہ سچا نکلا اس نے اپنی قسم پوری کی۔ کس طرح؟ اگلے سبق میں پڑھئے!"

دوسرا سبق : چولہے کے پاس کی عقل

پانڈو بڑا ہو گیا راتوں رات، راتوں رات اس کی مونچھیں نکل آئیں۔ جو مسیں پہلے سبق میں بھیگ رہی تھیں اب بھیگ چکیں! ہاں تو ہم کہہ رہے تھے راتوں رات اس کی مونچھیں نکل آئیں تا کہ وہ انہیں اینٹھ سکے، راتوں رات اس کا سینہ چوڑا ہو گیا، سیاہ بالوں سے اٹ گیا تاکہ وہ اپنی محبوبہ کا سر وہاں رکھ کر سہلا سکے۔ راتوں رات زیر ناف بال اُگ آئے کہ وہ انہیں گن سکے راتوں رات اس کے عقل داڑھ نکل آئی تاکہ وہ عقل کا استعمال کر سکے! راتوں رات جیسے کرشمہ ہو گیا، انقلاب آ گیا۔

پانڈو کے والد نے زندگی میں صرف ایک ہی کام کیا تھا اپنے نام پر قرض لیتے گئے تھے۔ بوڑھی ماں کی بیماری ایک مسئلہ تھی اور جوان بہن کی جوانی لمحۂ فکریہ! پانڈو گھر کا ذمہ دار لڑکا تھا۔ دوہری سطح پر ذمہ داری اسے پوری کرنی تھی۔

لیکن پانڈو کی ماں اس کی شادی فوراً کر دینا چاہتی تھی کہ بیٹے کو ملنے والا جہیز وہ بیٹی کی شادی میں دینا چاہتی تھی۔

پانڈو نے کہا تھا "ماں میں پیسہ کماؤں گا، فلیٹ خریدوں گا، پھر شادی کروں گا" پانڈو ایس ایس سی فیل۔ نوکری کا کوئی چانس نہیں۔ پیسہ آئے گا کہاں سے؟ پیسہ نہیں تو فلیٹ خریدے گا کیسے؟ پانڈو نہ اداکار تھا نہ کھلاڑی اور نہ ہی وہ صحافی تھا! پانڈو کے تو روز کے واندے تھے۔ مہینہ بھر اس نے وڑاپاؤ کی گاڑی پر کام کیا پھر جب ہفتہ وصولی کے جرم میں اس کا استاد جیل چلا گیا تو خود وڑاپاؤ کی گاڑی کا مالک بن بیٹھا۔ لاٹری کے ٹکٹ بیچے مگر کوئی چمتکار نہ ہوا تو ماں نے کہا "پانڈو! آدمی جیسا آدمی تو، لاٹری سے پیسہ کمانے کی راہ دیکھتا ہے۔"

"ماں مجھے خوب سارا پیسہ چاہیے۔ مجھے فلیٹ خریدنا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے مجھے ایزی منی چاہیے!"

"ایزی منی کیا؟" ماں نے پوچھا۔

"جھٹ پٹ پیسہ ماں!"

تب پتہ ہے ماں نے کیا جواب دیا "بیٹا میرے ساتھ جیجوری کے کھنڈوبا کے درشن کو چل، تیرا بھلا ہوگا۔"

پانڈو بولا "ماں کھنڈوبا کو بول پہلے پیسہ بعد میں درشن!"

"ایسا نہیں بولتے پانڈو، کھنڈوبا ناراض ہوتے ہیں۔" ماں غصہ ہو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی "گدھے آدمی ہے تو؟ شادی کر۔ اپن جہیز لیں گے!"

ماں کی عقل اور خودداری دیکھ کر پانڈو کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے ماں کو نمسکار کیا "آئی تو گھر وکھر چ گریٹ آہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تیری عقل چولہے کے پاس کی عقل ہے۔"

پانڈو نے اپنی ماں کے کہے مطابق ایک امیر کبیر باپ کی اکلوتی بیٹی سے شادی کی اس کی جائیداد اور فلیٹ ہڑپ لیا پھر ماں بیٹے نے اسے گھاسلیٹ ڈال کر اسٹو سے جلا دیا اور بولے کہ جل کر مر گئی۔

پھر دوسری شادی۔ اسے بھی جلایا اور کہا کہ جل کر مر گئی۔

پھر تیسری شادی۔ اسے بھی......

چالاک اور مکار وکیلوں نے پانڈو اور اس کی ماں کو کبھی جیل

نہیں جانے دیا۔ اس طرح پانڈو تین فلیٹوں کا مالک بن بیٹھا۔ آج کی تاریخ میں پانڈو کے پاس خوب دولت ہے وہ روٹری کلب کا ممبر ہے اگلے برس صدر بھی بن جائے گا۔ پانڈو کا ایک شوق سماج سیوا بھی ہے اور ہاں! معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہ اخبار بھی جاری کرنے والا ہے!

تیسرا سبق : گنڈو کی غنڈہ گردی

بچو! گنڈو نام کا ایک ننھا سا گل گوتھلا بچہ یعنی لڑکا کس طرح منسٹر بنا اس کے بارے میں پڑھو!

ایک تھا گنڈو۔ ایک دم شیطان۔ کوئی بچہ اس کے ساتھ کھیلنے کو تیار نہیں، جو اس کے ساتھ کھیلتا۔ جی بھر کے مار کھاتا۔ گنڈو بچوں کے کھلونے چھین لیتا۔ کتابیں پھاڑ دیتا۔ کرکٹ کھیل کر کھڑکیوں کے کانچ توڑ دیتا۔ ایک دم شیطان!! اسکول میں اس نے اپنے استاد کو نہیں چھوڑا۔ سب اس سے خوفزدہ تھے۔ گنڈو کا بس ایک ہی کام تھا۔ وہ خوب ورزش کرتا۔ شہر کا ایک بھی جمنازیم ایسا نہ تھا جہاں اس نے ڈنڈ نہ پیلے ہوں، اس نے بڑا ہو کر خوب بڑے بڑے کام کئے۔ پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ محلے کی کسی لڑکی کو ثابت و سالم نہیں رہنے دیا۔ پھر اس نے اپنا "گنیش منڈل" بنایا اور داداگری کے ساتھ دکانداروں سے چندہ وصولنے لگا یعنی ہفتہ وصولی شروع ہو گئی!

پھر وہ گلی کا سیوک بنا۔

پھر نگر سیوک۔

وہ دھیرے دھیرے ترقی کرتا رہا۔ اور ایک دن تو اس نے اپنے پڑوس کے بچے کو کہیں چھپا دیا اور اس کی ماں سے پھروتی کی رقم وصول کی۔ وہ کامیاب بھی ہوا۔ پھر اسے چناؤ کا ٹکٹ بھی مل گیا۔

وہ ایم ایل اے بنا۔ وہ ہمیشہ سپاری دیتا رہا۔ وہ ہمیشہ سپاری لیتا رہا۔ اس نے لوگوں کو خریدا اور ملک کو بیچا۔ وہ اپنی کرسی بچاتا رہا۔ اپنے محلے کی جن لڑکیوں کو اس نے ثابت و سالم رہنے نہ دیا کیا مجال کہ ان لڑکیوں کی لڑکیاں پاک باز رہ جاتیں!! اس کی حیثیت بڑھ گئی۔

لوگوں نے بھگوان اور خدا سے ڈرنا چھوڑ دیا اور اس سے خوف کھانے لگے۔ اس نے تقدس پامال کئے اور سماج میں انقلاب برپا ہوا۔ سارا معاشرہ چونک گیا۔ مگر کسی نے کچھ نہ کہا۔ سب سہم گئے۔ آخر سب کے پیٹ میں لڑکیاں تھیں! کون کہتا اور کس سے کہتا؟! اپنے ہی دانت اور اپنے ہی ہونٹ!

گنڈو نے ایک کارنامہ ایسا کیا جس کی وجہ سے اس کا نام رہتی دنیا تک سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔ گنڈو نے سارے معاشرے کی خصی کردی وہ اس طرح کہ سب بے حس ہو گئے۔ انہوں نے کانوں میں پھاہے رکھ لئے۔ زبان کو تالو سے سی لیا اور انتظار کرنے لگے کہ گنڈو کب ہماری چمڑی ادھیڑتا ہے اور کب ہماری چمڑی کے جوتے بنا کر ہمارے ہی سر وں پر مارتا ہے۔

دہشت دہشت۔ ہر طرف دہشت!

گنڈو کے ہزاروں منہ۔ بہت دور تک پہنچ۔ گنڈو کے ہزاروں ہاتھ۔ گنڈو کے پاس پیسہ! گنڈو کے لئے ایم ایل اے اور منسٹر بننا کیا مشکل تھا! دھیرے دھیرے اس کی جائیداد بڑھتی گئی۔ مکان بڑھے۔ گاؤں میں کھیتی باڑی بڑھی۔ اس نے جنگل کاٹ ڈالے۔ اس نے انسانوں کے ساتھ ساتھ ماحولیات کو بھی نہیں بخشا!

"بچو! تم سوچ رہے ہوں گے کہ گنڈو کے مقابلے میں اسے نیچا دکھانے والا اس سے لوہا لینے والا کیا کوئی بھی مائی کا لال نہیں تھا۔ کیا کسی کی ماں نے کسی ایسے مرد کو دودھ نہیں پلایا تھا کہ وہ گنڈو کو ختم کرتا تو سنو بچو! تھا ایک شخص ایسا جس نے ہمت کی تھی۔

بہت دن پہلے جب گنڈو کچھ نہیں تھا تو ایک شخص اسے ہمیشہ چڑھاتا رہتا "ممبئی تجھی بھاڑے گھسا آ بچی"۔ گنڈو اس وقت کچھ نہ کہتا تھا مگر بعد میں جب وہ بڑا ہوا تو جانتے ہو اس نے کیا کیا؟ اس شخص سے اپنے گھر کے بھانڈے برتن دھلائے۔ وہ شخص بعد میں کمزور ہوتا گیا اور گنڈو طاقتور بنتا گیا۔

بچو! گنڈو سے تم بہت کچھ سیکھ سکتے ہو، اس کی موقع پرستی، چالاکی اور ورزش سے ہونے والے فائدے یعنی غنڈہ گردی، مقابلے کی دوڑ، چت بھی میری پٹ بھی میری والا رویہ! آگے بڑھنے اور بڑھتے رہنے کے لئے جو چاہے کرنے کی مکمل تیاری! یہ تمام اوصاف سیکھنے جیسے ہیں!

چوتھا سبق : مطلب کی بات

سب ہندوستانی میرے بھائی ہیں پر کچھ ہندوستانی میرے برادر خصوصی ہیں کیونکہ وہ میرے فرقے کے ہیں کیونکہ وہ میری برادری کے ہیں کیونکہ وہ میرے محلے کے ہیں کیونکہ وہ میری گلی کے ہیں، پڑوسی دوست اور رشتے دار ہیں، داماد ہیں، بیٹے ہیں، بھانجے ہیں، بھتیجے ہیں۔ ان سب کا میں خیال رکھوں گا۔ ان کے لئے میں مر مٹوں گا۔ ان کو میں ترجیح دوں گا میں جو چاہوں گا پہلے اپنے لئے پھر ان کے لئے کروں گا۔ میں ملک کے لئے کچھ نہیں کروں گا۔ میں ملک کو کنگال اور بے حال کروں گا۔

فرقہ پرست نہیں ہوں میں۔ لیکن اگر خود کی ذات بتا کر فائدہ اٹھانا ہو تو میں ضرور اٹھاؤں گا۔ اسی طرح اگر اپنی ذات برادری کا کوئی منسٹر ہو تو وہ میرے لئے سب سے پہلے آگے بڑھ کر کام کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے سیکولرزم، بھائی چارہ سب موہ مایا ہے، مٹنے والا ہے رہنے والا جو ہے وہ یہ کہ قاعدے قانون کو لچکا کر، مروڑ کر، مار دھاڑ کر کے اپنے مطلب کے واسطے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے!

اپنی ذات سب سے اعلیٰ ذات

[باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھئے]



رونق شہری

نگاہوں میں اداسی، جذبۂ تسخیر سینے میں
دبا ہے مسئلہ جیسے کوئی گمبھیر سینے میں

نہیں تو مجھ سا دیوانہ کہاں چپ ہو کے بیٹھے گا
کہیں سے ٹوٹتی ہے سانس کی زنجیر سینے میں

ہوائے درد رستہ کاٹ کر تو کیا قریب آتی
کہیں سے آ کے جیسے چبھ گیا ہو تیر سینے میں

صف ماتم بچھی ہے آج تک چشم تصور میں
لہو رنگ آسماں کی اب بھی ہے تصویر سینے میں

بہت مشکل ہے اپنا دکھ کسی کو منتقل کرنا
نگاہوں سے اتر کر پھنس گیا شہتیر سینے میں

کسی بھی مسئلے کا مستقل حل ہی نہیں نکلا
بہت چبھتا رہا ہے ناخن تدبیر سینے میں

عبث ٹوٹے ہوئے سپنے کو یکجا کر کے ہم خوش تھے
عمارت غم کی بھی ہوتی رہی تعمیر سینے میں

کسی نے دل دکھایا ہے یہ اب عقدہ کھلا رونق
مہینوں زخم کی ہوتی رہی تشہیر سینے میں

● Golghar, Jharia, Dhanbad
828111, (Bihar)



رفیق راز

لوٹ کر نہیں آئی تن میں آتما اس کی
مہر و ماہ میں باقی اب بھی ہے ضیا اس کی

کچھ تو اس کے ہونے کی ہر طرف خبر پھیلے
ارے ہوائے صحرائی خاک ہی اڑا اس کی

خواب تو مرے اس نے نیند میں گنوائے سب
رات بھر رہی روشن چشم نیم وا اس کی

وہ ابھی دبے پاؤں ہے رواں مری جانب
خامشی خلاؤں کی ہے صدائے پا اس کی

خواب تیری آنکھوں کا خاک ہونے والا ہے
اک جھلک نگاہوں سے آ کے دیکھ جا اس کی

پیش پیش رہتی ہے شان بے نیازی سے
جسم کی نمائش میں ریشمی ردا اس کی

جانے کون سا منظر چبھ گیا زیادہ ہی
دیکھتے ہی بنتی ہے آنکھ میں حیا اس کی

بحر تو نشے میں ہے اپنی بے کرانی کے
پیاس پہ مری اب ہے منحصر بقا اس کی

● Radio Kashmir, Srinagar (J&K)



رئیس الدین رئیس

کیا تعجب ہے اگر اس میں روانی اب
خشک ہے برسوں سے یہ دریا بھی پانی اب

زندگی کرنی ہے دائم اب تو آسیبوں
استطاعت میں مری نقل مکانی اب

جکڑے رہتی ہے مجھے بے نام سی اک یا
ذہن و دل میں یاد بھی کوئی پرانی اب

سر جھکا کر سن لیا کرتی تھیں اولاد یں
ان عزیزوں کے دہن میں بے زبانی اب

نیند کا آنکھوں سے میری کیا تعلق اب
اب کوئی لوری نہیں کوئی کہانی اب

● 10/1725, Delhi Gate,
Aligarh - 202001

احمد سہیل

321, Old Elkhart, Rd-37, Palestine, Texas - 75801 (U.S.A.)



معاصر اردو تنقید ـ کیا ہے، کیا نہیں

اردو کی ادبی تنقید کا شاخسانہ تو یہی ہے کہ اس میں نظریاتی، نتائجی اور نظامیانے کی آگہی کا قریب قریب فقدان ہے۔ اردو تنقید اور اس کے نظریاتی مباحث کا بیشتر حصہ اجنبی رجحانات اور رویوں سے بڑی حد تک متاثر ہے جو اردو کے چند نقادوں کے یہاں محض اپنی "چودھراہٹ" یا "ذہنی عیاشی" کے سوا کچھ اور نہیں۔ ادھر ایک دوسرا طبقہ اس سلسلے میں اس قدر پیورِشن ثابت ہوا ہے کہ وہ ان نظریات کو اقدار شکن نظریات سے تعبیر کرتا ہے، اور سارا مسئلہ روایت پرستی اور کھوکھلی روشن خیالی کے تصادم کا ہے۔ قبول اور رد کے اس تعارض میں ہر مسئلہ ابہام کی صورت اختیار کر کے عدم آگہی کی خطرناک اور المناک قسم کی صورت حال کو جنم دے رہا ہے۔

تخلیق کے بغیر تنقید کا جواز نہیں اور نہ ہی ادبی نظریہ تخلیق کے بغیر پروان چڑھتا ہے۔ نئی نئی تحریکیں اور رویے آئے دن ادبی نظریوں کے مخاطبے کا حصہ بنتے ہیں مگر اس سے ادب کے قاری کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ کسی کے دستک دینے سے دروازہ نہ کھولنا بد تہذیبی ہی نہیں، احساس جرم یا احساس محرومی یا احساس کمتری کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ ادبی نظریات اور تنقید کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رہنی چاہیے تاکہ تازہ ہوائیں ادبی منظر ناموں کو ترو تازہ کرتی رہیں۔

لیکن فی الحال معاصر اردو تنقید کا منظر نامہ یہ ہے کہ تنقید کے چند چمکتے ہوئے ستارے ہی اردو میں ادب اور غیر ادب کا فیصلہ کر رہے ہیں اور اچھے، برے ادب کا فتویٰ اپنے طور پر ہی صادر کرتے رہتے ہیں اس طرح اپنے تعصبات، تخلیق کار اور قاری پر ٹھونستے نظر آتے ہیں۔ ان کا طریقۂ تنقید یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کے خلاف تخلیق کاروں کا استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف ان نقادوں نے جینوئن لکھنے والوں اور قاری کے روایتی اور فطری روابط میں شکوک و شبہات بھی پیدا کئے ہیں۔ قاری کو ادب سے بھٹکا کر ان غیر ضروری اور مصنوعی باتوں میں الجھا دیا ہے جو نہ ہی ادب ہے اور نہ ہی ادب و تنقید کی مثبت روش۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ ضروری نہیں کہ ان کے ذاتی یا نظریاتی دشمن تخلیق کاروں کے بھی دشمن ہوں۔ یہی غیر ضروری کشمکش اردو تنقید کے لئے زہر بن چکی ہے۔ اچھی اور بھرپور ادبی تحریروں کو کسی نقاد کی ضرورت نہیں ہوتی وہ بھی سچے "عشق" اور "مشک" کی طرح چھپتے چھپائے نہیں چھپتی۔ مگر تنقید؟

یہ امر افسوسناک ہے کہ ہمارے نقاد اشتہاری کمپنیوں کا رول ادا کر رہے ہیں۔ برے لکھنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور جینوئن لکھنے والوں سے دانستہ طور پر چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اردو تنقید کے متحرک گروہ غیر معیاری لکھنے والوں کی صف بندی کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ نئے رنگروٹ ان کے نام کی تشہیر کریں، ان کے سیاسی ایجنڈے کی ترویج میں حصہ لیں اور انھیں وہ بنادیں جو وہ ہیں نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ادبی فکری مرتبہ و مقام ہے۔ اب صورت حال اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ اچھے لکھنے والے بھی ان اشتہاری نقادوں کے پیچھے گھومتے نظر آتے ہیں اور ان کے چلائے ہوئے چکروں میں گرفتار ہو کر خود بخود غیر معیاری ادب تخلیق کرنے لگتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ دونوں ایک دوسرے کو مہذب طریقوں سے بلیک میل ہی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کا استحصال بھی کرتے ہیں۔ شہرتوں کی اس دوڑ میں نقاد اپنی دوکان تو بڑھا جاتا ہے لیکن جینوئن لکھنے والوں کو ان کی طبعی زندگی میں ہی سسک سسک کر ختم ہو جانا پڑتا ہے۔

اب نقاد، نقاد کم اور نیلام گھر زیادہ لگتا ہے۔ ادبی مجاوروں کا ایک جم غفیر ان کے ارد گرد حلقہ بند ہے۔ خوشامدی اور چاپلوس قلم کار ان کے ارد گرد خیمہ گاڑے بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں ان بد دیانت نقادوں کی نظر کرم سے پریم چند، فیض یا ن۔ م۔ راشد یا ناصر کاظمی کا سا ادبی درجہ مل جائے۔ معاصر ادب میں سارا مسئلہ شخصیت سازی اور شخصیت پرستی کا ہے۔ نظریاتی اور فکری مباحث تو ان کی اپاہج فکری اور تنقیدی وجود کے لیے محض بیساکھیاں ہیں۔ جن کا اصل میں کوئی چیندا نہیں۔ انھیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جو بات ان کے بس کی نہیں، اس پر وہ حاوی ہونے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر کام میں ٹانگ اڑائی جائے۔ دنیا میں اور بھی تو ڈھنگ کے کام ہیں جو کئے جاسکتے ہیں۔ دوسروں کو بلاوجہ کہنیاں مار کر

اپنی حماقتوں کی تشہیر کرنا کہاں کی دانائی ہے ؟اردو کے یہ مٹھی بھر نقاد کب تک اردو ادب کی زلفیں سنوارتے رہیں گے اور ایسی راہوں کی نشاندہی کرتے رہیں گے جن پر چل کر کئی تخلیق کار ان تاریک راہوں میں مارے جاچکے ہیں اور عنقریب مارے جانے والے ہیں۔

اردو نقاد اپنی انا کی جمود وش صورت حال کے سبب کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دے سکا جس کا انتظار اردو کی ادبی تنقید ایک عرصے سے کر رہی ہے۔ اب یہ ہے کہ عام قاری اور آگاہ قاری دونوں ہی اردو کے نقادوں کی ناقابل قبول باتوں سے بہت حد تک اوب چکے ہیں۔ اب ادب وہی شخص پڑھتا ہے جسے ادب پڑھنا ہے۔ عام آدمی ادب اور بالخصوص تنقید اور مفروضہ ادبی نظریوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ صرف گنے چنے لوگ ہی یہ تنقید پڑھتے ہیں اور بعض [stain] رد عمل کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اردو کا آگاہ قاری یہ بخوبی جانتا ہے کہ کون اچھا لکھ رہا ہے اور کون خراب ادب تخلیق کر رہا ہے۔ اس میں یہ [stain] ادب کیا ہوتا ہے یا کونسی تحریر ادبی حدود سے باہر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس امر کی بھی درجہ بندی ہونی چاہیے کہ کس تخلیق کار کا اردو میں کیا مقام ہے جس کا فیصلہ دیانت دار نقاد ہی کر سکتا ہے۔ اب اردو کا قاری اس بات کا اظہار کھلم کھلا کر رہا ہے، اور اب یہ بات ڈھکی چھپی بھی نہیں کہ اردو کا تخلیق کار نقادوں کے طرز فکر و عمل سے خاصا نالاں بھی ہے کہ ان نقادوں کے سبب انھیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا اور نہ ہو رہا ہے جو ان کا حق تھا۔ یہ حقیقت ہی اصل میں نقادوں سے بے اطمینانی اور ان کے مشکوک کردار کی آئینہ دار ہے۔

اردو میں نئے ادبی تنقیدی نظریات کی تشریح، تفہیم "ذاتی تناظر" اور سیاق ہی میں ہو رہی ہے اور اس کی اصل وجہ عناد ہے۔ مضمون کی سرخی نظریہ اور تنقید کے کسی اہم مسئلے کی نشاندہی کرتی ہے لیکن اس کی آڑ میں بھی مخصوص فرد کی شخصیت سازی کی جا رہی ہوتی ہے اور مبالغے کی حد تک اس کے کارناموں کا ذکر نہایت ہی فراخ دلی سے کیا جاتا ہے اور قاری کو سطر بہ سطر دھوکہ دیا جاتا ہے۔ التباس کی یہ فضا نہ صرف لکھنے والوں کو بے نقاب کرتی ہے بلکہ نقاد بھی بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے نقادوں اور تخلیق کاروں کا مسئلہ دیانت داری اور تخلیق کاری نہیں ہوتا۔ تمام زور اپنی شخصیت سازی اور نرگسیت کی نذر ہو جاتا ہے۔ "میں"....... "میں"...... کی گردان اور ذات کی پوجا انھیں بے معنی رومانویت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خود پرستی کا یہ روگ انھیں کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ اس پورے تناظر میں اردو کا تخلیق کار ہی نہیں بلکہ نقاد بھی خود پرستی کا شکار ہے۔ ان کی تمام کی تمام کاوشیں ذات پرستی سے شروع ہو کر ذات پرستی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کا سارا مکالمہ اپنی ہی ذات سے ہے۔ نرگسیت کے نفسیاتی محرکات نے ان کی "محدودیت" کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی ہے۔ اس مرض کی طرف کلاسکی شعرا اشارہ کر چکے ہیں۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں   بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے   (غالب)
دیکھیے کیا شور اٹھتا ہے حریم ناز میں   سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدہ کریں   (جگر)

اردو نقادوں کو اپنی ذات کے حصار سے نہ صرف نکلنا چاہیے بلکہ اپنی ذات کی نرگسیت کے حصار کو بھی توڑنا چاہیے۔ کیونکہ یہی نرگسیت ان کی جھوٹی انا کو تشکیل دیتی ہے۔ آج کل اردو میں دو ادبی رویوں کے بے معنی مباحث نے تنقید کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مغرب کے حوالے سے خوب فکری اڑانیں بھری جا رہی ہیں لیکن اپنے ماحول اور اپنی روایت سے الگ ہونے کے سبب یہ نظریات اردو میں کسی قسم کی نئی جمالیات کو تشکیل نہ دے پائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مغربی فکر و تنقید سے اردو والوں کو آگہی نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے کہ اردو کا پڑھا لکھا نقاد مغرب و مشرق سے خوب آگاہ ہے لیکن وہ اپنے تہذیبی ورثے کو ان مغربی افکار اور سانچوں میں ڈھالنے میں ناکام رہا ہے یا دانستہ طور پر ان معاملات سے پہلو تہی کر رہا ہے۔ اردو میں ابھی تک جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث نوآبادیاتی زمین کی باقیات ہی لگتے ہیں۔ مغربی ماڈل کو ہو بہو اردو کے ماڈل میں جڑنے کی کوشش ناعاقبت اندیشی اس لیے ہے کہ اردو نقاد ان ماڈلوں کو اردو کے مزاج میں ڈھالنے میں ناکام رہا ہے کیونکہ اس کے لیے اعلیٰ ذہن و فکری پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ اردو تنقید میں اس کا قحط ہے۔ جنوبی ایشیاء کے دانشوروں کو اپنا فکری ماڈل خود ہی تشکیل دینا چاہیے۔ ہوا یہ ہے کہ ان جدید تر ادبی و تنقیدی نظریات کو پیش کرتے ہوئے بڑی بڑی فلسفیانہ باتیں کی گئی ہیں لیکن اس فلسفہ زدہ تنقید نے نئے ادب کی کوئی مدد نہیں کی، کر بھی نہیں سکتی۔

تخلیق کے لئے تنقید ضروری ہے اور نقاد بھی، لیکن:

تنقید اور ادب کے نظریات میں صد اقتِ فکری کی اہمیت ہوتی ہے۔ نقاد کو اپنے معاشرے اور تہذیبی حوالے سے تنقید لکھنا چاہیے اور "ادب" اور "غیر ادب" کی درجہ بندی واضح طور پر ہونی چاہیے تاکہ ادبی اور تنقیدی طہارت کے بعد اس بات کی نشاندہی ہو کہ "ادب کیا ہوتا ہے"۔؟ اور کیا ادب نہیں ہوتا ہے۔ اردو کا نقاد ادب میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر رہا ہے وہ خود تو سورما بنا ہوا ہے اور بڑی مہارت سے جینوئن لکھنے والوں اور قاری کو ایک دوسرے سے متنفر ہی نہیں کر رہا بلکہ اپنی نام نہاد انا کی آڑ میں "تقسیم کرو۔ حکومت کرو۔" کے اصولوں کو بھی اپنائے ہوئے ہے۔ اس کے پاس اپنا کوئی فکری نظام، کوئی کلیہ، قاعدہ موجود نہیں۔ صرف ہوائی باتیں کی جا رہی ہیں جس کا عقلی اور منطقی بساط پر کوئی جواز نہیں۔ تنقید میں فکری ساخت کی سسٹم تھیوری اہم ہوتی ہے اور اس کی وساطت سے تنقیدی مظہر اور اس کی حرکیات شعور کا حصہ بنتی ہیں۔ جس طرح آئن اسٹائن نے کائنات کی ساخت کو

دریافت کیا، اسی طرح فکری ساخت کی آگہی کے انکشاف ہی سے کسی تنقیدی جہت کی رونمائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ جبکہ نئی ادبی تھیوری و تنقید اپنے ثقافتی اور آئیڈیالوجیکل تشخص پر اصرار کرتی ہے یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن آئیڈیالوجی اور ثقافت کا مسئلہ اردو میں ایک خطرناک رجحان تصور کیا جاتا ہے اگر اردو کا نقاد اس میں الجھ گیا تو وہ نہ تنقید کی مبادیات کو سمجھ پائے گا اور نہ ہی ثقافت اور آئیڈیالوجی کی نامیات سے اسے آگہی ہو سکے گی۔ بڑے تو یہی کہتے آئے ہیں کہ "اردو والوں کو ثقافت اور آئیڈیالوجی کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیے کیونکہ ہمارا معاشرتی مخاطبہ بہت ڈھیلا ڈھالا اور کمزور ہے۔ لہٰذا تخلیق کاروں کو تنقیدی مخاطبے کی کمزور صورت حال میں کسی قسم کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری تخلیقی شناخت، تنقیدی شناخت سے قدرے مختلف ہے۔ لہٰذا تخلیق کار کو نقادوں کی پھیلائی ہوئی دہشت سے بھی نہیں گھبرانا چاہیے۔ کیونکہ تخلیق کے بغیر تنقید کا کوئی جواز نہیں۔ اب تو سب ہی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اردو تنقید کے "ستونوں" کے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی جا رہی ہے اور نئے تخلیق کاروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا نقاد خود تلاش کرے اور اپنی فسطانت کے خلاف پر اسرار سازشوں کا دفاع اور مزاحمت بھی خود ہی کرے۔

یہ طے ہے کہ نئی نسل کے تخلیق کار اپنے پیش رو نقادوں کا اعتبار کھو بیٹھے ہیں اور اب اسے نئی نسل کے نقادوں سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ آج کا نوجوان نقاد زیادہ پڑھا لکھا، باشعور اور مہذب ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ خود تشکیلیت کے عمل سے گزر کر ہی وہ کچھ پا سکتا ہے اور تشکیل کو مہذب رنگ دینا جوابی مخاطبے کی ہی ایک شکل ہے جس سے تنقیدی اور نظریاتی طریق کار کی غیر اختصاصی اور غیر شناختی ترجیحات جنم لیتی ہیں۔ نئی نسل کے نقاد کو یہ بھی علم ہے کہ تنقیدی مکتب سازی نے تخریب کاری کے پیمانوں کا روپ دھار لیا ہے۔ پیش رو جینوئن لکھنے والے ان پیمانوں کا شکار ہو کر فکری انتشار ہی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اس کی مزاحمت سے وہ اپنے ہی حلقے کے لوگوں میں سٹ کر رہ گئے۔ مزاحمت کے اس پہلو نے اردو کے بیشتر نوواردو شعراء کو سطحی بنا دیا۔ اسی سبب آج کے کئی نامور نقاد اور ان سے جڑے ہوئے تخلیق کار بھی بے سمتی کا شکار ہو کر اپنی شناخت ہی نہیں اپنا فکری منصب بھی اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھے ہیں۔ یہ باصلاحیت لوگ فروعی باتوں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے چکر میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ اب نئی تنقید میں واقعات اور واقعہ نگاری کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور فکری سچائی آہستہ آہستہ اس کی جگہ لے رہی ہے جو اپنے وجود کا جواز خود ہی پیش کر رہی ہے۔ بیسوی صدی کے اختتام پر یہ آثار نمایاں ہو چلے ہیں کہ نئی نسل کی تنقید میں ابلاغ کی نئی عمرانیات نئے تنقیدی اظہار کو جنم دے گی اور ۲۱ویں صدی نئے تخلیق کار اور اس کے نئے نقادوں کی صدی ہو گی بشرطیکہ نئے تخلیق کار اور نئے نقاد اپنے پیش رو کی تقلید نہ کریں۔ ◆ ◆

بقیہ صفحہ ۱۹ : نصاب

ذات پات کا فائدہ اٹھائیے

(مندر وہیں بنائیے)

پانچواں سبق : دھرپکڑ

بچو! جو ناقد یہ کہتا ہے کہ فساد کا موضوع ہنگامی موضوع ہے اس پر لعن طعن بھیجو اور یہ دو کہانیاں ازبر کر لو۔ کہانیاں پڑھنے سے پہلے ایک بات اور سن لو۔ فسادات میں ایک گروہ نے ایک اکیلے آدمی کو دھر دبوچا تھا اور اس سے پوچھا تھا "بتا تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں جائے گا؟"

بچو دراصل یہ سوال ازل تا ابد آدمی کو حیران و پریشان کرتا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔ اب بھلا بتاؤ فساد ہنگامی موضوع کیسے ہو گیا؟ بہرکیف آؤ کہانیاں سنو اور سر دھنو!

پہلی کہانی

ایک شخص گلی سے نکلا، ہاتھ میں اردو کا تازہ اخبار تھا۔ ہندوؤں نے پکڑ لیا، پکڑ کر دبوچ لیا۔

"مجھے کیوں پکڑ لیا، ارے مجھے کیوں دبوچ لیا، میں بھی ہندو ہوں"

"ہندو۔ لعنت ہے تم پر۔ کیا کوئی ہندو اردو اخبار پڑھتا ہے۔"

خیر "اردو اخبار" پر دس سطروں کا ایک مضمون لکھو!

دوسری کہانی

ایک کو پھر دبوچ لیا "کون ہے بے تو؟"

مگر وہ شخص کچھ نہ بولا۔ ہیبت سے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی پتہ چل جائے گا۔ اتارو اس کی پینٹ۔" گروہ کے سرغنہ نے کہا۔

اس دفعہ وہ شخص تقریباً چیخ کر بولا "بھیا میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر ختنہ کرائی ہے۔"

بچو! جو ختنہ کراتے ہیں وہ مسلمان ہوتے ہیں اس لیے ختنہ کا ایک نام مسلمانی بھی ہے کچھ غیر مسلم ڈاکٹروں کے مشورے پر ختنہ کرا لیتے ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات میں بے چارے "آ بے لڈو جا بے لڈو" والی حالت میں ہوتے ہیں! ہندوؤں کے علاقے میں پھنس جاتے ہیں اور مسلمانوں کے علاقے میں بچ نکلتے ہیں اسی کا نام شاید سیکولرزم ہے۔ فرقہ وارانہ فساد میں ختنہ شدہ ہونا یا نہ ہونا ہی ایک ازلی یا ابدی شناخت لائسنس یا پرمٹ ہے! ◆ ◆

ے بھر غزلیں

عنبر بہرائچی

م ہوا شعر ، تو نقاد بنے ہو
ر کے شانوں پہ رعونت سے کھڑے ہو
موسی افکار ہیں مغرب میں، انہیں کے
بے چہرہ تراجم پہ بھی بقراط بنے ہو
یا خوب طبیعت ہے مرے شیام سلونے
بلیز پہ ارباب سیاست کی پڑے ہو
نٹوں بھری جھاڑی کو بھی کہتے ہو گلستاں
دریا کو فقط اوس کی ایک بوند سمجھے ہو
عشاق کی غیرت پہ بہت چیں بہ جبیں ہو
جو حاشیہ بردار ہیں بس ان کے سگے ہو
فنکار بصد عجز تمہیں دیکھ رہے ہیں
تم ہو کہ سر ناز کو خم دے کے تنے ہو
موضوع کوئی ہو تمہیں ہونا ہے مخاطب
سامع کے لئے نیند کا سامان کرے ہو
گر علمی مباحث میں کوئی تم کو نہ مانے
تہذیب کے ایوان کو مسمار کرے ہو
تدریس میں رہ کے بھی تن آسان ہو کتنے
دعوہ ہے کہ اردو کے لئے جان تجے ہو
منصب کو بھی پہنا کے تجارت کی ردائیں
باہر کی فضاؤں کے مزے لوٹ رہے ہو
کس درجہ وفادار ہیں شاگرد تمہارے
ہے ان کی مشقت، جو رسائل میں جمے ہو
عنبر میں چمک دیکھ کے کچھ علم و ہنر کی
لرزیدہ بدن کیوں ہو کہ جب اتنے کھرے ہو

● 590-Haibat Mau, Mawiya,
Rai Bareilly Road, Luchnow - 25

◆

جلتے ہوئے جنگل سے گزرنا تھا ہمیں بھی
پھر برف کے صحرا میں ٹھہرنا تھا ہمیں بھی
معیار نوازی میں کہاں اس کو سکوں تھا
اس شوخ کی نظروں سے اترنا تھا ہمیں بھی
جاں بخش تھا پل بھر کے لئے لمس کسی کا
پھر کرب کے دریا میں اترنا تھا ہمیں بھی
یاروں کی نظر میں ہی نہ تھے پنکھ ہمارے
خود اپنی اڑانوں کو کترنا تھا ہمیں بھی
وہ شہد میں ڈوبا ہوا لہجہ ، وہ تخاطب
اخلاص کے وہ رنگ ، کہ ڈرنا تھا ہمیں بھی
یاد آئے جو قدروں کے مہکتے ہوئے گلبن
چاندی کے حصاروں سے ابھرنا تھا ہمیں بھی
سونے کے ہنڈولے میں وہ خوش پوش مگن تھا
موسم بھی سہانا تھا ، سنورنا تھا ہمیں بھی
ہر پھول پہ اس شخص کو پتھر تھے چلانے
اشکوں سے ہر اک برگ کو بھرنا تھا ہمیں بھی
اس کو تھا بہت ناز خدوخال پہ عنبر
اک روز تہہ خاک بکھرنا تھا ہمیں بھی

◆

اُس پار کوئی ہو تو ندی پار کروں بھی
ملنے پہ اُسے جان کے بیزار کروں بھی
دنیا کے لئے اس کو فرشتہ کروں ہر پل
فرصت جو اسے ہو تو گنہگار کروں بھی
وہ جسم کو لو دے کے بہت دھوم مچائے
ہاتھ آئے کسی پل اسے اسرار کروں بھی
وہ میری خموشی پہ رہے دشت ہمیشہ
کچھ ناز دکھائے اسے گلزار کروں بھی
درپردہ مری خاک میں وہ نور بھرے ہے
کچھ دیر ہٹے خود کو میں شب زار کروں بھی
بے نام سی وادی میں خموشی پہ گذر ہے
وہ ساتھ ہو ، ہر گام طرب زار کروں بھی
ہاں! ٹھیک ہے وہ میرے تغافل سے ہے نالاں
اب موج میں آئیں تو اسے پیار کروں بھی
اس گوشہ نشینی کا الگ لطف ہے لیکن
وہ چاہے اگر خود کو میں بازار کروں بھی
وہ پاس ہے عنبر تو کہاں اس پہ نظر ہے
وہ دور رہے تو اسے کچنار کروں بھی

◆

درویش ہو ! مٹی کی بہاروں میں نہاؤ !
یہ کیا ؟ کہ رہ و رسم ہواؤں سے بڑھاؤ !
کشکول ہے سونے کا تو تسبیح گہر کی
پھر کیا ؟ رخ انور پہ رعونت بھی سجاؤ
ریشم کے مصلے پہ بنو سازشیں ہر پل
بازار میں ہر گام پہ کرتب بھی دکھاؤ
بوسیدہ قباؤں سے رہو دور ہمیشہ
زرپاش کلاہوں کے سبھی ناز اٹھاؤ
شہراہ پہ دکھلا کے فرشتوں کی ادائیں
حجرے میں ، اندھیروں کے سمندر میں نہاؤ
ہونٹوں پہ سجاتے رہو الفاظ کے موتی
کم خواب کی وادی کو عمل زار بناؤ
کس حال میں ہے خلق تمہیں اس سے غرض کیا؟
بس قصر معلی کو خیالوں میں بساؤ
اسلاف کی قبروں پہ کرو اشک فشانی
پر ان کے شعائر سے کبھی دل نہ لگاؤ
عنبر ! ہوا معلوم کہ گستاخ بہت ہو
اب خود کو دہکتے ہوئے شعلوں سے بچاؤ

◆

دشت زادے بھی عجب آب و ہوا لاتے ہیں
جان کر شہر کے بازار اٹھا لاتے ہیں
پھول سیمل کے ہر اک سمت اڑاتے ہیں شرر
ہم بھی ہر سانس میں پھاگن کی ادا لاتے ہیں
خواب میں جب بھی دمکتے ہیں خدوخال وہی
ہم تخیل کی ہتھیلی پہ حنا لاتے ہیں
شب کے بے نام شکنجوں سے اماں کب ہے مگر
اس کی آنکھوں سے شفق زار اڑا لاتے ہیں
ہم کہ آوارہ منش ، مست قلندر ٹھہرے
کبھی آندھی کبھی خوش نام گھٹا لاتے ہیں
مدتوں ایک خموشی کو بناتے ہیں ہنر
موج آتی ہے تو صدرنگ صدا لاتے ہیں
ہوشیاری میں نہیں کوئی مقابل اس کا
پھر بھی ہم اس کو بڑے ڈھب سے چرا لاتے ہیں
ہم کو اس ریت ندی میں ہی ٹھہرنا ہے کبھی
مرغ زاروں کو نگاہوں میں چھپا لاتے ہیں
شور کا آپ بھی کچھ ساتھ نبھائیں عنبر
کیوں بھلا خود کو یوں گمنام بنا لیتے ہیں

نسیم بن آسی
Koh-e-Noor General Store Parmar Katra,
Mughal Saria 232101 (U.P)

ایک پنکھ والی چڑیا

یکایک بجلی کا کوندا لپکا، جس سے دماغ کو جھٹکا لگا۔ اور نگاہیں باہر کی طرف جم گئیں۔ باہر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے مینڈک پھدک رہے تھے۔ ایک مینڈک میرے پاس ہی پھدکتا ہوا آرہا تھا۔ گرد آلود ہوا کا تیز جھونکا آیا اور جسم کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ مینڈک میری ننگی ٹانگوں پر رینگنے لگا۔

میں صبح کا اخبار لے کر کرسی پر بیٹھ گیا ہوں۔ اخبار کے پہلے ہی صفحہ پر کچھ ہنگامہ خیز سرخیاں ہیں۔ ایک طرف دو دنیا ہیں، جو ایک دوسرے کے سامنے مخالف انداز میں کھڑے ہیں۔ دوسری طرف ریل اور بس میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ پچاس سے اوپر لوگ جاں بحق ہو گئے ہیں۔ پورا اخبار ہنگاموں اور حادثوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پھر بھی ایک ہی صفحے میں ایک پوری صدی گزر گئی ہے۔ اخبار کے صفحات پر کچھ دوسری قسم کی بھی خبریں ہیں جن کا تعلق سیاسی رہنماؤں کے اصلاحی و تعمیری بیانات سے ہے۔ میرے ہونٹ اپنے آپ ہلنے لگتے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ ان سارے بیانات سے ہوتا ہوا تا کچھ نہیں ہے۔ میں اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوں لیکن ان خبروں کو پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے۔ ان چند سطور میں نصف صدی کے اخلاقی زوال کی داستان چھپی ہوتی ہے۔ ایک طبقے نے جن حالات کو پیدا کیا ہے، دوسرا اسے ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ کوئی جذبات میں آکر اپنے ہی فرض سے تجاوز کر گیا ہے۔ کوئی کھلی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے، جس سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے۔ خبریں اخبار کے صفحوں سے نکل کر میرے دل و دماغ پر حملہ آور ہو رہی ہیں۔ اُن کے رد عمل کو روک پانا میرے بس کی بات نہیں ہے دل چاہتا ہے اخبار کو پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دوں۔ ایک دھندلی سی چادر آنکھوں کے سامنے پھیل جاتی ہے۔ پھر پورے چہرے پر زور ڈال کر پلکیں کھولتے ہوئے پاتا ہوں کہ ثمینہ چھت پر ہے۔

میں ثمینہ کو آواز دیتا ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ دروازے پر آکر کھڑی ہو جاتی ہے جس سے کمرے کے اندر آتی ہوئی صبح کی روشنی چھپ جاتی ہے۔ اس کے سیاہ دراز بال بھیگے ہوئے ہیں۔ وہ غسل خانہ سے کچھ ہی پہلے باہر آئی ہے۔ اور چھت پر جا کر دھوپ میں بالوں کو سکھا رہی تھی۔ وہ شانوں پر بکھرے بالوں کو جھٹک کر پشت پر کر لیتی ہے۔ لیکن وہ کسی ضدی بچے کی طرح پھر واپس آجاتے ہیں۔ وہ میری طرف اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے اسے میرے کسی حکم کا انتظار ہو۔

"ناشتہ لگاؤ مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے۔"

وہ باورچی خانے میں چلی جاتی ہے اور میرے لئے ناشتے کا انتظام کرنے میں لگ جاتی ہے۔ میں کرسی پر بیٹھا صحن میں پھیلی دھوپ دیکھ رہا ہوں۔ جس میں وہ نرمی اور سنہرا پن نہیں ہے جو کسی کمسن لڑکی کے چہرہ پر ہوتا ہے۔ اس میں تیزی ہے جو بیچ والی عورت میں ہوتی ہے۔ جس کے باعث وہ جھکنے اور شرمانے سے انکار کر دیتی ہے اور اپنے عورت ہونے کا ہر وقت اعلان کرتی رہتی ہے۔ مجھے یہ دھوپ دیکھ کر اپنے بالوں کا خیال آتا ہے۔ جس کی سفیدی نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا ہے۔ اور تو کوئی بات نہیں، اپنے سے زیادہ عمر کی عورتیں بھی مجھے انکل کہہ دیتیں ہیں اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں ....

ثمینہ نے ناشتہ لاکر میز پر رکھ دیا ہے۔ پھر وہ میرے جوتے صاف کرنے لگتی ہے۔ میں ایسی نیک بیوی سے بہت خوش رہتا ہوں۔ دنیا کے سارے مرد ایسی بیویوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ثمینہ جب سے میری زندگی میں آئی ہے، میری ازدواجی زندگی میں بہار آگئی ہے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے وہ اپنے آپ میں مکمل ہے۔ کبھی معلوم ہوتا ہے وہ ابھی ادھوری ہے۔ وہ اسی طرح معصوم اور بھولی ہے جس طرح فلم کے پردے پر ہماری ہیروئنیں ہوتی ہیں جو سوائے ہنسنے مسکرانے کے دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہیں۔ اُس میں کیا کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اس میں کیسا گھنا جنگل اُگتا جا رہا ہے، جس میں ہر جانور ایک دوسرے کو ہڑپنے کے لئے بے تاب ہے۔ ثمینہ! تمہیں معلوم ہے، دنیا میں اتنا اناج پیدا ہوتا ہے کہ کسی کو بھوکا نہیں رہنا چاہئے۔ اس پر بھی اس کی آبادی کے نصف سے زیادہ لوگ بھوکے ننگے اور بیمار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ دنیا کی اسی فیصد آمدنی صرف بیس فیصد لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ثمینہ! میں چاہتا ہوں، تم اس سنگ دل اور بے رحم دنیا کے خوفناک

بچوں سے دور رہو۔میں تمہیں اس سے ہر طرح محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے خوابوں کی طرح......

ناشتہ کرنے کے بعد میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔ آج میں نے پتلون اور قمیض پہنی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ لباس اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں اس میں اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی اسمارٹ محسوس کرتا ہوں۔ میرے یہ کپڑے بیوی نے صاف کئے ہیں۔ جس سے دھلائی کا خرچ بچ جاتا ہے۔ میں جوتے پہن کر ڈاکٹر کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ تب ہی وہ مجھے گھر کے لئے ضروری اشیاء کی یاد دلاتی ہے۔ ساری چیزیں ختم ہو گئی ہیں۔ سبزی، کھانے کا تیل، آٹا دال کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے غصہ آرہا ہے۔ تم نے رات ہی میں ان ضروری چیزوں کی فہرست کیوں نہیں دے دی؟ مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے اور میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ وہ چپ ہو جاتی ہے۔ وہ میرے مزاج کو جانتی ہے۔اس کے منہ سے دوبارہ آواز نکلی کہ میں مرد بن جاؤں گا۔ایسے میں اسے اپنے عورت ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ کسی کی بیوی ہونے کا....

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا محلے سے باہر آگیا ہوں جہاں سڑک کے دونوں طرف گیہوں کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کی سنہری بالیاں کسی شرابی کی طرح جھوم رہی ہیں۔ کہیں ضرور برف باری ہوئی ہے جب ہی ہواؤں میں اتنی خنکی ہے۔ یہی موسم ہے، جب برف گرتی ہے، پانی بھی برستا ہے۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ بھی چلتے ہیں۔انسان کے مزاج کی طرح ان موسموں کا بھی کیا اعتبار۔ابھی دھوپ ہے ابھی ابر ہو گیا۔ کیا پتہ کس سمت سے ہوائیں اولے پتھر لیکر آجائیں اور ان ساری فصلوں کو غارت کردیں۔

راستے میں ریلوے گارڈ کے مکان کے پاس ایک بوڑھا اپنی ہی طرف آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میرے قریب آجاتا ہے۔ گورا رنگ، درمیانہ قد، قمیض شلوار اور سر پر چپکی سفید گول ٹوپی۔ وہ پریشان حال نظروں سے دیکھتا ہوا مجھے سلام کرتا ہے۔ آبادی کتنی دور ہے؟ میں اشارہ کر کے چلنے لگتا ہوں۔ وہ سامنے ہے۔اس کی آنکھوں میں عاجزی پیدا ہو گئی ہے۔ کیا رکو گے نہیں؟ میں لمحہ بھر کے لئے ٹھہر جاتا ہوں۔ جلدی کہو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ہم لوگ کشمیر سے آئے ہوئے ہیں۔ پریشان حال ہیں آپ لوگ ہماری کچھ مدد کریں میں اپنی گھڑی دیکھتا ہوں۔ اور مجھے اس بوڑھے کی بجائے اپنے آپ سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ نہیں بابا میں اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے ٹھیک وقت پر ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے جب بھی مجھے کھانسی آتی ہے رکنے کا نام نہیں لیتی۔ میں پتلون کی جیب سے رومال نکال کر ہونٹوں پر لگے کف کو صاف کرنے لگتا ہوں۔

سڑک کے کنارے یوکلپٹس کے اونچے پیڑ دھوپ میں نہا رہے ہیں۔ جس سے ان کی پتیاں چمک رہی ہیں۔ان کے طویل قامت سفید چکنے جسم پر نکھار آگیا ہے۔شاعری میں محبوبہ کے قد و قامت کی مثال سرو کے درخت سے دی گئی ہے۔ لیکن میں ثمینہ کی مثال یوکلپٹس سے دیتا ہوں۔ مانتا ہوں،وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں ہے لیکن شاعری میں سب چلتا ہے، یہ بھی چلے گا۔

کالج کے پرنسپل گپتا جی کے مکان کے لان میں انار کا پیڑ اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے۔ اس کے سرخ پھولوں کو دیکھ کر ذہن میں کئی ایسٹمین کلر بکھر جاتے ہیں۔ کوئی سوچتا ہو، میں ایسٹمین کلر فلموں کی بات کر رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ آجکل ان فلموں کی ضرورت بھی کیا ہے جب سڑکوں ہی پر سب کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

میرے چلنے کی رفتار پہلے سے تیز ہو گئی ہے۔ اتنا تیز چلنے سے آدمی کیسا تماشہ بن جاتا ہے۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔ کہیں کوئی مجھ پر ہنس تو نہیں رہا ہے۔ تب ہی مجھے اپنے پیچھے کوئی مکروہ آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز اکثر میرے کانوں میں آتی ہے۔ یہ کسی ٹریکٹر کی آواز ہے جس سے سمع خراشی تو ہوتی ہی ہے، راستہ چلنے والوں کو پریشانی بھی ہوتی ہے۔ کیا پتہ کب یہ کسی کے اوپر چڑھ جائے۔ وہ میرے ایک دم قریب آگیا ہے۔ اور میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ پہلے تمہیں جاؤ اور جلدی سے کوئی حادثہ کرو۔

تیز چلنے سے میرے پورے جسم کی ورزش ہو گئی ہے۔ میں ہانپ رہا ہوں۔ جس سے مجھے تیز کھانسی آنے لگی ہے۔ سانس پھولنے سے میں تھکا تھکا محسوس کر رہا ہوں۔ وقت کو پکڑنے کے لئے اپنے آپ کو پریشان کرنا اور خود کو مذاق بنانا کیسی حماقت ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا تو وقت مجھے کسی ایسے گڈھے میں پھینک دے گا جس سے نکلنا میرے لئے مشکل ہو گا۔ نکلوں گا بھی تو کوئی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔

میں کچھ ہی دیر میں بازار کی سڑک پر آجاتا ہوں۔ جہاں ٹمپو اور بس کے اڈے ہیں۔ان کے ڈرائیور اسٹیرنگ کے پاس بیٹھے بے صبری سے سواریوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ خلاصی لوگوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ وہ سواریوں کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑا اور گالی گلوچ بھی کر رہے ہیں۔ میں ایک بس کی طرف بڑھتا ہوں تب ہی ٹمپو والا چلاتا ہے۔ کہاں جا رہے ہیں، سڑک جام ہے میں سر سے پاؤں تک کانپ جاتا ہوں اور ٹمپو کے پاس کھڑا ہو جاتا ہوں۔

"کتنا کرایا لو گے؟"

"بیس روپئے۔"

"ایک دم دگنا!"

"سڑک جام میں پیٹرول بہت جلتا ہے اور پریشانی بھی بہت ہوتی ہے۔"

"پھر بھی کچھ کم کرو۔"

لیکن ٹمپو والا راضی نہیں ہے۔ میں خلاء میں دیکھنے لگتا ہوں۔ بس

میں تو تاخیر ہو جائے گی۔ میں ٹمپو والے کی بات مان جاتا ہوں۔ جیسے انسان مجبور ہو کر ہر بات مان لیتا ہے۔ ٹمپو پر پہلے ہی سے دو امیر غریب بیٹھے ہوئے ہیں میں بھی امیر غریب اس میں بیٹھ جاتا ہوں۔ میری طرح وہ اور قسمت کے مارے آجاتے ہیں۔ ٹمپو والے کی سواری پوری ہو چکی ہے۔ وہ اسے اسٹارٹ کر رہا ہے لیکن ٹمپو نے ضد پکڑی ہے اور آگے بڑھنے سے انکار کر رہا ہے۔ بہت کوشش کے بعد وہ گھر گھر کی آواز کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

جب آدمی آرام سے بیٹھا ہو تو اسے اپنے آپ الہام ہونے لگتا ہے اور اس کے خیالوں کے پنکھ نکل آتے ہیں۔ وہ کسی ٹمپو میں نہیں کار میں بیٹھا ہے۔ نہیں ہوائی جہاز میں۔ سب اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔

کچھ دور جاتے ہی سڑک جام شروع ہو گیا ہے۔ جسے دیکھ کر میری عقل کے کل پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ایک لائن ہو تو کوئی بات نہیں۔ یہاں تو ٹرکوں، بسوں اور ٹمپوؤں کی تین تین متوازی لائنیں ہیں۔ انسان کی آبادی کی طرح ان گاڑیوں کی تعداد میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ دائیں بائیں کہیں سے بھی ایک قدم بڑھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جام کی وجہ سے دیر ہو گئی تو ٹمپو والے کا کچھ نہیں بگڑے گا، میرا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا۔ میرا لیا کٹ کٹے گا وہ الگ سے۔

میرا ٹمپو آگے نکلنے کے چکر میں دائیں طرف سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تب ہی کوئی ٹرک اپنی دو گول گول آنکھیں نکال کر سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔ یہ تو میرا سائڈ ہے۔ ٹمپو والے کو دیکھ کر دوسری گاڑیاں بھی اس کے پیچھے لگ جاتی ہیں۔ اس پر سڑک والا اپنی خالص ٹکسالی زبان استعمال کرتا ہے۔ اس کے جواب میں ٹمپو والا بھی۔ اور ان کے درمیان آگئی ہیں ان کی ماں بہنیں اور بیٹیاں۔ جن کا اصل میں کوئی قصور بھی نہیں ہوتا۔

ہارن کی آوازیں اور انجن کا شور بڑھ رہا ہے۔ آگے پیچھے دور تک گاڑیوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ جو مسافر دیر سے بسوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے کوئی نہیں پوچھ رہا ہے، انہیں کہاں جانا ہے؟ جیسے وہ کسی جزیرے میں پھنس گئے ہیں جہاں وہ جی سکتے ہیں نہ مر سکتے ہیں۔ جو نئی گاڑیاں آرہی ہیں وہ بھی قطار میں لگتی جا رہی ہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا یہ قطار کہاں تک اور کتنی لمبی ہے۔؟

کچھ ٹمپو گھس پیٹھ کر رہے ہیں۔ گھس پیٹھ سے جب انسان ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا سکتا ہے تو ٹمپو والے کیوں نہیں ایسا کر سکتے۔ یہ زمانہ ہی گھس پیٹھ کا ہے۔ میرا ٹمپو بھی نیچی اونچی زمین پر لڑھکتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے جس کے باعث ہم سب اس میں بیٹھے ہوئے شرابی ہو رہے ہیں۔ لیکن کچھ ہی دور جا کر وہ پھر رک جاتا ہے۔

میں گھڑی دیکھتا ہوں اور گھبرا کر ٹمپو والے سے کہتا ہوں۔ یار! کسی طرح نکالو۔ مجھے ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے۔ اس پر وہ مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔ ایک دوسرا آدمی مضطرب ہو کر پہلو بدلتا ہے۔ مجھے کچہری جانا ہے۔ دیر ہو گئی تو وارنٹ ہو جائے گا۔

ایک خوبصورت عورت بس کی کھڑکی سے جھانک رہی ہے وہ بس میں ہوتے ہوئے بھی بے بس ہے۔ لوگ اسے ہی دیکھ کر اپنا غم غلط کر رہے ہیں۔ خودکشی کرنے کے لئے اس سے اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی ہے اور یہ خودکشی بھی کتنی رومانٹک۔ لیکن کوئی خودکشی کرے یا نہ کرے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ جام تو اپنے وقت ہی پر کھلے گا۔

میں بار بار اپنی گھڑی دیکھتا ہوں جسے اب سڑک پر پھینک دینے کو جی چاہتا ہے۔ گھڑی کا فائدہ ہی کیا جب کوئی کام اپنے وقت پر نہیں ہوتا ہے کچھ ڈرائیور اور خلاصی اپنی گاڑیوں سے اتر کر جام ہٹانے میں لگ گئے ہیں۔ جو کام پولس کو کرنا چاہئے، اسے وہ خود کر رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر پولس بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اسے تو صرف اپنی وصولی سے مطلب ہے۔

سامنے کچھ راستہ صاف ہوا ہے۔ میں ٹمپو والے سے عاجزی کرتا ہوں۔ یار! کوشش کرو۔ اور وہ جیسے ہی آگے بڑھتا ہے، کوئلے سے بھرا ایک ٹرک آکر راستہ روک دیتا ہے۔ جس پر ٹمپو والے نے اسے ایک موٹی سی گالی دی ہے۔ جو اسے گالی بھی نہیں معلوم ہوتی ہے۔

کتنے مسافر گاڑیوں سے نیچے اتر رہے ہیں اور آگے جانے کے لئے قریب کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پکڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں رکشہ نہیں ہے۔ وہ خود ہی اپنے سامان ڈھو رہے ہیں۔ سب سے زیادہ پریشانی ان عورتوں کو ہے جن کے پاس سامان کے علاوہ گود میں بچے بھی ہیں۔ گاڑیوں سے اتر کر جانے والے مسافروں کا قافلہ دور تک نظر آرہا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ باقی مسافر کسی بے آب و گیا صحرا میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے کوئی ہجرت بھی نہیں ہے۔ کیا وہ اتنے امیر ہو گئے ہیں کہ پیدل نہیں چل سکتے ہیں۔ یا اتنے غریب کہ ٹرین پکڑنے کے لئے اب ان کی جیب میں پیسے نہیں ہیں۔؟

"کچھ پتہ ہے، یہ جام کیوں ہے؟"

"یہی تو نہیں معلوم ہو رہا ہے۔"

مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ میرا حلق سوکھنے لگتا ہے۔ میں اپنے ارد گرد دیکھ رہا ہوں۔ جہاں کہیں پانی نہیں ہے۔ چلّو بھر بھی پانی نہیں۔ میرے اندر کوئی لہر اٹھ رہی ہے۔ کیا مستقبل ہے تمہارے ملک کا۔ تمہاری زندگی کا۔ کوئی کانٹا ہے، جو میرے دل و دماغ میں پیوست ہوتا جا رہا ہے۔

لوگوں کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں اور وہ غصہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

"آخر اس جام کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"ضرور ہوگی۔"

"تو پھر وجہ کیوں معلوم نہیں ہو رہی ہے؟"

لوگ ادھر ادھر دیکھتے ہیں، پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔

میں گھبرا کر ٹمپو والے کی طرف دیکھتا ہوں۔ بھئی بات کیا ہے۔ یہ جام کیوں نہیں کھل رہا ہے۔ لیکن اسے بھی اس کا علم نہیں ہے۔ وہ قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے۔

"یہ تو صرف اندازہ ہے۔ اصل بات تو معلوم نہیں ہو رہی ہے۔"

"اصل بات یہ ہے کہ یہ جام کبھی کھلے گا ہی نہیں۔"

میں اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کہیں لوگ مجھے دے کا کوئی پرانا مریض نہ سمجھ بیٹھیں۔ باہر جتنی دھوپ پھیلی ہوئی ہے اتنی ہی میرے اندر بھی اگ آئی ہے۔ میں ٹمپو والے کا کندھا پکڑ لیتا ہوں۔ مجھے یہیں اتار دو۔ جانے سے فائدہ ہی کیا جب ڈاکٹر ہی نہیں ملے گا۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہا ہے، جیسے میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔

کچھ دیر بعد گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں اور ان کے انجنوں کا شور پھر سنائی دینے لگتا ہے جس سے لوگ حواس باختہ اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے ان میں سوار ہو جاتے ہیں۔ بسوں، ٹرکوں اور ٹمپوؤں میں حرکت ہوتی ہے اور وہ مری ہوئی چال سے رینگنے لگتے ہیں۔ میرے چہرے پر کہیں رکی ہوئی شادابی لوٹ آئی ہے۔ اب میں کھل کر ہوا میں سانسیں لینے لگا ہوں۔ مسافروں کے غائب چہرے واپس آ جاتے ہیں اور وہ اپنے اندر تازگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مجھے ایک دروازے کے مرمریں سیڑھیوں کے پاس کوئی خوبصورت لڑکی کھڑی نظر آتی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے کوئی پیغام ہے وہ اپنی دونوں بانہیں میری طرف پھیلا دیتی ہے۔ لیکن جب میں اس کی طرف بڑھتا ہوں، جانے اسے کیا ہو جاتا ہے، اس کے دونوں ہاتھ ٹیڑھے ہو جاتے ہیں وہ آسمان میں اڑ جاتی ہے۔ میں چیخنا چاہتا ہوں۔ لیکن آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ کسی غیبی طاقت نے میرا گلہ گھونٹ دیا ہے۔!

شہر کے چوک میں آتے آتے سارا ٹریفک یکایک رک جاتا ہے۔ آگے کوئی راستہ نہیں ہے۔ چلنے کے لئے بھی نہیں۔ سڑک جام کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ جس کے ڈر سے سارا ٹریفک ساکت و جامد ہے۔ میں اپنے آپ کو کسی بھٹ میں پاتا ہوں۔ وہاں گھنا اندھیرا ہے۔ مجھے کسی زبردست گھٹن کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی بدبو پریشان کرنے لگتی ہے۔ میں یہاں سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ لیکن کوئی چیتے جیسی صورت والا بھٹ کے دروازے پر کسی مستعد پہرے دار کی طرح کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے بھی کوئی ہے۔ جس کے چہرے کا رنگ کالا ہے۔ اور آنکھیں چمکدار ....

چوک میں بہت گہما گہمی ہے۔ نیتا جی وزیر بننے کے بعد پہلی بار اپنے شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ انہیں کھلی کار میں بٹھا کر بہت بڑا جلوس سڑک پر چل رہا ہے۔ پارٹی کی جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی ہیں۔ پارٹی کے نوجوان کافی جوش و خروش میں ہیں۔ نعرے لگ رہے ہیں۔ بینڈ باجے بج رہے ہیں۔ وزیر کی گل پوشی ہو رہی ہے۔ پارٹی والے خوشی میں ناچ گا رہے ہیں۔ راستے چاروں طرف سے مسدود ہیں ٹریفک کو آگے جانے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یکایک ہوا رک جاتی ہے۔ مجھے کسی خوفناک طوفان کے آنے کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ بہت دور سے کوئی عجیب سی آواز سنائی دیتی ہے جیسے ہوا کا امتحان ہو رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے سانپ کی طرح لوٹتی ہوئی پانی کی لہریں کروٹ لینے لگتی ہیں۔ ہوائیں تیز ہو گئی ہیں۔ لہروں نے تیز ہو کر ایک بیڑے کو ہوا میں اچھال دیا ہے۔ وہ نامعلوم چٹانوں سے ٹکرانے والا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایسا ہوتا، ایک طوفانی لہر آگے بڑھتی ہے۔ جس سے بیڑے کا ایک پہیہ چٹانوں سے ٹکرا کر الگ ہو جاتا ہے۔ بیڑے نے ایک زوردار ہچکولہ لیا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا پہیہ بھی ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ ہوا پانی اور چٹانیں اس بیڑے سے کسی کھلونے کی طرح کھیل رہی ہیں۔ کبھی اسے دائیں، کبھی بائیں پھینک رہی ہیں۔ وہ شاید ڈوب رہا ہے۔! ○ ○

بقیہ صفحہ ۱۱ : [illegible]

خونِ جگر اور آتش سیال کا مسئلہ محض فلسفیانہ اور حکیمانہ یا علمی و نظری ہی نہیں ہے، ہم اپنی تجربی زندگی میں بھی اس کی داخلی کیفیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کہ تکوین (تخلیق) سے چند قبل سورج سیال ہی تھا۔ یہی آتش سیال گدلا پانی بنا، پھر اس کی ایک بوند خون کی پھٹکی بنی، پھر گوشت کا لوتھڑا، پھر اس کے اندر ہڈی کا ایک ڈھانچہ تیار ہوا، پھر اس پر چمڑے کا ایک غلاف بھی منڈھا گیا۔ پھر تو وہ ایک الگ ہی وجود ہو گیا۔ اس سارے مرحلے میں خونِ جگر ہی تغذیہ فراہم کرتا رہا۔ آخر کار وہ ایک ایسی مخلوق بن گیا جس میں معنی کے کتنے ہی جہان نو پوشیدہ تھے۔

معنی کے جتنے جہان اب تک دریافت ہو چکے ہیں، انہیں کی خبر اکثر ادیبوں اور شاعروں کو نہیں ہے کہ وہ فکری بنیاد پر اپنے فنی اسالیب کی عمارت تعمیر کر سکیں۔ اور ان کا قلب بھی اتنا مجلی اور منور نہیں ہو سکا ہے کہ حیات کے غیر متعین اور پوشیدہ امکانات کا مشاہدہ بلاواسطہ کر سکیں۔ اتنا ضرور ہے کہ جو قوی مایہ فنکار ہیں، وہ مسائل کی پیچیدگیوں سے الجھ الجھ کر شدید طور پر حساس اور جذباتی ہو گئے ہیں۔ تخلیق فن کے لئے یہ چیزیں بہت ہی ضروری ہیں۔ لیکن فن کے معیار و وقار کے لئے ضروری ہے کہ جذبے کا تجزیہ اور تحلیل نہایت ہی باریکی کے ساتھ کی جائے۔ موجودہ دور کی شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں بعض ایسے رجحانات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جہاں حس اور وجدان کی بھرپور ہمکاری کا عکس دکھائی پڑتا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی کشت ویراں سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ (۱۱ راگست ۹۲ء)

●Nasir Mansion, Near Muslim Club, Paakkisarai, Muzaffarpur- 1 (Bihar)

آپ کو چاہیے صافی
کیونکہ خوبصورتی کے معنی خوبصورت جلد سے کہیں زیادہ ہیں۔



کیل، مہاسے، پھوڑے پھنسی، گرمی دانے، سانس اور بدن کی بدبو جیسی شکایتیں دراصل بدن کے اندرونی نظام کی خرابی کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔
صافی قدرتی جڑی بوٹیوں کا ایک بے مثال مرکب ہے جو پورے نظام جسم کی اصلاح کرتا ہے اور جس سے بالآخر جلد کی صحت و دلکشی کی حفاظت ہوتی ہے۔
صافی خون کو جلد خرابیوں سے بچاتی اور دورانِ خون کو صحیح کرتی ہے، غذا کے جزو بدن بننے کی رفتار میں اضافہ کرتی ہے، سانس اور جسم کی بدبو اور قبض جیسی تکلیفوں کو دور کرتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ صافی پچھلے ۵۵ برسوں سے آزمودہ مصفیِ خون ہے۔
روزانہ رات کو صافی پیجیے اور تمام دن تروتازہ اور چست رہیے!

صافی کب استعمال کی جائے؟

- فسادِ خون
- جلدی خارش
- پھوڑے پھنسی
- کیل مہاسے
- دائمی و مزمنی قبض
- عام تکان اور سستی
- گرمی دانے
- نکسیر
- خسرہ
- پیشاب میں جلن وغیرہ کی شکایتوں میں

صافی پیشاب آور ہے اور خون کی تیزابیت سے پیدا ہونے والی شکایات سے بچاؤ کے لیے بھی مفید ہے۔



ہمدرد
صافی
خون صاف کرنے کا قدرتی طریقہ



بدر عالم خلش

ے وجود کی لو آفتاب ہے تو ہے
بب آ، کہ یہ جلنا عذاب ہے تو ہے

ںا بے سوال و سراپا نگاہ گزروں گا
ا بے نیاز اگر بے حجاب ہے تو ہے

ہے استوا سے بہت دور طور ہو کہ شعور
ی کا شعر کلیمی خطاب ہے تو ہے

"بہت عزیز ہے مجھ کو رخ سحر کی لگن"
ہ زور و شور سگاں انقلاب ہے تو ہے

ہے عمر قید بے آب و گیاہ گوشے میں
وضو کے کوزے میں تھوڑی شراب ہے تو ہے

ہ نقش آب گہر وہ ابد کی تاب کہاں
مرا صدف تہ موج سراب ہے تو ہے

برہنہ سر ہے ابھی تک دریچہ روشنی
روش روش پہ اگر سبز خواب ہے تو ہے

میں جس خیال کو چھونے کی ضد میں راکھ ہوا
وہ اب ہوا کی طرح ہمرکاب ہے تو ہے

تم آگئے ! تو چلو دلکشائی کرنے چلیں
بلا سے آج کا موسم خراب ہے تو ہے

• اس بین التونی شکست و رخت کیلئے میں ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ فیض کا عہد خوابوں کا عہد تھا۔ اور ہم لوگ عہد بے خوابی میں جی رہے ہیں۔ خلش

● House No.3 Sector No.3
Sastri Nagar, Kadma,
Jamshedpur-5

عین تابش

بجز بازار رسوائی بساط طشت پر کیا تھا
بہت جنس گراں کی کھوج میں نکلے مگر کیا تھا

سراب عمر میں اک حلقۂ دیوار و در کیا تھا
نظارہ خود ہی حیرانی میں تھا اسے چشم تر کیا تھا

بڑا دلسوز لمحہ تھا حساب وصل سے آگے
ادھر اک نقرئی گھنٹی سی بجتی تھی ادھر کیا تھا

سلوک دید تخم آرزو کی باریابی تھا
اور اس کے بعد آنکھیں تھک گئیں تو عمر بھر کیا تھا

بہت بیٹھے تھے کر کے حسن کی اقلیم پر قبضہ
مگر صحرا نورد پیر دل کو یہ ہنر کیا تھا

نخاس رنگ و بو میں مجمع عشاق تھا اتنا
مگر اس چوک پر بس اک صدی آگے کھنڈر کیا تھا

● Aamdari House
Sasram (Bihar)



ارشد غازی

حصار کون و مکاں سے نکلوں تو آگہی کا نصاب لکھوں
قلم پہ لفظوں کی بندشیں ہیں وگرنہ اس پر کتاب لکھوں
نظر سے آگے کی وسعتوں کا میں کیا بتاؤں طلسم کیا ہے
ہر ایک تعبیر اس حقیقت کی جی کرے ہے کہ خواب لکھوں
محیط ہے جانے کتنی صدیوں پہ یہ سمندر سی ذات میری
مگر ہے اصرار بے ثباتی کہ زندگی کو حباب لکھوں
سوال اٹھتے ہیں بے ارادہ، نظر میں ہے سب کے بے یقینی
اسے کہوں اضطراب ذہنی کہ نکتۂ انقلاب لکھوں
جھلس رہا ہے وہ اپنے شعلوں میں ساتھ چوکھٹ کے دیر ے زیر
بہ نوک شمشیر اس کی ہستی کو کس لئے اب عذاب لکھوں
ازل میں بھیجا تھا جو رسالہ، رموز و اسرار زندگی
میں لفظ تفسیر بن کے کیوں نا، سطر سطر کا جواب لکھوں
طبیعتیں ہو چلی ہیں عادی سرود و ساز و نشاط سے اب
میں سختیاں نسل نو کی قسمت، میں کاش پھر بے حساب لکھوں

● E - 16 - 21, Zakir Nagar,
Okhla, New Delhi - 25



ویریندر پٹواری

102-Deluxe Apts. Vasundhara Enclave Delhi - 110096

رات ایک عارضی منزل

رات کی تاریکیوں میں اگر کھو جاتا تو میں اس کا ذکر ہی کیوں کرتا! یہ تعجب کی بات تو ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں دن کے اُجالے میں کھو گیا تھا اور وہ بھی اپنے ہی شہر کی گلیوں میں! سنی سنائی بات ہوتی تب میں بھی ہنس پڑتا مگر خود پر جو بیتی ہے اس سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی خود پر اور کبھی حالات کی ستم ظریفی پر!

دراصل دہشت گردی کی آگ نے جہاں انسانیت کو جھلسا دیا ہے وہیں گلیوں، کوچوں، محلوں بلکہ شہروں کی پہچان بھی مٹا دی ہے، یہی وجہ ہے کہ میں برف میں دھنس دھنس کر جس لمبی گلی میں گھنٹوں چلتا رہا تھا تو مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ میں بڑی سڑک کی طرف جا رہا ہوں یا دریا کے کنارے کی طرف! وجہ یہ ہے کہ دائیں بائیں، آگے پیچھے، جلے یا ادھ جلے مکان تھے اور انہوں نے بھی برف کی چادر اوڑھ لی تھی، گلی میں کسی کے قدموں کے نشان بھی نہیں تھے، پھر میں کسی کو کہاں دیکھ پاتا جس سے پوچھتا کہ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں، یا میری منزل کہاں ہے، جبھی تو شام کی ڈوبتی روشنی سے گھبرا کر میں سحر کی پہلی کرن تک، یعنی ایک رات گزارنے کے لئے اس ادھ جلے مکان میں گھس آیا تھا۔

لیکن یہ رات ایک انوکھی رات ثابت ہوئی، کل شام جن لوگوں کو اس کمرے میں دیکھ کر میں لرز اٹھا تھا، اور پھر دبے پاؤں اندھیرے کی آڑ میں چھپ کر، رات بھر اپنے پھولتے ہوئے سانسوں پر قابو پا کر جن کی باتیں سن لی تھیں وہ صبح سویرے مجھے دیکھ کر اس قدر خوفزدہ ہو گئے جیسے میری جیب میں قلم نہیں بلکہ ریوالور ہے۔ یہ لوگ میرے لئے اجنبی ہیں، مجھے بھی ان پانچوں آدمیوں میں کوئی بھی جانتا یا پہچانتا نہیں ہے، لیکن رات بھر ان سب کی باتیں سن کر ان کے بارے میں اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ یہ وہ مفرور دہشت گر نہیں ہیں جنہوں نے ایک گاؤں میں ایک ساتھ درجنوں معصوم لوگوں کو گولیوں کی بوچھار سے ابدی نیند سلا دیا تھا، بلکہ یہ لوگ بھی میری ہی طرح اپنے اپنے گھروں کی تلاش کرتے کرتے یہاں ویسے ہی آپہنچے تھے جیسے کسی سیلاب سے مختلف جگہوں سے اُکھڑے کاٹھ کے ٹکڑے ایک ساتھ بہتے بہتے کنارے سے لگ جاتے ہیں۔

اگر یہ پانچ پانڈو ہوتے تو میں سمجھتا کہ کونے میں الگ تھلگ بیٹھا آدمی یدشٹر ہے مگر یہ لوگ اپنا راج پاٹھ حاصل کرنے کے لئے یہاں کوروں سے چھپ کر نہیں بیٹھے ہیں بلکہ اپنی اپنی جان بچانے کی خاطر یہاں پناہ گزیں ہو گئے ہیں اور ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک رہے ہیں۔ "کہیں یہ وہی درندے تو نہیں۔" ان میں سے ایک آدمی رات بھر بڑبڑاتا رہا اور اس وقت بھی وہ بڑبڑا رہا ہے۔ کیسا زمانہ آگیا ہے، شیطان کو دن میں بھی سب کچھ دکھائی دینے لگا ہے۔ اب وہ جو بھی کرتا ہے دن میں کرتا ہے! کم بخت اگر ایک کان میں گھس جاتا ہے تب دوسرے کان سے نکالا بھی جا سکتا ہے، آنکھوں کے راستے اندر گھس جائے تو آنکھیں کھول کر نکالا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ظالم تو ناک کے راستے اندر گھس کر پھیپھڑوں اور دل سے دماغ تک پہنچ جاتا ہے۔ انسان کو اپنے بس میں کر کے تقریریں کرواتا ہے، تحریریں لکھواتا ہے، گولیاں چلوا دیتا ہے۔ یعنی آدم زاد کو ایک مشینی انسان بنا دیتا ہے۔! پھر وہ آہ بھر کر باقی چار آدمیوں کو تسلیاں دے دے کر سمجھاتا ہے۔ مجھے قیامت کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حضرت نوح کی صدا بھی سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس بار پھر اپنا سفینہ لے کر آرہا ہے۔! اور اگر وہ نہ بھی آیا تب بھی روز محشر ہم شیطان کو پہچان ہی لیں گے۔ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا! پوچھ لیں گے ہم سب اس سے! کیا ملا ہمیں برباد کر کے۔! جنت نشاں دنیا کو جلا کر۔!! نسل آدم کا خون بہا کر!! دوسرا اور تیسرا آدمی صرف ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور آہ بھر کر پتھر کی طرح خاموش ہو جاتے ہیں، وہ دونوں حیران و پریشان ہیں کہ اگر مذہب کے نام پر لڑائی یا جنگ ہو رہی ہے تب کوئی ان کی خیر و خبر کیوں نہیں لے رہا ہے۔

ان کی گفتگو سن کر میں یہ جان گیا ہوں کہ ان میں سے ایک کسی سرکاری پاٹھ شالا میں ہندو بچوں کو سنسکرت پڑھایا کرتا ہے اور دوسرا کسی سرکاری مدرسے میں مسلمان بچوں کو عربی پڑھایا کرتا ہے، دونوں کو اس بات کا افسوس ہے کہ اب نہ کوئی اُن کے پاس دھارمک وچارن کے لئے آتا ہے اور نہ کوئی دینی تعلیم حاصل کرنے! چوتھا آدمی ایک گلوکار و رقاص ہے

[باقی صفحہ ۳۴ پر دیکھئے]

اقبال آصف

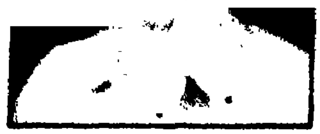
بدن دریا میں طغیانی بہت تھی — وہ اک خواہش کہ طوفانی بہت تھی
بدلتے موسموں کا جبر، اس پر — ہواؤں کی بھی من مانی بہت تھی
قبائے زرد پہنادی یہ کس نے — کبھی کشت گماں دھانی بہت تھی
نئے لہجے تراشے جا رہے تھے — مگر سوچوں میں ارزانی بہت تھی
وہ خالی ذہن تھے آصف کہ اس پر — طبیعت ان کی شیطانی بہت تھی

Jame Masjid Mohalla, Near Jahnda Katta, Bijapur - 586101

طارق قمر

بچپنا جب بھی گھر بناتا ہے — ایک دیوار بھول جاتا ہے
منتظر آنکھ جیسے جاتی ہو — کون دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
زندگی ہوگئی ہے رقاصہ — بس امیروں سے اس کا ناتا ہے
اچھا اے مصلحت خدا حافظ — حرف حق برگ و بار لاتا ہے
بجھ نہ جائیں کہیں چراغ اس کے — اب وہ سورج پہ مسکراتا ہے

Mohallah Jagat, Near Hind Inter College, Sambhal-244302





شارق عدیل

سکھ دکھ مل کر بھوگ سکھی — جیون ہے سنجوگ سکھی
بانجھ زمیں کے جانے کا — کون منائے سوگ سکھی
اتنا بھی آسان نہیں — لفظوں کا پریوگ سکھی
ہم خود رزق کے مارے تھے — کیا کرتے سہیوگ سکھی
غیر بھلے ہیں اپنوں سے — کہتے ہیں کچھ لوگ سکھی

P.O. Marehra, Dist Etah - 207401 (U.P.)

شاکر ادیبی

کبھی شعور میں آتا ہے لاشعوری بھی — مگر بصیرت ادراک ہے ضروری بھی
حضور اُن کے ہوں لیکن ہے بےحضوری بھی — بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
نہ جانے کون سے گوشے کی ہے کمی اس میں — حیات اپنی جو تشنہ بھی ہے ادھوری بھی
یہ سلسلہ تو قیامت پہ جاکے ٹوٹے گا — کسی کی آرزو اب تک ہوئی ہے پوری بھی
حقیر مجھ کو بناتا ہے میرا دست سوال — فقیر بننے نہیں دیتی ناصبوری بھی

4 - Teachers Colony, Bandar Mohalla Bhiwandi - 421302





اشرف عادل

ایک خانہ خراب ہے آگے — شہر دل زیر آب ہے آگے
قطرۂ آب کو غنیمت جان — دریا دریا سراب ہے آگے
ان اندھیروں کو زیر کرلوگے — ماہتاب آفتاب ہے آگے
آنکھ میں پالتے رہو سپنے — ہر حقیقت سراب ہے آگے
زندگی کے سوال کا عادل — بے مروّت جواب ہے آگے

1Badu Bagh, Khanyar, Srinagar - 190001

ہندی : گوری ناتھ

2 / 36, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi - 2

ترجمہ : احمد شکیل

آلودگی

چائے پیتے ہوئے منورما کو پہلی بار دلّی آنے کی بات یاد آئی۔ پہلی بار دلّی آتے ہوئے اسے لگا تھا کہ اس کی زندگی کی ساری دلی تمنائیں پوری ہو گئیں۔ نئی دلّی اسٹیشن سے باہر نکل کر ۱۶۲ نمبر کی بس کا انتظار کرتے ہوئے اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔

لیکن وہ خوشی وزیرپور کے بس پڑاؤ پر ہی آدھی ہو گئی تھی۔ بس اسٹینڈ کے بعد انڈسٹریل ایریا ہوتے ہوئے جب رکشہ جھگیوں کی طرف بڑھنے لگی تو منورما کو کھانسی شروع ہو گئی تھی۔ تیزاب آمیز ہوا اس کی سانسوں میں جلن اور خراش سی پیدا کر رہی تھی۔ اسٹیل فیکٹریوں کے مناظر اور ان میں کام کرتے لوگوں کو دیکھ کر منورما کا دل ایک انجانے خوف سے کانپنے لگا تھا۔ تھوڑی دور سے ہی جھگیوں کے حالات دیکھ کر اُسے لگا تھا کہ وہ کوڑے کچرے کے ڈھیر میں آ گئی۔

کوڑوں کچروں اور گندی نالیوں کو لانگھ کر تنگ راستوں سے گزرتی ہوئی جب وہ دربے نما کوٹھری میں پہنچی تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ روشن دانوں اور کھڑکیوں سے محروم وہ تنگ و تاریک کوٹھری اسے کسی گیس چیمبر س سی لگی تھی۔ ونے نے غالباً اس کی بے چینی بھانپ کر بلب کا سوئچ آن کر دیا۔ پنکھا بھی چلا دیا تو اسے ذرا سکون محسوس ہوا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دو آدمی والے کنبے کے لیے مناسب برتن ایک گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیوار ہلکے چونے سے پتی ہوئی تھی۔ اوپر چھجے اور ریک بھی بنے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کی خجی کے بعد جب کچھ سکون محسوس ہوا تو وہ ونے سے مخاطب ہوئی۔

"آپ جس دوکان میں کام کرتے ہیں وہ کدھر ہے؟"

"یہاں سے دور ہے۔ پرانی دلّی اسٹیشن کے بعد چاندنی چوک کے نزدیک۔"

"کیا نام بتایا تھا اُس جگہ کا؟ وہ بھی ایسی ہی جگہ ہے؟؟"

"نہیں۔ وہ بہت سندر جگہ ہے۔ دیکھو گی تو دیکھتی رہ جاؤ گی۔ بھاگیرتھ پیلس میں ہے وہ جگہ۔ الکٹرانکس کے سامانوں کے معاملے میں اُسے ایشیا کا سب سے بڑا مارکٹ کہا جاتا ہے۔"

"تو آپ اتنی دور اور اتنی خراب جگہ میں یہاں کیوں رہتے ہیں؟" منورما کا معصوم سا سوال تھا۔

اس سوال سے ونے جزبز ہو کر رہ گیا۔ منورما کے معصوم سے تجسس کو سمجھتے ہوئے بھی وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ تاہم اسے مطمئن کرنے کی اس نے کوشش کی۔

" اس جگہ تو بازار ہی بازار ہے۔ لوگوں کے رہنے لائق کمرہ وہاں نہیں ملتا۔ لیکن وہاں سے قریب اور یہاں سے بہتر جگہ سیلم پور میں ہے۔ موہت بھائی وغیرہ وہیں رہتے ہیں۔ ان سے میری باتیں ہوئی ہیں۔ ایک آدھ مہینے میں وہاں ایک کھولی خالی ہونے والی ہے۔ یہاں سے سو روپے زیادہ لگیں گے لیکن کافی سہولتیں ہوں گی۔ کچھ ہی دن اور دکھ دوں گا تمہیں۔ برداشت نہیں کر پاؤ گی کیا؟"

منورما یکایک ونے کے اوپر جھکی اور پوری طرح اس سے لپٹ گئی "آپ نے ایسی بات کیوں کہی؟ آپ جہاں ہوں گے وہاں مجھے کوئی دکھ کیوں ہو گا۔ پھر کبھی ایسی بات نہیں بولیے گا۔ نہیں تو میں ....." اور وہ کچھ اور ونے سے لپٹ گئی۔ ونے نے دیکھا کہ منورما کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں اس کا ایک ہاتھ منورما کے بالوں سے کھیلنے لگا تھا۔ ونے چاہ کر بھی کچھ بول نہیں پایا تھا۔ ایک بار منورما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لمحہ بھر دیکھا تھا اور پھر اس کی آنکھیں مند گئی تھیں۔ ہونٹ کانپتے کانپتے کٹھور ہو گئے تھے۔

منورما کو آج بھی بخوبی یاد ہے کہ اُس جھگی کے باہر چاروں طرف کوڑے کچرے، تھوک کھکھار، تیزابی زہریلی دھول سے بھری جہنمی دنیا دروازے کے پاس سے ہی شروع ہو جاتی تھی۔ بدبودار کھلے نالے اور دم گھونٹتے دھوئیں سے بھرے ماحول میں فیکٹریوں کے شور شرابے سے اس کی جان عاجز رہتی تھی۔ نزدیک میں کہیں پیشاب کرنے کے لیے بھی کوئی محفوظ، صاف ستھری اور آڑ والی جگہ نہیں تھی۔ سیکڑوں جھگیوں کے بعد ایک چھوٹی سی تنگ نہر تھی۔ اس کے کنارے کنارے دور دور تک پاخانوں سے پٹی پڑی جگہ میں کوڑے کے ڈھیر پر ہی حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے اور اسی نہر میں کپڑے دھونے سے لے کر غسل کرنے تک کے لیے سبھی لوگ مجبور تھے۔ صرف پینے کا پانی دور کے ایک نلکے سے لایا جاتا۔ تین

دنوں تک [illegible] نہا دھو سکی تھی نہ پاخانے جا سکی تھی۔ ایک بار بغل میں رہنے والی ور [illegible] کی ایک عورت سیتامائی کے ساتھ منہ پر آنچل رکھ کے وہ باہر گئی تھی لیکن ایک تو سڑک سے خالی قدم دھرنے بھر بھی کوئی جگہ نہ تھی دوسرے پاس پاس ہی بیٹھے کئی چھوکروں اور مردوں کے سامنے کسی آڑ کے بغیر اُسے بیٹھا نہ گیا۔ سیتامائی کو سب کے سامنے ساری اٹھا کر بے جھجک بیٹھتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی اور لگ بھگ دوڑتی ہوئی وہ اپنی جگی میں لوٹ آئی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوتا رہا کہ کچھ دنوں تک رات کی تاریکی میں یا پھر صبح ہونے سے پہلے ہی اندھیرے میں ونے اسے اپنے ساتھ حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے لے جاتا رہا اور وہ دم سادھے کسی طرح ضروریات سے فارغ ہوتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی جھجک ختم ہو گئی اور ایک آدھ بار تو دن کے اُجالے میں بھی وہ باہر جا کر ضروریات سے نمٹ آئی تھی۔

دوسرے مہینے ہی سلیم پور میں موہت جھا نے کمروں کا بندوبست کر دیا اور منورما وہاں چلی آئی تھی۔ سلیم پور کی جگی وزیر پور کی بہ نسبت کچھ صاف ہوا دار اور قدرے کشادہ تھی۔ یہاں نل بھی نزدیک ہی تھا جس میں صبح و شام دو تین گھنٹے پانی آتا تھا۔ منورما بڑے گیلن اور گھڑے میں پانی بھر کے رکھ لیتی تھی۔ پاخانے کے لیے تو یہاں بھی زیادہ تر لوگ باہر ہی جاتے تھے لیکن تھوڑی دوری پر سلبھ شوچالے کا انتظام تھا۔ ونے اور منورما فراغت کے لیے وہیں جاتے تھے۔

شروع شروع میں ونے اکثر منورما کو گھمانے پھرانے بھی لے جاتا تھا۔ لال قلعہ، جامع مسجد، انڈیا گیٹ، چڑیا گھر گھما کر چاندنی چوک میں ہلدی رام کی دوکان میں ایک بار اس نے اسے سموسے کھلائے تھے۔ لودی گارڈن میں قلفی کھلا کر محبت کے مارے جوڑوں کے بے جھجک بوس و کنار کا منظر بھی اسے دکھایا تھا۔ ان متوالوں کا کھلاپن دیکھ کر منورما کو مسرت آمیز تعجب ہوا تھا۔ ایک دن کناٹ پیلس کی رونق دکھلاتا ہوا موہن سنگھ پیلس کے انڈین کافی ہاؤس میں کٹلٹ کھلا کر کافی پلائی تھی۔ واپسی میں ایر کنڈیشنڈ پالیکا بازار کی زمین دوز دوکان سے ایک شفاف نائٹی خرید دی تھی۔

سلیم پور آنے کے تین مہینے بعد پیا پیٹ میں رہی تھی۔ اس وقت استقرار حمل کی بات یاد کر کے منورما کا دل گدگدیا اٹھا۔ بچی ہوئی چائے ختم کر کے کپ اس نے نیچے رکھا اور بچھاون پر تکیے کے سہارے آدھی لیٹ گئی۔ اولاد کے لیے ونے کے صبر و استقلال پر اسے فخر سا محسوس ہوا۔ شادی کو دس برس ہونے کو آئے اور صرف ایک چار سال کی پیا۔ دوسری اولاد کے لیے منورما کی خواہش زور مارتی تھی۔ ایک بیٹا ہو جائے بس آپریشن کرا لے گی۔ لیکن جب جب اس نے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا ونے نے مالی دشواریوں اور پیا کی پڑھائی لکھائی کی بات چھیڑ کر اس کی خواہش پر قدغن لگا دی تھی۔ ایک بار منورما نے سوچا کہ وہ ضد کر دے گی تو ونے کیسے نہیں مانے گا... مانے گا ہی۔ لیکن پھر یہاں کے حالات کا خیال آتے ہی وہ سہم گئی۔ اچانک بغل کی دراز سے ونے کی ڈائری نکال کر اس کے اوراق الٹنے لگی۔ پہلی مئی والے صفحے پر وہ دوبارہ پڑھنے لگی:

"ہم لوگوں کے گاؤں میں مختلف ذاتوں کے الگ الگ ٹولے ہوتے ہیں۔ لیکن دلی آکر ہم جن جگیوں میں رہتے ہیں وہاں برہمن، یادو، کایستھ، موسہر، بانتر، چمار سبھی ایک دوسرے میں مکمل مل کر ہم آمیز ہو گئے ہیں یہاں ہم سب نچلے طبقے کے ہو گئے ہیں۔ ہماری ذات، ہمارے دھرم، نام و نسب یہاں ہمیں جدا نہیں کرتے۔ اس کے بعد چند سطریں کاٹ دی گئی تھیں اور آخر میں لال روشنائی سے موٹے قلم سے خوبصورت حروف میں اشتہاری انداز میں لکھا ہوا تھا" دراصل ذات، دھرم، خاندان، قبیلہ، اور رسوم و قیود کی بنیاد پر طبقاتی شناخت قائم نہیں ہوتی۔ اس شناخت کی بنیاد صرف معاشی ہے۔"

منورما کی خواہش ہوئی کہ اگلے صفحے پر وہ لکھ دے۔ "یہاں سبھی دن رات پیسوں کے پیچھے جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔ اور جھگیوں میں رہنے والی ہر ایک عورت کو بدچلن اور ریکاڈ سمجھ کر اسے پٹانے یا جبر اً منہ کالا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔" لیکن کچھ سوچ کر وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ اس اُدھیڑ بن سے اس کے چہرے پر مایوسی گہرانے لگی اور اسے لگا کہ جیسے باہر کا سارا شور شرابہ اس کے کمرے میں در آیا ہے۔ یکایک بدبدانے لگی تھی وہ۔ "لکھوں گی اور ضرور لکھوں گی۔" اس فیصلے نے اس کے چہرے پر کی مایوسی کے نقوش مٹا دیے۔ اور اس نے لکھا"یہاں صبح کا نکلا شام کو لوٹ ہی آئے گا، ایسا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کس بس میں بم ہو گا اور کہاں اس کے پرخچے اڑ جائیں گے، کون کس سے ٹکرا جائے گی، کچھ پتا نہیں۔ اس مہانگری میں جتنے لوگ ہیں، اتنے خطرے ہیں، اتنے اندیشے ہیں۔ کمرے سے نکلے مرد کے بارے میں کمرے میں بیٹھی اس کی معصوم عورت بیک وقت شکوک اور اندیشے دونوں پالتی ہے اور دوسری طرف اس کا مرد جہاں جس مشین کے ساتھ گھس پس رہا ہوتا ہے وہاں یہ بھی سوچ رہا ہوتا ہے کہ پتا نہیں کمرے میں اس کی گھروالی کس کے جانگھوں تلے پس رہی ہو گی یا بھگر سے اڑا رہی ہو گی اور پتا نہیں بچے کہاں، کس حال میں ہوں گے۔"

لکھنے کے بعد منورما کو قدرے سکون کا احساس ہوا۔ ہلکی ہو کر اس نے ان سطور کو پڑھا اور یکایک کسی اور کو سنانے کی خواہش اس کے دل میں کلبلانے لگی۔ لیکن وہاں کوئی دوسرا موجود ہی نہ تھا۔ چار سال کی پیا بھی موہت جھا کی جگی میں ٹی وی دیکھنے چلی گئی تھی۔ آخر زور زور سے وہ خود پڑھنے لگی۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور جب تک وہ پوری طرح سنبھالا لیتی "بھابھی جی ہیں؟" کہتا ہوا ونے کا ممیرا بھائی سنتوش بھڑے ہوئے کواڑ کے پلّوں کو ڈھیل کر اندر جھانکنے لگا تھا۔

"ہاں ہاں!! آیئے۔" چارپائی سے نیچے اترتی منورما نے کہا۔
"پرنام بھابھی۔" کہتے ہوئے سنتوش اندر آ گیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"کشل۔ منگل کہیے۔" منورما نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"بس آپ کا آشیرواد چاہیے..... سب اُتم ہے۔"

اسی اثناء میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا اور باہر دروازے کے پاس سے ہی چلا کر بولا "پریا ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو گئی ہے۔ موہت چاچا نے لے آنے کو کہا ہے۔" یہ کہتا ہوا لڑکا پلٹے پاؤں باہر ہو گیا۔

"آپ بیٹھیے۔ میں لے کر آتی ہوں۔" سنتوش کو اتنا کہتی ہوئی منورما لڑکے کے پیچھے بھاگی۔ پریا کو گود میں لا کر بچھاون پر ایک طرف وہ سلا ہی رہی تھی کہ سنتوش نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ "ونے بھیا ابھی تک نہیں لوٹے ہیں؟"

"نہیں۔ وہ میرٹھ گئے ہیں۔ کل شام تک لوٹیں گے۔" منورما اتنا بولی ہی تھی کہ اچانک کچھ یاد کر کے اُسے پچھتاوا ہونے لگا۔ وہ طرح طرح کے اندیشوں میں گھر گئی۔

"او۔ ارے ہاں، پرسوں فون پر بات ہوئی تھی۔ دراصل مجھے ہی یاد نہیں رہا۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سنتوش کی ہنسی دیکھ کر منورما کو اپنے اندیشے صحیح جان پڑے۔ اُسے یقین ہو آیا کہ سنتوش یہ جان بوجھ کر ہی آیا ہے کہ آج ونے گھر میں نہیں ہے۔۔۔۔ ورنہ اس مہینے بھر میں کبھی وہ خیر خیریت پوچھنے کہاں آیا تھا۔ ان اندیشوں کے درمیان منورما کے دل و دماغ میں پچھلے مہینے کا ایک واقعہ کوند اٹھا۔ پچھلے مہینے اسی طرح شام کے وقت آیا تھا سنتوش۔ اس دن ونے ہاپوڑ گیا ہوا تھا۔ خیر خیریت کی رسمیات کے بعد چائے کے ساتھ ہی گھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مچھلی کا ذکر چل نکلا۔ اس پر سنتوش نے کہا تھا "بھابھی! کئی لوگوں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مچھلی میں نے کھائی ہے لیکن آپ کے ہاتھوں بنی مچھلی کا کوئی جوڑ نہیں۔ اب کیا بتاؤں۔ آپ کے ہاتھوں کی بنی مچھلی کا مزہ یاد آتا ہے تو رال ٹپکنے لگتی ہے۔"

"آپ کو ویسے ہی اچھی لگ جاتی ہے..... منورما نے بظاہر کہا تو یہی۔ لیکن اپنی تعریف سن کر دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی۔

"آج نہیں کھلاؤ گی، بھابھی؟"

"خوب کھاتے ہیں۔ لائیے خرید کر تو بنا دوں گی۔ کھائیے گا تو اپنے ہی ہاتھ سے۔"

"کیوں ؟ آپ کے ہاتھ سے نہیں کھا سکتا ہوں؟؟" مچھلی لانے جاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"بہت اڑتے ہو بچو!..... میرے ہاتھ سے تھپڑ کھا سکتے ہو۔" منورما نے ہی دل میں کہا تھا اور بظاہر مسکرا کر رہ گئی تھی۔

جس دن مچھلی گھر میں آتی منورما کے دل میں کسی جشن کی سی خوشی امڈ آتی تھی۔ اُس دن بھی وہ خوش تھی اور مسالے وغیرہ کی تیاری میں جٹ گئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں شاہ ورا سے ڈیڑھ کلو کی روہو مچھلی کے پیس بنوا کر لے آیا تھا سنتوش۔ منورما اسٹوو پر بھات چڑھا چکی تھی۔ مچھلی دھو کر مسالہ لگاتے لگاتے بھات تیار ہو چکا تھا۔ اسٹوو پر بٹلوہی چڑھا کر سنتوش کو مچھلی تلنے کے لیے کہہ کر وہ شوربے کا مسالہ پیسنے لگی تھی۔ سنتوش کو مچھلی تلنا ویسے ہی اچھا لگتا تھا اس پر مزید یہ کہ مسالہ پیستی ہوئی منورما کی بغل میں بیٹھ کر..... گویا دلی مراد بر آئی تھی۔ منورما کے جسم کی متناسب جنبش کو نگاہوں کے زاویوں میں سمو لینے میں لگا تھا سنتوش۔ بغل میں بیٹھی پریا بٹلوہی سے پہلا پیس تل کر نکلنے کے انتظار میں مچل رہی تھی۔

مچھلی تیار ہوتے ہی منورما نے سنتوش کیلئے بھوجن پروس دیا تھا۔ پریا تلی ہوئی مچھلی کے ساتھ بھات کھا کر سو گئی تھی۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سنتوش نے کہا "بھابھی! آپ بھی ساتھ کھاتیں تو بہت اچھا لگتا۔"

"دھت! آپ کھائیے..... لیٹ ہو جائے گی تو کیسے گا بس چھوٹ جائے گی ۔ میں بعد میں کھاؤں گی۔"

"بعد میں بھی تو یہی کھانا ہے بھابھی جان! ساتھ کھاؤ گی تو دونوں کو اچھا لگے گا۔" اس نے منورما کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"چھوڑیے..... لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کواڑ لگا دیتا ہوں۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔" اور اٹھ کر سنتوش نے کواڑ لگا دیا تھا۔ پھر نا نکر کے باوجود ساتھ ساتھ ایک ہی تھالی میں بٹھا لیا تھا اس نے۔ پل بھر کے لیے بھلے ہی منورما کو عجیب سا لگا تھا اور ذرا سنکوچ بھی محسوس ہوا تھا لیکن بھیتر سے غالباً اچھا ہی لگا تھا۔ شروع شروع میں اکثر ونے بھی اُسے ساتھ ہی بٹھا لیتا تھا۔ پھر گھریلو جنجال میں الجھ جانے کے بعد اُسے اس کا خیال ہی کہاں آتا تھا۔ لیکن تب بھی جب کبھی دونوں ساتھ ساتھ کھاتے تھے تو منورما کو اچھا لگتا تھا۔

کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھو کر سنتوش منورما کی ساری کا آنچل پکڑ کر منہ پونچھنے لگا تھا۔ منورما نے ایک ہاتھ سے آنچل چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن سنتوش نے نہیں چھوڑا "کیوں بھابھی! اس آنچل سے صرف بھیا کو ہی منہ پونچھنے کا حق ہے؟..... میرے جیسا دیور کوئی نہیں ہے؟"

"آپ نے بھیا کو پونچھتے دیکھا ہے؟" منورما نے حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دیکھا تو بہت کچھ نہیں ہے۔ مگر جو دیکھوں نہیں وہ جانوں بھی نہیں؟... بھیا تو بڑے بھاگیہ وان ہیں جو آپ جیسی پدمنی ناری پائی۔ میں تو آپ ہی کو دیکھ کر من کی پیاس بجھاتا ہوں۔" سنتوش کی نگاہیں منورما کی بلاؤز سے جھانکتے ہوئے گداز دائروں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ منورما کو سنتوش کی چور نگاہوں کا پتا تھا لیکن اس نے سر جھکا لیا تھا اور پیر کے ناخنوں سے

فرش کر بہنے لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ماحول پر چھائے سناٹے کو توڑنے کی غرض سے اس نے کہا تھا "پیاہ کر لیجئے۔"

"آپ جیسی دلہن کہاں مل رہی ہے جو کروں" منورما کا آنچل سنتوش کے ہاتھ میں ہی تھا۔ نگاہیں چہرے سے ڈکیت ہو گئی تھیں اور دھڑکنیں بیتاب۔

"دھت! میں کوئی سندر ہوں۔"

سنتوش کا ایک ہاتھ منورما کے کندھے پر چلا گیا اور دوسرے سے ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے کہا "آپ کو پتا نہیں کہ کتنی سندر ہیں آپ۔ سچ کہتا ہوں، جو قسم کھلالو۔ آپ جیسی کوئی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی ہے۔"

منورما ان تعریفی کلمات اور نظروں کے تیر سے اپنے بس میں نہیں رہی۔ اپنے پسندیدہ ہیرو دھرمیندر کی طرح سنتوش کے چوڑے سینے اور بانہوں کی مضبوط مچھلیوں کی گرفت میں وہ دھیرے دھیرے بے سدھ ہوتی چلی گئی اسی حال میں اس نے "چھوڑیے چھوڑیے" تو کہا تھا لیکن اس کے الفاظ میں مخالفت کی طاقت نہیں تھی اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

اچانک اسی لمحے پرپا اٹھ کر رونے لگی تھی۔ باہر دروازے پر بھی آہٹ ہوئی۔ دونوں ہڑبڑا کر تیزی سے الگ ہوئے تھے۔ دونوں کی دھڑکنوں اور دوران خون میں تیزی آگئی تھی۔ بدن پر رعشہ طاری تھا۔ دروازے پر موہت جھا تھا۔ سنتوش کچھ ہی دن پہلے گاؤں سے آیا تھا اس لیے خیر خیریت پوچھنے آیا تھا۔

موہت جھا کے ساتھ سنتوش اس کی جھگی میں چلا گیا۔ منورما پپا کے پاس آکر لیٹ گئی تھی۔ پپا پھر فوراً ہی سو گئی لیکن منورما کے سینے کی دھڑکن اور جسم کی تھرتھراہٹ ذرا بھی کم نہ ہوئی تھی۔ دل کی بے چینی سے اس کا سارا بدن کسمسانے لگا تھا۔ کافی دیر کے بعد اس نے اٹھ کر کواڑ لگایا اور تمام چھوٹے تھالی برتن بکھرے چھوڑ کر بدحواس سی پھر بستر پر لیٹ گئی۔ دیر رات تک اسے نیند نہیں آئی۔ اس کا خیال تھا کہ سنتوش بھی اس آگ میں جھلس چکا ہے اس لیے وہ ضرور آئے گا۔ منورما کی ذہنی حالت عجیب تھی۔ ایک طرف وہ سنتوش کی واپسی سے ڈر بھی رہی تھی دوسری طرف اس کی آمد کا بیقراری سے انتظار بھی کر رہی تھی۔ لیکن سنتوش نہیں آیا تھا۔ منورما رات تنہا اس آگ میں جلتی جھلستی رہی تھی۔

اس واقعے کی یاد سے منورما جب تب مضطرب ہو جاتی تھی۔ لیکن آج سنتوش کے آجانے پر اس دن کی یاد سے وہ بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں اس کی رائے پختہ تر ہو گئی تھی جہاں ہر مرد ہر عورت کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہے، طنز کرتا ہے، فقرے کستا ہے، اور کسی طرح پھنسانے کی فکر میں رہتا ہے وہاں یہ کہنا کہ "وہ نے آج نہیں آئیں گے"...... منورما کو لگا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ وہ دل ہی دل میں پچھتانے لگی۔

"اس طرح گم صم.... من مار کر کیوں بیٹھی ہو بھابھی! ایک دن بھی بھیا کی جدائی نہیں سہی جاتی؟" سنتوش مذاق کے موڈ میں تھا۔ اس کی باتوں سے منورما کا دھیان ٹوٹا۔

"دھت! پپا کو سلا رہی تھی۔" وہ اٹھ کر چائے بنانے لگی۔ چائے بناتے ہوئے اسے اس دن کے واقعے کی یاد پھر ہو آئی۔ پہلے وہ قدرے مضطرب ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اسے فکر بھی ہوئی اور تعجب بھی کہ کیوں کر کوئی عورت پرائے مرد کی محبت میں پھنس کر اپنے شوہر کو مار ڈالتی ہے.... اس وقت اسے لگا کہ سنتوش کے چوڑے سینے اور مضبوط بانہوں میں پھنس کر وہ بھی ایسا کر سکتی ہے.... لیکن یہ سوچ آتے ہی وہ اندر سے کانپ گئی۔ اسے لگا کہ سنتوش کی طرف مائل ہو کر وہ نے کی قاتل بن رہی ہے۔

اچانک منورما کو محسوس ہوا کہ سنتوش کسی سازش کے تحت آیا ہے اور اسے پھنسانے کے لیے جال پھیلائے گا۔ اسے دو دن پہلے اخبار میں چھپی ایک واقعے کی رپورٹ یاد آگئی.... خبر میں تھا کہ ایک عورت کا شوہر ایک اسٹیل فیکٹری میں نائٹ شفٹ میں کام کرتے ہوئے مارا گیا۔ حادثے کی خبر دینے کے لیے جو آدمی مرنے والے کے گھر آیا اس نے عورت کو تنہا پا کر مال و زر کا لالچ دے کر نیز طاقت کے بل پر جیسے تیسے پہلے اس سے جسمانی تعلق قائم کیا۔ اس کے بعد عشق و عاشقی کا چکر چلا کر شادی کرنے کا جھانسا دیا۔ جب عورت رضامند ہو گئی تب اسے اس کے شوہر کی موت کی اطلاع دی۔ خس کم جہان پاک.... پھر اس عورت کو فیکٹری کے مالک کے سامنے پیش کر کے معاوضے کی موٹی رقم ہتھیالی اور راتوں رات اس عورت کو ساتھ لے کر وزیر پور سے فرید آباد بھاگ گیا۔ وہاں وہ تین دن گزارنے کے بعد نوئیڈا چلا آیا۔ ایک ہفتہ یہاں بھی گزارنے کے بعد اس عورت کو ایک دلال کے ہاتھوں فروخت کر کے خود بھاگنے ہی والا تھا کہ پولس کی گرفت میں آگیا۔

اس خبر کی یاد آتے ہی منورما کی فکرمندی اور گہری ہو گئی۔ اس نے خوف کی جھرجھری لی پھر ہمت کر کے خود کو سنبھالا۔ چائے بن گئی تھی۔ کپ میں انڈیلنے تک سنتوش کے لیے اس کے دل میں نفرت بھر گئی۔ اسی انداز میں اس نے سنتوش کو کپ پکڑایا اور خود گھر سے باہر نکل گئی...

کچھ دیر بعد جب وہ گھر میں واپس آئی تو سنتوش چائے پی چکا تھا۔ منورما کے تیور بھانپ کر سنتوش دو بدا میں تھا۔ اندر سے ذرا سہا بھی۔ پھر ہمت بٹور کر اس نے اپنے تھیلے سے ایک پیکٹ نکالا۔ پیکٹ پلاسٹک کے رنگین ریپر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے پیکٹ منورما کی طرف بڑھایا۔ "یہ دیکھ لیجئے۔"

"کیا ہے؟"

"آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھ ہی لیجئے۔" سنتوش نے مسکرانے کی کوشش کی۔ منورما نے ریپر ہٹا کر کٹ کا خوبصورت ڈبہ کھولا۔ اندر ایک جوڑی بریسری۔ پینٹی، قیمتی کریم، پاؤڈر اور لپ اسٹک کے ڈبے، ڈبیا چمک رہے

تھے۔ "یہ کس کے لیے ہے۔" منورما کی آواز سخت تھی۔

"آپ کے لیے۔" مسکراتے ہوئے سنتوش نے بسکٹ کا ایک بڑا سا ڈبہ بھی بڑھایا۔ "یہ پپا کے لیے ہے۔" وہ منورما کے کندھے پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پیکٹ سنتوش کی طرح پھینکتے ہوئے بولی "لے جاؤ انھیں... اپنی بہن کو دینا.... میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ۔ میرا اپنا گھر والا مر گیا ہے کیا جو تم سے ارمان مناؤں گی.... فوراً یہاں سے نکل بھاگو۔" سنتوش نے پہلے تو اسے جبراً بس میں کر لینے کی ٹھانی لیکن منورما کا چنڈی روپ اور خطرناک تیور دیکھ کر وہ کانپ گیا اور دوسرے ہی لمحے باہر نکل گیا۔

منورما نے سنتوش کے نکلتے ہی اندر سے کواڑ بند کر لیا۔ غصے سے کانپتی ہوئی وہ چارپائی پر گر پڑی۔ بہت دیر تک دل پر سکون نہ ہو سکا۔ پورا جسم کانپتا رہا۔ پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اسی لمحے اچانک اس پیکٹ پر نظر گئی جو وہیں بغل میں پڑا تھا۔ جھپٹ کر اس نے پیکٹ کو اٹھا لیا اور کھڑی ہو گئی۔ چاہا کہ باہر پھینک آئے یا آگ لگا دے۔ اس نے ماچس کی ڈبیا اٹھائی۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر خریدار کی طرح دیکھنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ کسی میگزین میں "ہوم شاپنگ" والے اشتہار میں اس نے ایسی ہی بریسری اور پینٹی دیکھی تھی۔ اس کی نگاہ اس پر لگے اسٹیکر کی طرف گئی۔ اس پر دوکان کا نام، پتا، کوالٹی اور سائز کے ساتھ قیمت بھی لکھی تھی۔ ایک سٹ بریسری۔ پینٹی پر ۳۹۵ روپے اور دوسرے پر ۳۴۰ روپے درج تھے۔ سارے سامان وہ ہاتھ میں لیے دیوار کے سہارے پیٹھ ٹیک کر پاؤں پسار کے بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک ایک حالت میں مورت کی طرح گم صم ساکت و جامد بیٹھی رہنے کے بعد اس نے ہلکا سا چکر محسوس کیا۔ سر بھی دکھنے لگا تھا۔ دھیرے سے اٹھ کر بستر پر دراز ہو گئی اور آنکھیں موند لیں۔

لیٹی لیٹی وہ اپنے تن پر کے کپڑوں کی قیمت جوڑنے لگی تھی.....

ساری ۱۲۰ کی، پیٹی کوٹ ۳۰ کا، بلاؤز ۱۵ کا، کل..... کل.... ایک سو پینسٹھ۔ تبھی ۳۹۵ کی بریسری۔ پینٹی ہوا میں لہرائی۔ منورما کے تن کے تمام کپڑے اتار پھینکے اور ان کی جگہ خود فٹ بیٹھ کر فاتحانہ مسکرانے لگی۔ منورما نے اپنے گداز خوبصورت جسم پر نگاہ ڈالی اور کولھے مٹکا کر ناچنے لگی۔ اس کے ناچنے کی ادا اسٹرپٹیز ڈانس کرتی ڈیمی موری کی طرح تھی اس کا ایک ہاتھ پینٹی کے ویسٹ بینڈ سے کھیل رہا تھا... تبھی ایک چیخ کے ساتھ منورما کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا جسم تھر تھرا رہا تھا۔

نائٹ ڈیوٹی والے لوگ کام پر جا چکے تھے۔ رات کا سناٹا بڑھ گیا تھا۔ بغل کی جھگی میں چل رہے ٹی وی کی آواز سناٹے میں دخل در معقولات سی لگتی تھی۔ اڈلٹ چینل سے نشر ہونے والی انگریزی فلم کے درمیان کوئی سیکسی اشتہار آرہا تھا جس کی تیز آواز رات کے سناٹوں میں منورما کو صاف سنائی دے رہی تھی۔

منورما کی جان بے چین تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون جیسے نچوڑ لیا گیا ہو۔ ایک دم بے جان۔ تھکی ہاری سی ہو گئی تھی وہ۔ سامانوں کا پیکٹ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ کیا کرے۔ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس تذبذب میں وہ اور زیادہ پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ ◆ ◆

Dr RMLS High School West Bokaro - 8253/4
Dist : Hazaribagh (Bihar)

بقیہ صفحہ ۳۱ : رات ایک عارضی منزل

جبھی تو وہ ہر جملے کی ابتدا یوں کرتا ہے جیسے الاپ کے بعد گانا شروع کر رہا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں یوں ہلاتا رہتا ہے جیسے کشمیری بچہ نغمہ کر رہا ہو۔ (کشمیر لوک ناچ) وہ اپنے دکھوں کی بات کرتے کرتے اچانک تصورات اور احساسات کے دائروں میں داخل ہو کر پھر وہی داستان ماضی سنا کر آنے والے کل کی عکاسی کرتا ہے، پھر جانے کیوں وہ پل دو پل کے لئے یوں لگنے لگتا ہے گویا ویسا ہی ہوا ہے جیسا اس نے سوچا تھا۔ پانچواں آدمی یومیہ اجرت پر کام کرنے والا ایک مزدور ہے، وہ یوں چلا چلا کر بول رہا ہے جیسے اس کے جسم پر نکلے پھوڑوں کو کوئی چھری کی نوک سے کرید رہا ہو، وہ تالوں یا کرفیو سے اتنا ہی خوفزدہ ہے جتنا جلسوں جلوسوں یا مسلسل برف باری اور دریا کی طغیانی سے، وہ رو اس لئے رہا ہے کہ کل بھی اس کے بچے بھوکے سو گئے ہوں گے اور آج بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ بار بار ہر آدمی سے پوچھ رہا ہے۔ کیا آج جموں سے بسیں آئی ہوں گی۔

اس کمرے میں ہم سب کی کیفیت ایک جیسی ہے۔ کمرے میں ایک ہی کانگڑی (کانگڑی کشمیر میں عام ہوتی ہے) ہے جو نہ معلوم ان پانچوں میں کس کی ہے، ہم سب اپنے ٹھٹھرتے بدن کو گرمی دینے کے لئے باری باری تاپ لیتے ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے کھڑکیوں کے شیشوں کو صاف کر کے جھانک جھانک کر باہر بھی دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ کیا دیکھ رہے ہیں میں نہیں جانتا لیکن مجھے برف سے ڈھکے محلے اور گلیوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا ہے گویا دھرتی ماں سفید کپڑے پہن کر حاکموں سے ویسے ہی انصاف مانگ رہی ہے جیسے کسی زمانے میں مظلوم، کاغذی پیرہن زیب تن کر کے ایران کے حاکموں سے انصاف مانگا کرتے تھے۔ انصاف ملے گا یا نہیں یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن جب میں پلٹ کر ان پانچوں کو دیکھتا ہوں تب محسوس کرتا ہوں کہ جو محفوظ جگہ مجھے دن کو نہ مل سکی تھی وہ رات کی تاریکیوں میں مل گئی ہے۔

سوچ رہا ہوں کہ میں کہاں کھو گیا ہوں! یقیناً مجھے اپنی عارضی منزل بھی مل گئی ہے اور اپنے لوگ بھی۔ اب جو بھی ہوگا، اچھا یا برا، ہم سب کے ساتھ ہوگا۔ شاید وہ سوں سوں کی آوازیں جو میں رات بھر سنتا رہا ہوں وہ نوح کی صدائیں ہوں گی یا پھر...... ◆ ◆

سردار آصف



اترے سیلاب کی کہانی ہے — جھیل، دریا کی مہربانی ہے
غربتیں اس کی باوقار لگیں — آدمی کوئی خاندانی ہے
خود کو پہچانتا بھی کیسے میں — مجھ میں اب خون ہے نہ پانی ہے
کس سمندر نے اس کو بھیجا ہے — اس ہوا میں کہاں کا پانی ہے
کیسے ماں باپ حج کو جائیں گے — ایک بیٹی ابھی سیانی ہے

D.P.R.O. Offers Colony (Behind Collectorate) Binjor - 246701

عامر ریاض



چراغ بجھ گئے رقص صبا بھی ختم ہوا — سحر کے ساتھ مرا حوصلہ بھی ختم ہوا
کوئی تلاش سی رہتی تھی روز و شب ہمکو — تمہارے بعد تو یہ سلسلہ بھی ختم ہوا
کہاں ہے ذوقِ جنوں تیری منزل عرفاں — کہ پاؤں تھکنے لگے راستہ بھی ختم ہوا
عجب نہیں کہ شہیدانِ راہ راست کے بعد — غنیم معرکہ ٔ کربلا بھی ختم ہوا
نہ جانے کون سی خواہش پہ لوگ زندہ ہیں — کہ حرف و صوت کا وہ سلسلہ بھی ختم ہوا

Language Section (Urdu) Secretariat, Luchnow (U.P)

آغا سروش

ادب کیا ہے صدائے کن فکاں تخلیق کرنا ہے — الگ اپنے زمین و آسماں تخلیق کرنا۔
بیاں کرنا ہے کیا دل کی پریشانی کو غزلوں میں — یہ سمجھو آتشِ گل سے دھواں تخلیق کرنا۔
الٰہی چاند سورج سے غریبوں کا تعلق کیا — انہیں تو شام تک دو روٹیاں تخلیق کرنا۔
پس ہنگامہ ٔ مقتل مرے حلقِ بریدہ کو — ابھی اک پیکر صوت اذاں تخلیق کرنا۔
سروش اس بار تازہ فلسفہ اہل سیاست کا — بہاروں کے لہو سے گلستاں تخلیق کرنا۔

House No. 22-3-64, Yaqut Pura, Hyderabad - 500023

جاوید اشرف فیض



ذہن الجھن میں پڑا، فکر رواں ٹوٹ گئی — بے اثر شعر سے تاثیر بیاں ٹوٹ
جب ہوا میری محبت کا کوئی چاند غروب — آسماں نے کی فغاں، کاہ کشاں ٹوٹ
بارش غم سے جگر میرا ہوا پھر چھلنی — بات کیا کہئے جب منہ میں زباں ٹوٹ
مورچہ جیت کے ایسے میں دکھلا جائے — تیر و ترکش بھی ہے ناکارہ، کماں ٹوٹ
تن مرا باعث آلام جہاں چور ہوا — زندگی صورت دیوار مکاں ٹوٹ

Ghani Manzil, Anand Bhawan Lane, Raurkela - 769001

انس مسرور



جرأت ہے نہ مجرم میں نہ منصف عدیل ہے — لیکن ضمیر سب سے بڑا خود وکیل۔
موج ہوا کی طرح بہت انتشار ہے — بے رہنما گر وہ نہ بانگِ رحیل
اپنے بدن کے خوں میں نہیں میں نہا سکا — یہ مجھ میں کون ہے جو بہت ہی بخیل
ہم آنے والے کل کے لئے بھی کچھ خواب دیکھ لیں — گو عمر ہے دراز پہ وقت قلیل
ہم بیسویں صدی کے مجاہد ہیں یار لوگ! — شمشیر ہے نہ قلعہ نہ تیر و فصیل

Sakrawal, P.O.Tanda, Dist Ambedkar Nagar (U.P.)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۳)

ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں خطوط کا ایک زبردست تانتا لگ گیا ہے۔ تعریفی و تاثراتی مکاتیب کی بھیڑ میں اب طویل تجزیاتی مضامین کی بھی آمد ہورہی ہے ادبی رسائل و جرائد میں تبصرے، ہم عصر ردو ادب نمبر کی اشاعت کے اعلانات، شتہارات، خبریں، ذکر۔ گویا ان دنوں وری اردو دنیا کا ایک ہی موضوعِ گفتگو ہے ساعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر۔ شاعر کے ہر ہمارے میں موصولہ خطوں میں سے اقتباس ئے جارہے ہیں۔ صفحات محدود اور مکاتیب ے شمار۔ ابھی تو شاعر کا یہ تخلیقی تجربہ وری طرح روشن نہیں ہوا ہے تو خطوں کا یہ ال ہے۔ آئندہ کیا ہوگا، خدامعلوم۔ بہت ڑی تعداد میں جمع خطوں کو دیکھتے ہوئے ہا نہیں جاسکتا کہ ان کی اشاعت کا سلسلہ ب تک جاری رہے گا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر۔ سیمینار و مذاکروں کا سلسلہ بھی شروع رہا ہے۔ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے اور ہی باقی ہے وہ ردِ عمل بھی جو واقعی کسی ے غیرمعمولی اور مثالی کام کے لئے ہونا اہیے۔ اگر 'ہم عصر اردو ادب نمبر' واقعی ئنی بڑا ادبی کارنامہ ہے تو۔ (ادارہ)

حمد حسن ————————

بھئی۔ سچ یہ ہے کہ شاعر کے ہم عصر اردو ادب ر نے مجھے حیران کردیا، حیرانی اس پر ہوئی کہ آپ کی ری پشت میں بھی۔ سیماب اور اعجاز صدیقی کے بعد ایسی ی توانائی اور ایسی صلاحیت موجود ہے کہ اس مظلوم اور بے سہارا زبان اور اس کے ادب پر اس قدر بھرپور شمارہ تب کرسکے اور یہ شمارہ کئی ہزار صفحوں کا حال بغل میں ئے کتابت اور طباعت کے حسب معمول قسم کی غلطیوں سے پاک، مرتب کرسکے، کمال یہ نہیں ہے کہ بقول مُنّے دوسروں کے تخلیقی بچوں کو جمع کرکے آیا کی طرح بچہ گاڑی میں سوار کیا اور ٹہلانے یا بہلانے نکلے (کہ ہمارے ہاں اسی قسم کی قافلہ سازی کا نام اوارت پڑ گیا ہے) کمال یہ ہے کہ ہر صنف کے نمائندہ رجحانات اور مصنفین کے جائزے کے ساتھ ہر صنف کا جائزہ اور اس جائزہ پر اوارتی نوٹ۔ اور خیالات کے تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ۔ اب اتفاق یا اختلاف کے پہلو کو نظرانداز کردیجئے تب بھی مشقِ سخن کے ساتھ بقول حسرت یہ چکّی کی مشقت اور ایسی مسلسل اور ترتیب وار مشقت۔ یہ کام تو مدبرانہ تاریخ سازی ہوئی۔ نیاز فتح پوری اور محمد طفیل مدیر 'نقوش' سے آگے کی!

اور پھر وہ بھی اس کساد بازاری کے دور میں کہ پرانی آوازیں گونجنا بھول گئی ہیں اور نئی آوازیں ایسی بے رس ہیں کہ اکثر دامن دل کو کھینچتی ہی نہیں۔ پھر بھی اس سے بادۂ نیم رس نچوڑنا اور اسے افسردہ انگور کی سرمستی کے ساتھ پیش کرنا۔ ایں کار از تو آید۔ (باقی مصرعہ مطابق حال نہیں)

سیماب کے لئے دوام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی ان کے ناعاقبت اندیش دور نے اور اس سے زیادہ ان کی غلط بخشی نے کہ اکثر ان کے شاگرد ہی ان کی راہ میں حائل رہے اعجاز صدیقی کی راہ میں تقسیم ہند کی شورشیں حائل ہوگئیں کہ ان سے نپٹتے رہنے کے باوجود شاعر کو زندہ رکھنا معمولی کمال نہیں تھا انھوں نے یہ کمال بھی کر دکھایا (جس کا اندازہ آج ۱۹۴۷ء کے پورے ۵۲ سال بعد لگانا بہت دشوار ہے) اور اب وہ نسل بھی اٹھتی جارہی ہے یا اٹھ چکی ہے جو ان کارناموں سے واقف تھی تھوڑی بہت قدرداں بھی تھی۔ اور عین اس وقت آپ نے اعجاز صدیقی کی روایت کو زندہ تابندہ اور پائندہ رکھتے ہوئے اتنا بڑا دھاکا کردیا کہ سیماب کے پوتے بھی اس ملک ہندوستان میں کہ جو ۵۲ سال کے اردو کشی کی مہم میں سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے ہم عصر اردو ادب کا پرچہ اردو میں اور اردو ادب کے سلسلے میں مرتب کرسکتے ہیں اور اسے شایع کرسکتے ہیں گویا تاریخ پھر سے اپنے قلم کئے ہوئے ہاتھوں سے لکھ سکتے ہیں۔!!

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مبارک ہیں وہ ہاتھ اور مبارک ہے آپ کی یہ سعی کامراں کہ اوروں کی بات نہیں کہتا خود میرے سینے میں اس کاوش سے حوصلے اور اعتماد کے چراغ جل اٹھے!!

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

یوں نہیں ہے کہ شاعر کی اس یادگار ترتیب کے ہر حرف سے مجھے اتفاق ہو اور ہر سطر پر میں جان و دل نثار کروں اس کی ترتیب ہی کی نہیں مندرجات اور مشمولات سے بھی مجھے اختلاف ہے۔ ایک لطیفہ مجاز مرحوم بیان کیا کرتے تھے کہ ایک طالب علم امتحان کی تیاری کرنے میں خاصے پریشان رہتے تھے کسی نے سبب پوچھا تو بولے جس کتاب کو پڑھنے بیٹھتا ہوں مصنف سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ وہی حال میرا بھی ہے۔

اس دور کا پردردہ ہوں جو یہ دعویٰ کرے تو بے جا نہ ہوگا

بار الم اٹھایا رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

ایسے بہت سے تماشے نظر کے سامنے سے گزرے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ شہرت کی کرسی پر پستہ قد بونے بیٹھے ہیں اور ان کے قصیدہ نگار نثر و نظم والے ان کے حضور سربسجود ہیں یہ عمل کچھ آج سے نہیں کم سے کم داغ مرحوم (یا غیر مرحوم) کے زمانے سے جاری ہے۔ اور داغ کے حضور میں سجدہ ریز لوگوں میں غالب جیسے نام بھی شامل ہیں۔ ایسے ہی بہت سے نام بڑے توصیفی اور تعریفی کلمات کے ساتھ اس پورے 'شاہنامہ شاعر' میں بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ وگرنہ یکے بود رستیاں ان سب کا جائزہ لینے بیٹھوں تو آپ کی مروت تو نہیں مگر غلط بخشی کی ایک فہرست تیار ہو جائے مگر اختلاف (مخالفت نہیں) ہی تو جانِ سخن ہے۔

پڑھنہ ہو تو نیرنگ روزگار نے نیرنگ ہو کر رہ جائے۔ اس بحث وملکہ اس تذکرے کو چھوڑتا ہوں آپ نہ پہلے مدیر ہیں نہ آخری جسے غلط بخشی کا الزام دیا جائے کچھ سال بعد ہی آپ پلٹ کر دیکھیں گے تو جن ادیبوں اور ان کی نگارشات بلکہ صحیفوں کو آپ نے خود چوم کر سب سے اونچے خانے میں سجایا تھا وہ ردی کی ٹوکری کے نیچے کہیں دبے ہوئے ملیں گے۔ مگر اس سے کیا! یہ تو نفس کی آمد و شد کی طرح ادب کی آمد و شد ہے۔

اور انسان کی مجبوریوں کی ایک مجبوری یہ بھی ہوتی ہے جو عصری مجبوری کہی جاسکتی ہے اس سے دامن بچا کر چلنے کے لئے بڑی جرأت چاہیے بلکہ یوں کہئے جگر کا کلیجہ چاہیے کہ خرافات سے دامن تر نہ ہو۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

گرد اور دھول بھی زمانہ بہت اڑاتا رہتا ہے آخر جینے کے لئے سانس لینا بھی ضروری ہے اور سانس کے ساتھ یہ گرد اور دھول بھی ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچتی رہتی ہے۔ اور ہمارا حصہ بن جاتی ہے۔

خیر، یہ سب تو ہوا اختلاف سے کس کی رستگاری ہے، اگر اس کے باوجود یہی بہت بڑی نعمت ہے کہ اختلاف کے لائق تو کچھ ملا ورنہ زمانہ قدیم کے رسالے اور اس کے ضخیم نمبر موصول ہوتے ہی مدیر لنہ خط اور پھر تقاضے آتے ہیں اور ان ضخیم نمبروں میں کوئی رمق زندگی کی نہیں ملتی حد یہ ہے کہ اختلاف کرنے کے لائق بھی کچھ نہیں ملتا بس ماہ و سال کی گرد جمع ہوتی جاتی ہے کچھ بہکے ہوئے لوگ کچھ بہکی بہکی باتیں۔ جن پر کبھی ہنسی آتی تھی اب رونا آتا ہے کہ اس اچھی بھلی نسل کو کیا ہوا ہے کہاں بھٹک رہی ہے اور کس طرح ضائع ہو رہی ہے۔ آپ کے ہاں اختلاف کرنے کو کچھ ہے تو سہی۔ اور اس کچھ میں سب کچھ اردو ہی کا ہے۔ اس کا جنون، اس کا سوز، اس کا غرور، اس کا ناز۔

● D-7, Model Town, New Delhi -9

مشفق خواجہ

شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اول) دیکھ کر بے اختیار آپ کے لیے دل سے دعا نکلی۔ یہ آپ ہی کی ہمت اور حوصلہ ہے کہ ایسا شاندار نمبر شائع کیا ہے جو اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں بے مثال کارنامہ ہے۔ ابھی صرف ورق گردانی کی ہے۔ صحیح دلو تو اس وقت دوں گا جب اس کا بالاستیعاب مطالعہ کروں گا اور پھر مفصل خط لکھوں گا۔

دل شاہجہاں پوری کے نام یگانہ کا ایک خط آپ نے چھاپ دیا، باقی دونوں خط جو آپ کے پاس ہیں، وہ بھی بصورت عکس شائع کر دیجئے۔ ویسے جو خط آپ نے شائع کیا ہے، وہ اس سے پہلے "نقوش" اور "الحمرا" میں شائع ہو چکا ہے۔ عکس کی اشاعت کا یہ فائدہ ہوا کہ اقبال سے متعلق جملہ بھی سامنے آگیا۔ مذکورہ دونوں رسالوں میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔

آپ نے یگانہ کی جس مراسلاتی بحث کا ذکر کیا ہے، اسے جلد از جلد "شاعر" میں دوبارہ شائع کر دیجئے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو اس کا فوٹو اسٹیٹ مجھے عنایت کیجئے۔ آپ نے جنوری ۱۹۴۷ء کے شاعر کا حوالہ دیا ہے۔ بیدل لائبریری میں یہ شمارہ ہے مگر اس میں یہ بحث نظر نہیں آئی۔

● 3-D, 9/26, Nazimabad, Karachi - 74608 (Pak)

قاضی سلیم

ہم عصر اردو ادب نمبر جلد اول ملا۔ ساڑھے بارہ سو صفحات کی اس کتاب پر سرسری طور پر اپنے تاثرات رقم کرنا اس بڑے کام کی بے عزتی ہوگی۔ اردو کے نامور دانشوروں نے آپ کو بہت سراہا ہے سیکڑوں خطوط شائع بھی ہو گئے ہیں میں ان سب سے متفق ہوں، بعض تخلیق کاروں نے ان نکات کی نشاندہی بھی کی ہے جن کی کمی اس میں محسوس ہوئی مگر کوئی تخلیق perfect نہیں ہوتی ہمیشہ اس میں بہتری کی گنجائش یا ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی ہے جس کا ازالہ حصہ دوم میں ممکن ہے۔

بہرحال معاصر ادب کے لئے ایک تاریخی کام ہو گیا ان میں سے چند لوگ بھی بڑے ادیب اور شاعر کی حیثیت پالیں تو سمجھ لیجئے آپ بھی امر ہو گئے، اور تخلیقی کام میں ملتا ہی کیا ہے موت برحق ہے مگر اس پر فتح پانے کی ایک مبہم آرزو ہی ساری عمر اس کرب کو جھیلنے کا جواز بنتی ہے کہ شائد

آنے والوں کی سانسوں میں
دو چار سانسیں ہماری بھی شامل رہیں
اور ہم کچھ قدم بے سانس ہی چل سکیں

مجھے اتنا ضرور یقین ہے کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ مستقبل میں جو تحریریں اس عہد کے بارے میں لکھی جائیں گی ان کے لئے آپ کا یہ کارنامہ حوالوں کے لئے بنیاد بن سکے گا۔ بیماریوں کے بھنور میں ایسے پھنسا ہوں کہ زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ اس لئے مبارکباد پر اکتفا کرتا ہوں بطور اظہار تشکر -/Rs 250 کا منی آرڈر مرسل خدمت ہے۔

● 'Gulmohar' New Osmanpura, Station Road, Aurangabad - 431001

ھادی رودولوی

بہت انتظار کے بعد کوئی چیز ملے تو اس کا الگ ہی لطف ہوتا ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر پا کر جو خوشی ہوئی اسے بیان نہیں کر سکتا۔ رسائل اور ان کے نمبر تو بہت نکلتے ہیں لیکن آپ نے جن حالات میں اور جس محنت سے اس نمبر کو نکالا ہے اس طرح بہت کم نمبر نکلتے ہیں۔ آپ نے بھی اسے ہم عصر اردو ادب کی دستاویز بنا دیا ہے اور وہ سب کچھ شامل کر دیا ہے جو کوئی ہم عصر اردو ادب کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اتنے بڑے کام میں کسی کمی کا رہ جانا یا کسی کو شکایت ہونا فطری بات ہے لیکن اس سے آپ کی محنت کی قدر کم نہیں ہوتی۔ آپ نے جو کام کیا ہے وہ یاد رکھا جانے والا ہے۔

● A-2 / 7,Maurice Nagar, Delhi-110007

شفیقہ فرحت

ہم عصر اردو ادب نمبر ملا۔ محنت تم نے بہت کی۔ اتنے نام سمیٹ لینا۔ اتنا کام یکجا کر لینا نظم و نثر کے اتنے لمبے سفر کا جائزہ محاسبہ آسان نہیں۔ مبارک ہو۔ اب باقی دو حصے بھی جلد شائع کر دو کہ بات پرانی ہو جاتی ہے تو حسن ماند پڑ جاتا ہے کہیں دھول جمنے لگتی ہے۔ اس حصے کے تحقیقی ادب کا بھی یہی حال ہے۔ پھر بھی ہر جگہ خصوصاً اداروں میں اس کی پذیرائی ہوگی اور دستاویزی حیثیت حاصل ہوگی۔ چیک منسلک ہے۔

● 24, Tapti Apt, T.T.Nagar, Bhopal - 462003

عقیل عباس جعفری

شاعر کے چند پرانے نمبر میرے پاس موجود ہیں (ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام اور نثری نظم آزاد غزل نمبر وغیرہ) مگر موجودہ نمبر یقیناً ایک ایسی دستاویز ہے، جو [illegible]

وہاں طبقے کے لیے ہمیشہ ایک حوالے کا کام انجام دیتی رہے گی۔

آپ کے جریدے کا یوں تو ایک ایک صفحہ بڑے کام کا ہے مگر گوشہ مالک رام اور سوانحی لغت کے گوشے، میرے مزاج کے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ مفید محسوس ہوئے۔ گیان چند صاحب نے تذکرہ ماہ و سال پر جو مضمون سپرد قلم کیا۔ اس کی مدد سے میں نے تذکرہ ماہ و سال کے اپنے نسخے کو درست کر لیا۔ اس سے پہلے پروفیسر اسلم صاحب بھی اسی نوع کا ایک مضمون تحریر کر چکے ہیں۔ میرے پاس ان کا ایک مضمون بھی موجود ہے۔ اگر آپ کی نظر سے نہ گزرا ہو تو مطلع فرمایئے۔ تاکہ اس کی نقل آپ کو روانہ کر سکوں۔ ان دونوں مضامین کے باوجود بھی، تذکرہ ماہ و سال کی کئی اور غلطیاں میرے علم میں ہیں۔

● National Language Authorty
Pitras Bukhari Road, Sector - H/8-4
Islamabad (Pak)

حیدر طباطبائی ———

چند روز ہوئے ہم عصر اردو ادب نمبر اور ماہ نومبر ۹۰ء کا شاعر ملا۔ ہم عصر اردو نمبر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ بالکل ایسے جیسے خزانہ میرے نام بذریعہ پوسٹ آ گیا۔ ابھی ال خال ہی دیکھا ہے۔ ص ۲۲۸ پر اکبر الہ آبادی کے ذاتی خاکے کے بعد جو اکبر کے منتخب اشعار درج ہیں۔ ان کا پہلا شعر شاد عظیم آبادی کا ہے جو اکبر الہ آبادی کے نام سے درج ہے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

یہ شعر مصطفیٰ زیدی کا مختار صدیقی کے نام سے رقم ہے۔

فصیل جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں

● 10-B, Britamuia Rd, Essex, IG1, 2E
London (U.K.)

امر پرتاپ نیر ———

یہ واقعہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو حکومتوں کی سوتیلی بنے تو قیمتی اور اپنوں کی بے حسی کا لگاتار شکار رہی ہے۔ ادبی شخصیتیں معدوم ہوتی جارہی ہیں اور ادبی ماحول کا تو ایک طرح سے قحط پڑا ہوا ہے۔ گھوم پھر کر دو چار رسالوں پر نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن ماہنامہ کہلانے کے باوجود وہ ماہنامے نہیں۔ شاعر نہ صرف باقاعدگی سے چھپتا ہے بلکہ اس کے ملنے سے روح سرشار ہو جاتی ہے اور ماحول دمک اٹھتا ہے۔ آج دانشوروں کی نظروں میں یہ بہت ہی محترم ہے اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی کے زمانے سے ہی شاعر کسی گروہ کے ساتھ وابستہ یا کسی تحریک کا ناقوس نہیں رہا اور سرکار کی حاشیہ برداری اس کے مزاج میں ہی نہیں ہے۔

شاعر کے اردو ادب نمبر کے نوجوان مرتبین عزیزان نعمان۔ افتخار امام صدیقی۔ حامد اقبال اور کمال اختر نے اس کی تزئین و ترتیب میں جتنی عرق ریزی کی ہے اور جس تندہی سے اپنے شب و روز بسر کیے ہیں وہ میرے ذاتی علم میں ہیں۔ اس نے رسالے کی افادیت اور اہمیت کو سربلند کر دیا ہے۔ یہ کہنا بیجا ستائش نہ ہو گی کہ یہ نمبر کسی محنت کا نہیں، تپ۔ تیاگ اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ یہ اک دل پذیر۔ دلاویز مرقعہ ہے جس میں ہر دور کی ہر ادبی شخصیت کے نقوش ابھر رہے ہیں۔ ۱۲۵۰ صفحات پر پھیلے ہوئے اس ضخیم نمبر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مرتبین نے کتنی صبحیں کتنی شامیں اس میں صرف کی ہوں گی کہ کوہ کنی سے جوئے شیر لانا آسان نہیں ہوتا۔

نو آموز اور نو مشق شعراء اور افسانہ نگاروں کی بھرمار کے باوجود اس نمبر میں واقعات ہیں، حالات ہیں، مکتوبات ہیں، انکشافات ہیں، سوانح ہے۔ معرکے ہیں۔ شعر ہے۔ ادب ہے۔ یہ آگرہ اسکول سے لے کر آج تک کے آغاز و انجام کی شگفتہ کہانیاں لئے ہوئے ہے۔ ذرا غور تو فرمائیں۔ اس بزم میں بانو قدسیہ۔ جوگندر پال، سریندر پرکاش، اوم کرشن راحت، جیلانی بانو، زاہدہ حنا کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی، اختر سعید خاں، اسلم بدر زبیری، تسنیم عابدی، جوہر قاہوری، حسن شکیل بھی جلوہ گر ہیں۔

میرا یقین ہے کہ اس نمبر کو ہر اک صاحب ذوق و شوق عزیز از جان رکھے گا اس کا مطالعہ نہ کرنا اک بہت بڑی ادبی نعمت کو کھو دینا ہوگا۔

● 5-A, Major Shivdev Singh Marg, Civil Lines, Ludhiyana - 141001 (Punjab)

مختصر مختصر...

● بہت انتظار کے بعد شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر ملا۔ واقعی ایک یادگار چیز ہو گئی۔ ابھی تو اس کو پڑھنے میں کئی دن لگیں گے۔ آل احمد سرور (علی گڑھ)

● اردو ادب اور اردو زبان کو ہمیشہ آپ پر ناز رہے گا کہ آپ نے اتنا شاندار، جامع اور معیاری ہم عصر اردو ادب نمبر شائع کیا ہے کہ آپ کے دشمن تک آپ کی محنت، لگن اور تخیل کی داد دیں گے۔ جتندر بلو (لندن)

● واقعی آپ نے ایک کوہ گراں سر کیا ہے۔
گلزار جاوید (مدیر: چہار سو، پاکستان)

● خاص نمبر کو تحقیقی نقطۂ نظر سے زیادہ سائنٹفک بنایا جاتا تو یہ اور بھی بہتر ہوتا تاہم اب بھی یہ ایک ضخیم یادگاری نمبر بن گیا ہے۔ شاہین مفتی (پاکستان)

● آپ نے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ نے ایک تاریخ ادب شائع کر دی ہے۔ آپ نے ایک شاہکار تخلیق کیا ہے۔ آپ نے ایک ایسی شمع روشن کر دی ہے جس کی روشنی سے بہت لوگ استفادہ کریں گے۔
قمر نقوی (امریکہ)

● ہم عصر اردو ادب نمبر کے ہر باب میں آپ نے جو اپنے تبصروں سے آرائش کی ہے وہ بھی ادبی کارنامہ ہے۔ میں نے سب سے پہلے آپ کے ہی تبصرے پڑھے اکثر آپ نے کافی متاثر کیا۔ منظر، پس منظر، جملوں کے تیکھے اور چٹخارے دار نقوش معنوی آہنگ کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے ہیں۔
شمیم حیدر (دوحہ قطر)

بقیہ صفحہ ۴۴ : نقد و نظر

نے بھی رول ادا کیا۔

داستانوں کے تجزیاتی مطالعے سے لیکر ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے اور اس سے ہندوستانیوں کے طرز زندگی اور انداز فکر و نظر بدلنے تک اور اس کا اردو ادب خصوصاً افسانوں اور کہانیوں پر اثر مرتب ہونے سے متعلق فیاض رفعت نے سلیس اور دلچسپ اسلوب میں اپنی کاوش تحریر کی ہے۔

——— (محافظ حیدر)

ضخامت: ۱۱۲ صفحات ○ قیمت: ساٹھ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۷ء ○ ناشر: تخلیق کار پبلی شرز، ۱۹۷۷، کوچہ دکنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۲

شاہ حسین نہری

زندگی دشوار ہے تو شاہ جی بھی کیا کریں گے
ہم یہاں جیسا کریں گے آخرش ویسا بھریں گے

سوچتے ہیں جان جب دیں گے تو محفل سے مریں گے
لینے والے کو نہ ہو منظور تو پھر کیا کریں گے

موت کو بھولیں ، امانت زندگی کو جو نہ جانیں
ہو نہ کیوں گزران ان کی تنگ ، جیتے جی مریں گے

آتش سیر بدن کو لطف سیر باغ سمجھیں
آج تو خوش ہیں بہت ، کل کو مگر اس سے ڈریں گے

راہ میں اس کی مریں تو موت کیا مارے گی ہم کو
بس یہی جینا ہے جینا ، شاہ اس پر ہم مریں گے

O Lecturer, Dept of urdu, Balbhim College, Beed - 431122 (M.S.)

حلیم صابر

آپ نے سمجھا غلط یا ہم نے سمجھایا غلط
کچھ بھی ہو لیکن نتیجہ سامنے آیا غلط

آنکھ والوں کو بھی دیکھا کان والوں سے ملے
دیکھنے سننے کا جو انداز تھا پایا غلط

دشمنی اپنے اصولوں پر سدا قائم رہی
دوستی ہی نے ہمیشہ طرز اپنایا غلط

عمر میں وہ مجھ سے بڑے کب مانتے میری صلاح
مشورہ بھیجا صحیح ان کو نظر آیا غلط

ہے یہ بازار سیاست کون کس کو کیا کہے
آپ کی پونجی غلط میرا بھی سرمایہ غلط

O 2, Chamru Singh Lane, Calcutta - 700011

نیر واحدی

گلی کوچے ، نگہباں ، شہر دروازہ بناتا ہے
محل کاغذ کا ہے تیار شہزادہ بناتا ہے

بہت چالاک ہے دشمن محاذ آرائی سے پہلے
کوئی ناقابل تسخیر منصوبہ بناتا ہے

محل سازی میں رکھتی ہے حفاظت کی بھی اک صورت
ہر اک دیوار میں اک چور دروازہ بناتا ہے

مناظر پیش کرنے ہیں کسی فرضی لڑائی کے
سپاہی ، اسلحے ، میدان اور راجا بناتا ہے

ہجوم بیکراں کو شہر کے میں تکتا رہتا ہوں
کسی فرضی کہانی کے لئے خاکہ بناتا ہے

O Hakim Itwari Lane, Bania Pokhar, Gaya - 823001 (Bihar)

اظہار سلیم

تجسس کے سفر میں بادباں پھیلے ہوئے ہیں
صدف گوہر سمندر درمیاں پھیلے ہوئے ہیں

ہوا کی سازشوں سے باخبر رہنا ضروری ہے
بدلتے موسموں کے امتحاں پھیلے ہوئے ہیں

شکستہ دل شکستہ پر سمیٹوں میں کہاں تک
دعا کی نارسائی کے نشاں پھیلے ہوئے ہیں

میں ششدر ہوں محیط بیکراں باطن سفر میں
نظر کے زاویوں میں آسماں پھیلے ہوئے ہیں

کھلیں کب مجھ پہ اسرار صدا میں منتظر ہوں
خموشی میں کئی آتش فشاں پھیلے ہوئے ہیں

O 807, M.H.B. Colony, Malegaon - 423203 (M.S.)

نادر اسلوبی

یہ حرف و لفظ سنور کر کہاں سے آئے ہیں
جو تو نہیں تو سخنور کہاں سے آئے ہیں

یہ اور بات کہ میں نے کہے ہیں شعر مگر
ترے خیال سے بہتر کہاں سے آئے ہیں

ہماری راتیں گزرتی ہیں آرزو کرتے
یہ شہر دل میں ستمگر کہاں سے آئے ہیں

ہمارے شعر نے پائی ہے چاندنی ان سے
حسین چاند سے پیکر کہاں سے آئے ہیں

مری بیاض سے شاید کسی نے پڑھ لی غزل
وگرنہ شعر یہ باہر کہاں سے آئے ہیں

O C/o Show World, Chow Rasta, Hanamkanda, Dist Wrangal - 506011 (A.P.)

نقــد و نظـــــر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

جنگ اور امن

طالسطائی / شاہد حمید

ہندوستان میں عالمی فکشن کے ترجموں کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی ہے۔ لیکن اس کی تلافی پاکستان میں ہو رہی ہے۔ وہاں گذشتہ چند برسوں میں بعض بہت اہم ترجمے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ فی الحال ایک ترجمے کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

لاہور سے محمد سلیم الرحمٰن نے اپنے خط (۲۵ر نومبر ۱۹۹۴ء) میں مجھے بتایا تھا:

"شاہد حمید صاحب واپس آگئے ہیں اور ابھی ابھی ان کا "جنگ اور امن" کا ترجمہ شائع ہوا ہے یہ ترجمہ کسی نے کمیشن نہیں کیا تھا۔ اپنے شوق سے کیا ہے۔ اس کا معاوضہ بھی انھیں نہیں ملا۔ داد البتہ مل جائے گی، وہ بھی گنے چنے حضرات کی طرف سے۔"

کچھ عرصے بعد اجمل کمال کی وساطت سے دو جلدوں (۹۷۰+۸۱۶ صفحات) میں یہ ترجمہ مجھے مل گیا۔ میں نے مترجم شاہد حمید کو خط لکھا اور معاوضے کے معاملے پر افسوس ظاہر کیا۔ ان کا جواب آیا:

"رہا معاوضہ، یہ مسئلہ میرا ہی نہیں ہے، برصغیر کے چوٹی کے مصنفین کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ (محمد حسین آزاد کو اپنی بے مثال تحریروں پر کیا ملا ہو گا؟) اور اصل قصور اتنا ناشرین کا نہیں جتنا نظام کا ہے۔ یہاں بڑے طباعتی ادارے.. جو ایک دو ہیں... ان کی دلچسپیاں کچھ اور ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بے بضاعت ناشرین ہیں۔ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ چار پانچ سو کتاب چھاپ کر خود کیا کھائے گا اور مصنف کو کیا کھلائے گا۔ نزلہ ہمیشہ اسی پر گرتا ہے جو receiving end پر ہوتا ہے، چنانچہ مصنف اکثر اپنے حق سے محروم رہتا ہے۔ میں نے جب بھی کوئی چھوٹا موٹا کام کیا، کبھی صلے کی توقع پر نہیں کیا۔ جب میں نے "وار اینڈ پیس" کا ترجمہ شروع کیا (میں نے یہ کام کیوں کیا، میرے پاس اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں۔ بس یوں سمجھیں کہ ایک قسم کا Obsession تھا) مجھے معلوم تھا کہ مالی منفعت تو دور کی بات ہے، الٹا متعلقہ کتابیں اور دوسرا مواد اکٹھا کرنے کے لیے اپنی گرہ سے خرچ کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی تھا، اور وہ تھا ترجمے کو چھاپنے کا۔ جس ناشر سے بھی بات کی اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا، "نا بابا، نا۔ اتنی ضخیم کتاب اور وہ بھی ترجمہ (ترجمہ اس ملک میں گھٹیا کام سمجھا جاتا ہے) ہم اپنا روپیہ ڈبو نہیں سکتے۔" میرے ناشر کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ اس نے درسی کتابوں کے ناشر ہونے کے باوجود اسے چھاپنے کی ہامی بھر لی۔ (اگر کتاب بک گئی تو شاید کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی دے ہی دے گا....) لیکن اس شرط پر کہ طباعت کی ساری ذمہ داری مجھے ہی اٹھانا ہو گی، چنانچہ کمپوزر کے پیچھے میں ہی بھاگتا رہا، پروف بھی خود ہی (چار مرتبہ) پڑھتا رہا، اپنی نگرانی میں غلطیاں درست کراتا رہا، اور آخر میں پریس کے بھی چکر کاٹتا رہا۔ اور ملا کیا؟.... باذوق اور باعلم اصحاب کی تحسین۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے یہی کافی ہے۔" (۸ر مئی ۱۹۹۵ء)

ایک طرف اردو میں ترجموں اور مترجموں کے یہ مسائل ہیں، دوسری طرف امریکا میں محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" کا انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا ہے۔ پروفیسر فرانسس پریچٹ کے کیے ہوئے اس ترجمے پر نظرثانی کرنے کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کو دو (یا شاید تین) مرتبہ امریکا بلا کر کئی مہینے تک مہمان رکھا گیا۔ ایک دوست کا اندازہ ہے کہ "آبِ حیات" کے اس ترجمے پر ستر لاکھ روپے سے زیادہ صرف ہوئے ہیں۔

"جنگ اور امن" کے ترجمے کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ پہلے طالسطائی (۲۸ر اگست ۱۸۲۸ء تا ۷ر نومبر ۱۹۱۰ء) کی حیات کا اجمالی خاکہ ہے پھر سہیل احمد خاں نے اس کے ناول کا عمدہ تعارف کرایا ہے۔ "معروضات و تصریحات" کے عنوان سے مترجم شاہد حمید نے اصل ناول کے تصنیفی مراحل، اس کے مختلف ایڈیشنوں اور اس کے پاس معلوم انگریزی ترجموں کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی ہے۔ اس کے بعد روس کی تاریخ کا مختصر جائزہ ہے جس کے بغیر "جنگ اور امن" کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہوتا۔ اسی طرح "روسی مذہب" "خطابات"، "ہوزا"، "فرانسیسی کا استعمال"، "روسی تقویم"، "روسی فاصلے" کے زیرِ عنوان متعلقہ معلومات، فوج، مذہب، موسیقی وغیرہ سے متعلق اصطلاحوں کی فرہنگ، ناول کے اہم کرداروں کے باہمی رشتوں وغیرہ کی صراحت، روسی ناموں اور ان کے تلفظ کی تشریح، چیدہ چیدہ واقعات کی تاریخیں، چھ وضاحتی نقشے (جن میں ایک خود طالسطائی کا بنایا ہوا ہے) یہ سب کم و بیش ڈیڑھ سو صفحوں میں آیا ہے اور ترجمے کے متن کے ساتھ بھی ضروری حواشی دیے گئے ہیں۔ اس طرح شاہد حمید نے محض ناول کے ترجمے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اس کو سمجھنے کے ضروری لوازم بھی مہیا کر دیے ہیں۔ ان متعلقات کی تیاری خود ایک مستقل اور جاں کاہی کا کام ہے اور اس کی ہمت وہی کر سکتا تھا جو "جنگ اور امن" کا ترجمہ کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔

روسی حکومت کے زیرِ اہتمام طالسطائی کی "آنا کارینا" اور افسانوں وغیرہ کے ترجمے کرا کے شائع کیے گئے ہیں۔ یہ اچھے ترجمے ہیں لیکن "جنگ اور امن" کا ترجمہ یقیناً بہتر ہے جس کا سبب میر کے لفظوں میں یہ سمجھا جا سکتا ہے "کہ کسو دل کی لاگ اودھر ہے" شاہد حمید نے یہ ترجمہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لیکن ذمہ داری کے بھرپور احساس کے ساتھ کیا ہے۔ ترجمے کی زبان پر ان کی غیر معمولی محنت کا اندازہ "جنگ اور امن" کے کسی بھی صفحے کو پڑھ کر کیا جا سکتا ہے، خصوصاً جن لوگوں کو خود بھی اونچی تحریروں کے ترجمے کا کچھ تجربہ ہو وہ شاہد حمید کے اس کارنامے پر حیرت آمیز داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ "جنگ

اور امن" کرداروں، واقعوں، صورتحالوں، منظروں اور مکالموں کا موجیں مارتا ہوا سمندر ہے اور اس کے ترجمے کے لیے موجیں مارتے ہوئے سمندر ہی کی سی زبان درکار ہے۔ شاہد حمید نے اس زبان کو پالیا ہے اور ان کا ترجمہ یہ خوشگوار احساس دلاتا ہے کہ محنت کی جائے تو اردو زبان میں ہر قسم کے مطالب ادا ہو سکتے ہیں۔

کسی ادبی شاہکار کا اردو میں ترجمہ ایک ضروری فرض کا ادا ہو جانا ہے۔ کسی ضروری فرض کا ادا ہونا خوشی کی بات نہ ہو جس پر فخر سے سر اونچا کرلیا جائے لیکن اس فرض کا ادا نہ ہونا شرم سے سر جھکا لینے والی بات ضرور ہے۔ "جنگ اور امن" کا ترجمہ بھی ایک ضروری فرض تھا لیکن یہ اتنا مشکل فرض تھا کہ اس کو ادا کرنے والا یقیناً فخر سے سر اونچا کر سکتا ہے۔ شاہد حمید نے یہ ترجمہ بڑے بڑے دعووں کے بغیر اور خالص علمی کسر نفسی کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن ان کا یہ کارنامہ انھیں اردو کے بڑے مترجموں میں جگہ دلانے اور اردو دنیا کو ان کا شکر گزار بنانے کے لیے کافی ہے۔

ٹالسٹائی کے ناول اور شاہد حمید کے ترجمے سے کچھ روشناسی کے لیے آخر میں یہ چند اقتباس دیکھیے:

(۱) "جب سے ہوش آیا، وہ اپنے ہاتھوں پر جھکا زمین پر بیٹھا تھا۔ گولے بارود کا چھکڑا جو اس کے پاس کھڑا تھا، غائب ہو چکا تھا۔ سوختہ گھاس پر محض چند جلتے ہوئے سبز تختے اور چیتھڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک گھوڑا چھکڑے کے بچے کھچے ٹکڑے گھسیٹتا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا، جبکہ دوسرا بولو کی طرح زمین پر لیٹا ہوا تھا اور ایسی فلک شگاف اور لمبی چیخیں بلند کر رہا تھا کہ برداشت نہیں ہوتی تھیں۔"

(ص ۱۱۸۱)

(۲) "پرنس پہلے کی طرح پلنگ پر لیٹا ہوا تھا لیکن اس کے پرسکون چہرے کی درشتی نے پرنسس ماریا کے پاؤں دہلیز ہی پر روک دیے۔ "نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" پرنسس ماریا نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ پلنگ کے قریب پہنچی اور جس خوف و دہشت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ اس کے رخساروں پر ثبت کر دیے، لیکن یک لخت ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے سامنے پلنگ پر جو کچھ پڑا تھا وہ انتہائی وحشت ناک اور مہیب تھا کہ اس کے سامنے محبت اور شفقت کے جذبات جو وہ اس کے لیے اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی، آناً فاناً کافور ہو گئے۔ "نہیں، اب وہ نہیں رہے۔ وہ اب نہیں رہے بلکہ اس جگہ، جہاں وہ دراز تھے، کوئی اجنبی، دہشت ناک، لرزہ انگیز، ڈراونی، مہیب، پراسرار چیز پڑی ہے۔" پرنسس ماریا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔" (ص ۱۰۷۸)

(۳) "وہ صبح کے وقت عام طور پر جس طرح ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنا کرتی تھی، اب وہ اس میں ملبوس نہیں تھی، بلکہ اب اس نے اپنا بہترین ڈریس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے بال بنانے میں خاصا وقت صرف کیا تھا اور انھیں خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے چہرے پر زندہ دلی اور شگفتگی جھلک رہی تھی۔ تاہم وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے اور پیلے خدوخال کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ اگرچہ وہ اسی انداز سے بنی ٹھنی تھی جس طرح بن ٹھن کر وہ پیٹرز برگ کے اعلیٰ طبقوں میں گھوما کرتی تھی لیکن اس کی بے نوازی اس کے کسی کام نہ آئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنی کشش کھو چکی ہے۔" (ص ۵۳ ـ ۳۵۳)

(۴) "میں تربت کی جو کتاب تمہیں بھیج رہی ہوں اسے ضرور پڑھنا۔ آج کل یہاں ہر شخص اس کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس میں بعض باتیں مشکل ہیں اور وہ کم زور ذہنوں کی دسترس میں نہیں آسکتیں، پھر بھی یہ تصنیف بہت عمدہ اور قابل ستائش ہے۔ اس کے پڑھنے سے روح کو شانتی ملتی ہے اور وہ بلندیوں پر پرواز کرنے لگتی ہے۔" (ص ۱۸۴)

(۵) "میری پیاری ینکی، میں تمہار ہزار بار شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے مجھے وہ کتاب بھیجی جو ماسکو میں اتنی قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہے کہ ہر شخص اس کا شیفتہ ہو چکا ہے۔ چونکہ تم نے خود ہی مجھے بتا دیا ہے کہ اس میں اگرچہ بعض بہت اچھی باتیں ہیں لیکن اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ وہ کمزور ذہنوں کی دسترس میں نہیں آسکتیں، میری ناقص رائے میں ایک ایسی کتاب پر، جو ناقابل فہم ہو اور چنانچہ اس سے حاصل بھی کچھ نہ کیا جا سکتا ہو، وقت ضائع کرنا فضول ہے۔" (ص ۱۸۵)

(نیر مسعود)

ضخامت: ۱۷۸۶ صفحات ○ قیمت: چھ سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۳ ○ ناشر: پولیمر پبلی کیشنز، لاہور (پاکستان)

اردو افسانے کا پس منظر
مشرق و مغرب کے حوالے سے

فیاض رفعت

فیاض رفعت کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہے۔ افسانہ نگاری اور شاعری کے دشت کی سیاحی سے رخ بدل کر مقالہ نگاری کی طرف بھی نکل آئے ہیں جس کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ اردو کی داستان گوئی اور قصہ نگاری کا سراغ یونان سے عرب، عرب سے ایران اور ایران سے ہندوستان تک بڑی عرق ریزی سے لگایا ہے۔ ہندوستان میں پہلے ہی سے سنسکرت تحریروں میں رزم و رومان کے نقوش تو موجود ہی تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں ہندوستانیوں اور نو وارد مسلمانوں کے آپسی سماجی اختلاط سے ایک نئی زبان ظہور پذیر ہونے لگی جو اولاً محض بول چال کی زبان تھی اور جو علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی فوجوں کے ذریعے چودھویں صدی عیسوی میں دکن پہنچی جہاں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، ترکی، فارسی اور عربی عناصر کے ساتھ اس میں دکنی بھی شامل ہو گئی جس سے اس کا ایک روپ نکھر آیا جسے ہندی بھی کہتے تھے اور دکنی بھی۔ لیکن یہ ناگری لپی سے پہچانی جانے والی ہندی نہیں تھی بلکہ ہندوستان یا ہند میں بولی جانے والی زبان کے ناتے سے ہندی کہلائی جو بہت آگے چل کر ہندوی، ریختہ اور اردو سے موسوم ہوئی۔ چودھویں سے اٹھارویں صدی تک نظم و نثر کی سیکڑوں کتابیں اور رسالے تحریر ہوئے اس طرح یہ زمانہ اردو نثر کا پہلا دور قرار پاتا ہے جس میں ایک منظوم فارسی قصے "حسن و دل" کا ملا وجہی نے دکنی اردو میں آزاد ترجمہ اپنی لیاقت اور استعداد سے اس قدر اعلا پائے کا کیا کہ اس پر طبع زاد کا گمان ہونے لگا۔ ڈاکٹر زور اسے اردو کا پہلا ناول قرار دیتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں اردو شمالی ہند میں انگڑائیاں لیتی ہے اور انیسویں صدی میں اپنے دور شباب میں داخل ہوتی ہے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر پر بھی بہار آجاتی ہے۔ قصے کہانیوں کی کتابیں چھپنے لگتی ہیں جن میں سے بیشتر کا ماخذ سنسکرت اور فارسی کا افسانوی ادب ہے۔ اس ضمن میں فورٹ ولیم کالج نے اردو ترجموں اور طباعت و اشاعت کے ذریعے قابل قدر خدمات انجام دیں اور ایک

[باقی صفحہ ۴۱ پر دیکھیے]

بکتو بات

جنوری فروری ۹۱

ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت کے بعد شاعر کے عام شماروں کے درمیان عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب خصوصی شمارہ قارئینِ شاعر کے لئے غیرمتوقع ثابت ہوا اور سب کو حیران کرگیا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر اور عام شماروں کے ساتھ مذکورہ خصوصی شمارے پر بھی خطوں کا گویا سیلاب آگیا ہے۔ یہ ایک ادھورا، سرسری اور نامکمل شمارہ ایک مختلف و منفرد شمارہ بن گیا۔ مسرت ہورہی ہے کہ پوری اردو دنیا میں ہم عصر اردو ادب نمبر کی زبردست پذیرائی کے ساتھ خواتین پر خصوصی شمارے کی بھی گونج ہے۔ موصولہ خطوں میں سے چند ایک اس شمارے میں دئے جارہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو میں خواتین کا ادب موضوعِ بحث بنے۔ مغربی اصطلاحوں سے الگ تانیثی ادب، تانیثی تنقید کو اردو ادب کی روایت کے تناظر میں دیکھا جائے تاکہ اس موضوع پر شاعر کے کچھ اور خصوصی شمارے یا خاص نمبر ایک تاریخی ادبی دستاویز بن سکے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر۔ ۲ سے قبل شاعر کے کچھ اور خصوصی شمارے اشاعت پذیر ہوں گے۔ انتظار کیجئے۔ (ادارہ)

گلنار آفریں ——————

عالمی اردو قلمکار خواتین کا شمارہ دیکھا تو بہت خوشی ہوئی کہ یہ تو آپ نے ہم خواتین کے لئے بہت بڑا کام سرانجام دے ڈالا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے سرسری طور پر پڑھا بھی ہے۔ خاص طور پر آپ کا مضمون "خواتین کے ساتھ پہلے بھی بے انصافیاں ہوئیں۔ ہونے کو آج بھی ہورہی ہیں۔ مگر آپ جیسی ہستیاں بھی تو ہیں جو انصاف کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں، آپ بھی تو اسی دنیا کے مرد ہیں" جو بنا کسی لالچ و مطلب کے ہمیں اپنا حق دلانا چاہتے ہیں۔ آپ کی محنت آپ کی لگن اور آپ کا خلوص اس رسالے کے ہر ورق پر نظر آرہا ہے۔ دراصل یہاں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہوں گی کہ میں اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہوں کہ بہرحال باہر یعنی گھر سے باہر کی دنیا مردوں کی ہے، اور نظامِ کائنات کو یونہی شاید ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت ساری دلیلیں دی جاسکتی ہیں۔ مگر بات بہت طویل ہو جائے گی۔ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ ہم اپنے اپنے حدود میں رہ کر بھی بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ رہا سوال ذہانت اور صلاحیت رکھنے والی خواتین کا تو۔ ہم اسے یوں ترتیب دے سکتے ہیں کہ "کچھ ذہین اور باصلاحیت خواتین قلمکار" کو ایسے بڑے ادیبوں کی سرپرستی میسر آجاتی ہے جو ان کو ادب کے افق پر جگمگا دیتے ہیں اور کچھ جو ان کی دسترس سے دور رہتی ہے، وہ اپنے آپ بنا سہارے کے گرتی پڑتی ادبی سفر پر تنے تنہا چلتی رہتی ہیں۔ یقیناً یہ سفر طویل بھی ہوتا ہے اور تھکا دینے والا بھی ان کے راستے میں جو دشواریاں بھی آتی ہیں ان کا خود انھیں سامنا کرنا پڑتا ہے کوئی ان کے راستے میں پھول نہیں بچھاتا۔ بلکہ ان کے راستے میں تو کانٹوں کا ڈھیر لگادیا جاتا ہے۔ کامیابی کے پھول تو ان قلمکار خواتین کے راستوں میں بچھائے جاتے ہیں جن کے سروں پر بڑے ادیبوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ راستے کے تمام کانٹے پتھر سب صاف کردئے جاتے ہیں اور قدم اٹھتا بھی نہیں ہے کہ کامیابیاں قدم چومنے لگتی ہیں۔ زندگی کا سفر، اس کی مشکلات کیا ہوتی ہیں ناکامی اور محرومی کیا ہوتی ہے۔ احساس کی شدت کی تپش کیسے کب محسوس ہوتی ہے۔ ایک حساس دل پر کیا بیت جاتی ہے جب زندگی کے حادثات کو سمیٹ کر انسان جینا چاہتا ہے، اور وہ لمحے کیسے کربناک ہوتے ہیں جب جسم بے جان، آنکھیں نیند سے عاری اور خواب اس کے سامنے بکھرے ہوتے ہیں، مگر یہ سارے تجربات ان کی شاعری میں محسوس ہوتے ہیں جنھیں ایسے تجربات سے کبھی گزرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا ہوتا ہے۔ مگر ایسی خواتین بھی موجود ہیں جو ایسے تجربات سے گزر رہی ہیں اور لکھ رہی ہیں وہی کچھ جو سہہ رہی ہیں۔ اور اپنے اطراف ہونے والی ناانصافیوں اور سازشوں کے خلاف جنگ بھی کررہی ہیں۔ کیونکہ وہ کسی کی مرہونِ منت نہیں ہیں۔ یہ خواتین قلمکار اپنی تمام تر ہمتوں کے ساتھ اس ادبی سفر پر تنے تنہا چلی جارہی ہیں اور اپنے ہونے کا احساس دلانے میں مصروف ہیں۔ مجھے معلوم ہے یہ بھی کہ یہ قلمکار خواتین شاید بہت دور تک نہ جاسکیں، مگر جہاں تک بھی جاسکتی ہیں خود اپنے قدموں پر چل کر جارہی ہیں۔ شاید کہ کوئی ایک بھی باہمت قلمکار خاتون اردو ادب کی تاریخ کے اوراق پر اپنا نام درج کرانے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر ایسا ہوگیا تو۔ اس کا اپنا اور صرف اپنا نام وہاں ہوگا۔ آپ کی ہمت کو سلام عقیدت پیش کرتی ہوں۔

●B-117, Block - 13D, Gulshan-e iqbal, Karachi - (Pak)

عطیہ خان ——————

"شاعر" کا خصوصی نمبر "عالمی اردو قلمکار خواتین کا ادب" موصول ہوا، شکریہ۔ خواتین قلمکاروں کے متعلق یہ کام بڑا قابلِ قدر ہے۔ خواتین کی صلاحیتوں کو ہمیشہ کچلا گیا ہے۔ زبردستی انھیں مردوں کا زیرِ نگر اور محکوم بناکر انھیں اپنی قدرتی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع سے محروم رکھا گیا ہے۔

اس شمارے کے دوسرے حصے کے اداریے میں آپ نے لکھا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں خواتین نے غیر معمولی شعروادب کی تخلیق کی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں عورتوں کیلئے مساوی حقوق حاصل کرنے کی تحریکوں کی کامیابی کی وجہ سے عورتوں نے زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو کر اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروالیا ہے۔ لیکن اب بھی تنگ نظر حضرات خواتین کی فطری صلاحیتوں کو ماننے کیلئے تیار نہیں اور اسی لئے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے آج بھی خواتین کی تخلیقات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عورتوں کو ناقص العقل سمجھنے والی ذہنیت اب بھی کارفرما ہے جو یہ تسلیم کرنے میں مانع ہوتی ہے کہ عورتیں بھی ذہین و سمجھدار اور تخلیقی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ آپ نے عورتوں کی تخلیقی کاوشوں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ یہ

بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

● 52-Brent Way, London N3 1 Ap (U.K.)

شبنم عشائی ——

شاعر کے خصوصی شمارے کے لئے مبارکباد۔ یہ شمارہ شائع کر کے آپ نے عورت کو وہ مقام دیا ہے جو عورت کو لے کر تنظیمیں بنانے والے اور سیمینار کرنے والے نہیں دے سکتے۔ ریاض صدیقی کا 'نسائی ادب کا مسئلہ' شائع کر کے آپ نے خواتین کو خاصے کی چیز مہیا کرائی ہے۔ آپ کے ذوقِ انتخاب کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

● Ashai Manzil, Tapar Patan - 193121 (Kashmir)

ملکہ نسیم ——

عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب خصوصی شمارے میں عذرا پروین کی نظم 'شہری سرکس' بہت خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ آج کی ہر عورت اسی سرکس کا کردار جاری ہے۔ یہ بات اور ہے کہ کوئی تنی ہوئی رسی سے بخوبی گزر جاتی ہے اور کوئی رسی ٹوٹنے یا چھوٹنے سے جاں بحق ہو جاتی ہے۔ عذرا پروین قابل مبارکباد ہیں اپنے خوبصورت اور کرب زدہ تخیلات کے لئے۔ اس منفرد شمارے کے لئے مبارکباد۔

● 3543, Bairon ki gali, Moti Katla Road, Jaipur (Raj.)

شاہدہ وسیم ——

قلم کار خواتین کا خصوصی شمارہ اچھا ہے۔ آپ کی سلجھی ہوئی غیر جانب دارانہ حقیقت پسند سوچ قابل تعریف ہے۔ آپ کی بات صحیح ہے کہ قلم کار خواتین کے اظہار کا سلسلہ نیا نہیں ہے۔ لیکن اسے یہ سنجیدگی سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ میں سوچتی ہوں جہاں مرد قلم کار حضرات کی بے باکی ان کے فن کی خوبی مانی گئی ہے وہیں خواتین قلم کاروں کی سچائی، ان کی ذاتی زندگی کے اسرار اور ان کی لغزش بھی جانی ہے۔ یہ سوچ کا تضاد تو ہے۔

● Bever Veien 3 Lei 19, 0596 Oslo 5 (Norway)

ترنم ریاض ——

جس طرح آپ علامہ سیماب اکبر آبادی کے بارے میں یا ان کی تحریریں شائع کرتے ہیں اس سے اور آپ کے خواتین والے شمارے سے ہمیں حوصلہ افزائی ملی ہے۔ علامہ کی تحریروں میں بھی خواتین کی تعلیم کے بارے میں ایک خاص قسم کا ذمہ دارانہ رویہ پایا جاتا ہے جو اکثر لوگوں میں نہیں ہوتا۔ آپ بھی انھیں کی طرح خواتین کی تعلیم و ادب کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کا کوئی شعر ہم نے آج تک کہیں نہیں دیکھا

عصمت کے گل کدے میں پابند دستِ محرم
اڑنے لگے تو نکہت، گرنے لگے تو شبنم

خدا انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

● C-11, Jung Pura Ext. New Delhi - 4

بانو ارشد ——

شاعر کا خصوصی شمارہ "عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب" ملا۔ بعد شکریہ۔ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ البتہ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر رہی کہ خواتین کا علاحدہ نمبر پیش کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی میں تو سمجھتی تھی کہ شاعر اور ادیب میں مذکر اور مونث کی تفریق نہیں ہوتی ہے۔ فنکار فنکار ہوتا ہے عورت یا مرد نہیں۔ اب وہ زمانہ جاچکا ہے جب فن میں فنکار کی عزت اور پہچان اس کے مرد یا عورت ہونے سے کی جاتی تھی اور خاص طور سے عالمی فنکار کے سلسلے میں کیونکہ بیرونی ممالک میں تو عورت دوسرے درجے کی فرد، ہندوپاک کی طرح نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اور نہ ہی اس کو مرد سے کمتر شمار کیا جاتا ہے۔ علم و ادب میں مساوات کا درجہ بھی دیا جاتا ہے۔

● 12- Camrose Avenive, Edgware, Middx HA8 6EG (U.K.)

محمد حسن ——

اس کے لئے (ہم عصر اردو ادب نمبر) کے حوالے سے آپ کو مبارکباد دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک شاعر کا دوسرا شمارہ طلوع ہوا۔ یہ بھی ایک دریافت ہے۔ خواتین مصنفین کی تخلیقات پر مشتمل۔ ان کے تصورات و احساسات کا ترجمان۔ یہ بھی ایک نہایت اہم موضوع تھا جس کا حق شاعر نے (آپ نے) ادا کر دیا۔ اردو میں آج تک خواتین کے ادب کو مناسب اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ بھی چھان پھٹک نہیں کی گئی کہ خواتین کا ادب اپنے عوامل و محرکات کے اعتبار سے کس حد تک منفرد ہوتا ہے۔ آپ نے اس کا خام مواد یکجا کر دیا ہے۔ مبارکباد اور دوہری مبارکباد۔ یہاں بھی تشنگی کا احساس ہوا، مگر اس سے کیا؟۔ اپنے ہی ایک مصرعے پر اس خط کو تمام کرتا ہوں۔

کمی بہت ہے مگر سے دوستو کمی ہے بہت

(ڈاکٹر محمد حسن نے ہم عصر اردو ادب نمبر کے متعلق جو طویل خط لکھا تھا یہ اقتباس اسی خط کا آخری پیراگراف ہے۔ (ادارہ)

● D-7, Model Town, Delhi - 110009

سید مظفر حسین برنی ——

'اردو قلم کار خواتین کا ادب' پر خصوصی شمارہ موصول ہوا جس کے لئے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے یہ شمارہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے ۸۳ خواتین قلم کاروں کی تحریریں حاصل کر لیں اور ان کو حسب معمول حسن سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا۔ اردو میں خواتین کے اتنے ادب پارے اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ یہ پڑھ کر اردو کے مستقبل کے بارے میں نئی امیدیں بندھ سکتی ہیں کہ اگر خواتین کسی کام کو شروع کر دیں تو پھر ان کی تخلیقی اور تعمیری کوششیں جلد بار آور ہوتی ہیں۔ اب میں نہ اردو ادب سے مایوس ہوں نہ خواتین قلم کاروں سے۔ میں اب تک سمجھتا تھا کہ خواتین آج کل انگریزی میں خوب لکھ رہی ہیں، اور بس۔

● F- 3 / 17, Vasant Vihar, New Delhi - 110067

تاج سعید ——

خواتین نمبر جلدی میں نکلا، لیکن اچھا نکلا۔ جو اس کی اشاعت سے خوش نہیں ہیں انھیں اس کی دوسری جلد کا انتظار کرنے کو کہیے اور جو خواتین بچ گئی ہیں ان کی تخلیقات جمع ہوتے ہی ایک شمارہ اور نکال دیجئے۔ اور اگر اس کا دامن بھی کم نکلے تو ایک تیسرا بھی نکل آئے تو کیا برا ہے۔

● P.O. 323, Peshawar Cantt (Pak)

ذکاء الدین شایاں ——

"شاعر" کا خصوصی شمارہ جنوری، فروری ۱۹۹۹ء "عالمی اردو قلمکار خواتین کا ادب" کا بغور مطالعہ کیا۔ اس میں ۸۳ فنکاروں کی تخلیقات، ادبی مذاکرہ، قرۃ العین حیدر کا انٹرویو اور ریاض صدیقی کا "نسوانی ادب" سے متعلق ایک ترجمہ شدہ مقالہ شامل ہے۔ مدیر "شاعر" کی یہ کوشش قابل تعریف ہے کہ انھوں نے ہندوپاک، عرب اور مسلم ممالک اور یورپ کے مختلف شہروں میں سکونت اختیار کیے ہوئے

ان حصول، دفتری اور سرکاری مصروفیات میں اپنی خانگی زندگی اور دیگر تجربات و مشاہدات کی تلخ حقیقتوں کو جھیلتی ہوئی خواتین کی تخلیقات کو یکجا کر دیا ہے، جو اپنی ہجرت، حب الوطنی اور مغربی مادہ پرست معاشرے کی تمام خرابیوں کی زد پر "تنہائی" کے عذاب میں مبتلا ہیں اور شاعری یا افسانوں کے ذریعہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہیں۔ خواتین کا اپنی ذہنی نسوانی سطح پر ادب تخلیق کرنا، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ رسالہ "تہذیب النسواں" اور "حریم" جیسے رسائل سے لے کر آج ہندوپاک میں اس طرح کی گھریلو تخلیقات عام ہیں۔ اب عورتوں کی نئی بیداری کے نام پر "نسوانی ادب" یا تنقید کے جو علم اٹھائے جا رہے ہیں، وہ مغربی پروپیگنڈہ ہے، جسے ہم نے آنکھ بند کر کے قبول کر لیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے انٹرویو میں ادب، تاریخ اور تنقید کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ان کی تخلیقی تجرباتی زندگی کا نچوڑ ہے۔ ریاض صدیقی نے اپنے مقالے میں اگرچہ دبی زبان سے عورتوں کی نسوانی تخلیقات کو سراہنے کے جواز تلاش کئے ہیں لیکن اسلامی معاشرے کی پابندیوں کے درمیان ان کے خیالات منتشر ہو گئے ہیں۔ عورت کی نمائش اور وہ بھی شاعری و ادب کے وسیلے سے ذہنی، جذباتی، جسمانی اور جنسی تحریکات میں ملوث کبھی اسلامی ضوابط کے دائرے میں نہیں قید ہو سکتی۔ عورتوں کے تخلیق کردہ ادب کا مسئلہ اسلامیات اور مادیت کے تحت حاصل شدہ جھوٹی آزادی کے زیر اثر ہمیشہ برقرار رہے گا۔ یہی اس کا المیہ ہے۔ یہی اس کا تصادم۔

اس خصوصی شمارے کی تخلیقات کے گہرے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ خواتین "شاعری" کے میدان میں کسی عظیم ادب پارے کی تخلیق کو شاید ممکن نہ بنا سکیں۔ "عشق و عاشقی" کے موضوعات نئی نسل کے نوجوانوں کو کوئی تاثر اگر دیتے بھی ہیں، تو وہ چونکہ "عورت" کے ذہنی اظہار کا پیدا کردہ ہوتا ہے، اس لئے "عامیانہ" ہو کر رہ جاتا ہے۔ عاشقانہ دائرے سے باہر آ کر جب کوئی خاتون کسی سنجیدہ موضوع کو چھونے کی کوشش کرتی ہے تو "شاعری" کا کوئی معیار وضع کرنے میں ناکام رہ جاتی ہے۔ اسی خصوصی شمارے میں بیشتر شعری حصہ ہلکی پھلکی نظموں، نثری شاعری اور غزلوں کا رسمی اور سطحی اظہار ہے۔ اکثر غزلوں میں ہندی کے گیتوں کی فضا ہے۔ البتہ چند خواتین کی غزلیں اپنی وضع کاری کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ اس شمارے میں افسانوں کا تمام سرمایہ واقعی ایسا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ خواتین تخلیق کار صنف افسانہ اور ناول کو گہرائی اور خلوص کے ساتھ اپنی تخلیقات کا جزو بنائیں تو بس یہی صنف ایسی ہے جو ان کے لئے مناسب ہے۔ تنقید نگاری بھی ان کے بس سے باہر ہے۔ آمنہ ابوالحسن، ذکیہ مشہدی، نعیمہ ضیاءالدین، شکیلہ رفیق، شہناز کنول، قمر جہاں، قمر جمالی اور مہ جبیں قیصر۔ سب خواتین کے افسانے اپنے رنگ و آہنگ میں ممتاز ہیں۔ اور ان کی تعریف ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مدیر اعجاز صدیقی مرحوم کے وارث جناب افتخار امام صدیقی نے ان افسانہ نگار خواتین سے اتنے کامیاب اور خوبصورت افسانے حاصل کر کے "شاعر" کے اس خصوصی شمارے کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کہ خواتین تخلیق کار کو چاہئے کہ وہ "شاعری" اور "تنقید" کو قابو سے باہر کی اصناف سمجھتے ہوئے فن افسانہ نگاری پر اپنی پوری ذہنی توجہ صرف کریں۔ اور فہمیدہ ریاض، پروین شاکر یا کشور ناہید وغیرہ کی طرح "شاعری" کے بل بوتے پر آئندہ نسل کے لئے "نسوانی جذبات" کو عام کرنے سے گریز کریں۔ کچھ ادبی کام مردوں کے لئے بھی چھوڑ دیں!

● Near Old City Post Office, Pakaria, Pilibhit - 262001 (U.P.)

سلیمان اطہر جاوید

"عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب" شاعر کی امتیازی اور انفرادی پیش کش ہے۔ ریاض صدیقی صاحب کا مضمون "تانیثی ادب کا مسئلہ" خوب ہے اور بڑی حد تک سیر حاصل۔ ادبی فیچر اور "قرۃ العین حیدر سے ایک مکالمہ" بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔ آپ نے خواتین کا ادب تو پیش کر دیا (نثری کم، شعری زیادہ) لیکن اس اشاعت میں اردو ادب میں (نثر و شاعری) میں نسائیت جیسے موضوعات پر بھی مضامین ہونے چاہیے تھے۔ میں نے اردو شاعری میں نسائیت پر تھوڑا بہت مواد جمع کر رکھا ہے۔ جانے یہ اصلی شکل کب لے؟ بہر کیف اس نمبر کے لئے مبارکباد۔

● 9 - 4 - 134 / 11, Aruna Colony, Toli Chowki, Hyderabad - 8

صابر آفاقی

میں حقوق و فرائض میں عورتوں کی مساوات کا علم بردار اور مبلغ ہوں۔ میں ہی کیا دنیا کا ہر دانشور یہی نظریہ پیش کرتا چلا آیا ہے کہ خواتین کو زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے برابر ترقی کرنی چاہیے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ایسے خیالات رکھنے والوں کی آواز بلند نہیں ہو سکی، ہمارے مشرقی سماج میں ہر میدان میں مرد ہی کا غلبہ رہا۔ اور اس طرح ایک صحت مند اور معتدل سماج کبھی تشکیل نہ پا سکا۔ خود عورتوں کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے حقوق کے لئے کوئی کوشش کرتیں۔ اگر قرۃ العین طاہرہ کی طرح کسی ایک آدھ مجاہدہ نے ان ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی بھی تو انہیں اندھے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ مجھے شکایت ان خواتین قلم کاروں سے ہے جو ایسا ادب تخلیق نہ کر سکیں جسے دیکھ کر مرد چونک اٹھتے اور اگر کچھ خواتین نے لکھا بھی تو وہ جنسی مسائل پر ہی لکھتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے شعر و ادب میں خواتین کی کوئی اپنی تحریک پیدا نہ ہو سکی۔ مزید بد قسمتی یہ کہ اردو کے جریدوں نے بہت کم یہ سعی کی کہ خواتین کے ادب پر نمبر نکالیں۔

"شاعر" نے جہاں دیگر کئی معرکے مارے ہیں وہاں ایک کارنامہ یہ کر دکھایا ہے کہ "خواتین قلم کار نمبر" شائع کر کے دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا۔ میں نہیں کہتا کہ یہ نمبر کامل ہے یا ساری قلم کاروں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ممکن بھی نہ تھا کہ یہ ایک آدمی یا ایک مجلہ کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ ایک بڑے ادارے کا کام ہے لیکن اتنا تو ہوا کہ ایک تحریک کا آغاز ہو گیا۔ شاعر کی پیروی میں دیگر اردو مجلات کو آگے آنا چاہیے اور خواتین کے شعر و ادب سے دنیا کو روشناس کرانا چاہیے۔ ایک آدھ خاتون کا منفی رویہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا ہے اور حیرت بھی کہ اگر خود عورت ہی ناشکر گزار ہو جائے اور اپنے حامیوں کے کام پر تنقیص کرنے لگے تو پھر تحلیل خاتون کی یہ تحریک آگے کیسے بڑھ سکے گی۔

کیا پہنچے کی زمانے میں یہی باتیں ہیں

● P.O.Box 9, Muzaffarabad (A.K.) 13100 (Pak)

جانکی پرساد شرما

شاعر کا عالمی اردو قلمکار خواتین نمبر ملا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کی "رنگین تحری" نظم ہندوستان کے ہر نیساں کے شاندار اور عظیم دور کی یاد دلاتی ہے۔ اسی دور میں ہندی کے مہان کوی "نرالا" نے عورت پر "وہ توڑتی پتھر" کویتا لکھی تھی اور جے شنکر پرشاد نے "کامائنی" چھپا لیک۔ سیماب کی یہ نظم جنگ آزادی کی جمہوری قدروں کا

آئینہ ہے۔ اس کے علاوہ ابھی خواتین کے شعر و ادب پر چند اقتباسات پڑھ سکا ہوں۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ میرے جیسے قاری کے لئے یہ نمبر آئندہ ایک reference کی طرح کام آنے والا ہے۔

● B-330, Ashok Nagar, Shahdra, Delhi - 93

شاہد اختر ______________

خواتین نمبر بہت پسند آیا۔ معیاری اور وقیع نمبر تحریریں آپ نے حاصل کیں۔ کئی چیزیں بہت پسند آئیں ذکیہ مشہدی کا افسانہ انھی نئے موضوع پر بڑی فنکاری سے لکھا گیا ہے۔ شاہدہ حسن اور نفیس بانو شمع کی غزلیں بطور خاص پسند آئیں۔ دوسرے شمارے میں شکیلہ رفیق کی شریف +مرد=؟ اور قمر جمالی کی "کالا" اچھی لگی۔ نظموں میں عذرا پروین کی شرمی سرکس نے حیرت زدہ کر دیا۔ میرے خیال میں ۸۰ یا ۹۰ فیصد لوگ قاضی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ عذرا کو موضوع برتنے کا فن کتنا آتا ہے اس کی عمدہ مثال ہے یہ نظم۔ یہ نمبر عمدہ ہے اور آپ ہی نکال سکتے ہیں۔

● 227/2, Juhi Lal Colony, Kanpur-14

شباب اختر ______________

ایک اور تحریکی کام، ایک اور مبارکباد 'شاعر' اپنی روایت سے کتنی جڑا یہ بات مستند ہے اور اسے کارِ اثر میں لایا جاتا ہے بذریعہ شاعر۔ افتخار بھائی آپ نے عزائم پہ محو حیرت ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، مجھے یقین ہے یہ ۸۴ خواتین قلمکاروں سے سجا یہ خصوصی شمارہ ابھی بس دستک بھر رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے آپ ایک ضخیم شمارہ خواتین ادب کا ترتیب دینے کی کوشش میں ہیں اور وہ بھی ضخامت میں 'ہم عصر اردو ادب نمبر' جیسا ہی ہو۔ (انشاء اللہ)

قرۃ العین حیدر نے ایک مکالمہ اس شمارہ کو اہم بناتا ہے۔ نعیمہ ضیاالدین اور ذکیہ مشہدی کی کہانیاں اچھی ہیں۔ شاعری کے حصے میں ادا جعفری، شاہدہ حسن، رفیعہ شبنم عابدی، عذرا پروین، منصورہ احمد اور فرحت زاہد پسند آئیں۔

● Calcutta Cloth Stores, Kapra Patti P.O. Jharia - 828111 (Bihar)

ابن غوری ______________

صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر عصمت چغتائی زندہ ہوتیں تو وہ بھی ذکیہ مشہدی (انھی۔ جنوری ۹۹) کو پڑھ کر اپنا چہرہ لحاف میں چھپا لیتیں۔ ــ ایک ہی جست میں طے کر دیا قصہ تمام ادب کے نام سے صدی کی آخری بے ادبی۔

● Rahman Bagh, Nalganda (A.P.)

سہیل ارشد ______________

شاعر کا خصوصی شمارہ۔ عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب۔ باصرہ نواز ہوا۔ صرف قلمکار خواتین پر مبنی یہ شمارہ خوب ہے تاہم غزلیات کے حصے کے بغور مطالعہ کے بعد یہ تاثر ملتا ہے کہ کچھ شاعرات کی غزلوں کو محض اس لئے شامل کر لیا گیا کہ وہ شاعرات تھیں۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار پیش ہیں جن پر مجھے اعتراض ہے۔

وہ ان کی سوچ کیا کیجے بھلا
اس کو تو بس ایک کڑیا چاہیے (زریں یٰسین) (صفحہ ۱۳)

پنہاں نے اپنی غزل میں پھانک پھانک، دھانک کے ساتھ ساتھ، آنکھ ناک اور تاک کو بھی قافیہ مانا ہے۔ (صفحہ ۱۴)

سفر حیات کا کتنا طویل لگتا ہے
یہ اک خیال مرا جینا محال کر دے گا (رضیہ پروین۔ صفحہ ۲۵)

تمام عالم تڑپ کے جاگا ہے اب ہر اک بوند پر لہو کی
سکوت شب میں وفا ہماری کا اور کس کو خبر کہو گے
(غزالہ خاکوانی۔ صفحہ ۲۵)

خود بخود جانے کیا ہوا تسنیم
میرا حرف حرف اس کے نام ہوا (تسنیم فاطمہ۔ صفحہ ۲۴)

جنھیں لوگ اہل سخن بولتے ہیں
ہم اس کو بھی دیوانہ پن بولتے ہیں (کس کو؟ اور کیوں؟)

بہاریں تو آئی ہیں اب کے برس بھی
یہ پوچھو کہ کیا کیا چمن بولتے ہیں (فاطمہ تاج صفحہ ۲۴)

ترے ہجر میں ترے پاس ہوں تری قربتوں میں اداس ہوں
اسی الجھے، ہجر و وصال نے تو مجھے نچوڑ کے رکھ دیا
(رشمی بادشاہ)

یارب دے وہ کمال سخن جو دل پہ لگے سب زخموں کو
لالہ و گل یا جوہی، سوسن، سمن یا گلاب بنا ڈالے
(گل اور سمن کیا پھولوں کے نام ہیں؟)

میرے عناصر کی ہیئت آکے بدل کر، کون ہے وہ
خون جگر سے آنکھ میں جو تصویر آپ بنا ڈالے
(شعر ہے یا الفاظ کا ملبہ؟) (رخسانہ شمیم)

دوستو عرض ہنر دشوار ہے
بات کرنے کا سلیقہ چاہیے (زریں یٰسین صفحہ ۱۳)

آپ بھی پڑھیں اور غور کریں کہ میرے اعتراضات کہاں تک صحیح ہیں۔ ایک شمارہ نو واردان دنیائے ادب کو بھی لے کر ہو تو کیا ہی اچھا ہو۔

● No. 12, Dangal, P.O. Andal - 713321 (W.B.)

الف۔ ناظم ______________

'شاعر' کا مشترکہ شمارہ (عالمی اردو قلمکار خواتین کا ادب) نظر نواز ہوا۔ "شاعر" نے ہمیشہ ہی خواتین کے ادب کو اپنی زینت بنایا۔ جیسا کہ اداریے میں مدیر محترم نے فرمایا ہے۔ انھوں نے اپنے خوابوں کو تعبیر آشنا کرنے کی خوبصورت سعی کی ہے۔ شاعر کے اداریوں میں اکثر زبان و بیان کی خامیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ بیشتر خواتین کی تخلیقات قابل ستائش ہیں۔ تاہم درج ذیل اشعار میں مجھے فنی خامیاں نظر آئیں۔

اک صدائے گل کی طرح سے ہمیں
تیرے کوچے سے گزرنا چاہیے (زریں یٰسین)

مذکورہ شعر مشترکہ شمارے کے حصہ اول صفحہ ۱۳ پر درج دوسری غزل کا ہے۔ اس شعر میں 'طرح' کو بروزن 'طرحا' نظم کیا ہے۔ جو غلط ہے۔ طرح کا استعمال اساتذہ کے یہاں دو تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ طرح کی 'ر' کو متحرک باندھنا بھی درست ہے اور ساکن بھی۔

یہ تم نے نئی طرح نکالی
معشوق ہے آپ کی نرالی (مومن)

چمن میں آمد آمد ہے خزاں کی
صبث بلبل نے طرح آشیاں کی (رند)

قربتوں کی بٹ چکی سوغات جب شمع تو پھر
میرے حصے میں وہی تنہائیاں رکھی گئیں (نفیس بانو شمع)

اس شعر میں موصوفہ نے اپنے تخلص 'شمع' کو بروزن 'شمعا' استعمال کیا ہے جو درست نہیں ہے۔

ـ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (غالب)

غزل میں تجربہ اپنے عہد کا
سمویا ہے اسے اپنی ادا سے (زریں یٰسین)

مذکورہ شعر مشترکہ شمارہ حصہ دوم صفحہ ۱۹ پر درج ہے جس میں شاعرہ نے لفظ "عہد" کو بروزن "سفر" استعمال کیا ہے جو غلط ہے۔

● Beesalpur Dist. Pilibhit (U.P.)

فکرِ امروز

اردو کی دل پذیر انشاء، آسان املاء، اختصار نویسی اور سریع الفہمی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اردو میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک ہمہ گیر زبان میں ہونی چاہئیں۔ ہر زبان میں لہجے اور طرزِ ادا کا ایک خاص اسلوب ہے مگر اردو کی طرزِ ادا سب سے زیادہ خدوبت اور دلکشی کی حامل ہے۔ اس کا ایک لفظ 'نہیں' اتنی اداؤں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ کہیں نفی، کہیں اثبات، کہیں انکار اور کہیں اقرار کی متضاد کیفیتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ الفاظ کی کثرت، مرادفات کی فراوانی، تشبیہات اور صنائع بدائع کی زیادتی، محاکات کی وسعت اور اشارات و کنایات کی ارزانی سے اردو زبان میں تقریر و تحریر کی بیش از بیش آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

(۲۸؍ فروری ۱۹۳۴ء)

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۷۰
شمارہ — ۶

فون: 3829904

اردو کی نئی بستیاں

(جلد اوّل)

جون ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۲۰ روپے

زرِ سالانہ ۱۰۰ روپے	لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے	معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے	امریکہ ۲۵ ڈالر	برطانیہ ۱۵ پونڈ	خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۳۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

اردو کی نئی بستیاں

انٹرویو ○ خط ○ اقتباسات ○ معذرات

مرتبہ: افتخار امام صدیقی

غزلیات

نظمیات

سرورق

حامد اقبال صدیقی

کہانیات



شمارہ۔۶ [جون/۱۹۹۹ء] جلد۔۷۰

محفل اپنی

شاعر کا یہ شمارہ

شاعر کا یہ مشترکہ خصوصی شمارہ قارئین شاعر کے لئے ایک غیر متوقع شمارہ ہوگا۔ ایک بہت مختلف، متنوع اور وقیع خصوصی اشاعت۔ شاعر کی اشاعتوں میں معمولی فاصلہ آیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شمارہ اپریل ۹۹ء کے بعد مئی جون کے مشترکہ شمارے کو ایک اہم خصوصی اشاعت کی شکل دی جارہی تھی، کام تقریباً مکمل ہو گیا تھا کہ اچانک بعض نہایت ہی ناگزیر وجوہ کے سبب تیار شدہ خصوصی اشاعت کو روک کر مئی کا شمارہ اور پھر فاصلوں کو کسی مشترکہ شمارے کی خوب سیرتی سے کم کرنے اور بالکل ہی ختم کرنے کے لئے زیر نظر خصوصی شمارے کو پہلے تو سوچ کیا اور پھر ترتیب دیا۔ کم وقت میں پھیلے ہوئے موضوع کی محدود صفحات میں سمائی اور وہ بھی تخلیقی روپ میں، شکر کے ایک دانے پر مٹھائیوں کے نام لکھنا تھا۔ قارئین خود ہی اندازہ کرلیں گے کہ سو صفحات کی اس نہایت ہی اہم خصوصی اشاعت کا تمام تر لوازمہ ڈھائی سو صفحات کے خاص نمبر کا حکم رکھتا ہے۔ اب یہ شاعر کی روایت اور اس کا مزاج بن گیا ہے کہ اس کا ہر شمارہ اپنی تخلیقی ترتیب میں ایک خصوصی شمارہ ہوتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ایک بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع کے تقریباً تمام ہی پہلو اور اس کے مضمرات سامنے آجائیں۔ آپ کو یہ شمارہ کیسا لگا؟ اپنے گرانقدر مفید مشوروں سے نوازیے گا۔

کچھ اور خصوصی اشاعتیں

۲۰ویں صدی کے اختتام کو چند ماہ رہ گئے ہیں۔ ہم نے اعلان کیا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ دسمبر ۹۹ء تک کم از کم دو خصوصی شمارے اور شائع ہو جائیں ایک تو وہی نامکمل خصوصی اشاعت ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ایک دوسری اشاعت خاص بھی زیر ترتیب ہے۔ قبل از وقت اعلان کے بجائے ہم اپنے قارئین کے تجسس کو دھنک رنگ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اعلانات اور دعووں سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے کام اور قارئین کی بلند ذوقی پر اعتماد ہے۔ انتظار کیجئے اور شاعر کے ہر نئے شمارے کا استقبال کیجئے اور ہمارے لئے دعا گو رہیے کہ رسالہ شاعر اسی طرح ماہ بہ ماہ شائع ہوتا رہے اور آپ کے نکھرے ستھرے وجدان کو سیراب کرتا رہے۔

شاعر کی ۷۰ویں سالگرہ

جنوری ۲۰۰۰ء کے استقبال کے ساتھ شاعر اپنی عمر کے ستر سال بھی مکمل کرلے گا۔ یہ ہمارے لئے ایک بالکل نیا، انوکھا اور غیر معمولی واقعہ ہوگا۔ شاید اردو کے ادبی رسائل کے لئے بھی۔ ہماری دعا ہے بلکہ ہر وقت یہی دعا رہتی ہے کہ شاعر اپنی عمر کی ایک صدی مکمل کرلے اور ایک اور صدی کو بھی جئے۔ آمین! ہمارے بہت سارے خواب ہیں۔ ان خوابوں کی تعبیریں کیا ہوں گی، کس طرح ہوں گی یہ ہمیں بھی نہیں معلوم۔ پھر بھی خواہش تو یہی ہے کہ جو خواب ہم سوچ رہے ہیں، وہ تعبیر آشنا ہوں۔ شاعر کی کئی خصوصی اشاعتیں منظر عام پر آئیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر۔ ۲ جلد شائع ہو۔ سترویں سالگرہ کی خوشیاں منائی جائیں، پوری اردو دنیا ہماری خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو کہ یہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک اور اہم ترین واقعہ ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو والے اس واقعے کو کس طرح اپنا فخر بناتے ہیں اور عملی اظہار کرتے ہیں۔ اس موضوع پر آئندہ شماروں میں گفتگو کی جائے گی۔

ہم عصر اردو ادب نمبر

شاعر کے فقید المثال ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت کو اب کئی ماہ گزر گئے ہیں لیکن اس کی ترسیل و تقسیم کے کام ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔ ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں میں اس کی پذیرائی کی ایک نئی تاریخ بن رہی ہے اس کی ڈیمانڈ برابر ہے۔ نکاسی کے مسائل ہیں۔ شاعر کے مستقل خریداروں کے اپنے مسائل ہیں، بہت ساری پیچیدگیاں ہیں۔ اگر اب تک آپ کسی وجہ سے ہم عصر اردو ادب نمبر حاصل نہیں کرسکے ہیں تو عجلت کیجئے۔ امروزی کا پی کا انتظار مت کیجئے۔ کسی سے مستعار لے کر پڑھنے کی بابت نہ سوچئے کیوں کہ ہر شخص اسے محفوظ کر رہا ہے۔ بہت محتاط اور احتیاط کے باوجود خاص نمبر تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ عجلت کیجئے کہ مایوسی، انتظار کی غذا بن سکتی ہے۔

شاعر کے مستقل خریداروں سے

ہماری یہ روایت رہی ہے کہ ہم اپنے مستقل خریداروں کو ان کی مدت خریداری ختم ہو جانے کے باوجود رسالہ شاعر کی ترسیل نہیں روکتے۔ گو کہ اس میں زیاں ہی زیاں ہے لیکن ایک اعتماد ہر حال شاعر پڑھنے والوں کے ساتھ رہتا ہے کہ وہ اپنا سالانہ زر رفاقت ارسال کرہی دیں گے۔ ایسا ہوتا بھی ہے تاہم اگر زر سالانہ بروقت بھجوادیا جائے تو ہمارے مسائل کسی حد تک کم ہو جاتے ہیں اور رسالے کو بھی پابندی کے ساتھ شائع کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ کیا ہمارے قارئین اسے محسوس نہیں کرتے کہ ہم کم صفحات اور نہایت ہی کم قیمت میں زیادہ سے زیادہ اور متنوع تخلیقات نثر و نظم ہر ماہ پیش کرتے ہیں میکانکی اور بے روح ترتیب سے گریز کرتے ہیں۔ اپنے باذوق قارئین کے اعلیٰ معیار و مزاج اور ان کی پسند کو دھیان میں رکھتے ہیں۔ لہذا گزارش ہے کہ اپنا سالانہ زر رفاقت وقت پر ارسال کیجئے۔ اپنے بقایاجات کی ادائیگی میں تاخیر نہ کیجئے۔

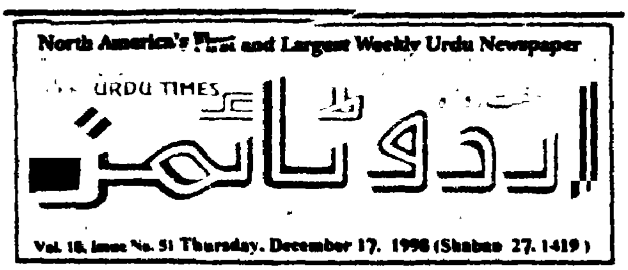
اردو کی نئی بستیوں سے

اردو کی نئی بستیوں سے شاعر کو تعاون مل رہا ہے اور شاعر کی گلوبل ریڈرشپ کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے لیکن عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی ہوئی دنیا اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ ہر شخص تک رسائی ہو جائے۔ اردو کی نئی بستیاں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان بستیوں کے شاعر نوازوں سے گزارش ہے کہ وہ رسالہ شاعر کے لئے اپنی مصروفیات میں سے کچھ اور وقت دیں۔ اس کی توسیع اشاعت کو مزید پھیلائیں۔ ابھی بے شمار ایسے اردو داں اور ادب نواز ہیں جن تک شاعر کو پہنچنا ہے۔ یہ کام تنہا ہمارے بس کا نہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے بہت سارے قلم کار ابھی شاعر سے وابستہ نہیں ہوئے ہیں۔ انجمنیں، ادارے، مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ اردو اور زبان و ادب کے فروغ میں مصروف کار افراد، شاعر کو ان سب تک پہنچانے میں ہماری مدد کیجئے۔ رہنمائی کیجئے۔ اپنے مفید اور کارگر مشوروں سے نوازیے۔

شمالی امریکہ اور کنیڈا کے اردو اخبارات

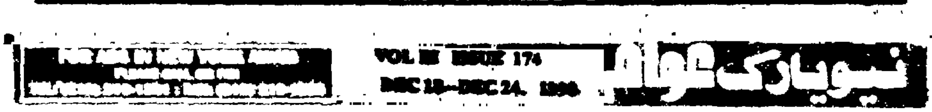
بالکل مفت

کیا آپ یقین کریں گے اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ شمالی امریکہ اور کینیڈا کے ہفت روزہ اردو اخبارات بلا قیمت تقسیم ہوتے ہیں؟ ان میں سے بیشتر اخبارات ہندوپاک کے کسی بڑے سے بڑے روزنامے ہی کی طرح شائع ہوتے ہیں۔ پاکستان کے 'جنگ' "نوائے وقت" اور 'جسارت' کی طرز کے بھرپور ہفت روزہ نیویارک، شکاگو وغیرہ میں ہندوستانی پاکستانی علاقوں یا جن علاقوں میں اردو جاننے والوں کے ہوٹل یا دکانیں وغیرہ ہیں وہاں ایک کونے میں ان اخبارات کا ایک ڈھیر لگا رہتا ہے آپ چاہیں تو اپنے پسندیدہ اخبار اٹھا کر گھر لے جائیں یا پھر پڑھ کر وہیں ڈال دیں۔ امریکہ کے کئی انگریزی اخبارات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اتوار کے اخبارات کئی کئی کلر کے ہوتے ہیں۔ اردو اخبارات اور وہ بھی مفت اگر یقین نہ آئے تو بذریعہ فیکس معلوم کیجئے۔ E.Mail سے معلوم کیجئے۔ یہ اخبارات انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ یہ سارے اخبارات اشتہارات پر زندہ ہیں۔ امریکہ کے کئی شہروں سے بہ یک وقت شائع ہونے والے یہ معیاری اخبار اور بھی مفت! ہے نا تعجب کی بات؟ مگر ٹھہریے! ان اخبارات کے لئے زر سالانہ بھی طے ہے، مثلاً اردو ٹائمز کا زر سالانہ ۴۵ ڈالر ہے اور اردو کے نام پر ۴۵ ڈالر دینے والے کتنے ہوں گے، یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قارئین شاعر کی دلچسپی کے لئے چند اردو اخبارات کے سرناموں کے عکس ذیل میں دیے جارہے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے اخبارات و رسائل ایک الگ تحقیقی موضوع ہے اس پر تفصیل سے آئندہ لکھا جائے گا۔ (ادارہ)









ساقی فاروقی

موت نے پروا کرتے کرتے پروا چھوڑ دیا
میرے اندر آج کسی نے جینا چھوڑ دیا

خوف کہ رستہ بھول گئی امید کی اجلی دھوپ
اس لڑکی نے بالکنی پر آنا چھوڑ دیا

روز شکایت لے کر تیری یاد آجاتی ہے
جس کا دامن آہستہ آہستہ چھوڑ دیا

دنیا کی بے راہ روی کے افسانے لکھے
اور اپنی دنیا داری کا قصہ چھوڑ دیا

بس تتلی کا کچا کچا رنگ آنکھوں میں ہے
زندہ رہنے کی خواہش نے پیچھا چھوڑ دیا

100, Sunny Garden Road,
NW4 IRY (U.K.)

شان الحق حقی

نہ خود کو سمجھا نہ میں راز این و آں سمجھا
یہی بہت ہے کہ بس تجھ کو جانِ جاں سمجھا
غبار راہ تھا وہ جس کو کہکشاں سمجھا
زمینِ زیر قدم کو ہی آسماں سمجھا
خرد نے جس کو بعید از گمان و وہم کہا
دل اس کو اپنی ہوا میں قریب جاں سمجھا
یہی تھی ایک سبیل حصول لذت زیست
کہ میں وفور الم کو نشاط جاں سمجھا
حصار وہم سے جانے کی راہ ہی نہ ملی
غرضیکہ میں نے مکاں ہی کو لامکاں سمجھا
سوائے حسرت دل ساز و برگ دل کیا تھا
جسے سجا کے خرابے کو خانماں سمجھا
پیام کچھ سر مصحف لکھے ہوئے دیکھے
میں جب رموز خدوخال مہ رخاں سمجھا
جو دل کا راز ہے آخر کھلے تو دل پہ کھلے
اسے نہ کوئی فلاطوں نہ برگساں سمجھا
اسی سبب سے کوئی کاروں نہ بن پایا
کہ میں نے حسرت دل کو بلائے جاں سمجھا
عیار حقیؔ ہے اک یہ بھی قول برحق کا
کہ جو نہ سمجھا ہو وہ بھی کہے کہ ہاں سمجھا

341- Frontenac Drive, D.D.O
QC H9G 1R4, Canada

ستیہ پال آنند

ہمیں بالآخر ملا ہی کیا ہے

بس ایک سودا تھا جو سمایا ہوا تھا سر میں
جنوں تھا تقلید سے بچیں
بھیڑ چال چھوڑیں
خود اپنے خضر حیات بن کر
حیات کی منزلوں کو ڈھونڈیں
وہ کیسا جذب دروں تھا، جس نے
پہاڑ کے سنگلاخ رستوں کو کاٹ کر
کوہسار زیر قدم کیے۔ چوٹیوں کو روندا
وہ جذبہ و جوش کیا تھا، جس نے
فضیلت و حیثیت میں لوگوں سے آگے بڑھ کر
اصالت و امتیاز پایا!
وہ کیسی شوریدگی تھی، جس نے
فنون میں فوقیت کی خاطر
کلاہ و کلغی کی سربلندی کو منتہائے کمال سمجھا!
عجیب سودا تھا
جس نے سر کو ہی بیچ کھایا
کہ جیتے جی ہی کپال کریا[1] میں سر گنوا کر
ہمیں بالآخر ملا ہی کیا ہے
کلاہ و کلغی کا اوج تو ہے
مگر ہمارے شکستہ سر میں بنام سودا رہا ہی کیا ہے
جو عاقبت کے لئے بچا کر سنبھال رکھیں؟

[1] کپال کریا۔ ہندو رسم۔ بیٹے کے ہاتھوں والد کی چتا پر لاٹھی سے ایک ہلکی چوٹ۔ کھوپڑی توڑنے کے عمل کی رسم

606 - Adams Street, Herndon,
VA 20170 4613 (USA)

اردو کی نئی بستیاں

انٹرویو ○ خط ○ اقتباسات ○ شذرات

مرتبہ : افتخار امام صدیقی

اردو کی نئی بستیوں میں زبان و ادب کے اپنے مسائل ہیں اور وہاں بسنے والے اردو مہاجرین اپنے اقتصادی مسائل کے ساتھ اپنی زبان اور ثقافت کے لئے بھی سرگرداں ہیں ۔ ان کے پاس وقت نہیں کیوں کہ وقت ان کا اپنا نہیں ۔ مختلف کلچر اور مختلف زبانوں اور مختلف لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی پہچان بنائے رکھنا آسان نہیں ہے ۔ بہت سارے سوال ہیں ، بے شمار مسائل ہیں ۔ سارے سوال اور سارے مسائل کی یکجائی ، بحث اور امکانات وغیرہ سے قطع نظر ذیل میں چند مضامین سے اقتباسات ، تبصرے ، شذرات وغیرہ دئے جارہے ہیں ۔ ان سے بے شمار قارئینِ شاعر کو اردو کی نئی بستیوں میں زبان و ادب کے مسائل کا کچھ اندازہ ہوسکے گا ۔ ادارتی شذرات سے کسی حد تک ان مسائل کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے ۔ مسائل اور بھی ہیں اور بہت ساری غلط فہمیاں بھی ۔ وہ امریکہ ہو یا یورپ یا خلیجی ممالک ، اردو والے جہاں بھی ہیں ، بہت زیادہ آسائشوں میں نہیں ہیں اور زبان و ادب کی کسی نہ کسی سطح پر خدمت کررہے ہیں ۔ قابلِ مبارکباد ہیں ایسے تمام لوگ ۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو کی نئی بستیوں کے دیگر ادب نواز اور قلم کار حضرات اپنے اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے قارئینِ شاعر کو مستفید کریں ۔ (ادارہ)

یورپ اور برطانیہ میں اردو

رالف رسل سے اطہر فاروقی کا مکالمہ

اطہر : یورپ اور خصوصاً انگلینڈ میں ہندوستان اور پاکستان کے اردو داں عوام کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ ان لوگوں میں کچھ تو وہ ہیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد یورپ اور انگلینڈ آئے تھے۔ اب یہ نسل زندگی کے آخری پڑاؤ پر ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو یہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ تیسرا گروپ ان نوجوانوں کا ہے جنھوں نے بہت بعد میں یعنی ۸۰ء کے بعد یورپ کی طرف مراجعت کی۔ آپ کے خیال میں ان تینوں نسلوں (Age Group) کے لوگوں کا یورپ میں اردو سے کیا رشتہ ہے، اور اس رشتے کے حوالے سے یورپ میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

رسل : میرے خیال میں یورپ اور خصوصاً انگلینڈ میں اردو کا مستقبل بہت روشن نہیں ہے۔ ابتداً انگلینڈ آنے والے لوگوں میں بڑی تعداد پاکستانیوں اور ان میں بھی اکثریت ناخواندہ یا بہت کم پڑھے لکھے لوگوں کی تھی۔ ان لوگوں کے ذہن میں روز اوّل سے ہی یہ بات بھی تھی کہ وہ جس ملک میں جا رہے ہیں وہ انگریزوں کا ملک ہے جنھوں نے ان پر حکومت کی ہے اور انگریز ان سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر اس تحفظِ ذہنی کے باوجود وہ انگریزوں کی بہت پروا نہیں کرتے تھے۔ جب ان لوگوں کی اولادیں تعلیم حاصل کرنے کی عمر کو پہنچیں تو انھوں نے ان کے لیے اردو کی جزوقتی تعلیم کا انتظام مساجد میں کیا اور دیگر مضامین کی تعلیم کے لیے انھیں دیگر اسکولوں میں داخل کرایا۔ ہندوستان اور پاکستان کے دینی مدارس و مکاتب کی طرز پر مساجد کے اسکولوں میں تعلیم کی ابتدا قرآن سے ہوتی تھی اور آگے چل کر بچے کو اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر یہ طریقہ انگلینڈ میں کامیاب نہیں ہو پایا۔ بچے جب دنیاوی تعلیم کے لیے اسکول میں جاتے تو وہاں انھیں جن مدرسین سے واسطہ پڑتا وہ ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کرتے تھے۔ یہ تربیت یافتہ مدرسین بچوں کی نفسیات سے بہ خوبی واقف ہوتے تھے۔ دوسری طرف مسجد کے مکتب کے مولوی صاحب قرآن اور اردو کی جزوقتی تعلیم کے وقت ان پر ہندوستان اور پاکستان کے انداز کی غیر ضروری سختی اور مار پیٹ روا رکھتے تھے جو بچوں کو بہت ناگوار معلوم دیتی اور ان میں سے اکثر بچے اردو میں ضروری واقفیت حاصل کیے بغیر درمیان میں ہی مساجد کے مدرسوں کو خیرباد کہہ دیتے تھے۔ یوں انگلینڈ میں آکر تعلیم حاصل کرنے والی پہلی نسل اردو سے صحیح طور پر واقف نہیں ہو پائی۔ اس وقت تک حکومت کی طرف سے بھی اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔ بعد میں جب ہماری کوششوں سے اسکول کی سطح پر باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا گیا تو زیادہ دل چسپی پاکستانی حضرات نے دکھائی مگر پاکستانیوں کی اپنے بچوں کو اسکول میں اردو پڑھانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسکول میں اردو پڑھنے سے انھیں سر ٹیفکیٹ ملتا جو بعد میں مختلف نوکریوں کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

۸۰ء کے بعد اردو تعلیم کی طرف مسلمانوں کی نئی نسل کا رجحان نسبتاً زیادہ رہا۔ یہ نسل اردو کی تعلیم اس لیے حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اپنے اجداد کی تہذیب و ثقافت سے ابتدائی واقفیت حاصل کر سکے۔ میرے ریٹائرمنٹ سے قبل School of Oriental and African Studies, University of London (SOAS) میں اردو تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں میں اکثریت ایسے ہی طلبہ کی تھی جو اردو کے ذریعے اپنے ملک کی تہذیب اور ثقافت سے

واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر بہ حیثیت مجموعی یہ تعداد ایک بہت مختصر سی اقلیت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ میرے خیال میں تو پورے ہی یورپ اور انگلینڈ میں اردو کا مستقبل اسی نفسیات کے تابع اردو اقلیت پر موقوف ہے۔ مگر یہ مختصر سی اقلیت اپنے والدین سے زیادہ روشن خیال ہے اور یہ بات یہاں کے مخصوص سماجی تناظر میں اردو کے لیے نیک فال ہے۔

مگر اردو کے مخدوش مستقبل کی ذمے داری میرے خیال میں بڑی حد تک خود اردو داں حضرات پر ہی ہے جنھیں زبان کے متعلقات کا صحیح عرفان و ادراک ہی نہیں تھا اور اسی لیے وہ لوگ اپنی نئی نسل کو اردو کی تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کرسکے۔ ناخواندہ اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی بات تو جانے دیں، تعلیم یافتہ اردو داں حضرات کے نزدیک بھی اردو کے فروغ کا مقصد ہندوستان اور پاکستان کی طرح کی فضول روایتی ادبی و شعری نشستیں برپا کرنا اور مشاعرے منعقد کرنا ہے اور یہ لوگ ہنوز یہی کررہے ہیں۔ ان کے اس رویے کے سبب نئی نسل کا اردو سے رشتہ بہت دور کا اور تعلق بہت واجبی سا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

اطہر: اردو کی اس مایوس کن صورتِ حال میں کچھ دخل اس تعصب کا بھی تو ہوگا جس کی طرف آپ نے ابتدا میں اشارہ کیا تھا کہ انگریز قوم تمام ایشیائی باشندوں کے ساتھ تعصب رکھتی ہے؟

رسل: انگریز اور دیگر یوروپین اقوام ایشیائی باشندوں کے تئیں جو تعصب روا رکھتے ہیں اس سے سب واقف ہیں اور اس کا اثر اردو پر بھی پڑا ہے مگر یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ تمام ایشیائی اس تعصب کو برداشت بھی کرتے ہیں۔ کئی دفعہ نوجوانوں کو صرف اس لیے قتل کردیا جاتا ہے کہ وہ ایشیائی یا سیاہ فام ہیں۔ یہ تعصب روز بہ روز بڑھ رہا ہے جس کے مختلف اسباب ہیں اور ان کی تفصیل میں جانے کا یہ مناسب موقع نہیں لیکن یہ بات کہنے کی ہے کہ روشن خیال انگریز اور دوسرے یوروپین لوگ اس طرح کے تعصب پر خاموش نہیں بیٹھے ہیں اور اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کے واقعات کی مذمت کرکے کرتے ہیں۔ مگر روشن خیال لوگوں کی مذمت سے تعصب رک تو نہیں رہا۔ دوسری طرف حکومت قانونِ توطن (Immigr...ion law) کو مزید سخت کررہی ہے تاکہ یہاں آنے والے ایشیائیوں کے داخلے پر پابندی لگادی جائے۔ ان سخت امیگریشن قوانین کی وجہ سے بھی ایشیائیوں کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے۔ ●

○ اطہر فاروقی نے شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے مشہور اردو مستشرق اسکالر رالف رسل سے ایک انٹرویو کیا تھا۔ یہ طویل اور اہم انٹرویو جلد اول میں شامل نہ ہوسکا۔ جلد دوم میں متوقع ہے کہ رالف رسل نے اردو ادب، اردو زبان کے رسم الخط، ہندوستان میں اردو کے مستقبل اور اردو زبان و ادب کے بعض بنیادی مسائل پر نہایت ہی بے باکی اور دانشوری کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس گرانقدر انٹرویو کا ابتدائی حصہ چونکہ یورپ اور برطانیہ میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے ہے لہذا موضوع کی مناسبت سے یہ ابتدائی حصہ یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ رالف رسل کے بیشتر خیالات مبنی بر حقائق ہیں۔ مشہور افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ نے اپنے ہفت روزہ اخبار 'راوی' کے اداریوں میں بارہا ان حقائق پر لکھا ہے۔ اطہر فاروقی اور رالف رسل کے درمیان یہ مکالمہ عملی روپ اختیار کرلے، ایسی کوششیں ضروری ہیں۔

(الف الف)

عطاء الرحمن صدیقی ندوی

نئی زمین نئے آسمان کی تلاش....!!!

ہندوستان میں جب اردو بے روزگار ہوئی اور پاکستان میں بھی اردو کا رشتہ روزگار سے کمزور پڑنے لگا تو اردو داں طبقے نے اقتصادی ہجرت کے لئے رختِ سفر باندھا اور دنیا کے مختلف گوشوں میں سکونت اختیار کی۔ معاشی تگ و دو کے کچھ عرصے بعد جب اقتصادی ہجرت درہم و دینار، ڈالر و ریال کے سہارے کامیابی سے ہمکنار ہوتی نظر آئی اور قدرے اطمینان نصیب ہوا تو اردو کے باذوق مہاجرین نے ابتداً وقت گزاری و دلچسپی کی خاطر شعری و ادبی محفلیں آراستہ کیں۔ رفتہ رفتہ اردو کے راستے سے باہمی تعارف کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور سیاسی و جغرافیائی حدود و قیود سے بلند ہوکر اردو نے ایک نیا علاقہ تشکیل دینا شروع کیا اس طرح معاشی جدوجہد کے سہارے عالمی سطحِ سمندر پر اردو کے نئے نئے جزیرے ابھرنے لگے، یوں تو یہ سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی سے شروع ہوچکا تھا، لیکن ادھر کچھ عرصے سے اردو کی ان نئی بستیوں کا تعارف اور ان کی ادبی خدمات کا ذکر بڑے زور و شور کے ساتھ ہونے لگا ہے اور اردو کی ان نئی بستیوں نے نہ صرف ہندوپاک کے اردو داں طبقے کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے بلکہ انھیں حیران و انگشت بدنداں بھی کردیا ہے اور یہ تاثر عام ہونے لگا ہے کہ یہ نوآباد بستیاں بڑے پیمانے پر اردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں اور اردو ان کی خدمات سے "مالا مال" ہورہی ہے کیونکہ ہندوپاک کی اردو آبادی نسبتاً غریب اور جدید الکٹرانک میڈیا سے محروم بھی ہے اس کے علاوہ مقامی سطح پر سیاسی چیرہ دستی اور اپنوں کی ستم ظریفی کا شکار بھی ہے جبکہ اردو کی یہ نئی بستیاں پرسکون انداز میں تمام میسر وسائل کے ساتھ زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہی ہیں.... لیکن کیا واقعتاً ایسا ہی ہے؟ یا محض دولت اور جدید میڈیا کا سہارا لے کر زبان و ادب کی خدمت کا ہنگامہ برپا کیا جارہا ہے؟....! کیونکہ زبان و ادب کی خدمت طویل جدوجہد، سنجیدہ محنت اور صبر آزما عمل مسلسل کی متقاضی ہے اور یہاں خلیجی ریاستوں یا دیگر ممالک میں اردو کے لئے جدوجہد کا درجہ ثانوی اور کسی حد تک تفریحی ہے۔ اس کے علاوہ جن مختلف سمتوں میں جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اردو کی یہ بستیاں ان سے یا اس قسم کے افراد سے محروم ہیں۔ زبان و ادب کی خدمت کا دائرہ زبان کی تعلیم و ترویج،

نشرواشاعت، تنقید و تحقیق، ادب و صحافت اور اصناف ادب کی جملہ اقسام پر محیط ہے جبکہ ان نئی بستیوں میں عام طور پر اردو ادب کی خدمات کا دائرہ شعر و شاعری اور شخصی جشن تک محدود ہے اگر یہ دائرہ کبھی وسیع بھی ہوتا ہے تو ایک آدھ سیمینار کم (Cum) مشاعرے تک پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ یہ سوال اپنی جگہ مستقل غور و فکر کا متقاضی ہے کہ کیا محض شعر و شاعری، زبان و ادب کی ترقی و ترویج کا ذریعہ ہے یا اردو کے تحفظ و بقا کی خاطر اس کی تعلیم و ترویج تہذیب و تثقیف اور توسیع و اشاعت اردو کی خدمت کا اصل میدان ہے؟ ان نئی بستیوں کے توسط سے اردو کی عالمی حیثیت کا بھی بڑا ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ بات بالکل عیاں ہو کر سامنے آئے گی کہ اردو کی عالمی حیثیت صرف ہندوپاک کے اردو داں طبقہ تک ہی محدود ہے عالمی سطح پر اردو کی جتنی بھی نئی بستیاں وجود میں آئی ہیں انھوں نے صرف اردو داں طبقے کو متحد کرنے کی کوشش کی ہے مقامی سطح پر غیر اردو داں طبقے کو اپنی محنت کا مرکز و محور نہیں بنایا ہے جبکہ اردو کا خمیر تو بڑی آسانی سے ہر غیر زبان کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اجنبی زبان بولنے والے تھوڑی سی محنت اور توجہ سے اردو سیکھ سکتے ہیں۔ خصوصاً اہل عرب اور اہل فارس۔ لیکن اس سطح پر کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی ہے۔ غیر اردو داں طبقے کو بنیاد بنا کر ان کی اپنی زبان میں ایسے پروگرام تشکیل دینے کی اور ایسی کتابیں ترتیب دینے کی ضرورت ہے جن کی بناء پر وہ اردو سیکھ سکیں یا اس کے متنوع ادب سے متعارف ہو سکیں، پچھلے چالیس سال کے عرصے میں اگر یہ کوشش کی گئی ہوتی تو ہندوپاک سے آگے بڑھ کر اردو کوئی نیا علاقہ نیا ملک فتح کر لیتی اور نئی سرزمین پر آباد ہو جاتی کیونکہ ہندوستان کی زمین تو اردو کے لئے تنگ ہو چکی ہے، پاکستان میں بھی اردو بولنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے اور وہاں اردو لسانی عصبیت کا شکار ہے لہٰذا اردو کے لئے نئی سرزمین کی تلاش ایک ناگزیر ضرورت ہے اردو کی ان نئی بستیوں کے لئے اس کے بڑے مواقع تھے اور ہیں لیکن تاحال اردو کی کسی تنظیم کسی ادارے یا انجمن کی طرف سے غیر اردو داں طبقے کو اردو سکھانے کا کوئی پروگرام، کوئی کوشش منظر عام پر نہیں آئی ہے، جبکہ خود اردو میں اس قسم کا سرمایہ موجود ہے۔ آپ اردو کے ذریعے عربی، فارسی، انگریزی، فرنچ اور جرمن تک سیکھ سکتے ہیں حتیٰ کہ خالص تکنیکی اور میکانیکی علوم و فنون بھی سیکھ سکتے ہیں۔ مگر بڑی بدقسمتی ہے کہ خود اردو سیکھنے اور سکھانے کے لئے کسی غیر ملکی زبان میں کوئی معقول کتاب دستیاب نہیں ہے جبکہ اس کی طلب بھی موجود ہے اور تڑپ بھی۔۔۔ مختلف ممالک میں آباد اردو کی یہ نئی بستیاں بڑے اعلیٰ معیار سے یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔ کاش...!! اردو کی یہ نئی بستیاں جنھیں ہر طرح کے مادّی و معنوی وسائل میسر ہیں، اس سمت کوئی پیش قدمی کریں اور مشاعروں کی سطح سے بلند ہو کر اردو کو حقیقی معنی میں عالمی زبان بنانے کا عظیم کارنامہ انجام دیں یا ہندوپاک کے اردو والے ہی ان نئی بستیوں کے تعاون سے اس طرح کا کوئی دوررس منصوبہ روبعمل لانے کی کوشش کریں کیونکہ اردو محض ہندوپاک کے اردو داں طبقے تک ہی محدود ہے، غیر اردو داں طبقے میں ترویج و اشاعت کا کام بہر حال نہیں ہوا ہے۔ ان نئی بستیوں کے لئے اس کا ایک بڑا اچھا موقع ترجمے کا وسیع میدان ہے۔ اردو کی بہترین کہانیاں، افسانے اور علمی و شعری سرمایہ دنیا کی مقامی زبانوں میں اور مقامی زبانوں کا بہترین ادب اردو رسائل و مجلات میں شامل کیا جائے۔ اس کے لئے کوئی ٹرسٹ، کوئی ادارہ، کوئی فنڈ قائم کیا جائے جو ادب کی توسیع اور زبانوں کے درمیان ثقافتی و ادبی رابطے کا کام انجام دے اس طرح عالمی ادب میں اردو کو بھی نمایاں مقام حاصل ہو سکے گا۔ حیرت کی بات ہے کہ اردو کے رسائل و مجلات میں تو عالمی زبانوں کی مختلف کہانیاں شائع ہوتی ہیں لیکن اردو کی ناقابل فراموش کہانیاں، معیاری افسانے اور زندہ و جاوید اشعار اس اعزاز سے محروم رہ جاتے ہیں۔ عالمی سطح پر اردو ادب کے تعارف کے لئے وسیع پیمانے پر کوئی کام نہیں کیا جاتا لیکن اردو کی عالمی حیثیت کا ذکر بڑے فخر و انبساط سے کیا جاتا ہے۔ اسے سوائے خوش فہمی کے اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ بہت ہی محدود پیمانے پر ادبی درآمدات کا کام ترقی پسندی کے دورِ عروج میں ہوا تو ہے لیکن بڑے پیمانے پر اردو کے ادبی شہ پاروں کی برآمدات کا کام نہیں ہو سکا ہے اور اس کی بڑی ضرورت ہے۔

تیسرا بڑا کام نشرواشاعت کا ہے، خلیج میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی نشست کی اشاعت کے لئے اخبارات و رسائل، آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہندوپاک میں ہونے والے بڑے سے بڑے ادبی پروگرام، تنقیدی و تحقیقی سیمینار اور دیگر ادبی سرگرمیوں کی خبریں ان نئی بستیوں تک نہیں پہنچ پاتی ہیں۔ حالانکہ یہ بات خود ان نئی بستیوں کے لیے مفید اور بصیرت افروز ثابت ہوگی کیونکہ اردو کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے جب تک اس بڑے سمندر سے فیضیاب نہیں ہوں گے بذات خود سرسبز و شاداب نہیں رہ سکیں گے۔ اس بات کی ضرورت کہیں زیادہ ہے کہ ہندوپاک میں ہونے والی ادبی خدمات کو یہاں متعارف کرایا جائے اور اردو کی یہ نئی بستیاں وہاں سے اپنے لئے ادبی غذا فراہم کریں۔ اس کے لئے ادبی و ثقافتی، علمی و فنی کتابوں کی درآمدات اور اخبارات و رسائل کی فراہمی کا کوئی مستقل سلسلہ پیدا کیا جائے۔ یہاں خلیج کے ہر ملک میں تقریباً ہر سال ہی کتابوں کی بڑی بڑی نمائشیں لگتی ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بھولے بھٹکے بھی اردو کتابوں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اسٹال بھی نظر نہیں آتا جبکہ یہاں کے اردو نواز طبقے کا ذوق بھی خاصا بلند ہے۔ قوت خرید تو اس سے بھی زیادہ بلند ہے اور اردو آبادی کا تناسب بھی زیادہ ہے۔ کیا یہاں کی کسی تنظیم کسی اردو نواز ادارے کو اس اساسی خدمت کا خیال نہیں آتا؟ پچھلے کئی سالوں میں کتابوں کی نمائش دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ بڑی تعداد میں یہاں مقیم اردو مہاجرین، کتابوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور بے نیل و مرام واپس ہوتے ہیں۔ اردو کتابوں کی فراہمی یہاں کے اردو داں طبقے کا بہت بڑا مسئلہ ہے جس کا حل کسی بھی ادبی تنظیم کے پاس نہیں ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے مختلف تنظیموں کے اسٹیج سے بڑے زور و شور سے لائبریری کے قیام کا اعلان سنتے آرہے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کوئی لائبریری رپورٹنگ کی سطح سے ابھر کر منظر پر نہیں آئی ہے۔ عوامی سطح پر جب بھی یہ کوشش بار آور ہوگی اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا، لائبریری کے علاوہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کا اردو داں طبقہ کتابیں خرید کر پڑھنا چاہتا ہے جس کا کوئی نظم نہیں ہے جبکہ ہندوپاک میں اردو ناشرین قاری کی قوت خرید کا رونا روتے رہتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ناشرین نے اردو کتابوں کی اشاعت سے پہلو تہی کرنا شروع کر دیا ہے۔ نتیجتاً بے شمار اردو مصنفین اشاعت کی حسرت لئے خدا کے حضور پہنچ جاتے ہیں... جبکہ یہاں خلیج کی مختلف ریاستوں میں ہر سال صرف مشاعرے پر دل سے بہرہ

لاکھوں صرف کئے جاتے ہوں گے۔ کیا اس بجٹ سے گمنام شعرا یا غریب مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے اردو کے نام پر کوئی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی؟ کیا یہ مسئلہ اردو کی ان بالمدار نئی بستیوں کی فکر و توجہ کا مستحق نہیں ہے؟؟؟ اسی طرح ہند و پاک خصوصاً ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیز کے شعبۂ اردو بھی ان نئی بستیوں کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جو بڑی کسمپرسی کا شکار ہیں۔ ہندوستان گیر سطح پر اردو زبان اختیار کر کے پڑھنے والوں کے لئے کوئی قابل ذکر وظیفہ کوئی اسکالرشپ یا مسابقت کا کوئی پرکشش گوشہ نظر نہیں آتا۔ کل ہند سطح پر اردو طلبہ کے لئے مضمون نویسی یا مقالہ نگاری کا کوئی مقابلہ منعقد بھی ہوتا ہے تو وہ بذات خود اردو کی غریبی کا اشتہار ہوتا ہے۔ انعامات کی گرانقدر رقم بالترتیب دو سو، تین سو اور پانچ سو روپے یعنی ۲۰، ۳۰ اور ۵۰ ریال سے متجاوز نہیں ہوتی۔ کوئی بھاری بھرکم پرکشش انعام نہیں ہوتا۔ حکومت کی سرپرستی میں چلنے والی اکاڈمیاں جن انعامات سے نوازتی ہیں وہ بھی ستم ظریفی کا عجیب اظہار ہے۔ خلیجی سطح پر کیا کوئی ایسا ادارہ یا سلسلہ نہیں قائم کیا جاسکتا جس سے ہندوستان کی جامعات کے شعبہ ہائے اردو میں کشش و مسابقت کی مختلف شکلیں پیدا کی جاسکیں اور ان طلبہ کی ہمت افزائی ہو جو یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ اردو کا کوئی مستقبل نہیں محض اپنے ذوق و شوق اور شعبۂ اردو کے تحفظ و بقا کی خاطر اردو پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کیا کوئی فنڈ اردو کے معیاری جرائد کی زندگی کے لئے نہیں قائم کیا جاسکتا....؟؟؟ خلیج کی مختلف ریاستوں میں ہر سال آٹھ سے دس لاکھ روپیہ چند مخصوص شعرا پر نچھاور کر دینا اور یہ سمجھنا کہ زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام ہو رہی ہے نہ صرف ایک قسم کی خوش فہمی ہے بلکہ زبردست قسم کی اردو فریبی بھی ہے اور وقت سے زر کثیر اور صلاحیتوں کا ضیاع بھی!!! غریب اردو کے نام پر اسراف کی ایک کڑی شخصی جشن منانے کی بدعت حسنہ بھی ہے اس میں بھی نوازش ہائے بیجا اور شکایت ہائے رنگین کا سنگین سلسلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شاعر کا جشن پے یک جشن کم پانچ جگہ منایا جائے تو یہ گلہ یقینی ہے اور اس اعزاز پر سوالیہ نشان نہ لگانا بے حسی بھی ہے اور بے اعتدالی کی توسیع و تائید بھی....!!! کیونکہ صرف ایک ہفتے کے اندر پانچ مرتبہ ایک ہی جشن کا اہتمام اور ہر جگہ ایک ہی بات کا اعتراف کرنا اور ہر جگہ اس پر خطیر رقم صرف کرنا دانشمندی کا اظہار یقیناً نہیں ہے اس کے علاوہ سوالیہ نشان کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ خدمات کا اعتراف کسی دانشگاہ، کسی قومی ادارے، کسی اکاڈمی یا پھر حکومتی سطح پر کیا جاتا ہے شخصی سطح پر نہیں اور اردو زبان و ادب کی نتیجہ خیز خدمت اسے قرار نہیں دیا جاسکتا ہے ہاں نوازش ضرور کہا جاسکتا ہے اور نوازش کیلئے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی، نوازش کسی بھی بنیاد پر ہو سکتی ہے، اور کسی پر بھی کی جاسکتی ہے....

ان گزارشات کی روشنی میں ممکن ہے مجھ پر بدذوقی، ناقدری و ناسپاسی کا الزام عائد کیا جائے لیکن دست بستہ عرض ہے کہ اردو کی ان نئی بستیوں کی ہمت شکنی یا ان کی خدمات کی ناقدری، لاسمتی و بے جہتی کا اظہار مقصود نہیں ہے، اردو کی یہ تمام نئی بستیاں اپنے اپنے دائرہ عمل میں جو خدمات انجام دے رہی ہیں وہ قابل قدر اور قابل ذکر حیثیت کی حامل ہیں اور شعر و ادب کے سلسلے میں ان کا تعاون مستحسن بھی ہے اور مبارکباد کا مستحق بھی اس کا اعتراف بھی کیا جانا چاہیے لیکن ۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کے مصداق اردو کے لئے جہان نو کی تلاش اور اردو کی نئی بستیوں کے حوصلے کی آزمائش کے لئے نئے افق کی جستجو ان گزارشات کا اصل مقصود ہے اور اردو کے لئے جہان نو کی تلاش میں شرکت کی یہ ادنیٰ کوشش ہے ہاں البتہ مقطع کی سخن گسترانہ بات کے لئے معذرت چاہتے ہوئے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خلیج میں اردو کے نام پر وقت، زر کثیر اور صلاحیتوں کے استحلال و استحصال کے علاوہ افراط و تفریط کا جو سلسلہ ہے اسے صحیح سمت اور صحیح رخ دینے کا متلاشی و تمنائی ہوں اور تمنا کا اظہار یقیناً گناہ نہیں ہے ۔

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

● P.O. Box 10894, Doha - Qatar (A.G.)

○ عطاء الرحمٰن صدیقی کا یہ مضمون شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے چند سال پیشتر موصول ہوا تھا۔ خاص نمبر کے لئے ایک باب 'اردو کی نئی بستیاں' کے عنوان سے موسوم تھا لیکن ضخامت کی وجہ سے دیگر اہم ابواب کی طرح یہ باب بھی جلد اوّل میں شامل نہ ہو سکا۔ مذکورہ باب کے کچھ مندرجات اب یہاں شائع کئے جا رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ مضمون بھی ہے۔ اس کے بعض بنیادی نکات آج بھی اہم ہیں تاہم اردو کی نئی بستیوں میں خصوصاً خلیجی ممالک میں، حالیہ برسوں میں خاصی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اردو کے اخبارات، کتابیں، رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ہندوستانی، پاکستانی اسکول قائم ہیں اور ان میں اردو زبان کی تدریس ہو رہی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں بسنے والے افراد اپنا پاسپورٹ اور اپنا وقت اپنے اپنے کفیل کے پاس گروی رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی زبان اور اپنی ثقافت کے لئے کچھ کرنا بڑی بات ہے ۔ جو اردو وہاں جس سطح پر بھی کام کر رہا ہے وہ قابل قدر ہے۔ ہاں انھیں میں سے نئے امکانات پر غور کیا جاتا اور ان پر عمل کیا جانا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے عمیق مشاہدے کے بعد جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے اتفاق و اختلاف کی گنجائش ہے لہٰذا اس مضمون کے بیشتر نکات کو موضوع بحث بننا چاہیے۔ (الف الف)

سائیں سُچا

شناخت کی تلاش

اسٹاک ہوم میں جنوبی ایشیا کے ادیبوں کی دس روزہ ورکشاپ کا انعقاد ایک مشترکہ خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا تھا۔ وہ خواب جو میں نے اور خالد سہیل نے مل کر دیکھا تھا۔ جب ہم دونوں ۱۹۸۶ء میں ترقی پسند تحریک کی پچاسویں سالگرہ کے جشن کے موقع پر لندن کے مغربی حصے کے ایک ہوٹل میں ملے تھے تو ہم کافی دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران نہ صرف ہمیں یہ احساس ہوا تھا کہ اپنی تحریروں اور اظہار بیان کے جدا ہونے کے باوجود ہم نظریاتی طور پر کافی قریب

تھے، بلکہ ہمارے دلوں میں یہ بھی خواہش انگڑائی لے رہی تھی کہ اگر ہم باقی ادیبوں کے ساتھ چند دن مل کر گزاریں تو ایک دوسرے کے خیالات، تجربات اور ادبی کاوشوں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم پوری کوشش کریں گے کہ باقی ادیبوں سے رابطہ قائم کریں اور کہیں چند دنوں کے لئے مل بیٹھیں۔ اس فیصلے کے بعد چار سال کی محنت، بیسیوں ٹیلیفون اور خطوط سے چند روسر پھرے ادیب اس بات پر متفق ہوئے کہ وہ سویڈن میں دس دنوں کے لئے جمع ہوں گے اور انہی ادیبوں کی موجودگی اور معاونت کی وجہ سے وہ ورکشاپ ایک کامیاب میٹنگ ثابت ہوئی۔ ادیبوں کی یہ ورکشاپ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ء کو شروع ہو کر ۸۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ اس ورکشاپ کا نام "شناخت کی تلاش" رکھا گیا تھا۔ یہ دس روزہ ورکشاپ تین حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ دو شاموں کے مذاکروں، دوسرا حصہ شاعری اور فکشن کی تنقیدی نشستوں اور تیسرا حصہ ایک بین الاقوامی شعری محفل پر مشتمل تھا جس میں اردو اور پنجابی شاعروں کے ساتھ سویڈش شاعروں نے [illegible] پیش کی تھیں۔

ورکشاپ کے پہلے حصے کا آغاز ۳۰ ستمبر کی شام کو ہوا۔ سب سے پہلے میزبان نے مہمان ادیبوں کو خوش آمدید کہا اور ورکشاپ کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے چار سالوں کی محنت اور دوستوں کی رفاقت کا ذکر کیا جس کے بغیر اس ورکشاپ کا انعقاد ممکن نہ تھا۔ میزبان نے ان ادیبوں کا بھی ذکر کیا جو اس ورکشاپ میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن بعض حالات اور مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ مذاکرہ شروع ہونے سے پہلے ادیبوں نے یہ طے کیا کہ مذاکرے کو کامیاب بنانے کے لئے وہ حتی الامکان کوشش کریں گے کہ بعض باتوں کا خیال رکھیں :

(۱) ہر ادیب کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کی پوری پوری آزادی دی جائے۔ (۲) حاضرین میں سے ہر شخص کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ جو چاہے سوال کرے۔

(۳) مذاکرے کے دوران اس بات کو پیش نظر رکھا جائے گا کہ اس تبادلہ خیال کا مقصد ایک دوسرے کے جذبات، افکار اور تجربات سے آگاہی حاصل کرنا ہے نہ کہ سچ اور جھوٹ کے جھگڑوں میں الجھنا۔

مذاکرے کا دوسرا حصہ یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء کی شام کو منعقد ہوا۔ اور پہلے حصے کی گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھایا گیا۔ جب مذاکرے کا آغاز ہوا تو گیارہ ادیب موجود تھے لیکن اس کے اختتام تک حاضرین کی تعداد پچیس ہو گئی تھی۔ نئے مہمانوں کی شمولیت کے باوجود حتی الامکان کوشش کی گئی کہ گفتگو کا تسلسل منقطع نہ ہو۔ وہ دو شاموں پر مشتمل مذاکرہ نہایت دلچسپ اور فکر انگیز ثابت ہوا۔ اس گفتگو کے دوران ادیبوں کی اس خواہش کا بھرپور اظہار ہوا کہ وہ سب چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کی روداد سفر سن سکیں اور جان سکیں کہ چونکہ وہ سب مشرق کو چھوڑ کر مغرب میں آ بسے تھے اور ان سب کا ادب اور فنون لطیفہ سے گہرا رشتہ تھا تو آخر اس سفر نے انہیں ذاتی اور تخلیقی سطح پر کس طرح متاثر کیا تھا۔ ان راستوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے کیا کھویا تھا اور کیا پایا تھا اور اس طویل مسافت کے بعد کیا وہ اپنے آپ کو مشرقی سمجھتے تھے یا مغربی، اور اگر اس سفر کے دوران ان کی شخصیت، سوچ اور شناخت بدل گئی تھی تو یہ تبدیلی سفر کے کس موڑ پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔

جب "شناخت کی تلاش" کے موضوع پر اظہار خیال کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلی بات یہ سامنے آئی کہ شناخت کی تلاش کا تجربہ صرف مہاجرین تک ہی محدود نہیں۔ ہر وہ شخص جو اپنی زندگی اور ذات کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا ہے اور حالات کا تجزیہ کرتا ہے اس عمل سے گزرتا ہے چاہے وہ اپنے ملک میں رہے یا ہجرت کر کے کہیں اور جا بسے۔ مذاکرے کے شرکاء اس بات پر متفق تھے کہ ہجرت کا تجربہ اگرچہ ایک تکلیف دہ تجربہ تھا لیکن اس تجربے نے شخصیات میں نکھار پیدا کیا تھا اور انہیں قلب ماہیت کے تجربے سے روشناس کرایا تھا جس میں پرانی شخصیت کے رنگ ہلکے اور نئی شخصیت کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔ ان ادیبوں کا خیال تھا کہ نئی شخصیت زیادہ وسیع النظر اور بالغ نظر ہے۔ وہ ماضی کے تنگ نظر خیالات سے آزادی کی خواہاں ہے اور بوسیدہ روایات کی زنجیروں سے نجات حاصل کرنے کی متمنی ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات نے یہ واضح کر دیا تھا کہ حقیقت کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں اور کسی ایک رخ پر اصرار کرنا اور باقی رخوں کو ٹھکرا دینا دانائی کی علامت نہیں۔

اس مذاکرے کے دوران شخصیت (Identity) اور شناخت Identification کے فرق پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ بعض شرکاء کا خیال تھا کہ Identity کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے جبکہ Identification کا تعلق اس گروہ کے ساتھ ہے جس کے ساتھ کوئی انسان زندگی گزارتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان آپ کو پنجابی سمجھتا ہو لیکن اگر اس کے ساتھ زندگی گزارنے والے اسے پنجابی نہیں سمجھتے تو معاشرتی طور پر ایک نئی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ ادیبوں کا خیال تھا کہ چونکہ ان کا کاغذ اور قلم سے گہرا رشتہ ہے اور جب ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات، شعر، مضمون یا افسانے کا روپ دھار لیتے ہیں تو انفرادی تجربات اجتماعی تجربات کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو اسی قسم کے تجربات سے گزرے ہوتے ہیں ان تحریروں کو اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ تحریریں لکھنے اور پڑھنے والوں کو اپنے ماحول کے ساتھ ایک نئے رشتے میں منسلک کر دیتی ہیں۔ ان ادیبوں کا خیال تھا کہ بعض مہاجرین نئے ماحول کے ساتھ جلد رشتہ قائم کر لیتے ہیں بعض دیر سے اور بعض ایک گہرا اور قریبی تعلق قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ نئے ماحول میں زندگی کی کامیابی اور نئے حالات کے ساتھ سمجھوتہ بہت سی تبدیلیوں اور قربانیوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ نئے ماحول میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے مہاجرین کو نہ صرف نئے طور طریقے سیکھنے پڑتے ہیں بلکہ اپنے نظریات اور خیالات میں وسعت بھی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ مغربی دنیا میں پہلی نسل کے لاکھوں ایشیائی مہاجرین اور تارکین وطن ایسے بسے ہوئے ہیں جو جسمانی طور پر تو نئے ماحول میں رہ رہے ہیں، لیکن جذباتی، ذہنی اور ثقافتی طور پر پرانے ماحول سے جڑے ہوئے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا ادب ان تجربات اور ان مسائل کی عکاسی کرتا ہے یا نہیں اور جو ادب تخلیق ہو رہا ہے کیا وہ ان لوگوں تک پہنچتا ہے جن کی زندگیوں سے اس ادب کا گہرا رشتہ ہے۔ وہ ادب جو مہاجرین کی آرزوؤں کی ترجمانی کرتا ہے اور تارکین وطن کی تاریک راہوں میں روشنی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ مہاجر ادیبوں کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ اپنے آبائی وطن سے تو کتابیں اور رسائل منگوا لیتے ہیں لیکن

دوسرے مہاجر ادیبوں کی تحریروں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ تارکین وطن اور مہاجر ادیبوں کو ایسے پبلشر مشکل سے ملتے ہیں جو ان کی تخلیقات کو چھاپ کر دور دور تک تقسیم کر سکیں اور کسی بھی کتاب کو چھوٹے پیمانے پر چھاپنے کی قیمت ناقابل برداشت ہوتی ہے اس مسئلہ کا ایک حل یہ تجویز کیا گیا کہ مختلف ملکوں میں رہنے والے مہاجر ادیب مل کر کسی ایسے بین الاقوامی ادارے کی داغ بیل ڈالیں جو ان کتابوں کی مختلف ملکوں میں فراہمی کا انتظام کر سکے۔ ان کا خیال تھا کہ جب ہم پہلی نسل کے مہاجرین کے مسائل اور ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی جدوجہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مہاجر تین گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

- ○ پہلا گروہ ان مہاجرین کا ہے جو پرانے رشتوں کو توڑ کر نئے ماحول میں نئے رشتے جوڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور نئے معاشرے میں بھرپور شرکت کرنے لگے ہیں۔
- ○ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ماضی اور فردا کے رشتوں میں ایک پُل بنانے کی اور مشرقی اور مغربی اقدار اور طرز زندگی میں ایک توازن قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔
- ○ تیسرا گروہ ان مہاجرین کا ہے جو مغرب میں رہ تو رہے ہیں لیکن مغرب میں مستقل قیام کرنا نہیں چاہتے وہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ایک دن واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے وہ مغرب کی معاشرت میں گھل مل کر رہنے سے کتراتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ملازمت کے دوران مجبوراً ۹ سے ۵ بجے تک یورپین یا شمالی امریکی ماحول میں ان کا طرز معاشرت اپناتے ہیں۔ لیکن فارغ اوقات میں اپنا پسندیدہ مشرقی طرز زندگی اپنا لیتے ہیں۔

ایشیا کے مہاجرین کے پہلے گروہ کی تعداد یورپ اور شمالی امریکہ دونوں میں بہت کم ہے۔ البتہ یورپ میں تیسرے گروہ کی اور شمالی امریکہ میں دوسرے گروہ کی تعداد زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ شاید یہ ہے کہ یورپ میں مزدور طبقہ کے لوگ زیادہ ہیں۔ جبکہ شمالی امریکہ میں مزدور اور پروفیشنلز کی تعداد متوازن ہے۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ شمالی امریکہ میں مہاجرین کو یہ احساس نہیں کہ کلونیل colonial حکومتوں کے زیر سایہ رہ رہے ہیں۔ اس لئے ان میں یورپ میں ایشیائی مہاجرین کی نسبت غصے اور نفرت کے جذبات کم ہیں۔ ایشیا کے وہ مہاجرین جو انگلینڈ، فرانس اور ہالینڈ میں رہ رہے ہیں ان میں سے اکثریت کے ذہنوں پر ابھی تک کلونیلزم کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند ایک خوش قسمت انسان ایسے ہیں جو مغربی معاشرے میں بھرپور شرکت کر سکے ہیں اور اپنا معاشرتی مقام بلند کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ان معاشرتی حالات اور مسائل کا اظہار ان تخلیقات میں بھی ہوا ہے جو یورپ اور شمالی امریکہ کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ یورپ کے تخلیقی ادب میں غصہ، بے اطمینانی، نوسٹلجیا اور علیحدگی پسند جذبات کا اظہار زیادہ ہے جبکہ شمالی امریکہ کے ادب میں باہمی مل جل کر رہنے، خیر سگالی اور مسائل پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کا اظہار زیادہ ہے اور غصے کے جذبات کم ہیں۔ بعض ادیبوں کا خیال تھا کہ شمالی امریکہ میں بھی مزدور پیشہ لوگوں کو پروفیشنلز کی نسبت تعصب اور دیگر مسائل کا سامنا زیادہ کرنا پڑتا ہے۔

مذاکرے کے دوران ادیبوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ ہجرت کے سفر میں دو طرح کے عوامل فعال ہوتے ہیں: Push Factors وہ عوامل جو لوگوں کو اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ Pull Factors وہ عوامل جو دوسرے ممالک میں جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بعض ممالک میں ایسے حالات پیدا ہوئے جنھوں نے لوگوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا، جن میں حالات کا جبر اور مخدوش معاشی اور معاشرتی حالات شامل تھے۔ جب لوگ اپنا ملک چھوڑنے پر تیار ہو گئے تو وہ ایسے ممالک کی تلاش میں نکلے جہاں بہتر مستقبل کی امید تھی۔ اس عمل کی ایک مثال دوسری جنگ عظیم کے بعد کا دور تھا۔ جب یورپ میں مزدور پیشہ لوگوں کی بہت ضرورت تھی اور یورپی ممالک نے غریب ممالک کے عوام کو ترغیب دی کہ وہ وہاں جا کر کام کریں۔ اس طرح یورپ نے وہ مزدور جو غریب ملکوں نے برسوں کی محنت اور ریاضت سے تیار کئے تھے سستے داموں خرید لئے۔ شروع میں کسی کا بھی خیال نہیں تھا کہ یہ مزدور پیشہ لوگ ان یورپی ممالک کو اپنی مستقل رہائش بنا لیں گے۔ سب سمجھتے رہے کہ ایشیا اور افریقہ کے یہ مزدور چند سال یورپ میں رہیں گے اور پھر واپس چلے جائیں گے۔ لیکن معاشی نظام اور کارخانوں پر نظر رکھنے والے ماہرین انسانی نفسیات کو نظر انداز کرتے رہے۔ جب زندگی کی بنیادی ضروریات پوری ہونے لگیں تو مہاجرین اور تارکین وطن نے اپنی جذباتی، معاشرتی اور تخلیقی ضروریات کی طرف توجہ مبذول کی اور ان لوگوں کے ساتھ نئے رشتے استوار کئے جن کے ساتھ وہ کام کرتے تھے اور زندگی گزارتے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ یورپ میں مہاجرین کی تعداد بڑھنے لگی۔ ایک اندازے کے مطابق آج کل یورپ میں ایشیا اور افریقہ کے مہاجرین کی تعداد تقریباً ۱۵ ملین ہے۔ اگرچہ مہاجرین کی اکثریت مزدور پیشہ تھی لیکن بعض مہاجرین پڑھے لکھے تھے۔ نہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھایا اور ایسی تخلیقات تحریر کیں جن میں مہاجرین کے مسائل کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اور ان پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔

مذاکرے کے دوران "بین الاقوامی ادب" کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا گیا۔ بعض ادیبوں کا خیال تھا کہ چونکہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے اور دنیا کے ایک حصے کی خبریں چاہے وہ سیاسی ہوں یا ادبی۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبار و رسائل کے ذریعے دنیا کے ہر کونے میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس لئے میڈیا کے اصحاب بست و کشاد عوام و خواص تک پہنچنے والی اطلاعات پر کافی اختیار رکھتے ہیں۔ اس صورت حال نے ادب کو بھی متاثر کیا ہے اور وہ ادب جو پہلے کسی ملک کی حدود سے باہر نہ نکلتا تھا آہستہ آہستہ ساری دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ان حالات کا خطرہ یہ ہے کہ اگر میڈیا ان چند لوگوں کے ہاتھ آ گیا جو بڑی بڑی بین الاقوامی انجمنوں کے مالک ہیں تو وہ عوام و خواص کو صرف ان خبروں، حالات، واقعات اور ادب سے واقف ہونے دیں گے جن سے ان کے مفادات کو تقویت ملے گی اور وہ ایسے ادب کو دبانے کی کوشش کریں گے جن سے ان کے معاشی سیاسی یا معاشرتی مفادات مجروح ہوں گے۔ اس وقت ہر ملک میں ایسی چھوٹی چھوٹی انجمنوں کی کمی ہے جو ان بین الاقوامی تجارتی انجمنوں کے جذبات کو لگام

ے سکیں اور ایک متوازن صورت حال پیدا کر سکیں۔

مذاکرے کے دوران سوال یہ پیدا ہوا کہ ہم مستقبل میں کس ادب کو بین الاقوامی ادب کہہ سکیں گے۔ کیا بین الاقوامی ادب وہ ادب ہو گا جو بین الاقوامی سنوں کی ترغیب پر تحریر کیا گیا ہو، جس میں مخصوص گروہوں کے مفاد اور نقطہ نظر کی تبلیغ کی گئی ہو اور اسے ساری دنیا میں پروپیگنڈا کے زور پر پھیلایا گیا ہو یا وہ ادب ے مختلف سماجی، معاشرتی اور نظریاتی اقلیتوں کے افراد نے تخلیق کیا ہو۔ پہلی صورت حال میں ایک ملک کا بہترین اور مقبول عام ادب ساری دنیا کا مقبول عام ادب بن ئے گا اور دوسری صورت حال میں ایک ہی تجربے یا کیفیت کو مختلف زاویوں سے پیش کیا جائے گا۔ ان دونوں صورتوں کی مثال سورج کی روشنی سے دی جا سکتی ہے۔ کیا رج کی روشنی سفید ہے جو ساری دنیا میں یکساں طور پر چمکتی ہے، یا سورج کی روشنی سات مختلف رنگوں پر مشتمل ہے اور ہر رنگ اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم ہر نگ کی اہمیت کو قبول کئے بغیر سورج کی سفید روشنی کا تصور نہیں کر سکتے۔ ادیبوں کا خیال تھا کہ دوسری صورت حال اس لحاظ سے بہتر ہوتی کہ اس میں انسانی زندگی کے لف رنگوں کو ادب میں جذب کیا جا سکے گا اور عوام و خواص انسانی زندگی کو مختلف زاویوں اور نقطہ ہائے نظر سے دیکھ سکیں گے۔ جب مختلف ادیبوں سے ان کی شناخت ے بارے میں ذاتی سطح پر سوال کئے گئے تو ان کے جوابات نہایت دلچسپ تھے۔ ادیبوں کی اکثریت نے زبان کے اشتراک کو ایک اہم قدر جانا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ زبان سے ایسے جڑے ہوئے ہیں جس طرح بچے آنول کے ذریعے اپنی ماؤں سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے زبان کی آنول ایک نفسیاتی تسکین کا وسیلہ تھی۔ ہم سب جانتے ں کہ زبان انسانی شخصیت اور ذہنی ساخت میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے ادیب مختلف ممالک کی مختلف زبانوں میں تجربوں کے بعد بھی جب ان تجربات کا لیقی اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہی زبان استعمال کرتے ہیں جس کی آغوش میں ان کا بچپن گزرا ہو۔ اس طرح مختلف زبانیں قومی اور بین الاقوامی، ذاتی اور اجتماعی، انفرادی ر معاشرتی تجربات میں پلوں کا کام کرتی ہیں اور انسان زبان کے ذریعے اپنے گھر اور ماحول میں رہنے کے باوجود ساری دنیا سے جڑ رہ سکتا ہے۔ ادیبوں نے اس حقیقت کا ں اظہار کیا کہ اپنے ملک اور معاشرے سے نکل کر دوسرے ملکوں اور معاشروں میں رہنے سے ان میں انسانی ہمدردی اور بین الاقوامی اخوت کے جذبات پروان چڑھے ں۔ مغرب میں رہنے سے وہ ملک، مذہب، زبان اور کلچر کی تنگ حدود سے نکل کر ایک عالمی پس منظر میں انسانی زندگی، جدوجہد اور ارتقا کو سمجھنے کے قائل ہوئے ہیں۔ ہوں نے اپنے نظریات اور طرز زندگی کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے نظریات اور طرز زندگی کا بھی احترام کرنا سیکھا ہے۔ چاہے وہ نظریات ان کے اپنے ریات سے مختلف اور متضاد ہی کیوں نہ ہوں ان کا خیال تھا کہ مختلف انسانوں کا انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک دوسرے کو احترام کی نگاہ سے دیکھنا اور انہیں قبول کرنے کے لئے اپنے بازو وا کرنا ایک احسن جذبہ تھا۔ ادیبوں کا خیال تھا کہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواب دیکھنا اہم تھا جس میں ساری دنیا کے انسان ظلم اور جبر سے نجات کر ایک آزاد اور باعزت ماحول میں زندگی گزار سکیں۔

ان ادیبوں کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ اگرچہ ایک بین الاقوامی انسانی برادری کا خواب دیکھنا احسن عمل ہے لیکن وہ اس حقیقت سے ناآشنا نہ تھے کہ عملی ندگی میں انہیں ہر موڑ پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ایک انسان کا دوسروں کو ہمدردی اور خلوص سے ملنے کا لازمی نتیجہ یہ نہیں کہ وسرے بھی اسے اسی جذبہ سے قبول کریں۔ بعض ادیب جو پرانے شہروں میں ذہنی تنہائی Inteleectual Isolation کا شکار تھے نئے شہروں میں معاشرتی تنہائی Social Isolatio کی صلیب اٹھائے پھر رہے تھے۔ بعض تو جذباتی، معاشرتی اور نظریاتی طور پر اتنے بدل گئے تھے کہ نہ صرف ان کے اپنے قبیلے نے انہیں قبول رنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ نئے معاشرے نے بھی انہیں اتنا مختلف پایا تھا کہ وہ انہیں اپنے میں سے ایک ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح وہ دو تہذیبوں کے درمیان علق محسوس کرتے تھے۔ ادیبوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ بیک وقت دو تہذیبوں میں زندگی گزارنے کا کرب پہلی نسل کے لوگوں کے حصے میں دوسری اور تیسری نسل کے لوگوں کی نسبت زیادہ آیا تھا۔

مجموعی طور پر "شناخت کی تلاش" کے موضوع پر ادیبوں کا تبادلۂ خیال بہت دلچسپ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مذاکرے کے دوران ادیب اپنی روح کے ئی گوشوں سے پردہ اٹھا رہے تھے اور خود آگہی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ادیبوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ ان کی روزمرہ زندگی میں انہیں ایسے مواقع میسر نہیں آتے ب ایشیائی مہاجر مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں تو وہ میزبان تہذیب کے علاوہ ایک دوسرے سے بھی کٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ کئی محفلوں میں زندہ رہنے والے مختلف ُرقوں سے ایک دوسرے سے تخلیقی سطح پر بھی کٹ جاتے ہیں۔ اس مذاکرے میں سلمان رشدی، وی ایس نیپال، انیتا ڈیسائی اور کئی دیگر ادیبوں کی تحریروں پر بھی تبادلۂ خیال ہوا اور مشرق اور مغرب کے ادبی دھاروں اور روایات کی آمیزش کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ ادیبوں کا خیال تھا کہ جوں جوں مشرقی ادیب مغرب کی زندگی کے قریب آتے چلے جاتے ہیں ان کی سوچ اور اظہار کے رنگ بدلنے لگتے ہیں۔ اور ان کے تجربات کے ساتھ ان کے انداز میں بھی پختگی آتی چلی جاتی ہے۔

ادیبوں نے ایک دوسرے کو دوسری زبانوں کے ادب پڑھنے اور ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا تاکہ انہیں دوسری قوموں کے تجربات سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ انہوں نے بین الاقوامی ادب کو اردو، پنجابی، ہندی اور دیگر ایشیائی زبانوں میں ترجمہ کرنے کے بارے میں گفتگو کی تاکہ ایسے تخلیقی پل تعمیر کئے جا سکیں جو ادبی اور معاشرتی زندگیوں کے رابطے بڑھا سکیں۔ اس بھرپور مذاکرے کے بعد اگلے چند دنوں میں شعری اور فکشن کی تنقیدی نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات پیش کیں، اور حاضرین نے ان پر سیر حاصل بحث کی۔ اس ہفتے میں ایک ایسی محفل کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس میں سویڈش شاعر اور حاضرین بھی شامل تھے۔ اس محفل میں اردو اور پنجابی شاعروں کا کلام سویڈش میں اور سویڈش شاعروں کا کلام انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ (تلخیص و ترجمہ: خالد سہیل)

● Vudya Kitaban, Box. 6099, S - 19106 Sollentuna - Sweden.



خالد سہیل

شمالی امریکہ میں اردو ادب

شمالی امریکہ میں اردو ادب کا سب سے زرخیز اور درخشاں باب شاعری ہے جسے مشاعروں اور نجی محفلوں نے بہت فروغ دیا ہے۔ کسی مشاعرے میں بیس تیس شاعروں کا کلام سنانا اور سیکڑوں سامعین کا سننا ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔ چوں کہ شاعروں کی فہرست طویل ہے، اس لئے میں اپنے اس مختصر سے خط میں صرف ان شاعروں کا ذکر کروں گا جن کی شاعری کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور اس وقت جن کے نام مجھے یاد ہیں۔ ان شاعروں میں مظفر شکوہ (نوحۂ ناتواں)۔ رشیدہ عیاں (حرف حرف آئینہ)۔ طلعت اشارت (اشارت)۔ نور احمد شیخ (نوشتۂ دیوار)۔ عرفانہ عزیز (برگ ریز، کف بہار)۔ اختر احسن (گیا گھر میں لگا)۔ سلمان اختر (دوسرا گھر)۔ اشفاق حسین (اظہار)۔ ظفر زیدی (زخم زخم اجالا)۔ حمیرا رحمان (اندمال)۔ نزہت صدیقی (ندائے امن)۔ فاروق حسن (نئی پرانی نظمیں)۔ ابرار الحسن (دائرے شاہین (بے نشان)۔ اور منیب الرحمٰن (بازدید، شہر گمنام) شامل ہیں۔ ہم ان شاعروں کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے سکتے ہیں۔ اگر ان کی تخلیقات کا فارم (Form) لحاظ سے بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں اردو شاعری کی قدیم و جدید روایات کے سب ہی رنگ نظر آ جائیں گے۔ ایک طرف ایسے شاعر کھڑے ہیں جن کے کلام کلاسیکی غزل کی خوشبو، ردیف قافیے کا فن کارانہ استعمال اور تشبیہات و استعارات کی چاشنی رچی بسی ہے۔ مظفر شکوہ، رشیدہ عیاں اور طلعت اشارت کے کلام میں اس بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ ان سے تھوڑا سا ہٹ کر ایسے شاعر کھڑے ہیں جن کی شاعری میں نیم کلاسیکی رنگ بہت گہرا ہے اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج نظر آتا۔ ان کی غزلوں میں نظم کا رنگ اور نظموں میں غزل کی خوشبو بھری ہوتی ہے، اشفاق حسین۔ عرفانہ عزیز۔ حمیرا رحمان اور سلمان اختر کی شاعری میں اس کی بہت جھلکیاں نظر آئیں گی۔

ان سے ذرا آگے بڑھیں تو ایسے شاعر ملیں گے جن کی شاعری غزل کے سحر سے نکل کر نظم کی سادگی اور جذبوں کی شدت سے نکل کر خیال کی توانا طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ ابرار الحسن۔ فاروق حسن اور منیب الرحمٰن کی شاعری میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک قدم اور آگے بڑھیں تو اردو شاعر روایتی نظم کو چھوڑ کر نثری شاعری کو گلے لگاتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ظفر زیدی کی نثری نظموں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے خیال میں امریکہ کی شاعری کی شناخت اس کے فارم (Form) کی بجائے اس کے مواد (Content) اور رجحانات (Attitudes) پر زیادہ مبنی ہے جو شمالی امریکہ کی معاشہ زندگی کی بہتر عکاسی کرتی ہے۔ اس شاعری نے بہت سے ایسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے جو اردو شاعری میں گرانقدر اضافہ ہے اور اس نے مہمان اور میز تہذیبوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان موضوعات پر سر فہرست ہجرت کا تجربہ ہے۔ اس ہجرت کا ایک پہلو تو ایسا ہے جس کا سامنا ایسے تمام مہاجرین کو پڑتا ہے جو ایشیا سے یورپ اور شمالی امریکہ کی طرف کوچ کرتے ہیں، ان مہاجرین کو نئے ماحول میں:

روزمرہ کی مشینی زندگی، سیکڑوں کلومیٹر کے فاصلے، والدین کی ملازمت، بچوں کا ڈے کیر جانا۔ زبان، لباس، کھانا، تعلیم اور کلچر کے مسائل۔ آزادئ تقریر کی جدوجہد اور بہت سے دیگر اہم تجربات سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں شمالی امریکہ میں ایشیائی مہاجروں کا تجربہ یورپ کی ہجرت کے تجربے کئی لحاظ سے مختلف ہے، شمالی امریکہ کے ایشیائی مہاجروں میں Working class people اور Professionals کا تناسب مختلف ہے، یہاں آپ کو ڈاکٹ انجینئرز، وکیلوں، بزنس مین اور کئی اور پروفیشنلز کے خاندانوں کی تعداد یورپ کی نسبت زیادہ ملے گی۔ اس لئے عام طور پر انہیں معاشی مسائل اور معاشرتی دشواریوں سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ان کو شمالی امریکہ کی زندگی سے استفادہ کرنے کے زیادہ مواقع میسر ہو سکے۔ اس کے علاوہ شمالی امریکہ کے ایشیائی مہاجروں کے سر پر کلونیلزم آسیب کا سایہ بھی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے ان کے ہاں ہجرت کا دکھ اور بے گھری کا احساس تو شدید ہے لیکن غصے اور نفرت کے جذبات کم ہیں۔

شمالی امریکہ کی اردو شاعری میں ایک اور پہلو بہت نمایاں ہے اور وہ اگلی نسل سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایشیائی مہاجر اپنے بچوں کے لئے اعلیٰ زندگی کی راہ ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ اس بارے میں بھی متفکر رہتے ہیں کہ وہ مغرب کی زندگی، روایات اور اقدار میں اتنا بھی نہ کھو جائیں کہ مشرق سے ناطہ بیٹھیں اور اپنی مشرقی روایات کو فراموش کر ڈالیں۔ والدین اور بچوں کے رشتوں کے عکس جگہ جگہ اردو شاعری میں نظر آتے ہیں، اگرچہ پہلی نسل کے اکثر والدین ا تک ماضی سے اس حد تک جذباتی طور پر وابستہ ہیں کہ بچوں کو مشرقی اقدار سے روشناس اور اس پر عمل پیرا کرانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ پہلی نسل حقیقت پسندانہ رویہ رکھنے والے والدین اور خصوصاً ایسے لوگ جنھوں نے شمالی امریکہ کے باسیوں کو شریک حیات بنالیا ہے اپنے بچوں کو اپنے ماحول اور فردا کے خوابوں سے کھیلنے اور نئے رشتے جوڑنے کی آزادی دیتے ہیں اور ماضی کو پاؤں اور ذہنوں کی بیڑیاں بنانے سے احتراز کرتے ہیں اشفاق حسین کی شاعری میں اس رو عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ شمالی امریکہ کی اردو شاعری کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اکثر شاعروں میں اپنی ذات، خاندان اور قوم کے مسائل کا شعور تو ملتا ہے لیکن شمالی امریکا معاشرتی زندگی کو ابھی تک قریب سے دیکھنے کا رویہ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مقامی لوگوں سے گھل مل کر رہنے سے کتراتے ہوں اور جذباتی رشتے استوار کر سے احتراز کرتے ہوں۔ ویسے چند مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں جن میں شمالی امریکہ کی زندگی کو اندر سے دیکھنے کی سعی نظر آتی ہے سلمان اختر اور ظفر زیدی کی شاعری

ںکوشش کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اردو شاعری جو ایشیا میں ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکوں کے زیر سایہ پلی بڑھی اور سیاسی اور نفسیاتی عوامل کی عکاسی کرتی رہی اس نے شمالی امریکہ میں ۔نئی بصیرتیں پائیں اور اپنے معاشرتی پہلو (Social Dimension) کا بھرپور اظہار کیا۔ اردو کے شاعروں نے نہ صرف معاشرتی مسائل پر تبصرے کئے بلکہ بین قوامی امن کے موضوع تک اظہار خیال کیا، عالمی امن کے موضوع پر نزہت صدیقی کی چند نظمیں فنی اور معنوی اعتبار سے عمدہ کوششیں ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی مائل پر اظہار خیال کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ میں آکر ایشیائی شاعروں کا فطرت سے بھی نیا رابطہ قائم ہوا ہے وہ ماحول جہاں ہر موسم نئے گل کھلائے، خزاں بہار سے بین تر دکھائی دے، لوگ دھوپ کی شدت کا خیر مقدم کریں، سایہ ابر سے گھبرائیں اور Acid rain اور جنگلوں کے کٹ جانے کے خلاف احتجاج کریں وہاں شاعری ںپنے ماحول سے ایک نیا رشتہ قائم کرتا ایک فطری بات ہے۔ عرفانہ عزیز کی شاعری میں فطرت کے نئے موسموں سے نئے رشتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ لی امریکہ کی شاعری اردو شاعری میں ایک خوبصورت باب کا اضافہ ہے جو یہاں کی مختلف سماجی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں اپنے تجربات اور تاثرات فن کارانہ ،ر پر پیش کرتی ہے چاہے وہ ہجرت کے دکھ ہوں، نامساعد حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوششیں ہوں یا بچوں کے لئے سہانے مستقبل کے خواب ہوں، وہ سب اردو اعری کے لئے نادر تحفے ہیں۔

بد قسمتی سے شمالی امریکہ میں اردو نثر نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی اردو شاعری نے کی ہے جہاں سینکڑوں لوگ شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں وہاں نثر میں ںنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ میں جب اردو فکشن کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں اکرام بریلوی، رضیہ فصیح احمد، رضا الجبار، انور جلیل شیخ، رحیم بان، رفعت مرتضیٰ اور معین اشرف کے نام ابھرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو شمالی امریکہ آنے سے پہلے ہی اپنے افسانوں کے مجموعے اور ناول چھپوا چکے تھے، لیکن ض نے ہجرت کے بعد اپنا تخلیقی سفر شروع کیا ہے۔ اردو تنقید میں چوہدری نعیم، عبدالقوی ضیا اور خورشید عالم مصروف زندگی اور لائبریریوں میں اردو کتابوں کے قحط کے باوجود تنقیدی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ شمالی امریکہ میں اردو نثر پر تنقیدی محفلوں کا فقدان بھی ہماری بدقسمتی ہے۔ اردو نثر میں ڈرامے اور سفر نامے کا گوشہ بھی خالی ہے۔ جاوید دانش اس میدان کا واحد سپاہی ہے، اس کی کتابوں "پرومیتھیس" اور "آوارگی" سے یوں لگتا ہے جیسے وہ قدیم و جدید کے دوراہے پر کھڑا ہو۔ اس کی سوچ میں ریدر حجانات کے واضح نقوش ملتے ہیں، لیکن اس کے انداز تحریر پر ابھی بھی روایت کے سائے لہراتے نظر آتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات کہ شمالی امریکہ میں اردو ڈرامے کے لی میدان میں تنہا سپاہی بھی قیمتی ہے۔

شمالی امریکہ کے اردو ادب میں ایک اور باب جو آہستہ آہستہ نکھر کر سامنے آرہا ہے وہ تراجم کا میدان ہے شمالی امریکہ میں اپنے کنیڈین اور امریکی ہم وطنوں سے ابلاغ کی راہیں استوار کرنے اور اہالیان ذوق پر اپنے فنی اور تخلیقی جواہر کے اظہار کے لئے ادیبوں نے گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ اشفاق حسین کی کتاب That day will dow، شاہین کی کتاب Dreams and Destinations اور بیدار بخت کی کتاب Anthology of Modern Urdu poetry۔ اس ںزل کی طرف اہم قدم ہیں۔ بیدار بخت کے علاوہ حفظ الکبیر قریشی اور چوہدری نعیم نے بھی اردو شاعری کے جاندار ترجمے کئے ہیں۔ فاروق حسن نے صرف شاعری کو ں نہیں افسانوں کو بھی انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ محمد عمر میمن کی کتاب Downfall By Degrees جو عبداللہ حسین کے افسانوں کا ترجمہ ہے اس قبیل کا ںاہکار ہے۔ ان کوششوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ کئی بنیادی طور پر انگریزی میں لکھنے والے ادیب بھی اردو ادب کا ترجمہ کرنے والوں کے کارواں میں شامل ہو گئے۔ اس ںروہ میں شہلا برنی، لیسلی لوین اور کیتھلین جگر سر فہرست ہیں۔ شمالی امریکہ میں اردو ادب کے ارتقا کی بات شاید اس وقت تک پوری نہ ہو جب تک ان رسائل کا ذکر نہ کیا ںجائے جو اردو ادیبوں اور شاعروں کی محنتوں اور ریاضتوں کو باقاعدگی کے ساتھ اصحاب ذوق کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں ان میں اردو انٹر نیشنل، اردو کینیڈا اور Annual of Urdu studie کی وساطت سے اشفاق حسین، شاہین اور چوہدری نعیم کی خدمات بہت اہم ہیں۔ شمالی امریکہ کی اردو صحافت اگرچہ ایک علیحدہ باب ہے لیکن "امروز" اخبار کے مدیر عابد جعفری اپنے اخبار میں ادبی مضامین اور تخلیقات چھاپ کر اپنا ادبی فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام تخلیقات اور محنتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے کہ شمالی امریکہ میں اردو بولنے اور لکھنے والوں کا ادبی ورثہ قابل قدر ہے۔ میرا خیال ہے ںہ وقت آگیا ہے کہ ایشیا میں بسنے والے اردو کے طالب علم، اساتذہ، محققین اور مورخین شمالی امریکہ میں رہنے والے اردو ادیبوں کی تخلیقات اور نگارشات کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں اور انہیں اپنی آرا سے نوازیں تاکہ ان کی شوق کی اگلی منزلوں تک رسائی ہو سکے۔

●

○ "شناخت کی تلاش" مشہور افسانہ نگار سائیں سچا کی مرتب کردہ ایک اہم کتاب ہے جس میں بیک وقت اردو، انگریزی اور پنجابی میں مضامین نثر و نظم شامل ہیں۔ یہ کتاب اسٹاک ہوم میں منعقد ہوئی تارکین وطن ادبا کی ورکشاپ کا جواز ہے جو ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ کتاب میں شامل تخلیقات تو اہم ہیں لیکن زیادہ اہم سائیں سچا کی وہ روداد ہے جو ورکشاپ کی سرگرمیوں اور مباحث پر مشتمل ہے اور وہ طویل خط جو خالد سہیل نے (بعنوان شمالی امریکہ میں اردو ادب۔ ایک طائرانہ نگاہ) سائیں سچا کے نام لکھا ہے۔ اس خط کو ایڈٹ کر کے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ دونوں تحریریں کئی سال قبل کی ہیں لیکن ان کے مباحث و مسائل آج بھی تازہ ہیں اور موضوع بنتے رہتے ہیں۔ چونکہ کتاب بہت دور تک نہیں جاپائی اس لئے یہ دونوں اہم تحریریں بھی اتنے برسوں میں زیادہ دور تک نہیں جاسکیں۔ موضوع بحث نہیں بن سکیں۔ یہ بہت بچی تحریریں ہیں اسی لئے شمارے کے اس موضوعاتی شمارے میں انہیں شامل کیا گیا ہے۔ سائیں سچا اور خالد سہیل دونوں ہی ذہین قلم کار ہیں۔ خالد سہیل کی نثر و نظم

میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو محض کتابیں نہیں ہیں بلکہ ان میں نہایت ہی فکر انگیز اور متنوع تخلیقی لوازمہ موجود ہے۔ انگریزی میں کئی کتابیں ہیں، تراجم ہیں، ناول ہیں۔ خالد سہیل ایک نہایت ہی ذہین تخلیق کار کا نام ہے جو ہر طرح کے اعزاز و انعام کا مستحق ہے۔ یہاں ان تحریروں پر کسی بھی طرح کا اپرلو مقصود نہیں حالانکہ ان سات، آٹھ برسوں میں اردو کی نئی بستیوں میں ہر سطح پر خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ نئے نئے قلم کار سامنے آئے ہیں، ادبی رسائل، ہفت روزہ اخبارات، اردو سے انگریزی میں تراجم، نئے ادارے، نئے اشخاص، نئے کام، اردو کی ترویج و اشاعت کی کوششیں وغیرہ۔ ان سے متعلق اسی شمارے میں تفصیلات دی جارہی ہیں۔ (الف الف)

سعید انجم

مغرب کے اردو افسانے



مغرب کے اردو افسانوں کی تاریخ پرانی ہے۔ مرزا غالب کے زمانے میں ان کا آغاز ہو گیا تھا۔ تب مغرب کے لوگ اردو دنیا میں پہنچ رہے تھے۔ اب اردو دنیا مغرب میں پہنچ رہی ہے۔ کچھ لوگ تو ایک دو نسلوں سے یہاں پر باقاعدہ آباد بھی ہیں اور ان میں سے بعض افراد اپنے افسانے مسلسل قلم بند کر رہے ہیں۔ یہ افسانے کیسے افسانے ہیں؟ ان افسانہ نگاروں کا اردو ادب میں مقام کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ مجھے تو صرف یہ معلوم کرنے کی خواہش تھی کہ جو لوگ مغرب میں آباد ہو چکے ہیں، ان کے اردو افسانوں کے موضوعات کیا ہیں؟ کیسے کرداروں کی طرف وہ غور سے دیکھتے ہیں اور کن واقعات کو وہ اہمیت دیتے ہیں؟۔ اس کام کی ابتدا ناروے سے ہوئی۔ سب سے پہلے میں نے ہرچرن چاولہ کے افسانے پڑھے۔ نصر ملک اور سائیں سچا کے افسانوں کے باعث یہ سلسلہ سکنڈے نیویا تک پھیل گیا کہ وہ دونوں بالترتیب ڈنمارک اور سویڈن میں رہتے ہیں۔ جب منیر الدین احمد بھی اس فہرست میں شامل ہو گئے تو گویا جرمنی سمیت پورا شمالی یورپ میرے سامنے تھا۔ شہلا علاؤالدین کا ایک آدھ افسانہ میں پڑھ چکا تھا۔ نعیمہ ضیاء الدین کی تخلیقات ایک تواتر کے ساتھ ادبی پرچوں میں نظر آرہی تھیں۔ ثریا شہاب کے پہلے ناول کے بعد پہلا افسانوی مجموعہ بھی شائع ہو چکا تھا۔ (۱۹۹۷ء)۔ پھر حیدر قریشی تھے جو جرمنی کے افق پر اردو زبان کے کثیر الاصناف ادیب کے طور پر اپنا نقش مسلسل گہرا کر رہے تھے۔ یورپ کے اردو ادیبوں کا سب سے بڑا مرکز برطانیہ تھا۔ واسو دیو کا پہلا افسانوی مجموعہ "آٹھواں سمندر" ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکا تھا۔ جتیندر بلو افسانے کا معتبر نام ہیں۔ قیصر تمکین اپنی صحافتی ذمہ داریوں کے باوجود اردو افسانے کی دنیا میں واپس آچکے تھے۔ صفیہ صدیقی، فیروزہ جعفر اور محسنہ جیلانی ایک ایک افسانوی مجموعہ شائع کرانے کے بعد افسانے کی ترویج و ترقی کے لئے فیروز مکرجی کے ساتھ متحرک ہو چکی تھیں۔ ان کے پہلے سیمینار میں مصطفیٰ کریم مغرب کے اردو افسانہ نگاروں کے فنی مسائل پر اپنا مقالہ پیش کر چکے تھے۔ پھر شاہدہ احمد تھیں جن کے افسانوی مجموعے "بھنور میں چراغ" کی دھمک پھیل رہی تھی۔ حمیدہ معین رضوی کا "اجلی زمین میلا آسمان" تھا۔ مقصود الٰہی شیخ کے افسانوی مجموعوں کے دوسرے ایڈیشنوں کی اشاعت کا غلغلہ تھا۔ غرضیکہ افسانے ہی افسانے اور افسانہ نگار ہی افسانہ نگار نظر آنے لگے۔

اردو افسانہ نگاروں کے بارے میں مضامین کا سلسلہ جب مغرب تک پھیلا تو یورپ کے علاوہ براعظم شمالی امریکہ کے افسانہ نگاروں کی فہرست بھی بنتی چلی گئی۔ آغا بابر اور رضیہ فصیح احمد کے ساتھ ساتھ رفعت مرتضیٰ، رضا الجبار، انور خواجہ، خالد سہیل، رحیم انجان اور عابد جعفری کے نام تو سامنے کی بات تھی۔ ان کے علاوہ برطانیہ کے ش صغیر ادیب کی طرح ایسے ادیب بھی موجود تھے جو افسانے تو لکھ رہے تھے لیکن ان کے افسانوی مجموعے شائع نہیں ہو رہے تھے۔ مغرب میں آباد اردو افسانہ نگاروں کے بارے میں لکھے گئے میرے مضامین کی تعداد فی الحال محدود ہے۔ نئی کتابیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں جمشید مرزا اور بانو احمد کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ ناروے سے شاہد ہو سیم کا پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ برطانیہ کی صفیہ صدیقی کا دوسرا مجموعہ "چاند کی تلاش" آیا ہے۔ اس فہرست میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں ہی مناسب سمجھا کہ دس مضامین کو حصہ اول کی صورت میں شائع کروا دیا جائے۔ مغرب کے اردو افسانوں کا مطالعہ جاری رکھا جائے اور حصہ دوم کی تیاری و اشاعت جلد از جلد کی جائے تاکہ مغرب کے اردو افسانوں سے دلچسپی رکھنے والے قارئین افسانہ نگاروں کے زور قلم میں اضافہ کر سکیں۔ (اوسلو۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۷ء)

● Nebbejordet 15, 1266 OSLO - 12 (Norway)

○ اردو کے مشہور افسانہ نگار سعید انجم کی کتاب "مغرب کے اردو افسانے" اردو کی نئی بستیوں میں مقیم افسانہ نگاروں کے فن پر ایک گرانقدر کام ہے۔ اس کتاب میں شامل دس اہم افسانہ نگاروں کی فہرست کچھ یوں ہے: چاندنی کی مہکار (مصطفیٰ کریم کے افسانے) صحافت سے صحیفوں تک (قیصر تمکین کے افسانے) زمانی مکانی جنت جہنم (منیر الدین احمد کے افسانے) دوسری آنکھ کا تیسرا رخ (جتیندر بلو کے افسانے) بے باک بے باقیہ (افتخار نسیم کے افسانے) سات لڑکیاں، چودہ طبق اور اکیس سال (ہرچرن چاولہ کے افسانے) بستیاں بگولے اور انسان (سائیں سچا کے افسانے) عقیدتوں کے شہر میں تجربوں کا آدمی (خالد سہیل کے افسانے) لفظوں کی کٹیا اور مسکراہٹ کا بیج (نصر ملک کے افسانے) ایک آوارہ گرد شاعر کے افسانے (جاوید دانش کی تحریریں) دس مضامین کے عنوانات نہ صرف تخلیقی ہیں بلکہ ہر مضمون دلچسپ اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کی شخصیت، اس کے تمام اہم افسانے، موضوعات، کردار، واقعات، حوالے، اشارے، سب کچھ شگفتہ، دل نشیں اور بالکل کسی کہانی کے دھنک رنگ بیانیہ کی طرح۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ افسانہ نگاروں کے فن کے حوالے سے اردو کی نئی بستیوں کو پوری طرح اجاگر کیا گیا ہے۔ قارئین وطن

کے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔۱۷۶ صفحات کی اس معیاری کتاب کا حصول Vudya Kitaban, Box 6099, S-19206 Sollentuna - Sweden اس پتے سے ممکن ہے۔(الف الف)

باقی احمد پوری

بین الاقوامی اردو شاعری

برصغیر سے باہر جو اردو اہلِ قلم اس وقت کام کر رہے ہیں ان کے بے شمار مسائل ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ ادب کی Main Stream سے کٹ جاتے ہیں۔ میڈیا تک ان کی رسائی نہیں رہ جاتی اور اس طرح ان کا کلام قارئین، ناظرین تک نہیں پہنچ پاتا۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی ان لوگوں کو دشواری پیش آتی ہے۔ البتہ گذشتہ چند سالوں سے اس صورت حال میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ وطن اور بیرونِ وطن ادبی حلقوں کے درمیان فاصلہ کم ہوا ہے۔ نقادوں کی ایک ایسی فضا قائم ہوئی کہ عالمی مشاعروں کا سلسلہ چل نکلا۔ امریکہ، ناروے، کویت، دبئی اور قطر میں عالمی مشاعروں کا انعقاد ہوا۔ دبئی میں سلیم جعفری مرحوم نے اور قطر میں جناب مصیب الرحمٰن نے عالمی مشاعروں کے سلسلے میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ آج کل جناب معراج جامی اور ساحر شیوی، 'سفیرِ اردو' کے ذریعے تارکینِ وطن شعراء و ادباء کی تخلیقات ادبی حلقوں تک پہنچا رہے ہیں۔

●

○ اردو کی نئی بستیوں میں مقیم کچھ شعراء پر مشتمل ایک کتاب 'بین الاقوامی اردو شاعری' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اسے کویت میں بسے ہوئے شاعر باقی احمد پوری نے ترتیب دیا ہے اور ان کے معاونین میں سعید روشن اور محمد کمال اظہر صاحبان شامل ہیں۔ اس سے قبل بھی باقی احمد پوری نے 'دھوپ کے شاعر' کے عنوان سے ۱۹۸۱ء میں ایسا ہی ایک انتخاب لاہور سے شائع کیا تھا۔ یہ انتخاب بھی لاہور ہی سے نومبر ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ۵۴ شعراء شامل ہیں اور ہر شاعر کی دو دو تخلیقات دی گئی ہیں۔ گٹ آپ خوبصورت ہے سرورق اور فلیپ کو شعراء کی تصاویر سے سجایا گیا ہے۔ یہاں اس کتب کے عنوان اور لوازمے پر تبصرہ مقصود نہیں بلکہ درج بالا اقتباس کے حوالے سے کچھ بنیادی باتیں عرض کرنی ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کو جو مسائل درپیش رہتے ہیں ان کا تمام تر تعلق ان کی اقتصادیات سے ہے لیکن Main Stream سے جڑنے یا کٹ جانے کا تعلق بھی ان کے اپنے مسائل ہی سے ہے ورنہ تو ادھر ہند و پاک کے تمام ادبی رسائل اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کو نہ صرف یہ کہ تواتر سے شائع کر رہے ہیں بلکہ ان کی پوری پوری کوشش یہی رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قلم کاروں سے رابطہ قائم ہو۔ ادبی رسائل میں بعض وہ شعراء بھی راہ پا رہے ہیں جو اگر اپنے وطن میں ہوتے تو شاید اپنے شہر کے مقامی اخبارات سے آگے نہ جا پاتے۔ مواقعوں کی کمی نہیں۔ وسائل کی بھی کمی نہیں بلکہ ایک زبردست ہوڑ ہے جس نے کچھ اور ہی مسائل پیدا کئے ہیں اور بعض قلم کار اس ہوڑ سے پیدا شدہ مسائل سے پریشان ہیں۔ ان مسائل کو ہم سب جانتے ہیں تاہم کسی موقع سے اس پر گفتگو ہوگی۔ عالمی مشاعرے اور شاعری بہت آسان اور سامنے کے کام ہیں۔ یہ ناگزیر ہیں لیکن نثر اور وہ بھی تخلیقی نثر، کم سے کم لکھی جا رہی ہے۔ دنیا کی بڑی زبانوں میں اردو ادب بہت سست رفتاری سے منتقل ہو رہا ہے اور جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کی پذیرائی نہیں ہو رہی ہے۔ دنیا کی بڑی شاعری سے تارکینِ وطن شعراء کتنا استفادہ کر رہے ہیں اور ان کی شاعری کس معیار کی ہو رہی ہے مستشرقین اردو اور اردو کی ترویج و اشاعت کرنے والے اداروں پر کام نہیں ہو رہا ہے وہ رسائل جو اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہو رہے ہیں وہ کسی بھی طرح ان نئی بستیوں کے نمائندہ ادبی جریدے نہیں کہے جا سکتے کہ ان میں وہی کچھ شائع ہو رہا ہے جو ہند و پاک کے ادبی رسائل میں آ رہا ہے بلکہ ان ادبی رسائل و جرائد پر ہند و پاک کے ان قلم کاروں کا قبضہ زیادہ ہے جن کا کام صرف اور صرف اپنی تخلیقات شائع کروانا ہوتا ہے خواہ اردو کا کوئی رسالہ ہو کسی بھی معیار کا ہو اور کہیں سے بھی شائع ہو رہا ہو۔ ماہنامہ افکار (کراچی) نے عالمی اردو مارکیٹ کا تصور دیا تھا لیکن رسالہ شاعر نے اس تصور کی عملی توسیع کی ہے اس کے باوجود یہ احساس بھی رہتا ہے کہ 'اردو کی نئی بستیوں' کے متعلق جیسا کام ہونا چاہیے، نہیں ہوا۔ "بین الاقوامی اردو شاعری" کی ضخامت: دو سو آٹھ صفحات اور قیمت ایک سو پچاس روپے ہے۔ یہ کتاب، شام کے بعد پبلی کیشنز، ۱۳۔ اے بہاولپور روڈ، لاہور (پاکستان) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ (الف الف)

سید قمر حیدر قمر

مشرقِ وسطیٰ میں اردو

برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں سے اردو بولنے، لکھنے اور سمجھنے والے جو لوگ بسلسلۂ معاش نقلِ مکان یا حصولِ علم کی غرض سے دنیا کے قابلِ ذکر ممالک میں پہنچے، وہ اپنا مزاج، اپنی ثقافت اور اپنے زبان و ادب کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور یہی چیزیں دیارِ غیر میں ان کی پہچان بنیں۔ اپنے اپنے روزگار کی مصروفیات سے فراغت کے بعد سامانِ طمانیت یہی ہوتا ہے کہ اپنے لوگوں سے ملا جائے اور اپنی زبان میں اپنے دل کی باتیں کی جائیں۔ اور اپنی زبان میں اپنے دل کی باتیں کرنے کا نام ہی ادب ہے۔ یوں تو دنیا کے دوسرے ممالک میں موجود اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں مگر مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں میں مقیم قلم کاروں نے بھی مثالی کام انجام دیا ہے اور ان کی نگارشات اردو ادب میں ایک صحت مند اضافہ نہیں بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں پائے جانے والے ایک مخصوص قسم کے ماحول میں رہنے کے باعث زندگی کی کچھ ایسی جہتیں اور رویے بھی قلمبند ہوئے ہیں جو اپنے اپنے ملک میں رہ کر کسی بھی طرح گرفتِ اظہار میں نہیں آ سکتے تھے۔ لہٰذا ع کے

انھیں اچھوتے آسمانوں کی تلاش و حصول نے یہاں کی تخلیقات کو ایک منفرد، تیکھی اور گراں بہا حیثیت دے دی ہے۔ لیکن اس قدر اہم اور تاریخی نوعیت کے کام کو رجسٹر کرنے کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں کیفیات و افکار کے بیش بہا خزانے ہوا برد ہوتے جا رہے تھے۔ یہی وہ فکر انگیز پس منظر تھا جو ادارہ اردو ادب کی تشکیل کا سبب بنا اور یہ کتاب مرتب کی گئی جو مشرق وسطی سے متعلق اردو قلم کاروں اور ان کی تخلیقات کے چند منتخب نمونوں کو رجسٹر کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ہے۔ اس سے قبل ریاض (سعودی عرب) میں مرتب کردہ کتاب ر رسالے "غریب الوطن ادیب" مرتبہ ڈاکٹر فہیم اعظمی (۱۹۸۵ء) "پیام صحرا" صفدر حسین (۱۹۹۱ء) شگوفہ (حیدر آباد) کا "سعودی عرب نمبر" مرتبہ: عابد معز (۱۹۹۲ء) صرف سعودی عرب کے چند اردو شعرا و ادبا کے تعارف اور نگارشات پر مشتمل تھے۔

● P.O. Box 21561, Riadh - 11485 (KSA)

○ اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والی یہ کتاب "مشرق وسطی میں اردو" نومبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی تھی اور اسے سید قمر حیدر قمر، ڈاکٹر راشد فضلی، شمس الحق نوشاد اور بشیر مرزا نے باہم مرتب کیا تھا۔ اس انتخاب نثر و نظم میں سعودی عرب (۴۸ قلم کار) عرب امارات (۱۴ قلم کار) سلطنت عمان (۷ قلم کار) قطر (۷ قلم کار) کویت (۹ قلم کار) بحرین (۴ قلم کار) شامل ہیں۔ ایک باب "وہ جو لوٹ گئے" کے عنوان سے ہے اس میں ۱۹ قلم کار اور ۴ مرتبین شامل ہیں اس طرح ۹۸ قلم کاروں پر مشتمل اس کتاب میں قلم کاروں کی تصاویر اور ان کا تعارف بھی شامل ہے۔ اس طرح یہ انتخاب کسی حد تک ایک اہم ماخذ بن گیا ہے۔ معاشی تگ و دو کے لئے ہجرت کرنے والے قلم کار یا تو اپنے وطن لوٹ جاتے ہیں یا پھر ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر ہجرت کرتے رہتے ہیں۔ اس نوع کے کام کبھی بھی مکمل نہیں کہلائے جا سکتے۔ خلیجی ممالک میں بسے ہوئے بہت سارے قلم کار اس میں نہیں آسکے لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ کتاب کا سارا التزامہ حروف تہجی کے تحت ہے۔ مرتبین نے 'حرف آغاز' میں مشرق وسطی کے بعض اہم اداروں اور اشخاص کا بھی ذکر کیا ہے۔ انتخاب میں دو عرب نثر او شعرا بھی شامل ہیں۔ خلیجی ممالک میں اردو اسکول اور کالج قائم ہیں، بہت سارے ادارے ہیں۔ اخبار بھی شائع ہوتے ہیں۔ مشاعرے اور نشستیں منعقد کی جاتی ہیں۔ ہزاروں طلباء زیر تعلیم ہیں۔ عربی رسم الخط کے قریب اردو رسم الخط بھی ہے لیکن پھر اردو داں یعنی عربوں کو اردو کی تعلیم اور خصوصی طور پر عربی ادب کا اردو میں ترجمہ یا اردو ادب کا عربی میں ترجمہ نہیں کے برابر ہے۔ وہ مقامی عرب جو ہند و پاک کا سفر کرتے رہتے ہیں، وہ بول چال کی حد تک اردو بول لیتے ہیں لیکن عربوں میں یا ان کے بچوں کو اردو کی تدریس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ خلیجی ممالک کی کچھ یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا ہے جہاں عربی بچے اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہند و پاک سے وہاں گئے ہوئے تارکین وطن کے علاوہ بھی مقامی لوگوں میں اردو کی تعلیم کا چلن عام کیا جائے۔ ایسے اشخاص، اداروں اور شعبوں کو نمایاں کیا جائے جو اردو ادب سے ہٹ کر اردو کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس طرح غیر ملکی اردو قلم کاروں کی تعداد بھی بڑھے گی۔ عربی اور فارسی میں شاعری کرنے والے اردو میں بھی شاعری کر سکیں گے۔ "مشرق وسطی میں اردو" ایک وسیع تر موضوع ہے۔ صرف شاعری یا افسانہ اس کے ذیل میں نہیں آتے۔ مرتبین نے حرفے چند میں جن اداروں اور اشخاص کا ذکر کیا ہے، ان پر کام ہونا چاہیے۔ ۲۷۴ صفحات کی یہ کتاب نومبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے تو خلیجی ممالک میں ادب و ثقافت اور درس و تدریس کی سطح پر کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ (الف الف)

<u>تسنیم حسن علی</u>

شمالی امریکہ میں اردو تدریس کا مسئلہ

اب آیئے شمالی امریکہ کی صورت حال کی جانب۔ آپ اس امر سے اتفاق کریں گے کہ تارکین وطن کی پہلی نسل امریکی زبان (انگریزی) اور مغربی تہذیب سے احساس کمتری کی حد تک مرعوب ہے۔ ان کا یہ احساس یہاں پر اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں مزید نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ہمارے خطے سے امریکہ آنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو پروان چڑھانے اور ان کی تربیت کرنے کے لئے ان کے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ انگریزی اور مغربی تہذیب کو اپنایا جائے۔ دوسری طرف وہ اپنے بچوں کو اس مغربی یلغار سے بھی بچانا چاہتے ہیں جو یہاں اسکولوں اور ٹیلی وژن پر جاری و ساری ہے۔ اس لئے انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجدیں اور عبادت گاہیں قائم کیں جہاں وہ اپنے بچوں کو ہر اتوار اور تہوار کے موقعوں پر اسلامی اقدار اور عربی زبان سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے بچے اچھے مسلمان بن سکیں یا کم از کم اچھے مسلمان کہلا سکیں۔ گھروں اور اسکولوں میں تعلیم کی حد تک ان لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے انگریزی زبان، لباس اور امریکی تہذیب پورے طور پر اپنا لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بچے امریکہ میں اپنی شناخت سے محروم اور تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے کنفیوژ ہو کر پروان چڑھ رہے ہیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر اس صداقت پر یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اگر آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ آئے کہاں سے ہیں تو آپ کو ہرگز یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ آپ کو جانا کہاں ہے۔ ہاں ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دو زبانیں اور دو ثقافتیں اختیار کر لی جائیں یعنی بچوں کو انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان بھی شعوری طور پر سکھائی جائے۔ نہ صرف زبان بلکہ اپنی تہذیب و تمدن سے بھی ان کا تعلق استوار رکھا جائے اور "آواز" کی اشاعت کے پیچھے یہی جذبہ کار فرما ہے۔ اس کی اشاعت کا مقصد اپنے بچوں کو اپنے ثقافتی ورثے اور قابل فخر ادبی روایات سے مانوس کرانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے پُر اعتماد، باصلاحیت اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک شہری ہوں اور انھیں اپنے ثقافتی ورثے پر بھی ناز ہو۔ (ماہنامہ "آواز" (نیویارک) شمارہ اول: جون ۱۹۹۸ء کے اداریے سے اقتباس)

جدید اردو تحریک (نیویارک)

ہمارے مستقبل کے چند منصوبے

جدید اردو کا منصوبہ اب تک اردو زبان روایتی انداز میں عربی/فارسی رسم الخط میں لکھی جارہی ہے۔ روایتی اردو دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ جدید اردو، روایتی (اردو، عربی/فارسی رسم الخط) رسم الخط کی بجائے رومن حروف تہجی میں لکھی جائے گی۔ اس لئے روایتی اردو تحریر کے بجائے بائیں سے دائیں لکھی جائے گی۔ انگریزی زبان کے لئے ۲۶ رومن حروف تہجی مستعمل ہیں جنھیں جدید اردو کے حروف تہجی کے طور پر اختیار کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ خ، غ اور چ وغیرہ کے لئے متبادل (تقریباً ۱۲ حروف) خصوصی طور پر اختراع کئے جائیں گے۔ بنیادی طور پر جدید اردو کا اولین مقصد ان بچوں کو روایتی اردو سے مانوس کرتا ہے جو پاکستان میں نہ رہنے کی وجہ سے عربی/فارسی رسم الخط سے نابلد ہیں۔ ان میں سے اکثر بچے سمجھنے اور بولنے کی حد تک روایتی اردو سے واقف ہیں۔ لیکن انھیں عربی/فارسی رسم الخط سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اردو پڑھنے میں دقت پیش آتی ہے بلکہ سرے سے پڑھ ہی نہیں سکتے۔ جدید اردو کے منصوبے کے دوسرے مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسے اعراب (Vowels) وضع کئے جائیں جو آسان ہوں اور اردو کی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔ یہ نئے اعراب جو رومن/انگلش حروف میں مستعمل اعراب کی مدد سے بنائے جائیں گے، ہجے کرنے میں آسانی پیدا کریں گے اور تلفظ کی درستی کے ضامن ہوں گے۔ انھیں موجودہ زیر، زبر اور پیش کی علامات کی جگہ استعمال کیا جائے گا اور یہ موجودہ اعراب کی نسبت زیادہ طور پر تلفظ کی درست ادائیگی کا سبب بنیں گے۔ منصوبے کے دوسرے مرحلے میں ایک ایسا کمپیوٹر سافٹ ویئر وضع کیا جائے گا جو نہ صرف پہلے سے موجود روایتی اردو تحریر بلکہ فارسی، ترکی، ہندی، انگریزی وغیرہ کو بھی جدید اردو میں منتقل کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوگا۔ اس طرح روایتی اردو میں موجود ہر قسم کے ادبی اور دوسرے تحریری مواد کو خودکار (Electronic) طریقے اور کم سے کم وقت میں جدید اردو میں ڈھال دیا جائے گا۔

اردو کا نصاب تعلیم میں اضافہ اردو کو نیویارک اور پورے امریکہ میں ہائی اسکول سے لے کر کالج کی سطح تک شامل نصاب کرانے کا منصوبہ بھی ہمارے عزائم میں شامل ہے۔

مثالی اسکول کا قیام ایک ایسے مثالی اردو اسکول کا قیام جہاں اردو اور اسلامی تاریخ کی تعلیم دی جائے۔ یہ اسکول پاکستان، بھارت اور مشرق اوسط میں یورپین اسکولوں کے طرز پر قائم کیا جائے گا۔ اس کی ملکیت اور اس کا نظام مسلمانوں یا مشرق اوسط سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے پاس ہوگا۔

تنظیم باہمی امداد ایک ایسی تنظیم کا قیام جو مسلم اور مشرق اوسط کے ممالک کے تارکین وطن کی آبادکاری اور امریکی معاشرے میں جذب ہونے میں ان کی مدد کرے۔ (ماہنامہ 'آواز' نیویارک۔ جون ۱۹۹۸ء)

○ نیویارک (امریکہ) سے اردو کا ایک خوبصورت اور خوب سیرت ماہنامہ 'آواز' جاری ہوا ہے۔ اب تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس رسالے کی مدیر اعلیٰ محترمہ تسنیم حسن علی ہیں۔ اسے 'جدید اردو تحریک' کے تحت ''امریکہ میں اردو کا پہلا ادب، ثقافت اور فکر و فن کا نمائندہ جریدہ'' کہا گیا ہے۔ دونوں شمارے اپنے گٹ اپ، مواد اور ترتیب و تہذیب کے لحاظ سے خاصے متنوع اور قابل مطالعہ ہیں۔ 'آواز' کے دوسرے شمارے کا اداریہ 'آواز دل' رسالے کو درپیش مشکلات کا اظہاریہ ہے۔ یوں تو ہر رسالے اور اس کے مدیر کے اپنے تجربے، مشاہدے اور تجزیے ہوتے ہیں۔ دوسروں کے مشورے 'زبانی جمع خرچ' کے کھاتے میں آتے ہیں۔ اس سے قبل 'آواز' کے شمارہ اولین سے منتخب کئے گئے درج بالا لوازمے پر کچھ تحریر کیا جائے، ذمہ داران 'آواز' کے لئے چند تجاویز شاید ان کے لئے کار آمد ہوں۔ چونکہ یہ رسالہ پاکستانی باشندوں کا ہے لہٰذا ان کی بیشتر توقعات پاکستانی اہل قلم حضرات سے ہیں تاہم انھیں ہندوستان سے زیادہ تعاون حاصل رہا ہے۔ اس کا اعتراف اداریے میں کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی جو بھی صورت حال ہو، پاکستان کی بہ نسبت یہاں لکھنے اور پڑھنے والوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ پھر یہ کہ ہندوستان میں بعض قلم کار نہایت ہی پابندی کے ساتھ ادبی رسائل سے اپنا قلمی رشتہ قائم رکھنا اپنا ادبی فرض سمجھتے ہیں۔ رسالہ کسی معیار کا ہو اور دنیا کے کسی بھی کونے سے شائع ہوتا ہو۔ بہر حال! یہ ایک الگ موضوع ہے۔ کہنا یہ ہے کہ 'آواز' کو اردو کی نئی بستیوں کا خالص نمائندہ بنایا جاسکتا ہے۔ دور دور تک پھیلی ہوئی ان بستیوں میں اردو قلم کاروں کی کمی نہیں۔ خود امریکہ میں بہت سارے لوگ بسے ہوئے ہیں۔ ہندوپاک میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کی کمی نہیں اور وہاں کے قلم کاروں کو مواقع اور وسائل میسر ہیں۔ اصل مسئلہ تو اردو کی نئی بستیوں کا ہے۔ کوئی ادبی جریدہ ان کی نمائندگی کے لئے نہیں ہے۔ ادبی تخلیقات کے ساتھ بڑی زبانوں کے تازہ ترین ادب کے تراجم، مستشرقین اردو کے کار و افکار، علمی و ادبی اداروں کا تعارف، قلم کاروں پر گوشے شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے، انٹرویوز، علمی و ادبی اور تہذیبی خبریں وغیرہ۔ اب رہا سوال ہندوپاک میں تخلیق ہونے والے ادب سے اور قلم کاروں سے جڑنے یا جڑے رہنے کی بات تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادبی رسائل سے بہت خاص تخلیقات کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ ہندوپاک کے تمام ادبی رسائل تمام لوگوں تک نہیں پہنچ پاتے، اردو کی نئی بستیوں میں بالخصوص۔ 'آواز' کے مدیران ان امور پر غور کر سکتے ہیں۔ رسالہ شاعر کا ہر ممکنہ تعاون ان کے ساتھ ہے۔

'آواز' کے اداریے سے اقتباس اور جدید اردو تحریک کے تحت جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے اپنے مسائل ہیں بالخصوص یورپ اور امریکہ میں۔ بڑے بڑے کمیونٹی سینٹر قائم ہو رہے ہیں اور اپنی اپنی سطح سے لوگ کام بھی کر رہے ہیں مگر درس و تدریس کے بے حد پیچیدہ مسائل ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر ملک کی اپنی سرکاری زبان ہوتی ہے، اس زبان کا کلچر ہوتا ہے، تاریخی اور جغرافیائی کلچر بھی اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا ہر مہاجر

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھیے)

اکبر حیدر آبادی

اک آہ کو شعلہ بار کرلے
اک اشک کو آبشار کرلے

جو لمحہ تری گرفت میں ہے
اس لمحے کو پائدار کرلے

گہرا ہے بہت سخن کا دریا
ڈوب اس میں اور اس کو پار کرلے

در بند ہیں جس پہ روشنی کے
وہ تیرگی اختیار کرلے

کب تک وہ جیئے گا جھوٹ بن کر
کب تک کوئی اعتبار کرلے

یہ "شارک" انا ہے تشنہ خوں
اس دیو کو اب شکار کرلے

اکبر، جو نقش معتبر ہے
اس نقش کو رہگوار کرلے

● 30 - Tuffley Rd, Bristol
B510 5EG England (U.K.)



عابد اللہ غازی

وہ پوچھتے رہے ہر اک کی ذات رستے میں
ملا نہ کوئی بھی چلنے کو ساتھ رستے میں

یہ سوچتے رہے منزل کبھی تو آئے گی
گزار دی یونہی ساری حیات رستے میں

پہونچ کے منزل مقصود پر ہوا معلوم
لٹا کے آئے ہیں کل کائنات رستے میں

مگر نہ گرمی شوق سفر نے مہلت دی
ملے تھے عالم صد ممکنات رستے میں

خوشی کو دیکھا ہے اتنے قریب سے ہم نے
کہ جیسے گزری کسی کی برات رستے میں

یہ بھول بیٹھے کہ ہے گھر پہ منتظر کوئی
ملے کچھ ایسے شمائل صفات رستے میں

جو ہو سکے تو کبھی خلوت چمن میں ملو
کہیں ہوئی ہے کبھی دل کی بات رستے میں

● Iqra, 2450 - Skokie Bouley
Skokie, IL 60077 (USA)



واصل عثمانی

ایسا بھی کوئی بزم میں صاحب حال آئے نا
جس کی نگاہ کے بغیر اوج و کمال آئے نا

ایسی بھی داستانِ عشق کاش کوئی رقم کرے
ہجر کا تذکرہ نہ ہو ذکر وصال آئے نا

اس کی نگاہ لطف نے میرا حصار کرلیا
کہدو مرے قریب بھی گردش حال آئے نا

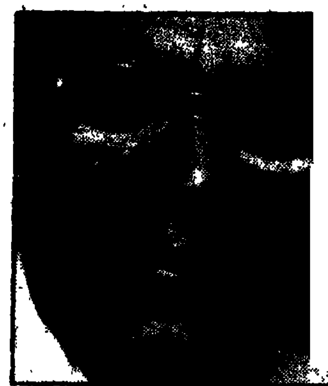
شعر نہ کہہ غزل نہ لکھ حال نہ ہو یہ جب تلک
بزم خیال میں کوئی تازہ خیال آئے

کرکے عطا متاع عشق اس نے یہ مجھ سے کہہ دیا
اب مرے سامنے کبھی دست سوال آئے

کہہ نہ سکا میں حال دل اس سے یہ سوچ سوچ کر
اس کی جبینِ ناز پر گرد ملال آئے

اے مرے ہم سفر بتا کیا ہے یہ ممکنات میں
اس کی گلی سے ہو گذر اس کا خیال آئے

● P.O. Box 2080,
Dammam - 31451 (K.S.A.)



عبدالقوی ضیاء

نہ جو سمجھیں جفا کیا ہے وفا کیا
کریں گے وہ دلوں کا فیصلہ کیا

میں اپنے راستے پر چل رہا ہوں
خیال رہزن کیا رہنما کیا

ہوائے زلف سے بھی ہم ہیں محروم
کہیں گم ہوگئی باد صبا کیا

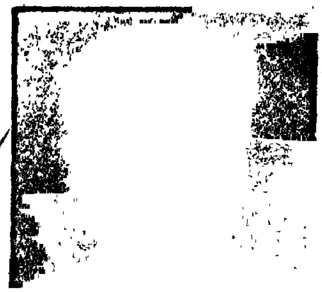
اک آہ سرد اک لرزیدہ آنسو
ہمارے شہر کی آب و ہوا کیا

غبار آیا ہے تنہا تابہ منزل
مسافر راستے میں رہ گیا کیا

دلوں کا کوئی پرساں ہی نہیں ہے
جہاں سے اٹھ گئی رسم وفا کیا

ضیاء اک چوٹ سی دل پر لگی ہے
کہیں ٹوٹا ہے کوئی آئینہ کیا

● 961 - Auger Ave,
Sudbury, Ont P3A 4A7 Canada



محمد طارق غازی

تہذیب کے سنگستانوں میں طارق نہیں تم تنہا صحرا
عمرانی حالت سے بے کل خلدون پھر صحرا صحرا
سہ روزہ مسافت آنکھ میں تھی، تو ہکلائی زرتا صحرا
صدیوں کا سفر کرنے والے کہتے ہیں کہ ہے لحہ صحرا
اس راہ میں ہم نے عبور کیے اب تک چودہ پندرہ صحرا
اک منزل نخلستان کی تھی، پھر ہر صحرا کو ملا صحرا
وہ ریگستاں کے باشندے جب فارس و روم میں جا بیٹھے
دیکھا کہ مدینہ تھا حیراں اور تھا جھینپا جھینپا صحرا
بوجہل ہوا ہے پھر زندہ تہذیب گزیدہ شہروں میں
لازم ہے کہ عفراء کے گھر میں بن جائے ہر اک بیٹا صحرا
امروز سے پھر دیروز میں چل، اس جدل تہی غیرت سے نکل
ذہنوں کا ابد ماضی کی خرد، روشن روشن فردا صحرا
یہ بات قریش سے بہتر کب جانی تھی کسی بھی قبیلے نے
فجار کی جنگوں میں نہ کبھی غیرت کی آڑ بنا صحرا
کوچوں میں دیواروں سے پرے یہ آنکھ بھلا کیا دیکھے گی
جو لوٹ کے یہ بھی نہ دیکھ سکی ہے ذہن میں کتنا بڑا صحرا
جب ذہن زوال آمادہ ہو تب چھوڑو بدن کی بستی کو
نکلو تو قدم کو حرا صحرا، پھیلو تو نظر کو بُتا صحرا
ہم دیدہ وروں کی طرف دیکھیں اور دیدہ ور آنکھیں میچیں
ہم دیدے ہیں خفتہ صحرا، وہ دیدے ہیں آندھا صحرا
سب دریا اپنے پاٹ کے جب وہ ریگستاں میں آئے تب
ان پیاس بجھانے والوں نے دیکھا نہ کہ تھا پیاسا صحرا
اجیاد ہوئے، امجاد ہوئے، اوتاد ہوئے، استاد ہوئے
سب مجنوں دشت نصابی کے مجھے میرا کتب خانہ صحرا
یہ سخت، ثقیل، کٹھن باتیں اب ختم کرو طارق صاحب
برساؤ نہ پتھر ذہنوں پر، کچھ ذہن ہیں مخمل سا صحرا

● Managing Editor, Saudi Gazette
P.O. Box 5576 Jeddah - 21432 (K.S.A.)

ذکاء صدیقی

سلگتی آنکھوں میں محفل جما کے چھوڑ گیا
عجیب خواب تھا، مجھ کو جگا کے چھوڑ گیا

وہ کون شخص تھا؟ آیا، تو ایک عالم تھا
گیا، تو سب کو تماشا بنا کے چھوڑ گیا

ہماری پستیٔ دیوار کو ہے اس سے گلہ
ہوا کی زد پہ دیا کیوں جلا کے چھوڑ گیا

میں گھر سے دشت جنوں کے سفر پہ نکلا تھا
تو پھر یہ کون ترے در پہ لا کے چھوڑ گیا

(۲)

جو مجھ میں تھا، وہی احساس بام و در میں تھا
اک انتظار کا ماحول سارے گھر میں تھا

جو اعتماد رہا عشق، پرہنر میں مجھے
وہ حسن کو غلط انداز سی نظر میں تھا

بہار تھی، نہ خزاں، بس ٹھہر گیا تھا وقت
عجب وقار اک اجڑے ہوئے شجر میں تھا

گھروں کو لوٹتے پنچھی بہت اداس سے تھے
کہ شام ہونے کو تھی اور میں سفر میں تھا

● P.O. Box 435, Dehran
31261 (K.S.A.)



اختر ضیائی

واہمہ تھا فروغِ ذات کہاں
بندگی سے ملی نجات کہاں

ایک تماشا تھی اپنی فردِ عمل
اپنا مقدور اپنے ہات کہاں

ذکرِ صبحِ نشاط ہی چھیڑو !
محض رو کر کٹے گی رات کہاں

خواب آتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں
زندگی میں انھیں ثبات کہاں

درد کی چھاؤں ہو گئی گہری
اپنا سایہ بھی اپنے ساتھ کہاں

مستقل دوستی رہی اپنی !
ہم سے روٹھا غمِ حیات کہاں

نسلِ آدم کو لے اڑا اختر
شوقِ تسخیرِ کائنات کہاں

● 13 Hor Street, London
E17 45D (U.K.)

اطہر راز

غمِ تنہائی سے بچنا ہے تو گاتے رہنا
کون دیکھے گا تمہیں شور مچاتے رہنا

آئینے کو بھی ہے تقریبِ ملاقات کا شور
خود پہ ہنسنا ہے تو اس کو بھی ہنساتے رہنا

کچھ حسیں خواب حقیقت میں بدل جاتے ہیں
اپنے خوابوں کو تصور میں جگاتے رہنا

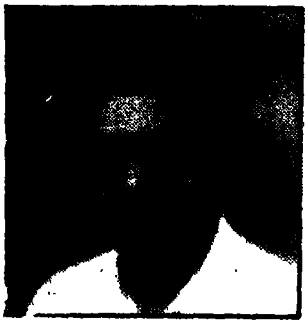
گھر کی دیواروں کو ہے حسنِ سماعت کا شعور
حال ان کو بھی اداسی کا سناتے رہنا

شہر کے اونچے مکانوں سے بہت دور کہیں
تم گھروندے کسی ساحل پہ بناتے رہنا

کیا خبر کوئی چلا آئے یکایک گھر میں
گھر کو کچھ تازہ گلابوں سے سجاتے رہنا

چند لمحوں کی ہیں مہمان کسی کی یادیں
راز یادوں سے خیالوں کو سجاتے رہنا

● 2:1 - Colwoods Gardens, Colliers
Wood, London - SW19 2DS. (U.K.)



نور پوکار

میرے لہجے کی بے باکی

بہت ممکن ہے
سفر سے پہلے ہی تھکن سے چور ہو جاؤ
بے سر و ساماں ہو جاؤ
بہت ممکن ہے
مرے لہجے کی بے باکی
تمہیں باور کرا دے
کہ اس سے پہلے بھی بہت بار
یہ دل دکھا تھا مگر اس بار
اس نہ بل و بے کس سے سارے کس بل لے گیا
جو کبھی جھیلوں کی طرح گہرے تھے
خوشبو کی طرح ٹھہرے تھے
بہت ممکن ہے
بھولی بسری یادوں کی غم ناکی
میرے خوابوں کو بکھرانے کی سازش میں
تمہیں یہ رمز سکھلا دے
کہ گلی کوچوں، آنگنوں، بند کمروں میں
کسے، کونسا نیا سبق پڑھانا ہے
کسے کونسا پرانا ورق بھلانا ہے
کتنی دور تلک ساتھ ساتھ چلنا ہے
اور کب لوٹ آنا ہے

P.O.Box 528, Safat - 13006,
Kuwait (A.G.)



محمد مظفر الدین فاروقی
34-Wild Wood Drive South Prospect Heights,
ILLINOIS - 60070 (U.S.A)

آنسو بنے زنجیر

"اُٹھو ٹھاکور! سمے آگیا ہے۔"
"کون ہو تم! مجھے کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔"
"کیا ماتا کی آواز نہیں پہچانتے؟۔"
"ماتا!! تمہارے درشن کی آس میں تپسیا کر رہا ہوں۔"
"ہاں! ٹھاکور تمہارے تپسیا کی اگنی سے آکاش میں ہلچل مچ گئی۔ پر اب اٹھو، سمے آگیا ہے۔"
"کیسا سمے ماتا؟"
"تپسیا کا انت!! بلیدان کا سمے۔"
"کس کا بلیدان ماتا؟"
"گربھ وتی کنیا کا لہو۔"
"پر۔ ماتا۔ گربھ وتی کنیا کہاں سے لاؤں۔"
"وہ تمہارے ہی گھر میں ہے ٹھاکور۔"
"وہ تو میرے سنتوش کی ماں ہے۔ اور سنتوش کے پاس ایک ہی ماں ہے۔"
"ہاں ٹھاکور! میں جانتی ہوں۔ پر، تم کتنا جانتے ہو اپنی پتنی کو۔"
"وہ پتی ورتا۔ بھاگیہ وان ہے۔ میرے گھر آتے ہی اُس نے ایک سندر سا پتر مجھے دے دیا۔"
"اور کچھ....."
"پنڈت سکھارام جیسے بڑے دھرماتما کی پتری ہے۔"
"کیا تمہیں پتہ ہے۔ اس نے فاطمہ کی کوکھ سے جنم لیا تھا؟"
"کون فاطمہ؟"
"پنجاب کی فاطمہ! پنڈت سکھارام ادھر آتے سمے اسے وہاں سے اٹھوا لائے تھے۔ فاطمہ کو انھوں نے سنجوگتا بنادیا۔ تمہاری پتنی، بھادو بائی اُسی سنجوگتا کی کوکھ سے نکلی ہے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے ماتا۔ بھادو بائی تو رام اور کرشن بھگتی میں ڈوبی ہوئی درگا داسی ہے۔"
"یہ بھی سچ ہے ٹھاکور! پر تو یہ کمال پنڈت سکھارام کا تھا کہ بھادو بائی کو انھوں نے درگا داسی بنادیا اور سنجوگتا نے بھی بھادو بائی کو نہیں بتایا کہ وہ کون ہے۔"
"کیوں نہیں بتایا؟"
"کہ سنجوگتا نے بولنے کی شکتی کھو دی تھی۔ پنجاب کے اس گاؤں میں جب بلوہ ہوا اور سارے لوگ سرحد پار چلے گئے تو اس وقت فاطمہ ۱۳ سال کی تھی۔ چند آدمیوں نے فاطمہ کو پکڑ کر کھلیان کے بیچ کھرلی پر باندھ رکھا۔ پھر سکھارام نے اس سندری کو دیکھ لیا۔ اس گاؤں میں فاطمہ سے پہلے اتنی سندر لڑکی کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تب ہی تو وہ آدمی اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ پرنتو سکھارام اس وقت تک پنڈت نہیں بنے تھے۔ اچھے مسٹنڈے جوان تھے۔ چاہت کی اگنی نے ان کے ہردے کو جلا ڈالا تو ڈنڈا سونت کر ان آمیوں کو بھگا دیا اور اُسے لے کر ادھر آگئے۔ پانچ سال بعد بھادو بائی پیدا ہوئی تو سنجوگتا نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور چیخ ماری۔ تیرا کیا بنے گا میری بیٹی؟ اور پھر بولنے کی شکتی ہی ختم ہو گئی۔ سکھارام بڑے دیالو ہیں۔ انھوں نے پتنی اور پتری دونوں کو درگا داسی بنادیا۔ پھر سکھارام پنڈت ہو گئے اور ان کے کوئی دوسری اولاد نہیں ہوئی۔ سکھارام کی جنم پتری میں کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔"
"پھر بھادو بائی کہاں سے آئی؟"
"بھادو بائی بھونڈو پہلوان کی بیٹی ہے۔"
"وہ کیسے ماتا! بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"
"بھونڈو پہلوان کو ایک دن پتہ چل گیا کہ سنجوگتا کبھی فاطمہ تھی۔ ایک رات جب سکھارام ناگپور پریڈ کرنے گئے ہوئے تھے تو بھونڈو پہلوان نے سنجوگتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور غصے میں کہا۔ تو فاطمہ سے سنجوگتا کیوں بن گئی۔ آ! تجھے میں پھر سے فاطمہ بنادوں، اس رات سنجوگتا گربھ وتی ہو گئی۔"
"سنجوگتا نے سکھارام سے کہہ کر بھونڈو پہلوان کو ختم کیوں نہیں کروایا۔"
"ایک تو سنجوگتا کو بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ دوسرے فاطمہ نے پانچ سال پہلے بہت خون خرابہ دیکھا تھا۔ اگر وہ زبان کھولتی تو ایک بھونڈو پہلوان ہی نہیں بہت سارے جل مرتے۔"
"تو اب میں کیا کروں ماتا۔"

"تمہیں کچھ کرنا نہیں ہے ٹھاکور۔ درگا داسی کا بلیدان کر کے لہو وشنو کے چرنوں میں ڈال دو۔"

"کیوں! میں ایسا کیوں کروں؟ بھادو بائی کچھ بھی ہو۔ میرے سنتوش کی ماں ہے۔"

"سنتوش کو کبھی بھی پتہ چل سکتا ہے۔ بھوشو پہلوان اور سکھارام دونوں زندہ ہیں۔ اچھا ہے کہ سنتوش بن ماں کے ہی پلے بڑھے۔ سوچ لو ٹھاکور۔ اس سندر آتما کو اس تچھ شریر سے نکال دو۔ اگلے ورش جب تم بھی آکاش پر آ جاؤ تو تمہیں بھادو بائی کی آتما میرے چرنوں میں مل جائے گی۔ تم ماتا کا درشن کرنا چاہتے تھے نا۔ تو اٹھو ٹھاکور سے آگیا ہے۔"

"ہر ہر مہادیو' مہاکالی درگا ماتا کی جے۔" آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ گیندے کے پیلے پیلے پھول ہر طرف بکھر گئے۔ ایک بڑا بیلا اوپر سے نیچے آیا۔ جس میں بیلے کے بہت سارے پھول تھے۔ وہ میرا گھر نہیں تھا۔ یہ چمکنے والی چیز۔ باپ رے باپ تیز دھاری والا چھرا۔ تم کہاں ہو بھادو بائی۔ دیکھو سے آگیا ہے۔ تم کتنی بھاگیہ دان ہو۔ تمہارے لہو کو وشنو بھگوان نے سویکار کر لیا ہے۔ وہ دیکھو وشنو کی آنکھیں کتنی بڑی ہو کر پھٹ گئی ہیں۔ وہاں رام کھڑے ہیں، کرشن کھڑے ہیں۔ ہنومان بھی ہیں۔ سیتا اور رادھا کہاں ہیں۔ یہاں سیتا اور رادھا کا کیا کام۔ گربھ وتی کنیا کے بلیدان کا سمے ہے۔ ماتا۔۔ درگا ماتا۔۔ جلدی آؤ ماتا تم سامنے تو آؤ۔ درگاہ ماتا سامنے آگئی اور میں نے چھرا ہاتھ میں لے لیا۔ نٹراج کے ناچنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے چندرما کا ٹکڑا دکھائی دینے لگا۔ نیلگی روشنی میں درگا ماتا کھڑی تھی۔ راکھشش کی کٹی ہوئی گردن سے لہو کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹپکنے لگا۔ ماتا کے دونوں ہونٹ سرخ تھے۔ باچھوں سے بھی لہو ٹپک رہا تھا۔ بھادو بائی نے کسمسا کر کروٹ بدلی۔ اس کا کملایا ہوا زرد مکھڑا اروپیلی روشنی میں بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔۔ گربھ وتی اپسرا۔۔ اور۔۔ اور بلیدان۔ ماتا کی جے۔۔ آواز کی گرج کے ساتھ ہی بھادو بائی نے چونک کر تکیے سے سر اٹھایا۔ لیکن اس کی چیخ نکلنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ چل گیا اور جب تک سارا بیلا خون سے نہیں بھر گیا میں نے بھادو بائی کو نہیں چھوڑا۔ پھر وہ ایکدم اچھلی اور زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ بھگدڑ سن کر سنتوش اٹھ بیٹھا اور ماں کو اس حال میں دیکھ کر چیخنے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر بھی چھرا پھیر دیا۔ اس کا سر پھولوں سے بھرے تھال پر پڑا اور بیلے کے سارے پھول لہو میں ڈوب گئے۔۔ لہو میں ڈوب گئے۔۔ لہو میں۔ ڈ۔۔و۔۔ب۔۔۔

"پھر کیا ہوا۔ آنکھیں کھولو ٹھاکور۔" پولس کے جوان نے پانی سے بھرا کٹورا اٹھا کر ٹھاکور کے منہ پر الٹ دیا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ میرے ہی گھر میں۔ نہیں۔ نہیں سورگ میں، میں نے سارا لہو وشنو کے چرنوں میں ڈال دیا۔ رام، کرشن، ہنومان اور درگا ماتا کے چرن بھی بھیگ گئے۔ پھر نٹراج اُسی لہو میں تھا تھیّہ کرنے لگے۔ تھا تھیّہ۔۔ تھا تھیّہ۔۔ ٹھاکور نے اٹھ کر ناچ دکھانے کی کوشش کی لیکن بے دم ہو کر گر پڑا۔

ٹیلیفون کی پہلی گھنٹی پر مسز شرما نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہلو! میں مسز شرما بول رہی ہوں۔"

"دیدی جی!" ادھر سے آواز آئی۔ "آج شام گوڑ گاؤں میں ایک اور شادی ہو رہی ہے۔"

"کس وقت؟"

"نکاح مغرب کے بعد ہوگا۔ اور رخصتی کے بعد دولہا اور دولہن اسی رات دبئی جا رہے ہیں۔"

"میں فوٹو گرافر بنرجی اور سونیا کو بھیج دوں گی۔"

"نہیں دیدی جی! آپ کا بھی وہاں جانا ضروری ہے۔ کیس گمبھیر معلوم ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے چلی جاؤں گی۔ تم بنرجی کو پتہ ٹھیک سے سمجھا دینا۔"

یہ کہہ کر مسز شرما نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تو اچانک سارے کمرے میں ایک سوگوار خاموشی چھاگئی۔ مسز شرما نے آنکھیں موند کر گردن کرسی کی پشت سے لگادی۔ بند آنکھوں کے اندر ہی اندر دریا کی رواں لہریں کٹ پتلی کا ناچ کرتی ہوئی پیچھے کی طرف بھاگنے لگیں۔ پھر آہستہ آہستہ کہیں دور سے بہت دور سے کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور سناٹے پر چھاگئیں۔ گرجتے بادل، چمکتی بجلی، طوفان بادوباراں اور انجن کی گڑگڑاہٹ۔ مسٹر شرما کا ذاتی وایو دوت ہمالیہ کی چوٹی سے ٹکرا گیا۔ اس دن گھر سے جاتے وقت شرما جی، رجنی کے گال پر اپنا آخری نشان اور بے اندازہ دولت چھوڑ گئے۔ پھر وہ واپس نہیں آئے۔ باپ اور تاؤجی نے آپس میں کھسر پھسر کر کے رجنی شرما کی شادی کمار شرما سے کردی تھی۔ تاؤجی ایک سال تک آنتوں کے کینسر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر شمشان جانے کے لیے تیار ہو گئے تو چھوٹے نے بڑے کی محبت اور دولت دونوں کو خاندان کے اندر ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کمار کی ساری اچھائیوں اور برائیوں سمیت اپنی اکلوتی لڑکی رجنی کا ہاتھ کمار کے ہاتھ میں دے دیا۔ ۴ سال کے اندر کمار شرما نے رجنی کو زندہ درگور کر دیا۔ بیٹھک کے بازو والے کمرے میں کمار کے سارے دوست جمع ہوتے اور رجنی گھر کے اندر سسکتی رہتی۔ صاحب، بی بی اور غلام کا کھیل لوگ کوٹھے پر کھیلتے ہیں لیکن کمار شرما نے یہ کھیل گھر پر کھیلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس کی۔ رجنی زبان کھولتی تو گال سرخ ہو جاتے یا پھر کمر کی ہڈی ٹوٹنے کا خدشہ لاحق ہو جاتا۔ ۳ سال یونہی کٹ گئے اور رجنی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے

ہی کو تھا کہ کمار نے پٹری بدل دی۔ بیٹھک والا کمرہ چھوٹ گیا اور کمار کا سارا وقت باہر گزرنے لگا۔ امریکن کونسلیٹ کی نئی پریس اتاچی، سوزی لن ہارٹ سے کمار کی ملاقات ہو گئی۔ سوزی کو چھوٹے جہاز اور لاابالی مردوں سے پیار تھا اور کمار کو سوزی کے گالوں میں پڑنے والے گڑھے بہت بھا گئے۔ کمار نے فوری دو دو ایو دوت خرید لیے اور دن رات ایک کر کے چھ مہینے کے اندر پائلٹ کا لائسنس لے لیا۔ لائسنس ملے چند ہی مہینے ہو پائے تھے کہ ایک دن مسٹر شرما وایو دوت میں بیٹھ کر ایسے چلے گئے کہ لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا۔

رجنی نے مسز شرما کے ٹائٹل کو ٹھاٹھ سے اپنا لیا۔ اور شرما جی کی ساری دولت کو بے سہارا عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ چند سال کے اندر اندر سارے بڑے شہروں میں مہیلا جاگرتی منڈل کے دفتر کھل گئے۔ انھیں دنوں شاہ بانو کے کیس نے سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ دیوی لال کے مشورے پر سب سے پہلے رجنی نے مہیلا جاگرتی منڈل کا نام بدل کر بیورو آف سوشل رائٹس اینڈ لیبرٹی (بی ایس آر یل BSRL) کر دیا۔ نیشنل پریس نے جس تندہی، جوش اور جذبے کے ساتھ اس کیس کو اچھالا اس کی مثال آزاد ہند کی پچھلی صحافتی تاریخ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ لیکن مسز شرما کی احتجاجی لے کی گھن گرج اور جارحانہ انداز سے نیشنل پریس بھی تھرا اٹھا۔ اپنے وقار اور بقا کی خاطر نیشنل پریس نے اصل موضوع سے ہٹ کر پرسنل لا پر جارحانہ حملے شروع کر دیے۔ اور بیورو چند مہینوں کے اندر شیطان کی طرح مشہور ہو گیا۔ شاہ بانو کا بوڑھا کھوسٹ شوہر شاہ بانو کا سارا رس نچوڑ لینے کے بعد شاہ بانو کو عزت کی روٹی سے بھی محروم کر رہا تھا۔ مسز شرما کے نزدیک سماجی ناانصافی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی تھی۔ اگر کامن سیول کوڈ سارے ملک پر یکساں لاگو ہوتا تو ایسی ناانصافی قانوناً رد کی جا سکتی تھی۔ اس بات پر مسز شرما کو سخت غصہ آیا۔ اور ان کے غصے نے بی ایس آر یل کی جڑوں کو مضبوط کر دیا۔

مسز شرما جب گوڑگاؤں پہنچیں تو برات آ چکی تھی اور نکاح کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پنڈال میں صرف پچاس یا ساٹھ لوگ ہوں گے۔ یعنی کچھ زیادہ شان شوکت والا معاملہ نہیں تھا۔ اس علاقے میں مسز شرما کو سب ہی جانتے تھے۔ جب سے انھوں نے فرید آباد کے کیس میں ثابت کیا تھا کہ سکینہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی تو مسز شرما اس علاقے میں کسی فلم اسٹار کی طرح مشہور ہو گئی تھیں۔ مسز شرما کو شادی بیاہ کی تقریب میں دیکھ کر لوگ بہت ہی محتاط ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب مسز شرما پنڈال میں داخل ہوئیں تو کسی نے ان سے تعارض کیا اور نہ ان کا استقبال۔ وہ تیز تیز قدموں سے وہاں پہنچ گئیں جہاں مسٹر بنرجی کیمرہ سنبھالے کھڑے تھے۔ مسز شرما نے بنرجی سے پوچھا۔

"کیا شادی ہو گئی بنرجی۔" لیکن جواب سونیا نے دیا۔

"نہیں دیدی! لڑکی کا باپ اور بھائی اندر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے باہر آتے ہی شادی ہو جائے گی۔"

"یہ لوگ لڑکیوں کو اندر بیٹھا کر ایسی رازداری اور پراسرار ماحول کیوں پیدا کرتے ہیں۔ محنت مزدوری کرنے والے لوگ ہیں سب ہی باہر گھومتے رہتے ہیں۔ شادی کے وقت کم از کم لڑکی کو پنڈال میں کیوں نہیں لے آتے۔"

"اب میں کیا بتاؤں دیدی۔ آپ اندر جا کر خود پتہ کر لیں۔"

"نہیں سونیا۔ مجھے ایک ضروری کام سے گوڑگاؤں پولس تھانے جانا ہے۔ تم خود اندر جا کر معلوم کر لو۔ کہیں کچھ ایسی ویسی بات تو نہیں ہے۔ ہاں مسٹر بنرجی تصاویر اچھی آنی چاہیں۔ دولھا اور دولہن کا چہرہ صاف صاف ہو اور دونوں کی عمروں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے۔"

"آپ فکر نہ کریں دیدی یہ کام ہو جائے گا۔" بنرجی نے اطمینان دلایا۔

مسز شرما نے چپکے چپکے بنرجی کو کچھ اور ہدایات دیں اور وہاں سے نکل کھڑی ہوئیں۔ انھیں ٹھاکور زریم سنگھ کے تھانہ پہنچ جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن مسز شرما تھانہ جا کر کیا کرتیں۔ لہٰذا وہ سیدھے اپنے گھر چلی گئیں۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے دیوی لال کو فون کر دیا کہ وہ صبح گوڑگاؤں کے تھانے سے مکمل رپورٹ لے کر آفس آ جائیں۔

دوسرے دن مسز شرما آفس پہنچیں تو بنرجی اور سونیا کانفرنس روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مسز شرما بھی وہیں پہنچ گئیں۔ ٹیبل پر تصاویر کا بنڈل رکھا ہوا تھا۔ ساری تصاویر بہت ہی اچھی آئی تھیں۔ ایک تصویر میں دلہن کا گھونگھٹ الٹا ہوا تھا اور اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لڑی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ کنیز کی عمر کوئی ۱۶ یا ۱۷ سال کی رہی ہو گی۔ رونے سے اس کا منہ سوجا ہوا لگتا تھا۔ اور بے ڈھنگا میک اپ آنکھوں کے آس پاس سے دھل گیا تھا۔ ساتھ میں کنیز کا دولھا کھڑا تھا۔ اس کی عمر ۳۵ سے کم نہیں لگتی تھی۔ چہرے پر کرختگی اور کراہیت آمیز مسرت بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ مسز شرما نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بنرجی! تم نے میدان مار لیا ہے۔ دیکھو! شادی زبردستی کی معلوم ہوتی ہے۔ سونیا ڈیئر! کیا تم نے پتہ کر لیا تھا کہ لڑکی اس شادی کے لیے راضی تھی؟"

"باپ اور بھائیوں نے اندر سے آ کر کہا کہ لڑکی ہاں کہتی ہے۔ تب قاضی جی نے نکاح پڑھایا۔"

"اندر کیا ہوا ہو گا۔ کوئی بتائے گا نہیں۔ لیکن یہ لڑکی اتنے آنسو کیوں بہا رہی تھی؟"

"دیدی! لڑکیاں شادی پر تو روتی ہیں۔ پسند کی شادی ہو تب بھی گھر چھوڑنے کے خیال سے آنسو تو نکل ہی آتے ہیں۔"

"سونیا! تم خود غور کرو۔ یہ غریب لوگ ہیں۔ لڑکی کو ماں باپ کے گھر کیا سکھ مل رہا تھا۔ اسے تو خوشی خوشی رخصت ہونا چاہیے تھا۔ یا پھر ایک آدھ آنسو بہا بھی لیتی تو اور بات تھی۔ یہ تو مسلسل روئے جا رہی ہے۔"

اتنے میں کاریڈور میں جوتوں کی آواز آئی اور دیوی لال مسکراتے ہوئے کانفرنس روم میں داخل ہوئے۔ مسز شرما نے گردن اٹھا کر انھیں دیکھا اور کہا۔

"دیوی! تم اپنے جوتے بدل دو یا مسکرانا کم کر دو۔"

"ٹھیک ہے۔ جوتے بدل دوں گا لیکن مسکرانے سے باز نہیں آسکتا۔ جوتے موچی نے بنائے ہیں اور مسکراہٹ بھگوان کی دین ہے۔"

"خیر۔ تمہاری مرضی۔ لیکن یہ چرچر کی آواز اب بند ہونی چاہیے۔"

"ہو جائے گی۔ اگر تم کاریڈور میں کارپیٹ ڈلوا دو۔ کیا تم صرف جوتوں پر بات کرو گی۔ گوڑگاؤں کے پولس اسٹیشن۔۔۔۔"

"کیا تفصیلات ہیں؟"

"بڑا ہی بھیانک کیس ہے۔ اگر پریس کو پتہ چل گیا تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ مہاشے پنڈت سکھارام بالکل پسند نہیں کریں گے۔"

"کون سکھارام؟"

"وہی جو پچھلے الیکشن میں پارلیمنٹ کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔"

"بی جے پی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے نا۔ مگر وہ تو شاید الیکشن ہار گئے تھے۔"

"ہاں! لیکن سکھارام خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ پارلیمنٹ میں ان کی اسٹیر نتھ بہت بڑھ گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ کیس بھی دیکھ لیں گے لیکن تم ان تصاویر کو تو دیکھو۔"

"کیا کوئی اہم کیس ہے؟"

"ہاں! گوڑگاؤں کے بابو جمّا خان کی لڑکی کنیز کی شادی کے تصاویر ہیں۔" دیوی لال ایک ایک کر کے تصویر اٹھا کر دیکھتے رہے۔ اور ایک تصویر کو کافی دیر تک ہاتھ میں پکڑے گھورتے رہے۔"

"اب کچھ منہ سے بھی بولو دیوی! تصویر کو کب تک گھورتے رہو گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم کیا سوچ رہی ہو۔ کیس جاندار ہے۔ سکینہ کے بعد اس علاقے کا یہ دوسرا کیس ہو گا۔"

"ہے نا!! تو پھر۔"

"کام شروع ہو جانا چاہیے۔ یہ دھاندلی اب بند ہونی چاہیے۔"

"کیسی دھاندلی دیوی بھائی۔" سونیا نے تعجب سے پوچھا۔

"شادی اور طلاق کے معاملات سرکاری افسروں کے سامنے ایک قانون کے تحت ہونا چاہئیں۔"

"کیا آنسو بہانے کی اتنی بڑی سزا۔ شادی کے وقت تو ہر لڑکی آنسو بہاتی ہے۔"

"کیا تم نے بہائے تھے؟"

"نہیں میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ شادی کیا ہوتی ہے۔"

"کیا شادی کی رات بھی پتہ نہ چلا۔"

"دیوی بھائی۔ آپ بڑے بھائی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایسا بیہودہ سوال کرتے شرم نہ آئی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ ہمیں شرم چھوڑ کر حقایق کا سامنا کرنا ہو گا۔ ناانصافی کو بہر حال بند ہونا ہے۔"

"ٹھیک ہے دیوی۔" مسز شرما نے تقریباً بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ آج کے دونوں کیس ہم ہفتے والی میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل کر لیں گے۔ تیاری کر لو دیوی لال۔"

ہفتے کے دن ٹھیک ۱ بجے لنچ کے بعد میٹنگ مسز شرما کی صدارت میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے سنٹرل سیکٹر (دہلی) کے انچارج دیوی لال نے گوڑگاؤں کے جمّا خان کی لڑکی کنیز کی شادی کی تصاویر تقسیم کیں اور انکشاف کیا کہ شادی زبردستی کی گئی تھی۔ لڑکی اپنے سے دوگنی عمر کے مرد کے ساتھ شاید سمندر پار جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ لہذا روایات کا سہارا لے کر لڑکی کی مرضی بر سر عام معلوم کیے بغیر شادی کر دی گئی۔ ملک میں ایسی سینکڑوں شادیاں ہو رہی ہیں۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر کے ایکشن کمیٹی کو متحرک کرنا پڑے گا۔ دوسری رپورٹ پیش کرنے سے پہلے دیوی لال نے چند کاغذات تقسیم کیے اور کہا کہ تفصیلات ان میں درج ہیں۔ پلونا گاؤں کی بھادو بائی پنڈت سکھارام کی بیٹی کے شوہر نے دعویٰ کیا کہ درگا ماتا نے خواب میں آکر گربھ وتی کنیا کا بلیدان مانگا۔ تو ٹھاکور زیم سنگھ نے اپنی جواں پتنی اور ۷ سالہ لڑکے سنتوش کا گلا کاٹ کر خون وشنو، شنکر، درگا اور ہنومان کی مورتیوں پر چھڑک کر پوجا کی۔ اور پولس اسٹیشن پر پہنچ کر اقبال جرم کر لیا۔

بہار اور بنگال سیکٹر کی انچارج مس ورما نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ شمالی بہار اور بنگال کے بعض قبائل میں عورتوں کو چڑیل ثابت کر کے ٹھکانے لگانے کی روایت نہایت قدیم ہے۔ ان قبائل میں لڑکیاں آبائی جائداد میں لڑکوں کے برابر حصہ دار ہوتی ہیں۔ مالدار خاندان کی خوبصورت لڑکیاں ایک عرصے تک غیر شادی شدہ رہ جاتی ہیں کیونکہ لڑکوں کو دلہن حاصل کرنے کے لیے منہ مانگی قیمت دینی پڑتی ہے۔ مالدار لڑکیوں کے قریبی رشتہ دار دولت کو ہڑپ کرنے کے لیے ان لڑکیوں کو چڑیل ثابت کر کے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ اس کام کے لیے پجاریوں کی جنھیں گونن Gunin کہا جاتا ہے کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ چڑیل ثابت کرنے کے لیے پجاری ۱۰ ہزار سے ۳۰ ہزار تک فیس لیتے ہیں۔ گونن کا جاسوسی نظام سارے سنتھالی اور ہو قبائل میں پھیلا ہوا ہے۔ ۲ ہفتے قبل ایک مقامی اخبار میں مغربی بنگال کے ایک گاؤں سوکھنڈی

کے ایک الم ناک واقعے کی رپورٹ چھپی ہے۔ سوکھنڈی میں ایک خاندان کی ۴ لڑکیوں کو سر بازار سخت اذیت دے کر مار ڈالا گیا اور ان لاشوں کو مقامی ہاسپٹل میں رازداری کے ساتھ ٹھکانے لگا دیا گیا۔ لڑکیوں پر الزام تھا کہ وہ سنتھالی قبیلے کے حسن پرست دیوتا بونگز Bongos سے جنسی تعلقات قایم کر کے مردوں کے اعضاء کو کھا جانے کی صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک پر گاؤں کے کھیا کا بھائی عاشق تھا اور ان کی جاسوسی کرتا تھا۔ چنانچہ ان لڑکیوں نے کھیا کے بھائی کی گردن چبا کر اسے مار ڈالا۔ لڑکیوں کے قاتل کچھ ۵۰ لوگ تھے وہ سب کھیا کے خاندان کے افراد تھے۔ اور پولس کھیا کے خوف سے قاتلوں کو پکڑ نہ سکی۔

گجرات اور راجستھان سیکٹر کی انچارج مس نیلنی سنگھ نے بتایا کہ گجرات ضلع بڑودا کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ۷۰، ۸۰ لوگوں کے سامنے ۵ نوجوان عورتوں کا پہلا جلوس نکالا گیا۔ اور انھیں مندر کے سامنے زندہ جلا دیا گیا۔ ان لڑکیوں کے والدین نے شادی کے وقت جو چیزیں جہیز میں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بار بار مطالبے کے باوجود ادا نہیں کیا گیا تو لڑکوں کے خاندان والے مل کر لڑکیوں کو سزا دینے پر مجبور ہو گئے۔ اسی مندر کے سامنے کئی سال پہلے روپ سنگھ کی ستی کا واقعہ بھی ہوا تھا۔ پولس کو حالیہ واقعے کا پتہ چل گیا تھا لیکن پولس کے وہاں پہنچنے تک وہ لوگ یہ کام کر کے غائب ہو چکے تھے۔

مس نیلنی نے ایک اور سنسنی خیز واقعے کا ذکر کیا۔ اودے پور شہر کے آس پاس آراولی پہاڑیوں کے دامن میں بلرام بھگتوں کے اڈے ہیں۔ جہاں سال میں ایک بار جنم اشٹمی کی رات بلرام بھگت وہاں جمع ہوتے ہیں۔ اس رات سینکڑوں اچھوت کنواری لڑکیاں اغواء کر کے یا لالچ دلا کر لائی جاتی ہیں۔ جنم اشٹمی کی رات بلرام بھگت پہلے خوب تاڑی پی کر اور گدا کندھوں پر رکھ کر ناچ رنگ کرتے ہیں۔ آدھی رات گزرنے پر پوجا پاٹ ختم کر کے وہ کندھوں پر ہل اٹھا لیتے ہیں۔ اور ننگ دھڑنگ ہو کر پہاڑیوں پر دوڑ لگاتے ہیں۔ دوڑ کے ختم ہونے پر انتہائی وحشیانہ طریقے سے اغوا شدہ لڑکیوں کی عزت ریزی کی جاتی ہے۔ اور صبح میں لڑکیوں کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔

بلرام کو ہندوستان کا رستم بن ڑالی کہا جاتا ہے۔ وشنو پران کی کہاوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وشنو نے اپنی چھاتی سے ایک کالا اور ایک سفید بال توڑ کر دیوکی کے رحم میں داخل کیا۔ کالے بال سے کرشن اور سفید بال سے بلرام پیدا ہوئے۔ بلرام کو وشنو کا آٹھواں اوتار اور کبھی کبھی کرشن کا جڑواں اوتار بھی کہا جاتا ہے۔ بلرام بھگت باڈی بلڈر، نہایت جری اور نڈر ہوتے ہیں۔ راجستھان کی کئی سیاسی پارٹیاں بلرام بھگت تحریک کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ مقامی پولس اغواء کی وارداتوں کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ سنا گیا ہے کہ سیویلین پولیس اور ریاستی ہتھیار بند پولس میں خود بلرام بھگتوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ پہاڑیوں سے واپس آنے والی لڑکیوں کی داستان دلخراش پر توجہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔

بحث مباحثے کے دوران مسز شرما کے تربیت یافتہ سماجی کارکن بہت جلد نتیجے پر پہنچ گئے اور متفقہ فیصلے صادر کر دئے گئے۔ تینوں دن سیکٹروں کے انچارج کو ہدایت کر دی گئی کہ مذہبی اور سیاسی منافرت پیدا کرنے والی زبان و بیان نہ استعمال کریں۔ مذہبی مقامات، مخصوص طبقے کے دیوتا اور سیاسی پارٹیوں کے نام رپورٹوں سے حذف کروئے جائیں۔ دیوی لال سے کہا گیا کہ وشنو، شنکر، درگا اور ہنومان کی جگہ صرف مورتیاں لکھی جائیں۔ مس ورما کو ہدایت کی گئی کہ حسن پرست دیوتا بونگز، کی جگہ صرف حسن پرست دیوتا لکھا جائے اور پجاری گونن کی جگہ قبیلے کے 'وچ ڈاکٹر' لکھا جائے۔ مس نیلنی کو ہدایت کی گئی کہ 'مندر' کی جگہ 'عبادت گاہ' کا لفظ استعمال کرے۔ 'اچھوت کنواری لڑکیوں' کی جگہ صرف 'لڑکیاں' لکھا جائے۔ بلرام بھگت کی جگہ 'بلرام کے ماننے والے' لکھا جائے اور رپورٹ کا آخری پیراگراف 'بلرام کو ہندوستان ـــ بلرام بھگتوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔' حذف کر دیا جائے کیونکہ اس پیراگراف کے نکالنے سے نفس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ رپورٹوں کی نوک پلک درست کرنے کے بعد فیصلوں کو منٹس میں شامل کر لیا گیا۔

دیوی لال کی رپورٹ روایات کا سہارا لے کر اور خصوصاً پرسنل لا کی آڑ میں شادی اور طلاق کے معاملات میں زبردست دھاندلی کی جارہی ہے۔ نیشنل پریس اور عوام کو ایک ساتھ موبیلائز Mobilize کیا جائے تاکہ کامن سیول کوڈ کی بنیاد پر سماجی مسائل کی یکسوئی کے لیے دستور سازی کی فضاء ہو سکے ایکشن کمیٹی کے سکریٹری مسٹر ناتھو رام کو ہدایت کی گئی کہ اس مہم کے لیے پروگرام جلد مرتب کیا جائے۔

پلوناگاؤں کا قتل گھریلو ظلم و زیادتی کا ایک انتہائی سنگین واقعہ ہے۔ اس کا تعلق کریمنل لا اور پولس سے ہے۔ لہذا پی یس آر یل ہر طرح مقامی پولس کی مدد کرے تاکہ قاتل کو قرار واقعی سزا مل سکے۔ مس ورما کی رپورٹ پی یس آر یل کا ایک وفد مسز شرما کی رہنمائی میں ریاستی حکومت سے مل کر ان واقعات کی چھان بین کا مطالبہ کرے۔ اور ساتھ ہی مقامی پولس پر زور ڈالے کہ ایسے واقعات کی مناسب تشہیر کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ جرائم کی روک تھام کیلئے موثر اقدامات کرے۔

مس نیلنی کی رپورٹ: یہ ہمارے سماج کا انتہائی گھناونا ناسور ہے۔ ڈاوری اور بے جا جہیز کی روک تھام کے لیے حکومت قانون بنا چکی ہے۔ اس پر سختی سے عمل درآمد ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں سے نمائندگی کی درخواست کی جائے۔

آراولی پہاڑیوں پر پائے جانے والے اڈے ثابت کرتے ہیں

کھنڈ صاحب کے نام پر جرائم پل رہے ہیں۔ لیکن اس واقعے کی مناسب چھان بین بھی ضروری ہے۔ چنانچہ مسز شرما سے درخواست کی گئی کہ وہ پی لیس آر یل کے اسٹاف کے ذریعے تحقیقات کے بعد آئندہ میٹنگ میں اس کیس کو دوبارہ پیش کریں۔

ان فیصلوں کو ڈکٹیٹ کرواتے ہوئے مسز شرما مسلسل سونیا کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ سونیا کی موہنی صورت پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے اور وہ خاصی بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ ڈکٹیشن ختم کر کے مسز شرما نے سونیا کو ایک بار پھر نظر بھر کر دیکھا اور سوال کیا:

"کیا سوچ رہی ہو سونیا۔ تم نے کوئی رائے نہیں دی۔"

"کچھ نہیں دیدی۔ میری رائے سے کیا فرق پڑے گا۔ لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ آخر زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ لہو کتنا سستا ہو گیا ہے اور آنسو کبھی کبھی کتنے مہنگے پڑتے ہیں۔"

**

بقیہ صفحہ ۱۹ : اردو کی نئی بستیاں

کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کلچر سے ہم آہنگ کرے۔ مگر اپنے وطن اپنی زبان اور اپنے کلچر میں بھی اس مہاجر کو سانسیں لینا ہوتی ہیں اور یہی تصادم نت نئے مسائل پیدا کرتا ہے۔ نئی اور پرانی نسل کے درمیان ایک کشاکش علاحدہ رہتی ہے۔ ایک غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ وہ نئی نسل جو انگریزی میں تعلیم حاصل کر رہی ہے اسے اردو کس طرح سکھائی جائے۔ جدید اردو تحریک (نیویارک) کے منصوبے غیر معمولی ہیں تاہم اردو رسم الخط کے بجائے رومن میں اردو کی تدریس بے حد نازک مسئلہ ہے۔ اردو کی درس و تدریس کا یہ طریقہ کار اپنی جگہ بالکل درست اور غیر اردو داں حضرات (غیر ملکی باشندے) کے لئے مفید ہو سکتا ہے تاہم مسلمان بچوں یا وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ہے یا گھر میں ماں باپ اردو بولتے ہیں، ایسے بچوں کے لئے اردو رسم الخط سے کوئی واقفیت نہیں رہے گی اگر رومن رسم الخط کے ساتھ اردو رسم الخط نہ رکھا جائے گا۔ جیسا کہ ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھے جانے کی پرجوش سفارش کی جا رہی ہے اور یہ بہت پہلے سے ہو رہا ہے۔ مسلمان بچے انگریزی، ہندی اور علاقائی زبانوں والے سہ لسانی فارمولے میں پھنسے ہوئے ہیں اور جہاں اختیاری زبان کا معاملہ ہے وہاں سنسکرت رکھی ہوئی ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کا چلن اگر ختم نہیں ہوا ہے تو کم ضرور ہوا ہے لیکن مایوس کن نہیں ہے۔ یہاں تمام تر مسئلہ اردو رسم الخط کا ہے۔ رسم الخط کسی بھی زبان کا ہو، وہ سیکھنے اور سکھانے کے شوق اور طریقہ تدریس پر منحصر ہے۔ عام طور پر مسلمان بچے ابتدائی عمر میں قرآن مجید پڑھتے ہی ہیں اور "بغدادی قاعدے" سے گزرتے ہیں۔ اب تو ہندو پاک میں بہت سارے ایسے نئے قاعدے آگئے ہیں جو اردو رسم الخط اور اردو املا کو آسان سے آسان طریقے پر سکھاتے ہیں۔ اردو رسم الخط سے شناسائی اور ذرا سی مشق سے بچہ پڑھنے لگتا ہے۔ جوڑ، آوازیں اور کچھ بنیادی اصول سمجھاتے ہوئے تحریری مشق کروائی جائے تو بچہ کچھ ہی دنوں میں لکھنے بھی لگتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کا رسم الخط مشکل نہیں اگر سیکھنے کا شوق ہو تو، ورنہ تو ہر زبان کا رسم الخط مشکل ہے۔ مسلمان بچوں ہی میں سنسکرت، فرنچ، جرمن، اسپینش وغیرہ زبانیں لکھنے بولنے اور پڑھنے والے مل جائیں گے۔ رومن رسم الخط کے ساتھ اگر اردو رسم الخط سے بھی تعارف کروایا جائے تو کم از کم حروف کی شکلوں اور آوازوں سے شناسائی تو ہو گی۔ جدید اردو تحریک سے وابستہ افراد اپنی زبان اور ثقافت کو ممالک غیر میں قائم رکھنے کے لئے جس سطح پر بھی کوششیں کر رہے ہیں وہ قابل قدر ہے۔ (الف الف) ** **

بقیہ صفحہ ۴۳ : سوچ رُت

کے پیچھے سریش کا چہرہ اور خط پورے خدوخال کے ساتھ تصور میں ابھرا۔ تمہارا نام تو سندری ہونا چاہیے تھا، سریتا کس نے رکھ دیا۔۔ لمحہ بھر کو اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہوا ہی چاہا کہ گھونگھٹ کاڑھ لے، مگر دوسرے ہی لمحے ڈھلتی ہوئی شام کو گاؤں کے اونگھتے ہوئے اسٹیشن پہ ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے سریش کا چہرہ یاد آیا۔ تو اس کے جسم کی شریانوں میں بہتا ہوا خون جوار بھاٹا ہو گیا۔ پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کو دیوار پہ مارا۔۔ تو ندی میں نہاتی ہوئی گوپیوں کا وستر چراتے ہوئے کرشن بھگوان کی تصویر کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ کر بکھرا اور کرچیں بستر اور جسم تک آئیں بلکہ کچھ اور دور تک۔ پرسکون سانس نے سمندر کی تہہ سے اٹھتے ہوئے طوفان کی آمد محسوس کی تو....ایک ایک کر کے ایک بار پھر اس نے اپنے سارے کپڑے اتار دیئے کہ سکون بھی اس کو اب اسی طرح آتا ہے۔!

**

بقیہ صفحہ ۴۸ : ٹھیک ہے

"بیٹے، ہما کا فون ہے۔ یہ لوگ شام میں مکہ جا رہے ہیں طواف کرنے۔ کیا ہم لوگ بھی چلیں؟"

میری بے چین روح کو جیسے ٹھکانہ مل گیا ہو۔ میں نے پرجوش الفاظ میں کہا۔ "ہاں ہاں ضرور چلیں گے بلکہ ہم لوگ عمرہ بھی کریں گے۔ کئی مہینے ہو گئے ہر بار صرف طواف کر کے ہی لوٹ آتے ہیں۔"

بیوی نے پروگرام طے کر کے فون رکھ دیا اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر گویا ہوئی۔ "واپسی میں ہم لوگ تھوڑی شاپنگ بھی کر لیں گے۔ عمرہ سیزن عروج پر ہے بلکہ اب حج کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ سنا ہے حرم شریف کے آس پاس کی دکانوں میں کپڑوں کا نیا اسٹاک آیا ہوا ہے۔ رفعت کل ہی لے کر آئی ہیں۔ انڈونیشین کپڑے سستے داموں میں مل رہے ہیں۔"

لاحول ولا قوۃ۔ میری زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ مجھ میں اپنی فوراً پیدا ہوئی روحانی کیفیت کو زبردست دھکا لگا تھا۔ اصلاً خواتین نے حرم شریف میں حاضری کا نہیں شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا بس آہستہ سے کہا: "ٹھیک ہے۔" ** *

شاهین

غلط سب استعارے لفظ بے معنی ۔ ترا لالا
حسیں ہے پھر بھی یہ بے ربط سی دنیا۔ ترا لالا
بدلتی رت میں اپنا جسم ہم مٹی میں بو آئے
سنور جائے گی اب کشت گل و لالہ ۔ ترا لالا
ہمیں مر کر بھی خود ہی اپنا استقبال کرنا تھا
ہوا نامِ خدا اب پاک یہ قصہ ۔ ترا لالا
اٹھا لیتے ہیں اکثر بوجھ ہم ساتوں سوالوں کا
کہ ہم ہیں رشک صد افسون و افسانہ ۔ ترا لالا
سفر میں اجنبی لوگوں نے وہ دلداریاں کی ہیں
سر منزل چراغاں ہی چراغاں تھا ۔ ترا لالا
بچھڑنے والے کتنے خوبصورت لوگ ہوتے ہیں
جو بن جاتے ہیں درماں چشم حیراں کا ۔ ترا لالا
سرابوں نے ہمیں دکھلا دئے آثار ساحل کے
اب ان کے نام اک جامِ طرب افزا ۔ ترا لالا
ہمیں کیا کیجئے معروف رہنے کی بری لت ہے
جدھر ہوں ساتھ رہتی ہے یہی دنیا ۔ ترا لالا
ہمیں عادت ہے خوش رہنے کی لیکن ماجرا یہ ہے
اسی پاپی سے پڑتا ہے ہمیں پالا ۔ ترا لالا
غریبی نے ہمیں برداشت کی قوت عطا کی ہے
مگر ہم سے الجھنا بھی نہیں اچھا ۔ ترا لالا
مقدر ہے ہمارا جس قدر مل جائے گو دنیا
خرابِ جستجو دنیا سے کیا شکوا ۔ ترا لالا
یہ ویرانہ سہی لیکن الگ بنیاد ہے اس کی
اسی دنیا میں ہے اک اور بھی دنیا ۔ ترا لالا
ہمیں شاہین اپنے دوستوں کے دکھ میسر ہیں
بدل ہوگا بھلا کیا ایسی دولت کا ۔ ترا لالا

نوٹ: tralala (ترالالا) ایک فرانسیسی لفظ ہے جسے میں نے ایک نعرہ مستانہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ "تاناہو" کی ردیف بھی موزوں ہو سکتی ہے۔ ترالالا "چھنا چھن چھن" کی قسم کا لفظ ہے جس کی آواز سے اس کے مفہوم کا تعین ہو جاتا ہے۔ (ش)

● P.O. Box No. 2276, Station D.
Ottawa, ONT. KIP 5W4 Canada

خالد سہیل

مسافر بولتے ہیں راستہ خاموش رہتا ہے
دعائیں مانگتے ہیں سب خدا خاموش رہتا ہے

وہ دریا بن کے بہتا تھا تو کتنا شور کرتا تھا
سمندر میں وہ جب سے آملا خاموش رہتا ہے

مورّخ اپنا نوحہ اسکے ہونٹوں پہ سجاتے ہیں
مگر تاریخ کا ہر سانحہ خاموش رہتا ہے

بہت کم ظرف ہوگا عشق کے جو بھید کھولے گا
کہ سولی پر بھی چڑھ کر باوفا خاموش رہتا ہے

ہیں کتنے قافلوں کے راز اس کے دل میں پوشیدہ
مگر خالد کہ مثل نقش پا خاموش رہتا ہے

● Penthouse No.6, 100 White Oax
Crt, Whit Eby, Ont LIP 187 Canada

نسیم سحر

بہت پرکھی ہر اک پوشاک ہم نے
چنا تب جامۂ صد چاک ہم نے

زمیں کی کتنی چھانی خاک ہم نے
نہیں دیکھے کہیں افلاک ہم نے

گلابوں کی طلب رکھی ہمیشہ
لگا کر صحن میں کیوں آگ ہم نے

لٹایا زندگی بھر ہم نے سونا
مگر پائی صلے میں خاک ہم نے

گہر خیرات کر ڈالے ہیں سارے
سمیٹا ہے خس و خاشاک ہم نے

وہاں اب پھول کھلتے ہیں جہاں پر
بکھیری تھی بدن کی خاک ہم نے

نسیم اب اس کی کیا تعبیر مانگیں
جو دیکھا خواب دہشت ناک ہم نے

● Post Box 5925,
Jeddah - 21432 (K.S.A.)

اشفاق حسین

دیپ جلتے تھے فروغِ شبِ ظلمت کے لئے
کم نہ تھی، بات، یہ اس شہر سے ہجرت کے لئے

پوچھ سکتا ہی نہ تھا کوئی وہاں پر یہ سوال
پیڑ کیوں کٹ گئے، پھولوں کی حفاظت کے لئے

اے گزرگاہ غریب الوطنی تو ہی بتا
کون سے پھول چنوں تیری عقیدت کے لئے

وہ ہوا کون سے رخ پہ تھی کہ جس کے آگے
ہر زباں گنگ تھی اظہار صداقت کے لئے

چھتیاں سوکھ کے کانٹا ہوئیں ہریالی میں
موسم شہر کے پتوں کی جراحت کے لئے

آنکھ کے ریشمی تاروں سے نہ بنتا کوئی خواب
ورنہ ترسو گے شب و روز بصیرت کے لئے

● 440 - Weldrick Road (E)
Richmond Hill ON L4B 2M3
Toronto (Canada)

شفیق سلیمی

بے نام دیاروں سے ہم لوگ بھی ہو آئے
کچھ درد تھے چن لائے، کچھ اشک تھے رو آئے

کچھ پاس نہ تھا اپنے، بس پیاس لئے گھومے
اک عمر کی پونجی تھی، سو اس کو بھی کھو آئے

توہینِ انا بھی کی، تسکین ریا بھی کی
یہ بوجھ بھی ڈھوتا تھا، یہ بوجھ بھی ڈھو آئے

اک کارِ نمو برسوں کرتے رہے بن سوچے
ہم بیج محبت کے صحراؤں میں بو آئے

پہچان کا ہر منظر، انجان ہوا آخر
لگتا ہے کئی صدیاں اک غار میں سو آئے

● P.O. Box 10808, Bani Yas
Abu Dhabi (U.A.E.)

بخشش لائلپوری

ایک نظم

تمہاری آنکھیں کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگی ہیں
تمہارے کان کچھ زیادہ ہی سننے لگے ہیں
تمہاری زباں کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہے
تمہارا ذہن کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا ہے
تمہارے پاؤں کچھ زیادہ ہی تیز چلنے لگے ہیں
تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں
تم ایک مشکوک انساں ہو
اگر مجھے زندہ رہنا ہے
تو پھر تمہارے زندہ رہنے کا
کوئی جواز نہیں۔

● 337, Staines Road, Hounslow
Iiddlesex TW4 5AP London (UK)



افتخار نسیم

بغیر اجازت اندر آنا منع ہے

شاعر اور خدا
کبھی نہیں سوتے
میں اگر خواب میں
آئن سٹائن کے ساتھ سو جاتا تھا
یا
دلیپ کی بجائے پران کے ساتھ

....

تو کیا ہے
مدھوبالا اور نرگس مجھے "بہنیں" لگتی تھیں
تو شرمندگی کیسی
دیواروں میں آنکھیں نہیں ہیں
پانی کے ٹب میں بھنور نہیں ہوتے
لیکن تم اس میں ڈوب کر مر سکتے ہو
کافی کی گرم سانسیں
میری عینک کی دھند بن جاتی ہیں
میں نے اپنے خوابوں پر
شرمندہ ہونا چھوڑ دیا ہے

● 6033 North Sheridan Rd.
Suite - 40J, Chicago, IL 60660 (USA)

حیدر قریشی

ماہیے

سب دکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے
O
نہیں ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے
O
سب ہو گئے سودائی
عشق کی پا نہ سکے
وسعت اور گہرائی
O
ان دیکھے جہانوں تک
دل نے پہنچنا ہے
چاہت کے خزانوں تک
O
مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہو دیوی کی
O
جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے
وہیں ڈال دیئے ڈیرے

● Aue Der Roos 7
65795 Hatters Heim I,
Germany



احمد سہیل

پتھر کا دل

جبت کو بددعا مت دو
جشن جدائی دل ناصبور کی تجدید ہے
بچھڑ جانا حادثہ ہے
شب دلبری تمہیں کھو دینے کا سوگ ہے
جہاں تقدیر کی تصویر مٹا دی جاتی ہے
محبت کا انکشاف کہانی بن کر
ہمیں برباد کر دیتا ہے
بے بسی ہمیں جدا کر دیتی ہے
محبت دلوں کے عقوبت خانے میں محفوظ رہتی ہے
جب کوئی محبت میں سسکا سسکا کر مار دیا جاتا ہے
جدائی کا صدمہ وہی جانتا ہے
جس کے خوابوں سے گلاب چھین لیا جاتا ہے
خدا تمہیں میری یاد میں نہ ترسائے
تم میری سوچوں میں آباد رہو
سانحے آتے ہیں اور ہمیں اجاڑ کر چلے جاتے ہیں
جدائی کی نہ ختم ہونے والی زندگی اور یہ دیوانہ دل
محبت نہ ختم ہونے والا سفر ہے
ازل سے ابد تک۔۔۔ خوابوں سے حقیقت تک
دل سے روح تک۔۔۔۔
دل سمجھوتہ نہیں کرتا
جیسے ہمارا صدیوں کا مرا ہوا لمحوں کا پیار
تنہائیوں میں راستے کہیں کھو جاتے ہیں
خوابوں کی سنسان گلیوں میں
ہاتھوں میں لیے پھرتا ہوں
آگ میں بجھا پتھر کا دل

● 321 - Old Elkhart Rd. 37
Palestine Texas 75801 (USA)

مقصود الٰہی شیخ
24 - Park Hill Drive, Bradford (West Yorkshire)
BD8 ODF (U.K.)

ذرا سی دھوپ دو

رات خواب دیکھا۔ تم کو دیکھا۔ جاگنے پر دیر تک لیٹا رہا۔ کھڑکی سے باہر آسمان کو تکتا رہا۔ خواب کے اثر میں جکڑا ہوا تھا۔ ماضی کی، حال کی یادیں گڈمڈ تھیں۔ بتا نہیں سکتا زیادہ زور پرانی یادوں کا تھا یا کم پرانی یادوں کا! میرے لئے کچھ پرانا نہیں عمر بیت گئی پھر بھی ذرا ذرا یاد ہے۔

ساری زندگی تمہیں کو چاہا۔ تمہیں چھوا تک نہیں۔ یہ میرا رڈیہ ہے۔ روح اور معرفت کی باتوں سے ناواقف ہوں۔ محبت کو چھاتا پھٹکا نہیں۔ میری محبت تم ہو۔ تمہارا سراپا۔ تمہارا جسم۔ تمہارا بدن۔ یہ سب کچھ میری محبتوں کا اتصال ہے۔

تمہارے جسم اور روح کو میں دو نہیں کر سکا۔ بانٹ نہیں سکا۔ اس خواہش پر قابو نہیں پا سکا کہ تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں تمہارے بدن کو، آنکھوں کو، بالوں کو، جیتے متحرک ہونٹوں کو چومنے کی شدید تمنا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تمہاری رنگت کو محسوس کرنے کی ضرورت تک محسوس کی ہے مگر کبھی احساس گناہ نہیں ہوا۔ اپنے خیالوں پر، تمہارے سراپا پر میرا حق ہے کہ میں نے تمہیں اپنے سے کبھی الگ نہیں سمجھا۔

یہ میں ہوں، جب تک ہوں، ہوں۔ مجھ میں سے کیا نفی ہو کہ میں، میں نہ رہوں گا۔ اس میں پڑنے کی مجھے کبھی فرصت نہیں ملی۔ اسی طرح تمہارے ہونے کی راحت مجھے سرشاری دیتی ہے۔ تمہارا وجود کن اجزاء کی یکجائی کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔ ان عناصر کی ترکیب کیا ہے؟ اس کی چھان بین میری پرابلم نہیں۔ میری اتنی ہی پرابلم ہے کہ تم "میں" ہو یا نہیں؟ تم میری رگ رگ میں ہو۔

مگر،

اب میں جاننا چاہتا ہوں تمہاری پرابلم میں ہوں یا نہیں؟ ایک حق ہے وہ تسلیم کر لو اور اگر تمہیں منظور نہیں۔ ناپسند ہے تو صاف کہہ دو۔ میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔ تمہیں چاہتا رہوں گا۔ یک طرفہ چاہت کے لئے تو فاصلے میں اور زیادہ سہانا پن ہوگا۔ پاس رہ کر اکیلا پن مجھے مسلسل رہتا ہے۔ پانے کی خواہش نہ پانے کی اذیت سے سوا ہو جاتی ہے جیسے تم غیر ہو۔ جسے ساری عمر چاہتا رہا ہوں اسے غیر کیسے سمجھوں؟

ہمارے بیچ کبھی غیریت نہیں آئی۔

اب وہاں دو موریہ پل نہیں رہا۔ وہ پہلی ملاقات آج بھی اس لئے امر ہے کہ اس ملاقات کا پل کے مٹنے یا رہنے سے تو کوئی سمبندھ نہیں تھا۔

یہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تھا کہ میں ایک ناتواں اپنے ایسے انسان پر لدا رہوں۔ میں رکشا سے اتر کر ساتھ ساتھ چل رہا تھا تم نے اپنی گاڑی روک کر مجھے لفٹ کی پیش کش کی تھی۔ ہم دونوں اجنبی تھے۔ وہ رکشا والا بھی ہماری طرح کا انسان تھا۔ یوں ہم تینوں اجنبی تھے مگر اس لمحے کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے بندھ گئے تھے۔ تمہیں میرا جذبۂ رحم اچھا لگا تھا مگر مجھے اور اس تیسرے انسان کو جس کی محنت نے اسے ایک اعزاز بخشا تھا، متذبذب کر دیا تھا۔

تم نے کہا،

اسے مزدوری دے کر چھوڑ دیجئے۔ منزل تک میں پہنچا دوں گی!

میری منزل ابھی نہیں آئی۔ یہ تم نے مجھے کہاں پہنچا دیا؟

یہ تم ہو،

یہ میں ہوں،

حقیقت یہ ہے کہ نہ تم میں ہو اور نہ میں تم ہوں۔ ہمارے بیچ سماج کا پہاڑ ہے۔ یہ کیا ہے کہ یہ سب جانتے ہوئے میں چاہتا ہوں وہی دو موریہ پل، کم از کم تمہاری اور میری ایک سوچ بنا ہوا اپنا وجود برقرار رکھے۔ ہماری پہلی ملاقات ہو۔ بار بار ہو وہی تذبذب ہو۔ وہی غیریت ہو پھر بھی ہم ساتھ ہوں۔ چلتے رہیں، چلتے رہیں اور منزل آجائے! وہ اس اپنے پن سے بہتر ہوگا کہ غیریت کب کی مٹ گئی مگر مدتوں بعد بھی ہم ایک نہیں۔ بیچ کی دیواریں اور اونچی اٹھ گئی ہیں۔

**



فرحت زاهد

پری زاد

پھول مت توڑنا
خوشبوؤں میں بدن کو بسانا نہیں
سائے ڈھلنے لگیں
ٹمٹیوں اور منڈیروں سے جب
پاس پیڑوں کے جانا نہیں
لڑکیو! تم بڑی ہو گئیں۔
پھر وہی ہو گیا
جس کا ڈر ماں کو تھا
کچی نیندوں میں آکر ستانے لگا
میرے خوابوں سے مجھ کو جگانے لگا
کوئی جن بھوت تھا یا پری زاد تھا
وہ جو ہر اک قدم پر میرے ساتھ تھا
اس کی پوروں کی جنبش تلک
پشت پر میں نے محسوس کی
اس کے قدموں کی آہٹ تلک مرے دل نے سنی
عاملوں نے کہا
اس پہ سایا ہوا
اک پری زاد کا
یہ سمندر کے اس پار گر جا بسے
یہ پری زاد پانی پہ اڑتے نہیں
اس طرف ان کی کوئی بھی منزل نہیں
کتنے موسم گئے
اپنے ہاتھوں پہ مہندی رچائے ہوئے
میں سمندر کے اس پار آباد ہوں
لیکن اک بات ہے
آج بھی جب کبھی
نرم رو چاندنی میں سنورتی ہوں میں
جب بھی پھولوں کے گجرے پہنتی ہوں میں
جب بھی خوشبو کے ہمراہ چلتی ہوں میں
ایسا لگتا ہے کوئی مرے ساتھ ہے
کون ہو؟! تم بھلا کون ہو؟!

● 1030 - Lakeside Place
Baldwin NY - 11510 (USA)

رشیدہ عیاں

اب جنوں کا کوئی ساماں نہیں ہوگا کیا
چاک دامانی کا امکاں نہیں ہوگا کیا

غم گساری نہ کریں مجھ سی کشیدہ سر کی
آپ کا مجھ پہ یہ احساں نہیں ہوگا کیا

درد و وحشت ہی قدم لیں مرے ساحل پہ تو پھر
ڈوب جانا مجھے آساں نہیں ہوگا کیا

نہ سہی فصل جنوں میں کوئی وحشت کی سبیل
ہاتھ میں جیب و گریباں نہیں ہوگا کیا

نصب جب ہوگی ہر اک موڑ پہ دہشت کی صلیب
گھر تو گھر شہر بھی سنساں نہیں ہوگا کیا

ماں کی آغوش گر مصحفِ سر رکھ دوں گی
اس کا دامن مرا جزداں نہیں ہوگا کیا

ڈوب جاؤں میں اگر اس میں بصد شوق عیاںؔ
بحرِ الفت پہ یہ احساں نہیں ہوگا کیا

● 88 - Glenridge Ave, Glen Ridge
NJ. 07028 (USA)

شاهده نسیم سالک

قید حیات

ایک ایک پل ہم قید ہوئے
جسم سے لے کر روح تلک
ذہن سے لے کر وادیٔ دل تک
زخم بیٹے مفلوج ہوئے
زیست کے گہرے ساگر میں
الم کے موجیں ڈبو رہی ہیں
جسم ہے مقتل روح ہے مقتل
شعلوں میں ہم جھلس رہے ہیں
لیکن ان شعلوں کے اندر
ہر جانب سے اپنی صدائیں
واپس ہم تک پہنچ رہی ہیں

● 8904 Saxton Drive Westchester
OHIO 45064 (USA)

اسلم عمادی

ایسا تو نہیں ہنر ہمارا
آساں جو کرے سفر ہمارا

سیلاب ستم گری کی زد میں
ہے کتنے دنوں سے گھر ہمارا

چہرہ تو غبار شہر میں اب
آتا ہی نہیں نظر ہمارا !

آنکھوں کی طرح ہے انتظاری
ہوتا نہیں بند در ہمارا ۔ !

سایوں میں ہے روشنی سی ہم کو
خوابوں پہ گذر بسر ہمارا

تردامنی اور سراب کے بیچ
دامن ہے جنوں سے تر ہمارا

اسلم ہمیں داستاں سے کیا کام ؟
ہر قصہ ہے مختصر ہمارا ۔ ؟

● P.O. Box 9758,
Ahmadi 61008 Kuwait (A.G.)



ارمان نجمی

سفر کا دشت ہے اور انتشار کی منزل
نہیں ہے کوئی بھی منزل غبار کی منزل

پڑاؤ ڈالو گے صحرا میں کس ٹھکانے پر
کہیں تو ہو شجر سایہ دار کی منزل

نہ جانے کیسی خرابی ہے اپنے ہونے میں
کہیں بھی ملتی نہیں اعتبار کی منزل

جڑوں پہ آب و نمو کے ہیں راستے مسدود
شجر کے آگے ہے بے برگ و بار کی منزل

یہ شہر وہ جہاں دیوار و در نہ کام آئیں
ہر ایک گھر ہے ہوا کے فشار کی منزل

اب ایک ہجر کا لمبا سفر ہے اور میں ہوں
گزر چکی ہے ہر اک انتظار کی منزل

عذاب مرگ مسلسل سے دن نہیں کٹتے
بہت ہی سخت ہے خود سے فرار کی منزل

● AL - Darab General Hospital,
AL - Darab, Gizan (K.S.A.)



یعقوب تصور

اسے تحصیل منزل کا ہنر کیسے کہا جائے
نہ جس میں راستہ طے ہو سفر کیسے کہا جائے

جسے خود ہی نہ ہو معلوم کس جانب رواں ہے وہ
اسے پھر کارواں کا راہبر کیسے کہا جائے

جو اپنی گفتگو میں حسن استدلال رکھتا ہو
اک ایسے شخص کو آشفتہ سر کیسے کہا جائے

جہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو دل میں
تو ایسی رہ گزر کو راہگزر کیسے کہا جائے

مسلسل تالیاں تو بج رہی ہیں بزم میں لیکن
خطاب اس کا بہت ہے پر اثر کیسے کہا جائے

ذرا سی بات پر ہو ایک ہنگامہ ہر اک لمحہ
اسے معیار وصف درگزر کیسے کہا جائے

اگر حق صداقت کی تصور ہو نہ عکاسی
تو وجدان سخن کو معتبر کیسے کہا جائے

● P.O. Box No. 4628,
Abu Dhabi (U.A.E.)

عشرت آفرین

تخلیق کا نیا گیت

پس صحیفوں میں
پیغمبروں نے لکھا
خداوند نے
کائنات کبیرہ کی تخلیق کے ساتویں روز
آرام فرمایا تھا
صرف چھ روز میں
کائنات کبیرہ کی تخلیق کا یہ عمل؟
پھر خدا سو گیا!
اور سوتا رہا!!
اور اب
جب سے تخلیق کا بار اٹھایا ہے میں نے
پتہ یہ چلا
کہ مجھ میں وہی کائناتِ کبیرہ
ہولے ہولے جواں ہو رہی ہے
قطرہ قطرہ مجھے پی رہی ہے
خداوند کی کائنات کبیرہ
مرے بطن میں جی رہی ہے
جس کی تکمیل کے واسطے
مجھ کو نو روز درکار ہیں
اور پھر
اس کے آگے کا سارا سفر
بے کراں دردِ تخلیق کا سلسلہ
اور بے خواب آنکھوں میں
معصوم مخلوق کے
بود و نابود کا زائچہ
وقت کے وصل اور ہجر کا ذائقہ
میرے حصے میں ہے
میرے حصے کا تھا

15310, Camino Delsol
Huston TX 77081 (USA)

نسیم سید

(۱)

ہجرت

ہریالی کی کھوج میں
تنہائی کے شہر بسائے
تن پر سبزہ لے کے
اندر پت جھڑ بڑھتی جائے
جب جب تیرا
سبز سجیلا ہرا ابھرا تن دیکھوں
"میپل" مجھ کو اپنا زرد سا نیم
بہت یاد آئے

(۲)

نمو

یہ جھجک جو میری نمو میں ہے
جو قد آوری سے عناد ہے
میری تربیت کا قصور ہے
میری پرورش کا فساد ہے
ابھی اگ رہی ہوں لحد سے میں
میری جڑ میں خوف کی کھاد ہے

115 - Hillcrest Ave, 2214 Apts
Mississauga, Ont L56, 3Y9 (Canada)

پنہاں

گیت

لھاس بھرے اجلے آنگن میں
جیسے بھور سمے
ہار سنگھار کے ننھے ننھے پھولوں کی ہو
ہلکی ہلکی بوندا باندی
ایسے کسی کی یاد آئے
جیسے ہلکورے لیتی لہروں کی سیڑھی سے
دھیرے دھیرے ہولے ہولے
جھیل میں اترے چاند کنول
ایسے کسی کی یاد آئے
جیسے تپتی دوپہری میں
کوئی پاگل پون جھکورا
کالی بدریا گھیر کے لائے
ایسے کسی کی یاد آئے
جیسے روتے روتے تھک کے
سو جانے والا بے چارہ بھوکا بچہ
نیند میں دھیرے سے مسکائے
ایسے کسی کی یاد آئے

1752, Alpine Dr. Carrollton
TX 75007 (USA)

ش۔ صغیر ادیب
65 Black Burn Street, Black Burn,
BB1, 7NG Lancs (U.K.)



وہ جو تعاقب میں ہے

وہ زور زور سے کئی سانسیں لیتا ہے۔

پھر گردن گھما کر ارد گرد میں نظر ڈالتا ہے۔ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے اور گو وہ نظر نہیں آتا، مگر اسے معلوم ہے کہ وہ موجود ہے۔ کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔ کسی کونے میں چھپا ہوا ہے اور مسلسل اسے گھور رہا ہے وہ اس کی آنکھوں کو اپنے بدن میں چبھتا ہوا محسوس کرتا ہے تب وہ یکایک بیحد ہراساں ہو جاتا ہے۔ اب کیا کرے، کہاں جائے، کیوں کر اس سے جو اس کے تعاقب میں ہے، پیچھا چھڑائے۔ تاہم اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ جو اس کے تعاقب میں ہے، بہت دیر سے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اسے یاد نہیں کہ وہ کب سے اس کے تعاقب میں ہے۔ کیونکہ جہاں تک وہ وقت کو شمار کر سکتا تھا، تب سے وہ اس کے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ گو وہ نظر نہیں آتا تھا، پھر بھی موجود تھا۔ کہیں نہ کہیں، کبھی کبھی تو اسے یہ محسوس ہوتا، جیسے وہ اس کے بالکل قریب موجود ہے۔ شانے سے شانہ ملائے کھڑا ہے اور اسے گھور رہا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں کو برچھی کی طرح اپنے وجود میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس کرتا۔ تب وہ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھتا اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

مگر وہ تھا ضرور، اور مسلسل اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ کیوں کہ نہ صرف وہ اس کی موجودگی کو محسوس کرتا تھا، بلکہ کبھی کبھی وہ اس کی آواز بھی سنتا تھا۔ ایک کھردری، نوکیلی، آہنی سرگوشی، جو اس کے کانوں میں اس طرح گونجتی جیسے تیزاب کی بوند زمین پر گر کر جھرجھراتی ہے۔۔۔ 'تم کہاں جاؤ گے، کیسے مجھ سے بچو گے۔ دیکھو' ذرا اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھو، کچھ نظر آیا، نہیں نظر آیا، ذرا پھر سے دیکھو۔۔۔' وہ سہم جاتا اور وحشت بھری نظروں سے اپنے دونوں ہاتھوں کو گھورتا، سرگوشی پھر گونجتی۔۔۔ 'ہاں، یہ ہاتھ غلیظ ہیں، ان پر دھبے ہیں، سیاہ دھبے، ذرا اپنے ہاتھوں کو سونگھو، ان سے بو آ رہی ہے۔ بیحد مکروہ اور غلیظ بو۔۔۔ ہے نا، سرگوشی تیز ہو جاتی۔

وہ سٹپٹا کر اپنے ہاتھوں کو سونگھنے لگتا۔ پھر وحشت زدہ ہو کر ہونٹوں پر زبان پھیرتا، آواز آتی۔۔۔ 'ہے نا، بو آ رہی ہے نا۔ جانتے ہو یہ بو کیسی ہے؟"

وہ ہاتھ اٹھا کر کنپٹی پر انگلی پھیرتا۔

"یہ بو خون کی ہے۔" سرگوشی زہر بن کر اس کے کانوں میں ٹپکتی۔

اس کا سارا وجود خوف سے لرزتا۔ پھر وہ دہشت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتا۔ 'کون ہے 'کون ہے یہ کم بخت، کمینہ، ذلیل، جس کی منحوس آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس کی آواز باہر سنائی نہیں دیتی، صرف کانوں میں محسوس ہوتی ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا، مگر بے سود، وہ جو کوئی بھی تھا، نظر نہیں آتا تھا، مگر تھا، اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اور نادیدہ سائے کی مانند اس کے وجود سے چپکا ہوا تھا۔ تب وہ ڈر جاتا۔ خوف اس کے جسم کے ریشے ریشے میں کیچوؤں کی طرح رینگنے لگتا اور رگوں کے اندر دوڑنے والی خون کی ندیاں دھیرے دھیرے جمنے لگتیں۔ ایک وحشت، ایک جنون اسے اپنی گرفت میں لے لیتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اسے جو کوئی بھی ہے، کسی طرح پکڑ لے اور اس کی گردن مروڑ ڈالے۔ وہ دیوانوں کی طرح ہوا میں ادھر ادھر ہاتھ چلاتا تاکہ اس نادیدہ وجود کو پکڑ سکے، تاہم اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ پھر وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

وہ ایک بار پھر زور سے سانس لیتا ہے اور ادھر ادھر گردن گھماتا ہے۔ پھر اپنے وجود کو دیکھتا ہے۔ اس کا پورا وجود، سر سے پاؤں تک، بیحد خراب و خستہ اور شکستہ ہو چکا ہے۔ بدنما، بدہیت اور بدصورت۔ ہاتھوں اور پیروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ جن سے بدبودار پانی رستا ہے۔ پورے بدن پر نیلی نیلی رگیں ابھر آئی ہیں جیسے بدنما کیچوے اس کے بدن سے چپکے ہوں۔ اس کے لمبے، استخوانی ہاتھ بیحد بدشکل ہو گئے ہیں اور ان سے بو آتی ہے۔ ایسی مکروہ بو کہ وہ اپنے ہاتھوں کو سونگھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ مگر وہ بو کیسی ہے اور کیوں آتی ہے۔ کیا واقعی وہ خون کی بو ہے؟ وہ زخمی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو گھورتا ہے۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں گندی ضرور ہیں اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی جیسے پتھر میں بال پڑ جاتا ہے۔ مگر ان

پر خون نہیں ہے۔ کم از کم اسے نظر نہیں آتا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر ہتھیلیوں کو سونگھتا ہے پھر جھٹکے سے سر پیچھے کر لیتا ہے۔ ایک بو، بیحد غلیظ اور مکروہ بو اس کے نتھنوں میں گھستی چلی جاتی ہے۔ وہ وحشت زدہ ہو کر ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔

"یہ بو خون کی ہے۔ ہے نا۔"

"نہیں، نہیں"۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے۔

سرگوشی پھر گونجتی ہے۔ "تم جانتے ہو، یہ بو خون کی ہے۔ وہ سارا خون۔ تمھیں یاد ہے نا۔" پھر سرگوشی ایک تیز سرسراتی ہوئی پھنکار میں بدل جاتی ہے۔ پھر ہلکی ہلکی کھنکتی ہوئی چیخوں میں جیسے تانبے کے برتن بج رہے ہوں۔ پھر وہ چیختی ہوئی آوازیں، رفتہ رفتہ تیز ہو جاتی ہیں۔ تیز اور تیز، تب وہ اور بھی ڈر جاتا ہے اور یکلخت بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور پوری قوت سے، جسم و جان کی پوری قوت سے بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سرگوشی پہلے چیخوں میں بدلتی ہے۔ پھر چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ کھنکتی ہوئی، اعصاب کو کاٹتی ہوئی، رگ رگ میں زہر بن کر ٹپکتی ہوئی، بھیانک آسیبی چیخیں جیسے بے شمار پاگل روحیں چلا رہی ہوں۔ وہ ان آوازوں سے بچنے کے لئے بھاگتا ہے۔ اندھا دھند بھاگتا ہے۔ مگر وہ آوازیں اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ آخر وہ کیسی ہیں؟ اور وہ سرگوشی کیسی ہے؟ اور کس کی ہے؟ کون ہے وہ کم بخت، ذلیل، کمینہ جو ہر دم اس کا تعاقب کرتا ہے اور نادیدہ سائے کی طرح ہر پل اس کے آس پاس موجود رہتا ہے۔

وہ ایک وحشی جانور کی طرح مسلسل بھاگتا رہتا ہے۔

اس کے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ گہرا آسیبی اندھیرا، اتنا دبیز کہ وہ اسے چھو کر محسوس کر سکتا ہے، اور خاموشی اور لرزہ خیز سناٹا۔ اور اس تاریکی، سکوت اور سناٹے میں ہر شے دھیرے دھیرے معدوم ہو جاتی ہے۔ بس ایک خلاء باقی رہتا ہے۔ ایک عظیم ترین اور لا انتہا خلاء۔ جس کی کوئی ابتدا نہیں ہے، جس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ محض ایک ویرانہ ہے۔ ایک بے پناہ اور بے کنار ویرانہ، اور وہ اس ویرانے میں بھاگ رہا ہے۔ جسم و جان کی پوری قوت سے بھاگ رہا ہے تاکہ اس سے، اس منحوس، کمینے، ذلیل سے پیچھا چھڑا سکے، جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہے اور ہر دم اس کے قریب، رگ جاں سے بھی قریب موجود محسوس ہوتا ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اسے اس کی موجودگی محسوس نہیں ہوتی، اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ اسے پیچھے کہیں چھوڑ آیا ہے۔ بہت فاصلے پر، وقت کے پچھلے موڑ پر، تو وہ رک رک کر سانس لیتا ہے۔ مگر پھر یک لخت اس کا سکون بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے کیونکہ یکایک وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تو اس کے قریب موجود ہے۔ بالکل قریب، اتنا کہ اگر وہ اسے دیکھ سکے تو ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا ہے۔ تب وہ سہم کر اور بالکل چور چور ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سنتا ہے، اس منحوس، ذلیل، زہریلی سرگوشی کو جو ہر چند کہ سنائی نہیں دیتی، پھر بھی سنائی دیتی ہے۔

"تو تم بھاگ رہے تھے۔ مجھ سے بچنے کے لئے بھاگ رہے تھے، ہے نا۔ مگر جاؤ گے کہاں؟۔ اس کائنات میں تو کہیں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں تم چھپ سکو، مجھ سے بچ سکو۔ تم جہاں بھی جاؤ گے، مجھے موجود پاؤ گے۔" سرگوشی دھیرے دھیرے معدوم ہوتی ہے، پھر ابھرتی ہے۔ پھر ایک تیز، زہریلی چیخ میں بدل جاتی ہے۔ وہ دانت پر دانت جما کر زور سے جبڑے بند کر لیتا ہے اور زور زور سے ہانپتا ہے۔ اس کا سینہ یوں پھولتا اور پچکتا ہے جیسے اس کے بدن کے اندرونی کھنڈروں میں شدید طوفان برپا ہو، تیز جھکڑ چل رہے ہوں اور ہر شے ان جھکڑوں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتی جا رہی ہو۔ تب وہ اور بھی ڈر جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ہولناک طوفان میں اس کا اپنا وجود خس و خاشاک کی طرح اڑ جائے، بکھر جائے، تحلیل ہو جائے۔ وہ اپنے بدن کو ٹٹولتا ہے۔ اوپر، نیچے، دائیں، بائیں۔ ہاں سلامت ہے، ابھی سلامت ہے، میرے جسم کا کھنڈر ابھی ٹوٹا نہیں۔ مگر کتنی دیر، اگر یہ طوفان نہ رکا تو۔۔۔۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے اور سہمی ہوئی نظروں سے ارد گرد میں دیکھتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ وہ جو اس کے پیچھے لگا ہے۔ کون ہے؟ کب سے لگا ہے اور کیوں؟

کب سے وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ اسے کچھ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے، شاید صدیوں سے، شاید مدتوں سے، شاید اس وقت سے جب دنیا کے پہلے آدمی نے قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ یا پہلی آبرو داغ دار ہوئی تھی یا پہلی بار کسی مجبور کا حق مارا گیا تھا، تب سے وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ یا پھر شاید اس وقت سے جب پہلی بار حق کہنے والے پر پتھر اٹھایا گیا تھا اور اس کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے تھے اور سچ کی ہتھیلی میں سلاخیں گاڑی گئی تھیں اور یا پھر شاید اس وقت سے جب پہلی عبادت گاہ توڑی گئی تھی اور مقدس صحیفوں کی بے حرمتی کی گئی تھی اور خون بہایا گیا تھا۔ معصوم، مظلوم اور بے گناہ خون بہایا گیا تھا۔ تب سے وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر اپنی ہتھیلی اور انگلیوں کو سونگھتا ہے اور ایک تیز، گھناؤنی اور مکروہ بو اس کے نتھنوں میں گھستی چلی جاتی ہے۔ یہ بو۔۔۔ شاید اس خون کی ہے جو معصوم جسموں سے بہایا گیا تھا۔ وہ معصوم جسم جو بیدردی سے کاٹے گئے تھے یا زندہ جلائے گئے تھے۔ وہ معصوم جسم اور وہ عمارت اسے سب کچھ یاد ہے۔ رتی رتی یاد ہے۔ وہ چیخیں اور کراہیں، آہیں اور فریادیں، اور پھر وہ جوش اور جنون، ایک آندھی تھی۔ ایک بے پناہ اور ہلاکت خیز آندھی تھی جو ہر شے کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گئی تھی۔ ہاں ہر شے کو، مروت کو اور دوستی کو اور بھائی چارے کو، اچھے اور سچے جذبوں کو اور صدیوں پرانی قدروں کو کہ جن پر گئے وقتوں میں نیک لوگوں نے آدمیت کی بنیاد رکھی تھی۔ آندھی سے

پہلے سب کچھ موجود تھا مگر آندھی کے بعد کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ صرف غلط کی طرح سب کچھ مٹ گیا تھا۔

شاید تبھی سے وہ اس کے تعاقب میں ہے۔

مگر وہ کیا کرتا۔ وہ تو تنکا تھا یا سوکھا ہوا پتا تھا، آندھی میں بہہ گیا تھا۔ جنون کے اندھیرے میں وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ ان سب سے کہا گیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ "سچ" ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے اور گو وہ سچ کی حرمت سے واقف تھا مگر وقتی طور پر وہ بینائی کھو چکا تھا۔ جب جھوٹ اور فریب اور ریاکاری کا اندھیرا اتنا دبیز ہو تو "بینائی" کام نہیں کرتی۔ چنانچہ وہ بھی نہیں دیکھ سکا اور اس ہجوم میں شامل ہو گیا جو اندھیرے کے کفن میں لپٹ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ سرکش، بپھرا ہوا۔ اسے یاد ہے، سب کچھ یاد ہے۔ وہ ہنگامہ، وہ پرشور نعرے اور گرد و غبار اور یہ بھی کہ وہ کتنا خوش تھا اور کس قدر جوش میں تھا۔ جیسے اس نے ان سب نے ساری دنیا فتح کر لی ہو اور پھر وہ لڑکی.....!

وہ یکایک رک کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ سناٹا، ویرانی اور آسیبی خاموشی۔ جیسے کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض ایک بے کنار ویرانی ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ ویرانی کہاں سے آئی؟ کیا اس کے اندر سے؟ ہاں شاید یہ اس کے وجود کے اندرونی کھنڈروں کی ویرانی ہے جو چاروں اور پھیل گئی ہے۔ مگر کیوں؟ وہ خوشی، وہ جنون، وہ جوش کہاں گیا؟ اس نے اور ان سب نے جو کچھ کیا تھا، وہ تو "سچ" تھا اور سچ کے سوا کچھ نہیں تھا تو پھر یہ ویرانی کیوں؟ چراغاں کیوں نہیں؟ عجیب بات ہے ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ "وہ" جنھوں نے فتح کی نوید سنائی تھی، اب کیوں نہیں بتاتے کہ یہ "شکست" کا عذاب انگیز پچھتاوا کہاں سے نازل ہوا ہے۔

وہ بے کسی سے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے اور گھوم کر دائیں بائیں اور پیچھے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ جو اس کے تعاقب میں ہے، موجود ہے۔ دائیں جانب یا شاید بائیں طرف یا شاید عقب میں۔ ہاں، وہ کم بخت موجود ہے اور اتنا قریب کہ وہ اس کی سانسوں کی .... زہریلی سانسوں کی آواز سنتا ہے۔

پھر ہلکی سی ہنسی، پھر سرگوشی۔ "تم رک کیوں گئے، بھاگو، بھاگتے رہو۔ مجھ سے بچنے کی کوشش کرتے رہو۔ پھر دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے۔"

وہ گھبرا کر قدم اٹھاتا ہے۔

ہاں تو وہ لڑکی۔ کتابوں میں لکھے لفظوں کی طرح معصوم اور پاکیزہ اور اس کا کتابوں ہی جیسا لفظ لفظ آراستہ بدن۔ اس لڑکی نے اپنے شبنم سے دھلے ہاتھوں سے کہ جن سے اس نے اب تک صرف کتابوں کے صفحات کھولے تھے، اپنے بدن کی اوہ کھلی کتاب کو چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی، پھر ایک مقدس کتاب اٹھا کر التجا کی تھی۔ "دیکھو، مجھے معاف کردو، تمھیں اس کتاب کا واسطہ۔ مجھ پر.... مجھ پر رحم کرو۔"

اس لڑکی کی ماں نے ہاتھ جوڑے تھے۔ "ایسا مت کرو۔ میری بچی بہت معصوم ہے۔ اس کی زندگی برباد مت کرو۔ تمھیں اوپر والے کا واسطہ---"

لڑکی کا باپ گڑگڑایا تھا۔ "تم خون بہانا چاہتے ہو۔ میرا خون بہادو۔ مگر اس معصوم کو---"

اس کے ساتھی نے جھپٹ کر لڑکی کے ہاتھ سے کتاب چھین لی تھی۔ کتاب کے ورق الٹے تھے۔ استہزائی انداز میں ہنسا تھا۔ پھر کتاب فضا میں اچھال کر بولا تھا۔ "یار کمال ہے یہ تو کتاب پڑھتی ہے۔"

"ہاں" اس نے جاہلانہ نظروں سے لڑکی کو گھورا تھا۔

اس کے ساتھی نے کہا تھا۔ "کتاب پڑھنے کا شوق مجھے بھی بہت ہے۔ مگر صرف بدن کی۔"

"تو پھر پہلے تو اسے پڑھ۔ میں سنوں گا، بعد میں میں پڑھوں گا۔"

مگر ان دونوں نے کتاب پڑھی نہیں تھی بلکہ پھاڑ ڈالی تھی۔ ورق پرزے پرزے کر ڈالے تھے۔ پھر جب کتاب کے پھٹے ہوئے اوراق چاروں طرف بکھر گئے تھے تو وہ دونوں باہر نکلے تھے۔ ہر طرف سکوت تھا اور ویرانی۔ ایسی ویرانی جیسے ساری کائنات ایک عظیم مرگھٹ میں بدل گئی ہو۔ جہاں کچھ دیر پہلے ہنگامہ تھا اور جوش اور جنون تھا اور شور، ایسا شور کہ دھرتی کے سارے طبق تھرانے لگے تھے اور جہاں "ہونے" کے آثار تھے، وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ "وجود" بے وجود ہو چکا تھا۔ صرف "فنا" کا احساس باقی تھا اور صرف کھنڈر باقی تھے۔ اس نے کھنڈر پر ایک نظر ڈالی تھی اور تبھی یکایک اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔ اس کا دھیان اپنے ساتھی کی طرف گیا۔ چنانچہ اس نے گردن موڑی اور پھر یکلخت حیرت زدہ رہ گیا۔ وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ اس کا ساتھی تو جا چکا تھا اور آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ضرور تھا اور اس کے قریب موجود تھا۔ وہ اس کی موجودگی صاف محسوس کر سکتا تھا۔ پھر یکایک اس کے کانوں میں ایک تیز سرگوشی گونجی تھی۔

"تمہارے ہاتھوں پر خون لگا ہے--"

اس نے گھبرا کر ہاتھ اٹھائے اور انہیں غور سے دیکھا۔ مگر اس کے ہاتھ صاف تھے۔ ان پر خون نہیں تھا۔ پھر اس نے وحشت بھری نظروں سے ارد گرد میں دیکھا تھا اور زور سے سانس لے کر بولا تھا۔

"میرے ہاتھ صاف ہیں۔"

"نہیں، ان پر خون لگا ہے۔ ان سے بو آرہی ہے۔ سونگھو انہیں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ اٹھائے۔ انہیں سونگھا، پھر ایک دم وحشت زدہ ہو گیا۔ "کون ہو تم۔؟"

وہ جو کوئی بھی تھا، ہنسا۔ اس کی ہنسی کی تیز، نوکیلی، دھار دار آواز، جو سنائی نہیں دیتی تھی، پر سنائی دیتی تھی، اس کے کانوں میں اترتی چلی گئی۔ "میں کون ہوں۔ میں پاکیزگی ہوں ان قدروں کی جنھیں تم نے بے آبرو کر ڈالا اور میں تقدس ہوں اس تہذیب کا جسے تم نے مٹا ڈالا اور میں عبادت گاہوں سے بلند ہونے والی الوہی آواز ہوں اور میں مقدس کتابوں میں لکھا ہوا محترم لفظ ہوں۔ میں آدمیت کا عرفان ہوں اور میں صرف آگہی ہوں۔ میں کل بھی موجود تھا۔ آج بھی موجود ہوں اور ہمیشہ موجود رہوں گا اور تمہارا تعاقب کرتا رہوں گا۔ تم آبادیوں میں رہو یا ویرانی میں جاؤ یا پاتال میں اتر جاؤ۔ میں ہر جگہ تمہارا پیچھا کروں گا اور تم چاہو بھی تو مجھ سے نہیں بچ سکو گے۔"

وہ ایک شدید لرزہ خیز سناٹے کے حصار میں گھرا، لب بستہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب پہلی بار اس نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ کوئی ہے، کوئی اس کے پاس کھڑا ہے۔ اور اس کے کان میں زور زور سے سانس لے رہا ہے۔ مگر اس کا ساتھی تو جا چکا تھا۔ پھر یہ کون ہے جو اس کے کان میں کہہ رہا ہے۔

"تمہارے ہاتھوں پر خون لگا ہے۔"

اور تب ایک دم وحشت زدہ ہو کر وہ یکلخت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اور تب ہی سے وہ بھاگ رہا ہے۔ دنوں سے، صدیوں سے، قرنوں سے۔ وہ اس سے بچنا چاہتا ہے۔ اس کے آسیبی وجود سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ پہلے وہ ادھر ادھر چھپتا پھرا۔ اس نے خود فریبی کے خول بنائے اور ان میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پر فریب لفظ تراشے اور ان کی آڑ لینے کی کوشش کی۔ پھر وہ ویرانوں کی طرف بھاگ گیا۔ اپنے سائے کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگا۔ مگر پھر بھی اس سے نہیں بچ سکا۔ وہ جو اس کے تعاقب میں ہے، ہر جگہ پہنچ گیا۔ اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرتا رہا۔

"تمہارے ہاتھوں پر خون لگا ہے۔"

بے حد تھک کر، بالکل چور چور ہو کر انجام کار وہ رک جاتا ہے اور اپنے ٹوٹتے پھوٹتے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے چاروں طرف خلاء ہے اور اندھیرا، اور نہ ہونے کا احساس، کچھ بھی نہ ہونے کا احساس۔ شاید وہ بھاگتے بھاگتے "وجود" سے "عدم" تک آ گیا ہے۔ وجود جو مظاہر اور اثبات سے عبارت ہے اور عدم جو نفی کی علامت ہے۔ وہ اثبات سے چل کر نفی کی دہلیز تک آ پہنچا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عدم سے آگے کیا ہے۔ اور یہ کہ اگر وہ وجود سے عدم تک آ پہنچا ہے تو اب اور آگے کہاں جائے گا۔ کیا عدم سے آگے بھی کچھ ہے۔ جہاں پہنچ کر وہ اس سے، جو اس کے تعاقب میں ہے، بچ سکے گا۔

وہ زور سے سانس لیتا ہے اور اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی سرگوشی کو سنتا ہے۔

پھر وہ چاروں طرف دیکھتا ہے اور یکایک حیران رہ جاتا ہے۔ ارے یہ کیا؟ یہ تو وہی جگہ ہے۔ ہاں وہی جگہ ہے جہاں بربادی سے پہلے آبادی تھی اور زندگی تھی اور الوہی آواز کی پرشکوہ گونج تھی اور مقدس صحیفوں میں لکھے سچے لفظوں کی طرح سب کچھ موجود تھا اور جہاں اس نے پہلی بار اس کے نادیدہ وجود کو محسوس کیا تھا، جو اس کے تعاقب میں ہے۔ مگر تعجب ہے، بڑا تعجب ہے۔ یہ ماجرا کیوں کر ہوا کہ وہ جس جگہ سے بھاگا تھا، وقت کے خلاء میں لمحہ لمحہ بھٹکنے کے بعد پھر وہیں واپس آ گیا تھا۔ وہ حیرت سے ارد گرد میں دیکھتا ہے اور ایک ایک شے کو پہچانتا ہے۔ پھر دفعتاً جھکتا ہے اور مٹھی بھر مٹی اٹھاتا ہے اور ہتھیلی پھیلا کر غور سے مٹی کو دیکھتا ہے۔ سنہری مٹی جس سے خوشبو آ رہی ہے۔ ایسی خوشبو جسے وہ ٹھیک ٹھیک سمجھ نہیں پاتا۔ مگر وہ خوشبو اس کے بدن میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ریشے ریشے کو مہکا دیتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ایک گہرے، مدہوش کر دینے والے نشے میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

"تم نے اس مٹی کو بھی بے آبرو کیا ہے۔"

وہی آواز، وہی زہریلی سرگوشی اور وہی تمسخر آمیز ہنسی۔ وہ سہم کر آنکھیں کھول دیتا ہے اور گھور گھور کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ دہشت سے اس کے جسم کی دیواریں چٹخنے لگتی ہیں۔ وہ گھبرا کر مٹی پھینک دیتا ہے اور سانپ کی طرح پھنکارتا ہے۔

"کون ہو تم؟" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگتا ہے۔ "تم ذلیل، کمینے، منحوس، کون ہو تم۔ سامنے کیوں نہیں آتے۔ اگر ایک بار سامنے آ جاؤ تو میں تمہاری گردن دبا دوں، تمہارا خون پی جاؤں۔"

وہ جو کوئی بھی ہے۔ اس کے بالکل قریب کھڑا ہے۔ بالمقابل، اور اس کی سرگوشی اس کے کانوں میں اتر کر اس کے وجود کے صحرا میں دور تک گونجتی چلی جاتی ہے۔ میں کون ہوں؟ تم جانتے ہو، میں کون ہوں۔ تم چاہو تو مجھے دیکھ بھی سکتے ہو۔ ہاں کوشش کرو، ذرا غور سے دیکھو، میں تمہارے قریب موجود ہوں۔ بالکل تمہارے سامنے۔ بس ذرا سی کوشش کرو تو تم مجھے دیکھ سکتے ہو۔"

وہ اپنی تمام حسیات سمیٹ کر آنکھوں میں لے آتا ہے اور بہت غور سے دیکھتا ہے اور تب یکایک حیرت سے، ایک شدید حیرت سے اس کا وجود ساکت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے جسم کا سارا خون جم جاتا ہے، تمام حسیات بے حس ہو جاتی ہیں اور آنکھیں یوں ٹھہر جاتی ہیں جیسے بے روح ہو گئی ہوں اور وہ بے جان ہو کر کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے اس ایک لمحہ میں اسے، جو پل پل اس کے ساتھ رہا ہے اور اس کا پیچھا کرتا رہا ہے، پہچان لیا ہے اور وہ کوئی اور نہیں، وہ خود وہی ہے اور اپنا ہی تعاقب کرتا رہا ہے۔



کاوش عباسی

تم نے ہمارا غم دھتکارا ہم بھی دور ہوئے
بہت تمہارے پیچھے بھاگے تھک کر چور ہوئے

سب یوں خود میں بند تھے کوئی آنکھ نہ انگلی اٹھی
قتل پڑا رہا سڑکوں پر قاتل مستور ہوئے

اسی جادو کی چھڑی نے ہی سب جادے لکھے تھے
تم کو دشت ملا، ہم زنجیری مقہور ہوئے

ہم کو ہماری آڑ میں رکھ کر رہزنوں نے لوٹا
ہم ہی لٹے، ہم ہی اپنے رہزن مشہور ہوئے

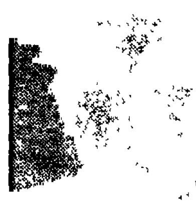
ہم نے سدا تم کو کھل مل جانے جیسا چاہا
تم ہم کج گفتاروں پر ناحق مغرور ہوئے

زخم ہمارے نوید بہار تمہارے وصال کی تھے
تم پت جھڑ میں بس رہے، یہ پک کر ناسور ہوئے

جگنو جو ظلمت میں نہ چمکا وہ بھی ظلمت تھا
آپ مٹے وہ، عدو سے جنگ سے جو معذور ہوئے

پیار بھی تھا دل خوار بھی تھا، تم پیار بھی ایسے تھے
تم سے تپتے تو شاد بھی تھے ہم کر رنجور ہوئے

● P.O. Box 8080
Riyadh - 11482 (K.S:A.)



ھمایوں ظفر زیدی

تجھے بھولے زمانے ہوگئے ہیں
یہ ہم کیسے تھے کیسے ہوگئے ہیں

جو اپنی ذات سے خود انجمن تھے
وہ سب کتنے اکیلے ہوگئے ہیں

بجھی جب شمع تو جانا یہ ہم نے
اندھیرے کتنے گہرے ہوگئے ہیں

اب اس انبوہ میں بتلائیں کیسے
کہ ہم کتنے اکیلے ہوگئے ہیں

وہ جن میں عکس تھے محفوظ اپنے
وہ سب آئینے دھندلے ہوگئے ہیں

درو دیوار سے شکوہ کریں کیا
یہاں انسان بہرے ہوگئے ہیں

ہم اپنی وضع پر قائم ہیں اب تک
وگرنہ لوگ کیسے ہوگئے ہیں

● P.O.Box No. 3845,
Ruwi 112, Muscat (Oman)



افضال نوید

چراغ سے کو طبیعت سے آب و تاب کیا
اگر وہ گل ہوا ہم نے اسے گلاب کیا

نشانِ پا نہ ملا گر رکھی غبار پہ آنکھ
حساب کھوگئے سارے اگر حساب کیا

ہوا کا سامنا کرنے سے جل بجھے الفاظ
ورق الٹ گئے یکسر اگر کتاب کیا

کہ اے گرفتہ نام و نمود کس کے لئے
اسی سے رکھا تماشا جسے حجاب کیا

ملا ہے جسم وہ ملغوبہ وجود و عدم
اسی اچنبھے پہ دن رات کوشتاب کیا

خرابی اور کہیں کی تھی اور نگاہِ سلوک
جہاں جہاں بھی گئی ہم نے اجتناب کیا

نوید کام نکالا طلسم زرد سے یاں
جو رنگ اڑ گیا چہرے کا سو سحاب کیا

● 40 - GordonRidge Place. 105,
Scarboro ONT. MIK 4H8 Canada

باقی احمد پوری

آنکھ میں گریۂ پیہم نہ پلٹ کر آئے
پھر یہ برسات کا موسم نہ پلٹ کر آئے

اور بھی دکھ کو بڑھاتی ہیں خزاں کی شامیں
زرد پتے تھے جو ہمدم نہ پلٹ کر آئے

ہم ترے ہجر سے مانوس ہیں لیکن جاناں
کل جو گزری وہ شبِ غم نہ پلٹ کر آئے

ہم نے یوں راہِ محبت میں اسے چھوڑ دیا
اس نے چاہا بھی مگر ہم نہ پلٹ کر آئے

یوں تو سو رنگ کی گزری ہیں بہاریں باقیؔ
دل پہ وہ پیار کے موسم نہ پلٹ کر آئے

● P.O.Box 23443 Safat - 13095
Kuwait - (A.G.)

رئیس وارثی

میرے پیکر سی کوئی مورت بنالی جائے گی
دل کے بہلانے کی صورت تو نکالی جائے گی

کون کہہ سکتا تھا یہ قوسِ قزح کو دیکھ کر
ایک ہی آنچل میں یہ رنگت سمالی جائے گی

کاغذی پھولوں سے جب مانوس ہوں گی تتلیاں
عاشقی کی رسم دنیا سے اٹھالی جائے گی

عشق تو پروان ہی چڑھتا رہے گا دوستو
حسن وہ دولت نہیں جو پھر کمالی جائے گی

خود پرستی کے نشے میں جن کو ہے زعمِ جمال
آئینہ دیکھیں تو ان کی خوش خیالی جائے گی

● 74 - 13, Woodside Ave,
Elmahurst, NY 11373 (USA)



فیصل ہاشمی

فردیات

تمہاری راہ سے ہٹنے کا کچھ ملال نہ تھا
جو مسئلہ تھا وہ یہ تھا کہ اب کہاں جائیں

پل کے نیچے سے گزرتی ہوئی مصروف سڑک
کیسے سمجھے گی کہ تنہائی کسے کہتے ہیں

میں ایک خواب لیے اپنے گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں تھی مجھے راستے میں دینا ہے

اب جو دیکھوگے تو پہچان نہیں پاؤ گے
وقت کے پاؤں نے چہرے کو مسل ڈالا ہے

بے چہرگی کی آگ میں پہچان جل گئی
اکیسویں صدی کا یہ منظر عجیب تھا

● Tokerod Berget - 13, 0986
OSLO - 9 Norway

صبیحہ صبا

حادثوں کی دنیا میں کون کس کو روتا ہے — یاد کر کے دکھ اپنے خون دل کا ہوتا ہے
آمدِ بہاراں پہ روئے خوب روئے ہم — درد یوں بھی تھمتا ہے، درد یوں بھی ہوتا ہے
خاک میں ملیں آخر، سب ریاضتیں ان کی — جاگنے سے کیا ہوگا، جب نصیب سوتا ہے
نقش ثبت ہوتے ہیں دل میں بے وفائی کے — ناز جن پہ کرتے ہیں، مان جن پہ ہوتا ہے
دل میں کتنے طوفاں ہیں، پرسکون چہرہ ہے — جانے وہ صبا اپنے دکھ کہاں سموتا ہے

25 - Venus Lane, Staion Island, NY 10314 (USA)

ریحانہ قمر

میں اس دل سے نکل کر بام و در تقسیم کرتی ہوں — کہ خود بے گھر ہوں اور لوگوں میں گھر تقسیم کرتی ہوں
ہواؤں کے لئے کچھ بھی بچا کر میں کہیں رکھتی — خزاں رت کی طرح پورا شجر تقسیم کرتی ہوں
عجب ماں ہوں کہ خود تو ان سے آگے جا نہیں سکتی — مگر میں اپنے بچوں میں سفر تقسیم کرتی ہوں
اسی خاطر پرانے لفظ میرے پاس آتے ہیں — کہ میں ان میں محبت کا اثر تقسیم کرتی ہوں
میں پس انداز کر سکتی نہیں یادوں کی دولت کو — اگر بچ جائے تو بار دگر تقسیم کرتی ہوں

8928 - Mesa Oak Dr., Reverside CA 92508 (USA)

سکندر سالم

کتنی شمعیں تھیں فروزاں، یہ اندھیرا نہ گیا — اپنے حالات کا رخ ہم سے تو پھیرا نہ گیا
تو نے جلووں سے ہر اک راہ منور کر دی — اپنی محفل میں وہی نور بکھیرا نہ گیا
اب کے نکلا ہے صداقت کا نیا اک خورشید — لاکھ ظلمات کی یورش سے بھی گھیرا نہ گیا
التفات ان کا ہمیں کو نہ میسر آیا — کوچۂ دوست میں ہر روز کا پھیرا نہ گیا
ملکِ افرنگ میں موسم کا نہ پوچھو احوال — دھند کا، برف کا، برسات کا ڈیرا نہ گیا

38 - Limton Drive, Brad Ford BD9 5JT, West York Shire (U.K.)

سلطانہ ذاکر ادا نقوی

ہم نے سمجھا تھا جنہیں دوست وہ دشمن نکلے — اور جانا جنہیں ہمدم، وہی بدظن نکلے
ایسے حالات نے کھینچا تھا مرے گرد حصار — چشم ماضی کو جو کھولا بہت روزن نکلے
جو ہر اک لمحہ رہے ساتھ مرے، میری طرح — وہ قریبِ رگ جاں بھی، تہہ دامن نکلے
لوٹ کے جا چکے جو سارے خزینے میرے — جو نگہبان بنے تھے، وہی رہزن نکلے
روشنی دور سے راہوں میں جو دیکھی تھی ادا — جب قریں آئے وفاؤں کے وہ مدفن نکلے

5210 - Cutter Lane, E1, Sobrante CA - 94803 (USA)

جوہر غوری

ٹوٹا آخر سیاہ شب کا غرور — پھوٹ نکلا طلوعِ صبح کا نور
کون فردا میں رنگ و نور بھرے — میں بھی لاچار آپ بھی مجبور
جو بھی سرکش ہو کاٹ دو گردن — اب سیاست کا ہے یہی دستور
وہ بھی شامل ہیں اب حکومت میں — جن کو کوئی نہیں سیاسی شعور
وہی اب کچھ بدل گئے شاید — یا مری آنکھ کھو چکی ہے نور

2550 E. College Place # 105, Fullerton CA 92631 (USA)

شمیم حیدر
Post Box No 11671, Doha - Qatar (A.G.)

سوچ رُت

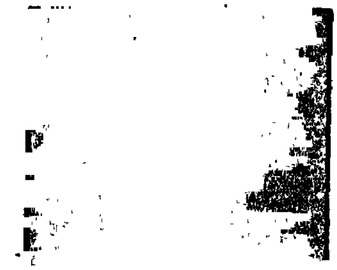
شیشہ چھناک سے ٹوٹا تو کچھ کرچیں اس کے بستر اور جسم تک بھی آئیں۔

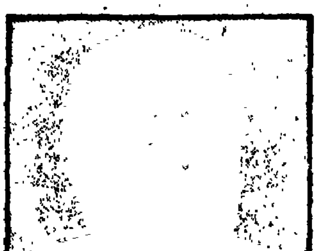
دیکھ سر لا اب کوئی ماں کا بجڑا بھی آئے تو اسے ٹال دے۔ اس حرامی نے تو اتنا تھکا دیا ہے کہ اب میں کسی کو بھی نہیں بھگت سکتی۔

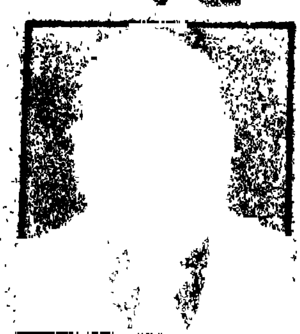
دراصل چھ کو بھگتانے اور ساتویں کو بھگتنے کے بعد وہ تھک کر اتنی چور ہو چکی تھی کہ پورا بدن پھوڑا ہو گیا تھا۔ انگ انگ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر کپڑے پہن لے۔ حالانکہ کپڑوں کے بغیر اب وہ اتنی عادی ہو چکی تھی کہ گاہک کے انتظار میں کپڑے کچھ دیر تک جسم پر رہ بھی جاتے تو بوجھ لگتے، الجھن ہونے لگتی۔ خود بہ خود بلاؤز کے بٹن کھلنے لگتے۔ سکون بھی اس کو اسی طرح آتا۔ اس وقت بھی پھولی ہوئی سانسوں کے سمندری مد و جزر کو جھیل کرنے کی کوشش میں کپڑوں سے بے نیاز لیٹے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑھتی ہوئی سانسوں کا الاؤ کسی طور کم ہونے کو نہ آیا تو دو چار مُغلظے زادا پنے ساتویں گاہک کو بک کر کروٹ لینے کی کوشش کی تو درد کے احتجاج نے اسے پھر چت کر دیا۔ اسی عالم کو عافیت سمجھ کر، لمحوں میں آنکھیں بند کیے سانسوں کے اٹھے ہوئے طوفان کے جھکاؤ کے انتظار میں بے حس و حرکت پڑی رہی.... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ طوفان کتنا ہی بپھرا ہوا کیوں نہ ہو، انتہا سکوت ہے۔ بلکہ طوفان کی شناخت ہی سکوت ہے.... پیاس بھی بھڑک اٹھی تھی۔ حلق کی نہر بھی دور تک سوکھ چکی تھی۔ مگر اس میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا کہ ہاتھ بڑھا کر سرہانے سے پانی کا گلاس ہی اٹھا لے۔ دیر تک یونہی پڑے رہنے کے بعد۔ محسوسات کی دہلیز پہ سانسیں جھکنے لگیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور نگاہیں سامنے لگی ہوئی تصویر کے اس منظر پر ٹک سی گئیں، جہاں ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کے سامنے ادھ ننگے بچے کچھ کھیل رہے تھے اور اس کا قد گھٹنے لگا۔ گھٹتے گھٹتے میسور کے نثر جن گاؤں کے چھوٹے سے گھر کے اس آنگن تک پہنچا جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ تنک دھڑ تنک، دھول میں اٹی کھیل رہی ہے اور بھیا تنگی.... تنگی کہہ کر ہنس رہے ہیں.... بے اختیار اس کا ہاتھ سرہانے گدے کے نیچے رکھی ہوئی چڑی تک گیا اور لیٹے ہی لیٹے اس نے چڑی کے دونوں خانوں میں پاؤں پھنسا کر اسے کمر تک کھینچ لیا۔ چڑی اور کمر تک کے اس اضطراری عمل کے دوران درد تو ہوا مگر نفسیات کے حصار میں۔ ہاں! عمل کی تکمیل پہ احساس کی اکائی پیدا ہوئی تو درد شدید ہو گیا۔ اب پھر اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ گھر، آنگن، آنگن کے داہنی طرف دو کمرے، بائیں جانب باتھ روم۔ کچن میں ماں، صبح سے شام تک۔ تکیہ کے نیچے سے جسم تک بریسیر کو آنے میں کچھ لمحے تو یقیناً صرف ہوئے۔ پرانے تالاب کے بالکل پیچھے سڑک کے تھوڑے سے فاصلے پہ پرائمری اسکول تھا۔ جب وہ پانچویں میں تھی تو کبھی بھیا کبھی ماں اسے چھوڑنے جاتی، اور اسی سال جب امتحان قریب تھا تو گڈو آ گیا.... داہنی طرف پڑے ہوئے اونچے پردے کو اس نے ہلایا تو اوپر رسی پہ پڑا ہوا بلاؤز ٹھیک اس کے سینے پہ گرا اب تو گڈو میٹرک میں ہو گا۔ گھر کے دو دروازے تھے۔ ایک تو پیچھے میدان کی طرف کھلتا جہاں بڑے بوڑھے منڈلی جماتے اور بچے زیادہ تر کبڈی یا پھر کچھ اور کھیلتے۔ دوسرا سامنے گلی میں۔۔۔ شام ساڑھے پانچ بجے جب بھی سائیکل کی گھنٹی بجتی تو وہ بے تحاشہ دوڑتی کہ باپو۔۔۔ اور وہ بے تحاشہ اٹھی کھونٹی پہ لٹکے ہوئے پیٹی کوٹ کو اتنی بے تابی سے اڑسا کہ ہک لگانے کیلئے دونوں ہاتھ پیچھے لے جانے پڑے مگر وہ مطمئن سی دھم سے بستر پہ گر پڑی۔ ہاں دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ دیر تک خالی خالی ذہن کے ساتھ بے سدھ پڑی رہی، مگر پھر دیر تک سوچ رت کی چھائی سحر انگیزی سے الگ نہ رہ سکی...

گاؤں گلیاں، کھیت کھلیان... دھان... باجرہ۔ مکئی گیہوں، چنا مٹر، مولی سبزی، شکر قند گڑ.. تال پوکھری۔ دکی دیوالی، عید، محرم، ہنسوڑ سکھیا چاچی سرجو لوہار، بندو ماسٹر، مولوی چاچا۔۔۔ پنڈت دیانند جی جو اس کے گھر کے ٹھیک سامنے رہتے تھے۔ اب بھی وہ تھکی تھکی سی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ اٹھ کر ساڑی نہ باندھ سکے۔ تھکی تو تھی ہی اب آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں کہ یاد آیا وہ کافی دیر سے پیاسی ہے۔ پانی کا گلاس اٹھایا۔۔۔ سونے کے لیے دوسرے کمرے کو چل پڑی۔ بے تھکن بستر پہ بیٹھ کر ایک گھونٹ پانی پیا کہ۔۔۔ بمبئی سے آئے ہوئے دیانند جی

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھیے)







اوم کرشن راحت

میرے لیے اک شخص پریشان بہت ہے   دنیائے محبت میں یہ پہچان بہت ہے
لیل اس کے علاوہ ہیں سبھی حرص و ہوس کے   جینے کے لئے جینے کا ارمان بہت ہے
لیا وقت نے گل کاریاں کی ہیں مرے رخ پر   آئینہ مجھے دیکھ کے حیران بہت ہے
پنوں کے ستم یاد نہیں رکھتے ہیں اے دل   کہنے کے لئے بات یہ آسان بہت ہے
س درد کی پونجی کو بچا لیجیے راحت   مفلس کے لئے اتنا ہی سامان بہت ہے

O 4-Melody St. Tongabbie, NSW 2146, Sydney (Australia)

خوشنود بخاری

شہروں میں تاراج وہی ہے خون خرابہ جاری ہے   جنگل کا قانون ہے لیکن امن کا چرچا جاری ہے
ک نوٹنکی آدھے پورے اور ادھورے چہروں کی   رنگ بدلتے کرداروں کا کھیل تماشا جاری ہے
مٹی کنکر پتھر اس کی تہ میں بیٹھتے جاتے ہیں   رُکتا بہتا بل کھاتا ہے، لیکن دریا جاری ہے
پنی اپنی بات سنانے کی کوشش میں سب کے سب   اک مچھلی بازار بنا ہے پھر بھی جلسہ جاری ہے
بیٹھ گئی ڈولی میں لڑکی لیکن یہ انجام نہیں   لڑکا جب تک افسردہ ہے یہ افسانہ جاری ہے

O P.O. Box, 2217, Doha - Qatar (A.G.)

وسیم بٹ وسیم

آزمانا ہے تو ٹھہرو مشکلیں ہونے تو دو   بندشوں سے کیا بنے گا لغزشیں ہونے تو دو
یاد کی پائل ہے، تیرا عکس پا ہے، اور پھر   التماسِ آئینہ ہے آہٹیں ہونے تو دو
خواہشوں کے پاؤں میں ہیں وسوسوں کی بیڑیاں   برکتیں کچھ منتظر ہیں گردشیں ہونے تو دو
اتنی ساری راحتوں کو اب نہ بھیجو ایک ساتھ   سکھ کو سہنے کی انوکھی عادتیں ہونے تو دو
اک سفر کی دلکشی کا ذکر باقی ہے ہنوز   فرصتیں ملنے تو دو کچھ قربتیں ہونے تو دو

O P.O. Box. 58171, Nairobi (Kenya)

مجید اختر

کب ستم مشقِ ستم گاری ہی کرتے آئے   اس سے پہلے یہ کرم یاری ہی کرتے آئے
خونِ مظلوم کے ماتم میں سیہ پوشی بھی   دستِ قاتل کے طرفداری ہی کرتے آئے
قصہ عظمتِ کردار کتابوں میں رہا   کام سارا لبِ گفتار ہی کرتے آئے
اُجلے پانی مری بستی کے زہر آلودہ   جام شیریں کے طلبگاری ہی کرتے آئے
سر پھرے کہنے قبیلے میں تھے ایسے اختر   سر کو زیبائے سرداری ہی کرتے آئے

O 19625- Jacob Ave, Cerritos (USA)

خالق بھٹی

چھیڑی غزل یہ کس نے شب ماہتاب میں   باقی رہا نہ کیف نہ مستی شراب میں
کیا مجھ سے پوچھتے ہیں ان سا بھی ہے کوئی   وہ آئینہ ہی دیکھ لیں اپنے جواب میں
نبضیں ہی کائنات کی ہیں جب رکی رکی   تو میرے دل کی دھڑکنیں ہیں کس حساب میں
کچھ تو دوائے درد ہو کچھ تو علاج غم   نسخہ نہیں ہے کیا کوئی تیری کتاب میں
خالق خود اعتماد تھے جو بندگان حق   نیند آگئی انہیں بھی شب ماہتاب میں

O 82 - Rome Rd, Walthamstow, London E17 6HA (U.K.)

قائم علی قائم

سرِ افلاک جب تازہ ستارہ دیکھ لیتا ہوں
تو بے منزل سفر کا استعارہ دیکھ لیتا ہوں

کبھی ساحل سے بھی طوفان اُٹھتے میں نے دیکھے ہیں
کبھی طوفاں کے اندر بھی کنارہ دیکھ لیتا ہوں

صلیبِ وقت پہ منصور ہے نہ کوئی سرمد ہے
چلو میں ہی لگا کر حق کا نعرہ دیکھ لیتا ہوں

جو پوچھے مدعائے زندگی کوئی تو میں ہنس کر
ہوا کے دوش پر اُڑتا غبارہ دیکھ لیتا ہوں

وہ عالم ہے کہ گھر سے بھی اگر باہر نکلنا ہو
تو کر کے احتیاطاً استخارہ دیکھ لیتا ہوں

P.O. Box 50001, Doha - Qatar (A.G.)

منیر حیدر

اُترتے دل پہ صحیفے اداس کرتے ہیں
تمہارے موسمی لہجے اداس کرتے ہیں

کبھی تو یادوں کی حدت سے دل پگھلتا ہے
کبھی کہ خون کے رشتے اداس کرتے ہیں

میں اپنے گھر کے مسائل کا کیسے حل ڈھونڈوں؟
مجھے جہان کے قصے اداس کرتے ہیں

یوں روز روز جدائی کی رات آئے تو
وصالِ یار کے لمحے اداس کرتے ہیں

کبھی کبھی جو ترے شہر میں پلٹتا ہوں
اجاڑ اجاڑ سے رستے اداس کرتے ہیں

P.O. Box, 26135, Safat, 13122, Kuwait

عطاء الرحمٰن جمیل

نہ پوچھ کیسے گزاری گئی کہاں گزری
قبول ہے کہ مری عمر رائیگاں گزری

وہی وہی مرے ہاتھوں سے سرسراتی ہوئی
حیات تھی جو دعاؤں کے درمیاں گزری

کہاں کے جلوے بسے تھے کہ خیر گی نہ گئی
تمام عمر نظاروں کے درمیاں گزری

تو اور چاہئے کیا اس دلِ شکستہ کو
ترے حضور اگر میری داستاں گزری

سمٹ چکی ہے در و بام میں جو عمر جمیلؔ
کبھی یہ چاند ستاروں کے درمیاں گزری

No.2, Holi Lane, Shamoli, Dhaka - 1207 (Bangladesh)

آصفہ نشاط

طلب طلب بھی نہیں ہے، عطا عطا بھی نہیں
مرے یقیں میں کمی ہو یہ سلسلہ بھی نہیں

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو ہونٹ سلنے لگیں
میں مانگنے سے تھکوں ایسا ماجرا بھی نہیں

عجیب قرب ہے دریا کے دو کناروں سا
عجیب دوری ہے جس میں کہ فاصلہ بھی نہیں

میں اپنے عیب سے نظریں نہیں چراؤں مگر
میں کیا کروں کہ مرے گھر میں آئینہ بھی نہیں

نشاطؔ کیسی ہے؟ کچھ لوگ پوچھ لیتے ہیں
میں کیا بتاؤں کہ اس سے تو رابطہ بھی نہیں

3109, Perlita Ave, Apt - 5, Los Angeles, CA 90039 (U.S.A)

کنیز فاطمہ کرن

آج پھر سوئے ہوئے درد کے بادل ابھرے
جس طرح سینۂ افلاس میں بجلی تڑپے

پھر گل و غنچے پہ یوں پڑنے لگی ہلکی پھوار
جس طرح لطف و عنایات کی شبنم برسے

گذرے ایام کی کھلنے لگی ست رنگ دھنک
درد کا شعلہ بجھا، یادوں کے آنچل چھلکے

تم نے جو درد دیئے تھے وہ فراموش ہوئے
مہرباں ساتھ جو گذرا تھا وہ لمحے جاگے

ہجر کی لمبی و تاریک گذرگاہ میں کرنؔ
پیار کے لمحے ہیں جیسے کوئی جگنو چمکے

Baz-e-Urdu, Baulkham Hill Rd, NSW-2153, Austrailia

شاہین نظر
P.O.Box 5576, Jeddah - 21432 (K.S.A.)



ٹھیک ہے

ٹیلی ویژن آن تھا
اور
پاپ میوزک کی تیز دھن پر
ننگی ٹانگوں والی
کھلے بانہوں والی
اور
بھڑکتے سینے والی

ایک عورت مست ہو کر ناچ رہی تھی۔ کچھ مرد ناچتے ہوئے اسے نوچے جا رہے تھے۔ عورت بظاہر اپنے آپ کو ان کے حملوں سے بچا رہی تھی مگر اس ادا سے کہ نوچنے والوں کی شہوت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

عورت جو پہلے سے ہی بہت کم کپڑے پہنے ہوئے تھی رہ رہ کر اپنے جسم سے کپڑے اتارتی جاتی تھی اور ہال میں موجود مجمع کی طرف اچھال دیتی تھی۔ جس "خوش نصیب" کو وہ کپڑے ہاتھ لگ جاتے وہ اسے کسی قیمتی تحفے کی طرح سینے سے لگا لیتا تھا اور آس پاس کے لوگ حسرت سے تکتے رہ جاتے تھے۔

یہ کسی رنڈی کا کوٹھا نہیں تھا بلکہ ایک وسیع آڈیٹوریم میں ہو رہے رقص کے ایک پروگرام کا لائیو ٹیلی کاسٹ تھا جسے سٹیلائیٹ کے ذریعہ پوری دنیا میں شائقین تک پہنچایا جا رہا تھا۔ ٹیلی ویژن بھی عجیب شئے ہے جو آن کی آن میں سب کچھ وا کر دینے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے۔ کچھ بھی، کہیں بھی، کسی کے ساتھ بھی ہو رہا ہو وہ منظر بس ری موٹ کے ایک بٹن کا مرہون منت ہے۔ انگلی کا صرف ایک اشارہ اور سب کچھ سامنے۔

کچھ دیر تک میں وہ ناچ دیکھتا رہا پھر چینل بدل کر کچھ اور کی تلاش میں لگ گیا۔ کبھی اس چینل پر رکا کبھی اس چینل سے آگے بڑھا۔ بے شمار پروگرام اور بے شمار دلچسپیاں۔ ٹیلی ویژن نہ ہوا جادو کا پٹارہ ہوا۔ بڑھتے بڑھتے ایک جگہ اٹکا۔ ایک کالا انگریز چہرے پر غازہ اور پوڈر کی دبیز تہیں جمائے اور پیشانی پر بالوں کی لڑیاں سجائے چلا چلا کر گا رہا تھا۔ پس پشت ننگی عورتیں نمودار ہوتی جاتی تھیں جن کے ساتھ وہ محو عشق دکھائی دیتا تھا۔ کبھی ساحل سمندر رنگیلے بدن والی کوئی عورت خود سپردگی کے عالم میں چت لیٹی ہوتی اور وہ اسی پر جھکا ہوا ہوتا، کبھی کوئی بستر پر لوٹ رہی ہوتی اور وہ اسے اپنے بس میں کرنے کے جتن کر رہا ہوتا اور کبھی چلتی لفٹ میں کوئی مچل رہی ہوتی اور وہ اس سے لپٹا ہوا ہوتا۔ یہ سب دیکھ کر تھوڑی دلچسپی پیدا ہوئی مگر جلد ہی مجھ پر یکسانیت طاری ہونے لگی چنانچہ پھر سے چینل بدلنے لگا۔ نگاہ اس ناچ والے پروگرام پر دوبارہ ٹکی۔

ننگی ٹانگوں والی
کھلے بانہوں والی
اور
بھڑکتے سینے والی

اس عورت کا ناچ عروج پر تھا۔ وہ اپنے جسم سے بیشتر کپڑے اتار کر تقریباً ننگی ہو چکی تھی۔ ابھی وہ کچھ دیر اور ناچنے والی تھی مگر میری طبیعت اوب چکی تھی۔ میں نے ری موٹ کا ایک بٹن دبا کر اسے چلتا کیا۔

اب ایک دوسرے چینل سے فیشن شو ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔

ہال کے بیچوں بیچ ایک لمبا پتلا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ اسٹیج کے دونوں طرف آمنے سامنے ناظرین بیٹھے تھے۔ اچانک پردہ اٹھا اور موسیقی کی زبردست گونج، تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور روشنیوں کی قوس قزح کے بیچ گوری چٹی عورتیں نکلنا شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے ایک عورت باریک سے کپڑوں کی گاؤن پہنے چلتی ہوئی اسٹیج کے آخری سرے تک آئی، مجمع پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور گاؤن کو جسم سے سرکا دیا۔ بجلی میں اس کا جوان جسم پورا کا پورا سامنے تھا۔ اب دوسری عورت نمودار ہوئی۔ اس کی صرف ٹانگیں دکھ رہی تھیں۔ اوپر کا حصہ ایک ریشمی دوپٹے سے ڈھکا تھا۔ کندھے اچکاتی، کمر لچکاتی وہ اسٹیج کے آخری سرے تک آئی۔ ذرا توقف کیا اور موسیقی کی ایک تیز جھنکار کے ساتھ دوپٹہ اچھال دیا۔ یہ بھی اتنی ہی ننگی تھی۔ تھوڑی دیر تک گھوم گھوم کر ناظرین سے داد وصول کی اور لوٹ گئی۔ اب تیسری عورت سامنے آئی۔ یہ اپنے میک اپ سے جنگلی

معلوم ہو رہی تھی۔ بالوں میں اس نے رنگ برنگے تنکے اور لکڑیاں کھونس رکھی تھیں۔ ہونٹوں پر بہت شوخ لپ اسٹک لگا رکھی تھی اور گالوں پر چند لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ کمر پر ایک چھوٹی سی تولیہ لپیٹ رکھی تھی اور اوپر سے ٹاپ لیس۔ اُس کے ہاتھ میں ایک جالی دار پنکھا تھا جس سے اس نے اپنے سینے کو ڈھک رکھا تھا۔ سن ۹۸ء بیسویں صدی کا گرم ترین سال قرار دیا گیا تھا اور یہ فیشن شو اس گرمی میں پہننے کے کپڑے کی نمائش کے طور پر منعقد کیا گیا تھا۔ بہر حال وہ عورت طرح طرح کی شکلیں بناتی ہوئی اسٹیج کے آخری سرے تک آئی اور ایک ادا سے پنکھا سینے سے ہٹا دیا۔ پھر ایک شان بے نیازی سے پنکھا جھلتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔ یہ سب دیکھ کر مردانہ ہوس کو تھوڑی تسکین پہنچی۔ مگر کب تک؟ اکتا کر میں نے چینل بدل دیا۔ اب ایک گھر کا منظر تھا۔ کالے رنگ کی ساری میں ملبوس ایک عورت سر پر پلّو ڈالے کسی مرد کے سامنے بیٹھی تھی۔ مرد حلیے سے وکیل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ بیوی بچوں والا گھر ہے اس میں صاف ستھرا پروگرام چلنا چاہیے۔ چند مکالمے سنے تو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی ہندی فلم ہے۔ عورت ایک بوڑھے مالدار کی بیوہ تھی اور وکیل کی ملی بھگت سے راستے کا کانٹا ہٹا دیا تھا۔ اگلے منظر میں عورت کے جسم سے ساری اتر چکی تھی اور اب وہ بلاؤز اور چڈی کوٹ میں ناچ ناچ کر وکیل سے اظہار محبت کر رہی تھی۔ اس سے اگلا منظر بستر کا تھا جہاں دو جوان جسم ایک دوسرے پر پلے پڑ رہے تھے۔

ابھی یہ منظر جاری تھا کہ میرا چھ سالہ بیٹا فواز آنکھ ملتا ہوا میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے جھٹ سے چینل بدل دیا۔

"ابو کارٹون لگایے۔" فواز نے فرمائش کی۔

میں نے کارٹون لگا دیا۔ تب تک مجھے یاد آیا کہ خبروں کا وقت ہو رہا ہے۔ میں نے فواز سے نیوز سننے کی اجازت مانگی تو وہ ضد کرنے لگا۔

"ابو، آپ ہر وقت نیوز ہی سنتے رہتے ہیں۔ آپ بہت دیر سے نیوز سن رہے تھے۔ اب میں کارٹون دیکھوں گا۔" وہ رونے لگا۔

اتنی دیر میں میری بیوی بھی آگئی۔

"آپ ٹی وی ہی دیکھتے رہیے گا یا مجھے سودا لا کر بھی دیجیے گا۔ تھوڑی دیر میں جمعہ کی اذان ہو جائے گی اور ساری دکانیں دو ڈھائی گھنٹے کے لیے بند ہو جائیں گی۔ گھر میں نہ مرغ ہے، نہ دودھ ہے، نہ....."

اس کی فہرست میں مزید کئی چیزیں جڑتی گئیں مگر میری توجہ بی بی سی کی عالمی خبروں پر مرکوز ہو چکی تھی۔ میں نے کہا۔ "بس بیگم، ذرا ہیڈ لائنس سن لوں پھر اٹھتا ہوں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ ادھر نیوز ریڈر نے خبریں پڑھنی شروع کیں۔ ابتداء امریکی صدر بل کلنٹن کے ناجائز جنسی تعلقات کے متعلق نئے انکشافات سے ہوئی۔ کلنٹن نے قوم کے نام اپنے خطاب میں مونیکا لیونسکی نامی ایک خاتون سے ناجائز جنسی تعلقات کا اعتراف کیا تھا۔ اس اعتراف کی ضرورت دراصل اس مجبوری کے تحت آئی تھی کہ مونیکا لیونسکی نے اپنا وہ گاؤن جس پر کلنٹن کے ساتھ مباشرت کے وقت دھبے آئے تھے گرینڈ جیوری کے حوالے کر دیا تھا۔ اور گرینڈ جیوری اس لیے بیٹھی تھی کہ کلنٹن نے ایک دوسرے مقدمے کی چھان بین میں مونیکا سے اپنے ناجائز تعلقات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ دوسرا مقدمہ یہ تھا کہ کلنٹن جب امریکی ریاست ارکنساس کے گورنر تھے تو وہاں کی ایک ملازمہ کو مبینہ طور پر اپنے پوشیدہ اعضاء دکھا کر رجھانے کی کوشش کی تھی۔

نیوز ریڈر اس واقعے کی اگلی پچھلی تمام تفصیلات سنا کر جا چکا تھا اور اب ماہرین اسی سیکس اسکینڈل پر اپنی رائے دے رہے تھے۔ کلنٹن کی صدارت کو لاحق خطرات اور اس سے پیدا شدہ سیاسی بحران پر گفتگو ہو رہی تھی۔ فلسطین کے قضیے پر پڑنے والے اثرات کا ذکر ہو رہا تھا اور عالمی اسٹاک مارکیٹ کے رد عمل کا اندازہ لگایا جا رہا تھا۔ گویا ایک فرد کی جنسی ہوس نے ساری دنیا کو لپیٹ لیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی اذان کا وقت قریب آچکا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ جدہ کی یہی مصیبت ہے۔ اذان ہوئی اور سارا کاروبار ٹھپ۔ اٹھتے اٹھتے فواز کو آواز دی جو ناراض ہو کر وہاں سے جا چکا تھا۔ میں نے کارٹون کا چینل سیٹ کیا اور سوپر مارکیٹ کی طرف بھاگا۔

کچھ دیر بعد لوٹا تو ٹیلی ویژن پر ایک کارٹون فلم چل رہی تھی۔ بظاہر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی بیٹے کے پاس بیٹھ گیا۔ اس چوکور ڈبے کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ آن ہو تو کمزور انسان آف رہتا ہے۔ ٹام اینڈ جیری کا سلسلہ وار سیریل چل رہا تھا جس میں جیری نامی چوہا ٹام نامی بلی کو طرح طرح سے پریشان کرتا ہے۔ اس وقت جو منظر سامنے تھا اس میں ٹام اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ساحل پر بیٹھا عیش کر رہا تھا۔ دونوں نیم برہنہ تھے۔ ٹام جب جب اپنی منظور نظر کے قریب ہونے کی کوشش کرتا جیری رنگ میں بھنگ ڈالنے پہنچ جاتا۔ میری طبیعت مکدر ہو گئی۔ کمبخت بچوں کے کارٹون میں بھی سیکس۔ میرا دل چاہا آگ لگا دوں اس ٹی وی کو۔ مگر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے فواز کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا:

"بیٹا، بند کر دو ٹی وی۔ اب کچھ کھیلو کودو۔"

فواز مچل گیا۔ "نہیں ابو"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ میرے ایک دوست کی بیوی کا فون تھا جو میری بیوی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے آواز دی اور بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ میری بیوی فون پر کچھ دیر باتیں کرتی رہی۔ پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کر مجھے مخاطب کیا۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھیے)

فکر امروز

میں نہایت صاف الفاظ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اپنی شاعری کو مفید، متین اور مہذب و بااثر نہ بنائیں گے۔ جب تک اپنے تغزل میں رفعت، اپنی نظم میں شوکت، اپنے خیالات میں بلندی اور اپنے ادراکات میں ترفع پیدا نہ کریں گے، ہمیں دنیا میں زندہ رہنے اور اپنی ادبی روایات کو زندہ رکھنے میں کامیابی نصیب نہ ہوگی۔

ابھی آپ کو اپنی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ و احساس نہیں۔

(۲۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء۔ مشاعرہ ڈبائی)

سیماب اکبرآبادی

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــــ ۷۰
شمارہ ــــــ ۷

فون: 3829904

اردو کی نئی بستیاں

(جلد دوّم)

جولائی ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ✕ روپے

زرِ سالانہ ◆ ۱۰۰ روپے
لائبریریوں سے ◆ ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ◆ ۵۰۰۰ روپے
معاونین سے ◆ ۲۰۰ روپے

پاکستان ◆ ۲۵۰ روپے
امریکہ ◆ ۲۵ ڈالر
برطانیہ ◆ ۱۵ پونڈ
خلیجی ممالک ◆ ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

اردو کی نئی بستیاں

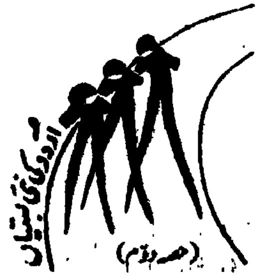
اردو کی نئی بستیوں سے متعلق شاعر کی یہ خصوصی اشاعت ہماری ان کوششوں کا ایک عملی روپ ہے جس کا آغاز ۱۹۸۰ء سے کیا گیا تھا۔ اور اس موضوع پر ایک ضخیم خاص نمبر کی اشاعت کا خیال بھی ذہن میں تھا لیکن ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن حد تک دشوار ترین ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اب تک "اردو کی نئی بستیاں نمبر" شائع نہیں کر سکے۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم نے اس کا خیال ترک کر دیا ہو، ارادہ بدل دیا ہو۔ ہم تو ۱۹۸۰ء سے برابر اسی عنوان پر نہ صرف کام کر رہے ہیں بلکہ اپنے مقصد کی طرف بتدریج پیش رفت بھی کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر شاعر کے گزشتہ کئی شمارے اور پھر عام شماروں میں اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کا تعارف، شاعر کی تیس سال کی فائلوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۸۰ء اور اس سے قبل بیرونی ممالک کے اردو قلم کاروں کی ہندوپاک کے ادبی رسائل میں اتنی چہل پہل نہیں تھی جو حالیہ دنوں میں نظر آ رہی ہے۔ رسالہ افکار (کراچی) میں البتہ ان قلم کاروں میں سے کچھ تواتر سے شائع ہو رہے تھے۔ ایک دو رسالے اور بھی تھے۔ قلم کاروں سے رابطہ آسان نہیں تھا اس لیے کہ ان کے پتے رسائل میں شائع نہیں ہو رہے تھے۔ کوئی کسی کو کچھ بتانے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ ہم نے اپنے طور پر جب کام شروع کیا تو یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ کن کڑے مراحل سے ہم گزرے ہیں۔ شاعر میں قلم کاروں کے پتوں کی اشاعت نے روابط کو نہ صرف ایک نیا تصور دیا بلکہ اس کو دور دور تک پھیلایا بھی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ شاعر کا یہی ایک بنیادی وصف موضوع بن سکتا ہے اور اسی وصف نے معاصر ادبی رسائل کے لئے ایک نئی فضا بنائی ہے۔ قلم کاروں کے صحیح پتوں کا حصول اور پھر انہیں عام کرنے کا رجحان رسالہ شاعر کا ایک کارنامہ ہی ہے۔ ہم آج بھی اردو کی نئی بستیوں کے نئے پرانے قلم کاروں کی جستجو کرتے رہتے ہیں، ان کے پتے شاعر میں شائع کرتے ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اول میں ڈائرکٹری اور اب دوسری جلد میں اس کا سلسلہ، علاحدہ سے عالمی اردو ڈائرکٹری کی تیاری۔ یہ سارا کچھ شاعر ہی کی طرف سے ہے اور شاعر ہی کی طرف سے ہوگا۔ پتوں کا ذکر اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ اس خصوصی اشاعت کی ترتیب کے دوران ہم پتوں کی دستیابی اور ان کی صحت کے لئے پریشان رہے ہیں۔ عالمی اردو قلم کاروں کے پتے، قلم کاروں کے لئے، ادبی رسائل و جرائد کے لئے، اداروں انجمنوں کے لئے، ثقافتی سرگرمیوں کے لئے ناگزیر ہیں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بطور خاص۔ ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد میں جو میٹر شائع ہوتا ہے وہ چھوٹے دائروں تک محدود رہتا ہے۔ کسی سے کچھ معلوم کرنا ہو، کچھ پوچھنا ہو، اگر پتہ موجود ہے تو کام آسان ورنہ تو خاموشی ہی خاموشی۔ ہم اگر اس خصوصی شمارے کو ترتیب دینے میں کامیاب ہو سکیں ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ قلم کاروں کے پتے ہی ہیں جو اس خصوصی شمارے میں بکھرے پڑے ہیں۔

شاعر کے اس شمارے کی ترتیب اور اس میں سمویا ہوا مواد اور اس کا تخلیقی تنوع، غالباً ادبی رسائل میں پہلی بار ایک بڑے اور وسیع تر موضوع کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔ ادبی رسائل میں قلم کاروں کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ کتابیں شائع ہو رہی ہیں انتخاب آ رہے ہیں لیکن صحیح معنوں میں اس موضوع کو اس کے تمام ممکنہ پہلوؤں اور مضمرات کے ساتھ برتا نہیں گیا ہے۔ انعام الحق جاوید کی مرتبہ کتاب "بیرونی ممالک میں اردو" اپنے موضوع پر پہلی گرانقدر کتاب ہے۔ اس کے بارے میں اس خصوصی شمارے میں کہیں تفصیل بھی دی گئی ہے۔ اس سے قبل آغا افتخار حسین نے ۱۹۶۸ء میں "یورپ میں اردو" کے عنوان سے ۹ ممالک کے بارے میں مضامین مرتب کئے تھے یا ماہنامہ "اخبار اردو" (پاکستان) کا خصوصی نمبر۔ افکار (پاکستان) کا 'برطانیہ میں اردو ایڈیشن' انشاء (کلکتہ) کا اسکینڈے نیویا نمبر وغیرہ، یہ سارے کام بہت اہم اور بنیادی ماخذ ہیں لیکن تسویدی نوعیت کے ان حوالہ جاتی ماخذوں سے استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن قلم کاروں، اداروں، انجمنوں اور اردو کی ترویج و اشاعت کا کام کرنے والوں سے رابطہ قائم کرنے والی سہولتیں ان میں نہیں ہیں سوائے اس کے کہ آپ مرتب کتاب سے رجوع ہوں۔

اردو کی نئی بستیوں کا موضوع محض شاعری، افسانہ یا مشاعرہ اور سیمینار نہیں ہے۔ یہ بہت غیر معمولی اور اہم موضوع ہے جس پر سنجیدگی سے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے اور ہم وہی کام کرنا چاہتے ہیں اور 'اردو کی نئی بستیاں نمبر' کی طرف پیش رفت کے طور پر یہ خصوصی شمارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ہماری یہ کوشش اب بھی ایک ابتدائی کوشش ہی ٹھہرے گی کہ اب بھی یہ وسیع تر موضوع ہماری گرفت میں نہیں آیا ہے۔ ہماری کوششیں جاری ہیں اور ہمیں عالمی اردو برادری سے بھرپور تعاون کی توقع ہے۔ یقین ہے کہ جب بھی اردو کی نئی بستیاں نمبر شائع ہوگا وہ ایک مثالی، ادبی، تاریخی دستاویز بن جائے گا۔ ہم یہ سب کچھ لکھ رہے ہیں کیوں کہ ہم سوچ رہے ہیں لیکن سوچ اور عمل کے درمیان جو کچھ ہے وہی ہمارا مسئلہ ہے اور اس مسئلے کو سمجھے بغیر لوگ اپنی اپنی سطح پر اس موضوع کو برت رہے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے رہنے والوں کے اپنے مسائل ہیں، بہت سارے حقائق ہیں۔ وہ معاملات ہیں جو ہندوپاک کے اردو والوں کا خاصہ ہیں۔ ان سب کے تناظر میں ان نئی بستیوں کو دیکھنا اور سمجھنا ہے۔

اردو ایک عالمی زبان ہے، رابطے کی زبان ہے، ہندوپاک کی ایک بڑی اور بنیادی زبان ہے۔ یہ محبتوں کی زبان ہے۔ دلوں کو سرحدوں کو جوڑنے کی زبان ہے ہندوپاک سے باہر بیرونی ممالک میں جن لوگوں نے اردو کو اپنی شناخت کے طور پر اپنایا ہوا ہے وہ ہندوستانی اور پاکستانی دونوں ہی ہیں۔ اردو کے ذریعے یہ روابط اور گہرے ہو سکتے ہیں اگر ہم بعض ان خطوط پر کام کریں جو اکیسویں صدی کے لئے بے حد ضروری ہوں گے۔ ہم اپنی پیاری زبان اردو، ہندوپاک ہی نہیں بلکہ دنیا کی [illegible] زبانوں کے بولنے والوں کو بھی اپنا گرویدہ کر سکتی ہے اور کر رہی ہے اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہے اور مل کر کام کرنا ہے۔ یہ کام بہت سعد قدری سے اور ہے شاعر کی یہ خصوصی اشاعت امن عالم کے نام ہے اور اردو زبان امن کی زبان ہے۔ ہمیں اردو دنیا کے ہر اردو داں سے دعاؤں کی، ان کے عملی تعاون کی سخت ضرورت ہے۔

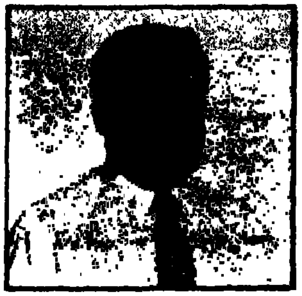


شمارہ ۷ [جولائی ۱۹۹۹ء] جلد ۷۰

خواجہ ریاض الدین عطش

اسی غم میں کہ پھر سرکش ہوا ہے
چراغ اندر ہی اندر جل رہا ہے
کرن پہنچی نہ رمزدر کھلا ہے
یہ گھر صدیوں سے بے آب و ہوا ہے
سرابوں کا سمندر بن گیا ہے
ہوا کا ریت پر جو نقش پا ہے
یہی بنتا ہے صدیوں کی حکایت
یہ ایک اک پل کا جو افسانچہ ہے
سفر کچھ بھی نہیں بجز اک ارادہ
مگر پھر اپنا اپنا حوصلہ ہے
شکستِ زندگی نے عکس چہرہ
شکستہ آئینے پر رکھ دیا ہے
مری معدوم خوشیوں کی طلب نے
خوشی کا غم کو اک چہرہ دیا ہے
غبارِ کشتگاں ہے پیچھے پیچھے
زمانہ آگے آگے چل رہا ہے
بشر کیا ہے بجز تابوت سایہ
کوئی سمٹا کوئی پھیلا ہوا ہے
وہ کیا بنجر پہ برسے گا جو بادل
ہوا کی انگلیوں پر ناچتا ہے
میں اک حتکہ سر طوفاں ہوں لیکن
بتا دیتا ہوں کس رخ کی ہوا ہے

● 4633 - West Medison St.
Apt 3D, Skokie, IL 60076 (UK)



قمر نقوی

نہ ہو ذوق سفر تو راہ چلنا بار خاطر ہے
قدم اپنا جو ہاتھوں سے اٹھائے وہ مسافر ہے

جو کانٹے راہ کے چنتا ہے چادر دھوپ کی اوڑھے
وہی تو زندگی کے مقبرے کا اک مجاور ہے

کتابیں ہیں بدن چہرے ہوئے ہیں نقش صفحوں کے
مگر کیا کوئی ہے۔ جوان کو پڑھنے پر بھی قادر ہے

تمھیں اب وار کرنے میں تامل کی ضرورت کیا
نہ سوچو میرے بارے کہ میرا دل تو صابر ہے

کرائے کا مکاں ہے جسم اس میں رہتے ڈرتا ہوں
مرا مالک مکاں خالی کرانے پر بھی قادر ہے

مجھے معلوم ہے تم میرے بارے میں یہ سوچو گے
قمر اب بھی روایاتِ قدیمی کا ہی شاعر ہے

● 6207, S. Indianapolis Pl,
Tulsa OK 74136 (U.S.A)



عرفان دانش سکندری

وہ سبزہ زار، وہ کہسار و دریا چل کے دیکھیں تو
ہیں جس مٹی کا ہم زندہ حوالہ، چل کے دیکھیں تو

وہ جو اس پار بستی ہے، سنا ہے ہم وہیں سے ہیں
بزرگوں میں کوئی ہوگا شناسا چل کے دیکھیں تو

کنارے جھیل کے اب بھی لڑکپن کھیلتا ہوگا
ذرا ماضی کے آئینے میں چہرہ چل کے دیکھیں تو

فضا میں تیر کس کا تھا، یہ سوچیں گے، مگر پہلے
گرا جاکر کہاں زخمی پرندہ، چل کے دیکھیں تو

حقیقت چاند کی کیا ہے، چلو سورج سے یہ پوچھیں
کہاں تک ہے یہ مانگے کا اجالا چل کے دیکھیں تو

گلِ امید کوئی پھر کھلا شاید، کہ صحرا سے
صبا لائی ہے خوشبو کا سندیسہ چل کے دیکھیں تو

وہی حیرانیِ چشمِ تمنا پھر سہی دانش
سنا ہے پھر وہی ہوگا تماشہ چل کے دیکھیں تو

● 237 Parkville Ave, Brooklyn
New York NY 11230 (USA)

اردو کی نئی بستیوں کے چند مستشرقین اردو

مرتبہ : افتخار امام صدیقی

اردو کی نئی بستیوں میں زبان وادب کے حوالے سے مسلسل کام ہو رہا ہے۔ وہ اردو داں ہندوستانی وپاکستانی جو روٹی روزی کی خاطر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں وہ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود تہذیبی وثقافتی سطح پر اردو کی ترویج واشاعت بھی کر رہے ہیں اور ہر طرح سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مختلف برّاعظموں میں اردو زبان وادب کی سرگرمیوں اور تدریسی کوششوں کی تفصیلات پر مبنی ایک گراں قدر کتاب 'بیرونی ممالک میں اردو' کے عنوان سے آئی ہے۔ اسے ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے مرتب کیا ہے اور مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے اسے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا ہے۔ پانچسو چار صفحات کی اس کتاب میں ۵ براعظموں کے ۴۴ ممالک میں اردو زبان وادب کے بارے میں ۴۸ قلم کاروں کے مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک اہم ماخذ ہے۔ اسے کام کا ایک خاکہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان سنجیدہ مضامین سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ تخلیقی سطح پر بیرونی ممالک میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح کا شعر وادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اپنے تخلیقی ادب کے بارے میں فن کار کیا کر رہے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ مشاعرے، سیمینار، شعری نشستیں، تدریسی کوششیں، تراجم، ریڈیو، ٹی وی کے اردو پروگرام، کتابیں، جرائد ورسائل کی اشاعت، انجمنیں اورادارے وغیرہ کے بارے میں خاصہ لوازمہ موجود ہے۔ اس کتاب پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں ہے تاہم ایسی غیر معمولی کتاب میں اگر دو باتوں کا اور خیال رکھا جاتا تو اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے والوں کو مزید آسانی ہو جاتی۔ ایک یہ کہ ہر مضمون نگار کا ذاتی پتہ اور مضمون کا سنہ تحریر دیا جاتا۔ ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی اس کتاب کے تمام مضامین ۱۹۹۵ء سے پہلے ہی کے ہوں گے۔ پتوں سے یہ ہوتا ہے کہ مزید معلومات کے لئے براہ راست مضمون نگار سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ اب کتاب کے مرتب ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا پتہ درج کیا جاتا ہے کہ کسی بھی طرح کی معلومات کے لئے ان سے رابطہ کیا جا سکتا ہے:

House No. 697, Street - 92, G - 9/4, Islamabad (Pakistan)

اس گرانقدر سنجیدہ کتاب میں بعض بڑے دلچسپ حقائق فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کے مسائل اور ہندوستان سے باہر اردو کی سرگرمیوں میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کا کردار۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان وادب کی جو بھی چہل پہل ہے اس میں پاکستانیوں نے بڑا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ساتھ ہی مختلف براعظموں میں قائم پاکستانی سفارت خانوں نے بھی بڑا اہم رول ادا کیا ہے بطور خاص اردو زبان کی درس وتدریس کے لئے۔ حکومت پاکستان اور سفارت خانوں کی کوششوں سے مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو کا قیام اور ہر طرح کی سہولتوں کی فراہمی سے غیر اردو داں طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح مستشرقینِ اردو میں اضافہ ہوا ہے اور دنیا کی مختلف بڑی زبانوں میں اردو ادب منتقل ہوا ہے مگر کلاسیکی شعر وادب زیادہ ترجمہ ہوا ہے۔ اس میں بھی غالب اور اقبال سب سے زیادہ۔ حکومت پاکستان کی طرف سے اور سفارت خانوں کے ذریعے اقبال پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ نئے نصابوں اور نئے تراجم میں پاکستان کا جدید اردو ادب شامل کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کا جدید اردو ادب داخلِ نصاب نہیں۔ یہاں سے تو کلاسیکی، نثر ونظم کے بعد کرشن چندر، منٹو اور قرۃ العین حیدر تک اس کے بعد کچھ نہیں۔ ہندوپاک کے قلم کار اپنے اپنے طور پر جدید ادب کو انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں لیکن مستشرقین کے ذریعے یہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ پوری دنیا میں اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہو رہا ہے لیکن ممالک غیر میں ہندوپاک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے درمیان ہی۔ وہ مستشرقین اردو جو ایشیاء یورپ سے خاصی بڑی تعداد میں ابھرے تھے اب ان میں کمی آگئی ہے اور تخلیق کار تو بالکل ہی نہیں ابھر رہے ہیں۔ نثر میں زیادہ کام ہوا ہے۔ پوری دنیا میں بولی جانے والی اردو زبان پر ہندوستانی فلموں اور گانوں کے اثرات زیادہ مرتب ہوئے ہیں جبکہ یہ فلمیں اور فلمی گانے اردو ہی ہیں لیکن ہندی کے نام پر ان کی مقبولیت ہے۔ ہندوستان سے باہر اردو کے فروغ میں ہندوستانی حکومتوں کا کوئی کردار نہیں ہے۔ ہندی کے شعبوں کا قیام اور ہندی کی ترویج واشاعت ہی کا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے جبکہ ہندی کے ساتھ اردو کا فروغ بھی ہندوستانی حکومتوں کے فرائض میں سے ایک ہے کیوں کہ اردو، ہندوستان کی زبان ہے اور اسی مٹی سے جنمی ہے۔ ممالک غیر میں بسے ہوئے اردو داں حضرات ثقافتی سرگرمیوں میں زیادہ مصروف رہتے ہیں لیکن غیر اردو داں لوگوں میں اردو کی تدریس کا اہتمام نہیں کرتے مثلاً ہندی پڑھنے والے طلباء کو اردو بھی پڑھانا، ہندی والوں کو اپنے ساتھ رکھنا۔ اپنی سرگرمیوں میں شامل کرنا۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ خلیجی ممالک میں ان عربوں کو اردو بولنا تو آگیا جو ہندوپاک کا سفر کرتے رہتے ہیں لیکن مقامی لوگوں کو نہ تو اردو پڑھانے کا انتظام ہوا اور نہ ہی شعر وادب کا کوئی خاص لین دین۔ خلیجی ممالک سے جو بھی شعر وادب ترجمہ ہوا وہ بیشتر انگریزی سے آیا یا پھر ہندوپاک کے عربی داں حضرات نے یہ کام کیا اور کر رہے ہیں۔ خلیجی ممالک میں پاکستانی اسکول، کالج یا ہندوستانی اسکول، کالج اگر قائم ہیں تو سفارت کاروں اور ہندوستانی پاکستانی مہاجرین کے بچوں کے لئے ہیں۔ مقامی بچے شاذ ہی ان اسکولوں، کالجوں کی طرف آتے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں میں اردو شعر وادب کی جو بھی سرگرمیاں ہیں ان میں ہندوستانی اردو داں حضرات برابر کے شریک ہیں۔

مستشرقین اردو پر حالیہ برسوں میں کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک دلچسپ تحقیقی موضوع ہے اور بے حد اہم بھی۔ ہندوپاک کے ادبی رسائل میں ان مستشرقین اردو پر کم کم لوازمہ شائع ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں عالمی مشاعروں اور عالمی سیمیناروں کا تصور ہندوپاک کے فن کاروں کی یکجائی ہے جبکہ عالمی سیمیناروں کا تصور تو ان مستشرقین اردو داں سے ہے جو مختلف براعظموں میں اردو کی تدریس کا کام کر رہے ہیں اور شعر وادب کے تراجم کے ساتھ مقالات بھی لکھ رہے ہیں۔ کتابیں شائع

کررہے ہیں۔ ایسے ہی چند ایک مستشرقین اردو کے بارے میں کچھ ابتدائی معلومات جو "بیرونی ممالک میں اردو" سے اخذ کی جارہی ہیں شاعر کے بے شمار قارئین کی نذر ہیں۔ اس موضوع پر ہماری معلومات میں اضافہ کیجئے۔ ایسے لوگوں کے کاروافکار کے بارے میں بتائیے جو دنیا کی بڑی زبانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو زبان و ادب کے لئے کام کررہے ہیں۔ شاعر کا مجوزہ "اردو کی نئی بستیاں نمبر" محض نئی بستیوں میں بسے ہوئے ہندوستانی پاکستانی قلم کاروں پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ یہ ایک علمی و تحقیقی ادبی دستاویز بھی ہوگا۔ جب بھی یہ نمبر شائع ہوسکا۔

رالف رسل

برطانیہ

اردو ادب میں رالف رسل کی حیثیت ایک زندہ روایت (Living legend) کی ہے۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی کے مقتدر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز (SOAS) میں مختلف حیثیتوں میں ہی طویل عرصے تک اردو کی خدمت انجام نہیں دی بلکہ برطانیہ میں جاکر آباد ہونے والے اردو داں عوام کے بچوں کے لیے مختلف سطحوں پر حکومت کے ذریعے اردو تعلیم کے نظم کے لیے بھی اہم کوششیں کیں۔

رالف رسل غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیر محض ہیں۔ انھوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کے اشتراک سے، اور خود بھی کلاسیکی اردو شعراء کے تراجم کیے اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھ کر مغربی دنیا کو اردو ادب کی عظمت سے روشناس کرایا۔ رالف رسل اس طرح کے نام نہاد احساس برتری سے بھی عاری ہیں جو مغربی اقوام، خصوصاً انگریزوں کے مزاج کا خاصہ ہے۔ انھوں نے برطانیہ میں ایشیائی باشندوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے تعصب کی بھی ہمیشہ شدید مخالفت کی ہے۔

رالف رسل (ولادت ۱۹۱۸ء) نے ادب عالیہ (classics) اور جغرافیہ کی اعلا تعلیم سینٹ جانس کالج، کیمبرج میں حاصل کی اور وہیں سے ۱۹۴۰ء میں پہلی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے فوجی ملازمت اختیار کی اور برطانیہ کی ہندوستانی فوج کے عہدے دار کے طور پر اردو زبان و ادب سے ان کی واقفیت کا آغاز ہوا جو ایسے عشق میں تبدیل ہوگیا جس میں وہ آج تک مبتلا ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اردو کی ڈگری حاصل کی اور مقتدر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لندن کے تدریسی عملے میں شامل ہوگئے۔

اردو زبان و ادب سے متعلق ان کے متعدد مضامین اہم علمی مجلوں (Acadamic journals) میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو کے باب میں ان کا نام Encyclopaedia Britannica میں بھی شامل ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام کے اشتراک سے بھی انھوں نے متعدد علمی پروجیکٹ مکمل کیے جن میں اہم Three Mughal Poets ہے۔ رالف رسل نے تدریسی مقاصد کے لیے مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل سلسلۂ کتب تیار کیا:

(1) Essential Urdu (2) Reading in Everyday Urdu
(3) A New Course in Urdu and Spoken Hindi
(4) A Primer of Urdu Verse Metre.

SOAS سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انھوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کے اشتراک سے غالبیات پر Ghalib : Urdu and Persian Ghazals, Volume II, (Oxford U.P.) کی تحریر کا کام مکمل کیا اور آج بھی رالف رسل اپنا بیش تر وقت اردو تدریس سے متعلق مواد کی تیاری میں صرف کرتے ہیں۔ ان کی حالیہ کتاب The Pursent of Urdu Literature ہے جو مجموعۂ مضامین ہے۔ اردو سے ان کی گہری وابستگی اردو ادب کی گہری فہم کی غماز ہے۔ ان کی عملی خدمات کے اعتراف کے طور پر کرسٹوفر شیکل کی کتاب Urdu in Muslim South Asia (O.U.P.) کی اشاعت بھی اردو عوام اور اردو ادب کے شیدائیوں کے لیے اہم تحفہ ہے۔ (اطہر فاروقی)

پروفیسر گامو

جاپان

دنیا کے نقشے پر اور براعظم ایشیا میں ۱۲۲،۶۱۳،۰۰۰ آبادی والے جاپان کے ہر شہری کی دنیا جینے کا گویا جنون ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں تیزی سے ترقی کرنے والے جاپان میں اپنی زبان اور اپنے کلچر کے تحفظ اور فروغ کے ساتھ دنیا کی دیگر زبانوں کو سیکھنے کا بھی شوق رہا ہے بطور خاص ایشیائی زبانیں اور ان میں بھی ہندی اور اردو۔ جاپان کا اردو سے بہت قدیمی تعلق ہے اور اس کی اپنی ایک تاریخ ہے لیکن ۱۹۰۸ء کے حوالے سے بھی گفتگو ہوسکتی ہے۔ اس وقت ٹوکیو اسکول آف فارن لنگویجز قائم ہوا اور اس میں شعبۂ ہندوستانی کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۰۹ء میں اس شعبے سے مولانا برکت اللہ بحیثیت استاد کے شامل کیے گئے۔ مولانا برکت اللہ ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ اس انقلابی کی زبردست اردو خدمات ہیں۔ وہ جاپان میں اردو درس و تدریس کے بانی تھے۔ اور پھر اس شعبے سے کئی ایک جاپانی وابستہ ہوئے۔ ان میں پروفیسر گامو کا نام اہم ہے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں اس شعبے سے منسلک ہوئے اور ایک طویل مدت تک اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں جاپان کی وزارت تعلیم نے انھیں ایک تعلیمی مشن پر برصغیر بھی بھیجا تھا۔ پروفیسر گامو کی تحقیقی و علمی سرگرمیوں میں اردو فارسی زبان و ادب اور اسلامی علوم شامل ہیں۔ اردو سے خصوصی تعلق اور عمر بھر کی خدمات کے باعث جاپان میں اردو داں حلقے انھیں جاپان کا "بابائے اردو" قرار دیتے ہیں۔ اس وقت اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز اور ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کے شعبۂ اردو کے سربراہ ہیروشی کان کاگایا اور پروفیسر سوزوکی تاکیشی ان ہی کے شاگرد ہیں۔ ٹوکیو کے سابق نامور استاد پروفیسر کروتاپاکی تسونیو بھی انھیں کے تلامذہ میں تھے۔ پروفیسر گامو کے علمی کارناموں میں ایک تو اردو زبان کی قواعد ہے۔ جاپانی زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی مربوط و مفصل کتاب ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ گامو کا سب سے اہم علمی

کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جاپانی زبان میں "باغ و بہار" کا ترجمہ ۱۹۴۳ء میں طبع کروایا اس طرح پہلی بار اہل جاپان کے سامنے اردو کے کلاسیکی ادب کو پیش کیا۔ اس وقت اہل جاپان کی اردو ادب سے واقفیت خاصی محدود تھی چنانچہ باغ و بہار کے ترجمے سے اردو ادب کے تراجم کو تحریک ملی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پروفیسر گاموکی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:

ایران کی تاریخ و ثقافت (۱۹۴۱ء) مذہب اسلام (۱۹۸۵ء) عجم کے شاعر (۱۹۶۴ء) سعدی شیرازی۔ اردو بول چال (بہ تعاون پروفیسر نورالحسن برلاس)۔

پروفیسر گاموکا انتقال شعبے سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ ان کی ذاتی کتابوں کا ذخیرہ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کے کتب خانے کی زینت ہے جس میں کل ۳۹۳ کتابیں شامل ہیں۔ اس ذخیرے میں اسلامی علوم و فنون کی کتابوں کے علاوہ پریم چند اور حالی کی کتابوں کے پورے سیٹ موجود ہیں۔

پروفیسر ہیروشی کان کاگایا

پروفیسر Kan Kagaya نے اردو اور مذہبی تاریخ میں ایم اے کیا ہے اور ۱۹۶۱ء سے اوساکا یونیورسٹی میں اردو اور اسلامیات کا درس دے رہے ہیں۔ تصوف ان کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ، سرسید، حالی اور اقبال پر خصوصی مقالات لکھے ہیں۔ ان کے تراجم اور نگارشات کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

آج کا اردو ادب (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) Gibbs Mohammadanism کا ترجمہ۔ مسدس حالی کا تعارف اور ترجمہ۔ شاہ محمد اسماعیل کی تذکیر الاخوان کے پانچویں باب کا ترجمہ۔ جنوبی ایشیا کی ہم عصر تاریخ (بہ اشتراک پروفیسر ہمانچی) جدید جاپانی ادب اور اقبال اور جاپان پر اردو مقالے۔ ان کا طویل منصوبہ 'اردو جاپانی لغت' کی تدوین ہے۔ اس لغت کے ذخیرۂ الفاظ کی بنیاد کلاسیکی ادب، جدید ادب، معاصر اخبارات و رسائل اور علوم و فنون کی اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ وہ اس منصوبے پر گزشتہ کئی برسوں سے کام کر رہے ہیں۔

سوزوکی تاکیشی

جاپانی اسکالروں نے صرف ترجموں ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے مختلف اہم موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں۔ یہ بات اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ یورپ، امریکہ، چین اور روس کے اسکالروں نے زیادہ تر ترجمے ہی کے کاموں کو اہمیت دی ہے مگر جاپانی اساتذۂ ادب نے اردو ادب کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب کی اہم اصناف اور موضوعات کی تقسیم میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اس نوعیت کے کام میں سب سے زیادہ پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے دلچسپی لی ہے۔ وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط سے اردو زبان و ادب پر کام کر رہے ہیں۔ وہ مختلف اصناف پر کئی گرانقدر مقالے تحریر کر چکے ہیں۔ اردو افسانے کا ارتقاء۔ اردو ناول کا ارتقاء۔ اردو بائیوگرافی کا ارتقاء۔ اردو ڈرامے کا ارتقاء۔ اردو غزل کا ارتقاء۔ پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے اس کے علاوہ جن دوسرے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے وہ یہ ہیں: اردو ادب اور میں، پاکستان کا ادب، پاکستانی اور اظہار کی آزادی، کلاسیکی اردو شعراء کی آمدنی۔ خدیجہ مستور کا فن (خدیجہ مستور کے ۹ افسانوں کا ترجمہ بھی) کرشن چندر کی تصانیف۔ علی عباس حسینی کی تصانیف۔ غالب: حیات اور کلام۔ قلی قطب شاہ: حیات و کلام۔ ولی: حیات و کلام۔ منٹو اور احمد ندیم قاسمی کی کہانیاں ترجمہ کر کے شائع کی ہیں۔ گزشتہ دہائی میں سب سے زیادہ کام افسانوی ادب پر ہوا ہے۔ اس کام کو زیادہ مستحکم، مربوط اور بامعنی بنانے کے لئے ایک خاص منصوبے کے تحت کسی ایک افسانہ نگار کی کہانیاں ایک ہی جلد میں شائع کی گئی ہیں اور اس کام کا آغاز پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے کیا تھا۔ تراجم کی اشاعت کے لئے ایک کتابی سلسلہ 'اردو ادب' کے نام سے جاری ہے۔ ہر سال اس سلسلے کا ایک شمارہ ضرور شائع ہوتا ہے اور یہ کام پروفیسر سوزوکی تاکیشی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ (ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضمون: "جاپان میں اردو" سے مندرجہ بالا لوازمہ ماخوذ ہے۔)

رحمان بیردی محمد جان

ازبکستان

ازبکستان میں اردو سے متعلق باتیں ادھوری ہوں گی اگر ایک شخص کا ذکر نہ کیا جائے کیوں کہ ان کے نام کے بغیر ازبکستان میں اردو دانی کا تصور ناممکن ہے۔ یہ نام ہے اردو زبان و ادب کے روح رواں استاد رحمان بیردی محمد جان کا۔ ازبکستان میں جتنے بھی اردو جاننے والے ملیں گے وہ ان کے براہ راست تربیت یافتہ شاگرد ہوں گے یا پھر ان کے شاگردوں کے شاگرد ہوں گے۔ (میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی رحمان بیردی سے تعلیم حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی) لیکن افسوس کہ گزشتہ سال وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ازبکستان میں اردو زبان و ادب کے اس شیدائی نے بے شمار کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ اردو قواعد پر مقالے۔ غالب، اقبال، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر اور دوسرے ادیبوں کی تخلیقات کے تراجم۔ پھر روسی، ازبک، قازق، تاجک اور قرغیز مصنفین کی تخلیقات کے اردو میں ترجمے ان کی کوششوں کے ثمر تھے۔

انصار الدین ابراہیم

معروف ازبک محقق انصار الدین ابراہیم کا مرتب کردہ اردو ازبک مشترک الفاظ کا لغت ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۶۸ صفحات کے اس لغت میں اردو اور ازبک کے ۲۰۰۷ مشترک الفاظ پیش کئے گئے ہیں۔ دیباچہ میں مرتب لکھتے ہیں کہ اس لغت میں شامل الفاظ کو تین گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ الفاظ آتے ہیں جن کے معنی دونوں زبانوں میں ایک یا قریب قریب ایک جیسے ہیں۔ دوسرے گروپ کے الفاظ میں تلفظ یا املا میں معمولی سا فرق ہے۔ تیسرے گروپ میں وہ الفاظ ہیں جن کی آوازیں یکساں لیکن معنی میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ انصار الدین ابراہیم مزید لکھتے ہیں کہ دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ بنیادی طور پر عربی فارسی الفاظ ہیں لیکن ان کے ساتھ اردو میں ازبک ترکی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ (خال مرزائف تاش مرزا کے مضمون

("ازبکستان میں اردو" سے ایک اقتباس)

ڈاکٹر شوکت بولو

ترکی

انقرہ یونیورسٹی (ترکی) میں قائم شعبۂ اردو زبان و ادب کی کامیابی اور ترقی میں زیادہ تر حصہ شعبے کے نگراں ڈاکٹر شوکت بولو کا ہے جو ۱۹۶۴ء سے اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ وہ ترک ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں پانچ سال زیر تعلیم رہ چکے ہیں۔ انھیں دمشق اور بغداد میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ایم۔اے اسلامیات اور ایم۔اے عربی، پنجاب یونیورسٹی سے کیا لیکن پی ایچ ڈی انقرہ یونیورسٹی سے کیا۔ مقالے کا عنوان تھا اردو نثر کا زریں دور (عہد سر سید) ڈاکٹر صاحب موصوف نے اردو زبان و ادب کے سلسلے میں بڑا وقیع کام کیا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے تاہم چند ایک اہم کام یوں ہیں: بال جبریل کا ترکی میں منظوم ترجمہ اور اس پر دو سو صفحات پر مشتمل مقدمہ جس میں علامہ اقبال کی زندگی اور فکر پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی معروف کتاب 'الکلام' کا ترکی میں ترجمہ اور اس پر حاشیے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب 'اقبال کامل' کا ترکی میں ترجمہ۔ رام بابو سکسینہ کی 'تاریخ ادب اردو' کا ترجمہ۔ حامد حسن قادری کی ضخیم تصنیف 'داستان نثر اردو' کا ترجمہ۔ شیخ اکرام مرحوم کی تین مشہور تصانیف آب کوثر، موج کوثر اور رود کوثر کے تراجم۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب 'آج کا اردو ادب' اور مولانا عبدالرحمٰن مصباح الدین کی تصنیف "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" کا ترجمہ۔ افضل اقبال کی تصنیف "محمد علی جوہر" کا ترجمہ علمی و ادبی کتابوں کے علاوہ بہت سی تاریخی و سوانحی کتب کو بھی ترکی میں منتقل کیا۔ زبان کیا ہے از پروفیسر خلیل صدیقی۔ منٹو کی بیس کہانیاں۔ ڈاکٹر شوکت بولو اس وقت ایک نہایت مبسوط اور ضخیم اردو ترکی لغت ترتیب دے رہے ہیں جو ان کی زندگی کا سب سے اہم کام ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو افعال پر ایک کتاب مرتب کی ہے۔

ایرکن ترکمان بے

سلجوق یونیورسٹی قونیہ کا شعبۂ اردو ایک ترقی یافتہ شعبہ ہے۔ اس کا قیام و دوام شعبے کے چیرمین پروفیسر ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ ایرکن ترکمان بے ایک نامور محقق اور نقاد ہیں اور ترکی میں اردو زبان و ادب کے پہلے اور اب تک واحد ترک پروفیسر ہیں۔ پاک و ہند کے مقتدر جریدوں میں ان کے تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا رومی پر ان کی ایک کتاب نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ اس طرح اردو ادب میں شاعری کا ارتقا ان کی ایک اہم کتاب ہے اس میں انھوں نے قلی قطب شاہ سے لے کر افسر ساجد تک کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے اور اشعار کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو گرامر پر بھی ایک کتاب ترکی زبان میں لکھی ہے جو بہت مفید ہے۔ ترکی اور اردو کا تعلق، اردو میں ترکی الفاظ، اردو میں ترکی عناصر۔ سجاد حیدر یلدرم کے ترکی سے اردو میں تراجم وغیرہ جیسے عنوانات پر ان کے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ (ترکی میں اردو از ڈاکٹر اے۔ بی اشرف سے ماخوذ)

کم یانگ کیو۔ جنگ جان گپ

جنوبی کوریا

کوریا کی نئی نسل دنیا کی مختلف زبانوں کی تحصیل کا شوق بھی رکھتی ہے اور یہ ان کی عملی ضرورت کا ایک حصہ ہے چنانچہ وہاں کے طلبہ و طالبات پاک و ہند کی زبانیں سیکھنے پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں کوریا کے دو طلباء نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ کم یانگ کیو نے اردو لسانیات میں اور جنگ جان گپ نے اردو ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ یہ دونوں طلبہ دراصل سیول میں اساتذہ کا کام بھی کر رہے ہیں اور انھیں کے ذریعے سیول یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کیا جا رہا ہے تاکہ مقامی طور پر اردو کی تدریس کا کام ہو سکے۔ کم یانگ کیو نے پروفیسر سحر انصاری کی نگرانی اور مشوروں سے کوریائی شاعری پر ایک سیر حاصل مقالہ بھی تحریر کیا ہے اس میں کوریائی شاعری کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں وہ اردو میں کوریائی زبان سے براہ راست ترجموں کی پہلی مثال ہیں۔ کوریائی شاعری کے تراجم کے حوالے سے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب 'خاموشی کی آواز' (Sound of Silence) بھی خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ جس میں پاکستان میں جنوبی کوریا کے سفیر اور نامور شاعر ڈاکٹر چانگ سو کو کی منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ کم یونگ کیو 'مشرق بعید میں اردو' کے زیر عنوان ڈاکٹر یونس حسنی کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں اور جنگ جان گپ، منٹو کی افسانہ نگاری پر ڈاکٹر ظفر اقبال کی نگرانی میں ایم فل کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ کم یانگ کیو اور جنگ جان گپ، کوریائی اردو، اردو کوریائی لغت کی ترتیب میں بھی مصروف ہیں اور اپنی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لئے نصاب اور نصابی کتب بھی مرتب کر رہے ہیں (جنوبی کوریا میں اردو۔ از سحر انصاری)

دیو ندر راج اپادھیائے

نیپال

جنوبی ایشیا کے ملکوں کی علاقائی تعاون کی تنظیم 'سارک' کے قیام سے نیپال میں اردو کو فروغ حاصل ہوا ہے کیوں کہ اردو واحد زبان ہے جو ان ملکوں کے درمیان قریبی تعاون اور رابطے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ تری بھون یونیورسٹی شعبۂ اردو کے قیام کے بعد نیپال کو اردو کے قریب تر لانے کی شعوری کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں "انجمن ترقی اردو نیپالی زبان و ادب" کام کر رہی ہے جس کا اہم مقصد دونوں زبانوں کے اعلیٰ ادب کو تراجم کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف کرانا ہے۔ نیپال کے ممتاز ادیب و شاعر دیو ندر راج اپادھیائے نے جو اردو ادب کا نہایت شستہ ذوق رکھتے ہیں، فیض احمد فیض کے منتخب کلام کا نیپالی زبان میں ترجمہ کیا۔ وہ میر، غالب اور اقبال کے کلام کے مترجم بھی ہیں۔ ایک انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ انھیں اردو کے ان عظیم المرتبت شعراء کے کلام کا نیپالی زبان میں ترجمہ کرنے کا خیال کیسے آیا تو جناب اپادھیائے نے نہایت شستہ اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: "مجھے اردو زبان نے بے حد متاثر کیا ہے اس لئے میں نے سوچا کہ ہماری سب سے قریبی زبان اردو ہے جو اپنے پس منظر اور لفظ و معنی کے اعتبار سے

بت اہم ہے لہذا اس کے کچھ شعرا کے کلام کا ترجمہ کر کے نیپالی عوام تک پہنچایا جائے تاکہ نیپالی پڑھنے لکھنے والے اردو زبان کی گہرائی اور گیرائی سے آگاہ ہو سکیں۔ انھوں نے اردو کو ایک سمندر سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کے خیال میں اردو زبان ایک سمندر ہے اور دیگر زبانیں ایک دریا ہیں جو اس سمندر میں آکر گرتی ہیں۔ دیوندر راج اپادھیائے نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ ان کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی زبانیں ہیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں اور وہ ہیں فرانسیسی اور اردو۔ (نیپال میں اردو از متین فکری سے ایک اقتباس)

ڈاکٹر احسان حقی

شام

عرب دنیا کی سب سے عظیم اردو داں شخصیت شام میں ہو گزری ہے۔ ڈاکٹر احسان حقی جن کا انتقال تقریباً ۸۶ سال کی عمر میں ۲۹ جولائی ۱۹۹۳ء کو دمشق میں ہوا۔ اس صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں برصغیر آئے اور علی گڑھ یونیورسٹی میں فرانسیسی زبان کی تدریس پر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کی مصاحبی بھی کی اور لاہور میں قائم معارف اسلامیہ کے سرگرم رکن بھی رہے۔ اردو بڑی روانی سے بولتے تھے۔ حقی صاحب کے نہایت شستہ اور بہ محاورہ اردو میں لکھے گئے کئی خطوط ان کے پاکستانی مداحوں کے پاس محفوظ ہیں۔ عربی زبان میں پاکستان پر مستند ترین کتاب انھیں کی مولفہ ہے۔ اس کے علاوہ کشمیری مسلمانوں پر ان کی تصنیف اس موضوع پر عربی زبان میں لکھی جانے والی واحد کتاب ہے۔ منو سمرتی کا عربی میں ترجمہ۔ ('شام میں اردو' از توحید احمد سے ایک اقتباس)

مریم سلگانک

روس

ماسکو یونیورسٹی کی ایک بزرگ معلمہ اور اردو شناس جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ سوویت زمانے میں ادیبوں کے "غیر ملکی کمیشن" کی سابق کارکن مریم سلگانک ہیں۔ غالباً بہت سارے اہل اردو اس نام سے واقف ہوں گے کیوں کہ 'سر وادیٔ سینا' کا فیض احمد فیض نے مریم سلگانک کے نام انتساب کیا تھا۔ موصوفہ نے روس میں "میدان اردو" میں بہت کارنامے سر انجام دیے۔ اور یہ مریم سلگانک ہی ہیں جنھوں نے درحقیقت روسی قارئین سے فیض احمد فیض کا تعارف کروایا۔ انھوں نے اردو سے روسی میں بہترین ترجمے کیے جن میں فیض کے کلام اور کرشن چندر کی تصانیف کے تراجم سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ تراجم کے علاوہ مریم سلگانک رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں نہایت دلچسپ اور معلوماتی مضامین لکھتی رہی ہیں جن میں قارئین کو برصغیر ہندوپاک کی ادبیاتی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں بتاتی رہی ہیں۔ اب جب نہ سوویت یونین نہ ہی ادیبوں کی یونین رہی (اب اس کی جگہ نئی انجمنوں نے لے لی ہے) مریم سلگانک، علم شرقیات کے انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ ادب میں آگئی ہیں۔

ڈاکٹر وی جی قلیمو منوف

روس کے اردو شناس ماہرین میں سر فہرست ڈاکٹر وی جی قلیمو منوف ہیں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک غیر ملکی زبانوں کے پبلشنگ ہاؤس ماسکو میں شعبۂ اردو کے چیف ایڈیٹر رہے اور ۱۹۶۰ء سے اب تک ماسکو اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ برائے بین الاقوامی تعلقات میں اردو پڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے "سوویت اصطلاحات کے اردو تراجم کے مسائل" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور اصطلاحات و زبان دانی کے حوالے سے ان کا علم گہری بصیرت کا حامل ہے۔ روس میں اردو کی تدریس کے حوالے سے انھوں نے بہت کچھ لکھا جو مقالات کی صورت میں ہندوپاک کے رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے اردو کے طلباء کے لئے کئی درسی کتابیں بھی مرتب کیں۔ ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والا ان کا درسی روسی اردو لغت اسی اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے تعلیمی نقطۂ نظر سے مرتب کیا ہے۔

Prof. Alexey Sukhochov

روس کے شرقیات کے مرکز ماسکو کے علم شرقیات کے ادارے میں اردو کے مطالعے میں کئی ماہرین ادبیات معروف ہیں۔ سرفہرست ایشیائی ادب کے شعبے کے سابق سربراہ Prof. Alexey Sukhochov ہیں۔ ان کا دائرۂ مطالعہ کافی وسیع ہے۔ وہ بجا طور پر آج کے اردو [illegible]سی محققین کے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ موصوف کی کتاب "داستان سے ناول تک" خاص طور پر دلچسپ اور اہم ہے۔ اس میں انیسویں صدی کی اردو نثر کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں کے کردار اور ان کی سرگرمیوں کو بالکل نئے زاویے سے دکھایا گیا ہے اور ان کی سرگرمیوں کے مثبت نتائج پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مخدوم کی شاعری کے روسی ترجمے کے ساتھ پروفیسر موصوف کی کتاب "مخدوم محی الدین" بھی شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ روسی شناس اسامہ فاروقی نے کیا اور یہ کتاب حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ پروفیسر Sukhochov اردو ادب پر متعدد مضامین، مقالوں، تبصروں اور دیباچوں وغیرہ کے بھی مصنف ہیں۔

Nataliya Prigarina

ڈاکٹر Nataliya Prigarina روس میں معروف ترین اقبال شناس ہیں۔ اقبال اور ان کی تخلیقات۔ اقبال کے کلام کی خصوصیات پر ان کی دو کتابیں 'اقبال اور عالمی ادب میں ان کا مقام' سمجھنے کے لئے نہایت اہم ہیں۔ فیض احمد فیض مرحوم نے ڈاکٹر N. Prigarina کے کام کو بہت سراہا۔ ان کی کتابوں کی تعریف کی اور کہا کہ موصوفہ نے اقبال کے کلام کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھا۔ افسوس کہ ابھی تک یہ کتابیں صرف روسی قارئین ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر N. Prigarina فارسی زبان کی ماہر ہیں۔ ان کو اردو کا بھی علم ہے۔ ان کے مطالعے کا بنیادی موضوع برصغیر ہندوپاک میں فارسی زبان کا ادب ہے۔ مرزا غالب پر موصوفہ کی کتاب بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ ۱۹۹۵ء میں موصوفہ کا ایک اور تحقیقی مطالعہ مکمل ہوا جسے روس میں علم شرقیات کے میدان میں ایک علمی و ادبی کارنامہ کہنے میں شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ کتاب کا عنوان ہے: 'فارسی شاعری میں سبک ہندی'

ANNA SUVOROVA

علم شرقیات کے ماسکو انسٹی ٹیوٹ کی ایک اور نہایت لائق و قابل

اسکالر پروفیسر Anna Suvorova ہیں جو کچھ عرصے سے شعبۂ ادب کی سربراہ رہی ہیں۔ ان کا دائرۂ مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ ادب، مصوری اور تھیٹر کی بھی ماہر ہیں۔ موصوفہ نے داستانوں پر ایک گہرا مطالعہ شائع کیا۔ اردو ڈرامے پر ان کی دو کتابیں نکل چکی ہیں جن میں اردو ڈرامہ اور تھیٹر کا ان کا اپنا دلچسپ نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو مثنوی پر موصوفہ کی کتاب ۱۹۹۲ء میں نکلی ہے۔ "ابتدائی عشقیہ اردو مثنوی"، اس کی فنی بنیادوں اور خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ادبی صنف میں۔ اس میں عشق مجازی اور عشق حقیقی اور کئی دوسرے اہم اور روسی قاری کے لئے نہایت دلچسپ مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں A. Suvorova کی لکھنؤ کی تہذیب و تمدن پر ایک اور کتاب شائع ہوئی جس میں پرانے لکھنؤ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی رنگا رنگ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اردو تہذیب کی تاریخ پر یہ کتاب علمی اہمیت بھی رکھتی ہے اور بہت پرکشش انداز میں بھی لکھی گئی ہے۔

NIKOLAI GLEBOV

روس میں اردو شناسی اور خاص کر اردو ادب کے میدان میں ایک اور نمایاں نام Nikolai Glebov کا ہے۔ موصوف ماسکو انسٹی ٹیوٹ میں ایک عرصے سے اردو ادب پر کام کر رہے ہیں۔ پروفیسر A. Suckochov سے مل کر انھوں نے روس میں اردو ادب کی تاریخ پر پہلی کتاب لکھی جس میں امیر خسرو دہلوی سے لے کر دورِ حاضر تک اردو ادب کے ارتقاء اور اس کے ہر دور پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے غالب، نظیر اکبر آبادی اور دوسرے شعراء پر مقالے اور مضامین لکھے۔ آج کل ان کی نگرانی میں ایشیائی انسائیکلوپیڈیا کے لئے کام ہو رہا ہے۔ اس کی سات جلدیں ہوں گی۔ ایک جلد ادب سے متعلق ہوگی۔ اس کے لئے وہ اردو ادب سے متعلق مواد تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ سب اردو شناس ان کی مدد کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا

محترمہ لدمیلا روس میں اردو کی نامور اسکالر ہیں۔ انھوں نے اکاڈمی آف سائنس یو ایس ایس آر سے ۱۹۸۷ء میں اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی۔ اردو اور روسی میں تقریباً ۲۰ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ماسکو یونیورسٹی میں پڑھاتی رہی ہیں۔ ماسکو ریڈیو سے منسلک رہی ہیں اور اس وقت ماسکو میں ادارۂ مشرقی علوم میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ان کے کام کا بنیادی موضوع اردو شاعری کا مطالعہ ہے۔ الطاف حسین حالی اور علی گڑھ تحریک کے زمانے کے ادب پر کتاب لکھی۔ کلاسیکی اردو شاعری کے ساتھ دورِ حاضرہ کے شعراء کے کلام پر بھی کام کیا ہے۔ درج بالا نوٹ محترمہ ڈاکٹر لدمیلا کے طویل مضمون "روس میں اردو" سے ماخوذ ہے۔

انّے ماری شمل

جرمنی

غالب اور اقبال کے تراجم کا کام بالخصوص انے ماری شمل (Anne-Marie Schimmel) نے کیا ہے جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں جانے سے پہلے بون یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ جرمنی واپس آچکی ہیں اور بون میں رہائش پذیر ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے غالب کے فارسی اور اردو کلام کے منتخبات جرمن شائع کئے۔ اقبال پر ان کا کام سب سے زیادہ ہے۔ البتہ تراجم کا بڑا حصہ فارسی کلام سے کیا گیا ہے چنانچہ جاوید نامہ اور پیامِ مشرق کے مکمل فارسی اور اردو کلام میں سے چیدہ چیدہ نظموں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ اقبال پر ان کی تصانیف کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ اس کے بیان کے لئے ایک پورا مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔ انے ماری شمل نے پاکستان اور وہاں کی زبانوں کے ادب کو نہ صرف جرمنی میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں متعارف کروانے کا کام غیر معمولی لگن اور کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی اس سلسلے کی بہت سی تصانیف چونکہ انگریزی زبان میں ہیں اس لئے ان کو یہاں پر علیحدہ علیحدہ پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ راقم الحروف نے ۱۹۸۶ء میں انے ماری شمل کے تعاون سے پاکستانی ادب کے تراجم پر ایک کتاب شائع کی تھی جس میں اردو کے علاوہ سندھی، پنجابی، پشتو اور ہندکو کے ادب پاروں کو شامل کیا گیا تھا۔ اس مجموعے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سارے تراجم براہِ راست جرمن زبان میں کئے گئے ہیں۔ ('جرمنی میں اردو' از منیر الدین احمد سے ماخوذ)

ڈاکٹر الکزنڈر بوسانی

اطالیہ

ڈاکٹر پروفیسر الکزنڈر بوسانی نے علامہ اقبال کی تصنیف جاوید نامہ کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۵۳ء میں پروفیسر ڈاکٹر الکزنڈر بوسانی، ہسپانوی پروفیسر M. Pareja، جرمن پروفیسر L. Hertinge کی مرتب کردہ اردو ادب کی مختصر تاریخ، روم سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ضمیمے کے طور پر اردو کی چند نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ اسی زمانے میں پروفیسر بوسانی نے اقبال کی تصانیف بانگ درا، زبور عجم، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز' سے منتخب کردہ نظموں کے تراجم پر مشتمل ایک انتھالوجی روم سے شائع کی۔ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر بوسانی کے دو مضامین 'اقبال کی فلسفیانہ شاعری میں ابلیس' اور 'انجمن ترقی اردو کراچی کی تاریخ اور کارگزاری' اطالوی زبان میں شائع ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر بوسانی کی تصنیف 'پاکستانی ادب کی تاریخ' میلان میں شائع ہوئی اسی سال پروفیسر بوسانی کا مرزا غالب کے فن پر معرکہ آرا مضمون (۲۸ صفحات) جرمن مجلے Der Islam کے شمارہ نمبر ۳۴۰ میں شائع ہوا۔ ('اطالیہ میں اردو' از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے ماخوذ)

ANDRE GUIMBRETIERE

فرانس

گارسیں دتاسی کے بعد فرانس میں اردو کے حوالے سے ایک اہم مستشرق آندرے گیمبرے تیر ہیں۔ ۱۹۵۹ء کے آس پاس اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے پیرس کے مدرسۃ الالسنہ شرقیہ میں ان کا تقرر ہوا۔ وہ پیرس میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں فرنچ کلچرل سینٹر کی ڈائرکٹرشپ کے دوران انھوں نے حسن عسکری سے اردو سیکھی اور اس کے بعد انھیں اردو ادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ فرانسیسی زبان میں ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زبان اور علامت کے موضوع سے انھیں گہری دلچسپی رہی ہے۔ ان

کے کئی تنقیدی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو فرانسیسی زبان میں ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری پر ان کے مضامین اور نظموں کے فرانسیسی ترجمے ان کا اہم کام ہے۔ علامہ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ پر ان کا تنقیدی مضمون سوچ کے نئے زاویے مہیا کرتا ہے۔ علامہ اقبال کی فلسفیانہ اور جمالیاتی فکر پر ان کا فرانسیسی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ بہت اہم ہے۔ اب وہ زبان ثقافت شرقیہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

ALAIN DESOULIERES

الین دیزولیئر، پیرس کے مدرسۃ السنہ شرقیہ میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں۔ دس سال اسلام آباد (پاکستان) میں رہے اور اردو میں مہارت حاصل کی۔ وہ لسانیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہسپانوی اور پرتگیزی بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے انڈین اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔ اردو زبان و ادب اور برصغیر کے مسلمانوں سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ بڑی روانی سے اردو بولتے ہیں۔ اردو زبان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ "اردو پوری دنیا کی ایک اہم زبان ہے۔ اس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مقامیت نہیں ہے یعنی یہ کسی خاص علاقے یا افراد کی زبان نہیں بلکہ یہ بولنے والوں کی نہیں، استعمال کرنے والوں کی زبان ہے۔ اسے اسی زاویے سے جانچنا چاہیے۔ (درج بالا لوازمہ 'فرانس میں اردو' از ڈاکٹر لئیق بابری اور اخبار اردو مطبوعہ ۱۹۹۶ء سے ماخوذ ہے۔)

پروفیسر یان مارک

جمہوریہ چیک

چیکوسلواکیہ کے ایک اہم مستشرق پروفیسر ونسنس پورزکا Vincenc Porcika جو ہندی اور اردو زبانوں کی تدریس سے تعلق رکھتے تھے اور گرامر اور دیگر لسانی مسائل کا گہرا مطالعہ ہے۔ ان کے کئی شاگردوں میں سے ایک پروفیسر یان مارک Jan Marck کا نام سر فہرست ہے۔ یان مارک (ولادت: ۱۹۳۱ء) مشرقی یورپ کے جنوبی ایشیاء کے شعبے میں محقق کے عہدے پر فائز تھے۔ آج کل وہ چارلز یونیورسٹی (پراگ) کے شعبۂ ہندوستانیات اردو فارسی زبانوں کے معلم ہیں۔ موصوف نے ۱۹۵۵ء میں اقبال کے شعری مجموعے "ضرب کلیم" کے تجزیے پر ایک مقالہ پیش کیا اور اس کے بعد یونیورسٹی کی اعلیٰ سند کے لئے اقبال کی حیات اور تصنیفات پر ایک گراں قدر مقالہ پیش کیا۔ یان مارک، فارسی تصنیفات کی تاریخ پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو فارسی اور تاجک ادبیات کی تاریخ مولفہ یان ریپکا (Jan Rypka) میں شامل ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں (۱۹۶۷ء) شائع ہوئی غالب پر پروفیسر یان مارک کا ایک مضمون "اردوئے معلیٰ" (دہلی) کے غالب نمبر (فروری ۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا اقصد کرشن چندر کی پورے چاند کی رات اور دیگر افسانوں کا ترجمہ۔ فیض احمد فیض کی نقش فریادی، دست صبا اور زنداں نامہ۔ اقبال کی پیام مشرق اور بانگ درا۔ میر امن دہلوی کی 'باغ و بہار' ('جمہوریہ چیک میں اردو' از ڈاکٹر آغا افتخار حسین سے ماخوذ)

ارسلہ روتھن ڈبس

سوئٹزرلینڈ

سوئٹزرلینڈ میں اردو کا کوئی بہت زیادہ چرچا تو نہیں ہے پھر بھی برن یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے میں ایم۔ اے کی سطح پر اردو تدریس کا انتظام ہے۔ اس شعبے میں چار زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی اور اردو۔ اس شعبے سے ارسلہ روتھن ڈبس ایک طویل عرصے تک اردو پڑھانے کے بعد اب ریٹائر ہو چکی ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی دور اور دور حاضر کے اردو ادب سے شعراء اور نثر نگاروں کی تخلیقات کا انتخاب کر کے اسے جرمن زبان میں ترجمہ کر کے ۶۰۵ صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی تھی۔ ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کا نام Allah's Indian Garden ہے جس میں ولی دکنی سے لے کر جوش، فیض اور احمد ندیم قاسمی تک کئی اہم شعراء کے کلام کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں انیسویں اور بیسویں صدی کی نثر کے تراجم بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کو جرمن زبان میں "اردو ادب کی تاریخ" بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر انے مری شمل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ: "ارسلہ روتھن نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تراجم کا شمار انتہائی عمدہ تراجم میں ہوتا ہے اور زبانوں کے بعد کے باوجود یہ پڑھنے والے کو تخلیق کی اصل فضا تک لے جاتے ہیں۔" ('سوئٹزرلینڈز میں اردو' از کرین ریچر لمان سے اقتباس۔ محترمہ کرین ریچر لمان ان دنوں محمد منشایاد کے افسانوں پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔)

حرف مکرر

شاعر کے محدود صفحات کے پیش نظر صرف چند ایک مستشرقین اردو کا مختصر احوال ہی دیا جا رہا ہے۔ ابھی یورپ، امریکہ، افریقہ، ایشیا وغیرہ میں اور بھی غیر ملکی اردو داں ہیں جو درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اور اپنی اپنی زبانوں میں اردو شعر و ادب کو منتقل کر رہے ہیں۔ تاریخ استشراق کے تحت ہندوپاک اور دیگر ممالک میں کام تو ہوا ہے لیکن اس موضوع پر ایک مکمل جدید تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے بالکل نئے انداز اور نئے مسائل ہیں اور گزشتہ ۲۵، ۳۰ سالوں میں اردو کو جو فروغ حاصل ہوا ہے اس کے ایک نئے تجزیے کی ضرورت ہے۔ جو علمی و ادبی کام ہو رہے ہیں ان کی یکجائی اور جائزے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص دنیا کے تمام بڑے شہروں کی یونیورسٹیوں میں شعبۂ ہندی کے ساتھ تال میل سے ہندوپاک سے باہر یہ دونوں زبانیں مل کر خاصہ کام کر سکتی ہیں۔ بڑی زبانوں کے ساتھ اردو لغت ایک بڑا تحقیقی موضوع ہے۔ اسی طرح اردو ہندی مشترک گرامر جو مستشرقین اردو نے ترتیب دی ہیں انھیں بھی موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ جدید مستشرقین اردو کو کلاسیکی ادب کے ساتھ جدید اردو ادب میں ہندوستان کے جدید اردو ادب کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اردو کی نئی بستیوں میں جو علمی و ادبی کام ہو رہے ہیں ان کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ ان بستیوں کی نمائندگی کے لئے کوئی سہ ماہی یا ششماہی ادبی رسالہ یا کم از کم ہندوپاک کے ادبی رسائل میں قابل ذکر لوگوں کے انٹرویوز اور گوشے آنا ضروری ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے روابط میں بہت کمزور ہیں اور اچھے لوگوں اور اچھے کاموں کو 'خوشبو' بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ رسالہ شاعر کو البتہ ہم 'خوشبو' بنانے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ (الف الف)

اردو کی نئی بستیوں سے ــــــ

مرتبہ : افتخار امام صدیقی

ذیل میں اردو کی نئی بستیوں سے علمی وادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں سے بعض کا ذکر کیا جارہا ہے۔ کچھ کتب ورسائل جو انگریزی اور اردو میں اردو کی نئی بستیوں کے شعروادب کے بارے میں ہیں۔ بعض اشخاص، ادبی انجمنیں، ادارے۔ کچھ دلچسپ اطلاعات واعدادوشمار۔ یہ سارا لوازمہ بہت سرسری سا ہے لیکن شاعر کے مجوزہ اردو کی 'نئی بستیاں نمبر' کے غیر معمولی خاکے کا یہ ہلکا سا اشاریہ بھی ہے کہ شاعر کے خاص نمبر میں ان امور پر بطور خاص تفصیل سے لکھا جائے گا۔ اردو کی نئی بستیاں تمام براعظموں میں بسی ہوئی ہیں اور اردو کے عشاق بے شمار ہیں جو اپنی اپنی سطح پر زبان وادب کی ترویج واشاعت میں معروف ہیں۔ ابتدائی مطالعے کے طور پر جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے، یہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ قابل ذکر اشخاص اور ان کے کاروافکار ہو سکتے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے اردو خدمت گزاروں سے التماس ہے کہ وہ ہماری معلومات میں اضافہ فرمائیں۔ (ادارہ)

✧

● اردو کی نئی بستیوں میں بسے ہوئے ہندوپاک کے قلم کاروں نے اردو اور انگریزی میں ان بستیوں سے متعلق، وہاں کے قلم کاروں پر یا پھر اہم اور مقتدر شعرا کا انتخاب، گاہے گاہے شائع کیا ہے۔ اردو ادب کے بارے میں انگریزی میں جو کتب ورسائل شائع ہوئے یا ہورہے ہیں ان سب کی فہرست بہت طویل ہے پھر بھی چند ایک نام ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔ یہ حالیہ برسوں کی اشاعتیں ہیں۔

● An Anthology of Modern Urdu Poetry

اس کتاب میں بیدار بخت اور کیتھلین گرانٹ نے اردو کے کئی اہم شعرا کے انگریزی تراجم پیش کئے ہیں۔

● Contemporary Urdu Poetry - A study in the Historical Prospective.

عبدالقوی ضیاء نے اس مختصر کتاب میں پاک وہند میں اردو کے ۲۵ برسوں کا جائزہ لیا ہے۔

● Across Continents (A Review of Urdu Language and Literature in Canada)

اس کتاب کو ولی عالم شاہین، ڈاکٹر انور نسیم اور اظہار مرزا نے مشترکہ طور پر ترتیب دیا تھا۔ اس کتاب میں ولی عالم شاہین کے دیباچے اور مضمون۔ ڈاکٹر انور نسیم کے خصوصی تجزیے، مظفر اقبال، عبدالقوی ضیاء اور راشدہ مرزا کے مضامین کے علاوہ دیگر کئی ایک مضامین بھی شامل ہیں۔

● Annual of Urdu Studies

چودھری محمد نعیم نے اس نام سے ایک سالانہ رسالہ جاری کیا تھا۔ اس میں تراجم، مضامین، تبصرے، خبریں اور کتابیات ہوتی تھیں ان کی ادارت میں ۶ شمارے شائع ہوئے۔ اب یہ ضخیم رسالہ محمد عمر میمن کی ادارت میں شائع ہورہا ہے اور اب تک کئی ضخیم شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

● An Anthology of Modern Urdu Poetry

محمد حفظ الکبیر قریشی نے اپنی اس کتاب میں فیض احمد فیض سے افضل امام تک ۲۸ جدید شعرا کی منتخب نظموں، غزلوں کو انگریزی میں Transcreate کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انگریزی ترجمے کے ساتھ اصل اردو متن بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں ٹورنٹو سے شائع ہوئی تھی۔

● Literary Encounters

خالد سہیل نے مغرب میں رہنے والے اردو کے چند مشاہیر قلم کاروں سے گاہے گاہے انٹرویوز کئے تھے۔ ۱۲ قلم کاروں سے کئے گئے یہ انٹرویوز روایتی مکالمے سے بہت مختلف ہیں۔ خالد سہیل نے اپنے سوال جدید نفسیاتی طریقۂ کلام کے تحت کئے ہیں۔ اس طرح تخلیقی پراسراریت کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کا انتخاب ہی ان انٹرویوز کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے۔

● Creativity - An Attempt to Understand

تخلیقیت کی تفہیم اور اس کے تمام پہلوؤں پر بہت تفصیل سے مقالہ بھی تحریر کیا ہے جو کتاب کے ۴۸ صفحات کو محیط ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد مقالہ ہے۔ کتاب میں اکرام بریلوی سے ضمیر الرحمان تک، ایک دلچسپ سلسلہ گفتگو کا پھیلا ہوا ہے۔ ہر انٹرویو سے قبل قلم کار کا سوانحی اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

● Vision And Envision

عبدالقوی ضیاء اردو اور انگریزی میں یکساں طور پر مضامین لکھتے ہیں۔ انگریزی میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب مغرب میں اردو شعروادب کے حوالے سے ایک اہم ترین ماخذ ہے۔ یہ محض اعدادوشمار کی کھتونی نہیں ہے بلکہ تاریخی وثقافتی شعور کے ساتھ یہ مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔ حوالہ جاتی نوعیت کی اس گرانقدر کتاب کے پورے لوازمے میں گہرائی وگیرائی ہے اور موضوع کے تمام ممکنہ مضمرات سے آگے دیکھنے کی ایک سعی بھی۔

● اردو کی نئی بستیوں میں ہندوپاک کے اور بھی مشاہیر قلم کار ہیں جو دوطرفہ تراجم کررہے ہیں اور اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت میں معروف ہیں۔ ان میں سے چند ایک نام یہ ہیں: منیرالدین احمد (جرمنی) Pakistanische Literature (جرمن) معاصر جرمن ادب، منتخب جرمن افسانہ۔ یعقوب مرزا۔ انھوں نے میر، غالب، اقبال اور فیض کا منتخب کلام انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ غزل کا ترجمہ مشکل ترین کام ہے لیکن یعقوب مرزا نے غزل ہی کے فارم میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔

نصیر احمد زبیری (Slovak Republic) براتسلاوا میں رہتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے خاموش خدمت گزار ہیں۔ کرشن چندر کی کہانی "دادر پل کے بچے" اور خواجہ احمد عباس کی کہانی "چار دل چار راہیں" کا ترجمہ سلوواک زبان میں کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی کہانی 'ہتک' کو ڈرامے کی شکل دے کر براتسلاوا کے ٹیلی ویژن پر پیش کیا جو بہت کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کے افسانے اور ناول ترجمہ کئے۔ ساتھ ہی فیض احمد فیض کی 'دست صبا'۔ اسرار الحق مجاز کی 'آہنگ'۔ ان کے علاوہ Majernik Bratislava کے اشتراک سے اردو ادب کا انتخاب Selection from Modern Urdu Literature کے عنوان سے ترتیب دیا۔ انھوں نے کئی سلوواک ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کے ترجمے اردو میں کئے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔

● ۱۹۹۲ء میں ناروے سے ۶۴۲ صفحات پر مشتمل رسالہ 'بازگشت' کا ایک ضخیم خاص نمبر شائع ہوا تھا۔ ہندوپاک سے باہر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی جس میں ہندوپاک اور اردو کی نئی بستیوں کے اہل قلم کی تخلیقات شامل کی گئی تھیں۔ اس میں معاصر نارویجین ادب کی خوبصورت جھلکیاں بھی ہیں اور تراجم بھی۔ اس کے مدیر جمشید مسرور اور معاون شاہد عمران تھے۔

● اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد یا کتابیں عموماً ہندوپاک ہی سے شائع ہوتی ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے قلم کار اپنی سہولت کے مطابق ہندوپاک میں اپنے احباب کو یا پھر پبلی شرز کو طے شدہ رقم دینے کے بعد ہر طرح کی الجھنوں اور پریشانیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اب کمپیوٹر اور 'اردو پروگرام' آجانے سے اردو کی نئی بستیوں میں بھی طباعت کا اہتمام ہونے لگا ہے۔

● ٹورنٹو (کینیڈا) سے اشفاق حسین نے 'اردو انٹرنیشنل' کے نام سے ایک خوبصورت اور خوب سیرت ادبی کتابی سلسلہ شروع کیا تھا اور جلد ہی اسے اعتبار حاصل ہو گیا تھا۔ اب یہ کتابی سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن اس کی گونج اب بھی ہے اور اشفاق حسین اس کے مکرر اجراء کی بابت غور کر رہے ہیں کہ ان پر اصرار کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔

● ولی عالم شاہین کا انگریزی جریدہ Urdu Canada ایک مختلف ادبی کاوش تھی جس کے ہر شمارے کا اردو دنیا کے سنجیدہ حلقے کو انتظار رہتا تھا۔ اب یہ سلسلہ کچھ سالوں سے منقطع ہے لیکن ولی عالم کینیڈا اور شمالی امریکہ میں اردو ادب کے فروغ کے ساتھ اردو کینیڈا کو مکرر جاری کرنے کی بابت غور کر رہے ہیں۔

● سلطانہ مہر ایک شاعرہ، ادیبہ اور صحافیہ کے طور پر خاصی شہرت رکھتی ہیں لیکن حالیہ برسوں میں بحیثیت تذکرہ نگار کے ان کی شہرتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ 'سخنور' کے عنوان سے تذکرۂ شعراء و شاعرات کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں اور بہت سلیقے سے شائع کئے گئے ہیں۔ فن کار کی تصویر، پتہ، اس کے دستخط اور عکس تحریر کے ساتھ سوالنامے کا جواب اور اس کی کوئی نظم یا غزل شامل کی گئی ہے۔ یہ سارا التزام تخلص کے اعتبار سے بہ لحاظ حروف تہجی دیا گیا ہے۔ اب سلطانہ مہر 'سخن ور' کی چوتھی جلد اور گفتنی (نثر نگاروں کا تذکرہ) کی پہلی جلد کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں سے سلطانہ مہر (امریکہ) علمی و ادبی مجاہدہ کر رہی ہیں اور پوری اردو دنیا سے قلمی تعاون کی خواستگار ہیں۔ ان کا پتہ ہے:-

Meher Book Foundation
20873, East Walnut, Canyan Rd,
Walnut - CA 91789 - (USA)

● وہ ادبی رسائل و جرائد جو اردو کی نئی بستیوں سے باہر ان بستیوں کے شعر و ادب اور ان کی علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے ہیں ان کی تعداد خاصی ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

دنیائے ادب

نوجوان صحافی اوج کمال نے کراچی (پاکستان) سے اپنی طرز کا ایک خوبصورت رسالہ جاری کیا ہے جو گزشتہ پانچ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس میں تصاویر ہیں، عالمی ثقافتی خبرنامہ ہے، انٹرویوز ہیں اردو کی نئی بستیوں اور ہندوپاک کے شعرا کی شاعری ہے۔ مشاعروں کا دلچسپ آنکھوں دیکھا حال ہے۔ یہ ایک مکمل باتصویر جدید ترتیب و تہذیب کا رسالہ اردو کی نئی بستیوں میں بے حد مقبول ہے۔ دنیائے ادب پبلی کیشنز کی جانب سے اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کی کتابوں کا اشاعتی سلسلہ بھی ہے۔ اوج کمال ایک پڑھے لکھے، باشعور اور ذہین صحافی ہیں۔ دنیائے ادب کا مستقبل تابناک ہے۔

● Monthly Dunya-e-Adab, C-B. 45 AL Falah Society, Shah Faisal Colony, Karachi - 75230 (Pak)

انشاء

ف س اعجاز کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونے والا جریدہ ماہنامہ 'انشاء' اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کی سرپرستی میں نہایت فعال ہے اس کا عالمی اردو افسانہ نمبر اور اسکینڈے نیویا نمبر اہم ماخذ ہیں۔ انشاء پبلی کیشنز کے تحت اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کی کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔ کئی اہم کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کا یہ ایک نمائندہ رسالہ ہے۔

● 6-A, Kanai Seal Street, Calcutta - 73 (W.B.)

افکار

ماہنامہ افکار (کراچی) کے مدیر صہبا لکھنوی نے اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کو سب سے پہلے ایک پلیٹ فارم دیا اور باقاعدگی کے ساتھ نہایت ہی منظم طریقے پر وہاں کے قلم کاروں کی تخلیقات کو 'افکار' میں شائع کرنا شروع کیا۔ افکار کا برطانیہ میں اردو ایڈیشن اور قلم کاروں پر خصوصی گوشے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ نئی بستیوں کے قلم کاروں کے لئے رسالہ 'افکار' یا صہبا لکھنوی (یہ ایک ہی نام ہے جس طرح چاہے کہا جائے) تخلیقی حوصلہ مندی کا استعارہ ہیں۔ اس استعارے کو دوسروں نے بعد میں خوب خوب استعمال کیا ہے اور کامیاب رہے ہیں۔

● C - 105, National Auto Plaza, Marston Road, Karachi (Pakistan)

اخبار اردو

مقتدرہ قومی زبان (پاکستان) کے تحت شائع ہونے والا ماہنامہ اخبار اردو، ایک اہم ترین علمی و فنی اور تحقیقی جریدہ ہے جو اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر شمارہ محفوظ کیا جانے والا شمارہ ہوتا ہے جس میں اردو کی نئی بستیوں کے بارے میں خاصہ معلوماتی مواد شامل رہتا ہے اور وہ تازہ ترین خبریں جو دیگر رسائل و جرائد میں نہیں ملتیں وہ 'اخبار اردو' فراہم کرتا ہے۔ دیگر رسائل و جرائد اخبار اردو ہی سے خبریں مستعار لیتے ہیں۔ اردو زبان سے متعلق فنی و تکنیکی مضامین وغیرہ کے لئے بھی 'اخبار اردو' کا کوئی ثانی نہیں۔ پہلے جمیل جالبی اور اب افتخار عارف کی ادارت میں شائع ہونے والے بڑے سائز کے ۲۸ صفحات میں سمویا جانے والا سارا لوازمہ قابل مطالعہ ہوتا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان ہی نے 'بیرونی ممالک میں اردو' جیسی گرانقدر کتاب شائع کی ہے۔

● Akhbar-e-Urdu, Muqtadra - Qaumi Zaban, Pitras Bukhari Rd, H - 8/4, Islamabad (Pakistan)

جریدہ

مشہور شاعر تاج سعید کی ادارت میں شائع ہونے والے تاریخ ساز رسالے 'جریدہ' کا ایک خصوصی شمارہ بلکہ بہت اہم خاص نمبر اردو کی نئی بستیوں کے شعر و ادب پر شائع ہوا تھا جس نے ایک اہم ماخذ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یوں بھی 'جریدہ' کے خصوصی نمبروں کی اپنی ایک منفرد روایت ہے۔ حال ہی میں ۶۰۸ صفحات پر مشتمل 'جریدہ' کا 'ٹیلی ویژن ڈرامہ نمبر' شائع ہوا ہے۔ زیتون بانو اور تاج سعید نے 'جریدہ' کے اردو کی نئی بستیوں والے خصوصی شمارے کو ایک مثالی ماخذ بنانے کی سعی کی ہے۔

●Maktaba Arzang, P.O.Box 232, Peshawar (Pak)

تخلیق

۲۵ سال سے زائد عرصے سے شائع ہونے والے ادبی جریدے تخلیق کے مدیر مشہور و معروف شاعر اظہر جاوید نے ہمیشہ ہی اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ نئے قلم کاروں کو روشناس کرواتے رہے اور اب 'خلیجی ریاستوں میں اردو' کے زیر عنوان ایک دستاویزی خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اس کا سرورق سلیمہ ہاشمی نے بنایا ہے اور اس کی تزئین عالمی شہرت یافتہ مصور اسلم کمال نے کی ہے۔ اظہر جاوید نے اس سے قبل 'تخلیق' کے عابد علی عابد نمبر کہانی نمبر اور سندھی ادب و ثقافت نمبر سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سچے تخلیق کار ہیں۔ یہ طے ہے کہ "خلیجی ریاستوں میں اردو" اظہر جاوید کا ایک مثالی تخلیقی کارنامہ ہوگا۔

●Bhagwan Street, Purani Anar Kali, Lahore (Pak)

●اردو کی نئی بستیوں میں بعض ایسے نہایت ہی غیر معمولی اشخاص بسے ہوئے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی درس و تدریس اور ادب کی ترویج و اشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اور بہت خاموشی سے زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ فہرست قدرے طویل ہے پھر بھی چند لوگوں کا ذکر اور بعض اہم اداروں کے بارے میں مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

مامون ایمن

پروفیسر مامون ایمن کو امریکہ میں اردو ادب و شاعری، صحافتی و تدریسی خدمات اور سماجی و قومی کارگزاری کے اعتراف کے طور پر اگر بابائے اردو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایم۔اے اردو (پنجاب یونیورسٹی) ایم۔اے ایجوکیشن (کولمبیا یونیورسٹی) ایم۔اے صحافت اور ایم۔اے انگریزی (نیویارک یونیورسٹی) نیویارک سٹی بورڈ آف ایجوکیشن میں انگریزی کے استاد رہے۔ موصوف وائس آف امریکہ کے اردو نامہ نگار بھی ہیں۔ بی بی سی اردو سروس اور گندھارنگ ایشیائی وی پروگرام سے بھی ان کا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے امریکہ کی تاریخ میں اولین مشاعرہ ۲۱ر اگست ۱۹۶۴ء کو منعقد کروایا۔ انھیں کی کاوشوں سے نیویارک ریاست میں ۱۹۷۸ء میں اردو کو ہائی اسکول کے درجے پر بہ حیثیت ثانوی زبان منظور کیا گیا تھا۔ مامون ایمن اردو، انگریزی اور پنجابی کے شاعر اور صحافی ہیں۔ وہ ادبی سنگم نیویارک اور ظفر زیدی کلچرل سوسائٹی نیویارک کے تاحیات سرپرست اعلیٰ۔ انڈوپاک کلچرل ایسوسی ایشن امریکہ کے مشیر اعلیٰ اور انٹرنیشنل اردو فورم امریکہ کے بانی چیئرمین بھی ہیں۔ ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام گزشتہ پندرہ سال سے عالمی مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں اور اردو کی مشہور شاعرہ حمیرا رحمان، نوجوان شاعر رئیس وارثی ان کے دست راست ہیں۔ (معرفت: حمیرا رحمان اور رئیس وارثی ان کے پتے شعری حصے میں درج ہیں۔)

خواجہ ریاض الدین عطش

شمالی امریکہ میں اردو قلم کاروں کی نئی نسل کے درمیان ایک اہم شخصیت ہیں۔ نئے شعراء آپ ہی سے استفادہ کرتے ہیں۔ آپ کے بہت سارے شاگرد ہیں۔ زبان اور فن شاعری کی تدریس کے لئے خواجہ صاحب بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ادب اور فن شاعری پر دسترس ہے۔

نیر جہاں

اردو مرکز انٹرنیشنل اور نیر جہاں، ایک ہی نام ہے۔ شمالی امریکہ اور کینیڈا ہی میں نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنے عالمی مشاعروں اور حسن انتظام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ نہایت ہی باخبر خاتون ہیں۔ ۱۹۹۸ء سے اردو مرکز انٹرنیشنل کی جانب سے ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے اور پہلا ایوارڈ عبد الرحمٰن صدیقی (مدیر: اردو لنک۔ امریکہ) کو ان کے شعری مجموعے 'نغمۂ زنجیر' پر دیا گیا ہے۔ محترمہ نیر جہاں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہیں۔ مستقبل کے کئی ایک منصوبے ہیں۔

سلیم جعفری مرحوم

سلیم جعفری (مرحوم) نے خلیجی ممالک میں شاندار انڈوپاک مشاعروں کی جو روایت قائم کی وہ نہ صرف پورے خلیجی ممالک بلکہ اردو کی نئی بستیوں کے لئے بھی مشعل راہ بنی۔ مقتدر زندہ مشاہیر شعرا کے جشن، نہایت ہی اعلیٰ درجے کے دیدہ زیب مجلّے، حسن انتظام اور مخصوص مزاج و طریقہ کار

ں وجہ سے وہ پوری اردو دنیا میں مشہور و مقبول تھے۔ جشن کے ساتھ ایوارڈ کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ ۱۹۹۸ء کا اولین ایوارڈ مشہور افسانہ نگار نجم الحسن ضوی (مقیم دبئی) کو دیا گیا تھا۔ شعرا کو مالی تعاون اور ان کے شعری مجموعوں ں اشاعت میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اب اس روایت کو بیگم سلیم جعفری نے باقی رکھنے کا عزم کیا ہے اور ان کا حوصلہ ڈاکٹر اختر جہاں ملک (دبئی) ہیں۔

- P.O.Box 5053, Dubai (UAE)

مصیب الرحمن ، محمد عتیق

اس وقت مجلس فروغ اردو ادب، مصیب الرحمٰن (ابن الحبیب احقر) ور محمد عتیق، پوری اردو دنیا میں اپنے گراں قدر ایوارڈ اور دوحہ قطر میں ہر سال سی نہ کسی شاعر کے جشن کی وجہ سے بے حد مشہور ہیں۔ جشن کا سلسلہ سلیم جعفری (دبئی) کی روایت سے پیوستہ ہے۔ مجلس فروغ اردو ادب (دوحہ قطر) یک فعال ادبی تنظیم ہے اور یہ دونوں اردو عاشق، دوحہ قطر کے ادبا و شعرا کے عاون سے ہر سال ایوارڈ فنکشن اور جشن، نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کرتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء سے جاری ایوارڈ کی مجموعی رقم دو لاکھ روپے ہے۔ یہ ارڈ ہند و پاک میں برابر مالیت کے دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۹ء کے لئے ہندوستان سے ماہر غالبیات کالیداس گپتا رضا اور پاکستان سے مختار مسعود کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور جشن شہزاد احمد بھی منعقد کیا جائے گا۔

- P.O. Box 40689, Doha - Qatar (A.G.)

مقصود الٰہی شیخ

اردو کی نئی بستیوں کے مجاہد اردو مقصود الٰہی (راوی) شیخ، ہفت روزہ راوی (لندن) کو ۲۵ سال تک نہ صرف جاری رکھا بلکہ برطانیہ سے اردو کی ایک اقتور آواز بن کر پوری اردو دنیا میں گونجتے رہے۔ مشہور افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ نے ناموافق حالات کے پیش نظر اس تاریخ ساز روایت کو اب تازہ کار نسل کو سونپ دیا ہے۔ محترمہ فریدہ شیخ اور مقصود الٰہی شیخ ہفت روزہ راوی سے سبکدوش ہوگئے ہیں لیکن ان کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے۔ راوی کو تخلیق کیا اور ۲۵ سال اس کی تربیت کرنے کے بعد اب اس کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔

ساحر شیوی

ساحر شیوی ایک شخصیت کا نام نہیں، ایک پورے ادارے کا نام ہے۔ اردو زبان و ادب کے نہایت ہی خاموش خدمت گزار جو کئی شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ مولانا قمر نعمانی (تلمیذ علامہ سیماب اکبر آبادی) کے ارشد تلامذہ میں سے ایک، کوکن رائٹرز گلڈ کے بانی اور سربراہ۔ اس ادارے نے اب تک نظم و نثر کی کئی عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ رسالہ 'سفیر اردو' (لندن) اور رسالہ ترسیل (بمبئی) کے بانی و سرپرست اعلیٰ، کئی انجمنوں اور اداروں کے سرپرست۔ برطانیہ میں ادبی محفلوں کے روح رواں اور ادبا و شعرا کے سچے ہمدرد۔

نور پرکار

اردو کے مشہور افسانہ نگار، شاعر اور مترجم نور پرکار، کویت کی علمی و ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی جان ہیں۔ اردو سے مراٹھی اور مراٹھی ادب کو اردو میں منتقل کرنے والے نور پرکار ہند و پاک میں یکساں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کویت میں ہند و پاک سے آئے ہوئے اردو قلم کاروں کی مختلف ادبی و تہذیبی انجمنوں اور اداروں کے ساتھ بھرپور تعاون کرنے والے کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اسی طرح سعید روشن اور باقی احمد پوری، نور پرکار کے نقش قدم پر گامزن ہیں اور بہت فعال ہیں۔

حنیف اخگر - محمد یسین

شمالی امریکہ میں مدت مدید سے مقیم حنیف اخگر کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ کئی شعری مجموعوں کے خالق، نیویارک کی قدیم ادبی روایت 'حلقۂ فن و ادب' کے بانی اور متعدد عالمی مشاعروں کے روح رواں اور معاصر مشاہیر قلم کاروں کے جشن کا اہتمام کرنے والے۔ نہایت ہی مخلص، متقی، بزرگ، شفیق اور زبان و ادب کے بے لوث خدمت گزار، مشاعروں میں اپنے مخصوص ترنم اور شگفتہ شاعری کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے دستِ راست محمد یٰسین حلقۂ فن و ادب کے بے حد فعال سکریٹری ہیں۔ جوان، حوصلہ مند، ذمہ دار، محنتی، دوسروں کو اپنا بھرپور تعاون دینے والے۔ زبان و ادب کے نہایت ہی پرجوش خدمات گزار، اعلیٰ درجے کے منتظم، ذہین، دوست مزاج ہیں۔ حلقۂ فن و ادب کے تحت عالمی مشاعروں کے علاوہ بھی شعراء و ادبا کی امریکہ آمد پر اپنی مہمان نوازی کے لئے بھی مشہور ہیں۔ اردو زبان اردو ثقافت کے فروغ کے لئے مستقبل کے کئی خواب رکھتے ہیں۔

- 241 - Jeff St. Metuchen NJ 0880 (USA)

عابد اللہ غازی انصاری

اردو کی نئی بستیوں میں گرانقدر علمی و ادبی اور تدریسی کام ہو رہے ہیں لیکن شمالی امریکہ میں ایک ایسا ادارہ "اقراء فاؤنڈیشن" کے نام سے موجود ہے جس کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس وقت اردو کی نئی بستیوں میں ابتدائی تعلیمی سطح پر نصابی کتب کو جدید طرز پر ترتیب و طباعت کا اہتمام انگریزی عربی اور اردو رسم الخط میں 'اقراء فاؤنڈیشن' ہی کے تحت ہو رہا ہے۔ ان کا آسان ترین جدید نصاب، ایشیا، یورپ امریکہ وغیرہ میں مکمل رہا ہے۔ کئی ایک فلاحی منصوبے اس ادارے کے تحت جاری ہیں۔ شکاگو میں نہایت ہی شاندار دفتر اور علاحدہ سے بک شاپ بھی ہے۔ اس ادارے کے روح رواں عابد اللہ غازی انصاری اور بیگم غازی ہیں۔ عابد اللہ غازی صاحب کا تعلق مشہور دینی و علمی گھرانے سے ہے۔ بہت اچھے شاعر، مقرر اور اعلیٰ درجے کے ناظم مشاعرہ ہیں۔

ذکر ان کا بھی کچھ ضروری ہے

درج بالا اہم اشخاص کے علاوہ بھی اردو کی نئی بستیوں میں بہت سارے مقتدر حضرات اپنی اپنی سطح سے اردو زبان و ادب اور درس و تدریس کے ساتھ ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ان تمام کے احوال کے لئے شاعر کا ایک شمارہ درکار ہوگا۔ فی الحال ان کے ناموں ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

زیڈ یو صابری (دبئی)، حسن چوگلے (دوحہ قطر)، محمد حفظ الکبیر

...ا)، حمیر ارحمان (امریکہ)، اشفاق حسین (کنیڈا)، محمد مظفر الدین فاروقی (امریکہ)، شاہدہ نسیم سالک (امریکہ)، غوثیہ سلطانہ (امریکہ)، تنویر علی (امریکہ)، حسن چشتی (امریکہ)، سید صغیر احمد جعفری (ابو ظہبی) ڈاکٹر عبداللہ (امریکہ)، افتخار نسیم (امریکہ) حیدر قریشی (جرمنی)، حنیف ترین (سعودی عرب) عذرا نقوی (سعودی عرب)، وکیل انصاری (امریکہ)، رئیس وارثی (امریکہ) وسیم بٹ وسیم (کینیا) عذرا رضا (امریکہ) ہمایوں ظفر زیدی (مسقط)، رئیس احمد (مسقط) سعید قیس (بحرین) فرحت زاہد (امریکہ) کنیز فاطمہ (آسٹریلیا) محمد عمر میمن (امریکہ) چودھری محمد نعیم (امریکہ) محمد سلیمان (دوحہ قطر) شمیم حیدر (دوحہ قطر) اشرف قریشی (دوحہ قطر) اشرف شاد (آسٹریلیا)

یہ اور ایسے ہی بہت سارے نام، ان کے پتے اور فون نمبر، شاعر کے آئندہ کسی شمارے میں دئے جائیں گے۔

چینی شاعر کا اردو مجموعہ

جامعہ بیجنگ (چین) میں شعبۂ اردو قائم ہے۔ یہ چار سال کا کورس ہے۔ تیسرے سال میں شعر و شاعری کی طرف طلبہ کی توجہ زیادہ مرکوز کی جاتی ہے۔ ہر چینی طالب عروض سیکھتے ہوئے اپنے طور پر شعر موزوں کرنے لگتا ہے۔ شعر موزوں کرنا کورس کا حصہ ہی نہیں بلکہ اچھے سے اچھا معیاری شعر کہہ کر ہر طالب علم ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نوعیت کے مقابلوں کے عمل سے ایک نام چانگ شی شون ابھر کر آیا۔ انھوں نے اپنا قلمی نام انتخاب عالم منتخب کیا۔ ان کا اولین اردو مجموعہ 'بانگ وفا' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اردو کے معتبر شاعر آفتاب اقبال شمیم کا ناتمام پیش لفظ اور ایک اور معتبر شاعر توصیف تبسم کے 'باد شمال' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔

اردو انٹرنیٹ پر

بی بی سی کی ورلڈ سروس نے ۳ مارچ ۱۹۹۹ء سے اپنی اردو سروس کی روزانہ چار نشریات کی نئی ویب سائٹ کا آغاز کر دیا ہے اور پہلی مرتبہ انٹرنیٹ پر نشریات اپنی تمام آوازوں سمیت میسر ہوں گی۔ بی بی سی کی ایشیا اور پیسفک ریجن کی سربراہ الزبتھ برائٹ نے بتایا کہ دنیا میں بیس کروڑ سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں اور ان کی بڑی تعداد جو جنوبی ایشیا سے باہر رہتی ہے ہماری نشریات نہیں سن سکتی مگر نئی ویب سائٹ کی بدولت اس علاقے کے لاکھوں افراد اپنے کمپیوٹر (PCS) پر ان نشریات کو براہ راست سننے کے قابل ہوں گے۔ پیر سے جمعرات چاروں نشریات اور جمعہ تا اتوار انھیں پروگراموں میں خصوصی میگزین اور فیچر پیش کئے جائیں گے۔ ان نشریات کا دورانیہ ایک گھنٹہ ۵۵ منٹ ہے اور اسے ہندوستانی وقت کے مطابق صبح ۷ بجے۔ دوپہر دو بجے۔ شام کو ساڑھے آٹھ اور رات کو ۱۱ بجے۔ پاکستانی وقت کے مطابق آدھا گھنٹہ پہلے۔ ویب سائٹ کا پتہ: www.bbc.co.uk/urdu

عالمی ادب میں اردو ادب کا مقام

ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کے شعبۂ اردو میں ایسو سی ایٹ پروفیسر اسادہ یوکاتاما نے فیضان عارف کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ 'عالمی ادب کی صف میں اردو ادب کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہے اگرچہ اردو کی اہم ادبی تصنیفات کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے اس کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ دراصل اردو ادب کو دوسری زبانوں کے ادب کی طرح عالمی سطح پر متعارف کرانے کے لیے اس کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں تراجم کی اشد ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کئے بغیر اردو ادب عالمی صف میں شامل نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ: اخبار اردو۔ مطبوعہ مئی ۱۹۹۹ء۔ پاکستان)

اردو ہوا کے دوش پر

اردو زبان کی عالمی اہمیت کے پیش نظر دنیا بھر کے چالیس سے زائد نشریاتی ادارے اپنی ملکی و غیر ملکی سامعین کے لئے اردو نشریات پیش کر رہے ہیں اور ان عالمی نشریاتی اداروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے سے اردو سروس پیش کرنے والے نشریاتی ادارے اپنی مجالس کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں اور پروگراموں کا دورانیہ بڑھا رہے ہیں۔ اپنے سامعین کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر سے بہتر فریکوینسی پر پروگرام پیش کر رہے ہیں۔

(اورنگ زیب ملک)

عالمی زبانوں کی درجہ بندی اور اردو

۱۴ر مئی ۱۹۹۲ء کے ٹورنٹو اسٹار میں عالمی زبانوں کی اہمیت اور استعمال کے حوالے سے شائع ہونے والے ایک تجزیے میں واشنگٹن یونیورسٹی کے سڈنی کابرٹ نے اردو زبان کو دنیا کی دوسری بڑی زبان قرار دیا ہے۔ Canadian World Almanac کے مطابق ہندی المانی یعنی اردو ہندی ہے جسے ۴۴۳ ملین لوگ بولتے ہیں۔ Collins Encyclopedia میں اردو زبان کو تیسری بڑی زبان قرار دیا گیا ہے جبکہ یونیسکو کی ایک رپورٹ میں بھی اردو کو تیسری بڑی عالمی زبان قرار دیا گیا ہے۔ بی بی سی کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق انگریزی اور چینی زبانوں کے بعد اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔

اردو لغت نگاری اور مستشرقین

مستشرقین نے اردو، انگریزی اور انگریزی اردو لغت کی ترتیب و تدوین پر غیر معمولی کام کیا ہے۔ سولہویں، سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے یہ سارے لغت لسانی، مذہبی، سیاسی یا تبلیغی سرگرمیوں کی بنیاد پر تالیف کی گئیں یا پھر ذاتی نوعیت کے لغات۔ ان سب کی اپنی ایک تاریخ ہے لیکن ادھر بیسویں صدی کے نصف آخر میں دنیا کی بڑی زبانوں کے ساتھ اردو کے بھی نصابی و تدریسی ضرورت کے لئے تو کبھی روزمرہ زندگی کے لئے بہت سارے چھوٹے بڑے لغت یا تو شائع ہوئے ہیں یا اشاعت پذیر ہونے والے ہیں۔ انگریزی، چینی، جاپانی، جرمن، فرنچ، ترکی، تاروتجمن، روسی وغیرہ زبانوں میں یہ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ یہ ایک دلچسپ تحقیقی موضوع ہے جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔



دلنواز صدیقی

بھی ہے کوئی زندگی، دشمنی بے تعلقی، عشق میں بھی جنوں نہیں
تے تخیلات کے، خشک ہیں ریگ زار سے، اتنا سکوں سکوں نہیں

رے جہاں نے فیصلے میری سزائے موت کے میرے بغیر کر لئے
ت سے دیکھتا ہوں میں رزم گہہ حیات میں ہوں بھی میں کہ اب ہوں نہیں

ے نگر کے باسیو! زہد و صفا کے ساتھ ساتھ عقل سلیم چاہیے
د عمل کا توڑ ہو ایسی کوئی دعا نہیں ایسا کوئی فسوں نہیں

ار یاض رنگ و بو سرد ہوا کے روبرو مشق خزاں لہو لہو
ہ برگ برگ میں پھر امید فصل نو ایسی کہ سرنگوں نہیں

ہ گماں نصیب کو فکر و نظر کے فیصلے صرف زباں کے، رائے کے
یقیں کی شدتیں یعنی عقل کل بھی ہیں حق کا رگوں میں خوں نہیں

● 510, Ridgewood Rd.
Shippinville PA 16254 (USA)



حنیف اخگر

تکمیل سجدہ جب مرے پروردگار ہو
میری جبیں پہ نقش کف پائے یار ہو

ہوتا ہے بے قرار تو دل بے قرار ہو
لیکن نہ اس قدر کہ اسے ناگوار ہو

دست جفا بھی چاہیے سرگرم کار ہو
جب ارتکاب جرم وفا بار بار ہو

اس کی شبیہ اس کا سراپا نہیں تو کیا
تشریح گیسو و لب و رخسار یار ہو

رت کوئی ہو قفس میں چمن کے مزے کہاں
وہ موسم خزاں ہو کہ فصل بہار ہو

دیوانگی فریفتگی ہی نہیں تو کیا
اخگر ذرا فریفتہ دیوانہ وار ہو

● 80 - 22, 159th Street,
Jamaica NY. 11432-(U.S.A.)

ساحر شیوی

کاغذ پہ قلم اپنا چلانے میں لگا ہوں
خوابیدہ بہاروں کو جگانے میں لگا ہوں

فرمائشیں یاروں کی کروں پوری تو کیسے
اک عمر سے میں پیاس بجھانے میں لگا ہوں

کیا بات ہے جھولی مری بھرتی ہی نہیں ہے
تھا بیں کا جب سے میں کمانے میں لگا ہوں

افسوس ہو گیا جس میں پسینہ نہیں نکلا
اوپر کی کمائی تھی، اڑانے میں لگا ہوں

جس وقت نظر آتا ہے کچھ فائدہ ہوگا
دو یاروں کو آپس میں لڑانے میں لگا ہوں

● 47 - Sutton Garden, Sudon
Park, Luton Beds, LU3 3AF (UK)

حمیرا رحمان

ایک نظم

روز شام کو
جب بھی رات اجالے کے
پاس کہیں منڈلاتی ہے
میں اپنے بچے کو صحن میں کھیلتا دیکھ پکارتی
ہوں
'بیٹا اندر آؤ۔ اندھیرا ہونے والا ہے'
وہ ہنس کے مجھے دیکھتا ہے
پھر کہتا ہے
امی جب میں اندر جانے لگوں گا
تبھی اندھیرا ہو گا
اس سے پہلے نہیں۔!
روز میں حیرت کرتی ہوں
سورج اس کی خاطر سرمئی کرنوں سے
کافی دیر لڑائی کرتا ہے
سوچتی ہوں کہ میری نسل نے
سورج کا
اتنا پیار اور اتنا بھروسہ
شاید کبھی نہیں جیتا

● 3 - Young Enclave
Yonkers, Ny 10710 (USA)

نیر جہاں

نیا منظر پرانا غم

ایک جلتے کاغذ کا
یاد کے سمندر سے
جانے کیسا رشتہ ہے

ہے دھواں دھواں ہر سو
اس دبیز کہرے میں
سائے سے ابھرتے ہیں
نیلے نیلے کاغذ پر
دھندلے دھندلے سائے پھر
جیسے جلتے حرفوں میں
دھیرے دھیرے ڈھلتے ہیں
آگ اور دھواں ہر سو
جیسے پھیل جاتا ہے
اک عذاب بینائی
آنکھ پر گزرتا ہے

ہم نے صرف دیکھا تھا
ایک جلتے کاغذ کو

● 721 - Hill St, Suit III, Santa
Monica, CA 90405 (USA)



شکیلہ رفیق

شمار کرلو

شمار کرنے نکلے ہو تو...
اس شہر بے رونق کی
نفرت کی قبریں
فرقوں کی گلیاں
دہشت کے مارے انساں
تعصب زدہ مکاں، اور
بے گناہ لاشیں شمار کرلو
شمار کرلو
ان روشنیوں کو
جگمگاہٹوں کو
محبتوں کو
لگاوٹوں کو
چاہتوں کو
جو اب
سیاہی میں ڈھل چکی ہیں
شمار کرلو
بڑے مکان کے
اس دروازے کو
جہاں
گئے دنوں میں
کھیلتے بچے
ہنستی بیبیاں
جوان لڑکے
مسکراہٹوں سے
چاہتوں سے
اپنے نام
گنوا رہے تھے
مگر اب
یہاں تمہیں رہے ہیں
اب تم.....
اس بڑے مکان کے
دروازے میں کھڑی
مجھ اکیلی،
زندہ
شمار کرلو
کہ....
تمہاری مردم شماری
اکارت نہ جائے

● I, Velma Drive, ONT
M8Z 2N2 Canada



سوھن راھی

رگ جاں میں بکھر کر بولتا ہے
پرانا زخم ڈر کر بولتا ہے

وہی تو معتبر ہے اشک اپنا
جو پلکوں پر ٹھہر کر بولتا ہے

کرن بن کر اندھیرے سے لپٹ جا
کہ سورج آہ بھر کر بولتا ہے

پرانی راہ سے کاٹا ہے جس کو
نئے رستوں سے ڈر کر بولتا ہے

وہ سُر سنگیت اور راگوں کا رسیا
خموشی میں اتر کر بولتا ہے

ہم اس چھاؤں میں آٹھہرے ہیں راہی
جہاں سورج اتر کر بولتا ہے

کڑکتی دھوپ یہ کہتی ہے راہی
گھنا سایا گزر کر بولتا ہے

● 63 Hamilton Avenue
Surbiton, Surrey KT6 7PE (Eng)

حفظ الکبیر قریشی

بدل گئے ہیں زمیں آسماں ہمارے لئے
نئے بنے ہیں رسومِ جہاں ہمارے لئے

کبھی اٹھے جو قدم اپنے منزلوں کی طرف
تھی منتظر نگہ رہبراں ہمارے لئے

نڈھال کر گئی ہے ہجرتوں کی جانکاہی
مسافتیں ہوئیں آزارِ جاں ہمارے لئے

رکھا ہے پائے کشاش سے گرم اپنا لہو
خرام جہد ہے منزل نشاں ہمارے لئے

تلاش منزل موہوم میں یقیں کی طرح
چمک اٹھا ہے سراب گماں ہمارے لئے

عدم محض ہے طلسم خیال کا پیکر
زمان ہے نہ مکاں ہے وہاں ہمارے لئے

کم از کم اپنی زمیں ہی رہے متاعِ مفید
فلک نہ ہوگا کبھی مہرباں ہمارے لئے

● 12 Harvey Court Richmond
Hill, Ontario Canada L4C 5R2



عابد جعفری

موتی سے کشکول میں کنکر ڈال گیا
وہ میری آنکھوں میں پتھر ڈال گیا

کیسے یہ تعمیر فصیل ذات ہو ختم
جب آیا دیوار میں وہ در ڈال گیا

خاک بدن میں جب سے دفن ہوا ہوں میں
جو آیا سینے پہ گل تر ڈال گیا

پھول سے مل کر بھی شبنم ہے اشک فشاں
رسم یہ غم کی کون ستم گر ڈال گیا

جو نکلا تھا اہل ستم سے لڑنے کو
آخر کو ہتھیار وہ لشکر ڈال گیا

کیسے کیسے ہاتھ بھرے ہیں زخموں سے
کون مری کشتی میں لنگر ڈال گیا

● 10 - 1235, Radom Street,
Pickering Ont , Liw IJ3 Canada

مصطفیٰ کریم
5 - Campion Close Scalby Scarborough,
YO13, OQJ (U.K.)

بازگشت

۲

میں نے گرینڈ ہوٹل کی راہ لی۔ وہاں سے پل کو پار کرنے کے بعد کھڑی ڈھلان کے ساتھ جانے والی پگڈنڈیاں ملتی ہیں۔ خم دار، ستواں سر سبز درختوں، سفید اور سرخ پھولوں سے بھری جھاڑیوں کے درمیان دور تک جاتی ہوئی پگڈنڈیاں۔ جو اسپا ہال کو جاتی ہیں اور اٹالین گارڈن کو۔ جو اسی ڈھلان پر بنا ہے۔ گلاب کے پھولوں سے گھرا سبز گھانسوں کا تختہ اور چاروں طرف بیٹھنے کے لیے سیڑھیاں اور ان پر سائبان۔ جس کی چھتوں پر زرد اور سبز پتوں سے بھری آئی وی کی لتیں چڑھی ہیں۔ نیچے سمندر ہے۔ کبھی تند اور کبھی پرسکوں۔

ادھر لوگ نہیں ہوتے اور ادھر میں اکثر آتا ہوں۔ ٹہلنے کی خاطر۔ بیوی کی اکتاہٹ سے فرار کی خاطر۔ شب و روز گھر میں میرے چہرے پر اس کی نگاہ پڑتی، میری آواز کانوں تک پہنچتی، اکتاہٹ تو اسے ہونی ہے۔ قبل اس کے کہ اکتاہٹ جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو جائے۔ ہم دونوں معمولی باتوں پر جھگڑ پڑیں۔ لنچ تازہ نہیں ہے۔ لاؤنج میں تین لیمپس کیوں جل رہے ہیں۔ میری قمیص پر استری کیوں نہیں کی گئی۔ میں گھر سے نکل آتا ہوں۔ میری بیوی ساتھ نہیں آتی۔ بلانے پر بھی نہیں۔ جون سے پہلے اسے کیاریوں میں پھول لگانے ہیں۔ ٹی وی پر اسے کوئی میوزیکل پروگرام دیکھنا ہے۔ اکثر تو وہ سنتی بھی نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں۔ سر پر ہیڈ فون لگائے کلاسیکل موسیقی سنتی رہتی ہے۔ آنکھیں بند اور متبسم چہرہ کھویا ہوا۔

ٹہلنا مجھے کچھ ایسا مرغوب نہیں۔ فوج چھوڑنے کے بعد ورزش سے میرا دل اچانک ہو گیا۔ امتحانات۔ ہسپتال کی چہل پہل۔ مریضوں کے پیچیدہ امراض کا چیلنج۔ مشکل، لیکن کامیاب آپریشنس۔ حسین نرسوں کا مرعوب ہو کر مجھے تکنا۔ مریض اور اس کے رشتہ مندوں کا ممنون ہونا اور—— اور اتنی بڑی تنخواہ۔ ڈاکٹروں کا مشورہ ہے اب سب کچھ بھول جاؤں۔ ٹہلوں۔ باغبانی کروں۔ تیرنے جاؤں۔ میرا دل جو دو بائی پاس آپریشن سہہ چکا ہے۔ اسے ایسی ورزشیں تو اتار سکیں گی ان کا کہنا ٹھیک ہے۔ ان مشاغل میں جب مشغول ہوتا ہوں تو تازگی محسوس ہوتی ہے۔ آج بھی میں تازگی محسوس کر رہا ہوں۔ آسمان میں سورج اور بادل کی آنکھ مچولی ہے اور زمین پر دھوپ چھاؤں کا کھیل۔ میں خوش ہوں ۔۔بہت خوش۔

بنچ پر بیٹھے آدمی کو دیکھ کر میں رک گیا۔ یہ وحید تھا۔ کھردرا پیلا چہرہ۔ داہنی آنکھ کے نیچے سیاہ مسّہ۔ عمر رفتہ اسے بھی مار بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر بھی میری طرح ڈھیر سے سفید بال تھے۔ سیاہ ڈفرل کے نیچے ٹوئیڈ کوٹ اور خاکی نما پتلون پہنے وہ سمندر کو تک رہا تھا۔

"وحید!"

اس آدمی نے چونک کر میری جانب نگاہ اٹھائی۔

"آپ؟" اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔

"میں منیر ہوں۔ مَرِی میں ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔"

"او۔ ہاں۔ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر منیر ہیں آپ۔ پہچان لیا۔"

وحید اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے اس نے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ سرد تھا اور گرفت ڈھیلی۔ وحید نے نہ گرم جوشی کا اظہار کیا اور نہ ہی مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

"آپ یہاں اسکاربرو میں؟ یہاں ہندوستانی پاکستانی شاذ ہی نظر آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں رشتے داروں سے ملنے لیڈز آیا ہوا ہوں۔ سوچا کیوں نہ ایسٹ کوسٹ گھوم آؤں۔ ماضی میں ادھر کبھی آنا نہیں ہوا—— لیکن آپ؟"

"میں یہیں بس چکا ہوں۔ آپ تو اب فوج میں جرنل ہوں گے؟"

وحید نے اپنا بڑا سر نفی میں ہلایا اور بولا۔

"۶۵ء کی ہندوستان پاکستان کی جنگ کے بعد میں نے استعفیٰ دے دیا۔ کئی افسر دوست اور میری بٹالین کے بہت سارے سپاہی اس جنگ میں مارے گئے۔ پھر میرا جی فوج میں نہیں لگا۔ جنگ وجنگ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آنکھوں کو سکیڑ کر اور منہ بنا کر وحید نے فوج اور جنگ

سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اس نے گفتگو جاری رکھی۔ آپ ۔۔۔ آپ میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔'

میری داڑھی، دھنسے گال اور ذرا جھکی پشت سے وحید نے نتیجہ اخذ کیا۔ فوج کے دنوں کی تصویر کو جب میں اپنی اس شبیہ سے ملاتا ہوں جو مجھے گھر کے قد آدم آئینے میں نظر آتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اپنے بگڑے ہوئے خدوخال کیسے بھلے لگتے ہیں۔

"کئی سال پہلے مجھے ہارٹ اٹیک ہوا۔ اب تک مجھ پر دو بائی پاس آپریشن ہو چکے ہیں۔ قبل از وقت ریٹائر ہو چکا ہوں۔ کاش زمانہ مجھ پر مہربان ہوتا؟"

"زمانہ کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔" وحید کے لبوں پر اداس مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنا پائپ سلگا رہا تھا۔

"آپ کی فیملی ساتھ نہیں آئی؟"

"فیملی؟ زرینہ؟ .... ہم نے علیحدگی لے لی۔ کبھی بنی نہیں ہم دونوں میں۔ مری کے بعد میری پوسٹنگ ملتان ہوئی وہاں ہم لوگ الگ ہوگئے۔ شادی کے صرف تین سال بعد۔ وحید غمزدہ بولا۔ اس نے ماچس کی بجھی تیلی کو انگلی کے ٹھوکے سے ہوا میں اڑا دیا۔ پائپ اس کے دانتوں میں دبی تھی اور دھواں اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

اس کی افسردگی، مجھے دیکھ کر خوش نہ ہونا میں سب کچھ سمجھ گیا۔ زرینہ سے وحید کو بہت محبت تھی۔ جب میں مری میں تھا تو اس محبت کو میں وحید کی آنکھوں میں پڑھ سکتا تھا۔

"آپ نے دوبارہ شادی....."

"نہیں۔ میں نے پھر شادی نہیں کی۔ دل ہی نہیں چاہا۔ زرینہ گئی تو سب کچھ گیا۔ حوصلے، خواہش، سبھی کچھ۔ زرینہ نے بھی شادی نہیں کی۔ وہ اب لاہور ٹائمز کی مدیرہ ہے.... میں بزنس کرتا ہوں اور دنیا گھومتا ہوں۔۔۔ آپ؟ بیوی بچے تو ہوں گے آپ کے؟ جب آپ مری میں تھے تو اس وقت تو کنوارے تھے آپ؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولا۔

"شادی میں نے اس ملک میں کی۔ بیٹا بیٹی امریکہ میں جا بسے ہیں۔ بیوی گھر پر ہے۔ چلئے نا میرے یہاں۔" آخری جملہ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ مجھے خوف تھا کہ مہمان کو اچانک دیکھ کر میری بیوی ناراض نہ ہو جائے۔

"نہیں۔ شکریہ۔ پندرہ منٹ میں میری ٹرین ہے۔ اب مجھے واپس جانا ہے۔"

وحید ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ میں بھی چل پڑا۔ میرے قدم سست تھے اور ذہن پر غبار تھا۔ کسی زمانے میں ہماری مری میں پوسٹنگ تھی وحید ڈپو ہیڈ کوارٹرس میں اسٹاف کیپٹن تھا اور میں سی۔ ایم۔ ایچ مری میں اسٹاف سرجن۔ کبھی کبھی آفیسرز میس میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی ہم دونوں ساتھ برج کھیل لیتے تھے۔ ایک دن وحید مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کے خسر بلڈ پریشر کے مریض تھے اور وحید چاہتا تھا کہ میں ان کا معائنہ کردوں۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو زرینہ گھر کے باہر دھوپ میں کھڑی نظر آئی۔ اس کے بال کھلے تھے اور اس نے بھورے رنگ کا کارڈیگن پہنا ہوا تھا۔ ایک گلہری اس کے ہاتھ پر چڑھی اس کی ہتھیلی پر بکھرے چنے کھا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر گلہری نے چھلانگ لگائی اور پاس کے درخت پر بھاگتی ہوئی چڑھ گئی۔ زرینہ بھی خفیف سی ہو گئی۔

وحید نے میرا تعارف زرینہ سے کرایا۔ وہ بڑے اخلاق سے ملی اور لاؤنج میں لے آئی۔ وہیں اس کے والد آتشدان کے پاس بید کی کرسی میں دھنسے بیٹھے تھے۔ بھاری بھرکم اور ذرا بل کھائی ہوئی تیکھی مونچھیں۔ پتہ چلا ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں۔ کمرے میں فرش پر اور کارنس پر کتابیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ وحید نے فخریہ بتایا کہ زرینہ انگریزی ادب میں ایم اے اور کتابوں کی دیوانی ہے۔ وحید کے خسر کا بلڈ پریشر ٹھیک تھا اور وہ جو دوائیں کھا رہے تھے وہ بھی مناسب تھیں۔ میں نے اطمینان دلا دیا۔ میں نے جب واپس آنا چاہا تو زرینہ نے لنچ کے لیے روک لیا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے لذیذ کھانے میں مصروف ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ زرینہ کے والد نے دوران گفتگو مجھ سے پوچھا۔

"بھائی کہاں کے رہنے والے ہو۔"

"جی۔ بنگال کا۔"

"وہاں کے لوگ اتنے ہینڈسم نہیں ہوتے۔"

"پاپا۔ وجہ، مگر بنگال ہے۔" زرینہ اپنے پتلے لبوں کو دبائے اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے گالوں میں شکنیں پڑ گئی تھیں اور بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

ہم سبھی ہنس پڑے۔ گفتگو جاری رہی۔ اچانک زرینہ کے پاپا نے پھر رائے زنی کی۔

"بھائی ایک اور بات ہے۔ انفنٹری آفیسر کی جو شان ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ کمانڈر ان چیف وہی بنتا ہے۔ فوج کا ڈاکٹر جتنی بھی ترقی کر لے اسے اسی کمانڈر ان چیف کو سیلوٹ کرنا پڑتا ہے۔"

مجھے اس نکتے کی وضاحت غیر ضروری محسوس ہوئی۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا زرینہ نے میری طرفداری کی۔

"پاپا فوجیوں کو علم کی قدر نہیں ہوتی۔ آپ کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے آپ اور وحید شیکسپیئر کو امیر اور غالب سے بھی واقف نہیں ہیں۔"

کھانے کے بعد مجھ سے وحید کے گھر میں نہیں بیٹھا گیا۔ میں

بے لطفی محسوس کرنے لگا تھا لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔

اس دن کے بعد وحید سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ پتہ چلا کوئی کورس کرنے دو ہفتے کے لیے کوئٹہ چلا گیا ہے۔ ایک دن زرینہ میرے ڈیوٹی روم میں آئی۔ بال ذرا بکھرے سے۔ سنولا چہرہ کمھلایا ہوا۔ وہ سیاہ اوور کوٹ پہنے تھی۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے بتایا وہ بیمار ہے۔ جب نرسنگ آرڈرلی اس کا ٹمپریچر لے چکا تو میں نے اسٹے تھسکوپ کا چسٹ پیس زرینہ کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ وہ اسے اپنے سینے پر سرکاتی جائے۔ اس نے اپنا دوپٹہ ہٹایا، قمیص کے بٹن کھولے اور گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر چیسٹ پیس کو اپنی چھاتی پر اوپر نیچے داہنے بائیں سرکانے لگی میں انہماک سے اس کی سانسوں کی آمد و رفت سنتا رہا۔ جب معائنہ ختم ہو گیا تو زرینہ بولی۔

"ایسا احتیاط دوسرے ڈاکٹر نہیں کرتے۔ ان کا بس چلے تو یہاں کان لگا کر دل اور پھیپھڑوں کی آواز سننے کا بہانہ بنا دیں۔" وہ اپنے پستانوں کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

"جب اسٹے تھسکوپ ساتھ نہ ہو تو کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

زرینہ کو زکام اور کھانسی تھی، میں نے نسخہ لکھ کر اسے دیدیا۔ وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

دوبارہ جب وہ آئی تو اس کی طبیعت بہتر تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ دواؤں کا استعمال بند کرے یا نہیں۔ میں ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کی تیاریاں کرنے میں مصروف تھا۔ میز پر کتابیں بکھری تھیں اور میں نوٹس تیار کر رہا تھا۔ معذرت کرتے ہوئے میں نے زرینہ کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ وہ میز کی دوسری جانب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گو میں لکھنے میں محو تھا پھر بھی مجھے احساس ہوا کہ زرینہ کی نگاہیں مجھ پر گڑی ہیں۔ میں نے جب آنکھیں اٹھائیں تو وہ جھینپ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ زرینہ جان گئی تھی کہ میں نے اس کی نگاہوں کے اسرار کو تاڑ لیا ہے۔

"کیسی ہے آپ کی طبیعت اب؟"

"جی۔ ٹھیک ہوں۔ دوائیں جاری رکھوں؟"

"ان کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ وٹامنس کھائیں ایک ہفتے کے لئے۔" میں نے نیا نسخہ لکھ دیا۔

"آپ ہمارے یہاں پھر نہیں آئے۔ پاپا پوچھتے رہتے ہیں آپ کے بارے میں۔"

"میرا تبادلہ پشاور ہو گیا ہے اور میں ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے انگلینڈ جانا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے بہت مصروفیت ہے۔"

زرینہ کا چہرہ بجھ گیا۔ لیکن فوراً اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"علم حاصل کرنا تو بہت اچھی بات ہے۔ کیسے یاد رکھتے ہیں آپ لوگ اتنی موٹی کتابوں کو؟" وہ میز پر بکھری کتابوں کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

"ان میں جو کچھ لکھا ہے انہیں یاد کر لینا ممکن نہیں۔ مضامین کو سمجھنا پڑتا ہے جو میرے جیسے انسان کے لئے مشکل ہے۔"

زرینہ نے اس طرح منہ بنایا جیسے جتا رہی ہو۔ کیوں بنتے ہو۔ وہ واپس جانے کے لیے کرسی سے اٹھی اور کہنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ انسان کو خوب علم حاصل کرنا چاہیے۔ میں نے کتنی بار وحید سے کہا۔ تم بی۔ اے ہو۔ فوج کی ملازمت چھوڑو۔ چلو امریکہ یا انگلینڈ جا کر مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ جھگڑنے لگتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی جھگڑنے کی بات ہے؟"

اس دن کے بعد بھی زرینہ میرے پاس سی۔ ایم۔ ایچ آئی۔ کبھی اس کے ساتھ اس کی کوئی بیمار سہیلی ہوتی یا کوئی مہمان جو اس کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوتا۔ زرینہ کا آنا مجھے بھلا لگتا۔ اس کے تصور سے مجھے خوشی ہوتی۔

ایک دن مال پر ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں وردی میں تھا۔ جب ہم ڈیو کمانڈر کے مکان کے سامنے سے گذرے تو وہاں کھڑے محافظ سپاہیوں نے خوب زور سے پیر پٹخ کر اور تن کر مجھے سیلوٹ کیا۔

"حد ہو گئی۔ ایسا اسمارٹ سیلوٹ تو ہمارے میاں کو بھی نہیں ملتا۔ حالانکہ وہ ڈیو ہیڈ کوارٹر میں اسٹاف کیپٹن ہیں۔" زرینہ مایوسانہ بولی۔

"یہ پنجاب رجمنٹ کی ڈی کمپنی کے سپاہی ہیں۔ گذشتہ سال میں اس رجمنٹ کا آر۔ ایم۔ او تھا۔ اس کمپنی کا اعلیٰ افسر بٹالین سے باہر گیا ہوا تھا۔ رجمنٹ کے کمانڈر نے ایک ہفتے کے لیے اس کمپنی کا انچارج مجھے بنا دیا۔"

"پھر تو اس کمپنی کی قسمت بن آئی ہو گی۔ لڑائی ہوتی تو زخمیوں کے لیے ڈاکٹر فوراً موجود۔"

"کمپنی سرحد کے پاس مقیم تھی۔ جنگ چھڑ جاتی تو آں جناب دشمن کو سو گز کے فاصلے پر بھی رائفل کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔"

"کمانڈر کو رائفل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہاتھ میں چھڑی ہو اور وہ اپنے سپاہیوں کو سامنے کھڑا انہیں للکار کر دشمن پر حملہ کرنے کے لئے کہتا ہو۔ جناب دل چاہیے۔ اتنا بڑا۔ حوصلے اور دلیری سے بھرا۔" زرینہ نے دل کی بڑائی کا اظہار ہوا میں ہاتھوں کو پھیلا کر کیا۔

"چھڑی تو خیر مذاق ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے جو کچھ کہا اس سے انکار نہیں۔ وحید نے بتائی ہو گی یہ بات؟"

"نہیں جی۔ پاپا بریگیڈیئر۔ ماموں برٹش فوج میں میجر تھے۔ ۴۳ء میں برما کے محاذ پر مارے گئے۔ فوجی خاندان سے ہوں اتنا تو مجھے

معلوم ہونا چاہیے۔" آنکھوں اور چہرے کو میری جانب ترچھا کیے زرینہ نے بڑے وقار سے کہا۔

اور ایک شام جب میں اس پہاڑی پر نیچے جا رہا تھا جہاں وحید کا گھر تھا تو زرینہ اپنے مکان کی طرف جاتی مل گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئی۔ زرینہ تیز چلتی آرہی تھی۔ چہرہ سرخ۔ سانس تیز اور گرم۔ بھورا کارڈیگن اس کے جسم پر تھا اور دونوں ہاتھ سیاہ اوور کوٹ کی جیب میں ٹھنسے تھے۔ آسمان پر بدلی تھی اور بوندا باندی ہو چکی تھی۔

"کہاں سے آرہے ہیں آپ؟"

" وہاں جو کرنل رہتے ہیں وہ بیمار ہیں۔ انہیں دیکھ کر آرہا ہوں۔" میں نے ہاتھ سے اس بنگلے کی جانب اشارہ کیا جو زرینہ کے گھر کے پاس تھا۔

" فوجی ڈاکٹروں کی بڑی عیش ہوتی ہے لیکن آپ تو بڑے مصروف نظر آتے ہیں۔"

" محض اتفاق ہے۔ آپ جب بھی ملتی ہیں میں مصروف نظر آتا ہوں۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم خاموش رہے۔ اکتوبر کی شام دھندلی تھی۔ نشیب میں سڑک پر چلنے والی روشنیاں دور تھیں۔ سڑک خالی تھی اور وہ پگڈنڈی بھی جہاں ہم دونوں کھڑے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے زرینہ نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اسے قریب پا کر جو مسرت وہاں لرزاں تھی اس کی شناخت مشکل نہیں تھی۔ اچانک زرینہ نے میری گردن میں بانہیں ڈال کر مجھے چوم لیا۔ قبل اس کے کہ میرا خوشگوار رد عمل ظاہر ہوتا۔ قبل اس کے کہ میں اسے لپٹا لیتا۔ زور سے۔ وہ مجھ سے الگ ہو گئی اور بغیر کچھ کہے تیز اپنے مکان کی جانب چل دی۔ میں نے اسے پکارا۔ اس کی جانب بڑھا۔ لیکن زرینہ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے اردلی کو پکار رہی تھی۔ اس کے مکان کا دروازہ کھلا۔ گھر کے اندر سے آتی بجلی کی روشنی میں زرینہ کے اردلی کو دروازے کے پاس کھڑا میں نے دیکھا میں واپس اپنے میس آگیا۔ کچھ خوش سا۔ کچھ گھبرایا ہوا سا۔

اس کے بعد زرینہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میری خواہش کے باوجود وہ نہیں ملی۔ اکتوبر میں ٹورسٹ اپنے گھروں کو واپس جا چکے ہوتے ہیں اور سردی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ شام آنے سے پہلے ہی وہ لوگ جن کی مَری میں مستقل رہائش ہوتی ہے وہ اپنے گھروں میں بند ہونے لگتے ہیں۔ دوپہر میں اگر دھوپ ہو تو مال پر کچھ چہل پہل ہوتی ہے۔ زرینہ کی ناکام تلاش میں اکثر وہاں گیا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اچھا ہوا ہم نہیں ملے۔ اچھا ہوا کسی سڑک پر۔ کسی دوکان میں یا ان پگڈنڈیوں پر جو شمشاد اور شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان خم کھاتی تھیں۔ زرینہ نظر نہیں آئی۔ بھورے رنگ کا کارڈیگن اور سیاہ اوور کوٹ پہنے۔ اس کا مرغوب لباس۔ میرے محبوب رنگ چونکہ وہ اس پر کھلتے تھے۔ نہ جانے کیا انجام ہوتا ہمارے ملنے جلنے کا۔ وہ فوجی افسر کی بیوی تھی۔ فوجی افسروں اور سپاہیوں کی بیویاں بہن کا رتبہ رکھتی ہیں۔ فوج کا ان لکھا قانون۔ جس کی خلاف ورزی میں میرا کورٹ مارشل ہو جاتا۔ کچھ دنوں بعد میں پشاور آگیا۔

اور آج ٹہلتا ہوا اسپاہال اور اوشن ہاؤس کے درمیان وسیع چبوترے پر آکر ریلنگ سے ٹیک لگائے میں دیر سے کھڑا ہوں۔ اردگرد کوئی نہیں ہے۔ نیچے سفید اور سیاہ چوکور پتھروں سے جڑا صحن خالی ہے اور اس کے سامنے وہ ننھا سا اسٹیج بھی۔ جس پر ابھی ابھی ایک ناٹک ہو گیا۔ وہ کھیل کھیلا گیا جسے میں نے اوپر لکھا ہے۔ اور اب جب کہ کھیل ختم ہوا تو ویرانی ہے۔ سوناپن ہے۔ سامنے سمندر پر اڑتی سی گلز کی چیخیں ہیں۔ اور میں ہوں یہاں۔ تنہا۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ ایک پل اور کٹ گیا۔ اور گھر میں میری بیوی سر پر ہیڈ فون لگائے موسیقی سن رہی ہے۔ شاید....

**

بقیہ صفحہ ۴۷: رہائی

سمجھتی ہو کہ تم میری مدد کر سکو گی تو یہ بات بھی بھول جاؤ۔ میں تجربے سے بہت سیکھ چکی ہوں، میں انکار نہیں کروں گی۔"

"لیکن وہ تو کسی گوری کو چاہتا ہے ـــــ" جمیلہ سمجھانے کے لیے الفاظ ڈھونڈتی رہ گئی اور بہن بول پڑی۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے، اس کو مجھ سے غرض نہیں، مجھے اس سے سروکار نہیں۔ میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں گی۔" وہ چپ ہو گئی پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "تمہاری قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں آپا۔ تم کتنے مزے سے ہو، اپنی زندگی اپنی مرضی سے گذارتی ہو، کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی قید نہیں، اپنا گھر اپنے دوست ـــــ میں بھی تمہاری طرح آزاد ہونا چاہتی ہوں آپا ـــــ اور پھر ابا کی قید سے رہائی کی اور صورت بھی کیا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے کہ ان کے حکم کے مطابق شادی کر لی جائے، یہ قربانی تو دینی ہی ہو گی اس کے بعد ہم ان کی رعیت تو نہ رہیں گے۔ شادی کے بعد یہ گاڑی ٹھیک سے چلتی ہے تو پھر کوئی بات نہیں ـــــ ورنہ اس سے بھی چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔" اس نے بہن کے حیران چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "ایسی گھبرانے کی بات نہیں آپا ـــــ ہم تم ہی نہیں اور بہت سی لڑکیاں اس قربانی پر مجبور ہیں، کیونکہ رہائی کی کوئی اور صورت بھی نہیں۔" وہ مستقبل کی آزادی کا تصور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور جمیلہ کا جی چاہ رہا تھا خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دے نہ جانے کیوں ـــــ

**



سعدیہ روشن صدیقی

سعدیہ بی بی سوچ کیا ہو اپنے آپ اکیلے میں
دنیا جیسی بن کے رہو تم دنیا کے اس میلے میں

ڈھونڈ رہی ہو کس کو آخر الگ تھلگ جو بیٹھی ہو
اب تم بھی شامل ہو جاؤ لوگوں کے اس ریلے میں

دل کی بابت کیا سمجھو ہو دھڑکن دھڑکن ٹھہرے گا
ایک ذرا سی چوک ہوئی تو پڑ جاؤ گی جھمیلے میں

خوشبو پر پابندی کب ہے اور نہ اچھے جذبوں پر
نازک کلیاں کھلتی جائیں آنگن کے ہر بیلے میں

خوابوں کو آنکھوں میں سجاؤ رنگ برنگے پھول کھلاؤ
کوئی نیا مہمان بلاؤ اب کے میلے ٹھیلے میں

ذائقہ ختم نہیں ہو جاتا آنکھوں کی اس بے نوری سے
سائیں بابا فرق بتائیں میٹھے اور کسیلے میں

ہر موسم کو سہنا سیکھو سعدیہ بی بی رہنا سیکھو
شہر بدلتا جاتا ہے اب مقتل اور کسیلے میں

● P.O. Box 26555, Abudhabi, (UAE)



زرین یاسین

چہرے پہ لکھی درد کی تحریر ملے گی
لفظوں کو کہاں اپنے وہ تصویر ملے گی

تم لاکھ روایات سے باغی رہو پھر بھی
پیروں میں چھنکتی وہی زنجیر ملے گی

نفرت کے بچھائے ہوئے بارود کے یہ ڈھیر
کیا ہوگا جو بچوں کو یہ جاگیر ملے گی

مدت سے رواں ہو کسی نادیدہ سحر میں
تم خواب سے جاگو گے، تو تعبیر ملے گی

بے مثل محبت تو ہے اک جھوٹی کہانی
اس دور میں رانجھا نہ کوئی ہیر ملے گی

● 241, Jeff Street, Metuchen
NJ 08840 (USA)



سیما عابدی

یہ تو خواب ہے میری آنکھ کا جو حقیقتوں میں ڈھلا نہیں
جو خیال میں تھا بسا ہوا وہی چہرہ مجھ کو ملا نہیں

سر شاخ جتنے گلاب تھے وہ ہوا کی شوخی سے کھل اٹھے
میں اتار لوں جسے جان میں وہی غنچہ دل میں کھلا نہیں

یہ تو موسموں کا مزاج ہے کبھی گرم ہے کبھی سرد ہے
غم جان کا ہے جو سلسلہ صبح و شام سے وہ گھٹا نہیں

سنا شہر بھر کا یہ روگ ہے کھلی آنکھیں ہونٹ سلے ہوئے
رہیں برقرار سماعتیں مگر ایسے جیسے سنا نہیں

رہی گفتگو بڑی دیر تک تری بزم ناز میں عشق پر
ہوئی بات جب بھی وفاؤں کی کوئی شمع لے کے اٹھا نہیں

سدا خوش رہو، رہو شادماں میرے بچو! عمر دراز ہو
میرے عہد نو کے نصیب میں یہ حسین رسم دعا نہیں

مجھے سیما لے کے چلا کوئی جو سوئے فلک تو صدا آئی
ہے متاع جاں میں غرور سا تجھے کیا ملا ہے پتا نہیں

● 2715 W - Summerdale (Gard)
Chicago IL 60625 (USA)

احمد سعدی

یہ آرزو تھی کبھی ان سے گفتگو کرتے
وفور شوق میں دل کو لہو لہو کرتے

غم حیات سے فرصت کہاں ملی اتنی
کہ اپنے چاک گریباں کو ہم رفو کرتے

تمام عمر یہ حسرت ہی رہ گئی دل میں
کبھی شکایت غم ان کے روبرو کرتے

سلوک ان کا ، عنایات ان کی کیا کہیے
جو کرتے اس سے سوا اور کیا عدو کرتے

بڑا اداس تھا منظر گلوں کے موسم کا
عبث ہم ایسے میں کیا ذکر رنگ و بو کرتے

کتنا طویل سفر رات کا اندھیرے میں
چراغ گھر میں جلانے کی آرزو کرتے

تمام عمر مرے ساتھ وہ رہا سعدی
تمام عمر کٹی اس کی جستجو کرتے

● New Babu Pura, P.O.
Saidpur, Dist Nilphamari (Bangladesh)

اقبال فرید میسوری

اب تو ممکن ہے سبھی، سوداگروں کے ہوتے
زخم پر زخم لگیں، چارہ گروں کے ہوتے

کیوں تعجب میں کروں اپنی کسی لغزش پر
بے خبر خود ہی رہا راہ بروں کے ہوتے

تم تھے شاہین صفت ! آج ہوا کیا تم کو
کیوں ہے کوتاہیٔ پرواز پروں کے ہوتے

تاک میں چور ہیں ، جالی بھی لگا دوان پر
کھڑکیاں اتنی بڑی کیوں ہیں دروں کے ہوتے

آس تھی، بھول تھی، قسمت تھی پتہ کچھ نہ چلا
ہم تو صحرائی ہوئے اپنے گھروں کے ہوتے

یہ اشارہ ہے کسی فتنۂ تازہ کا فرید
شہر خاموش ہے شوریدہ سروں کے ہوتے

● G.A.C, P.O. Box 335
Dammam 31411 (KSA)

محمد صبیح الدین انصاری

تم سے بڑھ کر کوئی مانا کہ مسیحا نہ ہوا
میرے ہر درد کا تم سے ابھی مداوا نہ ہوا

پھر کسی شخص کو حق گوئی کا انعام ملا
آج پھر داخل زنداں کوئی دیوانہ ہوا

ہم نے جو خواب بھی دیکھا وہ سہانا دیکھا
یہ الگ بات کہ ان میں کوئی پورا نہ ہوا

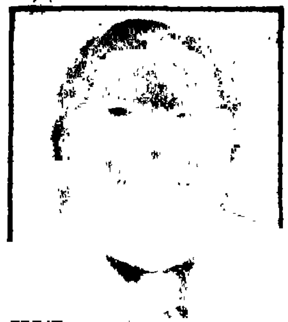
کچھ وہ خود بھول گئے وعدۂ فردا اپنا
کچھ تقاضا مری غیرت کو گوارا نہ ہوا

تھی کبھی دھوم زمانے میں ہمارے دم کی
آج ہم مر بھی گئے تو کوئی چرچا نہ ہوا

کیسے الفاظ کے شیشے میں اتارے کوئی
اک ہنسی کھیل ہوا تیرا سراپا نہ ہوا

جل اٹھے پھر ترے قدموں کے نشانوں کے چراغ
کہکشاں پھر مری تخیل کا کاشانہ ہوا

● P.O. Box 19964 Dubai (UAE)



عاصی کاشمیری

ہائیکو

چھوڑ دیا گھر بار
صحرا صحرا پھرتا ہوں
جھوٹا سب سنسار

O

آئے ہیں بادل
آنکھوں سے بہہ جائے گا
سارا ہی کاجل

O

شبنم پھولوں پر
کتنے اچھے لگتے ہیں
بچے جھولوں پر

O

مفلس کے گھر میں
چولھا جل سکتا نہیں
لکڑی مہنگی ہے

O

بچی سوئی ہے
گڑیا اس کی ٹوٹ گئی
کتنا روئی ہے

● 788 - WoodBorough Rd,
Nottiwgham (England) (UK)



محمد جمیل احسن

اے کاش

کاش یوں ہو کہ کبھی رات کے سناٹے میں
پھول سے پاؤں کی آہٹ گونجے
اور مری میز پہ رکھے ہوئے سارے کاغذ
نرم جھونکے کی تمازت سے ہوا میں اڑ جائیں
اور پھر ـــ فرش پہ بکھرے ہوئے سارے کاغذ
ایک معصوم کے ہاتھوں کا کھلونا بن جائیں ـــ
ان سے کھیلے ـــ وہ کبھی ان پہ قلم سے لکھے ـــ
پھر اسے بھر کے میں ان باہوں میں
اک تجسس بھرے احساس کو زندہ کر لوں
اس کے ننھے سے شرارت بھرے دل کو چھو کر ـــ
لکھنے پڑھنے کے سلیقے کا اعادہ کر لوں!

● Hagalundsgatan - 42 7ER
17150 Solna Sweden

◆

مظفر ظفر عظیمی

کٹھن سمے میں جگ میں آئے نبین کے سردار
گیان سے اپنے کیا انہوں نے مانو کا اڈھار

جب سے ہم نے من مندر میں اس کو لیو بسائے
ساری مایا موہ کی چنتا ہم کو نہیں ستائے

ڈھائی اکھر میں گیان چھپا ہے مورکھ سمجھ نہ پائے
پریم میں جیتے سو جیتے جو ہارے امر کہائے

چنتا ایسی اگنی ہے تن من دھن کو جلائے
اٹھے دھواں نا آگ جلے اندر اندر کھائے

ساگر کی لہریں کچھ کھوجیں ادھر ادھر نا پائیں
پیا ملن کی آس ہے شاید پلٹ پلٹ پھر آئیں

سورج اپنی کرنوں سے اس دھرتی کو چمکائے
جیوں جیوں اترے ساگر میں اندھیارا بڑھتا جائے

چمک دمک نا دیکھ کبھی تو دیکھ نہ ہنستے مکھڑے
ان کے پیچھے دیکھ کبھی اک دل ہے سو ہیں دکھڑے

● P O. Box 217, Doha Qatar (A.G.)

عذرا نقوی
P.O.Box 51178, Riyadh - 51143 (K.S.A.)

بوگن ویلیا کی اوٹ

شکر ہے کل رات بھر لائٹ غائب نہیں ہوئی۔ پنکھا چلتا رہا تو مچھروں سے نجات ملی۔ مدّت بعد پوری رات سونا نصیب ہوا تھا۔ ورنہ روز یہی ہوتا تھا ایک تو لائٹ غائب اور مزید یہ کہ آس پڑوس کے جنریٹر اپنی خوفناک آواز کے ساتھ چالو ہو جاتے تھے۔ پڑوس کے گھر میں تو شاید جنریٹر بالکل ہماری دیوار کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا آواز کے ساتھ اس کا دھواں بھی ہمارے حصّے میں آتا تھا۔

بہر حال آج صبح بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پوری رات کی نیند بھی کیا نعمت ہے۔ لیکن مجھ سے صبح ہی صبح اک غلطی ہو گئی۔ میں نے بے دھیانی میں اپنے کمرے کی باغیچے کے رخ والی کھڑکی کھول دی۔ وہ اپنا منحوس وجود لیے میرے سامنے موجود تھا۔ بیگ صاحب کے مکان کے سامنے وہ اپنی پوری سفاکی سے موجود تھا۔ کوڑے کا ایک اونچا ڈھیر۔ للی اور گلاب کی کیاریوں سے آگے وہ میرا دشمن موجود تھا۔

لاحول ولا قوۃ! میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر پلنگ کے سامنے لگے خوبصورت لینڈ اسکیپ پر نظریں جما دیں جو میں نے وہاں اس لئے سجایا تھا کہ آنکھ کھلے تو صبح سب سے پہلے میری نظر اس خوبصورت منظر پر پڑے۔ خزاں کے موسم کی وہ خوبصورت پینٹنگ جس میں میپل کے درخت نارنجی اور سرخ پتوں سے بوجھل اپنے میں گم کھڑے تھے، نیچے اک پہاڑی نالہ خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ میں اس منظر میں گم ہو جانا چاہتا تھا جو میری دسترس سے باہر تھا لیکن دنیا میں کہیں نہ کہیں تو موجود ہو گا۔ لیکن موجود تو کوڑے کا وہ ڈھیر ہی میرے گھر کے سامنے ہے جو بند کھڑکی سے گذر کر میرے اور اس حسین تصویر کے درمیاں حائل ہو جاتا ہے۔

مجھے کھڑکی پر غصّہ آنے لگا۔ کیا اس سمت کھڑکی کا ہونا ضروری تھا۔ مجھے یاد ہے ابّو نے اوپر کی منزل پر یہ کمرہ خاص طور پر اپنے لیے بنوایا تھا تا کہ سکون سے لکھ پڑھ سکیں۔ ان کے پڑھنے کی میز ہمیشہ کھڑکی کے سامنے ہی ہوتی تھی۔ وہ سال کے بارہ مہینے کھڑکیاں کھول کر سوتے تھے۔ بند کمروں سے انھیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ چند برس پہلے تک میرا بھی یہی حال تھا جب تک یہ بھیانک کوڑے کا ڈھیر میرے گھر کے سامنے نمودار نہیں ہوا تھا۔

آخر بیگ صاحب کو یہاں مکان بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی اور جب بنوا ہی لیا تھا تو رہتے کیوں نہیں۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اب خود ریٹائرمنٹ کے بعد کبھی بیٹی کے پاس چلے جاتے ہیں کبھی بیٹے کے گھر مہینوں جا کر رہتے ہیں۔ پہلے تو ان کے مکان کے سامنے صرف خالی زمین کا اک تکونہ سا ٹکڑا ہی میری آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ لوگوں نے وہاں کوڑا ڈالنا شروع کر دیا تھا کیونکہ ہر طرف خالی پلاٹوں پر مکان بن گئے تھے یہی خالی جگہ بچی تھی۔ بیگ صاحب نے گھبرا کر وہاں دیوار بنوا دی اور لوہے کا پھاٹک لگوا دیا جس میں ہمیشہ موٹا سا تالا لگا رہتا ہے۔ آنے جانے کے لیے وہ صحن کا پچھلا دروازہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے گھر آتا جاتا ہی کون ہے۔ اکیلے آدمی ایک ان کا نوکر۔ دیوار اٹھنے کے بعد وہ ایک تکونہ بڑا سا کوڑے دان محلے والوں کے لیے نعمت بن گیا تھا۔ شروع میں تو بیگ صاحب نے بہت واویلا مچایا لیکن بوڑھے، تنہا آدمی ان کی سنتا کون ہے۔ سنتا تو کوئی میری بات بھی نہیں۔

مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ ارے تم پروفیسر ثاقب سمجھتے کیا ہو خود کو۔ لوگوں نے آپ سے میونسپل کمیٹی کا الیکشن لڑنے کو کہا تو آپ خفا ہو گئے۔

"میں ان لونڈے لپاڑوں کے مقابلے میں الیکشن لڑوں گا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہو گا، ثاقب صاحب کا نشان سائیکل ہے۔ سائیکل کو کامیاب بنائیے۔ اور اگر بفرض محال میں جیت بھی گیا تو وہاں میونسپلٹی میں بیٹھے اور ٹھیکیداروں کے ساتھ سر کھپاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے پروفیسر صاحب۔" میں نے خود سے کہا۔ تو اب جھک مارئیے بند کھڑکی کے پیچھے یا یونیورسٹی میں ان لڑکے لڑکیوں کو اردو ادب پڑھائیے جنھیں کم نمبروں کی وجہ سے کسی اور مضمون میں داخلہ نہیں مل پایا ہے۔

میں خود سے الجھتا ہوا نیچے چلا آیا۔ برآمدے میں چائے کی ٹرے

میرا انتظار کر رہی تھی۔ میری پسندیدہ گرین لیبل چائے کی خوشبو۔ میری مخصوص پیالیاں۔ امی کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی ٹی کوزی۔ دل کو قرار آگیا۔ میں اپنی چائے بنا کر باہر لان میں نکل آیا آج اتوار کی چھٹی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی کم تھا۔ پچھلے دو تین برس سے میں اپنا زیادہ تر وقت اس لان کی دیکھ بھال میں صرف کرتا تھا۔ ایک پارٹ ٹائم مالی بھی آتا تھا۔ صبح شام میں اب یہیں ٹہلا کرتا تھا۔

ابو بتاتے تھے کہ ان کے والد نے سستے زمانے میں یہ تین ہزار گز زمین لے کر ڈال دی تھی۔ جب تو یہ جگہ بالکل ویرانہ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے پار یہاں بس آم کے باغ تھے یا اک نواب صاحب کی پرانی کوٹھی "امیر منزل"۔ "امیر منزل" بچپن میں ہمارے لیے اک پراسرار چیز ہوا کرتی تھی۔

ابو بتاتے تھے کہ انھوں نے ہمارا مکان صرف ۳۰ ہزار روپے میں بنوایا تھا۔ اصل میں ان کے وسائل محدود تھے لہذا چھوٹا سا، سادہ مکان بنوایا تھا اور باقی زمین یوں ہی چھوڑ دی تھی۔ اس میں چند پرانے درخت پہلے ہی سے موجود تھے پھر ابو نے چند گل مہر کے درخت لگائے تھے۔ یہ درخت ہم بہن بھائیوں کے ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ اب پورے گھنے معتبر درخت ہو گئے ہیں اور اب تو میرے سر کے آدھے سے زیادہ بال بھی سفید ہو گئے ہیں۔

آج کتنے دن بعد "امیر منزل" والے نواب صاحب یاد آگئے۔ ہمارے بچپن میں وہ ادھیڑ عمر کے تھے۔ ان کی شکل و وضع قطع، گرجدار آواز مان کے پورٹیکو میں کھڑی پرانی فورڈ، ان کے ڈرائنگ روم میں لگی تلواریں، شیر کا سر، قالینیں سب کچھ ہمارے لیے افسانوی چیزیں تھیں۔ ان کا پوتا جب دہرہ دون کے کسی انگریزی اسکول سے گرمی کی چھٹیوں میں آتا تھا تب ہم اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اب تو سنا ہے وہ کناڈا میں آباد ہو گیا ہے۔

میں اپنی سوچوں میں غرق ٹہلتا ٹہلتا سڑک کی طرف والی دیوار کی طرف آگیا جہاں میں نے لوہے کا جنگلہ بنا کر بوگن ویلیا کی بیل چڑھادی تھی تاکہ دیوار کی اس طرف جو بھی ہو میری نظروں سے اوجھل رہے۔ خوبصورت لال اور سفید بوگن ویلیا کے پھول بہت اچھے لگ رہے تھے۔ لیکن وہ بےہودہ کوڑے کا ڈھیر ان پھولوں سے پرے ضرور موجود ہے، مجھے خیال آیا۔

صبح کی ہوا خوری کی عادت میں نے ابو سے ورثے میں پائی تھی لیکن اب ٹہلنے جاؤں تو کہاں جاؤں۔ ہر طرف مکان ہی مکان، دکانیں، بازار اور سڑکوں پر کیچڑ اور کوڑے کی ڈھیریاں۔ پچھلے سال سے میں یہیں اپنے احاطے میں ٹہل لیتا ہوں۔ گھر کے سامنے اتنی خالی زمین تھی۔ تھوڑے سے حصے کو مہندی کی باڑھ سے گھیر کر میں نے اسے ایک چھوٹے سے لان کی شکل دے دی تھی باقی حصہ یوں ہی پڑا تھا۔ نیم۔ املتاس اور گل مہر کے درختوں کے نیچے محلے کے بچے آکر کھیل لیتے تھے میں انھیں کبھی منع نہیں کرتا۔ یہ بچے آخر کھیلیں تو کہاں کھیلیں۔ آس پاس کوئی کھلی جگہ ہی نہیں ہے۔ میری بیگم اکثر خفا ہو جاتی ہیں کہ کیا مصیبت ہے ہمارا ہی گھر رہ گیا ہے کھیلنے کے لئے۔

مجھے یاد ہے بچپن میں ہم لوگ دن کا زیادہ حصہ گھر کے باہر ہی گذارتے تھے۔ کرکٹ، گلی ڈنڈا، درختوں پر چڑھنا، چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی اس زمانے میں تھوڑی تھوڑی دور پر مکانات بن گئے تھے۔ سڑک ابھی کچی ہی تھی۔ خوب دھول اڑا کرتی تھی۔ سردی کے موسم میں باہر گڈھا کھود کر ہرے ہرے ہولے (چنے) بھون کر کھایا کرتے تھے خوب ہاتھ منہ کالا کر کے امی سے ڈانٹ کھاتے تھے۔ باجی آم کے نیچے ہنڈکلیا پکاتی تھیں۔ میری بیٹی تو شاید جانتی بھی نہیں ہنڈکلیا کیا ہوتی ہے۔

مجھے بے اختیار باجی کی یاد آنے لگی۔ تین سال ہو گئے ان سے ملے۔ جب وہ چھ سال کی مدت کے بعد امریکہ سے آئیں تھیں۔ کیسا شاک لگا تھا انھیں سب کچھ دیکھ کر۔ مکان ہی مکان۔ آبادی ہی آبادی۔ وہ "امیر منزل" کے سامنے لگے اس پرانے پیپل کو ڈھونڈ رہی تھیں جس کے نیچے سے گذرتے ہوئے وہ ڈرا کرتی تھیں کیونکہ لوگ کہتے کہ پیپل پر چڑیلیں اور چھلاوے بیریاں رہتی ہیں۔ وہ کہنے لگیں۔

"بھیا مکانوں اور دکانوں کے اس جنگل میں وہ گھنا پیپل کا پیڑ نظر نہیں آتا۔"

"تم پیپل ڈھونڈ رہی ہو باجی۔ "امیر منزل" کہاں ہے۔" "وہ کہاں گئی۔ امیر منزل کہاں گئی۔" وہ ہسٹریکل انداز میں بولیں۔ میں نے سامنے لگے بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر امیر منزل بلڈنگ کامپلیکس کا بورڈ لگا تھا اور زیر تعمیر فلیٹوں کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ پلاننگ ہو چکی تھی۔ بنیادیں تیار تھیں اور چاروں طرف لوہے کے سریئے، اینٹیں اور مزدوروں کی جھگیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ مزدور مکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں بہار سے آکر کام کرتے تھے۔

باجی کے چہرے کی وحشت مجھے آج تک یاد ہے۔ میں باجی کو کیا بتاتا کہ پورے تین مہینے امیر منزل کو میں نے کیسے معدوم ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ روز یونیورسٹی جاتے ہوئے میں اسے ٹوٹتے دیکھتا تھا۔ آخر میں ڈرائنگ روم والا پتھر کا آتشدان توڑنے میں سنا ہے مزدوروں کو بہت مشکل ہوئی تھی۔ وہی آتشدان جس کے اوپر لگا شیر کا سر دیکھ کر ہم ڈر جاتے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ پچھلے ہفتے باجی کا خط آیا تھا کہ شاید اس سال دسمبر کی چھٹیوں میں وہ ہندوستان آئیں۔ اور اس بار عین ہمارے گھر کے سامنے یہ نکوٹا کوڑے دان ان کا استقبال کرے گا۔ میری نظریں بلاارادہ دیوار کی طرف اٹھ گئیں۔ بوگن ویلیا کے دوسری طرف اب وہ کوڑے کا

ڈھیر جاگ گیا ہوگا۔ جھگیوں میں رہنے والے بچے اس میں سے پلاسٹک کی تھیلیاں چنتے ہیں۔

اف یہ بد تمیز۔اڑیل۔بد وضع پلاسٹک کی تھیلیاں ہر جگہ موجود ہیں آجکل۔دکانوں میں، سڑکوں پر، کوڑی پر اور نالیوں میں اڑی ہوئی۔ میری بیگم کہتی ہیں کہ میں جھکی ہو گیا ہوں۔ دکان داروں سے الجھ پڑتا ہوں کہ کیوں اتنی زیادہ پلاسٹک کی تھیلیاں دیتے ہو۔وہ کہتی ہیں کہ آپ کا بس چلے تو میرے ہاتھ میں کپڑے کا گنوار و تھیلا دے کر بازار بھیج دیں۔وہ کہتی ہیں کہ آپ نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر مسئلے کا۔

بیگم شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میں نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر چیز کا۔ میرے پھاٹک کے سامنے اک نئی، لال رنگ کی ماروتی ۱۰۰۰ آ کر رک گئی اور اس میں سے ٹھیکیدار سمیع اللہ اور ان کے ساتھ اک صاحب سفید چمکیلے سے سوٹ میں ملبوس اترے۔

"السلام و علیکم ڈاکٹر صاحب"۔ سمیع اللہ نے لان کے پھاٹک سے ہی آواز لگائی۔ "چہل قدمی ہو رہی ہے۔بہت ٹھیک ٹھاک جگہ بنائی ہے آپ نے۔"

میں سوچنے لگا کہ میرے باغیچے کی تعریف "ٹھیک ٹھاک جگہ" کہہ کر تو صرف ٹھیکیدار صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

"آپ سے ملیے آپ ہیں عبدالباری صاحب" سمیع اللہ صاحب نے چمکیلے سوٹ والے صاحب کا تعارف کرایا۔

"برسوں دبئی رہ کر آئے ہیں۔ یہاں سٹیل ہونے کا اور کاروبار کا ارادہ ہے۔ بہت بڑی پارٹی ہے۔"

عبدالباری صاحب نے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا میں نے اندر چل کر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ بولے۔

"یہیں باہر بیٹھتے ہیں بہت اچھی جگہ ہے۔"

"شکریہ" میں خوش ہو گیا۔ "یہ دیکھیے میں نے گلاب کی اک خاص ورائٹی منگوا کر لگوائی ہے۔ باغبانی اور یہ باغیچہ ہی اب میری زندگی ہے۔" ٹھیکیدار سمیع اللہ نے لان میں پڑی بید کی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا اور بولے۔

"صاحب یہی تو بات ہے۔ آپ تو سمجھیے سونے کی کان پر بیٹھے ہیں۔"

"اس کاروباری لہجے سے میں کچھ الجھ سا گیا۔ وہ کہہ رہے تھے

"آجکل آپ کے علاقے میں زمین تو سونے کے بھاؤ ہے۔ یہی زمانہ ہے لوگ اپنی قسمتیں بنا رہے ہیں۔

"کس کی" میں چپ نہ رہ سکا۔ "اپنی قسمت یا زمین کی قسمت"

"ہاہاہا!" وہ دونوں خوب محظوظ ہوئے۔

عبدالباری صاحب نے کہا۔

"بھئی آپ ادبی لوگ بھی بات کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب" ٹھیکیدار سمیع اللہ ذرا سرگوشی کے لہجے میں جھک کر بولے۔

"آپ تو سمجھئے کہ لکھ پتی ہیں۔اس علاقے میں جس کے پاس زمین ہے سمجھئے وہ تو سونے کی کان پر بیٹھا ہے۔ اتنی بہت سی فالتو زمین پڑی ہے آپ کے گھر کے سامنے۔ عبدالباری صاحب مارکیٹ سے بھی زیادہ دام دینے کو تیار ہیں۔ کیونکہ موقع کی زمین ہے۔"

مجھے کچھ یقین ہی نہیں آیا کہ سمیع اللہ یوں بے دھڑک سودے کی بات کریں گے۔

میں نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نارمل آواز میں پوچھا۔ "گویا آپ میرا گھر خریدنے آئے ہیں۔"

وہ بولے۔ "ہاں اگر زمین کے ساتھ اپنا مکان بھی بیچنا چاہیں تو واہ!واہ۔ بلکہ یہی بہتر ہوگا۔ آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔"

بڑی مشکل سے یہ الفاظ میرے منہ سے نکل سکے۔

"تشریف لے جایئے آپ دونوں۔ میرے گھر کے دام لگانے آئے ہیں۔"

عبدالباری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صاحب! آپ تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو گئے۔ ہم تو آپ کے بھلے کیلئے آئے تھے۔ مارکیٹ سے کچھ اور زیادہ دے دیں گے سوچ لیجئے"

سمیع اللہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کار کی طرف چل پڑے وہ کہہ رہے تھے۔

"اجی چھوڑیے۔ تھوڑے دن کی بات اور ہے۔ دبائے بیٹھے رہیں زمین۔ یہ سامنے والی کوڑی تو بھر گئی۔ اب ان کے ہی احاطے کی باری ہے۔"

میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر سوچا کہ مجھے اپنے احاطے کی دیوار اور کتنی اونچی کرانی پڑے گی۔ **

بقیہ صفحہ ۳۵ : راستی ھے ایك راہ پر خطر

اتفاقاً جیل کی سیر کو جانا پڑا تو اپنی گدی پر اپنی بیوی کو بٹھا دیتے ہیں اور جنتا کو یقین دلا دیتے ہیں کہ عوام کی بھلائی اسی میں ہے۔اس لئے جو لوگ دنیا میں دولت و طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ "سانچ کو آنچ نہیں" "راستی سیدھی سڑک ہے" اور "Honesty is the best policy" قسم کی باتیں صرف کتابوں میں لکھنے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ خود ان پر ہرگز عمل نہ کریں اور جھوٹ بولنے کے فن میں زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کریں۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔ **



عتیق انظر

مری زمیں سے جدا اپنے آسماں سے الگ
بھٹک رہا ہے کہاں چاند سائباں سے الگ

کبھی کسی کے فریبِ وفا میں مت آنا
کہ لوگ ہوتے ہیں دل سے جدا زباں سے الگ

میں اختلاف کے انجام سے بھی واقف ہوں
مرا بیان ہے پھر بھی ترے بیاں سے الگ

ترے وجود میں میں ہر جگہ نمایاں ہوں
کرے گا مجھ کو تو آخر کہاں کہاں سے الگ

چلو وہیں سے کریں ابتدا رفاقت کی
ہمیں ستاروں نے لڑ کر کیا جہاں سے الگ

خبر نہیں ہے نتیجے کی اس پرندے کو
ہوا کی شہہ پہ اڑا ہے جو کارواں سے الگ

● P.O. Box. 10894, Doha, Qatar (A.G.



سعید روشن

سفر میں دور تک سائے نہیں ہیں
مگر ہم پھر بھی گھبرائے نہیں ہیں

یہ کچے بیر جو کھائے نہیں ہیں
پرندے لوٹ کر آئے نہیں ہیں

یہ کس کی بات کرتے ہو میاں تم
مقابل ہم ابھی آئے نہیں ہیں

وہ اپنے بوجھ سے ٹوٹی پڑی ہے
ہوا نے ہاتھ پھیلائے نہیں ہیں

چلو روشن اسی جانب چلیں اب
جہاں پر جذبے دفنائے نہیں ہیں

● P.O. 21538 Safat 13076 Kuwait (A.G.)

جمشید مسرور

تلخ تلخ لمحے ہیں سرد سرد تنہائی
کس لئے کھلے غنچے کس لئے بہار آئی

یوں الجھ گئے موسم کچھ پتہ نہیں چلتا
کس طرف گئے سورج کس طرف گھٹا چھائی

دیکھئے مآل اس کا دھند ہو کہ آندھی ہو
ہم ہیں گرم ملکوں کے اور حسن سرمائی

آندھیاں سی چلتی ہیں ذہن کے دریچوں میں
آج کتنی شدت سے پھر کسی کی یاد آئی

منصفوں سے بھی اک دن پوچھتے چلیں یارو
تم نے کس طرح کاٹی ہم نے جو سزا پائی

اجنبی زبانیں جب بات کہہ نہیں پاتیں
بولنے لگے اس کا نغمۂ خود آرائی

● Lindebergasen 46 A, N -1068, Oslo 10 Norway

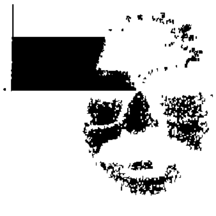


حنیف ترین

جب ترسیل بٹن تک پہنچی

ن، ترانامہ
ملتا تھا ہمیں
س کے الفاظ تلے
د تیں، معنی کی تشریحوں میں
طف کا سیل رواں رہتی تھیں
اتیں، بستر پہ
شہ خواب کا رکھ دیتی تھیں
عطر میں ڈوبی ہوئی دھوپ کی پیائش پر
چاندنی، نیند کو لوری کی تھپک دیتی تھی
ہن میں صبح و مسا
ک عجب فرحت نورستہ سفر کرتی تھی
لیکن اب ... قربتیں ہیں بہم
ساعت کو ... مگر ......
فون کی گھنٹی کو سننے کو ترستی خواہش
منقطع رابطہ پانے کیلئے کوشاں ہے
انگلیاں رہتی ہیں
ایک ایک بٹن پر رقصاں
یہی معمول ہے مدت سے
مگر، ٹیلی فون
ایک خاموش صدا دیتا ہے
سلسلہ لمحوں کا
صدیوں سا بنا دیتا ہے

● P.O. Box 378, Arar (K.S.A.)



محمد ممتاز راشد

گم شدہ میراث

اپنی اچھی روائتیں ساری
ہو رہی ہیں جو ہر گھڑی پامال
ان کو تخریب سے بچانا ہے
ان پہ افتاد کا جو عالم ہے
اس کا کچھ سدباب کرنا ہے

اپنے اچھے رواج ، عمدہ اصول
ہو چکے ہیں جو نیست و نابود
ان کو پھر سے فروغ دینا ہے
ان کو پھر سے بحال کرنا ہے
خود کو "پھر" باکمال کرنا ہے

اپنی ایسی روایتیں ساری
جو مضر ہیں ، مگر مروّج ہیں
ان سے دامن بچا کے چلنا ہے
ان کو جیسے بھی ہو بدلنا ہے

جتنے رسم و رواج ہیں معقول
وہ کسی ملک و قوم کے بھی ہوں
اور ہمارے لیے بھی ہوں موزوں
ان کو بس یہ سمجھ کے اپنالیں
وہ ہیں اپنی ہی گمشدہ میراث

● P.O. Box No. 41, Drawing Office, Doha, Qatar



غفار حسنی

بارش کے ننھے ننھے قطرے
حسرت سے چاہت سے لجا سے
پتوں کے پھولوں کے جسموں کو
نہلاتے ہیں ٹھنڈے پانی سے

سورج کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں
اپنی مدھم مدھم سانسوں سے
چن لیتی ہیں بارش کے قطرے
پھولوں کی چوڑی پیشانی سے

بھیگے بھیگے موسم کی خوشبو
رنگ دیتی ہے اپنے ہی رنگ میں
پتوں کے پھولوں کے ہونٹوں کو
اپنے نازک نازک ہاتھوں سے

پھولوں کے ہونٹوں کا میٹھا پن
ابھی بھونروں کو اکساتا ہے
پھولوں کے چہروں کا کھلتا رنگ
فطرت کے ہاتھوں مٹ جاتا ہے

قدرت کے پوشیدہ ہاتھوں سے
ہر شئے میں تبدیلی آتی ہے
یہ دنیا بھی کیسی دنیا ہے
زندہ رہ کر بھی مرجاتی ہے

● P.O. Box No.8, Damam - 31411 (K.S.A.)

سلطانہ مہر

خیال رکھنا

بڑے جتن سے جلائے ہم نے
دیئے ہزاروں محبتوں کے
رفاقتوں کے، مسرتوں کے
بجھا نہ پائے ہوائے وحشت
کہ ان سے روشن ہماری چاہت
اے میرے صاحب
خیال رکھنا
قدم نہ روکے کوئی بھی طاقت
کوئی قیامت کوئی عداوت
نہ بننے پائے کوئی رکاوٹ
خیال رکھنا

اے میرے صاحب
رفاقتوں کے دیئے جلانا
وصال لمحوں کو بھی سجانا
انا بھی روکے تو رک نہ جانا
انا کو دیوار مت بنانا

● 20673 East Walnut Canyon
Rd, Walnut, Ca 91789 (USA)

تسنیم عابدی

شجر بے سایہ

جب تمہیں یاد کبھی آئیں تو اتنا کرنا
آسمانوں کی بلندی پہ نظر کر لینا
بس سمجھ لینا کہ انسان ہے مجبور بہت
اور اس شہر محبت میں ہیں منشور بہت
منصب عشق بھی تو خود ہی ملا کرتا ہے
شکل الہام میں پیغام وفا ملتا ہے
ہاں نبھانے کے لیے خون جگر چاہیے ہے
عشق میں دل ہی نہیں ساتھ میں سر چاہیے ہے
کم ہیں وہ لوگ جو اس راہ سے زندہ لوٹے
صرف یوسف ہی فقط چاہ سے زندہ لوٹے
ابن آذر سے بھلا آتش دل کم تو نہیں
ہم کو اس آگ میں جل جانے کا کچھ غم تو نہیں
گر خطاوار ہمیں ہیں تو پلٹ جائیں گے
اپنے احساس کی چادر میں سمٹ جائیں گے
اور گر ٹوٹ گیا دل تو یہ قسمت اپنی
آ کے لے جاؤ نگاہوں سے محبت اپنی
ہم سمجھ لیں گے مسافت ہی فقط لکھی تھی
اپنی قسمت میں مشقت ہی فقط لکھی تھی
عشق کا پیڑ کبھی سایہ بھلا دیتا ہے!!
دل کو بس عشق کا اک روگ لگا دیتا ہے

● P.O. Box 2035, Abu Dhabi (UAE)



اسنیٰ بدر

سنو بس کرو اب

نہیں یاد آؤ
کہ لفظوں کا اتنا زیادہ دباؤ
مرے ذہن کو دے رہا ہے وہ گھاؤ
جو اتنا ابھرتا ہے
جتنا مٹاؤ
تعلق کا کوئی بھی مرہم لگاؤ
وفا کا نیا سے نیا گیت گاؤ
مگر ایک آنسو
(جو ہر سمت دھندلی کیے دے رہا ہے)
مری اتنی روشن نگہ سے اٹھاؤ
نہیں یاد آؤ
سنو بس کرو اب

● 53 - Geraldrige Road,
Hay Mills, Birmingham B25 8BE
England (UK)

عطیہ خان
52 - Brentway, London N3 IAP (U.K.)



راستی ہے ایک راہ پر خطر

راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

یہ شعر ہم نے بچپن میں پڑھا تھا اور یہ ہمارے دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ بچپن میں سادگی کی وجہ سے ہر بات سن یا پڑھ کر یقین کر لینا عام بات ہے اور ہمارے اندر یہ سادگی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھی اس لیے ہم نے راستی کی سڑک کو اپنا لیا۔ اس راہ پر چل کر قدم قدم پر جو ٹھوکریں کھائیں اور دھکے لگے اگر ہم انھیں بیان کریں تو لوگوں کی اب تک ہمارے بارے میں جو بھی رائے ہو ہمارے تجربات سن کر یقیناً ہمیں احمق سمجھنے لگیں گے اس لیے خاموش رہنا بہتر ہے۔ عمر کے ساتھ کچھ حاصل ہو یا نہ ہو تھوڑا سا تجربہ تو حاصل ہی ہو جاتا ہے اور یہ تجربہ ہمیں خاموش رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

سچ بولنے والے انتہائی سادہ لوح بلکہ بیوقوف ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں جس کی ایک زندہ مثال ہم ہیں راستی کو سیدھی سڑک سمجھ کر اس پر چلے تو زندگی میں کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ ٹھوکریں کھا کر ہر بار ہم نے سچ بولنے کی عادت کو ترک کرنے کی کوشش ... جس کو جو عادت پڑ جائے اسے چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، خواہ وہ جوا کھیلنے کی عادت ہو یا ... پینے کی یا سچ بولنے کی۔ اس عادت کے نقصانات کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے ... نہیں ہوتا اس لیے ہم یہ تحریر بطور مشورہ لکھ رہے ہیں کہ "من نہ کردم شما حذر بکنید"

سچ بولنے کا دعویٰ تو ہر ایک کرتا ہے لیکن دنیا میں ایسے فاترالعقل کم ہی ہوں گے جو کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ جھوٹ کے بغیر دنیا کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا لیکن جھوٹ کی ڈگری میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ ورنہ تا، مجبوراً اور مصلحتاً تو سب ہی کو کبھی نہ کبھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ ہمارے جیسے لوگ بھی اس سے پرہیز نہیں کر سکتے۔ ہمارے بزرگ شیخ سعدی نے بھی "دروغ مصلحت آمیز" کی حمایت کی ہے۔ لیکن بعض لوگ عادتاً جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ لوگ قسمیں کھا کر دوسروں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے ایسے لوگ جھوٹ بول کر اسے سچ ثابت کرنے کے ہنر میں ماہر ہوتے ہیں بلکہ شاید انھیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ خود کو بھی یقین دلا لیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔ ایسے شخص کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ سچ بول سکے۔ اگر وہ کسی دفتر میں کلرک ہے تو لوگوں کو بتائے گا کہ وہ منیجر ہے۔ جتنی اس کی تنخواہ ہے اس سے چار گنا بڑھا کر بتائے گا۔ یوں تو ایسے لوگ ہر ملک اور ہر سماج میں پائے جاتے ہیں لیکن برصغیر میں ایسے لوگوں کی تعداد خاص طور سے ذرا زیادہ ہی ہے۔ ان سے واقفیت کی ابتدائی منزلوں میں تو سیدھے سادے لوگ ان کی بات کا یقین کر لیتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور حقیقت وہ اپنی ہی مختلف بیانی سے واضح کرتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ جھوٹ بولنے والے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے ایک وقت جو کچھ کہتا ہے وہ دوسرے وقت یاد نہیں رہتا مثلاً ایک کلرک جو ایک بار خود کو منیجر بتائے گا وہ دوسری جگہ کہے گا کہ وہ انسپکٹر ہے اگر کسی نے پکڑ لیا تو بڑی خوبی سے بات بنا دے گا "ہم بھی تو انسپکٹر ہوں لیکن منیجر کی حیثیت سے میرا انتخاب ہو چکا ہے۔"
جھوٹ بولنے والوں کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے وہ اگر جھوٹ بولتے کے بعد پکڑے گئے تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہیں گے "ارے ہم ... مذاق کر ... "

در حقیقت قصۂ آدم کو رنگین بنانے کے لیے جھوٹ کا رنگ انتہائی لازمی ہے۔ اگر دنیا میں ہر شخص ہر وقت سچ ہی بولے تو دنیا کتنی بے رنگ اور سپاٹ ہو جائے۔ عشق تو لوگوں کو انتہائی معمولی بلکہ بدصورت عورتوں سے بھی ہو جاتا ہے مثال کے طور پر پرنس چارلس کو لے لیجیے کہ شہزادی ڈائنا جیسی خوبصورت بیوی کے مقابلے میں کمیلا پر عاشق ہوئے۔ لیکن ہر عاشق اپنی محبوبہ کے حسن کی تعریف کرتا ہے۔ اگر کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے کہے "تم بہت بدصورت ہو لیکن مجھے تم سے عشق ہے۔" بات تو سچ ہو گی لیکن اس سچ پر وہ محبوبہ اسی وقت ناراض ہو کر عاشق صاحب کو دروازہ دکھا دے گی۔ سچائی کڑوی ہوتی ہے اور اپنے

برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ لوگ سچ کے مقابلے میں بناوٹ، تملق اور جھوٹی تعریفوں کو پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب کی بنیاد ہی میں یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ اکثر دعوتوں میں کھانا اتنا بدمزہ ہوتا ہے کہ حلق سے نہیں اترتا لیکن مہمان، میزبان کو خوش کرنے کے لیے یہی کہتے ہیں کہ کھانا بہت مزے دار تھا۔

دنیا کا کاروبار چلانے کے لیے جھوٹ بولے بغیر گذارہ ہی نہیں۔ اگر ہر مجرم اپنے جرم کا اقرار کرلے کہ یہ قتل یا کوئی بھی جرم اس نے کیا ہے تو اس کو اس کے جرم کے مطابق سزا دے دی گئی اور قصہ ختم۔ مدعی، مدعاعلیہ، مصنف، گواہ، وکیل، عدالت، جیوری کسی کی ضرورت نہیں رہی ۔ کتنے لوگ بے روزگار ہو جائیں گے۔ بات تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جبکہ مجرم یا ملزم اپنی مذہبی کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہے گا سچ کہے گا اور سچ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہے گا اور اس قسم کے بعد مجرم جب بولنا شروع کرتا ہے تو اس میں سچ کے علاوہ باقی سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر وکیل، جج اور جیوری مل کر اس جھوٹ میں سے چھانٹ پھٹک کر کے وہ ثبوت تلاش کرتے ہیں جن کی بنا پر اسے قصوروار یا بے گناہ ثابت کیا جاسکے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اپنی جان بچانے اور دوسرے کی گردن پھنسانے کے لیے جھوٹ بولنا لازمی ہوتا ہے۔ خود وکیل بھی اپنے موکل کو جھوٹ بولنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اپنے موکل کو سچا اور مدعی کو جھوٹا ثابت کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، اور اکثر بلکہ بیشتر اصلی مجرم تو چھوٹ جاتا ہے اور کوئی غریب بے گناہ ملزم سزا پا جاتا ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عدالت میں جھوٹ بولے بغیر کام نہیں چل سکتا تو مذہبی کتاب کی قسم دلوا کر یہ گناہ کیوں کروایا جاتا ہے۔ وہ مذہبی رہنما جو اپنے مذہبی صحیفے کی ذرا سی بھی بے حرمتی دیکھتے ہیں تو فوراً مارنے مرنے (عموماً مارنے) پر اتر آتے ہیں وہ عدالتوں میں ان کی قسم کھا کر جھوٹ بولنے کو ان مقدس کتابوں کی بے حرمتی نہیں سمجھتے؟ کچھ دن پہلے ایک شعر نظر سے گذرا تھا۔

تہذیب کے خلاف ہوا سچ کا بولنا
اب جھوٹ زندگی کے سلیقے میں آگیا

شعر تو بہت پسند آیا لیکن اس کے ایک لفظ پر ہمیں اعتراض ہے ۔ وہ لفظ ہے "اب" جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی تھا جبکہ جھوٹ زندگی کے سلیقے میں شامل نہیں تھا۔ ہم تو تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے ماضی میں جتنی دور بھی جاسکتے ہیں ہمیں سچ بولنے والوں کا برا حشر ہوتا نظر آتا ہے۔ سچ بولنے کے جرم میں کسی کی زبان کھینچ لی گئی، کسی کی گردن اڑا دی گئی اور کسی کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔

اگر جھوٹ زندگی کے سلیقے میں شامل نہ ہوتا تو قصیدے جو ہمارے ادب کا ایک اہم حصہ ہیں ان سے اردو کا دامن خالی رہ جاتا۔ شاعروں کی روٹی روزی کے معاملات سچ بول کر تو طے ہو نہیں سکتے تھے کہ کوئی شاعر دربار میں حاضر ہو کر کہتا" جناب آپ انتہائی ظالم اور سفاک بادشاہ ہیں لیکن آپ حاکم وقت ہیں اس لیے اپنی رعایا کی دیکھ بھال آپ کا فرض ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ میری گذربسر کے لیے وظیفہ مقرر کردیجیے۔" سچ بولنے کے جرم میں اس شاعر کی زبان وہیں کھینچ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی جاتی ۔ بیچارے شاعروں نے حکمرانوں کی سرپرستی اور خوشنودی حاصل کرنے اور ان سے وظیفے لینے کے لیے اپنی خودداری کو پس پشت ڈال کر ان کی کیسی کیسی جھوٹی تعریفیں کیں۔ غالب جیسا شاعر جس کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ "الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وانہ ہوا" وہ بھی، جب بہادر شاہ ظفر کی ناراضگی کا اندیشہ ہوا تو "کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے" کہہ کر کس شان سے جھوٹ بولتے ہیں اور استاد شاہ ذوق کے مقابلے میں اپنی شاعری کو کمتر دکھانے کے لیے کہتے ہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ذرا تصور کیجیے غالب کی بحیثیت شاعر کوئی اہمیت نہیں ہے ان کی شہرت ان کے آبائی پیشے سپہ گری کی وجہ سے ہے۔ وہ میدان جنگ میں زرہ بکتر پہنے، گھوڑے پر سوار، ایک شمشیر آبدار ہاتھ میں لیے دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ذرا سی دیر میں کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں اور دشمن کو شکست فاش دے کر شان سے کامیابی کی خبر لے کر دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور بہادری کا تمغہ مع خلعت و انعام و اکرام کے حاصل کرتے ہیں۔ غالب کے متعلق یہ تصور ہی کتنا مضحکہ خیز ہے۔

جھوٹ نہ صرف انفرادی طور پر بولا جاتا ہے بلکہ اجتماعی طور پر یعنی حکومتوں کی طرف سے بھی بولا جاتا ہے۔ ہر ملک دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل دیتا ہے مثلاً اگر کسی ملک کے ایک فرقے کے لوگ اپنی حکومت سے ناخوش ہیں، اس کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہیں یا اپنے علاقے کو خود مختار بنانا چاہتے ہیں تو پڑوسی ممالک اس فرقے کو ہتھیاروں سے لیس کرتے ہیں۔ اس فرقے کے لوگوں کو فوجی تربیت دیتے ہیں اور ہر طرح سے انھیں اپنے ملک کے خلاف بھڑکا کر اپنے پڑوسی ملک کو کمزور بنانے میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں لیکن اعلیٰ الاعلان ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل دینا انھیں قطعی ناپسند ہے۔

عمر کے معاملے میں بھی لوگ سچ بولنے میں بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ یوں تو عمر چھپانے کا رواج غالباً عالمی حیثیت رکھتا ہے لیکن مغرب میں پیدائش کے سرٹیفکیٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پھر سالگرہ منانے کا بھی رواج ہے اور زیادہ تر لوگ عمر اتنے ہی سالوں کی

بتاتے ہیں جتنے سالوں کی سالگرہ منا رہے ہیں۔ ویسے یہاں بھی اکثر لوگ عمر چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ میں پیدائش اور موت کا ریکارڈ ایک دفتر میں محفوظ رہتا ہے اور جب کسی کی عمر سو سال ہو جاتی ہے تو ملک کی طرف سے اسے مبارکباد کا پیغام بھیجا جاتا ہے۔ کچھ دن پہلے ایک خبر پڑھی کہ ایک شوہر اپنی بیوی کو ہمیشہ اپنے سے ایک سال چھوٹا سمجھتا رہا۔ جس دن بیوی کے پاس ملک کا اس کی سویں سالگرہ پر مبارکباد کا پیغام آیا تب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی دراصل اس سے دو سال بڑی تھی۔ اگر بیوی کی موت سویں سالگرہ سے پہلے ہی ہو جاتی تو یہ راز شوہر پر کبھی عیاں نہ ہوتا۔ ان کی شادی جب ہوئی تھی اس وقت بیوی کی عمر شوہر سے زیادہ ہونا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے بیوی نے اپنی عمر تین سال کم بتائی اور اسے اس طرح نبھایا کہ خود بھی اپنی اصلی عمر بھول گئی۔ لیکن اب اس کی اصلی عمر کا انکشاف ہوا اس وقت تک "ٹوائے بوائے" عام ہو چکے تھے اس لیے شوہر کو یہ خبر پھیلانے میں کوئی شرم نہیں محسوس ہوئی۔

مغرب میں عمر چھپانے والے کم ہی ہوتے ہیں لیکن مشرق میں خود کو کم عمر ظاہر کرنا بہت عام بات ہے۔ اسکول میں داخلے کے وقت والدین بچوں کی عمر ہمیشہ کم کر کے لکھواتے ہیں۔ اگر داخلے کے وقت یہ ممکن نہ ہو تو بعد میں حلف نامے کے ذریعہ کم کروا دیتے ہیں اس کے باوجود بھی لوگوں کو ہم یہی کہتے سنتے ہیں کہ بہت کم عمری میں اسکول میں ان کا داخلہ ہوا تھا اس لیے والدین نے عمر بڑھا کر لکھا دی۔ جو عمر ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ میں لکھی ہے وہ ان کی اصلی عمر سے بہت زیادہ ہے۔ شادی کے وقت عمر کم بتانے کا رواج عام ہے۔ بہت سے لوگ ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ پر عمل جراحی کر کے بھی عمر کم کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملنے والوں میں ایک صاحب ہیں جن کی عمر ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ میں ۱۹۳۰ لکھی تھی۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور سرکاری ملازموں کو ۵۸ سال کی عمر میں ریٹائر ہونا پڑتا تھا ان کی شادی ذرا دیر سے ہوئی پھر اولاد نرینہ کی خواہش میں پانچ بیٹیاں پیدا ہو گئیں۔ جب چھٹی بار خدا نے انھیں بیٹے سے نوازا تو وہ اپنی عمر کی چوتھائی دہائی کے آخری حصے میں پہنچ چکے تھے۔ دوراندیشی اور سوجھ بوجھ تو ہمارے قومی کردار میں بھی شامل نہیں ہے۔ ہماری حکومتیں بھی یہ نہیں سوچ پاتیں کہ ایٹم بم بنا کر ایٹمی طاقتوں میں شامل ہو جانا زیادہ سود مند ہے یا ملک سے غریبی، جہالت، بیروزگاری اور پسماندگی دور کر کے پچھڑے ہوئے ملکوں کی صف سے باہر نکل آنا زیادہ فائدے مند ہے۔ تو ان صاحب نے بھی بچے پیدا کرتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ آدھے درجن بچوں کی پرورش کے لیے کافی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ریٹائرمنٹ قریب آ گیا تو انھیں احساس ہوا کہ ابھی تو کئی لڑکیوں کی شادیاں کرنا ہیں۔ بیٹے کی ساری تعلیم باقی ہے۔ اور اچھی تعلیم دلانے کے لیے اچھے پیسوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جو پنشن ملے گی اس میں اخراجات پورے کرنا ممکن نہ ہوگا۔ ملازمت کے دوران تو تنخواہ کے علاوہ اوپر کی بھی آمدنی ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنا ہائی اسکول کا سرٹیفکٹ نکال کر ۱۹۳۰ کو بڑے سلیقے سے ۱۹۳۸ بنایا۔ کلرک کو رشوت دے کر اپنی سروس بک غائب کرائی۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں عمر کا اندراج تھا اسے غلط ثابت کرنے کے لیے ہائی اسکول کا سرٹیفکٹ پیش کیا اور مزید آٹھ سال تک ملازمت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر جھوٹ بولنے کی اس جرأت رندانہ سے محروم ہوتے تو آٹھ سال تک ملازمت کر کے جو پیسہ کمایا اس سے بھی محروم رہتے۔

عمر کم بتانے کے بہت سے فائدے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ اپنی عمر کم بتاتے ہیں خود کو کم عمر سمجھنے بھی لگتے ہیں۔ دوسروں پر بھی اس کا رعب پڑتا ہے ان کی کامیابی سے لوگ مرعوب ہوتے ہیں کہ اتنی کم عمری میں اتنا کام کر ڈالا۔ عموماً زیادہ عمر کے لوگوں کو اس لیے اہمیت نہیں دی جاتی کہ اب تو یہ جانے ہی والے ہیں ان سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اسی لیے اکثر بزرگ اپنی عمر آٹھ دس سال کم کر کے بتانے لگتے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی صحیح عمر نہ معلوم ہونے سے ایک فائدہ ان کے مرنے کے بعد یہ بھی ہوتا ہے کہ ان پر تحقیقی کام کرنے والوں کو ان کی صحیح تاریخ پیدائش متعین کرنے کا کام مل جاتا ہے۔

اقبال نے کہا تھا "سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ" ہمارے ملک میں جمہوریت تو آئی اور ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن جمہور کی سلطانی تو نہیں آئی مگر بہت سے سیاستداں جمہوریت کا نام لے کر سلطان بن گئے۔ آج کل جس پیشے میں سب سے زیادہ پیسہ کمایا جا سکتا ہے وہ ہے سیاست۔ جن سیاستدانوں کو چند روز کے لئے بھی وزارت مل جاتی ہے ان کی بن آتی ہے۔ جگہ جگہ وہ اپنے لئے گھر خرید لیتے ہیں اور ان کے گھروں کے کونوں کھدروں میں نوٹ بھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس پیشے میں داخل ہونے کے لیے نہ تو کسی ڈگری کی ضرورت ہے اور نہ کسی تعلیمی قابلیت کی۔ صرف جھوٹ بولنے کے فن میں مہارت ہونی چاہیے۔ ووٹ دینے والوں کو یہ یقین دلا دینا کہ انھیں ووٹ دینے کے بعد ان کے بچوں کی تعلیم مفت ہوگی، ان کے مفت دوا علاج کا انتظام ہو جائے گا۔ ان کے محلے کی گندگی دور ہو جائے گی انھیں روزگار مل جائے گا غرضیکہ ان کے سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ ووٹ دینے والوں کو سبز باغ دکھانے میں جتنی مہارت ہوگی اتنی ہی شاندار کامیابی نیتاجی حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ووٹ دینے کے بعد غریب ووٹر تو غریب ہی رہتے ہیں لیکن نیتاجی کے الیکشن جیتنے کے بعد غریبی ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتی ہے اور اگر ایک بار نیتاجی کسی گدی پر بیٹھ گئے تو اپنی گدی کو ہوشیاری سے موروثی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اگر نیتاجی کو

(باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھئے)

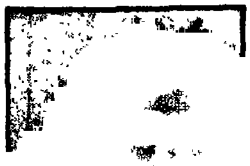


نعیمہ ضیاء الدین

دسترس

یہ متحرک پٹے پر بھاگتے قدموں کا نادیدہ سفر
برہم فشارِ خون کو اس مشتعل رفتارِ دل کو
اس سبک ہموار لہروں پر رواں بجرے کی سی آسودگی
دینے کا حیلہ ہے
حیاتِ عارضی کے وقفہ منظر میں جیسے کہ بڑھے دھیرج سے
نخلستان کا سایہ
تھکے قدموں کو جب چاہو، سنہرے رتھ سے تم آزاد کر ڈالو
بٹن پر دسترس رکھتے ہوئے دستِ تمنا میں سفر کا اسم پوشیدہ ہے
یوں اس طور گردش پا سکوں، دونوں تمہارے ہیں...
طبیب...!
اپنے کہے کو پھر سے دہرا کر ہے کب کا جا چکا
پر یہ مری رفتارِ دل، برہم فشارِ خون، دونوں ہی
باہم الجھے ہوئے پاتال میں اک سوچ کی!
ڈوبے چلے جاتے ہیں سرعت سے..... کہ
متحرک پٹے پر بھاگتے قدموں کا نادیدہ سفر
درپیش ہے کب سے
حیاتِ عارضی کے وقفہ منظر کو
ہاں لیکن
ذرا سی دسترس اس کے بٹن پر ہاتھ کو حاصل نہیں ہے..!

● AM, Kalbskopf - 1, 63263 - NEU
Isenburg, Germany





غوثیہ سلطانہ

دعا

اے رب!
دیکھوں تو
ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟
مسجد دامن کھینچے ہے
مندر پاس بلاتا ہے
ہر اک اپنی اپنی ہی
ہم کو راہ دکھاتا ہے
ایک دوراہے پہ کھڑی
سوچ رہی ہوں
انسانوں کا جنگل ہے
بھانت بھانت کی بولی ہے
الگ الگ ہر ٹولی ہے
آپس میں کھٹا بجتی ہے
کشمکش کھینچا تانی ہے
یا رب!

● 4140 Bay Side DR.
Hanover Park,
IL - 60103 (USA)

بانو ارشد

جیسے ہی اپنے آپ سے ملنا شروع کیا
دنیا نے اپنی آگ میں جلنا شروع کیا

آلامِ روزگار چھپاتے رہے بہت
زخموں نے پھول بن کے مہکنا شروع کیا

جیسے ہی میری آنکھ سے آنسو رواں ہوئے
بادل نے ساتھ ساتھ برسنا شروع کیا

جوں ہی دریچہ کھول وہ جلوہ نما ہوا
کرنوں نے باری باری اترنا شروع کیا

مدت کے بعد دیکھ کے آتو خوش میں ہوں
بلبل نے ڈالی ڈالی چہکنا شروع کیا

● 12 - Cambrose Ave,
Edgware, Middx HA8 6EG (U.K.)



سعید اختر درّانی

انجام نظر آئے ، نہ آغاز نظر آئے
طرفہ ہمیں ہستی کے تو انداز نظر آئے

ہیں اہلِ نظر وہ، جنہیں اس کون و مکاں کے
اعجاز میں اک صاحب اعجاز نظر آئے

وہ نغمہ جو آفاق میں پھیلا ہے ، اسے سن
شاید تجھے اک ہاتھ پسِ ساز نظر آئے

اس بزم میں یارب! ہے مرا بھی کوئی غم خوار؟
مجھ کو تو سبھی تیرے ہی دمساز نظر آئے

آئینے میں حیرت کی فراوانیاں دیکھیں
ذرّے میں طپاں نور کے سو راز نظر آئے

The U. of B. S.P.R.Edgbiston, Birmingham B15 2TT (UK)



اقبال واجد

ہر رنگ میں ہر بات میں پیچیدہ بہت تھا
وہ حسن خداداد جو سنجیدہ بہت تھا

بات اس کے قد و زلف سے آگے نہ بڑھی تھی
وہ یار کم آمیز جہاں دیدہ بہت تھا

اے مہر جہاں تاب تری بات پہ اکثر
زخم جگر درد سے شوریدہ بہت تھا

رکھتا تھا وہ یوں میری وفاؤں کا صلہ بھی
پر میری کسی بات پہ رنجیدہ بہت تھا

تھوڑا سا مری سوچ میں کچھ فرق تھا ورنہ
دل تھا کہ قدِ یار کا گرویدہ بہت تھا

P.O.Box 440, Damam - 31411 (K.S.A.)

غلام علی وفا

میری پلکوں سے تڑپتے خواب کا منظر گرا
بن کے اپنی بے بسی کا آپ خود مظہر گرا

اپنے اس خستہ بدن سے اس لئے بھی پیار ہے
ٹوٹ کر یہ جب گرا اپنے ہی قدموں پر گرا

تو اگر بیتاب ہے تو میں بھی تو خوددار ہوں
اپنی نظروں سے نہ مجھ کو اے دلِ خودسر گرا

دائرے سے بن رہے ہیں پھر مرے احساس میں
روح کے تالاب میں شاید کوئی کنکر گرا

تیری مسجد گر نہیں محفوظ پھر بھی اے وفا
تو نہ کر مسمار مندر تو نہ گرجا گھر گرا

Post Box No. 21538 Safat - 13076 Kuwait (A.G.)



جاوید زیدی

تھے دربدر، سو لئے سر پہ سب عذاب پھرے
ہمارے ساتھ کئی ہجرتوں کے باب پھرے

کہیں بھی ایک دریچہ انہیں کھلا نہ ملا
گلی گلی لئے جذبوں کے جو گلاب پھرے

بس اک خیال تھا جنت بنائیں گے دنیا
سو ہم خیال کی دنیا میں محو خواب پھرے

یہ آسماں پہ سوال و جواب کیا معنی ..
زمین والے تو پھر کتنے جواب پھرے

تمام عمر پھرے دشتِ جستجو میں جو
جہانِ زیست میں کیسے نہ وہ خراب پھرے

15719 - Red Springs, Houston, Tx 77082 (USA)

نظر بریلوی

حساب اور وہ پل پل کا ہو تو کیا کیجئے
پھر اس پہ حکم تو کل کا ہو تو کیا کیجئے

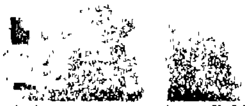
فصیلیں اتنی اٹھائی ہیں شہر والوں نے
گمان شہر پہ جنگل کا ہو تو کیا کیجئے

دکھوں کے ناگ ہمیں چھوڑ کر کہاں جائیں
ہمارا جسم ہی صندل کا ہو تو کیا کیجئے

جسے وہ جہد مسلسل کا نام دیتے ہیں
وہ رنگ جبر مسلسل کا ہو تو کیا کیجئے

ہم اپنے آج میں جینا تو چاہتے ہیں نظر
مگر خیال کسی کل کا ہو تو کیا کیجئے

Imco, Mab, P.O.Box No. 9046, Ahmadi 61004 Kuwait



شاهده وسیم
Bever Veien 3 Lei 19, 0596 OSLO 5, Norway

مقابلہ

ہر سال کی طرح اس سال بھی مقابلے کے کھیل کا اہتمام اپنی پچھلی تمام روایتوں کی طرح دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ سارا گاؤں اور قرب جوار کے قصبوں کے شائقین اس دلچسپ مقابلے کو دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو گئے تھے۔ اس میدان کے چاروں طرف جس کے ایک سرے پر بجرنگ بلی کا مندر تھا جس کے آمنے سامنے خوبصورت رنگی چنی بجرنگ بلی کی مورتی تھی۔ ساتھ ہی ایک چھتنار پیپل کا درخت جس کی لمبی لمبی جٹائیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور جس کے سائے میں کئی سادھو مہاراج بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی تخت اور چارپائیاں ڈلی تھیں جن پر لالہ امرت راؤ، مولوی خدا بخش اور بہت سے معززین بیٹھے تماشے کے شروع ہونے سے پہلے مختلف مسائل پر بات چیت کر رہے تھے۔ کچھ لوگ سابقہ مقابلے کو یاد کر رہے تھے اور ہنس بول رہے تھے۔ کیدار ناتھ اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور اپنی ہوس ناک نظروں سے سامنے مجمع میں کھڑی جنتا کو تاکے بھی جا رہا تھا جو اپنے گدرائے چمپا کی ڈالی جیسے جسم کو رنگین اوڑھنی میں لپیٹے شانتی کے کندھے پر اپنا نازک سا مخملی ہاتھ دھرے جنگی میدان کی طرف نظریں جمائے کھڑی تھی۔

میدان کے دوسرے سرے پر ایک مسجد تھی جس کے قریب نیم کے درخت نے اپنی گھنیری ٹھنڈی چھاؤں پھیلا رکھی تھی اس کے نیچے بچھے سفید چاندنی سے ڈھکے تخت پر اُجلے گاؤ تکیوں کے سہارے مولوی نبی جان، چودھری حشمت خان، تربینی لال اور دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ قریب ہی زمین پر ایک اینٹ کے سہارے بندو خاں، گٹھیلا بدن، تیل سے سنواری گئی زلفیں، کٹاراسی مونچھیں، بڑی بڑی آنکھوں کو سرمے سے مزید واضح کیے اکھاڑے کے بجائے سامنے کھڑی کوشل کو لگاتار گھورے جاتا تھا، بار بار پان کھائے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انھیں سرخ کیے جاتا۔

یہ میلہ ہر سال موسم بہار کی آمد سے کچھ پہلے منایا جاتا۔ دور دور سے لوگ جوق در جوق اس کو دیکھنے آتے تھے اور خوش ہوتے۔ گاؤں میں جہاں یہ میلہ لگتا تھا و نیا جہاں کا حسن سمٹ آتا۔ شہروں سے بیوپاری، دکاندار، بساطی اپنی اپنی دکانیں سجانے آتے۔ اس طرح ان کی کافی آمدنی ہو جاتی۔ چھوٹے موٹے لوگ جن کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہو تا وہ بھی اس میلے میں اتنا کچھ بچا لیتے کہ سال جیسے تیسے گزارنے کے قابل ہو جاتا۔ کچھ سرکاری لوگ بھی ہوتے اور وردی سمیت داروغہ پولس بھی لیکن ان کی یہ وردی یہاں لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ خود بھی لوگوں کے ٹھسا ٹھس مجمعے میں گھسے کھیل دیکھ رہے ہوتے۔ میدان کو اچھی طرح صاف کر دیا گیا تھا پانی کا چھڑکاؤ کر کے مٹی کو نرم بنا دیا گیا تھا۔ یہ عجیب کھیل تھا، کشتی بھی اسے نہ کہہ سکتے تھے۔ بس دو پہلوانوں کی ایسی زور آزمائی تھی کہ جو بجرنگ بلی کے مندر سے مسجد تک کے درمیان تقریباً آدھے کوس کے اندر کی کھینچا تانی تھی۔ میدان کے دونوں طرف جم غفیر اکٹھا تھا۔ میدان کے بیچوں بیچ دونوں پہلوان آ کھڑے ہوتے۔ دونوں کسرتی صحتمند تیل سے چپڑے جسم، بھولا ناتھ اور دلاور خان۔ مجمع انھیں دیکھ کر زور سے نعرہ لگاتا۔ دونوں پہلوان گلے ملتے، ویسے بھی دونوں بچپن کے یار تھے دونوں نے ساتھ ہی گاؤں میں اس زور آوری کے مقابلے کی ایک استاد کے زیر سایہ تربیت لی تھی۔ پھر کھیل یا مقابلہ شروع ہوتا۔ پنچ شروعات کا اعلان کرتے دونوں پہلوان دوست ہاتھ ملاتے پھر ایک آواز لگاتا جے بجرنگ بلی کی۔۔۔۔دوسرا نعرہ مارتا، دہائی ہے حضرت علی کی۔ پھر دونوں پہلوان گتھم گتھا ہو جاتے۔ لوگ سناٹے اور دلچسپی کے عالم میں مقابلہ دیکھا کرتے۔ ایک پہلوان دوسرے کو دھکا دیتے دیتے اپنے بازوؤں کے زور سے ٹھیلتا مسجد کے قریب پہنچتا لگتا کہ دوسرا اب پسپا ہو کر گر جائے گا لوگ دم بخود مقابلے کے فیصلے کے انتظار میں کھڑے ہوتے کہ گرتے ہوئے پہلوان کی حالت دیکھ کر مسجد کے قریب بیٹھے لوگ زور زور سے یا علی کی آواز لگاتے اور پہلوان کی ہمت بڑھ جاتے، وہ گرتے گرتے ایک دم تن کر کھڑا ہو جاتا۔ بازوؤں کی مسیں تننے لگتیں دھول میں اٹ گیا کسرتی بدن چمکنے لگتا وہ زور سے نعرہ لگاتا۔ دہائی ہے حضرت علی کی۔ اب جو وہ مقابل پر جھپٹتا تو مقابل اس کے پے در پے وار سے پیچھے کی جانب ہٹنے لگتا اور پہلوان اسے دھکا دیتے لتاڑتے، دھکیلتے آگے بڑھتا رہتا کہ بجرنگ بلی کا مندر قریب

آنے لگتا پہلوان کی حالت خراب ہوتی، پے در پے وار سے نڈھال ہو کر گرنے کو ہوتا کہ مندر کے قریب تخت پر بیٹھے لوگ اسے جوش دلانے کے لیے ہمت بندھانی شروع کرتے۔ جے بجرنگ بلی کا نعرہ بلند ہوتا، لوگوں کی حوصلہ افزائی اور جوش دلانے سے تھکی ہوئی نڈھال جان میں پھر سے تازگی کی لہر دوڑنے لگتی خون کی گردش تیز ہو جاتی وہ گرتے گرتے تن کر کھڑا ہو جاتا۔ اپنے بازوؤں کو اٹھا کر مچھلیوں کو ابھارتا اور زور سے آواز لگتا۔ جے بجرنگ بلی کی۔ اور وہ دوبارہ اپنے مقابل پر جھپٹتا اور حملہ آور ہوتا۔ یہ کھیل یوں ہی ہوتا رہتا جب دلاور بھولا ناتھ کو ریلتا مندر تک لے جاتا تو اب لگے کہ وہ گرنے کو ہے وہاں بیٹھے لوگوں کے دلاسے اور نعروں اور ہمت بڑھانے سے وہ پھر تازہ دم ہو جاتا۔ اسی طرح جب بھولا ناتھ دلاور خان کو دھکا دیتا مسجد تک لے جاتا کہ لگے گا اب ہار جیت کا فیصلہ ہونے کو ہے پل میں دلاور گرے گا اور فیصلہ ہو جائے گا، لیکن وہاں مسجد کے قریب بیٹھے لوگوں کی حوصلہ افزائی اور جوش دلانے سے پھر تن کر کھڑا ہو جاتا۔ ہار جیت کا فیصلہ کوئی نہ ہوتا کہ وقت ختم ہو جاتا۔ بلکہ لوگ ہی مقابلہ دیکھتے دیکھتے تھک کر دھیرے دھیرے کھسکنے لگتے۔ دونوں پہلوان تھک کر چور ہو رہے تھے پر ہار ماننے والا کوئی نہ ہوتا۔ آخر چودھری حشمت اور لالہ امرت راؤ مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کر دیتے نتیجہ دونوں پہلوان جیتے ہوتے مقابلہ برابر ہوتا۔

پھر سارا گاؤں شور مچاتا، خوشی مناتا اپنے اپنے گھروں کو لوٹتا۔ بچے غبارے لیے بگل بجاتے، چرمر کرتے گھومتے جھولوں کی طرف ہو لیتے تو کچھ لوگ کھانے پینے کی اشیاء گول گپے، دہی بڑے کے خوانچوں پر ٹوٹ پڑتے۔ عورتیں لڑکیاں منہارنوں کے گرد گھیرے ڈال کر بیٹھ جاتیں، تو بڑی بوڑھیاں حقے رکھ کر سامنے کی ہماہمی تکنے جاتیں۔ نوجوان ٹولہ اور باقی لوگ چودھری اور لالہ کی معیت میں بھیڑ کی شکل میں گاؤں کی گلیوں میں نکلتے۔ دونوں فاتح اپنے اپنے یار دوستوں کے کندھوں پر چودھری لالہ اور بہت سے لوگوں کے پہنائے گئے ہاروں سے لدے پھندے ہنستے مسکراتے جھک جھک کر سلام اور ہاتھ جوڑ پرنام کرتے جا رہے ہوتے۔ مجمع گھر پہنچتا تو کھلاڑیوں کی مائیں پہلے ہی اپنے مکان کی دہلیز پر موتی چور کے لڈو کی تھالی اور ایک تھالی میں آرتی سجائے کھڑی ہوتیں۔ یار دوست دونوں کو کندھوں سے اتارتے، ایک ماؤں کے چرنوں کو چھوتا تو دوسرا جھک کر سلام کرتا گلے لگتا۔ ایک ماں دونوں کے منہ میں لڈو ٹھونستی تو دوسری دونوں کی آرتی اتارتی تلک لگاتی یہ کھیل جانے کتنے برسوں سے کھیلا جا رہا تھا، بنا کسی رنجش بنا کسی بھید بھاؤ کے۔

سال کے ذہن بہت سارے ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ سال جشن ہی ٹھنڈے ٹھنڈے ہی گذر جائے یا پورا سال موسم گرما ہی میں بیتے۔ نہیں۔ ہر سال گرمی، سردی اور بارش سب رتوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے مزاجوں میں بھی گرمی سردی کا اثر کر جانا لازمی ہے۔ لیکن نہ تو وہ گرمی ایسے بڑھتی کہ لوگوں کو جلا ڈالتی نہ سردی ایسی ہوتی کہ جسموں کو جذبات کو احساسات کو ٹھنڈا کر دیتی۔ جب کبھی لوگوں کے مزاجوں میں گرمی نے زور کیا تو ہمیشہ کی طرح لالہ امرت راؤ چودھری حشمت خاں مولوی خدا بخش جیسے لوگوں نے ان گرم ہوتے مزاجوں پر ٹھنڈی میٹھی برکھا کے جیسے اثرات یوں ڈالے کہ دلوں کی گرمی ٹھنڈی پڑ گئی۔ کینہ پرور لوگوں نے اکثر ہی چنگاریوں کو ہوا دی لیکن وہ جلد ہی بجھ گئی۔ عورتوں میں اکثر جھوٹا جھول اور بچوں میں سر پھٹائی بھی ہوئی لیکن معاملہ جہاں کا تہاں ٹھنڈا پڑ جاتا۔ یہ سب تو ننھے بچوں جیسے جھگڑے تھے ان میں کوئی پختگی کوئی بنیاد تو تھی نہیں کہ یہ جھگڑے پھیلتے۔

سال بیت گیا، نیا سال شروع ہوا اور پھر اسی دنگل کی تیاریاں شروع کی جانے لگیں۔ لالہ اور چودھری نے دنگل کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ شائقین دور دور گاؤں سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ قصبوں سے لوگ سمٹ سمٹ کر پہنچنے لگے تھے۔ سودے اور خوانچے والے ہر سال کی طرح اپنی اپنی دکانیں اور اسٹال لگا رہے تھے کھیل والے اپنے خیمے اور جھولے میدان میں ایک طرف ٹھونک ٹھانک رہے تھے۔ عورتیں اور لڑکیاں اپنی اپنی چنریاں، دھوتیاں رنگ رہی تھیں، منہارنیں اپنی رنگ برنگی چوڑیوں کے لچھے سجا رہی تھیں، کھلونے والے رنگ برنگی مٹی کی گجریں لکڑی کے بنے اسٹال پر تلے اوپر جما رہے تھے۔ بجاج اپنے کپڑوں کے تھان پھیلا رہے تھے کہ مقابلے کی تاریخ آ پہنچی۔ میدان کو پانی چھڑک کر نرم کر دیا گیا تھا۔ سوندھی سوندھی مٹی کی بو ہر طرف پھیل رہی تھی۔ سامنے تخت پر پنواڑی کی کتھے چونے کی کلیوں کے ساتھ پان کے دھلے پتوں کے پاس گلوریاں بھی چاندی کے ورقوں میں لپٹی رکھی تھیں کیوڑے کی بھینی خوشبو فضا میں گھل مل رہی تھی۔ مسجد کے قریب چاندنیاں بچھا کر لوگ بیٹھ گئے تھے۔ تازہ گرم حقے قریب رکھے تھے۔ ادھر بجرنگ بلی کے مندر کے قریب تخت اور چوکیوں پر بیٹھے لوگ حقے اور بیڑی کے ساتھ شغل کر رہے تھے، ساتھ ہی بدلتی ہوئی سیاست پر بھی تنقید ہو رہی تھی۔ نگاہیں میدان پر جمی تھیں جہاں دونوں پہلوان آ چکے تھے لیکن ابھی اپنے اپنے یاروں کے گھیرے میں کھڑے ہنس بول رہے تھے۔ میدان عورتوں مردوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ سب کی نظریں پہلوانوں کو ڈھونڈتی تھیں۔ بھولا ناتھ اور دلاور خان۔ بھولا ناتھ کی پگڑی کا طرّہ اترا جاتا تھا، دلاور خان کی پگڑی کا کلف تلوار کی دھار بتا رہا تھا۔ ان کے جسم تیل سے چپڑے دھوپ میں کندن کی مانند چمک رہے تھے۔ نقارے پر چوٹ زور زور سے پڑنے لگی۔ لوگوں کی بے چینی خاموشی اور سناٹے میں بدلنے لگی، ماؤں کی گود میں تلملاتے بچے یکدم شانت ہو کر میدان کو تاکنے لگے جہاں دونوں پہلوان آمنے سامنے کھڑے تھے اور

چودھری اور لالہ کے آخری بگل کا انتظار کر رہے تھے کہ بجتے ہوئے نقاروں کی آوازوں میں اچانک دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں حاوی ہو گئیں۔ لوگ گھوم گھوم کر گاؤں کی اس سڑک کو دیکھنے لگے جہاں سے ہو کر گاؤں کی لاری گذرتی ہوئی شہر میں داخل ہوتی ہے۔ لوگوں میں بے چینی بڑھنے لگی ہر کوئی آنے والوں کو پر تجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ناٹے لوگ اونچے لمبے آدمیوں کے کندھوں سے تو کوئی اپنے پنجوں کے اوپر اٹھ کر، بچے بڑوں کی ٹانگوں کے درمیاں گھس گھسا کر۔ آنے والے دھول اڑاتے سامنے آگئے لوگوں نے غیر ارادی طور پر ہٹ کر ان کے لیے جگہ بنائی سوار بھیڑ کے درمیاں سے ہوتے ہوئے چودھری اور لالہ کے تخت کے قریب پہنچے۔ چودھری اور لالہ ان کو حیران حیران دیکھتے ہوئے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگ اتنے اُجلے اجلے بڑھیا کپڑے والوں کو دیکھ کر سراسیمہ سے ہو گئے۔ ان میں کچھ اپنے جیسے بھی لگتے تھے لیکن ٹھاٹھ باٹ ان کے بھی مختلف نہ تھے۔ وہ یوں عورتوں کے انداز میں شرماتے اور جی حضوری کے انداز میں انھیں دیکھتے جیسے وہ ان کی رکھیل ہوں۔ ان میں سے ایک دیسی بدیسی شان میں اکڑتا مونچھوں پر تاؤ دیتا گھوڑے سے نیچے اترا اور آگے بڑھ کر بولا "یہ ہمارے نئے سرکار ہیں" پھر ایک شرماتی ہوئی چور نظر گھوڑے پر بیٹھے لاٹ صاحب پر ڈالی جو بڑی لا پرواہی سے چاروں طرف عیارانہ نظریں دوڑا رہا تھا۔ چودھری اور لالہ نے ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ مہمان سگریٹ کا کش لگاتے میدان پر نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں مقابلے کا اعلان ہو چکا تھا۔ دونوں پہلوان حسب دستور ایک دوسرے سے زور آزمائی کر رہے تھے۔ پل دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔ مہمانوں کے چہروں سے بے زاری جھلکنے لگی۔ بھلا یہ بھی کوئی کھیل ہے مقابلہ تو چند گھنٹوں کا ہوتا ہے یہ کیا ادھر سے زور مسجد تک پھر وہاں سے بجرنگ بلی کے مندر تک۔

پہلوان اپنے زور پر دوسرے کو دھکا دیتے ایک کو مسجد تک لاتے کہ وہاں کوئی زور سے یا علی کا نعرہ بلند کرتا پھر جو وہ مقابل پر جھپٹتا کہ اسے مندر تک ڈھکیل لاتا۔ نئے مہمان پہلو بدل رہے تھے آخیر تھک کر ایک نے ہاتھ اٹھا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ لوگوں کی نظریں میدان سے ہٹ کر ان پر ٹک گئیں۔ چودھری اور لالہ نے جواب طلب نظروں سے انھیں دیکھا تو ان میں سے ایک شان بے نیازی سے بولا کھیل کہیں ایسے ہوتا ہے ہماری مانو تو وہ مکاری سے ہنسا چودھری اور لالہ جو خود بھی یہ مقابلہ دیکھتے دیکھتے تھک چکے تھے چونک کر اس کی رائے کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ تن کر چوکی کے اوپر کھڑا ہو گیا اس کے حواری اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہوئے۔ وہ دبی دبی مسکراہٹ سے گویا ہوا۔ مقابلہ اسے کہتے ہیں جس میں کسی ہار جیت کا فیصلہ ہو۔ اس پر مولوی خدا بخش کچھ سوچ کر بولے، حضور یہ کھیل تو برسوں پرانا ہے ضروری نہیں کہ فیصلہ ہار جیت پر ختم ہو کہ لالہ بولے "حضور اس روایتی مقابلے میں اکثر ایسے موقعے بھی آئے کہ ایک پہلوان دوسرے پہلوان پر حاوی ہوتا لیکن ایسے میں ہم کھیل ہی ختم کر دیتے ہیں یوں کھیل برابر ہوتا اور کسی جھگڑے کی جڑ نہ بنتا۔" لاٹ صاحب اس بات پر اتنا ہنسا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں کی سرخی خون رنگ دینے لگی۔ خوب ہنس لینے کے بعد وہ بولا۔ کھیل تو وہی ہے جس میں ہار جیت کا فیصلہ ہو، اس کے ایک چاپلوس نے درمیان میں لقمہ دیا۔ تو اور کیا اس طرح جب کوئی پہلوان ہارتا ہے تو اگلے سال وہ زیادہ محنت اور طاقت کے ساتھ میدان میں کودتا ہے۔ مولوی خدا بخش انجانے خوف سے سہم کر بولے۔ اس طرح تو پہلوانوں میں پارٹی بندیاں ہونے لگیں گی۔ لالہ گھبرا کر بولے نہیں نہیں رام رام پھر تو لوگ اپنے اپنے پہلوانوں کے گروہ میں بندھ کر بھید بھاؤ میں پڑ جائیں گے۔ کھیل ختم ہو چکا تھا میدان باہم بحث و تکرار کی نذر ہو چکا تھا۔ لوگ تتر بتر ہونے لگے۔

شوشہ ہی انوکھا تھا کوئی اس نئی رائے کا حامی تھا تو کوئی مخالف۔ بھیڑ کو یوں بے چین اور تتر بتر ہوتے دیکھ کر صاحب بہادر مکاری سے ہنسا اور بولا "ایسا کرو بیچ سے پالا کھینچو" ایک پہلوان کی ٹولی ادھر اور دوسرے کی اُدھر پھر مقابلہ ہوگا۔ دونوں پہلوان باری باری ایک دوسرے کے پالے میں لپکیں گے وہاں پہلوان اپنے پالے کا بچاؤ کرے گا آنے والا پہلوان دوسرے کو پچھاڑ دے بس کھیل کا فیصلہ ہوا۔ پالا بھی اس کا، فاتح بھی وہی۔ یہ ایک نیا شگوفہ پھوٹا تھا اور زبانوں زبان ہوتا ہوا سارے گاؤں میں ہر سو پھیلتا گیا۔ کچھ حیران تھے تو کچھ پریشان وجہ یہ تھی کہ پالا کیسے کھینچے۔ جس علاقے میں بجرنگ بلی کے مندر تھے تو وہاں مسجدیں بھی تھیں اور جہاں مسجدیں تھیں وہاں مندر بھی تھے۔ لوگ عجب سوچ بچار میں تھے کہ پالا کہاں کھینچے۔ آخر سب کو اپنی مسجدوں اور مندروں کا احترام بھی تو کرنا تھا کہ اچانک یہ خبر صور کی طرح کانوں کے پردے پھاڑ گئی کہ اب کوئی اور آواز اس شور سے نہیں ابھر سکتی تھی۔ ایک ہی راستہ ہے، جہاں بجرنگ بلی کے مندر کم ہیں اور مسجدیں زیادہ ہیں وہاں مندر ڈھادو، جہاں مندر زیادہ ہیں وہاں کی مسجدیں شہید کر دو۔ لوگ اتنے بڑے پاپ اور گناہ سے لرزاں تھے۔ لیکن ایسا ہی ہوا اور پالا بن گیا، مقابلے کا جوش اور جنون جو تھا۔ کھلاڑی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک طرف ذلا ورا اپنی مسجد کے نیم تلے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم جو کبھی سرسوں کے تیل میں بسا چمکتا تھا مگر اب تو لگتا تھا گویا وہی جسم بندوق صاف کرنے والے تیل میں بسا گیا ہو۔ بھولا ناتھ کی مونچھیں تو جیسے بارود سے جل کر چرمرا گئی ہوں۔ لاکھ انھیں مروڑتا لیکن بال جل جائے تو سیدھا کہاں ہو سکتا ہے۔

دن گذرتے گئے وقت بیت گیا، رتیں تمام ہوئیں کھیل کا

جوش بظاہر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ وہ مرو ہی گیا کہ کھیل اور دوڑ کا زور مسجد اور مندر تک جاتا تھا۔ کتنی بار ادھر گاؤں والوں نے سوچا جو ہوا سو ہوا پھر زور آزوری ہو اور کھیل بھی شروع ہوا۔ بھولا بجرنگ بلی کی جے جے کار کے ساتھ پالا پار تو کر جاتا لیکن وہاں کوئی مسجد کے نیم تلے بڑھاوا دینے والا نہ دکھائی دیتا وہ واپس پلٹ جاتا۔ اسی طرح جب دلاور مولا کی دہائی دے کر پالے کے اس پار گھس پڑتا تو وہاں برگد کے سائے تلے کوئی حشمت خاں اور ترینی لال نہیں ملتے۔ وہ پالے کو روند ڈالتا کہ کہیں تو اسے کوئی تعریفی جملے کہنے والا اور حوصلہ دینے والا ملے گا۔ ایسے ہی بھولا پالے کو کھنگال ڈالتا کہ اس پار کہیں تو اسے عورتوں لڑکیوں کی رنگ برنگی اوڑھنیاں نظر آئیں، کانوں میں بچوں کی ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں مگر چکر چوں کرتے جھولے دور دور نظر نہ آتے۔ پان کی خوشبو اور کیوڑے کی مہک جانے کہاں گئی۔ اب یہ کھیل ان سے کھیلا نہ جاتا تھا۔ یہ کھیل تو بڑا کٹھن اور ظالم ہے۔ دونوں فریقین کے بار بار زور کرنے پر بھی کوئی پالا نہ جیت پاتا۔ ہار جیت کا فیصلہ اب بھی نہ ہوتا۔ جو پارٹی ذرا کمزور پڑتی بدیسی کھیل کے سامان وہاں فوراً پہنچ جاتے۔ یوں دونوں میں معرکہ آرائی ہوتی کہ کبھی تو کوئی ایک پالا جیت لے گا۔ پھر وہی رونقیں ہوں گی۔ بجرنگ بلی کے مندر اور مسجد کے قریب نیم اور برگد کے سائے تلے سب تازہ حقہ لے کر بیٹھیں گے۔ مائیں آرتی اتاریں گی موتی چور کے لڈو کھانے کو ملیں گے، میلہ لگے گا، مزے مزے کے پکوان کھانے کو ملیں گے، تماشے دیکھنے کو ملیں گے لیکن ایسا نہ ہوتا۔

بہت دنوں بعد بھولا تھکا تھکا اپنی ہی سوچوں میں گم سر جھکائے چلا جاتا تھا کہ نامعلوم کب کیسے وہ پالا پار کر گیا، دوسری طرف اپنی دھن میں نکل گیا کہ ایک ڈراونی آواز پر چونک اٹھا۔ اپنے خیالوں سے نکل کر اس نے چاروں طرف دیکھا، اتنے میں آواز دینے والا جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آگیا۔ ایک پل میں دونوں کی نظریں ملیں، یہ دلاور تھا باوجود رنجشوں کے دونوں یار ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی سے لپٹ گئے پھر انجانے خوف سے سہم کر علاحدہ بھی ہو گئے اب وہ اس گاؤں کے وہ کھلاڑی نہیں تھے جنہوں نے ایک استاد کے زیر سایہ تربیت لی تھی اکھاڑے میں لڑے تھے۔ دونوں دیر تک اپنے دکھڑے روتے رہے پھر دونوں نے طے کیا کہ چلیں اس لاٹ صاحب کے پاس جس نے انھیں پالا بنانے کی تلقین کی تھی۔

وہ دونوں کسی طرح لاٹ صاحب تک پہنچ گئے وہ عیاری سے ان کے دکھڑے سنتا رہا پھر اکتائی ہوئی سانس کھینچ کر بولا "چھوڑو بھی ان باتوں کو ہمارے پاس اور بھی بہت کام ہیں نخلستان سے ریگستان اور اس سے بھی آگے عظیم سائبریا تک۔ خدا کی زمیں بہت بڑی ہے نئے نئے رن بنانے کے لیے۔

* *

اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد

- AWAZ (Monthly)

Editor : Mrs. Tasneem Ali,
59 - John Street, 9th Fl,
New York - 1003P

- BAZM-E-UF

Editor : Kan Fatima,
21- Baulk Hill Rd, NSW - 2153 Australlia

- INK AF

Edito ub Johar,
26 - A, Lalchand Mukeem Lane (Rathkhola)
Dhaka - 1100 (Bangladesh)

- JADEED ADAB

Editor : Hyder Qureshi,
Auf Der Roos - 7, 65795 Hattersheim I,
Germany

- LIBERTY

Editor : Anwar Sheikh,
P.O. Box 918, Cardiff CF5 2NL (U.K.)

- NIDA

Edior : Mrs. Tanveer Ali,
1480 - Cobble Gate, Reymolds Burg -
OHO 43068 (USA)

- SADA

Editor : Iqbal Mirza
P.O.Box 630, Croydon CR9 2WN (U.K.)

- SAFIR-E-URDU

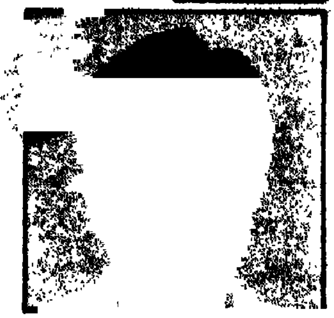
Editor : Sahir Shivi,
47, Sutton Garden, Suwdon Park,
Luton Beds LU3 3AF (U.K.)

- URDU LINK

Editor : Abdurrehman Siddiqi,
16439 - Binkrook Ave,
Cerritos - CA 90703 (USA)

- RAVI

Editor : Mhd. Shabbir Mughal,
West End House, Ground Fl., Legrams Mill,
Legrams Lane, Bradford BD7 1NH (U.K.)



عدیل زیدی

مزاج اس کا جدا ہے، ذرا سنبھل کے چلو　　میاں یہ شہر نیا ہے، ذرا سنبھل کے چلو
ہر ایک ذہن میں اندیشہ ہائے دور دراز　　ہر ایک لب پہ صدا ہے، ذرا سنبھل کے چلو
ہیں اس کی خاک کے پردے میں آسمان کئی　　زمین کرب و بلا ہے، ذرا سنبھل کے چلو
جدائیاں یہ کہیں دائمی نہ ہو جائیں !!　　مزاج سب کا جدا ہے، ذرا سنبھل کے چلو
سفر بھی دھوپ کا ہے اور عدیلؔ تلووں کو　　ہر ایک زخم ہرا ہے، ذرا سنبھل کے چلو

O 10742 Kenicott Trail, Brighton MI 48114 (USA)

سعید نظر

دنیا کے کونے کونے سے تو زور شر نکال　　پھیلائے نفرتیں جو کوئی اس کا سر نکال
گھبراتا کیوں ہے موت سے مرنا ہے ایک دن　　جاتی ہے جان جانے دے یہ درد سر نکال
شہروں کی خاک چھان کہ جنگل میں سر کھپا　　مل جائے کچھ سکوں ہمیں ایسی خبر نکال
صیاد نے دیا ہے مجھے تحفتاً قفس　　اڑ جاؤں لے کے اس کو میں وہ بال و پر نکال
مشکل نہ ہو رسائی میں اس تک کسی بھی طور　　میرے لئے تو ایسی نظر رہ گذر نکال

O P.O.Box 5561, Safat - 13056 Kuwait (A.G.)

افتخار شہزاد اعظمی

کل رات تیری یاد جو آئی تو پی بہت　　ویسے تجھے بھلانے کی کوشش تو کی بہت
اب میری دشمنی میں وہی پیش پیش ہے　　کل تک تھی جس کے ساتھ مری دوستی بہت
اب تو سکوت مرگ ہی طاری ہے ہر جگہ　　کل تک ہمارے شہر میں تھی زندگی بہت
انعام زندگی کے کئی مجھ پہ ہیں مگر　　محسوس ہو رہی ہے تمہاری کمی بہت
کچھ تو کہو کہ درد کی یہ رات کٹ سکے　　ڈسنے لگی ہے دل کو مرے خامشی بہت

O P.O. Box No. 4343, Safat - 13044 Kuwait (A.G.)

سید صغیر احمد جعفری

بات بگڑے تو بنالی جائے　　پیار کی راہ نکالی جائے
اس کی الفت میں گرفتار ہیں سب　　کس مسیحا سے دوا لی جائے
نہ لگے تیر نشانے پہ مگر　　آنکھ کا وار نہ خالی جائے
آج شعروں کی جگہ کاغذ پر　　اس کی تصویر بنالی جائے
اس کو ساغر میں ڈبونا اچھا　　جو جوانی نہ سنبھالی جائے

O P.O. Box 26137, Abu Dhabi (UAE)

مشتاق سنگھ

کس شہر کی دھول اڑ کر اس شہر میں آگئی　　ہر خوشی خونِ شفق بن کر سحر میں آگئی
قتل دشمن کا ہوا تھا دشمنوں کے شہر میں　　کس طرح وہ لاش بہہ کر اس نہر میں آگئی
درمیاں کچھ فاصلے کچھ حادثے کچھ تلخیاں　　جن کی تاثیر کرم بڑھ کر زہر میں آگئی
قتل کی جن سازشوں میں ذکر میرا تھا نہیں　　اس مقدمے کی سزا کیوں میرے گھر میں آگئی
اے محبت کے شہر! اے اودی تالاب! جمیل　　تیری پہچان زباں زیر و زبر میں آگئی

O 25-Fiwdhorn Ave, Hayes. Middlesex UB4 ODG England



یوگ دھیان آھوجہ یاس

مال و زر پا کے بھی جس دل کو قناعت نہ ملی
کیا ملا اُس کو جو تسکین کی دولت نہ ملی

وصل محبوب سے بڑھ کر کوئی نعمت نہ ملی
محفلِ جاناں سے بہتر کوئی جنت نہ ملی

لے گئے باغِ جناں تک دلِ وحشی کو مگر
کوچۂ یار کے باہر اسے راحت نہ ملی

جیتے جی جینے کی برکت سے وہ محروم رہا
دو گھڑی یادِ خدا کی جسے فرصت نہ ملی

یاس نے پائی ترے در کی گدائی کر کے
دہر میں جو کسی سلطاں کو بھی ثروت نہ ملی

1135 - Villa Greet CT. Raleigh, NC 276712 (USA)

عبداللہ ساجد

بے سحر آفاق ہے تاریک سایوں کا سفر
اور زمیں پر بار ہے صدیوں کی سانسوں کا سفر

کیا پتہ ٹھہرے کہاں وقتِ رواں کا قافلہ
گردشوں کی زد میں ہے بے نام چہروں کا سفر

مل نہ پائی ایک لمحہ بھی کہیں تسکینِ دل
تیس دن کرتا رہا میں بکھرے لمحوں کا سفر

رات بے تعبیر خوابوں کی تھکن کا اک فریب
اور دن صحرا کی وسعت میں سرابوں کا سفر

شاعری میں نت نئے ہوتے رہیں گے تجربے
جب تلک جاری ہے ساجد اپنی سوچوں کا سفر!

P.O.Box. 4575 Safat - 13046 Kuwait (A.G.)

ارشد اقبال آرش

چنچل شوخ جمیل ہو لڑکی
حسن کی اک تفصیل ہو لڑکی

میری سوچ نظر سے گہری
شرم حیا کی جھیل ہو لڑکی

میں بھی کوئی گل بن جاؤں
خوشبو میں تحلیل ہو لڑکی

جس میں دل کی کشتی ڈوبے
ایسا دریا نیل ہو لڑکی

آرش عطیہ خاص خدا کا
مورت خوب شکیل ہو لڑکی

Boccherini - 109, 09045 Quartu, S.E. (CA) Italy

فہیم باٹلہ

فرشتوں نے جھکایا سر سمجھ کر آدمی مجھ کو
مگر اس برتری پر آرہی ہے خود ہنسی مجھ کو

بناؤں آئینہ میں بھی نظر جس میں نہ آؤں میں
سکھادے ناصحا اپنا فنِ شیشہ گری مجھ کو

عجب کچھ حال ہے میرا کہ بچتا ہوں میں ساحل سے
رہا طوفاں میں اتنا میں کہ عادت ہوگئی مجھ کو

اندھیروں کو اجاگر کررہی ہے لو چراغوں کی
نظر اس روشنی میں آرہی ہے تیرگی مجھ کو

صلیبیں ہوں یا زنجیریں یا کوئی زہر کا پیالہ
نہ جانے کس طرف لے جائے میری شاعری مجھ کو

1528 Cameo DR. Redlands CA 92373 (USA)

پرویز مظفر

یہ سچ ہے دل کبھی رسوا کبھی حیران کرتا ہے
مگر کیسی نرالی حرکتیں نادان کرتا ہے

لگادیتی ہے اکثر میری وحشت آگ صحرا میں
کبھی گریہ مرا سیلاب پر احسان کرتا ہے

مٹادو نفرتیں دل سے اگر خواہش ہے جینے کی
یہی جذبہ بھری بستی کو ریگستان کرتا ہے

اسی کے واسطے دن بھر چمن میں پھول کھلتے ہیں
اسی پر چاند اپنی چاندنی قربان کرتا ہے

ہمیشہ باغ میں پتھر چلاتا ہے درختوں پر
ادھر وہ شہر میں آئینوں کی دکان کرتا ہے

48 - Sleeford Rd, Hall Green Birmingham B28 - 9QP (U.K)



صفیہ صدیقی

8 - Twyford Abbey Road, London,
NW10, 7HG (U.K.)

رہائی

اور اس نے باپ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

پھر گویا حبس بے جا کے دروازے ایک دم سے وا ہوگئے، ہتھکڑیاں کھل گئیں اور بیڑیاں ٹوٹ کر گر پڑیں، کم سے کم اماں کو تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جبھی تو ان کے چہرے پر جو اتنی لکیریں پڑ گئیں تھیں، فکر و تردد سے، اندیشوں سے، خوف سے، وہ سب ایکدم سے غائب ہوگئیں۔ پھر جب ابا کمرے کی کنجی ان کو تھما کر فیکٹری چلے گئے تھے تو انھوں نے اسے آزاد کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جلدی سے پراٹھے بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے بیٹی کے لیے ناشتہ لے کر آئی تھیں، لیکن جمیلہ ناشتے کی ٹرے کو نظرانداز کر کے غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی، اگر اس کو آزادی ملی ہے تو اس کے پاؤں کیوں اس طرح گھسٹ رہے ہیں گویا ان میں بھاری بھاری بیڑیاں پڑی ہوں، جسم کے مختلف حصوں میں ابھی بھی ابا کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کی بخشی ہوئی چوٹ کا درد موجود تھا جو رفتہ رفتہ روح میں منتقل ہو رہا تھا اس کی رگ و جاں میں تحلیل ہو رہا تھا، اور پھر نہانے کے بعد ٹب کے پانی کو بہاتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس پانی کے ساتھ اس کے سارے خواب، ساری خواہشیں، امیدیں ولولے سب بہہ گئے تھے اور اس کے اندر مایوسی کے سیاہ بادل سے بھر گئے تھے۔ اس کے آنسو بھی پانی میں شامل ہو رہے تھے۔

رات کو ابا کے آنے کے بعد اماں نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ پیر سے کام پر جا سکتی ہے۔ ابھی چند دن باقی تھے شاید اس وقت تک اس کے چہرے کے نشانات بھی غائب ہو جائیں، انھوں نے سوچا تھا پھر وہ جلدی سے برف کی ڈلی کپڑے میں لپیٹ کر ٹکور کرنے لگی تھیں۔ شادی پر اس کی رضامندی سے اماں مطمئن ہوگئی تھیں، انھیں اپنی پڑی تھی، اب چند دنوں کے لئے اطمینان ہوا، ابا کے کڑوے کسیلے جملوں اور دل دکھانے والے طعنوں سے وقتی چھٹکارا مل گیا تھا۔ گو کہ اماں کو اختیار تو کسی بات کا نہ تھا، نہ وہ کسی فیصلے کی مجاز تھیں، اور نہ ہی کسی بات میں کوئی ان کی رائے پوچھتا، پھر بھی جب کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہوتا ساری ذمہ داری ان کے سر پر آپڑتی، اور ماں ہونے کے ناطے ابا سارا الزام ان پر دے مارتے۔۔۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں باپ کے فیصلے رد کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے اور اماں کی مصیبت آجاتی۔۔ ہمارے زمانے میں تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ہم والدین کی عائد کردہ پابندیوں کے خلاف کچھ کہنے کی خواہش کے بھی گنہگار ہوتے۔ وہ بے بسی سے سوچتیں۔۔۔ نہ جانے یہ بچے ایسے کیوں نکلے، شاید اس ملک میں رہنے کی وجہ سے یہ سب ایسے نکل گئے، اور پھر یہاں کی تعلیم بھی بچوں کو خود مختار بنا دیتی ہے۔ اچھا ہی ہوا جمیلہ کے ابا نے سولہ سال کے بعد اسے اسکول سے اٹھا کر کام پر لگا دیا تھا اور اب وہ تین سال سے ملازمت کر رہی تھی پیسے کما رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر فکروں سے بوجھل دل سے سوال کرتیں، اگر ہم یہاں نہ آتے تو یہ جھگڑے بھی نہ ہوتے، یہاں کی فضا میں پلنے بڑھنے سے بچے اتنے خودسر ہو جاتے ہیں کہ بس اپنی مرضی کے کپڑے پہنے جائیں، اپنی مرضی سے گھومیں پھریں، ہر کام کے لیے اپنی مرضی مقدم، بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ انھیں اپنا وطن یاد آتا، اپنا گاؤں جہاں وہ پیدا ہوئیں پلی بڑھیں، شادی ہوئی جہاں ان کو کیا اختیار تھا اپنی ذات پر۔ پھر ان یادوں کے ساتھ وہاں کی غربت تنگ دستی اور بھوک کی یادیں بھی در آتیں تو وہ جلدی سے خدا کا شکر ادا کرتیں اور زندگی کے سارے مسئلے اللہ کی مرضی پر چھوڑ کر قدرے ہلکے دل کے ساتھ گھر کے کام کاج میں مشغول ہو جاتیں۔

اماں کو مطمئن دیکھ کر جمیلہ سوچ رہی تھی کہ اماں خوش ہیں لیکن مجھے تو عمر قید ملنے والی ہے، ابا کا بھانجہ بھی ان کی طرح ہوگا اور اس کی زندگی بھی اماں کی طرح گذرے گی یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھ جاتا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ ایک باہمت لڑکی بن کر دکھائے اور ابا کے غلط فیصلے کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ لیکن اماں نے پورے خاندان کی بدنامی کی جو تصویر کھینچی تھی اس سے اس کا معصوم دل سہم گیا تھا۔ وہ خود تو ابا سے بغاوت کر سکتی تھی لیکن اس کے انجام سے ڈرتی تھی، غصے میں ابا جانے کیا کر بیٹھیں، ان کا غصہ کس پر اترے، اماں پر، چھوٹے بہن

بھائیوں پر۔ امّاں اسے اکثر اردو کا اخبار پڑھ کر سناتیں تھیں خصوصاً ایسے باپوں کے قصے جو کہنا نہ ماننے پر بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے، یا کرایے کے آدمی بھیج کر قتل کروانے کی کوشش کرتے، وہ کسی صورت میں باغی بیٹیوں کو بخشتے نہ تھے، اور وہ مرنے کے لیے تیار نہ تھی، وہ جینا چاہتی تھی۔ ایک ہاں کہہ دینے سے کتنی آفات سے چھٹکارا مل سکتا ہے، جسمانی بھی، ذہنی بھی، وقتی طور پر سہی، امّاں نے سمجھایا تھا۔ اور وہ تو کمزور سی تھی ایک نازک سی پھول کی مانند جو اک چٹکی میں مسلا جا سکتا ہے۔ کاش وہ لڑکا ہوتی تو خاندان کی عزت کا اتنا بوجھ اس کے شانوں پر نہ ہوتا، وہ اداسی سے سوچتی۔

بات صرف اتنی تھی کہ ابا کی ایک چھوٹی بہن تھیں جنھوں نے اسے بچپن میں مانگ لیا تھا، مانگا وانگا تو خاک نہ تھا بس ہنسی ہنسی میں اپنے چھ سالہ بیٹے سے منگنی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جسے ابا نے ہنس کر ٹال دیا تھا، جمیلہ صرف دو سال کی تھی اس وقت، اور ابا گاؤں میں ننھے ننھے بچوں کی منگنی کرنے کا رواج جانتے تھے اور وہ اس کے بہت خلاف تھے۔ اور اب برطانیہ میں آنے کے بعد تو وہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ اور ہی منصوبے بنا رہے تھے، ایک ایسے روشن مستقبل کا جس سے ان کے افلاس زدہ رشتہ داروں کا کوئی تعلق نہ تھا۔

پھوپھی بے چاری کی زندگی حسرتوں، مجبوریوں اور سختیوں کی داستان تھی، ان کے شوہر نکمے تھے۔ کبھی ڈھنگ سے کوئی کام کر کے نہ دیا، اب وہ کسی طور اپنے بھائی سے ناطہ مضبوط کرنا چاہتی تھیں، شاید اسی بھائی کے وسیلے سے ان کے مقدر کی سیاہی کچھ چھٹ جائے، شاید ان کے دن بھی پھر جائیں اور اب زندگی میں کچھ آرام ملے۔ بیٹا تو ان کا بھی باپ ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا، کسی کام میں دل نہ لگاتا، میٹرک میں تین دفعہ فیل ہو کر اس کا امتحان سے دل بھر گیا تھا، اب دن بھر فلمی گانے گانا اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب پھوپھی کو یہ خبر ملی تھی کہ جمیلہ نے نوکری کر لی ہے تو انھوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی تھی مگر بھائی کو کچھ لکھنے کی ہمت نہ پڑی تھی کہ وہ لڑکیوں کو اتنی آزادی نہ دیں تو اچھا ہے، اور ابا کی فیکٹری خریدنے کے بعد تو ایکدم سے انھیں اپنے بیٹے کے بہتر مستقبل کی بشارت ہوئی اور انھوں نے لکھ بھیجا کہ چونکہ جمیلہ کو انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا اس لیے اب اس فرض کی ادائیگی کا وقت آ گیا ہے۔ لڑکی بھی جوان ہے اور ابا کو اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔

گو کہ ابا کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ انھوں نے کوئی وعدہ نہ کیا تھا بلکہ انھوں نے تو پھوپھی کی بات کا جواب ہی گول کر دیا تھا، وہ ماضی کے اس لمحہ کو بھول بھال چکے تھے اور بیٹی کے لیے کسی اچھے اور دولت مند رشتے کی تلاش میں تھے لیکن پھوپھی کا خط ملتے ہی نہ جانے کیا ہوا کہ ان کے دماغ نے ایک دم پلٹا کھایا، اور انھوں نے بس فیصلہ کر لیا کہ اگر میٹرک میں تین دفعہ فیل ہونے والے اس بھانجے کو انھوں نے بیٹی نہ دی تو ان کے آباو اجداد کی عزت و حرمت پر حرف آئے گا، وہ عزت جو نہ صرف ان کو بلکہ ان کے پورے خاندان کو ان کی اس چھوٹی سی فیکٹری کی ملکیت کے ساتھ حاصل ہو گئی تھی۔ حالانکہ گاؤں میں ان کی کوئی بھی حیثیت نہ تھی اس کا انھیں احساس تھا، اور یہ بھی کہ جس خاندان کی عزت کے لیے وہ بیٹی کی قربانی دے رہے تھے اس کا وجود صرف ان کے ذہن تک محدود تھا۔

پھوپھی کے خط کا مضمون جب اماں کو معلوم ہوا تو وہ سمجھ گئیں کہ پھوپھا پھوپھی صرف لالچ میں اس شادی کے خواہاں ہیں، وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ رشتہ کسی بھی طور سے موزوں نہ تھا، لیکن وہ کیا کہتیں، کس سے کہتیں؟ ابا کے حکم کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے ان کے پاس لفظ نہیں رہ گئے تھے۔ ان کا ذخیرہ تو شادی کے ابتدائی چند سالوں بعد ہی ختم ہو گیا تھا اور انھوں نے خاموش رہنے کی اہمیت کا راز جان لیا تھا۔ اب تو کبھی احتجاج کا کوئی جملہ زبان پر آ بھی جاتا تو وہیں اٹک کر رہ جاتا، باہر نکل کر ہی نہ دیتا، نکلنے سے انکار کر دیتا۔

ابا اچھے شوہر تھے اور اچھے باپ بھی، مشفق اور مہربان۔ بالکل اپنے معاشرے کے مردوں کی طرح جو بیوی سے بیٹیوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے احکامات بے چوں چرا بجا لائیں۔۔ جو نہ صرف یہ توقع رکھتے ہیں بلکہ اس کا مطالبہ بھی کرتے ہیں، اور اکثر اپنی جائز و ناجائز خواہشات اور فیصلوں کو مذہب کا مقدس لبادہ اوڑھا کر ان کو اور مجبور کر دیتے ہیں۔ ابا بھی پہلے بیوی کو رعیت سمجھتے رہے، پھر رفتہ رفتہ بیٹیاں بھی شریک ہوتی گئیں۔ لڑکے خود مختار تو نہ تھے مگر ان کے کچھ خصوصی اختیارات ضرور تھے۔ ابا ایک مطلق العنان حکمراں کی مانند تھے اسی لیے جب بیٹی نے ان کے بھانجے سے شادی کرنے میں حیل و حجت کی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے، بھلا اس لڑکی کی یہ مجال، انھوں نے غصے میں جوان بیٹی کو دھنک کر رکھ دیا تھا اور انھیں اپنے اس فعل پر ذرہ برابر ندامت نہ تھی۔ حکم عدولی کی برداشت ان میں قطعی نہ تھی۔

پھر جمیلہ کو زیورات پہنا کر ریشمی ملبوسات میں لپیٹ کر ایک خوبصورت سے پیکٹ کی طرح ابا کے بھانجے کو پیش کر دیا گیا۔ وہ بے ڈھنگا سا انسان جو اس نئے اور اجنبی ماحول میں اور بھی بے ڈھنگا لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر خوبصورت مردانہ سوٹ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کو سوٹ کے اندر انڈیل دیا گیا ہو۔ ایک ایسا انسان جسے مہذب طریقے سے کھانا کھانا بھی نہ آتا ہو اس کے سامنے "کورڈون بلو" (Cordon blu) (فرانسیسی طرز کے بہترین کھانے) کا سات کورس کا ڈنر پیش کیا جائے تو وہ اس سے لطف اندوز ہونے کی کیا اہلیت رکھتا ہو گا، اس کی کیا قدر کر سکے

گا۔ابا نے ایک بیڈروم کا ایک فلیٹ لے کر اسے جمیلہ کے جہیز سے آراستہ کروا کر،اس کے ہر زاویے سے تصویریں بھی کھنچوائی تھیں تاکہ پھوپھی پھوپھا پر رعب پڑ سکے وہ ان کے بیٹے کے لیے کیا کچھ نہ کر رہے تھے۔ہر طرح کا آرام مہیا کر رہے تھے۔

لیکن یہ سب تو ابا کی خوش فہمیاں تھیں کہ کسی پر ان کی امارت کا رعب پڑے گا۔ان کی بہن نے بیٹے کو جو سبز باغ دکھائے تھے اس میں مکان تھا بڑا سا،کار،عیش و عشرت اور دولت کی ریل پیل،لیکن سب سے پہلے تو بھانجے کو تیسری منزل کا یہ فلیٹ ناپسند ہوا،قطع نظر اس کے کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ نئے صوفے پر بیٹھا تھا،اور یہ سب سامان جو اس کے فلیٹ میں سجا تھا اس کو اس نے کبھی تصور میں بھی نہ دیکھا تھا،اور اس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں جن کی ضرورت اور استعمال سے وہ قطعی ناآشنا تھا۔لیکن اماں نے تو اس جنت کا تذکرہ کرتے وقت کام کا کبھی تذکرہ نہ کیا تھا لیکن رجسٹریشن کے دوسرے ہی دن ماموں نے اس کو اپنی فیکٹری میں لے جا کر کھڑا کر دیا تھا اور ایسے کام اس کے سپرد کر دیے تھے جو ایک داماد کے قطعی شایانِ شان نہ تھے۔ابا اسے بھانجہ تصور کرتے اور بے تکلفی سے کام کرواتے،لیکن اسے تو یہی معلوم تھا کہ بھانجہ جب داماد بن جائے تو بھانجہ نہیں رہتا۔اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کو ایسا کوئی کام نہ آتا تھا جو خواتین کے ملبوسات تیار کرنے والی اس چھوٹی سی فیکٹری میں اس کے سپرد کیا جا سکتا،ان کاموں کے علاوہ جو اسے بتائے گئے تھے،لیکن یہ تو کوئی عذر نہ ہوا داماد سے فیکٹری فلور پر کام کروانے کا۔۔۔۔اور جب اسکول کی چھٹیاں آئیں تو ابا نے اپنے بیٹے کو حساب کتاب کرنے والی بوڑھی مسز براؤن سے کام سیکھنے پر لگا دیا،جو اب پارٹ ٹائم کام کرتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول گیا،وہ تو خود کو اس آفس میں دیکھنے کا متمنی تھا، جہاں ایک جوان اور طرحدار گوری میم بھی ہوتی جو اس سے بے تکلفی سے "ڈیر" کہہ کر بات کرتی،اور چست لباس اور اونچی ایڑی کے جوتوں میں بل کھا کھا کر چلتی۔اور اس سے عشق لڑانے کا منصوبہ تو اس کے ذہن میں پل ہی رہا تھا۔

غضب یہ ہوا کہ شادی کے تین ماہ بعد ہی اسکول کی چھٹیاں آن پڑیں،اور ماموں کی کسی بات پر وہ بے حد گرم تھا۔بات دراصل یہ تھی کہ وہ کام وہام کا عادی نہ تھا،باپ کی طرح چند دن کے لئے کسی کام میں لگتا پھر اسے چھوڑ چھاڑ کر آوارہ گردی،یہاں ماموں صبح آٹھ بجے بلا لیتے اور شام چھ بجے سے پہلے تو کبھی چھوڑتے ہی نہ تھے۔سارا دن کھڑے کھڑے گذرتا،گھر پہنچتا تو بدن تھکن سے چور،اور ذہن غصے سے کھولتا ہوا،ذرا سی کوئی بات ہوتی اور وہ پھٹ پڑتا کھانے میں ذرا سی دیر ہوتی اور وہ جمیلہ کو بے نقط سناتا اور کاہلی کے طعنے دیتا۔حالانکہ وہ بھی اس سے آدھ گھنٹہ قبل ہی گھر پہنچتی تھی اور جلدی جلدی کھانا تیار کرتی۔اگر اس کی باتوں کے جواب میں حسبِ عادت کوئی جملہ انگریزی میں کہہ دیتی تو وہ گالی گلوچ پر اتر آتا۔اور اس دن بھی یہی کچھ ہوا تھا۔غصہ تو اسے ماموں پر تھا لیکن وہ ان سے کچھ نہ کہہ سکا،لیکن اس نے گھر آ کر جمیلہ کے پکائے ہوئے کھانے میں خوب نقص نکالے تھے،وہ بھی تھکی ہوئی تھی،اسے غصہ آ گیا اور جل کر اس نے ایک چھوٹا سا جملہ انگریزی میں کہہ دیا تھا" پھر خود کیوں نہیں پکا لیتے"۔پھر تو اس نے پلیٹیں توڑنے کے علاوہ جمیلہ کو بھی نہیں بخشا تھا اور کئی تھپڑ لگائے تھے۔جب وہ روتی ہوئی اماں کے پاس آئی تھی تو وہ بھی اس کو دیکھ کر رونے لگی تھیں اور داماد کو گالی کوسنے دینے لگی تھیں۔اس کے علاوہ ان کے اختیار میں اور کیا تھا۔وہ پھر برف کی ڈلی کپڑے میں لپیٹ کر اس کے چہرے کی ٹکور کرنے لگتی تھیں۔رات میں ابا گھر آئے تو ان کو کچھ بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔جب جمیلہ کے شوہر کے اس رویہ پر ماموں نے کچھ بھی نہ کہا تو اس کے مزے آ گئے،پھر تو اس نے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کا یہی آسان طریقہ اختیار کر لیا۔اب جب بھی اس کو ماموں پر غصہ آتا وہ گھر آ کر اس کی بیٹی کو پیٹ پاٹ کر رکھ دیتا، فیکٹری کے کچھ ایشیائی لڑکوں نے اس کو چند انگریزی گالیاں سکھا دی تھیں،اب وہ جمیلہ پر دھڑلے سے ان کا استعمال کرتا۔وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ گورے اپنی بیویوں کو کس طرح مارتے پیٹتے ہیں،اس نے عزم کیا تھا کہ یہ معلوم ہونے کے بعد وہ جمیلہ کو انگریزی بولنے اور دفتر میں کام کرنے کا مزا چکھا دے گا،اب جمیلہ بھی اماں کے پاس جانے کے بجائے گھر ہی میں رو دھو کر رہ جاتی،اماں سے شکایت کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ابا صبح سات بجے کے گئے گئے دس بجے رات میں پلٹتے تو ان سے کچھ کہنے سننے کی ہمت کس میں تھی۔جمیلہ سوجھا منہ لے کر اور سیاہ چشمہ لگا کر کام پر چلی جاتی جہاں اس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیاں اس کو پولس میں رپورٹ کرنے کا مشورہ دیتیں،امداد کرتیں۔لیکن ابا کا خیال اسے روک دیتا۔

ان حالات میں جمیلہ کے شوہر کی ہمت تو بڑھنی تھی،اب اس نے بیوی کو مختلف طریقوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا،اور ایک دن تو معاملہ حد سے آگے بڑھ گیا،اس کے شوہر نے پہلے تو اس کو کرسی پر سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا پھر لاتوں گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ چھ ماہ کی حاملہ تھی۔اس کی چیخیں سن کر اس کی پڑوسن آ گئی تھیں اور انھوں نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا تھا،جس سے وہ آدمی گھبرا کر رک گیا تھا،اور جمیلہ نے خود کو کسی طرح گھسیٹ کر دروازہ کھول دیا تھا اور باہر نکل آئی تھی،پڑوسن نے اس کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور اس کے والدین کے گھر چھوڑ آئی تھی،جہاں رات بھر وہ درد سے چیختی رہی حتی کہ ڈاکٹر بلانا پڑ گیا تھا جس نے فوراً ایمبولنس بلا کر اسے اسپتال بھیج دیا تھا۔

ابا کو ان مسائل سے دلچسپی نہ تھی اور پھر وہ تو بیٹی کو بیاہ کر فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے،ان کو ایک آرڈر پورا کرنا تھا جس کے لیے

فیکٹری میں دن رات کام ہو رہا تھا ورنہ ہزاروں پونڈ کا نقصان ہو جاتا جو ابا کسی صورت میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ جمیلہ اسپتال میں داخل ہو گئی ہے تو وہ ذرا گھبرا گئے تھے کہ کہیں پولس سے واسطہ نہ پڑ جائے۔ اس سے وہ بہت ڈرتے تھے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کی چھوٹی بیٹی نے ڈاکٹر کو یہ بتایا ہے کہ آپا سیڑھیوں سے گر گئی ہے تو انھوں نے اطمینان کا سانس لے کر فیکٹری کی راہ لی تھی۔ جمیلہ کئی دن سخت تکلیف میں مبتلا رہی پھر آپریشن سے قبل از وقت بچی پیدا ہوئی تھی، ماں بیٹی بہت کمزور تھے، اور بچی کو دو ماہ تک اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

جمیلہ کے گھر آ جانے کے بعد اس کے بہن بھائیوں نے سر جوڑ کر کچھ سنجیدہ باتیں کیں، کچھ اہم فیصلے ہوئے اور اماں کو ان سب سے قطعی بے خبر رکھا گیا۔ بچی کے گھر آنے کے بعد جب ابا نے پوچھا تھا کہ جمیلہ کب گھر جا رہی ہے تو اماں گول مول سا جواب دے کر رہ گئیں، ابا حالات سے کچھ ڈرے ڈرے سے تھے اور اماں غریب دونوں طرف سے پس رہی تھیں۔ ایک طرف بچے دھونستے دوسری طرف ابا جان کا خوف، جس کی دہشت میں تو وہ خدا کے احکامات بھول بھول جاتیں۔ جمیلہ کے شوہر کو سسرال میں منہ دکھانے کی ہمت نہیں پڑی تھی، اسے یقین تھا کہ ممانی ماموں نہ سہی پر ان کے بچے موقع ملنے پر ضرور اس کو زہر دے دیں گے۔ انھوں نے اب اس سے سلام دعا بند کر دی تھی، اگر فیکٹری میں مڈ بھیڑ ہو جاتی تو وہ اسے دیکھ کر منھ پھیر لیتے، ابا بھی بچوں کی نفرت کا یہ انداز دیکھتے مگر زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنی اولاد کو ڈانٹ پھٹکار سے اور اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور نہ کر سکے۔

لیکن انھوں نے اس کو سزا دینے کا ایک طریقہ سوچ لیا تھا، بس جمیلہ نے خاموشی سے ہوم آفس کو خط لکھ دیا تھا۔ اور پھر جب بھانجے کے "ڈیپورٹیشن" کا آرڈر آ گیا تو ایک دم سے ٹپٹا گئے، چیخے چلائے، جان لینے کی دھمکی دی، جان دینے کی دھمکی دی، مگر کچھ کر نہ سکے، جمیلہ نے پولس کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کر دی تھی اور اماں نے ڈرتے ڈرتے ابا کو یہ خبر پہنچا دی تھی۔ ابا نے جمیلہ سے بول چال بالکل بند کر دی تھی، مگر گھر میں وہ ہوتے ہی کب تھے کہ کسی کو ان کے اس رویے کا احساس ہوتا اور جمیلہ کو کہنے کے لیے ان کے پاس رہ کیا گیا تھا۔ وہ سوچتی ۲۱ سال کی عمر میں اس کی شادی بھی ہوئی اور طلاق بھی۔ جاتے وقت اس کا شوہر غصے میں سبھی کچھ کہہ گیا تھا۔

جمیلہ نے کونسل میں درخواست دے دی اور بڑی دوڑ دھوپ کے بعد سال ڈیڑھ سال میں کہیں جا کر اس کو "سنگل پیرنٹ" کی حیثیت سے فلیٹ مل گیا، اور اماں کے شدید اصرار کے باوجود وہ اپنے فلیٹ میں تنہا اپنی بچی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ وہ اب والدین کے سایۂ عاطفت میں رہنے کے لیے قطعی تیار نہ تھی، جب اسے وہ ساری جسمانی اذیتیں یاد آتیں جو پہلے ابا نے دیں پھر ان کے بھانجے نے اس کو دی تھیں تو اس کے دل و دماغ میں نفرت بھر جاتی، اب وہ ابا کی موجودگی میں گھر بھی نہ جاتی، اور صرف بھائی بہن اور اماں کی محبت اسے گھر جانے پر مجبور کرتی تھی۔

پھر اس کو اپنی چھوٹی بہن کی شادی کی خبر ملی تھی اور اس نے بہن سے پوچھا تھا۔

"کیا پھر کسی بھانجے بھتیجے کو بلانے کی خواہش ہے؟" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"نہیں بھئی، یہ تو کر کے دیکھ چکے۔ اور پھر ہم سب تو اس ملک میں اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اب گاؤں کے شریف لڑکے ہمیں قبول ہی نہ کریں گے۔ پھوپھی نے ہمیں خوب بدنام کیا ہوگا۔"

"تو پھر کون لڑکا ہے؟۔ تم نے دیکھا ہے اسے؟"

"نہیں بھئی، میں نے نہ دیکھا ہے نہ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کی امید ہے، کیا تم سمجھتی ہو ابا اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔" وہ ہنسی "تمھیں معلوم ہے بس ابا کی مرضی چلتی ہے۔"

"مگر.... مگر ابھی جلدی کیا ہے۔ تم ٹیچرز ٹریننگ کرنا چاہتی ہو اس کا کیا ہوگا؟" وہ گھبرا گئی۔

"جلدی انھیں اس لئے ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح خود مختار نہ ہو جاؤں، اس لیے شادی کی بیڑیاں ڈال کر قید کرنا چاہتے ہیں۔" وہ لمحہ بھر رکی "خدا جانتا ہے کیا ہم اب قید نہیں ہیں۔"

"تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں اس کے بارے میں؟" جمیلہ حیران تھی۔

"اس لڑکے کے بارے میں؟"

"بس اتنا معلوم ہے کہ ابا کے کسی دوست کا لڑکا ہے، اور ابا کے جیسے دوست ہوتے ہیں وہ تو تم جانتی ہی ہو۔ اس کی بھی کوئی کریانے کی دکان ہوگی یا سبزی یا گوشت کا کاروبار یا پھر ابا کی طرح چند مشینوں والی فیکٹری کا مالک ہوگا۔ ہاں ایک اور بات معلوم ہے اس کے بارے میں۔" وہ زور سے ہنسی۔ "وہ بھی اماں بس غلطی سے بتا گئیں۔ وہ کسی گوری کے عشق میں مبتلا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماں باپ زبردستی کر رہے ہیں اس شادی کے لیے۔ گویا ان کے خیال میں اس شادی کے بعد وہ گوری کو چھوڑ دے گا۔" جمیلہ منھ بنا کر بولی۔ "یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ کسی اور کو چاہتا ہے تو شادی سے کیا فرق پڑے گا۔ تم انکار کر دو۔ فوراً۔" اس نے بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"واہ آپا۔ واہ۔ انکار کر دوں تمہاری طرح اور پھر تمہاری طرح میرا بھی حشر ہو۔ کمرے میں قید، کھانا پانی بند، اور گھونسے تھپڑ علیحدہ۔ تمہارے منھ پر ابھی تک نشان ہے۔ اور میں تمہاری حالت دیکھ چکی ہوں۔ اور تم

(باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھئے)

کتاب بازار

اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والی وہ کتابیں جو حالیہ دنوں میں شاعر کو تبصرے کے لئے موصول ہوئیں۔ ذیل میں ان کتابوں میں سے چند ایک کا تعارف دیا جارہا ہے۔ اس التماس کے ساتھ کہ باذوق قارئین اپنی پسندیدہ کتابوں کو ضرور خریدیں گے۔ (ادارہ)

پہلی دستک

الیاس راج بھٹی

الیاس راج بھٹی افسانہ نگار (یادوں کے سائے) بھی ہیں اور شاعر بھی "پہلی دستک" ان کا اولین شعری مجموعہ ہے جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں، نظمیں اور گیت شامل ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر کے تعارف اور شین کاف نظام کے فکر انگیز دیباچے نے شاعر اور اس کے شعری لوازمے کی اہمیت کو پوری طرح روشن کیا ہے۔ جنوری ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی ۱۸۴ صفحات (اردو ہندی) کی یہ کتاب ۱۵۰ روپے میں سیمانت پرکاشن، کوچہ روح اللہ خان، دریاگنج، نئی دہلی۔ ۲ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

مصنف کا پتہ: P.O. Box 509, New York - 100008 (USA)

نئے دیس میں

جتندر بلو

جتندر بلو کے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ ہے۔ (پہچان کی نوک پر: ۱۹۸۶ء۔ جزیرہ: ۱۹۹۴ء) ۷ طویل و مختصر کہانیوں کا یہ مجموعہ افسانہ کہانی کی روایت کا ایک اہم پڑاؤ ہے۔ مرتی ہوئی بیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور آخری لمحوں کا منظر نامہ بھی ہے اور عالم آشوب بھی۔ زندگی میں زندگی کی انتہاؤں کو دیکھنے کی تخلیقی کوشش۔ مارچ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی ۱۸۴ صفحات کی یہ کتاب ۱۰۰ روپے (۵ پونڈ) میں قلم پبلی کیشنز۔ ۱۷ ۱/۷ ایل آئی جی کالونی، کرلا (مغربی) ممبئی ۷۰ سے حاصل کی جاسکتی ہے یا براہ راست مصنف سے منگوائی جاسکتی ہے:

6 - Corfton Lodge, Ealing, London W5 2HU (U.K.)

آگ اور پانی

انور شیخ

انگریزی اور اردو کے ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور صحافی انور شیخ کے شعر و افسانہ پر مشتمل یہ نئی کتاب اپنی خوبصورتی اور خوب سیرتی دونوں ہی سے شعر و ادب کے باذوق اور باشعور قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ کتاب کا گٹ اپ، اس کی ترتیب، ڈرائنگس، کاغذ، طباعت، سب کچھ ایک اچھی کتاب کو بہت اچھی کتاب بنانے میں معاون ہوئے ہیں۔ کتاب کا تخلیقی فکری لوازمہ کتاب کی روح ہے۔ ۱۶۸ صفحات کی یہ دیدہ زیب انوکھی کتاب صرف بہبودیٔ عوام کے لئے شائع کی گئی ہے اس لئے برائے فروخت نہیں ہے مگر مصنف کے پتے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

The Principality Publishers,
P.O.Box 918, Cardiff - CF5, 2NL (U.K.)

جان پہچان

محمد ہارون پاشا

یہ متنوع اور خوب سیرت اسلوب میں لکھی گئی کتاب متحدہ عرب امارات میں مقیم اہم پاکبازوں کے دلچسپ تعارفی و تفصیلی خاکے ہیں۔ مردہ پرستی کے اس دور میں یہ زندہ انسانوں کا ذکر ہے۔ جن اشخاص پر یہ خاکے تحریر کیے گئے ہیں ان میں ابلاغ، اداروں کے سربراہ، افسانہ نگار، انتظامیہ، اکاؤنٹنٹ، انجینئر، آرگنائزر، بینکار، ڈاکٹر، زراعت، سفارت کار، سوشل ورکر، سیلف میڈیا، شاعرات و شعراء، فن کار اور مصور کے باب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سید ہارون پاشا نے اپنی شگفتہ تحریروں سے ہر شخصیت کو گویا خلق کرنے کی سعی کی ہے۔ ۳۲۳ صفحات کی یہ کتاب، تابندہ پبلی کیشنز، ۲۔ میکلوڈ روڈ (موتی مینشن) اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر ۶، لاہور (پاکستان) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

حاجی بھائی پانی والا

ساقی فاروقی

ساقی فاروقی کی اس شعری کتاب میں ۱۰ نظمیں اور ۱۰ غزلیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں غزلیں کتب و رسائل میں بحث کا موضوع بن چکی ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ (شمس الرحمٰن فاروقی) بہت اہم ہے۔ ساتھ ہی ساقی فاروقی سے افتخار عارف کی طویل گفتگو بھی شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں ۱۱ انگریزی نظمیں دی گئی ہیں جو ساقی فاروقی نے انگریزی میں تخلیق کی تھیں۔ ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی اس کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپے ہے۔ کتاب اس پتے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

100 - Sunny Garden Rd, NWY IRY, London (UK)

نوادرِ اقبال یورپ میں

ڈاکٹر سعید اختر درانی کی یہ گرانقدر تحقیقی کتاب دراصل "اقبال یورپ میں" (۱۹۸۵ء) کا ماحصل ہے۔ موجودہ کتاب میں اقبال کے قیامِ یورپ کے متعلق بعض اہم امور زیر بحث آئے ہیں اور کئی دلچسپ حقائق بے حجاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک حصہ علامہ کے قیام جرمنی سے متعلق حالات و واقعات اور دستاویزات پر مشتمل ہے۔ اقبالیات کے باب میں یہ ایک اہم اضافہ ہے جو قابل مطالعہ بھی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اس کتاب کی قیمت ۱۲۰ روپے ہے۔ اسے اقبال اکادمی پاکستان نے شائع کیا ہے اور ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور (پاکستان) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

شاعر

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــــ ۷۰
شمارہ ــــــ ۸

فون: 3829904

اگست ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ❀ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ❀ خلیجی ممالک ۲ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai -

فکرِ امروز

❋

طرازِ نیاز

نوائے درد سے معمور ہے مرا آہنگ
تلاش کر نہ مسرت مرے فسانوں میں
شکستِ روح سے جب ٹوٹ جائے سازِ حیا
تو جان آئے کہاں سے شکستہ جانوں میں
قریب ختم ہے سوز و گداز کا قصہ
ہے لطفِ آخرِ شب میری داستانوں میں
خرابِ صبح ہیں سامان میری محفل کے
خمار بن کے ہوں کچھ دم کے میہمانوں میں
یہ مشتِ خاک ہے پھر طالبِ صعود و عروج
الٰہی کوئی زمیں بھی ہے آسمانوں میں
مجھے عطا ہو نیا ایک جرعۂ تخلیق
جمودِ زیست سے اب ہوں میں سرگرانوں میں

درونِ خاک سے پھر گل طراز کر مجھ کو
نیاز مند ہوں ، شایانِ ناز کر مجھ کو

سیماب اکبرآبادی

اداریہ

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

[illegible]

بخط شاعر

[illegible]

نقد و نظر

[illegible]

[illegible]

سرورق
حامد اقبال صدیقی

ہم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں
[قارئین و قلمکار]
۳۹

مکتوبات

ذکاء الدین شایاں	انجم عثمانی	قریشی
شہاب اختر	انوار انصاری	راھب
مشتاق انجم	سمیع الدین اطہر	ساد شرما
مہدی ٹونکی	احسان آوارہ	ناظم
سلطان سبحانی	رشمی بادشاہ	اویسی
	فاروق احمد بسمل	

۴۳

غزل ہی کو موضوع بنائیں گے ہم

غزل کی حمایت میں اس کے جس کردار اور پہلوؤں پر گفتگو کی جارہی ہے اس سے کتابی، نصابی اور مکتبی ذہن یہ سوچ رہے ہیں گویا ہم پرنٹ میڈیا کے خلاف ہیں۔ کتاب لفظ کے خلاف ہیں، نظم کے خلاف ہیں۔ نہیں! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم جو مشاہدہ کررہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، سوچ رہے ہیں وہی کچھ لکھ رہے ہیں۔ اردو زبان اور رسم الخط کی موجودہ ملکی و غیر ملکی صورت حال کے تناظر میں اگر غزل کے عملی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے جیسا کہ اس نوع کے تجزیاتی شذرات 'جرعات' کے تحت لکھے ہی جارہے ہیں، تو اس سے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے لئے مفید کام ہو سکتا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بولنے اور سنے جانے والے لفظ، لکھے ہوئے لفظوں پر حاوی ہو رہے ہیں؟ وقت کے تسلسل میں فی الحال تو یہی ہو رہا ہے اور جو ہو رہا ہے، غزل اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ ہندوستان کی اور بھی تو زبانیں ہیں، ان کی شاعری ہے۔ ان زبانوں کے علاقے ہیں، ان کے اپنے بولنے والے ہیں۔ تخلیق کار ہیں، ان کا اپنا ادب ہے انھیں کسی طرح کا کوئی خوف نہیں، ان کے مسائل اس حد تک نہیں جو اردو کے ساتھ ہیں، اس کے رسم الخط کے ساتھ ہیں۔ علاقائی زبانوں کے ادب ان کی شاعری، چاہے وہ کتنی ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو، اس کے لکھنے والے اور اس کے پڑھنے والے بہت محدود بھی ہو جائیں، کوئی فرق نہیں پڑے گا حالانکہ الیکٹرانک میڈیا نے علاقائی زبانوں اور اس کے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا ہے لیکن صنف غزل ہر تبدیلی کا ساتھ دے رہی ہے اور ہر تبدیلی کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ اس میں جو اوصاف ہیں، ہمیں ان میں سے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے لئے کام کرنا ہے اور غزل کو اردو ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے لئے بھی فخر کا درجہ دینا ہے۔ پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں میں بھی غزل اپنا جادو جگا رہی ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ، غزل نے معاشی سطح پر بھی بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ غالب اور اقبال بالکل سامنے کی مثالیں ہیں۔ غالب، غزل کے شاعر ہیں، اقبال نظم کے شاعر ہیں لیکن اقبال کی نظمیہ شاعری پر غزل کا اسلوب اور اس کی نغمگی حاوی ہے۔ چنانچہ اقبال کے جو شعر عوام و خواص میں مشہور ہوئے ان میں غزل کے تمام تر اثرات موجود ہیں۔ غالب اور اقبال کو ہند و پاک اور دنیا بھر میں جس طرح مسلسل پڑھوایا گیا ہے تو اس میں تمام تر کمال غزل ہی کا ہے۔ انیس مرثیہ نگاری کے امام ہیں اور انھوں نے مرثیے میں بڑی شاعری کی ہے لیکن یہ بڑی شاعری کتابوں، رسالوں میں یا مسلمانوں میں مقبول تو ہے لیکن ہندوستانی عوام میں مقبول نہیں ہے۔ نظم کا ایک اہم نام جوش کا بھی ہو سکتا ہے لیکن جوش کی نظموں سے ایسے اشعار از خود نکل کر نہیں آئے جیسا کہ اقبال کی نظموں سے۔ حالانکہ ایک طبقہ جوش کو بھی پڑھوانے کی سعی کر رہا ہے۔ مثالیں بہت ساری ہیں اور یہ ہمارا موضوع نہیں۔ غزل نے ذریعہ معاش کو ہزار راستے دئے اور اب بھی ہزار راستوں کی گنجائش رکھتی ہے۔

عالمی ادب کے ساتھ اردو شاعری کو رکھنے کے شوق بلکہ جنون نے غزل کو بہت نقصان پہنچایا ہے کیوں کہ غزل کا ترجمہ انگریزی یا کسی اور زبان میں ممکن نہیں۔ حالانکہ تخلیقی شاعری کا ترجمہ، وہ کسی بھی زبان کی شاعری ہو، آسان نہیں، مگر دنیا کی ہر چھوٹی بڑی زبان کے قلم کاروں نے، ان کے ناقدین نے اپنے ادب کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے اور بتانے کی سعی کی ہے کہ 'ہمارا ادب بھی ادب ہے' غزل کی گردن مار دینے والوں نے، صنف غزل کا مذاق اڑانے والوں نے، مغرب زدہ ذہنوں نے اور دوسری زبانوں کے شعر و ادب سے مرعوب ہونے والوں نے (اردو والوں کا مزاج ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی زبان کے شعر و ادب سے مرعوب ہو جاتے ہیں) صنف غزل کو عالمی زبانوں کے ادب کے ساتھ نہیں رکھنا۔ غزل پر کام ہی نہیں کیا اور اب بھی یہی ہو رہا ہے حالانکہ غزل اپنا کام کر رہی ہے۔ آئندہ ہم صرف دو موضوعات پر گفتگو کریں گے۔ عالمی شاعری اور غزل۔ غزل اور کلاسیکی طریقۂ تخلیق۔

اللہ

ISLAMIA COLLEGE
RAILWAY ROAD
LAHORE-7

Dated 5 · 5 · 1969

12/5/69

برادرم اعجاز صاحب

سلام مسنون ۔ عرصہ ہوا کہ کبھی آپ کا خط نہیں آیا ۔ اور اب تو نقوش بھی نہیں آیا ۔ غالب نمبر کے دیکھنے کو ترس رہا/ مشتاق ہے ۔ امید ہے کہ یہ نمبر مجھ کو بھی روانہ فرمائیں ۔ نوازش ہوگی ۔

خطوط کی اشاعت ایک ہی جلد چھپا ہو چکی ہے دوسری جلد جس وقت ملے گی دونوں جلدیں رسالہ خدمت کروں گا ۔ اصل میں یہ نمبر ایک مدت سے نایاب ہے ۔ کہیں کسی کباڑی کے یہاں مل جائے ۔ ورنہ دفتر میں مفقود ہیں ۔

اپنی خیریت سے کبھی کبھی شاد فرماتے رہا کریں ۔ آپ نے غالب نمبر کی قیمت لکھی نہیں ۔ ورنہ ضرور روانہ کرتا ۔ میرے لئے جب کوئی کام خدمت ہو ۔ بلا تکلف تحریر فرمائیے اور خادم سمجھیے ۔ بچوں کو دعا والسلام

خادم

کسریٰ منہاس عفی عنہ

کسریٰ منہاس بنام اعجاز صدیقی 1969ء

حضرت کسریٰ منہاس (غلام حسن، پ : ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۹ء۔ م : ۳۰ر نومبر ۱۹۹۵ء) اردو زبان وادب کے خاموش خدمت گذار تھے۔ شاعر، تاریخ گو، عالم اور علم دوست انسان تھے۔ تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ فن تاریخ گوئی پر ان کی کتاب نقوش پریس لاہور نے شائع کی ہے۔ وہ رسالہ 'نقوش' سے وابستہ ہوئے اور نقوش کے کئی اعلیٰ درجے کے ضخیم یک موضوعی خاص نمبر ترتیب دیئے۔ شاعر اور مدیر شاعر سے ان کے تعلقات تھے۔ شاعر کے کسی آئندہ خصوصی شمارے میں مرحوم پر خصوصی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ اس خط میں شاعر کے 'غالب نمبر' کا ذکر ہے اور ان کے مکاتیب نمبر کا بھی ذکر ہے جو دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ (ادارہ)

بہ خطِ شاعر



محمد علوی

وقت ٭

ہم نے وقت کو
گھڑی میں قید کر دیا ہے!
جہاں وہ
ہاتھ پھیلا کر
ہاتھ اٹھا کر
ہاتھ جوڑ کر
فریاد کرتا رہتا ہے!
جب وہ آزاد تھا
وہ زمانہ
یاد کرتا رہتا ہے!!

٭

"رونے کا مزا"

بڑی عمر کی کنواری لڑکیاں
رات کو بستر میں دبک کر
تکیے کو محبوب بنا لیتی ہیں
دیر تک رونے کا مزا لیتی ہیں

15/1, Park Palace, Sarita Kunj Society,
Paldi, Ahmedabad - 380007 (Gujrat)



تاج سعید

وسوسے

یہی دنیا ہے ہمدم جس میں ہم نے زندہ رہنا ہے
یہاں سورج نشیں چہروں پہ رونق ہے
جو یوں تو دیکھنے میں خوبصورت ہیں
مگر باطن میں جن کے جھانکئے تو
رنج کے آلام کے دکھ درد کے کتنے مگرمچھ
[illegible] ان کے اندر
اس طرح ہے جیسے یہاں سبھی [illegible] ہیں
کہ تھوڑی دیر میں آنکھوں لگے رہتے
ہم اس کردار کی حالت کو بیاں کرنے بیٹھیں تو
ادھر ان کے رنگ اور ان کی چمک
ڈھل ڈھل کے ان کا دامن رنگین ہو جائے گی
ادھر ان کے دکھ درد کا یہ آنند دھرتی کے رنگیں
سینے پر بکھر کر [illegible] کے حسن کو میلا کرے گا

ادھر پھر ان کے یہ دکھ درد
ان کے غم
جب دوسروں کے غم میں شامل ہو کے پھیلا کریں گے
کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کے دامن میں
خوشی کے راستوں کے پھول ڈالے
انا کی پھول خوشبوؤں کو [illegible]

P.O. 323, Peshawar Cantt (Pakistan)



وہاب دانش

یہ سچ ہے کہ
میں نے بجھایا نہیں
وہ دیا
جس کی ہر دھڑکن میں
لاٹ تھی جگمگی
روشنی ..... مانگ میں جس کی
سیندور تھی
سہاگن تھی وہ کنبے کی

یہ سچ ہے
ہوا
دسترس میں نہ تھی
کوئی طوفان بھی
قابو میں نہ تھا

پھر اندھیرا
[illegible]

wer Bazar, Ranchi - 834001 (Bihar)

سوچ کے زاویے

ادبی فیچر

ہم عصر اردو ادب نمبر اور بعد کے شماروں پر مختصر خطوں کے ساتھ طویل خطوں کی تعداد میں غیرمعمولی اضافہ ہوا ہے یوں ادبی فیچر کے لئے خاصہ اہم لوازمہ موصول ہورہا ہے ۔ گو ان سب کی سمائی ممکن نہیں تاہم بعض اہم مندرجات جو مجموعی طور پر قارئین شاعر اور طلباء کے لئے مفید ہوسکتے ہیں یا موضوعات اہم ہوسکتے ہیں ۔ ان پر بحث کی جاسکتی ہے یا کی جانی چاہیے ۔ ذیل میں جو مختلف النوع مباحث دئے جارہے ہیں وہ آج ہی کے موضوع ہیں اور مستقل موضوع ہیں ۔ آنجہانی مالک رام کے "تذکرۂ ماہ وسال" کو بنیادی ماخذ کی اہمیت حاصل ہے ۔ اب اس نوعیت کے جو بھی کام ہورہے ہیں یا ہوں گے وہ تذکرہ ماہ و سال کو اپنی مثال کریں گے یا اسے ماڈل بنائیں گے ۔ ہم عصر اردو ادب نمبر میں گوشۂ مالک رام کے تحت ادارتی شذرات کا رد عمل ہوا ہے اور دنیا بھر میں جہاں تہاں اس موضوع پر کام ہورہا ہے اس کی اطلاعات مل رہی ہیں ۔ کانپور سے شاعر کے ایک قاری نے لکھا :

> " آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم کئی سال سے اردو شعرا کے حالات جمع کررہے ہیں اور ان کا نمونۂ کلام بھی ۔ اب تک کئی ہزار شعرا کے کوائف اور ان کا کلام جمع کرلیا ہے ۔ غیرمسلم شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام جتنا میرے پاس ہے شاید ہندوپاک میں کسی کے پاس نہ ہوگا ۔ " (چاند میاں طیب)
>
> 88/139, Pashkar Road, Chaman Ganj, Kanpur - 208001 (U.P)

شخصی یا پھر اجتماعی طور پر سوانحی لغت پر کام تو ہورہے ہیں لیکن کوئی معیاری سوانحی لغت 'تذکرہ ماہ و سال' کے بعد شائع نہیں ہوئی۔ ناقص کام تو ہورہے ہیں ۔ معیاری کام کے لئے جس تحقیقی شعور کی ضرورت ہے اس کا فقدان ہے ۔ سید معراج جامی کا خط بطور خاص ادبی فیچر میں شامل کیا گیا ہے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ پوری اردو دنیا سید معراج جامی اور اس قبیل کے دیگر کام کرنے والوں کو اپنا تعاون دے ۔ سوانحی لغت پر تحقیقی کام کرنے والے افراد ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں ۔

شاعر کی خصوصی اشاعت "عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب" سے متعلق پسندیدگی کے کئی خط گذشتہ شمارے میں شامل تھے ۔ اس موضوع پر گاہے بہ گاہے بحث طلب مضامین اور تنقیدی شذرات شائع کئے جائیں گے ۔ عذرا پروین ایک نہایت ہی ذہین اور واقعی منفرد شاعرہ ہیں لیکن تنقیدی نثر میں بھی ان کا کاٹ دار لہجہ بہت مختلف ہوتا ہے ۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے ، سچ کہا ہے ۔ خواتین تخلیق کاروں کی اہمیت تو مرد قلم کاروں ہی کی طرح ہے اور ہم اسی 'اہمیت' کو ایک نئی تخلیقی معنویت دینے کی سعی کررہے ہیں۔

ابراہیم اشک کی ساری گفتگو اداریۂ شاعر (ماہ اپریل) غزل اور فنون لطیفہ پر ایک دوسرا مکالمہ ہے ۔ ہم نے صنف غزل کے سماجی اور ثقافتی تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں کمزور ہوتے ہوئے اردو رسم الخط کے باوجود غزل اپنا جو کردار ادا کررہی ہے وہ اردو زبان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے ادب یا اس کے کسی شعری فارم نے نہیں کیا ۔ ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ غزل اردو والوں میں ، ان کے کتب و رسائل ہی تک محدود نہیں ، وہ اپنے آپ میں ایسے خصوص کی حامل ہے جس نے اردو زبان ہی کا دفاع نہیں کیا بلکہ مرتے ہوئے مشترکہ تہذیب وتمدن کو اب بھی حرارت پہنچارہی ہے ۔ موصوف کی بحث کا جواب بھی ممکن ہے اس وقت جب غزل گلیکی کا جائزہ لیا جائے گا ۔ عظیم اور معمولی شاعری ، شاعری اور موسیقی ، آسمانی صحیفے اور لحن ، شعرا اور غزل گانے والوں کا کاروباری رشتہ اب تک کی گائی جانے والی غزلیہ شاعری اور اعلیٰ شاعری وغیرہ ۔ آج کی ہماری بحث تو غزل کے اس کردار سے ہے جسے ہم نے اب تک اپنا فخر نہیں بنایا ۔ ہم اب تک ان منطقی مباحث میں گرفتار نہیں جن سے اردو رسم الخط اور غزل کو کوئی کمک نہیں مل رہی ہے ۔ برسبیل تذکرہ نئی نسل کے شاعر شفق سوپوری کے حوالے سے قارئین شاعر کے علم میں یہ لانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے شاعری اور موسیقی کے تحت غزل گائیکی کا تفصیلی تحقیقی جائزہ لیا ہے اور ان کا تجسس

[illegible]



سید معراج جامی

کچھ تذکرہ ماہ و سال کے حوالے سے

مالک رام کی سوانحی لغت "تذکرہ ماہ و سال" جنوری ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آئی تو میں نے ۱۹۹۲ء کے آخر میں اسے حاصل کیا۔ مجھے اس کتاب کی خبر سے جس قدر خوشی محسوس ہوئی تھی کتاب حاصل کر کے اگرچہ وہ خوشی ضائع تو نہیں ہوئی مگر اس کی شدت میں کمی واقع ضرور ہو گئی تھی۔ کیونکہ تذکرہ ماہ و سال کی ورق گردانی کرتے ہوئے اتفاق سے ایک دو جگہ مجھے حیرت ناک جھٹکا لگا، جب میں نے دیکھا کہ پروفیسر منظور حسین شور علیگ کے سوانحی خاکے میں ان کی وفات ۲۲ر ستمبر ۱۹۸۱ء اور جائے مدفن میانی صاحب لاہور درج ہے۔ جبکہ شور صاحب ان دنوں حیات تھے، ان کا انتقال ۸ر جنوری ۱۹۹۴ء کو کراچی میں ہوا ہے۔ علاوہ ازیں معروف قلم کار شہزاد منظر کا نام شہزادہ لکھا ہوا ہے۔ شمس الدین فقیر دہلوی کے آگے ولادت کی جگہ لفظ وفات اور فصیح، میرزا جعفر علی (شاگرد ناسخ) کی سن پیدائش ۱۸۰۲ء اور وفات ۱۸۵۳ء لکھا ہوا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس بے شمار اغلاط اور تسامحات نظر آئے۔ مجھے اس بات کا تو اچھی طرح علم تھا کہ اس طرح کے تذکرے قطعی اکمل و مکمل اور صحتِ اغلاط سے مبرا نہیں ہوتے ہیں کیونکہ یہ تذکرے یا کوائف مختلف ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں لہذا ان ذرائع سے ان کوائف کی درستگی اور صحت کے بارے میں کچھ استفسار نہیں ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات کیا بلکہ اکثر یہ دیکھنے میں آیا کہ خود مصنف کی کتاب میں اس کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے کوائف میں سن یا مقام باوجود انتہائی غور سے پروف ریڈنگ کرنے کے بعد بھی غلط چھپ گئے۔ طباعت، کمان سے نکلا ہوا تیر ہے۔ جس کی واپسی مشکل نہیں ناممکن ہوتی ہے۔ بعد میں بس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ بلیڈ سے غلط اندراج کو کھرچ کر کاٹ بال پوائنٹ پین سے درستگی کی جائے یا اپنے ذاتی واقعات کو کسی مصلحت کی بنا پر غلط لکھ دینا اور بعد میں اس کی تصحیح کرنا۔ مگر اسے کیا کہیے کہ کسی محقق کے پاس اگر وہ کتاب بغیر درستگی کے چلی جائے اور محقق اسی کوائف اور واقعات کو اپنے مقصد میں استعمال کرے تو اس تسامح کا ذمہ دار محقق تو ہرگز نہ قرار پائے گا۔ تاہم تذکرہ ماہ و سال کے سلسلے میں جو سب سے بڑی بدنصیبی کی بات ہوئی ہے وہ اس سوانحی لغت کی بغیر نظر ثانی اشاعت ہے مجھے یقین ہے اور میں آپ کی اس بات کو صاد کرتا ہوں کہ اگر مالک رام آپ کی بات مان کر کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر گیان چند جین یا حنیف نقوی میں سے کسی ایک کو نظر ثانی کے لئے دے دیتے تو یہ کتاب واقعی ایک اہم بنیادی اور غیر معیاری ناقص اور ادھوری معلومات سے پاک ایک معیاری کتاب ہوتی۔

اس کتاب کے بارے میں جیسے ہی مجھے معلوم ہوا تو میرے لئے اسے حاصل کرنا اور جلد از جلد حاصل کرنا ایک مسئلہ بن گیا تھا کیونکہ ۱۹۹۰ء سے میں بھی تذکرہ دبستان کراچی پر کام شروع کر چکا تھا۔ میرا یہ تذکرہ سنہ ۱۹۴۷ء سے تاحال تک کے زندہ اور مرحوم شعراء، شاعرات کے سوانحی لغت، تصویر اور ایک غزل پر مشتمل ہے اور یہ سب کچھ صرف ایک صفحے ہی پر جمع ہیں۔ اس تذکرے سے قبل میرے پاس کراچی سے شائع ہونے والے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے چند تذکرے ہیں مگر ان تذکروں میں سوانحی لغت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ بس جس نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھ دیا بعینہ وہ چھاپ دیا۔ تذکرہ نگار نے کسی سے کوائف مکمل کرنے پر نہ کوئی سوال کیا اور نہ ضرورت محسوس کی۔ لہذا واقعاتی تذکروں میں داستان کا مزہ تو خوب آتا ہے مگر ایسے تذکرے تحقیق میں کوئی کام نہیں دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم، صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی (اللہ تبارک تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے) نے خفتگان کراچی، خفتگان خاک لاہور، وفیات مشاہیر پاکستان، وفیات عیان پاکستان مرتب کر کے تذکرہ نویسی یا سوانحی لغت کے ذیل میں سب سے بڑا کام کیا ہے ان کے تذکروں کی اہمیت اور افادیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ انھوں نے سوانحی تواریخ کو حتی الامکان درست درج کیا ہے لہذا میرے لئے وہ تمام تذکرے جو تذکرہ دبستان کراچی کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے تھے اہمیت رکھتے تھے۔ اسی طرح مالک رام کے تذکرہ معاصرین کی چاروں جلدوں کا حصول بھی میرے لئے آزمائش سے کم نہ تھا۔ اب تو الحمد اللہ میرے لئے ہندوستان سے کسی بھی کتاب کا حصول اتنا مشکل نہیں رہا۔ مگر یہ باتیں سنہ ۹۰ء اور سنہ ۹۱ء کی ہیں۔

تذکرہ ماہ و سال کو بغور پڑھ کر اور اس میں اپنے فہم کے مطابق اغلاط کی درستگی کر کے یہ سوچا کہ میں کیوں نہ اس نام سے ایک تذکرہ اسی نوعیت کا مکمل کروں ۔ یعنی ایک طرح سے مالک رام کے اس کام کو آگے بڑھاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے ایک خبر بنائی اور پاک و ہند کے تمام ادبی و نیم ادبی جرائد میں بغرض اشاعت بھیج دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ میں مالک رام کی مذکورہ کتاب میں سے ان اہم شخصیات کو جنھیں واقعی عالمی شہرت حاصل ہے مکرر اپنے تذکرے میں جگہ دوں۔ اور جو نامور ہستیاں اس تذکرے میں شامل ہونے سے رہ گئیں یا جنھیں بعد میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی انھیں شامل کر لوں۔ میں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ انہی دنوں ڈاکٹر محمد اسلم کی دونوں کتابوں خفتگان کراچی اور خفتگان خاک لاہور کے سلسلے میں ان سے مراسلت شروع ہوئی۔ ڈاکٹر محمد اسلم نے کرم فرمایا کہ دانش گاہ پنجاب کی بک شاپ سے دونوں کتابیں بارعایت خرید کر مجھے ارسال کر دیں۔ انھوں نے بھی میری اس خبر کو پڑھ کر مجھے مطلع کیا کہ آپ مالک رام کی کتاب سے استفادہ سے قبل اس کتاب پر میرے دو مضامین ضرور پڑھ لیں جو ماہنامہ سیارہ لاہور کے سالنامہ جنوری ر فروری ۱۹۹۳ء (اشاعت خاص نمبر ۳۳) اور اشاعت خاص نمبر (۳۴) میں شائع ہوئے ہیں۔ اتفاق سے شمارہ ۳۳ میرے پاس تھا۔ ۳۴ مجھے مل گیا میں نے دونوں مضامین پڑھے اور ان کی روشنی میں تذکرہ ماہ و سال کی کافی حد تک درستگی کی۔ مگر اب بھی اس تذکرہ میں اضافے اور تصحیح و ترمیمات کی گنجائش باقی تھی کہ مجھے برادرم صبیح رحمانی نے شاعر کے ہم عصر اردو ادب کی پہلی جلد کی آمد کی خوش خبری سنائی۔ میں نے ان سے گذارش

کی کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ نمبر بحیثیت مدیر ثانی سہ ماہی سفیر اردو، افتخار امام مجھے ارسال کریں گے یا نہیں کیونکہ سفیر اردو کا ہر شمارہ ان کو باقاعدگی سے جاتا ہے تاہم مجھے چند روز کے لیے شاعر کا نمبر دے دو۔ صبیح رحمانی نے فوراً مجھے ہم عصر اردو ادب نمبر دے دیا۔ شمارہ دیکھ کر دل خوش ہوا۔ مگر میں چونکہ اب تک اس کا نصف ہی پڑھ سکا ہوں لہذا رسالے کے مندرجات پر اظہار خیال رسالہ مکمل کر کے بھیجوں گا۔ سر دست یہ تحریر لکھنے کی نوبت یوں آئی کہ باب تحقیق میں مالک رام کے تذکرہ ماہ و سال پر آپ نے جو اداریہ لکھا اس کا ساتواں پیراگراف میرے ذکر سے شروع ہوتا ہے کہ "تذکرہ ماہ و سال کے بارے میں ایک اعلان پڑھا تھا کہ پاکستان میں سید معراج جامی (جامی) مذکورہ کام کو آگے بڑھاتے ہوئے کتاب کی دوسری جلد مرتب کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی تو جلد اول ہی کا ایک نیا ایڈیشن ترمیم و اضافوں کے بعد شائع ہونا ضروری ہے۔" اپنے بارے میں یہ تحریر پڑھ کر مجھ پر لازم ہوا کہ تذکرہ ماہ و سال پر اپنے کام کی تفصیلات سے آگاہ کروں۔ آپ نے بجا لکھا کہ ابھی تو تذکرہ ماہ و سال کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت اپنی جگہ برقرار ہے، جس میں ترمیم و اضافے ہونے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ محترم ڈاکٹر گیان چند نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے تذکرہ ماہ و سال کا جائزہ تصحیح، ترمیمات اور اضافے کے ساتھ پیش کیا ہے اور جو شاعر کے مذکورہ نمبر میں ۲۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ گیان چند صاحب کے اسی مضمون کو مکتبہ جامعہ مالک رام کے تذکرہ ماہ و سال کے دوسرے ایڈیشن کے طور پر شائع کر سکتی ہے اور مکتبہ جامعہ کو ایسا ضرور کرنا چاہیے۔

میں بھی اگر چاہوں تو مالک رام کے اس تذکرے کو گیان چند جین کے ترمیمات، تصحیح و اضافے کے ساتھ اپنے تذکرہ میں شامل کر سکتا ہوں مگر مالک رام کے اس تذکرے کے حقوق اگرچہ مالک رام ہی کے نام ہیں تاہم اخلاقی طور پر مجھے مکتبہ سے اس کی اجازت لینی ہوگی بلکہ ہو سکتا ہے کہ قانوناً بھی اس میں کوئی پیچ ہو۔ سال رواں کے ستمبر ۹۹ء میں ہندوستان جانے کا پروگرام ہے انشاء اللہ دہلی میں مکتبہ جامعہ کے ارباب اختیار سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

میں مالک رام کے تذکرہ ماہ و سال کے کام کو ان معنوں میں آگے بڑھا رہا ہوں کہ جو اہم شخصیات اس تذکرہ میں شامل ہونے سے رہ گئیں ہیں انھیں اور جن اہم شخصیات کے سوانحی لغت نامکمل ہیں یا ان میں تسامح ہے ان کو درست کر کے شامل کروں گا۔ علاوہ ازیں ۹۰ء سے ۹۹ء تک کے نامور، مشاہیر علم و فن کو شامل کر رہا ہوں۔ کتاب کا نام میں اپنی پسند سے بھی رکھ سکتا ہوں۔ مگر مجھے یہ نام ہی پسند آگیا ہے اس لئے میں اسی نام سے کتاب مرتب کر رہا ہوں۔ جلد دوم کا لاحقہ اسی لیے لگا رہا ہوں تاکہ اس نام کی اولیت کا سہرا مالک رام ہی کے سر رہے۔

مجھے امید ہے کہ میری گذارشات سے آپ کے ذہن میں میرے حوالے سے اس تذکرے کے سلسلے میں جو ابہام تھا وہ دور ہو گیا ہوگا۔ آخر میں آپ کی ادب پروری اور ادب نوازی کی نذر اسی تذکرہ ماہ و سال کا اعلان بھیج رہا ہوں کہ اسے 'شاعر' میں جگہ دے کر میرے اس کام میں سرپرستی فرمائیں۔ ہاں آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ الحمد اللہ میرے پاس تذکرہ ماہ و سال کے سلسلے میں اب تک تقریباً پانچ ہزار رجال کا تذکرہ جمع ہو چکا ہے۔ (ہندوپاک اور دنیا کے تمام ملکوں میں رہنے والے اہل علم و ادب، شاعر، نقاد، محقق اور مولف وغیرہ ہم کے مطلوبہ کوائف خوشخط تحریر میں درج ذیل پتے پر جلد ارسال فرمائیں۔ اصلی نام۔ قلمی نام۔ ولدیت۔ تاریخ۔ مقام پیدائش۔ تعلیم۔ شغل۔ تصنیف۔ تصویر اور پتہ۔ مرحوم اہل قلم کے لواحقین اور دوست احباب مذکورہ بالا معلومات کے علاوہ درست تاریخ و مقام وفات کا اضافہ کر کے ارسال فرمائیں)

● D - 12, Muniba Arcade, Gulstan-e-johar, Block - 7, Main University Rd, Karachi - 75290 (Pak)

عذرا پروین

شاعر کا عالمی اردو قلمکار خواتین نمبر



ہم عصر اردو ادب نمبر کا کرشمہ ابھی چکاچوندھی کیے ہوئے تھا شاعر کے قارئین کو یہ عالمی اردو قلمکار خواتین نمبر چونکا گیا ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کی برسہا برس کی مشقت کے بعد بھی یہ بندۂ بے آرام بجائے آرام کرنے کے اپنے اختراعی سفر پر چلتا رہا ہے اور اس کا ثبوت یہ خواتین نمبر ہے۔ مگر افتخار امام کے اس جلد باز اشاریے نے خود مدیر کی جان جوکھم میں ڈال دی ہے کہ اس اشاریے میں سیکڑوں خواتین جو شامل ہونے سے رہ گئی ہوں گی وہ ان کے اس کارنامے پر Fluid بھی پھیر سکتی ہیں گوکہ خواتین کے اس نمبر میں بھی بڑی تعداد ایسی خواتین قلم کار کی ہے جو ٹریجڈی لکھیں تو قاری ہنستا ہے اور کامیڈی لکھیں تو قاری روتا ہے۔ مگر افتخار امام کی اس مثالی کاوش میں اپنی عدم شمولیت پر وہ سب افتخار امام کو کوس کوس کر ٹریجڈی کنگ بنا دیں گی۔ اس صورت حال سے نپٹنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ اس شمارے پر نمبر ایک ڈالتے اور شمارہ نمبر دو بھی شائع کر کے بقیہ شکایتوں کو رفع دفع کرتے۔ اپنی اس جلد باز جسارت سے خود افتخار امام بھی مطمئن نہ تھے، اس لئے جان بخشی کے لئے انھوں نے اداریے کا بلٹ پروف اوڑھ لیا ہے اور 'ایک بہت ادھورا سا اشاریہ' کہہ کر خواتین کے ہاتھوں خود جاں بحق ہونے کے اعزاز سے بچا لیا ہے۔

خواتین قلم کار نمبر میں افتخار امام صاحب کی تعلیم نسواں، تزئین اور تشکیل نسواں کی جسارت میں سیماب اکبر آبادی کی روائتیں اور اعجاز صدیقی کے خوابوں کا سلسلہ آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ "ادبی مذاکرے" میں مقصود الٰہی شیخ صاحب کے خیالات کے بجائے خواتین کے خیالات کو فوقیت دی جانی چاہیے تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بھارت میں ادب میں خواتین قلم کار کی نمائندگی کی جو تصویر اس مذاکرے سے ابھری ہے وہ افسوسناک ہے۔ سکینہ ساجد، ادا جعفری، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، کشور

ناہید، خیر النساء مہدی کے ناموں کی ترتیب میں بھارت کی طرف سے صرف خیر النساء مہدی کی شمولیت کربناک ہے مگر یہاں بھی "ہلکا نا مکمل اشاریہ" کہہ کر افتخار امام جھکائی دے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ ہندوستان کی خواتین گونگی ہو چکی ہیں "پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے" یہ منظر ہندوستان کے اردو ادب کا جو الگ ہی پکچر پیش کر رہا ہے وہ سوچ میں مبتلا کر دینے والا ہے۔

بانو قدسیہ کے خیالات کم لفظوں میں خواتین کے ادب کی صورت حال کی مکمل طور سے تصویر کشی کر دیتے ہیں۔ خالدہ حسین نے اس عورت کے، جو گھر سماج اور رشتوں کے درمیان ریڑھ کی ہڈی کا رول ادا کر رہی ہے، ادب میں مصروف ہو جانے اور پھر بقیہ شعبوں کے تشنہ رہ جانے پر کشمکش میں مبتلا ہونے کا جو گہرا اور زیاں کار عمل ہے اس کا اقرار کیا ہے وہ جو واقعی ایک کڑوا سچ ہے۔ ادا جعفری کے خیالات گنجلک بھی ہیں اور نادیدہ خوف کے زیر اثر پوری تحریر مکمل کر اپنے موقف پر اصرار کرنے والی تعمیری شدتوں سے محروم ہے۔ شاعری میں نسائیت کی دکان نہیں سج سکتی مگر مردانگی یا نیم مردانگی کی دکان بھی تو (عورت کے اپنے ذاتی تجربوں میں جو جو رنگ ہیں شامل ہیں) غیر فطری معلوم دیتی ہے۔ دوسرا جملہ کہ فہمیدہ ریاض کی شاعری رد عمل کی شاعری ہے اور اس میں وہ انتہا تک پہنچ گئی ہیں، ادا جعفری کا یہ جملہ تو فہمیدہ ریاض کی شعری لیاقتوں کو مستند کرتا ہے اس میں صرف انتہا تک پہنچنے کا نہیں بلکہ منفی انتہا تک پہنچنے کا اشارہ ہونا چاہیے۔ جو تین چیزیں انہوں نے فہمیدہ ریاض کے حوالے سے کہیں وہ درج ذیل ہیں۔ (۱) رد عمل کی شاعری (۲) انتہا تک پہنچنا (۳) نسائیت کی دکان۔ شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ تینوں عنصر اگر اپنی تمام تر جمالیاتی اور فکری انفرادیت کے اصرار کے ساتھ پیش کی جائیں تو بڑا ادب خلق ہو سکتا ہے یہ تینوں چیزیں تو ترکیب استعمال کے معیار کے ساتھ معنی بدل لیتی ہیں۔ انھیں چیزوں کا سطحی استعمال ایک زمانے میں کثرت سے ہوا ہے اور آج بھی کہیں کہیں نہ صرف نظر آ رہا ہے بلکہ باقاعدہ مردوں کی سرپرستی میں نظر آ رہا ہے۔ تبھی تو ادا جعفری سے لے کر خیر النساء مہدی تک سبھی کا اصرار کہ یہ "مردوں کا معاشرہ ہے" مردوں کے لئے لمحہ فکریہ بھی ہو سکتا تھا مگر ہوگا نہیں۔ وہ بھی اس جملے سے بھاگ کر کسی سطحی نسائیت کی دوکان میں بیٹھ کر جنس کے گول گپے کھائیں گے اور جتنی زیادہ ادب کے نام پر عورت عریاں اظہار کو رد عمل کے نام پر پیش کرے گی یہ واہ واہ کر کے اپنا ٹائم پاس کریں گے بس! قصہ ختم!۔

قرۃ العین حیدر کے ساتھ ادبی مکالمے نے ایک بہت بڑی کمی پوری کی ہے اور یہ ادبی مکالمہ پورے شمارے کی جان ہے ایسی بے باک اور زبردست گفتگو جو اچھے اچھے اطلر مردوں کے حصے میں نہیں آ سکتی (انھیں خوفزدہ کر سکتی ہے، دائیں بائیں دیکھنے یا سرگوشی کرنے یا مبہم بیانات دینے پر مجبور کر سکتی ہے) ادب کے کئی اہم مسائل جس طرح ان کے یہاں منکشف ہوئے ہیں بے مثال ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے منفی کرب کے دباؤ سے باہر آ کر خواتین کو فخر کرنا چاہیے کہ ان کے درمیان عظمت اور سچ کی ایک مثال ہیں قرۃ العین حیدر جن میں ابھی مضحکہ خیزیوں پہ ہنسنے کی حس بچی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں جس جرأت مندانہ انداز سے انھوں نے Strong verdiet دیا ہے انھوں نے جو دوسرے کھل کر بول نہ پاتے۔ بولتے تو ادبی موت مار دیئے جاتے مگر قرۃ العین حیدر وہاں کھڑی ہیں جہاں یہ ہاتھ پہونچ نہیں سکتے۔

افسانوی گوشہ پاور فل ہے۔ سبھی افسانے اچھے ہیں۔ نعیمہ ضیاء الدین کا افسانہ بے حد پسند آیا۔ قمر جمالی نے ایک اچھوتے موضوع کا انتخاب کیا۔ مگر ذکیہ مشہدی بازی لے گئیں ہیں، ان کے سارے افسانوں میں جو عصری رو دھڑکتی ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور یہاں بھی انہوں نے باکمال ہنر مندی سے عصریت میں بیک وقت بہنے والی کئی لہروں کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس انتخاب اور اس پیش کش کے لئے افتخار امام بھی مبارکباد کے قابل ہیں۔ ذکیہ مشہدی کے ساتھ غزلوں میں داراب بانو وفا اور نظموں میں منصورہ احمد آگے نکل گئی ہیں۔ ادھر ناہید قمر کا نام بھی اکثر جریدوں میں برابر نظر آ رہا ہے۔ تسطیر میں ان کی لکھی نظمیں دیکھی ہیں اس بار بھی اچھی ہے نظم۔ بے ساختگی اور سادگی سے لپٹا ان کا نسائی لہجہ پروین شاکر کی روایت کو بڑھاتا نظر آتا ہے۔ بہر حال افتخار امام کا یہ اشاریہ، یہ عالمی خواتین قلمکار نمبر ایک بے حد گرانقدر تحفہ ہی نہیں بلکہ ایک بے حد Provoking روزنامچہ ہے، خواتین کا بھی اور ان کے بارے میں صحیح غلط لکھنے اور مفروضے Stablish کرنے والوں کا بھی۔ جس کی افتخار امام کو بھرپور داد تو ملے گی مگر بیداد کے ساتھ!

● P.O.Box No. 32, Head Post Office, Chawk, Lucknow - 3 (U.P.)



ابراہیم اشک

غزل، الیکٹرانک میڈیا اور موسیقی

اردو اور غزل، غزل اور اردو لازم و ملزوم ہیں۔ اردو زبان کا بہترین اور عظیم ادب زیادہ تر غزل ہی میں تخلیق ہوا ہے۔ میر اور غالب اردو غزل کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نظم کے ساتھ ساتھ غزل کا ہماری صدی کا ایک عظیم شاعر ہے۔ غزل کا رشتہ عوام و خواص سے جڑا ہوا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں تو کئی بار اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے غزل کے اشعار کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ غزل کے کچھ خاص اشعار انسانی زندگی میں وہ انقلاب لاتے ہیں کہ انسان کی تمام طرز زندگی ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔ غزل کے کئی اشعار زندگی کے اندھیرے میں مشعل راہ کی طرح روشن ہو جاتے ہیں اور بھٹکے ہوئے مسافر کو سیدھا راستہ دکھا دیتے

ہیں۔ جس قدر ہمارے سماج سے، غزل جڑی ہوئی ہے، ادب کی کوئی اور صنفِ سخن اتنے پر اثر انداز میں قطعی نہیں جڑی ہوئی ہے۔

غزل میں تغزل ہوتا ہے اور غنائیت کی وجہ سے اسے گایا بھی جاسکتا ہے۔ غزل فارسی شاعر حافظ شیرازی کے زمانے سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے محفلوں میں گائی جاتی رہی ہے۔ موسیقی میں دادرا، ٹھمری، مجرا، قوالی، بھجن، لاونی، راس، مانچ کی طرح غزل گائکی کا بھی ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ غزل گائکی اپنے مخصوص انداز سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ لیکن کئی بار یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ غزل کو مجرا، قوالی یا ٹھمری کے انداز میں بھی گایا جاتا ہے اس وقت غزل، قوالی، مجرا یا ٹھمری بن جاتی ہے۔ ایک خاص بات یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ موسیقی کی دھنوں پر گائی جانے والی غزلیں مخصوص قسم کی ہوتی ہیں۔ ہر غزل کو آپ موسیقی کی دھن پر کامیابی کے ساتھ نہیں گا سکتے۔ بحر، وزن میں ہونے کے باوجود ہر غزل کا رشتہ موسیقی سے نہیں جوڑا جاسکتا۔ غالب اور میر کی چند غزلیں (زیادہ سے زیادہ ۲۰۔۲۵) ہی ایسی ہیں جو گائی جاتی ہیں اور میں بڑی صاف گوئی کے ساتھ یہ بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ گائی جانے والی یہ غزلیں میر اور غالب کی عظیم غزلیں قطعی نہیں ہیں۔ یہی حال تمام اردو غزلوں کا ہے۔ کئی کئی دیوان چھان مارنے کے بعد غزل گانے والوں کو مشکل سے کوئی ایک آدھ غزل گانے لایق ملتی ہے۔ قلی قطب شاہ کے پورے دیوان میں سے محض ایک غزل "پیا باج پیالا پیا جائے نا"۔ گانے لایق ہے۔ ولی دکنی کا کوئی کلام نہیں گایا جاتا نہ ہی وہ گانے لائق ہے۔

حضرت امیر خسرو کا تعلق موسیقی سے خاص رہا ہے۔ طبلہ، سارنگی اور ستار ان کی ہی ایجاد ہیں۔ قوالی کو بھی امیر خسرو ہی نے فروغ دیا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امیر خسرو کا تمام کلام گانے کے لائق نہیں ہے۔ جو تخلیقات گائی گئی ہیں یا گائی جاتی ہیں ان کا شمار دس تک بھی نہیں پہنچتا ہے۔ استاد ذوق اور مومن خاں مومن کی بھی چند غزلیں ہی گانے لائق ہیں۔ استاد داغ دہلوی کے یہاں تغزل بھرپور ہے۔ زبان بھی سادہ اور بیان شوخی اور شرارت والا ہے لیکن غور کریں تو دس غزلیں بھی داغ کی ایسی نہیں ہیں جو گائی جاتی ہوں۔ یاس یگانہ کی غزل بھرپور ہے لیکن غزل گائکی کے لئے مناسب نہیں ہے۔ حسرت، جگر، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، اور فیض احمد فیض کے یہاں بھی چند مخصوص غزلیں ہی گانے والی ہیں۔

ان تمام حوالوں سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر غزل کا رشتہ موسیقی سے نہیں جوڑا جاسکتا۔ غزل گائکی کے لئے جو رنگ و آہنگ ہوتا ہے وہ ایک خاص طرز کا ہوتا ہے۔ غزل کی تمام شاعری میں سے دو فیصد غزلیں بھی ایسی نہیں ملتی ہیں جنہیں گایا جاتا ہو۔ اس لئے یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ غزل پڑھنے سے زیادہ سننے اور گانے کی چیز ہے۔ دنیا کی کسی زبان کے ادب کو لے لیجئے وہ محض گانے کے لیے نہیں ہوتا۔ چاہے انگریزی میں شیکسپیر کی شاعری ہو یا سنسکرت میں کالیداس، بھرتری ہری کا کلام، فارسی میں حافظ شیرازی اور سعدی کی غزلیں ہوں، فردوسی کا شاہنامہ، عبدالقادر بیدل کی غزل یا فیض اور غنی کاشمیری کی غزل سب ہی کو گانے سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ اردو غزل بھی گانے سے زیادہ پڑھی ہی جاتی ہے اور آئندہ بھی زیادہ پڑھی ہی جاتی رہے گی یہ خیال بالکل بے معنی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا غزل کو ہضم کر لے گا۔

آج غزل انٹرنیٹ پر آ رہی ہے لیکن اس کا رسم الخط رومن ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ پر جو غزل پیش کی جا رہی ہے اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اس کا معیار کیا ہے؟ وہ غزل کس معتبر شاعر کی ہے؟ اس شاعر کا ادب میں کیا مقام ہے؟ انٹرنیٹ موجودہ دور کا ایک الیکٹرانک میڈیا ہے اس کی اپنی کچھ مخصوص (Demands) مانگیں ہیں جس میں لوگوں کی دلچسپی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ غزل کی پرورش شہنشاہوں کی محفلوں اور درباروں میں ہوئی ہے وہاں سے نکل کر وہ جب کوٹھوں پر پہنچی ہے تو کوٹھے کی مخصوص ضرورت کے مطابق اس نے شکل اختیار کی، غزل مجرا بھی بنی، خانقاہوں میں پہنچی تو وہاں کی ضرورت کے مطابق قوالی بھی بنی، ریڈیو اور ٹی وی پر بھی غزل پہنچی اور وہاں کی ضرورتوں کے مطابق اس نے اپنا روپ بدلا "فارم" غزل ہی کا رہا لیکن اس کی روح اور چولا بدلتا رہا اور غزل ہر ایک کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو غزل مجرا، قوالی، ریڈیو، ٹی وی کے گلیاروں تک پہنچی کیا اس کا مقام اور مرتبہ وہی تھا جو ہمارے اعلیٰ ادب کی غزل کا ہے؟ یہ سوال نہایت غور طلب ہے۔ اگر ان محفلوں تک پہنچنے والی غزل اعلیٰ ادب کی غزل نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اعلیٰ ادب کی غزل کی تخلیق اپنی مخصوص Demand کے تحت ہوتی ہے وہاں نہ مجرا ہوتا ہے، نہ قوالی، ریڈیو، ٹی وی یا انٹرنیٹ۔ یعنی اس پر کسی بھی دور کے کسی بھی آنے والے میڈیا کا کوئی اثر بالکل نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت چٹان کی طرح اٹل اور پائندار ہے۔ اس لئے اعلیٰ غزل کے تخلیق کار کو کسی بھی میڈیا سے گھبرانے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت قطعی نہیں ہے۔ اعلیٰ غزل ہمیشہ اعلیٰ ادب کی طرح پڑھی جاتی رہے گی موسیقی ایک الگ میدان ہے اور ادب (Literature) الگ۔ دونوں کا ملن ایک نئی چیز پیدا کر دیتا ہے۔ نہ غزل موسیقی کو ہضم کر سکتی ہے نہ موسیقی غزل کو۔

ایک خاص بات میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ سنگیت میں ڈھلنے والی کسی بھی زبان کی شاعری اعلیٰ ادب کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی۔ اگر ایسا ہوتا تو تان سین اور ہری داس اور دیگر عظیم موسیقاروں نے جو شاعری اپنی بندشوں کے لئے کی ہے وہ دنیا کی عظیم شاعری ہوتی لیکن ایسا قطعی نہیں ہے۔ تان سین کے تخلیق کردہ "پدوں" کا موسیقی کے اظہار میں اعلیٰ مقام ضرور ہے لیکن اعلیٰ درجے کی شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہی حال موسیقی میں ڈھالی جانے والی غزلوں کا ہے۔

میں نے جب اپنا پہلا شعری مجموعہ "الہام" ترتیب دیا تھا تو اس وقت تک مختلف کیسٹ کمپنیوں کے لئے میری پانچ سو سے بھی زیادہ غزلیں ریکارڈ ہو چکی تھیں جنہیں گا کر غزل سنگروں نے ملک اور بیرون ملک، موسیقی کی محفلوں، ٹی وی چینلوں اور ریڈیو پر کامیابی حاصل کی تھی۔ میں نے ان میں سے کوئی بھی غزل اپنے شعری مجموعہ میں شامل نہیں کی۔ محترم کالیداس گپتا رضا نے ایک ملاقات میں پوچھا بھی کہ "ابراہیم تم نے گائی ہوئی کئی غزلیں اپنے مجموعے میں شامل کیوں نہیں کی ہیں جو بہت ہی مقبول عام ہیں۔؟" میں نے یہی جواب دیا کہ مجھے اعلیٰ ادب کی غزل اور گائی جانے والی غزلوں میں تمیز کرنا آتا ہے۔

اگر گائی جانے والی غزل عظیم ہوتی تو شکیل بدایونی اس صدی کے سب سے عظیم شاعر ہوتے۔ فلم اور پرائیوٹ ریکارڈوں کے لئے شکیل کی غزلیں سب سے زیادہ گائی گئی ہیں اور آج بھی گائی جاتی ہیں بلکہ ان کی ایک ایک غزل کئی کئی بار ریکارڈ ہوئی ہے لیکن اردو زبان و ادب کی تاریخ میں شکیل بدایونی کا مقام اور مرتبہ کیا ہے یہ بات تمام ناقد اور اہل ہنر اور اہل نظر بخوبی جانتے ہیں۔ میں اگر کوئی تبصرہ کروں گا تو یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔

الیکٹرانک میڈیا میں شاعری کے تعلق سے کیسٹ کمپنیاں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ ان کی Demand اعلیٰ ادب کی شاعری نہیں ہوتی۔ میڈونا، مائکل جیکسن، اسٹی وِنڈر انگریزی کے اعلیٰ ادب کی شاعری ریکارڈ نہیں کرتے ہیں۔ مہدی حسن، غلام علی، جگجیت، فریدہ خانم، بیگم اختر کوئی بھی غزل گانے والا غالب، میر، مومن کی مشکل غزلیں گانے کے بجائے انھیں غزلوں کا انتخاب کیوں کرتا ہے جو ہزار بار گائی جا چکی ہیں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ نہ تو کیسٹ کمپنیاں یا الیکٹرانک میڈیا والے انھیں پسند کرتے ہیں نہ ہی عوام میں اس کی کھپت ہے۔ رہائی وی اور ریڈیو کا سوال تو وہاں بھی ہمیں وہی غزل سننے کو ملتی ہے جو عام طور پر ہم کیسٹوں پر سنتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اعلیٰ ادب کی غزل کے تعلق سے الیکٹرانک میڈیا بے نیاز ہے اس لئے اعلیٰ ادب کی غزل کے تخلیق کار کو الیکٹرانک میڈیا سے گھبرانے یا ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے اسے اپنی سمت میں سفر جاری رکھنا چاہئے۔

جہاں تک غزل پر رقص اور مصوری کا سوال ہے تو یہ دنیا رنگ برنگی ہے یہاں ایسے کئی تجربات ہوتے رہتے ہیں آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ لیکن ایم ایف حسین اگر غالب کے کسی ایک شعر پر کوئی تصویر بنا دیتے ہیں تو غزل کی تخلیقی دنیا میں کونسا انقلاب برپا ہو جاتا ہے؟ یا روشن کماری، برجو مہاراج یا او ماشرما کسی غزل پر تھک پیش کر دیتے ہیں تو اس سے غزل کے اعلیٰ ادب کو کتنی تحریک ملتی ہے؟ اس کا کیا بھلا یا برا ہوتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایم ایف حسین سے متاثر ہونے والے کچھ دیگر مصور بھی کسی شاعر کے خیال کو اپنی تصویر میں ڈھال دیں۔ او ماشرما سے متاثر ہو کر بعد کی نسل کی کوئی تھک ڈانسر پھر کسی غزل پر اپنے فن کا مظاہرہ کر دے اور بس۔ اس سے زیادہ کسی بڑے انقلاب کے بارے میں اگر کوئی سوچتا ہے تو وہ بے معنی ہے۔

موجودہ دور کی غزل کو غیر معیاری کہنا صحیح نہیں ہے ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد اب جو دور شروع ہوا ہے اس نے غزل کو ہندو پاک میں نئی معنویت عطا کی ہے۔ خیال و فکر، وسعت و عظمت، زبان و بیان، استعاروں اور تشبیہات کے اعتبار سے غزل نے ایک نئی کروٹ بدلی ہے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا نئی نسل کے ساتھ سراسر زیادتی کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ آج کل تو غزل کی فضا میں ایسے اشعار گونج رہے ہیں۔

سوچوں اگر تو فکر دو عالم بھی کم مجھے لکھوں تو حرف حرف مرا کائنات ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کا کلاسیکی سرمایہ وافر، معیاری، جاندار اور متحرک ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو شعرا غزل ہی نہ کہیں۔ یہ خیال نہایت ہی مایوس کن ہے۔ معنویت اور تجدید غزل کے اس دور میں یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اکیسویں صدی میں غزل کے تعلق سے ایک بار پھر وہ اعلیٰ ادب تخلیق ہونے والا ہے جو اردو کی تاریخ میں آج تک کبھی نہ ہو سکا ہے اس کا رنگ ڈھنگ سب سے منفرد ہوگا۔

دیگر زبانوں میں یعنی ہندی، گجراتی، مراٹھی ہندوستان کی تین بڑی زبانوں میں صنفِ غزل عام رواج پا گئی ہے۔ گجراتی میں اردو کے بعد سب سے اچھی غزل کہی جا رہی ہے۔ ہندی میں بحر، وزن اور قافیہ سنبھالنے میں ہندی کے شعرا الجھے ہوئے ہیں لیکن ہر دوسرا کوی غزل کار بننے کی کوشش میں ہے، مراٹھی میں بھی اچھی کوشش کی جا رہی ہے اور یوں دیکھا جائے تو غزل کا کارواں بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس لئے کسی بھی طرح کی مایوسی غزل کے تعلق سے اردو والوں کو زیب نہیں دیتی۔

انٹرنیٹ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کی آخری کڑی ہے۔ آنے والے وقت میں کوئی اور ایجاد بھی ہو سکتی ہے اور اس کڑی سے جڑ سکتی ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ کلکتہ کی ایک سندھی خاتون جوان ونوں امریکہ میں مقیم ہے، اس نے انٹرنیٹ پر اردو شاعری غزل کے روپ میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہمیں اس کا پرزور خیر مقدم کرنا چاہیے۔ لیکن یہ غزل کونسی ہے؟ کیا یہ ہمارے اعلیٰ ادب کی روایتی غزل کی نمائندہ غزل ہے؟ ترقی پسند دور کی نمائندہ غزل ہے؟ جدید دور کی نمائندہ غزل ہے؟ یا موجودہ معنویت کے دور کی نمائندہ غزل ہے؟ کونسی غزل ہے؟ یہ سلسلہ کس طرح کی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے شروع کیا گیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جوابات ملنے کے بعد ہی یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ہمارے اردو ادب اور خاص طور سے غزل کی اعلیٰ روایت پر کیا اثر پڑے گا۔ ورنہ محض ایک تصویر، ایک تھک رقص، ایک مجرے، ایک ریڈیو پروگرام، ٹی وی پروگرام یا انٹرنیٹ پروگرام کا سلسلہ اعلیٰ ادب کی غزل کے سفر میں نہ تو رکاوٹ بن سکتا ہے نہ ہی اسے کوئی خاص بڑی انقلابی تحریک ہی دے سکتا ہے۔ اسے اگر کوئی تحریک دے سکتا ہے تو وہ ہیں 'شاعر' جیسے ادبی رسائل اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لکھنا پڑھنا، سوچنا سمجھنا۔ باقی سب تو محض ہوا کے جھونکے ہیں جو ادھر آئے اور ادھر گئے۔ غزل کا رنگ ہر جگہ چھا جاتا ہے جبکہ غزل پر کسی میڈیا کے چھا جانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ معاصر غزل کے تخلیق کاروں کو حافظ شیرازی کے اس شعر سے روشنی حاصل کرنا چاہیے اور اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخواں حافظ کہ بر نظم تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

حافظ شیرازی کی طرح ہمیں بھی غزل کہنا اور درِ نایاب پروتے رہنا ہے اور ان غزلوں کو خوش بیانی کے ساتھ پڑھتے رہنا ہے کیونکہ ان غزلوں کو سن کر فلک ثریا کے ہار نچھاور کرنے لگتا ہے۔

● 402 - Hill View Apt., Rashid Compound, Kausa - Mumbra - 400612 Dist. Thane (M.S.)



ندا فاضلی

103-Amar Apts., Dand-Para-1, Khar(W), Mumbai - 400052

بیسویں صدی کا اہم شاعر

آکٹویو پاز

آکٹویو پاز لاطینی امریکہ کے اسپانوی زبان کے ادیب و شاعر ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں انہیں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس اعزاز نے ان کی عوامی شہرت میں بھلے ہی اضافہ کیا ہو، لیکن دراصل ان کے ادبی وقار اور عالمی تہذیب و سیاست میں ان کے دانشورانہ کردار سے عالمی تاریخ کے سنجیدہ قارئین، بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے واقف تھے۔ پاز ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء میں میکسکو شہر میں ایک انقلاب پسند وکیل کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بھی مشہور صحافی اور ادیب تھے جنھوں نے فرانس کے خلاف ملکی جنگ میں عملی شرکت کی تھی۔

پاز کا بچپن مسکوک نامی ایک گاؤں میں گذرا۔ اس دور کے حالات کو انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یوں یاد کیا ہے۔

> ''مکسوک میں ہمارا آبائی مکان دیکھنے میں تو کافی بڑا تھا۔ اس میں بہت ساری کتابیں، کلاسکی فرنیچر اور آرائشی اشیاء کی بھرمار تھی لیکن ان کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ درودیوار سے خستہ حالی نمایاں تھی۔ اس مکان میں صرف ایک ہی کمرہ رہنے کے قابل تھا لیکن اس کی بھی ایک دیوار شکستہ تھی۔ دیوار کی اس کمی کو باہر کی ایک مہربان بیل نے اندر پھیل کر پورا کیا تھا۔ یہ ہی دھوپ اور بارش سے تھوڑا بہت ہماری حفاظت کرتی تھی۔''

پاز نے ۱۷ سال کی عمر میں پہلی نظم لکھی اور انیس سال کی عمر میں اپنا پہلا شعری مجموعہ شائع کیا۔ شاعری کے علاوہ پاز شروع سے اچھے نثر نگار بھی رہے ہیں۔ ان کی نثر میکسیکو کے ادب کی کلاسکی شخصیات اور ادب کے جدید مسائل پر تبصرہ و تجزیہ کے ساتھ ملکی و غیر ملکی سیاست میں بھی سرگرم رہی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے اسپین میں فاشزم کے خلاف ایک ادبی اجتماع میں شرکت کی، جہاں ان کی ملاقات پابلو نرودا، والیجو، آڈن، اسپنڈر وغیرہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے ہوئی۔ یہ دور اشتراکیت میں ان کی عملی شرکت کا دور تھا۔ جو ہٹلر اسٹالن معاہدہ، کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء ان کی فکری زندگی اور شاعری کا اہم موڑ سمجھا جاتا ہے۔ اس سال وہ فرانس گئے اور آندرے بریتوں کے ساتھ سرریلزم کی کئی نمائشوں اور اشاعتی منصوبوں میں شامل رہے۔ اسی سال وہ میکسیکو کی بیرونی سفارت کے شعبہ سے منسلک ہوئے۔ کئی ممالک کی سماجی و ثقافتی راہوں سے گذر کے، ۱۹۶۲ء میں میکسیکو کے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور یہاں کی تاریخ، کلچر، اور جغرافیہ کو اپنی کئی نظموں کا موضوع بنایا۔ اودے پور میں ایک دن، امیر خسرو کے مزار پر، ہمایوں کا مقبرہ، ہنومان، بندرابن، پیپل، نیم، برگد جیسی نظمیں مشرقی کلچر سے ان کی وابستگی کی علامتیں ہیں۔

پاز کی شاعری زندگی کو مشرق و مغرب کی سرحدوں میں نہیں بانٹتی۔ اس شاعری کا شاعر ایک ایسا سیاح ہے جو جہاں سے جب گذرتا ہے، اسی کا حصہ بن جاتا ہے۔ جب سفر ختم ہو جاتا ہے، تو دیکھا ہوا سب کچھ یادوں کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ اس شاعری کے موضوعی تنوع نے شاعر کی سوچ کو وسعت ہی عطا نہیں کی ہے ہر رنگ میں آنکھ کو وا کرنے کی جسارت بھی دی ہے۔ فطرت سے شدید قربت اور اس میں حیرتوں کی پراسراریت نے پاز کے الفاظ کو مادہ اور روح، ذہانت اور بصیرت کی ہم رشتگی کا ہم راز بنایا ہے۔ کائنات کی ہر شے ان کے اندر استعجاب جگاتی ہے اور معمولی سے معمولی شباہت بھی نئی بشارت کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اتر پردیش میں ایک نیم پر ان کی ایک نظم

بابل میرے، نیم کو مت کاٹیو
نیم میں چڑیوں کا ڈیرا ہے
بابل میرے، بیٹیوں کو مت ڈانٹیو
بیٹیاں چڑیا جیسی ہیں
جب یہ چلی جائیں گی
تو نیم پر اداسی چھا جائے گی

پاز کی نظموں کے بیانیہ میں سریت کی آمیزش، قارئین میں تخلیقی مسرت ہی نہیں جگاتی ہے، جدید ذہن کے تہہ در تہہ تجسس کو بھی آئینہ دکھاتی ہے۔ اس شاعری میں، بچہ کی آنکھ، باشعور ذہن اور وقت کے گذران کا امتزاج ہر جا میں جہان دیگر کا احساس دلاتا ہے۔ پاز کی مادری زبان اسپانوی ہے لیکن اس نے اسے کئی ممالک کے فلسفوں اور مناظر کی دھوپ چھاؤں سے امیر بنایا ہے۔ اس شاعری میں پوری کائنات ایک پریوار کی صورت میں ابھرتی ہے۔ یہ زندگی اور اس کی آزادی کا نغمہ ہے، جو حرفوں اور لفظوں سے ایک ایسا کولاج تعمیر کرتا ہے جو کئی زاویے اور ابعاد لیے ہوئے ہے۔ پاز کی ہی ایک نظم کا مصرع ہے۔ یہ لفظ ہیں جو خاموشی کی زبان میں بولتے ہیں۔

مٹھی بھر نظمیں

آکٹویوپاز

ترجمہ : ندا فاضلی

(۱)

درختوں کا ایک جھنڈ
کہیں!
کوئی نہیں!!
اور میں!
پتہ نہیں کہاں ہوں

(۲)

اس نے اپنے لیے ایک چہرہ ایجاد کیا
اس کے پیچھے
وہ جیا، مرا، اور آزاد ہوا
کئی بار
اس کا اصلی چہرہ
اب مصنوعی چہرے کی جھریوں سے بھرا ہے
ان جھریوں کا کوئی چہرہ نہیں ہے

(۳)

مرے بدن میں
تم اس پربت کی تلاش میں ہو
جس کے صحرا میں سورج
نہاں ہے
تمہارے جسم میں
میں اس کشتی کی تلاش میں ہوں
جو ڈھلتی رات کی لہروں میں
رواں ہے

(۴)

میرے ہاتھ
تمہارے وجود کے پردے ہٹا کر
برہنگی کو لباس بنا رہے ہیں
تمہارے جسم کو کئی جسموں سے نکال کر
میرے ہاتھ
تمہارے بدن کے لیے
نیا بدن سجا رہے ہیں

(۵)

تم اپنا بایاں پاؤں
آگے بڑھاتی ہو
اور دن
تھم کر
مسکراتا ہے
اور پھر آہستہ سے قدم اٹھاتا ہے
جبکہ سورج
جہاں ہوتا ہے وہیں جما رہتا ہے
تم اپنا دایاں پاؤں
آگے بڑھاتی ہو
اور سورج
آہستہ سے قدم اٹھاتا ہے
جبکہ دن
درختوں میں کھڑا رہتا ہے
تم کھلی فضاؤں میں
گام زن ہو
اور تمہارے ساتھ
درخت قدم ملا رہے ہیں
سورج چل رہا ہے
دن بدل رہا ہے
آسمان
بادلوں میں ڈھل رہا ہے

(۶)

میرے پاؤں ایک راستے میں ہیں
ان کی آہٹیں
کسی دوسرے راستے میں ہیں
میں گذرتے ہوئے
اس راستے میں اپنی آہٹیں سن رہا ہوا
جہاں چاروں طرف
دھند کے علاوہ
کچھ دکھائی نہیں دیتا

(۷)

کل رات
ایک جنگلی درخت!
اکیلے میں
مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا
لیکن
کچھ کہا نہیں

(۸)

ہوا کے ہاتھ اور ہونٹ
پانی کا دل
یوکلپٹس
آتے جاتے بادل
زندگی روز وجود میں آتی ہے
موت ہر زندگی میں مسکراتی ہے
میں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں دن نکل رہا۔
آسمان زمین پر ٹہل رہا ہے



اے خیام

A - 997, Sector - 11A, North Karachi, Karachi - 75850 (Pak)

ہرفن مولا

حسب معمول بیگم مجھے دروازے تک رخصت کرنے آئیں تو لالہ کے لیے احکامات جاری کر دیے۔ "لالہ وہ تمہیں یاد ہے نا، میں نے تمہیں الیکٹریشین کے لئے کہا تھا۔ آج اسے ضرور لے آنا۔" لالہ نے مجھے دفتر میں اتارا اور الیکٹریشین کو لینے چلا گیا۔ لالہ کے لیے بھی یہ روز کا معمول تھا۔ وہ مجھے دفتر چھوڑتا بیگم کے احکامات بجالاتا، میرے لیے دوپہر کا کھانا گھر سے لے کر آتا اور شام کو مجھے گھر چھوڑ کر خود بھی چھٹی کرتا۔

رات میں کھانے کی میز پر بیگم اپنی دن بھر کی مصروفیات کا بیان کرتیں کسی کی شکایت اور کسی کی تعریف یا خبروں پر تبصرے۔ اس روز وہ الیکٹریشین کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"بھئی یہ آزاد تو عجیب و غریب آدمی ہے۔ دو تین سوئچ خراب تھے اس نے پورے گھر کے سوئچ چیک کر ڈالے۔ واشنگ مشین کی آواز سن کر چونک پڑا، کہنے لگا اس کا ڈرم بیٹھ جائے گا اسے بالکل نہ چلائیں۔ پھر اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ شام تک پتہ نہیں کیا کیا کرتا رہا اور اب جو مشین چلائی ہے تو بالکل بے آواز۔ کوکنگ رینج کو گھورتا رہا، کہنے لگا شعلے نیلے کیوں نہیں ہیں، یہ تو برتنوں کو کالے کر دیں گے۔ پھر اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ بازار سے کچھ پرزے بھی خرید لایا۔ اب جا کر دیکھئے کیسے نیلے نیلے شعلے نکل رہے ہیں، پتیلیوں پر دھبے بھی نہیں پڑتے۔"

بیگم آزاد کی کارگذاری سناتی رہیں اور میں دل ہی دل میں حساب لگاتا رہا کہ اس نے بیگم سے کتنی رقم اینٹھ لی ہوگی۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"یہ بتاؤ اس نے بل کتنی رقم کا بنا ڈالا۔"

"یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں، میں نے پوچھا تو کہنے لگا لالہ کو بتادوں گا۔"

"تم نے لالہ سے پوچھا۔"

"نہیں۔ ابھی تو وہ بہت سارے کام بتا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا اے سی یونٹوں کی سروسنگ کی ضرورت ہے۔ کل وہ پھر آئے گا۔"

"بیگم [illegible] ہے کہ اس سے اجرت طے کر لو ورنہ بعد میں وہ اپنی مرضی کے مطابق تم سے پیسے وصول کرے گا۔"

"بھئی میں نے جب بھی اس مسئلے پر بات کرنا چاہی اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگا میں لالہ کو بتادوں گا۔"

اگلے دن میں نے لالہ سے آزاد کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

"صاحب وہ بڑا فنکار آدمی ہے۔ ہر فن مولا ہے۔ وہ ہر طرح کا کام مہارت سے کرتا ہے۔ وہ بجلی کا کام کرتا ہے، وہ موٹر کار کا کام جانتا ہے، وہ فریج اے سی کا کام کرتا ہے، وہ گھڑیوں کی مرمت کرتا ہے، وہ گھر میں رنگ و روغن کا کام کرتا ہے، وہ ہوٹل میں بیرا گیری کرتا ہے، وہ پلمبر کا کام کرتا ہے۔ صاحب وہ ہر فن مولا ہے۔ اس کو کوئی بھی کام بتادو وہ پوری مہارت سے کرے گا۔"

"لالہ اس کا پیشہ کیا ہے، روزی کیلئے کوئی خاص پیشہ تو اختیار کیا ہوگا اس نے۔"

"صاحب اس کا دماغ تھوڑا سا خراب ہے۔ وہ کسی کی اونچی آواز برداشت نہیں کرتا۔ جو اس کا عزت کرتا ہے وہ اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوتا ہے۔"

میں نے وقت گزارنے کے لئے راستے میں بات جاری رکھی۔

"تم اسے کہاں سے پکڑ لائے۔"

"صاحب وہ ہمارا دوست ہے۔ ہم جس ہوٹل میں ناشتہ کرتا ہے ادھر وہ چائے پینے آتا تھا۔ اخبار پڑھتا تھا اور ہنستا تھا۔ ہم نے پوچھا بھائی تم ہنستا کیوں ہے، ادھر اخبار میں کوئی لطیفہ ہوتا ہے کیا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولتا تھا۔ بس اخبار پڑھتا تھا اور مسکراتا رہتا تھا۔"

"پھر تم سے دوستی کس طرح ہوگئی۔" میں نے پوچھا۔

"ہم اس سے اخبار سنانے کو بولا تو وہ خبریں سنانے لگا۔ بولتا تھا ہم لوگ جس مصیبت سے گزرا وہ تم لوگ محسوس نہیں کرتا تھا۔ اب تم پر گزر رہا ہے تو تم لوگ باپ باپ کرتا ہے۔ بولتا تھا ہمارا مدد کو بھی کوئی نہیں آیا، تمہارا مدد کو بھی کوئی نہیں آئے گا۔"

"اچھا تو وہ بنگلہ دیش سے آیا ہے۔"

"صاحب یہ اس کو کبھی مت بولنا، وہ اس کو گالی سمجھتا ہے۔ بولتا ہے ہمیں

بنگلہ دیش کا کچھ نہیں معلوم۔ ہم تو مشرقی پاکستان میں رہتا تھا، مشرقی پاکستان نہیں رہا تو ہم بھی اس کو چھوڑ دیا۔"

رات کو کھانے کی میز پر بیگم نے آزاد کی کارگزاری سنائی کہ اس نے اے سی یونٹوں کی سروسنگ کی، کئی نلوں سے پانی رس رہا تھا، اس نے انہیں ٹھیک کیا، کچھ زنگ آلود پائپ کاٹ کر نئے لگا دیے اور زیر زمین پانی کی ٹنکی کی صفائی بھی کر ڈالی۔ اجرت کی بات پھر اس نے ٹال دی کہ وہ لالہ کو بتا دے گا۔"

مجھے اندازہ تھا کہ اس طرح کام نکال نکال کر کرنے والے اپنی مرضی کی اجرت طلب کرتے ہیں۔ شہر کے مخدوش حالات کے پیش نظر کاروبار کا حال یوں بھی خاصا مندا تھا۔ جیسے تیسے دفتر کو قائم کر رکھا تھا۔ ٹائپسٹ چلا گیا تو اس کی جگہ خالی ہی رہی۔ دفتر میں کوئی چپراسی نہیں تھا۔ میں نے بھی اس طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ جب تک ان کے بغیر کام چل رہا ہے، چلتا رہے۔ چھ سات افراد کا عملہ اور تین کمروں کا دفتر۔ اخراجات نکالنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کسی دن کوئی لاش ملتی، اگلے دن ہڑتال ہوتی اور دس دنوں تک اس کے اثرات قائم رہتے لیکن بیگم کو میں نے کاروباری حالات سے دور ہی رکھا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتیں۔ البتہ جس دن ہڑتال ہوتی وہ اپنی شاپنگ کے پروگرام اور دوسری مصروفیات کو ملتوی کر دیتیں۔

ایک دن یونہی خیال آیا تو میں نے بیگم سے آزاد کے بارے میں پوچھ لیا کہ اس نے کتنی اجرت طلب کی۔

"وہ عجیب آدمی ہے۔ اس نے کوئی اجرت طلب نہیں کی۔ میرے اصرار پر صرف اتنا کہا کہ لالہ کو بتا دوں گا۔ لالہ نے بھی کچھ نہیں کہا۔" بیگم نے بتایا میں نے لالہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"صاحب ہم اس سے معاوضے کا بات کیا تھا، وہ ناراض ہو گیا۔ بولتا تھا اگر ہم اس موضوع پر بات کرے گا تو وہ دوستی ختم کر دے گا۔"

"لالہ اس نے محنت کی ہے، اپنا وقت دیا ہے اسے اس کی محنت کا اجر تو ملنا ہی چاہیے۔"

"ہم اس کو سب بولا تھا صاحب مگر وہ بولتا ہے کہ لالہ تم بولا تھا کہ تمہارا گھر کا کام ہے۔ اب دوست کا گھر کام کرنے کا کوئی اجرت تھوڑا ہی ہوتا ہے ہم تو اپنا گھر میں کام کیا، اپنا گھر کا کام سمجھ کر کیا، اس کا معاوضہ کیسا۔"

"پھر بھی لالہ۔" میں نے کہنا چاہا۔

"صاحب اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک پیسہ نہیں لے گا۔ وہ ضد کا پکا ہے۔"

"آج کل وہ کیا کر رہا ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"بے کار ہے صاحب۔ بے روزگار۔"

"اچھا اسے میرے پاس لے آؤ۔ دفتر میں چپراسی کا کام کرنا چاہے تو جگہ خالی ہے۔"

اگلے روز لالہ اسے لے کر آیا تو میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی آزاد میاں۔ یہ تم اپنے کام کے پیسے کیوں نہیں لے رہے ہو؟"

اس نے لالہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔

مجھے لالہ کی بات یاد آ گئی۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔

"اگر دفتر میں چپراسی کی جگہ کام کرنا چاہو تو جب جی چاہے آ جانا۔ لیکن تنخواہ پہلے طے کر لو۔"

"صاحب میں تو آج سے کام پر آ سکتا ہوں۔" اس نے بہت دیر کے بعد کوئی بات کی۔

"ٹھیک ہے، آج سے ہی شروع ہو جاؤ لیکن تنخواہ کیا لو گے۔"

"صاحب، تنخواہ ہم اپنی ضرورت کے مطابق لیں گے۔ ڈھائی ہزار۔ کیونکہ ہمارا گزارہ اتنی ہی رقم میں ہو سکتا ہے۔"

"بھئی یہ تو بہت زیادہ ہے۔ اتنا تو ہم ٹائپسٹ کو بھی نہیں دیتے۔"

"صاحب ہم اپنی تنخواہ خود نکالیں گے۔ اگر ہم اپنی تنخواہ نہ نکال سکے تو ایک مہینہ کام دیکھ کر آپ ہمیں نکال دیجیے گا۔"

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے اس کی بتائی ہوئی تنخواہ پر اسے رکھ لیا اور اگلے دن دفتر پہنچنے کی تاکید کی۔

انتہائی ضروری ٹائپنگ کے کاغذات یا تو میں خود ٹائپ کر لیتا پھر اکاؤنٹنٹ یا دفتر کے عملے کا کوئی اور فرد۔ ایک دن اپنی میز پر ٹائپ کیے ہوئے کاغذوں کے انبار نظر آئے۔ اکاؤنٹنٹ نے بتایا کہ کل رات دیر تک آزاد یہ کام کرتا رہا ہے اور سارے ملتوی شدہ کاغذات ٹائپ کر کے دستخط کے لئے میز پر رکھ دیے۔ اس کا ایک اور جوہر کھلا۔ دفتر کے تینوں کمروں کے اے سی یونٹوں کی سروسنگ بھی ہو گئی۔ ہڑتال کے دنوں میں کمروں میں رنگ و روغن بھی ہو گیا۔ اسٹیشنری کے سپلائر کو اس نے اسٹیشنری لانے سے منع کر دیا اور خود ہی ہول سیل مارکیٹ سے رعایتی قیمتوں پر اسٹیشنری لے آتا۔ اکاؤنٹنٹ کو معاون کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت بھی آزاد نے پوری کر دی۔ ٹائپنگ کے کام وہ دفتر کے بعد کے اوقات میں کرتا۔ گویا اس نے اپنی تنخواہ کا بندوبست خود ہی کر لیا تھا۔ کاروباری حالات انتہائی نازک تھے لیکن اخراجات میں حیرت انگیز کمی نے کاروبار کو سنبھالے رکھا۔ میں نے غور کیا تو ہر معاملے میں آزاد کی کارفرمائی نظر آئی۔ وہ دفتر کا انتہائی اہم جز بن چکا تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگا۔

"صاحب ہم کو ذرا جلدی چھٹی دے دیا کیجیے۔ ہم دن کی روشنی میں اپنے محلے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دن ڈھلنے کے بعد یہاں کوئی داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"کیا ادھر حالات بہت خراب ہیں۔؟" میں نے پوچھا۔

" صاحب، بہت خراب ہیں۔ رات بھر گولیاں برستی ہیں۔ دھائیں دھائیں کی آواز سے بیوی بچے سہمے پڑے رہتے ہیں۔ صبح تک دو چار لاشیں گرتی ہیں اور دن بھر پولیس پکڑ دھکڑ میں لگی رہتی ہے۔ صاحب، ہم صبح جلدی آکر کام نبٹا دیا کریں گے۔"

"تم کام کی فکر مت کرو آزاد۔ اپنی سہولت کے مطابق کام کے اوقات متعین کرلو۔"

آزاد جلدی چلا جاتا اور صبح سویرے پہنچ کر اپنے کام سرانجام دے ڈالتا۔ اس کے ذمے خصوصی طور پر کوئی کام نہیں تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ ہر کام میں اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ ایک روز وہ دفتر نہیں آیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس سے رابطے کا واحد ذریعہ لالہ تھا لیکن اسے بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ دوسرے روز بھی نہیں آیا۔ روزانہ دفتر کے تمام لوگ اس کا انتظار کرتے رہتے۔ اس کی کمی دفتر کے ہر شخص نے محسوس کی۔ پھر وہ ایک ہفتہ کے بعد وارد ہوا تو اس کا عجیب حلیہ تھا۔

"صاحب ہم لوگ بری طرح گھرے ہوئے تھے، کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ہم تو پھر بھی نکل پڑے کیونکہ میرا بڑا لڑکا پانچ دن سے لاپتہ ہے۔ ہر جگہ ڈھونڈ لیا، سارے اسپتال دیکھ لئے، تمام تھانوں کے چکر لگا ڈالے، اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ وہ تو کسی بوری سے بھی برآمد نہیں ہوا۔ اب ہم کیا کریں۔ ایک بیٹی ادھر رہ گئی، ایک بیٹا یہاں چلا گیا۔ صاحب، ہم کس گناہ کی سزا بھگت رہے ہیں۔" اس کی آواز رندھ گئی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، چہرہ ستا ہوا تھا، شیو بڑھی ہوئی تھی اور وہ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔

"تم نے بیٹی کے بارے میں کیا کہا آزاد۔" میں نے پوچھا۔

"غائب ہو گئی تھی صاحب اور کیا۔ اٹھا لے گئے تھے سب۔ وہ واپس نہیں لوٹی ہم تو اس کی شادی کی تیاری کر رہے تھے، وہ خود ہی رخصت ہو گئی۔ اب یہ چودہ سال کا بیٹا ہے۔ نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہ تو لاخیرے لڑکوں میں بھی اٹھتا بیٹھتا نہیں تھا، کھیلوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا، بس اسکول جاتا تھا۔"

"آزاد، تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنے گھر والوں کو لے کر میرے یہاں آجاؤ۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں تو اپنے گھر چلے جانا۔"

"جب تک حالات ٹھیک ہونگے اس وقت تک تو۔" اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ اس نے کھانس کر گلا صاف کیا پھر بولا۔

"ہم بیوی بچوں کو اپنے سسر کے گھر چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں ٹیلی فون ہے، خیریت ملتی رہے گی۔ ان کا گھر بھی اسی محلے میں ہے مگر تھانے کے نزدیک ہے، شاید سب محفوظ رہیں۔"

"ٹھیک ہے تم ٹیلی فون کر لیا کرو اور حالات دیکھ کر گھر جایا کرو۔"

"صاحب ہم یہیں دفتر میں پڑے رہا کریں گے۔ لالہ بے چارہ بھی مشکل سے آتا جاتا ہے، کوئی علاقہ محفوظ نہیں ورنہ اسی کے گھر چلے جاتے۔"

آزاد روزانہ ٹیلی فون پر اپنے گھر والوں سے رابطہ کرتا اور مجھے ان کی خیریت سے باخبر رکھتا۔ ایک بار راستہ کھلا تو میرے اصرار پر وہ اپنے گھر گیا لیکن چار دنوں تک پھر وہاں سے نکل نہ سکا۔ لالہ خود کئی کئی دن غیر حاضر رہتا، وہ آزاد کی کوئی خبر نہ لا سکا۔ آزاد دفتر آیا تو اس کی پریشانی کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جا سکتا تھا۔

"صاحب۔ ہم کو بیوی نے الوداع کہہ کر رخصت کیا ہے۔ ہم بھی بیوی بچوں کو الوداع کہہ آئے ہیں۔ ہمارا دل کہتا ہے ہماری اب ملاقات نہیں ہو گی۔"

میں کچھ دیر تک کچھ بھی بولنے سے قاصر رہا۔

"آزاد، تم نے تو بہت برے حالات دیکھے ہیں، اتنے مایوس کیوں ہوتے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر طرح کا وقت گزر جاتا ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں اپنے بیوی بچوں کو وہاں سے نکال لاؤ۔"

"صاحب کتنے لوگ وہاں سے نکل سکتے ہیں اور جائیں بھی تو کہاں جائیں۔ ایک بہن دوسرے محلے میں رہتی ہے، وہ بھی اسی طرح کے حالات سے گزر رہی ہے، اس کے تو دو جوان بیٹے غائب ہیں۔ ایک سالا جس محلے میں رہتا ہے وہاں نہ کوئی داخل ہو سکتا ہے نہ نکل سکتا ہے۔"

شہر میں نفسا نفسی کا عالم تھا۔ روزانہ لاشیں گنی جاتیں۔ کم تعداد پر لوگ شکر ادا کرتے۔ ہر طرف سناٹا رہتا۔ اس بھرے پُرے شہر میں سڑکوں پر بتے لوٹتے۔ کہیں ٹائر جلائے جاتے، کبھی ہڑتال کی کال ہوتی اور اکثر کرفیو نہ ہونے کے باوجود کرفیو کا سا سماں ہوتا۔

لالہ بھی مشکل سے ہی پہنچ پاتا تھا۔ میں خود ہی کسی طرح گاڑی چلا کر دفتر جانے کی رسم ادا کرتا اور لوگوں سے خیر و عافیت پوچھ کر گھر واپس آجاتا۔ اس روز دفتر پہنچا تو آزاد ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"صاحب آپ ہماری تنخواہ بارہ سو روپے کر دیجیے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اب تک تو تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ سنتا آیا تھا، کمی کی بات پہلی مرتبہ سنی تھی۔

"کیا بات ہے آزاد۔ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"ہاں صاحب، ہمیں معلوم ہے ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو اپنی ضرورت کے مطابق تنخواہ لیتے ہیں۔ اب ڈھائی ہزار کی ضرورت نہیں رہی۔ بارہ سو میں ہمارا گزارہ ہو جائے گا۔"

میں اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔

"آزاد سب خیریت تو ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

" صاحب اب تو ادھر کچھ بھی نہیں بچا ہو گا۔" اس کی رندھی ہوئی آواز نکلی

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)



من موھن تلخ

فیصلہ ہوگا بھلے آج نہ ، کل ہوگا
جو بڑا آج کہے مجھ کو ، وہ پاگل ہوگا

مجھ کو پینے نہیں دیتے کہ نہ ہو آبِ حیات
خود نہیں پیتے کہ یہ زہر ہلاہل ہوگا

اپنی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملاکر جانا
جو بھی اب سانحہ ہوگا ، وہ مکمل ہوگا

یہ مزاجوں کا سفر ہوگا وہاں سے تو شروع
جسم کے بعد جہاں ذہن تراشل ہوگا

یوں ادھورا کیا ہر ایک نے ہر دوسرے کو
اب کوئی بھی کسی صورت نہ مکمل ہوگا

آج پھر زندگی سے جنگ لڑے گا کوئی
آج پھر اپنے ہی ہاتھوں کوئی گھائل ہوگا

دے کے انہونی کا احساس ، ادھورا مت چھوڑ
حادثہ کب کوئی بھرپور ، مکمل ہوگا

وہ سفر ہے ترا ، چلتا رہے تو جسم ہوشل
چھوڑ دے بیچ میں ، تو ذہن تراشل ہوگا

ہم سے سب کہہ کے گذرتا ہے جو لمحہ گذرے
جان لیں گے یہیں ، جو بھی کہیں جس پل ہوگا

کچھ جو کہنا ہمیں آیا تو نہیں وقت رہا
تلخ کیا عمر برابر نہ کوئی پل ہوگا !

● B-87, Gulmohar Park
New Delhi - 110049



عرفان صدیقی

ہم سے وہ جانِ سخن ربطِ نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے

اس کو رہتا ہے ہمیشہ مری وحشت کا خیال
میرے گم گشتہ غزالوں کا پتا چاہتی ہے

میں نے اتنا اُسے چاہا ہے کہ وہ دل کی مُراد
خود کو زنجیرِ محبت سے رہا چاہتی ہے

چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر ، یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

ہم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہیں آزاد
گھر کو چلتے ہیں کہ اب شام ہوا چاہتی ہے

ہم نے ان لفظوں کے پیچھے ہی چھپایا ہے تجھے
اور انھیں سے تری تصویر بنا چاہتی ہے

● Azmat Manzil, Hyder Mirza Rd
Golaganj, Lucknow - 226001 (U.P.)

دلکش اعظمی

اشتہاری زندگی کا میں نمائندہ نہیں
بندۂ خالق ہوں تخلیق کا بندہ نہیں

خول سناٹوں کا اوڑھے بستیاں تو ہیں مگر
ایسا لگتا ہے کہ اب ان میں کوئی زندہ نہیں

حیطۂ شب میں برہنہ آئینے بے عکس ہیں
روبرو دن میں کسی سے کوئی شرمندہ نہیں

جسم کے آباد ہنگامے پرندہ ہوگئے
شہر میں دل نام کا اب کوئی باشندہ نہیں

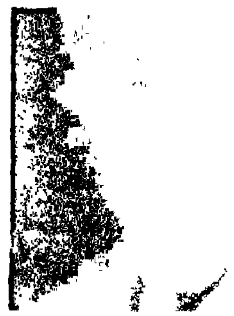
جوہرِ تعمیر چن کر لے گئی روشن صدی
آج کے لمحوں پہ نقشِ شہر آئندہ نہیں

دست ہی پر مقدر کی لکیریں کھینچ دو
زائچہ سنگِ جبینِ وقت پر کندہ نہیں

آج تک دھرتی کو بھکشا دینے والے ہاتھ
کون کہتا ہے کہ مستقبل درخشندہ نہیں

ذہن دلکش اس کشیدہ روغنی ماحول سے
مضمحل تو ہے مگر یکسر پراگندہ نہیں

● Vill. Bhadurpur, P.O.
Dohrighat, Dist. MAU (U.P.)



مظہر امام
176 - B, Pocket-1, Mayur Vihar, Phase-1, Delhi - 1100

تخلیقی فن کار کی بحالی

ترقی پسندی، عصری سماجی حقیقتوں سے رشتہ جوڑنے کی کوشش تھی جس میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور کم و بیش پندرہ سال تک ہمارے ہتم بالشان ادب پیدا ہوا۔ بعد میں تنگ نظری، ادعائیت، سیاسی سخت گیری وغیرہ اس تحریک کے زوال کا سبب بنیں۔ اور ایک نیا رجحان ادب میں شدومد یاتھ ابھرا۔ اس نے ادب کا رشتہ از سر نو فن سے جوڑنے کا بیڑہ اٹھایا اور بعض اعلیٰ درجے کی تخلیقات سامنے آئیں۔ نئی نسل نے اس رجحان کو صدق دل ماتھ لبیک کہا۔ لیکن جدیدیت کی جانب سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اپنے اثبات کے لئے ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کے انہدام کو اپنا ۔ ہی، ایک بڑا مقصد قرار دیا اور انہیں کے زنگ آلود ہتھیاروں سے خود کو لیس کرنے کی سعی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی معاملات میں ہنس کی چال چلنے کی س میں وہ اپنی چال بھی بھول گئے۔ میں نے اپنے مضمون "آتی جاتی لہریں" (مطبوعہ "شب خون" ستمبر ۱۹۶۷ء) میں اس اندیشے کا اظہار کیا تھا:

"جدید شاعروں میں ترقی پسندوں ہی کی طرح بلکہ ان سے بڑھی ہوئی شدت کے ساتھ گروہ بندی ہے اور توصیف باہمی کا جذبہ کار فرما ہے۔ نئی نسل کے مسائل سے گفتگو کرنے والے شعراء اور ناقدین بھی کٹر پن کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے یہاں رواداری اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کا فقدان نظر آتا ہے۔"

س کہ اس پر کسی نے توجہ نہ دی اور لوگ اپنی تیز روی اور طرراری کے زعم میں انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے جو جدیدیت کے کاسہ لیس نہیں

جیسا کہ میں نے عرض کیا ترقی پسندی کے زوال کے بعد ایک بڑے رجحان جدیدیت کا عروج ہوا۔ ترقی پسندی کے اثرات نسبتاً دیر تک رہے۔ یت کے بعض ترجیحی ایجنڈوں سے انحراف جلد ہی شروع ہو گیا۔ ہمارے یہاں "۳۶ء کی نسل" اور "۶۰ء کے بعد کی نسل" کی اصطلاحیں عام طور پر س ہوتی رہی ہیں۔ یہاں تک تو غنیمت تھا، لیکن اب ۷۰ء کے بعد اور ۸۰ء کے بعد کی نسلیں بھی اپنے وجود پر اصرار کرنے لگی ہیں۔ شکر ہے اب تک کے بعد کی نسل کا نام بطور اصطلاح نہیں سنا جا رہا ہے۔ "یکم جنوری ۷۱ء" اور "یکم جنوری ۸۱ء" سے دو نسلیں سامنے آ گئی ہیں اور انہیں شکایت ہے کہ ان خت نہیں ہو رہی ہے، دوسرے لفظوں میں انہیں وہ درجہ اعتبار حاصل نہیں ہو رہا ہے جو مثال کے طور پر جدیدیت کے ابتدائی دور میں بعض لکھنے ، کو حاصل ہو گیا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ شکایت انہیں دوسروں سے نہیں اپنے آپ سے ہونی چاہیے۔ جدیدیت کے پاس اپنے نقاد اور اپنے مبلغ ایک بڑا آرگن تھا، جدید تر نسل کے پاس اپنے نقاد نہیں ہیں۔ بعض نئے لکھنے والے جو تنقیدی نوعیت کے مضامین لکھ رہے ہیں، انہیں فہرست سازی یادہ دلچسپی ہے، اور خود کو اور اپنے بہت قریبی دوستوں کو نمایاں کرنے کا شوق ہے۔ اچھے ادب کی پرکھ اور اس کی طرف توجہ دلانے کا کام نہیں ہو رہا بعض بہت عمدہ نئے رسالے نکل رہے ہیں اور ان میں زیادہ تر نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں، اور انہیں کے توسط سے بعض نام ذہن کے ، پر روشن ہونے لگے ہیں۔ ان میں سے کسی رسالے یا کچھ رسالوں کو اعتبار اور استحکام حاصل ہوا تو نئے لکھنے والوں کے حق میں فال نیک ثابت ہوگا۔ کام بہت صبر و استقلال چاہتا ہے۔ تخلیقی قوت کو مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے سے Reinforce کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ہر نئے لکھنے کو اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے۔

میں ادب پر کوئی لیبل لگانے کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ اختر الایمان، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو کس خانے میں رکھیں گے۔ ترقی پسند؟ 'ان لیبلوں کے بغیر ہی ان کی بڑائی کا اعتراف ہوا ہے۔ لیکن ہمارا ذہن رجحانات کے حوالے سے سوچنے پر اتنا Conditioned ہو گیا ہے کہ نئی ، بھی ایک لیبل کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ اگر نئی نسل کو اپنی شناخت کے لئے واقعی کسی لیبل کی ضرورت ہو تو "مابعد جدیدیت" کا لیبل وں معلوم ہوتا ہے۔ "مابعد جدیدیت" کے تصور اور اس کی فلسفیانہ اساس پر گفتگو ہوتی رہنی چاہیے۔ یہ بحث بھی جاری ہے کہ امریکہ اور یورپ Post-Mr dernism کا دور کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا لیکن ... جہاں تک اردو کا تعلق ہے ... مفہوم میں استعمال کرتا

چاہیے، یعنی "جدیدیت" کے بعد کا دور۔ اب یہ نئے لوگ طے کریں کہ یہ دور کب سے قرار دیا جائے۔ ۱۹۷۰ء سے یا ۱۹۷۵ء سے یا ۱۹۸۰ء سے۔ میں ذاتی طور پر ۱۹۷۵ء بلکہ ۱۹۷۷ء کے حق میں ہوں، یعنی ایمر جنسی (Emergency) کے بعد کا دور۔ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ ۱۹۷۷ء ۔ ۱۹۷۵ء تک جدیدیت کے اثرات حاوی تھے اور خواہ اس سے اختلافات کے پہلو سامنے آنے لگے ہوں لیکن اس سے منحرف یا باغی ہونے کا کوئی واضح رجحان نہیں تھا۔

شناخت بڑے رسالوں اور نقادوں کے بغیر بھی بنتی ہے۔ شاید آج نو خیز لکھنے والوں کو یہ جان کر حیرت ہو کہ باقؔی "شب خون" میں کبھی نہیں چھپے۔ گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے انتقال کے بعد ہی ان پر لکھا جو "شفق شجر" میں دیباچوں کی شکل میں شائع ہوا۔

نئی نسل کے تخلیق کاروں کو نقادوں کی طرف دیکھنا بند کر دینا چاہیے۔ میں دو چار Genuine نقادوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ ہمارے لئے محترم ہیں۔ وہ نئی نسل سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں اور انہیں آگے بڑھانے کی اپنی سی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ہر معلم جو اپنی ترقی (Promotion) کے لئے اپنی پیٹھ پر دو چار کتابوں کا بوجھ لاد لیتا ہے، اپنے آپ کو نقاد منواتا ہے اور اپنی کتابیں نصاب میں شامل کراتا ہے، اپنے شاگردوں کو اپنی ہی کتابوں سے اقتباسات پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے، جس کی "سخن ناشناسی" مسلم ہے اور جو غلط زبان لکھنے میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ فن کار کی اہمیت خود اس کی تخلیقات متعین کریں گی، ناقدوں کی اسناد نہیں۔ نئے لکھنے والوں کے یہاں تخلیقی وفور کی کمی نہیں، لیکن صرف تخلیقی وفور بڑے یا کم از کم اچھے فنی کارنامے کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

نقادوں کی "جی حضوری" سے پورے طور پر اجتناب کرنا چاہیے اور ان سے بے نیاز ہو کر ادبی تخلیق کو اپنا مقصد حیات بنا لینا چاہیے۔ اگر تخلیق اچھی ہو گی تو نقاد لا محالہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے، ورنہ وہ خود درجۂ اعتبار سے گر جائیں گے۔

میں نقادوں کی جانب سے بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نام لینے کی ضرورت نہیں، لیکن جو ہمارے چند اہم نقاد ہیں، انہوں نے ۱۹۸۰ء تک کے فن کاروں کے سلسلے میں حتی المقدور اچھا خاصہ کام کیا ہے۔ ان کی دوسری ادبی مصروفیات بھی ہیں۔ ان سے توقع رکھنا کہ وہ نئے سے نئے لکھنے والے کی تحریریں توجہ سے پڑھیں اور ان پر اظہار خیال بھی کریں، زیادتی ہے۔ وہ اپنا کام کر چکے، اب دوسرے ناقدین کو سامنے آنا چاہیے۔ ویسے اب بھی یہ ناقدین بالکل نئے لکھنے والوں کی کتابوں کے فلیپ کے لئے کچھ نہ کچھ مروتاً لکھ ہی دیتے ہیں، ہر چند اس کا کوئی حاصل نہیں ہوتا۔ معروف نقادوں کی بات تو جانے دیجیے، خود میرے پاس (حالانکہ میں نقاد نہیں ہوں) روزانہ اوسطاً ایک کتاب (اگر اس میں رسالوں کے خاص نمبر اور بھاری بھر کم جرائد بھی شامل کر لئے جائیں) ضرور آتی ہے، اور اس کے ساتھ فرمائش ہوتی ہے کہ اس پر تبصرہ لکھ دوں یا کم از کم تفصیل سے اظہار خیال کروں۔ کتاب چھپنے سے پہلے دیباچہ یا فلیپ کے لئے رائے لکھنے کی فرمائشیں بھی تواتر کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ ادیبوں شاعروں پر چھپنے والی کتابوں اور خاص نمبروں کے لئے مضامین کی فرمائشیں الگ ہوتی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان فرمائشوں کو پورا کرنا مناسب ہے یا نہیں، کیا انہیں پورا کرنا ممکن ہے؟ ویسے ہمارے یہاں چند ایک ایسے "صائب الرائے" اصحاب موجود ہیں جو ہر ایک کی کتاب کے فلیپ کے لئے ایک ہی "رائے" عنایت کر دیتے ہیں، صرف لکھنے والے کا نام بدل کر سرخرو ہو جاتے ہیں!

اردو کے نئے لکھنے والوں کو کئی محاذوں پر سرگرم اور نبرد آزما ہونا ہے۔ سب سے اہم تو اس کی اپنی زبان کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ ہے۔ ادب کے قاری کی بازیافت کے سلسلے میں مسلسل کوشش کرنی ہے۔ اس ضمن میں حالیہ برسوں میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، لیکن اس جدوجہد کو اور تیز کرنا ہے۔ اداروں پر پروفیسروں اور خود ساختہ نقادوں کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا ہے۔ یہ لوگ تخلیقی ادب کے دشمن ہیں۔ چوں کہ اللہ نے انہیں تخلیقی صلاحیتوں سے محروم کر رکھا ہے، لہٰذا وہ اپنی محرومی کا انتقام تخلیقی فن کاروں سے لے رہے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جو حکومت ہند کی وزارت فروغ انسانی وسائل کے تحت کام کرتی ہے اور جس پر پروفیسر صاحبان کا عمل دخل ہے، ہر سال کئی لاکھ کی اردو کتابیں خریدتی ہے، مگر اس نے شاعری اور فکشن کی کتابوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کی کتابیں نہیں خریدی جا سکتیں، لیکن ان پر لکھی ہوئی کسی نیم خواندہ ریسرچ اسکالر کی کتاب بلا تکلف خریدی جا سکتی ہے!

ادب کی ضرورت اور اہمیت کو کون سمجھے؟ سیاست ہمارے معاشرے پر حاوی ہے۔ مشاعروں کی جو رپورٹیں چھپتی ہیں، ان میں ان شاعروں کا نام نہیں آتا جنہوں نے کلام پیش کیا بلکہ کسی سیاسی آدمی کی اس جاہلانہ تقریر کو نمایاں کیا جاتا ہے جس سے اس نے بحیثیت مہمان خصوصی سامعین کا وقت برباد کیا تھا۔ ادبی جلسوں میں سیاست سے وابستہ کسی نہ کسی شخص (شخصیت نہیں) بلکہ کئی کئی اشخاص کو صدر اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہے کیوں کہ ان سے مالی منفعت کی توقع ہوتی ہے۔ اور رپورٹوں میں انہیں کی "احمقانہ گہر افشانیوں" کو Highlight کیا جاتا ہے۔ ہمارا میڈیا (Media) بھی اسی ذلت اور کمینگی کو فروغ دے رہا ہے! ہم لوگ از کار رفتہ ہو چکے۔ نئی نسل کے کاندھوں پر بڑی ذمہ داری ہے۔ تخلیقی فن کار کی بحالی (Rehabilitation) ایک بڑا مسئلہ ہے جو نئی نسل کے سامنے ہے!

◆◆





انیس انصاری

موسم عشق میں پھر قحط پڑا

وسم وصل سے پہلے ہی فراق آپہونچا
شق کا بیج مری مٹی میں بیکار گیا اب کے برس
ری مٹی کئی فصلوں سے یونہی خالی پڑی تھی تاکہ
ود نکلے تو ہوا پھولوں پھلوں سے لد جائے
ادلوں نے مرے کھیتوں کو امیدوں سے بھرا
یں ہی کچھ سادہ تھا
معلوم نہ تھا
ھی بادل مرے کھیتوں پہ برس جائیں ضروری تو نہیں
موسم عشق میں پھر قحط پڑا
شق کی فصل مری مٹی کو راس آئے گی آخر کہ نہیں؟
فصل چھوڑیں تو غریب الوطنی چین بھی دے پائے گی آخر کہ نہیں
وئی ترکیب کہ دل درد سے خالی ہو جائے
یا وہ بارش ہو مری مٹی کا بنجر دھو جائے!

● Flat No.2, Type - VI, Dali Bagh Colony.
Lucknow - 226001 (U.P.)

رؤف خیر

Holo-Caust Museum
(ترائیلے)

پاؤں

یہ ہے اس نوجواں لڑکی کا وہ پاؤں
جو "پاگل پور" میں کاٹا گیا تھا
جلا تھا جس کے آگے گاؤں کا گاؤں
یہ ہے اس نوجواں لڑکی کا وہ پاؤں
کنارِ دریا دم سادھے جو بے چھاؤں
جوانوں کی ہوس کا مرثیہ تھا
یہ ہے اس نوجواں لڑکی کا وہ پاؤں
جو پاگل پور میں کاٹا گیا تھا

ہاتھ

یہ ہاتھ برف زار سے لایا ہوا سا ہے
جس ہاتھ میں کتاب کے بدلے مشین گن
آنکھیں ہیں خواب خواب مگران میں بجھے ہی بجھے
یہ ہاتھ برف زار سے لایا ہوا سا ہے
مٹھی سے ریت بن کے پھسلتا ہوا سے
اک بم کی طرح پھٹ بھی تو سکتا ہے دفعتاً
یہ ہاتھ برف زار سے لایا ہوا سا ہے
جس ہاتھ میں کتاب کے بدلے مشین گن

● 9 - 10 - 202/19, Risalabazar,
Golconda, Hyd - 8 (A.P.)

بھگوان داس اعجاز

سایہ

سایہ تیرا دیکھ کر ، جان گیا وہ نام
قد چھوٹا ہو جائے گا ، اگر بتایا کام

کتنی اونچی ہو گئی ، نفرت کی دیوار
ہمسائے کے پیڑ کا ، سایہ بھی انگار

سایہ سر کرنے چلے ، ہم ڈوبے منجدھار
پاؤں مرے اس پار تھے ، سر میرا اس پار

طے ہو جاتے فاصلے ، ہم مل جاتے کاش!
رات میں کر لیتے اگر ، سایہ ترا تلاش

منزل سائے کی طرح ، پیچھے پیچھے جائے
کھلے کواڑوں جب کوئی ، اپنا در کھٹکائے

● T - 451, Baljit Nagar,
New Delhi - 110008

انل ٹھکر

A - 1, Shambhu Apts., 38 - Adarsh Nagar
Hubli - 580032 (Karnataka)

غبار دیکھتے رہے

اذان کی آواز آئی۔
دونوں بھاگیں۔
پل بھر کی دیر جیسے قارون کے خزانے سے محروم کردے گی۔
بڑی نے بانہہ تھام لی۔
چھوٹی سینے پر سوار ہو گئی۔

دادا جی نماز.... بڑی نے بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

دادا نماج... چھوٹی سینے پر مٹھیاں مارتے ہوئے توتلی زبان میں بولی۔

مولوی صاحب ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔ آنکھیں کھولیں۔ سینے پر سوار چھوٹی کو دیکھا۔ مسکرادیے۔ کہا۔

شیطان!

مولوی صاحب اٹھ بیٹھے۔ چھوٹی کو سینے سے لگا کر چوما۔

دادا کے لاڈ سے بے نیاز چھوٹی، ان کی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتی رہی۔

دادا نماج۔ دادا نماج....

بڑی کیوں پیچھے رہے۔ وہ بانہہ کو یوں ہلانے لگی، جیسے بازو کو کندھے سے اکھیڑ کر ہی دم لے گی۔

دادا جی نماز۔ عصر کی نماز...

اری شیطانو! ہٹو اپنے دادا جی کو کھاٹ سے اترنے بھی دو گی یا بستر پر ہی نماز پڑھواؤ گی!

پوتیوں کے شور شرابے سے دادی باہر آئی۔ چھوٹی کو نیچے اتارا بڑی کے ہاتھوں سے مولوی صاحب کی بانہہ چھڑائی اور پیٹھ پر دھول جما کر اسے دھکیلا۔

پہلے تم دونوں وضو کرلو۔ جانماز بچھاؤ۔ نیت باندھو۔ جاؤ۔ میں آئی۔

یا اللہ.... میرے مولا... رحم کر، رحم کر۔ مولوی صاحب نے داڑھی سنوارتے ہوئے اپنے آقا کو یاد کیا۔

اب آپ کھاٹ سے اتریں گے بھی؟ اٹھیے، وضو کے لیے پانی رکھا ہے۔ ٹوپی کھونٹی پر ٹنگی ہے۔ اس سے پہلے کہ جماعت کے لئے تکبیر کی آواز آئے، مسجد پہنچ جایئے۔

توبہ، توبہ۔ جب دیکھو، کسی نہ کسی کے پیچھے لٹھ لیے پڑی رہتی ہو... مولوی صاحب نے ٹانگوں کو زمین پر رکھا۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے۔

نصیباں والیے، ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اللہ میاں نے اب تو ایک عدد بہو اور دو دو پوتیاں دے رکھی ہیں۔ کم از کم، اب تو اس بڈھے کو بخش دیا کرو۔

بڈھے ہوں گے آپ کے دشمن۔ بیوی کے تیور بگڑ گئے۔ وہ کھاٹ کی چادر جھٹک کر تہہ کرنے لگی۔

یہ جان کر کہ بیوی اس عمر میں بھی انہیں بڈھا تسلیم کرنے کو تیار نہیں، من میں ترنگ سی اٹھی۔ کچھ کہنے والے تھے کہ نظر بہو پر پڑی۔ بہو کواڑ سے ٹیک لگائے، ان کی غٹر غوں سن رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر اس کی لجاتی، مسکراتی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں کہ اس کے ہونٹوں سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑنے کو ہے۔ مولوی صاحب شرما گئے۔

بہو کسی پرائے گھر کی نہیں تھی۔ بڑی بہن کی بیٹی تھی۔ ان کے سامنے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی گود میں کھیلی، پلی، بڑھی، قد کاٹھی نکالی تو مولوی صاحب کی آنکھوں میں بس گئی۔ بیٹا بھی جوان ہو چلا تھا۔ وطن کے حال احوال سے، اس کے دکھ سکھ، روکھی سوکھی سے وہ مطمئن نہیں تھا۔ ہوا کا رخ عرب ممالک کی طرف تھا۔ وہ اسی سمت اڑنے کی سوچنے لگا۔ بیٹے کی زندگی بنتی ہے تو اس کے وطن چھوڑنے پر مولوی صاحب کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر بیٹے کی اڑان سے پہلے وہ اسے ایک بندھن، ایک رشتے میں باندھ دینا چاہتے تھے تاکہ برس، ڈیڑھ برس کے بعد جب بھی وہ آئے اپنی منڈیر پر بیٹھے۔

مولوی صاحب نے بیٹے کا نکاح بڑی بہن کی بیٹی سے پڑھوادیا۔

بچی بھی مولوی صاحب کا بچپن سے بہت احترام کرتی تھی۔ بہو بن کر آئی تو تعظیم و تکریم کی خوشبو سے، پھولوں سے لدی ٹہنی کی طرح گھر میں جھولنے لگی۔

مولوی صاحب کو بیوی نے شرماتے دیکھا تو اسے حیرت ہوئی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ پوچھ بیٹھی۔

آپ نے شرمانا کب سے سیکھا؟

مولوی صاحب الجھن میں پڑ گئے۔ سمجھ نہیں پائے۔ کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ مولوی صاحب کی نظریں بہو کی جانب اٹھ گئیں۔ بیوی نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا، ساس نے دیکھا، بہو مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھنے میں کھوئی ہوئی ہے اور پوتیاں ماں کی کرتی کا سرا پکڑے وہیں کھڑی ہیں۔ ساس نے چادر پٹکی اور ہانکا لگایا۔

اے ہے، خدا کا خوف کرو۔ نماز نہیں پڑھنی؟ چلو، چلو... جیسی ماں، ویسی بیٹیاں۔

بہو مسکراتے ہوئے مڑی۔ پوتیوں نے کلکاریاں بھرتے ہوئے ہیمنے کی طرح قلانچے بھرے۔

وضو سے فارغ ہو کر مولوی صاحب نے ٹوپی سر پر رکھی اور چل پڑے، بڑی مسجد کی جانب۔ مسجد گھر سے چند قدم پر ہی آباد تھی ویسے تو گاؤں بھی کتنا تھا! چھوٹا سا گاؤں۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں، مختصر سی ضرورتیں۔ کچے دھابے کی چھت اٹھائے چھوٹے چھوٹے گھر۔ کم کم بارشیں۔ نرم نرم سردیاں۔ تیز تیز دھوپ۔ جس کی تمازت میں تپ کر گاؤں والوں کے دل کندن بنے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب اپنے محلے میں ایک اکیلے مسلمان تھے۔ پورا محلہ ہندو کسانوں سے آباد تھا۔ مگر محلے میں عید اور دیوالی کی خوشیاں ایک سی ہوتی تھیں۔ عید کی نماز ہوئی نہیں کہ محلے کی کواڑیں شیر خرما کی منتظر رہتیں۔ دیوالی کے روز مولوی صاحب کا گھر مٹھائیوں سے چھلکنے لگتا۔ جسے رشتے داروں میں بانٹنے سے دو چار روز انہیں فرصت نہ ملتی۔ محلے والوں اور ان کے شاگردوں نے ہی انہیں مڈل اسکول کے معمولی معلم سے مولوی صاحب بنا دیا تھا۔ نئی نسل ان کے صحیح نام سے واقف نہ تھی۔ پرانے لوگ بھی ان کا اصلی نام بھولنے لگے تھے۔ ہر شخص انہیں مولوی صاحب کہہ کر ہی بلاتا۔ مسجد کا معاملہ ہے، مولوی صاحب کو بلاؤ۔ گلی محلے کی بات ہے، مولوی صاحب سے پوچھو۔ بھائی بھائی میں زمین جائداد کا مسئلہ ہے، تو مولوی صاحب کو بٹھاؤ۔ جلسے کی صدارت ہے، تو مولوی صاحب۔ جلسہ کسی پارٹی، قوم یا انجمن کا کیوں نہ ہو، ان کی تقریر سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھا۔ کسی کی بھویں نہیں تنیں۔ اسی گاؤں میں مدرس کا کام کرتے کرتے وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے مگر کبھی کسی نے ان کے پاؤں کو ان کی چادر کی دہلیز لانگتے نہیں دیکھا۔ ان کا دائرہ بھی اپنے گاؤں جیسا چھوٹا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے کنویں سے باہر پھلانگنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے لیے کائنات، پیر تلے کے فرش سے، سر پر کے آسمان کے ٹکڑے تک ہی محدود تھی۔ گاؤں میں دعا سلام سبھی سے تھی۔ یار دوست چند ہی تھے۔ دانت کاٹی روٹی کا رشتہ صرف ایک سے تھا۔

شیو شرن اور مولوی صاحب کے مالی و معاشرتی حالات علاحدہ علاحدہ تھے۔ لیکن ذہنی بھوک ایک تھی۔ مذہب مختلف تھے پر روحانی ضرورت ایک تھی۔ جسم جدا جدا تھے، بیماری ایک تھی۔ ادب اور مذہب کو پڑھنے کی اس بیماری نے دونوں میں قربت پیدا کر دی تھی۔ بعد نماز عشاء بیٹھ جاتے۔ بوڑھے برگد کے چبوترے پر۔ دونوں کے درمیان تیلی در تیلی خالی ہو رہی ماچس کی ڈبیا اور بیڑی کا بنڈل دم سادھے پڑے رہتے۔ کبھی نظم و نثر پر بحث ہوتی، کبھی مذہب و مراقبے پر، تو کبھی ملک و معاشرے کے حالات پر۔ جب ستارے تھک کر جھپکیاں لینے لگتے۔ بیڑیاں راکھ بن کر بکھر جاتیں۔ سینہ تمباکو کے دھویں سے بھر جاتا تب اپنے علم کے تجسس کو تھپکیاں دیتے ہوئے اپنے گھر کا رخ کرتے۔ شیو شرن تو اپنی ملازمت سے بندھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب سارا دن گھر پر ہی رہتے۔ ان کے پڑھنے کی بیماری روگ بن گئی تھی۔ فجر کی نماز سے لوٹتے ہی کھاٹ پکڑ لیتے۔ کتاب اٹھاتے اور ظہر کی نماز تک ڈٹے رہتے۔ گھر میں کسی کی مجال جو ان کے مطالعے میں خلل ڈالے۔ ہاں، یہ حق انہوں نے صرف اپنی پوتیوں کو دے رکھا تھا۔ کبھی چھوٹی آتی، تو کبھی بڑی۔ ایک دوسرے پر شکایتیں داغنا شروع ہو جاتیں۔ صبح کے دو تین گھنٹے وہ اطمینان سے مطالعہ کر پاتے۔ پوتیوں کے مدرسے سے لوٹتے ہی دھما چوکڑی مچ جاتی۔ ساری دنیا کا، دنیا کے ہر کام کروانے کے لیے مولوی صاحب ہی تھے۔ وہ ان کے گرد و پیش رہتیں۔ کبھی تو مولوی صاحب جھنجھلا کر ان میں صلح کروانے کے لیے کتاب ایک طرف رکھ دیتے، کبھی ڈانٹ ڈپٹ کرتے، تو کبھی حسرت سے انہیں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے۔ پوتیاں کھیلتے کھیلتے کبھی استاد، شاگرد کا کھیل کھیلتیں تو وہ کتاب میں منہ چھپائے، چوری چوری بڑے چاؤ سے ان کا کھیل دیکھتے رہتے۔

مدرسے کے استاد کی نقل کرتے ہوئے، بڑی کہتی۔ بولو

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔

چھوٹی ہاتھ باندھے لے میں دہراتی۔ بڑی دوسرا مصرع لگاتی۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

چھوٹی توتلی زبان میں گاتی۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میلی

میلی نہیں، میری۔ بڑی بگڑ کر کہتی۔

میلی۔ چھوٹی اپنا تلفظ درست کرنے کی ناکام کوشش کرتی۔

میلی نہیں میری

میلی!

اس طرح میری اور میلی کے جنگ چھڑ جاتی۔ لفظوں کی تکرار سن کر مولوی صاحب کتاب سے نظریں ہٹا کر مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہوتے۔

سوسنار کی ایک لوہار کی۔ بڑی کی کچ کچ سے تنگ آکر کبھی چھوٹی استاد بن جاتی۔ جھاڑو کی کاڑی تھامے، ہاتھ پیچھے باندھے، چکر کاٹتے ہوئے بڑی کو کھانے کی دعا سنانے کا حکم دیتی۔ بڑی حکم بجالاتی۔

بسم اللہ و علیٰ برکتہ اللہ ہ....

چھوٹی یک بیک ناک پر انگلی رکھ کر پلٹتی۔ کہتی۔

چوپ۔ کون بولا؟ خاموش۔

مولوی صاحب کو اپنے شاگرد اور مدرسہ یاد آجاتا۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کھیل کھیل میں دونوں بہنوں نے گھر کا بٹوارا کر کے ہر چیز کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ بڑی کے حصے میں دادی آئی۔ چھوٹی نے مولوی صاحب کو ہتھیالیا۔ دادی کے کپڑے لتے اور گہنوں پر بڑی نے اپنا حق جتایا، تو چھوٹی نے مولوی صاحب کے کتب خانے پر قبضہ کر لیا۔ باورچی خانہ بڑی نے لیا۔ چھوٹی نے فخر سے دیوڑھی کو قبول کیا، جہاں مولوی صاحب کی کھاٹ اور کتب خانہ آباد تھا۔ بیچ کا کمرہ سب کے لیے اور ماں چھوٹی کے لیے چھوڑ دی گئی۔ کیوں کہ وہ رات کو ماں کے ساتھ سوتی تھی۔

ایک دن دادی کی چوڑیاں پہن کر بڑی اٹھلانے لگی۔ چھوٹی نے ٹھینگا دکھایا۔

تیلے پاس چال چوڑیاں ہیں۔ میلے پاس دیکھ، اتنی سالی کتابیں ہیں

بڑی نے نہلے پر دہلا دے مارا۔

کتابیں پڑھنے سے داڑھی نکلتی ہے دادا جیسی۔

تو کیا ہوا!

چوٹیاں گر جاتی ہیں۔

میلے کوسل کی چوٹیاں نہیں ہونا۔ میں لمبی داڑھی رکھوں گی۔ داڑھی میں چوٹی باندھوں گی۔ ہاں۔

چھوٹی اور بڑی نے مل کر گھر میں ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ گھر کا ہر فرد اپنی چوکڑی بھول گیا تھا۔ کبھی ان کی بھولی حرکتیں دیکھنے اور معصوم باتیں سننے میں کھوئے رہتے۔ کبھی ان کی حرکتیں ہنساتی۔ کبھی ان کی باتیں قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتیں۔ مولوی صاحب گھر پر نہیں ہوتے تب ماں اور دادی ان کی باتوں سے لوٹ پوٹ ہوتی رہتیں۔

مولوی صاحب محلے کی چھوٹی چھوٹی تالیاں پار کرتے ہوئے، بڑی مسجد پہنچے۔ لوگ ابھی آرہے تھے۔ کوئی گھر سے۔ کوئی کاروبار سے۔ مولوی صاحب نے ایک بار پھر پاؤں دھو کر پاک کیے۔ جانماز پر پہنچے۔ اتفاقاً تبھی بجلی آگئی۔ پنکھے چلنے لگے۔ پسینا ہوا ہونے لگا۔ وہ اب سمجھے کہ بڑے دنوں کے بعد آج پوتیوں نے شور شرابا کیسے کیا! نماز کے لیے جگانا انہیں کیوں کر یاد آیا۔ بجلی گل تھی۔ ٹی۔ وی بند تھا۔ اس لیے اذان کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ سکی۔ انہیں کراہت محسوس ہوئی۔

ٹی وی ان کے وہاں بن بلائے مہمان کی طرح آبسا ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ ناشتا کر کے مولوی صاحب نے کتاب اٹھائی۔ کھاٹ پر بیٹھے کہ شیوشرن آپہنچا۔

مولوی صاحب، کپڑے پہنیے۔ شہر جانا ہے۔

کیوں؟! خیریت تو ہے؟۔ مولوی صاحب پریشان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سب خیریت ہی خیریت ہے۔ بچوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ٹی وی کے لیے۔ ان کے لیے ٹی وی خریدنا ہے۔

مولوی صاحب نے کپڑے پہنے۔ کتاب بغل میں دبائی۔ چل پڑے، شیوشرن کے ہمراہ۔ کچھ عرصہ سے شہر کی ہوا گاؤں تک آپہنچی تھی۔ مکانوں کی منیڈر پر اینٹینا (Antenna) نظر آنے لگے تھے۔ پہلی بار مولوی صاحب نے جب محمد علی چودھری کی منڈیر پر Antenna دیکھا، تو پریشان ہوئے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اس عمر میں چودھری صاحب کو کبوتر پالنے کا کیا شوق چرایا ہے! جو چھت پر کبوتروں کے لیے چھتری لگالی ہے!! خیر، اب گاؤں میں ڈسک اینٹینا بھی آگیا ہے۔

شہر پہنچ کر مولوی صاحب اس وقت تشویش میں پڑ گئے جب شیوشرن نے ان کے لیے بھی ٹی وی خریدنے کی تجویز رکھی۔ مولوی صاحب نے انکار کر دیا۔ وہ ضد پر آگیا۔ مولوی صاحب نے بہت سمجھایا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ مولوی صاحب نے بند مٹھی کھول دی۔ شیوشرن نے ان کی کھلی مٹھی کو بند کیا اور بولے۔

مولوی صاحب، آپ کی اور میری مٹھی الگ الگ تھوڑے ہی ہے۔ ارے بھائی، جب ہوں، دے دینا۔ مگر آج ٹی وی تو دو عدد ہی خریدے جائیں گے۔

مولوی صاحب کے ذہن میں ایک خیال روشن ہوا۔ ٹی وی کی چلتی پھرتی، بولتی گاتی تصویریں پوتیوں کے لیے بڑھیا کھلونا ثابت ہو سکتی ہیں۔ بہو بھی میکے کا بہانہ کر کے فلم دیکھنے تعلقے ہو آتی ہے۔ بیگم نے تو خیر، ساری زندگی گھر کے کام کاج اور میری خدمت میں گذار دی۔ اس کی تفریح کا سامان بھی ہو جائے گا۔ میں بھی بی بی سی پر خبریں دیکھ لیا کروں گا پیسے! پیسے کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ دے دیں گے۔ شیوشرن کہاں پرایا ہے۔۔

مولوی صاحب گھر آتے آتے بازار میں اپنے شاگرد کو ٹی وی لانے کی خبر سنا آئے۔ جو کیبل آپریٹر تھا۔ اس نے گھنٹے بھر میں ان کے ٹی وی کو کیبل کے ذریعے سارے جہاں سے جوڑ دیا۔

گھر میں ٹی وی کیا آیا، چراغاں ہو گیا۔ پوتیاں Excited ہو کر مٹھیاں باندھے، آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئیں۔ فلمی گانوں کی دھنیں کانوں پر پڑیں تو بہو کے کام میں تیزی آ گئی۔ بیگم ٹی وی کا کرشمہ دیکھ کر اللہ کی تعریف اور اللہ کے بندوں کی ذہانت کے گن گانے لگیں۔ مولوی صاحب بھی گاہ بہ گاہ جھانک لیا کرتے۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن کو اشتیاق سے دیکھتا ہے۔

نئی نویلی دلہن نو دن۔ کچھ دنوں میں اشتیاق جوار پر آ گیا۔ مگر اس مختصر سے عرصے میں ٹی وی نے گھر میں اپنا مقام بنالیا۔ سب کی ضرورت بن گیا۔ پھر رفتہ رفتہ عادت میں تبدیل ہو گیا۔ بہو نے بیچ کے کمرے میں ٹی وی ایسی جگہ پر رکھوایا تھا کہ باورچی خانے سے وہ ٹی وی کو دیکھ سکے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مولوی صاحب لیٹتے تو ساس، بہو، بچیوں کو گود میں لے کر ٹی وی کے سامنے اس طرح بیٹھ جاتیں، جیسے وعظ سننے بیٹھی ہوں۔ مولوی صاحب بھی صبح و شام بلاناغہ بی بی سی سننے کے عادی ہو گئے تھے۔ ویسے صبح ٹی وی کو جگانے کا کام چھوٹی اور بڑی ہی کیا کرتی تھیں۔ دینی مدرسے سے لوٹتے ہی وہ ٹی وی کا سوئچ آن کرتیں۔ ان کی دلچسپی کسی خاص پروگرام میں نہیں رہی۔ انہیں تو صرف اشتہار دیکھنے اور سننے میں لطف آتا تھا۔ ان اشتہاروں کی دھنیں، بول، گیت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے انہیں زبانی یاد ہو جاتے تھے، پھر وہ جب کبھی مولوی صاحب کو شہر یا تعلقے کا رخ کرتے دیکھتیں تو اشتہاروں میں دیکھی ہوئی چیزوں کی فرمائش کرتیں۔ جو کبھی کبھی ضد کی شکل اختیار کر لیتیں۔ گھر میں آئے دن نئی نئی قسم کے صابن، تیل، ٹوتھ پیسٹ نظر آنے لگے۔ باورچی خانے سے روز نئی طرح کی خوشبوئیں اٹھنے لگیں۔ ٹی وی کے سکھائے ہوئے پکوانوں کے بدلتے ذائقے زبان پر چڑھنے لگے۔ اخراجات بڑھنے لگے۔ ضرورتوں کے پر نکل آئے۔ گھر کا بجٹ گڑبڑانے لگا۔ مولوی صاحب اہل خانہ کے لیے یہ بوجھ اٹھانے تیار تھے۔ پر چند باتیں ان کو ناگوار گذر رہی تھیں۔ جن سے وہ جھنجھلا اٹھتے تھے۔ گھر کا بدلتا ماحول دیکھ کر ان کی طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہونے لگا تھا۔

گھر کے مناظر بدل رہے تھے۔ پہلے پوتیاں استاد شاگرد کا کھیل کھیلتی تھیں۔ تلفظ اور الفاظ کی خاطر تکراریں ہوتی تھیں۔ دادی کے گہنے اور دادا کی کتابوں کے لیے زبانی جھڑپ ہوتی تھی۔ آج کل ڈھیسوں ڈھیسوں کی آواز کے ساتھ مکے بازی ہوتی ہے۔ لکڑی کے ٹکڑے سے نشانہ لگا کر ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں نکالی جا رہی ہیں۔ پہلے بہو اور بیگم بچیوں کی باتوں سے لوٹ پوٹ ہو کر آنکھیں نم کرتی نظر آتی تھیں۔ اب ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر آنکھیں خراب کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک دن مولوی صاحب بھی ٹی وی کے پھندے میں پھنس گئے۔ کوئی پرانی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بیگم کے اصرار پر بیٹھ گئے۔ فلم دیکھی ہوئی تھی۔ جوانی میں۔ شہر کے سنیما گھر میں لگی تھی۔ مولوی صاحب بیگم کو برقعہ پہنا کر لے گئے تھے۔ پرانی فلم، پاس میں بیگم۔ مولوی صاحب فلم میں اتنے محو ہوئے کہ مغرب کا خیال نہ رہا۔ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے محروم رہ گئے۔ انہیں بہت ملال ہوا۔ وہ ٹی وی سے کترانے لگے۔

ان دنوں ایسی کئی ضربیں انہوں نے جھیلی تھیں۔ مگر آج کا گھاؤ بڑا گہرا تھا۔

صبح مولوی صاحب مطالعے میں مصروف تھے۔ پوتیاں مدرسے سے لوٹ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ناشتہ کر رہی تھیں۔ آج مدرسہ چھٹنے کے وقت استاد نے کہا تھا۔ بچو ہم کل آپ کو کربلا کا واقعہ سنائیں گے ناشتہ کرتے کرتے بڑی کو وہ بات یاد آ گئی۔ وہ اٹھی۔ چھوٹی بھی پیچھے ہو لی۔ دونوں نے مولوی صاحب کو گھیر لیا۔ بڑی نے پوچھا۔

دادا جی، دادا جی۔ کربلا کیا ہوتا ہے؟

مولوی صاحب نے کتاب سے نظریں ہٹائیں۔ دونوں کو دیکھا، سوچنے لگے کن لفظوں میں بات کی جائے۔ چھوٹی کو بے صبری تھی۔ اس نے مولوی صاحب کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

کہیے نا، یہ کیسا ہوتا ہے؟

مولوی صاحب نے لفظوں کو چنا۔ چھوٹے چھوٹے جملے تراشے۔ واقعہ کہنا شروع کیا۔ ابھی دو جملے بھی مکمل نہیں کر پائے تھے کہ پوتیاں پھر ہو گئیں۔ مولوی صاحب چونکے۔ دیکھا۔ دونوں بیچ کے کمرے میں کولھے آگے پیچھے ہلاتے ہوئے ایک ہاتھ منہ کے پاس لے کر ناچ رہی تھیں۔ ٹی وی پر ایک اشتہاری گیت زوروں سے بج رہا تھا۔

..... مستیاں مستیاں چھائیں ... بارشیں بارشیں چھائیں..

... کوکوکولا... کوکوکولا.....

پوتیوں کا رقص دیکھ کر مولوی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ نماز میں بھی مولوی صاحب کو بار بار یہ بات پریشان کر رہی تھی۔ وہ نماز سے فارغ ہوئے مسجد سے باہر آئے۔ دل اداس تھا۔ وہ گھر نہیں گئے۔ چائے پینے بازار کی طرف مڑ گئے۔

مولوی صاحب کے مسجد جاتے ہی بیگم بیچ کے کمرے میں آئیں۔ بہو اور ساس نے اپنی اپنی جانمازیں بچھائیں۔ نماز کے لیے تیار ہو کر تکبیر کہی اور نماز شروع کر دی۔ پہلی رکعت کی قرأت جاری تھی کہ بچیاں بھی آ گئیں۔ بڑی دادی کے بازو اور چھوٹی ماں کے پاس بیٹھ کر ماں کی نقل کرنے لگی۔ پہلی رکعت کی قرأت رکوع اور سجدوں کے دوران وہ

(باقی صفحہ ۳۸ پر دیکھیے)



شمیم قاسمی

نیا کچھ کر دکھانا چاہتی ہے
یہ ساعت آزمانا چاہتی ہے

مری دہلیز بھی میرا دیا بھی
ہوا باہر سے آنا چاہتی ہے

درندے ہوگئے سیراب لیکن
وہ لڑکی مسکرانا چاہتی ہے

دروں کے نام پر تازہ ہوا تو
مری دیوار ڈھانا چاہتی ہے

غزل کی ایک اک رگ سے ہوں واقف
دوانی ہے دوانا چاہتی ہے

● Qutbuddin Lane,
Patna - 4 (Bihar)



شہپر رسول

ہنستے ہوئے حروف میں جس کو ادا کروں
بچوں سے کس جہاں کی کہانی کہا کروں

قدموں میں کس کے ڈال دوں، یہ نام، یہ نسب
کچھ تو بتاؤ کس کا قصیدہ پڑھا کروں

یارب! عذاب حرف و تخیل سے دے نجات
غزلیں کہا کروں نہ مضامیں لکھا کروں

اب تک تو اپنے آپ سے پیچھا نہ چھٹ سکا
ممکن ہے کل سے آپ کے حق میں دعا کروں

کتنی نئی زبان ہو کیسا نیا سخن
اس عہد کو تو دیکھ لوں غالب کو کیا کروں

شہپر مری حدوں کا تعین کرے کوئی
آنکھوں سے بہہ رہوں کہ رگوں میں پھرا کروں

● Dept. of Urdu, Jamia Millia
Islamia, New Delhi - 110025



ریاض لطیف

حصار کے سبھی نظام گرد گرد ہوگئے
ہم اپنے اپنے جسم میں خلا نورد ہوگئے

روانیاں صفر ہوئیں، مسافتیں کھنڈر ہوئیں
نجات کے تمام شاہکار سرد ہوگئے

ہوائے جاں کا کیا میاں، اٹھا گئی، اڑا گئی!
جمے نہ تھے بدن میں ہم کہ پھر سے گرد ہوگئے

عبارتوں میں آبسی عجیب رت سکوت کی
قلم کی شاخ کے تمام برگ زرد ہوگئے

نہ پوچھ ہم سے کیا ہوا، حیات کا، ریاض کا
دوام چھو گیا انہیں تو گرد گرد ہوگئے

● 74 - Dandi Girah Ki Pol,
Kalupur - Ahmadabad - 380001

علی حیدر ملک

A - 2, Block - N, North Nazimabad,
Karachi - 74700 (Pak)

ادب اور تدریس ادب

ادب کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیلنج درپیش رہا ہے۔ کبھی مذہب کی طرف سے، کبھی اقتدار کی طرف سے، کبھی سماج کی طرف سے اور کبھی سائنس کی طرف سے لیکن ادب نے اب تک ہر چیلنج کا سامنا کیا اور اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے۔ پرانے اور خارجی چیلنجوں کے بعد اب اسے ایک نئے داخلی چیلنج کا سامنا ہے۔ اور یہ چیلنج ہے تدریس ادب کی جانب سے۔

جنوبی ایشیا میں ادب خصوصاً اردو ادب کی تعلیم و تدریس جس انداز میں ہو رہی ہے وہ کسی طرح اطمینان بخش نہیں ہے بلکہ اسے بہ آسانی غیر معیاری اور گمراہ کن قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو نصاب سے متعلق ہے جبکہ دوسرا پہلو تدریس سے تعلق رکھتا ہے۔ ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور جامعاتی سطح پر جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ یہ معیاری، متوازن اور ادب کی صحیح آئینہ دار نہیں ہیں۔ ثانوی درجے سے پوسٹ گریجویٹ سطح تک کے نصاب میں ربط، ہم آہنگی اور تسلسل مفقود ہے۔ کہیں مصنف ہی غیر اہم اور غیر نمائندہ ہے اور کہیں مصنف کا وہ نثری یا شعری فن پارہ غیر اہم اور غیر نمائندہ ہے جو کہ نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف درجوں میں شامل مضامین میں اکثر تکرار بھی نظر آتی ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنے مضمون "اردو ادب اور شعبہ اردو" میں خیال ظاہر کیا ہے کہ۔

> "عام طور پر اردو کی نصابی کتابوں سے طلبہ کے ذہن میں جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اردو ادب نثر میں حالی اور شبلی پر ختم ہو جاتا ہے اور شاعری میں اقبال پر۔ اس کے بعد جو کچھ آج کل کے رسالوں اور کتابوں میں نظر آتا ہے وہ نا قابل اعتنا ہے۔ اس قسم کے تاثر یا خیال سے خود اردو لیکچراروں کی اکثریت کے ذہن خالی نہیں۔ اردو کے طالب علموں کو انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔ اے تک کسی منزل میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ حالی، شبلی اور اقبال کے بعد اردو شعر و ادب میں کیا کچھ ہوا۔ موجودہ اردو ادب کا مغربی ادب سے کیا رشتہ ہے۔ میرا جی اور ن۔ م۔ راشد جیسے شاعر کیوں پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے مصرعوں والی نظم شاعری کی کون سی قسم ہے اور اسے کس طرح پڑھنا چاہیے۔ نذیر احمد اور قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں کیا فرق ہے۔ حالی اور حسن عسکری کی تنقیدیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں یا نہیں۔ یہ اور اس قسم کے کتنے ہی سوالات سے اردو میں ایم۔ اے کرنے والوں کو واقف ہونا چاہیے۔ لیکن میں یونیورسٹی کے ایسے اساتذہ کو جانتا ہوں جو خود ان سوالات سے ناآشنا ہیں۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔"

نظیر صدیقی کا یہ مضمون بہت پہلے لکھا گیا تھا۔ اس اثناء میں یہ خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ اقبال کے بعد فیض، راشد، ناصر کاظمی اور شبلی کے بعد قرۃ العین حیدر خدیجہ مستور اور غلام عباس وغیرہ کو بھی شامل نصاب کر لیا گیا ہے لیکن اکثر جامعات میں علم عروض کسی بھی درجے پر نصاب میں شامل نہیں ہے جس کے باعث طلبہ بحر، وزن اور تقطیع سے بالکل نابلد نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ پابند نظم کی مختلف ہیئتوں، نظم آزاد اور نظم معریٰ کے درمیان تفریق کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ نثری نظم کا معاملہ تو بہت بعد اور بہت دور کا ہے۔

نصاب کے بعد اس مسئلے کا دوسرا پہلو تدریس ہے جس کی ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ اساتذہ کا تقرر ہمارے یہاں سرکاری تعلیمی اداروں میں سفارش اور سیاسی بنیادوں پر ہوتا ہے اس لیے بیشتر اساتذہ نا اہلی یا کم اہلی کے باوجود استاد کے منصب پر فائز ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک نجی تعلیمی اداروں کا تعلق ہے تو ان میں بھی اہلیت کے بجائے مالی مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور جو امیدوار کم تنخواہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اسی کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔

اس وقت اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس نے برسوں سے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ وہ ہر کام کرتے ہیں مگر کتاب یا رسالے کے مطالعے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ عہدے اور گریڈ میں ترقی چونکہ سنیارٹی کی بنیاد پر ہوتی ہے اس لیے ان کی ترقی بھی ہوتی رہتی ہے۔ کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ اتنے دنوں میں آپ نے کیا پڑھا اور کیا پڑھایا۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ۔

> "صحیح تعلیم کے لیے صحیح نصاب پہلی ضرورت ہے لیکن صحیح تعلیم اس وقت تک ممکن نہ ہو گی جب تک صحیح نصاب کے ساتھ ساتھ

صحیح معلم موجود نہ ہوں خصوصاً یونیورسٹیوں میں۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ صحیح نصاب کون تیار کرے گا اور صحیح معلم کا انتخاب کس طرح عمل میں آئے گا؟ یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ اس گئے گزرے وقت میں بھی طلبہ کی ایک معقول تعداد ایسی پائی جاتی ہے جو پڑھنے لکھنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ ایسے طلبہ اچھے اور برے استاد میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اچھے استاد کی کلاس سے غیر حاضر نہیں رہتے اور اس سے کمرۂ جماعت میں اور کمرۂ جماعت سے باہر بھی استفادے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ ایسے اساتذہ جو شعر افسانہ یا مضمون وغیرہ لکھتے ہیں ضروری نہیں کہ اچھے استاد بھی ہوں۔ معلمی کا پیشہ ایک الگ صلاحیت اور الگ طرز زندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ وہ اساتذہ جو شاعر یا ادیب نہیں ہیں اپنے مضمون پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور بہ حیثیت معلم بے حد کامیاب ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو شعر و افسانہ لکھتے یا مضمون نگاری کرتے ہیں معلم کی حیثیت سے ناکام ہیں اور اچھی شہرت نہیں رکھتے۔ ادب کی تعلیم و تدریس کا شعبہ انتہائی مایوس کن اور تشویشناک ہے لیکن اس مسئلے کی طرف سے بھی ہم بہت سے دوسرے قومی نوعیت کے سنگین مسائل کی طرح چشم پوشی کررہے ہیں۔ یہ اس چشم پوشی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس مسئلے پر نہ تو کہیں کوئی مذاکرہ ہوتا ہے اور نہ کسی اخبار رسالے میں اس پر کوئی مضمون نظر آتا ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی کا مضمون "اردو ادب اور شعبۂ اردو" شاید اس موضوع پر شائع ہونے والا واحد مضمون ہے۔ اور اس لحاظ سے اہمیت کا حامل بھی ہے لیکن جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے۔

"اردو ادب اور شعبۂ اردو میں پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کی کوتاہیوں کی نشاندہی اصل مقصود نہیں بلکہ اس میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ادب کی تخلیق اور ادب کی تدریس کے درمیان کچھ اس طرح کا رابطہ ہونا چاہیے جیسا کہ مثال کے طور پر کیمبرج یونیورسٹی میں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" (حرف اوّل۔ اردو ادب کے مغربی دریچے) ◆◆

بقیہ صفحہ ۱۷ : ہرفن مولا

"کیا نہیں بچا ہوگا، ذرا مکمل کر کہو۔"

"صاحب رات کے وقت بیوی سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ کئی دنوں سے گھر والے سو نہیں سکے ہیں۔ ہر طرف اسلحہ بردار دندناتے پھر رہے ہیں، گھروں میں گھس جاتے ہیں، راشن پانی بھی تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ بیوی تو اب رو بھی نہیں پا رہی تھی۔ اس نے۔ اس نے حق مہر بھی ہم کو معاف کر دیا ہے۔"

"میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے پھر آزاد کی آواز سنائی دی۔

"اب تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے مگر کوئی اٹھاتا ہی نہیں۔"

میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے کرسی کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ لیا کیونکہ کمرہ بڑی تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ ◆◆

بقیہ صفحہ ۲۵ : غبار دیکھتے رہے

خاموشی سے تقلید کرتی رہی۔ مگر دوسری رکعت کی قرأت کے لیے ماں نے سورہ فاتحہ شروع کی ہی تھی کہ چھوٹی نے بھی اپنی قرأت میں مدرسے کی سکھائی ہوئی دعائیں توتلی آواز میں دہرانی شروع کر دیں۔ دعاؤں کا ذخیرہ ختم ہوا تو وہ کچھ کچھ بڑبڑاتی رہی اور پھر اس کی زبان پر ایک گیت چڑھ گیا۔ اس نے گانا شروع کیا۔

اے۔ کیا بولتی تو۔
کیا میں بولوں
سن
سنا
آتی کیا کھنڈالا
کیا کروں آکے میں کھنڈالا
جھومیں گے، ناچیں گے، گائیں گے، عیش کریں گے۔ اور

ماں اور دادی ہنس پڑیں۔ نماز ٹوٹ گئی۔ دونوں ہنس ہنس کر بے حال ہو گئیں۔ پیٹ میں بل پڑ گئے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چھوٹی کو گود میں لے کر چوم چوم کر اس کے رخسار سرخ کر دیے۔ بار بار اس کی حرکت کو دہرا کر، ہنستے ہنستے مولوی صاحب کا انتظار کرنے لگیں۔

مولوی صاحب آئے۔ دونوں نے چہک چہک کر چھوٹی بچی کا قصہ سنایا۔ مولوی صاحب حواس باختہ ہو گئے۔ ذہن سن پڑ گیا۔ وہ بے حس ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔

چند لمحوں بعد جب دماغ سوچنے کے قابل ہو گیا، تو وہ سنبھل گئے۔ فیصلہ کن انداز میں اٹھے۔ ان کے منہ سے ہلکے سے آواز نکلی۔ یا علی.. انہوں نے جھٹکے سے زور لگایا۔ ساس، بہو کو ٹی وی مولوی صاحب کے سر پر نظر آیا۔

مولوی صاحب سر پر ٹی وی لیے ہوئے مڑے۔ آنگن کا دروازہ



راهی فدوائی

تقوئ جہل کو کچھ ہوس چاہیے
باغِ جنت میں بھی خار و خس چاہیے
جلسۂ اعتراف ادب پروری
ایک دو سال کیا ؟ ہر برس چاہیے
سیلِ آلام و طوفان کرب و بلا
خفتہ قوموں کی خاطر جرس چاہیے
آدمی کے لیے علم کافی نہیں ـــــ
آدمیت پہ بھی دسترس چاہیے
اک مگس ہی پہ موقوف ہے شہد کیا
سینۂ گل میں پاکیزہ رس چاہیے
آتشِ ابتلا سے پگھل جائیں گے
مومیائی عزائم کو جس چاہیے
دم بہ دم نعمتِ زیست حاصل ہمیں
پھر تو شکرِ خدا ہر نفس چاہیے
صید احساس مظلومیت زندہ باد
آشیانہ بہ رنگ قفس چاہیے
اس تماشہ گہہ زندگی کے لئے ـــــ
خرس و خر اور فیل و فرس چاہیے
رگ حمیت کی پھڑکی نہیں راهیا
جسم میں کچھ تو غیرت کی نس چاہیے

● 6/184, Burhanuddin Street,
Cuddapah - 516001 (A.P.)



رفیق راز

پھیلی ہوئی ہے چار طرف گرد مہر و ماہ
روشن ہے میری آتشِ حیرت سے جلوہ گاہ
جل کر ہوا ہوں راکھ میں اپنے ہی دھیان میں
منظر تمام دھیان میں کس کے ہوئے تباہ
پانی سرابِ فکر کی موجوں سے دستیاب
سایہ کئے ہوئے ہے مسافر پہ گرد راہ
پہلے وہ برگ سبز ہوا خشک پھر گرا
پھر لی ہوائے سخت کی آغوش میں پناہ
بارش اثر کی آئے گی تاخیر سے میاں
ہفت آسماں کے سیر کو نکلی ہے میری آہ
نازل ہوا ہے شہر پہ موسم عذاب کا
لکھا گیا تھا چہرۂ معصوم پر گناہ
میرے خیال میں تو میرا ہی خیال ہے
ہوتا نہیں ہے پھر بھی ترے ساتھ کیوں نباہ
تیری ہی خواہشوں کا اجالا ہے آنکھ میں
لرزاں ہے خوف سے یہ ترا نور خواہ مخواہ
سوچوں رفیق راز تو خورشید سوچ کو
یہ کائنات کیا ہے بس اک نقطہ سیاہ

● Radio Kashmir, Srinagar (J&K)



خالد عبادی

پیار میں ایسی رواداری ہے
کھل کے دیکھو تو چمن ساری ہے
موجۂ خون میں جلتی بجھتی
غیرت سوز کی چنگاری ہے
خوش معاشی کے لئے عشق شعار
زیست بے کاری ہی بے کاری ہے
اب نہیں کوئی اٹھانے والا
پھول پتھر پہ بہت بھاری ہے
زخم کے پاس کوئی زخم نیا
کس بلندی پہ یہ ہمواری ہے
شب صحرا میں تلاش ہم جنس
اور تادور سکوں کاری ہے
سرگرانی ہے اگر تاک زدہ
شعر کہنے کا عمل جاری ہے

● 2 - Netaji Marg,
Patna - 800001 (Bihar)



شام بار کپوری

Picture Palace Khulna (Bangladesh)

انسان

زینب میرے آفس میں کام کی تلاش میں آئی تھی۔ پینتیس برس کی سانولی رنگت کی اس عورت کے چہرے پر ایک تناؤ سا تھا جو کسی کرب کی علامت تھا۔ گردشِ زمانہ نے اس کے خدوخال میں تبدیلی پیدا کردی تھی۔

"صاحب! کوئی کام ملے گا؟" اس کے ملتجیانہ لہجے میں افلاس کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔

"آفس میں تم کیا کام کروگی۔ یہاں تو چپراسی اور کلرک نوکری کرتے ہیں تمہارے لائق کوئی کام نہیں ہے۔"

"کوئی بھی کام دے دیجئے۔ میں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" اس کی گفتگو میں شائستگی تھی۔ لگتا تھا کہ کبھی اس نے زندگی کے اچھے دن گزارے تھے اب بے بس ہو کر مجبوری کی جھولی پھیلائے نوکری کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ مجھے اس ستم زدہ عورت پر ترس آرہا تھا۔

"یہاں عورتوں کے لیے کوئی کام کاج نہیں ہے۔"

اچانک مجھے یاد آیا کہ چند روز قبل گھر کی ملازمہ کام چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میری بیوی نئی نوکرانی کی تلاش میں تھی۔

"میرے گھر پر ایک ملازمہ کی ضرورت ہے، اگر تم چاہو تو....."

"بالکل صاحب! آپ حکم کریں۔ میں آج ہی سے کام کرنا شروع کردوں۔" اس کے چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی جیسے اچانک اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

"کل صبح تم میرے گھر آجانا۔" میں نے اسے اپنے گھر کا پتا بتادیا۔

وہ خوشی خوشی چلی گئی۔ رات کو میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر کیا۔ پرانی ملازمہ کے کام چھوڑنے سے بیوی کی مصروفیت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ نئی ملازمہ کی خبر سن کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

صبح میں ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ برآمدے میں نظر آئی۔ میں نے اسے اندر بلوایا۔ اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ کلکاریاں مار رہا تھا۔ میں نے اسے بیوی سے ملوایا۔

"گھر کے اوپری کام کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ صفائی، سلیقے اور مستعدی سے کام کرنا ہوگا۔ کسی دن چھٹی نہیں ملے گی۔" بیوی اسے کام کی تفصیل بتانے لگی۔ "دوپہر کا کھانا میرے گھر کھاؤ گی۔"

"بی بی جی! بے فکر رہیں۔ آپ کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی۔" خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

"تم رہتی کہاں ہو؟ میرا مطلب رہائش سے ہے۔" بیوی اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کرنا چاہتی تھی۔

"خالص پور کے محصور پاکستانیوں کے کیمپ میں رہتی ہوں۔" یہ کہتے کہتے وہ کچھ اداس سی ہوگئی۔

"تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"میرے شوہر سارا دن کیمپ میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ وہ پہلے جوٹ مل میں نوکری کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ ہزاروں بہاریوں کے ساتھ انہیں بھی برطرف کردیا گیا۔ جنوری ۷۲ء میں خالص پور میں تیس ہزار غیر بنگالیوں کا قتل عام ہوا تھا، اس کے بعد سے ان کا ذہنی توازن کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ کچھ چڑچڑے بھی ہوگئے ہیں۔ بیکار لوہا جب زنگ آلود ہو جاتا ہے تو کسی کام کا نہیں رہتا۔ بات بات پر مجھے جھڑکتے رہتے ہیں۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ کلیرنس آئے گا ہم لوگ پاکستان چلے جائیں گے۔" کئی سال ہوگئے، ان کے خواب کی کوئی تعبیر نظر نہیں آئی۔ جب میں اس بارے میں کچھ کہتی ہوں تو ان کے سپنے بکھر جاتے ہیں۔ مجھے مارنے پیٹنے لگتے ہیں۔ سات آٹھ سال ہوگئے ہم لوگ اسی طرح تسلی کی لوریوں سے بہلائے جارہے ہیں۔"

"کیمپ میں اور کون کون ہے؟" بیوی نے پورا اطمینان کرلینے کی ٹھان رکھی تھی۔

"شوہر اور اس لختِ جگر کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ شوہر کیمپ کی کوٹھری میں ردی کی ٹوکری کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ ہفتے میں ریلیف سے چند چھٹانک گیہوں ملتا ہے جس سے پیٹ کا دوزخ نہیں بھرتا۔ شروع شروع میں بھکارن بنی محلے محلے سبھوں کے سامنے جھولی پھیلائے بھیک مانگا کرتی تھی لوگوں کی للچائی نظریں میرے جسم کو چھلنی چھلنی کرنے لگیں تو

مجھے اپنی عزت خطرے میں نظر آئی۔ اس لئے کاسہ گدائی پھینک کر کیمپ میں محصور ہو گئی۔ بھوک ایسی بیماری ہے جو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ چنانچہ نوکری کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتی رہی۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

اس کی المناک داستان سن کر مجھے اپنے سینے میں درد کی ٹیس اُٹھتی محسوس ہوئی اس کی آپ بیتی سے بیوی بھی ملول ہو گئی تھی۔ میں بریف کیس لئے آفس جانے کے لئے گھر سے نکل پڑا۔

زینب برتن مانجھنے، کپڑے دھونے، مسالہ پیسنے اور "پوچھا" لگانے کے کام پر مامور تھی۔ بیوی نے اسے پڑوس میں بھی کام پر لگا دیا تھا۔ وہ محنت مشقت کرنے سے بالکل نہیں جھجکتی تھی۔ دلجمعی اور خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دیتی۔ کسی کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی آنے کا موقع نہیں دیتی۔ اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اس کے کام اور برتاؤ سے مطمئن تھے۔ وہ بچے کو زمین پر لٹا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ بچہ گھٹنوں کے بل چل چل کر اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا اور وہ بڑے اطمینان سے اپنے کام میں منہمک رہتی۔

ماہ و سال بیت گئے۔ زندگی اپنے محور پر گھومتی رہی۔ اب اس کا بچہ لڑکھڑا کر چلنا سیکھ گیا تھا۔ سارے گھر میں وہ چھوٹے چھوٹے پیروں سے گھومتا رہتا اور زینب حسب معمول اپنے کام میں تندہی سے لگی رہتی

چھٹی کا دن تھا۔ میں گھر پر آرام کر رہا تھا۔ بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ اچانک زینب روتی پیٹتی گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اسے اس حال میں دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

"صاحب! میرا بچہ گم ہو گیا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔

"کیسے؟ اور کہاں گم ہوا؟"

"صبح یہاں آنے سے پہلے میں دوسرے محلے میں ایک اور گھر میں بھی کام کرتی ہوں۔ آج اس گھر میں اپنے کام نپٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں، میرا بچہ کب اپنے نازک پاؤں سے چلتا ہوا گھر کے باہر نکل گیا۔ جب میں اپنے کام سے فارغ ہوئی تو اس کا کہیں بھی پتا نہ تھا۔ ہر جگہ اسے تلاش کیا۔ گھر والے بھی میری وجہ سے پریشان تھے۔ انہوں نے بھی اسے تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ادھر وہ لوگ تھانے میں رپورٹ درج کرانے گئے ہیں اور میں آپ کو اطلاع دینے چلی آئی ہوں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "میری زندگی کا آخری سہارا! اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں بے موت مر جاؤں گی۔"

"تم نے دوسرے محلے میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ ان دنوں بچوں کا اغوا بھی بہت ہو رہا ہے۔" اسے مصیبت زدہ دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔

"میرے بچے کے لئے آپ بھی کچھ کریں نا؟" وہ گڑگڑا کر بولی۔ اس کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اسے غمگین دیکھ کر میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے۔ اس کے بچے کی گمشدگی سے میں بے چین ہو گیا۔ جو لباس میں پہنے تھا، اسی میں ملبوس، پاؤں میں چپل ڈالے اس کے ساتھ گھر سے نکل پڑا۔

محلے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ محلے والے بھی بچے کی گمشدگی سے پریشان تھے۔ تگ و دو جاری تھی۔ تھانے میں رپورٹ لکھوادی گئی تھی۔ میں نے اخبار کے دفتر میں بچے کی گمشدگی کی خبر چھپوانے کے لئے فون کر دیا۔

وہ غم سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے دل پر چرکے پر چرکے لگ رہے تھے، مگر وہ ہر غم سہے جا رہی تھی۔ قدرت نے اس کی قسمت میں پریشانیاں لکھ دی تھیں۔ وہ صاحب خانہ کے برآمدے میں بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی اور اپنے مقدر کو کوس رہی تھی۔ اس کی زندگی میں حادثات پے درپے کسی عفریت کی طرح نازل ہو رہے تھے۔ اس کی بے بسی پر مجھے بھی صدمہ ہوا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن میں آفس میں فائیلوں سے نپٹ رہا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح سینہ کوبی کرتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ اسے پریشان حال دیکھ کر میں ایک بار پھر گھبرا گیا۔ اس کی آہ و زاری سے دفتر کا عملہ اس کے اردگرد جمع ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟"

"صاحب! میرا منا..." آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔

"کیا ہوا تمہارے منا کو؟ کیا مل گیا؟" اندھیرے میں مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔

"وہ اپنی دکھیاری ماں کو اس دنیا میں تنہا کر گیا۔" وہ بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔

اس دردناک خبر سے میرے دل کو دھچکا لگا۔ تمام اسٹاف اظہار افسوس کرنے لگا۔ میں اسے اپنے ساتھ لئے دفتر کے باہر نکلا۔ وہ غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی بمشکل چل پا رہی تھی۔ غم و اندوہ سے اس کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔

دوسرے محلے کی کراسنگ پر لوگوں کا جم غفیر دیکھا۔ چند پولس والے بھی کھڑے تھے۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر گھسا۔ مین ہول کے پاس بچے کی مسخ شدہ لاش پڑی تھی۔ تعفن سے فضا مکدر ہو رہی تھی۔ لاش کے قریب مہتر کھڑا تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"بابوجی! آج صبح میں مین ہول کا نالا صاف کرنے آیا تو اندر سے اس بچے کی لاش ملی۔ ..."

"مین ہول کا ڈھکن کیا ہوا؟" میں نے ڈھکن کی تلاش میں آس پاس نظر دوڑائی۔

"بابوجی! آپ کو معلوم نہیں۔ دیش میں مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ لوہے کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے۔ چوروں نے رات کو مین ہول کے ڈھکن چوری کر کے بیچنا شروع کر دیا ہے۔ سارے شہر میں ایک بھی مین ہول کا ڈھکن نہیں ہے۔"

زینب بچے کی لاش کے پاس بیٹھی بین کر رہی تھی۔ اسے غش پر غش آرہا تھا۔ ماں کے لخت جگر کی المناک موت سے ہر شخص سوگوار تھا۔ فضا میں حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔

محلے والے بچے کی لاش قبرستان لے جانے کے لئے اٹھانے لگے تو وہ بیقرار ہو کر اپنے مردہ بچے سے لپٹ گئی۔ لوگوں نے بمشکل اسے لاش سے الگ کیا۔ وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ جنازے میں شریک تھا۔

اس دلدوز سانحے کے بعد اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ نہ کسی سے بات کرتی تھی، نہ وقت پر کھاتی تھی۔ ہر شخص کی طرف کھوئی کھوئی نگاہوں سے ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی۔ آنکھوں میں کرب کا سمندر نظر آتا۔ اسے اندر ہی اندر بچے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ سینے پر صبر کی سل رکھے وہ نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔

کئی ہفتوں کی ذہنی کشمکش کے بعد اس کی حالت اعتدال پر آتی نظر آئی۔ لیکن کبھی کبھی اچانک کبھی کبھی اس طرح چونک پڑتی جیسے خلا میں کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ بظاہر وہ روزمرہ کا کام کرتی تھی، مگر گم صم رہتی۔ جذبات سے عاری اس کا وجود پتھر جیسا ہوتا جا رہا تھا۔

میری بیوی ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تاکہ اس کے سینے سے غم کا پہاڑ ہٹ جائے۔ وقت کا مرہم ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ بے دلی سے کام میں جٹی رہتی۔ اس کے دل میں نہ کوئی امنگ تھی اور نہ آرزو۔ صرف گھڑی کے کانٹے کی طرح زندگی کے محور پر گھوم رہی تھی۔

ایک دن اسے کچھ نارمل دیکھا۔ خلاف توقع وہ بیوی سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ میری بیوی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

"اچھا زینب! یہ بتاؤ کہ رات کو جب تم اپنے کیمپ واپس جاتی ہو تو شوہر سے کوئی تکرار وغیرہ تو نہیں ہوتی کیونکہ ان کے علاوہ تمہارا اب اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔"

"نہیں بی بی جی! ایسا نہ کہیں۔ میری ایک اور بھی اولاد ہے۔" وہ کھوئی کھوئی سی خلا میں گھورنے لگی جیسے یادوں کی شمع فروزاں کر رہی ہو۔

"میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارا صرف ایک ہی بچہ تھا۔ تم نے پہلے اس کا اظہار بھی کیا تھا کہ کیمپ میں شوہر اور بچے کے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

"...... ۱۹۷۱ء میں میری دو جوان بیٹیاں اور ایک گود کا بچہ تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی ۷۱ء کے دوران کر دی تھی۔ جنوری ۷۲ء میں ظلم اور بربریت قہر بن کر نازل ہوئی مقامی لوگوں نے خالص پور کے غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس میں میری بیاہتا بیٹی بلوائیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔" کرب سے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر غم کی لہریں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔

"جنوری ۷۲ء کا وہ واقعہ جس میں تیس ہزار بہاری تہہ تیغ کر دیے گئے تھے۔" میری یادداشت کی لو تیز ہو گئی۔ وہ دلخراش سانحہ میں اب تک بھول نہ سکا تھا۔

خالص پور صنعتی علاقہ ہے۔ زیادہ تر بہاری مزدوری کرتے تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد جنوری ۷۲ء میں ایک بہاری کے گھر کے سامنے ایک لاش پھینک دی گئی، جس کا سر تن سے جدا تھا۔ دھڑ بے یار و مددگار فریاد کر رہا تھا۔ بلوائیوں نے اس لاش کو بنگالی بنا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا کہ بہاریوں نے قتل کیا ہے۔ اس طرح قتل عام کا جواز پیدا کیا گیا تھا۔

"بی بی جی۔ وہ رات کسی قیامت سے کم نہیں تھی جو ہم پر گزری۔ بہاری مزدوروں سے ملیں خالی کروانے کے لیے غنڈوں، پارٹی ورکروں، اور مقامی مزدوروں نے مل کر کالونی میں دھاوا بول دیا۔ ہزاروں بہاریوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ میری بڑی بیٹی کی آبروریزی کی گئی۔ پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ میری گود کے بچے کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر کاغذ کی طرح پھاڑ دیا۔ میں انہیں دہائی دیتی ہوئی بڑی مشکل سے ایک دوسرے گھر میں پناہ لے پائی۔ میرے شوہر کی جان ان کے ایک بنگالی دوست نے بچائی۔ چھوٹی بیٹی کو محلے کے ایک شریف آدمی نے اپنی بیٹی بنا کر اس کی زندگی کی حفاظت کی۔ داماد باہر گیا ہوا تھا، اس لیے اس کی جان بچ گئی۔ اس واقعہ کے تصور سے اب بھی میرا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ ہزاروں بے گناہ جانیں گئیں۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ چھوٹی بیٹی بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ حالات ناسازگار تھے۔ کسی کی بھی عزت محفوظ نہ تھی۔ انھیں جان لیوا حالات کی وجہ سے چھوٹی بیٹی کی شادی کر دی۔ ۷۴ء کے تبادلہ آبادی میں پاکستان سے داماد کا کلیرنس آگیا تھا۔ چنانچہ وہ میری بیٹی کو لے کر پاکستان چلا گیا۔ جب سے ہم لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اس دھرتی پر میری تینوں اولادیں پیدا ہوئی تھیں، دو لقمہ اجل ہو گئیں۔"

"تمہارا وہ بچہ جو حال ہی میں حادثے کا شکار ہوا؟" اچانک میری بیوی کو

بچے کی یاد آئی۔
"ڈیڑھ سال قبل وہ پیدا ہوا تھا مگر کسے معلوم تھا کہ وہ بھی اسی طرح میری بد قسمتی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اس کی آپ بیتی سن کر میری بیوی کی پلکیں بھیگ گئیں۔ میں بھی اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے یہ دکھ اس کا نہیں بلکہ ستم زدہ انسانوں پر ڈھائے ہوئے مظالم کا استعارہ تھا۔

زینب پلو سے اپنے آنسو خشک کر کے کام کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ایک دن میں اپنے اسٹینو سے لیٹر لکھوا رہا تھا۔ وہ میرے سامنے سراپا غم بنی آن کھڑی ہوئی۔ زمانے کے تھپیڑوں نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ کانٹے کی طرح سوکھ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ حزن و ملال کا سایہ لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"صاحب! میں ایک ہفتہ کی چھٹی لینے آئی ہوں۔"

"اچانک چھٹی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"میرے شوہر سخت بیمار ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ بی بی جی سے چھٹی منظور کروالی ہے۔ جاتے ہوئے سوچا کہ آپ کو بھی اطلاع دے دوں۔"

"تمہیں اچانک اپنے شوہر کی فکر لاحق کیوں ہو گئی۔ وہ تو تمہیں زدو کوب کرتا رہتا ہے۔"

"وہ میرے مجازی خدا ہیں۔ اچھے برے جیسے بھی ہیں، میرے سر تاج ہیں، انہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ آج صبح بستر مرگ پر چھوڑ آئی ہوں۔ کم از کم آخری وقت میں ان کی خدمت کا موقع ملے گا۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری چھٹی منظور ہے۔ اپنی تنخواہ تو لیتی جاؤ۔" میں اپنی جیب میں بٹوا ٹٹولنے لگا۔

"صاحب! ابھی مہینہ ختم نہیں ہوا ہے۔ مہینہ پورا ہونے میں ایک ہفتہ ہے۔ چھٹی کے بعد آؤں گی۔ تو تنخواہ لے لوں گی۔ میں جلدی میں ہوں۔ معلوم نہیں، میرے شوہر پر کیا بیت رہی ہو گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز سے بولی اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ زینب میں ماں کی ممتا اور شوہر کا پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ وفاشعار اور محبت کا پیکر تھی۔ میں اس کے استقلال، مسلسل بربادی، ہمت اور عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں دفتر کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ میں اپنے کام میں اتنا مشغول رہا کہ کافی دنوں تک اس کی کوئی خبر نہ مل سکی۔

ایک شام برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا ایک عمر رسیدہ شخص بنیائن اور لنگی میں ملبوس میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے خستہ حالی ٹپک رہی تھی۔ زمانے کا ستایا ہوا الگ رہا تھا۔

"کیا کام ہے؟"

"میں زینب کا شوہر ہوں صاحب!" وہ رنجیدہ اور غم زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"زینب کہاں ہے؟ گزشتہ مہینے کی تنخواہ لینے بھی نہیں آئی۔ پڑوسی بھی اس کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔ وہ انہیں بتائے بغیر چلی گئی تھی۔"

"اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ سبھوں کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے اپنے دل میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ بد قسمتی کا ایسا پژمردہ پودا تھی جس میں کبھی بھی خوش نصیبی کے پھول نہیں کھل سکے۔

"چانک اس کا انتقال کیسے ہوا؟ یہاں سے تو اچھی بھلی گئی تھی، تمہاری تیمارداری کرنے کے لیے۔۔۔۔" اس کی ناگہانی موت سے میرے دل پر گھونسا سا لگا تھا۔ بیوی کو یہ روح فرسا خبر کیسے سناؤں گا۔ وہ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ کئی دنوں سے اصرار کر رہی تھی کہ کیمپ میں جا کر معلوم کروں۔ "آخر وہ کام پر کیوں نہیں آ رہی ہے۔

"میں بڑا کم ظرف اور ناکارہ آدمی ہوں۔ اپنی نیک اور وفاشعار بیوی کی قدر نہ کر سکا۔ بیماری سے میں صاحب فراش تھا۔ میرے ہوش و حواس معطل ہو گئے تھے۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ اس نے میری تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ایک صبح کیمپ میں پڑوس کی ایک بڑھیا میری عیادت کو کوٹھری میں داخل ہوئی تو زینب کو میری چارپائی کے قریب بے ہوش پڑی دیکھا۔ اس وقت بھی میں نیم بے ہوشی کی حالت میں اس واقعے سے بے خبر تھا۔ اس کی حالت نازک دیکھ کر بڑھیا کے شوہر اور لڑکے نے اسے رکشا پر بٹھا کر ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہ زندگی اور موت سے نبرد آزما تھی۔ اسے ہائی بلڈ پریشر تھا۔ دوسرے ہی دن ہسپتال میں اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ میں بستر سے اٹھنے کے قابل نہ تھا۔ پھر بھی لوگ مجھے پکڑ دھکڑ ہسپتال لے گئے۔ اسے لاوارث سمجھ کر مردہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کے مردہ جسم پر ایک بھی کپڑا نہ تھا اور نہ ہی گھر میں لاش کو لپیٹ کر لے جانے کے لیے کوئی کپڑا تھا۔ زینب کی ایسی بے بسی کی موت پر میں باؤلا سا ہو گیا۔ میرا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ بیچاری کو زندگی بھر کوئی سکھ نہ دے سکا، سوائے دکھ کے۔ میرے سامنے پڑی اس کی لاش فریاد کر رہی تھی۔ میں مجبور تھا، بے حد مجبور۔ میں اس کی

دردناک موت پر کراہ اٹھا۔ پڑوسی کے لڑکے کو ہدایت کرکے اپنی کوٹھری میں بھیجا بڑی لڑکی کی پرانی ساڑی ٹرنک میں پڑی تھی۔ وہ بے گوروکفن ماری گئی تھی، جیسے موت کے گھاٹ اتار کر دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ نو سال پہلے کی میری مرحومہ بیٹی کی شادی کی پرانی ساڑی ماں کی قبا کے لئے کفن بن گئی..... "وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔

"صبر کرو۔ اِنَّ اللّٰہِ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ "میں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے دلاسا دیا۔

"اسے زندگی بھر دکھ تکلیف کے سوا کچھ نہ ملا جسے زندہ رہنا تھا اسے موت چاٹ گئی اور جس کے دروازے پر موت دستک دے رہی تھی، وہ غموں کی گٹھری اٹھانے کے لیے زندہ رہ گیا۔ "دکھ، درد، کرب، غم سمٹ کر اس کے وجود میں سما گئے تھے۔

زینب کی ناگہانی موت سے مجھے بے حد قلق ہوا۔ میں نے کچھ ٹکے نکال کر اسے دئے۔

"یہ سو ٹکے اس کے چہلم کے لیے ہیں۔ بقیہ رقم اس کی تنخواہ کی ہے۔ دوسرے دن آکر پڑوسیوں سے بھی تنخواہ کی رقم لے جانا۔"

میں زینب کے شوہر کو لڑکھڑاتے قدموں سے جاتا دیکھتا رہا۔

میرے ذہن میں خیالات کے جھکڑ چل رہے تھے۔ میری نگاہوں میں زینب کا معصوم چہرہ گردش کرنے لگا وہ مجبور، بے کس، مفلوک الحال اور غریب الوطن ہونے کے باوجود دنیا کے لئے ایک مثال تھی۔ کائنات کی لامحدود وسعتوں میں ہزاروں، لاکھوں سیاروں کے درمیان اگا ہوا سورج جو اپنی الگ پہچان بنا رہا تھا۔

* *

بقیہ صفحہ ۳۷ : اپنا خون

اور پھونس ساتھ ساتھ دھرا جائے تب کا ہوگا؟ آگ تو لاگے کی نا؟"

"یقیناً"۔ کرنل بڑبڑائے۔

"یعنی کہ آپ مانت ہیں سرکار کی کجری کے دونوں لڑکن بجرنگی بابو ساحیب کی سنتان ہیں؟"

"لیکن۔ لیکن وہ ناجائز اولادیں ہیں۔"

"بھلے ناجائز ہوں۔ پر او لڑکن ماں کھون تو بجرنگی بابو ساحیب کا ہے نا۔۔ ٹھاکرن کا کھون۔"

"سو تو ہے۔ "کرنل خان تذبذب کے عالم میں ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولے "اب آپے بتا دیں سرکار، جب ٹھکرے کا کھون ٹھکرے پہ ہاتھ اٹھا دے۔ بے اجتی کرے تو ای ماں ہمرے برادری کا کون کسور (قصور)؟"

بھولٹی کا یہ جملہ سنتے ہی ٹھاکروں کے اٹھے ہوئے سر فرط ندامت سے جھک گئے۔ زہر اگلنے والی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ چند ساعت ایسی خاموشی طاری رہی گویا سبھی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پر اگلے ہی لمحے سب کے سب چونک اٹھے جب بھولٹی کی آواز دوبارہ ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ عاجزانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ہمری سرکار سے بس اب اتنی بنتی ہے کہ آپ ای بابو ساحبین سے کہہ دیں کی ای لوگ ہماری برادری کی نادان لڑکن کے آپن سنتان۔ آپن کھون جان کے ماپھی (معافی) دے دیں۔"

◇◇

بقیہ صفحہ ۴۷ : نقد و نظر

"گرم برف "اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ کنڑ اور ہندی میں بھی لکھتے ہیں لیکن اردو ان کا پہلا عشق ہے۔ آج کے ادیبوں کے متعلق یہ شکایت عام ہے کہ ان کے تخلیقی سوتے جلد خشک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اہل ٹھکر جیسے ادیب بھی ہمارے درمیان ہیں جو کئی زبانوں میں لکھ رہے ہیں۔ وہ ڈرامہ نویس بھی ہیں اور اداکار و ہدایت کار بھی۔ یہ تخلیقی وفور قابلِ رشک ہے۔

افسانوں کا یہ مجموعہ آج کی نسل کا نمائندہ مجموعہ ہے جو سچائیوں سے آنکھیں چرانا پسند نہیں کرتی۔ نہ ہی منافقت اور ریاکاری کی قایل ہے۔ تلخ حقیقتوں کو زبان و بیان کے ملمع چڑھا کر قابلِ قبول بنانا بھی اسے گوارا نہیں۔ وہ ہماری اس حقیقت پسند روایت کے امین ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ہندوستانی زبانوں میں حاوی رجحان قرار پایا۔ جسے اردو میں پریم چند، بیدی، عصمت چغتائی، منٹو، رام لعل اور غیاث احمد گدی جیسے افسانہ نگاروں نے بڑی عمدگی سے برتا۔ اب اہل ٹھکر اسے نئے تخلیقی زاویوں اور آج کی عصری حقیقت کے ساتھ بڑی کامیابی اور ہنرمندی سے پیش کر رہے۔ اس مجموعے کا مطالعہ گذشتہ پچاس سال کے ہند۔ تہذیبی مطالعہ ہے اور ایک باخبر افسانہ نگار کی ہنر خوبصورت اور معنی خیز اظہار۔ جس کا خیر مقدم کیا۔

ضخامت : ۱۴۴ صفحات ○ قیمت : ۱۰۰ روپے

A ۔ شمبھو اپارٹمنٹ، 38 ۔ آدرش نگر، ہبلی۔32 (کرناٹک) **(انور خان)**

قاضی فراز احمد

نمود

ہی خون سے پلتا رہا مرے اندر
ضمیر کا پودا مری خودی کا شجر

جنوں کی فصلیں مرے وقار کی بیل
ال پرندہ حیات و روح و شرر

ثبوت کا رشتہ خیال و خواب و نمو
ت کا پرتو تخیلات و نظر

و جاں کا ایندھن یہ روح کی حدت
ہتا ہے احساسِ غم بھی تازہ تر

ماغ کے نوری سفر کا اک اک پل
ہی خون سے پلتا رہا مرے اندر

● At d P.O. Sagwe Talu
Rajapur, Distt : Ratnagiri (M



منصور اعجاز

دو نظمیں

(۱)

میری ماں نے یہ نہیں چاہا
اس کا بیٹا،
لکھ پڑھ کے افسر بن جائے
خوب کمائے

کتنی اچھی، سچی تھی ماں
جب خوش ہوتی
سینے سے لگاتی
دعائیں دیتی
"میرے بیٹے نیک بنو
نیک بنو
تم نیک بنو"

(۲)

جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ
بائیں ہاتھ کا کھیل ہوا
حیراں ہوں میں اپنے یگ پر
سورج کو کیچ میں لت پت کر کے
چاند پر جس نے تھوک دیا ہے۔

● Rashid Studio,
Yavatmal - 445001 (M.S.)



ظہور منصوری نگاہ

رباعیات

(درزنی جمالیات)

پچھلے ہی پہر نکل پڑی ہے گھر سے
ٹھیکے پہ کہیں دیر نہ ہو اس ڈر سے
قدموں قدموں پھوٹ رہی ہے جو شفق
رستے رستے رنگ مہاور برسے

o

نخرے بھی کبھی ناز بھی کر لیتی ہے
اونچی کبھی آواز بھی کر لیتی ہے
چھوٹی سی کمائی میں چلاتی ہے گھر
دو پیسے پس انداز بھی کر لیتی ہے

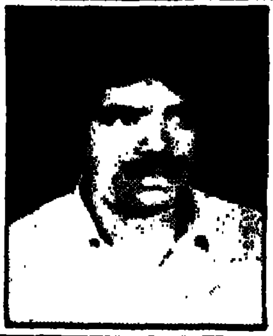
o

تھک ہار کے سوتی ہیں تو سوتی ہی ہیں
بیدار جو ہوتی ہیں تو ہوتی ہی ہیں
ہنستی ہیں تو ہنستا ہے جہانِ موجود
روتی ہیں تو لگتا ہے کہ روتی ہی ہیں

o

ساجن کو دیا کرتی ہے یوں بھی جھانسے
بیمار بنے، دیکھ کے چھینکے، کھانسے
میکے کا ارادہ ہو کہ زیور کی طلب
ہر بات میں سو بار رجھائے، پھانسے

● P.O.Box No. 30,
Rewa - 486001 (M.P.)



اشفاق سعید
177 - Ayesha Manzil Pipe Rd, Kurla, Mumbai - 70

اپنا خون

ٹھاکروں اور ہریجنوں کے بیچ پنچایت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح اطراف کے گاؤں تک پھیل چکی تھی۔ جو بھی سنتا دم بخود رہ جاتا۔ چونکہ گاؤں کی تاریخ میں ایسا واقعہ اب تک نہیں ہوا تھا۔ آخر ٹھاکروں کو پنچایت کی ضرورت بھی کیا؟ وہ بھی ہریجنوں سے؟ جبکہ ٹھاکر خود اپنے آپ میں ایک پنچایت ہوتا ہے؟ اس کی زبان پنچ ہوتی ہے؟۔ زبان سے نکلا ہوا حرف حرف انصاف ہوتا ہے یعنی اٹل فیصلہ! پھر بھلا اس پنچایت کے کیا معنی؟

پنچایت کے لیے شوالے کا چبوترہ منتخب کیا گیا تھا۔ گاؤں کے گاؤں اس پنچایت کو دیکھنے اُمڈ آئے تھے۔ چبوترے پر ٹھاکروں کی ٹولی سینہ تانے بیٹھی مونچھوں کو تاؤ دے رہی تھی۔ دوسری طرف برگد کے زیر سایہ سن رسیدہ ہریجنوں کا گروہ سراپا خوف و ہراس کا پیکر بنا آنکھوں میں ویرانی سموئے بیٹھا تھا۔ ان کے نوجوان پنچایت گاہ کی حدود سے باہر جوش و ولولے سے بھرے کھڑے تھے۔ اپنے بزرگوں کے برخلاف ذرہ خوف جیسی کوئی بات ان کے چہروں پر نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

پنچایت کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ کرنل نیاز خان سرپنچ کی حیثیت سے کنویں کی جگت پر براجمان تھے اور ہریجنوں کے چودھری بھولٹی رام کا بیان اس انداز سے سن رہے تھے گویا وہ عدل و انصاف کے دیوتا ہوں یا پھر جہانگیر وقت!

بھولٹی ہاتھ جوڑے کہہ رہا تھا۔ "سرکار کال سبیرے وجے بابو بستی ماں آئے رہے ساید ان کے گیہوں کی کٹائی واسطے مجور کی جرورت رہی۔ لیکن او بکھت کوئی پھرست سے نہ رہا سب کے سب اپنی اپنی مجوری پہ چلا گیے رہے۔ جب ان کے کوئی ناہی ملا تو نراس ہو کے لوٹ پڑے۔۔ لوٹتے بکھت ان کی نجر رام پلٹ پر پڑگئی جو نیم کے نیچے بیٹھا پڑھت رہا۔ وجے بابو او کے دیکھتے رک گئے آور پکڑ کے جبری لے جائے لاگے۔ اُو بار بار کہت رہا بابو ساحیب کوئنو دوسرے کے لیت جاؤ ہماری بکھت مجوری کرے کا ناہیں، پڑھے کا ہے۔ پرسوں سے ہمار اامتحان ہے۔ بہی پہ سرکار وجے بابو لال پیلے ہوئے گئے لگے مارنے کریانے سسر کے ناتی بڑا پڑھوتیا کے پونچھ بھئے ہیں۔ باپ دادا تو ہر جوتت جوتت مر گئے ای سسر پڑھے چلے ہیں وکیل ڈاگدر بنے کا سپنا دیکھت ہیں۔ چل سارے گیہوں کاٹ تورے جیسن چمار سیار وکیل ڈاگدر بنے لاگیں تو کا دسا ہوئی اس دیس کا؟ آور اچھڑ کے ایک لات او کری چھاتی پہ جما دیے سرکار رام پلٹو کبرو جوان ہے۔ اوماں بھی گرم کھون ہے۔ اوکی تلملسی دیکھوا پتا پر بھی بس ہاتھئے گوڑ جوڑت رہا۔۔ بنتی کرت رہا۔ مگر اُو جب نا مانے آور او کے پیٹتے رہے تب او ہو کھسیا کے ایک اڑ نگا لگاوا آور دھویں سے پٹک کر چڑھ بیٹھا پھر لگا پیٹنے۔ ہم جھوٹ ناہی کہب سرکار رام پلٹ پہ کھون سوار ہو گوا رہا۔ او بھی مارے مرے پہ اتارو ہو گوا رہا، او تو بھیم جی کی کرپا بھئے گئی جو ہمرے ڈانٹے سے چھوڑ دیا جو او کونو طرح جان لئے کے بھاگے۔ پھر۔۔ پھر نہ مائی باپ دیکھتے دیکھت سو چاٹھکر ہن لاٹھی لئی لئی بستی پہ ٹوٹ پڑا۔ آن کی آن ماں گھر مکان، کھیت کھریان جرے لاگ۔ بٹیا بہن کی اِجّت سے کھلواڑ ہوئے لاگ۔ اب آپے بتاؤیں سرکار ایسے میں کوئی کیسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے چپ چاپ منہہ ماں گھنگھنیاں ڈارے بیٹھا رہی۔ پھر بستی کے۔۔۔۔۔

بھولٹی اپنی بات ابھی مکمل کر بھی نہیں پایا تھا کہ ٹھاکروں کے چودھری جھاڑی سنگھ درمیان میں ہی تن تنا کے اٹھ کھڑے ہوئے اور گرج کر بولے۔ لیکن او چمروئے کی ہمت بھئی کیسے کہ ٹھاکر پہ ہاتھ اٹھادے ایک نیچ ولدر ہم لوگن کا جوٹھن پتری چاٹنے والے۔۔۔ جسے کبھی ہم لوگن کے آگے سر نہ اٹھا سکے۔۔ آنکھ ملا کے بتیا نہ سکے آج او ہے ہم سے مکالبہ (مقابلہ) کرے پہ تلے ہیں؟ کرنل صاحب آپ ان سے کہدیں ہم سے نہ الجھیں ناہی تو ابھی گھر بار جرا ہے آگے چتا جرے گی سمجھے! گٹھلی کتنا ہوں کا ہیں ناہی بڑھ جائے پر رہت ہے آم کے بھیتر ہی۔"

بھولٹی جھاڑی سنگھ کی دھمکی سن کر شش و پنج میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کہے۔ اگر وہ ٹھاکروں کے خلاف زبان کھولتا ہے تو وہ خاموش ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔ اپنی برادری کی جانب سے معذرت کرے تو ان کے پھر اٹھنے کا اندیشہ ہے چونکہ وہ دب کر یا ڈر سہم کر جینا

نہیں چاہتے۔۔ وہ بھی اب عزت کی زندگی چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا بھی معقول ہے کہ زمینداری کب کی ٹوٹ چکی۔۔۔ بندھوا مزدوری کا چلن بھی اٹھ گیا۔۔ سبھی کی اپنی اپنی زمینیں ہو گئی ہیں۔ کاشتکاروں میں شمار بھی ہونے لگے ہیں۔ پھر جہالت کا زمانہ بھی تو لد گیا۔۔ لوگ باگ پڑھ لکھ گئے ہیں۔ اونچ نیچ کی تفریق گھٹتی جا رہی ہے۔ ہر طرف مساوات کا نعرہ گونج رہا۔ سرکار دلتوں کو طرح طرح کی سہولیات فراہم کر رہی ہے۔ آرا کشن اور منڈل آیوگ کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ اس کے علاوہ عجیب بات یہ ہے کہ جانے کیسے سوزن لوگوں کی طرح ہمارے نوجوانوں میں بھی گرم خون سرایت کر گیا ہے جو معمولی معمولی باتوں پر کھول اٹھتا ہے۔ ایسا کیونکر ہو گیا ہے؟ برف میں چنگاری کیسے سما گئی؟ وہ تذبذب کے عالم میں اس گتھی کو سلجھانے کی ترکیبیں لڑا رہا تھا کہ یکلخت اس کی نگاہ بھیڑ سے پرے کھڑی کجری پہ جا ٹکی۔ کجری بستی کے لکھی راج گیر کی بہو تھی۔ گوری چٹی، بھرا ہوا گداز بدن، کجراری آنکھیں، بھاری بھاری ابھاردار جوبن پر ڈھیلی ڈھالی کرتی اور اس پر دھانی رنگ کی چنری میں غضب ڈھا رہی تھی اس کی نسبت سے بھولٹی کو بجرنگی سنگھ کا خیال آیا کیونکہ کجری اس کے یہاں کھیتوں کی نگرانی پر مامور تھی۔۔۔ دراصل یہ دکھاوا تھا اس کے پس پردہ وہ اس کی رکھیل تھی یہ بات کچھ ایسی ڈھکی چھپی بھی نہیں تھی بلکہ سارا گاؤں جانتا تھا۔ پھر تو بھولٹی کی آنکھوں کے آگے یکے بعد دیگرے بدامہ، بھانہ، دھنری، امرتی اور بدری کے حسین چہرے رقص کرنے لگے۔ یہ سبھی لڑکیاں ٹھاکروں کے یہاں کام کاج کیا کرتی تھیں اور ٹھاکر ان کے جسموں کے شیدائی تھے۔۔۔ وہ سوچنے لگا خود کو اعلیٰ ذات کی مسند نشین تصور کرنے والے بہ ظاہر تو ہم سے نفرت کرتے ہیں، ہم سے چھوت چھات برتتے ہیں۔۔ لیکن ہماری بہو بیٹیوں کے ساتھ منہ کالا کرنے سے باز نہیں آتے۔ کیا محض ہوس کی اگنی شانت کرنے کی خاطر اونچ نیچ، چھوت اچھوت کے تمام بندھنوں کو توڑ دیتے ہیں؟ اور ہم ہیں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموشی کو اپنا مقدر بنائے ہوئے ہیں۔ آخر خاموشی کی یہ میراث کب تک یوں ہی نسل در نسل منتقل ہوتی رہے گی؟ اس سے پہلے کہ وہ ان سوالات کا معقول جواب تجویز کرتا کوئی بات اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندی ساتھ ہی لبوں پر رم جھم رم جھم فاتحانہ مسکراہٹ برسنے لگی۔ ابھی وہ اس بارش میں پوری طرح بھیگ بھی نہ سکا تھا کہ کرنل خان کی بارعب آواز سماعت سے ٹکرائی۔ "لیکن تم لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی ٹھاکروں پہ ہاتھ اٹھانے کی؟"۔ اتنا سننا تھا کہ بھولٹی پر کپکپی طاری ہو گئی پر کسی طرح اس نے خود کو سنبھالا۔ "سرکار۔ ہمری برادری کے لیکھے (لیے) آپ لوگ تو بھگوان ہیں۔ آپ لوگ گھڑک کے تاک دیں تو ہم لوگن کی کپکپی چھوٹ جات ہے۔ رہا سرکار ہاتھ اٹھاوے والی بات تہ او کیکرا ایں اتنا دم ہے جو آپ بابو ساحبن پر ہاتھ اٹھاوے سوائے آپ کے اپنے کھون کے؟"

"مطلب!" کرنل کی متعجب آواز ابھری۔ بھولٹی لبوں پہ بکھری معنی خیز مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے ہاتھ جوڑے گویا ہوا۔ "مطبل (مطلب) تہ ایکدم صاب ہے سرکار۔ آپ سمجھ نہ پاویں تہ ای ہامرا کا کسور؟"

"پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ صاف لفظوں میں کہو جو کہنا چاہتے ہو۔" کرنل کے لہجے سے بھولٹی کی بات سمجھ نہ پانے کی جھینپ نمایاں تھی۔

"مطبل ای سرکار۔ ہماری برادری کے سبھی سیان بیٹا بہو بابو ساحبن کے گھر یا کھیت کھریان ماں مجوری کرت ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ تمہاری قوم تو صدیوں سے اونچی قوم کی غلام رہی ہے۔"

"مانت ہوں سرکار ہم لوگ گلام ہیں۔ ہم لوگن کا ہاتھ گوڑ گلام ہے۔ کھون پسینہ گلام ہے۔ پر سرکار ہم لوگن کی اجت کبھی گلام ناہی رہی۔ بہن بٹیا کا سر یر کبھی گلام نہ رہا۔ سرکار اجادی (آزادی) کے بعد سے لگ بھگ اڑتالیس برس بھئے گوا ای لوگن کے ہمری برادری کے بہن بٹیا کے سنگ کوکرم کرت۔"

"خاموش! جانتے ہو اس الزام کا نتیجہ؟"

"ای الجام ناہی ہے سرکار۔ سچائی ہے سچائی!"

"سچائی!"

"ہاں سرکار"

"تو تمہیں اس سچائی کو ثابت کرنا ہوگا۔ ابھی۔ اسی وقت۔ ہے کوئی ثبوت؟"

"ایک دو ناہی پچاسن ثبوت ہے سرکار پچاسن۔ پہلا ثبوت او دیکھو سامنے کھڑی ہے کجری!"۔ کجری کا نام سنتے ہی ٹھاکروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ زیادہ بولنے سے یا دمہ کا عارضہ ہونے کی وجہ سے بھولٹی کا سینہ دھونکنی کی طرح پھولنے پچکنے لگا تھا۔ چند ثانیے کی خاموشی کے بعد سانسوں کو درست کر کے دوبارہ بولنا شروع کیا سرکار۔ ای جو کجری ہے نا، لکھی راج گیر کی بہو ہے پلٹو کی گھروالی۔ بستی کا پورے جوار میں ایکرے مکالبے (مقابلے) سندر بٹیا کونو ناہی۔ ایکرے خاطر کئی دفعے گاؤں میں لاٹھی بلم نکل گوا رہا۔ کھون کھرابا (خرابہ) کی نوبت آگئی رہی۔ اب لگ بھگ تین برس سے ای بجرنگی بابو ساحیب کی رکھیل ہے۔ ای بات بستی کے لڑکا سیان سبھی جانت ہیں۔ ای بھی جانت ہیں کہ کجری کا گھروالا چار برس سے کمائے پردیس گوا ہے آور آج دن تلک لوٹ کے گھر ناہی آوا۔ پر کجری ای چار برس ماں دو لڑکا کے جنم دیے ہے۔ ہم آپ سے پوچھت ہوں سرکار، بتاؤں ای لڑکن ایکری کوکھ ماں آوا کہاں سے؟ جب کی ایکرا گھروالا یہاں ناہی آور ای آٹھو گھڑی چونسٹھ پہر بجرنگی بابو ساحیب کے سنگ رہت ہے۔ بتادیں سرکار، آگ

(باقی صفحہ ۳۴۳ پر دیکھئے)

فضل افضل

چمکتی دھوپ سے سپنے سنہرے کرلیے ہم نے
دوالی دیکھ لی ہم نے، دسہرے کرلیے ہم نے

جہاں بھی جس قدر بھی تم نے چاہا لطف فرمایا
اندھیرے دل کے گہرے اور گہرے کرلیے ہم نے

اداکاری نہیں آتی تھی پھر بھی کی بہی کوشش
ضرورت جیسی تھی ویسے ہی چہرے کرلیے ہم نے

سماعت تیز تھی احساس بھی بیدار تھا لیکن
تری خواہش کی خاطر کان بہرے کرلیے ہم نے

گذارے جس طرح افضل گذر جاتے ہیں دن اپنے
خدا کے فضل سے شام و دوپہرے کرلیے ہم نے

○ Gandhi Chowk, Yadgir - 585201 (Karnataka)

فصیح اللہ نقیب

دھند لائی ہوئی حیات دھواں
اب تو دل کی ہے کائنات دھواں

پیڑ پیڑ آگ، ڈالی ڈالی شرر
پھول پھل راکھ، پات پات دھواں

شہروں شہروں دھوئیں کے مرغولے
فرد، ملت، سماج، ذات دھواں

کاہشیں، آگ، گرم بستر، میں
خواہشیں، برف، سرد رات دھواں

ہے فضائے سخن، کہر آلود
شعر مبہم ہیں، لفظیات دھواں

○ K.M. Asghar Husain Jr College, Akola - 444001

راشد انور راشد

لہجے میں ترے غیروں کا ہے ڈھنگ، مگر کیوں
اب تجھ کو میں تسلیم کروں سنگ، مگر کیوں

تو نے ہی کئی قسطوں میں چاہی تھی مری موت
تو میری تباہی پہ ہے کچھ دنگ، مگر کیوں

وسعت کی تمنا میں کیا اپنا جگر چاک
وہ دائرہ کچھ اور ہوا تنگ، مگر کیوں

پھر خون کے دریا میں اٹھی موجِ حوادث
پھر ٹوٹ کے دونوں میں ہوئی جنگ، مگر کیوں

دستار انا دھول سے جا لپٹی اچانک
پندار زندگی پہ لگا زنگ، مگر کیوں

○ 120 - E, Braham Putra Hostel, J.N.U., Delhi - 110067

خوشبیر سنگھ شاد

میں اپنی ہر تمنا زندگی سے ہار بیٹھا ہوں
مگر اک اور باری کے لئے تیار بیٹھا ہوں

جسے دیکھو وہی معروف کاروبار دنیا ہے
مری معروفیت دیکھو کہ میں بے کار بیٹھا ہوں

مری آنکھوں کو خوابوں نے سزا کس جرم کی دی ہے
کہ دنیا سو رہی ہے اور میں بے دار بیٹھا ہوں

مرے پرکھوں کی چیخیں گونجتی ہیں میرے کانوں میں
میں ہاتھوں میں لئے روندی ہوئی دستار بیٹھا ہوں

مجھے اے شاد اپنے دشمنوں سے ڈر نہیں لگتا
میں اپنے آپ سے خود برسر پے کار بیٹھا ہوں

○ 220, Ramnagar, Alam Bagh, Lucknow

عباس رضا نیّر

ان اندھیروں کے کئی اور اسباب ہوتے ہیں
ورنہ جگنو بھی پس دامنِ شب ہوتے ہیں

دھوپ میں چلنے کی عادت ہے ہمیں بچپن سے
جلنے لگتے ہیں قدم چھاؤں میں جب ہوتے ہیں

ایسے جذبات جو رکھتے ہیں غموں سے نسبت
جب وہ الفاظ میں ڈھلتے ہیں ادب ہوتے ہیں

موم کے زینے پہ چڑھ جاتے ہیں سورج کیلئے
اس نئے عہد کے فنکار عجب ہوتے ہیں

ساتھ ہو جاتا ہے اندیشوں کا اک جم غفیر
جب کبھی ہم تری محفل میں طلب ہوتے ہیں

○ 16 - Canning Street, Lucknow - 226003 (U.P.)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۴)

ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں دنیا بھر سے خطوں کا ایک سلسلہ برابر جاری ہے ۔ مختصر و طویل خطوں کے ذخیرے میں سے بعض مندرجات کی اشاعت بھی جاری ہے ۔ تعریفی و توصیفی خطوں کے ساتھ اب طویل تنقیدی خطوط بھی موصول ہورہے ہیں ۔ شاعر کے عام شماروں اور پھر ہم عصر اردو ادب نمبر جلد دوم میں ان کی سمائی و یکجائی ممکن ہوسکے گی ۔ طویل خطوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے ۔ ہمیں خوشی ہے کہ قارئین شاعر ، اپنی سوچ اور مطالعے و مشاهدے کی سطح سے ہم عصر اردو ادب نمبر کو دیکھ رہے ہیں ، پڑھ رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں ۔ اور ہر طرح کی تنقید کا خیرمقدم کررہے ہیں کہ وہ تسامحات و اغلاط جو ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل میں راہ پاگئی ہیں ، جلد دوم میں ان کا اعادہ نہ ہوسکے ۔ موصول ہونے والے تنقیدی خطوں کے لئے ادارے کی طرف سے حواشی کی ضرورت ہے کیوں کہ خاص نمبر کی ترتیب و تہذیب اور اس میں تمام مواد کی پیش کش ، اس کی ہیئت اور بخیہ کاری کا کام ، تمام تر پہلے سے موجود و معلوم طریقہ* ترتیب سے یکسر مختلف ہے ۔ ہم نے شاعر کے سابقہ خاص نمبروں کے نت نئے تجربوں کو توڑنے کی سعی کی ہے اور پوری اردو دنیا جانتی ہے کہ شاعر کے خاص نمبروں کی ایک مثالی تاریخ ہے ۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کو ردّ تعمیر یا ردّ تشکیل کا ایک نیا اور مثالی ماڈل بھی کہہ سکتے ہیں ۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے 'جرعات' اور ابواب کے تعارفی شذرات ، خاص نمبر کے قاری کی رہنمائی کریں گے ۔ گزارش ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کو بہ نظر اصلاح دیکھا جائے لیکن اس کی نئی تخلیقی ترتیب اور اس کی روح کو بھی محسوس کیا جائے ۔ خاص نمبر ایک نئی تفسیر چاہتا ہے ۔ اور ہماری خواہش ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر پر مکالمہ جاری رہے لہذا خاص نمبر کے مطالعے کے دوران یا اس کے بعد ، آپ جو کچھ بھی محسوس کرتے ہوں اسے بلاکم و کاست لکھ بھیجئے اس یقین کے ساتھ کہ آپ کی ہر طرح کی رائے کا احترام کیا جائے گا ۔ (ادارہ)

جگن ناتھ آزاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب نے شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل پر شاعری میں مبارکباد دی تھی ۔ ان کا قطعہ مارچ ۹۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء کو انھوں نے مذکورہ قطعے میں دو شعر اضافہ کرکے مکمل قطعہ ارسال کیا ہے ۔ مکمل قطعہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے ۔ (ادارہ)

ماہنامہ شاعر ممبئی

کا ہم عصر اردو ادب نمبر دیکھ کر

شاعر کہ ماہنامہ ٔ عالی مقام ہے
اہل نظر نے جس کو ہمیشہ کیا پسند
نکلا ہے اس کا خاص شمارہ کچھ اس طرح
اردو ادب کا نام ہوا اور بھی بلند
پہلے تو انتظار رہا اس کا سال بھر
پھر ایک بار اس نے بھری اس طرح زقند
اک جنت نگاہ کا منظر نظر میں تھا
آنکھیں بھی بامراد ہوئیں دل بھی بہرہ مند
اے افتخار اس کے سوا اور کیا کہوں
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

●

نظیر صدیقی

ہم عصر اردو ادب نمبر کی پہلی جلد دیکھنے کا اتفاق ہوا اس کے زیادہ تر پہلو بہت پسند آئے ۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ آپ موجودہ اردو ادب کے تقریباً تمام پہلوؤں پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں اور آپ اردو ادب کے ان ایڈیٹروں میں سے ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب کی نئی نسل کے نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اس کے باوجود جی چاہتا ہے کہ آپ نے غالباً حوصلہ افزائی کی غرض سے جتنے نئے لکھنے والوں کو اس نمبر میں شامل کیا ہے اور کرنے والے ہیں ، ان کے انتخاب میں قدرے سختی سے کام لیا ہوتا ۔ جن لکھنے والوں نے ابھی تک کوئی انفرادیت حاصل نہیں کی ہے انھیں شاعر یا کسی اور رسالے کے آئندہ نمبر تک مزید پنپنے کا موقع دیا ہوتا ۔

●House - 1915, Street -10, I - 110/2, Islamabad - 44800 (Pak)

شمس الرحمن فاروقی

عرصہ ہوا تمہارا ضخیم اور کارآمد نمبر ملا تھا ۔ میں نے سوچا کہ اسے اگر پورا نہیں تو بہت کچھ پڑھ ڈالوں ، تب تمہیں لکھوں ۔ پڑھ تو لیا لیکن دیگر مصروفیات مفصل جواب لکھنے میں مانع آتی رہیں ۔ تاخیر سے لکھنے کے لئے شرمندہ ہوں ۔ تمہارا نمبر کارآمد ہے اور یہ اور بھی کارآمد ہوتا اگر اس میں کوئی بنیادی نقطہ ٔ نظر پیش کیا جاتا یا کسی مرکزی خیال کے گرد یہ نمبر مرتب کیا گیا ہوتا ۔ اس وقت تو یہ طرح طرح کی تحریروں کا مجموعہ ہے اور لکھنے والے زیادہ تر ایسے ہیں ، جن کی رائے یا خیالات کسی خاص قدر و قیمت کے حامل نہیں ۔ مجھ پر تم نے خاص کرم کیا جو میری تخلیقات منتخب کرکے چھاپیں اور کارٹون بھی ۔ لیکن کارٹون / تصویر میں اور مجھ میں کوئی خاص مشابہت نہیں ۔ لے دے کے ایک پائپ ہے جس سے وارث علوی یوں بدکتے ہیں جیسے گھوڑا چابک سے ۔ اب تو مجھے پائپ پینا / تمباکو چھوڑے آٹھ نو سال ہوگئے ۔

●29C, Hastings Rd, Allahbad - 211001

عبدالقوی دسنوی ______

'ہم عصر اردو ادب نمبر' کے متعلق آپ کو بھی میں نے اگرچہ مختصر رائے بھیجی تھی لیکن فوری طور پر اسے دیکھنے کے بعد جو رد عمل ہوا تھا اس کا اظہار کر دیا تھا۔ بلاشبہ آپ نے شاعر کا ہم عصر نمبر بہت ضخیم نکالا ہے جس کی مثال شاید اردو کا کوئی رسالہ پیش نہیں کر سکتا۔ اس ضخیم نمبر کے نکالنے میں آپ نے جس قدر محنت کی ہے وہ بھی قابل تعریف و تحسین ہے۔ آج جب اردو اپنے وطن میں اپنوں کے ہاتھوں لہولہان ہے آپ کے ہاتھوں اردو کو اتنا بڑا تحفہ، قابل فخر بات ہے۔ کاش اردو رسائل اور اخبارات کے مدیران آپ سے حوصلہ لیں اور اردو کے لیے کچھ اہم کام کرنے میں کامیاب ہوں۔ البتہ ایک کمی جو محسوس ہوئی وہ ترتیب سے متعلق ہے۔ میں اگر اسے مرتب کرتا تو اتنے ہی موضوعات پر مضامین شامل کرتا جو ہر لحاظ سے مکمل ہوتے۔ ان کے مطالعے کے لیے قاری کو دوسرے نمبر کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ شاعری کو لے رہے ہیں تو اس کا مکمل جائزہ ہونا چاہیے تھا۔ مناسب تھا کہ اس نمبر میں چند موضوعات یا اصناف کو اٹھاتے جو مکمل ہوتے۔ دوسرے حصے میں دوسری اصناف یا موضوعات کو شامل کرتے۔ اس طرح ہر نمبر مکمل ہوتا اور اس کی افادیت بڑھ جاتی۔ مطالعے میں بھی قاری کو لطف آتا۔

● 2 - Prince Colony Nemut Pura, Idgah Hills, Bhopal - 462001

عتیق اللہ ______

'معصری ادب نمبر' کے ٹھاٹھ باٹ ہی کچھ اور ہیں۔ ہر ہر ورق آپ کی محنت اور آپ کی لگن کا مظہر ہے، جس کے لیے آپ نے جانے کتنی راتوں کی نیند گنوائی ہوگی اور جانے کتنوں دنوں کو غبار بنایا ہوگا۔ اسے بنانے اور سنوارنے میں آپ کی بہترین تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کام آئی ہے جب ہی تو یہ صورت برآمد ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کا یہ کام مدتوں یاد رہے گا اور ارباب فکر و نظر کے لیے ہمیشہ حوالے کے طور پر کام آئے گا۔ اس کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ میری طرف سے آپ سب کو مبارکباد۔

● 221 - Ghalib Apts., Pitampura - Delhi - 110034

ذکی عباس (مدیر: عوامی منشور) ______

آپ کا خط ملا، پروفیسر ریاض صدیقی صاحب کے نام بھی مرسلہ خط مل گیا۔ آپ ہماری طرف سے عدم رابطے پر الجھ رہے ہیں کسی حد تک آپ کی یہ الجھن صحیح بھی ہے مگر زیادتی تو خود آپ نے ہمارے ساتھ یہ کر دی کہ ساڑھے بارہ سو صفحات کا یہ خصوصی نمبر نکال کر ہمیں اس کو پڑھنے پر لگا دیا، بغیر پڑھے ہوئے بھی کچھ لوگ تبصرہ کر دیا کرتے ہیں ابھی یہ پیشہ ورانہ صلاحیت ہمارے اندر پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہماری خواہش ہے کہ ایسا ہو جائے۔ تو صاحب ہم تو اس نمبر کو پڑھنے میں لگے ہوئے ہی تھے کہ آپ نے پھر خواتین نمبر بھی نکال ڈالا سوچا یہ بھی پڑھ لوں تو خط لکھوں گا اتنے میں آپ کے خطوط آ گئے۔ اب یہ سب کچھ پڑھ ڈالا ہے سو جواب پیش خدمت ہے :

آپ نے خط میں لکھا ہے کہ تبصرہ بھی بھیج رہے ہیں، وہ ابھی تک نہیں ملا۔ اگر مل جاتا تو بکھیڑا ہی دور ہو جاتا، پہلی فرصت میں چھاپ کر فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ہم تو آپ کے اس جناتی کام کو دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ آپ نے کیسے کر ڈالا۔ منصوبہ بندی، انداز پیش کش، ترتیب و کتابت، مواد و مصالحہ، توازن و اعتدال، سیاق و سباق، گذشتہ سے پیوستہ، ہم آہنگی و نظم ضبط، مطلوبہ چیزوں میں مطلوبہ یکسانیت اور ساتھ ہی ساتھ تنوع، بھرپور نمائندگی اور ہمہ جہتی تعاون و اشتراک کے حصول میں مثالی کامیابی، تاریخ و تعارف غرضیکہ کس کس پہلو اور خوبی کا ذکر کروں مجھے تو انتہائی دلی مسرت اور عجز کا اظہار و اعتراف کرنا ہے اور وہ جو ہمارے یہاں لفظ شاباش اور انگریزی میں Well done, brave ! کہا جاتا، کہنا ہے۔ عموماً لوگ اپنے نام وغیرہ کے چکر میں اس طرح کے خطوط لکھا کرتے ہیں جو مجھے اچھا نہیں لگتا اس لئے عرض ہے کہ میرا یہ خط قربت اور محبت کا مظہر ہے۔ کچھ لوگ عموماً ہر ممکن اپنائیت جتانے کے بعد یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ "محض ذاتی ہے، اشاعت کیلئے نہیں" لگتا ہے کہ دوسروں کو اپنے احساسات و تاثرات سے محروم رکھنا چاہتے ہیں یا ان سے چھپانا، اس بحث سے دور رہتے ہوئے ہم جو فرض ہے وہ ادا کر رہے ہیں اور بس یہی کافی ہوا کرتا ہے، سو قبول کیجئے۔ یقین جانئے ذاتی طور پر میں نے اس خصوصی نمبر سے بہت کچھ حاصل کیا، بیشتر معلومات سے محروم تھا، وہ جہالت دور ہوئی سب سے زیادہ حیرت تو اس امر پر ہے کہ خانوادہ سیماب کے کتنے لوگ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ڈھلائے ہوئے نکلتے رہے کہ ۷۰ سال سے یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ بمبئی اور بھارت جیسے شہر و ملک سے اردو زبان و ادب کی اتنی ٹھوس بلکہ معجزاتی خدمت، جبکہ نہ میں معجزہ کا قائل ہوں نہ آج کل معجزے ہوتے ہیں، بلاشبہ انسانی فہیم اور ارادہ کا زبردست و بے پناہ ثبوت ہے۔ مبارک ہو۔

آپ نے تو شاعر کے اشتہاروں کا شکریہ ادا کر کے طبیعت مکدر کر دی یہ پنج حرفی لفظ مجھے تو کاروباری سا لگتا ہے، اس سے مغائیرت کی بو آتی ہے۔ اپنے اگر اپنوں کا شکریہ ادا کرنے لگیں تو اپنائیت کی توہین ہوتی ہے۔ امید آئندہ آپ یہ رسمی کارروائی نہیں کریں گے۔

اہل قلم کے پتوں کے سلسلے میں آپ کا موقف بالکل صحیح ہے۔ عالمی سطح پر حروف تہجی کے لحاظ سے انگریزی ڈائریکٹری کے سوا اور کوئی حل نہیں پھر قارئین کرام سے ان کے براہ راست تعلق کا یہ حل تمام منافقوں اور پیشہ ور لوگوں کی ریشہ روانیوں کا موثر خاتمہ ہے، مجھے خود یہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ اپنی برادری کے ہی لوگ "پتے" تک چھپاتے ہیں حالانکہ یہ کوئی تجارتی مقابلہ و منافسہ کا معاملہ بھی نہیں ہے اگر ہم مزاج اور ہمنوا باہم ملیں تو اس سے اچھی بھلا کیا بات ہے؟ میں نے آپ کے حوالے سے کافی لوگوں کو عوامی منشور بھیجا ہے اور ارادہ ہے کہ کم و بیش سب ہی کو بھیجوں گا۔ مجھے جو چیزیں اچھی لگی ہیں وہ شاعر کے حوالے سے شامل اشاعت بھی کروں گا تمام حلقہ ہائے فکر کے لوگ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ واقف و باخبر تو ہوں۔ امید ہے آپ مجھے اس امر کی بخوشی اجازت دیدیں گے۔ اگر آپ کے پاس علامہ سیماب اکبر آبادی صاحب کی 'ہمارے سرورق کے سائز میں کوئی رنگین تصویر ہو تو ضرور عنایت کر دیجئے' اگر سائز کے مطابق نہ ہو، زیادہ ہو تب بھی ہم کام چلا لیں گے اگر رنگین نہ ہو تو B/W میں ذرا صاف ستھری تصویر بھیج دیں تاکہ [illegible] سے ہی بنوا لیں، امید ہے جو بھی ممکن ہوگا، وہ آپ ضرور کر دیں گے، میرا یہ کام اپنا سمجھ کر کر دیں۔ ذرا فرصت [illegible] جائے تو پسندیدہ اہل قلم سے براہ راست بھی رابطہ کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ بہت سے لوگوں کی غضب

نات کو میں نے پہلی دفعہ ہی پڑھی ہیں۔ سرحدی رے اور تنازعات کا یہ 'عدم مواقفیت' بھی ایک تحفہ ہے۔

● 261 - C11, C.C.Area, Tariq Roa P.E.C.H.S., Karachi - 28 (Pak)

انکی پرساد شرما ———

'شاعر' کا ہم عصر اردو ادب نمبر بڑے انتظار کے موصول ہوا۔ اس خاص نمبر کے شائع ہونے سے قبل ں کے کچھ لوگ جو بے سر پیر کی افواہیں اڑا رہے تھے، ،وہ کونے میں دبک کر بیٹھ گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ساہتیہ .ی میں اردو کے ایک صاحب نے اس پروجکٹ کی بابت لہا تھا۔ ان کا نام (ہم نے یہ نام حذف کر دیا ہے۔ ادارہ)۔ ۔ صاحب اور ہیں جن کا میں نام نہیں لے پا رہا ہوں... ن بقول غالب "دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا!" پ نے ایک ناممکن خواب کی داستان میں اپنی آتما کو انڈیل رکھ دیا ہے۔ ایسے حالات میں جب کہ وقت آپ کے ں پاس تھا لیکن آپ کے ساتھ نہیں تھا، آپ نے علامہ اب اکبر آبادی کے خواب کو اس ضخیم نمبر کی شکل میں ا کیا، ایسے منفرد کام کو سنسکرت زبان میں کہا جاتا ہے ے "یعنی نہ کبھی ماضی میں ہوا ہے न भूतो न भविष्यति نہ مستقبل میں ہونے کی امید ہے۔ یقینی اگر اعجاز صدیقی حب کا مندرجہ ذیل شعر آپ کے سامنے نہ ہوتا تو آپ ر کے قارئین کو عالمی اردو ادب سے متعارف نہ کر پاتے۔

ہم تو خون اپنا چراغوں میں جلاتے جائیں
اس سے کیا صبح کی تنویر ملے یا نہ ملے

۱۳ سو صفحات کے باوجود اس میں اتا اس کے ناموں والے ا کی تحریریں شامل ہو سکی ہیں۔ اس سے باقی دو جلدوں ں پیش آنے والی دشواریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انے آپ کو صبر بخشا ہے اور اڈگ حوصلہ بھی اور اردو ر کو فروغ دینے کی صلاحیت بھی۔ آگرہ اسکول کا باب ۔ کر آپ نے اچھا کیا۔ آپ کے مقالے "آگرہ اسکول: ب تعارف" سے بھی مجھ جیسے ہزارہا قارئین فیض یاب ں گے۔

● B - 33, Ashok Nagar, Shahdra Delhi - 110093

ماھدہ وسیم ———

ہم عصر اردو ادب نمبر اتنا عظیم ضخیم ہے کہ میں حیران ہوں، آپ نے بہت محنت کی ہے۔ اسے ادب کی ایک دستاویز بنا کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور اسے اتنی دور بھیجنے کی بغیر کسی تقاضہ کے زحمت اور دوسری آپ کی سچائی اور نیک نیتی کی گواہ ہے۔ اسے تو بھیجنے میں ہی کتنا ڈاک کا خرچ آیا ہوگا کیونکہ جو قیمت آپ نے اس کی رکھی ہے وہ اس کے معیار سے بہت کم ہے۔ بہت بہت مبارکباد قبول کیجیے اس کارنامہ عظیم کی انجام دہی کے لیے۔

● Bever Veiven 3Lei 19, 0596, Oslo 5, (Norway)

عظیم الدین عظیم ———

"شاعر" کا ہم عصر اردو ادب نمبر دیکھا، پڑھا۔ آپ کا ایک مضمون (اداریہ؟) "عالمی اردو قلم کاروں کے پتے اور فون نمبرس" میں آپ نے بڑے پتے کی باتیں بتائی ہیں، "اپنے پتے اردو میں لکھئے" ہم نے بھی کرناٹک میں شروع کیا تھا۔ بہت کچھ Experimentation کے بعد اب یہ عالم ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھ دیتے ہیں اور انگریزی پتے کے بالائی حصہ پر اردو میں پتہ لکھ دیتے ہیں۔ انگریزی میں لکھنے کا مقصد ہے مکتوب الیہ کو خط ملنے میں دیر نہ لگے۔ ایک حد تک Problem کا حل بھی طریقہ ہے۔

خاکسار نے "کرناٹک کے اردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی ڈائرکٹری" مرتب کی ہے۔ یہ مستند تو نہیں پھر بھی کوشش کہاں تک کامیاب ہے یہ جاننے کے لیے آپ کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔

● 362, "Moonstone", 24th 'B' Cross, Banashankari 2nd Stage, Banglore - 560070

ابن وحید ———

'ہم عصر اردو ادب نمبر' کے مفصل مطالعہ کیلئے تو ایک مدت درکار ہے لیکن گاہے گاہے نظر ڈالنے کے بعد اس امر سے انکار محال ہے۔ آپ اردو کی شیریں کے تیشہ بدوش فرہاد ہیں اور جوئے شیر کی پہلی دھار آپ کی محنت، دقیع مطالعہ، خلوص، قربانی اور ہمت کا ثبوت ہے۔ میرے پڑوسی اور مخلص فاضل چھوٹے بھائی شمس بدایونی کی تخلیقات (رباعیات) اور عکس تحریر شائع کی گئی ہیں (صفحہ ۲۸۱) لیکن فہرست میں نام غائب ہے۔ (اس تکنیکی سہو کے لئے ہمیں افسوس ہے۔ ادارہ) آگرہ اسکول جو میری نظر میں ادبی خانوادہ سیماب کا نام ہے اس پر سیر حاصل مواد پیش کرنے کیلئے شکر گزار ہوں۔ یہ خانوادہ کسی محقق بلکہ کئی ایک صاحبان تحقیق کی توجہ کا مستحق ہے۔ شعبہ اردو آگرہ یونیورسٹی کے اساتذہ کو اس جانب فوری توجہ کرنی چاہیے تاکہ مستقبل کی نسلوں کیلئے ادبی وراثت کا یہ بیش بہا حصہ محفوظ ہو جائے۔

شاعر میں نے بچپن سے وقفہ وقفہ کے تسلسل کے ساتھ پڑھا اور محفوظ رکھا ہے بصد خلوص دعا ہے کہ خدا اسے نظر بد سے بچائے اور آپ کی ہمت میں اضافہ کرے۔ بار بار 'ہم عصر اردو ادب نمبر' کو دیکھتا ہوں اور آپ کی ہمت اور حوصلہ کو اپنے تصور کی حدود سے بالاتر پاتا ہوں۔ انشاء اللہ مطالعہ کے بعد مفصل رائے لکھوں گا۔

● 29 - A, New Azadpuram, P.O. Izzatnagar, Bareilly - 243122

مختصر مختصر...

● ہم عصر اردو ادب نمبر ملا اور اس پر ایک نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ آپ کا کارنامہ ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

——— وزیر آغا (پاکستان)

● شاعر خاص نمبر ملا۔ یوں بھی قصیدہ بڑا مشکل کام ہے اور آپ کی یہ کوشش بلکہ جرأت بلکہ کارنامہ ایک پورے قصیدے سے بھی زیادہ کے مستحق۔

——— جمیل الدین عالی (پاکستان)

● آپ نے ہم عصر اردو ادب نمبر نکال کر اردو ادب پر گرانقدر احسان فرمایا ہے۔ آپ کی محنت اور دیدہ ریزی کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔ آپ کی محبت ہمت پر آفریں ہے۔ اختر ہوشیارپوری (پاکستان)

● شاعر کا خاص نمبر تو بالکل منفرد انداز کا ہے۔ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نایاب تحفہ ہے۔ جستجو آپ کی دیکھئے کہاں سے کہاں لے آئی۔ تخلیق، تنقید، تحقیق اور پھر آپ کی انفرادی سوچ۔

——— مختار شمیم (اندور)

● یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے ایک جن کو بوتل میں بند کر دیا ہے۔ اور یہ آپ ہی کا کام ہے۔

——— خوشنود بخاری (دوحہ قطر)



ستّار صدیقی

یہاں تو ساری دنیا دیکھنا ہے — مگر اپنے سوا ، کیا دیکھنا ہے
سمندر میں اترتا جارہا ہوں — ہے اس کا ظرف کتنا ، دیکھنا ہے
جو میں کل تھا، وہی تو آج بھی ہوں — چلو اب آئینہ کیا دیکھنا ہے
کوئی مطلب نہیں گفتگو سے — مخاطب کرنا ، چہرہ دیکھنا ہے
کتاب زندگی کا راز ۔ پانا — اندھیروں میں 'اشارہ' دیکھنا ہے

16-4-738, Chanchalguda, Hyderabad-24



وصی احمد وصی

اب تک حصارِ ذات سے نکلا نہیں ہے تو — دنیا کا ایک فرد ہے دنیا نہیں ہے تو
پگھلا اگر تو چار قدم بہہ نہ پائے گا — ٹکڑا ہے ایک برف کا دریا نہیں ہے تو
تیرے خلاف ڈھونڈ کے لاؤں ثبوت کیوں — یہ دل کا فیصلہ ہے کہ اچھا نہیں ہے تو
سکہ یہ کہہ رہا ہے اٹھالو زمیں سے — لیکن ضمیر کہتا ہے میرا نہیں ہے تو
دن رات ہو رہے ہیں ستم تجھ پہ اے وصی — پھر بھی کبھی زبان سے کہتا نہیں ہے تو

21-X, Gali Phatakwali, Khureji, Delhi - 110051



مرتضیٰ ساحل تسلیمی

شعورِ زیست کہاں کب سفر سمجھتا ہے — وہ میہماں جو سرائے کو گھر سمجھتا ہے
ہیں خشت خشت رقم واقعات عبرتناک — اک عام شخص جنھیں بس کھنڈر سمجھتا ہے
کچھ اس سے پہلے کہ ہو جائے اختتامِ سفر — بشر ضرورتِ زادِ سفر سمجھتا ہے
یقین کرتا کہاں ہے کسی پہ کوئی مگر — مرا ضمیر مجھے معتبر سمجھتا ہے
وہ بدگماں ہے تو ہو کون اس کو سمجھائے — میں بے وفا ہی سہی ، وہ اگر سمجھتا ہے

Idara - E- Alhasnaat, Rampur (U.P.)



صغیر منظر

مطمئن ہے وہ تو گل بوٹے سجا کے ہات میں — باغ مہکاتا ہے اب بادِ صبا کے ہات میں
آپ موسم دیکھنے چھت پر نہیں جائیں ابھی — بادلوں کی ڈور ہے پاگل ہوا کے ہات میں
کر نہیں پائے گی اپنے اور پرائے میں تمیز — تم کبھی تلوار مت دینا انا کے ہات میں
آبگینہ ٹوٹ جائے گا گرا جو سنگ پر — آئینہ مت دو کرم ناآشنا کے ہات میں
اپنی بربادی کا کوئی غم نہیں منظر مجھے — جانتا ہوں میں بقا بھی ہے فنا کے ہات میں

Near Kaharwadi Masjid, Khandwa - 450001 (M.P.)

جاوید اختر آزاد

دل میں کسی کے شوقِ شہادت نہیں ہے کیا — خوددار اہلِ حق کی طبیعت نہیں ہے کیا
اپنے لہو کا ذائقہ چکھنے لگے ہیں لوگ — ان کے لہو میں کوئی کثافت نہیں ہے کیا
مانا کہ اضطراب مسلسل ہے ذات میں — اس درد سے نجات کی صورت نہیں ہے کیا
دیوار اتحاد سے رسنے لگا ہے خون — بارِ ستم اٹھانا شرافت نہیں ہے کیا
شرحِ حیات پڑھنے سے کرتے ہو کیوں گریز — اوراقِ زندگی میں فصاحت نہیں ہے کیا

Delawerpur, Monger - 811201 (Bihar)

مکتوبات

مارچ ۱۹۹۹ء

حیدر قریشی

ابرار مجیب صاحب نے "مابعد جدیدیت پر ایک مکالمہ" میں جو نفسِ مضمون پیش کیا ہے میں اس سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ تاہم ان کی اس بات پر تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ "بہت کم فنکار ہیں جو نئی صورتحال سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں..... Genetics نے تبدیلیٔ جنس کو ایک کھیل بنادیا، ہمارے یہاں فنکار اس المیے سے واقف ہی نہیں (تخلیقی سطح پر)..."

میرا خیال ہے کہ محض نئی صورتحال سے مکالمہ کرلینا کسی فن پارے کو اچھا فن پارہ، نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس میں تخلیقی رچاؤ شامل نہ ہو۔ اور نئی صورتحال سے مکالمہ کیے بغیر بھی اچھا فن پارہ تخلیق ہو سکتا ہے۔ "مابعد جدیدیت" نے مصنف کی موت کا اعلان کیا تو غیر ارادی طور پر میرے ایک شعر میں مصنف کے باطن سے ابھرنے والی زندگی کا اظہار ہو گیا:

داستاں گو کی ذات سے ابھرے
جتنے کردار داستاں کے تھے

ایسی اور بھی متعدد مثالیں ہمارے ارد گرد موجود ہیں لیکن میرا خیال ہے ادب کو کسی ایک ہی نظریے یا ڈسپلن کے حوالے سے دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ مابعد جدیدیت سے پہلے ہی ہماری نئی تنقید نے ادب کی ہمہ گیری کو محسوس کر کے امتزاجی تنقید کی اہمیت کا احساس دلا دیا تھا۔ تبدیلیٔ جنس والی بات بھی اب پیچھے رہ گئی کہ ہم تو کلوننگ اسٹیج میں آگئے ہیں۔ تاہم کسی بھی برق رفتار تبدیلی کا عکس یا اثر ادب میں بھی اتنی ہی برق رفتاری سے دیکھنے کی طلب کرنا، اچھے ادب کے مقابلے میں مصنوعی ادب کے فروغ کا باعث بنے گا۔ جو ادب اپنے اندر کے رچاؤ سے معرضِ وجود میں آتا ہے وہی اچھے ادب میں شمار ہوگا جبکہ تیز رفتار تبدیلیوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے لکھا جانے والا ادب شاید تخلیق کے داخلی تقاضے پورے ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔

میں نے ابرار مجیب صاحب کے بنیادی موقف سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے یہ وضاحتیں کرنا ضروری سمجھا ہے۔

●Auf der Roos 7, 65795 Hattersheim I, Germany

انجم عثمانی

آپ کا اداریہ "غزل: ۲۱ویں صدی میں" ایک بار پھر ایک ایسے مسئلے کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ جس پر اگر خاطر خواہ توجہ نہ کی گئی تو آنے والی صدی میں ہماری زبان اور زبان کے حوالے سے تہذیب کو ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا ہے۔ آپ کی تحریر ایک دل دردمند کی ہوشمندانہ تحریر ہے۔ میری کتاب ٹیلی وژن نشریات پر تبصرے کی اشاعت کا شکریہ۔ ۱۹۹۶ء کی کتاب پر اگر ۱۹۹۹ء میں بھی تبصرہ ہو جائے تو غنیمت ہے۔ بہت سے جرائد کو تو یہ توفیق بھی نہیں ہوئی۔ کس بوتے پر کوئی محنت کرے۔ محافظ حیدر صاحب کا تبصرہ ان کی ژرف نگاہی اور انصاف کا مظہر ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے محافظ حیدر سے زیادہ مناسب کوئی اور نہ تھا۔ ان کی رائے میرے لئے بہت قیمتی ہے۔

●557, Laxmi Bai Nagar, New Delhi - 23

ذکاء الدین شایاں

شاعر شمارہ مارچ ۹۹ء کا بغور مطالعہ کیا۔ افسانے بہت معیاری ہیں اور سلیقے سے منتخب کیے گئے ہیں۔ نظموں کے مقابلے میں غزلیں زیادہ باوزن ہیں لیکن کچھ غزلیں مایوس کرتی ہیں اور چند ایک ایسی بھی ہیں جنھیں بے وجہ اولیت دی گئی ہے۔ بشیر بدر اور شہریار کی غزلیں سرفہرست ہیں۔ مواد اور اسلوب کے تعلق سے محمود شیخ نے اپنے مقالے تصوف اور نفسیات ادب میں ان موضوعات پر سینکڑوں کتابوں میں کہی ہوئی باتوں کو اپنی تحریر میں ایسا خلط ملط کر دیا ہے کہ مرکزی رشتہ بکھر گیا ہے۔ جنس، مادیت کا سیلاب، معاشرے کی بدعنوانیاں وغیرہ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج کے اس دولت اور ہوس پرست اور جنس زدہ خراب معاشرے کو 'مذہب' یا 'تصوف' کیوں کر قابو میں کر سکتا ہے؟ جبکہ یہ ماحول ان کے قائم کردہ حدود سے باہر ہو چکا ہے۔ اور خود یہ ادارے بھی اپنی حقیقی عملی حیثیت کھو چکے ہیں۔

غزل، کمپیوٹر اور مشینی دنیا کے تعلق سے کیا آپ ۲۱ویں صدی کے "ادب" کو صرف "آواز" میں قید کرنا چاہتے ہیں؟ اور 'کتاب' سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ابھی ۲۱ویں صدی کو آتے آتے بھی تیس یا چالیس سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ 'مشینی زندگی' کا آغاز تو ڈیڑھ صدی پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ انسان، انسان رہے گا، آپ اسے کبھی مشین نہیں بنا سکتے۔ یہی 'فرد' اور 'معاشرہ' کا مسئلہ ہمیشہ رہے گا۔ 'ادب' کو 'تحریر' سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ اسے غزل یا موسیقی کے سہارے 'تفریحِ طبع' کے لئے آپ (کچھ دیر کے لئے) آواز اور کمپیوٹر میں ڈھال تو سکتے ہیں لیکن اس کی 'تحریری' اور اس کی مدد سے تصوراتی قوت کو ختم نہیں کر سکیں گے۔

● Near Old City Post Office, Pakaria Pilibhit - 262001

فاروق راھب

شاعر کا ہر شمارہ آپ کی محنت اور جاں سوزی کی کہانی کہتا ہے۔ تازہ شمارہ (مارچ ۹۹ء) میں نظیر صدیقی کی تحریر کے جواب میں آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ شاعر کی اپنی لامحدود گلوبل ریڈر شپ ہے۔ "ایک کھڑکی کھلی ہے ابھی" کی اشاعت کا شکریہ! اس کہانی کی تعریف میں کچھ خطوط آئے ہیں۔ میں اپنے ان قارئین کا شاعر کے ذریعہ شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اپنے تعریفی کلمات سے نوازا۔ انیس رفیع میں یہ خوبی ہے کہ وہ جس ماحول میں رہتے ہیں اس میں ڈوب کر ہی اپنی کہانی کو جنم دیتے ہیں۔ 'قبا کلی' پسند آئی۔ منیر الدین احمد نے جرمن کی ایک عمدہ کہانی کا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ ان سے اور بھی ترجمے کرائیے۔ دیگر تخلیقات بھی دیرپا اثر قائم کرنے والی ہیں۔

●Shanti Puri, Motihari, 845401 (Bihar)

انوار انصاری

آپ کا اداریہ "غزل: ۲۱ویں صدی میں" بھرپور

ہے۔ میری بھی ذاتی رائے ہے کہ غزل تو ہندوستانی تہذیب کا مزاج ہے۔ یہ ہندوستان کی عظیم قوت ہے۔ نجی گفتگو میں غیر اردو داں حضرات بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ غزل کے اشعار سنانا فخر سمجھتے ہیں۔ اب تو ہندی ادب میں بھی غزل کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ کوی سمیلن میں ہندی کا شاعر بھی 'ہندی غزل' سامعین کو سناتا ہے اور واہ واہ کے ڈونگرے بٹورتا ہے۔ انیس رفیع کی کہانی مواد کے لحاظ سے تو کوئی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہاں ان کے انداز بیاں نے کہانی کو منفرد بنادیا ہے۔ فاروق راہب کی کہانی بھی اچھی ہے۔ غزلوں میں بہت گہرائی ہے۔ آپ نے بہ یک وقت کئی معیاری فن کاروں کی غزلوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے پرویز یداللہ مہدی کا انشائیہ بھی خوب ہے۔

● Audit Officer (Ptd), Old H.B. Road, Ranchi (Bihar)

شهاب اختر

مارچ ۹۹ء کے شمارے میں ادبی فیچر کے تحت مظہر الزماں خاں کی باتیں دل کو لگ گئیں۔ کتنی سچی باتیں لکھی ہیں انھوں نے۔ افتخار بھائی! اس کی اشد ضرورت ہے سچ ہے اگر ایسی صورت عام ہو گئی تو کہاں نظر ادیب کی، کہاں کی دور اندیشی۔ ایسا دور صحرا ہو گا جہاں آنکھیں ہی نہ ہوں گی۔ پھر وقت سے آنکھ ملائے کون؟۔ شاعر میں صفحات کے اضافے کے لئے شکریہ۔ محمود شیخ کا مضمون بے حد پسند آیا۔ بہت معلوماتی مضمون ہے۔ ان سے اور بھی مضمین لکھوایئے۔ علیم اللہ حالی اور علی ظہیر کی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔ غزلوں میں شہریار، عزیز پریہار، بشیر بدر، اور شمس تبریزی پسند آئے۔ پرویز یداللہ مہدی کی نثر اور طنز خاصہ پر اثر ہے۔ بخطِ شاعر میں زبیر رضوی اور صادق صاحبان کا کلام اچھا ہے۔

● Calcutta Cloth Store, Kapra Patti, Jhria (Bihar)

سمیع الدین اطہر

مارچ ۹۹ء کے شمارے میں مجھے "تصوف اور نفسیات ادب" روایت سے ہٹ کر مضمون نے بے حد متاثر کیا ہے۔ محمود شیخ، مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اسی طرح نظموں میں سرشار صدیقی کی 'حرارت' زبیر رضوی کی 'بساط دل سمیٹ لو' اور 'پیار کا سپنا' بہترین نظمیں ہیں۔ ادبی فیچر میں 'مابعد جدیدیت پر ایک مکالمہ' ایک اچھی بحث ہے۔ ادبی فیچر کو ہر ماہ جاری رکھیے۔

● Ghazal Villa, Yunus Colony, Aurangabad (M.S.)

مشتاق انجم

شاعر کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ مارچ کے شمارے میں انیس رفیع کی کہانی 'قبا کلی' بہت پسند آئی انیس رفیع پرانی ڈگر سے لوٹ آئے ہیں۔ مبارکباد۔ اپریل کے شمارے میں جتندر بلو نے واقعی کمال کر دیا۔ افسانہ 'بازار' ایک عمدہ اور فکر انگیز ماحول میں لے جاتا ہے اور سماجی حقیقت نگاری کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ خوشی اس بات پر بھی ہوئی کہ شاعر کے ذریعے اچھوتے اور عمدہ افسانے زیر مطالعہ آتے ہیں۔

● 16 - Cowies Ghat Road, Shibpur, Howrah - 711102

الف۔ ناظم

'شاعر' کے ہر شمارے میں نظم و نثر کے دونوں حصے ادبی سطح پر بہت متوازن اور معیاری ہوتے ہیں۔ یہ شمارہ بھی حسبِ سابق زیر نظر ہے۔ آپ کے اداریوں کے ذریعے بہت ہی اہم باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ آپ کا یہ کہنا (غزل اور فنون لطیفہ کے حوالے سے) کہ 'آج ہمیں اردو کے مستقبل کے لئے غزل کے اس بہت اہم کردار کو اپنے عمل کی روح بنانا پڑے گا' بالکل درست ہے۔ غزل میں محمود شام، مظہر امام، قربان آتش اور حفیظ انجم اچھے لگے۔ جیتندر بلو کے افسانے 'بازار' میں جادو ایسا اثر ہے۔ محافظ حیدر کے بعد یہ دوسرا افسانہ ہے جس نے مجھے بار بار پڑھنے پر مجبور کیا۔ یوسف عارفی کا 'غیر ضروری آدمی کی آخری شاپنگ' اور علی امام نقوی کا 'موسم' بھی پسند آئے۔ مبین صدیقی کا مقالہ بعنوان 'ردمابعد جدیدیت' بحث انگیز ہے۔ مبین نے بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ کئی اہم سوال اٹھائے ہیں جن کا مابعد جدیدیت کے اہل کاروں کے پاس کوئی جواز، جواب نہیں۔ اچھا ہوتا کہ وہ ان پانچوں شاعروں کے نام بھی واضح کر دیتے جن کی جانب انھوں نے اشارہ کیا۔

ایک حسین ترین شکایت کے لئے نوک قلم کو اشارہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اردو نثر لکھنے والے نثر و نشریات میں بے ضرورت انگریزی الفاظ اور جملے ٹھونس رہے ہیں۔ کیا اردو زبان میں الفاظ نہیں رہے؟ آپ چونکہ ایک معیاری رسالہ نکال رہے ہیں۔ رسالہ نہیں جوئے شیر نکال رہے ہیں اس لئے آپ اسے زیر بحث لائیں گے۔ میں آپ سے یہی توقع رکھتا ہوں۔

● 327 - Ghayaspur Nayi Basti, BisalPur, (Pilibhat) U.P.

اپریل ۱۹۹۹ء

احسان آوارہ

محترم پروفیسر گیان چند جس کے خط نمبر ۳ میں آگرہ اسکول کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ وہ ایک صاحب علم دانشور ہیں۔ لیکن شائد وہ اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ آگرہ ہی وہ مقام ہے جہاں اول اول فارسی اور ہندی کے دانشوروں نے سرکاری سرپرستی میں رہ کر تخلیقات کی تھیں اور یہ سلسلہ سکندر لودی کے عہد سے لے کر شاہجہاں کے عہد تک برابر جاری رہا تھا (جب تک کہ دارالسلطنت کو دہلی میں منتقل نہیں کیا گیا تھا) اس کے بعد دہلی جانے کے وقت سے یہ اسکول منقسم ہو گیا۔ وہ اس حقیقت سے بھی گریز کر رہے ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ اسکول میں جو واضح فرق ہے۔ وہ دو مختلف سوچ کا غماز ہے۔ بہر حال بقول شاعر ۔

آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ کیا اسی سلسلے سے منسلک ہو کر محترم جناب سیماب اکبر آبادی نے جو روایات شعری قائم کی تھیں کیا وہ ان سے پہلے اور بعد میں قائم رہی تھیں؟ اس لئے میری رائے میں آگرہ اسکول ایک حقیقت ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر مکمل تحقیق ہو۔ اور اس حقیقت کو ثابت کیا جائے۔ انہوں نے تو ایک سرے سے "اسکول" کو ہی درکنار کر دیا ہے اور اسکول کو دبستان کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ میں آگرہ گزٹ کے چند صفحات آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا، جس میں حوالوں کے ساتھ آگرہ کی ادبی روایات کا تذکرہ ہے۔ (آگرہ گزٹ کے کچھ صفحات کے عکس شاعر کی آئندہ کسی اشاعت میں دیے جائیں گے۔ ادارہ)

● Chaouni, Banda - 210001 (U.P.)

مہدی ٹونکی

ماہ اپریل کا شاعر ملا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد پابندی سے شاعر شائع ہو رہا ہے خوشی ہوئی۔ میرا اندیشہ غلط نکلا۔ غزل اور فنون لطیفہ پر نئے زاویے سے جو آپ نے اداریہ لکھا ہے وہ خوب ہے۔ کاش کوئی اس موضوع پر تفصیلی مضمون لکھے۔ سرورق اچھا ہے متاثر کیا، حامد اقبال صاحب کو مبارکباد۔ جتندر بلو کی کہانی 'بازار' بنا پیچ و موڑ کے سیدھی کہانی ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ آپ نے کہانی کی پیشانی پر جو نوٹ دیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ 'سیار کین وطن کی ذہنی پریشانیوں اور مسائل پر کہانیاں شاعر میں شائع ہوتی رہتی ہیں (صرف شاعر ہی سب سے زیادہ ان نئی اردو بستیوں کے افسانہ نگاروں کو شائع کرتا ہے) بہت سی ایسی کہانیاں ہیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا ہے اب نئے شمارے میں جتندر بلو کی کہانی پڑھ کر وہ کہانیاں یاد آگئیں۔ آپ کو اس کہانی کے چھاپنے پر اور جتندر بلو کو ان کی اچھی تخلیق پر دلی مبارکباد۔ کہانی دیر تک یاد رہے گی۔

گیان چند صاحب کے تینوں خطوط پڑھے، جی چاہا کہ ان کی کچھ باتوں پر (اعتراضات پر) لکھوں کہ ان خطوط کے بعد آپ کا 'عرض ہے کہ' پڑھا۔ آپ نے بہت سعادت مندی سے ان کے اعتراضات کا جواب دیا ہے پھر بھی اس مؤدبانہ جواب نے تفصیل ادھوری رکھی۔ تعجب ہے ڈاکٹر صاحب نے ہم عصر اردو ادب نمبر کو اچھی طرح سے دیکھے بنا پڑھے بنا اپنی رائے دے ڈالی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے فنکار، ناقد وادیب، چھوٹ بھیٹے، تخلیق کاروں کی تعریف و توصیف میں صفحات کے صفحات کالے کر رہے ہیں لیکن حضرت سیماب پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ بقول آپ کے محنت کا کام کون کرے۔ یہ ناقد وادیب حصول ناموری کے لئے قلم پکڑے ہوئے ہیں اردو کی خدمت سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں حضرت سیماب پر کام کرنے والا دور تک کوئی نظر نہیں آرہا۔ کہاوت ہے۔ یا تو کرے دردمند یا کرے غرض مند۔ اور دونوں باتیں آپ کے حصے میں آتی ہیں۔ چلو، آج کل کے ناقدین نے Departmental Store کھول رکھے ہیں جو جیسا چاہے لکھوائے لیکن محققین کو کیا ہوا؟

ایک بات عرض کروں۔ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے صفحہ ۱۰۶ پر ٹونک کے جن شعرا حضرات کا نام دے رکھا ہے وہ میرے رشتہ دار تھے جو شاعر میں چھپتے تھے۔ جناب (صاحبزادہ) عبدالشکور خاں شکور میرے سگے نانا تھے۔ اسی لئے مجھے شاعر سے دلی لگاؤ ہے۔

● Mubarak Manzil, Panch Batti, Tonk (Raj.)

جمال اویسی

شاعر کے شمارے تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ کل ہی اپریل ۹۹ء کا شمارہ موصول ہوا۔ جرعات کے تحت آپ نے پھر غزل اور گائیکی غزل اور فنون لطیفہ جیسی بحث اٹھائی ہے۔ غزل کا انٹرنیٹ پر آنا ایک عجوبہ ہی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غزل اور اردو لازم و ملزوم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں آپ غزل پر ایک مبسوط کتاب بھی لکھ سکتے ہیں۔ آپ سے ایسے اداریوں کی مزید توقع ہے۔ کیوں کہ یہ اداریے ہجوم کاہ میں چنگاری کا کام کر سکتے ہیں۔ اس شمارہ میں سلطان اختر کی غزل بہت پسند آئی۔ خاص کر مطلع بہت اچھا لگا اور یہ شعر ۔

کوئی سر لائق تعظیم میسر ہی نہیں
دربدر لے کے وہ دستار ہنر گھومتا ہے

برادر عزیز حامد اقبال صدیقی کو میری بہت بہت مبارکباد! ان کی پینٹنگ شاعر کے ہر شمارہ کو بہت جاذب نظر بناتی ہے۔ وہ بہت باصلاحیت شاعر بھی ہیں۔ شاعر ہی میں ان کی غزلیں بھی کبھی کبھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔

● Mohalla Faizullah Khan, Darbhanga (Bibar)

رشمی بادشاہ

اپریل ۹۹ کا 'شاعر' ملا! اپنے بارے میں جناب اندر پرتاپ نیر صاحب کا اظہار خیال پڑھا۔ خوشی ہوئی! جو رائے انہوں نے دی اس کا شکریہ ! لیکن میں یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ میرے خیال میں اپنی شناخت دنیا کی شناخت سے زیادہ ضروری ہے۔ میں کم از کم اسی بات کی قائل ہوں کہ جس نے خود کو پہچان لیا اسی نے دراصل دنیا کو پہچانا ہے۔ انسان خود میں ایک مکمل کائنات ہے۔ علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر نے خوشحال خان خٹک کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ "اپنی خودی پہچان۔ او غافل افغان" اور ان کا یہ مصرع " اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی" کیا ہمارے لیے قابل غور نہیں ؟ کیا اب بھی کسی کو اس بات سے اختلاف ہو سکتا ہے؟

● Shri Deep, 2 - Jai Bhawani Society, Panchgani - 412805 (M.S.)

سلطان سبحانی

یہ دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہو رہی ہے کہ برادرم حامد اقبال صدیقی شاعر کے لئے بہت خوبصورت اور معنی خیز سرورق ڈیزائن کر رہے ہیں میری طرف سے مبارکباد اور شاباشی انہیں پہنچا دیجئے۔ جلد ہی میں بھی کوئی ڈیزائن روانہ کروں گا۔

● 193 - M.H.B. Colony, Malegaon - 423203 (M.S.)

فاروق احمد بسمل

"معیار! معیار! معیار" ارے بھاڑ میں گئے آپ اور آپ کا معیار۔ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سالوں سے آپ کو اپنا کلام بھیج رہا ہوں مگر آپ نے شائع کرنے کی غلطی بھی نہیں کی جبکہ میرا کلام ہندوستان کے بہترین سے بہترین رسالے میں شائع ہو چکا ہے۔ واحد ایک شاعر باقی ہے جس میں آج تک شائع ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کے (کہ) شاعر کس طرح کا کلام چاہتا ہے۔ آپ بھلے ہی غور نہ فرمائیں مگر شاعر میں بے تکا اور بے وجہ کلام اکثر چھپتا رہتا ہے۔ خرابی میری شاعری میں نہیں شاعر میں ہے۔ غم نہیں مجھے اگر آپ کوئی جواب نہ دے سکے کیوں کہ میں جانتا ہوں شاعر کسی کو حوصلہ نہیں دے سکتا ہاں مایوسیاں ضرور دے سکتا ہے۔ شاعر کا نام بدل ڈالئے اور معیاری رسالہ نام رکھ دیجئے۔

شاعر تم نے پھیری ہے نظر دیکھ کر
تم سے امید تھی حوصلہ دو گے تم

(اس خط پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں کہ ہمارا جواب مکتوب نگار کے خط ہی میں موجود ہے۔ ادارہ)

● Ward No.10. House No. 37, Udhampur (JK)

شاعر کے قارئین سے

● زر سالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے میں اپنا تعاون دیجئے۔ ● منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف صاف انگریزی میں ضرور درج کیجئے۔

● زر سالانہ بھیجتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنے مستقل خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

تنقید و تقریظ

سید خورشید عالم

پہلے ہی صفحے پر مصنف نے کتاب کے زیر عنوان تصریح کردی ہے کہ یہ "ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تازہ ادبی تھیوری پر ایک محدود نظر" ہے۔ اس انکسار ہی سے پوری کتاب کے اسلوب کا رویہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر پیش لفظ میں لکھا ہے کہ: "..... میں پروفیسر نارنگ کو یقین دلاتا ہوں، ان کی پیش کردہ ادبی تھیوری چونکہ دوررس نتائج کی حامل ہوسکتی ہے اس لئے اس پر اختلاف رائے کے حق کی حفاظت کرنے کی طرف یہ پہلا قدم ہے....."

حال ہی میں ساختیات اور پس ساختیات پر اردو کے ادبی رسالوں میں کافی گرماگرم بحثیں رہیں۔ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ گوپی چند نارنگ نے اس موضوع پر گراں قدر کام کیا ہے لیکن ان کی مخالفت بھی کافی ہوئی ہے۔ زیر نظر کتاب ان سے اختلاف کا ایک سنجیدہ، ثقہ، عالمانہ اور منطقی بحث کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ ٹیری ایگلٹن کی ادبی تھیوری پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس میں دیئے گئے حوالوں میں سے قاری کی دلچسپی کے لئے صرف دو حوالے پیش کئے جاتے ہیں :

"ان دنوں امریکہ سے چھپی ہوئی ایک کتاب دی میڈونا کنکشن کا کافی ذکر ہو رہا ہے جسے ملک کے ممتاز ماہرین ساختیات و پس ساختیات نے میڈونا کے جسمانی عضویات کے مطالعے کا محور بنایا ہوا ہے۔ میڈونا کی باڈی کیمسٹری کا سنجیدہ مطالعہ ساختیاتی اصولوں پر مبنی طریقے سے کیا جارہا ہے۔ یہی ہیں وہ عملی طریقے جن سے امریکی دانشور کسی طرح ثقافتی سرمائے سے مالامال اقوام کو فکری سطح پر اس سرمائے سے لاتعلق کرکے لامرکزیت کا فریب دینا چاہتے ہیں۔" (حیدر قریشی منشور کراچی، اگست ۱۹۹۵ء)

"علامات کے پرستارو۔ ادبی تنقید میں پس ساختیات کا دور شروع ہو گیا ہے۔ یہ دور بھی چھ ماہ سے لے کر ایک سال تک پورا ہو جائے گا۔" (ایڈورڈ سعید۔ نیویارک میگزین۔ مارچ ۱۹۹۱ء)

ساختیات اور پس ساختیات کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے، خصوصاً جنہوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب اور مضامین کا مطالعہ کیا ہے اور ان قارئین کے لئے بھی جو اس موضوع کو سمجھنے کے لئے اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا معروضی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔ کمپوزنگ کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ طباعت نفیس ہے۔ ضخامت : ۱۲۹ صفحات ○ قیمت : ۱۰ ڈالر ○ مطبوعہ : ۱۹۹۷ء ○ پتہ :

70 - Heather side Drive, Scarborough,

ONT. MIW IT7, Canada

جلیں آتش کدے

منظور الامین

اگر ایک ہی شاعر ایک ہی موضوع پر شاعری کرکے اسے کتاب کی شکل میں شائع کردے، اور اس ایک ہی موضوع پر نظمیں، غزلیں، مسلسل غزلیں، قطعات، رباعیات، سانیٹ، اور دوسری زبانوں سے اسی موضوع کی شاعری کے منظوم ترجمے اس میں شامل کرے تو اس شاعر اور اس کتاب کا ذکر سن کر ہی اکتاہٹ کا ردّ عمل طاری ہو جائے گا۔ چنانچہ اکتاہٹ ہی کی ذہنی کیفیت کے ساتھ راقم الحروف نے یہ کتاب پڑھنا شروع کی جس کا یکہ و تنہا موضوع "برف" ہے۔ لیکن "حرف آغاز" سے جو دلچسپی قائم ہونے لگی تو بڑھتی ہی گئی۔ زبان کے اعتبار سے شاعر قادر الکلام ہے ہی لیکن برف کے تعلق سے مضامین، تشبیہات اور استعارات حیرت انگیز ہیں۔ "حرف آغاز" میں برف کی سائنسی توضیح، جغرافیائی محل وقوع، اس کی کوہستانی اور سمندری قسمیں، ان کی خصوصیات اور تباہ کاریاں بڑی دل چسپ تفصیل کے ساتھ دی گئی ہیں جن سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ عنوانات کی کل تعداد ۸۶ ہے۔ انہی سے مضامین کے تنوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں : فصیل برف۔ سلطانی برف۔ طویل برف کی شب (ہونا چاہیے برف کی طویل شب) برف، تم، اور ہم۔ برف پارے۔ برف کا کرفیو۔ برف کے زخم۔ کاروانِ برف۔ دل یخ بستہ۔ برف کی شیشہ گری۔ برف کی آشفتہ سری۔ اے پاکیزہ برف۔

نظمیں تو متاثر کرتی ہی ہیں لیکن غزلوں میں برف سے متعلق جو شعر کہے گئے ہیں پرلطف ہیں۔ عشق کی سرگرمی میں بھی برف کا عمل اور دخل حیرت انگیز ہے۔

شب برف رسوا ہے خوار ہے، کہ طویل و تیرہ و تار ہے
ہوئی ختم اس شب کی تیرگی جو چراغ عشق جلالیا

برف کا موسم بھی ہے اور ساقیٔ گلنار بھی
بات کیا ہے شیخ صاحب پارسا کیوں ہوگئے

برف کی شکل میں کردیتا ہے فاش اس کو کوئی
سینۂ ابر میں جو راز نہاں ہوتا ہے

برف باری کی یہ رت اور میری خوش قسمتی
اور بھی کچھ پاس آجانے کا موسم آگیا

کوہ سے جب بھی زمستاں کی پری آوے ہے
برف اور برف کی آشفتہ سری آوے ہے

برف کی رات ہے، تنہائی ہے، مایوسی ہے
اپنی تقدیر رہی سوئی ہوئی برف کے ساتھ

منظور الامین اردو، ہندی اور انگریزی میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے رہے ہیں لیکن اس کا گمان بھی نہ تھا کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ خصوصاً ایک ہی موضوع پر اس طرح شاعری کرنا اور ایسی شاعری کرنا قابل حیرت بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔ معرا نظمیں بھی کہی ہیں لیکن زیادہ تر نظمیں پابند ہیں۔ آج کے دور میں جب کہ پابند نظمیں خال خال ہی پڑھنے کو ملتی ہیں یہ نظمیں پذیرائی کے لائق ہیں، خاص طور پر جو مثنوی کی بحر میں کہی گئی ہیں۔ طرہ یہ کہ منظور الامین کی نظر اسی موضوع پر دوسری زبانوں کی

نظموں پر بھی رہی جن کے انہوں نے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ ان میں فارسی، انگریزی، روسی، چینی، کشمیری، آرکٹک اور فرانسیسی زبانیں شامل ہیں۔

برف بار شاعری کی کتاب کا عنوان جچا نہیں۔ کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت ستھری ہے۔ گٹ اپ نفیس ہے۔ یہ کتاب ترقی اردو بیورو دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ (موجودہ فروغ اردو کاؤنسل) ضخامت : ۲۰۰ صفحات O قیمت : ۹۰ روپئے O مطبوعہ : ۱۹۹۴ء O پتہ : بی ۳۔ بنجارہ ہلز، حیدر آباد (آندھرا پردیش)

دوسرا قدم

(ایک طویل نظم) علی ظہیر

علی ظہیر شاعروں کی نئی کھیپ میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ "رات کے ہزار ہاتھ" اور "انگلیوں سے خون" کے بعد یہ ان کی تیسری کتاب ہے۔ اس طویل نظم میں ابتدائے آفرینش سے خیر وشر کی جنگ کا منظر نامہ تاریخ کے کئی ادوار کا احاطہ کرتا ہوا موجودہ دور تک، اور مستقبل میں اس کرے کی امکانی مکمل تباہی خود انسان ہی کے ہاتھوں دکھائی گئی ہے۔ علی ظہیر نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اپنی اس نظم کو اور نہ پھیلا سکنے اور مکمل طور پر تمثیلی یا علامتی بھی نہ بنا سکنے کا اعتراف کیا ہے۔ تو پھر یہ نظم کتابی شکل میں شائع ہی کیوں کی گئی؟ یا اسے شائع کرنے کی جلدی کیا تھی؟ اس پر اور زیادہ محنت اور محنت صرف کرکے اس کو اور طویل، لیکن غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے، اور زیادہ موثر بنایا جاسکتا تھا۔ اردو میں طویل نظموں کا رواج بہت کم ہے۔ ایسے میں یہ ایک یادگار تخلیق ہو سکتی تھی۔ عنوان کے جواز میں شاعر لکھتا ہے کہ : "اگر ساری کہانی ایک سلسلہ وار طریقے سے پڑھی جائے تو کوئی شکل ضرور بنتی ہے۔ بس اسی ایک نئی شکل بنانے کی کوشش کا نام میں نے 'دوسرا قدم' رکھا ہے۔" بات کھل کر سامنے نہیں آئی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ علی ظہیر کے لاشعور میں غالب کے بسے ہوئے اس شعر نے انہیں اپنی ایک تفسیر پیش کرنے پر اکسایا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

کتاب کی پیش کش عمدہ ہے۔ ضخامت : ۶۲ صفحات O قیمت : ۶۰ روپئے O مطبوعہ : ۱۹۹۲ء O ناشر : دکاس پبلشنگ ہاؤس، ۶۰۔۵۷۶، مسجد روڈ، جنگ پورہ، نئی دہلی۔

سعادت حسن منٹو (جائزہ)

وارث علوی

سعادت حسن منٹو اردو کا غالباً سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ وارث علوی نے اس کتاب میں اس کی زندگی اور شخصیت پیش کرنے کے بعد منٹو کی تمام تحریروں یعنی ڈراموں، خاکوں، مضامین اور افسانوں کا عرق ریزی سے مختصر تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اپنی ذہانت اور دوررس نظروں سے کام لیتے ہوئے چند ایسے نئے نکات پیش کیے ہیں جو اب تک دوسرے تنقید نگاروں کے قلم سے نہیں نکلے تھے۔ نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے لئے خاص طور پر یہ کتاب منٹو کی تخلیقات کو سمجھنے میں کار آمد ہوگی۔

ساہتیہ اکادمی نے "ہندوستانی ادب کے معمار" والے سلسلے کے تحت یہ کتاب شائع کی ہے جو ایک قابل ستائش اقدام ہے۔ قیمت کم ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔ ضخامت : سو صفحات O قیمت : ۱۵ روپئے O مطبوعہ : ۱۹۹۵ء O پتہ : ساہتیہ اکادمی، سواتی، سندر مارگ، نئی دہلی 11001

روشن اندھیرے

(سفر نامہ امریکہ) رضوان صدیقی

پاکستان کے افسانہ نگار رضوان صدیقی نے ممالک متحدہ امریکہ کے کئی شہروں کا آنکھوں دیکھا حال، اس سے پیدا ہونے والے تاثرات اور اپنے کئی رشتے داروں اور دوستوں سے وہاں ملاقات کی روداد پیش کی ہے۔ مشاہدوں کی قلم بندی دل چسپ ہے۔ جگہ جگہ امریکی باشندوں کی اجتماعی طور پر ڈسپلن سے جکڑی ہوئی زندگی اور انفرادی طور پر حاصل لامحدود آزادی کا تقابل خاصے کی چیز ہے۔ ایک طرف وہاں کے طرز زندگی اور بے شمار سہولتوں کے میسر ہونے کا تفصیلی تذکرہ ہے تو دوسری طرف خاص خاص باتوں کے لئے عام معلومات کا ذخیرہ بھی اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ، سرورق، تزئین و آرائش لائق تحسین ہے۔ ضخامت : ۲۲۴ صفحات O قیمت : ۱۵۰ روپئے O مطبوعہ : ۱۹۹۶ء O پتہ : ارسلان صدیقی، A/27، بلاک 13، گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

مبصر : حافظ حیدر ☆ 24/85 - S.V.P. Nagar, Mhada Andheri (W) Mumbai - 53

موسمی پرندے

انل ٹھکر

کہانیاں لکھنا خواب اور حقیقت کے درمیان سفر کرنا ہے۔ ہر ادیب کی تخلیقات میں ان کی آمیزش کا تناسب مختلف ہوتا ہے۔ کسی میں اس کی شخصیت اور مزاج کے اعتبار سے خواب کی کار فرمائی زیادہ ہوتی ہے کہیں حقیقت تخیل کی باگ تھامے رہتی ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی گزشتہ پچاس سال کی تاریخ بھی خواب سے حقیقت کا سفر ہے۔ آزادی کے وقت ہم نے ہر طرح کے تعصبات سے پاک مساوات واخوت اور آزادی کے علم بردار ایک سماج کا خواب دیکھا تھا۔ آج کا ہندوستان شکستِ خواب کا منظر پیش کر رہا ہے۔ انیل ٹھکر کے افسانے اس منظر کو پیش کرتے ہیں۔ جن حقائق سے ہم آنکھیں چرانا چاہتے ہیں وہ انھیں اپنی تمام تر تلخی اور بھیانک پن کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً افسانہ "ننھے شہسوار" کا ادیب جس نے معاشی آسودگی کی خاطر اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھایا، آج وہ آزردہ ہے کہ اس کی ادبی کامیابی میں اس کے بچے شریک ہونے سے قاصر ہیں کیونکہ وہ اس کی تخلیقی سرگرمی کی اہمیت کا زبان سے ناواقفیت کے باوصف اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح افسانہ "موسمی پرندے" کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے جس کا لڑکا روزگار کی خاطر امریکہ بس گیا ہے۔ برسوں بعد بیٹا اپنے بچوں کے ساتھ ہندوستان آیا ہے اور وہ اپنے پوتوں کو دیکھ کر نہال ہو رہا ہے لیکن انھیں چھوتے، پیار کرتے ڈرتا ہے کہ وہ ایک اجنبی تہذیب کے سائے میں پل رہے ہیں۔ اس کے پیار سے کہیں انہیں وحشت نہ ہو۔ "معجزہ" مذہبی جنون وتشدد اور بے راہ روی کا آئینہ ہے جس نے ہمارے سماج کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس افسانے میں بند روحشت و تخریب کا استغاثہ بھی ہیں اور فطرت کے اصول تخلیق کا بھی جس میں لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ "آرائش" میں یہی اصول تخلیق ایک بالکل نئے اور نازک زاویے سے بیان ہوا ہے۔ افسانے "گونگی چیخ" اور "ہم بھی نریندر مرا نہیں" آج کے سیاسی ماحول کی تلخ سچائیوں کا اظہار ہے اور انل ٹھکر کے فنی قابو کا شاہد ہے۔

انل ٹھکر جانے مانے ڈرامہ نگار اور ادیب ہیں۔ ان کے ڈراموں کے دو مجموعے اور افسانوں کا ایک مجموعہ

(آگے صفحہ ۳۴۴ پر دیکھئے)

کتـــــاب بـــــازار

شاعر میں تبصرے کے لئے موصول ہونے والی کتابوں کی خاصی بڑی تعداد دفتر میں جمع ہے۔ اس میں اضافہ روز افزوں ہے۔ تبصروں میں تاخیر کا احتمال ہے چنانچہ شاعر کا ایک پرانا کالم نئے عنوان کے ساتھ مکرّر شروع کیا جارہا ہے تاکہ نئی کتابوں اور رسالوں کا مختصر تعارف آسکے۔ نئے کتب و رسائل کے اعلانات دیئے جاسکیں۔ قارئین شاعر سے التماس ہے کہ اپنی پسندیدہ کتابیں اور رسائل کی خرید کریں اپنے باذوق احباب کو اچھی اور معیاری کتابوں کے بارے میں بتائیں۔ ان کتابوں کو موضوع بنائیں۔ (ادارہ)

☆**سب سخن میرے** ○ بزرگ شاعر واصل عثمانی کا یہ اولین شعری مجموعہ ہے۔ یہ شاعری کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ معاصر شعری منظر ناموں کی خوب سیرت شاعری ہے۔ نظموں غزلوں کی اس خوبصورت کتاب میں تابش دہلوی (واصل عثمانی اور میں) اسلم فرخی (دستک سے دل تک) اور خود واصل عثمانی کے عرض شاعر نے کتاب کو اور وقیع بنادیا ہے۔ اگست ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی اس کتاب کی ضخامت: ۱۴۵ صفحات۔ قیمت: ایک سو پچاس روپئے ہے۔ پتہ : P.O.Box - 2080, Damam - (KSA)

☆**جینے والے** ○ عابد سہیل کے افسانوں کا مجموعہ 'جینے والے' شائع ہوگیا ہے۔ قیمت: ۸۰ روپئے۔ پتہ : نصرت پبلی شرز، امین آباد، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸ (یوپی)

☆**ذہن جدید** ○ اردو قاری کو نئی نظم کے قریب لانے کی ایک اور کامیاب کوشش۔ اس بار ذہن جدید میں پڑھیے : ۱۹۸۰ء کے بعد کی اردو نظم کا انتخاب و تعارف۔ قیمت : تیس روپئے۔ ترتیب و انتخاب : زبیر رضوی۔ پتہ : P.O.Box No. 9879, New Delhi - 110025

☆**خیاباں** ○ معروف و مقبول شاعر سید حنیف اخگر کا یہ دوسرا شعری مجموعہ ہے (چراغاں: ۱۹۸۹ء) ۱۰۴ غزلوں پر مشتمل اس مجموعے میں حمد، نعت، منقبت، رباعیات اور قطعات بھی شامل ہیں۔ کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ فنی التزامات کے ساتھ معاصر شاعری کے لوازمات بھی اس میں موجود ہیں۔ جون ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والی کتاب کی ضخامت : ۲۵۴ صفحات اور قیمت: دو سو روپئے ہے پتہ: الرزاق پبلی کیشنز۔ کمرہ نمبر ۲۰۷، عرفان چیمبرز، ۱۳۰۔ ٹمپل روڈ، لاہور (پاکستان)

☆**اردو کا شجرۂ نسب** ○ خواجہ ریاض الدین عطش کی یہ دلچسپ کتاب اردو زبان کی ابتداء نشو و نما اور اردو کے متعلق دیگر معلومات کا تحقیقی منظر نامہ ہے۔ ۳۱ عنوانات کے تحت ان مضامین میں تنوع، تجسس، تحریر کی شگفتگی اور معلومات کی چاشنی بھی ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو اس موضوع پر بے شمار تحقیقی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اپریل ۹۸ء میں شائع ہوئی ۹۱ صفحات کی اس کتاب کی قیمت: دو سو پچاس روپئے (امریکہ میں ۱۵ ڈالر) ہے۔ پتہ : 4633, W.Medson Street, Apt.3D, Skokei, IL 60076 (USA)

☆ **Direcory** o اردو اخبارات اور رسائل کے موضوع پر انگریزی میں یہ نہایت ہی مفید، کار آمد اور جامع ڈائرکٹری ہے جسے آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے تحت شائع کیا گیا ہے اور اسے نہایت ہی دیدہ ریزی کے ساتھ مودود علی صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ حروف تہجی کے تحت اخبارات و رسائل کے تفصیلی اندراجات دئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۸ عنوانات کے ذیل میں جو معلومات اور اعداد و شمار، پتے وغیرہ دیے گئے ہیں وہ سب پہلی بار کسی ایک ڈائرکٹری میں پوری صحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ انگریزی میں یہ اولین ڈائرکٹری ہے جو اردو اخبارات و رسائل کے بارے میں ترتیب دی گئی ہے جسے اردو کے تمام اخبارات و رسائل کے دفتر میں ہونا چاہیے۔ م۔ افضل (صدر : آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس) اور مودود علی صدیقی کا یہ ایک زبردست کارنامہ ہے۔ جولائی ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی ۴۳۴ صفحات کی دیدہ زیب ڈائرکٹری کی قیمت : تین سو روپئے ہے جسے 1734۔ دکھنی رائے اسٹریٹ، دریاگنج، نئی دہلی ۔ 110002 سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆**خالد محمود نمبر** ○ انتساب (سرونج) ایک ایسا ادبی رسالہ ہے جس نے ادھر شخصیات پر گرانقدر ضخیم نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ رسالے کے مدیر سیفی سرونجی ایک کے بعد ایک خوب سیرت اور خوبصورت نمبر شائع کررہے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود نمبر تازہ ترین کڑی ہے اور اعتبار سے ایک قابل مطالعہ محفوظ کیا جانے والا نمبر ہے جس میں خالد محمود کی شخصیت و فن پر مشاہیر کے مضامین مختلف عنوانات اور ابواب کے تحت دئے گئے ہیں۔ خالد محمود کی تحریر کے رنگ کے باب میں خالد محمود کے انشائیے، تجزیے، مضامین، جائزے، ترجمہ اور اس کے بعد انتخاب کلام۔ خطوط، تصاویر وغیرہ کو ۵۳۶ صفحات میں سلیقے سے سجایا گیا ہے۔ ستمبر ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئے اس خاص نمبر کی قیمت: تین سو روپئے ہے۔ پتہ : سیفی لائبریری، سرونج 464228 (ایم۔پی)

☆**اردو نعت اور جدید اسالیب** ○ نعت گوئی کے موضوع پر عزیز احسن کی یہ ایک بالکل مختلف تنقیدی کتاب ہے۔ نعتیہ ادب کے لئے نقادوں کی کمی اور نئے نقادوں کے لئے یہ گرانقدر کتاب ایک مثالی ماڈل ہے جس کا مطالعہ نعت نگاروں کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ کتابوں کی بھیڑ میں ایک نمایاں کتاب جو دسمبر ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی ۱۸۴ صفحات کی اس گرانقدر کتاب کی قیمت ۱۲۰ روپئے ہے۔ پتہ : فضلی سنز پرائیوٹ لمیٹیڈ، اردو بازار، کراچی (پاکستان)

فکر امروز

اردو شاعری نے نظامِ حیات پر جس قدر احسان کیا ہے وہ بجائے خود ایک مبسوط تاریخ ہے شاعری ہمارے تمدن میں ، ہماری معاشرت میں ، ہماری سیاست میں اور ہماری عمرانی زندگی کی رگ رگ میں جذب ہو چکی ہے۔ مردہ قوموں کو ابھارنا، بجھے ہوئے احساس کو مشتعل کرنا اور عساکر کے قوائے عمل میں حزر و حد پیدا کرنے کے علاوہ الفاظ کے مخارج منضبط کرنا، زبان کے محاورات محفوظ کرنا۔ سوئی ہوئی فضاؤں کو جگانا، اور جاگنے والوں کو عمل کے لیے تیار کرنا اور تخیل کو ان ارتقائی خطوط پر پہنچا دینا جہاں دوسرے فنونِ لطیفہ کی رسائی ناممکن ہے ، صرف شاعر کا کام ہے۔

معزز حضرات ! شاعری اور شاعر کا یہ درجۂ عروج اور یہ ہمہ گیری موجودہ ارتقائی دور کا کوئی نیا معجزہ نہیں۔ (تیسرا خطبہ۔ مشاعرۂ امروتی۔ منعقدہ : ۲۹ر نومبر ۱۹۳۰ء)

سیماب اکبرآبادی

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری
شدہ
۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

شاعر

اشاعت کا
۷۰واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد ـــــ ۷۰
شمارہ ـــــ ۹

فون: 3829904

ستمبر ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ✿ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ✿ خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

عصمت چغتائی بنام مقصود الٰہی شیخ

عصمت چغتائی (پ: ۲۱ راگست ۱۹۱۵ء م: ۲۴ راکتوبر ۱۹۹۱ء بمبئی) کا یہ ایک اہم خط ہے جو ان کے سوانحی کوائف کے بعض گوشوں کے ساتھ ان کے ذہنی رویوں کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ واضح رہے کہ عصمت صاحبہ نے وصیت کی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد انھیں سپردِ خاک نہ کرتے ہوئے نذرِ آتش کیا جائے۔ مرحومہ کی وصیت کا احترام کیا گیا تھا۔ مشہور افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ بریڈ فورڈ (برطانیہ) میں مقیم ہیں اور ہفت روزہ 'راوی' کو ۲۵ سال بعد نئے ہاتھوں میں سونپ چکے ہیں۔ (بشکریہ: مقصود الٰہی شیخ) (الف الف)

Ismat Chugtai   3. Indus Court "A" Road Churchgate, Bombay 400 020   Tel 292140

16-12-77

مکرمی۔ تسلیم۔

اتنے دن بعد بھی آپ نے یاد رکھا۔ میں کسی کام سے بیس دن کے لئے دہلی گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر خط دیکھا۔ یہ پچھلے پندرہ دن بڑے ہنگامہ خیز گزرے۔ ۸ دسمبر کو میری بھتیجی کی شادی ہوئی اور ۹ دسمبر کو میری بھانجی کا میاں انتقال کر گیا۔ نوجوان ایرانی فلم کیمرہ مین تھا۔ شوٹنگ کر رہا تھا۔ سستانے کو باہر نکلا تو فوراً [illegible] تھا ایک معمولی سی [illegible] کی چار دری دیوار ہل رہی تھی۔ پاس کچھ بچے کھیل رہے تھے ایرانی نے دیوار گرتے دیکھی تو [illegible] کر دونوں ہاتھ [illegible]۔ بچے تو بچ گئے مگر وہ دب گیا اور کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آٹھ دن بعد آپریشن ہوا خون نہیں بند ہوا اور دوسرے دن ختم ہو گیا۔ بہت عزیز تھا جیسے تینتیس برس سے اسے جانتی تھی۔ پارسی تھا۔ خاندان سے پر جھگڑ کر اس کی شادی اپنی بھانجی سے کروائی۔ پندرہ برس زندگی کی بہاریں دیکھیں دو جڑواں لڑکی اور ایک لڑکی ہے۔ پارسی رسم و رواج کے مطابق انجام ہوا۔ زندگی میں پہلی بار پارسیوں کا قبرستان دیکھا۔ جنازہ تیار کر کے پہاڑی پر کوٹھی کی طرف لے گئے۔ ہم دور کھڑے دیکھتے رہے۔ تین بار [illegible] جانور منڈلانے لگے اور پانچ منٹ میں فیصلہ ہو گیا۔

مرنے کے بعد کیا فرق پڑتا ہے۔ چاہے مہینوں قبر میں کیڑے کھائیں یا منٹوں میں فیصلہ ہو جائے۔ منزل تو سب کی ایک ہی ہے۔

ماشاء اللہ بچے جوان ہو گئے کیا کر رہے ہیں۔ میں پچھلے سال پاکستان گئی۔ لوگ بڑی محبت سے ملے سب ہی اپنے نظر آئے۔ قریب ڈیڑھ ماہ رہی۔ لاہور پنڈی اور اسلام آباد بھی گئی۔ ادیبوں اور فنکاروں سے ملاقات ہوئی۔ تاریخی مقامات دیکھے۔ [illegible] کہانیاں سنیں اور سنائیں۔ بڑا ہنگامہ رہا۔ معلوم نہیں پھر اب کب آؤں۔

اسلام آباد بہت پسند آیا۔ نگینہ سا جڑا ہوا ہے۔ لاہور اور بھی سرسبز نظر آیا۔ کراچی [illegible] بڑھ رہا ہے۔ پاکستان جانا ہوتا ہوگا۔ بچوں کی شادیاں بھی وطن سے دور ہی کرنا ہونگی۔

میری دونوں لڑکیاں سیما اور صبرینہ سلام کہتی ہیں۔ بریڈ فورڈ والوں کو سلام دعا۔ ملنا تو ہوتا رہتا ہوگا۔ آج بھیم کا خط آیا ہے انہیں بھی جواب دے رہی ہوں۔

دل بہت بھاری ہو رہا ہے۔ ایرانی بچے بیٹے کی طرح عزیز تھا اور میرا بڑا خیال رکھتا تھا۔

بچوں کو پیار۔

زیادہ طالب

عصمت چغتائی (بمبئی)

سرورق
حامد اقبال صدیقی

✱

ہم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں
[قارئین و قلمکار]
۴۰

مکتوبات

مظہر امام	عبدالقوی دسنوی	احمد سہیل
ش صغیر ادیب	نامی انصاری	رشید الدین
بسنہاں	سلیم شہزاد	مناظر عاشق ہرگانوی
	اندر پرتاپ نیّر	
	۴۴	

شمارہ۔۹ [ستمبر ۱۹۹۹ء] جلد۔۷

اردو غزل ، نصاب ، اساتذہ اور طلباء

اس سے قبل کہ عالمی شاعری اور اردو غزل پر کوئی مکالمہ قائم کیا جائے ایک سوال ابھرتا ہے کہ غزل ہمارے نصابوں میں، ہمارے اساتذہ اور طلباء کے درمیان اب کن حالات سے گزر رہی ہے؟ اور یہ کہ غزل کا جو ورثہ ہے، نئی نسل اس ورثے سے کس طور اور کس قدر استفادہ کر رہی ہے۔ غزل کی تدریس کے ذمہ دار اساتذہ خود غزل کے بارے میں کتنا شعور رکھتے ہیں؟ محض چند کلاسیکی شعرا یا حالیہ برسوں کے گنے چنے شعرا کی غزل کا درس دینا اور غزل کے پورے سرمائے سے واقفیت کے بعد غزل کی تدریس کرنا، دو الگ باتیں ہیں۔ کیا غزل کو غزل کی طرح پڑھایا جا رہا ہے؟ کیا غزل کے بارے میں علاحدہ سے کوئی بنیادی کتاب داخلِ نصاب ہے؟ اور اگر ہے تو وہ اب کتنی قابلِ مطالعہ ہے؟ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے ہاں غزل ناگزیر تھی لیکن غزل پر وہ توجہ نہیں دی گئی جو ماضی میں اساتذہ اور ان کے تلامذہ نے دی تھی۔ نظم اور وہ بھی آزاد نظموں کے رواج نے نظم کو رواج دینے والوں نے، شعرا اور نقادوں نے غزل پر وہ توجہ نہیں کی جو اس صنفِ سخن کے لیے درکار تھی لہٰذا زندہ صنف، زندہ تو رہی لیکن اس میں سموئی جانے والی، تخلیق کی جانے والی شاعری کمزور ہوئی اور غزل کو ہدف بنایا گیا۔ دبستاں نہیں رہے۔ اساتذہ کی اہمیت نہیں رہی، فن پر گرفت کمزور ہوئی۔ غزل کا سفر جاری رہا لیکن اس کے برتنے والوں نے غزل کو اپنا فخر نہیں بنایا اور بہت روایتی میکانیکی انداز میں غزل کے ساتھ جڑے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ غزل کے اس کردار کو نہیں اپنایا جو سماجی سیاسی اور ثقافتی سطح پر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہی اور کر رہی ہے۔ اردو کے اساتذہ اور طلباء کے درمیان غزل کا رشتہ وہ نہیں رہا جو اب سے کچھ دہائیوں قبل تھا۔ اب نہ پڑھانے والوں کو کوئی ذوقِ مطالعہ رہا اور نہ ہی پڑھنے والوں میں شوقِ مطالعہ رہا۔ ہندوستانی زبانوں کی شاعری اور غیر ملکی زبانوں کی شاعری کے درمیان صنفِ غزل کے ساتھ خود کو رکھنے والے اردو اساتذہ، نقاد اور شعراء کہیں نہ کہیں مرعوبیت اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس کرتے ہیں گویا غزل کوئی فرسودہ سی چیز ہے جو ان سے، ان کے ادب سے اور ان کی روایت سے زبردستی چمٹی ہوئی ہے۔ غیر اردو داں غزل پسند ذہنوں میں یہ خیال بسا ہوا ہے کہ غزل تو میر و غالب یا فراق و فیض ہی سے عبارت ہے۔ یا پھر غزل وہ ہے جو غزل سنگر س گا رہے ہیں، کہیں کہیں معیاری اور بیشتر غیر معیاری۔ ہمارے نصابوں اور ہماری درس گاہوں میں غزل کا ایک بنا بنایا پیٹرن ہے جو مدتوں مدت سے چلا آرہا ہے۔

ہماری درس گاہوں، نصابوں، اساتذہ اور طلباء کا ازسرِ نو جائزہ ضروری ہو گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ صنفِ غزل ان لوگوں کے درمیان اب کس حال میں ہے اور غزل کے مستقبل کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے خاص طور پر اس کے اس بنیادی کردار کے بارے میں جس پر شاعر کے اداریے لکھے جا رہے ہیں۔ ان وجوہ اور اسباب کا بھی جائزہ لینا ہے جن کے سبب یہ ذہین صنفِ سخن بیسویں صدی کے نصف آخر میں قدرے دھیمی اور کمزور پڑی ہے (بلحاظ کیفیت نہ کہ صنف) ہمارے خیال میں تو بظاہر ایسا ہوا ہے۔ اگر کام کیا جائے تو نئی غزل کے انتخاب سے معیاری غزل کے ماڈل تیار کیے جا سکتے ہیں۔ نئی غزل کی خوبیوں اور خامیوں پر مکالمہ ہو سکتا ہے۔ نئی غزل کے نئے اسالیب پر بات ہو سکتی ہے۔ غزل میں کیے جانے والے فنی تجربوں پر بات ہو سکتی ہے۔ جدید غزل کے لیے جو منظم تحریری و تقریری کام ہونا چاہیے وہ چونکہ ہوا نہیں ہے لہٰذا غزل کی تہذیب سے ہمارے اساتذہ کی واقفیت بھی کم ہوتی جا رہی ہے یوں بھی اساتذہ اپنے طلباء کے لیے آئینہ ہوتے ہیں لیکن اب یہ آئینے دھندلا رہے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ غزل کے حوالے سے ہماری یہ مسلسل گفتگو نظم مزاج ذہنوں کو، غزل مخالفین کو زہر لگ رہی ہے اور وہ جز بز ہو رہے ہیں لیکن ہمیں ان لوگوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ ہماری آواز، ۲۱ویں صدی کی آواز ہے۔ یہ اس غزل کی آواز ہے جو اردو زبان کا مسلسل دفاع کر رہی ہے۔



فضا ابن فیضی

رخ ہوا کا ہے، پھر اک بار پلٹنے والا
اب یہ کہسار بھی، ذروں میں ہے بٹنے والا

ہر طرف، شعلے کی تحریر نظر آتی ہے
کون ہے، برف کے اوراق الٹنے والا؟

تو، ہوا باندھ کے پیروں سے، یہ رستا طے کر
فاصلہ بیچ کا، پھر بھی نہیں گھٹنے والا

دھول بھر جائیگی آنکھوں میں، نہ یوں غافل رہ
بس، دو اک پل میں، یہ منظر ہے سمٹنے والا

میں کہ تم، دونوں، یہاں اپنے انا کی ہیں فصیل
راستے سے، کوئی پتھر نہیں ہٹنے والا

جس میں شامل ہے، مرے تیرے لہو کی خوشبو
آج، وہ ترکۂ اجداد ہے بٹنے والا

نہ دکھا زخم مجھے، ذات کی تنہائی کا
مجھ سے، اب رابطہ میرا بھی ہے کٹنے والا

آگہی لفظ کی، معنی کی بصیرت کیسی؟
وہ تو ہے بس، مرا آموختہ رٹنے والا

آج اس سانپ کا سر میں نے کچل ڈالا فضاؔ
وہ جو اک سانپ تھا صندل سے لپٹنے والا

● Maunath Bhanjan (U.P.)



محسن زیدی

جو سانحات مرے ساتھ روز و شب گذرے
تمہارے ساتھ تو وہ سانحات اب گذرے

جھکا کے سر کسی دربار و در سے کب گذرے
کہ جب بھی گذرے اسی طرح بے ادب گذرے

ترا ستم تو زمانے پہ آشکارا تھا
ترے کرم پہ مگر شک عجب عجب گذرے

نسیم صبح دبے پاؤں جانے کب آئی
نہ جانے رہ گذر خواب سے وہ کب گذرے

خزاں نصیبوں کا بس تم سلام کہہ دینا
چمن سے قافلۂ نوبہار جب گذرے

کوئی بتاؤ کہاں جا کے اب وہ پیاس بجھائیں
سمندروں سے بھی ہو کر جو تشنہ لب گذرے

محیط کب سے ہے آسیب کی طرح محسنؔ
دعا کرو کہ کسی طور اب یہ شب گذرے

● 18/53 Indira Nagar,
Lucknow - 226016 (U.P.)



صدیق مجیبی

غضب ہوتا جو لہجہ اور سادہ کرلیا ہوتا
کتاب دل تھی حاضر، استفادہ کرلیا ہوتا

صبا سارا گلستاں چھوڑ کر تم سے لپٹ جاتی
ذرا چاک گریباں گر کشادہ کرلیا ہوتا

کوئی منظر کسی کا دل دکھائے یہ نہیں چاہا
ردا ورنہ تھی زخموں کی لبادہ کرلیا ہوتا

یہ تلخی باعث آرام جاں ہوتی اگر میں نے
غم جاناں تجھے ہمرنگ بادہ کرلیا ہوتا

نہ جانے زندگی رسوا تو کرتی اور کس کس کو
اگر میں نے بھی مرنے کا ارادہ کرلیا ہوتا

جو ہوتا وصف کوئی تو مجیبیؔ یوں سزا ملتی
بنا کر بت زمانہ ایستادہ کرلیا ہوتا

● Bihar Urdu Acadamy,
Urdu Bhavan, Ashok Raj Path
Patna - 800004 (Bihar)

فن، متنِ محض، معاصر شعر و ادب اور قاری

ادبی فیچر

شاعر کے ہر شمارے میں شائع ہونے والی منظومات کو اچھی طرح پڑھا، پرکھا اور پھر منتخب کیا جاتا ہے مگر ہزار احتیاط کے بعد بھی فنّی اغلاط راہ پاجاتی ہیں۔ سہواً تو کبھی کمپوزنگ اور پھر تصحیح کے باوجود۔ کسی معیاری ادبی رسالے کے مندرجات ہر اعتبار سے معیاری ہی ہونے چاہئیں، یہ ضروری ہے تاہم سوفیصد ایسا ہی ہو، یہ ممکن نہیں حالانکہ شاعر میں در آنے والی غلطیوں سے اپنے تسامحات سے ہم خود ہی شرمندہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہم اپنی کاوشوں میں بہت حد تک کامیاب بھی رہتے ہیں اور جو دوچار فنّی جھول منظومات میں رہ جاتے ہیں ان کے بارے میں بطورِ خاص علامہ شارق جمال کے تنقیدی شذرات کو 'ادبی فیچر' میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس سے ہمارا ایک خاص مقصد بھی وابستہ ہے کہ نئی نسل کو فنی شاعری سے متعارف کروایا جائے اور وہ جو ترقی پسندوں، جدیدیوں نے استادی، شاگردی اور دبستانوں کو پیرویٔ مغرب کے چکر میں بے معنی قرار دیتے ہوئے ختم کردیا تھا اس کا ازسرِ نو احیاء ہوسکے۔ چونکہ ہمارا موضوع ان دنوں صنفِ غزل ہی ہے اور غزل ہی کو ہم اپنا عنوان بنائے ہوئے ہیں لہٰذا ہماری بھرپور کوشش یہی ہے کہ اچھی، سچّی اور معیاری غزلیہ شاعری تخلیق ہو، نئے شعرا مشقِ سخن کریں، ریاضت کریں، مطالعہ کریں۔ اپنے شعری کلاسک کو پڑھیں کہ صنفِ غزل کے ساتھ دیگر شعری اصناف میں ہمارا ورثہ بے حد غیرمعمولی ہے۔ غزل مخالفین نے فن کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ہم اسی طرف آرہے ہیں اور یہ سلسلہ مختلف صورتوں میں، مباحث میں گاہے گاہے شاعر کے صفحات پر، غزل کے حوالے سے جاری رہے گا۔

ہم عصر اردو ادب نمبر پر مختصر و طویل خطوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ پوری ادبی دنیا میں اس کی زبردست گونج ہے اور موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ مکالمہ روشن ہورہا ہے کیوں کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ یہ اپنے قاری پر طرح طرح سے منکشف ہوگا۔ ادبی فیچر کے تحت ایک اہم اور طویل خط دیا جارہا ہے ادارۂ شاعر کا مکتوب نگار کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں اور ہم اختلافی امور پر قلم لگانا بھی نہیں چاہتے تاوقتیکہ ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ حبیب حق صاحب نے کئی اہم ادبی امور اور مسائل پر اپنے زاویۂ نگاہ سے لکھا ہے۔ ہم نے ہم عصر اردو ادب نمبر میں اپنے ادارتی شذرات میں نئے پرانے ادبی موضوعات و مسائل کو اپنے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کی ہے بہت غیر جانبدار ہوکر۔ یہاں صرف علامہ سیماب سے متعلق چند باتیں ضرور عرض کرنی ہیں۔ علامہ کے کاروافکار اتنے وقیع، تنوع اور گہرے ہیں کہ جب بھی یہ نابغۂ روزگار، قد آور شخصیت از سر نو تخلیق ہوگی دنیا حیران رہ جائے گی کہ بیسویں صدی نے اپنی صدی میں اس آسماں صفت کو نہیں پہچانا اور ۲۱ ویں صدی اس پر فخر کرے گی۔

حبیب حق صاحب نے اپنے طویل مکتوب میں مابعد جدیدیت، متنِ محض، منشائے مصنف وغیرہم کی طرف جو اشارے کیے ہیں اسی کی توسیع کے طور پر مظہرالزماں خاں نے بھی گفتگو کی ہے اور بہت اہم گفتگو کی ہے۔ یہ بحث جاری رہے گی۔ (الف۔الف)

فنِ شاعری کا جاننا ضروری ہے

شارق جمال



دنیائے اردو شاعری میں اک زمانہ تھا کہ استادی اور شاگردی کا عام رواج تھا۔ ہر طبقے کے شعراء بغیر کسی استادِ فن کو اپنا کلام دکھائے کہیں پڑھتے تھے نہ ہی اشاعت کے لیے بھیجتے تھے اور نہ ہی اسے کتابی صورت میں لاتے تھے۔

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے اپنے زمانے میں ان کے تلامذہ کی کثرت تھی۔ داغ کے بعد علامہ سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ غیر منقسم ہندوستان کے ہر صوبے میں موجود تھے۔ بعد ازاں علامہ کے تلامذہ میں شفا گوالیاری اور استاذی طرفہ قریشی بھنڈاروی کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی بڑھی ہوئی تھی۔ مرزا داغ کے شاگرد احسن مارہروی کے شاگرد رشید ابر احسنی انصاری گنوری کے شاگردوں کی تعداد بھی خوب تھی۔ یہ اساتذہ فنی، عروضی اور لسانی عیوب سے اپنے شاگردوں کے

کلام کو پاک کرنے کا مشن جاری رکھے ہوئے تھے۔ اصلاحِ سخن کے ذریعے ہر طرح کے سقم سے شاگرد کو آشنا کرنے کے ساتھ ان الفاظ کی معلومات بھی دیتے رہے۔ جن کو متروکات کی فہرست میں لیا گیا تھا۔ خاص طور سے زبان و بیان کی صفائی کا یہ اساتذہ کافی خیال رکھتے تھے۔ فنی نقائص کے ساتھ لسانی عیوب کی نشان دہی کرنے کے ساتھ حروفِ علت دبانے۔ گرانے یا نہ دبانے۔ گرانے سے متعلق خصوصی نوٹ یا توجیہہ کے ذریعے شاگرد کی تربیت کیا کرتے تھے۔ الفاظ کے صحیح تلفظ اور وزن سے آگاہ فرماتے تھے۔ اس سب سے مذکورہ اساتذہ کے تلامذہ کا کلام کافی صفائی زبان والا اور اسقام سے پاک ہوا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد اسی طرح کی تربیت سے یہ شاگرد اس لائق ہو جاتے تھے کہ اپنے نو مشق شاگردوں کی خود تربیت فرمانے لگتے تھے۔ اس طرح مذکورہ اساتذۂ فن نے شعر و ادب کی خوب خدمت کی ہے۔ اب ایسے مصلح، اساتذۂ فن بھی نہیں رہے اور ان سے استفادہ کرنے والے طالبِ علم شاعری بھی نہیں ہیں۔

آج کے شعراء نے اسلوبِ نگارش کی تبدیلی کو ضروری تو جانا لیکن عروضی اور لسانی اسقام کی طرف سے لاپرواہ ہیں۔ بلکہ اسے ضروری ہی نہیں جانتے۔ کثرت ان شعراء کی ہے۔ جو ان فنی نقائص کی طرف سے چشم پوشی کیے ہوئے ہیں۔ ان میں نو مشق شعراء تو ہیں ہی، دیر مشق شعراء بھی ان مذکورہ اغلاط سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بچنے کی کوشش کرنا تو الگ رہا، ان نقائص کا علم بھی اکثر کو نہیں۔ بعض جو ان عیوب کو جانتے بھی ہیں تو تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں اور اپنے تخلیق کردہ شعر کو ناقص ہی رہنے دیتے ہیں۔

اردو شاعری میں حروفِ علت (ا۔ و۔ ی) کو دبانے۔ گرانے کا بھی ایک قاعدہ ہے۔ مثلاً عربی، فارسی کے الفاظ کے حروفِ علت کا جو لفظ کے آخر میں ہوں، درست نہیں۔ اس ضمن میں شوق نیموی شاگرد رشید شمشاد لکھنوی نے اپنی کتاب "اصلاح اور ایضاح" میں صفحہ ۱۹ پر تحریر کیا ہے کہ۔

"مؤلف بھی نہیں گراتا۔ بلکہ اکثر دیکھا کہ جہاں کسی نے (ی۔ ے۔ دونوں) گرائی۔ لوگ عیب فاش سمجھنے لگے۔ بلکہ غلطی پر محمول کرنے لگے۔"

لیکن ہندی اردو الفاظ سے حروفِ علت کا گرانا دبانا اکثر فصحا نے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ زبان کی سلاست اور فصاحت کسی طرح مجروح نہ ہو۔ جیسے علامہ سیماب کے ان شعروں میں یائے معروف و مجہول کو گرا کر وزن کو پورا کیا گیا ہے ۔

قسمتِ دہقاں میں عشرت مندئ حاصل کہاں؟
بجلیاں لہرائیں، جب کھیتی ہری ہونے لگی
عالم تو جانے کس مخلوق سے آباد ہو
آدمی میں آدمیت کی کمی ہونے لگی (لوحِ محفوظ ص ۔۷۹۔۸۰)

ان شعروں میں دو لفظ ہیں۔ پہلا "لہرائیں" دوسرا "جانے"۔ ان دو لفظوں میں یائے معروف و مجہول ہے۔ اور دونوں لفظ کی یا کو دبا کر وزن کو پورا کیا گیا ہے۔ اسے تقطیع میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ارکان، بحرِ رمل مثمن محذوف ۔

فا	علا	تن	فا	علا	تن	فا	علا	تن	فا	علا	تن	فا	علن
بج	لیا	لہ	را	ءِ جب	کے	تی	ہری	ہو	نے	لگی			
عا	لمے	نو	جا	نِ کس	مخ	لو	قسے	ا	با	دہے			

ان دونوں مصرعوں کو روانی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ اور یائے معروف و مجہول کے گرنے یا دبنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سلاست و فصاحت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی لکھا ہے۔ کہ جہاں حروفِ علت کے گرنے سے زبان کی سلاست اور فصاحت مجروح ہوتی ہے۔ وہاں ہندی، اردو کے لفظ کے حروفِ علت کو اہلِ فن نے دبانے سے گریز کیا ہے۔ حکیم منظور (سری نگر) کی ایک غزل "شاعر" مئی ۱۹۹۹ء کے شمارے میں صفحہ نمبر ۷ پر شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر ہے ۔

کیا کھلے دل لوگ تھے، در بھی کھلے رکھتے تھے وہ اب صدائیں بھی دے کوئی، در کوئی کھلتا نہیں

مندرجہ بالا شعر کے مصرع دوم میں ایک لفظ "دے" ہے۔ اس لفظ "دے" کی یائے مجہول کو دبا کر حکیم صاحب نے وزن کو پورا کیا ہے۔ جلد جلد پڑھنے پر مصرع مذکور کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ بھی، دے۔ لفظ "بھید" ہو جاتا ہے۔ اسے تقطیع میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ارکان، بحرِ رمل مثمن محذوف ۔

فا	علا	تن	فا	علا	تن	فا	علا	تن	فا	علن
اب	صدا	ئے	بی	دِکو	ئی	در	کئی	کھل	تا	نہی

یہاں حروفِ علت کو گرانے سے سلاستِ زبان و فصاحتِ زبان مجروح ہوئی ہے۔ مصرع مذکور کی فصاحت و سلاست کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے حکیم صاحب اک حکمت سے شعر یوں بھی کہہ سکتے تھے ۔ اب صدا بھی کوئی دے تو در کوئی کھلتا نہیں
حکیم منظور صاحب کی اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ۔

اس کو شبنم کی طمانیت کا ہو احساس کیوں ؟ جس نے دریا کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہیں

مصرع اولیٰ میں ایک لفظ طمانیت ہے۔ حکیم صاحب نے مصرع میں اس لفظ کا جو تلفظ قائم کیا ہے وہ غلط ہے۔ لفظِ مذکور میں "یا" غیر مشدد ہے۔ جبکہ وزن میں مشدد ہے۔ اس لفظ میں طہ۔ م۔ مفتوح ہیں۔ الف ساکن ہے۔ ن مکسور ہے۔ یا بھی مفتوح ہے۔ اور ت ساکن ہے دونوں حرفِ آخر ن۔ت سے پہلے ن سبب ثقیل ہے۔ ن + ی = نی

سبب خفیف نہیں ہے اس مصرع مذکور میں لفظ طمانیت کاوزن درست نہیں۔ یہ لفظ ارکن بحر ہزج مقبوض۔ "مفاعلن" کے وزن پر ہے۔ مثلاً ؎
مخالفت۔ پیامبر۔ صلاحیت۔ مکالمہ۔ منافرت وغیرہ کا ہم وزن ہے۔
اس لفظ کا صحیح وزن اس مصرع میں ہے ؎ "طمانیت کسی چہرے پہ کیوں نہیں آخر ؟ ؟ ؟"
تقطیع میں اس لفظ کا وزن بھی دیکھیں ارکان، بحر مجتث مثمن مخبون ابتر ؎

مفا	ع	لن	ف	ع	لا	تن	مفا	ع	لن	فع	لن
طما	نِ	یت	ک	بِ	چہ	رے	پ کوِ	ن	ی	॥	خر

مصرع کی تخلیق کے وقت شاعر کو چاہیے کہ روانی اور زبان کی سلاست و فصاحت کے لیے ہندی اور اردو کے حروف علت کو اسی جگہ دبائے جہاں فصاحت و سلاست مجروح نہ ہو۔ اور لفظ کا جو وزن ہے۔ اسی وزن کے مطابق شعر میں نظم کرے۔ حکیم منظور صاحب کا کلام اکثر میری نظر سے گزرا ہے۔ یہ نو مشق شاعر بھی نہیں۔ کافی کہنہ مشق ہیں۔ اس طرح کے اسقام سے انھیں بچنا چاہیے۔

اکثر شعراء مروجہ بحور سے ہٹ کر غیر مروجہ بحور میں طبع آزمائی کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ذرا سی غفلت کے سبب بہک جاتے ہیں۔ اور ارکان کی بحر سے مصرع کو خارج کر لیتے ہیں۔ مذکورہ شمارے میں ص ۴۲ پر اظہار سلیم کی بھی ایک غزل ہے۔ جو بحر ہزج مثمن محذوف میں ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف مروجہ بحروں میں ہے۔ لیکن مثمن محذوف ارکان میں اشعار کی تخلیق کم کی گئی ہے۔ اظہار سلیم نے مثمن محذوف ارکان میں غزل کے ۹ مصرع تو کہہ لیے یعنی ان ارکان میں ؎

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

لیکن ایک مصرع اولیٰ دوسرے نمبر کے شعر کا ؎ ہوا کی سازشوں سے باخبر رہنا ضروری ہے
بحر ہزج مثمن سالم ارکان ؎

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

میں کہہ گئے۔ کہ یہ ارکان، بحر مروجہ ہیں اور کثرت سے اس میں اشعار کی تخلیق ہوئی ہے۔ رواں دواں اس بحر میں شاعر کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ غزل میں ایک مصرع اور مصرعوں کے ارکان سے بڑا ہو گیا ہے۔ محذوف رکن کی بجائے سالم رکن ہو گیا ہے۔

اگر مذکورہ مصرع جو سالم رکن میں ہو گیا ہے اسے محذوف رکن آخر میں یوں کر لیا جائے تو تمام مصرعوں کے ہم وزن ہو جاتا ہے ؎
ہوا کی سازشوں سے باخبر رہنا ہے لازم

اس طرح کی عروضی غلطی، بھول چوک جب سامنے آتی ہے تو علم عروض کی اہمیت اور فن کو جاننے والے اکثر کہہ دیا کرتے ہیں کہ "عروض کا علم شاعر کے لیے بہت ضروری ہے۔"

- Takia Masoom Shah, Mominpura, Nagpur (M.S.)

ماضی، مستقبل اور لمحۂ موجود

منظہر الزماں خاں



ہر اچھی اور حاملہ تخلیق حال ہوا کرتی ہے کیونکہ ماضی اور مستقبل محض خواب ہیں کہ دونوں ہی غائب ہیں لیکن حال ہی اصل ہے کہ وہی لمحۂ موجود ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی تخلیق چاہے وہ ہزار ہا سال پرانی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر حال میں موجود ہے تو وہ حال ہی کی ہے اور لمحۂ موجود میں شامل ہے اور اُس کا لمحۂ موجود میں شامل رہنا اس کی زندگی کا ثبوت ہے لہذا غالب کا دو سو سال کے بعد بھی زندہ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ غالب کی شاعری لمحۂ موجود میں قائم ہے اور جب تک وہ لمحۂ موجود میں موجود رہے گی، زندہ رہے گی اور جب حال سے نکل جائے گی، ماضی بن جائے گی اور ماضی غائب ہے اور غائب موت ہے۔ چنانچہ ہر بہترین اور اچھی ہوئی تخلیق حال کا آئینہ ہوتی ہے اور حال کسی بھی عہد میں تعارف کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ وہ لمحۂ موجود میں شریک ہے اس لیے کہ لمحۂ موجود ہر حال میں لمحۂ موجود ہے اور اس طرح علم بھی ہر عہد اور ہر حال میں باقی رہتا ہے کہ علم جہان آباد ہے اور جہان آباد۔ وقت ہے اور وقت خالق ہے اور خالق ہر حال میں خالق ہے کہ وہ ہر لمحۂ موجود میں موجود ہے چنانچہ جب خالق موجود ہے تو تخلیق بھی موجود ہے لہذا اور یہ اکا یہ کہنا کہ متن ہے لیکن مصنف نہیں ہے۔ یعنی تخلیق ہے، خالق نہیں ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے نطفے کے بغیر بچے پیدا کر تا جب کہ بغیر نطفے کے نہ حیوان بچے پیدا کر سکتا ہے اور نہ انسان کیوں کہ ہر چیز کے لیے خالق ضروری ہے کہ بغیر خالق کے کوئی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی اس لیے کہ تخلیق بھی ایک زندہ اور پیچیدہ زندگی ہے جس کے اندر اور باہر بے شمار کہانیاں اور واقعات پھیلے ہوئے ہیں اور ان کہانیوں، افسانوں یا قصوں میں ان گنت، اشارے، علائم اور نشانات چھپے ہوئے ہیں جنھیں زبان بننے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور الفاظ کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے لیے عقل کی

ضرورت ہوتی ہے کہ دراصل علم اور عقل، دونوں ایک ہی ہیں کہ علم کے بغیر عقل ناقص ہے اور عقل کے بغیر علم ناقص ہے چنانچہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں اور جب دونوں ایک ہی ہیں تو پھر تخلیق اور خالق بھی ایک ہی ہیں۔ کیوں کہ خالق کی تخلیق، مخلوق ہے اور خالق اپنی تخلیق میں مخلوق کو اس کے مزاج، رہن سہن، لباس اور کردار کے علاوہ مکمل چہروں کے ساتھ تعمیر کرتا ہے تو وہ تمام کردار اپنی اپنی زندگی، اپنے اپنے ڈھنگ سے گزارنے لگتے ہیں۔ لہٰذا خالق کی مخلوق کو سمجھنے کے لیے پہلے ہمیں خالق کے مزاج کو سمجھنا ہوگا اور جب ہم خالق کے مزاج کو پہچان لیں گے تو اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق جو اس کی تخلیق ہیں ہمارے سامنے آئینہ بن جائیں گی چنانچہ کسی بھی اچھی تخلیق کے اندر چھپے ہوئے کرداروں کو اسی وقت ہم صحیح صحیح پیش کرسکتے ہیں جب ہم خالق کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں اور خالق کا مزاج اس کی تخلیق ہے۔ لیکن خالق کی پہچان کے لیے خود کی ذات کی تلاش ازحد ضروری ہے کیوں کہ خود کی ذات کو پہچان لینا خود کو دیکھ لینا ہے اور خود کو دیکھ لینا، خودی کو دیکھ لینا ہے اور خودی کو دیکھ لینا حق کو دیکھ لینا ہے اور حق کو دیکھ لینا تخلیق کا اصل حاصل کرلینا ہے۔ لہٰذا یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر اچھی تخلیق پیچیدہ اور حاملہ ہوتی ہے۔ جس کے اندر تہہ دار معنیاتی پیٹرن موجود ہوتا ہے جو قاری یا ناقد کی عقل کو ممیّز کرتی ہے۔ وہ عقل جو علم کی ذات کی اصل ہے۔ اس کے اندر ودیعت ہوتی ہے کہ وہی خالق ہوتی ہے اور خالق علم ہے۔ لیکن سوال یہاں یہ ہے کہ کیا وہ عقل یا علم ہر قاری یا نقاد کو نصیب ہے اور اگر نصیب ہے تو وہ عقل یعنی علم کی آخری آنکھ ہے کیوں کہ علم کی آخری آنکھ خالق ہے اور جب وہ خالق ہے تو تخلیق اس کے سامنے عیاں ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ قاری کی آنکھ خالق نہیں ہوتی کہ آخر دم تک وہ محض مخلوق ہی رہتی ہے۔ تاہم وہ خالق کی متلاشی رہتی ہے اور جب محض مخلوق رہنا ہی اس کا نصیب ہے تو پھر وہ تخلیق کی اصل کو کیسے دیکھ سکتی ہے اور جب وہ تخلیق کی اصل کو دیکھ نہیں سکتی یا دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی تو پھر خالق کو کیسے پہچان سکتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر اچھی اور پردہ دار تخلیق کے لیے عقل یعنی علم کی آخری آنکھ ضروری ہے کیونکہ جیسا کہ میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ عقل، علم ہے اور علم خالق ہے۔ چنانچہ تخلیق وجود میں آنے سے پہلے خالق کو دیکھتی ہے اور پھر وجود میں آنے کے بعد بھی خالق کو دیکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلے خالق میں موجود تھی بعد میں خالق سے ظاہری طور پر الگ ہوئی لیکن ظاہری طور پر الگ ہونے کے باوجود وہ خالق میں موجود ہے کیونکہ اس کا ظاہری طور پر الگ ہونا بھی اس میں موجود رہنا ہے۔ جیسے ایک بیج کے اندر پھول، پھل، درخت، پتے، جڑیں اور شاخیں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ بیج اپنے اندر سے پھول، پھل، پتے، جڑیں وغیرہ باہر نکالتا ہے مگر باہر نکالنے کے باوجود وہ اسی بیج کا حصہ ہیں یعنی اسی کا وجود ہیں چنانچہ یہ پوری کائنات بھی ایک بیج ہے اور اس بیج کے اندر تمام مخلوقات موجود ہیں اور وہ تمام مخلوقات اپنے خالق کو دیکھ رہی ہیں اور خالق اپنی مخلوقات کو دیکھ رہا ہے۔ بقول جان وہلر (John Wheeler) "انسانی شعور کائنات کی تخلیق میں برابر کا حصہ دار ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ شعور خود اپنی ہی کائنات کو دیکھتا بھی ہے جو اس کی خالق بھی ہے اور مخلوق بھی ہے۔"

لہٰذا یہ بات متعین ہوئی کہ خالق اور تخلیق ایک دوسرے میں موجود ہیں اور جب موجود ہیں تو پھر انہیں الگ کیسے کیا جاسکتا ہے اور جو الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے نہ خالق ملتا ہے اور نہ تخلیق۔ بلکہ وہ خود ہی کہیں گم ہوجاتا ہے۔ کھو جاتا ہے جبکہ خالق گم ہوتا ہے اور نہ تخلیق کہیں گم ہوتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ قائم رہتے ہیں۔ لیکن آج کے یہ قارئین یا ناقدین۔ تخلیق اور خالق دونوں کو الگ الگ تلاش کرنے کے لیے خود ہی بھٹک گئے ہیں۔ گم ہوگئے ہیں اور ان کا بھٹک جانا یا گم ہوجانا علم یا عقل کی آخری آنکھ سے محرومی کا نتیجہ ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔ "، تخلیق اپنے لیے قاری یا ناظر کی طالب ہوتی ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ جو قاری یا ناظر اسے نصیب ہوا ہے۔ کیا وہ صحیح معنوں میں ایک قاری ہے؟ یعنی کیا اس کی قرأت کا عمل محض مبالغہ آمیز تعریف کرنا یا مین میخ نکالنے یا درسی یا شعبہ چھڑی بن جانے تک محدود ہے؟ یا وہ جمالیاتی نکتہ آفرینی کی مدد سے تخلیق کاری کا حصہ بھی بن سکا ہے؟ اس سوال کا جواب مہیا کرنے کے لیے جس آنکھ کی ضرورت ہے وہ شاید ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی۔"

لہٰذا خالق اور تخلیق کی پہچان کے لیے۔ علم اور عقل کی آخری آنکھ ضروری ہے اور علم و عقل کی آخری آنکھ، خالق اور تخلیق کی آنکھ ہے کہ دونوں اصل ہیں اور اصل حق ہے اور حق لمحہ موجود ہے !!!

● House No. 256, 'SPL', C.C.B., Kachiguda, Hyderabad - 27 (A.P.)

ہم عصر اردو ادب نمبر کے حوالے سے

حسن حمد

نہ تو میری اتنی استطاعت ہے، اور نہ اتنی اہلیت کہ "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) پر تفصیلاً اپنی رائے کا مناسب اظہار کرسکوں، لیکن اس ضخیم، خوبصورت اور پُر از معلومات دفتر پر کچھ نہ کہنا ادبی بددیانتی ہوگی۔ چنانچہ میں اس مد میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ اگر دوران تاثر بہکنے لگوں تو معاف فرمائیں گے کہ، اول نہ تو میں اردو زبان و ادب کا استاد ہوں اور نہ ہی میرا تعلق کسی سیمینار، حلقہ یا کسی خصوصی ادارے سے ہے۔ محض قاری ہوں، اور وہ بھی قدیم یورولی روشن خیالانہ زاویۂ نظر سے کبھی کبھی شاعری کرلیا کرتا ہوں۔ افسانے بھی لکھے ہیں، دو ناول بھی : انھیں اب تک شائع نہیں کیا ہے۔ انگریزی نظموں کا ایک مجموعہ ضرور طبع ہوچکا ہے۔ مشغلہ سائنس سے متعلق ہے۔ اکثر آپ جیسے کرم فرما میرے خطوط چھاپ دیا کرتے ہیں۔ یوں میں ظاہر کردوں کہ چند معاملات کو چھوڑ کر (اور جو خاصے اہم ہیں) میں اردو ادب میں خاص طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کی باتیں زیادہ تر مانتا ہوں۔ اہل بصیرت میں رشید حسن خاں، گیان چند، قبلہ سرور صاحب، پروفیسر نارنگ وغیرہ کو بھی

وقعت دیتا ہوں۔ مابعد جدیدیت کے متعلق میری رائے بہت زیادہ اچھی نہیں ہے، کیوں کہ شکست وریخت۔ اور ناحقیقت پسندی، یعنی خارج کے وجود سے انکار۔ مجھے پسند نہیں۔

آگرہ اسکول والے قصے پر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ علامہ سیماب کو میں نے جستہ جستہ پڑھا ہے، انتہائی غور سے نہیں۔ مجھے ندامت ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وفات کراچی میں ہوئی تھی۔ تقسیم نے مسلمانوں کو، اور مخلوط تہذیب کو در ہم برہم کر دیا۔ جناب شارق جمال کا "غزلیات سیماب کا عروضی تجزیہ" لازمی طور پر علامہ کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ حضرت علامہ کی 'جدید شرح دیوان غالب' کو یک جا کر کتابی صورت میں شائع کرا دیا جائے؟ بڑی تدریسی خدمت ہوگی یہ۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ مختار صدیقی خود کو 'خاک پائے سیماب' سمجھتے تھے۔ وارث علوی کا مختار صدیقی پر مقالہ کسی رائے کا محتاج نہیں ہے، کہ وہ زیادہ تر الفاظ سے غیر معمولی الفت کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں، اور قاری کو ناقہ لیلیٰ کے ساتھ زیادہ دور جانے نہیں دیتے۔

حصہ تنقید میں چند مقالات بے شک عمدہ ہیں۔ خورشید سمیع کے مضمون پر محنت کی گئی ہے، ان کا کریڈو لگتا ہے، پر بات غالباً کھل کر سامنے نہ آ سکی۔ کاروانِ ادب منزلیں طے کرتے ہوئے اکثر راہیں تبدیل کرتا رہا کرتا ہے۔ اچھا نبض شناس اپنے احساسات پر کنٹرول رکھا کرتا ہے۔ کیا میں ایسی ہی بات نظام صدیقی کے بھرپور مقالے کی بابت کہہ سکتا ہوں؟ انھوں نے بھی ساری دنیا کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ خاصے حد تک کامیاب رہے ہیں۔ لیکن میں ذرا کنفیوژ ہو کر رہ گیا۔ نقاد، گو اسے کشادہ ذہن ہونا چاہیے، لیکن ساتھ ساتھ ایک زاویہ نگاہ کے حلقے میں اسیر بھی۔ دوران نقد اسی پیراڈکس کا مستقل سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نقاد جب اپنی رائے ظاہر کرنے لگتا ہے تو اس کے پشت پر بڑا بھاری بوجھ پڑا رہتا ہے، یا تو وہ اس خچر کی مانند جس پر نمک کی بوریاں لدی رہتی ہیں ندی میں غوطہ لگا کر اپنے بوجھ کو ہلکا کر سکتا ہے، یا اس خچر کی مانند جس پر روئی کی بوریاں لدی رہتی ہیں ندی میں غوطہ لگا کر اپنے بوجھ کو مزید بھاری کر سکتا ہے۔ کلیم صاحب مرحوم مجھے ایسا لگتا ہے بوجھ کو بھاری کرتے چلے گئے، جب کہ فاروقی صاحب ہوشیاری کے ساتھ بوجھ ہلکا کرنے کی فکر کرتے رہا کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔

دیویندر اسّر صاحب کا نسبتاً مختصر مقالہ، غور کرنے کے لائق ہے۔ اس کی تعریف بھی ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ اس جانب چلتے چلے جا رہے ہیں جہاں بوجھ ہلکا کرنے کی خواہش انھیں اس مشرقی شعریات سے دور کر رہی ہے جس کی اہمیت کو فی زمانہ رشید حسن خاں اور فاروقی نے پوری طرح جان لیا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جدید تر انفار میشن سپر ہائی وے، جب ذرا زیادہ مستحکم ہونے لگے گا، تو اپنے خدوخال خاصے بنیادی طور پر بدل ڈالے گا۔ یا تو ادب وفنون بحر ذخار میں ڈوب جائیں گے، یا تہذیب معلومات پر پابندی لگا دے گا۔ میں تو صاحب اتنا جانتا ہوں کہ ہم جیسے عام قاری ادب کو لطف کی خاطر پڑھتے ہیں۔ غالب ہوں یا میر، راشد ہوں یا اختر الایمان بنیادی طور پر حظ ابھارنے میں مدد کرتے ہیں۔ کبھی کبھی الفاظ ہمیں حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ اچھا فن کار نہ صرف جمالیاتی حظ بخشتا ہے بلکہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ خارجی وداخلی دنیا کو ایک نسبتاً نئے طور پر دیکھے۔ سائنس کی بھی تھوڑی سی ایسی ہی ہوتی ہے، لیکن فرویڈ والی وہ 'احساسات بحری' زیادہ تر فنونِ لطیفہ کے ذریعہ ہم پر طاری ہوتی ہے۔ تاریک رات میں کھلے آسمان میں جگمگاتے تاروں پر نظریں ڈالنا اتنا ہی عجیب وغریب ہوتا ہے جتنا کہ اپنے اندر ڈوب کر ایک قسم کے اخلاقی حس کا شعور حاصل کرنا۔ کانٹ نے ہمیں ایسا ہی بتایا ہے۔

میں فی الحال افسانوں والے حصہ کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ لیکن مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے اوپندر ناتھ اشک اور رام لعل مرحومین کے متعلق اتنی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ گو منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر وغیرہم پر خاصا کام ہو چکا ہے، لیکن اگر اگلی جلدوں میں ان جیسوں پر ایسی ہی معلومات اکٹھی کر دی جائیں تو اچھا رہے گا۔ پھر عظیم بیگ چغتائی ہیں، احمد علی ہیں، عزیز احمد، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، اے حمید وغیرہ بھی تو ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید سے متعلق جو چیزیں آپ نے یکجا کر دی ہیں، واقعی وہ لائق تحسین وتعریف ہیں۔ کم از کم ہم جیسے کم علم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

علی حماد عباسی نے 'مشعر کی پرکھ' کے تحت اچھا مقالہ لکھا ہے۔ محمد حسن صاحب اردو نظم کے زوال کو اپنی تھیوری کے لحاظ سے دیکھ رہے ہیں، جو کہ قطعی بری بات نہیں ہے۔ محترم نقاد ہیں اس لئے ان کی آرا یقینی طور پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ شین کاف نظام بھی نظم کی بازیافت پر فکر انگیز ہیں۔

بابِ تحقیق میں رشید حسن خاں کا مقالہ "تدوین میں منشائے مصنف کا تعین" ان لوگوں کو خاص طور پر پڑھنا چاہیے جو کہ فیشن کے طور پر مابعد جدیدیت کی سیاہ آندھی میں پھنسنا چاہتے ہیں۔ خاں صاحب جو کچھ بھی کہتے ہیں انتہائی سوچ سمجھ کر کہتے ہیں ان کی باتوں کے پیچھے تحقیق اور علم کا سمندر موجیں مارتا ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ تحریر مکمل نہیں ہوئی ہے، اس لیے رائے دینا درست نہ رہے گا۔ قاضی صاحب مرحوم کے بعد خاں صاحب غالباً ہمارے سب سے عمدہ محقق ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد بھی ہیں، لیکن وہ فارسی سے زیادہ وابستہ ہیں۔ آپ نے "مآثر غالب" دیکھا ہوگا، جسے کوئی چار سال پہلے پٹنہ کے ادارۂ تحقیقات اردو نے شائع کیا ہے۔ صاحب! قاضی صاحب کے حواشی پر جیسے حاشیے ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھے ہیں، بہت ہی کم لکھے گئے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک صاحب ہیں فرخ جلالی۔ گمنام، بے نشاں، نہ تو قاضی صاحب جیسا رعب اور نہ خاک میں مل جانے کی تمنا۔ میری تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ جناب علم کا بہتا دریا ہیں۔ نسخوں کو پڑھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہاں کے شعبۂ تاریخ میں عرصہ تک رہے ہیں۔ بدایونی دسترس ہے۔ "دیوانِ غالب نسخۂ خدا بخش" اس نسخے کے متن کی فوٹو کاپی شائع ہو چکی ہے۔ حواشی اور مقدمہ بعد میں شائع ہوگا (یا ہو گیا؟)۔

"توقیت میر" میں کالی داس گپتا رضا نے جوہر دکھائے ہیں۔ ہم تو انھیں 'غالبیا' جانتے ہیں۔ پر غالب خود 'میری' تھے۔ میرے خیال میں سب سے دلچسپ جی ہاں، لطف عطا کرنے والا۔ مقالہ جناب گیان چند کا ہے، جو امریکہ جا بسے ہیں۔ صاحب، کس قدر مواد یہاں موجود ہے۔ کس قدر محنت کی گئی ہے۔ مالک رام مرحوم

نے غالباً "تذکرۂ ماہ و سال" کی ترتیب میں خاص کاوش نہیں کی تھی۔ اپنے روزنامچے میں درج مشمولات کا تحقیقی جائزہ لیے بغیر شائع کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ایک زبردست ریفرنس کی کتاب ہے۔ گیان چند صاحب کے اس مقالے کے ذریعہ ہمیں مالک رام کی مندرجہ بالا کتاب میں ضروری تصحیں کرنی پڑیں گی۔ ہمیں جناب گیان چند کا انتہائی ممنون ہونا چاہیے۔

ترقی پسندیت اور جدیدیت کے بارے میں عرض ہے کہ دونوں تحریکیں دراصل یوروپی روشن خیالی سے پھوٹ کر نکلی ہیں۔ اردو ترقی پسند تحریک جس کا اجرا سجاد ظہیر اور ان کے ہم نواؤں نے کیا وہ کئی ایک اعتبار سے یوروپی انٹی فاشسٹ اور اشتراکی (مارکسی) تحریک اور سویت یونین سے متاثر تھی۔ ایک باقاعدہ پروگرام بنا تھا کہ، اول، تہذیب و ثقافت کو جبریت سے شکست کھانے نہ دیا جائے اور دوئم پس ماندگان کو ادب کے زمرے میں لایا جائے۔ جنس کا بھی دخل تھا، جو کہ فروئیڈ کی تھیوریوں سے متاثر ہوئی تھی۔ ہم نے یونگ وغیرہم کی بابت بعد میں جدیدیت کے حوالے سے جانا۔ بنے بھائی، بودیلئر، ورلاں، ریں بو وغیرہ کے قطعی خلاف تھے۔ (یعنی ان کی فکر کے، ان کے استعمال الفاظ کے نہیں)۔ وہ لوئی اراگاں کی جماعت سے ازحد متاثر تھے۔ پریم چند چوں کہ پس ماندگان کی حیات لکھتے تھے، اس لیے انھیں بزرگان میں سے ماننا ضروری تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی گویا کایا پلٹ کر رکھ دی۔ غزل نیم وحشی صنف سخن ٹھہری (اختر الایمان کہا کرتے تھے کہ غالب کے بعد غزل کون لکھ سکتا ہے: ایک حد تک حق بجانب تھے)۔ فکشن کا زبردست عروج ہوا۔ جدیدیت کے ابتدائی نقوش حلقہ ارباب ذوق کے ذریعہ ابھرے (اس جماعت کو کمیونزم سے اگر للہیّ نہیں تو بغض ضرور تھا۔ حبِ علی اور بغض معاویہ کی چپقلش زیادہ تر فتنہ انگیز رہی ہے)، جہاں کہ ذات کا داخلی کرب سرمایۂ حیات و سرمایۂ ادب ٹھہرا۔ شاعری پر زیادہ اصرار رہا۔ فسانے زیادہ تر ابلاغ سے محروم رہے، کہ تجریئیت اچھی چیز قرار پائی۔ سجاد ظہیر کی جماعت بار بار اعلان کرتی تھی کہ : بھائی میرے، پہلے ہم اس معاشرے کو سنوار لیں... انسان اور انسان کے درمیان استحصالی و جماعتی کش مکش کو دور کریں، پھر یہ خاروں بھری دنیا جنت کا نمونہ بن جائے گی۔ جدیدیت نے کہا : نہیں، آپ ادب کی بنیادی خصوصیت سے واقف نہیں ہیں۔ ادب میں اعلیٰ ترین چیز اعلیٰ زبان ہے، اور اس کا دل پذیر استعمال ہے۔ ادب سراسر آرٹ ہے، فن کی سحر انگیزی ہے۔ اور پھر لازمی ہے کہ ایک فن کار اپنے نجی جذبات کی آئینہ داری کرے۔ یہ کچھ ایسی ہی بات تھی کہ ہم بجائے بازاروں میں لین دین کرنے کے، مس حجاب اسماعیل کے دلکش ڈرائنگ روم میں بیٹھے کولڈ کافی کا گھونٹ لے رہے ہوں، اور ذرا اداس سی شام میں شفق کے ابھرنے اور ڈوبنے کا نظارہ کر رہے ہوں۔ لیکن یاد رکھنے کی بات ہے جو کہ بہت اہم ہے کہ دونوں تحریکیں خارجی دنیا کو ایک ایسی حقیقت مانتی ہیں جو کہ ہماری تھیوریوں سے آزاد، شاہد سے بے نیاز، ہم سے خارج میں موجود ہے۔ کائنات ہم سے باہر وجود رکھتی ہے۔ سامنے کے میدان میں ایک برگد کا درخت سر شام جھوم رہا ہے اور ہم اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں، ہوا کے زیر اثر وہ جھومتا رہے گا۔ بشپ برکلے چاہے کچھ بھی کہیں، ڈاکٹر جانسن سڑک کے کنارے لگے پتھر پر ٹھوکر مار کر، درد کا احساس کر، خارجی دنیا کا اعلان کرتے چلے جائیں گے۔ رسل نے گو بار بار کہا ہے کہ ایسی بات نہیں کہ خارج بین پسندوں کے ہاں محض ایک تصور ہے۔ افلاطون جس دنیا کو صحیح طور پر یقینی جانتا تھا وہ اس نامکمل دنیا سے ورے ہے (بلکہ اپنی حقیقت آپ ہے)، جس ہم محض اندازہ ہی لگا سکتے ہیں، اور ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ ہماری کائنات اس کا محض ایک ناقص چربہ ہے (پرچھائیں)۔ افلاطون کی کائنات، اس لیے نہ تو موجودہ (مادّی) کائنات کو کالعدم مانتی ہے، اور نہ فنونِ لطیفہ کی دنیا سے شاعروں وغیرہم کو نکال باہر پھینکتی ہے۔ جدیدیت دراصل پڑھے لکھے، رعونت و نکہت سے بھرپور، درمیانی طبقے کے فکر کی پیداوار ہے، جن کی روزی روٹی کا مناسب انتظام کیا ہوا ہے۔ اس دنیا کو وہ تجربہ گاہ سمجھتے ہیں، لیکن مذہب کے ماننے والوں کی مانند نہیں، بلکہ وان گاخ کی مانند جو کہ رنگوں سے تجربے کیا کرتا تھا، یا فرنچ شاعر گیوم اپولے نے آکی طرح، الفاظ جس کے لیے کھلونے تھے۔ جدیدیت کے بانیان ایک اعتبار سے ترقی پسندی کی کھوکھ ہی سے نکلے ہیں۔ ہاں وہ بھیمڑی کانفرنس کی روداد کے قطعی خلاف تھے، اور اقبال کی مانند وہ اپنی فارسی میں لکھنا چاہتے تھے کہ گفتگو عوام سے نہ ہو۔ تکبر کبھی کبھی ہمیں شہرت ضرور بخشتی ہے، پر اکثر مارسل پروست کی مانند بند دریچوں پر کارک لگے رکاوٹوں والے کمروں میں مقید بھی کر دیتی ہے۔ سویت یونین میں فنونِ لطیفہ کے شائقین کی تعداد بہت بڑی تھی، لیکن افسوس کہ ان کے ہاں ادب عالیہ پیدا نہ ہو سکا۔ ویب میاں بیوی نے کمیونزم کو ایک نئی تہذیب کے نام سے یاد کیا تھا، لیکن جلد ہی ایسا لگنے لگا کہ یہ 'تہذیب' استحصال اور ظلم پر قائم کی گئی تھی۔ جب میں اکیس سال کی عمر میں امریکہ گیا تھا تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ نئی آنے والی تہذیب تو یہی ہے۔ خروشچیف نے بھی پہلے کہا تھا کہ ہم جلد ہی امریکہ کے برابر ہو جائیں گے (گو اس نے جوتا اتار کر میز پر پٹخا تھا)۔ جدیدیت ایک طرح کا اظہار تھا کہ ہم دنیا کی بوالعجبیوں اور ظلم و ستم سے دور بھاگنا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند کہہ سکتے تھے کہ ان کی خوشتر مرغ کی مانند ہے جو کہ مصیبت میں پھنس کر اپنی گردن ریت میں دبا دیتا ہے، اور باور کرنا چاہتا ہے کہ دنیا مس حجاب اسماعیل کا ڈرائنگ روم ہے۔ غالب غالباً ترقی پسندوں کا ساتھ دیتے کہ وہ نئی دنیا کے متوالے تھے۔

مابعد جدیدیت (اور میں اس زمرے میں ساختیات، پس از ساختیات، بلکہ مابعد نوآبادیات کو بھی شامل کرتا ہوں) کے متعلق بہت ساری باتیں کہی گئی ہیں چند حضرات اسے حریت کا مکمل اظہار گردانتے ہیں۔ آغا بابر (جنھیں میں گہری وقعت دیتا ہوں) اور فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ یہ جدیدیت سے پھوٹ نکلی ہے۔ (کیا اسی طرز کی کوئی شئے ہے !) ولی کے گھر میں سنا ہے شیطان بھی پیدا ہوتا ہے، لیکن۔ اہم ترین بات یہ ہے۔ مابعد جدیدیت کا بنیادی فلسفہ قطعی مختلف ہے۔ قطبین کا فرق ہے۔ اسے کچھ یوں سمجھا جا سکتا ہے : میرے سامنے کے میدان میں 'موجود' برگد کا درخت موجود ہے یا نا موجود ہے، اس پر 'دانش ورانہ' (اس تحریک میں 'دانش مندی' محض اضافی امر ہے) فیصلہ صرف اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ میرا ذہن اس برگد کے درخت کا مشاہدہ کر ('مشاہدہ' اضافی ہے) اسے برگد کا نام دینے کا جواز رکھتا ہے۔ اگر میری آنکھ کے ذریعہ (یا یوں کہیں کسی حواس کی بدولت) میرا ذہن مشاہدہ نہیں کرتا تو پھر 'موجود' برگد کا درخت کیسی بھی حقیقت رکھنے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ معاملہ محض اشیا کو نام عطا کرنے کا نہیں، جس کی بحث افلاطون کے یہاں موجود ہے۔ معاملہ اشیا کے وجود کا ہے جو کہ ہماری کائنات میں مادی صورت میں موجود

فرض کی جاتی ہیں۔ کسی شئے کی کوئی بھی حقیقت نہیں جب تک کہ وہ شاہد کے شعور کے ذریعے جان نہ لی جائے۔ دنیا از سر تا پا سپاٹ، اتار یک اور پراگندہ رہے گی۔ ہر ایک باشعور ہستی (اگر شعور اشیا کو 'جان' بخش سکتا ہے) اپنی دنیا آپ پیدا کرے گی۔ نتائج بھیانک ہوں گے۔ اخلاق و تنظیم، رشتے اور تعلقات خالص سطحی اور سر اسر 'یک طرفہ' ہوں گے۔ منشائے مصنف محض ایک غیر ضروری رسم ٹھہرے گا۔ ہومر زے اس کے متعلق کیا کہتا ہے یا کہ سو اور ہجو قیل کیا کہتے ہیں، اس کی کوئی اہمیت : ہر ایک قاری اپنا خود ساختہ منشا اخذ کر سکتا ہے۔ حریت میدان حشر کی سی کیفیت کا دوسرا نام ہوگا (اگر ہم اس کیفیت کو مجموعی طور پر جان سکتے ہیں تو!) ادبی فن پارہ کسی ایک مصنف نے ضرور لکھا ہوگا (کیوں کہ معلومات عامہ ہمیں ایسا بتاتی ہے، اگر ہم یقین کریں!) اور غالباً منشائے مصنف بھی کوئی چیز ضرور ہوگی (کیوں کہ یہ بھی معلومات عامہ کے مطابق ہے)، لیکن اس فن پارے کو صحیح (اور پورے؟) طور پر جاننا اور سمجھنا اور واضح کرنا دراصل قاری کے ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحب بات یہ ہوئی کہ کسی فن پارے کی ہزاروں۔ بلکہ ان گنت۔ تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ نیر مسعود صاحب نے ایک افسانہ لکھا۔ کوئی دو سو اشخاص نے لطف لے کر پڑھا۔ قاری بنے۔ لیکن جہاں تک منشائے تخلیق از جانب مصنف ہے۔ یعنی کہ جیسی باتیں اس افسانے میں 'مجبور' نیر مسعود سے کہی گئی ہیں۔ اس کا صحیح اظہار قاری کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور موجودہ صورت میں دو سو ایسے اظہارات ممکن ہیں۔ ہم آپ یاد رکھیں کہ بنیادی طور پر قاری کی سمجھ کی اہمیت کی بات ہر ایک ناقد نے کہی ہے، چاہے کلاسیکی یونانی ہو، چاہے کلاسیکی عرب، یا چاہے کلاسیکی سنسکرت داں۔ ایلیٹ نے مثلاً بار بار ہر ایک عہد میں ادبی وراثت کو کھنگالنے اور سمجھنے اور نئی باتیں اخذ کرنے پر زور دیا ہے، لیکن جناب، منشائے مصنف کے واسطے سے۔ دانتے کی تصنیفات کے حوالے سے ہم دانتے سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟ محض دانتے کی تصنیفات سے اپنے نجی نتائج اخذ کرنے کی بدولت نہیں۔ کسی بھی علم میں ایسی ہی صورت حال پیدا ہوتی ہے، تجرباتی علوم میں بہت کم۔ انارکزم میں چند بہت اچھی باتیں ہیں۔ نطشے کے یہاں بھی، دریدا کے یہاں بھی، فوکو کے یہاں بھی۔ لیکن علم و فہم کی دنیا میں ایک بنیادی فاؤنڈیشنل ازم ہوتی ہے۔ ایک منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ ہم اگر کوئی سائنسی تجربہ کرتے ہیں تو چند اہم امور کو مان کر چلتے ہیں (کسی مخصوص سائنسی فکر کو کسی مخصوص تہذیب کا اظہار سمجھنا نادانی ہے۔) انسانی جسم کے خلیے محض باہر سے دیکھ کر جانے نہیں جا سکتے ہیں: انھیں علاحدہ کر انھیں جانچا جاتا ہے، مختلف اجزا کی تحلیل کی جاتی ہے۔ ہبل ٹیلیس کوپ جو کہ فی الحال فضائے بسیط میں گردش لگا رہا ہے، اس کے ذریعے ہم کائنات کے بارے میں نت نئی معلومات سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ تاریک بند کمرے میں کتابوں کے اوراق الٹتا ایک پرستار مابعد جدیدیت ان میں حقائق کا بھرپور پتہ چلا سکتا ہے جو کہ ہبل ٹیلیس کوپ کر رہا ہے تو ہمیں اس کو تاہ ذہنی۔ یا اس 'حریت'۔ کو خود سے دور کرنا ہوگا۔

مابعد جدیدیت کی اس بھول بھلیاں میں چند اچھی چیزیں ضرور ہیں۔ آغا بابر نے "اثبات و نفی" کے تازہ شمارہ میں ان کی جانب اشارے کیے ہیں۔ میں تو فلسفیانہ اعتبار سے اس عجیب تحریک کے خلاف ہوں۔ یوں بھی سماجی / تاریخی اعتبار سے ہم جدید بھی پوری طرح نہ ہو پائے ہیں، تو جدیدیت سے آگے جست کیوں کر لگا سکتے ہیں !!

جلد اول میں آپ نے اہم خطوط کے عکس دیے ہیں۔ جو بات مجھے بہت بھلی لگی وہ ادیبوں کے سال پیدائش اور سال وفات ہیں۔ سوانحی لغت بہت ہی کار آمد ہے، پر سوئے اتفاق نا مکمل ہے۔ میں ساقی فاروقی کا پیدائشی نام معلوم کرنا چاہتا تھا، کیا نام واقعی قاضی محمد شمشاد نبی ہے؟ آپ سے گزارش ہے کہ نئے ادیبوں کے سوانحی 'خاکے' تیار کرتے چلے جائیں۔ اگلی جلد میں انھیں درج کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اور مالک رام کے "تذکرۂ ماہ و سال" سے بہت مدد ملے گی۔ دراصل ایک زبردست ضرورت ہے کہ ہندوی / اردو ادیبوں کی بایو گرافیکل انڈکس تیار کی جائے۔ پروفیسر گیان چند سے مدد لی جا سکتی ہے۔

● Department of Bio-Chemistry, Rajindra Agricultural University, Dosa - 848125 (Bihar)

بقیہ صفحہ ۳۰ : شاعری اور سچ

ناتواں ہوں بس کہ فرقت سے تیری چوں برگ کاہ — اب صبا پھیرے ہے اس پہلو سے اس پہلو مجھے
انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں — ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے
مرگیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب — ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

سائنس اور فلسفے کے نظریے میں یہ سب غلط باتیں ہیں۔ کوئی ہونٹوں کی ایک حرکت سے مر نہیں سکتا۔ اور نہ ناتوانی سے بالکل معدوم ہو جاتا دماغی نقطہ چیں کہہ سکتے ہیں کہ شاعر لاعلم ہے وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ خوبصورتی یا نزاکت کچھ وزن نہیں رکھتیں وغیرہ وغیرہ۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ افلاطون جس نے شاعروں پر جھوٹ کا الزام لگایا۔ خود شاعر سا تھا۔ اس کا سارا کلام شاعرانہ ہے۔ گو اس نے شاعری نہیں کی۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ اگرچہ ری پبلک (Republic) میں اس نے شاعروں پر حملہ کیا اور خاص کر ہومر (Homer) پر۔ آئیان (Ion) جس نے ہومر کو عظیم ترین اور خدائی (Devine) شاعر کہا۔ افلاطون خود ایک عظیم ترین فلسفی تھا۔ اس سے بس ایک ہی نادانی ہوئی جس کو دنیا نے منظور نہیں کیا۔ ◇◇



محمد صلاح الدین پرویز

عورت کی نظمیں

۶ نظموں کی یہ سیریز اپنے شعری وصف میں بہت مختلف
ہے تاہم اخلاقی جمالیات شاید ان نظموں کو قبول نہ کرے
ذا تجربے کے طور پر صرف ایک ہی نظم شائع کی جا رہی
ہے۔[ادارہ])

١

سہیلیوں کے سنگ،
آنگن میں بیٹھی ہے وہ
یک سہیلی اسکی دیہہ پر ہلدی چندن مسل رہی ہے
یک سہیلی اسکے جوڑے میں سورج مکھی سادھ رہی ہے
یک سہیلی اسکی چنری پہ لال لال گلابوں والا چھاپا
ماپ رہی ہے
ب سہیلی اسکے لیے ہاتھی دانت کی سل پہ
ندی کے پتے پیس رہی ہے
ب سہیلی اسکے لیے ریشم کی انگیا کاٹ رہی ہے
ب سہیلی اسکے لیے بیلے کا گہنا گوندھ رہی ہے
ر ایک سہیلی .... کہاں گئی وہ !
تو ان سب سے زیادہ سندر تھی..
نا ہے وہ بھیتر گھس کے
ا سہیلی کے تن کے بھیتر گھس کے
ا حصے کو چھیڑ رہی ہے
اں خود ہی خود، کل رات اچانک
م و نازک گھاس اگی ہے
ا لال مخمل جیسی بیر بہوٹیاں جس پہ رقص کناں ہیں
بہ ایسے میں سہیلی کی اماں ہی آئے
س گھاس پہ بھاگتی لال لال مخمل جیسی بیر بہوٹیوں کو
موشی سے باندھ سکے۔

● Flat - 4, Tower - A, Zakir Bagh
New Delhi - 25



شبنم رومانی

ماحولیاتی غزل

(ماحول میں بڑھتی ہوئی کثافت کے خلاف ادبی ردِ عمل)

حاتم کا رازِ سربستہ ۔ دھول، دھواں اور شور
کوہ ندا کا سیدھا رستہ ۔ دھول، دھواں اور شور

زہر بھرا ہے میری سوچ میں، تیری باتوں میں
جزو خوں ہوئے جستہ جستہ ، دھول، دھواں اور شور

جیسے بستی کی بستی ہو وحشت کی زد میں
جیسے دشمن فوج کا رستہ ۔ دھول، دھواں اور شور

اک تحریک چلائی ہے میں نے اپنے ہی خلاف
اس تحریک سے ہیں وابستہ دھول دھواں اور شور

اک نسخہ تجویز کیا ہے "مرگ معالج" نے
اور نسخہ بھی کتنا سستا ۔ دھول دھواں اور شور

اک بوڑھے بابا کی گٹھری ۔ اشک دعا اور پھول
اک ننھے بچے کا بستہ ۔ دھول دھواں اور شور

میرے یار بھی کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں
میری بیٹھک کا گلدستہ ۔ دھول دھواں اور شور

● 207, Ghadiali Bldg,
Sadar, Karachi (Pak)



صادق

یہ مہانگر ہے

نووارد
اپنی پوٹلی میں بندھے
اناج کے دانے کہاں بوؤ گے ؟
سیمنٹ کنکریٹ کی سڑکوں پر
اس خطۂ زمین میں
دیکھو تو

یہاں سر سبز درختوں پر
کہیں بھی پھل پھول نہیں
اگر ہوں بھی
تو انھیں توڑنے کی
سخت ممانعت ہے
کہیں بھی
خوش رنگ پرندے نہیں
اگر ہوں بھی
تو انھیں چہچہانے کی اجازت نہیں
ہواؤں میں چو طرف
پٹرول کی بو،
اور دھول اور دھواں ہے
نووارد
اس خطۂ زمین سے لوٹ جاؤ
اپنی پوٹلی نہ کھولو
یہاں کا کوئی بھی موسم
تمہارے لیے سازگار نہیں ہے

● AG - I - 47C, Vikaspuri,
Boodella, New Delhi - 110018

شرون کمار ورما
Gali Onthan Wali, Chowk Prag Dass,
Amritsar - 143006 (P.B.)



اندھیرے کی طرف بڑھتے قدم

امر نے جام ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ کوٹھی کے پھاٹک پر چوکیدار کی، کسی کو ڈانٹنے کی آواز سنائی دی۔ امر ناگواری سے اٹھا، کھڑکی سے دیکھا پھاٹک کے باہر کچھ لوگ کھڑے تھے۔

"کون ہے۔ کیا تماشہ لگار کھا ہے۔" امر نے خفگی سے کہا۔

"مالک ہم فیکٹری سے آئے ہیں۔" ادھیڑ عمر والے نے پکار کر کہا۔ "دینو مر گیا۔"

سکاچ اس کے اندر پانی ہو گئی۔ دینو نام کا ایک مل مزدور پہلے بھی مرا تھا کھانس کھانس کر۔ اب یہ دوسرا۔ ڈیوٹی پر۔ امر نے نوکر کو بلایا۔ بوتل وغیرہ اٹھا لینے کو کہا پھر چوکیدار سے دو آدمی اندر بھیجنے کے لیے کہہ کر صوفے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

آنے والوں میں ایک تو وہی ادھیڑ عمر والا تھا جس کے بھدّے اور گندے پیر قالین پر بد نما داغ معلوم ہو رہے تھے۔ دوسرا نوجوان تھا، جس کی آنکھوں میں غصہ اور بغاوت تھی۔ وہ کمرے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہاں کی قیمتی، خوبصورت آرائشی اشیاء اچھی نہ لگی ہوں۔

"کیا ہوا تھا، کیسے مرا دینو، کس کی غلطی تھی۔ امر نے پوچھا۔ "پی رکھی تھی۔"

"وہ شراب نہیں پیتا تھا۔" نوجوان نے تلخی سے کہا۔

امر نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا اور ادھیڑ عمر والے کی طرف دیکھا۔

"پٹہ ٹوٹ گیا اور وہ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔"

"پٹہ پرانا تھا۔" نوجوان نے غصہ سے کہا۔ ایک بار پہلے بھی ٹوٹ چکا تھا۔ منیجر سے بدلنے کے لیے کہا تو وہ ٹال گیا۔ قصور دینو کا نہیں مل منیجمنٹ کا ہے۔"

"دینو کے دو بچے ہیں مالک، چھوٹے چھوٹے۔"

ٹی۔ وی پر ایک شوخ حسینہ، صابن کی اشتہاری فلم میں اچھل اچھل کر نہا رہی تھی۔ امر نے نوکر سے ٹی وی بند کرنے کے لیے کہا اور پوچھا۔

"لاش کہاں ہے۔ پوسٹ مارٹم۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اب۔" نوجوان نے تلخی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، پولیس کیس بنے گا۔" امر نے تحمل سے کہا اور ادھیڑ عمر والے کی آنکھوں میں جھانکا۔ "عدالت جو فیصلہ کرے گی۔"

"دینو کی گھر والی یہ سب نہیں چاہتی۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "اس کے پاس تو انتم سنسکار کے لیے بھی پیسہ نہیں ہے۔"

"اس کا انتظام ہم بستی والے کر لیں گے۔"

"تم چپ نہیں رہ سکتے۔" ادھیڑ عمر والا خفگی سے بولا۔ "مجھے بات کرنے دو۔ مالک آپ جو ٹھیک سمجھتے ہیں کریں۔ ہم لاش کی چیر پھاڑ نہیں چاہتے۔"

"غلطی دینو کی نہیں تھی۔" نوجوان جیسے غرایا۔ "فیکٹری میں سب ٹھیک نہیں چل رہا۔ ہم لوگ بھی انسان ہیں، مٹی کے کھلونے نہیں کہ ٹوٹ گئے تو پھینک دیا۔ ہم جب بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، بہانہ بنا کر ٹال دیا جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" امر نے جیسے اکتا کر کہا۔ "میں سارے معاملہ کی چھان بین کروں گا، لیکن اس وقت مسئلہ دوسرا ہے۔ ہمیں دینو، میرا مطلب ہے اس کی بیوہ اور بچوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ اگر یہ پولیس کیس بنتا ہے تو عدالت۔ تم جانتے ہو وہاں کتنا وقت لگ سکتا ہے۔" اس نے مزدوروں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جانے والا چلا گیا، بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ آگے تمہاری مرضی۔"

نوجوان شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر والا اسے خاموش اور شانت رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ امر ان پر نظر رکھے تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے ڈی۔ ایس۔ پی دوست کو اس حادثہ سے مطلع کر دے گا کہ فیکٹری میں اگر دنگا یا توڑ پھوڑ ہو تو پولیس سنبھال لے۔ ساتھ ہی وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے مزدور مشتعل ہوں اور حالات خراب ہوں۔

"دینو کے انتم سنسکار کے تمام اخراجات مل برداشت کرے گی، مدد

بھی۔"

"تو ہم چلیں مالک۔"

"ٹھہرو، میں بھی چلتا ہوں۔"

کار میں ان دونوں کو ساتھ لیا۔ باقی مزدوروں کو بستی پہنچنے کے لیے کہا۔ امر کے کہنے پر دینو کی لاش اس کے گھر بھیج دی گئی تھی۔ فیکٹری میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ آفس میں بیٹھ کر اس نے ڈی۔ ایس۔ پی اور کچھ دوسرے بارسوخ لوگوں کو فون پر اس حادثہ سے مطلع کیا۔

امر پہلی بار اس بستی میں آیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آدمی اتنی غلاظت اور تنگدستی میں بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ٹین، کھپریل، بوریے کے جھونپڑے، کوڑے کے ڈھیر، بدبو، مچھر، چوہے، کتے، سور اور آدمی ایک ساتھ رہ رہے تھے۔

دینو کی لاش کچے فرش پر پڑی تھی۔ اس کی بیوہ اور دونوں بچے ویران سی آنکھوں سے امر کو دیکھ رہے تھے۔ اندر باہر بھیڑ تھی، غصہ تھا، نفرت تھی۔

"بہت برا ہوا۔" امر نے کسی منجھے ہوئے اداکار کی طرح اداسی سے کہا اور آگے بڑھ کر بچوں کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھے۔ کئی آنکھیں چھلک گئیں۔ دینو کی بیوہ پھپھک کر رو دی۔ جھونپڑے میں گرمی، بدبو اور بھیڑ کے باوجود امر نے اپنا ذہنی توازن قائم رکھا اور ہمدردی سے بولا۔

"رو نہیں بہن۔ جو بھگوان کو منظور تھا۔ ہم اس کے سامنے کمزور اور مجبور ہیں۔ مجھے دکھ ہے کہ یہ حادثہ فیکٹری میں ہوا۔ لیکن تم اس مصیبت کی گھڑی میں خود کو اکیلا اور بے آسرا نہ سمجھو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" امر نے مجمع پر نظر ڈالی، اور اپنائیت سے کہا۔ "مجھ سے جو بن پڑا کروں گا۔" اس نے لاش سے چادر ہٹا کر مرنے والے کو پرنام کیا۔

"دو بچے ہیں تمہارے۔" امر نے دونوں کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "ہم ہیں نا بیٹا۔ فیملی میں کوئی بڑا ہوتا تو ہم ابھی اسے فیکٹری میں کام دے دیتے، خیر۔ اسکول جاتے ہو تم۔"

"نہیں، بستی میں کیا، آس پاس کوئی اسکول نہیں ہے۔" اس نوجوان کی باغی آواز تھی۔

"اسکول نہیں ہے۔" امر نے حیرت سے کہا۔ "آج تک کسی نے ہم سے کہا ہی نہیں، خیر، فیکٹری میں اسکول بنے گا۔ آپ کے بچوں کے لیے۔ مفت تعلیم دی جائے گی۔ سنو بہن میں تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ اس چھوٹی سی عمر میں۔ تم چاہو تو فیکٹری میں کام کر سکتی ہو، جو بھی تم چاہو، پوری پگار پر۔" امر نے جیب سے چیک نکالا اور دینو کی بیوہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پانچ ہزار کا ہے۔ یہ معمولی سی رقم ایک انسان کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ ایسا مت سوچنا۔ تمہاری نوکری آج سے پکی۔" اس نے بھیڑ پر نظر ڈالی۔ "انتم سنسکار کا کل خرچ فیکٹری دے گی۔ لاش وین میں جائے گی۔ پتہ تو نیا بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ حادثہ کہیں اور کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ اچھے بھلے آدمی کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم دینانا تھ جی اور ان کے پریوار کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بھول جائیں۔ بچے اچھے اسکول میں پڑھیں گے۔ شریمتی دینانا تھ جب چاہیں کام پر آ جائیں۔ مزدور تو دیش کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ یہ کارخانے، ملیں، فیکٹریاں سب آپ لوگوں کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہیں۔ ہم لوگ آپ کے بغیر کچھ نہیں۔ دینانا تھ جی فیکٹری کے پرانے، محنتی اور وفادار ورکر تھے۔ انہوں نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہمیشہ دیانتداری اور لگن سے کام کیا۔ وقت کے پابند، زبان کے پکے، قول کے سچے۔ ایک عظیم انسان۔ ہم نے ہمیشہ ان کی عزت کی ہے۔ نہ تو انہیں سیاست میں دلچسپی تھی، نہ ہڑتال وغیرہ میں کبھی حصہ لیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہڑتالیں قوم کو تباہ کرتی ہیں۔ ان کے لئے کام پوجا تھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے پریوار کے لیے ایسا کچھ کریں، جس سے ان کی آتما کو شانتی ملے۔ وہ دینانا تھ جی کے بغیر خود کو کمزور اور بے آسرا نہ سمجھیں۔ انہیں کندھوں نے کل دیش کا بوجھ سنبھالنا ہے۔ دینانا تھ جی شہید ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ہم ان کے نام سے شیلڈ اور نقد انعام ہر سال کسی محنتی اور ایماندار مزدور کو دیا کریں گے۔"

مجمع اب پوری طرح شانت تھا۔ امر نے لاش کے پاؤں چھوئے اور باہر آ گیا۔ بستی سے باہر نکل کر اس نے جیسے سکھ کا سانس لیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گپتا جی پہلے سے ہی کار میں موجود تھے۔

"کمال کر دیا امر بابو آپ نے آج۔" گپتا جی مسکرائے۔ "کیا زوردار بھاشن دیا ہے۔ مان گئے۔ اب تو اسمبلی کے لیے ٹکٹ آپ کو ہی ملے گا۔"

"آپ۔ یہاں۔" امر نے حیرت سے کہا۔

"ہم ٹھہرے جنتا کے سیوک۔ ہر بات کی خبر رکھتے ہیں۔" گپتا جی نے امر کے سگریٹ کیس سے سگریٹ لے کر سلگایا۔ "سوچا، آپ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں، آ گئے اپنے آدمی لے کر۔ مجمع میں ہمارے مسلح آدمی موجود تھے۔ یاد آیا، منتری جی آئے ہوئے ہیں۔ آپ مل لیں ان سے، میں چکر چلاتا ہوں کوئی۔"

"کہاں چھوڑوں آپ کو۔"

"ارے بھیا کہیں بھی پھینک آؤ۔ ہم تو تمہاری خاطر آئے ہیں۔ بڑی چنتا تھی سچ مچ۔ ان مزدوروں کا کیا بھروسہ۔ کسی سیاسی پارٹی کے بہکاوے میں آ کر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن بھیا، اسکول، شیلڈ، انعام۔ یہ سب کیا کہہ آئے ہو۔ ان لوگوں کا دماغ پہلے ہی خراب کر رکھا ہے بائیں بازو والوں نے۔"

"ارے گپتا جی، سب آپ سے ہی سیکھا ہے۔ کہا ہے، کر تو نہیں دیا۔" گپتا جی ہنس دیے۔

گھر پہنچ کر امر نے ٹی وی آن کیا۔ نوکر سے بوتل وغیرہ لانے کے لیے کہا۔ پیگ بنا کر یوں اندر ڈالا جیسے کچھ ڈبونا ہے، پھر مزے سے نگاہیں ٹی وی اسکرین پر لگا دیں۔ گپتا جی نے نوکر سے کباب لانے کے لیے کہہ کر اپنے لیے بڑا پیگ بنایا اور سگریٹ سلگا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اب وہ دیوار پر آویزاں خاندانی تصویریں دیکھ رہے تھے۔ بزرگوں کی تصویریں۔ راجہ صاحب۔ رائے بہادر۔ دیوان۔ سیٹھ جی۔ ایک تصویر میں امر کے دادا جی انگریز گورنر سے جاگیر کے دستاویزات لیتے ہوئے احسان مندی سے مسکرا رہے تھے۔ امر کے والد محترم مونچھوں کو تاؤ دیتے، کمر سے تلوار لگائے بڑی رعونت سے کھڑے تھے۔

"اے بھیا، یہ تصویر ہٹا دو یہاں سے۔ گورنر والی۔ آزادی کے بعد یہ اچھی نہیں لگتی۔ باپو گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد کی تصویریں لے آؤ۔ تمہیں ٹکٹ لینا ہے، الیکشن جیتنا ہے۔ منسٹر بننا ہے۔"

"گپتا جی، تصویریں ہٹا دینے سے کیا سچ بدل جائے گا۔ اس جاگیر کے تو پھل کھا رہے ہیں آج۔ خاندان کے بزرگوں کو شجرۂ نسب سے نکال دوں۔ انگریزوں کے بنائے وائس ریگل لاج میں رہا جا سکتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بیٹھا جا سکتا ہے۔ انگریز حاکموں کے نام پر سڑکیں آج بھی ہیں۔ وہی قانون، وہی افسر شاہی اور پولیس کو اپنایا جا سکتا ہے تو یہ بے جان تصویریں۔"

"بحث مت کرو، بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ انگریز ہمارا دشمن تھا۔"

یہ شوائز ریگل جو آپ پی رہے ہیں، ولایتی ہے۔"

"اچھا چھوڑو۔ ہمارے لیے پیگ بنا دو۔"

تبھی شمی پرس جھلاتی آگئی۔ پینسل ہل پر ڈولتی۔ اس نے گپتا کو دیکھا اور نظر انداز کر دیا۔ امر نے سوچا اب گپتا کو چلے جانا چاہیے۔ لیکن اب وہ کسی دیسی گھوڑے کی طرح گردن اٹھا کر ہنہنانے لگے تھے اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے شمی کو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ شمی نے پرس رکھ کر کہا۔

"تم لوگ چھری، کانٹے چلاؤ، میں ذرا فریش ہو لوں۔" وہ اندر چلی گئی۔

"امر بابو، یہ خطرناک لڑکی ہے۔" گپتا جی نے بتایا۔ "کئیوں کو تباہ کر چکی ہے۔ آج کل بہت اونچی اڑ رہی ہے۔ سیاست میں بھی۔"

"بالکل یہی رائے اس کی آپ کے بارے میں ہے۔" امر ہنسا۔

"کتیا ہے سالی۔ ادھر ادھر منہ مارتی ہے۔ بچ کر رہنا اس سے۔"

"آپ چنتا نہ کریں۔ کیا لے جائے گی مجھ سے۔ سمندر کی موج جب ساحل کو چھوڑ کر لوٹتی ہے تو پیچھے نمی تو چھوڑ ہی جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی کمزوری نہیں ہو وقتی ضرورت ہیں۔"

گپتا جی گئے تو امر کی ولایتی سگریٹوں کا پیکٹ بھی لے گئے۔ شمی تازہ دم ہو کر آگئی تھی۔ بیئر کا گلاس لے کر وہ امر کے پہلو میں جا بیٹھی۔ بولی

"یہ گپتا حرامزادہ کیوں آیا تھا۔ بڑا گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔ جوڑ توڑ کا ماہر۔ کسی کا دوست نہیں ہے یہ۔"

"منتریوں کو مرغیاں سپلائی کرتا ہے۔"

شمی امر کی گود میں لڑھک گئی۔ "دفع کرو اسے، مجھے پیار کرو۔"

وہ پیار کرنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ڈارلنگ تمہارے لیے ہے۔" امر نے ریسیور شمی کو تھما دیا۔ فون سن کر وہ اتاولی سی بولی۔

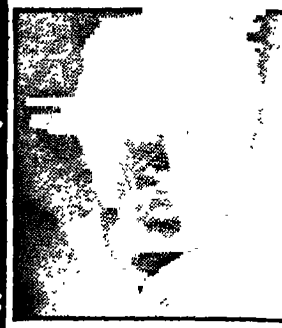
"مجھے ابھی جانا ہوگا۔ لندن سے میری ایک جرنلسٹ دوست اچانک آگئی ہے۔ صبح بنکاک جا رہی ہے۔ اچھا، پھر ملتے ہیں۔" شمی نے امر کے گال پر بوسہ دیا اور چلی گئی۔ رک کر بولی۔ "ناراض تو نہیں ہو نا۔"

"میں خوبصورت لڑکیوں سے ناراض نہیں ہوتا۔" وہ ہنسا۔ "یہ تو وہ ان ڈور پودے ہوتے ہیں جو ناراضگی کی دھوپ میں جھلس جاتے ہیں۔"

وہ چلی گئی تو امر نے سوچا۔ شمی کی اچانک آجانے والی سہیلی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ وہ ہنس دیا۔ کلب جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ گپتا تھا۔ اس نے امر کو بتایا کہ منتری جی فارم ہاؤس میں ہیں۔ وہ فوراً آجائے۔ وہ کار لے کر بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ شہر سے کافی دور، اونچے درختوں میں چھپا وہ فارم اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ اندھیرے میں کھڑے مسلح آدمی نے ٹارچ کی روشنی میں کار کا نمبر دیکھا۔ ڈائری میں نوٹ کیا۔ کار میں دیکھا اور گیٹ کھول دیا اور اسے پارکنگ لائٹ پر جانے کی ہدایت کی۔ وہ دھیرے بنا آواز کیے کار چلاتا عمارت تک پہنچا۔ اونچے قد، مضبوط ڈیل ڈول کے فوجی نما آدمی نے آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا۔ اس سے کار کی چابی لی اور اسے برآمدے میں لے گیا۔ ہلکی سی دستک پر دروازہ کھلا۔ کمرہ روشنی میں نہا رہا تھا۔ تمام کھڑکیاں، دروازے بند تھے، ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ سامنے صوفے پر منتری جی براجمان تھے، ان کے پیچھے اے۔ کے 47 رائفلیں لیے دو خطرناک قسم کے آدمی مستعدی سے کھڑے تھے۔ ان کی عقابی نگاہیں، امر پر تھیں۔ بائیں طرف دو مقامی نیتا بیٹھے تھے۔ دائیں طرف گپتا بیٹھا تھا۔ امر کو لگا وہ کسی مغل بادشاہ کے دربار خاص میں ہے۔ وہ منتری جی کو پرنام کر کے ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں سناٹا تھا۔ میز پر سکاچ کی بوتلیں، بادام، کاجو، انڈے وغیرہ سجے تھے۔ گپتا کے اشارے پر امر نے روپوں والا بیگ آگے بڑھا دیا۔ منتری جی ہلکا سا مسکرائے۔ پھر بولے۔

"ہم نے پولیس کمشنر سے کہہ دیا تھا کہ تمہارا خیال رکھیں۔ تم نے بڑی ہوشیاری سے سب کچھ سنبھال لیا۔"

دروازہ پھر کھلا اور شمی اندر آگئی۔ امر کو دیکھ کر ایک پل کو ٹھٹھکی پھر



مقیم اثر بیاولی

[جہتِ سفر افروز" سے غالب کے لیے چند غزلیں]

لر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
ہ جو رکھتے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے
(غالب)

◆

خونِ جگر" امانتِ غم کو بلاتا کون
ب رنگ خلوتوں میں سحر جگمگاتا کون
یا مٹی ہوئی تھی کسی کے جمال پر
ِ رنگ خار و خس کو گلے سے لگاتا کون
مخص قول و فعل میں اپنا قتیل آپ
مندۂ گماں کو نظر میں بساتا کون
ب مرثیہ بجھا ہوا آئینہ آئینہ
چھائیوں کو رشکِ گلِ تر بناتا کون
د رنگئ زمیں سے پریشان ہر نظر
ں کہکشاں مزاج سے آنکھیں ملاتا کون
راں ہیں فصلِ درد کی ویرانیوں سے ہم
بنوں میں بارشوں کی تمنا بجھاتا کون
نوں میں غرق ہیں وہاں گلبار شرکتیں
ں گھر کی بے کسی کو لہو سے سجاتا کون
سانس روشنی کی طرف دوڑتا ہوا
رکیوں کے ناز سفر میں اٹھاتا کون
ا بھی اسیر ہیں کسی دریائے ناز کے
احل کی قید و بند سے ہم کو چھڑاتا کون

● 261 - M.H.B. Colony
Malegaon - 423203 (M.S.)

◆

رنگِ پریدہ صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ہم کو سجائے خود میں جدھر بھی سحر گئی
شمس و قمر گواہ کہ مٹی سنور گئی
کرنوں سے اب کلام کریں آئینہ بدن
غنچے شگفتہ ہوگئے شب بھی گزر گئی
پھر تشنگی سے پھوٹ رہی ہے نئی کرن
پھر جستجوئے ذات افق سے ادھر گئی
آنکھوں پہ کھل رہے تھے دریچے نئے نئے
اپنے مکاں کی تہہ کو سمجھنے نظر گئی
شاید وہ کشتیوں میں بدل جاتی ہے پھر
اک لہر لہر لہر بچھا کر بھنور گئی
جیسے ہی عکس اس پہ پڑا میری فکر کا
اُس آئینہ پرست کی صورت اتر گئی
کیا پوچھوں وقتِ شام کسی جھلسے پھول سے
وہ حسن وہ غرور وہ مستی کدھر گئی
دشوار ہے گذارا کسی ایک پیڑ پر
ایسا سفر پروں میں ہوا باندھ کر گئی
جز وہم اور کیا تھا سمندر ترا بہاؤ
جس موج کو ابھرنا تھا آخر ابھر گئی

◆

ہوگئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

رکھ کر تن تن ، من سا پاگل پنچھی ہم میں
کس نے بچھائیں اپنی اڑانیں دھرتی ہم میں
خود کو بسانے دریا دریا پھیل گئے ہم
اس نے اس انداز سے رکھی کشتی ہم میں
بند مکاں ہیں یہ اپنی خوش فہمی ہے
روزن روزن جھانک رہا ہے کوئی ہم میں
سیپ ، سمندر ، موتی ، تارے ، جگ مگ سپنے
ایک تجلی کس کس روپ میں اتری ہم میں
ہاتھ پسارے آقا دَر دَر ملتے ہیں
کس نے باندھی ارمانوں کی جھولی ہم میں
شاید کوئی خوشبو ہے ہم میں بھی انوکھی
پھول بہائے ، مٹی ، بکھری نکھری ہم میں
یہ تازہ ہریالی برکت اپنے لہو کی
مٹی ہم سے جڑ کر کتنی چہکی ہم میں
فطرت بھی شہکار ہے اس کے دستِ ہنر کا
ملتی ہے پر ایک انوکھی مستی ہم میں
ضبط کی حد سے باہر ہے سورج کی تپش کچھ
چاند سجائے رات کوئی البیلی ہم میں

◆

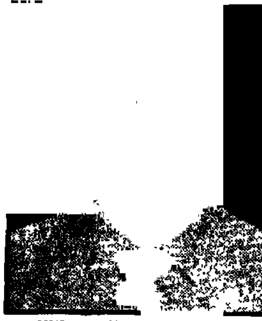
وفا مقابل و دعوئ عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ وفصلِ گل قیامت ہے

ابھی گئے ہیں کہیں ، جب وہ لوٹ آئیں گے
جو ہم پہ گذری ہے سب کچھ انھیں سنائیں گے
کسی کے خواب کو پیروں میں روندنے والے
کہیں بھی جائیں زمیں پر سکوں نہ پائیں گے
جو بس رہے ہیں لہو کی تمازتوں سے دور
وہ آنسوؤں کی گرہ کیسے کھول پائیں گے
وہاں تو ذات کا سایا بھی ہے مخل نظر
وہ اپنے دل میں ہمیں کس طرح بٹھائیں گے
نہیں ہے ظرف شمار و قطار میں جن کا
سنا ہے آج وہی ظرف آزمائیں گے
لہو میں جذب کوئی آفتاب ہوجائے
نئی زمین ، نیا آسماں بنائیں گے
کشاد و بست زمیں پر نظر نہیں جن کی
نقاب چہرۂ ہستی سے کیا اٹھائیں گے
بکھرتے خواب سے اپنا بھی کوئی رشتہ ہے
جہاں بھی رات ہوئی نیند کو منائیں گے

◆

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم حسن آشیاں کے لیے

تقسیم کیوں نہ ہوگی خوشی آنسوؤں کے بعد
ہم مرکزِ نشاط بنے ، کلفتوں کے بعد
آرائشِ قفس میں گرفتار ہم ہوئے
آزادئ بہشت سے محرومیوں کے بعد
یہ رنگ یہ مہک یہ تجلی ممکنات
کیا جانے کیا سفر ہے نئی سرحدوں کے بعد
ہم اپنا سارا حسن زمیں پر لٹا چکے
اب ہوگا کون خاک بسر خاکیوں کے بعد
اک شب گزیدہ راہ تھی یہ خواب نائے بھی
تعبیر بے نقاب ہوئی حوصلوں کے بعد
اک نام زندگی کے برق پر لکھا گیا
مجھ کو ملا ہی کیا ہے مری کاوشوں کے بعد
اس آسماں سرشت نے ذروں کو کیا دیا
راتوں پہ خوں چھڑکتی ہوئی جراتوں کے بعد
صحرا کا عکس کون مٹائے گا آنکھ سے
راحت نصیب ہو بھی اگر وحشتوں کے بعد



ریاض صدیقی

261 - C/11, C.C.Area, Tariq Road P.E.C.H.S.
Karachi - 28 (Pak)

بعد جدید کیا ھے

بعد جدیدیت کیا ہے؟اردو کے بعض ادبی رسالوں میں اب اس موضوع پر بھی تھوڑا بہت لکھا جانے لگا ہے مگر ابھی تک ایسا کوئی مکمل اور جامع مطالبہ قلمبند نہیں کیا گیا ہے جو اس کا صحیح ماڈل پیش کرتا ہوں۔ بعض باثر اہل الرائے جن کو ذرائع ترسیل اور دولت کی سہولتیں حاصل ہیں مدعی ہیں کہ اردو شعر و ادب بعد جدیدیت محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے مگر ابھی اس دعوے کی سند مشکوک ہے۔اس قسم کی پرچھائیاں اگر اردو شعر و ادب میں دکھائی بھی دیتی ہیں تو وہ جدیدیت ہی کے ساتھ گڈمڈ ہیں۔اس میں بعد جدید اسلوب اور متن کا کوئی خود مختار علاقہ نشان زد نہیں کیا جاسکتا ہے۔افریقی، ہندوستانی، کیریبین جزائر، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کا شعر و ادب تو واضح طور پر اینٹی پوسٹ ماڈرن اور اینٹی امپیریلسٹ ہی ہے کیوں کہ ان سب ہی ملکوں میں ابھی عوام کی بڑی اکثریت پرانے دور کے دیہاتی کلچر میں سانس لے رہی ہے جب کہ مقامی ذرائع و وسائل پیداوار۔منڈیوں اور اقتدار کی سیاست کے سرے سامراجیت کے ہاتھوں میں ہیں۔اردو شعر و ادب جو اسی فضا میں ۱۹۶۰ء کے بعد تخلیق ہوا ہے اگر نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی سامراجیت کو نشانہ نہیں بناتا ہے تو اس سے تقویت اسی سامراجیت کو حاصل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بین العالمی سامراجیت کے لئے باعث اطمینان ہے کہ اس نے کم سے کم اس علاقے میں نو آبادیاتی اور بعد نو آبادیاتی سامراجیت کے خلاف رائے عامہ بنانے والے ترقی پسند فکری رجحان کو تو ختم کردیا۔اردو شعر و ادب میں بعد جدید کے موجود نہ ہونے کے باوجود ہمارے بڑے شہروں کی سماجی زندگی میں بعد جدید رجحان اب حاوی ہوگیا ہے اور ان شہروں کی پڑھی لکھی نسل جو اسّی اور نوّے کی دہائیوں کے دوران تعلیم گاہوں سے سندیں لے کر نکلی ہے اس کے نہ صرف گن گاتی ہے بلکہ اس میں مبتلا بھی ہے مگر کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ بعد جدید کے حدود کیا ہیں اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔اولی الذکر بعد نو آبدیاتی ملکوں میں تو بہر حال بعد جدید کے خلاف فکری سطح پر مزاحمت کا رجحان پایا جاتا ہے مگر ہمارے یہاں تو ابھی کوئی ایسا رجحان بھی نہیں ہے۔بعد جدید کی یہ صورت حال کن قوتوں نے پیدا کی؟اردو کے دانشوروں پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی ہے۔ عوام کی بڑی اکثریت کو بھی جو ابھی تک ناخواندہ و بے شعور ہے اور پرانے دور کے دیہی کلچر میں زندگی کرتی ہے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔اس کایا پلٹ کی ذمہ داری حکمرانوں،ان کے بیوروکریٹس اور ان سے وابستہ اعلیٰ طبقے کی اقلیت ہی پر عائد کرنا درست ہوگا جن کی وساطت سے نئی نو آبادیاتی سامراجیت اور اس کے بعد جدید بین العالمی کلچر ہم پر وارد ہوا۔اس نے سب سے پہلے فلموں، شوبزنس، ذرائع ابلاغ اور تعلیم پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔طاقتور اور با اثر مذہبی قوتوں نے جو کبھی بین العالمی سامراجیت کی مخالفت کرنے والے شعر و ادب کے خلاف طوفان نوح برپا کردیا کرتے تھے بعد جدید کے ورود پر غیر جانبداری کا انداز اختیار کرلیا حالانکہ بعد جدیدیت نے سب سے زیادہ نقصان مذہبی شعور اور حسیت ہی کو پہنچایا ہے۔بعد جدید ٹیکنالوجی کے حصول اور اس کے استعمال میں بھی ہمارے مذہبی اداروں ان کی درس گاہوں اور اشاعتی مراکز نے کوئی تکلف نہیں برتا ہے۔

بیسویں صدی میں ماسوائے ترقی پسند فکر و نظر کے جو بھی فکری رجحانات اردو شعر و ادب اور علوم کے توسط سے آئے وہ سارے ہی برطانیہ اور امریکہ سے آئے تھے۔ساٹھ کی دہائی اس لئے حوالہ جاتی بن گئی ہے کہ فکری سطح پر امریکہ میں اتھل پتھل اور سوویت یونین کی اوپری قیادت میں انحراف کا یہی زمانہ تھا۔ اسی دور میں سنائی جانے والی یا (Talk) شاعری کی روایت امریکہ میں مقبول ہوئی تھی جبکہ اعلیٰ جدیدیت (High Modernism) بجائے خود ایک تنظیم (Institution) بن گئی تھی۔اس کے خلاف مزاحمت کی قوت اب ٹوٹ رہی تھی کیونکہ یونیورسٹیوں، آرٹ گیلریوں، میوزیم اور فاؤنڈیشنوں میں اس کے مراکز قائم ہوگئے تھے جو خود بخود قائم نہیں ہوئے تھے بلکہ نصابی اصلاح کے اس منصوبے کی وساطت سے ہوئے تھے جس کی ہمت افزائی اور پذیرائی امریکی سرکار کررہی تھی گویا وہ نئی صنعتی سرمایہ داری کے مستقبل کو ایک بہتر آزادانہ اور محفوظ فضا فراہم کرنے کا آلہ کار تھی۔اعلیٰ موڈرنزم نے مصوری، تجریدی اظہاریت، ہیئت پسندی، فنامنالوجی، دیومالائی کرنسزم (نارتھ روپ فرائی) نام نہاد پاپ آرٹ، فوٹوریلزم، نئی خاکہ نگاری، کانکریٹ پوئیٹری، نئی لسانی تشکیلات، جنس زدگی اور فیشن وغیرہ کو اپنے دائرے میں شامل کرلیا تھا۔فلموں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے کیونکہ ہالی ووڈ ہی نئے رجحانات کو موثر طریقے سے مشتہر کرنے کا ذریعہ تھا۔ناسٹلجیا آرٹ کا بھی اس زمانے میں خاصا غلبہ ہوا کیونکہ فکری وسائل کو حال سے بے دخل کرنے میں ماضی پرستی

کو آرٹ بنا دینے سے بڑی مدد ملتی ہے ہمارے یہاں انفرادی سطح پر یہ کردار انتظار حسین نے بڑے سلیقے سے انجام دیا۔ ان ہی اثرات کے نتیجے میں نئی صحافت کو فروغ حاصل ہوا۔ عمارت سازی کے شعبے میں بھی نئے نئے رخ ابھر رہے تھے۔ بعد جدیدیت نے ۱۹۷۰ء میں اپنے سفر کی ابتدا جدیدیت کی مخالفت سے کی تھی۔ اس موضوع کا احاطہ ہلٹن کارمر (Hilton Karmer) اور ٹام ولف (Tom Wolfe) نے کیا ہے۔ رولینڈ اور بارڈبری (Ruland & Bradbury) کے بقول ولف نے وال اسٹریٹ کے پس پردہ کام کرنے والوں کی محدود زندگی کا روایتی صحافیانہ انداز سے مشاہدہ کیا تھا۔
یہ حلقہ ترقی یافتہ ٹیکنکی سرمایہ داریت اور اس سے باہر اندرون شہر کی پسماندہ دنیا کا جو مزاجیت زدہ تھی بیوپاری تھا۔"

کارمر نے جدید کی کلاسکیت میں پائی جانے والی سنجیدہ فکر سے متوسط طبقے کے خلاف اس کے رجحان اور سیاسی جذباتیت کے کچرے کو الگ کردیا۔ اس طرح جدید کی کلاسیکیت میں ادب کو منڈی کا مال بنادینے اور معاصر سرمایہ داری کو تقدس کا سائبان فراہم کرنے کی وجہ سے جو گھٹن پیدا ہو گئی تھی اس نے دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ دراصل اعلیٰ جدیدیت کو بورژوائیت سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ سدھار کے اس رجحان کو مزید تقویت رسالے 'نیو کرائی ٹیرین' نے فراہم کی جس نے جمالیات سے لے کر خاندانی نظام اور مذہبی اقدار تک کا دفاع کیا کیونکہ نئی سرمایہ داریت نے خاندانی نظام اور مذہبی اقدار کو تقریباً موزو کر کے توڑ پھوڑ ڈالا تھا مگر مذہب اور مذہبی اداروں کی سرپرستی سے اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا کیونکہ عالمی سطح پر کمیونزم اور ترقی پسندیت کے خلاف نئی سرمایہ داری کو ان کی ضرورت تھی۔ پوپ اور ان کا کیتھولک فرقہ اگر اتنا طاقتور نہ ہوتا تو امریکہ کو پولینڈ میں رائج اجتماعی جمہوریت کا تختہ الٹنے میں کامیابی نہ ہوتی۔ 'نیو کرائی ٹیرین' کو یقیناً اپنے مشن میں ریاستی طاقت کا وہ تعاون نہیں حاصل ہوا جو امریکی لیفٹ قوت کو ٹھکانے لگانے کے لئے میکارتھی کو حاصل ہو گیا تھا۔ اس کی طاقتور مہم کی ناکامی کا سہرا جمہوریت پسند امریکی عوام کے سر جاتا ہے جنھوں نے مزاحمت کی تھی مگر اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا فرض طالب علموں کی تنظیم ایس ڈی ایس۔ سیاہ فام امریکیوں کی سول رائیٹس تحریک اور بعد میں ویٹ نام جنگ کے خلاف مزاحمت کی تحریک نے ادا کیا۔ ملک گیر ہنگاموں اور دنگے فساد کا یہ زمانہ امریکی سرمایہ داریت کے لئے لمحہ فکریہ ثابت ہوا کیونکہ جدیدیت کے سارے مہرے پٹ گئے تھے اور امریکہ میں لیفٹ کی قوت کا صحیح اندازہ سرمایہ داروں کو ہو گیا تھا۔ اسی صورت حال کو کاؤنٹر کرنے کے لئے بعد جدید کا شوشہ چھیڑا گیا تھا۔ جرگن ہیبر ماس (Jurfen Habermas) نے بعد جدیدیت کی لغویت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اسے سیاسی حوالے سے رجعت پسندانہ قرار دیا حالانکہ اس کا اپنا تعلق بورژوائی روشن خیال حلقے سے تھا اور وہ اس حلقے کے موقف یعنی مساوات، شہری حقوق، انسان پرستی، آزادی تحریر و تقریر اور آزاد میڈیا کا حامی تھا۔ اس کی یہ حمایت بھی میکارتھیت کو پسپا کرنے میں جو بائیں بازو کو موت کی نیند سلا دینے کے درپے تھا کارگر ثابت ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مغربی جرمنی میں بائیں بازو کو کچلنے کے لئے حکمرانوں نے اس کے خلاف دہشت گردی کو جائز قرار دے دیا تھا۔ بہر حال میکارتھیت کو پسپا کرنے والی قوتوں کے تاریخی کردار کے باوجود وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنا چولا بدل لیا اور بعد جدید کا ماسک چڑھا کر دوبارہ میدان میں اتر آئی۔ اپنی تاریخ کے اس دوسرے مرحلے میں نئی ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ داری نے طاقت اور محاذ آرائی کی پالیسی کو ترک کر دیا اور اب اس نے میڈیا، فلم، ٹیکنالوجی، مالی امداد، منڈی معیشت اور اقتصادیات کے ذریعہ پوری دنیا کو اپنی امپائیر کے ماتحت لانے کی پالیسی اپنالی۔ قدرت نے اسے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ریگن اور تھیچر جیسے رہنما عطا کر دیئے تھے جو اپنی قدامت پسندی اور مذہبیت کے باوجود طبعاً عوام دشمن تھے۔

جین فرانکوائیز لیوتار (Jean Famcois Lyotard) جس کا ذکر دیوندر اسر نے بھی کیا ہے بعد جدید نہیں ہے جیسا کہ لیوتار نے خود لکھا ہے کہ معاصر یا بعد معاصر ثقافتی تخلیقات سے اس کی وابستگی کو بعد جدید سے منتج کرنے والے غلطی پر ہیں۔ یوں بھی بعد جدید کے تناظر میں اس کی جمالیات کی تجزیہ کاری ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی فکر کے تانے بانے میں سماجی وسیاسی اجزا ملتے ہیں جو کلاسیکی سرمایہ دارانہ دور کے بعد والے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جدیدیت بہر حال سرمائے کی تنظیم سازی (Instrumentalization) اور تقدس کو نشانہ بناتی ہے۔ جیسا کہ ویٹ نام کی جنگ کے خلاف پینٹاگن کی طرف مارچ کے موضوع پر نارمن میلر (Norman Mailer) کی مقبول ناول (The Armies of the night 1968) سے اندازہ ہوتا ہے۔ جدیدیت نے اپنی غیر نظریاتی حد میں رہتے ہوئے نوکر شاہی کے کردار اور اواخر کی ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ داری کے کردار پر بھی تنقید کی۔ (اردو کی ادبی جدیدیت اصل امریکی جدیدیت سے مختلف ہے اس لئے اسے امریکی جدیدیت کا مقامی ایڈیشن سمجھنا صحیح نہیں ہوگا)۔ تھیوری نے جدیدیت کی اس تنقید کو بے معنی قرار دیتے ہوئے رائے دی کہ کسی بھی قسم کا ریڈیکل بدلاؤ اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ سماجی رشتوں میں ریڈیکل بنیادوں پر بدلاؤ پیدا نہ ہو۔ اس رائے کی صحت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیوتار اور تھیوری دونوں سیاسی ہیں اور دونوں ہی زمانہ ماضی کی انقلابی روایت سے جڑے رہے۔ مارکسیت کے خلاف دونوں کے یہاں کسی رجحان کا کھوج نہیں لگایا جاسکتا ہے تاہم دونوں نے مارلیو پونٹی (Marleauponty) کی طرح اسٹالن کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی اس کی مخالفت کی۔

بعد جدیدیت کلچر کے شعبے میں اس الٹ پلٹ کے مطالعے کا متقاضی ہے جو اواخر کے سرمایہ دارانہ نظام کی از سر نو تشکیل کے دوران ہوئی تھی۔

یہ کلچر جواب پیداواریت کا پیراڈائم بن گیا ہے زندگی کے ہر شعبے میں گھس آیا ہے مثلاً عمارت سازی، فیشن، فاسٹ فوڈ کی کاروباری قطاریں، شاپنگ مال، ڈپارٹمنٹل اسٹورز، اشتہار بازی یا اشتہار سازی کی صنعت، فلم، آرٹ کے شعبے اور چھپنے والی کتابیں وغیرہ۔ یہ ساری الٹ پلٹ اس دور میں ہوئی جب پرانے سماجی طبقات مثلاً کسان و مزدور اور شہروں میں حرفتی افرادی قوت موجود تھے۔ ان پرانے سماجی طبقوں کو انیسویں صدی کے بعد بتدریج اشیا اور منڈی کے سرمایہ دارانہ سسٹم نے نو آبادیالیا تھا کیونکہ کمپیوٹر اور خودکار ٹیکنالوجی کے عروج سے پہلے یہ طبقہ ہی سرمایہ دارانہ نظام کے لئے دردسر بنتا تھا۔ بعد جدیدیت دور کے اہل الرائے نئی دنیا کی مصروفیات کی غلامی میں مبتلا ہو گئے جیسا کہ اب آپ کو یہاں کے بڑے شہروں میں بھی ہر سو دکھائی دے رہا ہے۔ ادب کی اخباری صحافت جواب پیدا ہوئی ہے بعد جدید ہی کی طرف پیش قدمی کے مترادف ہے۔ دوسرے درجے کی ہالی وڈ فلمیں، پیرا ادب، سطحی سوانح نگاری، سائنس فکشن، فینٹسی ناولیں، فوٹو گرافی، جذبات کو برانگختہ کرنے والی امیج سازی، پاپ آرٹ اور گائیکی، موسیقی کا غل غپاڑہ۔ لباس کی نئی ڈیزائننگ، مردوں کا عورتوں کی اشیا استعمال کرنا اور عورتوں کا مردوں کی اشیا استعمال کرنا اور جادوئی حقیقت نگاری وغیرہ یہ سب ہی بعد جدید کلچر ہے۔ ہالی وڈ اور بالی وڈ جو کبھی اپنے جلو میں ایک فعال لیفٹ حلقہ رکھتے تھے اور انقلابی موضوعات پر تھوڑی بہت فلمیں بھی بناتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سمٹ گئے۔ امریکی حکمرانوں نے بڑی بڑی سرمایہ دارانہ تنظیموں اوران کے ذیلی اداروں کو متحرک کر کے ہالی وڈ میں ایک حلقہ بنادیا جس کا کام ایسی پروپگنڈا فلمیں بنانا تھا جن کا مقصد کسی نہ کسی طرح یہ باور کرانا ہوتا تھا کہ امریکی فوجی طاقت اور جاسوسی نظام سویت یونین پر حاوی ہے۔ ان فلموں کے ذریعہ سویت یونین کی پسماندگی اور وہاں کے ہیروز کی کردار کشی کی جاتی تھی۔ جیمس بانڈ اسی صورتِ حال کی پیداوار تھا۔ ہالی وڈ کی ان بعد جدید فلموں نے بین العالمی منڈی پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کرلی تھی۔ ادھر چند سالوں کے دوران جب نئی نو آبادیاتی سامراجیت کے خلاف یورپی ملکوں اور امریکہ میں ایک بار پھر لیفٹ قوتوں نے کروٹ لی تو میڈیا اور فلموں کے ذریعہ سابقہ دور کے مظالم کی من گھڑت کہانیاں پیش کی جانے لگیں۔ میڈیا نے کھوپڑیوں کے جمع کئے ہوئے اور سجائے گئے انبار دکھانا شروع کردیے ہیں مگر تین چار سو سالوں کے دوران جس ڈھٹائی سے نو آبادیاتی قوتوں نے انسانوں کا قتل عام کیا تھا اور کم و بیش کروڑوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا ان کھوپڑیوں کا کوئی ذخیرہ نہیں دکھایا جاتا ہے۔ بعد جدید نے تو جدیدیت کے ماس اور پاپولر کلچر کو بھی گندہ کردیا ہے۔ اس شعبے کے نئے لکھنے والوں نے تو جدید کو جوائس، فلابیر اور ماہلر (Mahlar) کی طرح بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ لکھنے والے جدید کلچریا منظر کے اجزا کو اس طرح اپنے متن میں تحلیل کرتے ہیں کہ ہماری تنقید بھی ان کے لئے بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ موجودہ عالمی منظر نامہ اس کا گواہ ہے جہاں پبلک تنقید ہے مگر اس کی حیثیت سرمایہ داروں۔ بنکاروں، مالیاتی اداروں، منڈی کے دلالوں اور بیوپاریوں کے لئے گدھے کی لات کے مترادف ہے۔ یہ وہی صورت حال ہے کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں کارواں چلتا رہتا ہے۔ اس طرح بعد جدید نے آزادیٔ فکر و نظر کے اس تصور کو فروغ دیا ہے جہاں بھونکنے کی آزادی ہے۔

بعد جدید نے ادب سے اس کے اصل حوالے یعنی بڑی عوامی اکثریت کو بے دخل کردیا ہے۔ فریڈرک جیمسن نے جو کہ انحراف پسند مارکسی ہے اس صورتحال پر تنقید کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ بعد جدید کی مجموعی زوال پذیر صورت حال سے نکلنے کے لئے موجودہ تاریخ کو گرفت کرنا سمجھنا اور تاریخی وجدلیاتی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ خیال بھی حقیقت ہے کہ بعد جدید جو کچھ بھی پیروڈائیز کرتا ہے وہ دراصل رائج آرٹ کی قسموں کو پیداواری اشیا میں بدلنے اور تحلیل کرنے کا آرٹ ہے جسے اس دور کی فلموں اس زمانے کے ذرائع ابلاغ و الکٹرانی میڈیا کے ذریعہ اچھالا جاتا ہے۔ بعد جدید کے لئے وہ Pastiche کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جس کے معنی ہیں "بہت سے بے ترتیب خارجی کوڑے کرکٹ سے بنا ہوا آمیزہ" پیٹر برجر (Peter Burger) نے خاصی مضبوط دلیلوں کے ساتھ لکھا ہے کہ اصل مسئلہ ادب اور آرٹ کے ادارے کی خود مختاری ہی کے نام سے لگام دینا تھا تا کہ کلچر اور سماج کے درمیان کوئی سرحدیں باقی نہ رہیں۔ بعد جدید کے اشیائی آرٹ اقسام میں ایونٹ گارد کے خواب کہ آرٹ کو سماج میں ضم کردیا جائے نمایاں رجحان تھا یعنی بعد جدید قسم کے ادب اور آرٹ کو پورے سماج پر مسلط کردینا جو منڈی معیشت اور گلوبل دیومالا کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ بقول برجر جیسے کہ بورژوائی کلچر نے اپنے ماضی کی محرومیوں کا انتقام لے لیا ہو کیونکہ اس نے سابق زمانے میں اپنے مخالف انقلاب کے خلاف بھی اسی قسم کی کلبیت (Cnicism) کا مظاہرہ کیا تھا۔ بعد جدید بورژوائی کلچر اور بعد جدید بھی ایونٹ گارد کی طرح جرم کا کوئی احساس کئے بغیر آرٹ سے سیاسی مواد کو نکال پھینکنے کی ترغیب دیتا ہے۔ بعد جدیدیت اسلوب کے فقدان، فکر و نظر کی سطحیت، تاریخیت کی نفی اور کرپشن کی آزادی سے عبارت ہوتا ہے اس میں تو بیگانگی کو محسوس کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی ہے جبکہ بیگانگی ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ سماج میں بہر صورت موجود رہتی ہے۔ بعد جدیدیت یوٹوپیا کو حوالہ بنا کر سوشلسٹ طرز احساس اور سسٹم کا مذاق اڑاتی ہے اور مدعی ہے کہ اشیا بس وہی کچھ ہیں جو ہمیں سامنے دکھائی دیتی ہیں، سبب اور دلیل کو بعد جدیدیت غیر مستند سمجھتی ہے اور ہر قسم کی لغویت، خرافات اور فحاشی کے مظاہر کو شعر و ادب کا موضوع بناتی ہے۔ اواخر کی ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ داری کو بعد جدیت ہی نے یہ مفروضہ فراہم کیا کہ اشیائے صرف بھی آرٹ ہی کے معروضات ہیں۔ لیوتار نے سرمایہ دارانہ نظام کے تناظر میں بعد جدیدیت کا احاطہ کیا ہے اور لکھتا ہے کہ سائنسی زبان کے کھیل بھی درحقیقت امرا اور رؤسا ہی کی ذہنی تفریح کا ذریعہ ہوتے ہیں اس طرح ہمیں جے

ایل آسٹن (J.L.Alistin) کے فلسفے آئی بی ایم بعد ساختیات کی لو۔ نیٹیت اور اسینڈرڈ آئل کمپنی کے مابین تعلق کا بھی احساس ہوتا ہے گویا بعد جدید ادب اور آرٹ بھی بھانمتی کا کنبہ جوڑتا ہے۔ یہ عجیب طرز زندگی ہے کہ لوگ جینز کے پھٹے ہوئے نیکر اور پتلون اور قیمتی جیکٹ میں پیوند لگا کر پہنیں اور اعلیٰ قسم کی کاروں میں سفر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد جدیدیت صداقت اور آگہی کے کلاسیکی ماڈلز مہیا نہیں کرتی ہے بلکہ بیوپاریوں کی طرح اشیاء فراہم کرتی ہے جن کی منڈی میں مانگ ہو۔ دلیل کی جگہ وہ طاقت اور جبر کو بروئے کار لاتی ہے۔ لیوتار نے یقیناً بعد جدیدیت کا مربوط تنقیدی مطالعہ قلمبند کیا ہے مگر وہ اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی متبادل ماڈل کی نشاندہی نہیں کرتا ہے۔ بعد جدیدیت کے اردو نقاد دیوندر اسر کا بھی یہی انداز نظر ہے بلکہ انہوں نے تو ترقی پسند نظام فکر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ سابق زمانے میں وہ خود بھی ترقی پسند ہوا کرتے تھے۔

موجودہ بین العالمی سرمایہ داری اور اس کی منڈی معیشت نے سابق زمانوں کے ان تمام وسائل کو معذور کر کے ختم کیا ہے جو عوام کی رہنمائی کا فرض ادا کرتے ہوں تاکہ وہ اپنی اشیا کے طلسم ہوش ربا سے عوام میں اور مقبولیت پیدا کریں اور ان کی مانگ میں بڑھوتی ہو۔ بعد جدید آرٹ کا بھی یہی موقف ہے۔ بعد جدیدیت کے اس عالمی منظر کا اثر اردو شعر و ادب کس انداز میں قبول کرے گا اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا کیونکہ اردو شعر و ادب نے حقیقی معنوں میں اب تک بعد جدیدیت سے استفادہ نہیں کیا ہے لیکن وہ اس استفادے سے زیادہ دیر تک دامن کشاں نہیں گذر سکتا ہے۔

حواشی

- J.F.LYOTARD - Post Modern Condition, Minneapolia. University of Minnesota Press 1984.
- F. Jameson - The Cultural Logic of Late Capitalism. New Left Review 146 (7-8) 1984.
- MANFREDO TAFURI - Architechure and Utopia. Cambridge M.I.T. Press 1976.
- DENNIS WALDER - Literature and Modern. Oxford University Press 1990.
- WOLF REYS AND BAKER - Literary Theuries. Macmillan London 1996.
- TERRY EAGLETON - Literary Theory Ed : 1996 Blackwell Publishers London 1996.
- PETER NICHOLLS - Modernisms. Macmillan. London 1996.
- FEATHER MIKE - Consumer Culture and Post Modernism. Sape London 1991.
- STEVEN EARNSHAW - The Direction of Literary Theory. Macmillan London 1996.
- RULAND AND BRADBURY - From Puritanism to Post Modernism. Penguin Books 1992.
- ماہانہ آئندہ شمارہ ۱۲۔۱۱ر ۱۹۹۴ء کراچی۔ بعد جدیدیت اور اس کے بعد۔ ریاض صدیقی۔ ادب کی آبرو۔ دیوندر اسّر

بہ خطِ شاعر

عبداللہ کمال



اُس کا دل اپنا گھر تھا، اپنے گھر میں رہتے تھے
وہ بھی کیا دن تھے جب ہم چاند نگر میں رہتے تھے

آنکھیں اُس کے تصور کے پیچھے جاتی تھیں
ہجر کی راتوں کو دور نئے سفر میں رہتے تھے

فرہاد کا تیشہ، قیس کا صحرا اور حسن تھا ہم سے
ہم حسنِ جنوں تھے، دل والوں کے سر میں رہتے تھے

اکثر جلتے رہتے تھے شب گردوں کی آنکھوں میں
شعروں میں ڈھلتے تھے اور خونِ جگر میں رہتے تھے

چاروں دشائیں سمٹی رہتی تھیں اپنے آگے
اُس دن کی ملاقات سے تو ہم اور شہر میں رہتے تھے

وہ بھی ہرن کی ہریالی میں کیسی خوشبو سی تھی
ہم بھی لمحوں کے فرشتے سا اُس کے شجر میں رہتے تھے

کچھ آسیبوں کو ہم باہر لے آئے، ورنہ
ہر پل بے چہرہ سے انجانے ڈر میں رہتے تھے

P.O.Box 47363
Andheri (W) Mumbai - 400058



بشیر سیفی

ہائیکو

میرے چاروں اور
یا تیرا سناٹا ہے
یا جھینگر کا شور

*

شاید میرے نام
مست ہوا پھر لائی ہے
خوشبو کا پیغام

*

پھر سے بانٹو تاش
شاید اب کے آ جائے
دھرتی پر آکاش

*

پھولوں کی خوشبو
ایسے بچھڑی پھولوں سے
جیسے میں اور تو

*

تیری اور چلا
دل کچھ ایسے رقص کناں
جیسے مور چلا

Deprt of Urdu, Allama Iqbal Open
University, Sector - H - 8, Islamabad (Pak)



ذکاء الدین شایاں

رنگِ موسم سے اُلجھتے ہو؟ فضا بدلی ہے
خاک اُڑاتے چلے جاؤ کہ ہوا بدلی ہے

چاروں جانب نئے عالم، نئے منظر، نئے دشت
دل کے آئین میں تفسیر ذرا بدلی ہے!

خوش زیبائشوں سے چہرے خراش آلودہ
زندگی! تو نے یہ اب کیسی قبا بدلی ہے؟

دل میں ہی منہ کو چھپائے ہوئے دنیا کے شور
اُس ہرن نے بھی قیامت کی ادا بدلی ہے

مرثیوں کی سی علامات، غزل کے لہجے
خوشبوئیں چاک گریباں ہیں، گھٹا بدلی ہے

Near Old City Post Office,
Pakaria, Pilibhit - 262001 (U.P.)

ہرچرن چاولہ
Helsetheilinga - 27, 1353 Baerums Verk (Norway)



طلوع

وہ سوچتا ناروے میں اس کا کون ہے۔ پیسہ ہے مگر پیسہ بیٹی بیٹا یا رشتہ دار تو نہیں ہوتا۔ مغربی محبوبہ چمک دمک کی دیوانی ہوتی ہے۔ اسے مشرقی بیوی کے رتبے کی عظمت کیا معلوم۔ کچھ دن پہلے وہ مرتا مرتا بچا ہے۔ ایک بار پھر بیمار ہوا تو اس کی بولورام ہو جائے گی۔ جانے موت اسے کس گھاٹ پہ مارے۔ وہ سوچتا تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھنٹوں بیٹھا رہتا وہ ستلج کے کنارے پیدا ہوا تھا۔ پنجاب کے حالات اسے بے چین کر دیتے کیا اس کی آخری خواہش پوری نہ ہو سکے گی اور اس کی راکھ کا کچھ حصہ ستلج کے پانیوں کو ترستا رہے گا۔

پنجاب میں بے گناہوں اور دانشوروں کا جگہ جگہ قتلِ عام، ہٹ لسٹیں، ہندو سکھ بھائی بھائی کا نعرہ لگاؤ اور گولی کھاؤ۔ ہر مندر صاحب کا سیاسی قلعہ بنایا جانا، اس پر فوجی حملہ، اندرا گاندھی کا بہیمانہ قتل اور وشواس گھاتک قتل، بے گناہ سکھوں کا قتل عام۔ اک آگ کا دریا تھا کہ کنارے توڑ توڑ کر شہروں اور بستیوں میں گھسا آتا تھا۔ باہر رہنے والے کچھ لوگ دور اوپر اونچے کوٹھوں پر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے، تالیاں بجاتے اور لڑنے والوں کو شاباشی دیتے تھے۔ جیسے کچھ بگڑے نواب قسم کے لوگ مرغوں یا مینڈھوں کو لڑا کر شور مچاتے اور تماشہ دیکھتے ہیں۔ یہ تماش بین لوگ اتنی اونچائی پر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوتے ہیں کہ نیچے لڑتے جانوروں کے قدموں سے اٹھتی دھول تک بھی ان تک نہیں پہنچ پاتی اور دھول کے دھندلکے میں وہ یہ تک نہیں دیکھ پاتے کہ کون ہارا، کون جیتا یا گیہوں کے ساتھ ساتھ کتنا بے گناہ گھن پس گیا۔ یہ لوگ عادتاً اور خوشی کی لہر میں واہ واہ اور شاباش شاباش کی گردان لگائے جاتے ہیں اور جب دھول بیٹھتی ہے تو انہیں اتنی فرصت کہاں کہ لڑنے والوں کا کیا ٹوٹا، کہاں زخم آیا، پوچھتے پھریں۔ وہ تو اپنے تھکے ہوئے گلوں کو انواع و اقسام کی وہسکیوں سے ٹکوریں پہنچانے ادھر ادھر اپنی طویل و عریض اور عظیم بلڈنگوں کی باروں میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔

بیماری کے بعد اسے نیند بہت کم آتی تھی۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد بے گناہ سکھوں پر مظالم اسے اور زیادہ غمگین کرتے اور نیند کی گولیاں بھی اس پر کوئی اثر نہ کر پاتیں۔ وہ سوچتا رہتا کہ دکھ کے اتنے بڑے ساگر سے کیا وہ چند قطرے بھی کم نہیں کر سکتا۔ اخبارات میں ایسی ایسی وحشت ناک تصویریں آنے لگی تھیں کہ انہیں دیکھ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کٹے بازو، کھلے سر، روتی اور بین کرتی بیوائیں، بے گھر لوگ، جلے ہوئے گھر، یتیم ہو گئے معصوم بچے۔ ان ہی تصویروں میں اس نے ایک معصوم بچے کی تصویر دیکھی جس کے سب رشتہ دار مار دیئے گئے تھے اور وہ ایک جلتے ہوئے مکان کے سامنے اپنی ننھی ننھی مٹھیوں سے آنسو بھری آنکھیں ملتا، آگ کے دریا کے کنارے بے بس لاچار اور بے سہارا کھڑا تھا۔ ایک ہی پل میں اس نے سوچ لیا کہ وہ اسے اپنائے گا۔ ظالموں نے جو کچھ اس سے چھینا ہے۔ وہ اسے وہ سب دے گا۔ اس نے انڈین ایمبسی کی معرفت بچے کا پتہ لگوایا۔ وہ دہلی کے ایک کیمپ میں پناہ گزیں تھا۔ اس نے نارویجین اتھارٹیز اور انڈین ایمبسی کے ذریعے اس کی بازیابی کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ آخر اس کی نیک نیتی پر مبنی کوششیں پھل لائیں اور اسے بچے کو ناروے لانے کا اجازت نامہ مل گیا۔ اس نے فوراً بچے کے نام ہوائی ٹکٹ خرید کر کیمپ انچارج کو بھجوا دیا اسے ادھر سے جواب آیا کہ پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات وغیرہ پر قریب دو ماہ لگ جائیں گے۔

بچہ پل پل اس کے خوابوں اور خیالوں میں بسنے لگا۔ دو ماہ اسے دو صدیاں محسوس ہوئیں۔ وہ یہ دو ماہ اس کے بغیر کیسے گذارے۔ وہ رات بھر بیٹھا سوچتا رہا۔ صبح کام پر جانے سے پہلے جب وہ شیو کرنے کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ رک گئے اور کچھ سوچ کر بنا شیو بنائے وہ کام پر چلا گیا۔

کچھ ہی دن پہلے اسے کیمپ انچارج کے خط کے ساتھ بچے کے کوائف ملے تھے۔ ساتھ میں ماں باپ کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ بچے کا نام مہندر سنگھ، اس کے باپ کا رابندر سنگھ اور ماں کا نام لاجونتی تھا۔ عمر اس کی صرف چھ سال تھی۔ بچے کے لئے گھر میں اس نے ایک کمرے کو سجانا سنوارنا شروع کیا۔ اس کے کھیلنے کا سامان، لکھنے پڑھنے کی میز کرسی، مختلف چیزوں کے مختلف شیلف، خوبصورت اور رنگین تصویروں والی

بہت سی کتابیں اور کامکس کے ساتھ ساتھ اپنے لئے اس نے ایک نئی کار بھی خرید لی جس کی بیک سیٹ کھل کر ڈکی کے ساتھ ایک چھوٹا سا کیبن بن جاتی تھی جس میں چلتی ہوئی کار میں ہی بچہ اپنے کھلونوں سے کھیل سکتا تھا۔

چند سال پہلے بیوی کے انتقال کے بعد اس نے سب رونقیں، ہنگامے اور دوستوں کی محفلیں تیاگ دی تھیں۔ ہاں ایک خوبصورت جھیل کے کنارے ایک وے سائیڈ ریسٹورنٹ ضرور کبھی کبھی اس کی شاموں کی تنہائیوں کا ساتھی بن جاتا تھا۔ وہاں سے اکتاتا تو کبھی کبھی کسی چھٹی کے دن جھیل کے کنارے، چٹانوں کی اوٹ میں دھوپ سے لبالب بھری ایک پلیٹ سی شفاف اور سپاٹ جگہ پر آبیٹھتا۔ جہاں چٹانوں کی سلیں اس کے اور اس کی محبوب جھیل کے بیچ پردے کا کام کرتی تھیں اور ہلکی ہلکی دھوپ جسم و دل کی دردوں پر ٹکوریں سی کرتی محسوس ہوتی تھی۔ یہیں وہ اپنا غم دور کرنے کو کبھی کبھی بیئر کی چسکی بھی لگا لیتا تھا۔ اس دن جانے وہ کوئی بیئر کی در پردہ شرارت تھی یا حقیقت پردۂ مجاز سے باہر آکر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا تھا زندگی کے تیس چالیس گرم و سرد موسموں کو گذار چکنے کے بعد بھی وہ واقعی ابھی تک تر و تازہ اور پر کشش تھی۔ اور شلوار قمیض میں تو بالکل پنجابن لگ رہی تھی۔

"بیٹھیے گا؟" اس نے جگہ بناتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ "میں ہفتہ یا اتوار کو کبھی کبھی لہروں سے دل بہلانے یہاں آجایا کرتی ہوں۔ بڑی پر سکون جگہ ہے۔"

وہ بہت دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بھی تنہا تھی۔ بارہ سال پہلے اپنے وطن میں اس کے حسن کے بیری چند لوگوں نے اس سے اس کا خاوند چھین لیا تھا اور وہ خاوند کی موت کے بعد اپنی چھوٹی چھوٹی دو بچیوں کے ساتھ یہاں بھاگ آئی تھی جو اب خود اپنے گھر بار والی ہو کر اس سے دور امریکہ جا بسی تھیں۔ راجندر اور پروین کبھی کبھی اچانک ہی یہیں مل جاتے تھے مگر انڈیا کے حالات نے راجندر کو پھر سے گوشہ نشیں کر دیا تھا اور اس نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ بہت عرصہ بعد ایک دن پھر اس کے قدم اسے وہیں لے گئے۔ پروین پہلے ہی دری بچھائے وہاں موجود تھی۔

"کہاں تھے؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے اندر"

"ٹھیک کہتے ہو۔ اندر بھی تو داتا کا دربار کھلا ہے۔ باہر ٹھکراتا ہے تو اپنا اندر ہی پناہ دیتا ہے۔" وہ بولی۔

"یہ اندر باہر کا کھیل بھی عجیب تماشہ ہے۔ اوپر والے نے کھلونا بنا رکھا ہے انسان کو۔" اس نے اداس اور فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"کچھ زیادہ ہی اداس لگتے ہو۔" وہ اس کی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اپنے وہاں جو کچھ ہو رہا ہے کسی کو بھی اداس کرنے کو کافی ہے۔" اس نے بیگ سے بچے اور اس کے ماں باپ کی تصویر نکال کر سامنے رکھتے ہوئے اور آدمی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "آجکل یہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

وہ اسے موقعہ دیتی خاموش بیٹھی رہی کہ وہ کچھ اور کہے۔ وہ بولا "یہ بچہ لاوارث اور یتیم ہو گیا ہے۔ قاتلوں نے جو کچھ اس سے چھینا ہے وہ اسے میں دینے کی کوشش کروں گا۔ وہ قریب دو ماہ بعد یہاں آرہا ہے۔"

"کون ہے؟"

"پتہ نہیں مگر اب تو اپنے ہی جگر کا ٹکڑا لگتا ہے۔"

"میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ! میرے ساتھ بچے کو لینے ایئرپورٹ چلو گی؟ دیکھو نہ مت کرنا۔" اس کے لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں۔

اوسلو فورنے بو ایئرپورٹ پر بچے کو ریسیو کرنے سے ایک دن پہلے جب وہ اپنے دوست حمید کے ہاں اوسلو پہنچے تو وہ انہیں پہچان بھی نہ سکا۔ راجندر داڑھی مونچھیں بڑھائے، سر پر پگڑی باندھے اور کلائی پر کڑا پہنے، باقی تینوں ککے بھی دھارن کئے ہوئے تھا۔ پروین کا تعارف کراتے ہوئے اس نے حمید کو بتایا کہ چند ہی روز پہلے انھوں نے شادی کر لی تھی۔ پھر اس نے تصویر کے ساتھ بچے کی پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کل اسے ایئرپورٹ پر لینے جا رہے ہیں۔"

بچہ سہما سہما تھا۔ سن سن، خاموش اور چاروں طرف حیرانی سے دیکھتا ہوا۔ پروین اور راجندر کو دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے چونکا ضرور مگر وہ پھر اپنی خاموش دنیا میں ڈوب گیا۔ راجندر، پروین سے بولا۔ "لاجو" اب وہ اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا۔ "مہندر کو اوسلو بھی تو دکھانا ہے کیوں نہ ہم ہفتہ بھر اور یہاں رک جائیں۔" اور انھوں نے کچھ دن مزید حمید کے ہاں رکنے کا پروگرام بنا ڈالا۔ شاید بڑے شہر کی رونقیں بچے کو اپنا دکھ بھلانے میں مددگار ثابت ہوں۔ انہوں نے سوچا۔

حالانکہ گھر اور کار کی پچھلی سیٹ کھلونوں سے بھری پڑی تھی مگر وہ پھر بھی اسے کھلونوں کی ایک بہت بڑی دکان پر لے گئے تاکہ وہ خود اپنی پسند کی چیزیں خرید سکے۔ وہاں ہر قسم کے بھالو، کتے، بلیاں، شیر، چیتے، آٹومیٹک جھولے، ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں، قسم قسم کی موٹریں، الیکٹرانک کھیلوں کی مشینیں اور جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا مگر بچے نے کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ خود انہوں نے کوئی کھلونا اسے پکڑا دیا تو اس نے لے لیا اور پھر اسے کار میں رکھ کر بھول گیا۔ اسٹین اینڈ اسٹرام

کے بڑے سٹور میں وہ اسے بچوں کے کپڑے کے سیکشن میں بھی لے گئے جہاں کئی رنگ برنگے اور خوبصورت ڈیزائنوں کے کپڑے اسے پہنا پہنا کر انھوں نے دیکھے مگر یہ سب کچھ بھی بچے کے چہرے پر خوشی کی کوئی لکیر نہ لا سکے۔ فراگنزپارک کے بچوں کے حصے میں اسے جھولے جھلائے گئے ۔ سی ساکا کھیل کھلایا گیا۔ گدگدی کر کے ہنسانے کی کوششیں بھی ناکام ثابت ہوئیں جیسے ہنسی اس کے ہونٹوں کا راستہ ہی بھول گئی ہو۔

ماں باپ کے ہاں ہار کیا کام ۔انہوں نے ایک دن اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ بس ذرا رنگ برنگی تصویروں کی ہنسانے والی کتابیں ضرور اس کے قریب رہنے دیں۔ اگلے دن وہ پھر اسے Bygdbyalle کے شپ میوزیم لے گئے۔ نئے پرانے چھوٹے بڑے جہاز دکھائے۔ ان کے بارے میں ساری کہانیاں بڑے دلچسپ انداز میں اسے سنائیں۔ دور دور تک خیرلی میں سمندر کی سیریں کرائیں ۔ میونخ میوزیم دکھایا۔ اسکوٹین بادے کے سوئمنگ پول میں اپنے ہاتھوں پر اسے گھنٹوں تیرنا سکھاتے پھرے۔ بچہ سب کچھ ایسے کرتا جیسے وہ کوئی چابی والا کھلونا ہو جیسے سب کچھ جو اس کے ساتھ بیت رہا ہو، وہ اس کا ساتھی نہ ہو۔

اگلے دن صبح انھوں نے اپنے گھر ہونی فاس کے لئے روانہ ہونا تھا۔ شام انھوں نے اسے گرینڈ ہوٹل میں بہترین کھانا کھلایا پھر اسے روشنیوں کا شہر دکھانے ہولمن کولن کی پہاڑی پر ہولمن ریسٹورنٹ لے گئے جہاں ریسٹورنٹ کی کھڑکی سے شہر کا نظارہ کرتے ہوئے انھوں نے آئس کریم کھائی۔

ہانی فاس جاتے ہوئے راستے میں جگہ جگہ کار روکتے اور اسے خوبصورت نظارے دکھاتے وہ اپنے گھر کی طرف بڑھتے گئے مگر ناروے کا تمام حسن بچے کو ذرا بھی اپنی طرف راغب نہ کر سکا جیسے کوئی بہت بڑی قیمتی اور اس کی دل پسند چیز اس سے چھن گئی ہو۔

راجندر اور پروین اپنے وقت کا سب سے زیادہ حصہ اسے ہی دیتے ۔ رات کو نارویجین بچوں کی طرح اسے اکیلے کمرے میں نہ چھوڑتے بلکہ اپنے ساتھ چھاتی سے لگا کر سلاتے مگر بچہ رات کو بھی نیند میں کبھی کبھی بڑبڑاتا اور ڈرتا رہتا۔

کچھ دن بعد کیمپ انچارج کا ایک اور خط انہیں ملا جو بچے کے بارے میں مزید معلومات اور تفصیلات کا مجموعہ تھا۔ یہ جان کر کہ بچے کا باپ ریلوے ملازم تھا۔ راجندر خود بچے کو ساتھ لے کر اوسلو گیا اور تمام سازوسامان کے ساتھ دس ہزار کرونر کی ٹرین، دو ریلوے سٹیشن، پہاڑیاں، درخت، پل، واٹر پمپ، لوکوشیڈ، لائنیں، کانٹے، سگنل، سرنگیں، پلیٹ فارم، سائیڈ ٹکس وغیرہ خرید لایا اور انہیں بچے کے کمرے کے ایک کونے میں ایک بہت بڑی میز پر پورے ریلوے سسٹم کی طرح سیٹ کر دیا۔ دیکھنے میں ٹرین پرانے زمانے کی اسٹیم انجن سے چلنے والی لگتی تھی اور اسی لئے بہت مہنگی بھی ملی تھی مگر اصل میں وہ چلتی بجلی سے ہی تھی جو بٹن دبتے ہی اسے اپنی ہی لائن کے پیچ سے حاصل ہونے لگتی تھی۔ یہ سب کچھ بھی بچے کی آنکھوں میں خوشی کی کوئی چمک، کوئی کرن تک نہ لا سکے۔

کام سے آتے ہی راجندر گھنٹوں بچے کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ گھوڑا بن کر اسے گھر کے کونے کونے میں گھماتا پھرتا۔ بچے کا ہاتھ ہی اگر اسے کہیں سے چھو جاتا تو وہ جان بوجھ کر پٹخنی کھا کر دور جا گرتا جیسے کنگ کانگ قسم کے کسی پہلوان نے اسے دھکا دے دیا ہو۔ ایسے ہی ایک دھکے کا پوز کرتے ہوئے ایک دن جب وہ اپنے ڈرائنگ روم کے کونے میں ایک اسٹول پر کھڑا وائی کنگ کے بڑے بڑے سینگوں والی ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں ننگی تلوار لئے ڈراؤنے مجسمے سے ٹکرایا اور مجسمہ اپنی تلوار کا وار کرتا ہوا سا اس کے سر کی طرف جھکا تو بچہ ایک دم چیخ اٹھا۔ "دارجی۔"

چیخ سن کر پروین دوڑی دوڑی اندر پہنچی اور سہمے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ مجسمے کی طرف دیکھتا اور سہا ہوا بچہ پروین کے گلے میں بانہیں ڈالے اس سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے باپ کو کسی غنڈے نے تلوار سے قتل کیا تھا۔ کیمپ انچارج کے خط میں یہ تفصیل بھی درج تھی۔

◆◆

بقیہ صفحہ ۱۶ : اندھیرے کی طرف بڑھتے قدم

اجنبیوں کی طرح آگے بڑھ گئی۔ گپتا نظر بچا کر مسکرایا۔ منتری جی نے ہلکا سا اشارہ کیا اور وہ پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹوں بعد دربار برخاست ہو گیا۔ منتری جی پچھلے کمرے میں چلے گئے۔ گپتا، امر کو باہر لے آیا۔ باہر کھڑے آدمی نے اسے کار کی چابی لوٹا دی۔ وہ اندھیرے میں چلتے ہوئے کار تک گئے۔

اچانک عمارت کے پچھواڑے شعلے سے بلند ہوئے۔ لپٹیں آئیں اور ڈوب گئیں۔ امر نے سوالیہ نظروں سے گپتا جی کی طرف دیکھا۔ گپتا نے دبی سی آواز میں کہا۔

"منتری جی تندوری چکن پسند کرتے ہیں۔ اب تم جاؤ۔"

سڑک پر دھیمی رفتار سے کار چلاتے ہوئے وہ سگریٹ سلگانے کے لیے رکا۔

عمارت کے عقب سے ایک نسوانی چیخ ابھری اور سناٹے میں ڈوب گئی۔ تندور سے اٹھنے والی لپٹوں کی سرخ زبانیں اندھیرے چاٹ گئے۔

بہت دور جا کر اس نے ہیڈ لائٹس آن کیں اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

◆◆



شین کاف نظام

آبجو تو ایسے ہی بہتی رہے گی

آبجو کے اس طرف
چگ رہے ہیں
ہنس، موتی
اس طرف
میں
چن رہا ہوں
لفظ ....
بن رہا ہوں
نظم
ہنس موتی چگ کے
برفیلی فضا میں
ڈھونڈنے کوئی ٹھکانہ
چل پڑیں گے
میں
یوں ہی چنتا رہوں گا
لفظ
بنتا رہوں گا
نظم
آئے گا کوئی
جو توڑ دے گا
ضبط کی ہر نظم
نظم کا ہر نسق
لفظ سارے آبجو کو سونپ دے گا
پھر چنے گا لفظ ....
آبجو تو ایسے ہی بہتی رہے گی

● Kalla's Street, Jodhpur (Raj)



ساجد حمید

خالی لمحوں کے درمیاں

اچھے دن کتنی سرعت سے گذر جاتے ہیں
شلیف میں رکھے
ٹوٹے پھوٹے
خام کھلونے
ہاتھوں میں لے کر
گرم لہو کے لمس کی لذت سوچ رہا ہوں
گھر آنگن میں
بے معنی، الفاظ ستارے
ننھے منے نقشِ قدم
بوند بوند چیخیں، اودھم
روشن آنکھوں کی سرگم
میٹھی باہنوں کا ہالہ
کیوں ڈھونڈ رہا ہوں
کیا میں بازی ہار چکا ہوں۔؟

● C/o, H.M.Sharif, Forest Contractor
Savayi Palya, Shimoga - 577201
(Karnataka)



شہرام سرمدی

Hypertention کی ایک نظ

رگوں میں
لہو کی حرارت
بہت تیز ہوتی چلی جا رہی ہے

بہت سرخ گہری لکیریں
خلا کینوس پر
عجب جال بننے میں مصروف ہیں رات د

تتلیاں ہونٹ پھولوں کا رس
چوسنے سے گریزاں
زباں موت کا ذائقہ
جاننے کو پریشاں

● Department of Persian,
University of Mumbai, Vidiya Nagri
Santacruz (W) Mumbai - 98

الیش کمار
1054 - Sector 5A, Bokaro - 827001 (Bihar)

شاعری اور سچ

شاعری اور سچ کا معاملہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب افلاطون (Plato) نے شاعری پر پُر زور حملہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاعری یا دیوتاؤں کے بھجن یا قومی رہنماؤں کی تعریف تک ہی محدود رہے۔ باقی تمام شاعری کو اپنی جمہوری ریاست (Republic) سے دو وجوہ کے سبب باہر نکالنا چاہتا تھا ایک یہ کہ شاعری بوسیدہ احساس میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ اس کا اخلاقی اعتراض تھا۔ اور دوسرے وہ جھوٹ بکتی ہے۔ یہ تھا دماغی اعتراض۔

افلاطون کا عقیدہ تھا کہ سچائی چیزوں میں نہیں خیالات میں ہوتی ہے۔ جو چیزیں ہم دیکھتے ہیں وہ محض خیالات کی نقل ہوتی ہیں۔ ایک کاریگر جو بستر بناتا ہے وہ اس کے اندر خیال کا نتیجہ یا نقل ہوتا ہے۔ اور جو مصور اس کی تصویر بناتا ہے یا اس پر شاعری کرتا ہے وہ نقل کی بھی نقل ہوتی ہے۔ وہ اصلیت سے تگنا دور ہو جاتا ہے۔ زید اور بکر پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن انسان کبھی نہیں مرتا۔

افلاطون کے اس فلسفے کا کئی بار مذاق ہوا۔ اس پر حقیقت پسندوں (realists) اور وجودیوں (materialists) میں بحث ہوتی رہی۔ من (mind) کو اصل ماننے والے افلاطون کی تائید کرتے رہے اور مادہ (metter) کے حامی اس کی تنقید۔ یہ تنازعہ انگلستان میں اٹھارویں صدی میں ہیوم (Hume) اور برکلے (Berkley) میں پھر اور خوب گرما گرم بحث و مباحثے ہوئے یہاں تک کہ ایک مذاحیہ فلاسفر نے یہ کہہ دیا کہ (No matter, never mind)۔ من اور مادہ کی بحث میں مت پڑو۔ لیکن یہ ایسا معاملہ ہے جس میں اپنے عقیدوں کے مطابق دونوں گروپوں میں بحث ہمیشہ جاری رہے گی۔ اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے ڈاکٹر جانسن (Jhonson) نے ایک کھمبے کو ٹھوکر مار کر یہ کہہ کر کرنا چاہا کہ کیا اس میں اصلیت نہیں ہے۔

افلاطون بچہ نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے جیومیٹری کے ذریعے جو اس وقت کافی ترقی پر تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اکیڈمی کے دروازے پر یہ لکھ دیا تھا کہ جو شخص جیومیٹری نہیں جانتا وہ اندر داخل نہ ہو۔ اپنے عقیدے کا ثبوت دیا۔ اس نے کہا کہ نقطے کی تعریف یہ ہے کہ اس کی کوئی لمبائی یا چوڑائی نہیں ہوتی۔ آپ مجھے ایسا نقطہ بنا کر دکھائیں۔ چاہے آپ کی پنسل نہایت نازک ہو۔ آپ ایسا نقطہ نہیں بنا سکتے۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی ضرور ہوگی۔ چاہے وہ آپ کو آنکھوں سے نظر نہ آئے۔ اسی طرح ایک سطر وہ ہے جس کی لمبائی ہوتی ہے چوڑائی نہیں ہوتی آپ ایسی سطر بھی نہیں بنا سکتے جس نقطے یا سطر پر جیومیٹری کا دار و مدار ہے وہ ہمارے بنائے ہوئے نقطے یا سطر نہیں۔ بلکہ ان کے خیال۔ ہمارے بنائے ہوئے ان خیالات کی نقل ہیں۔

اسی طرح ہر ایک چیز کی حقیقت اس کے اندرونی خیال میں ہے۔ آپ لذیذ سے لذیذ کھانا کھائیں۔ لیکن اس کی اصلیت سبزی اور گوشت میں نہیں۔ اس کے دیکھنے اور سونگھنے میں چھونے اور چکھنے میں اور آخر کار آپ کی پرورش میں ہے۔ اسی طرح کسی چیز کی بھی سچائی۔ اس کی مادّی شکل میں نہیں بلکہ جو ہم اس کے بارے میں خیال کرتے ہیں۔ ہماری حساب کی کتابیں یاد دلاتی ہیں کہ روپیہ سو پیسوں کا ہوتا ہے۔ کیا اس کی اصلیت یہی ہے؟ ایک مفلس اور دولتمند کے لیے روپئے کی قیمت مختلف ہوتی ہے۔ اور مختلف مقامات پر ایک ہی شخص کے لیے بھی اس کی قیمت اس کے حالات پر مبنی ہے۔ کبھی تو ایک پانی کا گلاس بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ صدیوں کے بعد آئین سٹائن (Ein stein) نے ہمیں بتایا کہ سائنس خود مختلف اصلیت کی ہے۔ ہر چیز کی سچائی انسان کے خیالات پر مبنی ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک میٹر کی لمبائی اس ڈنڈے کے برابر ہے۔ جو پیرس کے نزدیک سیودرن میں پڑا ہے۔ لیکن ایک مسافر سے پوچھئے جو تیس کلو میٹر چل چکا ہے کہ اس کا پہلا میٹر اس کے آخری میٹر کے برابر ہے۔ یا کیا ایک میٹر ایک بچے۔ ایک نوجوان یا بوڑھے کے لیے برابر ہے۔؟

وقت کی بھی یہی سچائی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے As you Like it میں آرلینڈو (Orlando) سے مسکراتا لہجے میں روزالنڈ (Rosalind) کہتی ہے۔ کہ وقت کی رفتار مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ آہستہ رینگتا ہے۔ کبھی تیز چلتا ہے اور کبھی بھاگتا اور کبھی بالکل ٹھہر جاتا ہے۔ جب آئین سٹائن سے رلیٹیوٹی (relitivity) کے بارے میں ایک بار پوچھا گیا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ جب ایک خوبصورت لڑکی

آپ کی گود میں ایک گھنٹے کے لیے بیٹھتی ہے تو وہ ایک گھنٹہ آپ کو ایک منٹ کے برابر محسوس ہوتا ہے لیکن اگر آپ ایک گرم پتھر پر ایک منٹ کے لیے بیٹھیں تو وہ ایک منٹ ایک گھنٹے کے برابر معلوم ہوگا۔ شاعروں نے ہجر و وصال کے وقت کا خوب جائزہ لیا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

یا ایک قوسِ قزح کی حقیقت کیا ہے؟ نیوٹن (Newton) کہتا ہے کہ یہ سورج کی کرن کا سات رنگوں میں بکھرنا ہے۔ یا جو ورڈز ورتھ (Wordsworth) کہتا ہے جس کا دل اسے دیکھ کر اچھل پڑتا ہے My heart leaps up when I behold a rainbow in the sky. اور جو اسے قدرتی ایمان (natural piety) کی طرف راغب کرتی ہے۔ یا جو ایمیلی ڈکسن (Emily Dickson) نے نیوٹن کے تین صدیوں کے بعد کہا کہ یہ فلسفے سے بھی زیادہ معتبر ہے (more convincing than philosophy)

ایک پھول کی سچائی کیا ہے جو ایک زراعتی سائنس دان (botanist) کہتا ہے کہ اس کا نام کیا ہے؟ اس کی قسم اور پھولنے پھلنے کی شرائط وغیرہ کیا ہیں یا جو ایک شاعر کہتا ہے کہ وہ اس کے سوکھ جانے پر روتا ہے (Weeps to see it weste away so soon) یا جو ہمیں زندگی کا اختصار یاد دلاتا ہے۔ (We have short time to stay as you) یا وہ پھول جو ایک عاشق اپنی معشوقہ کو بھیجتا ہے کہ وہ اپنی جوانی کو ضائع نہ کرے کیونکہ ہر ایک خوبصورت اور خوش کن چیز مختصر ہوتی ہے۔ یا علامہ اقبال کی گل رنگیں۔

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو اور تیری زندگانی بے نیاز آرزو وغیرہ

یا علامہ کا گل پژمردہ ؎

کس زباں سے اے گل پژمردہ تجھ کو گل کہوں کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
تھی کبھی موج صبا گہوارۂ جنباں ترا نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا
تیرے احسان کا نسیم صبح کو اقرار تھا باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا وغیرہ

اسی طرح چاند کی حقیقت کیا ہے وہ جواب ہوا بازوں نے دیکھا ہے یعنی ویران چٹانوں کا مرکب یا جو کیٹس (Keats) کہتا ہے۔ شاعروں کا بانی (maker of poets) یا جو علامہ اقبال کہتے ہیں۔

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں اس سیہ روزی میں لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں وغیرہ
یا ؎ اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے طوفِ حریم خاکی تیری قدیم خو ہے

اس لئے افلاطون کا یہ کہنا کہ مادہ چیزوں کی اصلیت ہمارے خیالات میں ہے۔ بے معنی نہیں۔ چیزیں ہمارے خیالات کی نقل ہیں اور شاعری جو ان چیزوں کی نقل کرتی ہے نقل کی نقل ہے۔ ارسطو لین (Aristolis) نے جو ارسطالین کا سب سے لائق شاگرد تھا۔ اس کے برخلاف آواز اٹھائی اور افلاطون کو ناراض کردیا۔ افلاطون کہنے لگا کہ ارسطالین ایک بچھڑے کی مانند ہے جو ماں کا دودھ پی کر اسے لاتیں مارتا ہے۔ افلاطون اندرونی اصلیت کا داعی (myslee) تھا اور ارسطالین، باہر کا (realist) کی ایک تصویر میں دونوں کھڑے ہیں۔ افلاطون اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے اور ارسطالین نیچے زمین پر۔ دونوں نے شاعری کے لیے لفظ نقل (Minesis) استعمال کیا ہے لیکن ارسطالین نے کہا ہے کہ نقل کا مطلب فوٹوگرافی نہیں جیسا افلاطون سمجھتا ہے بلکہ مصوری (painting) ہے۔ شاعر پھول یا قوس قزح کے بارے میں وہ باتیں لکھتا ہے جو اس پر اثر کرتی ہیں وہی ان کی اصلیت ہے۔ وہ شاعری کا تاریخ سے مقابلہ کرتا ہے۔ تاریخ صرف نقل ہی ہے جو کچھ ہو چکا ہے۔ وہی بیان کرتی ہے اس میں تبادلہ یا اضافہ نہیں کرسکتی۔ لیکن شاعری گہری اصلیت میں جاتی ہے۔ وہ ماضی سے سبق لیتی ہے اور مستقبل کے لیے نتیجہ نکالتی ہے اور راستہ بتاتی ہے۔ پیچیدہ واقعات کو صاف کردیتی ہے ارسطالین کا فلسفہ عام طور پر قبول کرلیا گیا نہ صرف شاعری کے لیے بلکہ تمام عطار (arts) کے لیے۔ عطار چیزوں کی نقل نہیں کرتے، ان کی اصلیت ظاہر کرتے ہیں۔ ارسطالین کی پیروی کرتے ہوئے رسکن (Ruskin) نے دو قسم کی سچائیاں بتائیں۔ ایک geometric اور دوسری organic۔ مطلب وہی تھا۔ جسے افلاطون اور ارسطالین نے minesis کے دو مختلف معنی لیے تھے۔ کیٹس اور گہرائی تک چلا گیا اور کہا کہ فلسفے کی سچائیاں جب تک ہمارے احساس تک نہ پہنچیں سچائی نہیں ہوتیں اور شاعری ہی یہ کرتی ہے۔

دنیا میں ہر قسم کے واقعات اور حادثات ظہور میں آتے ہیں۔ چھوٹے بڑے، غمگین و خوش کن۔ صاف اور دھندلے۔ جن سے عقل گھبرا جاتی

ہے اور انسان کو کچھ نہیں سوجھتا کہ وہ کیا کرے۔ ایک عظیم شاعر کی بینائی صاف ہوتی ہے وہ اس تمام معمے میں اصلیت کو دیکھ لیتا ہے اور اندھکار سے روشنی پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے لیے غم بھی بامعنی اور کارکن ہو جاتا ہے۔ جیسے جرمنی کا عظیم ترین شاعر گیٹے (Goethe) کہتا ہے۔ "جس نے غم نہیں دیکھا وہ خدائی طاقتوں کو نہیں جانتا۔ یا بقول کیٹس "میں نے غم کو خیر باد کہا اور اسے پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرا مستقل اور مہربان دوست ہے۔ یا ورڈزورتھ کہتا ہے کہ دردناک غم نے میری روح کو اطمینان بخشا ہے۔

شاعر کو سینکڑوں سوال پیش آئے ہیں۔ وہ ایک فلاسفر کی مانند حل پیش نہیں کرتا وہ ان کی گہرائیوں میں جاتا ہے اور مختلف وقت اور حالات کے مطابق حل ڈھونڈتا ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ جو ایک قسم کے حالات میں نیکی ہو۔ وہ دوسرے قسم کے حالات میں بدی بن جاتی ہے۔ اوتھیلو (Othello) کے حالات میکبتھ (Macbeth) کے حالات سے مختلف ہیں۔ اگر اوتھیلو، میکبتھ کی جگہ ہوتا تو وہ اپنے چچا کو مار کر سلطنت سنبھال لیتا۔ اور اوتھیلو کی جگہ پر میکبتھ نے آیاگو (Iago) کی بد معاشی تاڑلی ہوتی اور گھبرا کر ڈسڈی مونا (Desdemona) جیسے ہیرے کو صرف آخری بوسہ دے کر قربان نہ کرتا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے کہ آئین سٹائن کے زیر اثر اب تو سائنس بھی ایک جیسی نہیں رہی۔ اب یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدائے تعالیٰ بھی مختلف حالات میں مختلف آدمیوں کے لیے مختلف ہے۔ یہاں تک کہ جتنے آدمی ہیں اتنے ہی خدا ہیں۔ ہر ایک کے لیے خدا وہ ہے جو اور جتنا اس کی زندگی پر اثر رکھتا ہے اور اسے نیکی کے راستے پر چلاتا ہے۔ والٹیر (Voltaire) نے کہا ہے کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے مطابق نہیں بنایا تو ہم نے خدا کو اپنے مطابق بنا دیا ہے۔ لوٹزے (Lotze) کہتا ہے کہ ہم دماغ کے ذریعے سچائی تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ دل یعنی احساس کے ذریعے جو بدلتے رہتے ہیں۔ کیٹس نے کہا کہ سچائی ہمارے خیالات کی خوبصورتی ہے۔

جب تک مذہبی عقائد کو شاعری زندگی نہ بخشے۔ وہ مردہ سے رہتے ہیں۔ دماغی اصول ہوتے ہیں اور ہمیں موثر نہیں کرتے۔ شاعری انہیں متحرک کرتی ہے۔ تب وہ ہماری روح کا حصہ بن جاتے ہیں اور ہمارے چال چلن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ شیکسپیئر کے لفظوں میں شاعری ہوائی ناچیزوں کو نام اور جگہ بخشتی ہے۔ غصہ ایک خیالی حرکت ہے۔ لیکن جب ہم ایجکس (Ajex) کو غصے کے زیر اثر بھیڑ بکریوں کو انہیں یونانی دشمن سمجھ کر مارتا دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ غصے کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح حسد اوتھیلو کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور غرور میکبتھ کی شکل میں۔ یہ احساس ہماری روح میں اتر جاتے ہیں اور ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم صرف ایک ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں یہ خیال ہی نہیں رہتا، جو لڑکی ڈسڈی مونا کا پارٹ کر رہی ہے وہ ہماری ہم جماعت ہے اور اسے ہم ڈرامے کے بعد ملیں گے۔ اس میں کونسی حیرانی کی بات ہے کہ یہ ڈراما دیکھتے ہوئے ایک عورت اپنی جگہ سے اٹھ کر زور سے چلائی۔ "ارے بیوقوف اوتھیلو، تم اتنا بھی نہیں دیکھ سکتے کہ ڈیسڈی مونا بے قصور ہے نیز ڈاکٹر جانسن جیسا عقلمند اور ذی شعور شخص کنگ لیر (King Lear) کا ڈراما دیکھتے ہوئے ہال سے نکل گیا کیونکہ وہ کارڈیلیا (Cordelia) کی موت کا سین نہ دیکھ سکا۔ ایسے ڈراموں میں ہمارا دماغ ہمارے دل کے قابو میں ہوتا ہے۔ کومرج (Cobridge) نے کہا کہ اس وقت کا شعری اعتقاد ہمارے تمام شکوک مٹا دیتا ہے۔

آج کل کے سائنس کے وقت میں یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم جن بھوتوں کو نہیں مانتے لیکن شیکسپیئر کے ڈراموں میکبتھ، ہملیٹ، جولیس سیزر میں نہایت ضروری حصہ لیتے ہیں۔ ان کے برخلاف ہمارا دماغ بغاوت کرتا ہے اور وہ ڈرامے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ اعتراض غیر شاعرانہ ہے۔ شاعری میں ہم کو شاعر کے اعتقاد کو سمجھنا چاہیے۔ کیا وہ اپنے کو اچھی طرح واضح کرتا ہے یا نہیں۔ اس میں تو خلل نہیں ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ میکبتھ جیسا شاعرانہ خیالی۔ مغرور اور حساس شخص جو جن بھوتوں میں یقین رکھتا ہے ان کے کہنے پر ٹھیک چل رہا ہے یا نہیں۔ ارسطالیس یہ بھی کہتا ہے کہ شاعری میں سائنس اور فلسفے کے اصولوں سے زیادہ دل اور احساس کے اصول کام آتے ہیں۔ ہندی کا شاعر بہاری کہتا ہے۔

शूघे पाऊ न घर परत शोया ही के मार. (وہ نازک معشوقہ خوبصورتی کے بوجھ سے نہیں چل سکتی) ایسی ہی بات اردو کے شاعر بھی کہتے ہیں ۔

کمر نزاکت سے لچک جائے — کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
نزاکت اس قدر ہے ان کے پا کی — اٹھا سکتے نہیں رنگ حنا کو
ناز کہتا ہے زیور سے تزین جمال — نازکی کہتی ہے سرمہ بھی کہیں بار نہ ہو
یوں نزاکت سے گراں سرمہ ہے چشم یار کو — جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار کو
سیدھے سبھاؤ چل بھی نہیں سکتے اب تو وہ — کیف شباب بھی انہیں اک بار ہو گیا

ایک سائنس داں کہنے لگا کہ شاعر یہ کیسی فضول باتیں کہتے ہیں۔ کیا خوبصورتی یا نزاکت یا جوانی کا بوجھ ہوتا ہے۔ جس سے ایک حسین نازک عورت چل نہیں سکتی۔ یا سرمہ اور حنا کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ اردو کے شاعر معشوق کی کمر بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جغرافیہ ، وجود سارا ہر چند ہم نے چھان مارا
کی سیر گرچہ بحر و بر کی لیکن نہ خبر ملی کمر کی
شاہد مطلق ہستی کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
کہیں دیکھا نہ ہستی و عدم کا اشتراک ایسا جہاں میں مشکل رکھتی ہی نہیں ان کی کمر اپنا
جو پوچھا نیستی و ہستی میں کیونکر فرق ظاہر ہو کمر نے یار کی املا کیا میں حد فاصل ہوں
دید کمر یار کی مشتاق ہیں آنکھیں ہستی میں تماشائے عدم مدنظر ہے
مغرب نے خوردبیں سے کمر ان کی دیکھ لی مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

دماغی نقطہ نگاہ سے یہ تمام اشعار نہایت دروغ اور فضول ہیں مگر اب اس سے بھی آگے چلئے اردو کے عظیم ترین شاعر مرزا غالب کو سنئے ۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

یہ کیسا نازک معشوق ہے کہ عاشق نے اسے خواب میں چلتے دیکھا اور معشوق بیچارے کے پاؤں دکھنے لگ گئے ہیں۔ اور یہ مولانا حالی کا معشوق ہے، ملاحظہ کیجیے:

کیا نزاکت ہے کہ عارض ان کے نیلے پڑگئے ہم نے تو بوسا لیا تھا خواب میں تصویر کا

یہاں عاشق خواب میں بھی معشوق کا بوسہ نہیں لیتا۔ صرف اس کی تصویر کا بوسہ اور وہ بھی خواب میں لیتا ہے لیکن گال معشوق کے نیلے ہو جاتے ہیں۔ ہندی کا مشہور شاعر بہاری بھی پیچھے نہیں رہتا۔ جب رادھا کو اس کی ایک سہیلی خود اعتمادی کا سبق دیتی ہے کہ کرشن تمہیں ٹھٹھا محفل کر کے تنگ کرتا ہے تو اسے کیوں تنگ نہیں کرتی تو رادھا اسے آنکھوں سے منع کرتی ہے کہ وہ خاموش ہو جائے کیونکہ اس کے دل میں بیٹھا کرشن سب کچھ سن رہا ہے۔ اسی طرح کرشن مالا وغیرہ نہیں پہنتا اور نہ ہی خوشبودار عرق وغیرہ سینے کو لگاتا ہے کہ ان سے اس کے دل میں بیٹھی رادھا کو تکلیف نہ ہو۔ کبھی تو ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ کرشن کو دیکھ رہی ہے۔ وارث شاہ نے کیا خوب کہا ہے ۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی آکھونی سپنوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی

فارسی کے شاعر کا ضرب المثل شعر ہے ۔

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

میں تو بن گیا اور تو میں بن گیا۔ میں روح ہو گیا اور تو بدن ہو گیا۔ یہاں تک کہ کوئی نہ کہہ سکا کہ میں اور تو ایک دوسرے سے الگ ہیں)۔ بہاری کے ایک دوہے میں معشوقہ حیران ہوتی ہے کہ جب سب دروازے بند ہیں تو عاشق اس کے خواب میں کہاں سے آجاتا ہے۔ اسی طرح ۔

کھلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہے ہمیشہ کیا جانے کہ آجاتا ہے تو اس میں کدھر سے

انگریزی کا شاعر ہربرٹ شپمین (Herbert Shipman) کہتا ہے ۔ میں نے دل کے تمام دروازوں پر لکھ دیا ہے کہ عام راستہ نہیں ہے۔ لیکن عشق ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ میں ہر جگہ داخل ہو جاتا ہوں۔

رومیو (Romeo) کے لیے جنت وہاں ہے جہاں اس کی جولیٹ (Juliet) ہو۔ بہاری کی گوپیوں کو جب کرشن کا پیغامبر اُدھو جنت کا لطف پیش کرتا ہے وہ جواب دیتی ہیں کہ ایسی جنت پر خاک پھینکو اگر وہاں ہمارا عاشق نہیں ہے۔ عاشق کی صحبت میں ہمیں دوزخ بھی منظور ہے۔ بلیک (Blake) نے کہا کہ محبت دوزخ کی تباہی میں بھی جنت بنا لیتی ہے اور سکاٹ (Scott) کہتا ہے۔ محبت جنت ہے۔ اور جنت محبت ہے۔

اردو کے شاعر تو بار بار کہتے ہیں : ۔ ترا ملنا ترا نہیں ملنا اور جنت ہے کیا جہنم کیا

مجھ کو دوزخ رشک جنت ہے اگر میرے لیے واں بھی آتش ہو کسی کے روح آتشناک کی
نہ جاؤں گا جنت کو میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہوئیگا نقشہ تمہارے گھر کا سا
جو اور کچھ ہو تیری دید کے سوا منظور تو مجھ پہ خواہش جنت حرام ہو جائے
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

میں جانتا ہوں کہ میں ضرورت سے زیادہ تفصیل میں جا رہا ہوں۔ مگر افلاطون کے ساتھ جو شاید ان سب باتوں کو جھوٹ کہہ دے۔ بحث کرنا کونسا بچوں کا کھیل ہے۔ اور سنیے۔ معشوق کے ہجر میں عاشق کی تن شکنی۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر دیکھئے)



اسعد بدایونی

را سی بات پہ لوگ انجمن بجھاتے ہیں
و ہم ہی اپنا چراغِ سخن بجھاتے ہیں

ڑے جتن سے جلائی گئی تھی سینوں میں
یہ آگ اب جسے اہلِ وطن بجھاتے ہیں

ہدو کے خوف کی گرمی تو اک کہانی ہے
م اس سے تیغ بصد بانکپن بجھاتے ہیں

ہوائے عشق گھنے جنگلوں میں چلتی ہے
ستارے جھیل میں گر کر تھکن بجھاتے ہیں

نہ میرے خون میں گرمی نہ تیرے جسم میں رنگ
سو اب چراغِ ہوس جانِ من بجھاتے ہیں

جزیرۂ دل و جاں تک نہ آئے گا وہ جہاز
یہ آگ ہے جو برائے سخن بجھاتے ہیں

Urdu Department
A.M.U. Aligarh (U.P.)

کرشن کمار طور

قصور اس میں ہے کیا افلاک کا
میں خود دشمن ہوں اپنی خاک کا

جہاں کہتا ہے جس کو زندگی
تماشا ہے خس و خاشاک کا

مرے ماتھے پہ ہے لکھا ہوا
میں بندہ ہوں شہہ لولاک کا

یہ دل ہے اور دل کی سلطنت
یہاں کیا کام ہے ادراک کا

الگ کر دوں تو پھر سرمد بنوں
بہت ہے بوجھ اس پوشاک کا

اب اپنے آگے بھی جھکتی نہیں
ہے سر کتنا چڑھا اس خاک کا

تمہارا خشک دامن کیوں ہے طور
ہوا کیا دیدۂ نم ناک کا

E-134, Khaniyara Rd.
Dharamshala (H.P.)

اعتبار ساجد

کہاں جائیں کہ بزم آرائیاں سب ایک جیسی ہیں
ہماری شہرتیں، رسوائیاں سب ایک جیسی ہیں

فقط چہروں کی اور ناموں کی تبدیلی سے کیا حاصل؟
رفیقوں کی کرم فرمائیاں سب ایک جیسی ہیں

بھلا کیا تبصرہ جھوٹے گواہوں پر کیا جائے؟
کہ سب سچے ہیں اور سچائیاں سب ایک جیسی ہیں

ہمارے شہر کی گلیوں میں بہتے ہیں کئی دریا
سبھی گہرے ہیں اور گہرائیاں سب ایک جیسی ہیں

جہالت دیکھ کر شرما رہی ہے ان کی دانش کو
کہ جن کی منطقیں، دانائیاں سب ایک جیسی ہیں

ہم اپنے ساتھ لمحہ بھر کہیں رہتے نہیں ساجد
ہماری محفلیں، تنہائیاں سب ایک جیسی ہیں

E - 3, Officer's Flats, Allama Iqbal Rd.
Lahore (Pak)

سلیم شہزاد

323 - Mangalwar Ward, Malegaon - 423203 (M.S.)

ویر گاتھا

میں کروکشیتر میں بیٹھا یہ رزمیہ لکھ رہا ہوں۔

سورج نکلتے ہی جھانجھ بجتے ہیں، قرنے پھونکے جاتے ہیں، نقارے دھمکتے ہیں، سرخ سیاہ سبز سفید نیلے پیلے پرچم لہراتے ہیں۔ گھوڑے ہنہناتے ہیں، ہاتھی چنگھاڑتے ہیں، زنجیریں کھلتی ہیں، پہیے گھومتے ہیں، ڈھالیں کھڑکتی ہیں، تلواریں چمکتی ہیں، گرد کے بادل اطراف کو ڈھک لیتے ہیں، سورج بلند ہوتا ہے، دھوپ تیز ہوتی ہے، صف بہ صف جنگجو آئینے چمکتے ہیں۔ گھوڑے کف در دہن، لگامیں تنی ہوئی، پا در رکاب و دست بر قبضۂ شمشیر ان کی نگاہیں تلاش کرتی ہیں کہ میں کہاں ہوں؟

میرے اطراف انھوں نے حفاظتی حصار قائم کر رکھے ہیں، سات دائرے، ہر دائرے میں ہزار سورما ہزار ہتھیاروں سے لیس اور میں .... بے ہتھیار (کیا میں نہتا ہوں؟ یا میری آستین میں .....) آہن پوش سروں کے دائروں میں بالکل محفوظ ہوں میں، اور وہ: کسی اشارے کے منتظر، کف در دہن، خون کے پیاسے، گوشت کے بھوکے، مبارز طلب، رجز خواں، کروکشیتر میں دریا بہہ رہے ہیں: دجلہ و فرات، گنگ و جمن، دون و وارگا، سین و ٹائبر، ہوانگ ہو، مسی سی پی، نیل و رائن ... خون کے دریا بہہ رہے ہیں اور میں سب کی لہروں سے محفوظ ہوں۔ گرد کے بادل چھٹتے ہیں تو کھڑکی کھلتی ہے، ورق پلٹتا ہے، دھوپ تیز ہوتی ہے، آئینے چمکتے ہیں، پرچم لہراتے ہیں، قرنے، نقارے، زنجیریں، تلواریں، صف بہ صف جنگجو گھوڑے میرے اِشارے کے منتظر ہیں۔

ایک اشارہ.....

صرف ایک اشارہ ہوتا ہے اور تاریک شیشے کا پردہ اچانک روشن ہو جاتا ہے۔ آگ اگلتا ہوا دھویں کا دیو تیزی سے آسمان کی طرف بلند ہوتا ہوا۔ اور اب میرے چاروں طرف مسلسل شعاعی دھماکے ہو رہے ہیں اور ہو کا عالم طاری ہے۔ زمین کے تاریک سینے میں نامعلوم گہرائیوں اور نامعلوم لمبائیوں والی دراڑیں جن سے دھواں اور شعلے اور چنگاریاں نکل کر سناٹے میں کچھ شور پیدا کرتے ہیں اور شیشے کا پردہ تاریک ہو چکا ہے، کسی سمت سے کوئی خبر، کوئی اطلاع کوئی صبا نہیں آتی۔ جان لیوا حبس (جو میری جان لینے کے ناقابل ہے کہ میں شاید اس آخری کروکشیتر میں ابھی تک سانسوں کی الجھی ڈور لیے بیٹھا یہ رزمیہ ....) مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ باقی سب حصار ٹوٹ چکے ہیں۔ سہاویراں، سہا آسیب کا مسکن اور میں خود ہی وہ آسیب ہوں، اپنے آپ کے لیے خوف بنا ہوا، اپنے سایے سے ڈرتا ہوا۔ یہاں کسی کا سایہ نہیں: زلف کا سایہ، دیوار کا سایہ، شفقت کا سایہ، یہاں کوئی سایہ نہیں، کہیں دھوپ نہیں، کہیں سبزہ نہیں، آب نہیں، سراب نہیں، صرف دھویں کے دیووں کا لشکر ہے: پھیلتا بڑھتا ہوا اور دھویں کا کوئی موسم نہیں ہوتا (کبھی یہاں بہت سے رنگارنگ موسم ہوا کرتے تھے، بلکہ ہر رنگ کا ایک جدا موسم تھا، شاید کسی کتاب میں ان کے نام محفوظ ہوں، لیکن اب کوئی کتاب بھی کہاں؟) میری آنکھوں اور سانسوں اور رگوں میں دھواں اپنی کالی جڑیں پھیلا چکا ہے، پھیلائے جا رہا ہے، میں دھویں سے لڑ رہا ہوں، کالک کی تہیں مجھ پر جمتی جا رہی ہیں اور میں محجر ہوتا جا رہا ہوں، کسی آنے والے زمانے کے لیے حجری نقش بنتا جا رہا ہوں۔ (پتھر کی دیوار پر کھدا ہوا نقش ایک زاویے سے ہزاروں سال پرانا اور دوسرے زاویے سے نیا نیا سا لگتا ہے۔)

مہابھارت کا یہ تیرہواں دن ہے۔

میرے اطراف انھوں نے سات دائرے کھینچ رکھے ہیں: سروں اور دھڑوں کے دائرے، ہر دائرے میں ہزار سورما ہزار ہتھیاروں سے لیس .... میری اس اسیری کا ذمہ دار کون ہے؟

"آج انھوں نے ہمارے اور اپنے بیچ چکرویوں جما رکھا ہے۔"

"اس چکرویوں کو توڑ کر ہی ہم کوزوؤں پر وجے پا سکتے ہیں۔"

"اور ابھمنیو، ہم جانتے ہیں، اسے کیول تمھیں توڑ سکتے ہو۔"

"میں ان لکیروں کو توڑ سکتا ہوں" میں نے کہا۔ "میرے پتا نے اس کی خاص شکشا مجھے دی ہے۔ لیکن مجھے ان کے بیچ سے باہر آنا پڑا تو یہ میرے لیے مشکل ہوگا۔ میں ان دائروں سے باہر آنے کا ہنر نہیں جانتا۔"

شمال میں پہاڑوں کی اونچی دیواریں پھاند کر یاجوج ماجوج کی فوجیں میدانوں میں آتی ہیں اور کمزوروں اور نہتوں کو مار کاٹ کر پھر دیواروں

کے پیچھے جا چھپتی ہیں۔ زرد صحرا سے تاتاریوں کے زرد بگولے نمودار ہوتے اور بھوتوں بلاؤں کی طرح کوچہ و بازار، جھونپڑوں اور محلوں کو روندتے گزر جاتے ہیں کالے سمندر سے عفنتی ملاح ساحلوں پر تلواریں لیے دوڑ آتے اور بستیوں کو روند کر پھر اپنے جہاز لیے بیکراں افق کے پار گم ہو جاتے ہیں۔ وحشیوں نے جنگلوں، دریاؤں، صحراؤں اور بستیوں میں آگ لگا رکھی ہے۔ چاروں اور آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ خاک، راکھ، ہڈیاں، جلتے ہوئے جسم، ہتھیاروں کی کھڑک، زخمیوں کی چیخیں، لاشوں کی خاموشی، ہو کا عالم اور میں تنہا۔

فیصلہ ہی ایسا تھا کہ خداؤں کی مجلس شوریٰ میں سناٹا چھا گیا۔ میں جو یلیئم میں بیٹھا یہ رزمیہ لکھ رہا ہوں، خود سناٹے میں ہوں۔

"میں اولمپس کے کسی غار سے یہ تماشا دیکھوں گا" زیوس نے کہا، 'اور تم ٹرائے اور یونان والوں میں سے جس لشکر کی طرف تمہاری ہمدردیاں ہوں، اس طرف چلے جاؤ۔"

"حوالہ : ایلیڈ : ہومر کا رزمیہ"

زیوس کے ان لفظوں نے جنگی کتوں کو بھڑکا دیا اور لافانی مخلوق دو حصوں میں بٹ کر رزم گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ مغرور ہیرا، آہن پوش اتھینی، سمندروں میں طوفان لانے والا پوسائڈن، خداؤں کا پیغامبر ہرمیز اور خدائے آتش ہیفیس ٹس نے یونانی لشکر کا ساتھ دیا اور جنگ کا دیوتا اریز، سورج دیو فیبس، تیر انداز آرٹیمس، زیوس کی محبوبہ لیٹو، دریائے آفت زینتھس اور خوبصورت ایفروڈاس ٹرائے والوں کی صفوں میں جا شامل ہوئے۔

خداؤں کے اس طرح میدان میں اترنے سے جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا اور جب ان میں جنگ چھڑی تو مجھے حیرت نہیں کہ پوسائڈن کا مقابلہ فیبس سے، اتھینی کا سامنا اریز سے اور ہیرا کا تصادم آرٹیمس سے ہوا، لیٹو ہرمیز کے مقابل کر دی اور ہیفیس ٹس نے زینتھس کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ حیرت کا مقام وہ تھا جب جب خالی مخلوق کی دشمنیوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے دیوتاؤں نے اپنی بھڑاس نکالی۔ انھوں نے فضا میں اڑتے ہوئے تیروں کا رخ بدل دیا، اٹھی ہوئی تلواروں کو جھکایا اور نہ چاہتے ہوئے کسی پر نیزہ چلوایا، کبھی حریفوں اور کبھی حلیفوں کی آوازوں میں لڑنے والوں کو پکارا، قابل کو ناقابل سے بھڑایا اور شہزور کو کمزور پر وار کرنے پر اکسایا۔

تو ایسی تھی وہ جنگ جو ایک عورت کے حصول کے لیے لڑی گئی! خداؤں نے انتقام لینے والوں کو اپنی مرضی سے انتقام بھی نہ لینے دیا، ان کے اعمال قضا و قدر کے حوالے کر دیے اور خداؤں کا خدا زیوس مصلحت کوشی کے نام پر تماشا دیکھتا رہا۔

میں لیئشم میں بیٹھا یہ رزمیہ لکھ رہا ہوں۔ میں نے حسن فطرت کے گیت بھی لکھے ہیں مگر اب جنگ کے دیوتا مارس کی مدح سرائی کر رہا ہوں۔ میری یہ داستان ایک جلاوطن شخص اور اس کی جنگ جوئی کی داستان ہے جس نے بحر و بر میں متعدد آفات سے مقابلہ کیا اور یہ آفات دیوی جونو کی اس سے نفرت کے سبب تھیں۔ پس یوں ہوا کہ

"حوالہ : ای نیڈ : ورجل کا رزمیہ"

فیصلہ ہی ایسا تھا کہ خداؤں کی مجلس شوریٰ میں سناٹا چھا گیا۔

"ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے" خداؤں کے خدا جیوپیٹر نے کہا۔ "مصائب اور خوش بختی اس کے اپنے اعمال کی مرہون ہے، چاہے وہ یونانی ہو کہ لاطینی"

تب مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ پر جونو کی نفرت کیا ہے؟ نیچوں کا انتقامی جذبہ کیا معنی رکھتا ہے؟ رشک و حسد، خوف و ہراس، فرار و استحکام، خوش بختی اور بدبختی کے تصورات کیا ہیں؟ اگر اکلیز دریائے آفت زینتھس کے تیز دھاروں سے نبرد آزما ہے، اپنی اس طوفان بدوش پنچوں کے تاریک بھنور میں چکرا رہا ہے اور یولی سس اسکائلا کی تند موجوں میں پھنسا ہوا ہے تو یہ اس کے ارادے اور عمل کا نتیجہ ہے یا اس کا مقدر؟

جنگ ایلیئم کی رن بھومی میں ہو رہی ہو کہ لیئشم کے میدان میں، خداؤں کا خدا صرف تماشائی ہوتا ہے اور اکلیز، اینی آس، یولی سس اور میں اور سب نبرد آزما سورما سپاہی اپنے چکرویوں کے آپ اسیر ہوتے ہیں جیسا کہ

"حوالہ : گیتا، چھٹا ادھیائے مرکرم یوگ"

"اے ارجن، تو یوگی ہو جا، اپنے اعمال کے نتائج کی پروانہ کر مگر یاد رکھ کہ کرم یوگ سب یوگوں سے اعلیٰ ہے۔ تو اپنا دوست بھی ہے اور اپنا دشمن بھی اس لیے تو اپنی ذات کو فتح کر۔"

بھائیوں کو بھائیوں کے مقابل دیکھ کر میں نے اپنے شستر پھینک دیے تھے مگر کرشن کے اپدیش نے مجھے پھر شستر اٹھانے پر مجبور کر دیا کہ اگر یدھ میرا بھاگیہ ہے اور اس کرم سے مجھے چھٹکارا نہیں تو میں کیوں بھائیوں کو بھائیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے نتائج کی فکر کروں جبکہ یدھ ان کے لیے بھی آوشیک ہے، ان کے لیے بھی دھرم ہے اور جب کرشن بھگوان پانڈووں کے ساتھ ہوں اور کرن اور جراسندھ کوروؤں کے ساتھ اور اتھینی اور پوسائڈن یونانیوں کے ساتھ ہوں اور اریز اور فیبس ٹرائے والوں کے ساتھ تو یدھ کرم یا کرم یدھ اپنا پھل آپ ہو جاتا ہے، عمل ہی حاصل بن جاتا ہے کچھ اس طرح کہ

"حوالہ : دربیان شہادت حسین ابن علی (غیر مرقوم)"

"خلافت کو وراثت نہیں بنایا جا سکتا"

"پھر ایسے شخص سے بیعت جس کا کردار و عمل...."

"یہ ملوکیت کی ابتدا ہے"

"بیعت کے نام پر جبر و تعدی سے ہاتھ ملانے کے مترادف ہے"

"خروج کرو..... خروج کرو"

میں سب آوازیں سن رہا ہوں اور اپنے اندرون سے آتی آواز پر بھی میری توجہ ہے۔ اخی مکرم حسن معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے۔

"تو بھی گوشہ نشیں ہو جا"

"گوشہ نشیں ہو جانے پر بھی تو زہر کا پیالہ ان کے حصے میں آیا تھا"

"لایکلف اللہ نفساالاّ وسعہا"

"تو پھر" میں نے کہا، "میں لہاما کسبت وعلیہاما اکتسبت کے مصداق عمل کیوں نہ کروں؟"

تب کوفے سے مجھے ایک خط ملا کہ آپ خروج کریں، کوفہ آجائیں، تمام کوفی آپ سے بیعت کرنے پر راضی ہیں۔

مدینے سے میرا خروج لہاما کسبت کی طرح پہلا قدم تھا اور صحرا سلگ رہا ہے اور جو دانہ زمین پر گرتا ہے، بھن جاتا ہے اور فرات کی موجیں ساحل پر سر پٹک رہی ہیں کہ سپاہِ خدا تین رات کی پیاسی ہے۔ پھر وہ رن پڑا کہ زمین تھرا گئی اور چرخ کہن کانپ اٹھا اور چونکہ یہ جبر و اقتدار کے خلاف حق و صداقت کی معرکہ آرائی تھی اس لیے عقیدے نے حسین کے عمل کے حاصل کو شہادت کا نام دیا اور جون آف آرنے ولایت حاصل کی ولیہاما اکتسبت۔

"معمولی سپاہیوں کی فتح جون کا معجزہ ہے!"

"اور برگنڈی اور گال کی ملوکیت اور سیاست کی شکست"

"ان پڑھ کمزور دیہاتی لڑکی خداوند اور اس کے بیٹے کی حکومت..."

"اس کی باتوں کو خردمند کفر سے تعبیر کر رہے ہیں"

"سچ پوچھو تو یہ....."

محاصرہ ہوا، خون بہا، فصیل ٹوٹی تب کہیں جا کر شہر کا دروازہ کھلا اور یہ جون کا معجزہ ہی تھا۔ اب شاہی مجلس کے اراکین سر جوڑے بیٹھے تھے اور کلیسا کے ارباب اقتدار عصائے شاہی کے دباؤ میں ایک فیصلے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

"جون نے کفر کیا ہے"

"وہ ساحرہ ہے"

"کلیسا نے ہمیشہ ایسے افراد کو نذر آتش کیا ہے"

میں کلیسا کے منصفوں کی جماعت کے فیصلے پر آخری مہر لگاتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ اگر بے سر و ساماں افراد اپنی قلیل تعداد کے باوجود آلات حرب سے لیس کثیر تعداد پر غالب آجاتے ہیں تو یہ ان کا جذبہ ہے، ان کے عمل کی جراءت ہے یا اسے واقعی معجزہ کہنا چاہیے؟ ایسا معجزہ جس نے سیاسی اور شاہی تسلط کو بھی ایک بار متزلزل کر دیا کہ ارباب خرد معجزہ سرزد کرنے والی کمزور عورت کے مفلس دیہاتی عقائد کو کلیسا کے نظریات پر حملہ تصور کر رہے ہیں اور کفر کا فتویٰ عائد کر کے اسے نذر آتش کرنے کے درپے ہیں۔

مجھے بہرحال مہر لگانی ہے مگر اس سے پہلے مجھے سوچنے سے کوئی روک تو نہیں سکتا۔

"مشین میں جڑا ہوا دماغ تمہیں دیکھ رہا ہے"

"فیصلے پر مہر ثبت کرو، تمہاری اہمیت صرف مہر ثبت کرنے تک ہے، فیصلہ تو ارباب خرد اور ارباب اقتدار ہی کرتے ہیں، تم صرف مہر لگاتے ہو، سوچو مت، مہر لگاؤ، تمہارے تاخیر کرنے سے فیصلہ بدل نہیں سکتا اس لیے...."

"تو اپنا دوست بھی ہے اور اپنا دشمن بھی"

"مہر ثبت کرو"

مہر ثبت کردی گئی اور وہ ایک ہاتھ میں شاخ زیتون اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیے، ایک ہاتھ میں بائبل اور دوسرے ہاتھ میں بندوق لیے، ایک ہاتھ میں کاسہ گدائی اور دوسرے کی آستین میں خنجر چھپائے جوق در جوق سوئے مشرق رواں ہوئے۔

نئے راستوں کی دریافت کے در پردہ زمینوں پر قبضہ، حصول زر اور جبری تبلیغ دین ان کے مقاصد، ان کی زبانیں جدا جدا مگر ان کے خیالات میں یکسانیت انھوں نے اپنی باہمی مناقشت کے بیج دور مشرق میں آکر بو دیے۔

"وہ فرنچ ہے، نواب کے دربار میں نہیں رہ سکتا"

"اس کی حیثیت ملازم سے زیادہ نہیں"

"نہیں جانتے" میں نے کہا، "وہاں فرانس برطانیہ سے نبرد آزما ہے اس لیے یہاں ہند میں فرنچ اور برٹش ایک دربار میں نہیں رہ سکتے۔"

میں دیکھ رہا ہوں کہ مغرب سے ایک شعلہ اٹھتا ہے اور مشرق تک کو پھونک دیتا ہے۔ جنگ کی آگ جنگل کی آگ سے زیادہ تیز رو ہے کہ یہ پہلے ذہنوں میں بھڑکتی ہے پھر میدانوں میں اترتی ہے۔

ارکاٹ میں قدم جمانے کے لیے ہم نے فرانس والوں کے خلاف کیا کیا نہ سازشیں کیں اور اس کے لیے مقامی باشندوں کو کیسے کیسے نہ استعمال کیا۔ میر صادق جہاں دکن میں ہمارے ساتھ تھا اور میر جعفر وہاں بنگال میں ہم سے ملا ہوا۔

"بلڈی فول انڈینز"

"شاخ زیتون بلند رکھو"

"بائبل کی دعائیں پڑھتے رہو"

"حوالہ : زبور کی دعا ۱۸"

"میں خداوند کو جو ستائش کے لائق ہے، پکاروں گا۔ یوں میں اپنے

دشمنوں سے بچایا جاؤں گا۔ موت کی رسیوں نے مجھے گھیر لیا اور بے دینی کے سیلابوں نے مجھے ڈرا لیا، پاتال کی رسیاں میرے چوگرد تھیں، موت کے پھندے مجھ پر آپڑے تھے۔ اپنی مصیبت میں میں نے خداوند کو پکارا اور اس سے فریاد کی، اس نے میری آواز سنی۔

"تب زمیں ہل گئی۔ پہاڑوں نے جنبش کھائی۔ اس نے میرے دشمن سے مجھے چھڑا لیا۔ خداوند، تو میرا سہارا ہے۔ تیری بدولت میں فوج پر دھاوا کرتا ہوں، پیتل کی کمان کو جھکا دیتا ہوں، تو نے مجھے قوموں کا سردار بنایا ہے۔

"میرا خدا زندہ خدا ہے جو میرا انتقام لیتا ہے اور امتوں کو میرے سامنے زیر کرتا ہے۔ مجھے دشمنوں سے چھڑاتا اور مخالفوں میں سرفراز کرتا ہے۔ اس لیے اے خدا، میں تیرے نام کی مدح سرائی کروں گا۔"

پھر فلستیں بنی اسرائیل سے لڑنے کو اکٹھا ہوئے یعنی تیس ہزار رتھ اور چھے ہزار سوار اور ایک انبوہ کثیر جیسے سمندر کے کنارے کی ریت!

میں ابیاہ بن یوشع جو خداوند کے لشکر کا ایک معمولی سپاہی ہوں، سچ کہتا ہوں کہ ہم نے ان کے شہروں کے پھاٹکوں تک فلستیوں کو رگیدا اور جب واپس پھرے تو ان کے خیموں کو لوٹا اور آگ لگائی۔ پھر چند فصلوں کے بعد انھوں نے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا۔ ہم میدان سے فرار ہوئے اور کوہستان تک انھوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا۔ طالوت کے بیٹے مارے گئے اور یہ جنگ طالوت پر بھاری ہو گئی۔

فلستیوں کی شکست اور اس کے بعد اسرائیل کی شکست کے بیچ داؤد اور طالوت کے گھرانوں میں بھی جنگ آزمائی جاری رہی۔ طالوت اور اس کے بیٹے اور اس کے سب لوگ جب مارے جا رہے تھے تو داؤد آرامیوں سے محو جنگ تھا، جب داؤد راحیل سے گرم وصال تھا تو اوریا و بنی عمون کے خلاف صف آرا تھا اور جب

سچ تو یہ ہے کہ دشت آدم میں جس دن سے جنگ کی بنیاد پڑی ہے (کس دن سے؟) کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ کسی خطے میں خون نہ بہایا گیا ہو، گھروں کو پھونکا نہ گیا ہو اور فصلوں کو اجاڑا نہ گیا ہو، کہیں نہ کہیں کروکشیتر ضرور سجایا جاتا ہے: میدانوں اور ریگزاروں میں، پہاڑوں اور شہروں میں، دریاؤں اور سمندروں میں، فضاؤں اور خلاؤں میں غرض کسی نہ کسی مقام پر یونان کا ایریز، روم کا مارس، بھارت کی بھوانی، ایران کا آتش رو، عرب کی منات اور مصر کا ہورس سرگرم عمل نظر ہی آتے ہیں اور ہر زماں اور ہر مکاں اور ہر قوم کی روداد رزم و حرب لکھے چلے جانا میں نے اپنے سر لے لیا ہے اور شاید اس آخری کروکشیتر میں سانسوں کی الجھی ڈور لیے بیٹھا یہ رزمیہ.... (ناول کے چند صفحات) ◆◆

بقیہ صفحہ : دیوداس کی واپسی

شانتی کی مدد سے مجموعہ چھپ گیا۔

چند دنوں بعد "دیوداس کی واپسی" کے دو نسخے لے کر اننت ایک مشہور مبصر کے گھر گیا۔ اس سے پہلے وہ انہیں اپنے مجموعے کی ذاتی کاپی دے چکا تھا۔ اننت نے اپنے جھولے میں شمپین کی دو بوتلیں اور ایک سیکو گھڑی بھی رکھ لی تھی۔

کال بیل کی آواز سن کر دروازہ مبصر نے ہی کھولا۔

"نمسکار!"

"نمسکار..... نمسکار... آیئے جناب!"

جب اننت صوفے پر بیٹھا تو اپنے جھولے سے شمپین کی دو بوتلیں اور گھڑی نکال کر مبصر کے ہاتھ میں دے دیں۔ مبصر بولا،

"اوہو! شمپین اور سیکو گھڑی!!"

"پچھلے دنوں میرا دوست سنگاپور گیا تھا وہیں سے یہ سوغات لایا ہے۔ امید ہے آپ اس حقیر تحفے کو قبول کریں گے!"

"آپ نے بھی بلاوجہ زحمت کی۔" مبصر نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آپ کا مجموعہ میں نے پڑھ لیا ہے، اس پر ایک زبردست تبصرہ لکھوں گا۔ واہ واہ واہ مجموعے کی ٹائٹل کہانی "دیوداس کی واپسی" میں آپ نے کس خوبی سے دیوداس کے کردار کو آگے بڑھایا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کا دیوداس شرت چندر سے بھی آگے کی چیز ہے۔ آپ نے دیوداس کے کردار میں نئی روح پھونک دی ہے۔ establishment کے خلاف اس سے بہتر کہانی کوئی لکھ ہی نہیں سکتا یہ میرا چیلنج ہے۔"

اننت دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ دو شمپین کی بوتلوں اور سیکو گھڑی نے چمتکار کر دیا تھا!

"اس مجموعے کو میں ضرور ہٹ کروں گا۔ بس دیکھتے جاؤ۔ کھی کھی کھی...."

جب مبصر ہنسا تو ٹوٹے ہوئے دانت نظر آئے۔ کھی کھی کرتے ہوئے مبصر نے اننت سے پوچھا،

"آپ کیا لیں گے؟"

"شمپین...!!" اننت نے کہا۔

کھی کھی کرتے ہوئے مبصر نے شمپین کی بوتل اٹھالی! ◆◆

نجیب رامش

زخمیوں میں جبہ و دستار بٹوائے گئے
پھر وہ سب قاتل کے استقبال کو لائے گئے

ہم بھی کیا ہیں، اک ذرا جب مطمئن پائے گئے
یوں ہی تفریحاً ہمارے بال بکھرائے گئے

کم کیا جانے لگا بے وجہ جینے کا عذاب
یعنی اس کی زندگی میں حادثے لائے گئے

طے ہوا یہ لوگ تو کم ظرف دشمن بھی نہیں
دھوپ میں آنکھوں پہ جب آئینے چمکائے گئے

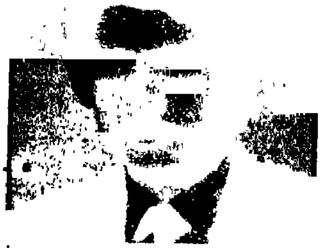
ایک فنکاری، کسی کا اک تبسم ایک خط
ہم بھی کیسی چھوٹی چھوٹی شے کو ترسائے گئے

بخل ہی برحق، تو یہ لے اپنے دریاؤں کے خواب
ریت پینا تھا تو کیوں ہم اتنا دوڑائے گئے

عاطفت بھی، اور یہ بے سود امیدیں بھی چھاؤں
ذہن میں شاید اب اترے دھوپ، سب سائے گئے

اپنا کمرہ قبر جیسا کرکے تم بھی پڑ رہو
آج پھر چھٹی ہے، پھر دن بھر کو ہمسائے گئے

● 3 / 28, Ram Shankar Nagar
Bhopal (M.P.)



نظام ہاتف

وہ سنگ جب مرے دستِ ہنر سے نکلے گا
تو پھر تو کوئی بھی آزر نہ گھر سے نکلے گا

میں اپنے سینے پہ بوؤں تو دانۂ گندم
اک آدم اور مری خلد سر سے نکلے گا

یہ آخری ہے اجالا، اسے غنیمت جان
کہ اب بجھا ہوا سورج سحر سے نکلے گا

زبانِ غیر مروّج بھی لوگ پڑھ لیں گے
جب اک لکھا ہوا پتھر کھنڈر سے نکلے گا

کبھی وہ آئے گا عین الیقین کی حد تک
کبھی تو وہ شبہ معتبر سے نکلے گا

شرارۂ سر سینہ چمک کے بجھ بھی گیا
کلیم گشتہ نجانے کدھر سے نکلے گا

ہوا کی سمت کی تیزابیت بتاتی ہے
سفید خون اسی برگ و بر سے نکلے گا

● 116 - B, Rly. Qrts Colony,
Muradabad - 244001 (U.P.)

شکیل جمالی

ڈوب جائے گا یہ سورج شام تک
نیک نامی ہے بس اک الزام تک

لوگ دل کا مول بتلانے لگے
چاہتیں بھی آگئیں نیلام تک

سب شکاری ہیں زمیں تا آسماں
موت ہے دانوں سے لے کر دام تک

شب گزاری کے وسیلے ڈھونڈ لو
ٹوٹ جائیں گے کھلونے شام تک

ماحصل تک ہیں جبینیں سجدہ ریز
ہر عبادت ہے کسی انعام تک

اب ہمارا ذوق درباری نہیں
اب غزل جائے گی خاص و عام تک

اپنا رستہ خود بنانا ہے تجھے
میرے بچے! میں ہوں اک دو گام تک

● Jama Masjid Market, Qazi Sarai,
Chandpur - 24725 (U.P.)

عبدالعزیز خان
Amin Bldg, Forth Fl. Flat No.21, Ibrahim
Rehmatulla Rd, Bombay - 400003

دیوداس کی واپسی

اسعد اپنی کہانیوں میں خواب بنتا تھا۔

لوگ اپنی زندگی کے خوابوں کو سچ بنانے کے لئے اس کی کہانیاں پڑھتے تھے۔ وہ مقبول کہانی نویس ہے، لیکن اس نے زندگی کے اطراف و اکناف میں بکھرے مسائل کو برہنہ اور تلخ شکل میں اپنی کہانیوں میں سمونے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ ایک نباض کہانی کار کی طرح وہ بخوبی جانتا ہے کہ مسائل اور زندگی کی تلخیوں سے بھری کہانیاں کوئی پڑھے گا نہیں، ہاں وہ کمیونسٹ ضرور قرار دے دیا جائے گا۔ کبھی کبھی وہ خود پر ہنستا کہ وہ ایسا کیوں سوچتا ہے۔ اسے تو بس کہانی سے غرض ہونی چاہیے، لیکن جب وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتا تو اسے احساس ہوتا کہ وہ ایک کہانی کار کے طور پر شہرت کی انتہائی بلندی کو چھونا چاہتا ہے، لیکن کیا کیا جائے۔ اس کی مقبولیت کے باوجود ناقد اس کی کہانیوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کیا وہ ان ناقدوں کی نظروں میں محض ایک فضول شئے ہے؟

اسعد اپنی خواہش کی تکمیل تو چاہتا ہے لیکن اس کی اپنی حدیں ہیں جنہیں وہ پھلانگنا پسند نہیں کرتا، ناقدوں کی توجہ کا مرکز بننے کے لئے ان کے آگے پیچھے گھومنا، ان کی خوشامد کرنا، ان کو خط لکھنا اور Entertain کرانا ضروری ہے اور یہ سب کرنا ہی اسے پسند ہے، نہ ہی اس کے مالی وسائل ایسے ہیں کہ وہ یہ سب کر سکتا ہے۔

شہر کے مختلف ادبی ادارے وقتاً فوقتاً اسے کہانی سنانے کی دعوت دیتے۔ لیکن وہ کہانی کو نظموں اور غزلوں کی طرح سنانے کی چیز نہیں پڑھنے کی چیز سمجھتا ہے۔ اسے ادبی نشستوں سے چڑ سی ہے، ان کہانیوں کے سامع وہی روزمرہ کے ملنے والے کہانی کار ہوتے ہیں وہی کہانیوں پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ سب کے سب کہانی پر ایک ساتھ تنقید کے ڈونگرے لے کر پل پڑتے۔ اس کے ساتھ جب بھی یہ صورت حال پیش آتی وہ زیر لب بڑبڑا کر رہ جاتا "حاسد"۔ اسعد کی کہانیاں اسٹڈی میں پڑھنے والی کہانیاں تھیں مگر اکثر وہ دیکھتا کہ لوگ بس اور راشن کی قطار میں لگے لگے اس کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں۔ اس موقعے پر اسے خوشی کے بجائے دکھ ہوتا۔

اسعد کی بھرپور کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں reality کو ایک خواب کی شکل میں دکھائے اور لوگ اپنی زندگی کی سچائیوں کو اس کی کہانی میں پڑھیں تو صرف یہی محسوس کر سکیں کہ اس کی کہانیاں صرف اور صرف خواب ہیں۔ استحصال، جبر اور pathos بھی اس کی کہانیوں میں شامل ہوتے ہیں عام قاری کی ان تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ وہ establishment کا حصہ بننا پسند نہیں کرتا۔ اس کا ایک خواب ہے کہ سرکار اسے انعام دے اور وہ انعام ٹھکرا دے، شاید اسی لئے جب گذشتہ دنوں کئی چھوٹے بڑے کہانی کاروں کو سرکار نے انعام دینے کا اعلان کیا تو کہانی کاروں کے کھلکھلاتے چہرے دیکھ کر اسعد کو اچھا نہیں لگا۔ اس نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا،

"جب ہم اپنی کہانیوں میں establishment کے خلاف لکھتے ہیں تو پھر سرکار کا دیا ہوا انعام کیوں لے رہے ہیں۔"

"انعام کیا سرکار کے باپ کا ہے! تو وہ پبلک کا پیسہ ہے۔" ایک کہانی کار نے سرکاری انعامات کا دفاع کیا۔

"مال مفت دل بے رحم۔" دوسرے نے کہا۔

اور پھر سب اسعد کو بھول کر ہنسی ٹھٹھا، شراب کباب میں مشغول ہو گئے۔ اسعد کی بات کسی نے نہیں سنی۔ انعامات کی رقم سے مزے اڑائے۔

کبھی کبھی اسعد سوچتا۔ وہ کتنا اچھا زمانہ تھا جب قاری کہانی کاروں کی کہانیاں پڑھ کر انہیں خط لکھتا تھا۔ پبلیشر ان کی کہانیوں کے مجموعے چھاپتے تھے۔ قاری ادیبوں کے آٹوگراف لیتے تھے۔ کہانیوں پر رائے دیتے تھے۔ کافی ہاؤس اور ریسٹورنٹ میں بحثیں ہوتی تھیں، ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس نے سوچا، اب سب کس قدر بدل چکا ہے۔ آج کے دور میں قاری تو گویا بچا ہی نہیں ہے، قاری کی جگہ حسد کرنے والے، ٹوپی اور جوتا اچھالنے والے، ٹانگ پکڑ کر کھینچنے والے ساتھیوں نے لے لی ہے، وہ ساتھی جو کبھی کبھار ہی کسی کہانی کی تعریف کرتے ہیں اور تعریف کے بعد سمجھتے ہیں جیسے بہت بڑا احسان کر رہے ہوں، انہیں یہ امید بھی

رہتی ہے کہ جب وہ کہانی سنائیں گے تو جس کی کہانی کی تعریف کی گئی ہے وہاں کی کہانی کی بھی تعریف کرے گا اور ان کا ساتھ دے گا، کہانی چاہے بری ہی کیوں نہ ہو!

اصت کو عظیم کہانی لکھنی ہے۔ عظیم کہانی ایک ہی ہوتی ہے۔ کیا وہ اپنی اب تک لکھی کہانیوں کو اپنی عظیم کہانی کے لئے خام مواد سمجھے؟

اصت بڑا ہی عملی آدمی تھا۔ اسے تاریخ پر عبور حاصل تھا۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ اپنی کہانیوں میں اساطیر و روایات سے فائدہ اٹھائے گا بالکل منیش مہرہ کی طرح۔ منیش مہرہ ایک بزرگ کہانی کار ہیں جنہیں شہرت اور عزت دونوں حاصل ہیں۔ انہوں نے اساطیر کو موضوع بنایا ہے۔ بہت سے کہانی کار ان سے متاثر ہیں۔ اصت نے طے کیا کہ اب وہ بھی اپنی کہانیوں میں روایتی تذکرے، تاریخی واقعات اور لوک کتھاؤں کو سمودے گا اور منیش مہرہ کی طرح بڑے بڑے انعامات جیتے گا۔ نہیں نہیں وہ تو ساترے کی طرح ایوارڈ ٹھکرائے گا اور کسی صورت میں بھی اور کہانی کاروں کی طرح hypocrite کبھی نہیں بنے گا۔

اس نے منیش مہرہ کو اپنا آئیڈیل بنالیا ہے۔

منیش مہرہ کی ہمیشہ یہ تگ و دو رہتی ہے کہ ماضی کے کسی نہ کسی کردار سے استفادہ کر کے اپنی کہانی کو پیش کریں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ سارے روایتی کردار اپنے ماضی کے ماحول کے ساتھ ترشے ترشائے ان کے ہاتھ آجاتے ہیں اور انہیں کردار نگاری میں دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔ بس صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ اپنی فنکارانہ چالاکی سے کہانی کو اپنے طور پر پیش کر دیں۔

منیش مہرہ ان دنوں متفکر تھے۔ انہیں ماضی کا کوئی کردار نہیں مل رہا تھا جسے بنیاد بنا کر وہ کوئی نئی کہانی لکھیں۔ تمام بڑے کرداروں سے وہ استفادہ کر چکے تھے۔

منیش مہرہ کو اصت نے کافی پڑھ رکھا تھا اور وہ منیش مہرہ کے لکھنے کی شاطری اور فن کی چالاکی کو اچھی طرح سمجھ بھی چکا تھا اور اب وہ چاہتا تھا کہ ان کے نقش قدم پر چل کر وہ سب کچھ حاصل کرے جو منیش مہرہ نے حاصل کیا تھا۔ وہ رات دن اس سوچ میں رہتا کہ کس موضوع پر کہانی لکھی جائے؟ ماضی کے کس کردار کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے؟

ایک بار اصت کسی علاقے سے گزر رہا تھا کہ ایک کباڑی کے فٹ پاتھ پر پھیلے پرانی کتابوں کے ڈھیر میں اسے شرت چندر کا ناول "دیوداس" نظر آیا اور اس کے ذہن میں یہ بات بجلی کی طرح کوند گئی کہ کیوں نہ دیوداس کے کردار کو آگے بڑھایا جائے؟ اس نے فوراً ناول خرید لیا۔ جب اس نے ناول پڑھا تو اس کے ذہن نے کہا، ناول میں تو دیوداس مر گیا مگر حقیقتاً دیوداس تو آج بھی زندہ ہے۔ اس زندہ دیوداس پر کہانی کیوں نہ لکھی جائے؟ اس نے "دیوداس کی واپسی" نام سے کہانی لکھ ڈالی!

شانتی گداز اور سرو قد تھی۔ اس کے بال کالی گھٹاؤں کی طرح شانوں پر بکھرے رہتے۔ لمبوترا چہرہ اس پر ستواں ناک، بادامی آنکھیں اور تراشیدہ گلابی ہونٹ، رنگ سرخی مائل سفید اور بدن میں اس قدر لوچ تھا کہ جیسے وہ کوئی رقاصہ ہو اور دنیا کے اسٹیج پر زندگی کا رقص کرنے آئی ہو۔ وہ کافی حد تک فریک تھی اور بات ایسے سنتی جیسے کتاب پڑھ رہی ہو۔ وہ ادب پڑھتی بھی تھی اور ادب پر گفتگو بھی کرتی تھی۔ زیادہ تر ادیب صرف اس کی قربت کے لئے اس سے ملتے اور یوں ظاہر کرتے جیسے وہ کوئی بڑی ادیبہ یا نقاد ہو۔ وہ جیسے ہی محفل میں آتی نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہ کبھی ساڑی بلاؤز، کبھی جینز ٹاپ اور کبھی شلوار قمیض میں ملبوس ہوتی۔ ہر ایک لباس اس پر سجتا اور اس کا بدن لباس کے اندر جیسے باتیں کرتا۔ شانتی اکثر اصت کو ادبی محفلوں کے بعد ریستوراں میں لے جاتی۔ شانتی فریک ضرور تھی مگر ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر اصت کی طبیعت اشانت ہو جاتی اور اس کے اندر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ شانتی نے اس کی ہر کہانی کی تعریف کی تھی۔ وہ اتنی کہانیاں سن چکی تھی کہ اب کہانی کا ایک کردار لگتی تھی۔ اصت اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک صاف گو لڑکی ہے! مگر پانچ سے اوپر!

اصت نے "دیوداس کی واپسی" کے عنوان سے اپنی کہانیوں کے مجموعے کا مسودہ دوستوں کے کہنے پر اکادمی کے سپرد کر دیا تھا، لیکن وہاں سے اسے امداد نہیں ملی شائد اس لئے کہ اس کی چند کہانیاں establishment کے خلاف تھیں، شائد اس لئے بھی کہ اس نے نہ ہی کسی بڑے ادیب کے تلوے سہلائے، نہ کوئی لابی بنائی، نہ ہی اکادمی کے ممبروں کی چاپلوسی کی۔ اس نے سوچا۔ کیوں نہ پیسوں کے لئے شانتی سے مدد طلب کی جائے۔

شانتی کو اصت نے اپنی مجبوری بتادی۔ شانتی نے کہا کہ وہ بے فکر رہے، جیسے ہی اس کا بھائی جہاز سے مال اتارے گا وہ پیسہ دے دے گی۔

ایک ادبی نشست میں کہانی سن کر شانتی اور اصت باہر نکلے اور ایک ریستوران میں داخل ہوئے۔ کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے شانتی نے کہا،

"اس ادیبہ کی کہانی میں کافی فلسفہ تھا۔ اتنا فلسفہ کہانی کو گنجلک کر دیتا ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ کہانی میں فلسفہ ہونا ہی نہیں چاہیے، بس رواں دواں کہانی چلے۔"

"زندگی میں جتنا فلسفہ ہے، اتنا فلسفہ تو کہانی میں آئے گا ہی، اس سے انکار نہیں کر سکتے اور پھر کہانی میں اتنا زیادہ فلسفہ بھی نہ تھا......"

"کہانی سنتے سنتے کیا تم سو گئے تھے یا پھر اس ادیبہ کو defend کر رہے ہو۔ کہانی کتنی مبہم تھی۔ آج کل تو یہی چل رہا ہے کہ دانشوری جھاڑنے کے لئے کہانی کو جتنی پیچیدہ بنا سکو، بناؤ۔ پھر وہ بھلے سے سمجھ میں ہی نہ آئے!"

(باقی صفحہ ۳۵ پر دیکھئے)





میکش اجمیری

سبھی پہ رحمتیں برساتے گھر سے کچھ نہ ملا
عجیب بات ہے حاتم کے در سے کچھ نہ ملا

اداس شہر میں آوارگانِ شہر تھے ہم
فضول رینگتے شام و سحر سے کچھ نہ ملا

دکھائی دیتے تھے صحرا بھی کہکشاں سے مگر
بجز غبار ہمیں رہگذر سے کچھ نہ ملا

بغیر کارواں بے سود قصدِ منزل تھا
رواں دواں تھے مسافر سفر سے کچھ نہ ملا

ہوا نہ رونے سے کم بارِ غم کبھی میکشؔ
ملول رہ گئے ہم چشمِ تر سے کچھ نہ ملا

Motibazar, Nimbahera - 312601 (Raj.)

آدم نصرت

وہ آنکھ جو کبھی دیوار پر بنی ہوگی
ضرور مجھ کو وہ پہچانتی رہی ہوگی

بنا کے چھوڑ دیا تھا لکیروں، حرفوں کو
اب ایسے لگتا ہے دونوں میں ٹھن گئی ہوگی

وہ اک مقام جہاں بیشتر سوار گرے
مری کلاہ، میرے سر سے گر گئی ہوگی

نئے افق ہیں، نئے چاند ہو رہے ہیں طلوع
کہ کچھ ہی دن میں یہاں روشنی نئی ہوگی

یہ فرقِ طبعِ گراں، بے سبب نہیں نصرت
ہوائے شہر یقیناً بدل گئی ہوگی !

35/E, Ruby Apts, Theeba Palace Rd. Ratnagiri (M.S)

مسلم شہزاد

متاعِ کیف و طرب کی نہ رنج و غم کی ہے
دلوں کے درمیاں دیوار بیش و کم کی ہے

ابھرتی ٹوٹتی پھر پے بہ پے بکھرتی ہوئی
وہ لوحِ آب پہ تحریر کس قلم کی ہے

تیرے وصال سے رشتہ تو دو گھڑی کا مگر
ترے خیال سے نسبت جنم جنم کی ہے

دھنک کیا، چاند کیا، لالہ کیا، استعارہ کیا
کہ مملکت تو سبھی پہ اسی صنم کی ہے

بہت دنوں سے نہ آیا گیا کوئی شہزاد
تو پھر یہ چھاپ سرِ راہ کس قدم کی ہے

Bazm-e-Kehkasha, Narkatia Ganj,W. Champar, (Bihar)

انور حیات

اثر نہیں ہے اثر کی دعا سے ان بن ہے
بہت دنوں سے ہماری خدا سے ان بن ہے

اجالا کرنے کا دل میں ارادہ ہے لیکن
دیا جلاؤں میں کیسے ؟ ہوا سے ان بن ہے

مرے مقام کا مشکل ہے اب تعین بھی
سخن شناس کی حرف و نوا سے ان بن ہے

چمن میں غنچہ کوئی کیسے مسکرائے گا
کہ غنچے غنچے کی بادِ صبا سے ان بن ہے

مری وفا مرے کیا خاک کام آئے گی
جفا پسند کی خوئے وفا سے ان بن ہے

Navrang Metal Mart, Chawrastha, Hanamkonda - 506011

مہندر اگروال

سمجھ کے ساتھ مکاری سے، کب تک ؟
غزل ہوگی اداکاری سے، کب تک ؟

حکومت دھول ہے جوتے کی میرے
رہوں سپنوں میں خودداری سے کب تک ؟

ہوائیں روک لیں جب پربتوں نے
کروں امید چنگاری سے کب تک ؟

حقیقت آگئی ہے سامنے، جب
رکھیں سمبندھ لاچاری سے کب تک ؟

مسلسل سوچنا، کہنے سے پہلے
غزل کے شعر بیگاری سے کب تک ؟

B.M.K. Medical Store, Sadar Bazar, Shivpuri (M.P.)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۵)

ہم عصر اردو ادب نمبر (اردو شعر ۔ ادب کا عالمی گاؤں) کے بارے میں خطوں کی تعداد میں اضافہ و ذخیرہ ہورہا ہے ۔ شاعر کے محدود صفحات میں خطوں کے اہم اقتباسات کی اشاعت بھی ہورہی ہے ۔ ابھی تو ان خطوط کی اشاعت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا ہے جو قارئین نے لکھے ہیں ، سخن فہم حضرات نے لکھے ہیں ، نئی نسل کے قلم کاروں نے تحریر کیے ہیں ۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز اور خواب جیسا ہے اور کسی بھی ادبی رسالے یا اہم کتاب کی پذیرائی کی ایک نئی تاریخ بنارہا ہے لیکن چونکہ ۱۴ سو صفحات (یعنی دو ہزار سے زائد صفحات کا مواد) پر بکھری ہوئی تخلیقی کائنات کی سیاحت آسان نہیں ہے لہذا ابھی سفر جاری ہے اور ممکن ہے (خدا کرے کہ ایسا ہو) کہ ہم عصر اردو ادب نمبر بیسویں صدی کی آخری دہائی کے لیے نہیں بلکہ پوری بیسویں صدی کے لیے چند بڑے ادبی و تاریخی واقعوں میں شمار کیا جائے ۔ بے شمار ادب ذوق مطالعہ کررہے ہیں ۔ ابھی ہم امتحان سے گزرہی رہے ہیں ۔ زیر اشاعت خطوں میں یہاں وہاں جو ادارتی قلم لگ رہا ہے وہ ناگزیر ہے ورنہ تو یہ کلام قارئینِ شاعر کا کلام ہے اور آزادئ اظہار کو ہم مقدم جانتے ہیں ۔ (الف الف)

کاوش بدری

"ہم عصر اردو ادب نمبر" کی ضخامت سے کہیں زیادہ اس کا فکری حجم ہے۔ اولاً ہر باب پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ہر باب میں شامل نثری پاروں کو اوسط رفتار سے پڑھنے والا قاری کم سے کم دوچار گھنٹوں تک پڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے ٹی وی اور بیوی بچوں کی جھنجھٹ سے نجات ملے ۔ چند قاری پائن کار اونٹ کی طرح بہ یک وقت سارے کا سارا نگل کر آرام سے کسی گوشے میں بیٹھ کر نگلی ہوئی غذا کو دوبارہ منہ تک لاکر جگالی کرنے لگ جاتے ہیں تاکہ بدہضمی کے شکار نہ ہوں۔ میرا معاملہ برعکس اندیشہ قارئین ہے۔ نثر ہو یا نظم اس کے صوتی آہنگ، لب ولہجہ، اس کی آوازوں کے زیر وبم تجوید وترتیل، کمالِ اظہار واخفا کو پابندی کے ساتھ محسوس کرکے پڑھنے سے ذوق کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ دورانِ مطالعہ کیف وسرور پیدا ہوجاتا ہے۔ آہنگ کے تعلق سے تاحال کسی نقاد نے کچھ نہیں لکھا۔ ان کی تنقیدات میں ان کے تبحر علمی کا مظاہرہ ہی ہوتا ہے۔ بعض مقالے حالانکہ اردو میں ہی شائع ہوئے ہیں مگر ان کو دوبارہ سلیس اردو میں ترجمہ کرکے پڑھنے کی ضرورت ہے چونکہ ان کی اردو مجھ جیسے ایک ادنیٰ شاعر و ادیب کے پلے نہیں پڑتی تو عام قارئین اس کو کیسے سمجھیں گے ؟ مثال کے طور پر نظام صدیقی کے مقالے "نئے عہد کی تخلیقیت کا پیش منظر وپس منظر" کو ایک بار یونہی سانس کو روک روک کر پڑھ چکا ہوں۔ بہت ساری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں ، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے ۔ ان کا کہنا سوفیصد صحیح ہے کہ ہر تحریر تخلیق نہیں ہوتی۔ سب سے بڑی کتاب مقدس قرآن جو ہر لحاظ سے ادب العالیہ ہے ہرگز تخلیق نہیں ہے بلکہ فرمودۂ ذات باری تعالیٰ ہے۔ اسی مصداق اردو کی متعدد شعری اردو نثری تصانیف کو ہم تخلیقات کا درجہ نہیں دے سکتے ۔ اور پھر ادب العالیہ آزادی کے بعد کس شاعر نے اردو کو دیا؟۔ ادب العالیہ کی طویل سے طویل تر نظمیں ہی متحمل ہوتی ہیں ۔ رامائن ، مہابھارت ، ڈوائن کامیڈی ، شاہنامہ اور مثنویٔ مولانا روم طویل نظموں اور ادب عالیہ کے لازوال نمونے ہیں۔ عظیم شاعری مختصر نظموں میں بھی ہوسکتی ہے اور ہوئی بھی ہے جیسے کبیر داس، ٹیگور کی مختصر نظمیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر میں ڈاکٹر محمد حسن کا مقالہ "اردو نظم کا زوال" میں بھی آزادی کے بعد لکھی جانے والی طویل نظموں کا ذکر نہیں۔ اس فروگذاشت کے سلسلے میں میں نے ان کو لکھا تو جواب ملا کہ "بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا مقالہ "اردو [نظم کا] زوال" پسند آیا آپ کی کاویم (ادب العالیہ، صنف مونولاگ میں قوم پسندانہ عناصر اور دراوڑی کلچر کے سا[تھ] انکشاف ذات پر اردو کی پہلی طویل نظم) کا تذکرہ ضرو[ر] تھا، اس کی طرف توجہ دلانے کا شکریہ۔" ماہنامہ شاعر شمارہ ۱۱ر نومبر ۹۸ء میں پروفیسر ذکاء الدین شایاں کے ا[دبی] فیچر میں وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ "میرا خیال ہے جا[رے] دور میں مختصر اور طویل جدید نظم گوئی میں خاصی ت[رقی] ہوئی۔" مگر افسوس اس امر کا ہے کہ انھوں نے ان طو[یل] نظموں اور مختصر نظموں کا ذکر نہیں فرمایا مگر ڈاکٹر محمد ح[سن] صاحب نے اپنے مقالہ اردو نظم کے زوال میں چند مو[ضوعاتی] نظموں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ان کا دامن کھینچا۔ "نظ[م] بافت کا مسئلہ "شین کاف نظام۔ "شعر کی پرکھ" علی عباسی اور ابن فرید ، خورشید سمیع ، دیویندر اسر اور ن[ظام] صدیقی کے مقالوں میں بھی ان طویل نظموں کا ذکر نہیں عہد حاضر میں لکھی گئی۔ اقبال کے بعد علامہ جمیلی مظہری آب وسراب، حرمت الاکرام کی "کلکتہ ایک رباب" عم[یق] حنفی کی "سندباد" اور کاوش بدری کی کاویم شائع ہوئیں۔ پوچھیے تو آپ کو ہم عصر اردو ادب نمبر کی دوسری جلد ایک مخصوص باب طویل نظموں کے تعلق سے ر[کھنا] ضروری ہے۔ تعجب اس امر کا ہے کہ کوئی نقاد مذکورہ طو[یل] نظموں کے حسن وقبح پر کچھ نہیں لکھتا۔ بہار یونیورسٹی کاویم پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیق شروع ہوچکی ہے۔ ذ[کاء] الدین شایاں نے اپنے ادبی فیچر میں لکھا ہے کہ "کسی ملک کوئی شاعر یا ادیب original نہیں ہوسکتا۔ نہ میر نہ غا[لب] ، نہ اقبال نہ فراق اور فیض، ہم عصر ادیب و شاعر کس قطار میں ہیں؟" اپنے سے پہلے کے ادب سے استفادہ کر[نا] اور ان کے معیاری عناصر کو اپنے کلام میں پیش کرنا عمل برائے سرقہ، توارد وغیرہ نہیں ہے۔ میں تو یہ اعلا[ن] کرتا ہوں کہ میں تلمیذ شعرائے شمال وجنوب ہوں۔ مو[لانا] ناطق نے لکھا کہ "میں تلمیذ داغ سے کہیں زیادہ تلمیذ دیو[ان] ...

خ ہوں۔ "ہر نثر نگار اور شاعر دوسروں کے ادب عالیہ سے استفادہ کرتا ہے مگر تخلیق میں originality ضروری ہے۔ میر و غالب کا کلام کوئی تخلص کے بغیر سنادے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ کلام میر و غالب کا ہے۔ اگر موجودہ دور کی جدید ترین مختصر نظموں کے لکھنے والے شعراء کے سنادئے جائیں تو ہم ہر نظم کے نظم نگار کی حیثیت سے بھی نامور، دانشور، مشہور مستند، معتبر شاعر کا نام لے سکتے ہیں۔ تخلص یا نام کے بغیر ہم آج کی جدید نظموں کے لیے ان کے تخلیق کاروں کو جان نہیں سکتے مگر تخلص یا نام کے بغیر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر میر کا ہے، غالب کا ہے، اقبال کا ہے، سیماب کا ہے، بانی، فضا ابن فیضی، مظفر حنفی، نشتر خانقاہی، عرفان صدیقی وغیرہ کا ہے۔

آپ سے میری گذارش بھی ہے کہ ایک باب نقاد شاعروں پر بھی مختص کریں۔ نقاد شعراء میں آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، تنویر احمد علوی، شارب ردولوی، نثار احمد فاروقی، ابوالکلام قاسمی، افسر جمشید، شمیم حنفی، حنیف کیفی، ذکاء الدین شایاں، حامدی کشمیری، جگناتھ آزاد، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، افتخار امام صدیقی، سردار جعفری، ڈاکٹر محمد حسن، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ وغیرہ۔

● 5-S.K. Meeruddin Street Noorullapet, Ambur - 633802 (T N)

☆ اردو کی طویل نظمیہ شاعری پر کوئی خصوصی شمارہ یا ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد دوم میں کوئی باب قائم کرنے کی بابت غور کر رہے ہیں۔ ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ اس موضوع پر کام ہونا چاہیے تاکہ نئی نسل کے شعراء کو معلوم ہو سکے کہ آزاد نظموں، نثری نظموں یا صرف غزل نے ہمارے روشن شعری ورثے میں اضافہ نہیں کیا ہے۔ اصناف کا تنوع ختم ہو رہا ہے۔ عظیم پابند نظمیہ شاعری کا خاتمہ ہو گیا ہے اور قوت شعری کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلی شعرا نے بڑی غزل کے ساتھ مختلف اصناف میں طویل نظمیں تخلیق کی تھیں۔ ہمارے زمانے تک آتے آتے خال خال نام ہی رہ گئے ہیں۔ عمیق حنفی ہوں، کاوش بدری ہوں، قاضی سلیم یا اعجاز صدیقی (دو مشہور نظمیں 'سنگ دل کا مسیحا' اور 'کرب خود کلامی' بھی اسی ذیل میں آتی تھیں) پابند موضوعاتی نظمیں ہی کہاں تخلیق ہو رہی ہیں کہ طویل نظموں کی طرف توجہ کی جائے۔ جن شعرا کی قوت شعری ۵، ۷ اشعار سے زیادہ نہ ہو یا سو، دو سو غزلوں سے آگے جو شعرانہ جا سکیں ان سے طویل پابند نظموں کی توقع ؟ بہر حال طویل نظموں کو ضرور موضوع بنایا جائے گا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کا ایک اہم باب نثر سے شاعری کی طرف "شاعری سے نثر کی طرف مگر شاعری' شاید آپ نے ملاحظہ نہیں کیا۔ وہ نقاد و نثر نگار جو شاعری بھی کر رہے ہیں لیکن اس پر نثر حاوی ہے اور شہرتیں بھی نثر نگاری میں حاصل ہوئی ہیں، ان پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ دوسری اور تیسری جلد میں بھی اس باب کے تحت اور بھی نقاد شعرا شامل کیے جائیں گے۔ (الف الف)

شبنم رومانی

"شاعر اعظم" سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے بڑا قاموسی کام کیا ہے۔ میں صہبا لکھنوی (مدیر "افکار") کو نمبری کہا کرتا تھا آپ ان سے بڑھ کر "نمبری" نکلے! اگر ایک پلڑے میں آپ کو اور دوسرے میں آپ کے "ہم عصر اردو ادب نمبر" کو رکھا جائے تو وزن برابر نکلے گا۔ یہ حوالے کی اشاعت ہے، اس کو یونیورسٹیوں میں رائج ہونا چاہیے۔ رہ گیا اس کا کلیتاً بے عیب ہونا تو یہ خلاف امر اور خلاف فطرت ہے۔ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ کوشش انسان کا کام ہے اور اس کو بار آور کرنا اللہ کا ! بہر حال قامت اور ضخامت کے اعتبار سے یہ نمبر ایسا ہے کہ اسے رحل پر رکھ کر ہی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ابھی میں نے اسے سرسری طور پر دیکھا ہے، تفصیلی مطالعے کے بعد انشاء اللہ تفصیل سے اظہار رائے کروں گا۔ ویسے سرسری مطالعے ہی سے اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہو گیا۔ مبارک صد مبارک۔

● Monthly 'AQDAR' 207, Ghadiali Bldg Sadar, Karachi (Pakistan)

فیاض رفعت

ادھر تم نے ہم عصر اردو ادب نمبر نکال کر زبردست ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ تمہارے شذراتی نوٹس نے حیرت میں ڈال دیا کہ ادب کی جملہ اصناف پر تمہارا مطالعہ کس قدر حاوی ہے۔ واقعی رشک ہوتا ہے۔ 'زلوی ایوارڈ' کے تم بجا طور پر مستحق تھے۔ میری مبارکباد قبول کرو۔ تم نے Monumental کام کیا ہے اور اس کا اعتراف بجا طور پر ضروری ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر پر تفصیل سے لکھوں گا۔ فی الحال تو اس کا ایک ایک لفظ اپنی روح میں اتار رہا ہوں۔ اور ہاں بھئی یہ عالمی خواتین نمبر بھی تم نے کمال کا مرتب کیا ہے۔

● Director Doordarshan, Chhajju Bagh, Patna - 1 (Bihar)

☆ 'زلوی ایوارڈ' کی مبارکباد کا شکریہ اور آپ کے توسط سے ان بے شمار قارئین شاعر، رفیقان شاعر اور خاندان سیماب کے لیے دعاگو حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنی مسرتوں کا اظہار کیا۔ شاعر میں 'زلوی ایوارڈ' کی خبر شائع کرنے کا مقصد اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے ۲۵ سالہ ہفت روزہ 'زلوی' کو خراج محبت پیش کرنا تھا۔ (الف الف)

سعید الظفر چغتائی

ہم عصر اردو ادب نمبر جستہ جستہ بہت دن پڑھتا رہا۔ کہانیوں پر زیادہ زور دیا۔ تحقیقی مقالے بھی پڑھے۔ کبھی زیادہ جی لگا کر، کبھی کم۔ یہ تو ایسی کتاب ہے کہ سرہانے دھری رہے۔ جب فرصت ہوئی، ایک چیز پڑھ کے دم لیا اور کچھ دن اس تحریر کا مزہ لیتے رہے۔ میں تو شعر بھی ٹھہر ٹھہر کر مصرعے مصرعے پڑھتا اور سنتا ہوں کہ الفاظ و افکار ہضم ہوتے جائیں۔ افسانوں میں سب سے زیادہ متاثر زاہدہ حنا کے افسانے نے کیا۔ کاش وہ اسے سیاسی اشارات پر ختم نہ کرتیں۔ ائل ٹھکر نے پرانی باتیں مگر دلچسپ اور تازگی بھرے انداز سے لکھی ہیں۔ اقبال متین کی کہانی 'ذہن کا مارا' منفرد ہے۔ منفرد تو زیادہ تر کہانیاں ہیں لیکن اس کا انداز اور پلاٹ نرالا ہے۔

● Kabir Colony, Jamalpur, Aligarh (U.P.)

اے۔ خیام

"ہم عصر اردو ادب نمبر" ابھی پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک دو یا چند نشستوں میں پڑھنے کی چیز بھی نہیں ہے۔ صرف ضخامت کے اعتبار سے نہیں بلکہ میٹر کے اعتبار سے بھی۔ یہ تو ایک دستاویز ہے اور اسے ہمیشہ حوالے کے طور پر بھی استعمال کیا جائے گا۔ تمام اصناف کے ساتھ آپ نے اپنے نوٹ بھی لگائے ہیں اور یہ نوٹ بے حد اہم ہیں۔ جستہ جستہ اسے پڑھ رہا ہوں۔ بھئی اس وضاحت کی کیا ضرورت تھی کہ یہ نمبر کسی کو (ہندوستان میں بھی) مفت نہیں دیا گیا۔ مجھے اندازہ ہے کہ ادبی پرچے کی اشاعت کتنا مشکل کام ہے پھر اتنا ضخیم نمبر اور اس پر مستزاد ڈاک کی مہنگائی۔ اگر اگر

لکھنے والے خرید کر پڑھیں تو کیا مضائقہ ہے۔ اب تو ادب وہی پڑھ رہے ہیں جو ادب لکھ رہے ہیں اور اس تعداد کو بھی اسی طرح قائم رکھا جاسکتا ہے کہ لکھنے والے بھی خرید کر پڑھیں۔ اب ہر لکھنے والا اس بات کی توقع کرنے لگا ہے کہ تمام لکھنے والے اور مدیران اسے اعزازی طور پر اپنی کتابیں اور رسالے پیش کیا کریں۔ میں اس بات کی توقع نہیں کرتا، جتنا خریدنے کی استطاعت رکھتا ہوں اتنا خرچ کرڈالتا ہوں اور کتابیں یا رسالے خرید کر بڑی طمانیت محسوس کرتا ہوں۔ "ہم عصر اردو ادب نمبر" پڑھنے کی چیز بھی ہے، خریدنے کی بھی اور رکھنے کی بھی۔ یقین کیجیے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

● A - 997, Sector 11A, North Karachi, Karachi - 75850 (Pak)

عرفان دانش سکندرپوری

ہم عصر اردو ادب نمبر کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ قاری پڑھنے سے قبل اس نمبر کو صرف ہاتھ میں اٹھا کر آپ کی انتھک محنت کے وزن کو محسوس کرلیتا ہے! اردو کی تاریخ آپ کے اس نوع کے ادبی کارناموں کو فراموش نہ کرپائے گی۔ جب سے نمبر آیا ہے جز بہ جز مطالعہ کررہا ہوں۔ کل کو سمجھنے اور پڑھنے کے لیے وقت درکار ہے۔ امریکہ کی مصروفیات میں انسان گھڑی کی سوئی سے بندھ کر چلتا ہے، وقت کم ہی ملتا ہے۔ لیکن اس نمبر کی کشش ہی کچھ ایسی ہے کہ اہم سے اہم کام چھوٹتے جاتے ہیں، اور مطالعہ کا سفر جاری ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ وہ لطف آرہا ہے جہاں سے شروع کرتا ہوں لفظ و معنی کے بے کراں سمندر میں ڈوب جاتا ہوں اور جب ابھرتا ہوں تو کوئی دُرِ نایاب لے کر ابھرتا ہوں۔ اس عظیم شاہکار پر لکھنا آسان کام نہیں ہے، مطالعہ مکمل ہونے پر کوشش کروں گا کہ حسب مقدرت کچھ لکھ سکوں۔ سردست تو یہ چند سطور ادبی نمبر کی وصولیابی کی رسید کے طور پر قبول فرمائیں۔ خالق لوح و قلم آپ کو طویل عمر دے کہ ایسی عرق ریزی کے ساتھ پرورش لوح و قلم کرنے والی ہستیاں اب کمیاب ہیں!

● 237 - Parkville Ave, Brooklyn, Newyork - NY 11230 (USA)

شاہین مفتی

سائنٹفک تحقیق کے باب میں عرض ہے کہ

(۱) لکھنے والوں کے نام حروف تہجی کے عین مطابق ہوں۔ نیز ناموں کی تفصیل میں بھی ابجد کا خیال رکھا جائے۔

(۲) یہ طے کرلیا جائے کہ اصناف ادب میں سے آپ کس کس کو متعارف کرانا چاہتے ہیں اور ان کا دورانیہ کیا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۸ء تک یا کچھ اور۔

(۳) ہمارے بہت سے سینئر لکھنے والے ابھی حیات ہیں لیکن آپ کے نمبر میں وہ کہیں نظر نہیں آئے جیسے غزل کے ضمن میں احمد ندیم قاسمی۔ اس طرح عصری تناظر میں ان سینئر حضرات کی عدم موجودگی بھی کھٹکے گی۔ (۴) کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ صرف "شاعر" میں لکھنے والے ادیبوں کے رشحاتِ قلم سے ہی فیض یاب ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اس کی تفصیل دی جاسکتی ہے کہ کس سال سے کس سال تک کا انتخاب ہے۔ (۵) کچھ اہل قلم کی تصاویر موجود ہیں اور کچھ کی نہیں۔ یہ بھی مناسب نہیں لگتا۔ (۶) پرچے میں بہت سارے نمائندین کی آرا کا جمگھٹا طبیعت پر گراں گذرتا ہے کیونکہ پرچے کی لکھائی بہت باریک ہے۔ اس قسم کی آرا کی تفصیل کسی علیحدہ حصہ میں اکٹھی کی جاسکتی ہے۔ (۷) اس نمبر میں بہت کچھ بہت زیادہ معیاری بھی نہیں (یہ فقرہ کافی سخت ہے اور اس سے آپ کا متفق ہونا ضروری بھی نہیں۔) غزلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کے دس بڑے غزل گو شعرا اسی طرح پاکستان کے دس بڑے غزل گو شعراء پر تبصرہ و تنقید والا سلسلہ بھی اچھا رہ سکتا ہے۔ (۸) آپ نے اتنی محنت کی ہے لیکن شاعر کا کاغذ بہت اچھا نہیں اس کی قیمت تھوڑی بڑھادیں لیکن کاغذ کی بہتری کی جانب توجہ فرمائیں۔

● B - 10, Shadman Town, Gujrat (Pak)

☆ محترمہ شاہین مفتی صاحبہ نے ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اول) کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ "خاص نمبر کو 'تحقیقی نقطۂ نظر' سے زیادہ سائنٹفک بنایا جاتا تو یہ اور بھی بہتر ہوتا" (مطبوعہ: شاعر مئی ۹۹ء) ہم نے محترمہ سے دریافت کیا تھا کہ 'تحقیقی نقطۂ نگاہ' سے زیادہ سائنٹفک سے آپ کی مراد کیا ہے۔ ان کا جواب قارئین شاعر ملاحظہ کریں اور ہم عصر اردو ادب نمبر کو اس خط کے تناظر میں دیکھیں کہ خاص نمبر زیادہ سے زیادہ سائنٹفک ہے کہ نہیں۔ کیوں کہ ہمارے ناقص خیال میں "ہم عصر اردو ادب نمبر" کی تخلیقی ترتیب اپنے آپ میں بہت نئی اور مختلف ہے۔ ادبی رسائل کے خاص نمبروں اور اہم علمی و ادبی کتابوں کی فہرستوں اور ترتیب سے بالکل الگ۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ ہم عصر اردو ادب نمبر کے 'جرعات' میں بہت تفصیل کے ساتھ اس پروجیکٹ کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ خاص نمبر کی روح اور اس کی کیفیت کیا ہے۔ شاہین مفتی صاحبہ اور دیگر وہ حضرات جو خاص نمبر پر کسی بھی طرح کا مکالمہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ 'جرعات' کا اچھی طرح مطالعہ کرلیں اس کے بعد اپنی گرانقدر رائے کا اظہار کریں۔ ہم اس کا خیر مقدم کریں گے اور ہم عصر اردو ادب نمبر کی دوسری جلد کی ترتیب و تہذیب کو اور زیادہ تخلیقی بنانے کی سعی کریں گے۔ (الف ا

خورشید سمیع

شاعر کا ہم عصر ادب نمبر ۱۹۹۹ء فی الواقع ایک گراں قدر ادبی تحفہ ہے جو آنے والے وقتوں میں اور ہر ملک کے ادبا اور شعراء کے لیے ایک دستاویزی اہمیت کا حامل ہوگا۔ اس نمبر کو ایک بحر ذخار قرار دینا، غلط نہ ہوگا کہ میری رائے میں اس بحر ذخار میں ان قطروں کی کمی نہیں، جو اپنے آپ میں سمندر کوش ہیں۔ ترقی پسندی سے جدیدیت تک اور جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک، ہمارے اسلاف نے کتنی منزلیں طے کی ہیں، یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے لیکن اس نمبر نے تمام تر مرحلوں کو بہت حد تک اجاگر کیا ہے۔ حالاں کہ فی الحال ادبی صورت حال یہ ہے کہ ـ

راستہ نہیں چلتے، صرف خاک اڑاتے ہیں
کارواں سے آگے گردِ کارواں کیوں ہے؟

اور ہم آوارہ گردوں کا حال یہ ہے کہ ـ

راستے کی گرد نے دھندلا دیے منظر تمام
ورنہ ہم آوارہ گردوں کی نظر میں کیا نہ تھا

بہر حال !! افتخار امام صدیقی کے دست و بازو کو نظر نہ لگے کہ اس کاریگری سے ترتیب و تزئین کی ہے کہ ایسا لگا کہ ـ

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ نمبر بڑی غیر جانب داری سے، بڑی چابک دستی سے، بڑی محنت سے وجود میں آیا ہے اور یہاں مدیر اپنی تر دامنی کے باوجود وقار بادہ گساری برقرار رکھنے میں کامیاب ہے کہ ـ

کہہ کہہ خورد و کم کم خورد   و گر مئے خوری باخرد منداں

M.I.T. Muzaffarpur - 842003 (Bihar)

خورشید عنبر

کسی رواج کسی رسم کے قفس میں نہیں ہم
تمہاری طرح زمانے کی دسترس میں نہیں ہم

انا کے غار میں جز ظلمتوں کے کچھ نہیں ہوتا
خبر یہ رکھتے ہوئے بھی خود اپنے بس میں نہیں ہم

تغیرات زمانہ سے سب ہوئے متاثر
ہماری راہ وہی ہے کہ پیش و پس میں نہیں ہم

قدم قدم پہ یہاں خیریت ہیں پوچھنے والے
خوشا فریب، سمجھتے ہیں خار و خس میں نہیں ہم

یہ کس کے سوز سے عنبر پگھل رہا ہے زمانہ
شرار بن کے اگر وقت کی نفس میں نہیں ہم

O 76 - Jamiat Colony, Ansar Mohalla, Bhiwandi - 421302, Dist Thane

وحید اشرف

خرد کا دور ہے یہ، دل کی روشنی کم ہے
تمام ساماں ہیں اک دل کا درد ہی کم ہے

خبر تو سنتے ہیں ہم آسمان کی لیکن
خداشناسی ہے کم اور خود آگہی کم ہے

زیادہ گو نظر آتا ہے قد و قامت میں
مگر ہے سایہ زیادہ اور آدمی کم ہے

غم حیات کو ہنس کر اگر نہیں کاٹا
تو یاد رکھو کہ رونے کو عمر بھی کم ہے

وحید عام ہے اب حسن و عشق کا چرچا
زیادہ دل لگی لیکن ہے اور لگی کم ہے

O Ayesha Complex , 1st Floor, Block I , 17 - Kalyan Society Vadodra - 390019

جاوید منظر

محبت کو یوں دربدر چھوڑ آئے
ہم اپنا لہو ، اپنا گھر چھوڑ آئے

بدن پر سجا ہے مسافت کا جامہ
کوئی کیسے گرد سفر چھوڑ آئے

ابھی شب کی منزل سے گزرے نہیں ہیں
مسافر چراغ سحر چھوڑ آئے

کوئی تو ہمارا قفس میں بھی ہوگا
یہی سوچ کر بال و پر چھوڑ آئے

ہمیں چھوڑ کر چل دیئے آپ ایسے
کوئی جیسے دیوار و در چھوڑ آئے

O Al - Alameen B-361 Block 'N' North Nazimabad, Karachi (Pakistan)

منظور چند سومی

زندگی تجھ پہ بھروسہ کیا ہے
تو ہے سایہ ، تو یہ سایہ کیا ہے

دور سے ہاتھ ہلائے اس نے
اس سے بڑھ کر بھی دلاسا کیا ہے

یہ قدم لوٹ رہے ہیں واپس
جانے اس گھر میں ہمارا کیا ہے

موت کے راگ سناتے کیوں ہو
ابھی یاں وقت گذارا کیا ہے

آگ اور خون ، دھماکے گولی
آج کے دن کا خلاصہ کیا ہے !

O Kanispura, Baramulla - 193101, Kashmir

غیاث انجم

ہر ایک لمحہ ابھی زیست انتشار میں ہے
یہ عہد تو کسی طوفاں کے انتظار میں ہے

لکھوں وہ نام تو حرفوں سے خوشبوئیں پھوٹیں
عجیب لذت دیرینہ یاد یار میں ہے

جہاں پہ حاکم و محکوم میں تمیز نہ ہو
وہ شہر لطف و کرم کون سے دیار میں ہے

ملا ہے جو مجھے اسلاف سے امانت میں
وہ آئینہ تو ابھی میرے اختیار میں ہے

حدیث دل کی ہے تفسیر لفظ لفظ انجم
غزل کی گونج مری روح کی پکار میں ہے

O Milletnagar, P.O. Radhanagar, Bakaro Steel City - 827010

مکتوبات

ن جولائی ۱۹۹۹ء

شاعر کا مشترکہ شمارہ 'اردو ادب کا عالمی منظر نامہ' (ایک شمارہ اردو کی نئی بستیوں کے نام) پسندیدگی اور مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کررہا ہے۔ قارئین شاعر محو حیرت ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ اس کی ترتیب میں سال دو سال لگ گئے ہوں گے؟ ایسا نہیں ہے! مشترکہ شمارے کا سارا تحقیقی و تنقیدی لوازمہ، پندرہ بیس دن کے اندر تیار کرلیا گیا تھا۔ یہ شب و روز کی محنت کا ثمر ہے۔ ہاں! اردو کی نئی بستیوں کے بارے میں ہمارا کام تو ۱۹۷۸ء سے جاری ہے۔ کئی عام شمارے اور پھر ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) میں اردو کی نئی بستیوں سے خاصہ تخلیقی مواد شامل ہے کہ اسے خاص نمبر سے علیحدہ کرکے کوئی شمارہ ترتیب دیا جائے تو بلاشبہ تین سو صفحات کا ایک خاص نمبر بن جائے گا۔ 'اردو ادب کا عالمی منظر نامہ' ایک ہلکا سا اشاریہ ہے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں گھسے پٹے موضوعات پر Trash تحقیقی کام بہت ہورہا ہے جبکہ موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ سوال یہی ہے کہ پڑھے کون اور پڑھائے کون۔ اساتذہ اپنی تدریسی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ دیگر سرگرمیوں میں الجھے رہتے ہیں اور طلبا کی سوچ کا مرکز، ڈگریوں کا حصول ہوتا ہے۔ حالانکہ یکسر ایسا نہیں ہے لیکن مجموعی صورتِ حال مایوس کن ضرور ہے۔ 'اردو کی نئی بستیاں نمبر' کا آسمانی کینوس کسی آفاقی مصور کے انتظار میں ہے اور ہم اس انتظار کو مسلسل جینے کی سعی کررہے ہیں۔ جس دن یہ انتظار ہمارے اندر مکمل ہوجائے گا 'اردو کی نئی بستیاں نمبر' شائع ہوجائے گا۔ فی الحال تو موجودہ خصوصی شمارہ موضوعِ گفتگو بنا ہوا ہے اور خطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کے بے شمار قلم کاروں، اداروں، انجمنوں اور صاحبِ ذوق قارئین کے مشوروں اور عملی تعاون کا انتظار ہے۔ ہندوپاک کے اردو قلم کار اور ناقدین ادب اپنی ہر طرح کی سوچ سے ماورا ہوکر اس خصوصی شمارے کو دیکھیں اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازیں۔

(الف الف)

مظہر امام

عالمی ادب نمبر بہت عمدہ ہے۔ سب سے زیادہ قابل تعریف ایڈیٹر کی موجودگی ہے۔ آپ کی محنت اور آپ کی واقفیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک ایڈیٹر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ آپ کی ادارت میں شاعر بہت آگے چلا گیا ہے۔ خدا کرے آپ کی یہ تخلیقی، ادارتی اور عملی صلاحیت و قوت اسی طرح برقرار رہے۔

●176 - B, Pocket - I, Phase - I,
Mayur Vihar, Delhi - 110091

عبدالقوی دسنوی

شاعر کا خاص نمبر "اردو کی نئی بستیاں" (جلد اول و دوم) ملا، بڑی مسرت ہوئی اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت مفید نمبر آپ نے پیش کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس طرح کا نمبر اردو میں پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ بہت سے ایسے شعراء اور نثر نگاروں کی تصویریں دیکھنے کو ملیں جو ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں اپنی زبان اردو کی خدمت کررہے ہیں۔ اسی طرح وہ غیر ملکوں میں اردو کا تعارف بھی کرا رہے ہیں اور اس کی طرف وہاں کے لوگوں کو بھی متوجہ کررہے ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھ کر لطف اٹھایا اور مسرت حاصل کی اور ان کی نثر پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ اس نمبر کی اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔

اگر ممکن ہو تو ایک نمبر ایسا بھی نکالیں جس میں بیرونی ملکوں میں رہنے والے شعراء اور نثر نگاروں کے حالات زندگی اور خدمات کے ساتھ ساتھ ان ملکوں میں اردو تعلیم، تعلیم گاہیں، اخبارات و رسائل اور کتب خانوں اور مطبوعات کی تفصیل شامل ہو تو ہماری معلومات میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔

● 2 - Prince Colony, Nemat Pura,
Idgah Hills, Bhopal (M.P.)

☆ مشترکہ خصوصی شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ شاعر کا یہ شمارہ 'اردو کی نئی بستیاں نمبر' کا ایک اشاریہ ہے۔ اس موضوع پر خاص نمبر کا خاکہ بہت وسیع ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔ اس مشترکہ شمارے میں کچھ جھلکیاں ضرور آپ نے ملاحظہ کی ہوں گی کہ محض تخلیقات کی سمائی سے اس مختصر خصوصی شمارے کو گرانبار نہیں کیا گیا ہے۔ نہایت ہی پیچیدہ اور پھیلے ہوئے موضوع کو خاص نمبر کرنا ایک وقت طلب اور روقت طلب کام ہے۔ کوششیں جاری ہیں۔ آپ کی دعائیں درکار ہیں۔

(الف الف)

احمد سہیل

شاعر (اردو ادب کا عالمی منظر نامہ) پرچا خوب ہے کئی وسعتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ زیر نظر پرچے میں شمالی امریکہ میں اردو پر بہت ہی سطحی نظر ڈالی گئی ہے۔ کسی ایسے صاحب سے اس مسئلے پر لکھوائیے جو صرف اردو کی نئی وسعتوں اور حرکیات سے آگاہ ہوں۔ کھلے ذہن کے ہوں، اور جو شاعری اور ناشاعری میں تمیز کرسکیں۔ عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی اور سائیں سچا نے اپنی تحریر میں کچھ اچھی اور پر مغز باتیں کی ہیں۔ یہاں اردو میں یا اردو پر بہت علمی اور تنقیدی کام ہوا ہے جس کا کہیں بھی ذکر نہیں۔ کیونکہ شمال امریکہ میں اردو بولنے والا مجلسی اور محفل بازی والی "شاعری" سے آگے دیکھ نہیں پاتا۔ یہاں اردو کے کئی سنجیدہ لکھنے والے ہیں مگر وہ ہم آپ کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

321 - Old Elkhart Road 37,
Palestine, TX 75801 (USA)

☆ آپ نے بجا فرمایا۔ شمالی امریکہ میں اردو 'بذات خود کسی ضخیم خاص نمبر کا متقاضی ہے اور انشاء اللہ 'اردو کی

بستیاں نمبر' میں موضوع سے انصاف کرنے کی سعی کی جائے گی۔ یہ شمارہ تو محض ایک اشاریہ ہے۔ لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ مختصر ترین صفحات میں بھی اپنے اشاریے کو جامع بنایا جائے۔ لوگوں کا ان کے کاروافکار کا ذکر ہے۔ کتابوں کا ذکر ہے اور خاصی اہم معلومات فراہم کرنے کی خواہش کی گئی ہے۔ ہمیں آپ کی رائے سے صدفیصد اتفاق ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے اردو میں یا اردو پر اعلیٰ علمی و تنقیدی کام کیا ہے ان کے بارے میں تفصیلات فراہم کی جائیں۔ اردو کے سنجیدہ لکھنے والوں کے بارے میں بتایا جائے۔ ہم اپنے طور پر جستجو کررہے ہیں، تحقیق کررہے ہیں۔ بھرپور عملی تعاون حاصل ہو تو اردو کی نئی بستیاں نمبر جلد شائع کیا جاسکے۔ شمال امریکہ اور دیگر ممالک میں قائم اردو کے ادارے اگر ہماری سرپرستی کریں تو یقیناً ایک تاریخی دستاویز مرتب ہوسکتی ہے۔ (الف الف)

ش۔ صغیر ادیب

یہ شمارہ کئی لحاظ سے اہم ہے اور یقینی طور پر محفوظ کرنے کے لائق ہے۔ اس شمارے کے مطالعے سے 'اردو کی نئی بستیوں میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ باہر کا ادیب کیا سوچ رہا ہے۔ کیا محسوس کررہا ہے۔ عصری عالمی مسائل سے متعلق اس کے احساسات کیا ہیں۔ اردو اگر بین المملکتی زبان ہے تو یہ ضروری ہے کہ اردو ادب عصری عالمی مسائل کا ترجمان بھی ہو۔ اور زیر نظر شمارہ اس تقاضے کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ کئی تحقیقات ایک سے زیادہ بار پڑھنے کے لائق ہیں۔ آپ نے واقعی ایک اہم کام کیا ہے جس کے لیے آپ داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

● 65 - Blackburn Street, Blackburn Lakes, B81 7NQ (U.K.)

نامی انصاری

اردو کی نئی بستیوں کا وجود اگرچہ سیمیاں کی سی نمود ہے جس کی تصدیق رالف رسل اور ستیہ پال آنند جیسے دانشور بھی کرتے ہیں۔ تاہم ان نئی بستیوں کی ادبی سرگرمیوں کو اجاگر کرنے کی آپ کی کاوش یقیناً قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

● 99/295, Nala Road, Chaman Ganj, Kanpur - 208001 (U.P.)

رشید الدین

شاعر کا مشترکہ شمارہ ملا۔ یہ ایک غیر متوقع، بہت مختلف، متنوع اور وقیع خصوصی شمارہ بن گیا ہے۔ جس کے لیے مبارکباد قبول کیجیے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا ایک محاورہ سنا تھا لیکن اسے عملی طور پر شاعر کے شماروں میں دیکھتا ہوں۔ آئندہ جنوری ۲۰۰۰ء میں شاعر ستر سال کا ہوجائے گا یعنی میری عمر سے صرف سات سال بڑا۔ ایک اور مبارکباد آپ کی نسل شاعر کی تیسری نسل ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے۔ آپ نے ہندوپاکستان کو چھوڑ کر اردو کی نئی بستیوں کی جانب توجہ دینی شروع کی ہے۔ یہ اچھی بات ہے اور شاعر کو تروتازہ اور زیادہ دنوں تک باقی رکھنے کی ضامن بھی۔

● 12 - 2 - 823 / A / 122, Santosh Nagar Colony, Mehdipatnam, Hyderabad - 28

پنہاں

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ آپ کی توجہ و محنت سے مرتب ہے۔ اس میں آپ کا مضمون 'اردو کی نئی بستیوں سے' معلوماتی تحریر ہے۔ دیگر مضامین بھی عمدہ اور شعری حصہ بھی بیشتر قابلِ تعریف ہے۔ غزل کے حوالے سے اظہار رائے کا جو سلسلہ چلتا رہا ہے اس پر ایک مضمون جلد ارسال کروں گی۔

● 1752, Alpine Drive, Carrollton, TX 75007 (USA)

سلیم شہزاد

عالمی اردو ادب کا مشترکہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ جتنے متنوع پہلو آپ نے اس شمارے میں سمیٹے ہیں، آپ ہی کا حصہ ہے۔ مبارکباد۔ شاعر برادران اور شاعر برادری اس شمارے کے ہر صفحے اور ہر کالم سے اپنا اظہار کرتی صاف نظر آرہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ہر آن ترقی اور توسیع کے لیے آپ کے جذبات قابلِ قدر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، ہم عصر اردو ادب نمبر شائع کرکے آپ تھکے نہیں۔ آپ کی انرجی میں مسلسل اضافہ ہو، خدا سے دعا ہے۔

● 323 - Mangalwar Ward, Malegaon - 423203 (M.S.)

مناظر عاشق ہرگانوی

شاعر کا جون جولائی کا مشترکہ شمارہ دستاویزی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے ان دونوں شماروں سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا۔ آپ فکروعمل کے توازن سے اپنے نقطۂ نظر کو جس طرح کینوس کا روپ دیتے رہتے ہیں اس میں نیاپن ہوتا ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

● Kohsar, Barahpura, Bhagalpur - 812001 (Bihar)

اندر پرتاپ فیّو

لگتا ہے اک عرصہ سے اس پروجیکٹ پر کام ہورہا تھا کیونکہ اتنی قیمتی معلومات لیے یہ ادبی گلدستہ سال چھ مہینے میں تو تیار نہ ہوسکتا تھا۔ افتخار امام کا مضمون اردو کی نئی بستیاں بڑا اثرانگیز ہے۔ ویسے بھی اس صاحب سیف و قلم کا ادبی انداز بھی کچھ اپنا ہی ہے۔ ان کی زبان بڑی پیاری شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ اپنی قوت بیان اور treatment کی ندرت سے انہوں نے اس موضوع کو ایک نیا ظرف دے دیا ہے۔ کاش کچھ ایک نئی غزلوں سے بھی وہ اس ادبی دستاویز کو مزین کرتے۔ جون کے شمارہ میں بابِ کہانی کمزور ہے۔ باقی ادبی جرائد سے قدرے بہتر ہونا الگ بات ہے۔ غزلوں میں اوم کرشن راحت صبیحہ صبا، وسیم بٹ اور نظموں میں ستیہ پال آنند اور تسیم سید کافی آگے ہیں لیکن جولائی شمارے میں اسیٰ بدر میر کارواں ہیں۔ حالانکہ آزاد نثری نظم میرے مزاج میں نہیں اترتی لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ اسیٰ بدر زندہ باد۔ میں عزیزہ کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی تخلیقی توانائیوں کو مزید تقویت دینے کے لیے اپنی خوبصورت زبان میں پابند غزل کی طرف لوٹ آئیں۔ ٹھیک ہے وہ تلخی حیات سے آنکھ نہ چرائیں لیکن حیات کے مسموم گوشوں کو مہکانے کا حوصلہ تو دیں۔ ہجر میں رونا اک grund reality ہے۔ مانتا ہوں یہ اپنی جگہ۔ مگر کلام میں رفعت، شوکت، سرشاری مصوری اور مترنم لہریں کون لائے گا؟ یہ کام بھی یقیناً بنی اسیٰ کا ہی ہے پھر آنے والا دور انہیں کا ہے۔

● 5 - A, Major Shidevt Singh Marg, Civil Lines, Ludhiana - 141001 (P.B.)

☆ محترمہ صبیحہ صبا کی غزل کے ساتھ ایک غلط پتہ محض ناموں کی مماثلت کی وجہ سے شائع ہوگیا ہے۔ ادارہ شاعر اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہے۔ محترمہ صبیحہ صبا کا صحیح پتہ یہ ہے Sabiha Saba, P.O. Box 26137 Abudhabi: (U.A.E.) قارئین شاعر نوٹ کرلیں۔ (الف الف)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

دلت آواز

ترجمہ : یعقوب راہی

"....دلت ادیب کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ مراٹھی ادب خود اس کا اپنا ادب ہے۔ اسے ادب میں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ جس سے سماجی جمہوریت کا جذبہ ابھرے یا سماجی تعاون کا بے غرض خیال پیدا ہو....." (پروفیسر پانتاوانے)

کتاب کی ابتدا میں "مراٹھی میں دلت ادب" کے موضوع پر پروفیسر پانتاوانے سے لیا ہوا بھاسکر نندن کا انٹرویو پڑھ لینے سے دلت ادب کی ماہیت سمجھ میں آتی ہے اور اس کتاب میں پیش کی گئی دلت شاعری کے ترجمے پڑھنے کو نہ صرف طبیعت راغب ہوتی ہے بلکہ اس کا مکمل حظ اور بھرپور رد عمل قاری کو نصیب ہوتا ہے۔

یعقوب راہی نے بڑی جانکاری اور جان کاہی سے دلت شعراء اور ان کا کلام منتخب کیا ہے۔ اکثر نظمیں واقعی انگارے ہیں اور جو نہیں ہیں ان کے بین السطور میں دہکتی چنگاریاں ہیں۔ کسماگرج کی نظم "نقاب کشائی" بڑے صحیح موقع پر درج کی گئی ہے۔ سبھی نامور دلت شعراء اور شاعرات نے نام نہاد اونچی ذات والوں کے سیکڑوں صدیوں کے ظلم، ناانصافی اور غیر انسانی رویوں کے رد عمل میں اپنے احتجاجی سائیکی کے دائمی سلگتے جذبات و احساسات الفاظ کے پیکر میں پیش کیے ہیں جنہیں مترجم نے ان کی اسپرٹ میں ان کا ترجمہ کیا ہے۔ جہاں شاعروں نے مراٹھی نظموں میں انگریزی یا سنسکرت الفاظ یا جملے استعمال کیے ہیں مترجم نے کمال ہوشیاری سے ان کا ترجمہ نہیں کیا اور جوں کا توں رہنے دیا جس سے اصل اسپرٹ برقرار رکھنے میں مدد ملی۔ لیکن ان کا مفہوم، تلمیحات، قبائلی، مذہبی اور معاشرتی ناموں اور اصطلاحات کی فٹ نوٹ میں تصریح کردی گئی ہے۔ اہم شاعروں اور شاعرات میں بابوراؤ باگل، نارائن سروے، کیشو مشرام، دیا پوار، نام دیو ڈھسال، جے وی پوار، ہیرا بنسوڈے، بابوراؤ جگتاپ، جیوتی لانجے وار، ارون کامبلے، سریکھا بھگت اور دامودر مورے بھی شامل ہیں۔ ہر ایک شاعر کے کلام کے انتخاب اور ترجموں سے پہلے اس کا مختصر اور جامع تعارف بھی دے دیا گیا ہے۔ پوری شاعری کا لہجہ خطیبانہ ہے جسے نظر انداز کرنا ہوگا کیونکہ یہ احتجاج کی شاعری ہے، جمالیاتی نہیں۔

مراٹھی سے اردو ترجموں میں یہ ایک اہم کتاب ہے جس کے لیے یعقوب راہی اور اس کی اشاعت میں مالی تعاون کے لیے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اور اس کے دلکش و اثر انداز گٹ اپ کے لیے ایڈ شاٹ پبلی کیشنز کے اطہر عزیز سبھی لائق مبارکباد ہیں۔

مراٹھی سے ناواقف اردو قارئین سے اس کتاب کو پڑھنے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے۔ ضخامت : ۲۵۶ صفحات ○ قیمت : دو سو روپئے ○ ناشر : ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، نانا بھائی لین، فلورا فاؤنٹین، بمبئی۔ ۱ ○ مطبوعہ : نومبر ۱۹۹۸ء ○ تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ

موسم عذابوں کا (افسانے)

علی امام نقوی

یہ افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے علی امام نقوی کا۔ یہ نام نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ ان کی دوسری تصنیفات میں "مباہلہ" اور "نئے مکان کی دیمک" جیسے افسانوں کے مجموعوں اور ایک ناول "تین بتی کے راما" کی پذیرائی ہوئی ہے۔ اپنے تازہ ترین مجموعے کے پیش لفظ میں علی امام نقوی نے ایک تمثیل اور اس کے مکالموں کے ذریعے افسانہ نگاروں کی قدیم، درمیانی اور نئی نسل کے تفاوت کی دلچسپ عکاسی کی ہے۔ اس کے بعد پہلا ہی افسانہ ہے "بنگالی ہاؤس کی منی"۔ یہ منی سبزی بیچنے والی ایک بدقماش عورت ہے جو شادی بھی کرلیتی ہے اور بچے بھی جنتی ہے۔ شوہر کی موت ہوجاتی ہے۔ بچے بڑے ہوجاتے ہیں جس کے بعد وہ اپنی ماں اور اس کے ماحول سے بچنے کے لیے اس سے الگ ہو کر اپنی اپنی زندگی کی ڈگر پر چلتے ہیں اور اپنی ماں کو پلٹ کر بھی نہیں پوچھتے۔ افسانہ نگار نے یہ پس منظر تیار کرکے بتایا ہے کہ ماں پھر بھی پانی سے بھری بالٹیاں بیچ کر اپنے ان بچوں کے لیے روپے جمع کر رہی ہے اور امید کرتی ہے کہ کبھی تو وہ اس سے ملنے لیے آئیں گے۔ آج کی مادّی دنیا کے المیے میں ممتا فطری جذبے کا مظاہرہ ایک ایسا حزنیہ ہے جو قاری کو متا کیے بنا نہیں رہ سکتا۔ اور پھر افسانہ چند ہی صفحات کا اختص لئے ہوئے ہے جو افسانہ نگار کی چابکدستی کی ایک عمدہ مثا ہے۔ اسی طرح "خواہش معصوم" بھی ایک نہایت ہی مخت افسانہ ہے جس میں تمثیل نگاری کی کاری گری سے افسا نگار نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سیاست دانو کو تو یہ فکر لگی رہتی ہے کہ غیر ممالک کے آپسی مناقشو میں بھارت کسی طرح ایک پرامن فضا تیار کرنے کا رول ا کرسکتا ہے لیکن خود بھارت میں فسادات کا جو دھواں ش شہر اور نگر نگر اٹھتا رہتا ہے اس کی فکر انہیں نہیں ہے۔ ایک طبع زاد موضوع ہے۔ افسانہ "شکستگی" فسادات ک ہیئت پر ایک پردرد احتجاج ہے۔ "مرحلہ" فرقہ وارانہ آہنگی کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ عام طور پر ہمارے ملک میں پولس کو ڈر اور نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن علی امام نقوی نے اس افسانے میں ایک ایسے پولس انسپکٹر کردار پیش کیا ہے جو ایک دوسرے فرقے کے شخص کی صرف بروقت مہمان نوازی کرتا ہے اور دوسری ہر طرح کی مدد کرتا ہے بلکہ اس شخص کے دور دراز مقام پر چلے جانے کے باوجود اسے نہیں بھولتا اور اس سے بذریعہ خط کتابت دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات برقرار رکھتا ہے۔ اس افسانے میں علی امام نقوی نے اپنے حساس مشاہدے انسانیت پرست رویے اور انسانی کردار کے اطوار کی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ "بازگشت" بھی ایک بہت ہی مختصر افسانہ ہے لیکن اس میں عجیب و غریب موڑ ہیں۔ ایک فسا میں ایک اغواشدہ لڑکی جب ماں بن جاتی ہے تو ایک دوسرے فساد میں اپنی جوان بیٹی کو اغوا ہونے سے بچانے کے لیے قتل کر دیتی ہے۔ ماں پر زندگی بھر جو گزری ہے اس کے پیش نظر اس کا یہ اقدام ضروری اور فطری ہوجا ہے۔ اس کی جذبات نگاری کا ایک دفتر ان کہی کے ذریعے قاری کے ذہن میں اتر جاتا ہے۔ اردو میں لکھے گئے فسادات

کے موضوع پر یادگار افسانوں میں اس افسانے کا شمار ہو سکتا ہے۔ دو افسانے "چھوٹے فریم کی ایک تصویر" اور "بیچ" بظاہر الگ لگتے ہیں لیکن دراصل ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یہ ایک بڑے پیچیدہ موضوع پر ہے کہ ایک شادی شدہ جوڑا ہے، اس کی اولاد بھی ہے، شوہر کو پتہ چلتا ہے کہ بچپن میں اس کی بیوی اس کی دودھ شریک بہن رہ چکی ہے جبکہ بیوی کو اس کا یقین نہیں ہے اور وہ شوہر سے طلاق پر تیار نہیں ہوتی۔ اس موضوع سے اٹھائے ہوئے مسئلے کا چونکہ کوئی حل نہیں ہے اس لیے اس افسانے کا اختتام غیر تشفی بخش لگتا ہے۔ یہ علی امام نقوی کا ایک کمزور افسانہ ہے۔ بہر کیف یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ افسانوں کے اس چوتھے مجموعے کے ساتھ علی امام نقوی نے اپنے فن کی پختگی اور معیار میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ سرورق اور گٹ اپ عمدہ ہے۔ ضخامت : ۱۴۴ صفحات ○ قیمت : ۸۰ روپئے ○ ناشر: علی امام نقوی ○ سن اشاعت : ۱۹۹۸ء۔ زیر اہتمام: انیس امروہوی، تحقیق کار پبلشرز، بی ۱۰۴/ر یاور منزل، آئی بلاک لکشمی نگر، دہلی ۱۱۰۰۹۲ ○ ملنے کے پتے : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں، دہلی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

دوسری مخلوق (افسانے)

محمود ایوبی

محمود ایوبی افسانہ نگاری کے افق پر ابھرتا ہوا ایک نیا ستارہ ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے لیکن اس کے شائع ہونے سے پہلے ہی ان کے چند افسانوں کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور وہ خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ایک امتیاز ہے۔

ابتدا میں محمود ایوبی نے مختصر طور پر اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے خیالات اور کردار پر ان کا اثر اور ان کے عمل سے اپنا عمومی رد عمل پیش کیا ہے جس سے ان کے افسانوں کے مطالعے اور تجزیے میں ایک حد تک مدد ملتی ہے۔

آج یہ بہت سنا جا رہا ہے کہ افسانوں میں افسانہ پن لوٹ آیا ہے۔ اس مجموعے کو اس کی ایک روشن مثال کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بیک کور پر محمود ایوبی کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ : "..... ان کے یہاں علامت اور ابہام کے نام پر کی جانے والی مہمل نگاری اور اساطیر اور متھ پر منطبق ہونے والی افسانہ نگاری کے لیے جگہ نہیں۔" گویا یہ معیوب میں شامل ہیں۔ ایسا لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ علامت نگاری اور ابہام کے سلسلے میں سریندر پرکاش، انور سجاد اور بلراج مین را کے نام لیے جا سکتے ہیں جنہوں نے چند یادگار افسانے اردو کو دیے ہیں۔ اسی طرح اساطیر کو تمثیل کے طور پر استعمال کر کے اور آج کی دنیا، آج کے سماج اور آج کے کرداروں پر منطبق کر کے عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے بلند پایہ افسانے تخلیق کیے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ محمود ایوبی نے ایسے افسانے کیوں نہیں لکھے بلکہ یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار کا اپنا مزاج الگ، صلاحیت الگ اور اسلوب کی پسند الگ ہوتی ہے جو اس کی فکر کا ذریعہ اظہار ہوتا ہے۔ محمود ایوبی نے سیدھے سادے بیانیہ افسانے لکھے ہیں تو یہ بھی ایک مشکل فن ہے۔ ایسے افسانے جن میں سادگی کے ساتھ پرکاری اور شدت تاثر ہو خونِ جگر سے لکھے جاتے ہیں۔ محمود ایوبی کے افسانوں کی یہی خصوصیت ہے کہ انہوں نے پیچیدہ موضوعات کا انتخاب کیا ہے نہ نثر میں شاعری کی ہے۔ موضوعات جانے پہچانے ہیں، نثر رواں دواں ہے اور ہر افسانہ اپنی فطری سادگی سے سجا ہوا ہے اور اپنا تاثر چھوڑ جاتا ہے

اس مجموعے کا پہلا افسانہ "جنازہ" محمود ایوبی کی شناخت بن گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار فضلو اپنے چھوٹے بھائی جملو کی لاش کو جو کسی حادثے کا شکار ہوئی ہے اور جس کی شکل پہچانی نہیں جاتی، بدقت ممبئی سے دور اپنے وطن لے جا کر تمام رسموں کے ساتھ دفن کروا دیتا ہے۔ لیکن واپسی میں چند ہی روز کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جملو کی لاش مردہ گھر میں پڑی ہے اور فضلو کو کسی اور کی لاش غلطی سے دیدی گئی تھی۔ اب فضلو کی مالی استطاعت ہی ہے نہ ذہنی سکت کہ وہ اصلی بھائی کی لاش حاصل کر کے از سر نو تدفین عمل میں لائے۔ چنانچہ وہ لاش حاصل کیے بغیر ذمے دار عہدے داروں سے جو کچھ کہہ کر چلا جاتا ہے وہ الفاظ قاری کے دل پر پتھر کی طرح چوٹ لگاتے ہیں۔ فضلو کا اپنی فرض شناسی کا دعویٰ اور ہوائیگیٔ فرض کی تسلی، چاہے لاش کسی کی ہو، قانون کے رکھوالوں کی جہالت اور عدم فرض شناسی کے مقابل ایک دردناک موڑ ہے۔ یہ ایک یادگار افسانہ ہے۔

"اٹک" "اکھوا" "بیچ" اور "کشمن ہے ڈگر" ان چار افسانوں کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات ہیں لیکن ہر ایک پلاٹ تنوع لیے ہوئے ہے اور پیش کش ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ یہ افسانے مذہب کے نام پر انسان کی انسان کشی پر افسانہ نگار کی ایک لمبی چیخ ہیں۔ یہ ایک ایسا احتجاج ہیں جس کی گونج قاری کے محسوسات میں لہرانے لگتی ہے۔ افسانہ "دوسری مخلوق" کا موضوع نہایت دلچسپ ہے کہ کس طرح ایک ٹریڈ یونین لیڈر کو establishment اپنے ہتھکنڈوں سے convert کر لیتا ہے۔ اس افسانے کی طوالت کم ہو سکتی تھی جس سے اس کا تاثر اور بڑھ جاتا۔ آخر میں میں ان دو افسانوں کا خاص طور پر ذکر کروں گا جو سادگی اور حقیقت نگاری کا کمال ہیں۔ ایک تو ہے "جو کھم" جس میں ممبئی شہر میں لوکل ٹرینوں اور بسوں سے روزانہ سفر کرنے والوں کا افسوسناک حال ایک دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا ہے "بن باس" جو لوگ ممبئی میں باہر سے آکر بسے ہیں، یعنی مختلف ریاستوں کے قصبوں اور چھوٹے شہروں سے ہجرت کر کے، جب وہ بمشکل برسوں میں ایک بار چھٹیوں میں اپنے وطن جاتے ہیں تو ان پر کیا بیتتی ہے اس کا تذکرہ ان قارئین کے لیے Identification کا موقع پیدا کرتا ہے جو میٹروپولیٹن شہروں میں بس گئے ہیں۔ ان کی حالت کی ترجمانی کے لیے افسانہ نگار نے ایک بلیغ جملہ لکھا ہے : "ممبئی دل سے تو پسند نہیں ہاں پیشہ سے ضرور پسند ہے۔" اس افسانے میں جزئیات نگاری واقعیت سے اتنی قریب ہے کہ طویل ہو جانے کے باوجود افسانے سے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

محمود ایوبی اپنے افسانوں کے اس پہلے مجموعے کے لائق تحسین و مبارکباد ہیں۔ مستقبل میں ان سے اور بلند معیار افسانوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایجوکیشنل شاٹ پبلشرز کی جانب سے اطہر عزیز نے بڑے جاذب نظر معیار سے اسے شائع کیا ہے۔

ضخامت : ۱۴۰ صفحات ○ قیمت : ۱۵۰ روپئے ○ سن اشاعت: ۱۹۹۸ء ○ زیر اہتمام : اطہر عزیز، پبلشر ایڈ شاٹ پبلیکیشنز، سانے بلڈنگ، دوسرا منزلہ، ٹاٹا بھائی لین، فلورا فاؤنٹن، ممبئی ۴۰۰۰۰۱ ○ تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ اور دوسرے۔

مبصر : محافظ حیدر

24/86, S.V.P. Nagar, Mhada, Andheri
(W) Mumbai - 400053 (M.S.)

کتـــاب بـــازار

شاعر میں تبصرے کے لیے موصول ہونے والی کتابوں کی خاصی بڑی تعداد دفتر میں ذخیرہ ہورہی ہے ۔ اس میں اضافہ روز افزوں ہے ۔ تبصروں میں تاخیر کا احتمال ہے چنانچہ شاعر کا ایک پرانا کالم نئے عنوان کے ساتھ دوبارہ شروع کیا گیا ہے تاکہ نئی کتابوں اور نئے رسائل کا مختصر تعارف فوری طور پر آسکے ۔ نئی کتب و رسائل کے اعلانات دیے جاسکیں ۔ قارئینِ شاعر سے التماس ہے کہ اپنی پسندیدہ کتابیں اور رسائل کی خرید کریں ۔ اپنے باذوق احباب کو اچھی اور معیاری کتابوں اور رسائل کے بارے میں بتائیں ۔ نئی کتب و رسائل کو موضوع بنائیں ۔ (ادارہ)

O

فرہنگ ادبیات ___________

(لسانی و ادبی اصطلاحات کا توضیحی و تنقیدی مطالعہ)

مصنف : سلیم شہزاد O ضخامت: ۷۵۴ صفحات O قیمت: چار سو روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۸ء O رابطہ : منظر نما، ۲۳ سنگوار وارڈ۔ مالیگاؤں۔ ۴۲۳۲۰۳ (مہاراشٹر)

وادیٔ کوکن (ماہیے) ___________

ساحر شیوی O ضخامت : ۱۳۴ صفحات O قیمت : سو روپے O مطبوعہ : جون ۹۹ء O پتہ : بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان: D - 12، مونیبہ آرکیڈ، گلستانِ جوہر، بلاک 7، مین یونیورسٹی روڈ، کراچی ۷۵۲۹۰ (پاکستان)

شائزو فرینیا (نفسیات کے آئینے میں) ___________

خالد سہیل O ضخامت : ۱۴۸ صفحات O قیمت: سو روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۸ء O ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولہ مارکیٹ ۔ دریاگنج ۔ دہلی۔ ۲

اضطراب (شاعری) ___________

مظفر صدیقی O ضخامت : ۱۴۴ صفحات O قیمت: ایک سو روپے O مطبوعہ: نومبر ۱۹۹۷ء O پتہ: V/70، ماہی کالونی، بانسواڑہ۔ 327001 (راجستھان)

بنگال میں اردو نثر کی تاریخ (ادبی تاریخ)

سالک لکھنوی O ضخامت : ۲۹۱ صفحات O قیمت: ستر روپے O مطبوعہ :۱۹۹۸ء O پتہ: ۲/۷۵۔ اے، رفیع احمد قدوائی روڈ، کلکتہ - 700016

مرا نورِ بصیرت عام کردے ___________

(روزنامہ انقلاب (بمبئی) کے اداریوں کا انتخاب)

ہارون رشید علیگ O ضخامت : ۱۳۶ صفحات O قیمت: ایک سو روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ ، جے جے ہسپتال، بمبئی۔ ۳

تعبیر (افسانے) ___________

معین الدین جینابڑے O ضخامت : ۱۳۶ صفحات O قیمت :۱۵۰ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O پتہ : A-4, نیو اکاڈمک اسٹاف کوارٹرس، یونیورسٹی آف بمبئی، ودیانگری، سانتاکروز (مشرق) بمبئی - 400098

تنہا پرندے کی اڑان (شاعری) ___________

تسلیم الٰہی زلفی O ضخامت : ۲۱۶ صفحات O قیمت : ۱۵۰ روپے / دس ڈالر O مطبوعہ : ۱۹۹۴ء O پتہ :

222 - Ashlar Road, Richmond Hill, ONT.
LAC 2 W6 - Canada

لب مماس (نظمیں) ___________

وہاب دانش O ضخامت : ۱۱۴ صفحات O قیمت :۵۰ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O پتہ : اردو مرکز، 247۔ ایم آئی جی، لوہیانگر، پٹنہ - 800020 (بہار)

معانی اور تناظر (تنقیدی مضامین) ___________

وزیر آغا O ضخامت : ۳۳۲ صفحات O قیمت :دو سو پچاس روپے O مطبوعہ : دسمبر ۱۹۹۸ء O پتہ : مکتبہ نردبان۔ ۹۔ اولڈ سول لائن، سرگودھا (پاکستان)

اردو رسم الخط اور املا ۔ ایک محاکمہ

(لسانیات۔ تنقیدی مضامین)

ابو محمد سحر O ضخامت : ۱۸۴ صفحات O قیمت :۱۳۰ روپے O مطبوعہ : فروری ۱۹۹۹ء O رابطہ : مکتبہ ادب۔ ۳۹ مالویہ نگر، بھوپال ۴۶۲۰۰۳ (ایم پی)

ادب کہانی ۔ ۱۹۹۶ء (سالانہ ادبی جائزہ) ___________

انور سدید O ضخامت : ۲۴۰ صفحات O قیمت : ۱۳۰ روپے O مطبوعہ : ستمبر ۱۹۹۸ء O پتہ : مکتبہ فکر و خیال۔ 172 سٹیج بلاک اقبال ٹاؤن۔ لاہور (پاکستان)

تحقیق و تجزیہ (مضامین) ___________

ڈاکٹر وہاب عندلیب O ضخامت : ۱۱۲ صفحات O قیمت: پچاس روپے O مطبوعہ : جون ۱۹۹۹ء O پتہ : ۱۱۔ کے، ایچ بی کالونی، عقب عدالت، گلبرگہ۔ ۲ (کرناٹک)

بے آواز سمندر (شاعری) ___________

عقیل شاداب O ضخامت : ۱۱۲ صفحات O قیمت : ۷۵ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O پتہ : برج راج پورہ، کوٹہ، (راجستھان)

ادبی رسائل

نوائے ادب (سہ ماہی) ___________

مدیر : آدم شیخ O ضخامت : ۸۰ صفحات O قیمت ۲۵ روپے فی شمارہ O زرِ سالانہ : سو روپے O پتہ : انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، ۹۲۔ دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱ (مہاراشٹر)

مژگاں (سہ ماہی) ___________

مدیر اعزازی : ایس۔ ایچ بھارتی O ضخامت : ۱۲۰ صفحات O قیمت : ۲۰ روپے فی شمارہ O زرِ سالانہ ۷۵ روپے (سو روپے رجسٹرڈ ڈاک) O پتہ : احمد ولا۔ ۸۵ ۔ جے، توپسیا روڈ، کلکتہ۔ ۳۹

انتساب (سہ ماہی) ___________

مدیر : سیفی سرونجی O ضخامت : ۱۸۴ صفحات O قیمت :۲۵ روپے فی شمارہ O زرِ سالانہ : سو روپے O رابطہ : سیفی لائبریری، سرونج۔ ۴۶۴۲۲۸ (ایم پی)

گلبن (سہ ماہی) نعت نمبر ___________

مدیر : سید ظفر ہاشمی O ضخامت : ۲۳۲ صفحات O قیمت : ۳۰ روپے O فی شمارہ :۸ روپے O زرِ سالانہ ۴۵ روپے O پتہ : C - 2 ، راحیل اپارٹمنٹس، نزد گائیکواڑ حویلی، رائے کھڑ، احمد آباد۔ 380001 (گجرات)

شفق (ماہنامہ) ___________

مدیر اعلیٰ اعزازی: ابوالفیض عثمانی O مدیر: سید مختار علی O ضخامت : ۶۴ صفحات O قیمت :۲۰ روپے فی شمارہ O زرِ سالانہ : دو سو چالیس روپے O پتہ: مجیب منزل کے پیچھے، پائیگاہ موتی باغ روڈ، ٹونک (راجستھان)

جدید ادب (ادبی مجلہ) ___________

مدیر : حیدر قریشی O ضخامت : ۱۱۲ صفحات O قیمت :چالیس روپے فی شمارہ (ہندو پاک میں) ۵ ڈالر یا تبادل O پتہ : Auf Der Roos 7, 65795 Hatter Shem-1, Germany

فکر امروز

❋

شعر کی عروضی و لغوی تعریف سے اس وقت بحث نہیں۔ اس زمانے میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دل میں چبھنے والا ایک نشتر اور تکلم کی عام سطح سے بلند ایک کلام ہو یعنی جو خیال شعر میں نظم کیا جائے وہ عامۃ الناس کے خیالات سے ممتاز و مرتفع ہونا چاہیے۔ اگر شاعر کے خیالات عام خیالات سے متوازن ہوں تو شاعر کو ان کے موزوں کرنے کے سوا اور کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں ہر خیال کے نظم کر دینے کا نام شاعری نہیں۔ بلکہ شاعری نام ہے خیالات کے بلند و محفوظ کی موزوں ترجمانی کا۔ اور شاعری نام ہے، اس تصویر میں جان ڈالنے کا جو نقاشِ فطرت شاعر کے دماغ پر مرقسم کرتا ہے۔ (۱۴واں خطبہ۔ مشاعرہ بزم ادب اورئی ضلع جالون۔ منعقدہ: ۱۵ر جون ۱۹۳۵ء)

سیماب اکبرآبادی

مکتبہ قصر الادب

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد ــــ ۷۰

شمارہ ــــ ۱۰

فون: 3829904

اکتوبر ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

✱

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ❀ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ❀ خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

Cables: 'REPTILEFUR' CALCUTTA
TELEPHONE: 34-3370

Codes: A. B. C. 6TH EDN. 5 LETTERS
BENTLEY'S & PRIVATE

LATIFSONS & CO.
EXPORT - IMPORT
AGRA & CALCUTTA

7, COLOOTOLA STREET,
Calcutta-1 7-1-1971
(INDIA)

Ref. No. ______

عزیز گرامی۔ تسلیم

آپ کا ۲۰ جنوری کا ارشاد موصول ہوا۔ ایک مدت کے بعد [illegible] [illegible] دعا ہے کہ [illegible] ۔ اگر [illegible] تو [illegible] کیا [illegible] ہے۔ [illegible] قریب [illegible] [illegible] ہیں۔

[illegible] میں [illegible] زیادہ [illegible] [illegible] کر چکا ہوں۔ [illegible] [illegible] عنوان پر [illegible] تھا [illegible] کے ذریعے سے [illegible] ۔ [illegible] کر دیا۔ [illegible] [illegible] کا عنوان تھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] زندگی [illegible] ۔ [illegible] ہو سکے۔

[illegible] ۱۱-۲-۱۶۶ [illegible] نام [illegible] [illegible] ۔ [illegible] جنرل [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کر دیجئے [illegible] ۔ [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] میں [illegible]

مشکور ہوں گا [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] جانتے ہیں۔ [illegible] [illegible] ۔ [illegible]

ل۔ احمد بنام اعجاز صدیقی

لطیف الدین احمد اکبر آبادی (پ: ۱۸؍اپریل ۱۸۸۵ء۔ م: ۲؍جون ۱۹۸۰ء) کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ طبع زاد افسانوں کے ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے مترجم بھی تھے۔ 'انشائے لطیف' کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں۔ انشائیہ اور نثری نظم کے درمیان انھوں نے تخلیقی نثر لکھی ہے۔ اکبر آباد کی مناسبت سے علامہ سیماب، شاعر، اعجاز صدیقی اور خاندانِ سیماب سے گہرے تعلقات تھے۔ انگریزی ادب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ روسی ادب کو اردو میں متعارف کروانے والوں میں ل۔ احمد کا شمار ہوتا ہے۔ یہ خط ضروری حواشی کا متقاضی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ل۔ احمد مرحوم پر [illegible] کا تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا۔ (الف۔ الف)

All offers are subject to final confirmation.

سرورق

حامد اقبال صدیقی

*

ہم عصر اردو ادب نمبر

شمارہ۔ ۱۰ [اکتوبر/۱۹۹۹ء] جلد۔ ۷۰

اساتذہ اور طلباء بھی تو اردو ادب کے قاری ہو سکتے ہیں؟

غزل کے حوالے سے اُفُقی مکالمہ جاری ہے اور اس مکالمے میں ایک سوال اس قاری کے بارے میں بھی قائم ہوا جو غزل پڑھ رہا ہے، سن رہا ہے یا جو ادب پڑھ رہا ہے۔ اور جب قاری کی بات چل نکلی تو معلوم ہوا کہ شعر و ادب کا قاری جو بھی ہے وہ سکڑ رہا ہے، محدود ہو رہا ہے۔ پھر سوال بنا کہ ادب کا قاری کون ہے؟ ادب کا جو بھی قاری ہے اس میں درس و تدریس سے وابستہ اساتذہ اور اردو طلباء بھی شامل ہیں۔ اور جب اس نکتے پر غور کیا گیا تو بہت سارے حقائق حیرت بن کر ابھرے اور بہت زیادہ حیران کر گئے۔ اردو اساتذہ ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی یونیورسٹیوں، کالجوں اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں موجود ہیں۔ کل ہند سطح پر ان کی ایک انجمن بھی ہے۔ جب اردو اساتذہ کی تعداد ہزاروں میں ہے تو اردو طلباء کی تعداد تو بھی بے شمار ہوگی۔ اساتذہ و طلباء کی اتنی بڑی تعداد میں کتنے فی صد ہیں جو ادبی رسائل پڑھتے ہیں؟ (خریدنے کا مسئلہ الگ ہے جو پڑھنے کے ساتھ تو جڑا ہوا ہے لیکن یہ اور بھی زیادہ سنجیدہ مسئلہ ہے) کتابیں خریدتے اور پڑھتے ہیں؟ ان ہزاروں اساتذہ اور طلباء کے درمیان اردو ادب کا ذوق و شوق بہت معمولی بلکہ اب واجبی سا رہ گیا ہے۔ حیرت! کوئی حیرت!

ادب کے قاری کی محدودیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے اردو اساتذہ اور طلباء ایک طرح کی میکانیکی نظام تعلیم میں جکڑے ہوئے اردو زبان اور اس کے نصابی ادب سے تو وابستہ ہیں لیکن اس کے آس پاس یا اس سے اوپر اٹھ کر اردو زبان کے معاصر ادب کو نہیں پڑھ رہے ہیں۔ اس کی جستجو نہیں کر رہے ہیں۔ آج کے بیشتر اردو اساتذہ اور طلباء اپنی نصابی سرگرمیوں سے باہر تقریباً صفر ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک بحث طلب اور بہت گمبھیر موضوع ہے اور ایک طویل مقالے کا متقاضی بھی۔ اردو کی نصابی کتابیں بھی ایک تحقیق طلب موضوع ہے کہ آج کا اردو نصاب طلباء میں کوئی شوق، کوئی ذوق پیدا نہیں کر رہا ہے۔ ذہانتوں کو نہیں ابھار رہا ہے۔

زیادہ دور کی بات نہیں، مہاراشٹر کی دسویں جماعت کے اردو نصاب میں پروفیسر آل احمد سرور کا مضمون "اقبال اور اس کا فلسفۂ خودی" شامل تھا۔ ہمارے استاد محترم جالب مظاہری (مرحوم) جو عربی فارسی کے جید عالم تھے اور شاعر بھی (تلمیذ : علامہ سیماب اکبر آبادی) تھے۔ انھوں نے ۲ ماہ میں اس اہم مضمون کا درس مکمل کیا تھا۔ اہم بات یہ کہ اپنے درس کے دوران انھوں نے علامہ اقبال کے بارے میں اتنی معلومات اور حوالے فراہم کر دئے تھے کہ آج کے اردو اساتذہ اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر یہ کہ فلسفہ کیا ہے؟ خودی کیا ہے اور آل احمد سرور کون ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ مزید مطالعے کے لئے کون کون سی کتابیں اور رسالے معاون ہو سکتے ہیں۔ اسکول کی لائبریری میں اقبال پر کون کون سی کتابیں ہیں۔ کون سے ادبی رسائل اسکول لائبریری میں آتے ہیں۔ لائبریری اور مطالعہ کی اہمیت وغیرہ۔ شاعر کے ضخیم اور تاریخی 'اقبال نمبر' (۱۹۸۸ء) کی ترتیب میں استاذی جالب مظاہری مرحوم کے دروس اور یادداشتوں نے خاصی مدد کی تھی۔ استاد کی اپنی ایک شخصیت اور اپنا ایک کردار ہوتا ہے جو طلباء پر اثرانداز ہوتا ہے۔ آج استاد اور طالب علم کے درمیان وہ رشتہ نہیں رہا جو ماضی کی روایت رہا ہے۔ بہت سارے مشاہیر ادباء و شعراء درس و تدریس ہی سے وابستہ تھے اور انھوں نے اپنے شاگردوں میں بھی ذوقِ مطالعہ پیدا کیا تھا۔ ان میں سے بھی کئی نام بعد میں نامور ہوئے، معتبر ہوئے۔

کیا یہ ہمارے اساتذہ کی ذمہ داری نہیں بنتی کہ وہ 'نصاب باہر' معاصر اردو ادب میں بھی دلچسپی لیں؟ معاصر ادبی رسائل سے جڑیں۔ اپنی تنخواہ میں سے چھوٹا سا بجٹ کتب و رسائل کی خرید کے لئے مختص کریں! جب اساتذہ ہی اپنی زبان کے ادب اور اس کے ادبی رسائل سے دلچسپی نہیں رکھیں گے تو پھر طلباء کا حال معلوم؟ آج کے اردو اساتذہ اپنے طلباء کو تلقین نہیں کرتے کہ وہ نصاب کے علاوہ بھی اردو ادب کا مطالعہ کریں۔ رسائل خریدیں، معیاری کتابیں خریدیں۔ طلباء سے یہ نہیں دریافت کیا جاتا کہ وہ کون کون سے ادبی رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں؟ ان پر پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں۔ ماہ دو ماہ میں نصاب کے علاوہ کوئی پیریڈ معاصر شعر و ادب، ادبی رسائل اور ادبی کتابوں کے بارے میں نہیں ہوتا کہ طلباء معلومات میں اضافہ کیا جاسکے۔ ان میں ادب کا شوق پیدا کیا جاسکے۔ لائبریری کی اہمیت، اس سے دوستی اور ضرورت کے بارے میں بتایا جاسکے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ نصاب کے مشمولات کے بارے میں اساتذہ اپنی لکھی ہوئی درسی شرحوں اور اپنی مکتبی کتابوں ہی کی خرید پر زور دیتے ہیں۔

اردو اساتذہ اور طلباء کا ایک سروے از بس ضروری ہو گیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہزاروں اساتذہ و طلباء میں سے ادب کے قاری کیوں نہیں ابھر رہے ہیں۔ اردو اساتذہ کے بارے میں یہ تحقیق ہونی چاہیے کہ وہ جس نصاب کی تدریس کر رہے ہیں اس کے بارے میں وہ کتنا جانتے ہیں۔ نصاب باہر اردو زبان و ادب سے ان کی واقفیت کتنی ہے؟ حالانکہ اساتذہ کے لئے ورکشاپ منعقد کئے جاتے ہیں لیکن یہ ورکشاپ اپنی وقتی کامیابی سے آگے کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کر پاتے۔ ہائر سکنڈری اسکولوں کے طلباء تو بالکل کورے نکل رہے ہیں۔ وہ اپنے مشاہیر قلم کاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے اساتذہ بھی ضرورت بھر تعلیم حاصل کر کے آتے ہیں۔ بی اے اور ایم اے کی سطح کے طلباء بھی اپنے نصابی دائرے سے باہر نکل نہیں پاتے اور نجی اساتذہ کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ پی ایچ ڈی کے طلبا اور ان کے اساتذہ کا حال تو اور بھی برا ہے۔ یہاں اس پر گفتگو کی فی الحال کوئی گنجائش نہیں۔

ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کی لائبریریاں یا شعبۂ اردو کی اپنی لائبریریاں ہیں ان کی اپنی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان تمام لائبریریوں میں ادبی رسائل اور ادبی کتابوں کی رسائی خود ایک مسئلہ ہے۔ اردو شعبے کے ذمہ داران کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی اپنی کتابیں لائبریری میں موجود ہیں یا نہیں۔ غزل پر مکالمے کی ابتداء سے غزل قاری اور پھر اردو اساتذہ اور طلباء زیر بحث آگئے اور بعض اہم مگر بنیادی امور پر گفتگو کے لئے ایک اشاریہ تیار ہو گیا۔ اور اس اشاریے سے ایک بڑا سوال ابھر کر آیا ہے کہ بے شمار اساتذہ اور طلباء میں سے چند سو بھی ایسے نہیں ہیں جو ادب کے سکڑتے ہوئے، محدود ہوتے ہوئے قارئین میں اضافہ کر سکیں؟



اختر سعید خاں

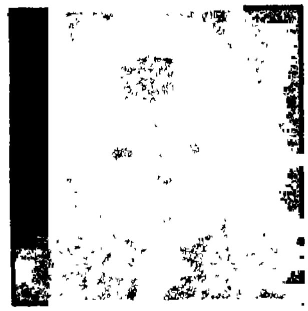
وہ چراغِ آرزو کی آنچ بھی مدھم نہیں ۔ دل بہت غم دیدہ ہے لیکن ہلاکِ غم نہیں
اور کیا ہے ایک تہمت کے سوا یہ زندگی ۔ سرزمینِ دل اگر شعلہ نہیں شبنم نہیں
جن کے بس میں اس کی آنکھیں کہہ گئیں رازِ دروں ۔ کون سا ہے اب وہ عالم جو مرا عالم نہیں
آشنائے غم بھی ہے وہ دوستدارِ دل بھی ہے ۔ اب نہ جو محکم جو پیمانِ وفا محکم نہیں
اور بھی تو ہیں در و دیوار کرتے زندگی ۔ یہ جو جو ہو بر سبیلے ہے پیر دو دار ہم نہیں
اب بھی کچھ چھلکے ہوئے غم ڈھونڈ لیتے ہیں مجھے ۔ بزمِ دل برہم ہوئی پر کیا ہی برہم نہیں
پھر دیارِ حسن سے کوئی خبر آنے کو ہے ۔ دل بھی کچھ ٹھہرا ہوا ہے آنکھ بھی پرنم نہیں

یوں سنبھل کر ہر قدم رکھنا پڑا اختر مجھے
جیسے یہ دنیا مآلِ لغزشِ آدم نہیں

نکل ہی آئے گی دل کے قرار کی صورت ۔ نظر تو آئے کوئی اعتبار کی صورت
عجیب نشاط ہے اک جبر زندگی کا وہم ۔ گلے لگائے رہے اختیار کی صورت
کوئی چراغ سا جلتا رہا ہے سینے میں ۔ تمام عمر اک امیدوار کی صورت
وفا شناس ہے اب کون شہرِ یاراں میں ۔ کھڑا ہوا ہوں غریب الدیار کی صورت
یہیں کہیں دلِ آوارہ جشن ساماں تھا ۔ یہ رہگزر کہ جو اب ہے غبار کی صورت
وہ فوق سنج ہوئے یار جن کی سانس ۔ چمن میں رہ کے نہ دیکھی بہار کی صورت
چمک رہی ہیں ستاروں کی نم دار آنکھیں ۔ بدل رہی ہے ترے انتظار کی صورت

یہ رات دل کی تپش ہے سبب نہیں اختر
کوئی تو چیز ہے دل میں شرار کی صورت

Inside Itwara, Allahabad Bank Road,
Bhopal - 462001 (M.P.)



قتیل شفائی

مت روک مجھے میرے یار بہت مجبوری ہے
سن اُس کی بزمِ ناز میں میری حضوری ہے

جو بیت رہا ہے وہ چاند سے پرے تھے
دو چار سو کوس کی یہ دوری کیا دوری ہے

اُس ہال تو مجھ پنگھٹ پر آنے جانے سے کوئی
اس لال کی خاطر مرنا مجھ کو منظور ہے

دو لفظ بیجا لکھے تھے میں نے دو لفظ اُس نے
میں اب سمجھا کیوں اب تک بات ادھوری ہے

فرہاد سے شیریں چاہتی تھی جو فلسفے میں
یہ کوہ کنی بس گویا اک مزدوری ہے

ہاں اُس کا تو چرچا بار بار میری غزلوں میں
لیکن یہ میری نگارش غیر شعوری ہے

رکھتا ہے مشکل پیروں میں ہے ہاتھوں کو خو
جو اُس کے بدن میں رچی ہوئی کستوری ہے

دو آتشہ کیف نہ کیوں ہو اُس کی آنکھوں میں
رنگت کچھ بادامی کچھ انگوری ہے

یہ میرے دوست قتیل سو حین بیں رنگ نہ رس
ہاں شاعری ان کی ناپ تول میں پوری ہے

19 - Ghalib Colony,
Samanabad Lahore (Pak)

غزل: هزار چہرہ، معجزّ نما یا اندھا کنواں

ادبی فیچر

ادبی فیچر کے لئے اس ماہ کی بحث اردو غزل کے بارے میں ہے۔ شاعر کے جرعات میں غزل کے اس کردار پر مکالمہ قائم کیا گیا ہے جو ہمارے کتب و رسائل سے باہر کی غزل ہے۔ سماجی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر غزل نے مشترکہ تہذیب و تمدن کے لئے اردو زبان کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اس پر ایک نئی بحث کا آغاز کیا گیا اور ان پہلوؤں کو روشن کرنے کی سعی کی گئی ہے جن پر 'اردو خواص' نے توجہ نہیں کی بلکہ ان پر غور ہی نہیں کیا گیا۔ اردو غزل ہمارے درمیان میکانیکی ہوکر رہ گئی ہے۔ غزل پر کوئی نئی تنقید، غزل کے لئے کوئی عالمی نوعیت کا علمی کام، غزل کے لئے وہ سرگرمیاں جس سے معلوم ہوکہ ایک زندہ صنفِ سخن، زندہ کیوں ہے ؟ ہندوستان کی آزادی کے بعد ترقی پسندوں، جدیدیوں اور مابعد جدیدیوں نے اپنے درمیان غزل کی موجودگی کو کبھی محسوس نہیں کیا سوائے اس کے کہ مخالفتیں ہوئی ہیں اور شد و مد کے ساتھ ہوئی ہیں۔ غزل کا مذاق ہی اڑایا گیا۔ اپنے اپنے سیاسی و ادبی مفادات کے تحت غزل کو پرے ہی پرے کیا گیا۔ ہماری اس نئی بحث نے غزل کے ان مسائل کو بھی ابھارا ہے جن سے 'غزل ناقد' پریشان ہیں، ادبی رسائل کے مدیران حیران ہیں۔ ہم ان مسائل پر بھی غور کررہے ہیں اور کوشش کررہے ہیں کہ نئی غزل اور زیادہ معیاری اور بڑی شاعری کے زمرے میں آئے۔ کلاسیکی غزل ہی کی طرح زرخیز ہو۔ عالمی شاعری کے ساتھ رکھی جاسکے۔ یہ ممکن ہے کیوں کہ آج کی غزل میں اس کے امکانات ختم نہیں ہوئے ہیں، مرے نہیں ہیں۔ صنف زندہ ہے تو اس کے اوصاف بھی زندہ ہیں۔ بس یہ ہے کہ ہمارے غزل کاروں کے لئے کچھ نئے ضوابط، اصول اور حدوں میں ان کی تربیت از بس ضروری ہوگئی ہے۔

محترم ظہیر غازی پوری نے غزل کے اوصاف بیان کیے ہیں اور بعض ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن پر بحث قائم ہونی چاہیے۔ زندگی اور موت کا تعلق اور تسلسل، دنیا کے ارتقائی عمل کو متحرک کیے ہوئے ہے اور وقت اس کی تاریخ لکھ رہا ہے۔ یہی وقت غزل کی تاریخ بھی لکھ رہا ہے۔ وقت، تاریخ اور غزل۔ تینوں کے درمیان تال میل آج بھی یکساں طور پر بنا ہوا ہے۔ وقت اور تاریخ اگر کسی موضوع پر ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو وہ موضوع یا تو بچھڑ جاتا ہے یا پھر گُم ہوجاتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ صنفِ غزل نے وقت اور تاریخ کے ساتھ اپنا رشتہ برابر بنائے رکھا ہے۔ وہ اگر غزل کاروں کے ہاتھوں کمزور ہوتی ہے تو اس نے کتب و رسائل سے باہر اردو کی عالمی ثقافت میں خود کو زندہ رکھا ہے۔ دیگر زبانوں میں خود کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر پنہاں نے غزل کی لغوی تعریف کو نئی معنویت دی ہے کیوں کہ غزل نے اپنے لغوی معنی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے غزل مخالفین کا بھی بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے اور تجزیہ کیا ہے اور کئی ایک بالکل نئے سوال قائم کیے ہیں۔

محترم ستیہ پال آنند نے شاعر کے حالیہ 'جرعات' میں غزل کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر نظم تخلیق کی ہے۔ قارئین شاعر اردو نظم کے اس اہم نام سے بخوبی واقف ہیں کیوں کہ وہ شاعر کی وہ تاریخی بحث نہیں بھولے ہیں جو "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تحت گوشۂ ستیہ پال آنند کے حوالے سے مدتوں مدت تک جاری رہی اور ابھی ہم عصر اردو ادب نمبر۔ ۲ میں اس کا اختتامیہ باقی ہے۔ آنند جی غزل کے مخالف ہیں۔ وہ اب ادبی رسائل میں اپنی نظموں کے ساتھ پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں کہ ہماری بحث کا دائرہ کار کتب و رسائل سے باہر اس غزل سے ہے۔ جو ہمارے کلچر میں، ہماری ثقافت میں ایک زندہ تہذیب کی روایت کے بطور پوری آب و تاب کے ساتھ سانسیں لے رہی ہے۔ لیکن اب ہم غزل کے بارے میں اس عالمی شاعری کے تناظر میں بھی بات کریں گے۔ صنفِ غزل کی مخالفت، آج کی مخالفت تو ہے نہیں۔ اکیسویں صدی میں بھی آنند جی کی آواز سے آگے پھر کوئی آواز یا آوازیں شور مچائیں گی لیکن غزل تو صدی اور صدیوں کا حصہ اور ورثہ بننے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ ستیہ پال آنند صاحب کی نظم کا جواب مقصود نہیں۔ ہم اپنی بات کہہ رہے ہیں۔ انہیں اپنی بات کہنے دیں۔ بحث جاری ہے۔ (الف۔ الف)

نئی غزل کی صورت گری

ظہیر غازی پوری

میں نے غزل پر جب کبھی کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھایا، غزل کا ایک نیا رخ میرے سامنے آگیا۔ لوگ اسے "ہزار شیوہ" کہتے آئے ہیں مگر مجھے یہ "ہزار چہرہ" بھی معلوم ہوتی ہے۔ جب بھی اس کی جانب غور سے دیکھا، اس کا کوئی نیا نقش، نیا پہلو، نئی شباہت یا نیا پیکر مجھے نظر آیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خود زندگی غزل کے سانچے میں ڈھل گئی ہے، جس کے باعث غزل میں زندگی اور زندگی میں غزل کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے مگر اس کیفیتِ احساس سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ذہن کا تربیت یافتہ ہونا لازمی ہے۔ غزل جہاں کہیں بھی رہی ہے، جس حال میں رہی ہے، اس نے اپنے دامن میں ہر روش، ہر جہت، ہر واقعہ اور ہر رویہ کو سمیٹا ہے۔ شاید اسی وجہ سے غزل بذات خود ایک تہذیب کا درجہ پا چکی ہے۔ غزل بھارت میں کہی جائے، پاکستان میں تخلیق کی جائے یا امریکہ، جرمنی، کویت، سعودی عرب اور ناروے میں بیٹھ کر کہی جائے کہیں اپنے لباس فاخرہ اور انداز ساحرانہ کو نہیں چھوڑتی۔ آج غزل ہمارے فہم و ادراک ہی کا حصہ نہیں بلکہ زندگی کی توانائی اور روح کی غذا بھی ہے۔ ایسے میں یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کے یکسر بدلے ہوئے منظر نامے میں غزل کی بقا کا امکان ہے کہ نہیں۔ اکیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ یکسر بدل سکتا ہے، سائنسی کرشمے دنیا کی ہیئت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، انداز معاشرت میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے، طرز زندگی میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے، طبقاتی کشمکش میں اضافے کے امکانات ہو سکتے ہیں، چاند، مریخ، زحل، عطارد تک انسان کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے، آسمانوں میں معلق کرۂ ارض پر آباد کاری کی صورتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انسان محبت سے بے نیاز ہو جائے، بچوں کی توتلی آوازوں سے متاثر ہونا ترک کر دے، ماں کی ممتا پتھرا جائے اور انسانی رشتے بے معنی ہو جائیں۔ انسان جب تک احساس کی سطح پر زندہ ہے، اس کے ساتھ تہذیب ہوگی، ادب، زبان، زندگی اور اس کی قدروں کی تہذیب۔ وہ لباس ضرور پہنے گا چاہے اس کی تراش خراش کچھ بھی ہو، وہ علم ضرور حاصل کرے گا، چاہے اس کی نوعیت بدل جائے اور ادب و زبان سے یقینی طور پر متاثر ہوگا، چاہے اظہار و بیان کے طریقوں میں فرق آجائے لہٰذا منظر نامہ اکیسویں صدی کا ہو یا چوبیسویں صدی کا، اردو زبان اور اس کا رسم خط باقی رہے گا تو غزل بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ زندہ و تابندہ رہے گی۔

یہاں میں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ غزل ہر منظر نامے میں اپنی عکس تابی برقرار رکھنے کی متحمل رہی ہے۔ یہ زندگی اور کائنات کو ہر عہد میں منعکس کرتی آئی ہے۔ ستیہ پال آنند جیسے نظم نگار شاعر نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اردو کے شعری ادب کے جس منظر نامے کی تشکیل ہوئی ہے، اس میں غزل ایک راسخ صنفِ سخن کے طور پر ابھری ہے اور اسٹیج کے مرکزی حصے پر قابض ہے۔" غزل کے نکتہ چیں کلیم الدین احمد بھی اس سچائی سے انکار نہیں کر سکے کہ "انسان جب تہذیب کے اعلیٰ ترین زینوں پر ہوگا اس وقت اس کی شاعری اشعار غزل تک محدود ہوگی۔"

ان حقائق کی روشنی میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح غزل گذشتہ چھ سو سال سے عوام پسند، خواص پسند اور ہر دلعزیز رہی ہے، اسی طرح آنے والی صدیوں میں بھی اس کی جادو اثری اور ہر دلعزیزی یقیناً باقی رہے گی۔

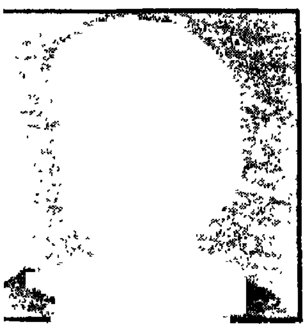
غزل ہر دور میں مقبول اور معتبر بھی رہی ہے اور مقہور و معتوب بھی۔ ایک طرف عظمت اللہ خاں نے اس کی ریزہ خیالی پر نکتہ چینی کی اور بے دریغ اس کی گردن اڑا دینے کا فرمان جاری کیا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اسے ذہنی تھکن، سہل پسندی اور تقلیدی رو کے نام سے تعبیر کیا، کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشیانہ صنف قرار دیا تو دوسری طرف رشید احمد صدیقی نے غزل کو شاعری کی آبرو کہا۔ آل احمد سرور نے اسے چاول پر قل ھو اللہ لکھنے اور نقش نگینے کا فن تسلیم کیا، ڈاکٹر محمد حسن نے اس میں شاخ گل کی لچک محسوس کی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے غزل کو سماجی روابط اور اجتماعی کیفیات اور روحانی وسعتوں کا نقیب و داعی ثابت کیا۔ ہر دور میں غزل نئے رنگ و آہنگ میں سامنے آئی ہے۔ شعریات کی کسوٹی پر بھی کھری اتری ہے۔ شاعری کی دوسری اصناف میں معاشرہ اور انسان کے اتنے پہلو اجاگر نہیں ہو سکے جتنے غزل میں ہوئے ہیں۔ غزل نے تاریخی اتھل پتھل کو بھی سمیٹا ہے، معاشرہ کے آشوب کو بھی جذب کیا ہے اور شخصی تجربات کی خوشہ چینی بھی کی ہے۔ اس کا ہر شعر ایک کوزہ ہے اور ہر کوزے میں تجربات و مشاہدات کا دریا بند ہوتا ہے۔ غزل میں ایک نوع کی ریزہ چینی ہے اور بے شک ہے مگر اس کی ہر ریزگی اور بکھراؤ کی کیفیت میں ہمہ جہتی اور ہمہ گیری ہے۔ یہ حقیقتاً "جزو" میں "کل" کے مصداق ہے۔ یہ مشکل سے مشکل مسائل عمومی شکل میں یوں پیش کرتی ہے کہ منطق و فلسفہ حیران رہ جاتے ہیں۔ غزل جذبہ و احساس کا آئینہ بھی ہے اور زندگی کا ناقدانہ جائزہ بھی۔ اس میں عقل و شعور کی سیال کیفیت جاری و ساری نظر آتی ہے جو تلخ سے تلخ حقیقت کا عرفان کراتی ہے۔ غزل فرد کا انفرادی تشخص بھی ہے اور سماجی بصیرت کا شناخت نامہ بھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے لفظوں میں "غزل مطالعہ نہیں اجتماعی محاکمہ ہے۔" اجتماعی محاکمہ وہی صنف بنتی ہے جو شعور ذات کے ساتھ عرفانِ کائنات کی ہر کرید، ہر خلش اور ہر تحرک اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ غزل کے طلسم خانہ میں قدم رکھئے اور لفظ لفظ کی معنوی تہ داری تک رسائی حاصل کیجیے تو دو مصرعوں میں متحیر کر دینے والی کائنات بھی مرتکز نظر آئے گی اور بقول ڈاکٹر فہیم اعظمی کئی افسانچے بھی برآمد ہوں گے۔ نئی غزل نہ تو کھوکھلے جھانجھ کی بے معنی کرخت آواز ہے اور نہ محض خالی ٹن پیٹنے کا کوئی عمل ہے۔

نئی غزل نے منجمد تخلیقی قوتوں کو بیدار کیا ہے اور ذہنی ٹھہراؤ کو اجتہاد کی لپک عطا کی ہے۔ پچاس سال قبل کی غزل میں تقسیم اور ہجرت کا المیہ اور آشوب؛

آویزش کی تصویر کشی جابجا موجود ہے۔ عصری غزل میں زندگی کی سفاک صداقتوں کا جائزہ لینا مقصود ہو تو برصغیر میں برپا ہونے والے قتل وخوں، فرقہ وارانہ فساد و شر پر تخلیق کردہ ہزاروں اشعار پر نظر ڈالی جائے اور ملکی زبوں حالی، مہاجروں پر تشدد اور صوبائی تعصبات کے باعث ہونے والے خون خرابے کی اذیت ناکی کو محسوس کرنا ہو تو گزشتہ چند برسوں میں لکھی جانے والی غزلوں کا مطالعہ کر لیا جائے۔ یہ بات خود واضح ہو جائے گی کہ عصری غزل ہمارے عہد کی زندگی کو پوری طرح بیان کرنے میں کامیاب ہے اور اس بیان میں تاثیر کی شدت، اظہار کے نئے سانچے اور شعری اعتدال کے بہترین نمونے بھی سامنے آئے ہیں۔

کلاسیکی غزل میں رچاؤ، نغمگی اور لطفِ بیان کا قضیہ ایک طویل بحث کا متقاضی ہے۔ غزل کی ساخت اور ہیئت مخصوص ہے۔ تکرار قافیہ سے پیدا ہونے والی جھنکار اور ردیف سے اٹھنے والی لطیف موسیقی غزل میں ایک نوع کا رچاؤ اور نغمگی خود پیدا کر دیتی ہے۔ یہ خوبی ہر عہد کی غزل میں موجود رہی ہے۔ لطفِ بیان بھی غزل کا خاص وصف رہا ہے جسے ہم انفرادی لب ولہجہ، اسلوب کی تازگی اور اظہار کے نئے سانچے وغیرہ کہتے ہیں۔ اس کو میں تخلیقی عمل کا اعجاز کہتا ہوں۔ قطب شاہ سے میر تک غزل نے دو سو سال کا طویل سفر طے کیا ہے۔ اس پورے عہد کی غزل کو کلاسیکی غزل کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے مگر غالب کو احسان دانش نے "جدت پسند شاعر" لکھا ہے لہٰذا غالب کے عہد سے موجودہ عہد تک کی غزل کو نئی غزل یا جدید غزل کہنا غلط نہیں ہوگا۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کلاسیکی غزل کا رچاؤ اور نغمگی دراصل تغزل تھا جسے طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ تغزل حقیقتاً رنگِ سخن اور اندازِ اظہار ہے، جو ہر شاعر کا اپنا اور دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے باوجود غزل کے ہر شعر یا شاعر کی ہر غزل میں وہ مخصوص قسم کا تغزل ہو یہ کبھی ضروری نہیں رہا۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے لفظوں میں "ضروری نہیں کہ غزل کا ہر شعر تغزل کی نمائندگی کرے۔" خود غالب نے مختلف اندازِ سخن اختیار کیا تھا۔ فکر و فن کی روش اور اسالیبِ بیان کی تبدیلی کے ساتھ روایتی تصورِ تغزل غیر محسوس طریقے سے خود رخصت ہو گیا۔ اب تغزل کی جگہ غزلیت نے لے لی ہے اور غزلیت کے لیے تربیت یافتہ جذبہ و شعور کے ساتھ ذہن و نظر کی بالیدگی، علمی و فنی بصیرت اور تخلیقی زبان و الفاظ پر خلاقانہ قدرت لازمی ہوتی ہے۔ آج کی غزل میں نو بہ نو موضوعات، عہد حاضر کے غالب رجحانات، عصریت کے فکری تناظرات اور انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کی عکاسی اس طرح ہوئی ہے کہ استعاروں، پیکروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج غزل خود اپنے عہد کی صورت گری کرنے لگی ہے لہٰذا فکر و اظہار کی ہر سطح پر نئی غزل کو کلاسیکی غزل پر فوقیت حاصل ہے۔

Hashmia Colony, Pugmil, Hazaribagh - 825301 (Bihar)



غزل۔ ایک بے مثال صنفِ سخن

سکینہ ساجد سہاں

ہر ایک صنفِ سخن خوب ہے مگر پنہاں   زمانے بھر میں غزل کی کوئی مثال نہیں

غزل پر گفتگو کا آغاز اس کی تعریف سے کرنا ایک گھسی پٹی روایت ہے مگر میرے اس مضمون میں اس کا مقصد محض تمہید باندھنا نہیں بلکہ یہ بذاتِ خود ایک اہم اور قابلِ توجہ مسئلہ ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ "عورتوں سے باتیں کرنا غزل کی تعریف ہے یا تضحیک؟ یہ سوچے بغیر آج بھی اکثر و بیشتر خاصے عالم و فاضل اور باشعور شعراء و نقاد جن میں غزل کے مخالفین کے علاوہ اس کے محبین و پرستار اور بڑے بڑے نامی گرامی غزل گو بھی شامل ہیں، غزل کی یہی گمراہ کن تعریف دہراتے رہتے ہیں۔ یہ تعریف نہ صرف یہ کہ موجودہ دور کی وسیع الموضوعات اور متنوع المزاج نیز خواتین کی غزلیات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے بلکہ قدیم غزل بھی اس تعریف کے دائرے سے باہر تھی۔ اردو شاعری کی شاندار عمارت کے تین بنیادی ستون میر، غالب اور درد مانے جاتے ہیں۔ ان میں سے غالب جیسے فکری شاعر کی بات کجا کہ احساس کی سطح کے شاعر میر کے یہاں بھی ساری کی ساری شاعری صرف ایسے موضوعات پر مشتمل نہیں جنہیں محض "عورتوں سے باتیں کرنا" کہا جا سکے۔ ان کے یہاں بھی ایسے بے شمار اشعار موجود ہیں جو اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً

بس یہ جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے   وہ بھی اک عمر میں ہوا معلوم
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت   اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اس کے بعد درد کی طرف آئیے۔ یہاں عشقیہ شاعری کے بھی تیور کچھ اور ہی ہیں۔ جسے عورت سے باتیں کرنا ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا اور صرف میر و درد پر ہی موقوف نہیں بلکہ مجموعی قدیم شاعری کا ایک بڑا حصہ تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے جس کے ذیل میں حیات و کائنات، فنا و بقا اور جزو کل جیسے بے شمار مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ اور ان تمام موضوعات کا بھی غزل کی مذکورہ بالا تعریف سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے باوجود اگر قدیم غزل کو عورتوں سے باتیں کرنا مان بھی لیا جائے تو موجودہ دور کی غزلیات جن میں ایک بڑا حصہ خواتین کی غزلوں کا بھی شامل ہے اسے عورتوں سے باتیں کرنا کیسے مانا جا سکتا ہے۔ اگر مذکورہ بالا تعریف کو سینے سے لگائے رکھنے کی کوئی مجبوری لاحق ہی ہے تو کم از کم اس میں اب اتنا اضافہ تو کرنا ہی پڑے

گا کہ ’’غزل عورتوں سے باتیں کرنے کا نام ہے اور مردوں سے باتیں کرنے کا نام بھی ہے۔‘‘ اس کے باوجود بات نہیں بنی بلکہ اور بگڑ گئی۔ ہاں اگر یہ تعریف یوں کی گئی ہوتی کہ ’’غزل محبوب سے باتیں کرنے کا نام ہے‘‘ تو آج خواتین کی شاعری کے پیش نظر اس میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا ہوتا۔ مگر یہ تعریف بھی غزل کی اتنی جامع تعریف نہیں ہوتی جتنی یہ صنف وسیع الامکانات ہے۔ عشق و محبت کے جذبات و احساسات کے اظہار کی فراوانی کے باوجود غزل کا دائرۂ کار بس یہیں تک محدود نہیں بلکہ اس کی رسائی لامحدود ہے۔ جس شاعر میں جتنا دم ہے وہ اتنے آگے کی منزلیں سر کر سکتا ہے۔

غزل کے مخالفین کے ذہنوں میں اس صنف کا جو فرسودہ سا تصور قائم ہے اس میں اچھا خاصا دخل اس غیر ذمہ دارانہ تعریف کا بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل کو جتنا نقصان اس کے مخالفین اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نہیں پہنچا سکے اس سے زیادہ نقصان اسے اس تعریف سے پہنچا ہے جو غزل کے بجائے ریختی جیسی کسی صنف کا تصور پیش کرتی ہے اور غزل کی اصل حقیقت، عظمت، وسعت اور حسن و وقار کو بری طرح مجروح کرتی رہی ہے۔

غزل کی عظمت یہ ہے کہ یہی وہ صنفِ سخن ہے جو سب سے زیادہ موثر و مہذب انداز میں ظاہری، بناوٹی اور مصلحت پسند انسان کے اندر موجود اصلی اور سادہ و معصوم انسان کو تلاش کر کے اسے باہر کی دنیا سے متعارف کراتی ہے۔ یاد رہے کہ صرف عورتوں سے نہیں۔ غزل کی سرگوشی کا دائرہ عورتوں تک یا خواتین کی غزلوں میں صرف مردوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے مخاطبین کا حلقہ اتنا ہی وسیع ہے جتنی وسیع یہ دنیا اور انسانی کائنات ہے۔ مثلاً شاعر کی خود اپنی ذات، محبوب، رقیب، دوست، دشمن، اپنے، بیگانے، ناصح، واعظ، ساقی، ناخدا، اہل دل، اہل اقتدار، سرمایہ دار، مفلس، مزدور، کسان، مظلوم، ظالم، قاتل بلکہ پوری دنیا اور سارا زمانہ، حتیٰ کہ غزل کا شاعر گاہے گاہے خدا سے بھی ہم کلامی کا شرف حاصل کرتا رہتا ہے۔ موسیٰ کی طرح صرف عاجزی و انکساری کے ساتھ ہی نہیں بلکہ جرأت رندانہ اور کمال بیباکی کا مظاہرہ بھی سرزد ہو جاتا ہے۔

غزل کے متعلق حمایتی اور مخالفتی دونوں طرح کے مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین بلکہ متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ میں یہاں اپنی اس مختصر سی تحریر میں ان تمام باتوں کو دہرانا نہیں چاہتی جو پہلے ہی بار بار دہرائی جا چکی ہیں۔ صرف چند اہم نکات کی طرف توجہ چاہوں گی۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ غزل گو شعراء نظم گوئی کے خلاف نہیں ہیں۔ وہ شعراء جو نظمیں نہیں لکھتے وہ بھی نظم نگاری کی مخالفت نہیں کرتے مگر ایسے نظم نگار شعراء جو غزلیں نہیں کہتے انہیں غزل سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ ایسے لوگوں نے اس صنف کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ بنا رکھا ہے۔ اور یہ رویہ ایک شدت پسند رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ اردو شاعری میں نظم کے رواج کے بعد ایسے ہی شدت پسند شعراء و نقاد نے غزل کو پیچھے دھکیل کر خود آگے نکل جانے کی شعوری یا لاشعوری کوشش میں الزام تراشی کو اپنا شعار بنا لیا اور غزل دشمنی پر اتر آئے۔ ایک زمانے میں اس قسم کی باتیں بہت اچھالی گئیں کہ غزل فارسی شاعری سے مستعار ہے، یہ اردو کی اصل شاعری نہیں۔ اس کے استعارے اور علامتیں سب مستعار ہیں۔ غزل کے مضامین اور موضوعات بھی بہت فرسودہ ہیں۔ اس میں کوئی نئی بات بیان کی ہی نہیں جا سکتی کیونکہ اس کے سارے نہ سہی مگر کچھ الفاظ یقیناً پہلے ہی سے مخصوص و متعین ہوتے ہیں یا کر لیے جاتے ہیں مثلاً ردیف اور قافیہ نیز بحور و اوزان اور مطلع و مقطع کی پابندی کی وجہ سے غزل ایک ایسا ڈھانچہ ہے جو بڑی شاعری کے لیے بہت چھوٹا اور نامناسب ہے۔ بنے بنائے سانچے میں زبردستی افکار و خیالات کو مار پیٹ کے ٹھونس دینے کا نام شاعری نہیں۔ اس لیے یہ سچی اور بڑی شاعری نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ صنف اپنی ممکنہ ارتقائی منزلیں میر و غالب کے یہاں طے کر چکی ہے۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ اقبال کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے اس کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا غزل سے مزید کچھ توقعات بے سود ہیں۔

ان الزامات کے پیش نظر اب اگر آج کی ترقی یافتہ غزل کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج کی اردو غزل کسی لحاظ سے بھی عربی و فارسی غزل سے مستعار نہیں رہی۔ یہ صنف اپنے سارے قرض اتار چکی ہے اور اب اپنے ذاتی رنگ و آہنگ اور مزاج و مذاق کی مالک ہے۔ اسی طرح قدیم غزل کے مستعار استعاروں اور علامتوں کے ذمہ دار اصل میں غزل کے وہ شعراء تھے جنہوں نے مستعار لفظیات سے اجتناب کو ضروری نہیں جانا۔ یا یوں تھا کہ وہی لفظیات خود ان کی اپنی لفظیات بھی تھیں اس لیے وہ ان کے لیے مستعار تھیں ہی نہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اکتساب و اجتناب کے یہ تمام مراحل فطری اور ضروری تھے۔ اس سے غزل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے بلکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوئی ہیں۔ اس میں استحکام پیدا ہوا ہے۔ روایتوں کی زمین پر قدم جمانے کے بعد ہی اس نے جدتوں کے آسمان کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ اور یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ بالکل اسی طرح قدیم غزل کے فرسودہ موضوعات کے ذمہ دار بھی ہمارے شعراء تھے۔ اس میں بھی اس صنف کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔ اور جدید غزل نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اس کے موضوعات کے تنوع کا مقابلہ شاید ہی کوئی اور صنف کر سکے۔ بلکہ تنوع اور انفرادیت کی مثالیں اتنی واضح ہیں کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔ میر، درد، غالب اور حسرت سب کے یہاں غزل اپنی اپنی انفرادی شان کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے سانچے یا ساخت کی مجبوری کے تحت سب نے ایک ہی جیسی شاعری پیش کی ہے۔ غزل اپنے شاعروں کو ان کے اپنے مزاج اور رجحان کے مطابق موضوعات اور لہجے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ اس کے باوجود یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ غزل اپنے متعینہ حدود و قیود کی وجہ سے خیالات کو بنیادی حیثیت اور اہمیت دینے کے بجائے اپنی ساخت کو برقرار رکھنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ اور یوں غزل کی شاعری میں افکار و جذبات و احساسات کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا غزل محض لفاظی ہے کیونکہ غزل کے الفاظ شاعر کے جذبات و احساسات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ اس کے افکار اس کے الفاظ کے غلام ہوتے ہیں۔ چنانچہ غزل کی شاعری سچی اور بڑی شاعری نہیں ہو سکتی۔ صرف یہی ایک الزام ایسا ہے جو غزل کے شاعروں کے سر نہیں ڈالا جا سکتا بلکہ غزل براہ راست اس کی ذمہ دار خود ہے لیکن یہی اعتراض سب سے زیادہ غلط اور گمراہ کن ہے کیونکہ مذکورہ بالا صورت حال صرف وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں غزل کو حقیقی شاعر میسر نہیں آتا ہے۔ یہ بھی

کہا جاتا ہے اور سچ بھی ہے کہ غزل تو سبھی کہہ لیتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عمدہ اور اعلیٰ غزلیں صرف بڑے اور سچے شعراء نے ہی تخلیق کی ہیں۔ طرحی مشاعروں میں پیش کی جانے والی چھوٹے اور بڑے شاعروں کی غزلوں کا فرق میرے اس خیال کی تائید کے لیے ایک اچھی مثال ہے۔ غزل بذاتِ خود جتنی بڑی صنف ہے اتنا بڑا شاعر اگر اسے مل جائے تو پھر غزل سے زیادہ معجزنما کوئی اور صنف نہیں۔ یہی تو وہ صنف ہے جس پر حقیقی معنوں میں ساحری اور پیغمبری کا دعوکا ہو سکتا ہے اور شاعر اپنی بادہ خواری کے باوجود خود کو ولی سمجھنے لگتا ہے۔

میں جانتی ہوں میری بات پوری طرح اب بھی واضح نہیں ہو سکی ہے۔ مگر وضاحت ناممکن نہیں اگر یہ مثال پیش کروں کہ سمندر سے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال پہلے سے بنا ہوا ہوتا ہے یا ڈور میں کانٹے اپنی مرضی کے ضرور باندھ لیے جاتے ہیں لیکن جب بھی جال یا ڈور سمندر سے باہر کھینچی جاتی ہے تو ایک ان دیکھا منظر نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ پہلے سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ جال میں کیا کیا آئے گا اور کانٹے میں کس رنگ و نسل کی مچھلی ہو گی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں نظم کی تمام تر آزادیِ اظہار کی سہولتوں کے باوجود اس تنگنائے غزل میں ہی شاعری کی ناؤ نظم کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بہت آگے نکل جاتی ہے۔

نظم ایک سوچے سمجھے اور محسوس کیے ہوئے جذبے یا خیال کو سوچ سمجھ کر بیان کرتی ہے جبکہ غزل انجانی دنیا کے ان دیکھے تحفے لاتی ہے۔ غزل کا شاعر جب اپنے منتخب قافیے اپنی ردیف کی ڈور میں باندھ کر اپنی ذات کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈالتا ہے یا اپنے پسندیدہ اوزان و بحور کا جال اپنے لاشعور کی وسعتوں میں پھینکتا ہے جہاں احساسات و جذبات و خیالات کی موجیں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی ہوتی ہیں تو اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ اس بار اسے کیا نعمتیں ملنے والی ہیں اور کیسے خزانے ہاتھ لگنے والے ہیں۔ وہ جو کچھ پاتا ہے اس پر خود بھی حیران رہ جاتا ہے اور اپنے عجز و انکسار کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا، بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یہی غیب سے آئے ہوئے مضامین شاعری کی دیوی اپنے سچے پجاری کو بطور انعام عطا کرتی ہے۔ لہٰذا میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ غزل کا موضوع چاہے حسن و عشق ہو، تصوف ہو، فطرت ہو، شکوۂ غم روزگار ہو، کربِ ذات ہو یا فلسفۂ حیات و کائنات یا مسئلۂ فنا و بقا، کچھ بھی ہو مجموعی اور بنیادی طور پر غزل سوز و انبساطِ قلب و روح کی وہ خود کلامی و سرگوشی ہے جو قلعۂ ذات کی تلخیوں میں ضمیر کائنات کے ان دیکھے خوابوں کا رس اتنی شائستگی، سلیقے اور ایمائیت کی وضعداری کے ساتھ گھولتی رہتی ہے کہ زندگی خود اپنی تشنگی کے سرور سے شرابِ سیرابی کشید کرتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔

آخری بات یہ کہ غزل کے امکانات نہ کبھی کسی میر و غالب پر ختم ہوئے تھے اور نہ کبھی کسی میر و غالب پر ختم ہوں گے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ جس طرح انسان، زندگی، فطرت اور کائنات کی پراسراریت لامحدود ہے اسی طرح غزل کے اظہار کے آفاق کی پہنائیاں بیکراں ہیں۔ غزل کے جس شاعر میں جتنا دم ہو گا وہ اتنی ہی اعلیٰ منزلیں سر کرے گا۔ باقی اس کے بعد آنے والوں کی ذمہ داری ہو گی۔

اور اب صرف ایک سوال باقی ہے کہ غزل جتنی بڑی صنف ہے کیا اتنا بڑا شاعر اسے عربی، فارسی اور اردو میں اب تک میسر آ چکا ہے۔ یا آنے والے زمانوں میں پیدا ہو گا؟ غزل کی وسعتِ پنہاں کا ان کو علم نہ تھا بقدرِ ظرف نہیں تھی یہ تنگنائے جنہیں

● 1752 - Alpiwe Dr. Carrollton, TX 75001 (USA)

بقیہ صفحہ ۳۳ : اردو میں معیاری ناول کا مسئلہ

اس میں پوشیدہ زندگی کی بصیرت کو سمجھ کر اس سے ذہنی یا عملی استفادہ کرنے کا اسے موقع ملنا چاہیے کہیں کہیں اس کی غیر پروپیگنڈیائی انداز سے بھی فکری رہنمائی ہونا چاہیے۔ ناول بہت بڑی صنف ادب ہے اس کو اپنا فریضہ انجام دیتے رہنا چاہیے۔

آج کے دور تک آتے آتے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نوجوان بھی ناول نگاری کی جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ہمارے مشہور و معروف ناول نگاروں کے ناولوں کی سطح سے ناول نہ لکھے ہوں لیکن ان کی جانب ناقدانہ ہمدردی کی نگاہ ڈالنا ضروری ہے اس سلسلے میں احمد داؤد کے ناول "رہائی" اظہر نیاز کے "دورخی" اور انور سن رائے کے مختصر ناول "چیخ" کی مثالیں ضروری ہیں۔

کچھ ناول نگاروں کے ناولوں کی پبلسٹی نہیں ہو پاتی۔ اس کا علم ایک طویل عرصے بعد ہوتا ہے۔ سلمیٰ اعوان، انور غالب، طارق محمود، سیاسی و انقلابی رہنما طارق علی اور چند اور ناول نگار بھی اس میدان میں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناول کو نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان سے بھی ناولوں سے متعلق خبریں آتی رہتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان ایک سو تیس سالوں میں کئی موڑ آئے، کئی نئے تجربے ہوئے، ہیئت شکست و ریخت کی زد میں آئی، نئے نئے اسالیب نے جنم لیا اور خاصے رجحانات کا احاطہ ہوا، جیسے تاریخی رجحان، اسلامی تاریخی رجحان، تاریخی و سیاسی رجحان، تہذیبی و معاشرتی رجحان، خود سوانحی رجحان، مزاحیہ رجحان، دستاویزی رجحان، ناسٹلجیائی رجحان، نفسیاتی رجحان وغیرہ۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ اردو میں معیاری یا اچھے ناول نہیں لکھے جا رہے ہیں ایک زیادتی ہے اور یہ کہنا کہ محض "امراؤ جان ادا" "آگ کا دریا" اور "آنگن" یا ایک دو اور ناول قابل ذکر ہیں۔ اردو ناول کی صنف کے ساتھ ناانصافی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں زیادہ تر وہ نقاد کر رہے ہیں جنہوں نے تمام رجحانات سے متعلق ناولوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر شاعری کی تنقید کی طرف ملتفت ہیں یا مغرب کے ناول ہی کو بہتر اور بڑا ناول تصور کر کے اپنی متعصبانہ رائے کو پیش کرتے ہیں۔ اس گمبھیر صورت حال میں ناول کے لیے کلمۂ حق کہنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ آیئے اردو ناول کو شروع سے آخیر تک ذرا ڈھنگ سے یا یہ کہ باضابطہ طریقے سے پڑھیں تاکہ زیر بحث مسئلے پر تعصبات سے آزاد رائے سامنے آ سکے۔

ایک منظوم خط

افتخار امام صدیقی کے نام

[صنفِ غزل کے حق میں ان کے اداریوں اور غزل اکادمی
کی تجویز کے جواب میں]

ستیہ پال آنند

بہت سے رت جگے جھیلے
بہت آہ و بکا میں وقت گذرا
غم پرستی کے سیہ حجرے میں پہروں بیٹھ کر روئے
صنم پوجے ملال و حزن کے ان بت کدوں کے، جو
سخن کے بت تراشوں، آذروں نے
مدتوں پہلے
عرب میں یا عجم میں
اپنے وقتوں کے تعلق سے تراشے تھے

بہت غزلیں کہیں
شعروں میں حسن و عشق کے پیکر تراشے
صنعتیں ایجاد کر کے
مرد محبوبوں سے ہم نے
استعاروں کی زباں میں بات کرنے کا ہنر سیکھا
مجازی عشق سے عشقِ حقیقی تک پہنچنے کے
عسیر الفہم ژولیدہ عقیدوں میں الجھ کر راستہ بھولے
خیال و خواب میں مفہوم کھو کر خود سے باتیں کیں
جنوں میں بک گئے لیکن ولی ہونے کی
خود ہی پیش گوئی کی
بزرگوں کے وہ گُر از بر کیے
جو شعر کہنے میں معاون تھے
بہت کچھ کر لیا۔ دیوان چھاپے۔ محفلوں میں داد حاصل کی!

مگر آخر کیا کیا؟
کون سی سچائیوں کے نخل کی یہ آبیاری تھی؟

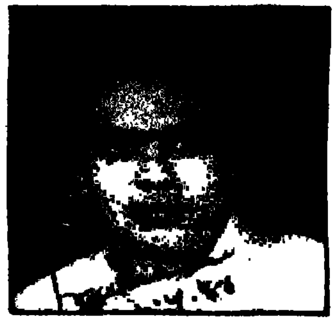
یہ کیسی شاعری تھی؟ انفعالیت، شکستِ ذات
خود ترسی کی قدریں تھیں
جنہیں معصوم ذہنوں میں سمویا تھا
سمجھ کر جوہرِ فن، حسنِ روحِ شاعری ہم نے!
کبھی اس حزن کے حجرے سے نکلیں تو!
کبھی تازہ ہوا میں سانس لینے کو تو راضی ہوں!
کبھی سوچیں کہ ہم نے کیا دیا ہے
آنے والی نسل کو اب تک وراثت میں؟

کوئی ایسا صحیفہ جس میں پورے دور کی تاریخ لکھی ہو
صحیفہ جو تدبر کی علامت ہو، تعقل سے عبارت ہو
صحیفہ جس میں مخفی ہو کسی گذرے ہوئے کل کی کہانی
عصرِ حاضر کے تناظر میں؟
صحیفہ، فلسفے کا، عشق کا، رازِ طریقت کا
صحیفہ، صاف پانی کا وہ چشمہ
عکس جس میں جھلملاتا ہو سبھی روشن مناروں کا
شبیہیں قوم کے معمار فنکاروں کی
جو ہر دور کی تاریخ سازی میں معاون تھے؟

مگر ہم نے تو بس غزلیں کہیں۔ اور یہ نہ سوچا
کہ اس "خود مست صنفِ شعر" سے آگے بہت کچھ ہے!

ہمیں کچھ سوچنا ہوگا
بہت سی اور راتیں جاگ کر اب کاٹنا ہوں گی
غزل کے اندھے کنوئیں سے اگر باہر نہ نکلے تو
ہماری آنے والی نسل کو کیسے خبر ہوگی

367 - Burnett Ave Cambridge, ONT NIT IG6 Canada



لطف الرحمٰن

اپنی روانیوں میں مرے سر سے کم نہیں
باہر لہو لہو مرے اندر سے کم نہیں

صحرا بچھا ہوا ہے نگاہوں میں دور تک
دل بے کرانیوں میں سمندر سے کم نہیں

اس کی نگاہ تول رہی ہے دلوں کے دکھ
مقتل کا رنگ اب کے سوئمبر سے کم نہیں

کس دشت بے نوا میں رہی فصل گل مقیم
لہجہ کسی گلاب کا پتھر سے کم نہیں

لیکن وطن کی بات ہے پھر بھی وطن کی بات
گرچہ دیار غیر مجھے گھر سے کم نہیں

وہ چپ، وہ خوف جاں کی اداسی ہے شہر میں
اک مجھ سا بے ادب بھی پیمبر سے کم نہیں

بیٹھا ہے کوئی اب بھی ببولوں کی چھاؤں میں
وعدہ کسی کا، وعدۂ محشر سے کم نہیں

● Tatarpur, Bhagalpur - 312012
(Bihar)



محمد اظہار الحق

وصال و ہجر کے سب مرحلے ناگفتنی ہیں
فقط عشاق کے جسموں کے پنجر دیدنی ہیں

سفر انہونیوں کا ہے ہمارے ساتھ مت آ
ہمیں جانے دے ہم تو یوں بھی قسمت کے دھنی ہیں

اپاہج کھیتیاں ہیں جن پہ خوشے ہیں نہ پتے
زمیں! اس بار تو نے بیٹیاں کیسی جنی ہیں

غدر کے بعد کی بستی ہے جس میں آئے ہو تم
یہاں مالک سبھی قلاش اور بندے غنی ہیں

سنہری طشت میں سر اور سر پر تاج زریں
منقش چھت ہے دیواروں پہ تعزیریں بنی ہیں

● 78 - C - 2, Gali - 8,
I - 8/1, Islamabad (Pak)



مصحف اقبال توصیفی

اشک پلکوں کے کنارے تیرے
آسماں، چاند، ستارے تیرے

چار سو میں نے بچھادیں آنکھیں
ہر طرف تو تھی نظارے تیرے

کیسی دیوار تھی خاموشی کی
کچھ تو تھا بیچ ہمارے تیرے

کیا ہوا تیرا پندار انا
کیا ہوئے سارے غبارے تیرے

دیر سے آئی ذرا۔ وصل کی شب
سوگئے ہجر کے مارے تیرے

رات دیتی رہی در پر دستک
منتظر صبح تھی دوارے تیرے

● Flat No. 204, Moghal Mast
Apts 12 - 2 - 822 / A / 2,Mehdi
Patnam Hyderabad - 28 (A.P.)



مرزا حامد بیگ
197 - Mehran Block, Allama Iqbal Town,
Lahore (Pakistan)

لاکرز میں بند آوازیں

رات کا پہلا پہر تھا جب وہ دونوں ہانپتے کانپتے ہوئے اس غیر آباد کنویں تک پہنچے تھے۔ اُن دونوں نے اہم سرکاری دستاویزات کے بھاری پلندے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھے تھے۔ ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے لیے محض اس لیے اجنبی نہ تھے کہ ہر دو نے اہم دستاویزات سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کی خاطر اس غیر آباد علاقے میں ایک ہی اُجاڑ کنوئیں کا انتخاب کیا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں تفصیلات میں جانے کا وقت ہی کہاں تھا، جان کے لالے پڑے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں بیک وقت وہاں پہنچے تھے اور ایک دوسرے سے تعارف کے لیے یہ بہت تھا۔

دونوں نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے کنوئیں کی منڈیر پر جھکے اور اپنے اپنے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔

اب وہ اس کھلے میں، کنوئیں کی نیم پختہ منڈیر پر پھسکڑا مار کر بیٹھ رہے تھے۔ اُن دونوں کے تھری پیس سوٹ کچی مٹی کی بوباس جذب کر رہے تھے اور دونوں میں سے ہر یک کی گردن پر کسی ہوئی ٹکٹائی کی گرہ ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

وہ دیر تک یوں ہی ساکت رہے اور پھر ان دونوں میں سے کسی ایک نے اپنے سینے میں گہرا سانس بھرا اور آپ ہی آپ بڑبڑایا:

"غضب خدا کا، دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔"

"لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔" دوسرے نے قدرے متوحش نگاہوں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے جواب میں کہا۔

"ہاں کبھی نہیں۔"

چہرے مہرے کی خشونت اور شدید گھبراہٹ کا احساس دونوں میں مشترک تھا۔

"کچھ زمانہ ہی ایسا آگیا کہ اعتبار اٹھ گیا۔ پکے اعلام پر لکھت پڑھت اپنے معنی گم کر بیٹھی۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔ ایسے میں زبانی کہے سنے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ بہت روکا، بہت سمجھایا لیکن نہیں صاحب۔ ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آتا تھا۔ ایسے میں کوئی کیا کرے۔"

"بہت بچ بچا کر یہ ریکارڈ یہاں تک لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا۔ کیا خیال ہے اب تک کاغذات کی روشنائی پانی میں ایک نہیں ہو گئی ہو گی؟"

"کب کی۔ لیکن شک سا پڑتا ہے۔ یہ کنواں کہیں خشک ہی نہ ہو۔"

یہ سن کر دوسرا اسناٹے میں آگیا اور بعد تامل کے بولا:

"کیا آپ نے اس سے پہلے دن کی روشنی میں اطمینان نہیں کر لیا تھا؟"

"اتنا وقت کس کے پاس تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ سب یکایک ہی ہوا ہے۔"

"ہاں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے۔"

اب دونوں کو چپ سی لگ گئی۔ دیر تک گم سم بیٹھے رہے، پھر ایک نے کچھ یوں استفسار کیا:

"آپ کے اس بھاری بوجھ کی آواز نہیں آئی کنوئیں میں گرنے پر۔ سنی تھی آپ نے؟"

"نہیں، میں نے دھیان نہیں دیا۔ آپ کہیے۔ جب میں کنوئیں پر جھکا تھا تو آپ نے کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز سنی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دراصل ہم بہت جلدی میں تھے۔"

اُدھر وہ دونوں سخت تشویش کے عالم میں اجاڑ کنویں کی مینڈ پر جھکے ہوئے ہیں اور اِدھر گاؤں کے چوپالوں اور گلیاروں، شہر کے گلی محلوں اور دکانوں کے تھڑوں پر گئے وقتوں کے لوگ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں تھامی ہوئی عرضداشتوں کے پلندے لہراتے ہیں۔

بحث مباحثہ طول پکڑ گیا ہے۔ گئے وقتوں اور نئی سرکش نسل کے درمیان افہام و تفہیم کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ عقل

(بقیہ صفحہ [illegible])

کشمیری لال ذاکر

اپنی تقدیر سے کچھ دیر خفا ہو جاؤں
سوچتا ہوں کہ میں تجھ سے بھی جدا ہو جاؤں

ایک لمحے میں بکھر جاؤں، میں خوشبو بن کر
جذب ہو جاؤں ہواؤں میں ، فنا ہو جاؤں

اس بھری دنیا میں ، سو ڈھب کے خدا دیکھے ہیں
سوچتا ہوں کہ میں خود اپنا خدا ہو جاؤں

میرے معصوم سے کردار ، بڑے اچھے ہیں
ان کو چاہوں تو کبھی ان سے خفا ہو جاؤں

مجھ کو تاریخ میں ڈھونڈیں، یہ مورخ صدیوں
کاش میں رنگ حنا ، رسمِ وفا ہو جاؤں

● 367, Sector - 44 A, Chandigarh



اسرار اکبر آبادی

جو اچھا تھا زمانہ ، اب نہیں اچھا
مگر دل ہار جانا ، اب نہیں اچھا

مرے صحرا میں بھی کھلنے لگے ہیں گل
سمندر پار جانا اب نہیں اچھا

سحر کی زعفرانی کیاریاں مہکیں
چراغِ غم جلانا اب نہیں اچھا

تری تعریف ہے مہماں نوازی کی
مگر مہمان خانہ اب نہیں اچھا

زر و آہن کی ہے آلودگی ہر سو
کہیں کا آب و دانہ اب نہیں اچھا

● E 3 - 600, Ashok Park,
Shaheed Nagar, Agra - 282001
(U.P.)



رفعت صدیقی

تھے خوش کہ دریا کے دھارے پلٹتے جاتے ہیں
خبر نہ تھی کہ کنارے بھی کٹتے جاتے ہیں

ملا نہ غور سے پڑھنے کا وقت ہم تو ف
کتابِ زیست کے صفحے الٹتے جاتے ہیں

عمارتیں نئی اونچائیوں کو چھوتی ہیں
مگر مکینوں کے قد ہیں کہ گھٹتے جاتے ہیں

تلاش میں ہیں پرندے، کہاں چھپائیں
شجر قریب میں جتنے ہیں کٹتے جاتے ہیں

ترقیوں نے گھٹائے ہیں فاصلے کیا
مگر یہ لوگ کہ خانوں میں بٹتے جاتے ہیں

● 1st Fl. B- Block, Premier
Enclave, Humayun Nagar,
Hyderabad - 28 (A.P.)



عبید قمر
Mhd Pur, Shah Ganj, Patna (Bihar)

کلینڈر

جی ہاں میں دکان میں ہی سوتا ہوں رات کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے اور میری نیند اُچٹ گئی تھی۔ سچ پوچھئے تو میں سویا ہی کہاں تھا۔ نہیں نہیں، میں جاگ بھی تو نہیں رہا تھا۔

نئے سال کی آمد کا ہوا سر پر سوار تھا اور انسانی زندگی کی بے بضاعتی کا احساس حواس پر مسلط! دیر رات تک نیم خوابیدہ ذہن میں عجیب ہولناک سی اودھم مچی ہوئی تھی۔ پھر یکایک ہنگامہ ہاؤ ہو کے ساتھ دھم دھم، تڑاخ تڑاخ، ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں مجھے اپنے نرغے میں لے چکی تھیں۔ بم پھٹ رہے تھے۔ فضا میں گولیاں داغی جا رہی تھیں۔ اور آتش بازی کی چنگاریاں ہوا میں تیر رہی تھیں۔ میں جیسے ڈراؤنے خواب سے سہا اٹھ کھڑا ہوا۔ دوکان کے پٹ کھولتے ہی طرح طرح کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

گم ہوتی ہوئی مدھم سی آواز ۔۔۔ "دینا ناتھ جی ۔ کوئی ایسی ٹیبلٹ دیجئے کہ میں کھڑا کھڑا ہی سو جاؤں۔"

پھر بالکل ساتھ ساتھ چلتی ہوئی آواز ۔۔ "اجی دینا بھیا! آپ کے پاس کوئی ایسا کیپسول ہے جسے کھا کر رات کے آسیب کا خوف جاتا رہے؟"

اور پھر آگے کی طرف دھکے دیتی ہوئی آواز۔ "دینا ڈارلنگ! کیا میں زندہ ہوں؟ اُف تمہارے پاس کوئی ایسی میڈیسن ہے جسے کھا کر مجھے احساس ہو کہ میں واقعی زندہ ہوں۔"

ان ہمزادوں کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی کینچلی بدن سے الگ کر دی ہو۔ میرا چہرہ فق تھا اور منہ کا مزہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں تیزی سے مٹھائی کی بند دوکان کی طرف بڑھا اور پردیپ کو آوازیں دینے لگا۔

"پردیپ دکان کھولو۔ دکان کھولو پردیپ۔ !دیکھو اتنے سارے لوگ کھڑے ہیں۔ سبھوں کو مٹھائیاں کھلاؤ۔ ہاں ہاں! میری طرف سے انہیں مٹھائیاں۔۔۔"

مجھے جیسے الہام ہوا تھا کہ ان سبھوں کے منہ کا مزہ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ فوری طور پر انہیں بھی شیرنی کی ضرورت تھی۔ لیکن پردیپ کواڑ کھولتے ہی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔

"بھیا! مٹھائی تو کب کی ختم ہو چکی۔"

وہ سب جو تاریکی میں مجھے امید کا موہوم نقطہ سمجھ کر نظروں سے جکڑے ہوئے تھے کہ جانے میں انہیں کون سی مٹھائی کھلاؤں گا جو ان کے رگ و پے میں مٹھاس بھر دے گی۔ چند لمحوں کے لیے خوشی کے پلڑے پر کھڑے جھول رہے تھے۔ نفی میں جواب سنتے ہی وہ بے کل ہو اٹھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کی جھلاہٹ چیخ و پکار کا روپ دھار لے۔ میں نے ایک زوردار قہقہہ بلند کرتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔ "ہمزادو! کیا ہم نئے سال کا خیر مقدم نہیں کریں گے؟" پھر میرے قدم کلینڈر کی دکان کی جانب اٹھنے لگے۔ مختلف آوازیں میرا پیچھا کرنے لگیں۔

"ہاہاہا۔ نیا سال کیا نیا سورج لے کر آئے گا دینا جی!"

"کم و بیش بیس سالوں سے میں دیکھ رہا ہوں بھیا کہ ہر نیا سال رات کے آسیب کو دن پر بھی مسلط کرنے کے درپے ہے۔"

"پیارے دینا جی! عالم سکرات میں بھلا دن اور رات کی تمیز کہاں ممکن؟ کہ نیا سال۔۔۔۔"

ان آوازوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے میں ڈومن کو اٹھانے لگا جو دکان کے باہر برآمدے میں سویا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے دینا بھیا۔؟"

"ارے یار نیا سال شروع ہو گیا اور میں کلینڈر لینا بھول گیا تھا۔"

ڈومن نے بیٹھے ہی بیٹھے ہانک لگائی۔ "ارے او شیام جی، ایک عمدہ کلینڈر لیتے آؤ دینا بھیا کے لیے۔" آوازیں سن کر بغل کے مکان کا دروازہ کھلا اور میاں آفتاب نکل آئے۔ "نیا سال مبارک ہو بھیا!"

"ارے بابو، تم بھی ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"امتحان ہے نا دینا بھیا!"

"ہاں پیارے، یہ دنیا بھی تو امتحان ہال ہی ہے نا۔ ذرا چوک ہوئی اور بیڑہ



رؤف خلش

انحرافی

لذتوں کے لاؤلشکر
مال وزر سے لیس ہو کر
"بے خداتہذیب" کی اس "باخدا" بستی میں
جب بھی کرّوفر سے گھومتے ہیں
زلزلے آتے ہیں کتنے
نفس کی پھر سے اساطیری غلامی جاگتی ہے
لوٹ آتا ہے زباں پر
پھر سے ممنوعہ شجر کا ذائقہ

اور ایسے میں
وہ جدو جہد والے انحرافی
خوف کی نیلی عبائیں اوڑھ کر
تاویل کے حجروں میں چھپ جاتے ہیں
شب خوں مارنے کی کوششوں میں
قید ہیں "شب خیزیوں" کے درمیاں
اجتہادی بن نہیں پاتے ! OO

• 16 - 8 - 544, New Malakpet,
Hyderabad - 500024

زندگی تجھ سے ہم ہار بیٹھے

دھول کے، خوشبوؤں کے، دھوئیں کے
اس قدر ہم تو عادی نہ تھے
لمبی سڑکوں نے
ملنے والوں نے
تیز رفتار کاروں نے
کردیا ان رویوں کا عادی
چڑچڑاہٹ، الرجی
ایک ہی بات ہے
صبح سے شام تک
ہم بھی اوروں کے ہمراہ
مصروف ہیں
ایسی اک دوڑ میں
جس کا انجام
کوئی نہیں جانتا
بھاگ جانے کا بھی اب تو یارا نہیں
زندگی تجھ سے ہم ہار بیٹھے ! OO

ابھی تک چھپتا چھپتا پھر رہا ہوں

کتب خانے میں میرے شیلف سے
کتنی کتابیں جھانکتی ہیں
اس کی، قانون کی، شعر وادب کی
مری دانش وری سب میں
ابھی تک مستند ہے
مرا دل موم جیسا ہے
کبھی خوں ریزیوں پر
خوں کے آنسو رونے لگتا ہے
عطا مجھ کو ہوا
ادراک بھی، احساس بھی
مگر میں کیا کروں؟
ہابیل کی میت اٹھائے
ہزاروں سال سے یونہی
شریف آبادیوں میں
ابھی تک چھپتا چھپتا پھر رہا ہوں ! OO

خروج

عجب تماشہ ہوا کہ
آسودگی نے اپنے ہی گرد جالا سا بن لیا
زندگی سے رونق فنا ہوئی
لعنتوں کی پرچھائیوں میں گھر کر
ہر ایک نعمت ہوا ہوئی!
کاش اس قدر تو نہ لوٹ مچتی
تمہارے اندر نہ یہ تعیش کا عیب ہوتا
ہوس کی آندھی کو تاڑ لیتے
جو تم کو بھی علم غیب ہوتا
نہ خواب بنتے نہ ذائقوں کو عروج ہوتا
طلسم کے دلربا جزیروں سے
یوں تمہارا "خروج" ہوتا
سنا ہے، اب تو
تمہیں بھی سچ کی تلاش ہے OO

اقامہ[1]

سطوتوں میں خدا کی زمیں کتنی محصور ہے
"حکم نامہ" ہماری رہائش کا دستور ہے
گونگی للچاہٹوں کو زباں دے کے
اندھا وسیلہ بنا ہے
ہاتھ میں آگئے ہیں
چند چمکیلی آسائشوں کے دیئے،
دیکھنا ____
نور کی وادیاں جب کسی دن
الٹ دیں بساط
روشنی منعکس ہو کے
ٹوٹے ہوئے آئینوں پر پڑے گی
اور "تجدید" کے غم میں گھلنے لگیں گے
آخری سانس لیتے امیدوں کے بجھتے گہر
واپسی کے لئے صرف ہوگا "جوازِ سفر" (

1۔ عربی میں پاسپورٹ کو کہتے ہیں



نظام صدیقی
527 - Daira Shah Mohibulla, Bahadur Ganj,
Allahabad - 211003 (U.P.)

آگرہ اسکول کا ایک تخلیقیت افروز سخنور
نازش پرتاپ گڑھی
نیو کلیائی فوق عملی تنقید

عالمی اور قومی ادب کے منظر نامہ میں ایک انچ کا اضافہ صدیوں میں ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے اصول حقیقت (Reality Principle) اور اصول خواب (Dream Principle) سے جڑے بغیر حقیقی تخلیقیت، عصریت، معنویت اور قنیت سے عاری بے معنی اور بے مقصد تقلیدی اور تحکیمی تحریروں کا پہاڑ کھڑا کر دینا تو آسان ہے۔ لیکن رائی بھر تخلیقیت افروز شعر و ادب کی تخلیق نہیں۔ تخلیقیت روح ادب ہے۔ تخلیقیت کُل ہے۔ تخلیقیت حرف اول اور حرف آخر ہے۔ تخلیقیت حیرت تمام اور رحمتِ تمام ہے۔

Creativity is the Holy spirit of literature, creativity is Alpha and omega. Creativity is a wondrous whole and gracious whole. (Subjective and objective creativity in post modern literature By Nizam Siddiqui.)

ہر تحریر تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ محض ترتیب، تقلید، تحکیم (Dictation) اور تکسیر (Minaturisation) کا منشور ہو سکتی ہے۔(۱) تقلیدی فن (۲) تحکیمی فن اور تخلیقی فن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حقیقی تخلیق کی تہذیب اور محض تقلید کی کسری تہذیب میں قطبینی تفاوت ہے۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے استعاراتی اور علامتی "فلک الافلاک" (افتخار جالب) پر فائز ہو۔ اردو ادب میں "جدلیاتی الفاظ" اور "جنگلاتی الفاظ" (شمس الرحمٰن فاروقی) کے آسمان محراب کی طرف منہ اٹھا کر بات کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ انسانی شعور و احساس کے ساتویں آسمان کے عرفان کے بغیر اس تک رسائی ناممکن ہے اور یہ جمالیاتی اور فکریاتی رسائی بیک وقت اپنی ذات، اپنے سماج، اپنی تہذیب اور اپنی پوری دنیا کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے یکسر نئے تناظر کے تصور وقت کی مکمل آگاہی سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کی بغاوت آفریں نئی تخیلی اور فنی تقلیب تو بعد میں ہوئی ہے۔ ہر دور میں سیاق نیا ہوتا ہے اور وہی اضافی حقیقی نئی تخلیقیت، عصریت، معنویت اور قنیت عطا کرتا ہے جو بھی شاعر، ادیب، دانشور اور ناقد نئے تناظر کو اس کی تمام داخلی اور خارجی سطحوں پر پہچاننے کو آمادہ ہوتا ہے۔ وہ خود بخود نئی تخلیقی اور عصری نامیات سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور اس کی شعری تخلیقات، ادبی تفکرات اور دانشورانہ تنقیدات سے "نئے عہد کی تخلیقیت" گویا ہوتی ہے۔ نئی فکریات، نئے مفاہیم، نئے کوائف اور نئے معانی طلوع ہوتے ہیں جو از سر نو حرکی جمالیات، نئی معنویات، نئی اخلاقیات اور نئی تعبیرات کی تخلیق، تشکیل اور تعمیر کرتے ہیں۔

روایتی ترقی پسند اور روایتی جدیدیت پسند ادب کے حاشیہ پر شعری عباقرہ علامہ سیماب اکبر آبادی کے آگرہ اسکول کی زندہ، نامیاتی اور متحرک شعری روایت کے علمبر دار جناب نازش پرتاپ گڈھی زندگی بھر اپنے دوش پر اپنی صلیب اٹھائے بڑے جتن، بڑی نوک پلک، بڑی روح گداز کسک، بڑے خوشگوار تیکھے پن اور البیلے بانکپن کے ساتھ لفظ کی حرمت، تقدیس اور متاع قلم کی عظمت کو بچائے ہوئے زندگی بھر اپنے تخلیقی فکر و فن کی عبادت، ریاضت اور سادھنا میں حسب توفیق مستغرق رہے۔ ان کی منتخب "زندگی سے زندگی کی طرف" مائل تخلیقیت افروز شاعری میں اکثر لفظ تخلیقی معنوں میں کلمہ بنتے ہیں۔ ان کے خونِ جگر سے اس کو ابدیت نصیب ہوتی ہے۔ اس تخلیقی کلمہ کے معانی اور مفاہیم کی کائنات لامحدود اور بیکراں ہوتی ہے۔ جناب نازش پرتاپ گڈھی کا نظمیہ حسن پارہ "لفظوں کا المیہ" خاطر نشیں ہو۔

لفظ تو آج بھی انسان کی طرف تکتا ہے
لفظ کانٹا ہی نہیں، پھول بھی بن سکتا ہے
لفظ ٹپکائے گا امرت، لب گوتم تو ہے
رقص فرما ہو، مگر کوئی کنھیا تو ملے
منتظر ہے کسی چشتی، کسی نانک کے لیے
لفظ ہو جائے گا زندہ، کوئی عیسیٰ تو اُٹھے
کوئی بنسی میں سمولے تو یہ نغمہ ہو جائے
لفظ کو کرشن جو مل جائے تو گیتا ہو جائے
پوجا بے سود، جو خالی ہو شوالہ دل کا
لفظ میں نور سموتا ہے، اجالا دل کا

لفظ میں نور سمودو تو ستارہ بن جائے　　دل جو رکھ دو تو لبِ ناز کا بوسہ بن جائے
لفظ کہتا ہے پھر ایک بار اچھالو مجھ کو　　میں حقیقت ہوں تباہی سے بچالو مجھ کو
میں صداقت ہوں نگاہوں میں اٹھالو مجھ کو
میں محبت ہوں کلیجہ سے لگالو مجھ کو

یہ نظمیہ صداقت پارہ لفظ کی بے حرمتی کی بیسوائی تہذیب کے خلاف ایک شدید احتجاج، انحراف، اجتہاد اور فکریاتی اور جمالیاتی شعری انفراد کا تخلیقیت افروز اور معنویت خیز رجزیہ مکاشفہ ہے جو ان کی روشن ضمیری اور روشن فکری سے منور ہے۔ تخلیقی فکرو فن میں اپنے طور پر ہمیشہ زندہ، تابندہ اور پائندہ رہنے کی نامیاتی خوبی ہوتی ہے۔ اس سے ہر نئے عہد میں نیا تعبیراتی مکالمہ استوار ہوتا ہے جس سے نئی معنویات پاشی ہوتی ہے۔ یہ شعری اور فکری نامیاتی سیرت (خوبی) ہمیشہ مردہ روایت سے گریزاں اور زندہ روایت سے مربوط ہوتی ہے اور اپنے نئے عہد کے تناظر میں نت نئی تخلیقیت افروزی کی اہل ہوتی ہے۔ وہ بیک وقت تخلیقیت افروز فن کار کی لسانی، اسلوبی اور ساختی لیاقت (Competence) اور انفرادی فکریاتی اور شعریاتی کارکردگی (Performance) کا جمالیاتی مظہر ہوتی ہے۔ محولا بالا نازش کے نظمیہ صداقت پارہ کی قرآتی کارکردگی کے بعد اس کے الفاظ کی تخلیقیت، معنویت، عصریت اور فنیت کبھی بھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ ان کا وجود نازش کے مافی الضمیر کے تخلیقی ابلاغ کے باوصف ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ (یہاں لفظ محض رابطہ یا وسیلہ نہیں ہے۔ اس لئے بار بار ہم اس کے پاس واپس لوٹتے ہیں۔ یہ قرآتی بازگردش (Regression) نت نئی معنی آفرینی کی حامل ہوتی ہے) کیونکہ الفاظ کے درمیان نظم نے اپنی "صداقت" پائی ہے تو اسی صداقت نے پہلی بار نظم کے لفظوں کو "کلام" ہونے کی عظمت، حسن اور تقدس سے منور کیا ہے۔ نیا عہد نامہ، یوحنا کی انجیل، میں اس ضمن میں کتنے بلیغ رمز کا انکشاف کیا گیا ہے۔

"ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔"

ذمادم "کن اور فیکن" کی تخلیقیت کا جشن جاریہ تو آج بھی قائم اور دائم ہے۔ وجود (Being) اور موجود (Becoming) کا آفاقی رقص تخلیق ہر لمحہ جاری ہے۔ تشکیل، رد تشکیل اور باز تشکیل کا تخلیقی اور معنوی عمل ہر لحظہ جواں، ہر لحظہ جرأت آزما، ہر لحظہ تازہ کار ہر لحظہ نادرہ کار اور تغیر آشنا ہے۔ حقیقی تخلیقیت اور معنویت کسی ایک مقام پر ساکت و صامت نہیں ہوتی۔ وہ ہر عہد کے فکری اور فنی حصار کا ارتفاع کر نت نئے انداز میں حسن آرا اور معنی آرا ہوتی ہے اور نئے تفسیراتی اور تعبیراتی مکالمہ کی خواستگار ہوتی ہے۔ صداقت، خیر اور حسن سے مملو نازش کے منتخب نظمیہ اور غزلیہ حسن پاروں کو فی زمانہ اردو ئی مابعد جدید سیاق میں نئے عہد کی تخلیقیت کی نئی تعبیرات، نئی جمالیات اور نئی معنویات کی روشنی میں پرکھنے اور ان کے حقیقی شعری مرتبہ کو ترقی پسند اور جدیدیت پسند تعصبات اور تحفظات سے بلند ہو کر ازسر نو متعین کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ ان کا حقیقی تخلیقی فکرو فن اوادہ رسیدہ ترقی پسند تقلیدی فن اور جدیدیت گزیدہ تحکیمی فن کا ارتفاع کر حقیقی تخلیقیت اور معنویت کا امین ہے۔ یہ سورج آسا حقیقت ہے کہ روایتی ترقی پسند ہمالیائی جوہڑ میں ایک آدھ چھٹانک ہی حقیقی تخلیقیت اور معنویت ہے باقی تو سب ترقی پسندانہ محکوم پروپیگنڈائیت اور منشوری اشتہاریت ہے۔ دوسری طرف روایتی جدیدیت کے قطب میناری جوہڑ میں ایک آدھ تولہ ہی حقیقی تخلیقیت اور معنویت ہے۔ باقی تو سب فیشن گزیدگی، فارمولا سازی، بے معنی اور بے مقصد ابہام، اہمال اور اشکال پسندی، نئی لسانی تشکیل زدگی اور بے مغز تجربہ پسندی کا طومار ہے جو ناشاعری کے مترادف ہے۔ ان دونوں اردوئی نو آبادیوں کا بہت بڑا پوشیدہ مفاد گزیدہ حصہ وقت کی ایک ہی گردش کے بعد آج ردی کی ٹوکری کا رزق ہے۔ یہ دونوں درآمد تحریکات آج ہماری ادبی تاریخ کا آثار پارینہ ہیں۔ ان کی صرف تاریخی معنویت واہمیت ہے۔ پوری دنیا میں انؐ کا کتبہ لکھا جا چکا ہے۔ گو ان تحریکوں کے نام لیوا ادبی مجاور آج بھی موجود ہیں جو انعام یافتہ ہو کر باقاعدہ اوادہ رسیدہ ہو گئے ہیں جبکہ وہ زندگی بھر اسٹیبلشمنٹ یا ادارہ کے نقاب پوش مخالف رہے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ژاں پول سارتر کے مانند انعام واپس کر نئی نسل کے سامنے کوئی روشن مثال قائم کرتا۔ عالمی اور قومی ادب میں ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا ہے جس کو عموماً مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا اولین اصرار ہے کہ ادب بھی دوسرے مظاہر کے مانند اپنی مخصوص اردوئی ثقافت کا ہی متعین کردہ ہے۔ وہ نہ تو ادب کو روایتی جدیدیت کے مانند مطلقاً آزاد، خود مختار اور خود کفیل سمجھتی ہے اور نہ روایتی ترقی پسندی کے مانند تاریخ کا سیدھا سادہ بچکانہ عکاس محض تصور کرتی ہے۔ یہ دونوں تحریکیں محض ایک وحدانی نظریہ اور رویہ کی امین ہیں۔ ایک ادب برائے زندگی کا قائل ہے تو دوسرا ادب برائے فن کا موئد ہے۔ وہاں دونوں کے برعکس تکثیری مزاج، نظریہ اور رویہ کی حامل وسیع المشرب تخلیقیت کیش ادبی اور ثقافتی جمہوریت کی موئد ہے۔ یوں بھی جب کسی بھی نوعیت کی لسانی تشکیل (Linguistic Icon) کی رد تشکیل کی جاتی ہے تو فطری طور پر کثیر تخلیقیت اور کثیر معنویت کا افق طلوع ہوتا ہے۔ درحقیقت رد تشکیل اصلاحی طور پر تشکیل کشائی اور "باز تشکیل یابی" ہے۔ اور معنوی طور پر دراصل معنویت کشائی اور "باز معنویت یابی" ہے۔ فرانسیسی زبان میں "De Construction" کا حقیقی مفہوم ہی "معنی اور تعبیر کی جانب" ہے۔ De کے معنی "کی طرف" بھی ہے "کوں ترک سیوں"

کا مطلب "معنی اور تعبیر" ہے۔ یارانِ طریقت نے فرانسیسی نہ جاننے کی وجہ سے مکھی پر مکھی ماری ہے۔ اردو میں اس کا اصلاحی ترجمہ لاتشکیل ردِ تعمیر اور ساخت شکنی وغیرہ غلط العام (Common error) ہیں۔ پھر ان محولا بالا دونوں تحریکوں کے برخلاف اردو کی مابعد جدیدیت کی تخلیقیت کی تیسری لہر (Third Wave) بیک وقت یہ کشادہ دلی سے تسلیم کرتی ہے کہ زندگی اکبری ساخت (Macro Structure) اور فن اصغری ساخت (Micro Structure) ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر نئے عہد کی تخلیقیت تو مانتی ہے کہ "حسن صداقت کا چہرہ اور خیر روح ہے۔" در حقیقت ادب میں بیک وقت متضاد اور متخالف روئے نیز کثیر پوشیدہ عناصر بھی جدلیاتی سطح پر کار فرما ہوتے ہیں۔ ادب کا معاملہ اپنے دور سے سیدھا نہیں خاصہ پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہوتا ہے اور عمل در عمل کے یہ پیچیدہ روئے ایک دوسرے سے مل کر کسی عہد کی ہمہ جہت تصویر بناتے ہیں۔ اس لئے ایک اعلیٰ درجہ کا شعری متن "ایک معنی" نہیں بلکہ "انیک معنی" کا اہل ہوتا ہے۔ بقول ژاک دریدا وہ "معنویات پاش ہوتا (Dissimination of meanings) ہوتا ہے۔ در حقیقت متن میں معنی خیزی کی متصادم قوتوں کو دھنا اور سلجھانا ردِ تشکیل ہے۔ یہ اردو کی مابعد جدیدیت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اسی فکریاتی کشادہ دلی کی وجہ سے عہد اختلف عہد کے شاعروں کے کلام سے ایک نئے تفہیماتی مکالمہ کو قائم کیا جاتا ہے تاکہ ان کے حسن پارہ کے مختلف تخلیقی اور معنوی اطراف اور "اطراف" کو زیادہ سے زیادہ منور کیا جائے۔ نازش خود بھی نہایت فطری طور پر تکثیری فکر و فن کے قائل ہیں۔ وہ مغرب اور مشرق میں مکالمہ کے موئد ہیں۔ تاہم مشرقیت کے نو آبادیاتی تصور کی ردِ تشکیل بھی کرتے ہیں۔

کوئی بھی فن ہو شعور بشر کی محنت ہے　　کوئی زباں ہو وہ جاگیر آدمیت ہے
ہر اک وہ علم جو دنیا میں پایا جاتا ہے　　کوئی بھی اور کہیں بھی، میرا اپنا ہے　　(جواب آں عزیزم)

وہ ہر نوعیت کے فکریاتی اور جمالیاتی نظام کے گرہ نیم باز (Dobule Binding) کو کھول کر بیکراں بنانے کے خواب عرفان میں مستغرق رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا شعری مخاطبہ "حرف برہنہ" کا حامل ہو کر بھی "کمال گویائی" کا بھی امین ہے۔

اٹھو کہ موجوں کو ایک ہی رخ پہ لائیں اور بیکراں بنادیں　　اٹھو ستاروں کو اک لڑی میں پروئیں اور کہکشاں بنادیں
تمام لفظوں کو ایسی ترتیب دیں کہ ایک داستاں بنادیں　　تمام بکھرے ہوئے گلوں کو سمیٹ کر گلستاں بنادیں　　(اے نغماں گرو۔)

نازش کے تخلیقی فکر و فن کے آئینہ خانہ میں صداقت، محبت اور محنت کی یہ تثلیث نہایت معنی خیز اور حسن پرور ہے۔ یہی ان کے تمام ترجیحی اقداری اور جمالیاتی نظام کی آفریدگار اور پروردگار ہے۔ کسی بھی اچھے اور سچے تخلیقیت آفریں فنکار کے مانند اپنے مخصوص فکر و فن کی تخلیقی ترسیل کیلئے نازش کو بھی لازمی طور پر تین سیڑھیاں پار کرنی پڑی ہیں۔ (۱) دنیا کو پہچاننا (۲) اس پہچان سے اپنے کو جاننا (۳) اس جاننے کو دوسروں میں پرکھنا اور ہر عالم میں زندگی اور فن کی قدروں کو اپنے خونِ جگر سے پرورش کرنا ہے تاکہ باذوق اور ہوشمند اہل قاری یا سامع کے دل و دماغ میں حوصلے اور اعتماد کے چراغ جل اٹھیں اور وہ والہانہ اپنائیت کے ساتھ اٹھیں اور مخالف موجوں کو ایک ہی رخ پر لا کر بیکراں بنادیں! یہ فکری اثباتیت اور تخلیقیت متاثر کن ہے۔

ارباب خرد نے مجھے دیوانہ بتایا　　جس لمحہ میں آپ اپنے کو محسوس ہوا ہوں
آجائیں ادھر بھی نہ شکستوں کے بگولے　　امید کی دیوار سے لگ کر تو کھڑا ہوں
نہ حرف آیا چمن پر نہ خود ہوئی رسوا　　پھری ہے نکہتِ گل در بدر سلیقے سے
زندہ رہنے کی تمنا ہو تو پھر کیا کچھ نہ ہو　　دل کے سناٹے پہ مجھ کو اعتبار نغمہ ہے
اے زندگی وہی قدِ رعنائے حسن تھا　　تیرے ادا پرست، جسے دار کہہ گئے

"زندہ رہنے کی تمنا" "With live" اپنے کو محسوس کرنے، جاننے اور پہچاننے اور "زندگی کے ادا پرست" بننے اور "معیار و قدر حسن و جمال" کو "اعتبار نغمہ" اور "فراز دار" تک بلند کرنے اور "نکہتِ گل" کے مانند در بدر سلیقہ اور وقار سے پھرنے اور بیک وقت زندگی اور فن کی دلنواز اور تخلیقیت بار خوشبو پھیلانے کی ان تینوں محولا بالا منزلوں میں آدمی کا اپنا عمل متواتر کار فرما ہوتا ہے۔ یہ انسانی عمل آدمی کو ایک ساخت عطا کرتا ہے۔ زندگی کی چٹان پر کھدے ہوئے کتبہ آسا آدمی "شکستوں کے بگولے میں" "امید کی دیوار سے لگ کر کھڑا خود اپنے آپ کو نہایت جاں کاوی اور ہوشمندی سے گڑھتا ہے اور نازش کے مانند پھر "زندگی سے زندگی کی طرف" "قدم قدم" بڑھتا ہے کہ "جہاں اور بھی ہیں" اور زندگی کے "درد تہہ جام" کو بھی چھک کر پی جانا چاہتا ہے تاکہ وہ نئے "خاکے اور لکیریں" کا ایک اور خواب دیکھ سکے اور "نیا ساز اور نیا انداز" تخلیق کر سکے اور "اپنی دھرتی اور اپنی بات" کو اپنے "متاع قلم" کو "کلمہ سرمدی" کا رنگ و آہنگ عطا کر سکے تاکہ "ہندوستان جاگ اٹھا" کی حسین اور خوب تر تعبیر سامنے آسکے۔ اس کے آفاق پر "چرخ وطن کے مہر و ماہ" آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ روحانی فیضان کا ابدی سرچشمہ بن جائیں اور متبادل ذیلی طبقات (Subal Tern) بھی ان سے فیضیاب ہو کر اپنی حق شناسی، حق جوئی اور حق یابی کے ساتھ منصفانہ طور پر سرفراز ہو سکیں۔ فرائض کی ادائیگی تو ہر دور میں ان کا مقدر رہا ہے۔ لیکن حق یابی کسی بھی اطوپیا (Utopia)

اور بوطیقا میں ان کا سوبھاگیہ نہیں بنا۔ وہ ہر عہد میں علم، طاقت اور اقتدار کے کھیل کے پوشیدہ مفاد کا شکار رہے جو معانی، مراتب اور مناسب کو متعین کرتا اور سختی سے ان کی پابندی کراتا ہے۔ رسومیاتی مابعد الطبیعات، علم اور اقتدار کے تمام ضابطے زبان کے بد بخت نظام کی مدد سے صدیوں سے صرف ''معنی کے افتراق (Defference) اور التوا (Deferment) کو ہی دباتے، کچلتے، نظر انداز کرتے اور پس پشت ڈالتے نہیں آئے ہیں بلکہ ہر دور میں ''پورے آدمی'' کی بے حرمتی اور متبادل ذیلی طبقات کو پامال کرتے رہے ہیں۔

''تلچھٹ کی ہنتا'' کی اپنی تمام مجبوریوں اور حد بندیوں کے ساتھ زندگی کے پل صراط سے گزرتے ہوئے اپنی متواتر تشکیل، رد تشکیل اور باز تشکیل کرتے ہوئے نہایت فطری طور پر شعری فکر و فن نازش کی تخلیقی ترسیل کا سب سے موثر، طاقتور اور معنی خیز فنی اور اقداری وسیلہ بن گیا۔ کیونکہ اس میں نہ صرف وہ تینوں زندگی آموز، زندگی پرور اور زندگی بار سیڑھیاں موجود ہیں جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے بلکہ وہ ان کو پار کرکے حسب مقدور ایک معتبر اور موقر تاریخ ساز اکائی میں بدل گئے ہیں جو آدمی کے ہونے (Being) کا سب سے بڑا سبب ہے۔ بہتے ہوئے وقت کی ریت پر اس کی انفرادی تخلیقی حسیت اور آفاقی بصیرت کے قدموں کا جگمگاتا ہوا نشان ہے۔ اس کی جمالیاتی اور اقداری شاہد ہے۔ جب میں نازش کی ''لکیریں'' سے ''دُرد تہہ جام'' تک ان کے شعری نگارخانۂ رقصاں کو دیکھتا ہوں تو اس کی پوری دنیا میرے سامنے نہایت فنی رعنائی، برنائی اور توانائی کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے جو ان کی داخلی تہذیب، مزاج، روح سے ان کی خود کلامی سے ہی نہیں، ملک، قوم اور خصوصی طور پر متبادل ذیلی طبقات کے دوسرے افراد سے ان کی ہم کلامی سے، ان کی شب و روز کی بیکراں محنت کے اندر سے، پھوٹتے اور اگتے ہوئے ان کے خیال، خواب، جذبہ، شعور اور وجدان کی نغمگی سے بیک وقت نہ صرف مجھے روشناس کرادیتی ہے بلکہ روح شناس بھی۔ دو لفظوں میں کہیں تو ان کی داخلی اور خارجی تہذیب کی ارتقائی شکل خود ان کی محنت کی زبان میں پوشیدہ ہے۔ اس محنت کی زبان میں آدمی کا ہونا (Etre) منعکس ہوتا ہے۔ محنت اور تخلیق کے لمحوں میں ہی آدمی اپنی ساخت (اسٹرکچر) کو گڑھتا ہے۔ خدا نے آدمی کو کس امیج (Image) میں بنایا تھا۔ اس کی جھلک خود آدمی اپنے فکر و فن میں اپنے کو محدود معنوں میں خدا بنا کر ہمیں دیدیتا ہے۔ محدود معنوں میں ہی سہی آدمی یوں خود بھی تخلیقیت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ''خدا خالق احسن ہے تو شاعر بھی خالق اصغر ہے۔ وہ ادبی لانگ (زندہ روایت) کا پروردہ ہو کر بھی نت نئی پارول آفرینی (تخلیقیت آفرینی) کا اہل ہوتا ہے جو بیک وقت تخلیقی فنکار کی لسانی، اسلوبی اور ساختی لیاقت اور انفرادی تخلیقی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی، جوش اور ساغر نظامی کے بعد قومی، وطنی اور جمہوری نظمیہ شاعری میں وہ سب سے ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

ترا ہی رنگ مری زندگی کے جام میں ہے
تری زمیں کی سوندھی مہک مشام میں ہے
تو ہی مکان تخیل کے سقف وبام میں ہے
ترے ہی ذکر کی خوشبو مرے کلام میں ہے
نہ مہر و ماہ کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
مری جبیں ہے فقط تیرے آستاں کے لئے (اے میرے وطن)

لیکن ان کی تخلیقیت افروز انفرادیت اور متبادل ذیلی طبقاتی حسیت اور بصیرت کے باوجود بھی ان کا ترقی پسند ادب کے معماروں کو تیسری نسل سے بقول سراج اجملی (مصنف ترقی پسند غزل) براہ راست رابطہ قائم رہا ہے۔ پہلی نسل میں اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، فراق گورکھپوری، مسعود اختر جمال دوسری نسل میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، پرویز شاہدی، وامق جونپوری، ظہیر کاشمیری، کمال احمد صدیقی اور دور آخر کی تیسری نسل میں نازش پرتاپ گڑھی، حسن نعیم، پرانے باقر مہدی (اب یہ باشعور طور پر منحرف ہو کر اپنی میلیشیائی اور دریدائی ''تشکیک پسند اور تخلیقیت پسند انفرادیت اور آفاقیت کا ایک جگمگاتا ہوا تن تنہا نخشِ تمثال بن گئے ہیں اور اردو ادب میں نیطشے کے کیمل (Camel) اور (Lion) کے اسٹیج سے گزر کر از سر نو بچہ (Rechild) ہو گئے ہیں جن کی بیکراں کرب آگہی اور نشاط آگہی بیک وقت جدلیاتی سطح پر ایک نئی فکریاتی اور جمالیاتی وسعتِ امکان کی تلاش مدام تلاش میں کوشاں ہے) عزیز قیسی، شہاب جعفری، اجمل اجملی، حسن عابد، ظفر گورکھپوری، راہی معصوم رضا، اویس احمد دوراں، مصطفیٰ زیدی، شاہد احمد شعیب، اقبال ماہر، شبنم نقوی، نصر قریشی اور مظہر نسیم قابل ذکر و فکر ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترقی پسند نظمیہ اور غیر غزلیہ شاعری کے سو فیصد میں پانچ فیصد ہی حقیقی تخلیقیت و معنویت کارفرما ہے۔ ورنہ بدترین تقلید و تحکیم کا کلومار ہے جو فی زمانہ قابل رد ہے اور مردہ روایت کے مترادف ہے جس کو میں روایت کہتا ہوں۔ اس قلیل ترقی پسندانہ نظمیہ اور غزلیہ تخلیقیت و معنویت میں نازش کا بھی خونِ جگر شامل ہے۔ نازش کی کثیر جہت نظمیہ شاعری آزادی کے بعد، عمرانی، ثقافتی، اور سیاسی تواریخ بھی مرتب کرتی ہے اور متبادل ذیلی طبقات کی امنگوں، خواہشوں، مایوسیوں اور

رومیوں کا ادبی اور جمالیاتی مظہر بھی ہے۔ لیکن ان کی غزلیہ شاعری ان کی روح کے درد و داغ، سوز و ساز اور کرب آگہی کا داخلی زلزلہ پیمائی مکاشفہ ہے۔ بنیادی طور پر آگرہ اسکول کا زندہ، تابندہ اور پائندہ علمبردار ہونے کی وجہ سے ان کو خوش نما روح آگیں الفاظ، فصیح و بدیع تراکیب اور تازہ کار امیجری کے حسن انتخاب کی خوب ترفنی اور جمالیاتی بصیرت بھی حاصل ہے۔ تازش ان بورژوا ترقی پسند اشرافیہ میں نہیں ہیں جو عالیشان ایوانوں میں بیٹھ کر جھگی جھونپڑیوں اور جھوپڑپٹیوں کے خوش خوابیہ یا بدخوابیہ میں روحانی اور بصیرتی نابینائی کے شکار ہوتے ہیں اور کشمیری اور ایرانی قالینوں پر بیٹھ کر روسی وڈوکا کے جام و سبو کے آس پاس کبیر کی "جھینی جھینی چدریا" میر کی جامع مسجد کی سیڑھیوں اور رومانی طور پر مہترانی کے چیتھڑوں میں نمایاں چھاتیوں اور کولہوں کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ اور ہر نوعیت کے انعامات اسٹیبلشمنٹ سے حاصل کر، وار ورس کا خیالی اور تصوراتی ذکر منہ کا مزہ یوں بدلنے کے لئے کرتے ہیں جیسے جوش ملیح آبادی جنگل کی شاہزادی کا کرتے ہیں۔ جس میں عورت کسی بساطی کی دکان کا اشتہار معلوم ہوتی ہے۔ فی زمانہ اردو کے نام نہاد ترقی پسند بڑے شعرا کے طبقاتی کردار کا ثقافتی مطالعہ یا متبادل ذیلی طبقاتی مطالعہ کیا جائے تو عمومی طور پر ان کے اشرافی طبقے اور ترقی پسند موضوع سخن میں قطعی ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔ ان میں خلوص فکر و فن کا فقدان ہے۔ اس سورج آسا حقیقت سے "اردو تنقید کی فرقہ واریت، سڑے گلے ناسور کے مانند نمایاں ہوتی ہے۔ مابعد جدید تناظر میں نئے عہد کی تخلیقیت یکسر گوریلا جنگ ہے جو "تنقید کی تخلیقیت اور جامعیت" پر اصرار کناں ہے۔ یہ سوچ پن میں اضافہ کن ویہ اور بر تاؤ (Holistic Approach) ہے۔ وی گیتھا اور راجہ دورائے کی تازہ ترین نئی غیر اشرافی توازنیت افروز کتاب - "Toward A non Brahmin Millennium - From Iyothee thass to Periyar' (ایک غیر برہمنی عہد ہزار سالہ۔ ایوتھی تھامس سے پیری یار تک) میں یونیسکو کے خطاب یافتہ "نئے عہد کی تخلیقیت کے پیامبر" اور "جنوبی ایشیا کے ستر اط" ای۔ وی۔ راماسوامی پیری یار کے قول کے مطابق "آج محض سچ بولنا ہی کافی نہیں ہے۔ سچ کا ساتھ دینا بھی ناگزیر ہے۔" دوسری اہم اور فکر خیز تخلیقیت افروز مکاشفاتی کتاب ڈاکٹر عبدالکلام اور سوامی سندر راجن کی مشترکہ کاوش "ہندوستان ۲۰۲۰ : نئے عہد ہزار سالہ کا ایک خوش خواہد (ویژن) ہے۔ ان کے تخلیقی خواب عرفان کے مطابق "حقیقی تخلیقیت سائنس، آرٹ اور اسراریات کا جوہر اصل ہے۔ فنون لطیفہ ان کے درمیان ایک قوس قزحی پُل ہے۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا کی نئی عہد ساز کتاب "بڑھتے فاصلے" بھی ان کی تکثیریت پسند انسانیت اور ویژن کی امین ہے۔ یہ اقلیت اور اکثریت کے درمیان ایک نئے توازن کی داعی ہے۔ پرانا توازن عدم اعتدال ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے وسیع تر زاویۂ نگاہ سے اردو کی مابعد جدیدیت کے تخلیقیت افروز ادبی معاشرہ اور تہذیب میں نئے مباحث سے جن جوڑے دار اضداد کی ترجیحی حیثیت چیلنج کی زد میں آگئی ہے۔ ان کا مختصر خاکہ یوں ہو سکتا ہے۔

مغرب رنو آبادیات	بالمقابل	مشرق رتیسری دنیا
عالمیت	بالمقابل	مقامیت رثقافتی تشخص
مرکزیت	بالمقابل	تکثیریت
مہابیانیہ رعظیم بیانیہ	بالمقابل	مختصر تخلیقی بیانیہ
اشرافیہ	بالمقابل	دبے کچلے عوام ردلت ، پدولت
سنسکرت رکلاسیکی زبانیں	بالمقابل	جدید زبانیں ربھاشائیں
برہمنی شعریات	بالمقابل	بھگتی صوفی سنت دوڑے چلی آرہی عوامی شعریات، علاقائی، قبائلی اور آدی باسی شعریات، دیسی وادی شعریات

اس خاکے کے جوڑوں میں، پہلے عنصر کا غلبہ صدیوں سے چلا آتا ہے یعنی دوسرا عنصر پہلے کا غیر تھا۔ دبا ہوا یا نظر انداز کیا ہوا تھا اور اس کی اپنی کوئی پہچان نہ تھی اور اگر تھی تو پہلے عنصر کے حوالے سے اور اس کی رو سے تھی۔ (اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ مرتبہ گوپی چند نارنگ) محولا بالا جوڑے دار اضداد کی روشنی میں دہلی اور لکھنؤ کے شاہی اور اشرافی اسکول کے بالمقابل علامہ سیماب اکبر آبادی کے جمہوری آگرہ اسکول کی جبریت، معنویت اور اہمیت آج روشن تر ہو جاتی ہے۔ یہ مردہ روایت کی نہیں بلکہ زندہ، نامیاتی اور متحرک روایت کی امین ہے۔ اردو ادب میں سیماب روایت مہر نیم روزی صداقت ہے۔ اس کے ناقابل تسخیر بنیادی چٹان کے قلب میں عظیم بیانیہ "وحی منظوم" اور "الہام منظوم" حسن آرا اور معنی پاش ہے۔ اس کے مقامی (Local) افقی اساس پر آفاقی (Universal) نئے عہد کی تخلیقیت کا عمودی ہیکل کھڑا ہو رہا ہے۔ محترم گیان چند جین کے اس فتوے کی بابت "میری رائے میں آگرہ دبستان نہیں ہے۔" (صفحہ ۸، ادبی فیچر، شاعر، اپریل ۱۹۹۹ء) اپنے طویل جوابیہ میں افتخار امام صدیقی نے اس غیر تحقیقی اور غیر علمی محاکمہ کی نہایت مدلل طور پر رد تشکیل کی ہے۔

"آگرہ اسکول کے قیام کو تو ایک صدی ہوا چاہتی ہے۔ اسے علامہ سیماب نے قائم کیا تھا۔ "شاعر" اس کا نمائندہ ہے اور اپنی عمر کے سترویں

سال میں ہے۔ سیماب نے اپنے رجحانات و نظریوں کا اپنی نثر و نظم کے ذریعہ مسلسل اظہار کیا ہے۔ ان کے خطبات، ان کے مضامین اور ان کی اصلاحیں۔ بحیثیت ایک شخص کے اگر انہوں نے کسی دبستان کا تصور دیا ہے تو اس کے لئے کوششیں بھی کی ہیں۔ اپنے تلامذہ کی اپنے "نصب العین کے تحت تربیت کی ہے۔ ماہنامہ شاعر، سیماب کے نصب العین کا آئینہ دار ہے۔ قبلہ اعجاز صدیقی نے ۱۹۷۷ء تک (م:۱۹۷۸ء) اسی نصب العین کے تحت شاعر کو جاری رکھا اور اب تیسری نسل سیماب و اعجاز کے کار و افکار کو ۲۱ صدی میں لے جارہی ہے۔"

افتخار امام آگے رقم طراز ہیں ۔

"دہلی یا لکھنؤ کے دبستان ہوں یا آج کا کوئی مفروضہ دبستان کسی فرد واحد نے شعوری طور پر اتنا اور ایسا وقیع کام اسکول یا دبستان کے لئے نہیں کیا جیسا کہ سیماب نے کیا۔ اس پر بحث ہونی چاہیے تاکہ جو لوگ اپنے آپ میں واقعی انجمن ہیں، نابغہ روزگار ہیں۔ اپنے کار و افکار سے نسلوں کو متاثر کررہے ہیں اپنے تاثرات مرتب کررہے ہیں۔ ان کو اسکول یا دبستان کہا جاسکے جو دو مفروضہ ادبی اسکول ہیں۔ وہ یا تو سرے سے رد ہو جائیں یا مفروضہ نہ رہیں۔" (صفحہ ۱۱، ادبی فیچر، شمارہ اپریل ۱۹۹۹ء)

یہ سورج آسا حقیقت ہے کہ اردو ادب کی شعری تواریخ میں نازش پرتاپگڈھی آگرہ اسکول کے ایک ایسے تخلیقیت افروز سخنور ہیں جنھوں نے اپنے نظمیہ صداقت پاروں اور غزلیہ حسن پاروں کو سیماب روایت کے جمالیاتی اور اقداری ترجیحی نظام میں تخلیق کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے تاہم ہر نوعیت کی روایت سے دامن بچائے ہوئے زندہ سیمابی روایت کی جست گاہ سے زقند بھر کے اپنے عہد کی نئی اضافی تخلیقیت، عصریت، معنویت اور رفعت سے بے اختیار ہمکنار ہوئے ہیں اور نہایت فطری طور پر پامال دلت ادب کی تحریک سے متاثر ہوئے ہیں جو بعض ہندوستانی زبانوں میں کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ اس کے ابتدائی آثار و نشانات ان کے شعری منظر نامہ کا ایک زندہ اور دھڑکتا ہوا حصہ ہیں جو انکار، انحراف، احتجاج، اجتہاد، جرأت فکر اور جرأت اظہار کے آتش فشاں کے پھول ہیں۔ وہ بذات خود پرولتاریہ یا پامال محنت کش طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو اقتصادی سطح پر انڈر ڈاگ Under dog دلت اور پد دلت سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ ذاتی سطح پر اس تلخابۂ حیات اور تلخابۂ غم کی جرعہ کشی سے ان کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری کا بیشتر حصہ مملو ہے۔ شاعر، ادیب، دانشور اور ناقد دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو اسٹیبلشمنٹ کے سفید ہاتھی کے سونے چاندی کے ہودے پر سوار مختلف بلاک کے سفارت خانوں، اداروں اور ادبی درگاہوں کا جھانجھ مجیرا بجاتے ہیں اور مختلف نوعیت کے انعام و اکرام، اسفار و مناصب سے سرفراز ہوتے ہیں اور ایک وہ ہوتے ہیں جو اسٹیبلشمنٹ کے سفید ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلے اور پیسے جانے والے عوام کے درد و داغ اور سوز و ساز کے ساتھ ہوتے ہیں۔ نازش پرتاپ گڑھی کا تعلق دوسری نوعیت کے جگلاوا انقلابی شعرا سے ہے۔ ان کی آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے یا جگ بیتی آپ بیتی بن جاتی ہے۔ نازش نے ہمیشہ شاویانہ اشرافیہ فکر، اشرف پسندی کی رد تشکیل کرتے ہوئے پسماندہ اور استحصال زدہ ذیلی متبادل طبقہ کے سلسلہ کو استوار رکھا ہے جو سنگ زیر پا کے مترادف رہا ہے۔

عوام و شعر کے مابین سلسلہ ہوں میں   سمجھ لو تو کہوں ایک قافلہ ہوں میں

اکثر ارباب فکر و نظر کا خیال ہے کہ نازش بنیادی طور پر نظموں کے شاعر ہیں جو اکثر "کمال گویائی" کے ساتھ بیشتر "حرف برہنہ" کے خوگر رہے ہیں۔ اس ضمن میں اس عہد کے ایک بڑے انقلابی شاعر سردار جعفری فرماتے ہیں۔

"کون بڑا شاعر ہے جس کے یہاں حرف برہنہ نہیں ہے ؟ اگر نہیں ہے تو اس کی بڑائی پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا اقبال میں حرف برہنہ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے مخالفین نے اسے غلط طور پر سمجھا اور پیش کیا۔ دراصل ہماری غزل کی شاعری خلوت کی شاعری رہی اور خلوت میں حرف برہنہ کام نہیں دیتا۔ لیکن جلوت میں تو حرف برہنہ ہی کام دیتا ہے اور بڑی شاعری صرف خلوت کی نہیں ہوتی۔ دنیا کی بڑی شاعری جلوت کی شاعری زیادہ ہے۔ انقلابی کا حرف برہنہ تو اس کا اصل جوہر ہے کہ اس کے بغیر تو وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ دراصل ہم فریاد کی شاعری کے عادی رہے ہیں۔ للکار کی شاعری کے نہیں اور للکار کی شاعری تعبیر حرف برہنہ کے نہیں ہو سکتی۔"

آگے سردار جعفری فرماتے ہیں۔ "بڑے شعرا حرف و لفظ کے استعمال کا ہنر جانتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعری میں حرف برہنہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ حرف برہنہ نہیں بلکہ استعارہ خود بخود بن جاتا ہے۔ یہی تخلیق کی شان ہوتی ہے۔" (تقریر : نیا سفر مرتبین عاشور کاظمی اور علی احمد فاطمی)

نازش پرتاپ گڈھی کی کیمیا تاثیر اور معنی خیز غزلیہ شاعری میں آخری عمر میں جاں نثار اختر کے مانند زبردست فکری اور اسلوبی تبدیلی آئی تھی۔ وہ اپنی حقیقی تخلیقیت، ذہنی جودت اور وجدانی قوت سے صفحۂ قرطاس اور اذہان کے آفاق پر صدیوں قائم و دائم رہنے والے چند غزلیہ اشعار کہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جاں نثار اختر کا غزلیہ مجموعہ اسی زمانہ میں چونکہ شائع ہو گیا تھا۔ اس لیے ہندو پاک میں خصوصی تذکرہ کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن اقتصادی مجبوریوں کے باعث نازش کا کوئی نیا غزلیہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اس لیے وہ مختلف روایتی ترقی پسند اور روایتی جدیدیت پسند گروپ کے تنقیدی

لفظوں کے ناپ تول اور جانچ پرکھ میں پچھڑ گئے یا عمداً "تنقید کی فرقہ واریت" اور ادبی بے انصافی کے تحت نظر انداز کر دئے گئے۔ تاہم بقول افتخار امام صدیقی "میں لیکن لفظوں میں نہیں ہوں" والا معنی خیز معاملہ بھی ہوتے ہوتے عمل آرا ہو تا ہی ہے جو "تنقید کی تخلیقیت" کے لئے دلاویز ہے۔ یہ خورشید نیم روزی صداقت ہے کہ نازش کی غزلیہ شاعری ایسے تقدیسِ غم اور تقدیسِ جبیں کی امین ہے جو زندگی بھر زندگی کے آتش کدہ میں تپ کر کندن بننے کے بعد وجود پذیر ہوتی ہے۔ غم سے ہر نوعیت کے اقداری جنموں میں تہذیب نفس ہی نہیں تنویر نفس بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی روشن ضمیر اور روشن فکر غزلیہ شاعری کو وقت کی گردش سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اہل قاری یا ناقد کے ذہنی حاشیہ میں کہیں آویزاں ہو کر اس کو ابد تک جمالیاتی آسودگی اور اقداری روشنی بخشتی رہے گی۔ البتہ ان کی نظمیہ شاعری کے بڑے حصہ کو خطرہ لاحق ہے۔ اس پر بیشتر راست انداز، بیانیہ لہجہ، آہنگ اور اسلوب حاوی ہے۔ کہیں کہیں خطیبانہ شور و شر اور خام جذباتی وفور بھی ہے۔ لیکن آخری عمر کی غزلیہ شاعری میں بیشتر اختصار، ایما، ایجاز اور اعجاز کار فرما ہے۔ گو کہیں کہیں راست انداز بھی در آتا ہے۔ محتاط اور متوازن سطح پر یہ عیب نہیں ہے۔ عرفان غم کی آبداری، اسلوبی سادگی و برجستگی اور کیمیا اثری خاطر نشان ہو۔

احساسِ کربِ ذات ترا شکریہ بہت   میرے غمِ حیات کی تنہائی کم ہوئی
حیراں کھڑے ہیں مصلحتِ وقت کے حضور   کیوں اے جنوں اسی لئے نکلے تھے گھر سے ہم
دیکھ لئے سب اپنے پرائے   غم ہی تو اب درد مٹائے
احساس نہیں ہے اب غفلت شعار کا   منت گزار ہوں میں غمِ روزگار کا
سینکڑوں نوحہ و نالہ پہ شرف رکھتا ہے   وہ تبسم جو ہے پروردۂ اندوہ ملال
روز ہنس بول کے دن کاٹ دیا کرتے ہیں   روز ہو جاتے ہیں رنجیدہ سے ہم رات گئے
صدہا گل و گلزار قدم چوم رہے ہیں   ہم آبلہ پا، دشت میں یوں گھوم رہے ہیں

بیکراں صحرائے شبِ غم میں سفر مدام سفر کرنے والے نازش پرتاپ گڈھی کا ایک اور غزلیہ رنگ و آہنگ تقدیس جبیں ہے۔ اس کا بلند ترین منصب اور وظیفہ یہ ہے کہ وہ رفیع تر انسانی عزائم اور مقاصد کے لئے نیزے پر بلند ہو۔ اگر جھکنا ہے تو زیر خنجر جھکے۔ اس لئے خود آگاہ اور خود آشنا انسان سب کا قبلہ گاہ ہے۔ اس کی تہذیب نظر تو پردہ شکن اور حجابات افگن ہوتی ہے اور اول و آخر تخلیقیت افروز اور معنویت جو بھی۔ رب تخلیقیت اور معنویت کا سمندر ہے۔ (مولانا روم)

کیا تارے کیا مہر و ماہ   انساں سب کا قبلہ گاہ

کم سے کم لفظ میں زیادہ سے زیادہ "اسرار اکبر" کے ساگر کو غزلیہ بوند سے سمو دیا ہے۔ حسبِ توفیق بیک وقت ہم "وصالِ اصغر" اور "وصالِ اکبر" کے تجلی اعظم کے لئے "دیدۂ حیراں" اور "دیدۂ نگراں" میں منقلب ہو سکتے ہیں۔ اگر فضل ربی نصیب ہو۔ شرط صرف "تہذیبِ نگاہ" اور "تنویر بصیرت" کی ہے۔ برجستگی، گہرائی اور اونچائی خاطر نشیں ہو۔ گہرائی اور اونچائی دائروی سطح پر ایک ہے۔ حقیقی شاعری سطور میں نہیں بین السطور میں ہوتی ہے۔

سب کچھ میری تہذیب نظر کے کرشمے   اس بار گہِ ناز میں پردے نہ حجابات

نازش اپنی غزلیہ شاعری میں بھی انسانی عظمت، شرف اور حرمت کے رجز خواں بھی ہیں۔ زندگی کے کارزار میں مسلسل جد و جہد اور محنت پیہم کے لئے نہایت آہستہ دلسوز اور روح گداز حکیمانہ لہجہ میں دعوت دیتے ہیں تو شاعری کے اس رفیع مقام پر فائز نظر آتے ہیں جس کی ہر عہد میں معنویت اور اہمیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔

اے زندگی وہی قدِ رعنائے حسن تھا   تیرے اداپرست، جسے دار کہہ گئے
زلف ہیچاں بہت دراز سہی   کم نہیں کائنات کا بھی طول
وہیں سے اصل میں ابتدا اپنی مسافت کی   جہاں منزل سمجھ بیٹھا ہے میر کارواں اپنا

نازش پرتاپگڈھی کی غزلیہ شاعری میں سفر مدام سفر کا یہ زندگی اور فن پرور حوصلہ مستقبل بیں مستقبل پرور اور مستقبل افروز ہے۔ اس لیے ان کی سادہ، پرکار اور کیمیا تاثیر آواز الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ حقیقی تخلیقیت افروز شاعری آبِ رواں پر انسانی دستخط کے مترادف نہیں ہے بلکہ ابدیت کے صفحہ پر خدا کے دستخط کے مانند جاوداں ہے اور بذات خود آنے والی نسلوں کے لئے منبع نور، سرور اور شعور ہے۔



جمیل اصغر

پ نے ظلم کا حل جنگ و جدل پر رکھا
نے یہ بارِ گراں دوشِ غزل پر رکھا

رگی کے لئے اک معرکہ سَر کرنا تھا
ہتھیلی پہ قدم دشت و جبل پر رکھا

ت کے ہاتھ میں میزان تھمادی اس نے
نتیجے کو مرے قول و عمل پر رکھا

ب کی پہچان کے اوصاف الگ ہوتے ہیں
نے پہچان کا حل پیڑ کے پھل پر رکھا

روٹھے ہوئے بچے کو ہنسانے کے لئے
ج جو کام ضروری تھا وہ کل پر رکھا

نیارات سب اس کے ہیں کہ مختار ہے وہ
خری فیصلہ سانسوں کا اجل پر رکھا

Mominpura, Burhanpur- 450331(M

وراثت شکوہ کشمیری

دار کی راہ ہم نے پالی ہے
حق پرستی روش بنالی ہے

سر میں قائم رہے ظفر کا جنوں
اس لئے پھر شکست کھالی ہے

خواب میرے فقط حقیقت ہیں
باقی دنیا محض خیالی ہے

ہجر کا درد ہے نہ شوقِ وصال
ہم نے اک وضع یہ بنالی ہے

اپنی یادوں کی نرم چھاؤں میں
ایک دنیا الگ بسالی ہے

بعد میرے کہیں گے ہم مشرب
میکدہ جیسے خالی خالی ہے

11541 - Brandy Hall Lane,
Gaithersburg MD 20878 (U.S.A)

سیدجعفر امیر

تصوف

بعد جنوں ہے بے خودی، از بس کہ بے نیاز ہوں
میں نہ صدائے درد ہوں، میں کہ نہ نغمہ ساز ہوں

ظلم و ستم کی حد نہ رکھ، دیکھوں میں غم کی انتہا
میرا تو امتحاں تو لے، شاید کہ خود مجاز ہوں

ترک طلب سے پائی ہے، میں نے مراد زندگی
لب پہ نہ میرے مدعا، میں کہ نہ شکوہ باز ہوں

دنیا سے بے نیاز میں پہنچا جنونِ عشق تک
حرف کمال عشق تو، میں بھی تو عکسِ یار ہوں

راہِ تلاش حق میں یہ سدرہ سفر کی حد ہے کیوں
جلوا نما تو نہ ہوا جبکہ میں تیرا راز ہوں

ہو نہ سکا تو داد رس میں نہ سوال کرسکا
تو بھی خدا نہ بن سکا، میں بھی نہ چارہ ساز ہوں

P.O.Box 33402, Amarillo,
Texas 79120 (U.S.A)

مظہر سلیم
11/15/C K.D. Chawl, V.B.Nagar Kurla, Mumbai - 70



تعاقب

بیوی گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بدحواسی سے کہنے لگی۔ اب اٹھ بھی جایئے۔ دیکھئے۔ باہر پولس آئی ہے۔۔ پولس۔۔؟ ہاں۔۔۔ پولس۔۔۔۔!

ایک بار پھر۔۔۔۔۔ پولس کا نام سنتے ہی میرے حواس خطا ہوگئے اور ہاتھوں کے سارے طوطے اچانک اڑ گئے۔ میں اپنے آپ کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کرنے لگا۔

پولس کئی دنوں سے وینکٹ رمن کی موت کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا رہی تھی۔ میں نے اور چال کے مکینوں نے وینکٹ رمن کے بارے میں تمام حقائق سچ سچ بتادیئے تھے۔ پولس کی تحقیقات کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کب تک چلے گا۔ جب تک تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتی تب تک پولس اسٹیشن کے چکر لگانے ہی پڑیں گے یا کبھی پولس خود اس چال میں آدھمکے گی۔

بیوی بڑبڑانے لگی تھی کہ اس وینکٹ رمن نے تو ہمارا جینا دوبھر کردیا ہے۔ مرنے کو تو مر گیا مگر پریشانیاں ہمارے حصے میں چھوڑ گیا۔ اب کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ جایئے بھی، پولس سب کا بیان لکھ رہی ہے آپ بھی صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہم اسے بالکل نہیں جانتے وہ گاندھی نگر میں رہتا تھا ضرور اور ہمارا پڑوسی بھی تھا۔ بس اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

میں اپنے دماغ کی ساری کھڑکیاں اور دروازے وا کرتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ وینکٹ رمن کے دروازے پر کافی بھیڑ تھی۔ پولس مختلف لوگوں سے ایک بار پھر وہی سوالات پوچھ رہی تھی۔ لاش ملنے کی جگہ کا معائنہ اور پوچھ تاچھ یہ سب پریشان کن تھا۔ چال میں پولس کی بار بار آمد سے مکینوں میں خوف و ہراس پایا جانے لگا تھا۔ وینکٹ رمن کی موت ویسے تو خودکشی تھی۔ لیکن کچھ لوگ اسے قتل سمجھتے تھے۔ محلے کی بزرگ خواتین اور تجربہ کار لوگ اس موت کو ایک غریب، لاچار، بے بس اور دکھی باپ کا زندگی سے فرار سمجھتے تھے۔ میں اسے قتل ہی تصور کرتا تھا۔ قاتل کون تھا یہ میں جانتا تھا اور شاید نہیں بھی!

پولس کو میں نے بیان دیا تھا کہ "وینکٹ رمن ہمارا ایک اچھا پڑوسی تھا۔ اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی چال کے مکین اس سے نفرت کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس پر غصہ ضرور ہوتے تھے۔ اس وقت جب وہ رات کو دارو پی کر آتا تھا اور خوب گالی گلوج کرتا تھا۔ اپنی پتنی کو مارتا، خوب شور کرتا، پھر نشے میں چور سو جاتا۔ ایسے موقع پر لوگوں کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ تب اس پر لوگ غصہ ہو جاتے، اسے برا بھلا کہتے تھے۔ اس کی جوان لڑکیاں یہ سب دیکھتی رہتیں اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں۔ شرمندگی کی وجہ سے کسی سے نظریں بھی نہیں ملاپاتی تھیں۔ وینکٹ رمن کو پتہ نہیں کونسا غم کھائے جارہا تھا جس کی وجہ سے وہ شراب میں ڈوب کر ذہنی سکون حاصل کرتا تھا۔ چال کے لوگوں کو کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بہت بڑے حساب میں الجھ گیا تھا۔ شاید زندگی کا حساب!

پولس جب مجھ سے سوال جواب کر چکی تو میں واپس اپنے گھر آگیا تھا بیوی اور بچے کسی انجانے خوف سے دبکے بیٹھے تھے جیسے مذبح خانے میں جانور۔ بیوی مجھ پر برس پڑی۔ آخر کب تک آپ اس چال میں رہیں گے۔ گھر بدل کیوں نہیں دیتے کوئی اور گھر تلاش کیجئے۔ اب اس چال میں رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ آئے دن یہاں جھگڑے ہوتے ہیں۔ کبھی پانی پر تو کبھی گٹر صاف کرنے پر، آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ جھگڑے، گندگی، شور شرابہ اور دوسری تکلیفیں تو قابل برداشت تھیں مگر اب تو یہاں ایسی موتیں بھی ہونے لگیں ہیں۔ میں بیوی کی بات قطع کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ میت نہیں، خودکشی۔ ہاں جو بھی ہو اور یہ پولس۔ پہلے کبھی اس چال میں پولس کا گذر نہیں ہوا۔ اور اب نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ پولس بار بار ہمیں پریشان کر رہی ہے جیسے وینکٹ رمن کی موت میں ہمارا ہاتھ ہو۔

تم خوامخواہ ڈر رہی ہو۔ پولس اپنی تحقیقات مکمل کر رہی ہے۔ ان کا جو کام ہے انھیں کرنے دو اور ہمارا جو فرض ہے وہ ہمیں کرنا چاہیے۔ یعنی پولس کی تحقیقات میں ان کے ساتھ تعاون کرنا۔ سمجھیں۔۔۔ ہاں!

ہاں! سمجھ گئی۔

بیوی کے چہرے کا سورج ڈر اور خوف کے بادلوں میں جا چھپا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس ذہنی کشمکش اور تذبذب سے باہر نکالنا چاہ رہی تھی۔ مگر ناکام ہو گئی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ وینکٹ رمن کی موت کی وہ بھی ذمہ دار ہے اور چال کے لوگ بھی۔ میں اسے بار بار سمجھاتا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اور وہ خاموش ہو جاتی۔ مگر پتہ نہیں وہ کتنے اندیشوں اور وسوسوں کا شکار تھی جو اسے اندر ہی اندر پریشان کیے ہوئے تھے۔ وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی کہ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اتنے برسوں میں اس چال میں پولس کا داخلہ۔ ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ وینکٹ رمن کی لٹکی ہوئی لاش اسے جب تب دکھائی دے جاتی تو اس لاش سے وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بچانا چاہتی تھی۔ اسی لیے بار بار اصرار کرتی کہ اس گھر کو، اس چال کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں جہاں وینکٹ رمن کی یاد کی پرچھائیں تک نہ پہنچے۔

وینکٹ رمن کی موت معمہ بنتی جا رہی تھی۔ چال کے سبھی لوگوں نے دیکھا تھا کہ وینکٹ رمن نے اپنے گھر میں سلنگ فین سے لٹک کر خودکشی کی تھی۔ لوگ وینکٹ رمن کی عبرت ناک موت سے بے حد فکر مند بھی ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی باتیں اور قیاس آرائیاں ہوتیں۔ لوگوں کو تعجب اس بات پر تھا کہ وینکٹ رمن نہایت ہی ڈرپوک آدمی تھا وہ صرف اپنی پتنی پر ہی ساری بہادری خرچ کرتا تھا۔ ایک معمولی چوہے سے ڈر جاتا تھا۔ چال کے لوگوں سے تو وہ اس قدر ڈرتا تھا جیسے وہ ان کا مقروض ہو یا اس نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو۔ کیا ایسا شخص خودکشی کر سکتا تھا۔ شاید نہیں؟

وہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ وینکٹ رمن کی لٹکی ہوئی لاش دیکھ کر تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا اور میں لڑکھڑا گیا تھا۔ فوراً اپنے گھر آ گیا تھا۔ لاش بہت دیر تک لٹکتی رہی تھی۔ پولس آئی، پنچ نامہ ہوا۔ پوچھ تاچھ کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ پھر تو پولس کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ چال میں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سبھی لوگ اس موت سے کافی دکھی اور غمگین ہو گئے تھے۔ انھیں بھی ہر جگہ وینکٹ رمن دکھائی دیتا۔ وہ اس سے دور بھاگنا چاہتے تھے۔ میں بھی چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی وینکٹ رمن کہیں سے آ جائے گا اور کہے گا چلو چائے پلاؤ، بیڑی ولاؤ۔۔۔۔ کیونکہ اسے جتنا قریب سے میں جانتا تھا شاید چال کے دوسرے لوگ نہ جانتے ہوں۔ وہ میرا قریبی پڑوسی تھا۔ آندھرا پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا چھوٹا سا خاندان تھی، دو جوان لڑکیاں اور ایک لڑکے پر مشتمل تھا۔ لڑکیاں شادی کے لیے بیٹھی تھیں اور بڑا لڑکا آنند لوباش لڑکوں کی صحبت میں آوارہ بن گیا تھا۔ وینکٹ رمن نہایت غریب مگر محنتی تھا۔ پریل کی گل مہر سلک مل میں کام کرتا تھا۔ اس کی پتنی آس پاس کے گھروں میں کام کرتی اور بچوں کو سنبھالتی تھی۔ بے حد شریف عورت تھی۔ پتہ نہیں وہ وینکٹ رمن کے گھر کیسے پہنچی۔ شاید۔ قسمت لے آئی تھی۔ ویسے وینکٹ رمن بھی شریف اور سیدھا سادا آدمی تھا اس میں ایک ہی عادت بری تھی کہ وہ جب رات کو شراب پی کر آتا تو پتنی کو خوب مارتا اور تھک کر سو جاتا۔ شروع میں روز کی لڑائی اور گالی گلوج سے چال کے لوگ کافی پریشان ہوئے تھے مگر دھیرے دھیرے وہ سب اس کے عادی ہو گئے تھے۔ جب تک وینکٹ رمن شراب کے نشے میں چور گھر نہیں آتا اور مار پیٹ نہیں کرتا تب تک بہت سے لوگوں کو نیند نہیں آتی۔

گل مہر سلک مل میں جب طویل ہڑتال کی وجہ سے تالہ بندی ہو گئی تو وہ بے روزگاری کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اس نے اپنے آپ کو شراب میں ڈبو دیا تھا۔ جس کی وجہ سے گھر میں اس کے اور بیوی بچوں کے درمیان تناؤ بڑھنے لگا تھا۔ وہ آپس میں لڑ جاتے اور مفت کا تماشہ ہو جاتا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ وینکٹ رمن جیسے آدمی نے خودکشی کیوں کی اور اگر واقعی اس کا قتل ہوا ہے تو کس نے کیا؟ وینکٹ رمن نے تو خودکشی کی تھی پنکھے سے لٹک کر۔ اس نے شاید اپنے گھر والوں سے تنگ آ کر اپنے آپ کو مار دیا تھا۔ کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ وینکٹ رمن کی بڑی لڑکی ہیما کا ایک مسلم لڑکے اکبر خان عرف راجو کے ساتھ عشق چل رہا تھا۔ راجو بیئر بار کا مالک تھا۔ ہیما اکثر اس لڑکے کے ساتھ غائب رہتی تھی۔ بڑا لڑکا آنند کام تو کچھ نہیں کرتا تھا بس دن بھر نکڑ پر بیٹھا رہتا یا آوارہ گردی کرتا۔ اب وہ گرد بھی پینے لگا تھا۔ چھوٹی لڑکی جیا ایک سوشل ورکر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ اسے بھگانے میں اس کی بڑی بہن کا ہاتھ تھا۔ اور ماں تو ویسے بھی قسمت کی ماری تھی وہ سب کے لیے آنسو بہاتی، بھگوان سے دعائیں کرتی تھی۔ شاید وینکٹ رمن یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو شراب میں ڈبو دیا تھا۔ چال میں تو یہ بھی کہا جانے لگا تھا کہ اس کی پتنی بھی بدچلن ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ مگر میں جانتا تھا اس شریف عورت کو۔ اس میں جو خوبیاں تھیں وہ بہت سے شریف کہلائے جانے والے لوگوں میں بھی نہیں ہوں گی۔

وینکٹ رمن آدمی بہت اچھا تھا۔ اتوار کو ہم چال کے آخری سرے پر رام بھروسے ہوٹل میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے۔ وہ بڑے مزے کی باتیں کرتا تھا اور خوب ہنستا تھا۔ ہنس مکھ آدمی جو تھا۔ وہ شیواجی بیڑی پیتا تھا۔ خوب دھواں چھوڑتا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی کی حقیقت

شاید اتنی ہی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ چال کے لوگوں نے اس کے گھر والوں کی بداخلاقیوں کی وجہ سے چال سے باہر نکالنا چاہا۔ مگر وینکٹ رمن کی شرافت اور اپناپن آڑے آجاتا۔ اس نے چال میں کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی کسی کی بے عزتی کی تھی۔ وہ سب کا ساتھی اور مددگار تھا۔ اس نے اپنی ملنساری کے طفیل سب کا دل جیت لیا تھا۔ وینکٹ رمن کی شرافت کی وجہ سے اس کے گھر والے ہمیشہ چال والوں کے عتاب سے بچے رہے اور انھیں کسی مصیبت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

جب بابو بھائی مستری کے سر پر پڑوسی کی چھت گر پڑی تھی اس وقت وینکٹ رمن نے ہی اسے ہاسپٹل میں ایڈمیٹ کرلیا تھا۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات اور شادی بیاہ اور بیماری و موت میں بھی وہ پیش پیش رہتا۔ یہی نہیں تہواروں کے موقع پر بھی سب کا ساتھ دیتا۔ خاص طور پر گنیش چترتھی پر دس دن تک ویڈیو فلم کا انتظام کرتا چال کے لوگوں سے چندہ کرتا اور فلم دکھاتا۔ پرساد تقسیم کرتا، پوجا کا اہتمام بھی کرتا۔ وینکٹ رمن کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ کہانی کا کوئی کردار ہو۔ جو کہانی سے باہر آگیا ہو۔ ایسے کردار عام زندگی میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔

ان دنوں بیوی مجھ سے ناراض سی تھی۔ غصہ اور ناراضی نے اسے چڑچڑاہٹ کا شکار بنادیا تھا۔ وہ اس چال کو چھوڑنے پر اصرار کرنے لگی تھی۔ بار بار یہی کہتی۔ یہاں سے نکل چلو۔ یہ شریفوں کے رہنے لائق جگہ نہیں۔ اب تو یہاں خودکشی بھی ہونے لگی ہے۔ پولس کا آنا عام بات ہوگئی ہے۔ کیا شرابیوں، غنڈوں، موالیوں اور پولس کے مستقل خوف کے درمیان کوئی شریف آدمی رہ سکتا ہے بس بہت ہوگیا اب ایک اچھا سا فلیٹ خرید لو اور یہاں سے نکل چلو۔ پرسکون ماحول میں۔

میرے لیے فلیٹ خریدنے کا خیال جیسے خواب ہوگیا تھا۔ آفس میں تمام ساتھی ٹیبل کے نیچے کی کمائی سے خوبصورت فلیٹوں میں پہنچ گئے تھے ایک میں ہی تھا جو اپنی سچائی اور ایمانداری کو گلے لگائے بیٹھا تھا یا مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کام میں نہ کرپاؤں۔ مگر ایک دن نریندر کمار نے مجھے وہ گر بھی بتادیا جو میں جانتا نہ تھا۔ پھر تو سب کچھ بدل گیا۔ نوٹوں کی بارش ہونے لگی میں اس بارش میں بھیگتا ہی چلا گیا اور ایک ایسے راستے کی طرف چل پڑا جہاں سونے چاندی کی چمک تھی۔ روپیوں کی ریل پیل تھی۔ اب نہ بینک سے لون لینے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی کسی سے قرض لینے کی۔ پھر میں نے ممبرا میں ایک بہت بڑا فلیٹ خرید لیا۔

اس چال کو چھوڑتے وقت میں کافی جذباتی ہو رہا تھا۔ کیونکہ میں نے ۲۰ سال یہیں گزارے تھے۔ یہیں میں نے اپنے کیریر کی شروعات کی تھی۔ میں یہیں دلہن بیاہ کر لایا تھا یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر گھل مل گئے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے، دکھ درد بانٹتے۔ کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مجھے اب بھی وینکٹ رمن کا ہنستا ہوا چہرہ اور لٹکا ہوا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو۔ اتنی ساری یادیں چھوڑ کر کیوں جارہے ہو۔ میرا دل بھر آیا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے چھلک پڑے تھے۔

شہر کی ایک پاش کالونی کے ایک بہت بڑے فلیٹ میں ہم شفٹ ہوچکے تھے۔ سبھی نے گھر کو خوب سجایا تھا۔ بیوی بہت خوش تھی۔ وہ کہنے لگی کہ ہم نے ایک منحوس جگہ سے نجات حاصل کرلی۔ بچے بھی خوش تھے۔ اس نئے ماحول اور اجنبی لوگوں کے درمیان انھوں نے بہت جلد اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا تھا۔ میں بھی بے انتہا خوش تھا۔ بیوی اور بچے اس چال اور وہاں کے گندے اور تھرڈ کلاس لوگوں کو دھیرے دھیرے فراموش کررہے تھے۔ مگر میں شاید ان لوگوں کو بھول نہ پاؤں کیونکہ میرے ماضی کی خوشگوار یادیں وہیں سے وابستہ تھیں۔ مجھے تو ہر موڑ پر وینکٹ رمن دکھائی دیتا تھا۔ جیسے وہ میرا انتظار کررہا ہو۔ ساتھ ساتھ ہو، میرا حوصلہ بڑھاتا ہوا اور گپ شپ کرتا ہوا۔

برسوں بعد آج مجھے اس چال کی اور وہاں کے مکینوں کی بہت یاد آرہی ہے۔ جہاں میں نے بیس برس گزارے تھے۔ جہاں کے ہر گھر کا حال میں جانتا تھا۔ لیکن آج میرے گھر کا منظر بھی دھندلا گیا تھا۔ کیونکہ اب میرا بڑا لڑکا جو انجینیئرنگ کے فائنل ایر میں ناکام ہوچکا ہے۔ وہ کالونی کے اپنے دوستوں کی صحبت میں گردپینے لگا ہے۔ اور بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اخلاقی حدوں کو پار کرکے کالونی کے ایک غنڈے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اب ہماری ساری امیدیں چھوٹے بیٹے سے وابستہ ہیں۔ وہ اس سال میڈیکل کے فائنل میں ہے۔ ادھر میرا ریٹائرڈمنٹ بھی قریب ہے۔ اس درمیان مجھے وینکٹ رمن بہت یاد آیا۔ اسے میں نے اپنے سے بہت قریب محسوس کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وینکٹ رمن میرے وجود کی اندھیری کوٹھری میں آکر بس گیا ہے۔ اب ہر روز میں شراب پی کر گھر لوٹتا تو بیوی سے لفظی جھڑپ ہوجاتی اور ہم دونوں خوب لڑتے۔ ہمارا چھوٹا بیٹا یہ سب تماشہ دیکھتا رہتا۔ بلڈنگ کے دوسرے فلیٹوں تک ہماری آواز نہیں پہنچ پاتی تھی۔ بیوی بھی اندر ہی اندر موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے مایوس ہوگئی تھی۔ بس امید کی ایک ہی کرن تھی۔ چھوٹا بیٹا۔ وہ اب تک ساری برائیوں اور بری صحبتوں سے دور تھا۔

اس دن میں آفس سے چھوٹ کر سیدھا گھر جانے لگا۔ راستے میں وینکٹ رمن، اس کی ملنساری، شرافت اور پھر اس کی موت کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے آج اپنے اندر اس کے درد کو محسوس کیا۔ وہی درد اور وہی احساس جو وینکٹ رمن کی زندگی کا حصہ تھا۔ اتفاق سے

(باقی صفحہ ، پر دیکھئے)



راشد جمال فاروقی

چند نظمیں

(۱)

ایسا کیا ہے میرے پاس
چند کتابوں کے اسباق
کہنہ بوسیدہ اوراق
یہ آئندہ نسلوں کی میراث سنبھالو
مجھ کو سبک سبک ہونے دو

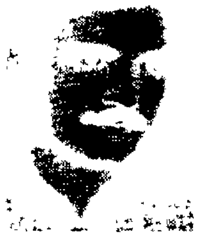
(۲)

تو اپنے اسرار کھولتا ہے
ذرا ذرا سے
تھکا تھکا کر۔ ستا ستا کر
مری کتابیں رموز سے آگہی سے پُر ہیں
تجربہ گاہیں نئے نتائج اگل رہی ہیں
مگر ابھی کیا۔

(۳)

اک تتلی
دیوار سے چپکی، لرز رہی ہے
زور تھمے کالی آندھی کا
اور وہ اپنے رنگ برنگے کام پہ نکلے

● A - 1498, IDPL Town Ship,
Virbhadra (Rishi Kesh),
Dehradun - 249202 (U.P.)



کوثر مظہری

اندر کا انسان

دریا کے قریب جاؤ گے
تو پیاس کی شدت بڑھ جائے گی
چھتنار تلے آرام کرو گے
تو دھوپ کی تمازت سے پگھل جاؤ گے
اچھا ہے کہ ریت میں پھرو
تاکہ سراب تمھارا رفیق سفر ہو
اور یہ تپتا ہوا سورج۔ چھتنار
کیوں کہ ___
تمھارے اندر کا انسان،
دریا اور چھتنار دونوں سے فزوں تر ہے

● Dept of Urdu, Jamia Millia
Islamia, New Delhi - 110025



فاروق شکیل

سین ریو (enryu)

دل اکساتا ہے
میں بھی بڑھ کے کچھ لے لوں
بہتا دریا ہے

○

اردو کا استاد
گھر میں انگریزی تعلیم
اردو کی فریاد

○

باطن سچا ہے
دور مگر کچھ ایسا ہے
ظاہر جھوٹا ہے

○

دل کا شکستہ ساز
شب کے گہرے سناٹے
یادوں کی آواز

○

جذبے بے حس ہیں
اونچے اونچے محلوں میں
انساں مفلس ہیں

23 - 2 - 90, Moghalpura,
'erabad - 500002 (A.P.)

ممتاز احمد خاں
1837/14, Dastagir Society, F.B. Area,
Karachi - 75950 (Pakistan)

اردو میں معیاری ناول کا مسئلہ

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا درجِ ذیل مقالہ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے لئے موصول ہوا تھا۔ اردو ناول کے لیے نمبر میں بطورِ خاص ایک باب قائم کیا گیاتھا جس کے تحت تنقیدی مضامین ، ناول پر شذرات ، مذاکرہ ، اردو ناول کی مختصر ترین تاریخ اور مشاہیر ناول نگاروں کے جائزے کے ساتھ نئے قلم کاروں سے خصوصی طور پر لکھوائے گئے ناولوں کے ابواب شامل کئے جانا تھے لیکن یہ بھرپور باب جو کسی ضخیم کتاب کا حکم رکھتا ہے ، تکنیکی دشواریوں اور ہم عصر اردو ادب نمبر کے بڑھتے ہوئے حجم کی وجہ سے دوسری جلد کے لیے موخّر کرنا پڑا ۔ اب اس میں ترمیم و اضافے جاری ہیں ۔ مذکورہ مقالہ چونکہ کئی سال قبل تحریر کیا گیا تھا اور اب دوسری جلد کے آتے آتے یہ مزید پرانا ہوجائے گا لہذا نئے مقالے کی شمولیت کے پیش نظر اس مقالے کو شائع کیا جارہا ہے ۔ اس میں جن ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ بیشتر پاکستانی ناول ہیں اور ان پر ناول کے حوالے سے تنقیدی مضامین وغیرہ بھی لکھے گئے ، بحثیں ہوئی ہیں ۔ یہ سلسلہ جاری ہے ۔ پاکستان میں اردو ناول نے پیش رفت کی ہے ۔ حالیہ برسوں میں کئی ناول شائع ہوئے ہیں ۔ ہندوستان میں اردو کے تخلیقی ناولوں کی رفتاربظاہر سست ہے لیکن حالیہ برسوں میں خاصے اچھے ناول تخلیق ہوئے ہیں اور ہورہے ہیں ۔ مشرف عالم ذوقی اور عبدالصمد کے کئی ناول شائع ہوچکے ہیں ۔ سید محمد اشرف ، اقبال مجید ، زاہدہ زیدی اور کئی دیگر قلم کاروں کے ناول آئے ہیں ۔ ہم نے بطورِ خاص افسانہ نگاروں سے ناول لکھوائے ہیں ۔ انور خان ، علی امام نقوی ، ولی محمد چودھری ، عذرا پروین ، انل ٹھکر ، احمد یوسف ، شاہد اختر اور کئی دیگر نئے نام اس فہرست میں آتے ہیں لیکن ناول کے موضوع پر جو فضا بننی چاہیے ، وہ اب تک نہیں بن سکی ہے ۔ ناول پر یوسف سرمست کی کتاب 'بیسویں صدی میں اردو ناول' کے بعد ۱۹۹۶ء تک اردو ناول پر اگر کوئی بھرپور تنقیدی جائزہ سامنے آیا ہے تو وہ ارتضیٰ کریم کی اہم کتاب 'اردو فکشن کی تنقید' ہے ۔ اس میں 'ناول پر تنقیدی سرمایہ' کے عنوان سے ۲۴۳ صفحات مختص کیے گئے ہیں ۔ ۸۴۰ صفحات کی ضخیم کتاب سے باہر یہ باب اپنے آپ میں اردو ناول پر ایک تنقیدی کتاب ہے ۔ ممتاز احمد خاں ، افسانہ نگار اور نقاد ہیں ۔ ناول پر دو اہم کتابیں تصنیف کرچکے ہیں ۔ 'اردو ناول کے بدلتے تناظر' اور 'اردو ناول آزادی کے بعد'۔

اس مضمون کی اشاعت کا مقصد اردو ناول پر ایک نیا مکالمہ قائم کرنا ہے کیوں کہ اس میں بعض بہت اہم اور بنیادی سوال روشن کئے گئے ہیں جن پر بحث ہونی چاہیے تاکہ مشاہیر افسانہ نگاروں کے ساتھ نئے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو حوصلہ ہوسکے کہ وہ اچھے اور معیاری ناول تخلیق کرسکیں ۔ آزادی کے بعد ہندوپاک میں جو ناول تخلیق کیے جاچکے ہیں ان میں سے چند ایک ہی موضوعِ بحث بن سکے ہیں ۔ پھر یہ کہ معیاری ناول کا جو تصور ناول نقادوں نے بنارکھا ہے ، بہت سارے اچھے ناول اس تناظر میں نہیں آتے ۔ ایسا نہیں کہ تاریخی ، سوانحی ، نفسیاتی یا رومانی ناول لکھے نہیں گئے ۔ پھر یہ کہ ناول کی تاریخ میں ابھی ایسے ناموں کو شامل نہیں کیا گیا جو شعرا کی صف میں آتے ہیں جیسے شاد عظیم آبادی کا ناول 'صورت الخیال (۱۸۷۶ء) اور دیگر دو ناول ۔ سیماب اکبر آبادی کے کئی ناول (آفتابِ زندگی ، وفا کی دیوی وغیرہ) ۔ ڈاکٹر یوسف سرمست اردو ناول کی تاریخ لکھ رہے ہیں اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے تنقیدی و تحقیقی کام اردو ناول کے باب میں جاری ہیں ۔ شاعر کے 'ہم عصر اردو ادب نمبر ۔ ۲' میں یہ سارا الوازمہ اپنے مکمل تعارف کے ساتھ آئے گا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ناول کے قلم کار و قارئین ناول کے اس نئے مکالمے میں شریک ہوں ۔ شاعر کے صفحات حاضر ہیں ۔ (الف الف)

یہ سوال ادبی حلقوں میں ایک عرصے سے گردش کررہا ہے کہ اردو میں معیاری ناول کیوں نہیں لکھے گئے یا کیوں نہیں لکھے جارہے ہیں؟ اس سوال

میں لفظ "معیاری" کو ہم لفظ "اچھے" سے بھی بدل سکتے ہیں اور جہاں تک بڑے ناول کی تخلیق کا مسئلہ ہے تو اس پر بعد میں مکالمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اردو ناول سے ہماری مراد 'ادبی ناول' ہے نہ کہ عام سے رومانی، عشقیہ سطحی اور پوچ قسم کے ناول۔ جن سے زندگی کی بصیرت حاصل عبث ہے۔

اگر ہم ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے ناول "مراۃ العروس" (۱۸۶۹ء) کو ناول کی ابتدا تصور کریں اور تھوڑی دیر کے لئے ادبی تنازعات کو پس پشت ڈال دیں جو ناول کی اوّلیت سے مشروط ہیں تو آج ناول کی عمر ایک سو تیس سال بنتی ہے۔ اور اگر ہم ہسپانوی مصنف سروانتیس (Cervantes) کے رومانی ناول 'ڈان کوئکزوٹ' یا ڈان کی ہوٹے Don Quixote کو جو کہ 1612 میں وجود میں آیا، انگریزی یا مغربی ناول کی ابتدا سمجھ لیں تو مغرب میں ناول کی عمر تقریباً ۳۸۵ سال بنتی ہے اور وہاں کے ناولوں میں اب تک ہر قسم کے رجحانات سمیٹے جا چکے ہیں۔ اگر اس میں براعظم امریکہ کے ناول کو بھی شامل کر لیں، جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بڑا حصہ ہے تو مغرب کا ناول اپنے معیار میں یقیناً بہت آگے کی چیز مانا جائے گا۔ لہٰذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟ دراصل ہم اپنے ناول کو مغرب کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور احساس کمتری اور بے بضاعتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں تاریخ کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہم ۱۹۴۷ء سے پہلے تک مغرب کی غلامی میں تھے۔ خاص طور پر پڑھے لکھے حضرات جن میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر حضرات اور ناقدین بھی شامل ہیں، نو آبادیاتی ذہنیت کے ابھی تک حامل ہیں، لیکن سب نہیں۔ جن لوگوں نے ناول کو باضابطہ پڑھا ہے اور جو ناول کا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں اور جو مغرب اور مشرق کے ناول کے تقابلی تجزیے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، انہیں علم ہے کہ اپنے سماجی و معاشرتی ماحول اور انقلاباتِ زمانہ کے جبر کے راستوں سے گزرتے ہوئے بھی اردو ناول لکھنے والوں کا سانس نہیں اکھڑا اور گذشتہ ایک سو پچیس سے بھی زائد سال میں انہوں نے خاصی پیش رفت کی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے نوجوان اور باہمت ادیب بھی سامنے آئے ہیں جن کے نزدیک مغرب کا ناول بالعموم اور تجرباتی ناول بالخصوص، جسے ہم Post Modern کے حوالے سے جانتے اور سمجھتے ہیں، سب کچھ ہے اور ہم دنیا میں اچھے یا معیاری یا بڑے ناول نہ لکھے جانے کے باعث کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔

دراصل حاوی تنقید کے اس دور میں نعرے بازی کا چلن عام ہو گیا ہے۔ اگر کوئی پہلی بار یہ کہہ دے کہ "آگ کا دریا" میں قرۃ العین حیدر نے "نظریہ تناسخ" کو فنی لحاظ سے برتا ہے تو یار لوگ اس فقرے کو لے اڑیں گے اور جب تک گرد بیٹھ نہ جائے اور دوسرے اس کے برعکس کوئی حقیقت ان کے گوش گزار نہ کر دیں، وہ اسی لاگ کو گائے جائیں گے۔ اسی طرح اگر کسی نے کہہ دیا کہ 'اردو میں اچھا ناول نہیں لکھا گیا ہے اور اس صنف ادب پر جمود طاری ہے' تو یہ بھی کچھ نقادوں کے لئے نعرہ بن جائے گا اور وہ اسی کی جگالی کئے جائیں گے، اور ناولوں کو پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس طرف نکل جایئے یہی نعرہ سننے کو مل رہا ہے کہ اردو میں اچھے ناول نہیں لکھے جا رہے ہیں۔

ایک دو حضرات تو اسی پر برہم ہیں کہ جب پاکستان اور ہندوستان میں ناول لکھا ہی نہیں جا رہا ہے تو ہماری یونیورسٹیاں ناول پر ریسرچ کیوں کرا رہی ہیں۔ کچھ لال بجھکڑ کہتے ہیں کہ ہمارا مزاج ناول کی تخلیق سے مناسبت نہیں رکھتا۔ یہی بات ڈرامے کے لیے بھی کہی جاتی رہی ہے۔ کچھ کے نزدیک ایک ایسا ناول جس میں مٹی کی خوشبو ہے وہ کچھ ایسے نظریوں پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں جن میں ہماری حیات و ممات کے راز پنہاں ہیں، وہ مذہبی پروپیگنڈا ہیں۔ اس کی ایک مثال بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ" ہے جس میں قرآن مجید کے رزق حلال کے فوائد اور رزق حرام سے انسانی شخصیت کے ریزہ ریزہ ہونے کے فلسفے کو ماجرے کی بنیاد بنایا گیا ہے، وہ سب بے کار ہے۔ لیکن یہی لوگ 'کامیو' کافکا، سارتر، پروست، ٹامس مان، ہمینگوے، میلول، دوستوفسکی وغیرہ کے مخصوص نظریات پر سر دھنتے ہیں مگر پاکستانی تناظر میں اگر کسی فلسفیانہ مذہبی نظریے کو پیش کیا جاتا ہے اور جہاں تبلیغ بھی موجود نہیں ہے، وہاں یہ لوگ کان، آنکھ اور دماغ کے دروازے فوراً بند کر لیتے ہیں حالانکہ ڈاکٹر احسن فاروقی (مرحوم) نے اپنی کتاب 'اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' کے آخری باب میں بسلسلہ ناول کے امکانات یہ لکھا تھا کہ 'مذہب اور ادب دونوں ہی کو انسانیت سے پورے طور پر سروکار ہے۔' (صفحہ ۲۸۳) آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ دونوں کو بنیادی آفاقی اقدار سے تعلق ہے۔ بلکہ انہوں نے ایک ایسا معنی خیز جملہ لکھا ہے جس کا بالکل چرچا نہیں ہوا۔ اور وہ یہ ہے۔ "ناول کو بھی زندگی میں اہم جگہ دلانے کے لئے ایک علامہ اقبال کی ضرورت ہے۔" (صفحہ ۲۸۴) اب یہاں مصیبت یہ ہے کہ خاصے ادیب، شاعر اور نقاد علامہ اقبال کی عظمت ہی کو پورے طور سے نہیں سمجھ پائے ہیں تو وہ اچھے ناول کی روح کو کیا سمجھیں گے جب کہ ناول اب ایک فلسفیانہ عمل ہی ہے۔

غالباً یہ حقیقت اب واضح ہو گئی ہو گی کہ اس قسم کے شور و غل کی وجہ ہی سے ناول پر وقت پیغمبری پڑا نظر آتا ہے۔ تاہم ناول کے بارے میں لوگوں کے ذہن پر پڑی غلط فہمیوں کی گرد کو صاف کرنا بھی ضروری ہے اور اس صنف ادب کو لاغر اور کمزور سمجھنے والوں کو کم از کم ناول پڑھنے پر مجبور کرنا از حد ضروری ہے کیوں کہ اس سلسلے میں ایک جملہ یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ ناول پڑھنا تضیع اوقات ہے یا یہ کہ سات سو صفحے کا ناول پڑھے۔ یعنی مرغی اپنی جان سے جائے اور کھانے والے کو مزا نہ آئے۔

اس حقیقت سے پڑھے لکھے حضرات باخبر ہیں کہ مغرب میں نشاۃ الثانیہ کے بعد بڑی تخلیقات اور مطالعے کا خوب زور بندھا اور پھر جب صنعتی انقلاب نے جاگیردارانہ نظام کو سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیل کیا تب زیادہ سے زیادہ ناول لکھے اور پڑھے جانے لگے۔ اس میں برطانیہ کا رول نمایاں ہے۔ ان کے یہاں رزمیہ (Epic) کی توانا روایت اور ڈرامے کے زوال نے ناول کی بلوغت میں بطور خاص حصہ لیا۔ لہٰذا ان کے مجموعی سرمائے کو ہم پر یعنی برصغیر والوں پر سبقت حاصل ہے اور حاصل رہے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ برصغیر میں ناول لکھنے والا زرخیز ذہن نہ موجود تھا اور نہ ہے اور نہ ہوگا۔ خود ڈپٹی نذیر احمد کی مذہبی تمثیلیں فطری طور پر اسی پروسیس (Process) کے تحت وجود میں آئیں جس طرح کہ جون بنین (John Bunyan) کی پلگرمس پروگریس (Pilgrim's Progress - 1678) وجود میں آئی اور انگریزی ناول کا خام مال بنی۔ اس کے بعد رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانۂ آزاد" اور شرر کا "فردوس بریں" سامنے آیا۔ کیا ان دونوں کتابوں کی تاریخی، تنقیدی اور فنی حیثیتوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے خواہ ان میں خاصے نقائص موجود ہوں۔ تقریباً سب ہی ناول کے پارکھوں مثلاً یوسف سرمست، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر احسن فاروقی وغیرہ نے ان ناولوں کو مسترد نہیں کیا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں ایک اور موڑ آیا جبکہ مرزا ہادی رسوا نے "امراؤ جان ادا" جیسا ناول تخلیق کیا، جس میں لکھنو کی زوال آمادہ تہذیب اور اس کے جان لیوا مسائل کا موثر احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک طوائف کی ذاتی داستان نہیں ہے۔ یہاں سے ناول تیزی سے آگے بڑھا اور پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر "گئودان" لکھا۔ اس ناول نے پڑھنے والوں کو چونکایا۔ اس میں شہر اور دیہات دونوں ہیں اور کسان کی زندگی کے اتنے نشیب و فراز ہیں کہ پریم چند کے مشاہدے اور پیچیدہ واقعات کو فکشن بنانے کی صلاحیتوں پر رشک آتا ہے۔

اب تک ناول کی جو پوزیشن تھی اس کو مزید نکھارنے کے لیے جو فن کار ابھر کر آئے ہیں وہ اردو ناول کی تاریخی اور تنقیدی دونوں حیثیتوں میں امتیاز کے حامل ہیں۔ سجاد ظہیر کا ناولٹ "لندن کی ایک رات" شعور کی رو کی تیکنک کے خفیف سے استعمال کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ عزیز احمد نے "ہوس" سے "شبنم" کی تخلیق کے دوران اردو ناول پڑھنے والوں کو "گریز" اور "ایسی بلندی ایسی پستی" جیسے ناول دیے۔ جن میں آخر الذکر کے لیے حسن عسکری جیسے نقاد نے لکھا کہ "یہ اردو کا اجتماعی ناول ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ ایک قابل ذکر خراج تحسین ہے۔ اس ناول سے قبل عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کر چکی تھیں۔ کچھ نقادوں نے شمن (شمشاد) کی (جو کہ اس ناول کی ہیروئن ہے) ایک امریکن سے شادی پر خاصی ناک بھوں چڑھائی ہے۔ لیکن یہ کردار جس قسم کی ٹیڑھی لکیر اور کج ادا اور اندھیرے کو روشنی سمجھ کر اس میں جست لگانے والی ایک مختلف ہی کردار تھی، اس کا کسی امریکی سے شادی کر کے زندگی کا ایک اور تلخ تجربہ کرنا کوئی بعید نہ تھا۔ ویسے بھی جس طرح شمن کے کردار کو عصمت چغتائی نے ڈھالا ہے وہ ان کی کردار نگاری کی صلاحیت اور انسانی نفسیات کی فہم رکھنے کی بنیاد پر ان کو ناول کی دنیا کا اہم فرد بناتی ہے۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "شامِ اودھ" سامنے آتا ہے۔ اودھ کی تہذیب کے خاتمے کے بالکل آخری دور اور نئی قدروں کی ابتدا کی عکاسی کی بنا پر یہ ناول آج بھی اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر تقسیم کے بعد ابھرنے والے فنکاروں میں نمایاں حیثیت کی مالک ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں "میرے بھی صنم خانے" اور ۱۹۵۲ء میں "سفینۂ غم دل" جیسے دو ناولوں سے انہوں نے موضوع، مواد، اسلوب، ہیئت اور تیکنیک میں تبدیلی کا واضح احساس دلایا۔ ان کے ناسٹلجیا (Nostalgia) کو کوئی بھی تنقید کا نشانہ بنا سکتا ہے، ان کے موضوع سے اختلاف کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے لیکن ناول کو ایک نئی سمت میں لے جانے کے نمبر انہیں ضرور ملیں گے۔ خصوصی طور پر ان کی اس فن کاری کا معترف ہونا پڑے گا کہ ان کے یہاں ریڈابیلٹی (Readability) یا مطالعیت متاثر نہیں ہوئی ورنہ تھوڑا سا مختلف نظر آنے کے زعم اور شوق میں یہ خصوصیت اناڑی کے ہاتھوں کچل کر رہ جاتی ہے!۔

شوکت صدیقی نے غالباً قیام پاکستان سے قبل "کوکا بیلی" لکھا تھا۔ اسے اب انہوں نے "جانگلوس" کے بعد "چار دیواری" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ بتاتا یہ ہے کہ "کوکا بیلی" کے بعد انہوں نے ۱۹۵۷ء میں "خدا کی بستی" پیش کیا۔ یہ ناول چھپتے ہی مقبول ہوا۔ اس میں غربت و افلاس کی موثر تصویر کشی کی گئی ہے اور ایک معاشی استحصالی نظام میں یہ سماجی برائیاں کس طرح فرد کے کردار کو تباہ کرتی ہیں اور مجموعی طور پر کس طرح ہماری سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی اقدار کو مسخ کرتی ہیں اس کا احاطہ بہت اچھی طرح کیا گیا ہے۔ اسی میں مجموعی طور پر پورا معاشرہ اپنی اپنی فطرتوں اور جبلتوں کے ساتھ منعکس ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹی وی پر اس کی ڈرامائی تشکیل نے عام قارئین کو اسے پڑھنے پر مجبور بھی کیا۔ اس کے اب تک بقول مصنف ۴۴ ایڈیشن آ چکے ہیں جو کہ ایک ریکارڈ ہے اس کا چینی کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس سے ایک نکتہ یہ بھی ابھرتا ہے کہ اگر الیکٹرانک میڈیا اتنی جرات کرے کہ ادبی ناولوں کی ڈرامائی تشکیل کرنے لگے تو ناول کے فروغ میں اس کا نام درج ہو جائے۔ لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے۔ "خدا کی بستی" کے دو سال بعد قرۃ العین حیدر کا مشہور زمانہ ناول "آگ کا دریا" وجود میں آیا۔ یہ ناول آج بھی متنازعہ ہے اس میں ہزار سال کی زندگی اپنے تمام تر تنوع کے ساتھ روشن ہو گئی ہے جس طرح ورجینا وولف (Virginia Woolf) نے اپنے ناول اورلینڈو (Orlando) میں کئی صدیوں کی زندگی بیان کرنے

کے لیے اور لینڈو ہی کو ہر عہد میں ہیرو بنایا۔ اسی طرح اس نئی اور انوکھی تکنیک کا قرۃ العین حیدر نے خلاقانہ استعمال کرتے ہوئے ڈھائی تین ہزار سالہ زندگی کے تمام اہم ادوار میں گوتم نیلمبر، چمپا اور کمال ابوالمنصور کو قائم و دائم رکھا اور پس منظر جاری و ساری ہندوستان اور پاکستان سے لے کر یوروپ تک کے منظرنامے کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے خاصے رجحانات سمیٹ لیے ہیں اور شعور کی رو، داخلی خود کلامی، تلازمۂ خیال اور اساطیر کے حوالوں سے تہذیب کے بننے بگڑنے اور نئی نئی شکل میں متشکل ہونے کے ماجرے کو بڑی فنی خوبیوں سے پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسا کثیر الجہات اور رجحان ساز ناول ہے کہ جب بھی پڑھا جاتا ہے زندگی کی ایک نئی جہت سامنے آتی ہے اس میں اتنی طویل تاریخ کو مربوط پلاٹ کے بکھیڑے سے آزاد رہ کر قابل مطالعہ ماجرے کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے کہ قرۃ العین حیدر کو تاریخی شعور اور اس کے فن کارانہ استعمال پر داد دینے کو طبیعت چاہتی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ اپنے اپنے تعصبات میں بہت سے نقادوں نے بشمول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اس کی عظمت کو قبول نہیں کیا، تاہم یہ ناول آج بھی اردو ناول کی آبرو اور اس کی تاریخ کا ایک اہم موڑ اور سنگ میل (Milestone) ہے۔

مرحوم شمیم احمد نے "آگ کا دریا" کی بابت دو اہم باتیں کہی تھیں: ایک یہ کہ "آگ کا دریا" نے اپنی اشاعت کے ساتھ زبردست تخلیقی سرگرمی کو جنم دیا ہے دوسرے یہ کہ اس نے ناول کے ضمن میں بے بضاعتی کے شکوے کو دور کر دیا ہے۔ مرحوم کی اس رائے سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ "آگ کا دریا" کے بعد ہی خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" اور جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" آیا۔ "آنگن" تقسیم ہند کے پس منظر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے حامی دو گھرانوں کے کرداروں کے درمیان آویزش اور پھر ہیروئن کے آئیڈیل کے ٹوٹنے کی اچھی داستان ہے اور نفسیاتِ جنس پر مبنی خود نوشت ناول "علی پور کا ایلی" اپنی جگہ خود ایک مستقل اہمیت کا حامل ناول ہے، البتہ "تلاشِ بہاراں" اس کی ہیروئن کی مبالغہ آمیز کردار نگاری کے باعث جمیلہ ہاشمی کا سنگ میل نہیں کہلایا جاسکتا۔ یہ اعزاز انہیں جدید دور میں "دشت ہوس" کی اشاعت سے مل سکتا ہے جس میں حسین بن منصور حلاج کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے اور شاعرانہ نثر کا نہایت ہی خوب سیرت استعمال کیا گیا ہے کہ جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

رشیدہ رضویہ کے تین ناول "لڑکی ایک دل کے ویرانے میں" "اسی شمع کے آخری پروانے" اور "گھر میرا راستے غم کے" اس قابل ہیں کہ ان پر تذکرہ کیا جائے۔ اتفاق سے یہ ناول اب تک اندھیرے ہی میں رہے ہیں حالانکہ ان پر مختلف رجحانات اور قرۃ العین حیدر کے اثرات کے حوالے سے گفتگو ہونا چاہیے۔ اسی طرح جیلانی بانو کے فن کا بھی "بارش سنگ" اور "ایوان غزل" کے حوالے سے تجزیہ ہونا چاہیے کیوں کہ دونوں ہی ناول اچھے ہیں۔ معاشرے کی رگوں میں احتجاج، بغاوت اور دہشت کے دوڑتے ہوئے خون کی اچھی عکاسی کرتے ہیں۔

فنتاسیائی رجحان (Trend of Fantasy) کے حوالے سے محمد خالد اختر کی معاشرتی فنتاسی "چاکیواڑہ میں وصال" اور حجاب امتیاز علی کی سائنسی فنتاسی "پاگل خانہ" قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر کے ناول "ایک وائلن سمندر کے کنارے" "الٹا درخت" اور گدھا سیریز جیسے "ایک گدھے کی سرگذشت" "گدھے کی واپسی" اور "گدھا نیفا میں" فنتاسی کی اچھی مثالیں ہیں۔ کرشن چندر کا ناول "شکست" اور کئی دوسرے ناول جلدی میں تخلیق کیے گئے تھے لہٰذا وہ صرف رومانی حقیقت نگار ٹھہرتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ کرشن چندر کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا جائے۔ ناول کی شاہراہ سے گزرنے والے قاری اور نقاد ان پر نگاہ کئے بغیر آگے نہیں جاسکتے۔ گو کہ الطاف فاطمہ کا زیادہ تذکرہ نہیں آتا اور یہ بڑی زیادتی ہے۔ ان کے دو ناولوں "دستک نہ دو" اور اب جدید دور میں "چلتا مسافر" کا چرچا ہونا چاہیے بالخصوص "چلتا مسافر" اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ سقوط مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے پس منظر میں ہے۔ یہ اتنی بڑی انسانی ٹریجڈی تھی کہ اس پر تو کئی ناول سامنے آنا تھے۔ البتہ رضیہ فصیح احمد کا ناول "صدیوں کی زنجیر" اس شکوے کو تھوڑا بہت کم کرتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا ناول "ایک چادر میلی سی" ناولٹ کی حیثیت سے چھپتا رہا ہے۔ یہ دیہی پنجاب کی خاص معاشرت کے حوالے سے چھوٹا کینوس ہونے کے باوجود قابل ذکر ہے۔ اس پر انڈیا پاکستان دونوں ملکوں میں فلمیں بنی ہیں۔ دیہی معاشرت کے سلسلے میں بلونت سنگھ، غلام عباس، غلام الثقلین نقوی بھی قابل ذکر ہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد عبداللہ حسین کا ایک ناول "باگھ" شائع ہوا تھا اس سے قبل "اداس نسلیں" کے حوالے سے وہ تیزی سے ابھرے تھے اور بحیثیت ناول نگار انہوں نے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ "باگھ" کا پس منظر کشمیر ہے اور مفاہمت نہ کرنے والے کردار اسد کے حوالے سے یہ قابل ذکر ناول ہے تاہم "اداس نسلیں" ۔ وسیع کینوس اور تقسیم ہند کے پس منظر میں اہم کرداروں کی بددلی اور مایوسیوں کے حوالے سے عبداللہ حسین کا لینڈ مارک (Land Mark) قرار دیا جائے گا۔

۱۹۸۰ء کے لگ بھگ جب کہ انتظار حسین نے اپنا ناول "بستی" لکھا اور جس میں ہیئت کا تجربہ ہے، ناول کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ادھر قرۃ العین حیدر کا "آخری شب کے ہم سفر" بھی آچکا تھا۔ اس میں بنگال کا پس منظر ہے اور کہانی کا موضوع ہے کہ وقت کے سفر میں کس طرح لوگ اپنے

آئیڈیلز (Ideals) کو بھلا کر ایک مفاد پرست کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اس کے برعکس انتظار حسین نے اپنے ناسٹلجیا (Nostalgia) کو ماجرے کا حصہ بنایا۔ اس میں اساطیری حوالے، ڈائری، خود کلامی، جاتکیں، استعارے اور علامتیں، سب کچھ ایک دوسرے میں گندھ کر ماجرے کی تشکیل کرتے ہیں اور ایک سطح پر ہجرت کے المیے کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ ناول متنازعہ حیثیت کا حامل تھا اس پر اب بھی بحثیں ہو رہی ہیں مگر انتظار حسین نے "روپ نگر" اور "لاہور" کو آپس میں جوڑ کر اپنے آپ کو بچالیا ہے۔ ان کی مخصوص زبان بالخصوص ناول کے پرانے قارئین کو بہت اپیل کرتی ہے۔ ان کا دوسرا ناول "تذکرہ"، "بستی" سے آگے کی کوئی چیز نہیں لیکن اس میں ناسٹلجیا آخیر میں مدھم پڑجاتا ہے لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ "روپ نگر" اور "چراغ حویلی" کو یاد کرنے والی بوڑھی خاتون کے بعد کی نسل ناسٹلجیا اور ہجرت کے تصور سے آزاد ہو کر دیگر نئے مسائل کے اسیر نظر آئیں گے۔

انیس ناگی نے "دیوار کے پیچھے" میں حقیقت کو ایک دوسرے پس منظر میں اجاگر کیا ہے ان کا ناول اسٹیبلشمنٹ (Establishment) کے جبر کو ابھارتا ہے۔ اس میں بھی کہانی کہنے کے اسلوب میں تبدیلی کا احساس دلایا گیا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی ہیئت کی مکمل شکست وریخت نہیں کرتی۔ قاری اگر ذہین ہو تو کسی الجھن یا رکاوٹ کے بغیر بھی اس کی تفہیم کر سکتا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ہمارا اسٹیبلشمنٹ حق گو کو، یا اپنی رائے کا برملا اظہار کرنے والے کو تہہ تیغ کرنا چاہتا ہے۔

جوگندر پال نے "نادید" میں اندھے کرداروں سے ماجرے کی تشکیل کا کام لیا ہے اس میں صرف ایک کردار بینا ہے مگر دیگر اندھوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے نابینا کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ یہ ایک سیاسی تمثیل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح عوام الناس کو ان کے رہبر غلط سمت میں لے جارہے ہیں، انھیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اب، سیاست مقامی جبر سے آزاد ہو کر بین الاقوامی جبر کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے جس سے عوام کے دکھوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اندھے کرداروں سے کامیاب کردار نگاری کے فن کی حرمت کو قائم رکھنے میں جوگندر پال نے واقعی کمال کیا ہے۔ ان کا اگلا ناول "خواب رو" ہجرت اور تقسیم ہند کے موضوع پر ایک نئے رخ سے روشنی ڈالتا ہے۔ جس کی تشریح و تعبیر مختلف قارئین اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کریں گے۔ اس میں مصنف کا نقطۂ نظر متنازعہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہجرت کے دکھ کا موضوع اپنی ذات میں خود ہی متنازعہ ہے!

بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" یقیناً ایک متنازعہ ناول ہے اس میں رزق حرام کے مہلک اثرات کا پروفیسر قیوم کے ذریعے انکشاف کیا گیا ہے۔ رزق حرام کی قرآن شریف میں ممانعت کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ انسان رزق حلال کھائے۔ پروفیسر قیوم کا کہنا ہے کہ مغرب کے پاس رزق حلال یا حرام کا کوئی تصور نہیں۔ رزق حرام جس وقت جسم میں داخل ہوتا ہے تو جینز (Genes) کو متاثر کرتا ہے یہ جینز اندھے لنگڑے لولے ہی نہیں ناامیدی کا عنصر بھی لیے ہوتے ہیں۔ رزق حرام، مہلک مادیت پرستی کو جنم دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔ ایسی قوم دیوانی ہونے لگتی ہے۔ اس ناول پر اب تک حمایت اور مخالفت میں بحثیں ہوئی ہیں۔ ایک ناول نگار انسانی زندگی کی حقیقتوں، ابدی سچائیوں اور انسانی تقدیر کے مسئلوں کو مورخین، اور فلسفیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر زیر بحث لاتا ہے۔ ہمارے معیاری ناولوں میں فکر کا یہ عنصر گہرائی کے ساتھ آیا ہے۔ ہمیں اس ناول کو اپنے جدید ناولوں میں اہمیت دینا چاہیے۔

ڈاکٹر انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" تجرباتی رجحان کی صف میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ اس کی بنیاد ہالینڈ کے مصور بوش کے پینلز (Penals) ہیں۔ ان میں جو استعارے اور علامتیں استعمال کی گئی ہیں وہ ایک عدم توازن کے شکار معاشرے میں جاری و ساری ظلم و ستم اور ہمہ گیر استحصال کی کہانی سناتے ہیں۔ ان کے یہاں تجرباتی طور پر حقیقت نگاری، مقصدیت، تلازمہ خیال، تبصرے سب آپس میں گڈمڈ ہو کر ناول کو ایک ایسی نئی ہیئت عطا کرتے ہیں جس کے ہمارے قارئین عادی نہیں۔ اسی قسم کا دوسرا ناول فہیم اعظمی کا "جنم کنڈلی" ہے۔ جس میں ہیئت کو جان بوجھ کر توڑا گیا ہے۔ یہ ناول کہیں سے پڑھنا شروع کر دیں اور کہیں بھی ختم کر دیں کوئی فرق نہیں پڑتا! مگر اس میں بیانات (Statements) دلچسپ زبان میں آئے ہیں۔ اس کا تھیم Theme زندگی کی لایعنیت اور ایسی ناآسودگی کا عذاب ہے جو کبھی آسودگی میں تبدیل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہی انسان کی جنم کنڈلی میں لکھا ہے! ناول کا حاصل قنوطیت اور ہمہ گیر ناامیدی ہے۔ تکنیکی نقطہ نظر کے تحت اس میں قاری کو شعور کی رو کا بھی احساس ہوگا۔ ساتھ ہی وہ اسے ناول کے بجائے اینٹی ناول (Anti - Novel) بھی نظر آئے گا۔

کچھ نقاد ۱۹۸۰ء کے بعد کے ناولوں کو کہ جن میں ہیئت اسالیب و تکنیک کے تجربے ہیں اور موضوعاتی نیرنگی ہے، شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے یہ تجربات کا ایک تشکیلی مگر عبوری دور ہے۔ تجربات کی گرد بیٹھنے کے بعد ہمیں پتہ چل جائے گا کہ کون ناول نگار معیاری ناول نگار کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ ہمارے آج کے ناول نگاروں کی اکثریت پر مغرب کے اثرات ہیں جو کہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ ناول کی ریڈابیلیٹی (Readability) کسی طور سے متاثر نہ ہو۔ آج کا قاری ہو کہ کل کا قاری اسے ناول سے لطف یا حظ اٹھانے، اسے دلچسپ پانے اور اس کی فکر یا

([illegible])



نثار احمد نثار

آنکھ کے رستے سے گزروں نیلگوں ہو جاؤں میں
یا دہانِ زخم سے نکلوں کہ خوں ہو جاؤں میں

بس مری اک جست میں دریافت ہوگا آسماں
جب کبھی بھی سوچ لوں مثلِ جنوں ہو جاؤں میں

سرکشی ان کی انہیں جانے کہاں لے جائے گی
بیکراں دریا کی لہروں کا سکوں ہو جاؤں میں

حکم پھر مجھ پر ہی صادر کر گیا شاہِ زماں
اس کی سرتابی کروں یا سرنگوں ہو جاؤں میں

ساز پر اپنی سماعت تک بھی آمادہ نہیں
اب یہی تدبیر ہے سوز دروں ہو جاؤں میں

● Begumpur, Samastipur,
848101 (Bihar)



شاهد اختر

خود پھنس گئی ہے اپنی ہی دلدل میں کائنات
اتری ہے میرے ساتھ جو دنگل میں کائنات

پھر نامراد وصل پہ راضی نہیں ہوا
اور ہاتھ سے نکل گئی اک پل میں کائنات

گزرے گی اس طرف سے بھی اس پار کی ہوا
رکھنا ذرا سنبھال کے آنچل میں کائنات

اک لمحہ بیٹھتی ہی نہیں چین سے کبھی
اب کے برس کچھ اور ہے ہلچل میں کائنات

بے چین ہے تو ہو گی، اب اس کا علاج کیا
اپنی خوشی سے آئی ہے مقتل میں کائنات

اتنی حواس باختہ پہلے کبھی نہ تھی
پیہم ابھرتی ڈوبتی پل پل میں کائنات

ہم نے بھی کس کے باندھ لیا ہے شب وصال
ڈھیلی پڑی ہوئی تھی جو کمبل میں کائنات

● Moh. Mughalpura,
P.O. Sasaram - 821115 (Bihar)

شگفتہ یاسمین

ذرّہ تھی اک نظر میں ستارہ بنا
مجھ کو تیری نگاہ نے کیا کیا بنا

ہجرت اسیر میری نگاہوں نے یار
ہر رہگزر پہ نقشِ کفِ پا بنا

میرے جنونِ عشق کے رنگوں کی لہر۔
ساحل کی ریت پر میرا چہرہ بنا

میں اُس کو کائنات سمجھتی رہی
اُس نے مری وفا کو تماشہ بنا

اک بوند بھی نہیں کہ تجھے نذر میں کرو
فرقت نے میری آنکھ کو صحرا بنا

لہروں کے شور نے، میرا کل سطح آب
چہرہ مٹا دیا کبھی چہرہ بنا

غم ہائے روز و شب سے الجھتی میں کب تک
میں نے شکستِ ذات کو دنیا بنا

اے یاسمین دیکھنا دیوارِ عشق
بادِ صبا نے میرا سراپا بنا

● C - 3 Arika Apt, Block - 16,
Gulshan-e-Iqbal, Karachi (Pak)



سمیرا ناظم
C/o. Hyder Enterprises, Karobari Complex
Jail Road, Raichur - 584101 (Kar)

دو بیل

"اماں ! دھان کے کھیت نہیں رہے، کہاں گئے ؟"
لسم چھوٹے راٹھور کی نیلے رنگ کی بنیان کو تار پر پھیلاتے ہوئے بولی۔ اماں نے پچھتے والے باورچی خانے میں لال مٹی سے لپے لکڑی کے چولھے پر توا الٹا رکھا اور اپلے چولھے میں جھونکتے ہوئے اک ذرا کسم کی طرف دیکھا، کچھ خشمگیں کے سے انداز میں، پھر پیتل کے تھالے میں لندھے آٹے سے ایک پیڑا بناتے ہوئے بولی۔ "اتنے سال بعد میکے آئی ہے اور آتے ہی سوال پہ سوال کئے جا رہی ہے ۔ کسم آخر تجھے ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہوا ہے بھلا اماں ؟" کسم نے یونہی گیلے ہاتھ اپنی ساڑی کے آنچل سے جلدی جلدی رگڑ رگڑ کر پونچھے اور بالٹی کا بچا ہوا پانی گملے میں ڈالتے ہوئے اماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"تم ہی کہو۔ بلکہ کچھ سوچو ذرا۔ کتنا بدل گیا ہے، وہ وہاں بکائن کا درخت تھا اور وہاں حوض کے پاس لکڑیاں رکھی جاتی تھیں اور جہاں تم مسالہ پینے کی سل رکھتی تھیں اس کے پاس ہی تو پانی کی ٹنکی تھی اور چوکی کے پاس برآمدے میں بڑا سا لوٹا، گاگر اور الگنی پر تولیہ لٹکا رہتا تھا اور پھر ندر بابو جی کی بیٹھک میں ادھر کرشن جی کی مورتی کے نیچے تمہارے سنگھاردان کے پاس، گدے دار، نرم، سفید چادروں سے مزین فرش ہوا کرتا تھا، اور ادھر مشرقی گوشے میں۔ شیشم کی چوکور دادا جی کی بڑی میز! ماں سب کہاں گئے ؟ اب تو سب کچھ بدل گیا ہے، کچھ بھی نہیں رہا؟ میں.... میں اگر اتنے برسوں نہیں آئی تو کیا سب کچھ بدل جانا ضروری تھا؟ کسم کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے اور پیڑھی پر ترچھا بیٹھ کر آنچل منہ پر رکھ کر جیسے سسکیاں روکنے لگی۔ اماں نے روٹی کو اور چمٹے سے آنچ کو ایک طرف کر کے پلٹ کر کسم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے بولی۔

"کسم! اب اتنے سالوں بعد تک وہ سب کچھ جیسا کا ویسا رکھنا ممکن نہ تھا اور پھر تمہارے پتاجی کے گذر جانے کے بعد سارا کچھ انتظام، راجشور اور گوتم نے سنبھال لیا۔ بٹیا! وہ تو میری اتنی ہی سنتے ہیں جتنی انہیں کرنا ہوتا ہے، باقی کچھ تو اپنی مرضی سے کرتے ہیں!"

"تم نے کچھ کہا نہیں ؟ روکا نہیں ؟ جب بکائن کا درخت کٹا۔ ! میرا جھولا جو تھا اس پر!" کسم نے ایک دم سے تڑپ کر اماں کی آنکھوں میں دیکھا۔ تم تو جانتی تھیں! اور پھر وہ اپنی سسکیاں روکنے میں ناکام ہونے لگی!

اماں نے اسی لمحہ کسم کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "اس وقت کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ راجشور اپنے لیے کمرہ بنوانا چاہتا تھا۔ راجشور کی بیوی انگریزی جانتی ہے، اور تو اور نہ صرف بکائن کا درخت کٹا بلکہ مچھلیوں والا حوض بھی توڑنا پڑا۔ اُدھر باغیچہ لگا ہے پھولوں کا۔ مگر تو کیوں سوچتی ہے اتنا کچھ ! اب اپنی بیٹی کی سگائی کرنے آئی ہے، سکھی سکھی سب کام نمٹا۔ ویسے بھی جب بیٹیاں پرائی ہو جاتی ہیں تو میکے میں ان کی یاد کے سوا ان کا اپنا کیا رہ جاتا ہے!" کہتے کہتے اماں کی آواز بھی بھرآنے لگی اور اماں کی گود میں، اماں کی خوشبو میں لیٹے لیٹے کسم کو اک عرصے بعد یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی مٹی میں آگئی ہے۔ مگر مٹی کی سگھند میں پرایا احساس ہے، پرائی ماتا! کیا ایسا ہو جاتا ہے کہ بیٹی کے پرائی ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کا بچپن، ہنسی، کھلونے اور نقش بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ اس راکھ کی طرح جو چولھے میں لکڑیوں کے بدن سے جھڑتی ہے اور جھڑ کر، پھر کہیں، کسی گھورے میں پھینک دی جاتی ہے، یا اگر بتیوں سے سلگتی ہے۔ یا پھر ماتھے پر لگائی جاتی ہے۔ میکہ اور راکھ۔ !! وہ ایکدم سے اماں سے کچھ پرے ہٹ کر بیٹھ گئی اور یونہی چپ چاپ سی بیٹھی راکھ کو چولھے میں دیکھتی رہی۔ اماں نے گیلی آنکھیں پلو سے صاف کیں۔ توا پھر صافی سے پونچھا اور روٹی ہاتھ پر تھپک کر توے پر ڈال دی اور جس وقت لال رنگ کی چھینک میں اس نے روٹیاں رکھنی شروع کیں تو کسم کا چھوٹا بیٹا راٹھور بھاگتا ہوا وہاں آگیا، اس کے ہاتھ میں کچی کچی، چھوٹی چھوٹی آمبیاں تھیں، جنھیں وہ کتر کتر کھا رہا تھا!

"اماں ! کیا رماکانت درماتاؤ کا آموں کا باغ ابھی تک ہے ؟" آمبیاں دیکھ کر کسم کو رماکانت تاؤ یاد آگئے ان کے کئی اک آم کے باغ تھے۔ اس کا دل تھوڑا سا کھل اٹھا، بے اختیار ہی وہ راٹھور کو اپنی طرف بانہہ سے پکڑ

کر کھینچنے لگی اور اس کے ہاتھ سے آسی لینے لگی۔

"ہاں شاید ہے، بہت عرصہ ہو گیا، ادھر میرا جانا نہ ہوا۔ تمہارے تاؤ بھی بس اب کبھی کبھی آتے ہیں!" کہتے کہتے اماں نے اک اور روٹی سینکنی شروع کر دی۔

کسم نے دانت سے ننھی آسی کا اک ٹکڑا کاٹا تو اس کا ذائقہ ایکدم بدل گیا، اسے ایکدم سے پتہ نہیں کیوں کیسی عجیب سے خوشی ہوئی، ہری ہری آسی سے اس کے بچپن کی مہک آرہی تھی اور آسی کے چھوٹے سے گھنڈی نما منہ سے اک عجیب قسم کا کسیلا اور کڑوا سا رس بہہ کر سبز چھلکے پر دور تک سوکھ گیا تھا اور وہ یونہی دیر تک بیٹھی رہ گئی۔ وقت کہاں سے کہاں چلا گیا تھا، آج وہ رتن گری جہاں اس کی سسرال تھی، یہاں اپنے میکے مادھو پور آئی تو اسے سب کچھ بدلا بدلا لگا۔ ایک بار پتاجی کے مرنے پر آئی تھی۔ پھر بشویشور کانت، اس کے پتی کا جگہ جگہ تبادلہ ہوتا رہا اور وہ اس کے ساتھ نجانے کہاں کہاں گھومتی رہی، اب بڑی لڑکی رتو اٹھارہ برس سے اوپر ہو گئی تھی اس کا بیاہ یہیں مادھو پور کے پاس کیلاش سٹی میں بشویشور کے کسی دوست کے لڑکے کے ساتھ طے ہوا تھا لڑکا شوگر فیکٹری میں منیجر تھا، ذاتی مکان تھا، اچھے پڑھے لکھے لوگ تھے، بشویشور نے بنا تردد کے رشتہ طے کر دیا اور کیلاش سٹی جانے سے پہلے اس نے جب بشویشور سے مادھو پور چند دن آنے کے لیے کہا تو بشویشور مان گیا، یوں بھی کسم کی ماں اور بھائیوں سے مشورہ لینا بھی ضروری تھا۔ مگر یہاں اتنے دنوں میں سب کچھ کتنا بدل گیا تھا، کسم اتنے دن بیت جانے پر بھی اک اپنی ہی پرانی دنیا میں جی رہی تھی، اپنے من کی دنیا میں، جو لڑکی اپنی شادی کے بعد کبھی بھلا نہیں پاتی۔ شاید وہ اپنا جھولا بھی نہیں بھلا پاتی اگر اس کے میکے کے درخت اس کی یاد کی ڈالیوں سے بندھے رہیں!!

شام کو اس نے باہر چارپائی بچھوا کر پہلے ہی کی طرح سے روٹی نکالی اور کڑم کے ساگ سے مکئی کی روٹی کھانے میں اسے بڑا مزہ آیا حالانکہ راٹھور اور رتو، اندر، چھوٹے کمرے میں میز پر چاول گوشت اور کڑھی ... تھے، راٹھور بار بار آکر اسے بلا رہا تھا۔

... کڑھی اور مکھن سے چاول بڑے اچھے لگ رہے ... کھا رہی ہو۔

... شفق کو دیکھا، شفق

"ہاں! صبح پھر راٹھور اور رتو نکلنے نہیں دیتے!"

تو پھر چل، روشنی تو ابھی ہو گی ہی، ویسے بھی گھر یہیں پاس ہی میں ہے۔ اماں نے سرہانے رکھی شال کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔

وہ بھی چارپائی کے نیچے رکھے اپنے چپل پہننے لگی۔ زرد ساڑی کا سنہرا آنچل سر پر لئے وہ اماں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی گئی اور پتہ نہیں اس لمحہ اس کا دل اک الھڑ لڑکی کی طرح دھڑکنے لگا! جس وقت وہ دونوں لکشمی تائی کے گھر پہنچیں۔ وہ گھرونچی پر کپڑا لپیٹ رہی تھیں اور کچے آنگن سے پانی کے چھڑکاؤ کی خوشبو ابھی تازہ اٹھ رہی تھی۔ سفید چاندنی والے اک چوڑے پلنگ پر تائی نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا اور جب کسم، ساٹن کے ملائم گاؤ تکیے سے کمر لگا کر بیٹھی تو اسے اک عجیب سے سکون کا احساس ہوا، یہاں آسمان اپنا لگتا تھا اور سب کچھ اپنا اپنا۔ وہ نلکا۔ جو امرود کے درخت کے پاس تھا اور جس سے ٹھنڈا پانی نکال کر وہ وہیں، پتھر پر بیٹھ کر، برج موہن کے سامنے ہی نہایا کرتی تھی اور چمکیلی دھوپ میں گیلے کپڑے سکھاتے سکھاتے برج موہن جلدی سے بندر کی سی چستی کے ساتھ امرود کے درخت پر چڑھتا اور نیچے اس کے لیے امرود توڑ کر پھینکتا اور وہ انہیں جلدی جلدی اپنے دوپٹے میں بھر لیتی اور پھر اک دفعہ اس کے پیر پر قینچی گر پڑی اور زخم کسی طرح بھرنے نہ آیا۔ مگر پھر برج موہن اسے روز اپنی سائیکل پر بٹھا کر سرکاری ہسپتال لے جاتا اور مرہم پٹی کرواتا۔ راستے بھر نہر کنارے چلتے چلتے وہ برج موہن سے، برج موہن کی پیٹھ سے گال لگائے لگائے طرح طرح کی ڈھیر ساری باتیں کیے جاتی۔ نہر کا وہ دور تک پھیلا ہوا پانی اور تیرتے ہوئے وہ ٹوکرے اور اک لمبی کچی سڑک!

اس دوران لکشمی تائی نے اس سے جو بھی باتیں پوچھیں وہ ان کا ٹھیک طرح سے جواب نہ دے پا رہی تھی، کھوئی کھوئی سی رہی، تبھی برج موہن آگیا، سانولا سا، لمبا کرتا اور پاجامہ پہنے اور ہونٹوں پر مسکین سی مسکراہٹ لیے۔ نمستے! کہہ کر وہ وہیں پلنگ پر اک ذرا کنارے بیٹھ گیا۔ وہ چپکے چپکے اسے دیکھے گئی۔ اسے لگا برج موہن ویسا ہی ہے، ذرا بھی نہیں بدلا، لگتا ہے سب کچھ وہیں کا وہیں رکا کھڑا ہے!

جب وہ برج موہن سے بات کرنے کے بارے میں سوچنے لگی تو برج موہن باہر کسی کے بلانے پر اٹھ کر چلا گیا۔ اور لکشمی تائی نے وضاحت کے لیے بتایا کہ کھیتوں پر کٹائی شروع ہونے والی ہے اور برج ...ہن آج کل اسی کام میں بہت مصروف ہے، اور اس بار اس نے ... اگائی تھی۔

... گنہ کا رس اور کچالو اسے بالکل بھی اچھے نہ ... تک وہ غیر ارادی طور پر ... ۳۰ کی ماں

...OT (Bihar)

Moh. Mughalpura,
P.O. Sasaram - 821115 (Bihar)

لکشمی تائی سے وداع لے کر چلنے لگیں تو باہر برآمدے تک آئیں اور برآمدے سے کچھ اور باہر آئیں تو انہیں اک احاطے میں، ٹین کے شیڈ تلے، اک لال رنگ کی موٹر نظر آئی۔ کسم نے اپنے ساتھ چلتی اماں سے پوچھا۔ "اماں یہ کیا ہے؟ اماں یہ تو؟"

تو اماں نے کہا۔ "ٹریکٹر ہے! برج موہن نے خریدا ہے!"

"تو کیا اب بیل نہیں رہے؟" کسم نے بڑی ہراس بھری نظروں سے اماں کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ اب بیل نہیں رہے!" اماں آہستہ سے بولی! ▬

بقیہ صفحہ ۲۷ : تعاقب

اس دن میں نے شراب کو چھوا تک نہیں تھا۔ بیل دبائی تو بیوی نے دروازہ کھولا مجھے دیکھ کر تعجب خیز انداز میں چیخ پڑی اور بے ہوش ہو گئی میں اس کی طرف دوڑا۔ پھر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ بھی نہ تھا۔ بیوی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آنے لگی۔ مگر دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔۔۔ آپ کے ساتھ وہ بھی تھا۔ وہ کون۔۔۔ وہی۔۔۔ ہاں ہاں وہی۔۔۔۔۔۔!! میں سمجھ گیا تھا کہ بیوی بھی وینکٹ رمن کو بھلا نہیں پائی ہے۔ اس کی یادیں ہمارا تعاقب کر رہی ہیں۔ اسے بھلانا اب مشکل ہے۔

بیوی جب ہوش میں آئی تو گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی وہ ٹکٹکی لگائے سلنگ فین کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ ادھر مت دیکھو۔۔۔ میں اسے بار بار کہہ رہا تھا۔ اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ مگر اس نے تو جیسے اپنی نظروں کے تیر چھت میں گاڑ دیے تھے۔ پھر اس نے انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔ میری نظریں بھی پنکھے کی جانب اٹھ گئیں تو میں اپنے آپ کو حیرت و خوف کی خلیج میں گرتا ہوا محسوس کرنے لگا۔۔۔

کیونکہ اب کی دفعہ پنکھے سے وینکٹ رمن نہیں میں خود لٹک رہا تھا۔ ▬

بقیہ صفحہ ۱۵ : کلینڈر

غرق!"

"لیجئے بھیا کلینڈر۔ آپ بھی غضب کے آدمی ہیں کہ اتنی رات گئے آپ کو کلینڈر کی سوجھی۔"

"ارے بھائی یہ کیسا کلینڈر دیا ہے تم نے؟ اس میں تو ڈیٹ کوپن ہی اکھڑا اکھڑا سا ہے۔"

"لے جائیے بھیا! سارے ڈیٹ کوپن بس پن اَپ کر دیے گئے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہیں کتنی تیز ہوا چل رہی ہے۔"

"ہاہا۔ ڈیٹ کوپن۔۔۔!!" میں جیسے قہقہے کے بگولے میں گھر گیا۔

ہڑبڑا کر میں اپنی دکان کی جانب بڑھا ہی تھا کہ یکایک 'ہری بول، بول ہری' کی آوازوں سے ہنگامہ ہاؤ ہو کے بعد دہشت زدہ خموش فضا لرز اٹھی۔ دوسری تمام آوازیں دم توڑ چکی تھیں۔ لائٹ یکایک گل ہو گئی تھی۔ میرے سارے ہمزاد جیسے میرے اندر سہم کر دبک گئے تھے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا ڈیٹ کوپن کو اڑا لے گیا۔ میں نے ماتمی جلوس کی ہلکی روشنی میں دیکھا کہ ایک پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ ڈیٹ کوپن ارتھی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میں سڑک پر شل ہاتھوں میں سادہ کلینڈر لیے ساکت و جامد بس اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔

کلینڈر کے نقش و نگار کو تاریکی مکمل طور پر نگل چکی تھی۔ ▬

بقیہ صفحہ : لاکرز میں بند آوازیں

سخت حیران ہے کہ وہ درمیان کے لوگ کیا ہوئے۔ وہ، جو گئے وقتوں اور نئی نسل کے درمیان میں پل بنا کرتے تھے۔

ہر طرف ایک ہر بونگ مچی ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ شور ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔ گاؤں کے چوپالوں اور گلیاروں، شہر کے گلی محلوں اور دکانوں کے تھڑوں پر رعشہ زدہ ہاتھ ہیں، جن کا کوئی شمار نہیں۔

مردہ خانوں سے دس دس، بیس بیس سال پرانے پوسٹ مارٹم کیے گئے مردے اپنے دولخت سروں اور موٹے بخیے سے سلے ہوئے پیٹ کو تھامے ہوئے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹوں کے خستہ اوراق کے انبار ابھی کچھ ہی دیر پہلے اُجاڑ غیر آباد کنوئیں میں جھونک دیے گئے۔

کوئی کہتا ہے :

"اُمتِ وسط کیا ہوئی؟ کہاں گئے وہ لوگ، جو اس نسلی خلیج کو پاٹ دیا کرتے تھے؟؟"

رات کا پچھلا پہر ہے اور اُجاڑ کنوئیں کی منڈیر پر جھکے ہوئے دو بوجھل وجود کنوئیں کی سمت مسلسل جھکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ▬

زرِ سالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے میں اپنا تعاون دیجئے۔



خواب اکبر آبادی

زمیں سے دور ستاروں پہ لے گئی مجھ کو
نئے جہان دکھاتی ہے آگہی مجھ کو

کبھی جو دیکھے تواریخ کے ورق میں نے
لہو میں ڈوبی نظر آئی ہر صدی مجھ کو

دلِ تباہ کا نغمہ کسے سناؤں میں
دکھائی دیتی ہے ہر سمت بے حسی مجھ کو

ہر اک لطیف و حسیں شے سے خوف آتا ہے
یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی مجھ کو

مری نگاہ سے گذرا جو خواب گیتاسار
نصیب ایک نئی روشنی ہوئی مجھ کو

A - 2, Kamla Nagar, Agra - 4 (U.P.)

انور شمیم

دریا کا اور چھور بھی ہے؟ اور زمیں ہے کیا
منظر نگاہ کے لئے کوئی حسیں ہے کیا

کیوں قتل کے لئے مجھے جنگل میں لے چلو
گھر ہی بہت ہے، گھر ہی میں ہوتا نہیں ہے کیا

گر حادثوں کے خوف سے نکلو نہ شہر میں
محفوظ اپنے گھر میں رہو گے یقیں ہے کیا

تم نے تو پھر پلٹ کے بھی دیکھا نہیں کبھی
تم سے بچھڑنے والا وہیں کا وہیں ہے کیا

جس وادیِ حسین کی مشکل ہے اب شناخت
لت پت لہو میں یہ مرا خلد بریں ہے کیا!

Sadar Bazar, Samastipur - 848101 (Bihar)



عقیل گیلاوی

علامت، استعارے اور یہ پیکر کرائے کے
کہ اس شوکیس میں جتنے ہیں سب منظر کرائے کے

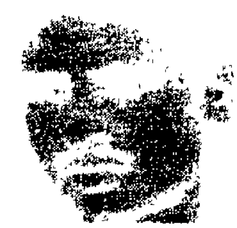
پرندے منہمک ہیں برف کی تحریر بینی میں
فضا میں دور تک بکھرے ہوئے شہپر کرائے کے

کہاں تک زندگی محفوظ رہتی ایسے عالم میں
ہمارے سر پہ آویزاں رہے خنجر کرائے کے

تقاضوں کے سنہرے پھول ہر موسم میں کھلتے ہیں
لچکتی شاخ پر روشن رہے زیور کرائے کے

مخالف سمت سے یلغار کی بھرپور تیاری
ادھر بے انتہا سہمے ہوئے لشکر کرائے کے

C/o Paradise Clinic, Aramore Wasseypur, Dhanbad. (Bihar)



الف ۔ ناظم

سنہری اوس کا قطرہ نہیں میں
کہ سورج کی خبر رکھتا نہیں میں

فضاؤں میں اڑا کرتا ہوں اکثر
پرندہ کوئی پربستہ نہیں میں

شریکِ حال ہیں سب دھوپ سائے
ہو رستے کا شجر، تنہا نہیں میں

ابھی جانو نہ مجھ کو خشک پتہ
ابھی تو شاخ سے ٹوٹا نہیں میں

نہ ہو جس پر کوئی بھی موڑ ناظم
کبھی وہ راستہ چنتا نہیں میں

Ward No. 19, Bisalpur, Dist Pilibhit. (U.P.)



اقل اجنبی

ہوا سی آگ سی پانی سی دھوپ سی گزری
کن امتحانوں سے بھی اپنی زندگی گزری

تمام پھول اسی وقت ٹوٹ کر بکھرے
مرے قریب سے خوشبو جب آپ کی گزری

مرے ضمیر کی چٹان کو نہ کاٹ سکی
ہزار دل سے تمناؤں کی ندی گزری

ہزار کوششوں کے بعد بھی نہ سو پائے
ہر ایک رات کی جیسی یہ رات بھی گزری

اندھیری راتوں میں تیرے خیال و نام کے ساتھ
نہ جانے کتنے چراغوں کی روشنی گزری

8/15, Bar Faujdaran, Daulat Ganj, Gwalior - 1 (M.P)

فضل حسنین
A - 7, Patrakar Colony, Ashok Nagar
Allahabad - 211001



محفل خواب

میدانِ ادب میں داخلہ پانے کے لیے ایک قلمکار کو کن کن صعوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ تو اس کا دل ہی جانتا ہوگا لیکن دشوار ترین منزل تب آئی جب ہمیں ایک ادیب کی حیثیت سے برداشت کر لیا گیا اور ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے ہمارے پاس باقاعدہ دعوت نامے آنے لگے۔ کچھ دنوں تک تو اس ایڈونچر سے ہم یقیناً محظوظ ہوتے رہے لیکن آخرش وہ موقع بھی آ ہی گیا جب ہمیں ادبی سیمینار اور سمپوزیم میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہونے لگا اور بہت جلد ہمیں احساس ہو گیا کہ ان محفلوں میں دانشوری کا مظاہرہ نہایت اذیت ناک ہوتا ہے (سامعین کے لیے) اور ہم سیمینار کے مقررین اور مقالہ نگاروں کی جائز و ناجائز قابلیت سے کہیں زیادہ سامعین کی قوتِ برداشت کی داد دینا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ایک عرصہ سے اس طرح کے سیمینار یا سمپوزیم میں شرکت کرتے ہوئے ہم نے پایا کہ ماہرین ادب اگر کبھی کسی مدعے پر متفق نظر آئے بھی تو عموماً لایعنی باتوں پر۔ مثلاً غالب قمار بازی و مے نوشی کے اتنے رسیا تھے کہ ان مشاغل کے طفیل اکثر ذلیل و خوار ہی نہ ہو جاتے بلکہ مے نوشی کے لیے قرض لینے میں بھی عار نہ محسوس کرتے اور قرض ادا نہ کر پانے کی صورت میں ایک بار تو عدالت میں حاضر ہو کر فی البدیہہ شعر کہہ کر اپنی گلو خاصی کرانی پڑی۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اسی طرح فانی بدایونی کے بارے میں ہم نے دانشوروں کو اسی غم میں ماتم کرتے ہوئے پایا کہ مرحوم نے نہایت تنگدستی و محرومی کی زندگی گزاری۔ حالانکہ تصویروں میں فانی جس طرح کی شیروانی زیب تن کیے نظر آتے ہیں، ہم اگر اتنا قیمتی کپڑا کسی طرح خرید بھی لیں تو اتنے اچھے ٹیلر سے اسے سلانے کی ہمت شاید ہی کر سکیں۔ غرضیکہ آج تک کسی سیمینار میں کوئی تعمیری یا نئی بات سننے کا اتفاق اس عاجز کو نہ ہو سکا۔ اس وقت اپنے ایک حریف نما دوست کا واقعہ یاد آ رہا ہے جو شاعری میں مبتلا رہنے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً نثاروں کی صف میں بھی آ کھڑے ہونے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

ہوا یوں کہ ایک مقامی درس گاہ میں علامہ اقبال پر سیمینار منعقد ہو رہا تھا لیکن باہر سے آنے والے خصوصی مقرر نے عین موقعے پر معذرت نامے کا تار بھیج دیا کیونکہ اسی تاریخ کو کوئی سرکاری تقریب فاضل مقرر کے ہاتھ لگ گئی تھی جو ہر اعتبار سے زیادہ سودمند تھی۔ چنانچہ ہم نے از راہِ مذاق اپنے دوست شاعر سے کہا۔ "ایسا نادر موقع کب ہاتھ آئے گا۔ کیوں نہ آج آپ ہی میدان یعنی سیمینار مار لیں۔" اس پر موصوف نے عاجزانہ لہجے میں فرمایا "اقبال پر میں ادھر کچھ دیکھ نہیں سکا۔"

"اقبال نے ادھر کچھ کہا بھی نہیں۔" ہمارے منھ سے بے اختیارانہ طور پر نکل ہی گیا۔ بس اتنا سا اشارہ کام کر گیا اور جناب نے اپنی سابقہ معلومات کے بل بوتے پر ہی سیمینار میں ایسی دھوم مچا دی کہ نومشق سامعین عش عش کر اٹھے البتہ تجربہ کار قسم کے سامعین موصوف کو اسٹیج پر دیکھتے ہی مراقبے میں چلے گئے۔

ممکن ہے آپ کو ان محفلوں سے زیر بار ہونے کا شرف ہنوز حاصل نہ ہو سکا ہو۔ اس لئے ان صبر آزمائشوں کی اذیت دہی پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے آپ کو ایک بار آگاہ کر دینا ہم اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں۔

ادبی سیمینار یا سمپوزیم کے انعقاد کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ موضوع کے انتخاب کا ہوتا ہے کیونکہ ماہرین سیمینار کا عقیدہ ہے کہ عنوان جس قدر خشک ہوگا، سیمینار کی کامیابی کے امکانات اسی قدر روشن ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سیمنار کا موضوع منتخب کرتے وقت ماہرین ادب اپنی تمام تر لیاقت صرف کر دیتے ہیں۔

خدا خدا کر کے جب یہ منزل سر ہو جاتی ہے تو ایسے مقالہ نگاروں اور مقررین کی تلاش شروع ہوتی ہے جو خشک سے خشک تر تقریر کرنے میں مہارت رکھتے ہوں۔ چونکہ خالصتاً خشک قسم کی تقریر کرنا اتنا

آسان بھی نہیں اس لئے ان مخصوص مقررین کے دستیاب نہ ہوپانے کی صورت میں اکثر سیمینار ملتوی ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اس معاملے میں اگر ذرا بھی چوک ہوئی اور کسی مقرر نے مغالطے میں ذرا بھی دلچسپ قسم کی تقریر کردی تو سمجھئے کہ بس سیمینار گیا اور منتظمین کی نااہلی کا بھانڈا پھوٹا۔ اس کام کے لئے عموماً اعلیٰ درس گاہوں کے اساتذہ کی خدمات لی جاتی ہیں جو ایک ہی طرح کا کورس بیس تیس برس تک مسلسل پڑھاتے رہنے کے باعث کسی موضوع پر ایک ہی تقریر بار بار دھرانے میں ذرا بھی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ جس طرح مشاعروں کے لئے شعراء کو مدعو کرنے میں گروہ بندی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح اس کام میں بھی اب اس پہلو پر خصوصی توجہ دی جانے لگی ہے کہ ان محفلوں کا تعلق بھی بہر حال ادب ہی سے ہے۔

ان محفلوں کے مقررین کے لئے دوسری بات جس کا لحاظ رکھنا اشد ضروری ہے، یہ ہے کہ ان میں ایک دوسرے کی نفی کرنے کا فن باہم عروج پر ہونا چاہیے ورنہ اگر ان کا پیش رو کسی مخالفت کے بغیر صاف بچ کر نکل گیا تو پھر سیمینار یا سمپوزیم کا مقصد ہی کیا رہ جائے گا۔

ان دانشوروں کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ وقتِ مقررہ سے کچھ زیادہ دیر تک بولیں ورنہ پھر اس گھنٹی کا کیا مصرف رہ جائے گا جو عاجز آکر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے گویا کہہ رہی ہو کہ "حضرت! آپ کافی بور کر چکے۔ اگر آپ اب بھی خاموش نہ ہوئے تو محفل بچے کھچے سامعین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی۔" لیکن مقررین کے لئے مشکل یہ ہوتی ہے کہ گھنٹی کے احتجاج سے قبل اگر وہ خاموش ہوگئے تو کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ موصوف اس فن میں ابھی کچے ہیں۔ اس کوشش میں تو ہم نے اکثر یہ بھی دیکھا ہے کہ کسی مقرر کا مقالہ یا حفظ کی ہوئی تقریر اگر متعین مدت سے کچھ قبل ختم ہوگئی تو موصوف گھنٹی بجنے کے انتظار میں اپنی تقریر کو دہرانے لگتے ہیں۔ چونکہ ادبی محفلوں کے سامعین ان تقریروں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینے کے اصول پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں اس لیے مقرر کی یہ حرکت عموماً گرفت میں نہیں آتی البتہ ایسے مقررین اکثر پکڑ لئے جاتے ہیں جو اپنی اصل تقریر سے فارغ ہوجانے کے بعد گھنٹی بجنے کے انتظار میں موضوع سے ہٹ کر بولنے لگتے ہیں کیونکہ سامعین میں کچھ تو ایسے کچے ہوتے ہی ہیں جو گاہے گاہے ان تقریروں پر دھیان دے ہی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر گھنٹی بجنے سے قبل سامعین ہی بجھنے لگتے ہیں کیونکہ سامعین میں بہر حال اکثریت ایسے مظلوموں کی ہوتی ہے جو دل ہی دل میں ہر مقرر سے فریاد کرتے رہتے ہیں ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو آنکھ لگ گئی تیرے فسانے میں

(اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں)

کبھی کبھی ایک نہایت دلچسپ منظر ابتداء میں ہی دیکھنے کو مل جاتا ہے جب کوئی نو مشق سیمینار یہ کسی اور موقع کے لئے لکھوائی گئی تقریر نشر کرنے لگتا ہے۔ چونکہ نئے مقرر کے ابتدائی کلمات پر سامعین اس امید پر کچھ توجہ دے ہی دیتے ہیں کہ شاید موصوف کی تقریر میں کوئی نئی بات ہو لیکن یہ جان لینے کے بعد کہ حضرت ایک کہنہ مشق "سیمینار باز" ہیں، سامعین حسبِ روایت بے اعتنائی فرماتے ہوئے سیمینار کے اختتام کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان محفلوں کا اختتام تو اور بھی مایوس کن ہوتا ہے کیونکہ ایک طویل مدت تک پوری کامیابی کے ساتھ برقرار رکھی جانے والی بے کیفی کو کم کرنے کے لئے ان نشستوں میں چائے وغیرہ کا اہتمام بھی عموماً نہیں کیا جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پورے وقت تک خشکی و بے لطفی سے ہمکنار سامعین آخر میں کچھ راحت محسوس کرلیں اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے۔ اگر کسی سیمینار سے اس قسم کی بدعنوانی کی خبر مل گئی تو اسے نہایت کمزور قسم کے سیمینار سے تعبیر کیا جاتا ہے (صرف اور صرف کھانے کے لیے منعقد کئے جانے والے سیمینار ایک الگ موضوع ہے۔)

ان تقریروں کا سلسلہ ختم ہونے پر سامعین کچھ دیر تک راحت کی سانس بھی نہیں لے پاتے کہ ایک اس سے بھی زیادہ اذیت ناک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ سوال و جواب کا دور ہوتا ہے جس میں عموماً سوال برائے سوال کرنے کی ہی کوشش کی جاتی ہے اور اس بات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ سوال ایسا ہو جس کا جواب حتی الامکان ممکن ہی نہ ہو ورنہ پھر سوال کرنے والے کی قابلیت کا لوہا کیسے مانا جائے گا۔ بعض حضرات کو تو ہم نے اپنا سوال ختم کرنے کے بعد فوراً خود ہی جواب دیتے ہوئے بھی پایا ہے۔ غالباً انھیں خدشہ رہتا ہے کہ کہیں ان کے سوال کا جواب صاحبِ معاملہ دے ہی نہ دے۔ اس لئے اپنا سوال ختم کرتے ہی فوراً جواب نشر کرنا شروع کردیتے ہیں۔

ہم آپ سے سچ بتائیں کہ جب کبھی ہمیں اچھی نیند کا لطف لینا ہوتا ہے تو ہم کسی ادبی سیمینار میں چلے جاتے ہیں اور نشست گاہ کے کسی کونے میں دیوار یا ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دو تقریروں کے بعد ہی ہم گھوڑے گدھے کیا وہاں موجود ہر چیز بیچ کر ایسا سوتے ہیں کہ پھر دری یا کرسی اٹھانے والا ہی ہمیں جگاتا ہے۔ اس بدسکونی کے دور میں بے خبری کی نیند اگر چند لمحے کے لئے ہی میسر آجائے تو اسے نعمت خداداد سمجھئے۔

لہذا اگر خدانخواستہ آپ بھی بے خوابی کے شکار ہوں تو کسی ادبی سیمینار یا سمپوزیم کا رخ کیجئے!

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۲)

ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں تعریفی و توصیفی خطوں کے درمیان طویل تجزیاتی خطوط کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ خاص نمبر کے حوالے سے مشمولات پر ہوئی بحث کے تناظر میں جلد دوم کو سجایا جاسکے ۔ قارئین و قلم کاروں کے خطوط کے ساتھ اس کالم میں اور "ادبی فیچر" کے تحت طویل خطوط دیئے جارہے ہیں ۔ ابھی عالمی سطح کے اردو ناقدین کی تفصیلی آراء کا انتظار ہے ۔ ایک بات تو طے ہے کہ اتنا ضخیم نمبر اور اس میں بھی سطر در سطر اور لفظ در لفظ جہان معنی موجود ہوں ، اس کے بارے میں بغیر عمیق مطالعے کے کچھ نہیں لکھا جاسکتا ۔ مشاہیر قلم کاروں کی اپنی مصروفیات ہیں ، اپنے کام ہیں ، اپنی ترجیحات ہیں لہذا وقت لگ رہا ہے ۔ ہمیں بھی لیکن اپنا کام کرنا ہے ۔ ہمارا طریقۂ کار ذرا مختلف ہے ۔ ہم اپنی تاریخی روایت سے اکتساب کرتے ہیں ۔ اپنے اسلاف کے کاروافکار سے استفادہ کرتے ہیں ۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۷۷ء شاعر کے خاص نمبروں میں جو تجربے کیے گئے ہیں ، ہم نے اپنی ہی روایت کے ان ہی تجربوں کی توسیع کی ہے اور ایک نئی تخلیقی کائنات کو ہم عصر اردو ادب نمبر کے روپ میں متعارف کروایا ہے لہذا اس کے بارے میں اظہارِ خیال میں تاخیر کا احتمال ہے ۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم عصر اردو ادب نمبر پر بحث ہو اور خوب بحث ہو ۔ جیسا کہ بار بار لکھا جارہا ہے ، ہم صحت مند تنقید کا خیر مقدم کریں گے ۔ (ادارہ)

ابو محمد سحر

"شاعر" کا ہم عصر اردو ادب نمبر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کی اشاعت میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی۔ اسے دیکھے بغیر ہندوستان میں اتنے ضخیم، معیاری اور دیدہ زیب نمبر کی اشاعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہم عصر اردو ادب کے موضوعات و مسائل کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ نمبر ہم عصر نظم، غزل، افسانہ، تحقیق اور تنقید کے بہترین اور نمائندہ انتخاب پر بھی مشتمل ہے۔ دبستان آگرہ کے تصور کو جو استحکام اس نمبر میں دیا گیا ہے وہ ضرور اہل نظر کی توجہ کا مرکز بنے گا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی اور "شاعر" کے متعلق تحقیقی مواد ریسرچ اسکالروں کے بہت کام آئے گا۔ اس کے علاوہ فکر انگیز مذاکرے، کثیر تعداد میں مشاہیر ادب کے نادر و نایاب خطوط، ہم عصر اہل قلم کے دستخط، تصاویر، ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی منظومات، سوانحی لغت، پتے اور ٹیلی فون نمبر، غرض یہ کہ کیا ہے جو اس نمبر میں نہیں۔ اسے ہم عصر اردو ادب کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ کی محنت و جانکاہی لائق صد ستائش ہے۔

یہ نمبر مدیر کی حیثیت سے آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھی نمونہ ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت کے لیے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

● 39 - Malviya Nagar, Bhopal - 462003 (M.P.)

اویس احمد دوراں

"شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر کے متعلق کچھ لکھنے کی تاب و مجال میرے اندر نہیں ہے کہ یہ ایک بہت ہی وسیع اور گہرا سمندر ہے۔ افتخار امام صدیقی نے برسوں کی عرق ریزی اور ہر ممکن ذریعہ سے اپنی حلال کمائی سے ایک کوزہ خریدا اور اس میں اردو ادب کے بحر ذخار کو بند کردیا۔ میری عقل تو اب بھی حیران و پریشان ہے کہ "شاعر" کے عام شماروں کے باوجود اتنا ضخیم نمبر کیسے شائع ہوا؟؟ اس نمبر سے قبل میں بھی کبھی کبھی جھنجھلا جاتا تھا کہ آخر بار بار کے اعلانات کے باوجود یہ نمبر بازار میں کیوں نہیں آرہا ہے؟ حالانکہ مجھ کو آپ کی مالی دشواریوں کا بھرپور احساس واندازہ تھا مگر اس کے باوجود برسوں سے ایک ہی اعلان کہ "شاعر" کا ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر بس اب اگلے ماہ مکمل ہو کر بازار میں آجائے گا۔ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا وغیرہ وغیرہ کو یہ ناچیز بھی اکثر طفل تسلی جیسی کوئی چیز سمجھ لیتا تھا۔ مگر جب آپ کا اعلان جیتی جاگتی تصویر کی صورت میں سامنے آگیا تو دل نے بڑی خفت اور شرمندگی محسوس کی۔

"شاعر" کے ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر کے متعلق جب اطلاع ملی کہ اس کی کچھ جلدیں دربھنگہ کے بک اسٹالوں پر بھی آگئی ہیں تو میرے بڑے بیٹے جمال اویسی دوڑے دوڑے بک اسٹال پر گئے اور ۲۵۰ روپے میں اس "کوزہ" کو جس میں اردو ادب کا بحر ذخار بند ہے خرید کر لائے۔ اس کے بعد میں نے بھی الگ سے آپ کو خط لکھ کر ایک جلد کی فرمائش کی اور آپ نے فوراً بھیج دی۔ اس کی قیمت بھی میں نے بذریعہ منی آرڈر بھیج دی مگر یہ قیمت بھی اتنے عظیم الشان ادبی دستاویز کے لیے کچھ نہیں ہے۔ آپ کے قلم کی جولانیوں، آپ کی برسوں کی عرق ریزیوں اور آپ کی وہ حلال کی کمائی جو آپ نے "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں بے دریغ لگادی ہے ان کی قیمت کوئی ادا کر سکتا ہے؟ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ آپ کو داد و تحسین کی نہیں اس قیمت کی ضرورت ہے جو اس نمبر پر درج ہے یعنی دو سو پچاس روپے۔ اس کے بعد آپ کے سلیقہ اور حسن ترتیب کی بطور خاص داد دینی چاہیے کہ یہ آپ کا جائز حق ہے۔ اس داد کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جہاں پہنچ کر میں حیرت زدہ ہوں کہ ہر باب اور تقریباً ہر ادیب کے تعارف کے تحت آپ کے قلم نے اتنے پھول کیسے کھلائے؟ شعری ادب ہو یا افسانوی ادب یا تنقیدی ادب سب پر آپ نے جدا جدا لکھا ہے اور جس نثر میں لکھا ہے وہ بہت سلجھی ہوئی، متوازن اور حسین و متاثر کن ہے۔ برادر محترم اعجاز صدیقی مرحوم یاد آگئے۔ اس سلسلے میں پہلے اقبال کا ایک عظیم و حسین شعر سناؤں گا اس کے بعد خاکسار خود اپنا شعر سنانے کی اجازت طلب کرے گا کہ یہ شعر آپ لوگوں کے بھی حسب حال ہے۔ پہلے اعجاز صدیقی

مرحوم کی سادہ طرز بودوباش جس میں بہرحال ایک شانِ دلآرائی پوشیدہ تھی اس کی یاد آتے ہی اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

سوتو روضۃ الکبریٰ میں وتی آتی ہے
وہی عظمت ، وہی رفعت ، وہی شانِ دلآرائی

میری اس تعریف و توصیف کو یقیناً مبالغہ ہی نہیں بلکہ پتہ نہیں کیا کیا سمجھا جائے گا مگر میں بڑے ادب کے ساتھ معذرت طلب کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ میری اس تحریر کو تعریف و توصیف نہیں بلکہ صرف "یاد" سے تصور کرنا چاہیے۔ کسی کی یاد بھی تو مدتوں تڑپاتی رہتی ہے۔ اعجاز صدیقی مرحوم کی یاد ہنوز آتی ہے۔ وہ غریب تھے اور کروفر کی زندگی سے کوسوں دور تھے۔ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے کرب آگیں مرض کے باوجود شعر و ادب کو عبادت کا درجہ دے رکھا تھا۔ "شاعر" کے ضخیم نمبروں کی بنیاد ڈالی تھی۔ بنیاد کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مگر اعجاز صدیقی مرحوم ایک بنیاد ہی نہیں بلکہ ایک قصر بھی تھے۔ ان سے قبل علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم) جو بلاشبہ ایک نابغہ روزگار تھے۔ ان کے کارنامے حیران و ششدر کر دینے والے ہیں۔ وہ قصر الادب کی بنیاد بھی تھے۔ اور اب مجھ ایسے ذرہ ناچیز کا بھی وہ شعر سن لیجئے جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں ہے۔

ہر سانس ایک ہمالہ کئے جارہی سر
ہر لحظہ ہوتے جاتے ہیں آسان راستے

خاکسار کا یہ شعر ('لمحوں کی آواز' میں شامل غزل کا شعر) آپ کی اس خوبصورت نثر کی نذر جو شاعر کے ضخیم، ہم عصر اردو ادب نمبر' میں شروع تا آخر چراغ کی طرح روشن ہے۔ میں نے اس چراغ کی لو کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس کی قربت کا بھی تقاضہ تھا۔ (ایک طویل خط سے اقتباسات)

●Mohalla Faizulla Khan, Darbhanga, (Bihar)

عفت موہانی ——————

اسے مکمل طور پر جلد سے جلد پڑھ کے اس کے بارے میں رائے دینا ذرا دیر کی بات ہے۔ ابھی تو چوتھائی حصہ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اسے غور، دلچسپی سے اور لطف لے لے کر پڑھنے میں یقیناً ایک مہینہ لگے گا۔ یہ ضخیم نمبر یونہی سرسری طور سے پڑھنے کے قابل تھوڑی ہے۔ اتنی بلند فلک رسا ادبی عمارت اٹھانے میں آپ معمارانِ ادب نے شب و روز جیسی انتھک محنت کی ہے۔ اس شاندار عمارت کی ایک ایک لفظ کی اینٹ دیدہ ورانِ ادب سے بھرپور توجہ چاہتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی بقا و فروغ کا نعرہ لگانے والے بہت سے ہیں۔ مگر آپ کی طرح اردو زبان و ادب کے پژمردہ درخت کی آبیاری اپنے خون سے کرنے والے بہت کم ہیں۔ شور و غل، نعرے بازی، ہلڑ اور زبانی آہ و فغاں سے کسی نے کچھ نہ کیا۔ دبلے پتلے نازک سے شاعر کو اپنا خون دے کے جتنا صحت مند تندرست اور فربہ کیا ہے۔ وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس فقید المثال کارنامے پر آپ کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے۔ بہت کم ہے۔ پرچے کی دید سے جو تحیر کا عالم مجھ پر طاری ہوا تھا وہ ابھی تک قائم ہے۔

●16 - 4- 422/5, Old Malakpet, Hyderabad - 36 (A.P.)

ارشد غازی ——————

پہلے ایک شعر تمہاری نذر :

میں فکر رازِ ہستی کا پرستار مری تسبیح کے دانے، زمانے آؤ خط پڑھتے ہیں......

کوئی بھی معیاری و تحقیقی نمبر جب تک نہیں نکالا جاسکتا جب تک رسالے کے "مدیر" کی نظر زمانے کی خصوصیتوں، تقاضوں، ادبی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی تحریکوں پر گہری نہ ہو، قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ اسے ازبر نہ ہو، تاریخ کی ادبی تحریکات اور ان عوامل کا مطالعہ نہ ہو، اس کا ذہن، داخلی اور خارجی محرکات سے پاک، حال سے باخبر اور امت کے مستقبل کا ادراک رکھتا ہو لاریب! تم "شاعر" کے لیے وجہ افتخار اور اردو ادب کے امام اعظم ہو، تمہاری بے پناہ فکری صلاحیتوں نے تاثرات و احساسات کی ہمہ گیری کے باعث شاعر کو کائنات و انسانیت کا علمبردار بنادیا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ "شاعر" آج بھی روایت شکن نہیں، تمہاری ادارت میں شاعر نے بلاشبہ نئی جہتوں کے ساتھ اپنی راہوں، اپنی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔ شاعر کے حالیہ "ہم عصر اردو ادب نمبر" پر فی الفور کیا تبصرہ کروں کہ جس نمبر کی تیاری میں ذہنی و جسمانی مشقت نے کئی سال لیے، اس پر چند سطروں کا تبصرہ اس کا حق نہ ادا کر سکے گا۔ یہ نمبر تمہارے بلند اقبال ہونے کی علامت ہے۔ تمہاری سے بے پناہ محبت کے نقوش اس کے صفحے صفحے پر ثبت اس نمبر کو دیکھنے کے بعد میں یہ کہنے میں حق بجانب کہ تم اردو ادب کا وہ آئینہ ہو جس میں پستہ قد بھی خود آور محسوس کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں برس تک جوان رکھے اور تم "یونہی" اردو ادب کی خدمت کرتے رہو۔ اس قحط الرجال کے پر آشوب میں تمہارا وجود کسی بھی طرح مہر نیم روز سے کم نہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں مجھ پر زیادہ فخر کر کہ میں نے "شاعر گیہاں" افتخار امام کو نہ صرف دیکھ برتا بھی۔

E-16/21, Zakir Nagar, N. Delhi -)025

مختصر مختصر...

● رسالہ ابھی میں نے پڑھا نہیں ہے، دیکھا ہے دیکھ ہی کر دنگ رہ گیا ہوں کہ آپ نے کس غضب معرکہ سر کیا۔ آپ کا حوصلہ قابلِ داد و تحسین ہے۔

—————— نکہت بریلوی (پاکست

● واقعی بہت خوب نمبر نکالا ہے آپ نے جس لئے آپ اور آپ کے رفقائے کار تحسین و تعر کے قابل ہیں۔ آپ نے ادارت کا حق اس طرح ا کہ اصناف کے جائزے کے ساتھ اپنے ادارتی آر تفصیلی اظہار کیا ہے جس سے تمام جائزے جامع مکمل ہوئے ہیں —— ارمان نجمی (سعودی عرب

● حصہ اول کی ضخامت کو دیکھ کر آپ کی ہم استقامت، محنت اور مشقت پر دل عش عش کرا اس گراں قدر کام کی تکمیل میں آپ کو کیا کیا صعو جھیلنا پڑی ہوں گی اس کا اندازہ اس ذخیرۂ فن و تخ دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔

—————— یعقوب تصور (عرب امارا

● شمارہ میری توقعات سے کہیں اوپر ہے۔ مر طفیل صاحب کی یاد تازہ ہو گئی۔ اردو ادب کی مو کساد بازاری کے پیش نظر اس قسم کا کیم و ضخیم نمبر کر آپ نے جس جگرداری کا ثبوت دیا ہے۔ اسے د کر تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جائے گا۔

—————— کرشن کانت (بٹالہ۔ پنجاب

بکتو بات

مئی ۱۹۹۹ء

انور خان

شاعر کا مئی ۹۹ء کا شمارہ پسند آیا۔ م۔ ناگ کی کہانی 'نصاب' حالیہ اکثریتی سیاسی طبقے کے افراد کی سوچ کو ایک نئے انداز سے پیش کرتی ہے۔ م۔ ناگ کے افسانے میں طنز تو ہوتا ہی ہے، ان کا ٹریٹ بھی بہت عمدہ ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہم مسلمانوں کے سیاسی نمائندوں کی سوچ کو بھی ملا دیں تو یہ اسکیچ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہمارے سیاسی نمائندے تعلیمی اداروں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ منسٹری سے نکالے گئے تو ڈونیشن (خیرات) پر جی رہے ہیں اور اپنی سفید پوشی کی لاج رکھ رہے ہیں۔ نسیم بن آسی اور وریندر پٹواری کی کہانیاں بھی خوب ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ عام شماروں کو بھی اس قدر دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ "نقد و نظر" میں "جنگ اور امن" میں نیر مسعود کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ شاہد حمید کے اس ترجمے کا نہ صرف ہندوستانی ایڈیشن شائع ہونا چاہیے بلکہ اس کی معقول رائلٹی بھی ان کو ملنی چاہیے اور ہم سب کو اسے حاصل کرکے خرید کر پڑھنا چاہیے کہ یہ ایک بہت اہم کام ہے۔

●17 - 311, Tejas Nagar, BPT Colony.
Reynould Rd, Wadala, Mumbai - 37

فیاض رفعت

تازہ شمارہ بابت مئی بہت خوب ہے۔ ادبی فیچر، مقالات، کہانیاں، غزلیں، بخط شاعر، مٹھی بھر غزلیں، آثار لفظ لفظ، نقد و نظر، جرعات سبھی کچھ بے مثال ہے۔ عظیم منظور، مخمور سعدی، حامد اقبال، رفیق راز، مہتاب حیدر نقوی، عامر ریاض، رئیس الدین رئیس کی غزلیں دل کو چھو گئیں۔ ظ۔ انصاری صاحب کی تحریر دیکھ کر ماضی روشن ہو اٹھا۔ کیا نابغہ روزگار شخص تھا نہ رہا۔ کاش کوئی اسکالر ظ۔ انصاری پر سنجیدگی سے کام کرے۔ بخط شاعر عنوان کے تحت نشتر خانقاہی کی غزل پڑھ کر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ عقیل شاداب اور مختار شمیم نے بھی جی خوش کر دیا۔ عنبر بہرائچی کی مٹھی بھر غزلیں بھی غیر معمولی ہیں۔ آپ نے بھی کیا کیا گوہر نایاب یکجا کر دیے ہیں۔

شاہد حمید صاحب نے طالس طائی کے ناول جنگ اور امن کے ترجمہ پر کتنی عرق ریزی کی ہے۔ اس کا اندازہ نیر مسعود کے تبصرہ سے ہوا۔ واقعی تخلیقی سرشاری کے بغیر اتنا بڑا کام ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک زمانہ ہوا غالباً ۱۹۵۸ء۔۱۹۵۹ء میں وار اینڈ پیس سے تین چار باب اس حقیر و فقیر نے ترجمہ کر کے انشاء کراچی کو بھیجے تھے۔ ان دنوں جون ایلیا، سید محمد تقی اور رئیس امروہوی انشاء دیکھ رہے تھے۔ جون ایلیا نے ترجمے کو بے حد سراہا تھا اور تاکید کی تھی کہ کسی بھی طرح اس ترجمے کے وقیع کام کو پورا کیا جائے۔ افسوس مزاج کی شوریدہ سری اور ستم ہائے روزگار نے اس کا موقع نہ دیا۔ شاہد حمید صاحب نے یہ عظیم الشان کام انجام دے کر اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ ترجمہ ہندوستان میں بھی شائع ہونا چاہیے۔ اردو کاؤنسل برائے فروغ اردو کے ڈائرکٹر حمید اللہ بھٹ صاحب کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

● Director, Door Darshan, Door Darshan Kendra, Chhajjubagh, Patna - 800001 (Bihar)

شہپر رسول

"شاعر" کا مئی ۹۹ء کا شمارہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ صرف ۴۸ صفحات میں آپ نے کیا کچھ سمیٹ لیا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید اور احمد سہیل کی تحریریں خوب ہیں۔ ان خطوط پر اور بھی لکھا جانا چاہیے۔ ادبی فیچر بھی خاصے کی چیز ہے۔ آپ کا اداریہ "غزل، غزل کار اور ناقد" دعوت فکر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام باتیں نئی نہیں ہیں لیکن اہم ہیں ان کا بار بار لکھا جانا اپنی ایک الگ اہمیت رکھتا ہے۔ غزلوں کا حصہ اچھا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے اداریے کی چغلی کھاتا ہے۔

● Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

تاج پیامی

آپ نے اداریہ میں غزل، غزل کار اور ناقد کے تحت جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان پر واقعی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ آپ نئے شاعر سے متعلق لکھتے ہیں کہ "وہ بڑے ادبی رسائل کے مدیران کو نہایت ہی جرأت مندی کے ساتھ خط لکھنے لگتا ہے کہ اس کا کلام نہ صرف یہ کہ شائع کیا جائے بلکہ نمایاں طور پر شائع کیا جائے۔" اگر نئے شاعر کا کلام واقعی اس قابل ہے کہ اسے نمایاں طور پر شائع ہونا چاہیے تو اسے ضرور نمایاں طور پر شائع کرنا چاہیے۔ کہنہ مشق اور پرانے شعراء کا کلام اگر اس لائق نہیں تو انہیں شائع ہی نہیں کرنا چاہیے۔ آپ نے اسی شمارہ میں بہت سے مستند اور کہنہ مشق شاعروں کو نمایاں طور پر شائع کیا ہے جن میں ہزاروں خامیاں ہیں مثلاً : مخمور سعیدی کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

آجائے لبوں تک اگر اک جام بہت ہے
تھوڑا سا اجالا بھی سر شام بہت ہے

یہ گھسا پٹا مضمون اپنی معنویت کھو چکا ہے۔ ہاں مطلع میں ایک بات ضرور کہی گئی ہے:

مخمور! بس اب بادۂ عشرت کی ہوس کیا
پینا ہو تو تلخابہ آلام بہت ہے

ان کا شعر ہے : سنتے ہیں کہ سنسان ہیں سب کوچہ و بازار
کہتے ہیں مگر شہر میں کہرام بہت ہے

اس کو یوں ہونا چاہیے۔

کہتے ہیں کہ سنسان ہیں سب کوچہ و بازار
سنتے ہیں کہ شہر میں کہرام بہت ہے

کہرام کا تعلق سننے سے ہے۔ پھر یہ مصرع : "کم کم ہی فروزاں ہے کہیں، مشعل اور اک" یہاں "کہیں" کا محل نہیں اسے یوں ہونا چاہیے "کم کم ہی فروزاں ہے ابھی مشعل اور اک"۔ دوسرا مصرع وہ خود درست کر لیں۔ احتشام اختر کی غزل کا مطلع کسی شمار قطار میں نہیں۔ دوسرے شعر کا مصرع ہے "ساری گرمی تھی ایک کے دم سے" کس کے دم سے؟ آخری شعر ملاحظہ ہو۔ "ہم بلندی کو چھونے والے تھے: سر پہ آکر گری چٹان کہاں" آخری مصرع کی نثر ہوئی "سر پہ آکر چٹان کہاں گری"۔ کیا شاعر بلندی کو چھونے کے ساتھ سر پر چٹان کے گرنے کا بھی آرزو مند ہے۔ نشتر خانقاہی کی غزل واقعی اچھی ہے۔ "عجب" کو بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ مختار شمیم کے شعر کا

مصرع ہے۔ "طائرِ فکر کہاں، وسعتِ امکاں کہاں" جس لفظ کے آخر میں نون واضح ہوتا ہے اضافت کے بعد واضح نہیں رہتا۔ صحیح ہوا "وسعتِ امکاں"۔ حکیم منظور صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی غزل کا مقطع بھی بے کار ہے۔ اس غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اپنے اپنے ... دونوں کی تھی اک اپنی بات
اس نے کچھ پوچھا نہیں، میں نے کچھ مانگا نہیں

بات پوچھنا محاورہ ہے، بات مانگنا نہیں۔ وہ دراصل کہنا چاہتے تھے، میں نے کچھ کہا نہیں لیکن قافیہ تنگ تھا۔

● Darul Adab, Mahadeva Mohalla, Arrah - 802301 (Bihar)

خالد عبادی

مئی ۹۹ء کا شاعر بصیرت افروز ہوا۔ آپ نے اپنے اداریہ (غزل: غزل کار اور ناقد) میں بعض ایسی باتیں اٹھائی ہیں جو غزل کے مزاج میں تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔ میرا خیال ہے آج کے بیشتر غزل کہنے والے غزل گوئی کے اس تصور سے متاثر ہیں جسے جدیدیوں نے پروان چڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی غزلوں میں موضوعاتی تنوع اور فنی اکتسابات کی کمی نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ شکایت عام ہے کہ غزل پر زیادہ تنقیدیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تنقیدیں معنوی جہات کی عقدہ کشائی تک ہی محدود ہیں۔ غزل نگاری کے روایتی اور بنیادی Tools کی جانب بہت کم توجہ دی گئی۔ یہ خامی ترقی پسند تنقید اور جدید تنقید دونوں کے یہاں مشترک رہی۔ فاروقی صاحب نے اپنے بعض حالیہ مضامین میں اس جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے یہاں شاید غلو کی موجودگی کے سبب بعض حلقوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اگرچہ مجموعی اعتبار سے شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ کوشش قابلِ تعریف تھی۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ غزل پر اس کے کلاسیکی سیاق و سباق میں تنقید لکھنے والے کتنے لوگ ہیں، بیشتر نے تو اپنی عمر عزیز جدیدیوں کو پڑھنے میں ہی ضائع کر دی۔ فیض کو مستثنیات میں رکھیں تو خیال گزرتا ہے کہ ترقی پسندوں میں سردار، مخدوم، پرویز اور مجروح کا بہ نظر غائر مطالعہ بھی کم نے ہی کیا ہوگا۔ چہ جائے کہ جگر، فراق، اصغر، نشور، اثر اور جمیل مظہری وغیرہ۔ اساتذہ کو تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اب ایسے میں جو غزلیں لکھی جائیں گی ان کا انداز و معیار کیا ہوگا؟ جدیدیوں سے ذرا پیشتر فراق نے مصحفی اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے آتش کے فنی کمالات و فتوحات کو اجاگر کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں اور انہیں ایک طرح سے پھر سے زندہ کر دیا۔ یا یوں کہیں کہ زندہ ادبی روایتوں کا حصہ بنا دیا۔ افسوس کہ بعد والے اس طرح کی کوئی خدمت انجام دینے سے قاصر رہے۔ ایسے میں آپ بھلا کس سے عمدہ اور سلیقے کی غزلوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ غالب کے علاوہ ہمارے نقادوں نے کس کی جانب سنجیدگی سے توجہ دی۔ میر پر بھولے بھٹکے کسی نے کچھ لکھ دیا بس قصہ پاک۔

دوستوں سے گفتگو کے دوران میں بار بار یہ کہتا رہا ہوں کہ غزل کے مزاج میں تبدیلی کے لئے مطالعہ کے رخ میں تبدیلی لانا ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رخ کا تعین کون کرے گا۔ میں ذاتی طور پر نظیر، اکبر، اور اقبال کی غزلوں کو مطالعہ کا مرکز و محور بنانے کے حق میں ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی غزلوں میں موجود امکانات کی جانب توجہ دینے کی ہمارے نقادوں نے قطعی زحمت گوارا نہ کی۔ یہاں تک کہ نظمیں اور اقبال کی غزلوں کا الگ سے ایک انتخاب بھی شائع نے کیا جاسکا۔ وجہ؟

● 2 - Netaji Marg, Patna - 800001 (Bihar)

خوشنود بخاری

غزل کے تناظر میں جو بیڑا آپ نے اٹھایا ہے اس کے خوش آئند ہونے میں کوئی شائبہ نہیں۔ موضوعات کی کمیابی اور خیالات کی کم مائیگی کے باوجود غزل ہی ہے جو اردو کو پوری دنیا کی زبانوں پر حاوی کرتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ غزل وہ غیر فانی اور فقید المثال عنصر ہے جو نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی ادب میں نمایاں کردار کا حامل ہے۔

● P.O. Box 559, Doha - Qatar (A.G.)

عظیم راھی

ناشاعری پر سلیمان اطہر جاوید کا مقالہ حاصلِ شمارہ ہے۔ احمد سہیل کی تنقیدی بصیرت سے بھی انکار نہیں۔ ادبی فیچر کے مضامین اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔ افسانوں میں م۔ ناگ، نسیم بن آسی اور ورِیندر پٹواری متاثر کرتے ہیں۔ ہندی افسانے کا ترجمہ 'آلودگی' بھی اچھا ہے۔ غزلیں ڈھیر ساری ہیں، اس میں اچھے شعر کی تلاش تفصیلی مطالعے کی متقاضی ہے۔ نقد و نظر (تبصرے) اور مکتوبات بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ الغرض شاعر کا شمارہ بھی پچھلے کئی شماروں کی طرح وقیع اور قابلِ مطالعہ ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر جیسا خاص، وقیع اور اہم نمبر شائع کرنے کے بعد بھی آپ عام شمارے جس پابندی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اسے دیکھ کر میں واقعی حیرت زدہ ہوں۔ آپ کے بلند حوصلوں اور ارادوں کی داد دیتا ہوں۔

A - 6, Noman Apts, New Shanti - Bazar
oad, Aurangabad - 431001 (M.S)

ناھید سلطانہ ناھید

ماہ مئی کا شمارہ پڑھا بہت پسند آیا۔ مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہوئے سہیل ارشد صاحب کے ناقدانہ مکتوب پر نظر گئی جس میں خاص شمارے خواتین نمبر کی چند شاعرات کی تخلیقات پر بے باک تنقید کی گئی ہے۔ موصوف کا اعتراض بجا ہے معاً یہ بھی بجا ہے کہ شروع میں ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں ایسی تخلیقات کو صحیح نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محترمہ گلنار آفرین کا مراسلہ پڑھ کر خوشی ہوئی موصوفہ بلاشبہ حساس دل رکھنے والوں میں سے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں ایسی مستورات کی کمی نہیں جو بنا کسی سہارے کے ادبی شاہراہ پر گامزن رہنے کی سعی کرتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ ایسی کسی ادیبہ نے مطلوبہ منزل پائی یا نہیں۔ کیونکہ میرا ابھی زمانۂ طالب علمی ہے اور میں بھی ایسے ہی کارواں کی نئی راہرو ہوں۔ آج کے دور کی مناسبت سے خواتین کے تئیں عقیدت رکھ کر آپ سنت نبویؐ ادا کر رہے ہیں تاہم محترم ذکاء الدین شایاں کے خیالات پڑھ کر افسوس ہوا۔ جہاں تک نسوانی جذبات کا سوال ہے تو وہ اشعار کے ذرائع سے ہی کیوں، جذبوں کے اظہار کے ذرائع تو افسانہ اور ناول بھی ہو سکتے ہیں غزل کی بنیاد حسن و عشق ہے سب جانتے ہیں یہ بات اور ہے کہ جدید شاعری کا موضوع محض حالات حاضرہ ہی رہ گیا ہے۔ بہتر ہے یہ بھی کیونکہ اب وہ پرسکون اور سست قدم زمانہ نہیں رہا۔ نقاد کا مقصد مضامین کو سنوارنا ہوتا ہے تاکہ مصنف کے عزائم کو پست کرنا۔ محترم شایاں شاعری جیسی لطیف صنف کو خواتین کے ساتھ تقسیم کرنا نہیں چاہیے۔ آخر میں موصوف نے کہہ ہی دیا ہے۔ اس طرح اگر

رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں اور مرد حضرات جیسی آزادی مستورات کو ملے تو یقیناً یہی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مرد کو پیچھے کر سکتی ہیں۔ مگر افسوس ایسا کچھ نہیں ہوگا اور ہونا بھی نہیں چاہیے کہ عورتوں کی بہتری اسی میں ہے۔ شاعر کے پاس تو حساس دل ہوتا ہے وہ کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا۔ اور حساس دل رکھنے والا شاعر کہاں ہوتا ہے... میں حقیر گستاخی کے قابل نہیں برادرم شایاں سے معذرت خواں ہوں!

کسی مجبوری کے پیش تحت کافی تاخیر ہوئی حاضری میں۔ تاہم امید کرتی ہوں کہ آپ میرے اس خط کو ضرور شائع کریں گے۔ خواتین نمبر میں شامل نہ ہو سکی اس کا افسوس ہے بہر طور خواتین نمبر کا دوسرا حصہ بھی آپ نکالنے والے ہیں اگر مجھے بھی موقع دیں تو میری خوش بختی ہوگی۔

● Ranipur, Barparia, 841232 - Siwan (Bihar)

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ

ضیاء حسنی

شاعر کے تازہ شمارے نے کچھ اس طرح رجھایا کہ میں اسے کئی نشستوں میں برابر پڑھتا رہا ہوں۔ عالمی سطح پر اردو کس طرح مقبول ہو رہی ہے بالکل مختلف ماحول میں اہل بسے ہوئے افراد کس طرح لگن سے مشغلۂ نوشت و خواند میں لگے ہوئے ہیں۔ عبدالقوی ضیا، قیصر تمکین، ہندر بلو، علیہ خان، مقصود الٰہی شیخ، سید عاشور کاظمی اور ساحر شیوی کے نام اور کام سے واقف ہوں اور ان کی تخلیقات پڑھتا رہا ہوں لیکن آپ نے کافی سعی اور جستجو کے بعد ایک ہی شمارے میں نہ صرف متعدد قلم کاروں سے متعارف کرایا بلکہ ان کے خیالات اور افکار سے واقفیت کی بھی راہ ہموار کی ہے اس لحاظ سے زیر نظر شمارہ اہم، متنوع اور جاذب نظر ہے اور ایسی توقع ہے کہ اس خاص نمبر کو جگہ جگہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ میں آپ کی اس مخلصانہ کوشش کو سراہتا ہوں اور مبارکباد دیتا ہوں۔

اس شمارے کو آپ نے انٹرویوز، اقتباسات، شذرات اور معیاری نثری اور شعری تخلیقات سے آراستہ کر کے مطالعہ کو خوب سیراب کیا ہے۔ خاص طور پر یہ مضامین یورپ اور برطانیہ میں اردو (انٹرویو)، نئی زمین نئے آسمان کی تلاش، شمالی امریکہ میں اردو، مغرب کے اردو افسانے، مشرق وسطیٰ میں اردو کا مسئلہ، شمالی امریکہ میں اردو تدریس کا مسئلہ، اردو کی نئی بستیوں کے چند مستشرقین اردو مفید اور معلوماتی ہیں اور ان سے اردو کے منتشر کنبے کے کوائف و مسائل پوری طرح سامنے آئے ہیں۔ وہاں بھی اردو کا مستقبل روشن اور تابناک نہیں ہے لیکن جس خلوص اور لگن سے کام ہو رہا ہے اس سے قدرے اطمینان ہوا ہے اور امید کی کرنیں نمودار ہو رہی ہیں۔ افسانوں اور غزلوں سے الجھنیں اور اضطراب سامنے آیا ہے اور دیار غیر میں بالکل مختلف ماحول میں قلم کار جس طرح خلوص و لگن سے کام کر رہے ہیں یہ جذبہ بھی ابھرتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ کتابوں کی تفصیلات، رسائل و جرائد کے پتے، قلم کاروں کے پتے عام طور پر یہ معلومات دوسرے جرائد سے حاصل نہیں ہو پاتیں۔ اس سے قلم کاروں سے رابطہ استوار ہوگا اور بکھرے ہوئے قلم کاروں پر کام کرنے میں آسانی ہوگی۔

● 35 - Chota Bazar, Fatehpur - 212601 (U.P)

علی تنہا

'اردو ادب کا عالمی منظر نامہ' نمبر پڑھا۔ آپ کی بڑی ہمت اور زبان اردو سے عشق ہے کہ آپ نے یہ چراغ روشن رکھا ہے۔ یہ ہم تمام کیلئے مایہ افتخار ہے۔ (بلکہ مایہ افتخار صدیقی ہے) جون ۹۹ء کے شمارے میں ساقی فاروقی صاحب کی غزل میں تازہ کاری بہت ہے۔ کاش ہمارے نئے غزل گو، بے معنونیت اور تکرار سے بچ جائیں۔ اکثر غزلوں میں یکسانیت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اردو ادب کی خدمت کرنے کی مزید ہمت اور لگن عطا فرمائے۔ وگرنہ ادبی رسائل کا حال تو پتلا ہے ہی۔

● Producer, Radio Pakistan, Multan (Pak)

جانکی پرساد شرما

'اردو ادب کا منظر نامہ' موصول ہوا۔ اس کے مفصل مطالعے میں تھوڑا سا وقت لگ گیا۔ معلوم ہوا کہ اردو دنیا کتنی بڑی ہے اور مجھ ایسے لوگوں نے اسے کتنا محدود سمجھ رکھا ہے۔ اپنے مجموعے پر نشست ہو جائے، اخباروں میں رپورٹ آجائے، رسائل میں موافق تبصرے آجائیں۔ اور اگر ایک آدھ انعام مل جائے تو کیا کہنے۔ میرجی کو اس جہاں میں اور کیا چاہیے

یہ آپ کی عاجزی ہے کہ اداریے میں آپ نے اسے ایک ابتدائی کوشش مانا ہے لیکن اس کوشش کے پیچھے ایک وژن رہا ہے۔ انتھک محنت تو خیر ہے ہی۔ اردو کی نئی بستیوں کے چند مستشرقین اردو اور اردو کی نئی بستیوں سے پڑھ کر بیرونی ممالک میں اردو کی تخلیقی صورت حال کی نئی جان کاری ہوئی۔ محمد مظفر الدین فاروقی کی کہانی "آنسو بنے زنجیر" بڑی جاندار اور معیاری کہانی ہے۔ ہندوستان کے سماجی پس منظر کی فن کارانہ عکاسی ہے۔

شاعر کے اس شمارے سے ہماری یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کو سبق لینا چاہیے۔ تحقیق کے میدان میں کچھ کام تو ہوئے ہیں لیکن اس نوع کے کام کی کمی ہے جیسا کہ شاعر کا یہ خصوصی شمارہ ہے۔ یہی ایک شمارہ بھی موضوع بن سکتا ہے۔ آخر میں ایک بات اور ! اردو کی نئی بستیاں تو بس رہی ہیں لیکن پرانی؟؟؟

● B-330, Ashok Nagar, Shahrda, Delhi - 93

یوسف عارفی

اردو کے اجنبی دیاروں سے آپ نے یہ کیا کچھ کھوج نکالا ہے۔ افسانہ، شاعری، ادبی فیچر، تنقیدی شذرات، تخلیقی معلومات، رسائل و جرائد۔ وہ زبان جو اپنے ہی ملک میں اجنبی بن جانے کے کربناک اندیشوں میں مبتلا ہے اسے آپ نے اجنبی دیاروں میں دریافت کر کے پوری اردو دنیا کو روشن آمیز خوش خبری دی ہے۔ آپ کی اس سرگرم کوشش سے وہ لوگ سبق سیکھیں جنہیں اردو زبان کی حفاظت اور اس کی ترقی و ترویج کی ذمہ داری تفویض کر دی گئی ہے۔ محض تعریفی اور حاجی بگویم جیسے مجلّے شائع کرنے سے اردو زبان کا بھلا نہیں ہوگا۔ اجنبی دیاروں میں ہم عصر لکھنے والوں کی تلاش و جستجو اور ان پر سیر حاصل مواد اکٹھا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ "شاعر" کو ایک عالمی رسالہ بنانے کی جستجو میں لگ گئے ہیں۔ لیکن "شاعر" کی بدبختی یہ ہے کہ اناپ شناپ قسم کی کتابوں کو مالی اعانت دینے والے ادارے اور اکیڈمیاں آج بھی چپ ہیں کہ "شاعر" کے لیے مالی اعانت منظور کرنے سے ان کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوگا۔

● B - 5, 4th Cross, Anubhav Nagar, Nagarbhavi Main Road, Bangalore - 560 072.

نقــد و نظــــر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

ابر کاری (افسانے)

مقدر حمید

مقدر حمید کے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ چند سال پہلے اپنے پہلے مجموعے سے انہوں نے افسانہ نگاروں کی نئی پود میں اپنی شناخت قائم کرلی تھی اور اپنے اس دوسرے مجموعے سے وہ افسانہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔

خود مقدر حمید نے اس کتاب کے دیباچے بہ عنوان "عرض حال" میں لکھا ہے۔ " خارجی حالات، داخلی محسوسات اور اظہار کی خلش نے میری کہانیوں کو جو رنگ دیا، اسی سے اسلوب عبارت ہے.... جو بھی ہے، کھلی آنکھ کے مشاہدے، بند پلکوں کی اذیت و کرب اور دن رات کے شخصی رغیر شخصی تجربوں سے گزرے لمحات کا رقم ہے۔ ان سنگلاخ راہوں سے گزر کر جو بات قلم کی نوک پر ٹھہری، بس اسی کو دیانت اور خلوص کے ساتھ پیشانی پر رکھا اور یہی میرے افسانوی رویے کا مقدمہ ہے!" ان کا یہ بیان ان کی افسانہ نگاری کا ایک کھلا اور صاف پس منظر پیش کرتا ہے۔

چودہ افسانوں کے اس مجموعے میں خود کتاب کے عنوان والا افسانہ "ابر کاری" بہترین افسانہ کہلایا جاسکتا ہے۔ یہ Could Seeding کا خوب صورت ترجمہ ہے۔ خشک سالی کے ماحول کو چابک دستی سے پیش کرتے ہوئے ایک عورت کی پرزور چھٹی حس اور خداداد خوش اعتقادی کی، سائنس دانوں کے ایقان اور میکانکی مذہب پرستوں کی خام خیالی پر زبردست فتح کا بڑا انوکھا نمونہ ہے۔ "دیمک" روحانیت کی پیشہ ورانہ نمائش کے پیش پا افتادہ موضوع پر نئے ڈھنگ سے لکھا گیا ہے ایک باا‌ثر افسانہ ہے۔ دہشت گردی کے موضوع پر "کاروبارِ خیر و شر"، فسادات پر "وجینے کے لئے"، شادی جیسے سنجیدہ اور اہم معاشرتی ادارے کے تئیں جدید نسل کے غیر مستقل مزاج اور غیر ذمہ دارانہ رویے پر "بدلتے موسم" اور توہم پرستی پر "یاد گل" کامیاب افسانے ہیں۔ مقدر حمید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی عام موضوع پر بھی لکھتے ہیں تو خاص انداز سے اور اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے۔

یہ کتاب مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔ کمپوزنگ اور سرورق کی پیش کش پر ایڈشاٹ کی مہر لگی ہے۔ دیدہ زیب گٹ اپ ہے۔

ضخامت : ۱۰۸ صفحات ○ قیمت : سو روپے ○ ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، بمبئی ○ مطبوعہ : جولائی ۱۹۹۸ء ○ ملنے کے پتے : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ

فکر و فن اور فکشن (تنقید)

ڈاکٹر یونس اگاسکر

ڈاکٹر یونس اگاسکر ممبئی یونیورسٹی میں ان چارج شعبۂ اردو بھی ہیں اور ادبی رسالے "ترسیل" سہ ماہی کے ایڈیٹر بھی۔ محقق بھی ہیں اور مصنف بھی۔ ناقد بھی ہیں اور تبصرہ نگار بھی۔ منکسر المزاج ہیں اسی لئے خاموشی سے اردو ادب کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے "غالب اور تنقید حالی" میں حالی کے بارے میں لکھا ہے: "اچھے معلم کے لیے ایک اچھا طالب علم ہونا بھی ضروری ہے۔" اس کا اطلاق خود ڈاکٹر یونس اگاسکر پر بھی ہوتا ہے۔ رعب دار زبان اور انداز اختیار کئے بغیر جس طرح مختلف مضامین میں انہوں نے حالی، نذیر احمد، فراق اور کرشن چندر کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے وہ ایک طالب علم کے رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ٹھوس دلائل کے سہارے یونس اگاسکر نے اپنی منکسرانہ سادگی سے اپنے نکات پیش کیے ہیں جو قابلِ نزاع ہو سکتے ہیں لیکن جو یقینی طور پر قابلِ قدر اور قابلِ غور ہیں۔

" گاندھی جی اور اکبر الہ آبادی" ایک اچھوتے موضوع پر دل چسپ مضمون ہے۔ اتنے ہی دل چسپ "مولوی نذیر احمد کا ذہنی سفر" اور احمد علی کے مشہور انگریزی ناول کے اردو ترجمے کا تاثر بہ عنوان "دلی کی شام : ایک تہذیب کا مرثیہ" ہیں۔ لیکن اس کتاب کے دو تجزیاتی مضامین "بیدی کا افسانہ : صرف ایک سگریٹ" اور "منٹو کے خطوط" خاصے کی چیزیں ہیں۔

ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، ممبئی کے زیر اہتمام پیش کردہ گٹ اپ شاندار ہے۔

ضخامت : ۱۲۸ صفحات ○ قیمت : ۱۵۰ روپے ○ ناشر: کوکن اردو رائٹرز گلڈ، ممبئی ○ مطبوعہ : نومبر ۱۹۹۸ء ○ ملنے کے پتے : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج ۔ دہلی۔

مبصر : محافظ حیدر

24/85, S.V.P. Nagar, Mhada, Andheri
(W) Mumbai - 400053 (M.S.)

دوسرے دن کا سورج

اندر موھن کیف

"دوسرے دن کا سورج" اندر موہن کیف کا اولین شعری مجموعہ ایک نئی بازیافت (تقریباً نصف صدی کی محنت اور زندگی کا گہرا تجربہ) جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں زندگی کے روز و شب کو صحیح ڈھنگ سے دیکھنے پرکھنے کا سلیقہ ہے اور اپنے ان ہی محسوسات کو بغیر تکلف کے بیان کر دینے کا ہنر بھی۔

زیر تبصرہ تصنیف، کیف صاحب کی غزلوں، نظموں دوہوں اور رباعیوں کا مجموعہ، ہمیں ان کے ماضی سے روشناس کراتے ہیں۔ جن میں ان کا فلسفیانہ انداز تحریر ماضی کے جھروکوں سے جھلکتی ہوئی یادیں۔ جو "سرگوشی" میں ملتی ہیں۔ اردو فارسی کی مٹھاس ایک طرف، تو گنگا جمنی زبان کا سنگم دوسری طرف۔ کھڑی بولی استعمال بڑی خوبصورتی سے دوہوں میں کیا گیا ہے۔ الفاظ سادہ اور عام فہم ہیں۔ طنزیہ اظہار خیال بھی سیدھے سادے لفظوں میں جیسے کسی نے کیف صاحب نے کہا ہو۔ "لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" یہی بات ان کی "جاتی ہوئی صدی کا آخری پل" میں صادق آتی ہے

دن تو نکلا نہیں ہے ابھی!
رات کیا ڈھل گئی ؟

مختصر تعارف (سابق وائس چانسلر جموں و کشمیر

ڈاکٹر وحید الدین ملک نے لکھا ہے۔ بلراج کومل کا "پیش لفظ" اور ممتاز جدید شاعر ندا فاضلی نے بعنوان "باشعور شاعر" اندر موہن کیف کی شخصیت کو کوزے میں بند کیا ہے۔

چندر کانت گھانگے کے سرورق کی مختلف رنگوں میں ماڈرن پینٹنگ اپنی جگہ پُر معنی پرکشش اور اہم ہے۔ جو دوسرے دن کے سورج کی ترجمان ہے۔

مصنف کا پہلا شعری مجموعہ ہندی میں غالباً ۱۹۴۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کا عنوان "آسمان خالی ہے" ہے۔ نیز "کھڑکی بھرا آسمان" زیر ترتیب ہے۔ لیکن یہ مجموعہ بھی ہندی انگریزی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے۔

ضخامت : ۱۴۴ صفحات ○ قیمت : ۷۵ روپے
○ مطبوعہ : ۱۹۹۸ء ○ پتہ : ۹۶/۸، سول لائنز، جھانسی ۲۸۴۰۰۱ (یوپی) ○ مبصر : نجمہ شیخ ۔ (لائبریرین) انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی۔

دستاویز ۔ ۸

جابر حسین

اردو شعبہ بہار قانون ساز کاؤنسل کے تحت شائع ہونے والی یہ ضخیم کتاب جسے جابر حسین (چیئر مین قانون ساز کاؤنسل) نے ترتیب دیا ہے اور اس کا موضوع ہے 'جھارکھنڈ کی تشکیل کا سوال' اس موضوع پر بظاہر یہ ایک طویل ایوان کارروائی کی رپورٹ ہے لیکن یہ محض رپورٹ نہیں ہے بلکہ صوبہ بہار کی سیاسی، سماجی اور تاریخی داستان بھی ہے۔ ہندوستان کے دلتوں اور پچھڑی ذاتوں کا سچا احوال نامہ ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کی یہ اہم دستاویز ہے جو ایوان کی کارروائی سے بہت بلند ہو کر وہ سارا مکالمہ جمع کیا ہے جو بہار، جھارکھنڈ اور اس کے پیچیدہ مسائل تک محدود نہیں رہا۔ ایک قابل مطالعہ اہم کتاب جس میں باشعور لوگوں کے لئے ایک تحفہ بھی ہے۔ دستاویز کا ہر دستاویزی کتاب ہوتا ہے۔ مارچ ۹۹ء میں طبع ہوئی ۳۴۰ صفحات کی کتاب کی قیمت صرف پچاس روپے
پتہ : شعبہ اردو، بہار قانون ساز کاؤنسل ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۱ (بہار)

عالمی اردو ادب

نند کشور وکرم

نند کشور وکرم کی ادارت میں شائع ہونے والی اس حوالہ جاتی کتاب میں حسب معمول افسانے، غزلیں، نظمیں، خطِ شاعر، رباعیات، ماہیے، گیت، سوانحی اشاریے، اخبارات کی رفتار ترقی، تعلیم کی پیش رفت، کتابیات، وفیات، ۵ مرحوم مشاہیر کے گوشے، اور یادِ رفتگاں۔ ۱۹۹۷ء کا یہ سارا جائزہ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ ضخامت : ۳۸۴ صفحات ۔ قیمت : دو سو روپے۔ پتہ : J - 6, Krishan Nagar, Delhi - 110056

ادبی اردو چینل

عبید اعظم ہاشمی - قمر صدیقی

عبید اعظم ہاشمی اور قمر صدیقی کی ادارت میں ممبئی سے ایک اور دیدہ زیب، خوب سیرت کتابی ماہنامہ 'ادبی اردو چینل' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ جولائی ۹۹ء کا شمارہ اپنے متنوع مندرجات کے ساتھ باذوق قارئین کے لئے پیش ہے۔ ۴۸ صفحات کے شمارے کی قیمت : ۵ روپے اور زر سالانہ : پچاس روپے ہے۔ پتہ : 7/3121 گیانن کالونی، گونڈی، ممبئی 400043

قطار میں کھڑا آدمی

شکیلہ رفیق

مشہور افسانہ نگار شکیلہ رفیق کے افسانوں کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا ہر افسانہ اپنے اسلوب، موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے مختلف ہے۔ کتاب کے تمام افسانے ادبی رسائل کے قارئین اور افسانہ ناقدین سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ۲۱۔ افسانوں پر مشتمل اور دو سو صفحات کی اس کتاب کی قیمت : سو روپے ہے۔ پتہ : الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور، (چوک پرانی انارکلی) لیک روڈ، لاہور (پاکستان)

ادیبوں کے لطیفے

نارنگ ساقی

آج کی دنیا میں ہر کام اور ہر بات ایک مکمل فن بن گئی ہے۔ لطیفہ گوئی یا لطیفہ نگاری بھی ایک فن ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ایک ہی لطیفہ کسی کے انداز بیان سے ہم کو ہنسا دیتا ہے اور کسی کے انداز بیان سے اچھا خاصہ لطیفہ ایک سیلی ہوئی پھلجھڑی بن جاتا ہے۔ زبانی بیان سے زیادہ مشکل کسی لطیفے کا تحریری بیان ہوتا ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ لطیفے کا پنچ لائن پر ختم ہو جانا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد صراحت، کوئی اور تفصیل یا اظہار خیال ہر گز نہیں ہونا چاہیے جس سے لطیفے کا اثر مجروح ہو۔ زیر نظر کتاب میں لطیفوں کو غیر دلچسپ بنانے کے کئی نمونے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً : "آغا حشر کاشمیری کو لوگ بنارسی بھی کہتے تھے اور وہ اتفاق سے لنگڑے بھی تھے۔ آغا صاحب کو آم کھانے کی دعوت دینے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن دعوت میں تپش صاحب آموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ آغا صاحب نے قریب آکر پوچھا، 'کچھ منہ سے بھی پھوٹو آم کیسے ہیں؟' 'ایسے عمدہ اور میٹھے ہیں کہ انہوں نے بنارسی لنگڑے کی بھی ایسی تیسی کر دی۔' (موٹی سی گالی) چونکہ آغا حشر کاشمیری گالیاں ایجاد کرنے میں ماہر تھے، تپش کا جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔"

اب یہاں "... ایسی تیسی کر دی ہے۔" پر لطیفہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگلا فقرہ فضول جوڑ دیا گیا اور لطیفے کا تاثر جاتا رہا۔ ایسی کئی مثالیں ملیں گی۔ انگریزی میں لطائف کی کتابیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اگر نارنگ ساقی دو چار کتابیں پڑھ کر لطیفوں کی پیش کش کے اسلوب پر غور کر کے یہ لطائف مرتب کرتے تو بات کچھ اور ہی ہوتی۔ اسلوب کے علاوہ مواد کے اعتبار سے بھی اس کتاب میں کئی لطیفے کمزور ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب دوسرا ایڈیشن ہے جس میں پہلے ایڈیشن کے کئی لطائف خارج کر دیئے گئے اور نئے شامل کر لئے گئے۔ امید کہ تیسرے ایڈیشن میں اردو ادیبوں کے لطائف مواد اور اسلوب دونوں طرح سے منتخب کہلائے جائیں گے۔

کتابت عمدہ ہے لیکن پروف ریڈنگ ذمہ داری کے ساتھ نہیں کی گئی ہے۔ برٹرنڈ رسل کو تین جگہ سر ٹرینڈ رسل لکھا ہے اور جان نثار کو جان گر نثر۔ طباعت ستھری اور جلد بندی اچھی ہے۔

ضخامت : ۲۵۶ صفحات ○ قیمت : ۱۵۰ روپے
○ مطبوعہ : ۱۹۹۶ء ○ پتہ : نارنگ ساقی : فیمز ڈیلی ایکس انڈیا، ۶۔۷، کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
○ مبصر : محافظ حیدر

کتاب بازار

شاعر میں تبصرے کے لئے موصول ہونے والی کتابوں اور رسائل کی خاصی بڑی تعداد ذخیرہ ہورہی ہے۔ چونکہ تبصروں میں تاخیر کا احتمال ہے لہذا شاعر کا ایک پرانا کالم نئے عنوان کے ساتھ مکرر شروع کیا گیا ہے تاکہ نئی کتابوں اور نئے رسائل کا مختصر سا تعارف فوری طورپر دیا جاسکے۔ نئی کتب و رسائل کے اعلانات دئے جاسکیں۔ قارئین شاعر سے التماس ہے کہ اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسائل کی خرید کریں۔ اپنے باذوق احباب کو اچھی اور معیاری کتابوں اور رسائل کے بارے میں بتائیں۔ نئی کتب و رسائل کو موضوع بنائیں۔ (ادارہ)

O

انگلیاں فگار اپنی (شاعری)

مصنف : زبیر رضوی O ضخامت : ۱۲۸ صفحات O قیمت : ۷۵ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O رابطہ : مکتبہ ذہن جدید، پوسٹ بکس نمبر 9789، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵۔

درد آتا ہے دبے پاؤں (افسانے)

مصنف : اقبال مہدی O ضخامت : ۲۰۸ صفحات O قیمت : ۱۰۰ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O پتہ : عابد ولا، گل مہر ایونیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵۔

ہومیوپیتھی اور نوجوانوں کے جنسی مسائل (مضامین)

مصنف: ڈاکٹر ایم۔اے شاہ O ضخامت : ۳۰۶ صفحات O قیمت: ۱۵۰ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۸ء O رابطہ: صبا پبلی کیشنز، صدرہ بل، حضرت بل، سری نگر، ۱۹۰۰۰۶ (کشمیر)

نذر نظیر (نظیر صدیقی کی شخصیت اور فن)

مرتبین: جاوید وارثی، ڈاکٹر محمد محسن O ضخامت : ۳۰۴ صفحات O قیمت: ۱۵۰ روپے O مطبوعہ : نومبر ۱۹۹۹ء O پتہ: نظیر صدیقی، مکان ۱۹۵، اسٹریٹ ۱۰، سکٹر آئی ٹین ٹو، اسلام آباد (پاکستان)

جہات (شاعری)

مصنف: شاہد لطیف O ضخامت : ۱۰۸ صفحات O قیمت: ۱۰۰ روپے O مطبوعہ : اپریل ۱۹۹۹ء O پتہ: اے۔۳۱، شاہین اپارٹمنٹ، وفا پارک روڈ، کوسا، ضلع تھانہ ۴۰۰۶۱۲

بین السطور (تنقیدی مضامین)

مصنف: حمید سہروردی O ضخامت : ۱۲۰ صفحات O قیمت: ۹۰ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۸ء O پتہ : توکل بک ڈپو، مومن پورہ گلبرگہ ۵۸۵۱۰۴ (کرناٹک)

سب خواب (شاعری)

مصنف : نصرت گوالیاری O ضخامت : ۱۹۰ صفحات O قیمت : سو روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۸ء O رابطہ: تہذیب اردو، 5071۔ کوچہ رحمان، چاندنی چوک، دہلی۔

گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ

مصنف: خلیق انجم O ضخامت : ۳۰۴ صفحات O قیمت :۱۷۵ روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۸ء O رابطہ : انجمن ترقی اردو، اردو گھر راؤز ایونیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

اندھی گلی کا سورج (شاعری)

مصنفہ: وضاحت نسیم O ضخامت :۱۶۰ صفحات O قیمت : ۱۵۰ روپے O مطبوعہ : جنوری ۱۹۹۹ء O رابطہ : A-891، بلاک H، نارتھ ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

جسٹس سری کرشنا کمیشن رپورٹ

ترجمہ : یونس حسن انصاری O ضخامت : ۴۵۰ صفحات O قیمت : سوروپے O مطبوعہ : مئی ۱۹۹۹ء O رابطہ : جمعیۃ علماء مہاراشٹر، ۱۷۹۔ وزیر بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳ (مہاراشٹر)

مہا ساگر (ناول)

مصنف : عبدالصمد O ضخامت : ۳۲۸ صفحات O قیمت :دوسو پچاس روپے O مطبوعہ : جنوری ۱۹۹۹ء O رابطہ : معیار پبلی کیشنز، K - 302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۱

بودلیئر کی نظمیں (ترجمہ و تعارف)

مترجم :مظہر مہدی O ضخامت : ۱۶۰ صفحات O قیمت : سوروپے O مطبوعہ : دسمبر ۱۹۹۸ء O رابطہ : مصنف : 280 - 8 - 16، چنچل گوڑہ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۲۴ (آندھرا پردیش)

کلکتے کی ادبی داستانیں (مضامین)

مصنف: وقار راشدی O ضخامت : ۲۷۴ صفحات O قیمت: دوسو پچاس روپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O پتہ : بی۔۴۸، شاہ فیصل ٹاؤن، جناح ایونیو، ملیر ہالٹ، کراچی ۷۵۱۰۰ (پاکستان)

اردو تنقید کا سفر (جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں)

مصنف: ڈاکٹر تابش مہدی O ضخامت : ۳۲۰ صفحات O قیمت : دوسوروپے O مطبوعہ : ۱۹۹۹ء O رابطہ : بیت الرافیہ جی۔۵۔اے، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

ادبی رسائل

آثار (ماہنامہ)

مدیران : فیصل عجمی، ثمینہ راجہ O ضخامت : ۵۲ صفحات O قیمت :سوروپے (فی شمارہ) زرسالانہ ۴۰۰ روپے O رابطہ : ۱۳ ڈی، ایس این سی سینٹر، تھرڈ فلور، فیض حق روڈ، بلیو ایریا، اسلام آباد (پاکستان)

گل بوٹے (بچوں کا رسالہ)

مدیر : فاروق سید O ضخامت : ۳۲ صفحات O قیمت ۶ روپے (فی شمارہ) O زرسالانہ: ۸۵ روپے O رابطہ رحمٰن کمپاؤنڈ، روم نمبر۔۱، بائیکلہ، ممبئی ۴۰۰۰۱۱ (مہاراشٹر

शेष (اردو ادب ہندی میں)

مدیر :حسن جمال O ضخامت : ۱۵۲ صفحات O قیمت ۱۵ روپے (فی شمارہ) ۶۰ روپے (چار شمارے) O رابطہ نزد پٹا نواس، لوہار پورہ، جودھپور ۳۴۲۰۰۲ (راجستھان

شفق (ماہنامہ)

مدیر اعلیٰ : (اعزازی) ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی O ضخامت ۶۴ صفحات O قیمت : بیس روپے (فی شمارہ) O سالانہ : دوسو چالیس روپے O رابطہ : حبیب منزل، پیچھے پائیگاہ، موتی باغ روڈ، ٹونک (راجستھان)

الکوثر (دینی و عصری رجحانات کا ترجمان)

مدیران: مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی، ڈاکٹر مظفر حسن، O ضخامت : ۸۰ صفحات O قیمت :دس روپے (فی شمارہ) O زرسالانہ : چالیس روپے O رابطہ : سہ ماہی الکوثر دارالعلوم خیریہ نظامیہ، بہار دری، سہسرام ۸۲۱۱۱۵ (بہار

نعت رنگ (حمد نمبر)

مرتب : صبیح رحمانی O ضخامت : ۲۸۸ صفحات O قیمت :۱۰۰ روپے O رابطہ : 25-E، فیس - V، اینڈ لی فلیٹس، شادمان ٹاؤن نمبر۔۲، نارتھ ناظم آباد

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری
شدہ
۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا
۷۰واں
سال

علمی ادبی
و تہذیبی
ماہنامہ

جلد ــــ ۷۰
شمارہ ــــ ۱۱

فون: 3829904

نومبر ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے	لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے
تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے	معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان	امریکہ	برطانیہ	خلیجی ممالک
۲۵۰ روپے	۲۵ ڈالر	۱۵ پونڈ	۲ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

فکر امروز

نہ دنیا کی کوئی صبح نئی صبح ہے۔ نہ کوئی شام نئی شام ہے۔ نہ تارے نئے ہیں نہ چاند نیا ہے۔ نہ سورج نیا ہے۔ نہ دریا نہ پہاڑ۔ نہ آبشار نہ لالہ زار، مگر پھر بھی ہر صبح میں نئی طلعت۔ ہر شام میں ایک نئی نزہت۔ ہر رات میں ایک نئی پھبن۔ غرض کہ ہر چھپ کر طلوع و نمودار ہونے والی چیز میں ایک نیا پن موجود ہے۔ اسی طرح موجودات عالم، واقعات و کیفیات کے لحاظ سے نیا رنگ و اثر اور نئے ماحول کا عالم بدلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ لاتعداد اشعار کہے جانے کے بعد بھی کوئی نیا شعر دماغ سے پیدا نہ ہو۔ یا اس میں کوئی ندرت محسوس نہ کی جاسکے؟ الا ماشاء اللہ۔

جس طرح فطرت کی قدامت، نئے واقعات و حادثات سے ہمارے لیے تنوع پذیر کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہماری شاعری میں بھی الفاظ نہ سہی، کم از کم خیالات و احساسات اتنے نئے ہونے چاہئیں جو ہمارے اشعار کے نئے اور نادر سمجھے جانے پر دنیا کو مجبور کردیں۔ (۱۵؍جون ۱۹۳۵ء)

سیماب اکبرآبادی

ایوانِ غالب
غالب انسٹی ٹیوٹ
ماتا سندری لین
نئی دہلی - ۲

۲۷ جولائی ۸۶ء

محترمی اعجاز صاحب

آداب

کل آپ کا محبت نامہ ملا، شکریہ
اس سے قبل ناظر نعمان صدیقی صاحب کا ایک خط ملا تھا، میں انہیں
جواب دینے ہی والا تھا کہ آپ کا سرفراز نامہ مل گیا۔ بہرحال
میں شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں تک خاموش رہا،
میں ممنون ہوں کہ آپ یاد فرماتے رہتے ہیں اور رسالہ میں
مجھ اندنوں پابندی سے ملنے لگا ہے،
ڈاکٹر سید محمود صاحب کی طبیعت اندنوں بے حد خراب ہے
بس دعا کیجئے کہ وہ واقعی سنبھل جائیں،
آپ کی صحت کے بارے میں بھی اکثر تشویش رہتی ہے
خدا کرے آپ روبہ صحت ہوں،
میں [illegible] مشیر کے طور پر ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ
کام کر رہا ہوں، میرا نیا پتہ بھی آپ دفتر میں نوٹ
کروا دیں، ایک غیر مطبوعہ غزل بھیج رہا ہوں،
امید ہے کہ آپ بہتر ہوں گے، آپ کا حسن نعیم

پتہ نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا، کیا تھا؟
لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا، کیا تھا!

نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا؟
لباسِ عشقِ محبت دل پہ تنگ تھا، کیا تھا!

خبر نہیں کہ انہوں نے کہاں پہ سر پھوڑا،
خرد کے طرۂ لعلیں میں سنگ تھا، کیا تھا!

پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں،
یہ اپنے دلیش کا باسی ملنگ تھا، کیا تھا،

نسیم تینے چمن اور گل اُٹھے دل میں
وصالِ یار ہی خوشبو تھا، رنگ تھا، کیا تھا!

حسن نعیم

۶ جنوری ۱۹۲۷ء (پٹنہ) - ۲۲ فروری ۱۹۹۱ء (بمبئی)

حسن نعیم (سید حسن) غزل کے وہ سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنی شعری عمر میں غزل ہی کو موضوع بنایا، غزل سے اپنا لہجہ دریافت کیا اور آخری سانسوں تک غزل ہی سے جڑے رہے۔ وہ کتابی رسالی غزل سے ماورا بھی غزل کے لیے کام کر رہے تھے۔ غزل گائیکی میں موسیقی اور غزل کے رشتے کی باریکیوں کی افہام و تفہیم کر رہے تھے۔ سانسوں نے وفا نہیں کی ورنہ وہ تخلیقی اور عملی سطح پر غزل کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ بمبئی میں اپنے مستقل قیام کے دوران وہ اکثر راقم الحروف کے ساتھ غزل اور غزل گائیکی کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اردو تنقید نے حسن نعیم جیسے شعراء کو نقدِ شعر کا ماڈل نہیں بنایا۔ یہ خط اور غزل دونوں ہی اہم ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر۔ ۲ میں حسن نعیم مرحوم پر تفصیل سے لکھا جائے گا۔

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز اتنے پیار سے
کام کتنا ہو چکا ہے، وقت کتنا رہ گیا

شعری مجموعہ اشعار اور پس مرگ دبستان اردو میں معیاری غزل کی نمائندگی کریں گے۔ (الف الف)

ہم عصر اردو ادب نمبر

ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

[قارئین و قلمکار]

شمارہ ـ ۱۱ [نومبر ۱۹۹۹ء] جلد ـ ۷۰

اردو رسم الخط ،قاری، مسائل اور عمل کا فقدان

آج کا ایک بنیادی سوال قاری ہے
قاری وہ جو ادب پڑھ رہا ہے
قاری وہ جو اردو زبان سیکھ رہا ہے
قاری وہ جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے
قاری وہ جو ادب تخلیق کر رہا ہے
قاری وہ جو ادب کا درس دے رہا ہے۔ قاری وہ جو اردو اخبارات، کتب ورسائل
سے وابستہ ہے
قاری وہ جو اشاعتی اداروں سے وابستہ ہے
قاری وہ جو اردو اکاڈمیوں میں موجود ہے
قاری وہ جو مشاعروں میں آتا ہے۔ قاری وہ جو ریڈیو سن رہا ہے
قاری وہ جو ٹی وی دیکھ رہا ہے
قاری وہ جو اردو کے حوالے سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے
قاری وہ جو اردو جانتا ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہے

۱۹۶۰ء کے بعد قاری کا زوال ہوا تھا بلکہ قاری کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا
مگر یہی وہ دور ہے جب فکشن اور شاعری کے قاری بڑی تعداد میں موجود تھے
کتابیں بھی شائع ہوتی تھیں اور رسائل بھی
کتب ورسائل کی فروخت ہوتی تھی
کتابوں کے ایک سے زائد ایڈیشن شائع ہوتے تھے

آج کا ایک بنیادی سوال رسم الخط بھی ہے
رسم الخط کے ساتھ بہت سارے مسائل جڑے ہوئے ہیں
رسم الخط اور قاری، ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں
اردو رسم الخط کمزور ہوتا جا رہا ہے
قاری بھی کم ہوتے جا رہے ہیں
اردو ادب، ہندی میں منتقل ہو رہا ہے
اردو شاعری ہندی میں زیادہ بک رہی ہے
اردو شعراء اب ہندی رسم الخط میں اپنے مجموعے شائع کر رہے ہیں

اردو غزل نے ہندوستانی ثقافت کی نمائندگی کی ہے
اردو غزل نے ہندوستانی موسیقی کو، ہندی فلموں کو، ہندی گیتوں کی مقبولیت میں
اہم کردار ادا کیا ہے
اردو غزل گائیکی نے معاشی وسائل کو پھیلاؤ دیا ہے
غزل نے ہندوستان کے مشترکہ تہذیب وتمدن کو تقویت دی ہے
لیکن غزل قاری اور سامع، اردو رسم الخط کے بجائے ہندی اور دیگر زبانوں کے
حوالے سے ہے

اردو زبان نے ہندی کو غیر معمولی طور پر مالا مال کیا ہے
ہر سطح پر اردو نے ہندی کو دیا ہی دیا ہے

اردو کے کمرشیل نیم ادبی، نیم سیاسی اور نیم فلمی ماہناموں کی تعداد اشاعت کسی
بھی طرح پچاس ہزار سے کم نہیں۔ خواتین کے بعض ماہناموں کی تعداد اشاعت
ایک لاکھ سے کم نہیں۔ ایک لاکھ قاری کا مطلب ایک لاکھ اردو جاننے والے
یہ اتنی بڑی تعداد قاری کی ادب کیوں نہیں پڑھتی؟
وہ خالص ادب جو ادبی رسائل میں سمویا جا رہا ہے
وہ خالص ادب جو کتابوں میں سجایا جا رہا ہے
کتابیں، جو اردو اکاڈمیوں اور اہم سرکاری اردو اداروں کے تعاون سے خاصی بڑی
تعداد میں شائع ہو رہی ہیں

اردو میں مذہبی رسائل، مذہبی کتابیں اور مذہبی لٹریچر بڑی تعداد میں شائع ہو رہا
ہے
اس لٹریچر کو پڑھنے والے بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں
یہ بہت بڑی تعداد اردو جانتی ہے
ان اردو جاننے والوں میں شعر وادب کا ذوق رکھنے والے بھی بڑی تعداد
میں موجود ہیں
دینی مدرسوں اور دینی اداروں میں اردو رسم الخط موجود ہے
بلکہ اردو زبان کو ان اداروں سے خاصی تقویت مل رہی ہے
قاری یہاں موجود ہے

اردو رسم الخط کا زوال
قاری ہے، نہیں ہے کے مسائل
گھروں میں رسم الخط کا کم ہوتا ہوا چلن اور لڑکیوں کی اردو تہذیب میں تربیت کی
کمی
رسم الخط اور قاری کے مسائل بے شمار اور الجھے ہوئے ہیں
ہم اپنے میکانیکی اور روایتی طرز فکر و عمل سے بے طرح چپٹے ہوئے خواب دیکھ
رہے ہیں
وقت اپنا کام کر رہا ہے اور جو منظر نامے بنا رہا ہے وہ کسی بھی طرح اطمینان بخش
نہیں

اردو رسم الخط اور قاری کے لئے مستقبل کے کیا
عملی پروگرام ہو سکتے ہیں، اس پر غور کرنا ہے
داد و فریاد، ماضی کوبی، مطالبات اور
مرکزی وعلاقائی سرکاروں کی دہائی کے بغیر



بلراج کومل

نورانی دروازہ

نورانی دروازے کے
ایک طرف
شور ہے
یہ دروازہ ہرگز
نورانی دروازہ نہیں
دروازے کے دوسری جانب
شور، زیادہ شور ہے
نورانی دروازہ یہی ہے
وہ جو دوسری جانب ہیں
اور کہتے ہیں
یہ دروازہ
نورانی دروازہ نہیں
اس کو بڑھ کر قتل کرو
مل کر اس کی ہڈی بوٹی ایک کرو

وہ دروازہ جو نورانی تھا یا نہیں تھا
اب ہے فقط ملبے کا ڈھیر
اس پر لاشوں کے انبار
کل تک یہاں پہ آوازوں کا جنگل تھا
اب کوئی آواز نہیں
دور دور تک خاموشی
دور دور تک تاریکی

ساون رُت میں

پہلی آئی
دیوانی تھی
آکر چھم چھم ایسے برسی
دور دور تک
جل تھل، جل تھل
ایک مر گئی

دوسری آئی
رکی وہ پل بھر آسمان میں
دور دیس میں
رم جھم، رم جھم
جا کے برسنے
چلی گئی
تیسری آئی
آسمان میں آویزاں ہے
وہ نہ برستی ہے، نہ وہ کھلتی
لوٹ کے وہ جاتی بھی نہیں
آگے بھی جانے کا اس کا
کوئی بھی امکان نہیں

وہ جواب تک آئی نہیں
میں اس کے خواب میں کھویا ہوا
پاگل، دیوانہ
ساون رت میں
ایک کے بعد ایک گھٹا کے جادو میں
گھر کا راستہ بھول گیا

● E - 139, Kalkaji, New Delhi - 110019



شہریار

چاہتا کچھ ہوں مگر لب پہ دعا ہے کچھ اور
دل کے اطراف کی دیکھو تو فضا ہے کچھ اور

جو مکاں دار ہیں دنیا میں انھیں کیا معلوم
گھر کی تعمیر کی حسرت کا مزا ہے کچھ اور

جسم کے ساز پہ سنتا تھا عجب سا نغمہ
روح کے تاروں کو چھیڑا تو صدا ہے کچھ اور

پیش گوئی پہ نجومی کی بھروسا کیا
وقت کے دریا کے پانی پہ لکھا ہے کچھ اور

تو وفا کیش ہے جی جان سے چاہا ہے تجھے
تیرے بارے میں یہ لوگوں سے سنا ہے کچھ اور

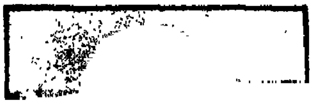
● 4/81-A, Kabir Colony,
Jamalpur, Aligarh - 202002 (U.P.)

مابعد جدیدیت ، نقّاد ، نئی نسل ، لفظ اور متن

ادبی فیچر

شاعر میں ۱۹۷۸ء سے اور بطور خاص ۱۹۸۰ء سے ایک مکالمہ قائم کیا گیا تھا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد کیا؟ اس وقت تک کتب و رسائل میں نہ تو اس طرح کا کوئی سوال قائم ہوا تھا اور نہ ہی کسی نے انفرادی طور پر ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد کے شعر و ادب پر کوئی تنقیدی مضمون لکھا تھا ۔ جبکہ شاعر کے کئی شمارے نئے قلم کاروں پر مشتمل شائع کئے گئے تھے ۔ "نئی شاعری ، نئے نام` نئی نفسیات ، نئی شعری کائنات اور افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء وغیرہ ۔ ۱۹۸۱ء سے تاحال ، امکانات سے مملوقلم کاروں کے تعارف کا سلسلہ شاعر میں برابر جاری رہا ہے ۔ مابعد جدیدیت کی بحث تو ۱۹۹۰ء سے ابھر کر آئی ہے ہم نے اس بات پر زور دیا تھا اور اب بھی اپنے اسی موقف پر قائم ہیں کہ ۱۹۸۰ء تک آتے آتے ترقی پسندی اور جدیدیت کا زور ٹوٹ گیا اور نئی نسل اپنے طور پر اپنے عہد کو سوچ رہی ہے اور ادب تخلیق کررہی ہے آج بھی یہی صورت حال ہے حالانکہ جدیدیوں کو اب بھی یہ اصرار ہے کہ مابعد جدیدیت کا کوئی سوال نہیں بنتا کہ نئی نسل نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ اسے جدیدیت سے انحراف کہا جاسکے آج ترقی پسند ایک بار پھر سرگرم عمل ہیں ان کا اصرار بھی یہی تھا اور اب بھی ہے ۔مابعد جدیدیوں نے جدیدیت کو رد کرتے ہوئے ایک نئی ترقی پسندی کی بابت کہنا اور لکھنا شروع کیا ۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے پیروکار جو بھی رہے ہوں ، بہت سیدھی سی بات ہے کہ یہ دو دنیاؤں اور دو بڑی سیاسی طاقتوں اور ان کے نظام کے نفاذ کا معاملہ ہے ۔ ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں پر اپنے اپنے نظام کی بالادستی اور اسی کے تحت فنون لطیفہ کو تخلیق کرنے کا اصرار ۔ ان سب سے قطع نظر اگر بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے شورکے بغیر بھی اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق ہوا ہے ۔ وہ ادب تخلیق ہوا ہے جو زمانوں زمانوں سفر کرتا رہے گا ۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے جو ادب تخلیق کیا اور جس طرح کے ادب کی تخلیق پر زور دیا اس میں سے بیشتر مرکھپ جائے گا اور یہ ہورہا ہے لیکن ان میں جو واقعی ادب ہے (وہ کیا ہے ؟ ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے) وہ رہ جائے گا ۔ مابعد جدیدیت کی بحث ابھی جاری ہے اپنے تمام تر الجھاووں کے ساتھ کیوں کہ یہ بھی مغرب سے مستعار ہے اور اس کی بعض اصطلاحیں بڑی معنی خیز ہیں ۔ عوامی سطح پر ان اصطلاحوں کے پیچھے جو مذہبی ، سیاسی اور سماجی کارگذاریاں ہورہی ہیں ان کے بارے میں کوئی بحث نہیں ہوئی بطور خاص نیوورلڈ آرڈر اور سیکولرائزیشن کے بارے میں ۔

اردو میں مابعد جدیدیت کے بارے میں ہمارا رویہ وہی رہا ہے جو ترقی پسندی اور جدیدیت کے بارے میں ہے ۔ اس پر شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں تنقیدی شذرات موجود ہیں ۔ ۱۹۸۸ اور ۱۹۸۹ء میں ادبی مذاکروں کے لیے جو سوالنامے مرتب کیے گئے تھے ، ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسالہ شاعر میں براہ راست اس نظریے کی تبلیغ نہ کرتے ہوئے اپنے طور پر نئی نسل کے فن پاروں کے ذریعے اس بحث کو قائم کرنے کی سعی کی تھی ۔ ہم عصر اردو ادب نمبر شائع ہوچکا ہے اور اس سے قبل شاعر کی بیس سال کی فائلیں موجود ہیں ۔ دراصل ہم نے سیدھے سیدھے مغرب سے رشتہ نہ جوڑتے ہوئے اپنی روایت کے تناظر میں اپنے شعروادب کی بحث قائم کرنے کی سعی کی ہے اور اب بیسویں صدی کے نصف آخر کے ادب کا جائزہ یہ بتائے گا کہ ترقی پسند ، جدیدیت پسند اور مابعد جدیدیت کے نظریوں نے اردو زبان و ادب کو کیا دیا ۔ ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی کی آخری سانسوں میں ہم کچھ اور بھی سوال قائم کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ مابعد جدیدیت کے تحت اردو میں جس مغربی نظریے کی تبلیغ کی گئی اس سے نئی نسل پرکوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوئے حالانکہ بعض نئے قلم کاروں نے مابعد جدیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے لیکن وہ اپنے اظہار میں واضح نہیں ہیں حالانکہ مجموعی طور پر نئی نسل کے قلم کاروں کا رویہ نہ تو اب ترقی پسندانہ رہا ہے اور نہ ہی جدیدیت پسند ۔ وہ مابعد جدیدیت کے الجھاووں میں بھی نہیں ہیں ۔ ہم نے اب بالکل تازہ کار نسل کے قلم کاروں کو جو ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء اور اس کے بعد یا یوں سمجھئے کہ رسالہ شاعر نے ۱۹۸۰ء سے جن نئے قلم کاروں کو متعارف کروایا وہ اور دیگر نئے قلم کاروں کو اظہار خیال کی دعوت دے رہے ہیں ادبی فیچر کو اور زیادہ بامعنی بنانے کی سعی کررہے ہیں ۔ نئے قلم کار بلا تکلف اپنے خیالات کا اظہار کریں ۔ وہ جو سوچ رہے ہیں اس کا برملا اظہار کریں ۔ (الف ۔ الف)





مابعد جدیدیت اور اردو تنقید

احمد سہیل

مابعد جدیدیت کے پس منظر میں کانٹ (Kant) کی "جدیدیت اور لبرل انسان دوستی" ہیگل (Hegel) کے "انسلاکی جدلیات کے قوانین" مارکس (Marx) کا "اقتدار یا قوت بمقابلہ حریت" اور نطشے (Nietzsche) کا "طنزیاتی نظریہ اور منفی آزادی" کے تصورات پوشیدہ ہیں۔ لیکن گذشتہ پچیس برسوں میں مابعد جدیدیت کے نظریات پر چارلس جنکس، ایہاب حسان، ژاں لیوتار، بودریلا، ڈینئل بل، جرگن ہبر ماس، ماز دے لیوز، گواتری، جیمسن چارلس التاری، مدن سروپ، فونٹی کلی ون، جیمی ین لنڈا ایت ایز گلبرٹ، ایگر جین کورنر اسٹیون، مالوون اونیل، ہنگٹن، ایڈورڈ سعید وغیرہ نے بھرپور طور پر لکھا ہے۔ خاص طور پر دریدا نے اس سلسلے میں "دیگر ممکنات" پر نظر ڈالی جبکہ فوکو کے یہاں "خلیج کی ایک مستقل تنقید" سامنے آتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے نظریے میں سب سے پر مغز اور دلچسپ بحث ادبی بیماریت پسندوں جیمی سن، ہنگٹن اور ایڈورڈ سعید کے یہاں ملتی ہے۔

آج کے دور میں انسان دوست، دانشور کے تجربے میں انسانی تناؤ اور انسانی محرومیوں کے معاشرتی عوامل سب سے زیادہ اہم ہیں تو دوسری جانب معاشرتی سطح پر ثقافتوں اور ذیلی ثقافتوں کی حرکیات اور سکونیات نئی تغیر پذیری سے دوچار ہے۔ مابعد جدیدیت کو نئی لبرل ازم کا نام بھی دیا جارہا ہے کیونکہ اس کی فکری حدود لامحدود ہیں جو کہ کسی سلسلہ بند یا نظریاتی کلیہ بندی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتی۔ ثقافتی بازیافت کا مسئلہ بہر طور اس نظریے میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ مابعد جدیدیت کے نظریے میں فنون لطیفہ کی جمالیات ثقافتی حصار ہی میں جنم لیتی ہیں اور ادب و فن کو خلق کرتی ہیں۔ لہذا یہ نظریہ تکثیریت کا نظریہ بھی ہے۔ اس سے قبل عمرانیاتی اور بشریاتی علوم کو جدیدیت پسندوں نے اپنی لغت سے باہر نکال پھینکا تھا وہ اب دوبارہ ادب و فن کے جمالیاتی مخاطبے کا حصہ بن چکا ہے اور ادب کی مخصوص میکانیت کو دریافت کرتے ہوئے مابعد جدیدیت نے نئے فکری اور تنقیدی مخاطبے کو جنم دیا۔

مابعد جدیدیت کا نظریہ زمانی صداقتوں پر مبنی آئیڈیالوجیکل موقف ہے جس میں بیانیہ کو دریافت کیا گیا ہے اور معروضی صداقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے تجریدی اور چیستانی مخاطبے کو رد کیا۔ مابعد جدید نظریہ، مابعد جدیدیت، نئی مارکسزم، نو تاریخیت اور تانیثیت کے نظریاتی اجزائے ترکیبی سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ۱۹۶۰ء کے بعد کی تنقید ہے اور اس سے تنقیدی رویے بنیاد پسند نظریات کا رد ہیں جو کہ مغرب کی عمرانیاتی نظام ترتیب کی وابستگی کی مبادیات تصور کیا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت کا نظریہ اپنے مزاج میں ایڈیکل بھی ہے۔ وہ ہمی اور عملی نوعیت کا بھی ہے جو کہ معاصر زندگی کی تکثیریت کو ابھار کر افتراقات کو منظر عام پر لاتا ہے۔ مابعد جدیدیت کو بنیادی طور پر انسان دوستی کی فکری روش کا ثقافتی کارنامہ نمایاں بھی کہا گیا جو وسیع تناظر میں معاشرتی نوعیت کا ہے جس میں نئی قسم کی رومانی خوشبو ہی نہیں ملتی بلکہ تجارتی معاشرے سے اپنی علیحدگی کا احساس بھی ملتا ہے۔ یہ نظریہ کاروباری دنیا سے ایک واضح فاصلہ قائم کیے ہوئے ہے۔ معاشرتی سطح پر مابعد جدیدیت کا نظریہ فکری نئی جہات کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور معاشرت کے حاوی نظام فکر میں اپنے نفوذ کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ مابعد جدید نظریہ رومانوی خوابوں کے مبادلیاتی تصورات کو توڑ پھوڑ کر چکنا چور کر دیتا ہے اور معاشرے میں افراد کی قلبیات کی "فرد بندی" کرتا ہے۔ فرد کی فکری خود مختاریت میں در آنے والے موضوعی جبر اور اثرات پر مباحث کے دروازے کھولتا ہے۔ "خود مختاری" کا تصور ہی اصل میں انسان دوستی سے عبارت ہے۔ فرد جس معاشرے میں بستے رہتا ہے وہ اپنی انسانی دنیا خود ہی تشکیل دیتا ہے اور اپنی خود مختاری کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ خود مختاری کا تصور فرد کے نظام میں ہی پنہاں ہوتا ہے۔

ہیگل کے الفاظ میں "خود مختاری" معاشی نظام یا کلیت کی استدلالیت میں شناخت کی جاسکتی ہے جو کہ دیگر فکری مرکبات کے ساتھ رو بہ عمل ہوتی ہے۔ جس میں فرد کی معاشرتی حرکیات اور کلیت بھی شامل ہیں۔ مابعد جدیدیت نے نظریے کے دوسرے انتہائی قطبین پر لبرل ازم بھی نظر آتا ہے جو کہ انفرادیت پسند خود مختاری کے تصور سے پر ہوتا ہے اور اپنے طور پر "آزاد" تصور کرتا ہے اور اپنے انتخاب کی ترجیحات خود تشکیل دیتا ہے۔ کانٹ کے مضمون میں خود مختاری کا یہ عمل "خاص جواز" اور "عملی جواز" میں منقسم ہوتا ہے جو کہ بصیرت بھی ہے یا ہبرماس کے حوالے سے معاشرتی نظام میں ان جہات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے (جس میں معیشت، قانون، انتظامیہ اور جمالیات شامل ہوتی ہیں) جو بذات خود جدیدیت کے "معاشرتی کل" سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ معاشرتی زندگی بین العمل کا افق ثابت ہوتے ہیں جو خود بہ خود اپنی روایت اور منطق کو ترتیب دے کر بہت کم انسانی زندگی کے مختلف نظاموں میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ جبکہ جدیدیت اکثر معاشرے کے حاوی محرکات سے الجھتی رہتی ہے۔ فن کار اور انسان دوست دانشور عموماً جمالیاتی نظام پر حاوی ہونے والے معاشرتی نظام کی قانونی اور انتظامی بندشوں کے خلاف احتجاجی رویہ بھی اختیار کرتی ہے۔ مشہور ناول نگار جان اپ ڈک (John updike) کے بقول مابعد جدید سیکولر نیوز رپورٹ نہیں ہے اور نہ ہی یہ بہت سارے اندیشوں اور نہ ہی مقدس خبروں کی رپورٹ ہے۔ غالباً اپ ڈک نے یہ بات اس لیے لکھی کہ وہ ناول کو متوسط طبقے کی سیکولر خبر تصور کرتے ہیں۔ رد تشکیل نے متن کو کھلونا بنادیا لہذا متن کی تشریح اس افق پر متوازی اور حاشیائی نوعیت کی رودادنگاری ثابت ہوئی اور رد تشکیل کی چھلنی سے گذرتے ہوئے متن کے اپنے کئی ٹکڑے ہوگئے لہذا اس مقام پر

تنقیدی مخاطبہ فیشن ایبل ثابت نہ ہو سکا اور اس ابہام کا یہ نتیجہ بر آمد ہوا کہ اردو تخلیل، مابعد جدیدیت سے باہم نہ ہو سکی۔

فوکو سے جب یہ پوچھا گیا کیا آپ مابعد جدید دانشور ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ "وہ مابعد جدید کی اصطلاح کے معنی نہیں جانتے۔" فوکو نے مابعد جدیدیت کے مسائل سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا لیکن اس نظریے پر فوکو کے بڑے احسانات ہیں کیونکہ ان کی فکریات سے ہی مغربی فکر میں مابعد جدیدیت نے وصف کی شناخت ممکن ہو سکی خاص طور پر پس روشن خیالی اور پس مارکسی نظریات کے فکری مزاج کو۔ ان کی فکری عرق ریزی ہی سے مستحکم اعتبار حاصل ہوا کیونکہ فوکو کا اصل فکری مقولہ معاشرتی انسلاکات کے حوالے سے کائنات کی آگہی ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا گیا کہ مابعد جدید نظریات کے اجزائے ترکیبی میں تانیثیت کو بھی کلیدی مقام حاصل ہے۔ فوکو کا مابعد جدیدیت اور تانیثیت کے حوالے سے تساوی نوعیت کا حوالہ بھی بنتا ہے۔ لیکن اگر درجہ بندی کی جائے تو فوکو کو مابعد جدید نظریے میں جگہ ملتی ہے وہ بنیادی طور پر تانیثی مفکر نہیں ہیں۔ بقول ڈیوڈ ہوئے (David Hoy) نے لکھا ہے "وہ (فوکو) ان معنوں میں مابعد جدید کے منکر ہیں۔" اسی طرح سوزن ہیک مین (Susan (Hekman نے لکھا ہے کہ "فوکو کے کارہائے نمایاں میں مابعد جدیدیت کا جوہر موجود ہے۔ حالانکہ اس لیبل کو فوکو نے مسترد کیا۔"
اسکاٹ لیش (Scott Lash) کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ "میری معلومات کے مطابق فوکو نے شاید مابعد جدید کی اصطلاح کو استعمال کیا ہو۔" کیونکہ ان کی جمالیات Distnitly Recognisable کی مابعد جمالیات ہے۔

اس منظر نامے کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اردو میں ہونے والی مابعد جدیدیت کی بحث فی الحال ادھوری ہی نہیں بلکہ بہت بے رنگ و بو بھی لگتی ہے۔ فکری رویئے اور تحریکیں فرد کے شعوری آگہی اور اس کے ادراک کے بحران سے پھوٹتی ہیں۔ اس فکری بحران میں ارتقائے انسانی کی رمق بھی نظر آتی ہے۔ انسانی ارتقاء کے ادراک کو ہم واہمہ کہیں یا صداقت یا التباس یا قول محال سے معمور کریں لیکن جینوئن فکر مثالیت یا فینٹسی ہی سے جنم لے کر قبولیت عامہ حاصل کرتی ہے۔ مغرب میں مابعد جدیدیت اب کوئی الجھاؤ پیدا کرنے والا فکری متنازعہ فی مسئلہ نہیں وہاں ہر بات صاف طور پر سمجھ میں آرہی ہے کیونکہ مغرب کا معاشرہ تغیر پذیری کے ساتھ اپنے تہذیبی بحران پر کھلا مکالمہ کرتی ہے اور اس مخاطبے میں آگے پیچھے ظاہری اور اخفائی محرکات سے بھی آگاہ ہوتی ہے جبکہ اردو میں مابعد جدیدیت دل لگی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا پیمانہ بنی ہوئی ہے۔ مابعد جدیدیت سے پہلے ترقی پسندی اور جدیدیت کی تحریکیں اور رویئے اردو میں رائج رہے۔ یہ تحریکیں اپنے مخصوص فکری ایجنڈے کے ساتھ ابھریں اور پھر انھی تحریکوں میں انحرافی عناصر ابھرے، باغیوں کی اس فوج نے اپنی انفرادیت اور اپنی تخلیقی شناخت کو اپنے طور پر ہی متعارف کروانے کی کوشش کی۔ کچھ معاشرتی مخاطبے سے کٹ گئے کچھ آئیڈیالوجیکل طور پر التباس کا شکار ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جس نے جو چاہا وہ کیا۔ ترقی پسندوں میں حاضری کو جدیدیت پسند رسائل میں چھپنا اعزاز سمجھا اور ایک وقت یہ بھی آیا کہ اپنے تخلیقی یا تنقیدی فکر کے اس سفر میں ابھی وہ کچھ ہی تھے۔ ترقی پسندوں اور جدیدیت کو کوئی دے کر ان سے الگ ہونے اور کوئی بات جس کی اردو ادب ان سے توقع کر رہا تھا وہ نامکمل ہی رہی۔ کوئی بھی ان تحریکوں سے فکری اور جذباتی طور پر وابستہ نہ رہا۔ صرف اپنی شخصیت کے پرچار کے لیے ان تحریکوں کو استعمال کرتا رہا۔ اردو کا فکری تنور ہمیشہ ہی سے گرم رہا۔ کسی نے اس میں ترقی پسندی کی روٹی لگائی کسی نے جدیدیت کی۔ کئی ایک کی روٹیاں ان کی خواہش کے مطابق پک نہ سکیں۔ کچھ نے اس تنور میں بہتر روٹیاں لگائیں مگر اب یہ تنور ٹھنڈے ہو چلے ہیں۔ لہٰذا اردو کا لکھنے والا اب تنہا ہے اور اپنی شناخت کے چکر میں الٹے سیدھے کرتب دکھا رہا ہے۔ اس کا نہ تو کسی فکری مخاطبے سے سروکار ہے نہ ہی اسے مابعد جدیدیت سے مکمل آگاہی حاصل ہے۔ بس وہ ان پراسرار اسٹیبلشمنٹ سے اس لیے جڑا رہنا چاہتا ہے کہ اسے اپنے دشمنوں سے تحفظ حاصل ہو سکے۔ مابعد جدیدیت میں جس قسم کا روشن خیال پروجیکٹ ملتا ہے وہ اردو میں نظر نہیں آتا۔ یہاں یعنی اردو میں رجعت پسندی کا پروجیکٹ بہت مستحکم ہے۔ جہاں کھلا فکری مخاطبہ کرنا، اپنی موت کی خود دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اردو والے اپنی فکری اور خلقی کھوکھلے پن کو تسلیم نہیں کرتے۔ اردو کا دامن مختصر سے مختصر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ کہاں معاشرے کی وسعتوں کو سمیٹ پائے گا؟ ہم پیسے اور نارسائیوں کے تحت اپنے تہذیبی اور فکری مسائل کو حل کر سکیں گے؟ اردو والوں کو سچائی کے ساتھ اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ وہ اپنی زندگیوں میں کتنے ترقی پسند رہے ہیں اور انھوں نے جدیدیت کو کتنا سچائی سے اپنایا ہے؟ وسیع النظری کی باتیں کاغذ پر تو مل جاتی ہیں مگر فکری کشادگی کہیں نظر نہیں آتی۔ اردو والا اپنے معاشرتی مخاطبے کے سلسلے میں مغالطوں کا شکار ہے۔ اس بے معنی صورتحال میں وہ مابعد جدیدیت کو کیسے اپنا سکے گا۔ وہی مکر آمیز اور سازشی ماحول اور اردو کے فکری بین العمل حاوی ہے۔ لہٰذا ان کی فکر اور تحریروں میں جینوئن فرد کا جمال و بحران نہیں ملتا۔ وہ اصل میں وہ نہیں جس کا دھوکہ وہ اپنے قارئین کو بڑی ہوشیاری اور دلیری سے دیتا ہے۔ اس کا اجتماعی شعور گم شدہ ہے۔ معاشرتی مخاطبہ اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ ذرائع ابلاغ کے رنگا رنگ التباس نے اسے عمیق فکر کے جوہر سے محروم کر دیا ہے۔ وہ فکر کے حساس مسائل کو سنجیدگی سے برتنے کا اہل نہیں، کیونکہ اس کے لیے بڑی جگر سوزی کرنی پڑتی ہے اور مابعد جدیدیت کا "مشغلہ" نہ دل لگی ہے اور نہ ہی یہ باآسانی سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی آسانی سے ہضم ہوتا ہے۔ اس کو برتنے سے پہلے خود بھی وسیع النظر اور وسیع مطالعہ ہونا لازمی ہے۔

● 321 - Old Elkhart Road H - 37, Palestine Texas 75801 (U.S.A.)

BIBLIOGRAOPHY

Altieri, Charles. 1990. "The Power and Limits of Oppositional Postmodernism" American Literary History 2 : 443 - 81
Aronowitz, Stanley - 1987. "Post Modernism and Politics" Social Text 18 : 99 - 115
Hekman, S. 1990). Gender and Knowledge : Element of a Postmodern Feminism. Cambridge : Polity Press.
Hoy D. (ed) 1986. Faucault : Acritical Reader. Oxford : Basil Blackwell.

Lash. S. 1985. Postmodernity and desire. Theory and Society. 14 - 1 - 33.
Jameson. Fredric. 1984. Postmodernism or Cultural Logic of Late Captialism. "New Left Review. 146 : 53 - 92.
Mckenna. Andrew. 1992. Violence and Difference. Illinois : University of Illinois.
Mcgowah. 1991. Post modernism and Its Critics. Ithaca and London. Cornell university Press.
Racevskis. Karlis. Post Modernism. 1993. Charlotterville. University of Virgina Pr.
Updike, John "Modernist, Postmodernist, what will they think of next New Yorker in 10 Sept 1984 135 - 42

لفظ کا تقدس اور ادیبوں کی ذمہ داری

سمیع احمد سمیع

ہر باشعور ادیب و شاعر کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ فکر و خیال کی طاقت ایک بڑی طاقت ہے۔ مگر یہ طاقت اظہار کے بغیر بالکل اسی طرح بے کار ہے جس طرح کسی پٹرول پمپ میں ذخیرہ کیا ہوا پٹرول۔ پٹرول اپنی قوت و صلاحیت کا مظاہرہ اپنے استعمال کے توسط سے کر سکتا ہے۔ اس کے استعمال ہونے کے مختلف ذرائع ہو سکتے ہیں۔ انسانی ذہن کی وادی میں فکر و خیال کے بے شمار پودے نشو و نما پاتے رہتے ہیں۔ جن خیالات و خواہشات کو اظہار ہونے کا موقع ملتا ہے وہ صوری اور معنوی اعتبار سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور جن کو اظہار کا پیکر نصیب نہیں ہوتا وہ ذہن ہی میں مدفون رہتے ہیں۔ فکر و خیال کے اظہار کے بھی مختلف وسیلے ہو سکتے ہیں۔ ایک عام آدمی اور فنکار میں یہی فرق ہے کہ ایک عام آدمی اپنے خارجی عوامل کے رد عمل سے گزرنے کے باوصف اپنے جذبات و احساسات اور تشویقات و تفسیرات کو دوسروں تک بہ احسن نہیں پہنچا سکتا۔ ہم اس بات کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک شخص جو کسی سے محبت کرتا ہے مگر فنکار نہیں ہے وہ ایک انتہائی خوبصورت سی نظم یا غزل کو پڑھتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال پہلو مارنے لگتا ہے کہ وہ بھی اسی خوبصورت نظم کی طرح اپنی محبوبہ پر ایک خوبصورت سی نظم تخلیق کر سکتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے ذہن کی سطح پر اس کی محبوبہ کے رنگ و روپ کے ساتھ ساتھ اس کے ناز و انداز، عشوہ و غمزہ اور دل آویز مسکراہٹ کے کتنے ہی زاویے، کتنے ہی رخ رقص کرنے لگتے ہیں۔ مگر وہ اپنی محبوبہ کی شکل و صورت کو لفظوں میں نہیں ڈھال سکتا کیوں کہ اسے شاعری نہیں آتی اس لئے وہ اپنے خیال اور خواہش کی صورت گری سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمام آدمی اپنے اندرونی جذبے کے اظہار کا بالکل ہی سلیقہ نہیں رکھتے۔ ہر فرد میں تھوڑی بہت مصوری، سنگ تراشی، موسیقی اور تحریری صلاحیت ہوتی ہے اور وہ بھی خارجی عمل سے اثر قبول کرتا ہے۔ اور خود تاثیری کے لمحات سے بھی گزرتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ایک فنکار خارجی عوامل سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے اور تاثرات کو جلد قبول کر لیتا ہے۔ ایک فنکار کے اندر ذخیرہ اندوزی کی بھی غیر معمولی صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ اپنے ارد گرد کے مسئلوں، حادثوں اور مزاحمتوں کے رد عمل کو اگر کسی وجہ سے اظہار کا پیکر نہیں دے سکتا تو اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ اور وہ خواہشات و جذبات کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ایک قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ماحول میں موجود مزاحمتوں، منفی قوتوں، غیر جمہوری اور ناپسندیدہ رویوں کا عمل تو اس کی شخصیت کے اندر نشو و نما پاتا ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو اس کے ذہنی ذخیرے میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ وہ سریع الحس ہوتا ہے اس لیے وہ ذرا ذرا سی چیز کو محسوس کرتا ہے اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خواہشات و جذبات جو اس کی شخصیت میں ذخیرہ اندوز ہو کر سیال مادے کی طرح اخراج کے لیے مسلسل اضطراب کا شکار رہتے ہیں جو ہر تخلیق میں ڈھل کر اپنی تمام تر بے ساختہ پن کے ساتھ لفظوں، استعاروں، تشبیہوں اور طرح طرح کی اداؤں کی صورت میں کرشمہ سازی دکھانے لگتے ہیں۔ ایک عام آدمی میں اول تو ذخیرہ اندوزی کی فنکارانہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ وہ اپنی اندرونی صورت حال کو پیش کرنے کے لیے اضطراب و فشار کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اس میں اپنے اندرونی جذبوں کا منظر نامہ پیش کرنے کی استعداد بھی نہیں ہوتی۔ ایک فنکار اپنی تخلیقی اظہاریت ہی کے وسیلے سے جذباتی و فکری دباؤ یا فشار سے نہ صرف نجات حاصل کرتا ہے بلکہ دوسروں کو انبساط و مسرت سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ یہ فنکار کے اندر خارجی اثرات کا جو رد عمل ہوتا ہے اس کا دباؤ اس کے اندر اس کا شدید مضطرب بلکہ مشتعل صورت میں ہوتا ہے کہ اس کی کیفیت ایک دیوانے کی سی ہوتی ہے۔ ایک دیوانے اور ماہر فن میں کیفیت کے لحاظ سے بہت باریک مگر اہم فرق ہوتا ہے۔ فنکار ایک ایسا دیوانہ ہوتا ہے جو خرد افروزی اور آگہی بانٹتا ہے۔

قلم کار کے تمام تخلیقی رویے اظہاریت کے ساتھ ہی میں نمو پاتے ہیں۔ اظہاریت اور اسلوب کو صورت گری عطا کرنے والے الفاظ ہوتے ہیں۔ یعنی الفاظ اظہاریت کا ایک موثر ذریعہ ہیں۔ فکر و خیال جب ہم آہنگ خواہشات اور مربوط اظہاریت میں ڈھل جائیں تو وہ فن کہلاتے ہیں۔ فن و ادب کا تعلق زبان سے ہے اور زبان لفظوں کا ایک مربوط و منظم مجموعہ ہے۔ ذاتی جذبات و خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اور زبان کو زبان کا تقدس الفاظ کے توسط سے ملتا ہے۔ احساسات و تفکرات فنکار کی ذات کی گلیوں میں چاند ستارے کی طرح ضو فشاں ہوتے ہیں جن کی روشنی الفاظ کے توسط سے اس کے فن کو اجالتی ہے اور اس کا فن سماج و معاشرے کو اجالتا ہے۔ لہذا خیال کی قوت مسلم مگر خیال اگر ذہن میں پیدا ہو کر ذہن ہی میں فنا ہو جائے تو وہ بے کار محض ہے۔ مگر جب یہی فکر و خیال اور جذبات و احساسات رد عمل کی صورت میں وجدان سے اظہار کی ٹھوس تمثالی صورت اختیار کرتے ہیں تو قیامت ڈھاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ لفظ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جیسا کہ ابھی کہہ چکا ہوں کہ لفظوں کے طریقہ استعمال ہی سے ایک عام آدمی، ایک حقیقی دیوانے اور تخلیق کار یا ماہر فن میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ موضوع و مواد یا فکر و خیال ایک زبردست قوت ہے اور اس قوت کا منبع و مخزن الفاظ ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ خیال لفظوں کی رگوں میں خون

کی طرح ہو کر ایک ایسی قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے جو انسان کے فکری رویے، میلانات اور نظریات تک کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ اپنے اثرات سے تہذیب و تاریخ کی تشکیل نو کے ساتھ ساتھ فرسودہ روایات کی چھانٹی بھی کرتا ہے۔ موضوع و مواد کو وجود و نمود عطا کرنے والے ان الفاظ کے تقدس، اہمیت، اثر آفرینی اور عمل ترسیل کو بامعنی، بامقصد اور باوقار بنانے کی تمام تر ذمہ داری قلمکار پر ہے۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کی خوش بختی ہے کہ ان کی دسترس میں ایسی قیامت خیز اور انقلاب آفریں شے موجود ہے۔ فکر و خیال نے اس مخزن بے بہا کے مالک ہونے کی حیثیت سے ادیبوں اور شاعروں پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لفظوں کے تقدس کو قائم رکھتے ہوئے اس مخزن کی حفاظت بھی کریں اور اس کے استعمال میں روشن ضمیری اور آگہی کو بھی بروئے کار لائیں۔ لکھنے والے لفظوں کے امین بھی ہوتے ہیں اور ان کے نباض بھی۔ دل و دماغ اور فکر و شعور کو مسخر اور متعین کرنے کے لیے ایک سچا فن کار جب فکر و احساس کو صوری وصف عطا کرنا چاہتا ہے تو تمثالوں، امیجز اور ذہنی خاکوں کی انگلیوں کو لفظوں کی نبض پر رکھتا ہے اور تخلیقی فعالیت کی ایسی فضا اپنی تخلیقات کے بطن میں پیدا کر دیتا ہے جس میں نہ صرف جمالیاتی اوصاف اور ادبی قدروں کی بازیافت ہوتی ہے بلکہ اس میں عہد ساز، رجحان آفریں اور جمہوری آدرش رکھنے والا معنوی حسن بھی موجود ہوتا ہے۔

لفظ جو فکری قوت کا پیکر اس خزانہ اپنے دامن میں رکھتا ہے وہ جس قدر موثر، تحسین اور جمالیاتی اہتمام کے ساتھ ادب میں ظاہر ہوتا ہے کسی اور میں نہیں۔ کیوں کہ انسانی آدرش، اس کی خواہشات اور احساسات کی خوبصورت ترین شکل و صورت شعر و ادب ہے اور ادب جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ عہد ساز بھی ہے اور عہد آفریں بھی۔ یہ انقلاب پرور بھی ہے اور نغمہ افروز بھی۔ یہ زندگی کا ثناخواں بھی ہے اور نوحہ گر بھی۔ یہ دل کو بالیدگی بھی دیتا ہے اور ذہن کے آنگن کو مہکاتا بھی ہے۔ یہ بعض اقدار کی نفی بھی کرتا ہے اور بعض قدروں کا اثبات بھی۔ یہ تہذیب و ثقافت کا خزینہ بھی ہے اور خیر و شر کا میدان کارزار بھی۔ ادب تہذیبی عمل بھی ہے اور ایک ایسا آئینہ بھی جس میں زندگی کی تمام تر قدریں رنگارنگی کے ساتھ عکس پذیر ہوتی ہیں۔ کبھی یہ بعض احساسات اور واقعات کو صرف پیش کر دیتا ہے اور کبھی ان کی تفسیر کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اور کبھی تنقیدی رویے سے بھی کام لیتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا کہنا ہے کہ ہماری زندگی کے لیے تنقید سانس کی طرح ناگزیر ہے۔ اس طرح ادب اگر واقعی تنقید حیات ہے تو پھر یہ ہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس۔ لہٰذا اگر اتنی ناگزیر اور اہم شے کے تقدس کو برقرار نہ رکھا گیا تو یہ تنقید حیات کا کام انجام نہیں دے سکتی۔ اس طرح ادب وسعت اور معنی آفرینی سے محروم ہو جائے گا۔ زندگی کی اچھائیوں اور برائیوں کا تجزیہ نہیں کر پائے گا۔ تیکھی اور گہری رائے نہیں دے سکے گا۔ اس طرح یہ زندگی کی قدر و کشش کے بند دریچوں کو نہیں کھول سکے گا۔ حسیت اور معنویت کی بنیادوں کو استوار کرنا اس کے بس سے باہر ہو جائے گا۔

ادیب و شاعر ہی ادب کو اس کا صحیح مقام عطا کرتے ہیں۔ اس لیے ادب کے اعلیٰ ہونے کے لیے ادیب اور قلم کار کا بھی مخلص و اعلیٰ ہونا ضروری ہے۔ حالی کا یہ کہنا آج بھی درست ہے کہ اچھا ادیب ہی اچھا ادب پیش کر سکتا ہے۔ ٹوٹتی ہوئی قدروں اور بکھرتے ہوئے معاشرے کے اجزائے ترکیب نو کی ذمہ داری خون جگر صرف کرنے والے ادیب و شاعر ہی پر ہے۔ اس طرح ادب کے اوصاف و اقدار کی بحث سے پہلے خود ادیب و شاعر زیر بحث آتے ہیں۔

الفاظ اور ان سے پیدا ہونے والے ادب کی اہمیت ممکن ہے ان کی نگاہوں میں کچھ نہ ہو جو ان کو محض خود ستائی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ معاشرے میں ان کا شمار بھی مفکرین اور مدبرین میں ہو۔ اس انداز نظر اور ادبی رویے سے نہ صرف ادب کی اہمیت و حیثیت کو شدید نقصان پہنچتا ہے بلکہ ذاتی، گروہی اور ذاتی سود مندی کی غیر مخلصانہ روایت کو راہ پانے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ ایسے ادیبوں کے ہاتھوں لفظ کا تقدس جاتا رہتا ہے اور جھوٹا ادب تخلیق ہونے لگتا ہے جس کا رشتہ عوامی دھاروں اور عصری صداقتوں سے کٹ جاتا ہے۔ ادیب جھوٹ لکھ کر عارضی قسم کی شہرت و مسرت تو حاصل کر سکتا ہے مگر حقیقی اور دیرپا سربلندی اس سے ہمیشہ دور رہتی ہے۔ کذب آرائی سے ادب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ پاتی بلکہ ایسے نمائشی اور غیر معتبر لکھنے والوں کا تعلق جگالی سے جو ز نا جگالی کی توہین ہے۔

ایک باشعور اور باضمیر قلمکار دنیاداری کی فریب کاریوں کو سمجھتے ہوئے اپنے تخلیقی وظیفے کی جمالیات اور جوہر تخلیق کی تکمیل انسانی فطرت کے تنوع، معاشرتی تضادات کی ان گنت صورتوں کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس کا تخلیقی کردار و عمل ان تمام سطحوں پر خیر، حسن اور آزادی کا نقیب بن جاتے ہیں۔ جس کی وساطت سے وہ دنیا کو جنت بنانے کا خواب دیکھتا ہے۔ قلم کار اپنے اظہار و بیان کو معاشرتی مسئلوں اور تاریخی صداقتوں کے پس منظر سے منسلک کر کے فرد کے جمالیاتی شعور، آزادی کے سپنوں کو اپنے سپنوں سے ہم رشتہ کر دیتا ہے اور ہیئت و مواد کے متوازن تخلیقی رویے کے مظاہرے میں کامران ٹھہرتا ہے۔ اس لیے ایک تخلیق کار سے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمرانی و انسانی رویوں کو اچھی طرح سمجھنے کی سعی کرے۔ کیوں کہ تاریخ کے فطری دھاروں میں زندگی بسر کرنا ادیب و شاعر کا فریضہ بھی ہے، منصب بھی۔ ادبی تخلیقات ہی وہ آئینے ہیں جن میں ہم اپنے خوابوں، آدرشوں، خواہشوں اور امکانات کو زیادہ سے زیادہ پرکشش اور خوبصورت انداز میں منعکس دیکھتے ہیں اور ان کو زندہ لفظوں کے پیکر میں سمو کر زندہ بھی رکھ سکتے ہیں۔

تاریخ کے صفحات اس بات کے شاہد ہیں کہ انسان دشمن ذرائع ابلاغ نے الفاظ کو صرف انہیں مفہوم و معنی میں استعمال کیا ہے جو ان کے اپنے مفادات سے مطابقت رکھتے تھے۔ لیکن وہ ادیب و شاعر جو لفظوں کے تقدس کو سمجھتے ہوئے سچا ادب تخلیق کرنے پر ایمان رکھتے ہیں وہ اجارہ داری، فریب کاری اور منافقت کے خلاف ہمیشہ فکر و نظر کا پرچم بلند کرتے رہے ہیں۔ وہ لفظوں کے جارحانہ استعمال کے حق میں کبھی نہیں رہے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ ادیب و شاعر لفظوں کا تقدس اسی وقت قائم رکھ سکتے ہیں جب ان کی ذات کی اندرونی دنیا میں اس کی امنگ ہم ہو۔ قلمکار معاشرہ، تاریخ، علم اور ادب سے تجربات حاصل کر کے اپنے اندر خوب و زشت کی تمیز پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے مگر جب تک لفظوں کے تقدس و اہمیت کا احساس اس کی شخصیت و حسیت میں رچ بس کر اس کے شعور و لاشعور کا جزو نہ بن جائے۔ اس وقت تک اس کو لفظوں کے بطن میں چھپی ہوئی قوت کا صحیح اندازہ

ہوگا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ارباب فن و ادب کو کسی حال میں بھی لفظوں کی اہمیت اور ان کے استعمال کے سلسلے میں بیرونی دباؤ کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ لفظوں کے تقدس کے احساس کا چشمہ خود قلم کار کی ذات کی نشیب میں پھوٹنے تاکہ یہ احساس اس کے دوسرے احساسات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر آزاد تخلیقی امکانات کی صورت اختیار کرلے۔ اس طرح قلم کار از خود اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے لگے گا جس کے ہم متمنی ہیں۔

بیرونی دباؤ یا پند و نصائح کے فیشار سے اور دوسروں کی خوشنودی کی خاطر فرمائشی طور پر لفظوں کے تقدس اور اہمیت کی کھوکھلی علمبرداری کا مظاہرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔

آج کے جدید ادب میں لفظ، زبان اور متن کے حوالے سے ساختیات اور رد ساختیات کی بحث بڑی شدومد کے ساتھ چھڑی ہوئی ہے۔ ہمیں ان مباحثوں کے تناظر میں بھی لفظوں کی پرتوں، رشتوں، تقدس اور اہمیت کا بغور جائزہ لینا چاہئے کیونکہ تحریر بولتی ہے لکھاری نہیں (Writing writes not writers) کی روشنی میں بھی الفاظ کی اہمیت اور کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ افلاطون کا یہ کہنا کہ کرسی کا خیال کرسی سے اہم ہے کیونکہ اگر ایک کرسی ٹوٹ کر تباہ ہو جائے تو کرسی کے خیال سے دوسری کرسی بن سکتی ہے لیکن اگر کرسی کا خیال ہی ذہن سے مفقود ہو جائے تو دوسری کرسی دوبارہ نہیں بن سکتی۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ مگر بات صرف کرسی کے خیال کی اہمیت ہی پر ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اگر ہوائی جہاز کے موجد کے ذہن میں ہوائی جہاز کا خیال پیدا ہو کر ذہن ہی میں رہتا تو آج ہوائی جہاز کے وجود سے کوئی واقف نہیں ہوتا۔ موجد کے خیال کو صورت گری دینے کے لیے ٹھوس اشیاء کی ضرورت پڑی تھی اور ہوائی جہاز کا وجود اس کے ٹھوس اشیاء کے باہمی رشتوں ہی سے قائم ہے اسی طرح کسی نظم کا خیال یا کسی کہانی کا پلاٹ ذہن میں پیدا ہو کر اگر ذہن ہی میں رہ جائے تو اس کے بارے میں سوائے تخلیق کار کے کسی اور کو کچھ علم نہ ہوگا۔ پھر یہ کہ عام آدمی کے ذہن میں بھی بہت سے اچھوتے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں دوسرے صرف اس وجہ سے نہیں جان سکتے کہ اس کے پاس وہ تخلیقی صلاحیت نہیں جس کی مدد سے وہ اپنے خیال کو لفظوں کا پیکر دے سکے۔ لہٰذا کسی ادبی فن پارے کا بامعنی تصور الفاظ کے بغیر ممکن نہیں۔

● DT/78/18, Samanabad, F B Area, Karachi (Pak)

جدید تر تخلیقی رجحان

آفاق عالم صدیقی



زبان و ادب کے عروج و زوال کا قومی عروج و زوال سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی قوم اپنا تشخص قائم رکھنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو اس کی زبان اس کا ادب اور اس کی تہذیبی قدریں بھی اپنا معیار و وقار کھو دیتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی زبان مر جاتی ہے تو پھر اس قوم کی تہذیبی شناخت اور تمدنی پہچان کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جو قوم زندہ، متحرک اور فعال ہوتی ہے اور جس کی تہذیب، ثقافت اور فنون لطیفہ زندگی کی ہمہ کالی کی صلاحیت رکھتے ہیں تو اس کی زبان بھی اظہار و بیان اور ترسیل و تفہیم کے ہر چیلنج کا سامنا کر سکتی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ جو بھی زبان زندہ اور فعال ہوگی اس کا دامن انحراف و بغاوت سے خالی نہیں ہوگا۔ اردو بھی چونکہ ایک زندہ، متحرک اور اظہار و بیان کے ہر طریقے کی متحمل زبان ہے اس لیے انحراف و بغاوت کی لہریں یہاں بھی محسوس کی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک زبان و ادب میں رجحانات کا سوال ہے تو یہ صرف اردو ہی کا نہیں دنیا کی ہر زبان کا معاملہ ہے۔ ایک رجحان امتداد زمانہ کی وجہ سے پردۂ اخفا میں چلا جاتا ہے تو دوسرا ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے یا اس کے جاتے جاتے تیسرا ابھرنے لگتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ جو رجحانات امتداد زمانہ کی وجہ سے پردۂ اخفا میں چلے جاتے ہیں وہ فنا نہیں ہو جاتے بلکہ زیریں لہر کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ادب میں رجحانات کا قائم رہنا یا رجحانات کا آتے جاتے رہنا ایک فطری عمل ہے۔ تاہم رجحانی جذبندی اور کسی مخصوص رجحان کی وکالت میں باقی ماندہ ادب کو ہدف ملامت بنانا یا اسے دوسرے درجے کی چیز سمجھنا نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ ادبی بددیانتی بھی ہے۔ کیونکہ عظیم ادب کسی قسم کی رجحانی تنگ نظری اور آئیڈیولوجیکل جذبندی کے محدود تصور سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ یوں بھی جب کسی ازم یا آئیڈیولوجی کے دائرے میں قید ہو کر ادب تخلیق کیا گیا ہے، انسانیت، عالمی اخوت اور بشریاتی فطرت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ہیں، اور نظریاتی سمت، حد بندی کا اور زندگی کی یک رخی شدت پسندی کا شکار ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آئیڈیولوجی بھلے ہی ادب کو کتنی ہی زرخیز کرتی ہو مگر نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام تر نظریاتی وابستگی، آئیڈیولوجیکل جذبندی، رجحاناتی محدودیت اور ازم و تحریک سے الگ رہ کر بھی ادب اپنا رشتہ ان اقدار سے بنا سکتا ہے۔ بلکہ بنائے رکھتا ہے جو انسان اور زندگی کی فطری زائیدہ ہیں۔ اس لیے ادب کو فارمولہ بند نہیں ہونا چاہئے کیونکہ زندگی نام ہے تحرک اور تغیر کا۔ وہ کسی فارمولے کے گھنے درخت کے نیچے براجمان ہوہی نہیں سکتی۔ زندگی تو لمحہ لمحہ نئے امکانات سے قریب تر ہوتی ہے۔ ہر نیا عہد نئے تقاضوں کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ زندگی کرنے کے اپنے طریقے اور سمجھوتے ہر عہد اپنے ساتھ لاتا ہے۔ واقعات و حادثات اور مسائل و میلانات کے نئے نئے جہان معنی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ نئے عہد کا پرانے عہد سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا ہے۔ ہر نئے عہد کا پرانے عہد سے ایک خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے کیونکہ ہر عہد ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک قدر مشترک بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سے جدید تر ادب کا رابطہ کسی نہ کسی سطح پر قدیم ادب سے ضرور قائم رہتا ہے۔ اور ہر عہد

کے فن کار اپنی الگ شناخت بناتے ہیں۔ ادب و فن میں خود اظہاریت کی نئی سبیل نکالتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ ہر نیا فنکار اظہار و بیان اور ترسیل و تفہیم کے تئیں خود کو منفرد ثابت کرنے کے لیے نئے الفاظ ایجاد کرتا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد "ہم الفاظ کو ایجاد نہیں کرتے بلکہ ان کے طرز استعمال سے ان کے معانی کو سمجھتے ہیں۔" الفاظ چونکہ عوامی ملکیت ہیں اس لیے اسے سب استعمال کرتے ہیں لیکن الفاظ یا بالفاظ دیگر زبان کا وقار و معیار اور اس کی تازگی و دلکشی فنکاروں کے دم ہی سے قائم رہتی ہے۔ ویسے لفظوں کی اپنی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی، الفاظ نہ تو حسین ہوتے ہیں اور نہ بدصورت، وہ نہ تو آئیڈیولوجیکل ہوتے ہیں اور نہ سیکولر، وہ نہ تو شاعرانہ ہوتے ہیں اور نہ وحشیانہ۔ وہ نہ تو محض تخلیقی ہوتے ہیں اور نہ محض تجریدی۔ ہمارے یہاں ایک فیشن بن گیا ہے کہ جب بھی کسی ادیب کی تعریف کرنی ہوتی ہے تو بلا سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں صاحب نے تخلیقی الفاظ کا بھرپور استعمال کیا ہے، کیا کوئی تخلیقی الفاظ کی فہرست بنانے کی ہمت کر سکتا ہے، یا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ بس فلاں فلاں الفاظ ہی تخلیقی ہیں، یا یہ کہ فلاں فلاں الفاظ تجریدی ہیں۔ ہرگز نہیں کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی الفاظ کو ٹکڑوں میں بانٹ دے۔ جو لوگ ایسا کرتے اور کہتے ہیں وہ زبان و ادب میں ایک گمراہ کن رویے کو فروغ دینے کے علمی اور اخلاقی سہو کے شکار ہو رہے ہیں کیونکہ لفظ کسی معنی مخصوص کے اسیر نہیں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ترقی پسندوں نے بھی انہیں الفاظ کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا تو جدیدیت نوازوں نے بھی انہیں الفاظ کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اور اب جو نسل افق ادب پر اپنی تابناکی دکھا رہی ہے وہ بھی انہیں الفاظ کو استعمال کر رہی ہے، مگر ظاہر ہے کہ حالات و واقعات اور اپنے عہد کے نئے تقاضوں کے پس منظر میں نئی فکری جہت اور نئی معنویت کے ساتھ۔ وہ نسل جو ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں ہوئی ہے، اپنے پیش روؤں سے کئی معنی میں مختلف ہے۔ سب سے پہلے تو اس کی انفرادیت اسی سطح پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کسی قسم کی آئیڈیولوجی یا ازم کے تحت ادب خلق کرنا اپنے لیے باعث فخر نہیں سمجھتی۔ وہ اپنے رویوں سے اس بات کی بھی غمازی کرتی ہے کہ فکری طور پر آئیڈیولوجیکل جکڑ بندی سے آزاد رہنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نسل کے فنکار ناقدوں سے ہمدردی کی امید نہیں رکھتے۔ وہ تو کھلے عام کہتے ہیں کہ "میری تنقید زیادہ اور وکالت کم ہو۔ مگر تنقید فارمولہ بند اور آئیڈیولوجیکل نہ ہو۔ موجودہ نسل خوب جانتی ہے کہ تقلیدی اور مصنوعی تنقید سے نہ تو ادب کا بھلا ہوتا ہے اور نہ ادیب کا۔ اس نسل کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بزرگ ناقد انہیں قابل توجہ نہیں سمجھ رہے ہیں۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بزرگ ناقدوں میں سے چند ایک کو چھوڑ کر سبھی اپنے اپنے رویوں میں پختہ ہو چکے ہیں۔ اور ان کے پاس اب اتنا وقت بھی نہیں رہا کہ وہ اپنے پختہ رویوں کا محاسبہ کر سکے اسے پابہ زنجیر کریں اور نئی نسل کی تخلیقات کا مکالمہ و مشاہدہ کریں، اور اپنے تمام تر سابقہ رویوں اور تحفظات سے بالاتر ہو کر حق نقد ادا کریں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ نئی نسل کی تخلیقات کا تجزیہ پرانے زاویوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ گذشتہ دہائیوں میں ہوئی تبدیلیوں نے اس نسل کے فنکاروں کو فکری طور پر متاثر کیا ہے۔ وہ ادب و زندگی کے بارے میں اپنے طور پر سوچنے لگے ہیں۔ اشتراکیت کا تنزل و بکھراؤ اور رد عمل کی صورت میں مذہبیت کا احیا اس نسل کے سامنے کا واقعہ ہے۔ سیکولر قدروں کو جھٹلانے پر تلی کٹر سیاسی اور مذہبی تعصب زدگی کا بھی اس نسل کو ذاتی تجربہ ہے۔ ملک و قوم بلکہ بنی نوع انسان کے قابل رحم اور توجہ طلب مسائل یعنی (بھوک، مفلسی، بیماری، بے روزگاری، دہشت گردی اور جہالت وغیرہ پر میڈیا اور اسکرین کے توسط سے پردہ ڈالنے کی کامیاب سازش اس نسل کے فنکاروں کے سامنے ہو رہی ہے، حد تو یہ ہے کہ دولت و ثروت کے قارون وقت کا ہماری تہذیب، ثقافت، لوک ورثہ اور کلاسیکیت کا اغوا کر کے دیس لے جانا اور ہمارا تمسخر اڑانا اور ہمارے دانشوروں، فنکاروں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ سب آج ہی کے مسائل ہیں۔ جس سے آج کی نسل کے فنکاروں کا ہر آن سامنا ہے۔ یہ نسل اپنے پس منظر میں سیکڑوں نظریوں اور آئیڈیولوجیوں کے بنائے گئے خواب محل کو مسمار ہوتے ہوئے دیکھ چکی ہے۔ اس لیے نئی نسل کے فنکار شعر و ادب کے پیش نظر کسی قسم کی مقصدیت کا علم بلند کرنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ جان چکے ہیں کہ یہ سب سعی بے جا ہے۔ نیز یہ کہ عظیم ادب خلق کرنے کی رو کے کھٹکے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو لاکھوں ٹن کاغذ سیاہ کرنے کے بعد روس کے بکھراؤ اور انتھوپیا کے جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے تخلیقی قوت سے مالا مال فنکاروں کو سنگ میل کی احتیاج نہیں ہوتی اور نہ اسے بھیڑ چال کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد کے فنکار تمام تر تحفظات سے دست بردار ہو کر اپنے عہد کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنے تہذیبی شعور اور تمدنی آگہی اور معاشرتی، بشریاتی انسلاکات اور ثقافت و لوک ورثے کے تناظر میں اپنے فن کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ آج کا فنکار اپنی ارضیت سے دست بردار ہو کر اپنی تہذیبی قدروں سے دامن کش ہو کر، اور اپنے سامنے کے مسائل سے نظریں چرا کر کسی مغربی مفکر یا منکروں، نظریہ ساز یا ہیئت گزار کے خوشامدی اور ڈھنڈھورچی بن کر دانشوری کا امپورٹیڈ تاج پہننے کے قطعی مدعی نہیں ہیں۔ اس نسل کے فنکاروں کا تعلق زندگی سے بلاواسطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجربات و مشاہدات ہمیں لیباریٹری کے تجربات کی طرح ناقابل فہم نہیں لگتے ہیں۔ ان کے تجربات اتنے حقیقی اور سچے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کا عکس لگتے ہیں۔ وہ اپنے پیش رو فنکاروں کی طرح ہیئتی تجربات کے نام پر عوامی زندگی کو معمہ بنا کر ذہنی بازیگری کے لیے مجبور نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی سچے سلگتے مسائل پر تجریدیت کا پردہ ڈال کر ہمیں بہلانے بلکہ بہکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ عوام اور عوامی مسائل کو اپنا سمجھتے ہیں اسی لیے ان کے سامنے ترسیل و تفہیم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آیئے اب ذرا اس نسل کے شاعروں کے کلام سے حظ اٹھائیں۔ اور ان کے رویوں کا مشاہدہ کریں۔

ہتھیلی ڈھل گئی ہے تاکتوں کی	مگر آنکھوں میں منظر چیختا ہے	(خورشید اکبر)
صدائے غیب سے معمور ہے کاشانۂ حسرت	مری شوریدگی کس ملک کی تصویر رکھتی ہے	(خالد عبادی)
یہ کیا کہ چند ہی شاخوں کو دھوپ، آب، ہوا	میں پیڑ ہوں مجھے نسبت ہر ایک ڈال سے ہے	(عالم خورشید)

گم ہوتا ہوں لامحدود فضاؤں میں سوچ کے کچھ باتیں گھبراتا ہوں (جمال اویسی)
بے ثمر کرنے پر آمادہ ہوئے چاہتے کیا ہو مرے اشجار سے (خالد عبادی)
دھڑکنیں تیز ہوئیں دل کی جو پتہ کھڑکا اب کہاں جینے کی مانند ہے جینا گھر میں (عاصم شہنواز شبلی)
زخموں کو اشک خوں سے سیراب کر رہا ہوں اب اور بھی تمہارا چہرہ کھلا رہے گا (احمد محفوظ)
برسات تک میں لوٹ سکوں گا مجھے یقیں نہیں رونے بھی دو لپٹ کے پرانے مکان سے (نعمان شوق)
جواں ہوگی تو سمندر کو کچھ نہ سمجھے گی ابھی تو پیاس کو صحرا میں چلتے رہنا ہے (سرور ساجد)
ہرے موسم کی پہلی خواہش اف خوشی غم کی دیوانی ہوگئی ہے (عطا عابدی)
زندگی کا یوں مزہ لینے میں آخر حرج کیا؟ پھر بنالیں گے نشیمن چھت ٹپکنے دیجئے (راشد انور راشد)
جانے کیا تاثیر تھی ضبط فغاں کو دیکھ کر آخر شب کا ستارہ ہم زباں لگنے لگا (راشد طراز)
میں وہ شجر ہوں کہ جس کو خودی نے پالا ہے جھکانا چاہوگے لیکن جھکا نہ پاؤ گے (کوثر مظہری)
سجدہ کرتے ہیں روایت کے غلام دل جھکایا تو جبیں کچھ بھی نہیں (جمال اویسی)
اک دھند کی دیوار ہے اطراف ہمارے تکنیک کی زد میں ہے ابھی ذات ہماری (خورشید طالب)
میں جس بچے کی صورت میں رہا برسوں نہیں ہے ساتھ اب اس کا گوارا بھی (عادل حیات)
گواہ تھا نہ کوئی میری بے گناہی کا برائے نام ہی دنیا یہ میری حامی تھی (رئیس الدین رئیس)
حاصل ہے ہم کو لذت توبہ خطا کے بعد بہتر ہے آدمی ہیں فرشتہ نہیں ہیں ہم (طارق متین)

فنکار اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے کیونکہ وہ عوام کی بہ نسبت بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اور بقول کولرج "شاعر اپنے عہد میں اور اک کی بلند ترین منزل پر ہوتا ہے۔ فنکار کی دوربین آنکھیں وہ سب بھی دیکھ لیتی ہیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے عہد میں تو جیتا ہی ہے وہ آنے والے زمانوں کی دھمک بھی محسوس کرتا ہے۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر عہد کے فنکاروں میں معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تخلیقی جدت اور عبقریت کا حق ادا کر کے ادب کو مالا مال اور خود کو لازوال بنا پاتے ہیں۔ فوری اور سرسری مطالعے میں آتے ہوئے مندرجہ بالا اشعار کو ذہن میں رکھیں تو شاید اس بات کے اعتراف میں زیادہ قیل و قال کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ یہ شعراء کسی قسم کی تعصب زدگی اور نظریاتی جکڑبندی کے اسیر نہیں ہیں۔ ایک بات جو غیر جانبدارانہ طور پر کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ نئی نسل کے کاروان شعراء میں جتنے نام شامل ہیں وہ سب کے سب تمام و کمال خوبیوں سے مالا مال نہیں ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ عصری حسیات کو گرفت کرنے کی صلاحیت ان میں ہے۔ کیونکہ انہیں تجربات سے زیادہ زندگی کے حقائق اور مسائل سے دلچسپی ہے اس لیے امید کی جاسکتی ہے کہ یہ شعراء آئندہ بھی انسان اور زندگی کی زائیدہ قدروں کو قائم و دائم رکھیں گے۔ اور ہیئتی و تجریدی تجربات کے نام پر ادب اور قاری کے رشتے کو مشکوک بنانے کے بجائے قاری سے رشتہ مستحکم کریں گے۔

● At · Pura. P O Kabaria, Darbhanga - 846009 (Bihar)

بقیہ صفحہ ۱۹ : دل کاری

آلود۔ ذرا سا سینے میں درد کیا اٹھا دنیا بھر کے وسوسے ذہن کو ڈسنے لگے۔ اب یہ ہلکی سی چبھن سردی اور بلغم کے باعث بھی ہوسکتی ہے یا پھر پیٹ میں دندناتی گھومتی گیس بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے۔ اس نے جیب ٹٹول کر ایمرجنسی والی گولی کی طرف سے اطمینان کیا، پھر گردن جھٹکی، شانے اچکائے: اُونہہ۔ بیٹھے بیٹھے بے وقت نیند آجاتی ہے آج کل.... "اب نظر کے سامنے وہی ٹی۔ وی اسکرین تھا اور اختتام کو پہنچتا ہوا چاٹ شو۔

"ناظرین میں موجود وہ صاحب جو اپنا ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں، غالباً کچھ پوچھنا چاہتے ہیں آپ نہیں.... آپ... ہاں لیجئے....."

"میرا سوال ملک کے نامور سرجن، ڈاکٹر بیڈیکر سے ہے۔"

"کیمرے کا زاویہ بدلا، ڈاکٹر بیڈیکر اور ناظرین پر سے گزرتا ہوا اس کے چہرے پر آکر رک گیا۔ اب پورے اسکرین پر اس کا چہرہ تھا۔ اس کے پراسرار دوست کا جو کبھی غائب ہو جاتا اور کبھی آن موجود ہوتا تھا۔ تو آخر کار وہ بولا... وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"آپ نے ایک بہت بڑے اور اتنی ہی ممتاز شخصیت کے مالک سیاسی لیڈر کے دل کا، حال ہی میں کامیاب آپریشن کیا ہے۔"

"جی ہاں... کیا ہے۔"

"کیا کوئی سلوشن کوئی محلول ایسا آپ کے پاس نہیں تھا جو رگوں میں بہتے گندے خون کے ساتھ ساتھ نفرتوں کے میل کو بھی دھوکر نکال باہر کرتا؟"

اتنے میں ایک غیر معمولی بلند آواز کے ساتھ ٹی وی اسکرین اندھیروں میں ڈوب گیا۔ کمرے کے ٹیوب اور بلب بجھ گئے۔ سیلنگ فین بھی بند پڑ گیا۔ پھر بجلی چلی گئی!

وہ دھیرے سے اٹھا اور اس نے تازہ ہوا کے لیے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔

OO

گنگ محل

ہندی : وشنو کھرے

A - 33, Navbharat Times Apts.,
Mayurvihar, Delhi - 110091

اردو : جانکی پرسادشرما

وشنو کھرے ہندی کے مشہور و معروف شاعر ، نقّاد اور صحافی ھیں . ایک شاعر کے روپ میں اپنے سماجی سروکاروں اور منفرد طرزبیاں کی بنا پر معاصر ہندی کویتا میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ھیں . اپنے قریب ٤٥ سال کے تخلیقی سفر میں انہوں نے ہر قسم کے نظریاتی جمود اور سیکٹرئنزم کے خلاف ذہنی سطح پر یہ محاذ قائم کیا ھے . آج رگھوویر سہائے مرحوم کے بعد وہ واحد کوی ھیں جنھوں نے کویتا کی مروجہ زبان سے الگ ھٹ کر اسے ایک نیا محاورہ ، ایک نیا ڈکشن دیا ھے . جہاں نثر اور شاعری کی زبان کی حدیں ملنے لگتی ھیں . اور بول چال کی زبان بذات خود ایک فن کی صورت اختیار کرلیتی ھے . وہ اشوک واجپئی کے مرتب انتخاب 'پہچان . ١' کے ایک کوی ھیں . موصوف کے اب تک تین شعری مجموعے شائع ہوئے ھیں . 'خود اپنی آنکھ سے' 'سب کی آواز کے پردے میں' اور 'پچھلا باقی' . خاص طور پر ان کے 'سب کی آواز کے پردے میں' کو غیرمعمولی مقبولیت ملی ھے . یہ آزادی کے بعد ہندی کے چند بہترین کویتا سنگر ہوں میں سے ایک ھے . اردو سے ان کی انسیت کا ثبوت یہ ھے کہ انہوں نے میرؔ کے ایک شعر کی کتابت کراکے کتاب کے شروع میں چھپوایا ھے . آج نئی نسل کے کوی سب سے زیادہ وشنو کھرے ھی سے متاثر ھیں . یہاں پیش ھے ان کی ایک تازہ اور غیرشائع شدہ نظم 'گنگ محل' وشنو کھرے نے تاریخ اور متھ کو موجودہ حقائق کی وابستگی میں دیکھنے کے کئی ایک تخلیقی تجربے کیے ھیں . وہ صفت اس نظم میں بھی موجود ھے . اس نظم کا ماخذ اکبر نامہ اور تاریخ و لسانیات کی دیگر مستند کتابیں ھیں . مندرجہ ذیل نظم ترجمہ نہیں ھے . اس کے دوسرے Stanza میں صرف دو تین لفظ بدلے گئے ھیں کیونکہ انہیں اردو میں پڑھنا مشکل تھا . باقی نظم کو ہوبہو اردو رسم الخط میں منتقل کردیا گیا ھے . اردو قارئین کے لیے یہ بات باعث مسرت ہوگی کہ ہندی کویتا آج اس زبان میں بھی لکھی جارہی ھے . ہندی اور اردو کی ایکتا کے لحاظ سے یہ نظم ایک مثالی حیثیت رکھتی ھے . (ج پ ش)

کھلی بحثوں کو دعوت دینا
روادار شہنشاہوں کو بھی پریشانی میں ڈال دیتا تھا

ہجری ۸۸-۹۸۷ کے دوران دیوان خاص میں
جب اس بات پر مباحثہ ہوا
کہ خداوند کی بنائی سب سے عمدہ شے اشرف المخلوقات
آدم زاد کی واحد پیدائشی مقدس زبان کیا تھی؟
تو قاضی اور علماء اس پر یک رائے تھے
کہ اللہ کی زبان عربی ہے
جس میں اس نے 'کن' فرما کر کائنات کو وجود بخشا
اور کتاب المبین کو نبی پر نازل کیا

اُدھر برہمن اور دوسرے اونچی ذات والے درباری
پوری خوف زدہ شائستگی لیکن معذرت بھری سختی سے کہتے رہے
کہ وید جو کائنات کی قدیم ترین کتابیں ہیں ایشور نے ہی لکھی ہیں
چونکہ سنسکرت میں ہیں جس کا نام ہی دیووانی ہے
لہٰذا اس دبراؤ کی ضرورت نہیں
کہ 'پر برھمہ' کس زبان میں بولتا ہے
دھیمی آواز میں انہوں نے پانینی[1] کی قدامت کا حوالہ بھی دیا

ان پڑھ ہونے کے باوجود
آقائے ذی شان جلال الدین اکبر
ایک ایسا بادشاہ تھا جسے چیزوں کے ساتھ تجربہ کرنے
اور انہیں صحیح یا باطل ثابت کرنے میں بیدار دلچسپی تھی

چنانچہ اس نے بیس حاملہ ہندو مسلمان عورتوں کو
جو کم و بیش ایک ہی وقت میں ماں بننے والی تھیں
اور زچگی کے فوراً بعد بھیج دیا فقط ان کی اولادوں کو
اس محل میں جسے آگرہ سے دور نیم بیابان میں
خاص اسی مقصد سے بنوایا گیا تھا
جہاں صرف دھائیں تھیں اور آیائیں اور چند دوسرے اہل کار عورت مرد
جن سب کو حکم تھا کہ ان کے منہ پر پٹی رہے گی
وہ پالیں گے ان بچوں کو لیکن ان سے اور آپس میں قطعی نہیں بولیں گے
اس محل میں جو دوسرے کارندے آئیں گے وہ بھی اپنا منہ بند رکھیں گے
ورنہ ان سب کی زبان قلم کرلی جائے گی
معاوضے دئے گئے تھے ان بچوں کے عوض میں
یا انہیں نظام کے کام سے طلب کیا ماتا گیا تھا
یہ پتہ نہیں چلتا
یہی بتایا گیا ہے
کہ ظلِ الٰہی جاننا چاہتے تھے کہ یہ بچے
جب بولنے لائق ہوں گے تو کون سی زبان بولتے پائے جائیں گے
عربی، سنسکرت، یا کوئی اور؟

[1] سنسکرت کا مشہور قواعد نگار جس کا وقت عیسیٰ سے قبل پانچویں صدی ہے

مہینے بیت گئے تین چار برس بھی
کہ عالم پناہ کو فتح پور سے دور اس عمارت کی یاد آئی
جس کی بے زبان خاموشی کی وجہ سے آس پاس کے کاشت کاروں، گوجروں نے
اسے نام دے دیا گنگ محل
۱۰ راگست ۱۵۸۲ء کو گیا بادشاہ
اپنے بحث کرنے والے درباریوں کے ساتھ اس عمارت تک
جہاں اب بھی گونگے بنے ہوئے عورت مرد پال رہے تھے بچوں کو
حکم بھول سکتا ہے بادشاہ، کارندے اس کی تعمیل نہیں بھولتے

چنی ترک کرائی اکبر نے چالیس مہینوں کی
اور کہا عورتوں سے
جن کے گلوں کی نسیں جڑ ہو چکی تھیں
اور جو خود اب صرف اشاروں میں بات کر سکتی تھیں
کہ بچوں کو حاضر کیا جائے
عالی جاہ، ملاؤں، پنڈتوں عالموں کے سامنے
پیش کئے گئے بیس بچے بے حد سہمے ہوئے
ایسے اور اکٹھے انسان انہوں نے کبھی دیکھے نہ تھے
لیکن کہا مہابلی نے مسکرا کر ان سے عربی میں :
بولو!!

گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے بچے
تب عالم پناہ نے پچکار کر ایک سے سنسکرت میں بولنے کو کہا
اشارہ پا کر سبھی علماء اور پجاری
حوصلہ بڑھانے لگے بچوں کا دونوں بھاشاؤں میں

جو ٹنکیانے لگے پیچھے ہٹتے ہوئے
کچھ کتوں، سیاروں بھیڑیوں کی طرح رونے لگے
کچھ غرانے لگے دوسرے جانوروں، پرندوں کی مانند
بادشاہ نے تب ان سے ترکی، دکنی اردو، برج، کوروی سب میں بولنے کو کہا
بچاس درباری دیگر زبانوں میں اصرار کرتے رہے ان سے

اب بچوں کی آنکھیں نکل آئی تھیں
ان کے کانپتے بدن اینٹھ رہے تھے ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا
کچھ نے وحشت میں پیشاب اور پاخانہ کر دیا
کچھ دیوار کے سہارے دبک گئے ایک کونے میں پلّوں کی طرح
اور ان کے منہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں
جو انسانوں نے کبھی انسان کی اولاد سے سنی نہ تھیں

تھرا گیا اکبر اس کے معنی سمجھ کر
کلیجا اس کے منہ میں آ گیا
وہ یہ تو کہتا تھا کہ دنیا میں پیغمبر ان پڑھ ہوئے ہیں
چنانچہ ہر خاندان میں ایک بیٹا اس طرح امّی چھوڑا جا سکتا ہے
لیکن بچوں کو اس طرح گونگا دیکھنے کا مادہ اس میں نہ تھا
حکم دیا اس نے چیخ کر
بولنا شروع ہو یہاں سب خوف اور من چاہا
سونپ دو یہ بچے ان کے والدین، سرپرستوں کو
فوراً خالی کرو اس منحوس محل کو
آئندہ یہاں ایسا کچھ نہ ہو

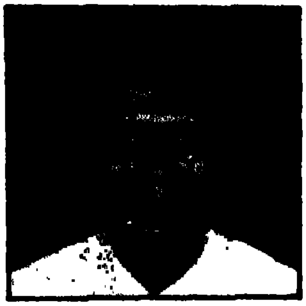
یہ پتہ نہیں چلتا ہے
کہ ان بچوں کے کوئی اپنے سامنے آئے یا نہیں
کس کس نے پہچانا اور اپنایا ان بیس معذوروں کو
انہیں کبھی آئی بھی یا نہیں کوئی زبان
کیا وہ بسا پائے اپنے گھر

چن دیے گئے گنگ محل کے سبھی روشن دان، کھڑکی، دروازے
لیکن آس پاس کے گاؤں میں افواہ پھیل رہی
کہ اس کے بھیتر سے اب بھی جانوروں جیسی گونگی آوازیں آتی ہیں
دھیرے دھیرے ڈھہ گیا گنگ محل
کچھ برسوں تک رہے کھنڈر میں سیار اور چمگادڑیں
آگرہ کے پاس کی اس شاہی تجربہ گاہ کا تو کیا
اس فیض آباد کا بھی نام و نشان نہیں ملتا
جہاں ایک دن پہلے بادشاہ سلامت نے مقام فرمایا تھا

'اکبر نامہ' میں اس رات ظل الٰہی کی
تہجد کی نماز کی یہ دعا بھی درج نہیں ہے
کہ کبھی کبھار میں تیرے پیمبروں کو لے کر جنس لیتا تھا
لیکن میرے اللہ میرا یہ آزمودہ کفر بھی معاف کر
کہ خدائی زبان جیسی کوئی چیز نہیں ہے

وہ شاندار اس لیے کہ جب اکبر نے یہ فریاد کی
تو اس کے بہت کچھ جان چلے : بن کا ایک کونا
کسی ننھے شبہ کے خوف کے مارے ہمیشہ کے لیے گونگا ہو چکا تھا

Janki Prasad Sharma, B-330, Ashok Nagar,
Shahdra, Delhi - 110093



مقدر حمید

306/C-2, 3rd Flr, Map Khan Nagar, Marol Maroshi Rd
Marol Naka, Andheri (E), Mumbai - 400 059

دل کاری

ٹیلی ویژن پر اپنے پسندیدہ چاٹ شو کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے اس ادیب دوست کی گفتگو یاد آگئی جو کچھ عرصہ پہلے ایک غیر رسمی ملاقات کے دوران ہوئی تھی۔ اس کا یہ دوست کہانیاں اور گیت لکھتا، سماجی سیاسی بیداری کو اہمیت دیتا، استحصال کے خلاف آواز اٹھانا ضروری گردانتا اور ہر اس مورچے پر فعال نظر آتا جو ناانصافی اور ظلم کے خلاف صاحبانِ اقتدار کو جھنجھوڑنے کی غرض سے سامنے آیا ہو۔ بڑی عجیب اور غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ ہمیشہ اس کی نظر مسئلے کے کسی ان چھوئے پہلو پر ہوتی۔ ایسے سوال کرتا جو سوچنے پر مجبور کر دیتے، بسا اوقات سوچ کے ڈھلے ڈھلائے سانچوں پر ضرب لگاتے اور ذہن میں اتھل پتھل مچا دیتے۔ اس نے اچانک پوچھا تھا : آپ جو سائنسی طرزِ فکر کے حامی ہیں اور استدلال پر زور دیتے ہیں، تو بتائیے کہ انسانی جسم میں فوقیت کس کو حاصل ہے۔ دل کو کہ دماغ کو ؟

"دماغ کو۔ یوں کہ دماغ کی حیثیت مرکز کی سی ہے۔ جسم کے سارے اعضاء دماغ کے احکامات بجالاتے ہیں۔ ہر نیک و بد عمل کا منبع دماغ ہے۔ دل کیا ہے؟ بس ایک پمپ ہاؤس۔ خون اور آکسیجن کی فراہمی کا کام اسے سونپا گیا ہے، سو وہی کرتا ہے۔"

دوست نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہماری بہتری زبانوں میں ایسے محاوروں کا چلن ہے جو دل کو افضلیت دیتے نظر آتے ہیں۔ جیسے : دل صاف ہونا، دل میں کینہ، محبت، نفرت، غم کا ہونا۔ کوئی اچھی بات ہو تو ہمیں دلی مسرت ہوتی ہے، سانحہ ہو تو ہمارا دل شریکِ غم ہوتا ہے، یادیں دل میں بستی ہیں، دل کسی پر آتا ہے، دل کسی مشغلے سے اوب جاتا ہے، دل سے دل کو راحت ہوتی ہے۔ ہماری شاعری، ہمارا سارا ادب یہاں تک کہ مذہبی صحیفے بھی دل کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہیں، ایسا کیوں؟"

"بھائی میرے۔ شعر و ادب اور بعض مذہبی کتابوں کی زبان میں رمز و کنائے کا عمل دخل رہا ہے۔ بات کہی جاتی ہے استعاروں میں، اشاروں میں۔ غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے، اور کیا؟"

"یا یہ کہ ہمارا علم اس سلسلے میں محدود ہے ؟ ہم اب تک جو معلومات حاصل کر سکے ہیں وہ ناقص اور نامکمل ہے۔ عین ممکن ہے رازہائے دروں سے ابھی پردہ اٹھنا باقی ہے۔ جیسا کہ اکثر سائنسی ایجادوں اور دریافتوں میں ہوتا ہے کہ اچانک کوئی نئی تھیوری سامنے آتی ہے اور پرانی، معتبر تھیوری کو رد کر دیتی ہے۔ جسے اب تک مکمل صداقت تسلیم کرتے آئے وہ باطل ہو جاتی ہے، کوئی نیا پہلو چشمِ بینا کی زد میں آتا ہے اور برسوں کے یقین کو لرزہ براندام کر جاتا ہے! ہوتا ہے کہ نہیں ایسا؟ تو پھر امکان بنتا ہے کہ ہماری سائنسی جستجو یا مابعد الطبیعاتی تحقیق کچھ ایسے انکشافات کرے کہ ہم حیران رہ جائیں اور کہہ اٹھیں، اچھا تو یوں ہے حضرتِ دل!!"

پھر کچھ ایسا ہوا کہ عرصہ دراز تک اس دوست کی کوئی خبر نہیں ملی۔ معلوم ہوا شہر میں نہیں ہے۔ اچانک غائب ہو جانا ایک طرح سے اس کی عادت بن گئی تھی۔ آج خبروں میں ہے کل کوئی اتا پتا نہیں۔ مدت بعد کوئی آکر بتاتا کہ وہ تو آدی باسیوں میں تھا، ان کے کسی آندولن کے ساتھ!

چاٹ شو میں گفتگو کا موضوع تھا 'دل'۔ دل کے امراض کے ماہر پینل میں شامل تھے۔ بالخصوص مختلف طریقہائے علاج کی نمائندگی کرنے والے شہرت یافتہ ڈاکٹر۔

"ہمارے ملک میں اوپن ہارٹ سرجری غیر ضروری حد تک زیادہ تعداد میں کی جا رہی ہے۔ مرض کا علاج نسبتاً کم خرچ اور کم تکلیف کے ساتھ ممکن ہے مریض اور مرض کی نوعیت کو مدِ نظر رکھیں تو۔ لیکن ایسا ہو نہیں رہا ہے۔"

"دراصل سرجری کی جولانی ہے، اس کے پیشِ نظر کمرشیل پہلو ہوتا ہے۔ مریضوں کی روز افزوں تعداد کو دیکھیں تو سارا معاملہ کروڑوں تک پہنچ رہا ہے۔ اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ علاج معالجہ اگلے وقتوں کی طرح صرف کارِ خیر یا خدا ترسی کا پیشہ تو رہا نہیں۔ دوسرے تمام پیشوں کی طرح بلکہ کچھ زیادہ ہی بزنس بن کر رہ گیا ہے۔"

"صرف ایلوپیتھی والے ہی نہیں، کبھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں۔"
"ایسی صورت میں Hypotheg Oath ایک مذاق نہیں لگتا؟"
"آپ حضرات ایک اہم پہلو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ایلوپیتھی میں جراحی کی شاخ معتبر تسلیم کی جا چکی ہے اور دل کے آپریشن میں کامیابی کی شرح تقریباً سو فی صد ہو چلی ہے۔"
"لیکن پورا سچ یہ ہے کہ جراحی مکمل شفا کا علاج نہیں۔ پانچ سات برس بعد رگیں پھر بند ہونے لگتی ہیں۔ اور یہ بات واضح طور پر مریض تک پہنچانے میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔"
"لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یونانی آیورویدک، ہومیوپیتھی وغیرہ معالجے کی پچھڑی ہوئی شاخیں ہیں۔ اب کہیں پیش رفت ہو رہی ہے، تاہم آج بھی ان پر اعتبار کے سلسلے میں عام طور سے تردد پایا جاتا ہے۔"

ایک چھوٹے سے کمرشل بریک کے اعلان کے ساتھ ہی اشتہارات شروع ہو گئے۔ منی کار کا نیا ماڈل، لباس غسل میں بدن کی نمائش کرتی لڑکی کے ساتھ، نئی موٹر بائیک کا اشتہار، اس سے بھی زیادہ مختصر لباس میں ایک اور لڑکی۔ صابن کا اشتہار، سرسبز و شاداب پہاڑیاں، دودھیا آبشار اور انتہائی متناسب جسم کی کم سن حسینہ اور اس کا فربدن کے لباس کا نعم البدل محض گرتے ہوئے پانی کی مہین چادر! کیمرے نے کلوز اپ کی طرح پیش قدمی کی، اس نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر چینل بدلا۔ نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے۔ غزلوں کا پروگرام چل رہا تھا جو آج کل محض خانہ پری کے طور پر بہت پہلے ریکارڈ کئے گئے ٹکڑوں میں دکھا دیا کرتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کو سب کچھ بھول کر موسیقی کی لہروں میں ڈوب گیا۔

آج کل سارا وقت ٹیلی ویژن کے ساتھ گزر رہا تھا۔ وہ جو کسی زمانے میں کھلی ہوا اور آزاد فضا کا پرستار تھا، جس کے نزدیک سینما ہال کے مقابلے باغ کی تفریح زیادہ معتبر تھی، جو چہار دیواری کی قید پر دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے کو ہمیشہ ترجیح دیتا تھا، آج اپنے معمولات میں ایسی تبدیلیاں لانے پر مجبور ہو گیا تھا جو اس کا مزاج ہرگز نہ تھیں۔

زندگی کے سفر کا بیشتر حصہ آزمائشی ادوار پر مشتمل تھا۔ تقریباً اب تک کی ساری عمر کچھ جوڑنے، کچھ آسودگی پانے کی تگ و دو میں کٹتی چلی گئی تھی اور جب لگا کہ اب کہیں معاشی اطمینان حاصل ہوا ہے تو ان تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا خاطر خواہ ملکہ نہیں رہ گیا تھا۔ زندگی کی ان تھک جدوجہد اب ہرجانہ وصول کر رہی تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر تنبیہی گھنٹیاں بجانے لگی تھی۔ جن کی خاطر اتنا سب کیا وہ دور جا بسے تھے۔ دونوں بیٹے امریکہ میں مقیم تھے اور انتہائی خوش حال تھے۔ بیٹی بیاہ کے بعد اپنا گھر بسا چکی تھی۔ فون پر خیریت پوچھ لی جاتی۔ لڑکے سال دو سال بعد چھٹیاں گزارنے آ جاتے۔ پوتا تین برس کا ہو گیا ہے۔ پچھلی بار جب وہ آئے تو کیسی رونق آ گئی تھی۔ تین سال کا چھوٹا سا شیطان سارے میں دندناتا پھرتا۔ کبھی یہ پھینک تو کبھی وہ۔ گھر کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے سکون ہو۔ کوئی بات ہو، کہتا 'کیوں؟' اور یہ کیوں اسے چونکا دیتا، کہیں دور لے جاتا۔ بہت پہلے کوئی اور بھی تھا جو اپنے ہاتھوں میں سوالیہ نشان کا علم اٹھائے پھرتا تھا۔ ایسا کیوں، ویسا کیوں! باغ میں اس کا تتلیوں کا تعاقب کرنا، بندر کی طرح درختوں پر چڑھنے کی کوششیں، چڑیوں کے گھونسلوں سے اسرار اٹھانے کے جتن، ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنا۔ یہ پیاری پیاری مصروفیت اسے تھکا دیتی اور پھر نیند کی پری پلکوں پر لوری کی تھپکیاں دے کر، خوابوں کے سنہرے دیس میں لے جاتی۔ وہ اپنے اس ننھے منے دوست کو نیند میں مسکراتے، گھنٹوں، تمام تر محویت کے ساتھ دیکھتا رہتا۔ پھر۔ واپسی کی گھڑی آ جاتی۔ رخصت کرنے کے بعد ایرپورٹ سے لوٹ کر گھر میں داخل ہوتا در و دیوار پر نظریں پھیرتا، ہر اس گوشے کو چھوتا، محسوس کرتا، جہاں ننھی شرارتوں نے کچھ دیر کو ڈیرا کیا تھا۔ میٹھی میٹھی پیاری پیاری آوازیں دیر تک، دور تک سرگوشیاں کرتیں۔

یہ ٹیلی ویژن معمر لوگوں کے لیے عہد جدید کا وردان ہے۔ گھر بیٹھے ریموٹ کے اشاروں پر ساری دنیا پلک جھپکتے آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ کہاں کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، چھوٹی بڑی سنجیدہ باتیں، بحثیں اور ان سے جی اوبنے لگے تو تفریح کی خاطر فلمیں، نئی اور پرانی۔ اور ان سب سے بڑھ کر موسیقی کے چینل۔ بعضوں نے تو شور شرابے سے بھرپور پاپ میوزک کے ساتھ ساتھ پرانے گانوں کے بے حد عمدہ پروگرام شامل کر رکھے ہیں۔ اگلے دنوں کی وہ دل کو چھونے والی میلوڈی اور وہ معنی خیز گیت جو پل بھر میں کہیں دور لے جاتے، کبھی شوخیاں جگاتے مسکراہٹیں بکھیرتے تو کبھی دل کو گداز کر دیتے۔ بعض گانوں کو سن کر اس پر رقت طاری ہونے لگتی اور وہ جلدی جلدی رومال سے آنکھیں صاف کرتا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ لیکن وہاں کون تھا دیکھنے والا!؟ دیوار و در تو آپ کی ان بچکانہ حرکتوں پر رائے زنی سے رہے۔ اس کی دوائیاں طے شدہ اوقات کے مطابق تپائی پر رکھی ہوتیں۔ یادداشت کی پرچی کے ساتھ۔ ایمرجنسی کی صورت میں استعمال کی جانے والی سوربی ٹریٹ Sorbitrate کی گولیاں جیب میں کہ کہیں اچانک دورہ پڑ جائے تو فوراً زبان کے نیچے رکھی جا سکے آسانی کے ساتھ بلا تاخیر۔ کورڈلیس ٹیلی فون بھی قریب کہ ہاتھ بڑھا کر اٹھا لے۔ ٹیلی فون کے آلے میں دلدوں کے نمبر پروگرام شدہ تھے۔ ایک نمبر پر فلاں ڈاکٹر، دو پر فلاں، تین پر بیٹی کے گھر کا نمبر، چار پر..... بس اسی طرح۔ وہ اکیلے میں کبھی کبھی نمبروں کا آموختہ کرتا کہ عین وقت پر ذہن سے اتر نہ جائیں۔ پھر ذہن گولیوں، دوائیوں، ٹیلی فون نمبروں سے پرے جست

ٹکاتا اور وقت کی فریم بیتے لمحوں کا ایک منظر نگاہوں کے سامنے لے آتی:
"کوئی اچھا سا شعر سنایئے۔"

جاں بلب ہوں ہے کہ کہاں وہ دل بر جادو لقب
دل بر جادو لقب کے ہجر میں ہوں جاں بلب

"واہ شعر ہے یا بجلی کا بلب؟"

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

"یعنی Tres Passers will be prosecuted۔"
"آنکھوں کا تھا قصور، چھری دل پہ چل گئی۔۔۔"
"بھئی چھری چاقو والی بات سے خوف آتا ہے۔"
"تو پھر۔"

بام پر ہے وہ لطف دوبالا ہوتا
دل نے مجھ کو بھی اچھل کر جو اچھالا ہوتا

"نہایت اوباش قسم کا ہے!"
"لعنت ہے۔ آخر کوئی تو پسند آئے تمہیں۔"
"پسند ذرا اونچی ہوا کرتی ہے اپنی جی ہاں۔ اور یہ دل کی کیا رٹ لگا رکھی ہے، جتنے شعر سنائے بس دل ہی دل؟"
"اور کیا۔ دل ہی تو ہے۔ ویسے محترمہ پوچھ سکتا ہوں آپ کو دل سے کیا بیر ہے؟"
"دل بے وقوفیاں کراتا ہے۔ اس کی بات کبھی نہیں سننا چاہئے۔"
"اچھا؟ آپ نے نہیں سنی؟"
"سنی تھی..... لیکن....."
"لیکن کیا؟"
"ان سنی کر دی۔"
"ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ یہ۔ یہ جہاں آپ کا دل...."
"ہٹئے۔ شیطانی نہیں۔ کہے دیتی ہوں۔"

اس شوخ شرمیلی ہنسی کا ساتھ دینے لگے چاند تارے، پھول، بادل، جھرنے، عطربیز ہوائیں اور زندگی بن گئی ترنگوں امنگوں کا گہوارہ۔ لیکن اچانک۔ لمحوں کے کھیل میں، کھن گرج کے باعث اس نقرئی ہنسی کی جھنکار دب کر رہ گئی۔ سب کچھ بڑی خاموشی سے ہوا تھا۔ بہت پہلے۔ کچھ لوگ جو چہرے مہرے سے اوروں جیسے تھے لیکن جن کی روحوں میں شیطنیت حلول کر گئی تھی، دروازوں پر ایک خاص قسم کا نشان بنا کر چلے گئے تھے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ یہ نشان کیسی بھیانک تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ پھر آگ کی لپٹوں نے عمارتوں کو اور مکینوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لپلپاتے شعلوں کی حدت تیز تر تھی کیوں کہ یہ نفرت کا زہر پی کر اٹھے تھے۔ دھوئیں کی چادر نے پبلک گارڈن کی اور علاقے کے ہر باغ و راغ کی روشوں کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا، جھلستی ٹہنیوں پر پھول مرجھا گئے اور پرندوں کے میٹھے سریلے نغمے دہشت ناک سناٹوں کا لقمہ بن گئے تھے۔ بہت دنوں تک ایسا لگا تھا کہ اب کہیں اجالا نہیں ہوگا۔ نہ کوئی سورج اگے گا، نہ چاند کی نرم و سبک کرنیں اپنے لمس سے خوابیدہ سرشاریوں کو جگائیں گی۔ اب کی اماوس اتنی کالی، اتنی مہیب تھی کہ سانسیں سینے میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔

لیکن منظر کوئی سا ہو، دل کش، دل ربا یا پھر اندوہناک، اسے ثبات کہاں! بھلے ہی قرب کے لمحات یادیں بن کر سینے میں ہوک اٹھائیں یا لمبی تاریک راتوں کے عفریت دل میں برچھیاں پیوست کیا کریں!

چھوٹا سا کمرشیل بریک شاید ختم ہو گیا ہوگا، چلو چینل بدلتے ہیں اور دیکھتے ہیں وہی اپنا دل والا چاٹ شو۔

"یہ جناب کہلاتی ہے 'کے لے شی ان تھیراپی' Chelation Therapy۔ ہم مختلف ادویات کا جو یہاں دستیاب نہیں اور دوسرے ملکوں سے منگائی جاتی ہیں، مریض کی انفرادی ضرورت کے مطابق محلول بنا کر Intraveinous انٹراوے نس انجکشن لگاتے ہیں۔ معیاد ختم ہونے پر مریض چاہے تو ایک بار پھر انجیوگرافی Angiography کرا کے دیکھ لے کہ ساری رکاوٹیں، سارے بلاکس Blocks نہ صرف دل کی رگوں سے بلکہ پورے جسم سے، جہاں کہیں بھی رہے ہوں، بالکل صاف ہو گئے کہ نہیں۔ شرطیہ!" یورپ اور امریکہ میں کئی ڈاکٹر کامیابی کے ساتھ اس طریقہ علاج کو رائج کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔"

"اگر یہ اتنا ہی شافی علاج ہے تو پھر عام اور مقبول کیوں نہیں؟"

"اب اس کا ہم کیا جواب دیں۔ ڈر ہے ہمارے چینل کے دیگر معزز ڈاکٹر صاحبان کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ خیر۔ سنئے۔ اوپن ہارٹ سرجری کی آج کی تاریخ میں کم از کم پانچ لاکھ کا نسخہ بنتا ہے۔ اس کی تیاری اور حصول میں شامل ہیں۔ پنج ستارہ پرائیویٹ اسپتال، سرجن، کارڈیالوجسٹ، اور اس طرح کی پوری ٹیم۔ تو ظاہر ہے کہ یہ لابی پوری کوشش کر رہی ہوتی ہے کہ کوئی اور متبادل طریقہ علاج جو نسبتاً کم خرچ اور کم خطر بھی ہے، عام نہ ہونے پائے...."

اس پر وہ ہڑبونگ مچی، مخالفت موافقت کی آوازوں کا وہ شور و غل ہوا کہ پروگرام پیش کرنے والے کے لیے قابو پانا مشکل ہو گیا۔ خود اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی۔ بڑی مشکل سے خاموش کرایا گیا اور سختی سے اس ہدایت پر کاربند رہنے کی تاکید کی گئی جس میں صرف اپنی باری پر بات کی جانے کی شرط رکھی گئی تھی۔ گفتگو، ناظرین کے سوالات کے ساتھ پھر شروع ہوئی۔

"آپ ایلوپیتھی اور ماڈرن میڈیسن کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں جب کہ ہمارے یہاں سارا معاملہ شفاف ہوتا ہے۔ ہزارہا تجربوں اور ثبوتوں سے

بعد ایک دوا مارکیٹ میں لائی جاتی ہے، ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد ہی ایک طریقہ اپنایا جاتا ہے، برخلاف اس کے یونانی اور آیورویدک والے حضرات آج بھی سینہ بہ سینہ کے معمول پر کاربند نظر آتے ہیں۔"

"یہ تو نہ کہیے۔ حالات بدلے ہیں اور یہاں بھی کافی حد تک ٹرانسپرنسی آچلی ہے۔"

"لیکن جس کے لیے شی ان تھیراپی کی بات ہو رہی ہے وہ متبادل طریق علاج ضرور ہے لیکن یونانی آیورویدک نہیں، جدید طبی طریقۂ کار ہے۔"

بحث جاری تھی۔ مختلف زاویے سامنے لائے جا رہے تھے لیکن مسئلہ کا کوئی حتمی حل پیش نہیں کیا جا رہا تھا۔ تقریباً سارے چاٹ شو بس ایسے ہی کسی خاطر خواہ نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوتے ہیں۔

گھومتے پھرتے کیمرے کی آنکھ نے ناظرین کا رخ کیا تو وہ چونک پڑا۔ شرکاء میں اس کے دوست کا چہرہ نظر آیا۔ پھر وقفے وقفے سے دکھائی دیتا رہا۔ لیکن وہ بحث میں حصہ کیوں نہیں لے رہا تھا؟ چپ رہنے والوں میں سے تو وہ تھا نہیں، پھر۔؟ عین ممکن ہے اس نے کچھ کہا ہو اور پروگرام والوں نے ایڈٹ کرتے وقت اس حصے پر قینچی چلادی ہو۔ اس نے سوچا فون کر کے پوچھا جائے اپنے دوست سے۔ ممکن ہے وہ گھر پر ہو۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ کیا مناسب ہے؟ نہیں۔ سستی غالب آگئی۔ پھر کسی موقع پر پوچھ لیں گے۔ اب غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ اونگھتے ہوئے، نیم وا آنکھوں سے چاٹ شو میں بحث کرنے والوں کو دیکھ رہا تھا اور نہیں دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا اور نہیں سن رہا تھا۔ پھر اچانک ٹی وی اسکرین پھیل کر بہت بڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا بہت سارے چہرے گڈمڈ ہو گئے اور خود اس کا اپنا چہرہ بہت بڑا ہو کر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ درد کی شدت صاف عیاں تھی۔ وہ انجائنا کے حملے سے بے قرار ہے، کراہ رہا ہے۔ سینے پر کوئی پے در پے مکے مارے جا رہا ہے۔ اندر باہر جیسے ہتھوڑے چل رہے ہیں۔ مانوس اور غیر مانوس آوازیں سماعت پر دستک دے رہی ہیں:

"اوپن ہارٹ سرجری نہ ہوئی، کھیل ہو گیا، جب چاہا چیر پھاڑ کر ڈالی!"

"راجدھانی کے ایک ڈاکٹر کا دعوا ہے کہ آرٹریز کے بلاکس Reversable ہیں یعنی معمول کو لوٹائے جا سکتے ہیں۔ طرز زندگی کی تبدیلی سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہ تین دن کا ورکشاپ کرتا ہے مختلف شہروں میں۔ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات بستر پر جانے تک کے معمولات کا صحت افزاء تعین۔ کون سی غذا کھائی جائے، کیسے پکائی جائے۔ چھوٹی بڑی ساری باتیں۔ بہت سارے لوگ صحت یاب ہو رہے ہیں اور بائی پاس سرجری کے عذاب سے بچ رہے ہیں۔ ورک شاپ میں میاں بیوی دونوں کو یا پھر قریبی عزیز کو بلایا جاتا ہے۔"

"... کھنڈالہ میں ایک نیچر کیور فارم ہے۔ دل کے مریض کو اصلی کمی پاتے ہیں! ایک طرف تو بے شمار لوگ ہیں جو قسم کھاتے ہیں اس فارم کے یقینی طور پر کامیاب طریق علاج کا، دوسری طرف بہت سارے لوگ اسے مشکوک سمجھ رہے ہیں۔"

"....ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک سیاست داں کی بیوی جو دل کے عارضے میں مبتلا تھی بغرض علاج ایک مدت اس فارم پر گزارنے کے بعد، بے حد خوش اس اطمینان کے ساتھ شہر لوٹ رہی تھی کہ اب مکمل طور سے شفایاب ہو گئی ہے۔ راستے میں دل کا شدید دورہ پڑا اور کار کے کسی نزدیکی اسپتال تک پہنچنے سے قبل ہی بے چاری آں جہانی ہو گئی!...."

"..... بہت سارے واقعات، مثالیں، بہت سارے طریقے، بے شمار مشورے... لیکن فیصلہ تو اپنا کرنا ہے!...."

سبز لبادوں میں آنکھوں کے سوا سر اور سارے چہرے کو ڈھانپے ہوئے ہیولے.... چمک دار تیز آلات ہاتھوں میں اٹھائے۔ پراسرار انداز سے سلو موشن میں حرکت کرتے ہوئے.... آوازیں رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئیں۔ وقت ٹھہر گیا۔ نظر سے دھند کی ایک چادر ہٹی تو دوسری تن گئی۔ اب سامنے ایک ہشاش بشاش اور تن درست نوجوان تھا۔ شکل و صورت، حرکات و سکنات، بے حد مانوس....

"آیئے۔ ذرا حساب کتاب ہو جائے۔"

"کیسا حساب کتاب بھائی؟"

"جناب! معاملہ دل کا ہے۔ یہ تو بتایئے کتنی دل آزاریاں کیں؟ کتنے دل توڑے؟... اپنی ذات سے آگے کبھی دیکھا؟ ایک طرف تو اپنے دل کی معصومیت اور پاکیزگی پر ناز اور دوسری طرف قدم قدم چھوٹے بڑے سمجھوتے! دوسروں کو جن حرکتوں کے سبب ملعون و مطعون کیا، خود ان سے کتنے الگ تھے؟ اپنی شخصیت کو انا کا پہاڑ بنائے رکھا اور دوسروں سے شاکی رہے کہ بلاوجہ حاسد اور دل آزار ہوئے جاتے ہیں....."

"سراسر بہتان ہے۔ زیادتی ہے.... ٹوٹ کر محبت کی ہے... کبھی کسی کا برا نہیں چاہا... مورد الزام قرار دینے سے پہلے ذرا یہ تو دیکھئے کہ چہار سمت کیسے فضا کو مسموم کر رکھا ہے.... جس طرز زندگی کی دہائی دی جاتی ہے اس کی شکل بگاڑنے اجاڑنے میں کوئی کسر باقی رکھی؟.. تعصبات کے بیج بوئے گئے، نفرتوں کی فصل اگائی گئی... زندگی جینا ایک مسلسل تناؤ بن گیا دل و دماغ کے لیے...."

".....ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ گواہ موجود ہیں۔ پوچھ لیتے ہیں...."

اب ایک سنسنی خیز منظر اجاگر ہوا۔ اس نوجوان کا چہرہ، آنکھیں، ہاتھ پاؤں سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ مزید جھٹکا ہن کو لگا جب دیکھا کہ چھتے پر منڈلاتی شہد کی مکھیوں جیسی آوازوں کا شور خود اپنے جسم و جاں سے اٹھ رہا ہے۔ گھبرا کر خاموش کرنا چاہا تو شور اور بڑھ گیا... "طرز زندگی.. طرز زندگی.... طرز زندگی...."

وہ آنکھیں ملتا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ہتھیلیاں نم تھیں اور پیشانی عرق

(باقی صفحہ ۱۳ پر دیکھیے)



جاوید ناصر

ام دن کی قبا اتار سے گی

ست

پنے ہیروں کو پھیلا کر

ہیرے گی ہماری بستی کو

در بخشے گی

ید کی محفل

بتک روشن ضمیر کتنا سے

آسماں سے بڑا ہو بزرگ

وہ ___

سلسلہ سزا نہیں دیا

Director, Doordarshan, Doordarsh
Kendra, Ahmedabad (Gujrat)



رحمٰن جامی

تجھ سے ملنے کی خوشی میں سبھی رونا ہو جائے!
آنکھ برسے تو یہ موسم بھی سلونا ہو جائے

دیکھ لوں خواب ترا تجھ کو نظر میں بھر لوں
آنکھ بھر کر جو کبھی چین سے سونا ہو جائے

امتیازِ من و تو اب نہیں چلنے دوں گا
اب ترے سامنے جو کچھ بھی ہے ہونا ہو جائے

کھیلتی ہے جو کھلونے کی طرح لوگوں سے
میرے ہاتھ آئے یہ دنیا تو کھلونا ہو جائے

تجھ سے یکسوئی میں کرتی ہیں بہت سی باتیں
منتظر ہوں کہ ترا سپنا پرونا ہو جائے

ہاتھ میں میرے ہے اکسیرِ جنوں اے جامی
میں جو مٹی کو بھی چھو لوں تو وہ سونا ہو جائے

"Al - Hira" 12-2-83017/3, Hill Colony,
Mehdipatnam, Hyderabad - 500028 (A P)



مناظر عاشق ہرگانوی

تروینی

(۱)

زمیں سے آسماں تک بے کلی ہے
سکوں کا نام بھی ملتا نہیں اب
ہوا کے ہو گئے ذرے پریشاں

(۲)

بھنور کے بیچ کشتی گھر رہی ہے
تھپیڑوں کے در و دیوار سے جنگ
قریں ہے ہم اب ساحل لے گا

(۳)

دلِ ناداں کو سمجھا نا ہے بیٹھا
تمنا بھی کو کچھ ہو تو دعا مانگ
زمانے میں محبت کے خدا سے

(۴)

شگفتہ ہو نہ سکی برگِ زندگی میری
غمِ حیات کا بوجھ اٹھا رہا ہوں میں
شریں ہوا کے سہارے تری امید کے ساتھ

(۵)

ابھی تو رنگ فضاؤں میں گلستاں سا ہے
تو اپنے جسم کی شفاف چاندنی میں نہا
مرے وجود پہ چھایا ہوا غبار نہ دیکھ

Kohsaar" Barahpura,
Bhagalpur - 812001 (Bihar)

بہ خطِ شاعر



بشیر بدر
11, Rehana Colony, Idgah Hills, Bhopal - 462001 (M P)

فیض صاحب کی غزل

غزل بول چال کی زبان میں شعر و حکمت ہے۔ صرف موزوں مصرعوں کے اکہرے پن سے اچھے گیت، عوامی غزل اور درگاہی قوالی بھی نہیں لکھی جاسکتی۔ غزل کی سادگی معصوم بچوں کی مسکراہٹ اور پیمبرانہ معصومیت کی بصیرت ہے۔ زندگی میں علم و حکمت مادرانہ شفقت اور پدرانہ تربیت میں، جو ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں مگر نظر نہیں آتی ہیں۔ غزل کلچر کی دشمن مصنوعی، دقیق علمی زبان ہے۔ غزل، غزل ہے یہ ادبی کوڈ میں سازشی پیغام یا فرمان نہیں ہے کبھی کبھی فیض کے دار و رسن والے اشعار دیوانگی کی سازش لگتے ہیں۔ آج کی اردو میں یہ مصنوعی زبان، آزادی کے بعد بڑی تیزی سے مرجھانے لگی تھی، سوکھے پتوں کی طرح بکھر رہی تھی، فیض صاحب کو اس تبدیلی کی آہٹ نظموں کے کچھ مصرعوں میں محسوس ہوئی مگر ان کے اشتراکی غزل کدے نے وقت کے سب دریچے بند کرکے ادبی چھاونی (Cantt) میں محفوظ رہنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

ان کی سیاسی غزل کا مرکزی کردار ایک نیم فطری رحم طلب مقید سپاہی ہے ان کی اور ہماری غزل کا عاشق اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود اس اشتراکی انقلابی سے کہیں زیادہ فطری ہمہ رنگ وہ آدمی ہے جسے بولی جانے والی زبان کی بدلتی جمالیاتی قدروں کا احساس ہے۔ اس بولی جانے والی اردو کی تہذیب و تربیت بڑے جتن سے غزل نے کی ہے۔ گھر، بازار، اسکول، کالج، عبادت گاہ کی یہ بولی اسٹیشنوں، دفتروں اور بازاروں میں بولی جانے والی زبان کو غزل نے پرکھ پرکھ کر قبول کیا ہے۔ غزل میں بول چال کے لہجوں اور علمی اور تہذیبی لفظوں کی کشمکش کا توازن ہے۔ چپکے چپکے گنوار اور بے تہذیب لفظوں کی سند مل جاتی ہے اور پرانے بادشاہ لفظوں کے تاج اتار لیے جاتے ہیں۔

انگریزی، ہندی سے آئے ہوئے دفتری اور بازاری لفظوں کو حریم غزل میں باریابی ملنے لگتی ہے مختلف زبانوں سے آئے ہوئے لفظ جب سو فیصدی اردو بن جاتے ہیں تو کسی شعر و شاعر کے وسیلے سے ہماری غزل کا اعتبار اور وقار بن جاتے ہیں۔ غزل کی اس نئی زبان کی دریافت یا توسیع میں جلد بازی، فنی بے ہنری اور لفظ ناشناسی سے ناکامی ہاتھ آتی ہے۔ نئے لفظوں کے انبار لگانے سے غزل کی صورت بگڑ جاتی ہے لیکن جب کوئی نووارد غزل کے فنی اور جمالیاتی معیار پر غزل بن جاتا ہے تو وہ ہماری زبان میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ ۱۹۵۵ء کے آس پاس غزلیہ لفظوں کا طے شدہ حصار ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا لیکن ترقی پسند غزل کے سربراہ مثلاً مجروح صاحب اور فیض صاحب اپنے قدیم غزلیہ حصار میں رہ کر پرانے لفظوں، ترکیبوں اور طے شدہ استعاروں سے کام بھی چلا رہے تھے اور نئے امکانات کو بھی پرکھ رہے تھے۔ ایسے حضرات کی تمام تخلیقی جرأتوں کے باوجود صدیوں پرانے استعارے دار و رسن، قید و قفس بہار و خزاں، گل و بلبل احساس سے عاری Time Bared Capsoule ہو کر بے جان ہو گئے۔ ترقی پسند غزل کے یہ شعر بلاشبہ غزل کے اچھے شعر ہیں

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے — ترا ہاتھ، ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے — (مجروح)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا — (مجروح)

مجھے افسوس ہے کہ زمانے کی اس تیز رفتار لسانی بے رحمی نے ہندوستان کے کروڑوں غزل کے چاہنے والوں کو اس اچھے شعر سے پوری طرح محظوظ ہونے سے کیوں محروم کر رکھا ہے۔

فراز دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ — جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے — (مجروح)

یہ غزل کے عاشق بھی خوب ہیں۔ اچھے شعر کا فراز دار انہیں پسند نہیں آرہا ہے لیکن پاکستان کے احمد فراز پسند کر رہے ہیں۔

فیض انگریزی اور عربی میں ایم۔اے ہیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شعری مجموعوں میں انگریزی اور عربی کے شعر و ادب کے حوالے نہیں نظر آتے جب کہ غالب، سودا، اقبال، حافظ، سعدی ایسے عظیم فنکاروں کے وہ حوالے دیتے چلتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے "نقش فریادی" میں سر کتاب اپنے دوستوں مجاز اور جذبی سے جس محبت کا اظہار انہوں نے آغاز سفر میں کیا تھا وہی مجموعہ جب کلیات میں دوبارہ

چھپا تو ان کے پرانے یاروں کے وہ نام حذف ہو چکے تھے۔ کلیات میں یہ حوالے غور طلب ہیں۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　　مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا　　　(غالبؔ)

دنے بود ختم، جانے خریدم (نظامی)

'دست صبا' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد　　　عالم پیر دگر، بندۂ جواں خواہد شد

سنگ بار ایستہ دسگاں را کشادند (شیخ سعدی، دست صبا، ص ۶۵)

اے ساکناں کنج قفس، صبح کی ہوا　　　سنتی ہی جائے گی، سوئے گلزار، کچھ کہو　　　(سوداؔ)

موسم آیا تو نخل دار پہ میر　　　سر منصور ہی کا بار آیا　　　(میر)

گماں مبر بہ پایاں سید کار مغاں　　　ہزار بادۂ ناخوردہ درگستاں موت　　　(اقبال)

موری ارج سنو (نذر خسرو) ستمبر ۷۵ء۱۹

غنی روز سیاہ پیر افغاں را تماشا کن　　　کہ نور دیداش روشن کہ چشم زلیخارا　　　(غنی)

انتساب : یاسر عرفات، مع الاحترامات

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ فیض، سردار جعفری اور ان کے ہمنواؤں سے دور ہوتے گئے، کیوں؟ سردار جعفری کی خالص اشتراکیت سے یا سردار جعفری کی گرم گفتاری، غیر جمالیاتی مقصدیت سے یا فیض کی اپنی شخصیت سازی کے منصوبے اور سردار جعفری کی اپنی شخصیت سازی کے منصوبوں کا ٹکراؤ ہے یا.. کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

فیض کی غزل کے بنیادی مزاج اور آہنگ کو سمجھنے میں یہ واقعہ مدد دیتا ہے غالباً یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے اطہر نبی کے ترتیب کردہ فیض سیمنار (لکھنو) میں میں نے ایک پرچہ پڑھا تھا اس پرچے میں، میں نے دار و رسن، قاتل، مقتل، قفس و آشیاں کے علامتی اظہار کے سلسلے میں ہاؤس (حاضرین) کے سامنے فیض کے دس شعر پیش کئے تھے۔ ان شعروں میں ایک شعر وہ بھی تھا جس کا ایک مصرعہ یہ ہے :

سر سے باندھے ہوئے مقتل میں کفن لاکھوں ہیں

اشعار پیش کرنے کے بعد میں نے حاضرین سے پوچھا کہ فیض کے یہ دس شعر ان کے اس غزلیہ نظام کو سمجھنے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں جو ان کے سر فروشانہ رویوں اور منفی طاقتوں کے جبر و استبداد کی کشمکش کا غزلیہ اظہار ہیں۔ ان دس شعروں میں جو شعر فیض کے اسلوب کے اس رویے کی نمائندگی نہ کرتے ہوں وہ حذف کر دیے جائیں۔

مجروح صاحب کی سرپرستی میں یہ منظوری ملی تھی کہ یہ اشعار فیض کے اسلوب کی وضاحت کے لیے مناسب ہیں۔ میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ دس شعر جو آج فیض کی باغیانہ سر فروشانہ شعریت کے امتیازی اسلوب کے نمائندہ اشعار ہیں ان میں شعر نمبر ۳، ۷، ۸، ۹ بالترتیب داغ دہلوی، ریاض خیر آبادی، رند، اور قائم چاند پوری کے ہیں۔ ہماری غزل کی استعاراتی زبان کی یکسانیت کی یہی خوبی ہے کہ ڈیڑھ سو سال پرانا شعر بھی نیا لگتا ہے اور نیا شعر بھی اتنا پرانا ہو جاتا ہے۔ اس دائمی اسلوب کی افادیت قابل احترام ہے لیکن غزل میں نئے اسلوب کے راستے بھی اس طرح مشکل ہو رہے ہیں۔

فیض ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی شہرت ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہے لیکن اس میں ان کی ذاتی جدوجہد اور شعری صلاحیتوں کا بھی حصہ ہے۔ سجاد ظہیر اشتراکی ادب کے کامیاب رہنما ثابت ہوئے تھے۔ اشتراکیت سے پہلے نظم و نثر میں مغرب کے اثرات سے جدید رومانی فضا پیدا ہوئی تھی، اردو ادب پر انگریزی کے وسیع Romantic Period کا اثر تھا اردو نظم و نثر میں مغربی روّیوں کی خوشگوار آمد تھی۔ نیاز فتح پوری جیسے لوگ تھوڑی سی انگریزی کی واقفیت سے ہمارے اردو اور فارسی میں بچے اور سنورے ذہنوں پر حاوی ہونے لگے تھے۔ مولانا نیاز کی خود پسند شوخیوں کی داستان ان کے ادبی کاروباری رسالے نگار میں محفوظ ہے۔ نیاز معمولی موزوں طبع آدمی تھے مغربی ادب کی اترن پہن کر جوش اور جگر کو ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد نیاز فتح پوری جیسے لوگ بجھنے لگے اور ان کے ہمنوا مگر کہیں زیادہ باشعور اور باصلاحیت نظم و نثر نگار جیسے فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری بے اعلان ترقی پسندی کے سائے میں آگئے۔ یہ الگ بات ہے کہ سجاد ظہیر کی اس ادبی مورچے کی قیادت کسی حد تک سردار جعفری نے حاصل کر لی تھی۔

سردار جعفری کے "ترقی پسند ادب" میں شاید فیض تک کا کوئی شعر شامل نہیں ہے، ان کی اس کتاب میں مظفر شاہجہانپوری کا یہ شعر اس وقت کے نوخیز ذہنوں کو ایسا یاد کرایا گیا تھا کہ میں ابھی تک نہیں بھلا سکا۔

اس طرف روس، ادھر چین، ملایا، برما　　　اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

۱۹۵۵ء کے آس پاس سردار جعفری، جذبی (شاید فیض بھی) جیسے شاعروں کو "قید بامشقت" میں شعری تربیت کے لیے بھیجنے کا اشارہ کر چکے تھے۔ 'شاہراہ' میں ان کی یہ تحریریں 'حق گوئی اور بے باکی' کے عنوان سے محفوظ ہیں۔

سجاد ظہیر کی خالص مارکسیت پر لکھنوی آہستگی کی نفاست پردہ پوش رہتی تھی۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے۔ اس لیے بے باک، حوصلہ اور منصوبہ بند نثر و نظم کے مضبوط سپاہی سردار جعفری کی صوبیداری مطلق العنان ہونے لگی تھی۔ فراق کی عشقیہ اور جنسی بے راہ روی کا کورٹ مارشل ہونے والا تھا۔ فیض اور جذبی کی بھی بھی غزلیہ شاعری کے مقابلے میں ظہیر کاشمیری، نیاز حیدر، مظفر شاہجہانپوری اور پوربی بھاشا کے کئی مشاعرہ مار شاعر، جذبی اور فیض کو Side Track کرنے ہی والے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کیونسٹوں کے لیے عدالتیں اور جیل خانے بیدار ہوگئے۔ اس نیم سیاسی اور نیم ادبی انقلاب نے جن لوگوں کو ادبی وسیاسی قیدی بناکر اردو زبان میں ہیرو بنادیا تھا اس میں اشتراکی رہنما اور اتفاقیہ ادیب سجاد ظہیر دو ایک ادب پسند آرمی آفیسرز اور فیض احمد فیض تھے۔

اس نکتہ پر تادیر غور کرنا ہے کہ فارسی اور اردو کی غزل کے سیاسی اور تہذیبی استعارے دار و رسن، زنداں، قید و سلاسل، قفس و آشیانہ والی خالص متصوفانہ اور عشقیہ شاعری میں جو اشتراکی جانبازی کی افسانوی مقبولیت فیض کے وسیلے سے آئی، وہ ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جنگ آزادی کے سلسلے میں بھی ایسے کئی شعر آئے جو آج تک ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہیں لیکن ہم انھیں کوئی درجہ نہیں دیتے۔ مثلاً

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے　　دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

فیض نے پوری شاعرانہ فنکاری، استحکام اور ٹھہراؤ سے ان علامتوں کو اپنی غزل میں برتا۔ اس عہد میں ان کی مقبولیت کی وجہ فیض کے افسانوی کردار کی وجہ کے ساتھ اس لیے ہوگی کہ ہماری اردو غزل کے دو سو سالہ جس لہجے کو انگریزی شناس اردو داں طبقہ ماضی کی تقلید کہہ کر نہیں سمجھ سکے تو احتشام حسین، ممتاز حسین اور ان سے کم تخلیقی صلاحیت کے بے شمار تنقید لکھنے والے اور رسائل کے مدیر کیا سمجھ سکتے تھے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۹ء تک جس برق رفتاری سے دنیا بدلی ہے۔ اشتراکی نظریۂ زندگی اور ادب کا طلسم دنیا میں چھوٹے چھوٹے مذاہب سے زیادہ ناکام ہوا ہے اس کے بعد ہمارا آپ کا اس طلسم سے باہر آجانا کوئی ذہانت کا کارنامہ نہیں ہے۔ آپ غزل کے آس پاس آیئے۔ فیض کی اس سیاسی غزلیہ اظہار کی لفظیات کو یکجا کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ماضی کے یہ محترم ترین الفاظ اب کسی دور افتادہ گاؤں کے بزرگ کی یادداشت تک میں دھندلا گئے ہیں۔ آپ اس زبان میں پیاسے کے لیے ایک گلاس پانی نہیں مانگ سکتے، ایک کلومیٹر کا سفر نہیں کر سکتے، اس غزلیہ زبان میں جو فارسی اور اردو میں سینکڑوں سال کے ماضی کی خوبصورت شاعرانہ زبان تھی۔ اس کا جدید روپ نہ اپنا رخ و سے اور نئے زمانے سے، اور آج کی عوامی اور ادبی زبان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اسی لیے فیض کی پوری غزل کی نہیں بلکہ سیاسی خوابوں کی خفیہ غزل کی زبان کو زندہ اور رواں دواں زبان سے ملانے اور اسی میں جمالیاتی شعریت تلاش کرنے کی کوشش کا آج کی آنے والی زبان اور زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ زبان اور زندگی کے آثار قدیمہ کا احترام کرنا چاہیے اتنا ہی احترام فارسی زدہ اسلوب کی اس غزل کا بھی لازمی ہے لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ جس لفظ کے وسیلے سے ہم سراج اور ولی کی دنیا میں پہنچیں گے اور جو ادبی اور جمالیاتی بصیرت حاصل کریں گے وہ فیض کی غزل سے حاصل کرنا ایک جھوٹ ہوگا کہ ولی اور سراج نے جب ان لفظوں کو چھوا تھا تو وہ سچی زندگی کا سچا اظہار تھے۔ اور فیض نے جب ان پرانے لفظوں سے نئی حقیقت کو سمجھنا چاہا تو وقت اور زندگی کے معیار سے ایک غیر فطری شاعرانہ کاروبار ہوا ہے اس نکتہ پر بغیر جذباتیت کے غور کرنا چاہیے۔ فیض کے وہ شعر جنہیں ہماری غزلیہ تنقید اشتراکیت اور زردانہ نظام کی جنگ میں شعری آیات کا درجہ دیتی تھی، اس کی ناکامی کی وجہ سمجھنا لازمی ہے۔ اس وقت اشتراکی نظریات کے معمولی مفسر، شعر و ادب کے سب سے بڑے پارکھ سمجھے گئے تھے۔ اشتراکی نظریہ اس درجہ سیاسی، سماجی اور ادبی فیشن بن گیا تھا کہ جگر صاحب، سردار جعفری کی پناہ میں آگئے تھے۔ فراق گورکھپوری جنھیں اپنی انگریزی زبان پر ناز تھا، مجنوں گورکھپوری جو اردو اور انگریزی ادب کا خاصا شعور رکھتے تھے وہ بھی سجاد ظہیر سے لے کر سردار جعفری کے منظم سیاسی اور نیم ادبی کاروبار کے آگے بے بس ہوگئے تھے۔ نیاز فتح پوری جو فارسی اور انگریزی کے حوالوں پر نمائشی قدرت رکھتے تھے وہ بھی اپنی تمام فقرے بازیاں بھول گئے تھے۔ کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ سردار جعفری، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی کی طرح کے ان گنت چھوٹے بڑے لوگ جو ترقی پسند علم کے سائے میں آگئے تھے ان کے سامنے سر اٹھا سکیں۔ خالص ترقی پسند شاعروں کی گرم گفتاری اور راست نظریہ اظہار کے سامنے پڑھے لکھے مارکسی فیض احمد فیض کا قدیم غزل کی زبان کا احترام، اس داخلی موسیقی کی پراسراریت کو ادب کی جمالیات کے عاشقوں نے آخری پناہ گاہ سمجھا تھا۔

ولی سے لے کر اصغر گونڈوی تک دار و رسن، قید و قفس، بلبل و صیاد، کی فضاؤں کے تمام رنگا رنگ منظر کو فیض کی زبان سے اگر ادا کیا جاسکتا تھا تو یہی تنقیدی معیار، مزاج اور اس کی خوش فہمی سے ہماری ساری کی ساری عاشقانہ غزل، صرف مجاہدانہ غزل ہو جاتی۔ فیض کی عملی سیاسی جد و جہد کی روشنی میں ہر قدیم استعارے کو نئی معنویت صرف پرانا ذہن ہی دے سکتا تھا۔ اس طریقۂ کار سے ہماری پوری اردو شاعری انقلاب روس، انقلاب جہاں کا فیض کی '

غزل سے زیادہ انسانی جہد و جہد فی انقلابی اور سیاسی و سماجی شعور والی غزل ہو جاتی ہے لیکن تیز رفتار بدلتی ہوئی زبان، نئی زندگی کی معنویت کو جب اس دور کا فنکار پوری طرح بھلا رہا تھا بے مایہ سمجھ رہا تھا اسی قدیم سرمایے کو نئی معنویت میں فیض کی غزل نے پیش کیا۔ مقبولیت کا کوئی ہنگامی زمانہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ اور وہی ہوا۔

آج کا اردو بولنے والا طبقہ ہندوستان میں ۹۵ فیصد فرسودہ غزلیہ روایتوں کو صرف نصابی ضرورتوں میں امتحان پاس کرنے کے لیے، سبق کی طرح پڑھتا ہے لیکن یہ ایک فیصدی سے کم ہے۔ دوسری طرف چاروں طرف سے نئی اردو اور ہندی کی بول چال کی زبان میں ایک طاقت اور عصری سچائی ہے۔ دنیا اور اس کے تعلقات کے نام اور Images بدل گئے ہیں۔ اردو اور ہندی کا نیا لہجہ عالمی ہو رہا ہے۔ اس میں ماضی کے شعری محاوروں کو تیزی سے ہم بھول رہے ہیں۔ ہمارے باشعور اور ہمت والے ساٹھ سالہ شاعر و ادیب بھی اپنی ان عظیم روایتوں سے لبریز زبان کو ہر سطح پر محفوظ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ کرتے تو یہ ہمارا گناہ عظیم ہوتا۔ ہماری تمام کوششوں کے باوجود چلن میں دو سو سالہ شعری علامتیں مریں گی نہیں۔ لیکن سو جائیں گی اور ان کو مرنے سے بچانے کے لیے ہمارا غزلیہ سرمایہ سب سے بڑا محافظ ہوگا۔

آج غزل شناسی اور غزل پسندی کا جو معیار ہے اس پر میر و غالب کے سینکڑوں شعر نہ صرف پورے اترے ہیں بلکہ آج کے انسان کے دکھ سکھ میں شریک ہوئے ہیں، اسے راہ دکھاتے ہیں۔ یہ تو اردو اور ہندی بولنے والے کروڑوں لوگوں سے میر و غالب کا رشتہ ہے۔ غالب جن کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہو گیا تھا اور میر ان سے بھی پچاس برس پہلے چلے گئے اور یہ ہی عام لوگ کسی طرح میر و غالب کے اس سرمائے تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے ہیں جب تک اس عہد کے سیاسی سماجی حالت کو سمجھتے ہوئے غزل کی اس غزلیہ زبان کو نہ جانتے ہوں جو اس عہد کی عام تہذیبی زبان تھی۔ اس زبان کو اب ہندوستان اور پاکستان کے اردو ایم۔ اے عام طور پر سمجھنے میں حد درجہ دشواری محسوس کریں گے۔ فیض جنھیں سیاسی قیدی ہونے کے بعد سب سے مشہور شاعر ہونے کی سزا ملی تھی۔ ان کی غزل کے دو نمایاں حصے ہیں۔

(۱) میر و غالب کے فارسی آمیز کلام سے بھی زیادہ فارسی آمیز اسلوب میں ان کے شعر ہیں۔ اس اسلوب میں یہاں ان کے کچھ نمائندہ شعر پیش کیے جا رہے ہیں ان شعروں میں غزلیہ فکر و احساس کی ندرت گزشتہ دو سو سال کی روایتوں کے ساتھ ہے۔ ان شعروں کی امیجری اور زبان دونوں سے آج کا رشتہ کتابی رہ گیا ہے۔ ان شعروں میں شاعر کا کہیں انوکھا اور مہذب روایتی تخیل، اور اس سے مطابقت رکھتا ہوا فارسی آمیز تلمیحاتی اظہار ہے۔ اردو ادب کا ہر وارث یہی چاہے گا کہ ان شعروں کو سترہویں، اٹھارویں صدی کے تسلسل کے ساتھ بیسویں صدی کے حسن اور زندگی سے وابستہ کیا جائے اور یہی معیار شعر پسندی اگر لازمی ہے تو اصغر، یگانہ، اور فراق تو اور بہت اہم ہو جائیں گے ان کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے ایسے سینکڑوں قابل قدر شاعروں کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا۔

فارسی رنگ و آہنگ کے فیض کے یہ اشعار غزل کے بہت مخصوص پرستاروں کے لیے ہیں۔ جدید اردو کے طالب علم انھیں اکتساب علم کے لیے ضرور ایسے ہی پڑھیں جیسے بیسویں صدی کے ہزاروں غزل کے اساتذہ کا قرض ہم پر واجب ہے۔ فیض کی وہ خوبصورت غزل جوان کے درد مند دل اور ان کی محبت اور محبوب کی غزل ہے، دراصل وہی میراث اکیسویں صدی کے پڑھنے والوں کے نصیب میں آئے گی۔ غزل کے عام پرستاروں کے لیے یہ اشعار بڑی ذہنی مشقت اور عمیق مطالعہ چاہتے ہیں۔ ہم فیض کے سیاسی احساسات سے لبریز اشعار محنت اور مشقت سے خود پر طاری کر سکتے ہیں لیکن ان دو سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔

(۱) اس قدیم اور عظیم غزلیہ اسلوب کے لاکھوں شعر جو بیسویں صدی میں کہے گئے اور زبان کے عصری مزاج کی تیز رفتاری سے کتابوں میں دفن ہیں ان کو پڑھے بغیر، فیض کے ان شعروں کو کیا ہم ان کا انفرادی کارنامہ قرار دے سکیں گے؟

(۲) کیا آج کی غزل (جس میں حسرت، جگر، فراق سے لے کر ناصر کاظمی اور ناصر کاظمی سے لے کر عباس تابش جیسے نوخیز شاعر ہیں) پڑھے بغیر فیض اور صرف فیض کا وہ مقام تسلیم کر لیں گے جو اردو غزل کے تمام اکتسابات سے باخبر ہوئے بغیر ہمارے خوش فہم ذمہ دار ادبی لوگ فیض صاحب کے قدموں میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کی غزل کے مختلف دھاروں کا انتخاب الگ الگ پیش ہے۔

(۱)

سر خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتی ہے — کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری — قفس میں آج صبا بے قرار گزری ہے
جان جائیں گے جاننے والے — فیض، فرہاد و جم کی بات کرو
ہے فقط مرغِ غزلخواں کہ جسے فکر نہیں — معتدل گرمیِ گفتار کروں یا نہ کروں

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
ہمیں نے روک لیا پنجۂ جنوں ورنہ
فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
سو پیکاں تھے پیوست گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
یہ جفا کے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم
دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
جس خاک میں مل کے خاک ہوئی وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
پھر لہو سے ہر ایک کا سرِ داغ
مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن و دار کروگے کیا
اب کے برس دستورِ ستم کیا کیا بابِ ایزاد ہوئے
جس دھجی کو گلیوں میں لئے پھرتے ہیں طفلاں
جو چل سکو تو چلو راہِ وفا، مختصر بہت ہوئی ہے

یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں
کیوں محو مدحِ خوبیِ تیغ ادا نہ تھے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
خونِ دل وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا ہم رنگِ گلِ طناز کیا
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی
پر ہوا جام ارغواں کی طرح
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کمتر جاتی ہے
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیاد ہوئے
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علم ہے
مقام ہے اب نہ کوئی منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

(۲)

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
ایک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
اور کچھ دیر نہ گزرے شبِ فرقت سے کہو
کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
جب تجھے یاد کرلیا، صبح مہک مہک گئی
وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھا
انھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گذر گئے

مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں
موسمِ گل ہے، تمہارے بام پر آنے کا نام
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں
آج وہ یاد بے حساب آئے
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی
ہم ان میں ترا سوا انتظار کرتے رہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے کی
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

حصہ اوّل کے شعری انتخاب میں یہ ذہنی مجسمے جن لفظیات سے تخلیق کیے گئے ہیں وہ اردو زبان اور اردو تہذیب کا شعری خزانہ ہیں۔ اس اردو خزانے میں عرب اور ایران کی عربی اور فارسی زبان کے ساتھ، عرب اور ایران کی اعلیٰ انسانی اور شعری تہذیبیں تحلیل ہو کر ہندوستانی ہو گئیں ہیں۔ جدید اردو اپنی اس عظیم عالمی وارثت کو بھول کر ہمارے خوبصورت دوڑتے بھاگتے شہروں کی زندگی ہو جائے گی۔ عظیم شہروں کی بھیڑ جانوروں کا میلہ نہیں۔ بلکہ انسانی تاریخ و تہذیب کا نیا منظر نامہ ہے۔ اس کی وراثت ہزار رنگ کی دھوپ میں مسکراتا، دوڑتا، بھاگتا انسان ہے۔

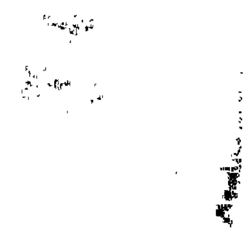
"کلاہ خسروی، بوئے سلطانی، غارت گل چیں، قفس و زنداں، مرغ غزل خواں، گرمیٔ رفتار کا اعتدال، دست عدو، پنجۂ جنوں، اسیر کوتہ کمند، فقیہ شہر، سوئے میخانہ سفیران حرم کا سند داغ، جام ار غواں، کوئے دار، سوئے یار (یہ الٹ پلٹ) باب ایزاد؟ محو مدح خوبی، تیغ ادا، حسن دست عیسیٰ، یاد روئے مریم"۔ فارسی کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ماضی کے کچھ نام ہیں۔

یہ اس بھیڑ کی زندگی کی تہذیبی وراثتوں کا لازوال ماضی ہے جو اب مراٹھی، بنگالی مدراسی نما ہندی انگریزی کے لفظوں کو اردو بنا کر بولتی ہے۔ اردو تہذیب کے اصلی خالق وہی ہوتے ہیں جو قسم کھا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ اردو ایک روح اور ایک آتما ہے اس انسان کی شناخت ہے جسے ہندوستانی اور پاکستانی کہتے ہیں اور جس کے لہو میں ایشیا اور ذہن میں امریکہ ہے۔ اور روس بھی بکھر ابھرا ہے۔

خدا کی قسم میں سردار جعفری اور بشیر بدر کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ یہ دونوں بہت چھوٹے ہیں ان لوگوں سے جن کے لہو کی حرکت سے بمبئی لوکل ٹرین ہے۔ تو اس بھیڑ کی بھولی ہوئی زبان میں جو شعری آیات کے نام ان سے عظیم لفظی کیپسول امرالقیس، نابغہ ذبیانی، حافظ، سعدی، اور فارسی والے غالب نے محفوظ کیے ہیں۔ ان کو فیض صاحب کی شاعرانہ زبان میں محفوظ کرنا اور مار کسی پلیٹ میں بند کر کے اردو غزل کی Seal لگانا ایک کار پیمبران جدید و قدیم ہے۔

اس کے بعد تو اجازت ملے گی یہ لینے کی کہ اس پلیٹ کو منظوم کر کے اس جدید بھیڑ کو غزل کے نام سے اب نہیں دیا جا سکتا اور آج کی غزل سے سرمائے میں فیض احمد فیض کا Poetic Contribution ان کے دوسرے مسے والے ہی اشعار ہیں۔ یہ ہماری غزل کا ایک حصہ ہیں۔ غزل کی زمیں سے اس چھوٹے سے ٹکڑے کا نام فیض احمد فیض ہے اور میں۔ اس فیض سے پیار کرتا ہوں۔ فیض کے یہ اشعار اس سادہ و پرکار پکی غزل میں شامل ہوں گے جو اردو غزل کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس کارنامے میں اگر امیر خسرو کا صرف نام لیں اور دکنی شعرا سے آج تک کی غزل کا انتخاب کیا جائے تو کئی ہزار ایسے لازوال شعر ملیں گے اور یہ سادہ سادہ سے شعر انسانی شاعرانہ فکر کا معجزہ ہیں۔ اگر مجھے زیادتی کرنے کی اجازت دی جائے تو اقرار کرلوں کہ ہماری غزل کی تنقید نے، غزل کی تلاش کے علاوہ ہر کام کیا ہے۔

قلی قطب شاہ سے اب تک کتنے شاعروں کے غزلیہ معجزے زمیں کھا گئی ہوگی۔ اب بھی صرف آج کی زبان میں سمجھ آ جانے والے ان ہزاروں شعروں میں فیض کے اگر پچیس شعر بھی شامل ہو جائیں تو کیا غزل میں فیض کبھی بھلائے جا سکتے ہیں؟ فیض کی یہ غزل جو آج کی بول چال زبان میں تمام غزلیہ فنکاری کو روح میں بسائے ہوئے نرم نرم جھونکے کی طرح دلوں میں درد کے دروازے اور یادوں کی کھڑکیاں کھولتی ہے۔ یہ محبت کی غزل کے چند شعر ہی ان کا سچا غزلیہ سرمایہ ہیں لیکن فیض کی قدیم استعاروں والی غزل ان کی سیاسی آرزوؤں کی یادداشت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اسے خونِ دل سے لکھا ہو لیکن اس کی رسائی بمشکل چند ذہنوں تک ہوگی۔ جذبوں اور احساسات سے لبریز ان کے ایسے اچھے شعر اردو غزل کے مرکزی لہجے کا تسلسل ہیں۔ ان کے کچھ شعر محبت کے پھول ہیں جن کی خوشبو دلوں کو چھوتی رہے گی۔ غزل کی تاریخ اور تذکرے میں فیض کا نام رہ رہ کر یاد آتا رہے گا۔ OO



جلیس نجیب آبادی

(نذرِ میرؔ)

،ی آنکھوں میں سیل آب نہیں
، کی دنیا یہاں خراب نہیں

ے کہتی ہے شامِ تنہائی
یں نہیں آج یا جناب نہیں"

کو زنجیر کردیا ہم نے
. وہ پہلا سا پیچ و تاب نہیں

ے کچھ بول، وقت تھوڑا ہے
شی بات کا جواب نہیں

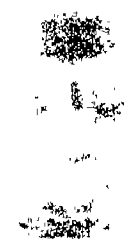
، سے روشن ہے دشتِ فکر و خیال
۔ عورت ہے ماہتاب نہیں

ھ ہے زندگی کے رنجِ فراق
۔ دو دن کا یہ عذاب نہیں

تعبیر اپنے پاس رکھو
ن آنکھوں میں کوئی خواب نہیں

کر رحم ربِّ موجودات!
شوں کا تیری حساب نہیں

● Pathanpura, Najibabad
246763 (U.P.)



شاھد کلیم

اب آگے اور مت جاؤ یہ منظر آنے والا ہے
دھویں اور دھند میں لپٹا مرا گھر آنے والا ہے

ہر اک انساں ہے خائف عہدِ نو کی آہٹیں سن کر
نہ جانے کون سادہ روپ بھر کر آنے والا ہے

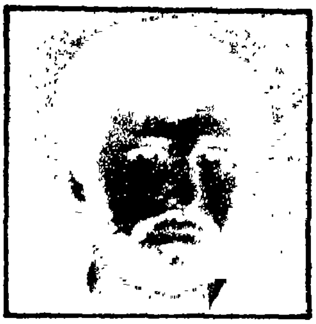
نہیں کوئی نہیں ہے اجنبی، ناآشنا ان میں
مگر لگتا ہے اپنی سمت پتھر آنے والا ہے

کہاں تیار ہے کوئی بھی اس کے خیر مقدم کو
وہ سورج کس لیے اپنی زمیں پر آنے والا ہے

تمہاری بات پر ہم کو یقیں ہرگز نہ آئے گا
یہی ہم سنتے آئے ہیں سمندر آنے والا ہے

شجر کو کر دیا ہے جس نے بے برگ و ثمر شاہدؔ
وہی سفاک موسم میرے اندر آنے والا ہے

● Dood Katora, Ara - 802301 (Bihar)



عبدالاحد ساز

پنپ رہی ہیں عجب آہٹیں زمانے میں
کہ جیسے اب کوئی دن ہوں قیامت آنے میں

در آ رہی تھی کسی اجنبی نظر کی کرن
شگاف تھے تری پلکوں کے شامیانے میں

تمام گردشیں اک سمت، اک طرف زینہ
رکھا گیا ہے مجھے قید درمیانے میں

شکستِ وعدہ کی محفل عجیب تھی تیری
مرا نہ ہوتا تھا برپا ترے نہ آنے میں

جواب ڈھونڈھنے میں لطف اہلِ دانش کو
مجھے سوال کو نغمہ بنا کے گانے میں

دیارِ یار میں صدیوں سے گونج ہے جس کی
مری بھی لے ہے اسی راہ کے ترانے میں

مری شناخت، مرا واقعہ ہے سازؔ مگر
کہانی اور کسی کی مرے فسانے میں

● Zakaria Manor, 4th Floor,
149 - Yusuf Meherali Road,
Bombay - 400003



علی تنہا
Senior Producer Radio Pakistan, Multan (Pak)

تصویر کا راستہ

اُس نے اختر کو بلایا اور بتایا کہ یہاں سوائے ایک پرانی محراب کے اور کوئی شے کام کی نہیں۔ محراب، اصل میں سنگِ سیاہ کی تھی اور اس کے فرش کے پتھروں پر کچھ ایسے نقش کندہ تھے کہ انسان کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے۔

مکان چند راہداریوں اور دالانوں پر مشتمل تھا، جس کا صحن گولائی میں بڑے مردانے میں ختم ہونے کو آتا تھا۔

"اب اس مکان کا مصرف کیا ہوگا اختر؟"

اس کی ستواں ناک پر سنہری عینک کے شیشوں میں سے بڑی بڑی غلافی آنکھیں غصے سے دہک رہی تھیں۔

"بدرالنساء جب تک نہیں آتی، اس کے بارے میں کوئی آخری بات نہیں ہو سکتی، لیکن میرا اب بھی خیال یہ ہے کہ اس حویلی کو بیچنا اپنے ہاتھ پیر کٹوانا ہیں۔"

اختر اس کی کلائی پکڑے، چلتا ہوا اسے صحن سے گذار کر مردانے میں لے آیا۔

"مجھے جنگ سے ایک سال پہلے کا واقعہ، اس گھر کا یاد آرہا ہے۔ برسات کے دن تھے اور وہ وردی ڈاٹے بھاری بوٹوں کی دھمک کے ساتھ بولتا جاتا تھا۔ میں نے اتنی رسان سے اسے پہلی بار سنا تھا۔"

"تم نے حکیم جان کو دیکھا تھا؟"

"ہاں!" وہ مسہری پر گاؤ تکیے کو کمر تلے لے جا کر بولا۔

"اس نے مجھے بتلایا کہ جنگ قریب ہے اور معلوم پڑتا ہے میں دوبارہ اس گھر میں آنے کا نہیں۔ میں ویسی سی باتیں پہلے بھی نہیں کرتا تھا، اب بھی نہیں۔ مگر اب کی بار مجھے ہول آنے لگا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں نے تایا جان کو کل رات صحن میں آوازیں دیتے سنا ہے۔"

پوچھا "کیا کہتے تھے تایا جی؟"

"بولے، حکیم تیرا قد بڑھ رہا ہے بہت، اسے کاٹ کر صحن میں لگالو۔"

میں لڑکپن سے تایا جی سے لام کے قصے سنا کرتا تھا۔ کہا میں نے، تایا جی قد کیا کٹوانا، میں ہی صحن میں سالم کا سالم اُگ آتا ہوں۔ بہت ہنسے، اور معلوم ہے کتنی دیر بعد مجھے یاد آیا، وہ ہنس کہاں رہے تھے؟ بندہ نیند میں کیا کیا بھول جاتا ہے۔"

"پھر؟"

"پھر، حکیم جان جنگ میں مارا گیا۔ معلوم ہے اس کا آدھا دھڑ کٹ گیا تھا گولا لگنے سے۔ اس محراب سے آگے جاتا ہوں تو مجھے صحن ایک دم تایا جی کی لوہا لاٹھ آواز سنائی پڑتی ہے۔ "'حکیم جان کو کہہ، گھر آجائے، وہ کیوں اتنی دور چلا گیا ہے؟"

وہ اختر سے پوچھنا چاہتا تھا، حکیم جان کو اتنے برس بعد یاد کرنے کا فائدہ؟ آدمی کیسی کیسی بھول کے چکر میں آجاتا ہے۔

اب وہ محراب والے قصے کو دوبارہ پوچھنا چاہتا تھا، مگر اختر جلدی میں تھا اور باہر دھرتی کے مساموں سے گرمی ابلی پڑ رہی تھی۔ سوائے بدرالنساء کے انتظار کرنے کے سب کچھ بے سود تھا۔

"کوئی پچاس برس ہونے کو آتے ہیں، بدرالنساء یہاں آئی تھی مگر حالت اس کی اب تو دیکھی نہیں جاتی۔"

"لیکن اختر اور بدرالنساء کے سوا کسی اور کو معلوم بھی تو نہیں، ان کندہ تصویروں کا حال۔"

بشارت نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کتنے لوگ اس گھر سے کچھ لئے دیے بنا سدھار گئے۔ لیکن تصویروں کے جھمیلے میں اسے پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ مت بندے کی ماری جائے تو کیا کیا کرتا ہے؟

اس نے کرمو کو آواز دی اور بڑا تالا دوبارہ ٹھونک بجا کے، دروازے کی مضبوط زنجیر میں ڈال دیا، باہر نکل کے قسم کھائی کہ اس کے بعد تصویروں کے اس الجھیڑے میں نہیں پڑے گا۔ اس کے دماغ میں پرانے گھر کی طرح نئے فسادوں کی جگہ ہی کہاں ہے؟

"کون تھا اس گھر کو آباد کرنے والا؟"

اس نے یاد کر کے ایک خالی ہنسی کے خوف سے پیچھے ہٹ کر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔

"ایک سے ایک بڑا گرگا آتا گیا۔ اور تصویر پر لڑتا بھڑتا خالی ہاتھ نکل گیا۔"

زمان نے بشارت کو بتلایا تھا کہ سارا بکھیڑا ان تصویروں کی وجہ سے ہے۔ تصویروں والی اینٹیں اکھڑوا دیں، سب کچھ اپنی جگہ پر جم رہے گا۔ بشارت کو گھر کے اس تذکرے سے ہول آتا تھا۔ زمان سے بولا۔

"بھائی! قسم کھالی ہے میں نے تو اس گھر کو دوبارہ نہ کھولنے کی، جو بھی یہاں آیا ہے، روتا ہوا گیا ہے۔ کیا منحوس گھر ہے؟"

بشارت نے گھر دوبارہ نہ کھولنے کا عہد سچ کر دکھایا۔ اصل میں اسے کھولنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ اختر کو یہ بات اس دن یاد آئی جب بدر النساء نے مرنے سے کچھ دن پہلے پیغام دیا کہ بشارت تو نہیں ہے مکان کی منقش اینٹیں ایک ایک کر کے چوری ہو گئی ہیں۔ اور اب اس میں کوئی خاندان آبسا ہے۔ پہلے تو یقین نہیں آیا مگر جا کر دیکھتا کیا ہے کہ گھر میں وہ اودھم مچا ہے، گویا لوگ صدیوں سے یہاں رہتے آئے ہوں۔ ماتھا ٹھنکا۔ خدایا! یہ مخلوق کہاں کی، اس گھر میں آن گھسی ہے؟ پھر دھیان جڑا کہ شاید بشارت کی اجازت سے آن بسے ہوں۔ مگر بشارت کو گئے تو زمانے لد گئے۔ اسی کشمکش میں اسے یکایک رنگین ٹائلوں کی قطار نظر آگئی۔ یہ نہایت کاریگری سے پرانی منقش اینٹوں کی جگہ لگائی گئی تھی۔ وہ مارے غصے کے بھنا اٹھا۔" کیسے حرامی لوگ ہیں؟ صحن میں اس کی آمد پر مجال ہے کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔ کیا کوئی اجنبی دوسرے کے گھر میں اس ڈھٹائی سے رہ سکتا ہے۔؟

یہ پوہ کے ابتدائی دن تھے اور سنگ سیاہ کی بڑی محرابوں والے دالان کے ساتھ گلِ داؤدی آگ کی طرح دہکے جاتے تھے۔

"آپ کون ہیں صاحب؟"

اختر نے برابر میں کھڑی بھاری کولہوں والی مردانہ آواز میں سوال کرتی ہوئی عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کی موٹی ناک میں ہیرے کی کیل دھوپ میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

"میں؟ میں؟ میرے بارے میں پوچھ رہی ہیں آپ؟"

"کیا آپ بشارت ہیں؟"

"نہیں، میں بشارت نہیں۔ لیکن اس گھر میں یہ سب لوگ کون ہیں؟"

عورت نتھنے پھلاتی ہوئی زور زور سے ہنستی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ کھڑے کھڑے اسے خیال گذرا، شاید وہ پرائے گھر میں گھس آیا ہے۔ کیونکہ لوگ گھر میں اپنے اپنے کام سے لگے ہوئے اسے اب برے معلوم نہیں پڑتے تھے۔ اس پر ایک لمحے میں کتنے زمانوں کا غبار گذر گیا۔

راہداریوں کے فرش بدلے گئے تھے اور چھوٹے بڑے کمروں کے علاوہ دالانوں کا رنگ بھی نیا نیا کرایا گیا تھا۔ وہ مڑتا ہوا بشارت کے اس گھر کے بارے میں دوبارہ کسی سے پوچھنے کی حالت ہی سے در گذرا۔

اختر باہر نکل رہا تھا کہ اسی عورت نے آواز دے کر روک لیا" صاحب! آپ کو یاد ہوگا، یہاں بشارت سے پہلے جو لوگ رہتے تھے۔ وہ کون تھے؟"

عورت کو غور سے دیکھنے پر کھلا کہ یہ عورت کھڑے کھڑے رنگ بدل رہی ہے۔

"ہاں ہاں "اختر کے بزرگ رہتے تھے یہاں۔ مگر آپ کون ہیں؟"

عورت کے ریشمی بھرے جسم میں دیر تک ہنسی کی وجہ سے تھرتھری رہی۔

"لو! ہم کون ہیں؟"

عورت، اختر کو سر سے پاؤں تک دیکھتی برآمدے کی طرف کھسک گئی اور وہ نیند میں چلتا ہوا بغلی دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔ وہ باہر کب آیا؟ یا وہ اندر ہی رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا ہے تو بشارت کے دروازے کے سامنے ایک ہجوم اندر باہر آ رہا تھا۔

"یہ پل جھپکنے میں دنیا کو کیا ہو گیا؟"

اسے لگا یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ حتیٰ کہ خواب بھی نہیں ہے۔ اسے بشارت کے لڑکے دلاور نے یقین دلایا کہ کوئی شے بھی جھوٹ ہے نہ خواب ہے۔ سب سچ ہے۔

"انکل آپ بڑی حویلی سے ہو کر آگئے ہو۔ ادھر سالا جو لوگ رہتا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا۔ کیسا حرامی لوگ ہے؟"

اختر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ کیوں کہ اس نے دلاور کو بتایا ہی کب تھا کہ وہ بڑی حویلی سے ہو کے آیا ہے۔

"انکل! تصویروں والی اینٹوں کے غائب ہونے کے بعد معلوم ہے، کیا لفڑا ہوا؟"

وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اور اختر کو انتہائی انہماک سے ان لوگوں کے بارے میں بتایا۔ اختر دلاور کے ترشے ہونٹوں کو دیکھ کر بشارت کو یاد کرتا رہا۔

"مجھے اب معلوم ہوا۔ دلاور! کہ یہ لوگ کون ہیں۔ تعجب ہے۔"

دلاور کی باتیں سیاہ آندھی کی طرح تمام چیزوں کو تنکوں کی مثال بہاتی ہوئی گذر گئیں۔ یہ کیسا دلاور ہے جس نے بشارت کو مار کر ایسا گھر بنایا ہے جس میں ہر شے نئی اور بدلنے والی ہے۔ کیا یہ بشارت کا بیٹا دلاور ہی ہے؟ اگر یہ دلاور نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس نے دیکھا گہری سیاہ آندھی میں دھکے کھاتا ہوا اڑ رہا ہے۔ وہ اندھیرے اجالے کے درمیاں کہاں ہے؟ کیا اس آندھی میں اس کا کوئی ٹھکانہ ہے؟

"ٹھکانہ؟"

وہ ہنسنے اور رونے کی کیفیت سے آزاد، خواب کی سی حالت میں گھر گیا ہے۔ خواب میں چلنا پھرنا دوبھر ہے۔ آدمی بھاگے تو کہاں؟ چلے تو کدھر؟ رکے تو کیونکر، سارے رستے تو آندھیوں نے مٹا دیئے ہیں۔ اگر کوئی رستہ ہے تو جنگل کا ہے۔ مگر وہ بھی کہاں؟ چلیئے اگر یہ رستہ مل بھی جائے تو کیا ہوگا؟" رستہ مل جائے، کیا ہوگا؟"

اختر خواب کو یا حقیقت کو اپنے آپ سے یوں ہٹاتا ہے۔ جیسے سچ مچ اسے رستہ مل گیا ہے۔

OO



ساغر جیدی

دوہے

مکتب مکتب دیکھ کر، روٹی کی تدریس
ہکا بکا رہ گیا، ہر لنگڑا ابلیس

بے رحمی سے ہر کوئی، کرتا ہے استعمال
اس دنیا میں واقعی، ہم ہیں چور کا مال

دولت مندوں کی یہاں عجیب ہے تحریک
کاسۂ زریں تھام کر، مانگ رہے ہیں بھیک

عالم عالم کو یہاں کہتا ہے اوباش
اک اندھا اک اندھے سے کھیل رہا ہے تاش

ہم تو آنکھیں موند کر، کہہ دیں گے آمین!
کچی دعائیں شیخ جی! تقوے کی توہین

وہی پٹیں گے ہار کر، اذیتوں کے گھونٹ
ہم تو بس شطرنج کے، ہاتھی گھوڑا اونٹ

اکتالے پر پیٹ لے، چاہے پہاڑی راگ
بات نہ مانے گا تری، دل ہے پرانا گھاگ

● D No 20/369, M V Street,
Cuddapah - 516001 (A P)

خاور نقیب

تشویش

طنابِ غم سے
الجھی ہوئی خوشی
زار و قطار
بحرِ احمر بہاتی ہے
فصیلِ کائنات سے لپٹے ہوئے صحرا
سراب اگل کر خوش ہیں
نہ جانے گھبرائے ہوئے قدم
کسی طرف اٹھ جائیں
اور سفر کر رہی
قزاق امر بیلوں سے الجھ کر
کس نادیدہ صحرا میں جا پڑیں
یا کسی
ناشنیدہ دریا میں غرق ہو جائیں
یا ضم ہو کر
کسی بیوہ کے عدت گزار ایام میں
دکھوں کو لا انتہا کر دیں!!

● Editor 'Tarweej', P.O.Kood,
Sungra Cuttack - 754221
(Orissa)



منیر حیدر

بخت اور تاب کو دائم یونہی اللہ ر
منزلیں پاؤں میں جاری سفر اپنا ر

عشق ہے، ذوق ہے، نفرت ہے، ہوس رانی
نام احساس نے جینے کے ہیں کیا کیا ر

مستقل ہوگئی بنجر بھلے شاداب ز
ابر لوٹا نہ کبھی کاندھے پہ دریا ر

خشک یہ ہونٹ جو اک بوند بھی پانی ما
تشنگی بڑھ کے مقابل مرے صحرا ر

وہ تو پتھر میں بھی کیڑے کو ہے دیتا روز
اور جسے چاہے سمندر میں بھی پیاسا ر

کامیابی کی ضمانت اسے دیتا ہے جہا
زندگی ہار کے جو حوصلہ ہم سا ر

کنجِ صحرا میں کس آرام سے بیٹھے ہو
خود کو دنیا کی ہر اک بھیڑ سے تنہا ر

● P.O.26135, Safat - 13122
Kuwait (A.G.)



مہدی ٹونکی
Mubark Manzil, Panch Batti, Tonk (Raj.)

میرا جنازہ

ابھی ابھی میرا جنازہ میرے گھر سے نکلا ہے۔

میرے کندھوں پر میرا جنازہ تھا۔ جنازے کی وجہ سے میرے کندھے دکھنے لگے تھے۔ جنازہ میرے گھر سے آگے بڑھتا گیا، لوگ کندھا دینے کے لیے آنے لگے۔ جیسے ہی چوتھے پائے کو میں نے دوسرے شخص کے کندھے کو منتقل کیا مجھے راحت ملی۔ اب میں نے چال دھیمی کر دی۔ پیچھے کے لوگ میرے برابر آنے لگے۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہوتا چلا گیا، پیچھے سر گھما کر دور سے ہی ایک پتلی گلی کا نشانہ سادھ لیا اور جیسے ہی جنازے کے جلوس کا آخری آدمی بھی مجھ سے آگے بڑھ گیا میں پھرتی سے گلی میں گھس گیا۔ گلی میں پہنچتے ہی میں نے اطمینان کی سانس لی۔ نہ جانے کیوں انسان دوسروں کو دھوکہ دے کر خوش ہوتا ہے، اپنی اس چالاکی پر خوش ہوتا ہے۔ اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ دل میں اس خیال سے گدگدی پیدا ہو رہی تھی کہ کس طرح میں نے اپنے جنازے کو دوسروں کے کندھوں کو منتقل کر دیا۔ جی چاہا سڑک پر کھڑے ہو کر خوب زور زور سے قہقہے لگاؤں نہ جانے کتنے برس ہو گئے تھے مجھے قہقہے لگائے ہوئے۔ اگر میں بچہ ہوتا تو یقیناً خوب ہنستا، خوب ہنستا۔ پیٹ دبا دبا کر قہقہے لگاتا جب تک کہ آخری ہنسی بھی پیٹ سے نکل نہیں جاتی۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ میں بچہ نہیں ہوں، اگر ایسی حرکت کروں گا تو لوگ مجھے پاگل سمجھیں گے۔ مجبوراً میں اپنی خواہش داب گیا۔ عجیب بات ہے لوگ اپنی امیج کے بگڑنے کے ڈر سے بہت ڈرتے ہیں، بچہ امیج کو نہیں جانتا۔ وہ ہر طرف خوشی سے بکھرنا چاہتا ہے۔ پھول کی طرح کھلنا اور لہلہانا چاہتا ہے اسی لیے وہ بے فکر ہوتا ہے۔ خوش رہتا ہے لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اسے یہ احساس ہوتا جاتا ہے کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اس لئے اب میں بچوں کی طرح آزادی سے من چاہے کام نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے آپ کو سمیٹنے لگتا ہے اور جب بچہ جوان ہو کر، بڑا ہو کر ذمہ داری کے کچھ کام کاج کرنے لگتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اتنا سمیٹ چکا ہوتا ہے کہ اس کی خواہشات کی بیل مرجھا چکی ہوتی ہے۔ 'لوگ کیا کہیں گے' کے تیروں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو خود ساختہ تہذیب کے حصار میں مقید کر لیتا ہے۔ جتنے لوگوں سے میل جول، جتنے بڑے کام، اتنی ہی بڑی امیج کا خول۔

میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اب بچہ نہیں تھا۔ بس اسی خیال نے مجھے ہر طرف خوشبوؤں کی طرح بکھرنے سے روک دیا تھا۔ میں کھل کر ہنس نہیں سکا۔ میری ایک خواہش مر گئی۔ پھر بھی مجھے مسرت ہو رہی تھی کہ اب میرے کندھوں پر میرا جنازہ نہیں ہے۔ اب تو وہ بہت آگے نکل چکا ہے۔

میں گلی سے نکل کر بازار میں آیا۔ وہاں کی چہل پہل، شور شرابہ مجھے اچھا لگا۔ میں نے تھڑی پر سے سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور ہوٹل میں گھس گیا۔ کبھی نوجوانی میں یار دوستوں کے ساتھ چھپ چھپ کر سگریٹ پیتے تھے لیکن بعد میں بزرگوں کے احترام کی وجہ سے بڑوں کے ڈر سے، بیوی کی ناک بھنوں سکیڑنے سے بچے کے بگڑنے کے اندیشے سے اور سب سے زیادہ مالی بدحالی کے خوفناک سانپ کے ڈر کی وجہ سے ہوٹلوں کی چائے اور نشے پتے کو چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس وقت میں اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ سارے خوف، سارے اندیشے میرے لیے اجنبی ہو گئے تھے۔ میں بے فکری کے ساتھ ہوٹل میں گھس گیا۔ مجھے اس وقت سگریٹ کا سلگانا، لمبے لمبے کش لے کر دھوئیں کی دھار کو دور تک فضا میں چھوڑنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہوٹل بھرا ہوا تھا۔ لوگ چائے پی رہے تھے، دھواں اڑا رہے تھے، گنگنا رہے تھے، برابر رکھے اگالدان میں بلغمیں تھوک رہے تھے اور چٹخارے دار گالیاں چھوڑ رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں بے فکروں کی محفل میں آ گیا ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ متواتر دو سگریٹوں کو لمبے لمبے دھوؤں میں تبدیل کیا۔ ہوٹل سے باہر نکلا اور تھڑی پر سے پان خریدا۔ پان کو گلے میں داب کر سینہ پھلائے خراماں خراماں بازار سے گزرنے لگا۔ کبھی میں بازار کو شیطان کا اڈا سمجھتا تھا، اس لیے میں نظریں جھکائے تیزی سے بازار سے گذر کر دفتر اور دفتر سے گھر پہنچنے کی جلدی میں رہتا تھا۔ لیکن مجھے اس وقت یہ بازار ایک خوبصورت پرکشش نمائش گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں کی رونق، چہل پہل بہت بھلی معلوم ہو رہی

تھی۔ میں سر اٹھائے اطمینان سے آس پاس کا نظارہ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ پان کی پیک سے جب منہ بھر گیا تو میں نے بیچ سڑک پر 'پچ' کی آواز کے ساتھ پچکاری چھوڑی۔ اسی وقت کسی نے میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ میں مڑا۔ سامنے میرے بچپن کا دوست کھڑا مسکرا رہا تھا۔ چوتھی کلاس کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ آج کل وہ بیڑیاں بنا رہا تھا۔ سینما کے ٹکٹوں کی بلیک بھی کیا کرتا تھا۔ "اے یار تو کہاں رہتا ہے۔؟ برسوں بعد دکھائی دیا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور کھینچتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ "آ یار۔ آج تو ایک دو گیم ہو جائیں۔"

مجھے کیرم بہت پسند ہے۔ شادی سے پہلے، میں یار دوستوں کے ساتھ خوب کھیلا کرتا تھا۔ شادی کے بعد ذمہ داریوں نے مجھے اس قدر جکڑ لیا تھا کہ میں اب اس کھیل کو وقت اور پیسے کی بربادی سمجھنے لگا تھا لیکن اس وقت انکار نہیں کر سکا۔ دوست کے ساتھ سٹے سٹے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل کا دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلتا تھا۔ یہ کیرم ہال تھا۔ دس کیرم بورڈ بچھے ہوئے تھے جن پر لٹکے تیز بلب روشن تھے۔ کئی بورڈوں کے پاس بھیڑ بیٹھی تھی۔ لگی تیز روشنی میں ان کے متجسس چہرے کیرم بورڈ پر ایسے جھکے ہوئے تھے جیسے نقاب پوش ڈاکٹروں کی نگاہیں آپریشن ٹیبل پر لیٹے مریض کے آپریشن میں مشغول رہتی ہیں۔ ہال دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ گوٹوں اور اسٹرائکرس کی آپس میں ٹکرانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ گالیاں اچھل رہی تھیں۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ ہوٹل کے ملازم چھوکرے پان بیڑی سگریٹ چائے اور گٹکوں کی تھیلیاں ٹرے میں لئے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ ہم دونوں ایک خالی بورڈ پر جا بیٹھے۔ جلد ہی بورڈ کا نیا ڈبہ، پان اور چائے آ گئی۔ گیم شروع ہوتے ہی دوسرے لوگ بھی ہماری طرف آ گئے۔ گیم پر گیم ہوتے رہے۔ پان سگریٹ اور چائے آتی رہی چونکہ میں بہت برسوں بعد کھیلنے بیٹھا تھا اس لیے زیادہ تر گیم ہارتا۔ لیکن ہارنا بھی مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ بات چیت بہت جلد بے تکلفی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ گٹ پر لگے غلط نشانے پر یار دوستوں کا گالیاں بکنا، قہقہے لگانا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں کی ٹینشن کی بیماری سے مجھے چھٹکارا مل گیا ہو۔ بیٹھے بیٹھے جب ہم تھک گئے تو باہر نکلے۔ میرا دوست مجھے فلم ہال میں لے گیا۔ میں سینما کا پوسٹر نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے جب فلم شروع ہوئی اور "گرما گرم" سین آیا تو میں اچھل پڑا۔ فلم تو 'صرف بالغوں کے لیے' تھی۔ میں نے گھبرا کر آس پاس دیکھا، لوگ بہت اطمینان سے اشتیاق سے فلم دیکھنے میں محو تھے۔ میرا دوست میری ران پر ہاتھ مار کر ہر گرم سین پر کہتا "۔واہ۔ کیا شاندار سین بنایا ہے مزا آ گیا۔"

دھیرے دھیرے میں نارمل ہو گیا اور جلد ہی فلم کے ہر سین کو دلچسپی اور توجہ سے دیکھنے لگا۔ مجھے بہت مسرت حاصل ہو رہی تھی، جیسے میرا بچپن لوٹ آیا ہے۔ شادی سے پہلے کی مست، بے فکر اور آزاد زندگی پلٹ آئی ہے۔ رات کے ایک بجے میں واپس گھر لوٹا، نیند سے بوجھل آنکھیں لئے، بیوی نے مجھے ناگواری سے دیکھا، مگر کہا کچھ نہیں۔ علی الصبح جب میں معمول کے مطابق سو کر نہیں اٹھا تو میری بیوی نے مجھے جگایا۔ مجھے بہت ناگوار گذرا۔ میں نے بیوی کو بری طرح سے جھڑک دیا۔ صبح کے ضروری کام کاج یعنی نل سے پانی بھرنا، دودھ لانا اور بچے کو اسکول چھوڑ کر آنا۔ بیوی کو ہی کرنے پڑے۔ میں دیر تک سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو سورج دس بجے کی سوئیوں پر سوار تھا۔ بچپن میں بھی میں کبھی اتنی دیر تک نہیں سویا تھا مگر اس وقت دیر تک سونا اچھا لگا۔ مستی سے انگڑائی لی اور گیارہ بجے دفتر پہنچا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا ورنہ میں دفتر وقت سے پہلے پہنچنے والوں میں سے تھا۔ لیکن مجھے کوئی ندامت نہیں ہوئی۔ حاضری کے رجسٹر پر دستخط مارے اور سیدھا یونین لیڈر کے پاس پہنچ گیا۔ میرے سیکشن کے لوگوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر اپنے اپنے کاغذوں پر نظریں جمالیں۔ میں سب سے پہلے اپنے سیکشن میں پہنچ کر کرسی پر جمنے والوں میں سے تھا اور دفتر کا وقت ختم ہونے پر بھی سب سے بعد میں کرسی سے اٹھنے والوں میں سے تھا۔ یونین لیڈر کے کمرے میں پہنچ کر میں نے سارا دن ان مشوروں میں گذارا کہ کن مدوں پر اسٹرائک کے لیے ملازمین کو آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ آفس سے چائے کی تھڑی اور تھڑی سے یونین کے کمرے میں۔ سارا وقت اسی گردش میں گذرا۔ آفس کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی دفتر سے نکلا مجھے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں سیدھا کیرم ہال پہنچا۔ جم کر کھیلا۔ آج اور بھی لطف آیا۔ وہاں سے نکل کر سینما ہال پہنچ گیا۔

اب دیر سے گھر پہنچنا میرا معمول بن گیا تھا اور صبح دیر تک سو کر اٹھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ دیر سے دفتر پہنچنے اور کرسی پر سے غائب رہنے میں اب مجھے فخر محسوس ہوتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بنا لحاظ و شرم گالیاں بکنے پر مجھ میں وزن بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اب میں زیادہ تر یونین کے نیتاؤں کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ لیکن مجھے یہ احساس تھوڑا بہت ضرور ہوتا تھا کہ پہلے جو نیتا مجھ سے مشورے لینے کے لیے آتے تھے، اب جبکہ میں خود ان کو مشورے دیتا ہوں تو وہ میری باتوں پر، میرے مشوروں پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔

میں سوشل ورکر تھا۔ میرے محلے میں میری بہت عزت تھی وقعت تھی جب بھی لوگوں کے مسائل لے کر کارپوریشن تھانے، محکمہ رسد، اسپتال یا دوسرے دفاتر میں جاتا تھا تو وہاں کے افسران مجھے عزت دیتے تھے۔ کام فوری ہوتا تھا لیکن ان دنوں جب سے میں نے لوگوں کے کام میں لاپرواہی برتنا شروع کر دی ہے، ضرورتمندوں سے اپنا محنتانہ لینا

شروع کردیا ہے تو اب کام اٹکنے لگ گئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری آمدنی تو بڑھ گئی ہے لیکن یہ آمدنی گھر پہنچنے کے بجائے میری تفریح اور شوق میں اٹھنے لگ گئی ہے مگر پھر بھی میں خوش ہوں۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں کھانی کا بیل ہوں۔ بیوی بچوں کی سہولیات کی فکر اور دفتر کے کام کاج کے بوجھ سے چھٹکارا مل جانے کے بعد مجھے اب ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کہ اب میں اپنی زندگی اور اپنے وقت کا خود مالک ہوں۔ رات گئے تک ہوٹلوں میں بیٹھے رہنا، ہوٹلوں کے باہر فٹ پاتھ پر یار دوستوں کے جمگھٹوں میں وقت گذارنا، آزادی کی علامت معلوم ہوتا تھا۔ تاش لاٹری اور شراب میں پیسے خرچ کرنا اب میرا محبوب مشغلہ تھا۔ مجھے اس خرچ پر فخر محسوس ہوتا تھا۔ بیوی نے اب نوکری کرلی تھی اس لیے اب گھر کے اخراجات سے بھی لاتعلق ہوگیا تھا۔ پہلی بار جب میں شراب پی کر گھر پہنچا تھا تو بیوی بہت ناراض ہوئی تھی لیکن میں نے اس کی ذرا سی بھی پرواہ نہیں کی۔ لیکن جب دوسرے دن پھر شراب میں مست گھر پہنچا تو وہ چیخنے چلانے اور رونے لگی۔ میں غصے میں بھڑ گیا اسے خوب گالیاں بکیں اور زدوکوب کر کے اس کے احتجاج کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔ میں اب اطمینان سے گھر میں ہی شراب پینے لگ گیا تھا۔ ہاں ایک بات اور ہوئی۔ میرا اکلوتا بچہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ جب میں دفتر سے گھر پہنچتا تو وہ مجھے دروازے پر میرا انتظار کرتا ہوا ملتا تھا۔ دور سے ہی مجھے دیکھ کر بھاگتا ہوا آتا تھا اور میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا تھا۔ میری جیبوں کی میرے بیگ کی تلاشی لیتا تھا۔ رات کو میرے پاس ہی سوتا تھا اور سونے سے پہلے ڈھیر ساری فرمائشیں مجھے یاد کراتا تھا لیکن اب وہ میری صورت دیکھتے ہی اپنی ماں سے چپک جاتا ہے۔ اس نے اب مجھ سے فرمائش کرنا، اپنی ضرورتوں کا کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

یار دوستوں کے ساتھ بلیو فلمیں دیکھتے وقت مجھے بیوی کی سخت ضرورت محسوس ہوتی۔ تنور میں سے نکلی گرم گرم روٹی کی طرح میں تپ جاتا لیکن جب میں شراب کی مہک کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا تو بیوی اور بچے کو دور دوسرے پلنگ پر سوتا ہوا پاتا۔ میں بیوی کو جگانے کے لیے اس کے پاس تو جاتا لیکن جگانے کی ہمت نہیں جٹا پاتا۔ اصل میں ایک بار جب میں گرم گرم، سیکس سے سنسناتا ہوا، شراب کی وجہ سے لڑکھڑاتا ہوا سوتی ہوئی بیوی کے پاس پہنچا اور اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مجھے غصے سے دیکھا۔ میں نے اسے اپنے پلنگ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا لیکن بیوی نے سختی سے کہا۔ 'نہیں۔' اور بچے کو لپٹا کر سو گئی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ 'اری چل'۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میری بیوی نے دونوں ہاتھوں سے جو زور سے دھکا دیا تو میں لڑکھڑا کر اپنے پلنگ پر جا گرا۔ نشہ ہرن ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں سے کسی نے ہمت نکال لی ہو۔ جیسے بند شیشی میں سے انجکشن سیرنج کے ذریعہ دوا نکال کر شیشی خالی کردی جاتی ہے۔ میں جیسے تیسے کر کے اٹھ بیٹھا۔ مگر دونوں ہاتھوں سے پلنگ کی پٹی پکڑے ایسا بیٹھا رہا جیسے بوڑھا گدھ سوکھی شاخ پر مونڈھا اٹھائے اڑنے کی ہمت جٹاتا ہے۔ اسی وجہ سے اب جب بھی میں بلیو فلموں کے ننگے سین آنکھوں میں لیے جسم گرمائے جب گھر میں داخل ہوتا ہوں تو بس بیوی کو للچاتی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔

کبھی کبھار تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنی موجودہ حالت پر سوچنے کا موقعہ ملتا ہے۔ وہ بھی صبح کے وقت۔ صبح جب سو کر اٹھتا ہوں تو ایک دو پیگ لے کر ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے جاتا ہوں لیکن جس رات صبح کے لیے میں شراب نہیں لاتا تو صبح میرا جسم بہت ٹوٹنے لگتا ہے۔ آلکسی میں پلنگ کی پٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھا رہتا ہوں۔ اس وقت مجھے بیوی اور بچہ یاد آتے ہیں۔ ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو کبھی کے اسکول جا چکے ہوتے ہیں۔ بے سکت جسم میں صرف دماغ ہی کچھ فعال رہتا ہے جس طرح ٹھنڈ سے اکڑے سانپ کے جسم میں صرف زبان ہی فعال رہتی ہے۔ مجھے اپنی موجودہ زندگی، ایک بڑے گندے نالے کی طرح بہت دھیرے دھیرے بہتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جس کی سطح پر سووروں، کتوں کی پھولی ہوئی لاشیں، ٹوٹے پھوٹے جوتے، ٹوکرے بہت آہستہ آہستہ، نہیں کے برابر بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا کہ لوگ میری عزت اب پہلے کی طرح کیوں نہیں کرتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لوگوں نے میرا سوشل بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ کبھی مجھے یہ خیال آتا کہ جیسے میں ایک بے غیرت کتا ہوں جسے ہر جگہ سے دھتکار مل رہی ہے۔ کبھی سوچتا کہ میں اپنے سماج میں ایک معزز شخص سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اپنے معاملات سلجھوانے کے لیے میرے پاس آتے تھے۔ میری باتیں غور سے سنتے تھے اور سمجھوتے کے لیے راضی ہوتے تھے۔ کسی بھی تقریب میں مجھے عزت سے بلایا جاتا تھا۔ تقریب میں جب پہنچتا تھا تو سماج کے لوگ میرا استقبال بہت خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ لیکن جب سے اپنی تفریحات اور شوق میں مشغول ہوا ہوں نہ تو میرا سماج کے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ کہیں اگر اتفاق سے ان سے ملاقات ہو بھی جائے تو وہ مجھ سے ایسے کٹ جاتے ہیں جیسے لوگ اس شرابی سے کٹ جاتے ہیں جو شراب کے لیے پیسے ادھار مانگتا ہے۔

سوشل ورکر میں اب بھی تھا لیکن صرف لیٹر پیڈ کی حد تک کیونکہ اب لوگوں نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتر میں پچھلے سال کی سینیئر ٹی لسٹ میں میرا نمبر تیسرا تھا مجھے امید تھی کہ اگلے سال یقیناً مجھے

ترقی مل جائے گی لیکن جب فہرست نکلی تو میرا نام غائب تھا۔ مجھ سے نیچے کے لوگوں کا پروموشن ہو گیا تھا۔ میں غصے میں بھنبھناتا ہوا اعلا افسر کے پاس پہنچا۔ اعلا افسر نے میری سروس بک منگا کر میرے سامنے رکھ دی۔ جگہ جگہ لال عبارتیں درج تھیں۔ شکایتیں بجا تھیں۔ کیا کہتا؟

باس کے دفتر سے جب باہر نکلا تو مجھے ایسا احساس ہوا جیسے مجھ سے جونیئر لوگ جو اب ترقی پا گئے تھے مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ میں تلملا گیا۔ غصے میں بھر گیا آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی دفتر سے نکل آیا اور بار میں پہنچ گیا۔ جیسے جیسے نشہ بڑھتا گیا اپنی بے عزتی کا خیال شدت سے کچوکے دینے لگا اسی غصے میں صبح کے لیے شراب لانا یاد نہیں رہا۔ گھر آیا تو اپنا ٹینشن بیوی کے جسم کے ذریعہ ہلکا کرنا چاہا لیکن بیوی کو جگانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ گھر اور گھر سے باہر اپنی بے عزتی اور بے وقعتی پر دیر تک کڑھتا رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا کمرے میں بھرا ہوا تھا۔ پھر سونا چاہا تو کمرے میں کسی کی موجودگی نے کروٹ لے کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میری بیوی اسکول جانے کے لیے ساڑھی باندھ رہی تھی کسے ہوئے بلاؤز میں ابھرا ہوا بدن میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ گورا پیٹ گندھے ہوئے گیہوں کے آٹے کی طرح خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ ناف، اس کے گورے گورے بھرے پیٹ پر بہت دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے خوبصورت چہرے پر جھومر۔ زیر ناف ساڑھی کی تہیں جمانے کے لیے جب وہ سانس کھینچ کر پیٹ بھینچتی تو سینا اور ابھر جاتا پھر جب سانس چھوڑتی تو ابھرے پیٹ کی چکنی جلد اور چمک اٹھتی۔ میں بھوکی نظروں سے بیوی کو دیکھنے لگا مگر اپنے میں اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکا کہ ساڑھی باندھتی بیوی کو لپک کر گود میں بھر لوں یا اپنے پلنگ پر کھینچ لوں۔ بس دیکھتا ہی رہا۔ میری بیوی ساڑھی باندھ کر جیسے ہی پلنگ کے پاس سے گذری میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچا۔ بیوی نے غصے سے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ جھٹک دیا پھر دیوار پر سے ٹنگا

پرس لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے سرہانے رکھی ؟ طرف بنا دیکھے ہاتھ بڑھایا لیکن جب مطلوب چیز ہاتھ نہیں لگی تو پا دیکھا۔ بوتل نہیں تھی۔ میں نے دماغ پر زور دیا۔ رات کو لایا ہی کہ مجھے جھونجھل آگئی یہ سوچ کر کہ شراب نہیں ہے میرا بدن اور تیز ٹوٹنے لگا۔ میرا دھیان پھر بیوی کی طرف گیا۔ اپنی بے عزتی کے سے میں اور بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ناچار گالیاں بک کر رہ گیا۔

اچانک میرا بیٹا کمرے میں داخل ہوا اور بستہ اٹھا کر جانے لگا۔

"ارے یہاں آرے" میں نے بیٹے کو آواز دی۔ میری آواز سن چونکا اور پھرتی سے کمرے سے نکلنا چاہا میں نے جلدی سے اس کا ہا لیا اور اپنی طرف کھینچنے لگا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگانے ا

"چھوڑو میرا ہاتھ" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے بھی غصہ آگیا "حرامی۔ مجھ سے بھاگتا ہے کیا میں تیرا باپ ہوں؟"

"ہاں تم میرے باپ نہیں ہو۔" اس کے لہجے میں پختگی تھی۔

"میں تیرا باپ نہیں ہوں تو پھر کون ہوں؟" میں غصے سے پھنکا ایک چانٹا اس کے گال پر دھر دیا۔

اس نے مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور تھوک نگلتے ہو۔ "باپ کوئی ایسے ہوتے ہیں؟ چھوڑو میرا ہاتھ" مجھے ایسا محسوس ہ میرے بیٹے نے نفرت کا تھوک نگلا نہیں ہے بلکہ میرے منہ پر تھو ہے۔ میری نظریں جھک گئیں۔ رہی سہی طاقت بھی جاتی رہی۔ شکنجہ ڈھیلا ہوتے ہی اس نے اپنا ہاتھ کھینچا اور بھاگ نکلا۔

میں کچھ دیر تک مرجھائے پتے کی طرح گردن لٹکائے ایک دم مجھے اپنا جنازہ یاد آیا۔ میں جلدی سے اٹھا اور لپک کر گھ دروازے سے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا میرا جنازہ گلی کے موڑ پر ہی میں تیزی سے دوڑا اور اپنے جنازے کو اپنے کندھوں پر لے لیا۔ مجھ اپنا جنازہ بہت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ OO



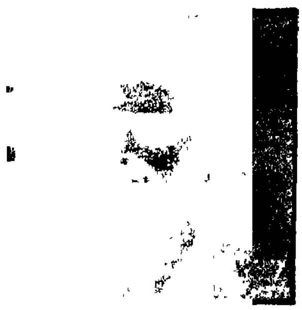
احمد محفوظ

نظم

رات کا پچھلا پہر ہے
خواب کی کالی لکیر
آج پھر اک دم سمٹ کر
میری ان آنکھوں کی ویرانی میں
خود کو جذب کرنا چاہتی ہے
میں ابھی تک جاگتا ہوں
رات کتنی مہرباں ہے
آج میرے ساتھ وہ بھی جاگتی ہے

لیکن اب یہ نبض بیداری
کہ ڈوبا چاہتی ہے
آنکھ بوجھل ہو رہی ہے
کاش وہ اب خواب صورت ہی
مری آنکھوں کے رستے
مجھ میں آجائے
تو پھر میں ایک لمبی نیند سو جاؤں

● Urdu Department, A.M U
Aligarh - 202001 (U.P)



صبیحہ صبا

موسم نئے پھولوں کی جب شال بدلتے ہیں
دھڑکن میں چھپے نغمے سُر تال بدلتے ہیں

چاند اور ستاروں کے اثرات خدا جانے
کیا جانئے کب دل کے احوال بدلتے ہیں

موسم یہ اداسی کا برسوں سے نہیں بدلا
ویسے تو سبھی موسم ہر سال بدلتے ہیں

منظر کئی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے رہتے ہیں
ماضی کی طرح ان کو کب حال بدلتے ہیں

سو رنگ میں زندہ ہیں جذبات مروّت کے
انسان کے یہ جذبے اشکال بدلتے ہیں

اک خوئے محبت پر قائم ہیں صبا ہم تو
اک وہ ہیں کہ ہر لحظہ اعمال بدلتے ہیں

● P. O. Box 256137,
Abudahabi (U.A.E.)



ترنم ریاض

ماہیے

گئی رت کی کہانی ہے
سوکھی پتیوں میں
اک یاد پرانی ہے

○

یوں رہتے ہیں چپ چاپ
مطلب ہو تو لوگ
رکھتے ہیں میل ملاپ

○

ہائے برہنہ سہہ پاؤں
آنسو کی طرح
تیری یاد میں بہہ جاؤں

○

بس اور عذاب نہیں
اب زخمی دل کو
اک غم کی بھی تاب نہیں

○

دونینوں میں تو بستا
اچھا لگے دل کو
تکتے رہنا رستا

○

جس دن بارش برسے
پاس مرے رہنا
جانا نہیں گھر سے

● C - 11, Jangpura Extn,
.New Delhi - 110014

سید محمود ہاشمی
44 - Hob Moor Road, Birmingham
B10 9BU (U.K.)



ذکر لندن کے شاعروں کا

نہ جانے اردو کے پہلے شاعر ولی دکنی نے اپنا پہلا شعر کیسی بابرکت ساعت میں کہا تھا کہ اردو شاعری ہمیشہ زرخیز رہی۔ اردو جاننے والوں میں اتنے شاعر پیدا ہوئے کہ شمار میں نہ رہے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ رہی کہ اردو ادب کی کسی تاریخ میں اتنی گنجائش ہی نہ ہوئی کہ سب کا ذکر کر سکے۔ مشاعروں کی بنیاد پڑی تو شاعری پر اور رنگ چڑھا۔ شاعروں کی ایک ایسی نسل بھی پیدا ہوئی۔ جن کو مقامی شعراء کہا گیا۔ واہ ملے یا بیداد، ان کا سب سے بڑا اعزاز یہی ہوتا ہے کہ وہ مشاعرہ کے اسٹیج کو بڑے شاعروں کے لئے "ہموار" کریں، سب سے پہلے آئیں، اپنے شعر سنائیں اور مشاعروں کو "چالو" کردیں۔ "ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے" کی صورت یہ بڑے شاعروں کے لئے جیتے ہیں۔

برطانیہ میں تمام شاعر اپنا "مقام" چھوڑ کر آئے ہیں۔ کوئی کراچی یا حیدرآباد سے آیا ہے۔ کوئی حیدرآباد دکن یا دلی سے آیا ہے۔ کوئی لاہور یا گوجرانوالہ سے یہاں پہنچا ہے۔ اور کسی نے اسلام آباد یا راولپنڈی، پشاور یا نوشہرہ سے اپنا مقام چھوڑا۔ اور برطانیہ کے کسی شہر میں ٹھکانہ کیا۔ اب برطانیہ میں کوئی "مقامی شاعر" نہیں۔ ہر شاعر بڑا ہے۔ اس لنکا میں ہر ایک باون گز کا ہے۔

یہاں مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ اور بڑے دھڑلے سے ہوتے ہیں۔ لندن بہت بڑا شہر ہے۔ اس لیے یہاں کے کسی نہ کسی علاقے میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی مشاعرہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی مشاعرہ ہماری زندگی کا معمول بنتا جارہا ہے۔ جب سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ یہاں کی حکومت تہذیبی سرگرمیوں کے لیے گرانٹ دیتی ہے ہم اس بات کے اور بھی زیادہ قائل ہوگئے ہیں کہ مشاعرہ ہماری تہذیبی زندگی کا ایک لازمی و بے حد لازمی جزو ہے۔

شروع شروع میں ہم میں سے کچھ پڑھے لکھے اپنے اپنے شہر کی مقامی کونسل میں کونسلر بنے اور لارڈ میئر تک کا اعزاز حاصل کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ نیم تعلیم یافتہ لوگ بھی انگریزی بولنے کی مشق کرتے کرتے اس میدان میں کود پڑے کہ اس طرح اپنوں اور بیگانوں میں نام اونچا ہوتا تھا۔ عزت ہوتی تھی۔ جب مشاعروں کی دھوم مچی۔ اور مشاعروں کے اسٹیج پر شاعروں کی واہواہ ہوئی تو سماجی مرتبہ بلند کرنے کا جیسے ایک اور دروازہ کھل گیا۔ شاعروں کے قریب جاکر اور مشاعرے سن سن کر بعض ایسے لوگ بھی شاعر بن گئے جو اس سے پہلے اردو میں صرف خط و کتابت کی شد بد رکھتے تھے۔ ان میں ایک عجیب طرح کی خوداعتمادی پیدا ہوئی۔ اور بہتوں کو احساس ہونے لگا کہ اگر فلاں شخص شاعر بن سکتا ہے تو یہ کاریگری میں بھی دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ ہر نئے مشاعرے میں نئے نئے شاعر دکھائی دینے لگے۔ اور بقول شخصے اب یہ حال ہے کہ مشاعرہ کے ہال میں بعض اوقات سامعین سے زیادہ شاعروں کی تعداد ہوتی ہے۔

ان نئے شاعروں میں سے بعض کی شاعری کا ایک منبع وہ غزلیں ہوتی ہیں جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے رسالوں میں وقتاً فوقتاً چھپی تھیں۔ ان کے لکھنے والے غیر معروف تھے اور غیر معروف ہی رہے۔ اب بھی وہ خود تو غیر معروف ہی ہیں لیکن ان کا کلام "حیات نو" پارہا ہے۔ دنیا میں کسی کا اچھا کام (اور کلام) کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ وہ غزلیں اب ہمارے نئے شاعروں کے کام آرہی ہیں۔ بعض پرانے شاعروں کے دیوان بھی ہمارے کچھ نئے شاعروں کے لئے بڑے مفید ثابت ہورہے ہیں۔ ان کے اشعار کو اپناتے وقت حسب مقدور ان میں "اصلاح" کرلی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اگر کہیں شعر کا وزن گر جائے یا کسی مصرع میں سکتہ پڑے تو پڑتا رہے۔ نئے شاعر اگر ترنم سے پڑھنے والے ہوں تو اس طرح کی "باریکیوں" پر ترنم پردہ ڈال دیتا ہے۔ بعض پڑھتے وقت الفاظ کا تلفظ اس طرح کرتے ہیں کہ اچھے خاصے شعر بھی ڈگمگانے لگتے ہیں لیکن جیسا کہ اس طرح کے شاعر نے کہا تھا۔ صاحب ہر شخص فیض اور حبیب جالب تو ہو نہیں سکتا۔ یہ ہمارا شوق ہے کسی کے شوق پر پابندی نہ لگایئے اور یہ مت بھولیے کہ انگلینڈ فری کنٹری ہے یہاں پاکستان کا مارشل لا نہیں چلتا......"

اس طرح کے شاعروں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ

مشاعرے کے آخر میں سکہ بند شاعروں کی باری آتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کرائے پر لیے ہوئے ہال کے منتظمین ہال کی بتیاں بجھانے اور کرسیاں اٹھانے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اس طرح کی باتیں اب عام ہونے لگی ہیں کہ مشاعروں میں شاعروں کو اسٹیج پر بلانے کی روایتی ترتیب بدل دی جائے اور بڑے شاعروں کو آخر میں بلانے کے بجائے پہلے بلایا جائے۔

یہاں شاعروں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اکثر تقریبات میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے تقریب کے آخر میں مشاعرے کا انعقاد انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور تو اور اب خالص مذہبی اور تدریسی تقریبات میں بھی مشاعرہ بار پانے لگا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا بریڈ فورڈ کی تنظیم "چشم خیال" نے عرس اولیائے کرام کا اہتمام کیا تو پروگرام کا ایک جزو مشاعرہ بھی تھا۔ اسی طرح بریڈ فورڈ ہی کے ایک اسکول نے "والدین کی شام" (Parent's Evening) کو اپنے ہاں ایک مشاعرے کا بھی اعلان کیا تو تیر نشانے پر بیٹھا۔ ایشیائی والدین جن کے بارے میں مقامی اسکولوں کو عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اس شام کو مناسب اہمیت نہیں دیتے جوق در جوق وہاں پہنچے اور مشاعرے سے پہلے ٹیچرز سے ملنے اور اپنے بچے کی تعلیمی کارکردگی پر تبادلہ خیال کرنے کے فریضے سے بھی عہدہ برآ ہوئے۔ مشاعروں کی مقبولیت کا کیا راز ہے؟

اس کی شاید ایک وجہ وہ بھی ہے جو مجھے ایک نوجوان کے ذریعے معلوم ہوئی۔ کچھ عرصہ ہوا میرے گاؤں کا ایک نوجوان مجھ سے ملنے آیا، مجھے گھر میں اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر کہنے لگا "انکل! آپ یہاں بیٹھے ہیں اور شہر میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔" وہ نوجوان اردو بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس کے والدین اسے چھوٹی عمر میں ہی گاؤں سے یہاں لے آئے تھے۔ وہ یہیں پلا بڑھا تھا، یہیں پڑھا تھا۔ مشاعرے میں اس کی دلچسپی پر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں مشاعرے میں کب سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے؟ کیا اردو سمجھ لیتے ہو؟"

وہ ہنسا اور بولا۔ "میں نے آج تک کوئی مشاعرہ نہیں چھوڑا۔ سچ بڑا مزہ آتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم اردو شعر سمجھ لیتے ہو؟"

وہ پھر ہنسا۔ "میں شعر سننے تھوڑے جاتا ہوں، میں تو شاعروں کو دیکھنے جاتا ہوں۔ سچ! بڑا مزہ آتا ہے۔"

پھر میری حیرانی کو دور کرتے ہوئے بولا۔ "انکل۔ آپ تو جانتے ہوں گے ایک لفظ ہوتا ہے مکرر۔ جب کوئی شاعر شعر سنا رہا ہو اور اونچی آواز میں اس کی طرف دیکھ کر "مکرر" کہہ دیا جائے تو وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کرتا ہے، جھکتا ہے اور ناچ ناچ کر شعر سناتا ہے۔ بس میں تو یہی دیکھنے جاتا ہوں۔ سچ۔ بڑا مزہ آتا ہے۔"

پھر کہنے لگا۔ "میں اپنے ساتھ کبھی کبھی کسی دوست کو بھی یہ تماشا دکھانے لے جاتا ہوں۔ ہم باری باری "مکرر" کہتے ہیں اور شاعر کو دیکھ دیکھ کر خوب ہنستے ہیں۔"

یہاں شاعروں کے کلام کے مجموعے بھی چھپتے ہیں جن میں دیباچے اور فلیپ کی اس قدر گھما گھمی ہوتی ہے کہ بسا اوقات کتاب کا اصل متن پس منظر میں جا گرتا ہے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات بڑے دھوم دھڑکے سے ہوتی ہیں۔ ان تقریبات میں دعوت (کام و دہن) کا بھی پورا پورا سامان ہوتا ہے۔ صاحب یا صاحبہ کتاب کی مدح میں مضمون پڑھے جاتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں۔ کتاب میں شامل دیباچوں اور تقریبات رونمائی کے دوران پڑھے جانے والے مضامین کے بعد نہ وہ کتاب آسانی سے کسی کتابوں کی دکان سے ملتی ہے، نہ اس پر بعد میں کہیں کوئی تنقید یا تبصرہ ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھار برسر راہے کسی مضمون یا کسی ادیب یا ادیبہ کے کسی اخباری انٹرویو میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ اظہار خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں تنقید نہیں لکھی جا رہی کوئی نقاد پیدا نہیں ہو رہا۔ اور یہ کہتے ہوئے کوئی اس طرف دھیان نہیں دیتا کہ کتابوں کی رونمائی نے تعریف و تحسین کی جو فضا پیدا کر رکھی ہے اس میں سنجیدہ تنقید کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ اور کسی کو کیا پڑی ہے کہ مصنف اور اس کے مدح سراؤں کے اس نقار خانے میں خواہ مخواہ طوطی کی آواز بنے! یوں بھی لکھنے والے کو اپنی کتاب کی رونمائی کے دوران اتنی داد مل جاتی ہے کہ اسے مزید داد کی کوئی طلب نہیں رہتی۔ اکثر کو اپنی کتاب پر "ایوارڈ" بھی ملتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ایوارڈ کسی جانے پہچانے مستند ادارے نے دیے ہوں۔ بعض ادارے کسی مخصوص شاعر کو ایوارڈ دینے کے لیے ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ایوارڈ دینے کے بعد ادبی منظر نامے سے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے ان کے قیام کا مقصد صرف وہ ایوارڈ دینا ہی تھا۔ جب ان کا کام ختم ہوا تو وہ بھی میدان سے غائب ہو گئے۔

اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا!

رونمائی کی تقریب پر کتاب بھی بکتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر صرف اس تقریب ہی پر کتاب بکتی ہے۔ کتنی بکتی ہے؟... اس کا انحصار عام طور پر کتاب لکھنے والے کے ذاتی تعلقات پر ہوتا ہے۔ اس موقع پر "معاونین" اور "مواحقین" قسم کے کچھ لوگ بھی "سیلز مین شپ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہال کے دروازے کے باہر ایک میز پر کتابوں کا انبار پھیلا ہوتا ہے اور اس کے ارد گرد کھڑے کچھ لوگ ہر آنے والے کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ "صاحب! یہاں سے کتاب لے لیجئے۔ ہال میں سب

کے ہاتھ میں کتاب ہے، کتاب کے بغیر اچھے نہیں لگیں گے۔" اور لوگ کتاب خرید کر اور اس پر مصنف یا مصنفہ کے دستخط کروا کے کتاب ہاتھ میں لیے خراماں خراماں ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ بعض اس "پل صراط" سے گزرتے ہوئے اپنا دس پونڈ کا نوٹ بچا بھی لیتے ہیں اور عین کتابوں کی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے کسی جان پہچان والے سے اس طرح ملتے ہیں جیسے برسوں کے بعد مل رہے ہوں۔ "اخاہ! آپ ہیں۔" کہتے ہوئے ان سے مصافحہ کرتے اور بغل گیر ہوتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ تیر ہمیشہ نشانے پر بیٹھے۔ ہال کے اندر جا کر بھی اس امر کا امکان رہتا ہے کہ ان کا ہاتھ کتاب سے خالی دیکھ کر کوئی اپنی پھرتی دکھائے، لپک کر ان کے پاس پہنچے اور "ارے۔ آپ کو کتاب نہیں ملی" کہہ کر جیسے ان کی مدد کرنے کے لیے بے تاب ہو، ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ انہیں ہال کے دروازے کے باہر لے جائے۔ جہاں اب تک بچا ہوا نوٹ ان کی جیب سے نکل جائے اور کتاب ان کے ہاتھ پر آ چپکے۔

بعض خوش نصیب مصنفین کی کتاب کی رونمائی کی تقریبات مختلف شہروں میں بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مصنف صرف کتاب چھاپنا ہی نہ جانتا ہو بلکہ دوسرے کاروبار دنیا میں بھی طاق ہو، فعال ہو، لوگوں سے میل ملاپ رکھنے کے آداب سے واقف ہو اور بھاگ دوڑ کر سکتا ہو، ورنہ بازی الٹ سکتی ہے۔

ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ ایک شاعر صاحب کے ہاں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی شاعری کی کتاب جو آٹھ دس برس پہلے چھپی تھی، ان کے مکان کے دو کمروں میں بڑی نفاست سے رکھی تھی اور کمروں کی زینت کو دوبالا کر رہی تھی۔ شاعر صاحب نے انہیں چائے پلائی اور کتاب کا ایک نسخہ ان کی نذر کیا۔ قیمت دینی چاہی تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ "ابھی رہنے دیجئے۔ کچھ عرصے سے میں نے اسے بیچنا بند کر دیا ہے اب اہل ذوق کے لیے یہ تحفۂ شاعر ہے۔" ان صاحب نے بتایا کہ وہ شاعر صاحب سے پوچھنا چاہتے تھے کہ ان کی نئی کتاب کب چھپ رہی ہے لیکن انہیں جرأت نہ ہوئی۔ تاہم کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولے۔ "تین چار اور مجموعے تیار ہیں۔ اس پہلی کتاب کی نکاسی ہو لے تو اس بارے میں سوچوں گا۔ بیگم انہیں گھر میں دیکھتی ہیں تو ان کا پارہ خواہ مخواہ چڑھ جاتا ہے۔"

پاکستان کی طرح یہاں بھی اب یہ روایت عام ہوتی جا رہی ہے کہ مصنف اپنی کتاب خود چھاپے اور اپنا پبلشر خود بنے۔ مصنفین اپنی کتاب کی لکھائی چھپائی پر خوب خرچ کرتے ہیں۔ کتابیں آرٹ پیپر پر چھاپتے اور دل کے ارمان جی بھر کے نکالتے ہیں۔ کتابیں اتنی بھاری ہوتی ہیں کہ ان کا مطالعہ کرنے کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے موٹے موٹے ورق سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ دیباچوں کی کثرت ہوتی ہے اور تعارفی فلیپ ان پر مستزاد۔

یہ ہیں ہمارے لندن کے شعرا اور ان کا حال احوال۔ OO

بقیہ صفحہ ۴۵ : مکتوبات

کلیم اختر ——————

ماہنامہ "شاعر" کی تعریف و توصیف میں جو کچھ لکھا جائے کم ہے۔ اگست ۱۹۹۹ء کا تازہ شمارہ بلاشبہ قابل تحسین اور خصوصیت کا حامل اس لئے بھی ہے کہ مشمولات میں ایک مقناطیسی کشش ہے۔ مظہر امام کا مضمون "تخلیقی فنکار کی بحالی" کے حوالے سے نئی نسل کے فنکاروں کی بحالی اور قدر و قیمت اور ان کے درجہ اعتبار سے متعلق ایک اچھی گفتگو بھی ہے اور نہیں بھی۔ بے شک "مابعد جدیدیت" کے تصور اور اس کی فلسفیانہ اساس پر گفتگو ہوتی رہنی چاہیے۔" لیکن یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا تامل ہے کہ "ان سے توقع رکھنا کہ وہ نئے سے نئے لکھنے والے کی تحریر توجہ سے پڑھیں اور ان پر اظہار خیال کریں زیادتی ہے۔" زیادتی نہیں بلکہ فنکار کے ساتھ ناانصافی ہے، بے ایمانی ہے۔ دوسری بات کہ "وہ اپنا کام کر چکے"۔ یہ بات بھی حلق سے نیچے نہیں اترتی ہے کہ جب تک سانس چلتی رہتی ہے تب تک ہر فنکار یا ناقد کچھ نہ کچھ کام کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک پڑھنے لکھنے سے تعلق ہے تو ادب سے ذرا سا بھی ذوق رکھنے والا فنکار آخری دم تک کچھ نہ کچھ پڑھتا لکھتا ہی ہے۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر اپنی کتاب پر تبصرہ لکھوانے یا کم از کم تفصیلی اظہار خیال کرنے کے لئے کسی ناقد کے پاس کچھ بھیجتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اس ناقد کو درجہ اعتبار جانا۔ جو اس ناقد کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے۔ ورنہ آج نئی نسل کے فنکار اور آئندہ ہونے والے بھی نئی نسل کے فنکار کسی ناقد کو منہ لگانا چھوڑ دیں تو پھر وہ کہاں نظر آئیں گے؟ سچ تو یہ ہے کہ ادیب یا شاعر ہی ناقد کو جنم دیتا ہے۔ یوں کہئے کہ ناقد ادیب و شاعر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ آج بھی غالب اور اقبال پر کم و بیش، کچھ نہ کچھ لکھا ہی جا رہا ہے۔ ان پر لکھنے والے فنکار یا ناقد اپنی تحریروں کے اوائل میں نئی نسل کے ہی کہلاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ "وہ اپنا کام کر چکے" بے بنیاد اور بے اثر ہے۔ کوئی فنکار یا ناقد مبتدی ہو یا منتہی۔ دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں، لازم و ملزوم ہیں۔ اس بات ماننے میں قباحت کیا۔ لہٰذا میری ذاتی رائے ہے Genuine فنکار ہیں ان پر Genuine ناقدین کو کچھ ضرور لکھنا چاہیے۔ خواہ وہ نئی نسل اور خلاق ذہن فنکار ہوں یا پرانی نسل کے فنکار۔ ورنہ فنکار کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور اردو ادب کے ساتھ بھی۔

مظہر امام صاحب کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ رپورٹوں میں شاعروں کا نام نہیں آتا جنہوں نے کلام پیش کیا بلکہ کسی سیاسی آدمی کی جاہلانہ تقریر کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ بہرحال زیر نظر مضمون ایک کامیاب اور خوبصورت ایک اچھا مضمون ہے۔ جس سے نئی نسل کے فنکاروں کو بیدار کرنے اور ان کی قدر و منزلت متعین کرنے کی اچھی کوشش ملتی ہے۔ بہرکیف شاعر کا زیر نظر شمارہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

Laheria Tola, Gaya - 823001 (Bihar)



صابر فخرالدین

دوستی کو رواج دینا ہے　　دشمنی کا خراج دینا ہے
ہیں جو پسماندہ ایسے لوگوں کو　　ایک اچھا سماج دینا ہے
وہ جو ممتاز ہیں زمانے میں　　ان کو تحفے میں تاج دینا ہے
اپنے مقصد میں جاں کا نذرانہ　　کل نہیں ہم کو آج دینا ہے
ہم اگائیں گے اب وہ دھرتی پر　　جن کو سستا اناج دینا ہے

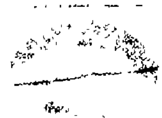
Opp Police Qrts, Main Rd, Yadgir - 585201 (Karnatak)



قاضی رئیس

اے زندگی تیرے سانچے میں کس کو ڈھلنا تھا　　وجود اپنا ہمیں خاک میں بدلنا تھا
یہ اور بات ہے کس طرح خار جاں نکلا　　چلو کہ جان تو چھوٹی اسے نکلنا تھا
خزینہ روح کا کب تک چھپائے پھرتا وہ　　بدن کے سانپ کو یہ لعل تو اگلنا تھا
رہِ حیات میں تھا جان کا زیاں لیکن　　سفر میں سانس کے قیدی کو ساتھ چلنا تھا
بقا کی چاہ میں قاضی یہ بھول بیٹھے سب　　کہ آرزو کا مقدر تو ہاتھ ملنا تھا

Basera - 91, 15th Gali, Ban Colony, Aurangabad. (M.S)



بدر نظیری

ہمارے دوست کے سر میں وہ سودائے درم کیا تھا　　جو دیکھا مڑ کے اس کو پیر تسمہ پاسے کم کیا تھا
بہت خوش رنگ تصویروں میں تھے وہ نقرئی چہرے　　مگر ان خارہ پشتوں کی صدا کیا تھی، قدم کیا تھا
سجے تھے اس کے سارے جسم پر تیر و سناں خنجر　　مگر ہاتھوں میں لہراتا ہوا مثلِ علم کیا تھا
نہایت بردباری سے وہ اپنی بات کہتا تھا　　مگر چہرے پہ رنگوں کا بدلنا دم بدم کیا تھا
مظالم کے چھپے تھے اس کے دل میں کتنے منصوبے　　بظاہر اس کی پیشانی پہ وہ نقشِ کرم کیا تھا

Shama Gnrl Store, Ghaffor Manzil, Jamia Nagar, N.Delhi

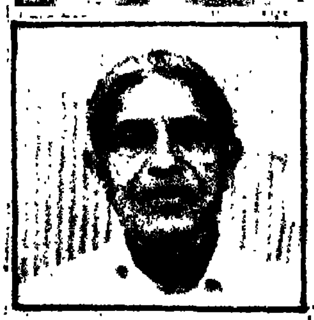


ایشور دت انجم

تکتی رہتی ہیں سوئے در آنکھیں　　یوں بھی کرتی ہیں شب بسر آنکھیں
آنکھ سے وہ نظر نہیں آتا　　دیکھنا ہے تو بند کر آنکھیں
وہ تو رہتا ہے میرے دل میں جسے　　ڈھونڈتی ہیں ادھر ادھر آنکھیں
وقتِ رخصت نمی سی آنکھوں میں　　لوحِ دل پر ہیں نقش تر آنکھیں
کس کو اب دیکھتی ہیں اے انجم　　کل زمانے سے بے خبر آنکھیں

A7/78, Motinagar, New Delhi - 110015





شکیل رحمانی

اس سے بڑھ کر بھی ستم ہوگا کیا؟　　چہرہ اخبار سے کم ہوگا کیا ؟
نہ پرکھنا یہاں فن کا کردار　　بک گیا جو وہ قلم ہوگا کیا ؟
دے گی شہر کی ویرانی سبق　　گھر ترا باغ ارم ہوگا کیا ؟
منحرف پہلے بھی تھا اب بھی ہوں میں　　سوچ لے سر مرا خم ہوگا کیا ؟
اہل باطل کے خدا بننے تک　　سر کوئی اور قلم ہوگا کیا ؟

189 - Chauraha Amdu Khan, Najibabad (U.P.)



نفیس تقی

ایک اک لفظ میں اثر باندھا   فکر و معنی سے جب ہنر باندھا
کھل گئے بادبان کشتی کے   اور پتوار نے سفر باندھا
باغ میں ہم نے کی قلم کاری   شاخ سے مژدۂ ثمر باندھا
ہر پرندے نے اپنے دامن میں   آسماں بس اڑان بھر باندھا
جس کی تعبیر ہی نہ ممکن تھی   ہم نے وہ خواب آنکھ پر باندھا

Moh Talia, Sironj - 464328 (M.P.)



ناصر مجیبی

کیا کروں کیسے فضاؤں میں یہ سب دے جاؤں   دے دوں حرفوں کو زباں خامہ کو لب دے جاؤں
دوں ہر اک زخم کو اب قوتِ گویائی بھی !   اور دنیا کے ہر اک غم کو لقب دے جاؤں
زندگی دھول اڑاتی ہوئی صحرا سی ہے   چاہتا ہوں کہ طراوت کا سبب دے جاؤں
رات بھیگے تو ذرا آنکھ بھی نم ہو جائے   خیرہ نظروں کو کوئی ایسی بھی شب دے جاؤں
جب نئی نسل زباں اور ادب بھول گئی   کس کے ہاتھوں میں یہ تقدیسِ ادب دے جاؤں

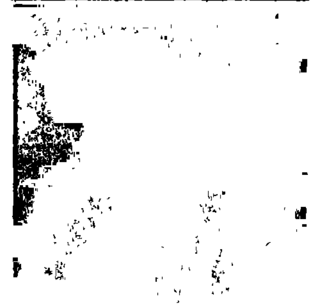
Gaddi Moh Meena Bazar Dhanbad - 836001 (Bihar)



انجم بارہ بنکوی

ختم ہو گی تنگ دستی فاقہ مستی ایک دن   جتے جتے ہی بسے گی گھر گرہستی ایک دن
ان خزاں آثار لمحوں سے شکایت کس لئے   موسم گل نے بھی کی تھی سرپرستی ایک دن
دل کی خودداری نے اس دنیا کو ٹھوکر مار دی   ورنہ یہ ناگن مرے دل کو ہی ڈستی ایک دن
پھر صدائے العطش گونجے گی سارے شہر میں   خوں رلائے گی تیری دریا پرستی ایک دن
ہاں کبھی اس روشنی میں گفتگو ہو ایک رات   رزق مٹی کا بنے گی سب کی ہستی ایک دن

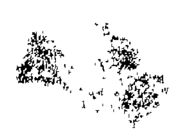
28 - Mansab Manzil, Karbala Rd, Bhopal (M.P)



فیروز

کوئی سانحہ سانحہ کیوں نہیں   یہاں لوگ اب غمزدہ کیوں نہیں
مسافر تو چلتے ہیں اب بھی مگر   درختوں کا وہ سلسلہ کیوں نہیں
اسے چاہتے ہیں دل و جاں سے ہم   جدائی کا لیکن گلہ کیوں نہیں
کئی ہمسفر مل رہے ہیں ہمیں   سفر کا مگر حوصلہ کیوں نہیں
ہوا کیا کہ فیروز بجھ سے گئے   وہ اگلا سا اب مرحلہ کیوں نہیں

Moh. Amla Patti Motihari (Bihar)



فراق جلال پوری

کبھی اک پل کو بھی فرصت سے نہ بیٹھے گھر میں   سوچتے یہ تھے کہ رولیں گے سکوں سے گھر میں
یاد آتا ہی نہیں دیپ جلائے کب تھے؟   پاؤں کس دن سے خوشی نے نہیں رکھے گھر میں
ایسے بھی مسئلے آتے ہیں اب اکثر اوقات   ہم کہ ہوتے ہوئے گھر بھی نہیں ہوتے گھر میں
بھوت افلاس کا دن بھر تو ڈراتا ہے مجھے   شام آتے ہی چلے آتے ہیں سائے گھر میں
تھی کہاں اتنی کمائی کہ بچا لیتے کچھ ؟   اور برے وقتوں کی خاطر اسے رکھتے گھر میں

Moh. Qazipura, P.O.Jalalpur, Dist Ambedkar Nagar (U.P.)

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اور فوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۷)

صدیقی

آپ کی طرف سے روانہ کیا جانے والا خصوصی
کیا۔ آپ نے واقعی بہت بڑا اور کسی حد تک ناممکن
لھایا ہے اور وہ بھی اتنے ناسازگار حالات میں۔ روایتی
جملوں میں تو اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی ہے۔
ھتے ہوئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اور آپ
ونین نے بڑی سنجیدگی اور بڑے سلیقے سے یہ مہم
ہے۔ سیماب صاحب کے عنوان سے جو حصہ آپ
ب کیا ہے کچھ تشنہ سا محسوس ہوتا ہے مگر اس تشنگی
وہ اس حصے کے مطالعے نے اتنا زیادہ انسپائر کیا کہ
اختیار چل پڑا۔ ان جیسی شخصیت پر میں نے پہلی بار
ا ہے۔ اپنی یہ آرا آپ ہی کو روانہ کر رہا ہوں ممکن
ہے پسند کریں اور اگلے آنے والے حصے میں شامل
آپ سے جو جزوی اختلاف مجھے ہے اس کی نشاندہی
میں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی آرا پر آپ
پھر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ گروہی اور تنظیمی
ں میں ان کے کرتا دھرتاؤں سے جو غلطیاں ہوتی
و اس سماج میں ہوں گی۔ ترقی پسند کرتا دھرتاؤں
ں غلطیاں ہوئی ہیں۔ بہر حال اس کے لئے معذرت
ں اور آپ کے اس اعزاز کا متمنی ہوں جو اس اشاعت
آپ کو ملنا چاہئے۔ نمبر پر بھرپور تبصرہ بھی قلمبند
ناہو منشور میں شائع ہوگا بلکہ طے یہ ہوا ہے کہ آئندہ
ں جلدوں پر بھی جب وہ مل جائیں گی تبصرہ ہوگا۔
ہے کہ یہ تبصرے آپ کے اعزاز کے لئے ناکافی ہوں
تو وہ چیز ہے کہ

ہے تو اور چاہئے وسعت میری زباں کے لئے

ایک مضمون اور اپنا تعارف نامہ بہت پہلے ہی آپ
دیا تھا معلوم ہوتا ہے نہیں ملا کیوں کہ اس نمبر میں تو
ئی ذکر نہیں ہوا ہے۔ یہاں سے ایک صاحب پندرہ
ف، ماہ منظر نامہ نکالتے ہیں یہ ادبی جرنلزم کی ایک
ہے۔ وہ نشر مواد کی تلاش میں میرے پاس آتے ہیں تو
میں ان کو ماہنامہ شاعر کی تخلیقات کے بعض حصے دے دیتا
ہوں جو بشکریہ شاعر وہ Reproduce کرتے ہیں۔ میں
نے ان سے کہا ہے کہ وہ پرچے آپ کو بھی بھیج دیا کریں۔

● 3 - H, 9/A, F C Area, Karachi (Pak)

آپ نے ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل) میں شامل
"آگرہ اسکول" کو دلچسپی سے پڑھا، اسے اہمیت دی اور اس کے
حوالے سے ایک بالکل مختلف نوعیت کا مقالہ لکھا ہے اور
میرے مضمون سے جزوی اختلاف کیا ہے۔ باب آگرہ
اسکول کے مطالعے سے اور لوگوں کو بھی تشنگی کا احساس ہوا
ہے۔ دراصل یہ بہت وسیع موضوع ہے اور پھر یہ کہ علامہ
سیماب کے کار و افکار خود اتنا پھیلاؤ لئے ہوئے ہیں کہ ہر
عنوان ایک کتاب کا عنوان بن سکتا ہے۔ علامہ پر سست رو
تحقیقی کام کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے۔

آپ ہی کی طرح کئی ایک نقاد حضرات مذکورہ باب
سے Inspire ہوئے ہیں اور علامہ پر مقالے لکھ رہے
ہیں۔ علامہ چونکہ ہر عہد کے شاعر ہیں اور زندہ شاعر ہیں
لہٰذا زبانوں زمانوں سفر کرتے رہیں گے۔ جی ہاں! ترقی پسند
کرتا دھرتاؤں سے بہت ساری غلطیاں ہوئی ہیں۔ تعجب
ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنے عہد کے اس نابغہ روزگار
فن کار سے استفادہ کیوں نہیں کیا حالانکہ سیماب کے ہاں وہ
سارا شعری لوازمہ موجود ہے جو ترقی پسندوں کو درکار تھا۔
علامہ کی نظموں کے صرف دو مجموعے "کار امروز" اور
"شعر انقلاب" اور غزلوں کا آخری مجموعہ "لوح محفوظ"
دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر جدیدیوں نے بھی کچھ کم نقصان نہیں
پہنچایا۔ اب بھی ہم عصر اردو ادب نمبر میں شامل "آگرہ
اسکول" سے کئی ایک ذہنوں کو اختلاف ہے بلکہ قبول کرنے
کے لئے آمادہ نہیں۔ کسی علمی و تحقیقی مکالمے کے لیے تیار
نہیں بس وہ عادت ذہنی کا شکار ہیں۔ اب علامہ پر جو تنقیدی
و تحقیقی کام ہو رہا ہے اور کتابیں شائع ہونے والی ہیں، اس
سے عادت ذہنی پر یقینی اثر پڑے گا۔

آپ کا مقالہ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد دوم)
کے بجائے شاعر کے کسی متعاقب شمارے میں شائع کیا جا رہا
ہے تاکہ جو مکالمہ "آگرہ اسکول" کے تحت جاری ہوا ہے،
دوسری جلد تک اسے بہت روشن کیا جا سکے۔ اس موضوع
پر ایک تعارفی کتاب بھی زیر ترتیب ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ آپ ہم عصر اردو ادب نمبر کی
دوسری جلد میں شامل رہیں گے۔ شاعر خاصی بڑی تعداد
میں پاکستان کے اہل قلم حضرات اور سخن فہم قارئین تک
پہنچتا ہے۔ شاعر کے مندرجات وہاں کے اخبارات و
رسائل میں اخذ کئے جاتے ہیں۔ شاعر کے حوالے سے
تخلیقات کی اشاعت پر ادارۂ شاعر کو کوئی اعتراض نہیں ہے
۔ ہم چاہتے بھی یہی ہیں کہ شاعر صرف ادیبوں شاعروں
کے لئے شائع نہیں ہوتا بلکہ ادب کے طلباء اور قارئین کے
لئے بھی ہوتا ہے اور طلباء و قارئین کو بطور خاص ذہن میں
رکھا جاتا ہے۔

ہم عصر اردو ادب نمبر پر آپ کے گرانقدر تفصیلی
تبصرے کا انتظار ہے۔ (الف الف)

شرف کمالی

بحمد اللہ شاعر کا ہم عصر اردو ادب نمبر ملا، تاخیر
ضرور ہوئی لیکن مجھے یقین تھا کہ ادارہ شاعر اسے خوب
صورت اور وقیع انداز میں ضرور پیش کرے گا کیوں کہ ایسے
کارہائے نمایاں انجام دینا خانوادۂ سیماب کا ہمیشہ خاصہ رہا ہے
۔ صحافت کے میدان میں اس سے قبل ایسے کئی معرکے
اعجاز، افتخار اور ناظر نعمان صاحبان کے بزرگوں نے سر کئے ہیں۔
شاعر کا یہ تازہ کارنامہ بہت خوب صورت، بہت جاذب، بہت
شاندار بلکہ سب ایسے اس سے قبل منصہ شہود پر آئے
ہوئے نمبروں سے بہتر ہے کیوں کہ یہاں گذشتہ تجربات
سے بہتر کو بہترین بنانے کا فن آپ کو اللہ تعالیٰ نے بخشا
ہے۔ یہ دو ہالیائی ضخیم نمبر بصورت حال گویا ہے کہ اس کو اس
طرح پیش کرنے میں بڑی محنتیں اور صلاحیتیں صرف ہوئی
ہیں اور یقیناً اس کے لئے صاحبزادگان انجاز صدیقی مرحوم
قابل مبارکباد ہیں کہ اتنا عظیم الشان نمبر ان کی بدولت

ہمارے باعث ہے چنانچہ اب افتخار لو باعث صد افتخار کہا جا[illegible] مجھے اندازہ ہے کہ آپ کی والدہ [illegible] ہو گا کہ یہ خواب حقیقت [illegible] کر منظر عام پر آئے اور اس میں ان کی [illegible] تمنا [illegible] ہے اس لئے ان کی خدمت میں بھی مبا[illegible]

سرسری نظر سے اسے دیکھا ہے اور جستہ جستہ پورے انہماک سے ایک ایک باب، ایک ایک منثور و منظوم شہ پارہ ضرور پڑھوں گا فی الوقت اتنا ہی کہوں گا کہ ' جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ پہلے صفحہ پر "فریاد" اظہار عجز ہے۔ پیغمبر اعظم ﷺ کی پیروی میں آپ نے اپنے مقصد کو شامل سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے۔ برسبیل تذکرہ سلام بن رزاق کو مبارکباد دینا ضروری ہے کہ ان کا افسانہ 'ابراہیم سعد' میں پڑھ چکا ہوں۔ افسانہ واقعی صحیح حقائق کی عکاسی کرتا ہے۔ سلام کا طرز تحریر سونے پر سہاگہ، بدرالدین جناب (ہیڈ ماسٹر) اور امیر علی معاون مدرس جیتے جاگتے کردار ہیں اور ہمیشہ قاری کے ذہن میں محفوظ رہیں گے۔ سلام صاحب کی برادری یعنی درس و تدریس سے میرا بھی تعلق رہا ہے اور میں بھی کبھی 'شرف جناب' کہلوایا ہوں لیکن گاؤں میں 'باری کا کھانا' کبھی میں نے بھی قبول نہیں کیا۔ خاندانی بڑائی کے زعم میں شادی کے پیغامات آنے کے باوجود بیٹی کے جیون کو برباد کرنے والے والدین اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

سیماب شعر (صفحہ ۹۹) عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن .... الخ۔ شعر کو میں بہادر شاہ ظفر کا شعر سمجھتا تھا۔ شاہ ظفر کی مشہور غزل ہے "لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں ... الخ" آپ سے جب ملاقات ہوگی تو تحقیق ہوگی فی الوقت علامہ سیماب مرحوم کا ایک مقطع پیش خدمت ہے۔ جس کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ ایسا شعر کسی استاد ہی کے قلم سے نکل سکتا ہے۔

عمر ان کا آئے، بسم اللہ سیماب
مگر اب ہم میں باقی کیا رہا ہے

ہم عصر اردو ادب نمبر میں جن بزرگ تخلیق کاروں کی شمولیت ہے ان سب کو مبارکباد! ہر فن پارے پر تبصرہ کوئی کس طرح کرے؟ افتخار میاں کو پھر تبصرہ نمبر شائع کرنا پڑے گا۔

● 446, B/9, Indrajeet Colony, Jadhavwadi, Kolhapur - 41005 (M.S)

٭ جس شعر کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ علامہ سیماب کا ہی ہے اور 'کلیم عجم' میں موجود ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے نام سے جو غزل مشہور ہوئی ہے وہ ظفر کے کسی دیوان میں موجود نہیں۔ اس غزل کے کئی شعر مضطر خیر آبادی کے ہیں۔ کسی موقع سے اس غزل پر تفصیل سے لکھا جائے گا کہ بہتوں کے ذہن میں علامہ کا شعر بہادر شاہ ظفر کے نام سے محفوظ ہے۔ (الف الف)

راز انذمانی

ہم عصر اردو ادب نمبر مہینوں پہلے ملا۔ اتنا ضخیم اور شاندار ہی نہیں بلکہ عظیم نمبر نکالنے کے لیے آپ لوگوں کی تعریف کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں کیونکہ جو کچھ بھی کہوں، لگے گا محض روایتی، تکلفاتی اور رسمی باتیں کہہ رہا ہوں۔ دراصل ہم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ Superlatives کا استعمال اس بے دردی سے کرتے ہیں کہ جب سچ مچ کسی ہمالیائی کاوش کی تعریف کرنی ہوتی ہے تو ہمارے پاس Superlatives کی یا تو کمی ہو جاتی ہے یا پھر ہمیں ہمارے علم میں موجود بہترین الفاظ پھیکے، بے جان اور بے معنی لگنے لگتے ہیں۔ غلط اور بے جا استعمال کر کے ہم نے لفظوں کی عظمت چھین لی ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی محنت، لگن، وسیع و عمیق مطالعہ، اور اس شمارے کو بروئے کار لانے میں آپ لوگوں کی Dedications & Commitment کا ثانی اس صدی میں تو ممکن نہیں اگلی صدی کی خدا جانے۔ استاد سیماب اکبر آبادی اور ان کے اسکول سے متعلق تقریباً ۱۲۰ صفحات میں پھیلے مواد کی تخلیق و ترتیب اس جامع انداز میں ہوئی ہے کہ گویا اس موضوع پہ یہ حرف آخر ہے۔ اس پہ بحث تو ہو سکتی ہے کیونکہ کسی بھی موضوع پہ صف آرائی ہو جاتی ہے کچھ حق میں ہوں گے تو کچھ اس کے خلاف! ہمارے عزیز ہمسر جونپوری (پورٹ بلیئر میں سکونت پذیر ہیں) صاحب کے مطابق آپ نے جناب سیماب صاحب کو "ضرورت سے اونچا اٹھا دیا ہے۔" میرے جیسے لوگوں کو اس باب سے بے انتہا فیض پہنچا ہے کہ ہمیں اردو زبان کے اس دور اور اس دور کے مشاہیر کے بارے میں تقریباً کوئی علم نہیں تھا۔ سوائے چند شعراء کے نام کے۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ ہر باب کے آنا آپ نے جو سیر حاصل مضمون لکھا ہے اس کے لئے آ کو کس قدر مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ مختلف مضامین، او اشخاص، حالات، اس دور کے حالات و ماحولیات کا تج ادبی میلانات و رجحانات۔ انگریزی کا ایک ہی لفظ کافی۔ Mind Logyling ادبی تخلیق و تصنیف، تر آپ شوق نہیں، ریاضت نہیں عبادت کے درجہ تک جا چکے ہیں اور کامیاب ہیں۔ لیکن جو بات میں تر تدوین کے لیے کہہ سکتا ہوں، وہی بات افتخار بھائی اف کہ مشمولات کے بارے میں کہنے سے قاصر ہوں۔ ایمانی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ مشمولات اعلیٰ تھیں۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ اس طرح کی ایک تار اشاعت میں شائع ہونے والی بیشتر تخلیقات نے اندر کے قاری کو مایوس کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شا شمارے کی تاریخی و دستاویزی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا کی وجہ سے انہوں نے اپنی تخلیقات کا چناؤ صحیح نہیں اب انہیں افسوس ہو رہا ہوگا ورنہ بڑے نام بالخصوص بن رزاق، انل ٹھکر وغیرہ سے بہتر افسانوں کی توقع یہی حال دیگر مشمولات کا بھی ہے۔ ہاں تکنیکی مضامین معیار البتہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ خصوصاً محمد حسن صاحب مقالہ آزاد نظم پر۔ اس نمبر کے متعلق اتنا کہہ سکتا ہوں جب تینوں جلدیں منظر عام پر آجائیں گی تو یہ ادب پر ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ حاصل کر لیں گی آئندہ کئی نسلیں "کام دھنو" کی طرح دوہتی رہیں اور اسی تعلق سے امید ہے آئندہ شماروں میں شامل کاروں کے مشمولات بھی اسی اعلیٰ پائے کی ہوں گی شمارہ کے صوری و معنوی معیار سے میل کھائیں۔

سرورق اپنے آپ میں ایک شاہکار ہے۔ نظر ہٹنا نہیں چاہتیں۔ ان شوخ بہ ظاہر بے ترتیب رنگوں کوئی شے ہے پوشیدہ جس کی تلاش رہتی ہے۔ ایسے کارنامہ کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لیے آپ کو بھائی کو اور "شاعر" خاندان کو میری دلی مبارکباد

1 M G Road, Port Blair - 744101

مکتوبات

اگست ۱۹۹۹ء

شمس الرحمٰن فاروقی

اگست ۱۹۹۹ء کا "شاعر" چند دن ہوئے گھر کے پتے پر ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ پرچہ نہ صرف ایک عرصے کے بعد آیا ہے بلکہ گھر کے پتے پر شاید پہلی ہی بار آیا ہے۔ اگر آئندہ بھی گھر کے پتے پر بھیجتے رہو تو خوب ہوگا۔ میں ممنون ہوں گا۔

مظہر امام کا مضمون کہیں اور بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ بات وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ عرفان اور تاج کی غزلیں بہت خوب ہیں لیکن ان کے ساتھ جو غزل ہے وہ بے جوڑ لگتی ہے۔ تبصروں میں مزید جان آنی چاہیے۔ تم صفحات کی تنگی یوں پوری کرتے ہو کہ ایک صفحے پر بہت کچھ ڈال دیتے ہو۔ یہ طریقہ ہر جگہ کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں لوگوں نے کھل کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور تاثرات ظاہر کرنے والوں کی تعداد بھی کثیر ہے۔ یہ اس نمبر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ معراج جامی نے مالک رام کے تذکرہ ماہ و سال کے اندراجات کو بھی مالک رام صاحب کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو ادب کی ایک مبسوط اور حتی الامکان درست فرہنگ تواریخ Date List بہت ضروری ہے۔ خوشی ہے کہ معراج جامی نے اس طرف توجہ کی ہے۔ کانپور کے وہ صاحب جنھوں نے بقول خود کئی ہزار شعرا کے حالات و انتخاب کلام جمع کئے ہیں اور منظر عام پر خاص زور دیا ہے لائق مبارکباد ہیں۔ تم نے ان کا نام شائع نہیں کیا۔ اب کردو تو خوب رہے۔ یا چاند میاں صاحب انھیں کا نام ہے؟ (یہی ان کا نام ہے۔ ادارہ)

- 29C- Hasting Road, Allahbad 211001 (U P)

مقصود الٰہی شیخ

اس وقت اگست کا "شاعر" سامنے ہے۔ گزشتہ شمارہ بھی خوب تھا۔ رائے زنی کی تحریک زوروں پر تھی مگر فرصت نصیب نہ ہوئی لہٰذا زیر نظر الشوع پر بات ہوگی۔ وہ بھی شہ پاروں کے بارے میں اپنی ناقص رائے پیش کرنے کی جسارت ہی ہے۔ آکتوپاز۔ بیسویں صدی کا اہم شاعر، ندا فاضلی کی تحریر ہے۔ بڑے آسان اور دلپذیر پیرائے میں انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ندا فاضلی کا نظموں کا ترجمہ بھی بڑا رواں ہے۔ دراصل شعر کا ترجمہ کوئی شاعر ہی کرے تو اس میں معنویت اور مٹھاس گھل مل جاتی ہے۔ اے خیام کا افسانہ "ہر فن مولا" بڑی موثر کردار کہانی ہے۔ مجھے خیال ہوا تھا کہ انجام کی آخری تین سطروں میں اوپری جذباتیت جھلک رہی ہے مگر انجام پلٹ کر کہانی کو ذہن میں دہراتا ہے اور انسانیت جگاتا ہے۔ میں نے خیام صاحب کو براہ راست بھی داد کا خط لکھا ہے۔

شام بارکپوری کا "انسان" تو باتوں باتوں میں کرزادیتا ہے۔ یہ ان انسانی المیوں میں سے ایک ہے جو برتاؤ میں سارے جہان میں عالمی دہشت گردی کے ظلم کو مات کرتا ہے مگر جیسے یہ مقہور طبقہ جیتے جاگتے انسانوں کا نہیں اور نہ ہی ان کا دکھ درد کوئی معنی رکھتا ہے بلکہ ملاخوں کے پیچھے راندۂ درگاہ مخلوق کی طرح الگ کر کے بھول جانے لائق ہے۔ ان "لوگوں" کے لیے تو اتنی سہولتیں بھی میسر نہیں جتنی عادی مجرموں یا مہذب دنیا کے جاسوسوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ ان پر دوسری قیامت ٹوٹی اور دنیا چپ رہی۔ غم و اندوہ کی یہ حقیقت میونخ (جرمنی) کے فضل یزدانی نے دنیا بھر کے سفیروں کے کانوں میں "انڈیلی" مگر سب اکارت۔ ایک وجہ جو بجائے خود ایک المیہ کہا جانا چاہیے وہ یہ رہا کہ "ان لوگوں" کے وہ "اپنے" جو بیرونجات میں پھیلے ہوئے تھے وہ بزدلی کی حد تک خاموش رہے۔ خدا جانے یہ دکھ بھری داستان کہاں جا کر ختم ہوگی۔ "غبار دیکھتے رہے" اور "اپنا خون" روایتی کہانیاں ہیں لیکن خوبیوں سے خالی نہیں۔ اہل ٹھکر نے ایک مخصوص ماحول میں مولوی صاحب کے کردار کی بنت میں انتہائی مہارت دکھائی ہے۔ ساخت کی یہ مہارت مدھم پڑ جاتی ہے جب انجام سامنے آتا ہے۔ بدلتی ہوئی قدروں پر اہل ٹھکر سے اس سے بہتر کی آس کی جاتی ہے۔

تنقید، ان دنوں رسائل کی طرح محدود دائروں میں سکڑ گئی ہے اس لئے بسا اوقات افادیت مجروح ہوتی دکھائی دیتی ہے لیکن ہر رسالے اور ایڈیٹر کے لیے یہ وہ کڑوی گولی ہے جو معیار کا گراف بڑھانے کے لیے بہر صورت کھاتا ہے۔ (کیا آپ ایسے مضامین حرف حرف پڑھ کر شامل کرتے ہیں؟) ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں خطوط کا تانتا بندھا ہوا ہے مگر تاخیر کی وجہ سے جہاں "مطالعہ" میں صرف ہونے والا وقت ہے وہیں برائے بیت وزن نکتہ چینی کا عنصر بھی آرہا ہے۔ اس میں شک نہیں ڈائرکٹری وغیرہ پر بے کی دھول اور غبار محسوس ہوتا ہے لیکن آج کل اتنی تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں کہ ماضی میں شنید میں نہ ہوں گی۔ ٹیلی فون کمپنیوں کے مقابلوں کی وجہ سے بار بار نمبر بدلتے ہیں اسی طرح لیکن کچھ کم درجہ پر پتوں کی تبدیلی آتی ہے۔ اشاعتی سلسلے بھی .. تصویر یہ اردو میں کم کم ہے۔ تاثرات اور مکتوبات کی دلچسپی برقرار ہے۔ کتابوں پر تبصرہ اور کتاب بازار کی اپنی افادیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کتابوں کے تحفوں اور تبادلوں کا پرانا رواج از سر نو زیادہ شد و مد سے شروع کرنے کی تحریک چلانی چاہئے۔ آپ غزل کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ ادھر بھی متوجہ ہوں تو مناسب ہوگا۔

- 24 - Park Hill Dr Bradford BD8 ODF (U K.)

ذکاء الدین شایاں

اگست ۱۹۹۹ء کا شمارہ موصول ہوا۔ اداریے سے لے کر مکتوبات وغیرہ تک تمام مواد کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد عرض یہ ہے کہ یہ شمارہ ثابت کرتا ہے کہ "شاعر" نے اپنے مزاج کی معیاری سطح اور غیر جانبداری حق گوئی کو پہچان لیا ہے۔ وہ قارئین حضرات جو خصوصاً پاکستان وغیرہ سے ماہی ادبی جریدوں کی ضخامت کا مقابلہ کرتے ہوئے اور اس پرچے کو "دبلا" بتاتے ہوئے اسے کم حیثیت رسالہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ادبی مشمولات کے وزن کو محسوس نہیں کرتے۔ موجودہ دو ایک شماروں سے "شاعر" کے قلمکاروں نے ادب کی حقیقی اور بنیادی انفرادیت پر توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ اس مرتبہ بھی مضامین اور افسانے بہت

متوازن، سنجیدہ ہوئے اور کافی غور و خوض کے بعد قلمبند کیے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اب افسانہ نگار پھر ترقی پسند تحریک کی پیدا کردہ اسی روش کو اپنانا چاہتے ہیں جو جدیدیت اور مابعد جدیدیت وغیرہ جیسی اصطلاحوں کے فریب اور اس کے زیر اثر خود کلامی، بے جا انشائیہ نگاری اور غیر ضروری شعری طریقہ کار میں گرفتار کر دی گئی تھی۔ نظمیں چند ہی متاثر کرتی ہیں۔ اور کم و بیش یہی حال غزلوں کا بھی ہے۔ کچھ غزلوں میں خواہ مخواہ بھاری بھرکم عربی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ غزلوں میں رسمی لہجہ اور سپاٹ پن زیادہ ہے۔ چند غزل گو شعراء تخلیق کی اہمیت، تنقید کی دخل اندازی وغیرہ سے متعلق حسی حیثیت سے گومگو کی حالت میں ہیں۔ اور جیسے سب سے بیزار ہیں۔ عرفان صدیقی اچھی غزل کہتے ہیں۔ لیکن انھوں نے "چاہتی ہے" کی ردیف میں ابتدائی چند اشعار جو لکھے ہیں وہ بے وجہ نسائی لہجے کے غماز نظر آتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ فارسی میں تانیث اور تذکیر کا فعل کے صیغے میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اردو کے کلاسیکی شاعروں نے جب غزل گوئی شروع کی، تو اس کو ذہن میں نہ رکھا۔ اور محبوب (یعنی عورت) کے لیے بھی مذکر کا صیغہ استعمال کیا۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ اس وقت ہمارا معاشرہ "عورت" کے ذکر کو معیوب سمجھتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اسی طرح اب صیغۂ تانیث کے فعل کو بھی غزل میں واضح کرنا مناسب نہیں۔

"ہم عصر اردو ادب" حصہ اول کی بابت جو خطوط ابھی تک "شاعر" میں شائع ہوئے ہیں وہ بہت سرسری اور لخت لخت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ صف اول کے ناقدین نے بھی جو آراء پیش فرمائی ہے وہ بہت ادھوری اور تشنہ ہیں ۔ کچھ حضرات نے قصیدہ نگاری کی طرز پر اس خصوصی نمبر اور اس کے مدیر محترم کے بارے میں نظم تخلیق کر کے داد دی ہے، جو بالکل بے محل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ہم عصر اردو ادب نمبر" اتنا ضخیم ہے کہ اس کو مکمل پڑھنے اور ہضم کرنے کے بعد ایک مضمون کی شکل میں ہی کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اور اسی وقت اس نمبر کی اصلی قدر و قیمت سامنے آ سکے گی۔ اس کام کے لیے وقت چاہیے جو میرے خیال میں ہمارے عموماً ناقدین اور مبصرین کے پاس نہیں ہے۔ ہاں راقم الحروف کا ارادہ ہے کہ ایک ماہ بغور اس کا مطالعہ کر کے اپنی ناچیز رائے انشاء اللہ ضرور "شاعر" کے لیے روانہ کرے گا۔ امید ہے قارئین کرام انتظار برداشت کریں گے اور افتخار صاحب اسے قبول فرمائیں گے۔

● Near Old City Post Office,
Pakaria, Pilibhit - 262001 (U P)

شعیب شمس ______________

غزل پر آپ کے اداریوں نے پہلے بھی متاثر کیا ہے۔ حالیہ شمارے میں بھی آپ نے غزل کے سلسلے میں جو باتیں کہی ہیں وہ درست ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ غزل پر بہت کچھ نہیں لکھا گیا ہے، غزل گویوں پر مضامین بہت لکھے گئے ہیں مگر غزل بہ حیثیت صنف شاعری پر ہمارے کم ہی ناقدین نے قلم اٹھایا ہے۔ اگر اس پر غور کیا بھی گیا تو اسے "نیم وحشی صنف سخن" کہہ کر ذلیل کرنے کی کوشش کی گئی یا پھر اس کی تعریف میں اسے "اردو شاعری کی آبرو" کہہ دیا گیا۔ لیکن بہ حیثیت صنف عربی و فارسی شاعروں کے علاوہ اس صنف نے عالمی سطح پر اور کن زبان کو متاثر کیا یا اور زبانوں کی شاعری، غزل سے کس قدر مختلف ہے اس کے متعلق کسی نے بحث نہیں کی۔ کسی نے غور تک نہیں کیا کہ ادب اور تنقید کا یہ بھی ایک موضوع ہو سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ ادب میں قیادت کی جنگ کو فتح کرنے کے لیے مغربی ادب کی مثالیں دے کر قارئین کو مرعوب کرتے رہے اور کر رہے ہیں لیکن خود ان کی اپنی صنف نے مغربی ادب پر کیا اثرات مرتب کیے اس کا تذکرہ کرنے سے کتراتے ہیں۔ آپ نے بالکل ہی درست فرمایا کہ "بولنے اور سنے جانے والے لفظ لکھے ہوئے لفظوں پر حاوی ہو رہے ہیں" اور اسی رجحان کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ غزل میں ضرورت سے زیادہ سہل پسندی در آئی اور اسی بے جا سہل پسندی نے ابہام کے لیے راہیں ہموار کیں۔ اسی کا اثر ہے کہ اردو زبان و ادب کے قارئین اور تخلیق کاروں کے درمیان فاصلہ اس قدر بڑھ گیا کہ آج ہم قارئین کی کمی کا رونا روتے ہیں۔ بھئی! جب ہم قارئین میں اضافہ کریں گے تب ہی تو عالمی شاعری میں غزل کا مقام متعین کر پائیں گے۔ لے دے کر بات وہیں آکر اٹک جاتی ہے کہ جو لکھنے والے ہیں، وہی پڑھنے والے بھی اور خریدار بھی وہی۔ گھوم پھر کر ہماری نگاہیں چند "ادبی چودھریوں" پر ہی مرکوز ہو جائیں گی۔ جن سے زیادہ امیدیں وابستہ رکھنا ہوش مندی ہرگز نہیں ہوگی۔

ابراہیم اشک نے غزل الیکٹرانک میڈیا موسیقی کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے بالکل ہی ٹ ہے کہ مختلف شعراء کی کچھ ہی غزلیں ایسی ہیں جو با مختلف گویے گا رہے ہیں۔ ہر غزل موسیقی کی محتاج ہے۔ بلکہ کچھ ایسے شعراء کی غزلیں بھی گائی جا رہی جن کا ادب میں کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ ان حالات صنف غزل کو نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

مظہر امام آج کی ادبی تاریخ کی ایک قد آور شخص ہیں۔ غزلیں تو ان کا میلان ہیں ہی لیکن انھوں نے تنق مضامین بھی خوب لکھے ہیں اور اپنے مضامین میں مع ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ ان کا مختصر سا مضمون "تخلیق کا بحالی" بہت زیادہ پسند آیا۔ مگر مضمون مختصر ہی نہیں زیادہ مختصر ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ہی انھوں نے مسائل پر گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدیدیت اور پسندی، نئی نسلوں کی شناخت، جدید تر نسل نے پاس نظا کی کمی، ادب بغیر کسی لیبل کے بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی اہمیت، وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ چند مسائل جنھیں مظہر امام نے اپنے مضمون میں Touch کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کھل کر باتیں نہیں کی ہیں۔ جدیدیت نے ترقی پسندی کی نفی کیوں کی؟ اور اس ادبی منظر نامے پر یہ تحریک زیادہ دنوں تک کیوں نہیں پائی؟ اور وہ سارے شعراء و افسانہ نگار کن پردوں میں چھپ گئے جو جدیدیت کے زمانۂ عروج میں Mush Room طرح ابھر کر سامنے آگئے تھے (میں نے دانستہ "مرحوم" اصطلاح استعمال نہیں کی ہے) اور اس کے بعد مابعد جدیدیت آئی تو سرد کیوں پڑ گئے؟ اب نارنگ صاحب اس پر مضامین کیوں نہیں لکھتے؟۔ مخمور سعیدی نے جب اردو اکادمی سے رخصت لی تو نارنگ صاحب پھر مابعد جدیدیت پر کوئی سیمینار کیوں نہیں کر پائے؟۔ نیا ورق، ذہن جدید دیگر رسائل میں اس موضوع پر بحثیں کیوں نہیں لے دے کر ایک وزیر آغا رہ گئے ہیں جن کا مضمون عاشق قسطوں میں (کوہسار، بھاگلپور) شائع کر رہے ہیں۔ مابعد جدیدیت میں بھی وہ دم خم نہیں جس کی بنیاد ادب کی تخلیق کی جا سکے۔ مظہر امام نے بھی مابعد جدیدیت ترجمہ کر کے اسے جدیدیت کے بعد کا دور تسلیم

ی مقرر کردیا یعنی ایمر جنسی کے بعد کا ادب۔ لیکن یاسی و سماجی منظر نامہ ایمر جنسی سے قطعی مختلف ہے۔ ر میں کیا ہوا، لوگ بھول گئے ہیں۔ آج سیاست میں رگندگی آگئی ہے اور سماجی طور پر ہر شخص کس طرح کے ماحول میں سہمی ہوئی زندگی گزار رہا ہے، وہ زیادہ ۔ خوف کا جو ماحول آج ہے وہ ایمر جنسی میں تو نہیں یا ابتدا اسی وقت ضرور ہوئی تھی۔ اس لئے ۷۵۔۷۷ ر کے ادب کو ہم کوئی نئی تحریک نہیں کہہ سکتے۔ ماڈرنزم نے تو مغرب میں جنم بھی لیا اور اس کی موت گئی۔ ہم کیوں ایک مردہ تہذیب کو اپنے ادب پر کی کوشش کر رہے ہیں؟۔ جدیدیت نے تو زبان و تیا پانچہ کیا ہی تھا مابعد جدیدیت بھی کم و بیش وہی سب کے موڈ میں ہے۔ اور پھر نئی نسلوں کو نقاد کا مسئلہ۔ یہ ہر دور میں رہا ہے۔ ترقی پسندوں کے پاس احتشام ، آل احمد سرور جیسے ناقد تھے۔ جدیدیوں کو بھی شمس ، فاروقی، شمیم احمد اور دوسرے ناقد مل گئے۔ مابعد ت کو نارنگ اور وزیر آغا۔ لیکن یہ لوگ نئی نسل کے سا پر لکھیں تب نا؟ وہاب اشرفی، عبدالمغنی اور ے اب بھی کلاسیکی ادب کی تنقید میں لگے ہوئے ہیں۔ م شکیل الرحمٰن کا ہے جنھیں نہ تو ترقی پسندوں نے دی، نہ جدیدیوں نے اور نہ ہی مابعد جدیدیوں نے۔ ے اردو ادب کی جمالیات میں پہلے بھی الجھے تھے، اب جھے ہوئے ہیں۔ رہ گئی بات اردو کے استادوں کی تو ۔نے اپنے ایم۔اے کے امتحانات کے دوران جو پڑھا تھا ب تک اگل رہے ہیں۔ انھیں خبر ہی نہیں کہ فیض کے ۔ شاعری اور کرشن چندر کے بعد اردو افسانہ نگاروں کا یا اب بھی سرگرم سفر ہے۔ انھیں مطالعے کا شوق ہی ۔نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ امتحانات کے دنوں میں بھی ۔نے اقبال پر صرف مضامین پڑھے، اقبال کو نہیں پڑھا چند پر تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیا، پریم چند کے ں اور ناولوں کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان سے کیا امید یں نہ جائیں۔ یہ سارے مسائل ایسے ہیں جن پر حل کر کی جانی چاہئے۔ ایک مختصر مضمون میں اشارے ینے سے کام نہیں بنتا۔

اس شمارہ کے تقریباً سبھی افسانے اچھے ہیں اور اچھے ہو سکتے تھے اگر افسانہ نگاروں نے جی آتا کر افسانوں کو ختم نہیں کر دیا ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں اب بیشتر افسانہ نگار ساحر مرحوم کی باتوں پر عمل کرنے لگے ہیں کہ اسے ایک خوبصورت موڑ پر ہی لا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اردو کے ایک سہ ماہی رسالے کے مدیر کا اصول یہ ہے کہ تخلیق کو "واضح" نہیں ہونا چاہئے۔ کیا آپ بھی "غیر واضح" تخلیقات ہی پسند کرتے ہیں۔ ویسے میں واضح اور غیر واضح کی تشریح نہیں کر پاؤں گا۔

• Shah Compound, Shastrinagar, Motihari - 845901 (Bihar)

عطا عابدی ——————

شاعر (اگست ۹۹ء) میں سید معراج جامی کی تحریر "کچھ تذکرہ ماہ و سال کے حوالے سے" پڑھی۔ خوشی ہوئی کہ وہ مالک رام کے تذکرہ ماہ و سال کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے ایک تاثراتی نوٹ (مطبوعہ زبان و ادب، پٹنہ مئی جون ۱۹۹۴) میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ تذکرہ ماہ و سال ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کے حوالے سے بہتوں کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اس کی تصحیح تفصیلی طور پر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تذکرۂ ماہ و سال جیسی حوالے کی کتاب واقعی حوالہ کے لائق بن سکے۔ معراج جامی نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر محمد اسلم (لاہور) کے دو مضامین جو ماہنامہ سیارہ (لاہور) کے سالنامہ جنوری ر فروری ۹۳ء (اشاعت خاص نمبر ۳۳) اور فروری ۹۴ (اشاعت خاص نمبر ۳۴) میں شائع ہوئے تھے، کا تذکرہ کیا ہے۔ ناچیز نے ان مضامین کا مطالعہ کیا ہے اور اول الذکر مضمون کو زبان و ادب (پٹنہ) میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا جو اس رسالہ کے جلد ۲۰ شمارہ ۳ (مئی جون ۱۹۹۴) میں راقم الحروف کے تاثراتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس سے بھی قبل اسی رسالہ کے جلد ۱۹، شمارہ ۱: ۳ میں تذکرہ ماہ و سال "ایک جائزہ" کے عنوان سے ڈاکٹر سید حسین احمد کا مضمون شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر حسین احمد نے تذکرہ ماہ و سال کو اغلاط کا دفتر بے پایاں قرار دیتے ہوئے کئی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی اور اس کی تصحیح بھی کی تھی۔ پروفیسر محمد اسلم کا اول الذکر مضمون جب سیارہ میں شائع ہوا تو راقم الحروف نے اس کی تاریخی اور حوالہ جاتی اہمیت کے پیش نظر زبان و ادب میں شائع کرایا تاکہ ہندوستان میں بھی اردو ادب کے قلمکار و قارئین تذکرہ ماہ و سال کی مزید غلطیوں سے آگاہ ہو سکیں۔ پروفیسر محمد اسلم کا دوسرا مضمون دراصل پروفیسر سید محمد سلیم (لاہور) کے ایک اعتراض کی جوابی وضاحت اور "استدراک" کے تحت پہلے والے مضمون میں کتابت کی بعض اغلاط کے سبب ابہام پیدا ہونے کے اندیشے کے پیش نظر لکھا گیا تھا۔ سیارہ ۳۴ میں ی رؤف خیر نے پروفیسر محمد اسلم کے مضمون کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے حضرت گیسو دراز کے تعلق سے اپنی وضاحت پیش کی تھی۔ جناب مظہر امام کا مضمون تخلیقی فنکار کی بحالی، ان کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔ مجھ ناچیز کے خیال میں تخلیقی فن کار کی بحالی (تلاش یا شناخت کے معنوں میں بھی) نئی نسل کے سامنے ایک بڑا مسئلہ اگر ہے تو اس کا حل نئی نسل کے موجودہ تنقیدی رویے (وہ جو بھی جیسے بھی ہیں) کی تبدیلی پر بھی منحصر کرتا ہے۔ اس بابت کچھ واضح اشارے مظہر امام صاحب نے بھی کیے ہیں، جو توجہ طلب اور قابل عمل ہیں۔

جناب ابراہیم اشک کا مضمون "غزل الیکٹرانک میڈیا اور موسیقی" بھی دلچسپی سے پڑھا۔ ابراہیم اشک کا رشتہ ان تینوں سے ہے اس لئے ان کی باتیں تکنیک و تجربے پر مبنی ہوں گی۔ لیکن میں تو اب تک یہی سمجھتا ہوں کہ غزل چاہے اعلیٰ ادب کی ہو یا سطحی ادب کی، گائی جا سکتی ہے۔

• Urdu Section Bihar Legislative Council, Patna - 800015

سرفراز تبسم ——————

آپ کی مناجوں کا دل سے قدردان ہوں۔ آپ جس لگن اور محنت سے "شاعر" کے اوراق سجاتے ہیں آپ کے حسنِ نظر اور ذوق کی داد دینا پڑتی ہے۔ "شاعر" میں جگہ جگہ نئی الفاظی گھومتی ہے ناچتی ہے۔ پرانے الفاظ کو آپ نئی آواز نیا استھان دینے میں بہت آگے ہیں اور شاید "شاعر" کے سوا ایسا کہیں نہیں ہو رہا۔ الفاظ کا نیا اسکیل نئی ترتیب "شاعر" میں ہی ملتی ہے۔ کیونکہ ترقی پسند ادیب و شاعر اور تحریکیں جدیدیت کا شور مچانے والے زبان و ادب کے دعوی دار تو شاید تھک کر بیٹھ چکے ہیں۔ آپ کیوں نہیں تھکے رکے.....؟؟

• 18-B, Francisabad, Gujranwala 52251, Pakistan

(باقی صفحہ ۳۸ پر دیکھئے)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

نیاز فتح پوری شخصیت اور فن

عقیلہ شاہین

"جس طرح ہر پیغمبر اپنی امت کے ساتھ مبعوث ہوا کرتا ہے اسی طرح حضرت نیاز فتح پوری اپنا عہد اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے۔" (رئیس امروہوی)

اس ریمارک سے شاید ہی کسی اردو ادیب، نقاد یا پروفیسر انکار کر سکے کہ نیاز فتح پوری بذات خود ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ایسے نابغہ روزگار کم پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک طرف بحیثیت افسانہ نگار، ناقد، مکتوب نگار، مترجم، مقالہ نویس اور صحافی اپنا مقام بنایا تو دوسری طرف "نگار" جیسے وقیع اور بلند معیار و مرتبہ رسالے کے مدیر کی حیثیت سے دھوم مچائی۔ "نگار" اور نیاز ایک دوسرے کی پہچان ہو گئے تھے۔ اس طرح ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی ممکن نہیں تھا۔

ڈاکٹر عقیلہ شاہین کا پی ایچ ڈی کے لیے یہ مقالہ نیاز کی شخصیت اور فن پر ایک مبسوط تحریر ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے تحقیق کی ہے اور نیاز کے بارے میں بے شمار معلومات نہ صرف اکٹھی کی ہیں بلکہ ان پر اظہار خیال بھی کیا ہے جس میں جوش عقیدت موج زن ہے ویسے کہیں کہیں نکتہ چینی بھی کی ہے۔

نیاز کا ایک زبردست کارنامہ یہ ہے کہ "ادب برائے ادب" کے قائل ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ترقی پسندوں کی ایک بڑی تعداد کو متعارف کیا۔ کئی نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جنہوں نے آگے چل کر ادب میں اپنا ایک مقام بنایا۔ مثلاً فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہم۔ مخدوم محی الدین کی انقلابی شاعری کا تعارف پیش کرنے والا پہلا مضمون جسے محبوب حسین جگر نے لکھا تھا "نگار" ہی میں شائع ہوا تھا اور اسی مضمون سے مخدوم کو کل ہند شہرت ملی۔

عقیلہ شاہین نے "نگار" میں مختلف عنوانات کے تحت شائع ہونے والی نیاز کی تحریروں کے، یعنی "ملاحظات" "باب الاستفسار" "باب الانتقاد" "مالہ وماعلیہ" "مطبوعات موصولہ" کے بارے میں لکھا ہے: "....(ان کو) دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیاز یقیناً ایک کامیاب صحافی تھے۔" یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ادبی رسالے میں شائع ہونے والی ان چیزوں کو کیا صحافت میں داخل کیا جائے گا؟ راقم الحروف کے خیال میں اس باب کے تحت نیاز کی وہ تحریریں اور ان کا معروضی مطالعہ ہونا چاہیے تھا جب نیاز "زمیندار" "خطیب" "توحید" "نقاد" اور "رعیت" اخباروں سے منسلک تھے۔ تب ان کی صحافت کا مکمل تناظر قاری کو حاصل ہوتا۔

مشفق خواجہ کے اس حوالے سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ: "انہوں نے فکری جمود اور تقلید کو ختم کر کے جو فضا پیدا کی اس کی بناء پر انہیں ادبی مجدد کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔" لیکن اس بیان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ: "اس صدی میں جتنی تحریکیں سامنے آئی ہیں ان کے پیچھے نیاز فتح پوری کی روشن خیالی کار فرما ہے۔"

نیاز کا ایک نہایت ہی قابل اعتراض خیال ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کہ: "یہاں کا مسلمان قیامت تک آزاد نہیں ہو سکتا۔" اور اس پر عقیلہ شاہین کا تبصرہ: "نیاز کی یہ پیشن گوئی بہت حد تک درست ہے" قابل مذمت ہے۔ تقابل کیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں وہاں کا ہندو کتنا آزاد ہے اور "مہاجر" کتنا آزاد ہے۔ کتابت میں یکسانیت نہیں ہے۔ سرورق سادہ اور اچھا ہے۔

ضخامت: ۴۳۰ صفحات ○ قیمت: دو سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۵ء ○ پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (پاکستان) ○ مبصر: محافظ حیدر

نئے دیس میں (افسانے)

جیتندر بلو

جیتندر بلو کے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے وہ دو ناول اور افسانوں کے دو مجموعے پیش کر چکے ہیں جن کے بل پر وہ نئے افسانہ نگاروں میں اپنی پہچان قائم کر چکے ہیں۔ اس مجموعے میں سات افسانے ہیں۔ پہلا افسانہ "مونگرل" کافی مشہور ہو چکا ہے۔ ہجرت کر کے انگلستان میں قیام پذیر ہندوستانیوں کو وہاں جس تعصب کا سامنا کرنا اور شکار ہونا پڑتا ہے اس موضوع پر جیتندر بلو نے کئی عمرانی اور نفسیاتی زاویوں سے اپنے افسانے میں روشنی ڈالی ہے جو ان کے حساس مشاہدے اور عمیق [illegible] کا ثبوت ہے۔ "مونگرل" کا، جس کے لغوی معنی [illegible] النسل کے ہیں لیکن جو زیادہ تر دو الگ الگ نسلوں سے پیدا ہوئے مخلوط کتوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً [illegible] انگلستانی ماں، ہندوستانی باپ جو ایک دوسرے سے [illegible] ہو چکے ہیں اور ان دونوں کے اکلوتے بیٹے پر مشتمل ہے۔ ان تین کرداروں کے رویے، عمل اور رد عمل سے کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ جو نفسیاتی پیچیدگیاں ظہور میں آتی ہیں وہ حیرت انگیز ہونے کے سبب قابل [illegible] دلچسپ ہیں۔

"خدا کا رنگ" میں جیتندر بلو نے ایک عجیب [illegible] میں لیا ہے۔ ایک سیاہ فام کردار افسانے کے راوی سے [illegible] ہے جو کہ سانولا ہے: "..... دل سے کہتا ہوں [illegible] سفید آدمی کو Racist ٹھیراتے ہیں لیکن اس [illegible] Racist تو ہم خود ہیں۔ یعنی میری اور تمہاری [illegible] لوگ۔" یہ حقیقت پسندانہ خود احتسابی ہے۔ انسان کا اپنے خلاف احتجاج ہے۔ اور آگے چل کر افسانہ [illegible] قدرت کی یہ ستم ظریفی دکھائی ہے کہ وہ سفید قومیں جنہوں نے کالی، سانولی اور پیلی نسلوں کے ملکوں پر حکمرانی [illegible] استحصال کر کے اپنی خوشحالی کی تعمیر و تشکیل کی وہ اپنی [illegible] کے لیے خدا کے شکر گذار ہیں۔ بین السطور میں [illegible] جاننا چاہتا ہے کہ سفید قوموں نے غلام ملکوں میں جو [illegible] پھیلائی ہیں کیا ان کا ذمے دار بھی خدا ہے؟

اس مجموعے کا سب سے اہم اور سب سے اچھا افسانہ

ہے جس پر کتاب کا نام ہر کھا گیا ہے: "نئے ولیس میں" ستان میں مستقل طور پر مقیم ایک ہندوستانی خاندان کی نسل پر وہاں کی سماجی قدریں کس طرح اثرانداز ہوتی ، ان کی ماہرانہ جزئیات نگاری اور فنکارانہ کردار نگاری ذریعے تصویر کشی کی گئی ہے۔ خصوصاً ماں باپ کی فطری بات نگاری قابل داد ہے۔ اس موضوع پر اردو میں کئی نے لکھے جاچکے ہیں لیکن جتندر بلو کی انفرادیت سب الگ صاف نمایاں ہے۔ موضوع کے پیش نظر عنوان ہو گیا ہے۔

"ــنگی ساتھی" ایک ہندوستانی شوہر اور اس کی انگریز ن کے Complexes کے پیچیدہ موضوع پر فنی ہ ـتی سے لکھی گئی کہانی ہے۔ جتندر بلو باشعور نظر ہونے پختہ فکر رکھنے کے سبب جانب داری ایشیائی باشندوں کی دی اور گوروں کے خلاف تعصب سے حیرت انگیز طور پنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ ایک کردار ـ ملواتے ہیں: "یقین کرو جس نسل سے میرا تعلق ہے پنی غرض کے واسطے سفید لوگوں کے تلوے چاٹنے سے ی ـیز نہیں کرتی۔ لیکن جب کوئی انگریز صحیح معنوں میں ے قریب آنا چاہتا ہے تو وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں ہمارا کلچر ان سے میل نہیں کھاتا۔ یہ عجیب رویہ ہے جو نے اپنا رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے ہی اپنے معیار بنا رکھے ہیں۔ . . "اسی افسانے میں ان کی بصیرت افروز غور و فکر کی ایک برحق مثال یہ ہے: "تم ت پہلے والی نسل اس ارادے کے ساتھ اس ملک میں آئی تھی۔ چند سال محنت مزدوری کر کے کچھ پیسے بنالیں گے، پھر واپس لوٹ کر آرام سے زندگی جئیں گے لیکن ان لوگوں کا خواب ادھورا ہی رہا انہوں نے واپس جانے کی جتنی بھی کوشش کی اتنا ہی اس معاشرے میں دھنستے چلے گئے۔ پیسے کی ہوس نے انہیں روکے رکھا۔ ان میں زیادہ تر تو مر کھپ چکے ہیں۔ باقی جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ تم جس نسل سے تعلق رکھتے ہو اس کا المیہ یہ رہا ہے کہ وہ لوگ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ بیچ میں لٹک کر رہ گئے ہیں۔ وہ کہیں بھی خود کو Adjust نہیں کرپاتے . . . ." اس افسانے میں مختلف ـشوہر اور بیوی کے تہذیبی، نفسیاتی اور سماجی الجھنوں کی بڑی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔

نئے افسانہ نگاروں کا ذوقی مطالعہ رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ ایک دعوت فکر ہے۔ الیاس شوقی نے اسے بڑی نفاست سے شائع کیا ہے۔

ضخامت: ۱۸۴ صفحات ○ قیمت: ۱۰۰ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ○ ناشر: قلم پبلی کیشنز، ۲۔ارے ۱۔ ایل آئی جی کالونی، کرلا (ویسٹ) ممبئی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔ ۲۵ ○ مبصر: محافظ حیدر

جامعہ

سرسید احمد خاں نمبر

سرسید احمد خاں ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے، وہ عہد جو صرف تاریخ کا حصہ نہیں بن گیا بلکہ عہد بہ عہد اپنی ایک تاریخ بناتا جارہا ہے۔ ایک نابغہ روزگار شخصیت کے کار و افکار اپنے عہد کی تاریخ میں گم نہیں ہو گئے بلکہ یہی کار و افکار عہد بہ عہد تاریخ کو لکھ رہے ہیں۔ وہ کار و افکار جو بیسویں صدی میں اپنی نئی معنویت کے ساتھ روشن رہے اور اب ۲۱ویں صدی میں اس نئی صدی کو اپنی نئی معنویت دیں گے۔ وہ نئی معنویت کیا ہو سکتی ہے اس کی افہام و تفہیم کے لیے رسالہ جامعہ (دہلی) کا ضخیم سرسید نمبر شائع ہوا ہے جسے شمیم حنفی اور سہیل احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ سرسید پر یا کسی بھی شخصیت پر جامعہ کا یہ خصوصی نمبر محض روایتی یا میکانیکی ترتیب میں نہیں ہے بلکہ اس میں مدیران کی سنجیدہ فکر، جستجو اور مشمولات کے ذریعے اپنی بات کہنے کی ایک سعی کی گئی ہے جو کامیاب ہے۔ بہت سلیقے سے پرانے اور نئے مضامین کو ۸ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نئی نسل کے قلم کاروں کی شمولیت نے سرسید نمبر کو اور زیادہ اہم بنادیا ہے کیونکہ نئی نسل ہی میں تاریخ جذب نہ ہو، اسلاف روشن نہ ہوں تو پھر ماضی و مستقبل کے درمیان ایک خلا یقینی ہے، تہذیب و تربیت، علم و فن اور ورثہ، نئی نسل میں منتقل نہ ہو، جذب نہ ہو تو روایت سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

تمیں مضامین اور ایک اداریے پر مشتمل جامعہ کا سرسید احمد نمبر ایک جامع صفات شخصیت کے بارے میں ایک تازہ ترین دستاویز ہے، سرسید کے بارے میں ایک نیا مطالعہ، ۲۱ویں صدی کے لیے ایک نئی معنویت، ایک نیا تناظر ہے۔ نئی نسل کے لئے علمی و ادبی اور فکری لوازمہ ہے۔ اس نمبر کا مطالعہ ہر ایک کے لیے یکساں طور پر مفید ٹھہرے گا۔

معاصر سہ ماہی ادبی کتابی سلسلوں میں 'جامعہ' کا ہر شمارہ اپنے علمی و ادبی، فکری اور تہذیبی مشمولات کے سبب مختلف اور منفرد ہوتا جارہا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی اور سہیل احمد فاروقی نے رسالہ 'جامعہ' کو زندہ متحرک اور وقیع بنادیا ہے۔

ضخامت: ۳۹۳ صفحات ○ قیمت: اسی روپے (سرسید نمبر) فی شمارہ: ۲۰ روپے۔ سالانہ قیمت: اسی روپے ○ مطبوعہ: جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء ○ رابطہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ ○ مبصر: الف الف۔

.... بس

ڈاکٹر داؤد کاشمیری

"یہ مجموعہ اپنی تہوں میں ایسے درجنوں جملے اور پھبتیاں لئے ہوئے وارد ہوگا جنھیں ہر طرح کی محفلوں میں زبان زد یا ضرب المثل ہونے کا شوق بھی ہے اور اس کی سکت بھی۔ مزاح میں طنز کی ترشی اور طنز میں درد کی چاشنی۔ طنز و مزاح اور درد کے عالم میں پھبتی کسنے کی بے قراری۔ یہ خصوصیت ہے اس کے بعض مضامین کی مرحم میں سنی ہوئی یہ وہ ملکھی ہے جسے نکالا نہیں جاسکتا۔ داؤد کاشمیری کی کوئی تحریر بمبئی شہر میں رہے بغیر پورا لطف نہیں دے سکتی۔ پڑھنے والا اگر اس تصنیف سے پوری طرح فیض یاب نہ ہوسکے تو سمجھئے کہ وہ بمبئی سے فیض یاب نہیں ہوا اور جو ممبئی سے محروم رہ گیا اس کا ۲۱ویں صدی میں شان سے داخلہ مشکوک ہے۔" (ڈاکٹر ظ۔ انصاری)

ظ انصاری مرحوم کی یہ تاثر تحریر کتاب کی اشاعت سے پہلے مسودے پر لکھی گئی تھی جسے ڈاکٹر داؤد کشمیری نے اپنی اس کتاب میں نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ کتاب میں شامل ۲۴ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے بارے میں ظا صاحب کی گرانقدر رائے بہت اہم ہے۔ داؤد کاشمیری کی تحریریں اعلیٰ درجے کی اور قابل مطالعہ ہیں۔ وہ ایک اچھے ناقد بھی ہیں۔ محترم سردار جعفری صاحب پر ان کی تنقیدی کتاب "سردار جعفری کی شاعری 'فن برائے فن' اب تک بحث میں ہے۔

ضخامت: ۱۷٦ صفحات ○ قیمت: ۳۰ روپے ○ مطبوعہ: ستمبر ۱۹۹٦ء ○ رابطہ: فاروق سید، گل بوٹے پبلی کیشنز، بھائیکلہ، ممبئی ۱۱ (مہاراشٹر) ○ مبصر: (الف الف)

کتاب بازار

"اردو شاعروں کو بہر حال یہ غلط فہمی تو ہے کہ بازار میں ان کی کتاب کو خریدنے والا موجود ہے اور یہ کہ وہ خرید کر پڑھے جاتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رسم اجرا کی محفلوں میں ہونے والی قصیدہ خوانیوں سے اور اکادمیوں کے انعاموں سے اور بھی تقویت ملتی ہے۔ لیکن یہ ایک روشن سچ ہے کہ شاعری ہو یا افسانہ، اس کو خرید کر پڑھنے والے ہمارے یہاں بے حد کم ہیں اور یہ ترجیحی اعتبار سے سال چھ مہینے میں کوئی کتاب خریدتے ہیں۔ 'ذہن جدید' کے ایک حالیہ سروے کے مطابق دلی میں ادبی کتابیں خریدو فروخت کرنے والے قابلِ ذکر کتب فروشوں کی ادبی کتابوں کی سات دن کی مجموعی کاؤنٹر سیل ۲۱ سو کے آس پاس تھی۔ اردو کے پبلی شرز دن بہ دن کم ہوتے جارہے ہیں جو صرف اس کاروبار میں ہیں وہ صرف اکادمیوں سے مالی امداد پانے والی کتابوں یا پھر کتاب کی اشاعت کے شوقین ادیب کی جیب سے ملنے والی رقم کے سہارے اپنا کمیشن کاٹ کے کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ (زبیر رضوی۔ ذہن جدید۔ مارچ تا اگست ۱۹۹۹ء) "

()

افکار غالب (تنقیدی مضامین)

مصنف : ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم () ضخامت : ۴۸۶ صفحات () قیمت: دوسو روپے () مطبوعہ : ۱۹۹۹ء (طبع دوم) () رابطہ : غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، ماتا سندری لین، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

تلاش غالب (۴۳۰ غیر مطبوعہ خطوط، نودریافت کلام)

مرتبہ : نثار احمد فاروقی () ضخامت : ۳۹۲ صفحات () قیمت : دوسو روپے () مطبوعہ : (طبع ثانی) مئی ۱۹۹۹ء () رابطہ : غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، ماتا سندری لین، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

سردار پٹیل اور ہندوستانی مسلمان (مضامین)

مصنف: ڈاکٹر رفیق ذکریا () مترجم : مظہر محی الدین () ضخامت : ۲۷۱ صفحات () قیمت: سو روپے () مطبوعہ: ۱۹۹۷ء () پتہ: انجمن ترقی اردو، اردو گھر، ۲۱۲۔ راؤز ایونیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

موج سراب (شاعری)

مصنف: رہبر جونپوری () ضخامت: ۱۱۲ صفحات () قیمت : ۷۵ روپے () مطبوعہ : ۱۹۹۷ء () پتہ : 424، N3-'A'، کوہ نور پورہ، بی ایچ ای ایل۔ بھوپال۔ ۴۶۲۰۲۳

ید بیضا (شاعری)

مصنف: ابوالمجاہد زاہد () ضخامت : ۱۹۲ صفحات () قیمت: ۸۰ روپے () مطبوعہ : اکتوبر ۱۹۹۸ء () رابطہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلی شرز، ڈی ۳۰۷، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

لفظوں کا پل (شاعری)

مصنف: ندا فاضلی () ضخامت : ۱۴۴ صفحات () قیمت: ایک سو روپے () مطبوعہ: ۱۹۹۸ء (دوسرا ایڈیشن) () پتہ : ۱۰۳۔ امر اپارٹمنٹ، ۳ اشٹارہ، اکھار (ویسٹ) بمبئی۔ ۵۳

اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ (تنقید)

مصنف : ڈاکٹر غلام رسول ساجد () ضخامت : ۶۴۰ صفحات () قیمت : تین سو روپے () مطبوعہ : ۱۹۹۷ء () پتہ : 7/10، سی۔ بلاک، ونوبا بھاوے نگر، پائپ روڈ، کرلا (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۷۰

ایک لہر آتی ہوئی (مضامین)

مصنف: مظہر امام () ضخامت : ۲۰۸ صفحات () قیمت : ۱۵۰ روپے () مطبوعہ : ۱۹۹۷ء () پتہ : ۶/۷۔ بی، پاکٹ ا، فیز۔ ا، میور وہار، دہلی۔ ۹۱

نئی افسانوی تقلیب (تنقیدی مضامین)

مصنف: مہدی جعفر () ضخامت : ۲۰۴ صفحات () قیمت : ایک سو پچیس روپے () مطبوعہ : ۱۹۹۹ء () پتہ : B - 135، شاستری نگر، بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۱ (ایم پی)

طلوع (شاعری)

مصنفہ: منصورہ احمد () ضخامت : ۲۳۰ صفحات () قیمت : ایک سو ساٹھ روپے () مطبوعہ : ۲۰ نومبر ۱۹۹۷ء () پتہ: اساطیر: ۴۵۔ اے، مزنگ روڈ، لاہور (پاکستان)

زہر گل (شاعری)

مصنف: عالم خورشید () ضخامت : ۱۱۲ صفحات () قیمت : نوے روپے () مطبوعہ : ۱۹۹۸ء () پتہ : آفس آف دی ڈی اے (پی) پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱ (بہار)

انیس ناگی اردو ادب کا اینٹی ہیرو (تنقید)

مصنفہ: شاہین مفتی () ضخامت : ۱۱۰ صفحات () قیمت : درج نہیں () مطبوعہ : ۱۹۹۷ء () پتہ : حسن پبلی کیشنز، کرشن نگر لاہور (پاکستان)

ادبی رسائل

نیا سفر (ادبی سلسلہ)

مرتبین : سید عاشور کاظمی، علی احمد فاطمی () ضخامت ۵۲۰ صفحات () قیمت : ایک سو روپے (اس شمارے کی) زر سالانہ : دوسو روپے () مطبوعہ : جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء () رابطہ : ۶۸۔ مرزا غالب روڈ، الہ آباد۔ (یوپی)

اردو بک ریویو (ماہنامہ، تبصرے، مضامین، جائزے)

مدیر مسئول : عارف اقبال () مدیر : جاوید اختر () ضخامت : ۶۴ صفحات () قیمت : ۲۰ روپے (فی شمارہ) () زر سالانہ: ۱۰۰ روپے () مطبوعہ جولائی اگست ۹۹ء () رابطہ ۔ 1739/3، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

بادبان (سہ ماہی ادبی سلسلہ)

مدیر اعزازی : ناصر بغدادی () ضخامت ۲۴ صفحات () قیمت : ایک سو پچاس روپے () مطبوعہ ۹۸ء () شمارہ نمبر: ۵ () رابطہ : 2.8/14، E اسکوئر، بلاک نمبر ۱۴، گلشن اقبال، کراچی ۵۳۰۰ (پاکستان)

تناظر (سہ ماہی ادبی رسالہ)

مدیرہ : قمر جمالی () ضخامت : ۳۵۲ صفحات () قیمت سو روپے () مطبوعہ: مارچ ۹۹ء () رابطہ 117، اے جی کالونی، پوسٹ یوسف گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰... (آندھرا پردیش)

غالب نامہ (اردو میں علمی و تحقیقی افکار کا آئینہ)

مدیر اعلیٰ: پروفیسر نذیر احمد () ضخامت : ۳۲۰ صفحات () قیمت : ساٹھ روپے () مطبوعہ: جولائی ۹۹ء () رابطہ غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، ماتا سندری لین، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

جریدہ (کشمیر نمبر)

مدیران : زیتون بانو، تاج سعید () ضخامت صفحات () قیمت : دوسو روپے () مطبوعہ: جون ۹۹ء () رابطہ : مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس ۳۲۳، پشاور (پاکستان)

فکر امروز

جس فلسفے کا اردو شاعری سے مطالبہ کیا جارہا ہے، صوفیہ کے کلام میں اس کا فقدان نہیں۔ الٰہیات و روحانیات کے وہ تمام درس جو نثر میں کسی طرح بہ پیرایۂ موثر بیان نہیں کیے جاسکتے، شعر کے ذریعے سامعہ میں جذب کیے جاسکتے ہیں۔ وہ حقائق و معارف جن کی تفسیر و توضیح نثر میں نہیں کی جاسکتی، شعر کے پردے میں آسانی سے متجلی ہو جاتے ہیں۔ حقیقی شاعری وہی شاعری ہے جو ہماری روح کو جھنجھوڑ دے۔ ہمارے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کردے اور ہمارے دماغ کو اپنے اثرات سے متکیف کر کے ہمیں سرخوشی و بے خودی کا اہل بنادے۔

(۱۳واں خطبہ۔ درباری مشاعرہ منعقدۂ درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ تالی منڈی، آگرہ۔ ۲ر مارچ ۱۹۳۴ء)

سیماب اکبرآبادی

بانی
علامہ
سیماب
اکبرآبادی
مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار
اعجاز صدیقی
مرحوم

اشاعت کا ۷۰واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۷۰
شمارہ — ۱۲

فون: 3829904

دسمبر ۱۹۹۹ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی
حامد اقبال صدیقی

قیمت ۹ روپے

زر سالانہ ۱۰۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۱۲۰ روپے

تاعمر خریداری ۵۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۲۰۰ روپے

پاکستان ۲۵۰ روپے ✿ امریکہ ۲۵ ڈالر ● برطانیہ ۱۵ پونڈ ✿ خلیجی ممالک ۶ سو روپے

کینیڈا اور دیگر ممالک سے ۴۰ ڈالر

SHAIR MONTHLY, P.O.Box No. 3770, Girgaon, H.P.O. Mumbai - 400004

آپ کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا ضامن

ماہنامہ

ایوانِ اردو

دہلی

ہر ماہ منتخب موضوعات پر اعلیٰ تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی مضامین اور تخلیقی ادب کی تمام اہم اصناف کی مکمل نمائندگی۔

ملک اور بیرونِ ملک کے نئے پرانے اہلِ قلم کے تعاون سے

قیمت : فی شمارہ : پانچ روپے زرِ سالانہ : ساٹھ روپے

اور بچوں کی تفریح اور تربیت کے لیے

بچوں کا ماہنامہ



اُمنگ

دہلی

دلچسپ معلوماتی مضامین اور خبریں...... دل کو چھو لینے والی سبق آموز کہانیاں رنگا رنگ تصویریں

کارٹون...... کامکس...... لطیفے...... پہیلیاں اور بھی بہت کچھ

ایک بے حد دیدہ زیب رسالہ جو بچوں میں تعلیمی لگن بھی پیدا کر رہا ہے اور ان کی دلچسپی کا سامان بھی

قیمت : فی شمارہ : چار روپے زرِ سالانہ : چالیس روپے

مدیر

منصور احمد عثمانی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

سکریٹری اُردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

ادارہ ....

شمارہ ۔ ۱۴ [دسمبر ۱۹۹۹ء] جلد ۔ ۷۰

محفل اپنی

یہ شمارہ

دسمبر ۹۹ء کا یہ شمارہ سال کا آخری شمارہ ہے۔ اللہ کا احسان و کرم ہے کہ ۹۸ء کی طرح ۹۹ء میں بھی ہم نے شاعر کے ۱۲ شمارے بشمول دو اہم خصوصی اشاعتوں کے ادب کے باذوق قارئین کی خدمت میں پیش کئے۔ ۹۸ء اور ۹۹ء میں شاعر کے صفحات مختلف النوع مباحث اور تازہ بہ تازہ تخلیقات سے دھنک رنگ رہے اور ہر شمارہ ایک اہم اور قابل مطالعہ شمارہ تسلیم کیا گیا۔ یہ تازہ شمارہ ایک اور مثال ہے۔ یقین ہے کہ اس شمارے کو بھی پسند کیا جائے گا۔

۲۰ ویں صدی کا اختتامیہ

سنہ دو ہزار، ۲۰ ویں صدی کا آخری سال ہوگا۔ جاتی ہوئی صدی اور آنے والی صدی کے درمیان کا ایک تاریخی سال۔ ہم بھی شاعر کے صفحات پر ۲۰ ویں صدی کو الوداع کہتے ہوئے ۲۱ ویں صدی کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔ گو کہ ہم نے بہت پہلے سے اس کا آغاز کر دیا تھا اور "ہم عصر اردو ادب نمبر" اس کی سب سے بڑی اور روشن مثال ہے۔ ایک تاریخی مثال۔ اور اب جنوری تا دسمبر ۲۰۰۰ء میں شاعر کے ۱۲ شماروں کو مزید خوب سیرت بنانے کی سعی کی جائے گی۔

شاعر کا آئندہ شمارہ

ہزارہ میں شاعر کی خصوصی اشاعتوں کے تحت فروری و مارچ کا مشترکہ شمارہ ایک خصوصی اشاعت ہوگا۔ اس کا ایک اعلان شاعر کے اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔ یہ خاص شمارہ "عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب" اور "اردو ادب کا عالمی منظر نامہ" ہی کی طرح ایک مثالی، منفرد، معیاری شمارہ ہوگا۔ محفوظ کیا جانے والا شمارہ۔ دیکھئے گا کہ کہیں آپ اس شمارے سے محروم نہ رہ جائیں۔

ہم عصر اردو ادب نمبر

ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت کو ایک سال مکمل ہو رہا ہے۔ مگر یہ تو آج ہی کی بات لگ رہی ہے کیوں کہ ادبی دنیا میں یہ تاریخ ساز خاص نمبر گفتگو کا مستقل موضوع بنا ہوا ہے۔ مطالعہ جاری ہے۔ تبصرے، تنقیدی تجزیے اور جائزے، مکالمے وغیرہ جاری ہیں اور اب ہم عصر اردو ادب نمبر پر سیمیناروں کا سلسلہ بھی شروع ہونے والا ہے۔ خبریں آرہی ہیں، ہند و پاک ہی میں نہیں بلکہ اردو کی نئی بستیوں سے بھی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ ابھی تو خاص نمبر کی نکاسی کا سلسلہ بھی پوری طرح ختم نہیں ہوا ہے۔ شاعر کے مستقل خریداروں کے اپنے مسائل ہیں۔ بڑی تعداد میں شائع ہونے والا "ہم عصر اردو ادب نمبر" اب ختم پر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر ہم عصر اردو ادب نمبر۔ ۲ بھی پیش کر دیا جائے مگر جلد اوّل سے فرصت بھی تو ملے۔ کیا آپ نے ہم عصر اردو ادب نمبر کی جلد اوّل حاصل کر لی ہے؟

شاعر کے خریداروں سے

رسالہ شاعر کی مقبولیت اور پوری اردو دنیا میں اس کی رسائی کا سبب اس کے با قارئین ہیں اور ہمیں اپنے قارئین پر فخر بھی ہے تاہم بعض خریدار شاعر بروقت سالانہ ارسال نہیں کرتے جس سے مستقل مالی مسائل اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ گزارش ہے

- **بروقت اپنا زر رفاقت ارسال کیجئے**
- **اپنے بقایاجات کی ادائیگی کیجئے**
- **شاعر کی توسیع اشاعت میں حصّہ لیجئے**

یقین کیجئے کہ شاعر ایک خالص ادبی و علمی رسالہ ہے قطعی غیر تجارتی رسالہ اس وقت آپ کے بھرپور عملی تعاون کی ضرورت ہے۔

شاعر کی ۷۰ ویں سالگرہ

جنوری ۲۰۰۰ء میں شاعر اپنی ادبی و صحافتی عمر کے ۷۰ برس مکمل کر رہا ہے۔ ہمارے لئے خوشیوں اور مسرتوں کا یہ وہ نادر موقع ہوگا کہ اس کے اظہار کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ادبی رسائل کی تاریخ کی ایک بالکل منفرد اور زندہ مثال ہندوستان کی کسی زبان میں شعبۂ ادب کی ایسی دوسری مثال نہیں۔ یہ فخر ہماری روایت کا فخر ہے۔ ہم اردو والوں کے مزاج سے بھی واقف ہیں۔ وہ کوئی بھی کام اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ وہ کام کوئی سیاسی یا بڑا سماجی مسئلہ نہ بن جائے اور میڈیا میں نہ اچھل جائے چنانچہ اپنے اس فخر میں شاعر کے بے شمار قارئین کو شامل کرنا چاہیں گے۔ یہ ہمارے اسلاف کا ہے اسے ایک صدی مکمل کرنا ہے۔ اپنی ایک اور صدی کو جینا ہے۔ ہزارہ کے شمارے شاعر کی ۷۰ ویں سالگرہ کے بھی شمارے ہوں گے۔

شاعر کی توسیع اشاعت

شاعر کی ستر ویں سالگرہ کے موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ رسالہ شاعر کو دور دور تک پہنچائیں۔ ہند و پاک اور اردو کی نئی بستیوں کے تمام ادب دوست قارئین تک شاعر کی رسائی کا پروگرام ہے۔ ہمیں ایک ایسا NET WORK تیار کرنا ہے جس میں شاعر کے مستقبل کے منصوبوں کی تکمیل ہو سکے یقیناً ۲۱ ویں صدی، شاعر صدی ہوگی شاعر کی توسیع اشاعت کے لئے آپ کیا تعاون دے سکتے ہیں؟ آپ کے ذہن میں کیا خاکہ ہے نئی صدی کے لئے شاعر کو نئے سرے سے دیکھنے، سوچنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ہماری ضرورت ہیں۔ (ادارہ)

امتیاز علی عرشی بنام اعجاز صدیقی



رضا لائبریری - رام پور
۱۵ جولائی ۱۹۸۰ء

میرے عزیز، آپ کے کارڈ نے میرے دکھ کو بڑھا دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے کہ آپ برسہا برس سے اپنا مال رہے ہیں، آندھی میں چراغ جلا رہے ہیں، تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ گروہ مخالفوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے بننے بگڑنے سے تعلق رکھنے والے مسائل کے لیے کوشش فرما رہے ہیں۔ میاں کی ادھیڑ زندگی گیا۔ آنا تو جانور بھی کر لیا کرتے ہیں، دعا ضرور دیتا ہوں کہ اب صحت عطا ہو، تو محنت کا کام بھی توفیق ملے۔

پچھلے ہفتے لو بلڈ پریشر کا مجھ پر حملہ ہوا ہے۔ آج کل $\frac{110}{80}$ دیا دے ہے، جبکہ میری عمر تو بیاسی سال ہے۔

نئے مضامین لکھنے کی ہمت اب نہیں رہی۔ کچھ پچھلے ادھورے مسودے رکھے ہوئے ہیں۔ ذرا ٹھیک ہو جاؤں، تو اُن کو نکالوں گا، اور بعد تکمیل و تہذیب حاضر کر دوں گا۔

خدا کرے یہ خط آپ کو بالکل تندرست پائے۔ والسلام

مخلص
عرشی



جگن ناتھ آزاد

اس دور میں دنیا! ترے تیور نہ سمجھنا
ایسا ہے کہ بُت گر کو بھی کافر نہ سمجھنا

اے عزمِ سفر! ذوقِ سفر تیرا محافظ
خارِ رہِ منزل کو گلِ تر نہ سمجھنا

وہ سنگ سہی کہتے ہیں گوہر جسے لیکن
ہر سنگ کو اے دل! کبھی گوہر نہ سمجھنا

جوہر جسے کہتے ہیں وہ ذرّہ سہی لیکن
ہر ذرّے کو یارو! کبھی جوہر نہ سمجھنا

جو اپنی طرف آپ جبینوں کو نہ کھینچے
اس در کو کبھی سجدۂ گہہ سر نہ سمجھنا

اے اہلِ حرم! کفر کی دولت ہے بڑی چیز
تحقیر سے مجھ کو کبھی کافر نہ سمجھنا

ظاہر کا نہیں رہبر و رہزن میں کوئی فرق
رہزن کو مسافر! کبھی رہبر نہ سمجھنا

ذرّات بھی ہوتے ہیں فضاؤں میں درخشاں
اے دیدۂ روشن انہیں اختر نہ سمجھنا

وجدان کے پھولوں کی مہک شعر ہے اس کو
افکار کی امواج کا گوہر نہ سمجھنا

تابندہ روایاتِ سخن کہتی ہیں مجھ سے
ہر قافیہ پیما کو سخنور نہ سمجھنا

یہ دل مرا آزاد! جہاں بیں تو ہے لیکن
اس کو کسی جمشید کا ساغر نہ سمجھنا

●A-25, GOVT. QUARTERS,
GANDHI NAGAR, JAMMU- 180004



مصوّر سبزواری

وہ رزمیوں کی شجاعت پہ دنگ ہوتی ہوئی
تھی اک نیام میں تلوار زنگ ہوتی ہوئی

مبارزت کی طلب بجھ گئی قبیلے میں
لڑی ہو جیسے کتابوں میں جنگ ہوتی ہوئی

ادھر ہی جائیں گے آوارگانِ اوّلِ شب
گلی جو کھلتی ہے اندھی سرنگ ہوتی ہوئی

سفر ہے پھیلتے سایوں سکڑتے جسموں کا
رہِ نجات بتدریج تنگ ہوتی ہوئی

سپاہِ فیل سیہ سوچ کر ذرا یلغار!
ہیں چیونٹیوں کی قطاریں دبنگ ہوتی ہوئی

کوئی نہیں ہے نمودِ کنارۂ روشن
ہوا ہے سر پہ سو دیوار سنگ ہوتی ہوئی

●CHOUDHRI SARAI SAMBHAL
DISTT : MORADABAD (U.P.)



وارث کرمانی

غریب شہر

یہ کیا بستی ہے کیسے لوگ ہیں یارب کہاں ہوں
یہاں کے رہنے والے سب معزز اور مہذب
نہ ان کی رمزیت مجھ میں نہ میری سادگی ان
نہ ان کے عالمانہ تبصروں کے فن سے میں واقف
نہ میری بے تکلف گفتگو کی قدر انہیں معلو
یہ اپنی بات پہلے ذہن میں تیار کرتے
اسے کچھ کاٹتے کچھ پیٹتے کچھ تیز کرتے
پھر اس میں تہ بہ تہ معنی کے امکانات رکھتے
فضا آگاہی والہام کی لفظوں میں جھلکا
مطالب کی بلندی کو مہ و انجم پہ لے ج
بڑی نرمی سے پھر اس بات کا اظہار کرتے
کہاں تک خوبیاں ان کی بتاؤں بے زباں ہوں
یہ کیا بستی ہے کیسے لوگ ہیں یارب کہاں ہوں

EWA SHARIF
ST BARABANKI. (U.P)

فنِ شاعری ،شاعرات ،مابعد جدیدیت اور ....

ادبی سحر

شاعر میں فنّی وعروضی مسائل پر گفتگو کا سلسلہ تو رسالے کے اجراء ۱۹۳۰ء سے جاری ہے۔ لیکن ترقی پسندی اور جدیدت کے مستعار شور نے اردو کی کلاسیکی شعری روایت کو نہ صرف یہ کہ نقصان پہنچایا بلکہ نام نہاد اور خودرو قلم کاروں کی بلکہ جعلی قلم کاروں کی حوصلہ افزائی زیادہ ہوئی۔ غزل پر نظم کو ترجیح ملا بند نظمیہ شاعری کا زوال آزاد اور نثری نظم اور اب غیر ضروری ہیئتی تجربے۔ ان سب نے غزل جیسی ذہین صنف سخن کو خاصہ تسرب کیا اور غزل بہ لحاظ شاعری کمزور ہوئی۔ دبستان ختم ہوگئے بلکہ کردیئے گئے۔ شاعر کے صفحات پر فنی و عروضی بحثیں بھی کم ہوئیں، بطور خاص ۱۹۷۵ء کے بعد حالیہ برسوں میں تو غزل کا فن زیادہ بے راہ روی کا شکار ہوا ہے۔ ہندوپاک کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والا شعری لوازمہ اس کی عکاسی کرتا ہے۔ شعری مجموعوں کی بہتات نے غزل کو اور بھی نقصان پہنچایا ہے اور غزل مخالفین کو نکتہ چینی کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ ہم نے غور کیا ہے اور ہم چاہتے بھی ہیں کہ ازسر نو غزل کے حوالے سے فنی و عروضی مسائل پر شاعر کی فائلوں سے انتخاب دیا جائے مگر اس سے قبل صاحب فن حضرات سے شاعر کے شعری مشمولات پر اظہار خیال کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ علامہ شارق جمال ہوں یا محترم طلحہ رضوی برق یا سید مبارک علی۔ ہمارا مقصد غزل کی نئی آوازوں کو فنّی وعروضی مسائل سے متعارف کروانا ہے۔ غزل کے فن پر نیا تنقیدی مکالمہ قائم کرنا اب ناگزیر ہوگیا ہے۔ طلحہ رضوی برق صاحب نے جہاں جہاں گرفت کی ہے ان پر بھی بحث ممکن ہے۔ علامہ شارق جمال کے اعتراضات پر بعض قلم کاروں نے اپنا دفاع کیا ہے۔ مکتوبات کے کالم میں ایسے خطوط ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ ایک بنیادی نکتہ یہ ہے اور تاریخ عروض گواہ ہے کہ ماہرین عروض داں کبھی بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوئے۔ اختلافات کی گنجائش ہمیشہ ہی رہی ہے۔ اور رہے گی۔ مثلاً یہ کہ علامہ شارق جمال اور طلحہ رضوی برق صاحب نے شاعر کے شعری مشمولات کے نقائص پر جو گرفت کی ہے اس سے مدیر شاعر کا فنی و عروضی شعور مشکوک ٹھہرتا ہے لیکن صاحب فن اندازہ کرسکتے ہیں کہ اغلاط وتسامحات میں کہیں سہو ہے توکہیں کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ کہیں کوئی لفظ کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے۔ کہیں مدیر کا اپنا شعری رویّہ بھی کارفرما ہے۔ بہر حال ! شاعر کا ہر شمارہ ادب کے باذوق قاری اور نئے قلم کاروں کی ذہنی تربیت کے لئے ہوتاہے۔ مگر یہ بزرگ قلمکاروں کے لئے بھی ہے۔

ڈاکٹر نکہت الدین شاہاں نے خواتین کے ادب کے بارے میں جو سوال قائم کئے ہیں وہ بہت اہم ہیں اور غور طلب بھی۔ ان پر بحث ہونی چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں شاعرات کی خاصی بڑی تعداد سامنے آئی ہے بالخصوص پاکستان میں۔ اور اب ہندوستان اور اردو کی نئی بستیوں سے بھی نئے نام سامنے آرہے ہیں۔ تاریخ ادبیات اردو ہو یا انگریزی۔ اگر ماضی میں شاعرات کو اہمیت نہیں دی گئی تو اس کی بہت ساری وجوہ ہیں۔ کم از کم غیر منقسم ہندوستان میں ان تمام وجوہ پر انگریزی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے:

SECLUDED SCHOLARS WOMEN'S EDUCATION AND MUSLIM SOCIAL REFORM IN COLONIAL INDIA BY GAIL MINAULT - 1996

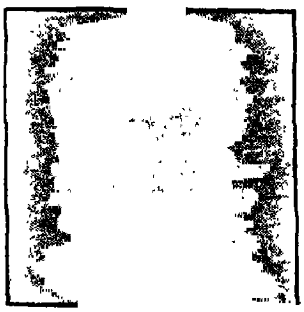
اس کتاب کے مباحث نہایت ہی فکر انگیز ہیں اور بتاتے ہیں کہ تعلیم نسواں کے تحت عورت کے ذہنی سفر نے گذشتہ چند دہائیوں میں اپنے وجود کو ہر سطح پر منوایا ہے۔ عورت تو صدیوں سے مرد کے زیر اثر رہی ہے لیکن اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار بھی کرتی رہی ہے جس کو مرد دنیا نے کبھی بھی اہمیت نہیں دی۔ یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اس پر کوئی بحث کوئی مکالمہ قائم کیا جائے تاہم تاریخ ادب اردو کے حوالے سے یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ عورت بطور شاعرہ ہر دور میں موجود رہی ہے لیکن "عیب و گناہ" کے شدید اثرات سے کبھی بھی آزاد نہیں ہوسکی ہے۔ آج بھی نہیں ۔عورت پر مرد کے جبر اور ظلم و ستم کی ایک پوری تاریخ کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ عورت کو فنون لطیفہ سے باہر رکھنے کی پوری سعی کی گئی ہے جبکہ فنون لطیفہ، عورت ہی سے عبارت ہے آج بھی مرد کے تسلط سے 'عورت' کو من چاہی عورت کی سطح سے اوپر اٹھنے نہیں دیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے تو عورت کا نہ صرف یہ کو خوب خوب استعمال کیا ہے بلکہ خوب خوب استحصال بھی کیا ہے اور عورت مسلسل بے لباس اور بے روح ہورہی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں جو کچھ ہوا ہے وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی ممکن نہیں۔ زیب النساء مخفی سے ادا جعفری (عزیز جہاں ادا بدایونی) تک بے شمار نام ہیں شاعرات کے جو مرد کی بے توجہی، بے نیازی بلکہ بے اعتنائی کی نذر ہوگئے۔ مولوی کریم الدین کی تذکرۃ النساء "ایک اولین کاوش ہے لیکن وہ میر تقی میرہوں(حالانکہ ان کی صاحبزادی خود بھی اچھی شاعرہ تھیں) یا شیفتہ یا نساخ، یا رام بابو سکسینہ یا کوئی اور مکمی کے ہاں شاعرات کی کوئی اہمیت نہیں۔ شمیم سخن ،تذکرۃ الخواتین یا تذکرۂ شاعرات اردو۔ آزادی ہند سے قبل تک خواتین قلم کار یا شاعرات ،ادب کا کوئی خاص موضوع نہ بن سکیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ہمارے لوک گیت ہمارے محاورے ہماری کہاوتوں کا جو بھی ورثہ ہے وہ عورت ہی سے بن سکا

ہے۔ ہماری والدہ ملجدہ اردو کی ادبی صحافت کا ایک نہایت اہم مگر خاموش کردار ہیں۔ ان سے زبان کی فصاحت و بلاغت کا درس ملا ہے۔ محاورں اور کہاوتوں کا جو کتابی سرمایہ ہے وہ ہمارے علم میں ہے لیکن کتابی محاوروں اور کہاوتوں سے قطع نظر بھی جو کچھ ہمیں والدہ سے حاصل ہوا ہے وہ ہماری تربیت کا ایک حصہ ہے۔ حال ہی میں گفتگو کے دوران کسی موضوع کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ : بھوک میں دیوار بھی پاپڑ لگتی ہے۔ ایسے ہی بہت سارے محاورے اورکہاوتیں جو کتابوں میں نہیں رہیں، اپنی والدہ سے سننے اور سیکھنے کو ملی ہیں۔ ماضی میں تعلیم نسواں کے تحت کئی ایک ریفارمر سامنے آئے ہیں۔ سرسید احمد خاں علّامہ راشد الخیری ،حالی اور سیماب اکبرآبادی کے نام نمایاں ہیں خواتین کے پچاس سے زائد ادبی رسائل شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ سارا موضوع ایک کتاب کا موضوع ہے۔قصّہ مختصر یہ کہ ماضی میں جو کچھ ہوا ۔ رسالہ شاعر نے ابتدائی زمانوں ہی سے خواتین کی نگارشات کو اہمیت دی ہے ۔ نئی نسل میں سے با صلاحیت قلم کاروں کو متعارف کروانے کا عمل جاری ہے۔ "عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب'خصوصی شمارہ' صرف ایک اشاریہ ہے اس موضوع پرخاص نمبر بھی آئے گا اور تذکرہ بھی ۔ ذکاء الدین شایاں صاحب کے قائم کئے گئے سوال زیر بحث آئیں گے۔ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا ہے۔

ڈاکٹر اسلم حنیف نے اپنے طور پر مابعد جدیدیت کی افہام وتقسیم کی ہے۔ اس موضوع پر آئندہ شمارے کے ادبی فیچر میں اظہار خیال کیا جائے گا۔(الف الف)

"فنِ شاعری کا جاننا ضروری ہے"

رضوی برق



ماہنامہ "شاعر" ممبئی بابت ستمبر ۱۹۹۹ء کا نہایت فکر انگیز اداریہ غزل جو دشمنوں کو بھی دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ مسلّم غزل ایک مکمل تہذیب ہے ایک مسلسل تاریخ۔ شاعری کا فن خونِ جگر کا متقاضی ہے اور خونِ جگر عبارت ہے زندگی سے۔ غزل زندگی اور اس کی شائستگی ہمہ جہت کا دلآویز آئینہ ہے۔ نسلیں گذری ہیں اس کی نوک پلک درست کرنے میں تب اسے وہ جمالِ جہاں آرا نصیب ہوا جس کے مُجیر ہر زبان و ہر مکاں بے شمار ہیں۔ جناب شارق جمال کی تحریر بعنوان بالا بھی اسی شمارے میں اہم اور غور طلب ہے اردو غزل یا شاعری کا فن اور اس کے رموز و غوامض اب عام نگاہوں سے او جھل ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا مبتدیوں سے فاحش غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں جن کے دُور رس نتائج سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مشاعرے اور طرحی مشاعرے مبتدیوں کی تربیت گاہ ہوتے تھے۔ استادی و شاگردی کا رشتہ اہم اور مبارک ہوتا تھا۔ افسوس اب یہ درخورِ اعتنا نہ رہے۔ جناب شارق جمال نے حکیم منظور صاحب کی غزل کا ایک شعر لکھا ہے اور اس میں لفظ "طمانیت" کے تلفظ کی گرفت فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "طمانیت" اور اس کے جس تلفظ کے وہ قائل ہیں اصلاً غلط ہے۔

در حقیقت یہ لفظ طُمَانِینَۃ۔ طمانینت ہے۔ میں انگریزی، فارسی اور اردو کی تین اہم اور مستند لغتوں سے یہ لفظ اور اس کے معنی نقل کرتا ہوں:

(۱) Persian- English Dictionary by F. Steingose Page: 819 . طمانینة. tumaninat: Rest, Repose, Tranquality quite, Serenity of mind,

(۲) واژہ نامۂ نوین از محمد قریب (تہران ایڈیشن ۱۹۶۹) صفحہ ۷۱٦ طُمَانِینَۃ ـطمانینت: آرامیدن ـسکون قلب ـقرار گرفتن. آرامش. آسایش (۳) فرہنگ آصفیہ از مولوی سید احمد دہلوی (جلد سوم صفحہ ۲۴۸) طُمَانِینَت (ع) اسم مونث : اطمینان دل جمعی۔ خاطر جمع۔ تسلی خاطر۔ (یہ لفظ جس طرح بفتح طاے ویک نون مکسور مشہور ہے، غلط ہے۔ صحیح بضم اول وکسر نونِ اول ویاے معروف وفتح نون ثانی بمعنی سکون قلب تصور کرنا چاہئے۔ گو صراح سے ایک نون کے حذف کا جواز ظاہر ہوتا ہے)"۔

اس نون ثانی کے حذف کے جواز کے بعد بھی طمانیت کا تلفظ یاے مشدد سے ہی ہوگا اور یہ قطعاً غلط نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ طبیعت اور طبیعت کی طرح طمانیت اور طمانیت دونوں استعمال میں آگئے ہیں۔ لفظ "طُمَانِینَت" مذکورہ تینوں لغت میں نہیں ہے۔ اسی طرح شریعت اور شرعیت کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

محترم شارق صاحب نے مزید لکھا ہے کہ: "دونوں حرف آخرینہ سے پہلے نِ سبب ثقیل ہے۔ (یعنی) ن + ی = نی، استادِ فن شاعری ابو المعانی مرزا یاس (یگانہ چنگیزی) عظیم آبادی لکھنوی لکھتے ہیں:

"سبب ثقیل وہ ہے جس کا دوسرا حرف بھی متحرک ہو' جیسے همه اور دمه (یہاں 'ہ' فقط اظہار حرکت کے لئے ہے کوئی حرف مستقل نہیں ہے) یا جیسے دل حزیں میں حرکت لام بحالتِ اضافت سبب ثقیل کا وجود اردو میں نہیں پایا جاتا کیوں کہ دوسرا حرف متحرک نہیں ہوتا۔ عطف و اضافت کی وجہ سے متحرک ہوجانا اور بات ہے۔" (چراغ سخن ،صفحہ ۵۴)

شارق صاحب آگے لکھتے ہیں:

اظہار سلیم نے مثمن محذوف (ہزج) ارکان میں غزل کے ۹ مصرع تو کہہ لئے یعنی ان ارکان میں: مفاعلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین "۔

مگر یہ تو سالم بحر کے ارکان ہوئے۔ محذوف میں چوتھا رکن فعولن آتا ہے۔ موصوف محترم نے بجا طور پر حرف علت کے غلط طور پر دبانے اور گرانے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ نئے شاعر اس نقص سے باخبر ہیں یا عمداً اس غلط کے مرتکب ہوتے ہیں۔ "شاعر" ستمبر ۹۹ء کے صفحہ ۱۷ پر مقیم اثر بیاولی کی پہلی ہی غزل میں ہر قافیئے سے الف بیجا طور پر غائب ہو جاتا ہے۔

خون جگر امانت غم کو پلاتا کون شب رنگ خلوتوں میں سحر جگمگاتا کون

ان کی دوسری غزل کا آخری مصرعہ بھی دیکھئے۔ ع۔ جس موج کو ابھرنا تھا آخر ابھر گئی۔ حکیم منظور صاحب کا مصرعہ "اب صدائیں بھی دے کوئی" در کوئی کھلتا نہیں" بدلا جا سکتا تھا مگر اپنی اصلی صورت میں بھی غلط تو نہیں۔

حضرت علامہ سیمابؔ کے مصرع میں جانے کی 'ی' دبتی ہے تو اسی نظیر سے ہم حکیم منظور کے مصرع کا دفاع کریں گے اور ان کے ہی مصرع بجلیاں لہرائیں جب کھیتی ہری ہونے لگی۔ " سے اسی شمارۂ پیش نظر میں ذکاء الدین شایاں کے مصرعہ: ع خونیں زیبائشوں سے چہرے خراش آلودہ۔ صفحہ ۲۲ اور جناب وحید اشرقؔ کے مصرع: ع تمام ساماں ہیں اک دل کا درد ہی کم ہے۔ صفحہ ۴۳ کا درست ہونا تسلیم کریں گے۔

نئی غزلوں میں اکثر ایسی غلطیاں نظر آرہی ہیں جنہیں نہیں ہونا تھا مثلاً نظام ہاتف صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں ع "کبھی تو وہ شبہ معتبر سے" نکلے گا۔ لفظ شُبہ ہے نہ کہ شَبہ بروزن قلم (فَعَل) صفحہ ۳۹ پر مسلم شہزاد کی غزل میں یہ شعر ہے۔

دھنک کیا، چاند کیا، لالہ کیا، استعارہ کیا کہ مملکت تو سبھی پہ اسی صنم کی ہے

مصرعوں کا وزن ہے: مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن اس شعر کے مصرعہ اول میں لفظ "کیا" صرف "ک" ہو کے رہ گیا ہے جب کہ کیا بروزن کا آنا چاہئے۔ مثلاً ع کیا وہ نمرود کی خدائی تھی یا دو دن کی زندگانی میں کیا کیا کرے کوئی۔ پھر دوسرے مصرعے میں مملکت سے زیادہ مناسب لفظ ملکیت ہوتا بہ اعتبار معنی اور "پہ" کی جگہ "پر" ۔ پہ اور پر کے استعمال سے آج کل عام ناواقفیت نظر آتی ہے۔ غزل کے فن میں قافیے کا ہنر بھی بے حد اہم ہے۔ صرف ایک حرف روی کے ناقص علم سے قافیوں کی تمیز مشکل ہے۔ نئی غزلوں میں قافیے بھی اکثر غلط نظر آنے لگے ہیں۔ شاعر اگست ۹۹ء کے صفحہ ۱۸ پر دلکش اعظمی کی غزل میں بَندہ، زندہ، پراَگندہ اور باشِندہ قافئے آتے ہیں۔ اسی غزل کے مطلع کا دوسرا مصرع ناموزوں چھپا ہے اور چھٹے شعر کے مصرعوں میں لفظ "میں" اور "تم" غالباً چھوٹ گیا ہے۔

اسی طرح صفحہ ۳۸ پر فضل افضل صاحب نے اپنی غزل میں بہرے گہرے کا قافیہ "چہرے" لایا ہے۔ اسی صفحہ پر راشد انور راشد کا مصرعہ ہے: پندار زندگی پہ لگا رنگ مگر کیوں؟ زندگی کا وزن فاعلن ہے نہ کہ فعولن۔ شاعر بابت جون ۹۹ء کے صفحہ ۱۳ پر باقی احمد پوری نے ہیم' ہدم کا قافیہ موسم لکھا ہے صفحہ ۳۶ پر قائم علی قائم نے غبارہ اور کنارہ کا قافیہ نعرہ لایا ہے۔ صفحہ ۴۳ پر سلطانہ ذاکر ادا نقوی کی غزل کے اس مصرع "چشم ماضی کو جو کھولا تو بہت روزن نکلے" میں لفظ "بہت" کی ت مصرعہ کے وزن سے فاضل ہے۔ صفحہ ۴۶ پر کنیز فاطمہ کرن اپنی غزل میں "گل وغنچے" اور "لمبی وتاریک" لکھتی ہیں۔ صفحہ ۱۶ پر حضرت حقی کی غزل میں ایک مصرعہ ہے غرضیکہ میں نے مکاں ہی کو لامکاں سمجھا" "غرضیکہ" کی جگہ پر "غرض کہ" ہونا چاہئے تھا۔ صفحہ ۲۰ پر عابد اللہ غازی کی غزل میں "ذات" کا قافیہ "ساتھ" لکھا ہے جب کہ "سات" لکھنا تھا جیسا کہ رات کا قافیہ "ہاتھ" نہ لکھ کے "ہات" لکھتے ہیں۔ صفحہ ۲۱ پر عبد القوی ضیا کا مصرع "خیال رہزن کیا رہنما کیا" ناموزوں ہے۔ رہزن کی جگہ رہزنی ہوتا ہے۔ شاعر بابت جولائی ۹۹ء صفحہ ۴ پر خواجہ عطش لکھتے ہیں۔ "سفر کچھ بھی نہیں جز اک ارادہ" "جز یک ارادہ" لکھنا چاہئے تھا۔ آخری شعر میں اس غزل کے لفظ ٹکہ بجائے ٹکا لایا ہے۔ ٹکہ مسلم دور حکومت میں ایک سکہ تھا۔ روپیہ کہہ لیں۔ صفحہ ۳۶ پر بانو ارشد کی غزل میں ردیف ہے "شروع کیا" لو رہے ردیف "شرو کیا" ہو کے رہ گئی ہے۔ صفحہ ۷ پر اقبال واجد کے اس شعر میں:

اے مہر جہاں تاب تری بات پہ اکثر زخم جگر درد سے بیتاب بہت تھا

"زخم جگر درد" کی ترکیب بعید از فہم ہے۔

غرض یہ کہ غزل جو اردو شاعری کی آبرو کہی گئی ہے، صرف خون جگر چاہتی ہے۔ آتش نے شاعری کو مرصع سازی کہا ہے۔ اک مصرعہ تر کے لئے فن شاعر میں

سیروں لہو خشک ہوتا ہے۔ کیوں زبان کی یہی صفائی ستھرائی، سادگی و سلاست، روانی و برجستگی، لب و لہجے کی نزاکت و صلابت، محاورہ، روزمرہ، ضرب المثل اور تشبیہ و استعارے کا برمحل و درست استعمال، انتخاب وزن و بحور، قافیہ و ردیف کا علم، پرواز خیال، ندرت فکر، تازگیٔ مضامین بندش الفاظ و تراکیب اور ان سب کے ساتھ فرد و معاشرہ کے قلب کی دھڑکن، نبض ہستی کی دھمک، زندگی بدلانی، طبع کی جولانی اور وہ سب کچھ، جسے ہم شاعری بالخصوص غزل کا فن کہتے ہیں مزاج غزل سے آشنائی ہی اچھی شاعری کی بنیادی شرط ہے۔ مطالعہ، ریاض، مشق و ممارست کو ہم معین و معاون ہی کہیں گے اور بس کہ یہ مرہون منت ہے اس وجدان شعری و خوش مذاقی کی جو خاص قدرت کا عطیہ ہے کیوں کہ:

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

● SHAHTOLI DANAPUR CANTT. PATNA- 801503 (BIHAR)

ادبیات میں خواتین کا تناسب؟

■ کمال الدین سامان



خواتین کے لئے ادب تخلیق کرنا اور خود خواتین کا ادب کی تخلیق میں گزشتہ چند دہائیوں سے یکایک بے تحاشہ شامل ہو جانا، توجہ طلب ہے۔ اور یہ دونوں عمل بالکل متضاد ہیں۔ انگریزی اُردو، فارسی یا دوسری ملکی اور بین الاقوامی زبانوں کے ادبیات کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو اندازہ ہوگا اور یہ سوال سامنے آئے گا کہ کئی صدیوں پر محیط ادب و شعر میں آخر ہر جگہ خواتین فنکاروں کا وجود کیوں نہیں ہے؟ اور یکایک اس رواں صدی کے آخری حصوں میں خواتین نے شدت کے ساتھ ادبیات کی جانب رُخ کیوں کیا ہے؟ ہمارے اکثر مفکرین اور نقاد اس بارے میں یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ مرد کے معاشرے نے عورتوں کے تخلیق کردہ ادب کا تذکرہ اپنی ادبی تاریخ سے خارج کر دیا ہے۔ بات عجب ہے۔ اردو ادبیات ہی پر نظر ڈالئے۔ سترھویں، اٹھارہویں، انیسویں اور اب بیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے تک خواتین کا تخلیقی ادب کیا محض اس لئے منظر عام پر نہیں لایا گیا کہ ادبی مورخین نے اسے پوشیدہ رکھنا چاہا؟ یا حقیقتاً خواتین کا تخلیقی ادب ایسا تھا ہی نہیں کہ قابل ذکر ہوتا یہ مسئلہ اہل ادب اور اہل فکر کے لئے شدید غور و خوص کا متقاضی ہے۔ یوں تو ہر ادب میں مردوں نے سچائی کے ساتھ عورتوں کی زندگی کے ہر پہلو پر اتنا مواد تخلیق کر دیا ہے جو اپنے معیار و مرتبے میں خواتین کے تخلیقی ادب پر بھاری رہے گا۔

اپنی اُردو زبان کی ادبیات سے قطع نظر، ہم پہلے انگریزی ادب و شعر کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہماری طرح کیا انگریزوں نے بھی (جو بہر حال ہم سے زیادہ حقیقت نگار اور صاف گو سمجھے گئے ہیں) خواتین تخلیق کاروں سے تعصب برتا؟ کیونکہ چودھویں 'صدی' سے لے کر پانچ صدیوں کے ادب میں صرف چار پانچ خواتین ہی کا چند سطری تذکرہ ملتا ہے۔ بعد کو انیسویں اور بیسویں صدی میں ضرور چند عورتیں ادب کے میدان میں ابھری ہیں جن میں زیادہ تر ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں اور بہت کم شاعرات بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تنقید کے دائرے میں کسی خاتون نقاد کا حوالہ نہیں۔ اب موجودہ مغرب میں "ماڈلنگ" کے تصویری کاروبار اور نمائشی جولاں گاہ کی طرح انگریز خواتین ادب کو کتنی کثرت سے اپنائے ہوئے ہیں، یہ جائزہ اس سے باہر ہے۔

ڈبلو۔ آر۔ گڈمین نے دو ضخیم حصوں میں "اے ہسٹری آف انگلش لٹریچر" مرتب کی جس میں ابتداء سے لے کر اٹھارہویں صدی کے آخر تک کے ہر صنف کے شاعروں اور ادیبوں کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ ۹۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ اس کی پہلی جلد ہے جس میں عظیم عہد ساز اور دیگر چھوٹے بڑے مصنفین کی تعداد ڈیڑھ سو ہے۔ ان میں صرف پانچ نہایت معمولی خواتین ہی کا ذکر ہے جن کی بابت چند جملوں میں تذکرہ شامل ہے۔ تفصیل یہ ہے۔ چاسر کے عہد میں اٹھائیس بڑے قلمکاروں میں کوئی خاتون نہیں۔ بلکہ ایلی زبتھ کے طویل دور کے ۱۳۰ شاعروں اور نثر نگاروں میں خاتون کا وجود غائب ہے۔ سترھویں صدی کے تیس مصنفوں میں خاتون کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اٹھارہویں صدی کی ابتداء کے سولہ مصنفین کے درمیان خاتون کا نام ہے۔ اٹھارویں صدی میں بعد کو پینتالیس اہل قلم کے ساتھ صرف پانچ خواتین کا چند سطری ذکر ہی کیا گیا ہے۔

۱ ۔ جینی برنی ۔ ایک معمولی نثر نگار۔
۲ ۔ لیڈی میری مونٹیگو ۔ چند خطوط اس کے نام سے وابستہ ہیں
۳ ۔ مس کلارا ریو ۔ معمولی تخیل اور رومانی انداز کے خوفناک منظوم افسانوں کی مصنفہ۔
۴ ۔ محترمہ این ریڈکلف ۔ مافوق الفطرت۔ محیر العقول اور رومانی خیالات رکھنے والی معمولی نثر نگار
۵ ۔ محترمہ جینٹ لیوری۔ دو معمولی ڈراموں کی مصنفہ

اس تاریخی جائزے سے واضح ہو کہ ان پانچ خواتین میں شاعرہ کوئی نہیں ہے اور نہ کوئی تنقید نگار ہے۔

گذمین کی مذکورہ انگریزی ادبیات کی تاریخ کا دوسرا حصہ ایک سو چالیس قلمکاروں کے تفصیلی اور تنقیدی تذکرے پر مشتمل ہے۔ جن میں صرف بارہ خواتین نثر نگاروں کا ہی ذکر ملتا ہے۔ اور شاعری کے باب میں دو تین ہی عورتیں ہیں جنہوں نے ضمنی طور پر نثر کے ساتھ ساتھ برائے نام شعر گوئی سے بھی تعلق رکھا۔ تنقید میں کوئی نہیں ہے تاریخ کی یہ جلد (صفحات ۳۵۰) تین بڑے ادوار میں منقسم ہے۔

۱ ۔ انیسویں صدی کا رومانی عہد ۔ (جان آسٹن)

۲۔ وکٹورئن دور ۔ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۸۰ء تک ۔ (الیزبیتھ براؤننگ برسٹنا روسٹی۔ مسز ٹرولوپ۔ چارلٹ برونٹ۔ مسز جارج ایلیٹ)

۳۔ جدید عہد ۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۶۶ء تک (مسز رچرڈسن ۔ کیتھرائن۔ ورجینا وولف) ان ادوار میں صرف نو خواتین کا ذکر ہے۔

اس طرح جائزے کے مطابق پورے انگریزی ادب میں تقریباً تین سو مرد شاعروں، نقادوں ادیبوں اور نثر نگاروں کے مقابل کم و بیش صرف چودہ خواتین کے نام ملتے ہیں جو اصلاً نثر نگار ہیں ان میں بھی جان آسٹن، چارلٹ برونٹ، جارج ایلیٹ اور ورجینیا وولف ہی کو ادبی عظمت حاصل ہو سکی۔ ۱۹۶۶ء تک انگریزی ادبیات میں خواتین کا یہی تناسب ہے۔ اب اردو ادبیات کی تاریخ ملاحظہ کیجئے۔ قدیم تذکروں میں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رام بابو سکسینہ جیسے صاحب علم، انصاف پسند اور ایماندار ادبی مورخ نے انگریزی میں جب ضخیم "تاریخ ادب اردو" مرتب کی تو ۱۹۲۲ء تک کسی بھی خاتون کا تذکرہ نہیں کیا۔ کیا وہ خواتین سے تعصب برتتے تھے؟ یا حقیقتاً انہیں تلاش کرنے کے باوجود کوئی بھی ایسی ادیبہ، شاعرہ یا مصنفہ نہیں مل سکی جس کے تذکرے کو وہ اپنی تاریخ میں شامل کرتے۔؟ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور ہمارے سنجیدہ محققین کو اس طرف توجہ دینا چاہئے۔

ترمیم اور اضافے کے ساتھ دسمبر ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے "مختصر تاریخ اردو ادب" کو شائع کیا۔ اس میں خورشید الاسلام تک ایک سو چھتر ادیبوں، ناقدوں اور شعراء کا نام درج ہے۔ خاتون اہل قلم سرے سے غائب۔ ایسا کیوں ہے، البتہ جب ترقی پسند تحریک کی ابتداء ہوتی ہے۔ (یعنی ۱۹۳۶ء سے) تو ڈاکٹر رشید جہاں پہلی خاتون قلمکار، وہ بھی نثر نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہاں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ سجاد ظہیر کے "انگارے" گروپ کے ادیبوں کو فرائڈ کے زیر اثر جنس نگاری کی پوری آزادی نصیب ہوئی۔ اور پھر عورتوں کو جب موقع ملا، تو انہوں نے اولاً جنس سے ملوث تحریروں کے ذریعہ مردوں کو چونکایا۔ ان میں عصمت چغتائی سرفہرست رہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا تحقیقی مقالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" واضح کرتا ہے کہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے ساتھ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مسرور، رضیہ سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر کی ادبی عظمت کا تمام دارومدار ان کی افسانوی نثر ہی پر رہا اور شعر گوئی سے کسی کا تعلق نہ ہو سکا۔ صفیہ اختر بھی اپنی خطوط نگاری کے وسیلے سے متعارف ہوئیں۔

قاضی عبد الغفار نے "مجنوں کی ڈائری" "لیلیٰ کے خطوط" اور نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے ادب لطیف کے پردوں میں "عورت" کے تمام ذہنی، نفسیاتی، جنسی اور جسمانی زاویوں کو اتنی تفصیل اور شدت کے ساتھ ادب کا جزو بنادیا کہ خواتین فنکاروں کو اپنی طرف سے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نظر نہ آئی، تاہم ترقی پسند عہد کی مذکورہ خواتین نے ناول نگاری، افسانہ نویسی اور خطوط نگاری میں اپنے ذہن و قلم کے جوہر دکھائے اور ادب کی تاریخ میں اپنا نام نمایاں طور پر درج کرالیا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ "ذکر اس پری وش کا" اور وہ بھی خود اس کے نسوانی ذہن و فکر کے لہجوں میں۔ مرد اہل فن کے درمیان کیوں نہ ندرت رکھتا۔ لیکن اس دور میں بھی آخر شاعرات کی پیداوار کیوں التواء میں رہی؟ اس سوال کا جواب کہیں سے تو ملے۔

پاکستان میں "خواتین آپ بیتی" کے خصوصی شمارے بھی اسی ذہنیت کے غماز ہیں جو فی زمانہ عورتوں کی نمائش، لہجوں کی نزاکت، اظہار عشق کے نسوانی طریق اور اسٹیج کی اداکاری اور خوش آدائیگی کے گرد ہی عام مطالبات بنتے جارہے ہیں۔ اس میں اشتہاری روش کے ساتھ خواتین کے مرتب کردہ ادبی تحقیقی مقالے بھی شامل ہیں۔ خواتین تنقید کے میدان میں قطعی ناکام رہی ہیں، اس کے تحفظ کا بھی یہ وسیلہ ہیں۔ اور مستزاد یہ کہ نئی امریکی تنقید نے اس کی کو پورا کرنے کی غرض سے "نسوانی تنقید" کی بے معنی اصطلاح بھی وضع کرلی ہے۔ جس کو ہمارے ناقدین حضرات بغیر سوچے سمجھے اردو تنقید کی راہ میں کوئی انوکھا طرز خیال کر کے برابر خامہ فرسائی میں مصروف ہیں۔ ہماری بالکل نئی نسل جس کو تاریخی سلسلہ وار اردو، انگریزی اور فارسی ادبیات کے سنجیدہ مطالعے سے محروم کردیا گیا ہے۔ ان امریکی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو اصطلاحات کی پیچیدگیوں میں اتنی الجھتی جارہی ہے کہ اس کے سامنے کسی ادب کی حقیقی حیثیت مشتبہ ہو چکی ہے۔

ہندی ادبیات کی دنیا ہی الگ ہے۔ وہاں تو گیتوں، دوہوں اور شاعری میں مردوں کی "محبوبیت" اور عورتوں کے "معاشقوں" کی قدیم زمانے سے آزادی ملی ہوئی ہے چنانچہ ہندی زبان کی شاعرات کے لئے مرد تخلیق کاروں نے کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ اب اسٹیج کی اشتہاریت اور تصویری فراوانی نے اس کو خواص و عوام سب کے لئے ارزاں کردیا ہے۔ آج ادب مطالعے سے تقریباً باہر کی بیکار چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر مسئلہ یہ بھی ہے کہ ادب میں صرف "شاعری" اور اسٹیج ہی اب سب کچھ کیوں ہوتا جارہا ہے؟ ناول، افسانہ، تنقید اور نثر کے سلسلے میں اسٹیج یا نمائش کا گزر کیوں نہیں؟ تنقید اور نثر کے تخلیق کار آخر اپنی مقبولیت کے لئے کون سا حربہ استعمال کریں؟ ۔۔۔۔۔۔ ان کو قارئین کہاں سے ملیں؟

ہم موجودہ ادبی تخلیقات پر سنجیدگی سے غور کریں۔ مرد اور خواتین کے ادب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا بالکل غلط ہے۔ تخلیق کردہ ادب پاروں کا وزن سب سے اہم ہے۔ اگر کوئی تخلیق اس وزن کے معیار پر پوری نہیں اترتی، تو اسے مقابلے میں کم درجہ دینا چاہئے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا خالق مرد ہے یا عورت۔ ہمیں یہ تو غور کرنا لازم ہے ہی کہ آخر ان آخری دو دہائیوں کے اندر یکایک حشرات الارض کی طرح شاعری کے اسٹیج یا اوراق پر اچانک اتنی بڑی تعداد میں خواتین کا وجود کیسے ہو گیا؟ جب کہ گذشتہ تین چار صدیوں میں ان کا نام "شاعری" میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر ہے بھی، تو محض افسانہ یا ناول وغیرہ کی نثر میں۔ یوں تو خواتین اور گھریلوں زندگی کے مسائل پر مبنی ہندوپاک میں سیکڑوں ڈائجسٹ اور جرائید برابر شائع ہو رہے ہیں اور بازار ان سے پٹے ہوئے ہیں! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ "ماڈلنگ" کے اثرات نے خواتین شاعرات کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو!

● NEAR CITY OLD POST OFFICE , PAKARIA/ PILIBHIT, 262001 (U.P)

"مابعد جدیدت" اور "اردو کی تازہ نسل"



اسلم حنیف

بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کے آس پاس ابھرنے والی نوجوان اردو نسل کے حوالے سے مختلف و متضاد قسم کے نظریات مختلف اردو رسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے مضامین کی اشاعتی رفتار بہت دھیمی ہے لیکن ان کی اہمیت و افادیت سے اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اٹھارہ انیس سال سے مسترد کی جانے والی نئی نسل پر ادبی جرائد اور ادبی مفکرین نے اب باقاعدہ سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ سن ستر کی نسل کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا جا سکا ہے اس لئے کوتاہ نظری کی تاریخ اور زیادہ طویل قرار دی جا سکتی ہے۔ قطع نظر اس کے "مابعد جدیدیت" کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اجمالی طور پر یہ خلاصہ سامنے آتا ہے۔

(i) اردو کی متذکرہ نسل جدیدیت ہی کی ایک توسیعی شکل ہے۔ (ii) اردو میں مابعد جدیدیت (Post Modernism) کا وجود لایعنی ہے۔ (iii) اس نسل کو مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کیا جانا چاہئے۔ (iv) شناخت کے لئے کوئی نیا نام رکھا جانا چاہئے۔

جو لوگ زیر بحث نسل کو جدیدیت کی توسیع قرار دیتے ہیں وہ "توسیع" کے معانی کا تعین نہیں کرتے یعنی یہ نسل ماڈرنزم (Modernism) کی توسیعی شکل ہے یا پائی ماڈرنزم کی؟ اور اردو میں رائج الفاظ "جدید" اور "جدید ترین" ان ہی تحریکوں کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں یا ان مفاہیم سے ہٹ کر ان کا استعمال کیا جاتا ہے؟

مغرب میں وکٹورین رویے اور مارکزم کے تحت جو تنقیدیں لکھی جا رہی تھیں اس میں تصنیف پر مصنف کی اہمیت کا نظریہ وکٹورین رویے کی دین تھا اور مارکزم سے تعلق سے واحد معنی اور غیر مشروط وابستگی کے تصورات نے جو ماحول پیدا کیا تھا اس کے خلاف رد عمل کی صورت میں "نئی تنقید" وجود میں آتی ہے۔ نئی تنقید نے متذکرہ اصول کی نفی کرتے ہوئے تخلیق کی خود مختاری کا احساس بیدار کیا۔ تمام خارجی دباؤ لایعنی قرار دیتے ہوئے مصنف پر تصنیف کی اہمیت و عظمت کے دلائل فراہم کئے۔ اس تنقید نے کثرت معنی کے نظریے کو اہم قرار دیتے ہوئے Close Reading یعنی ایسی قرأت جس کی روشنی میں تخلیق کے باہمی مضمرات اور انجذاب کی کیفیت ابھر سکے کو رائج کیا۔ اس طرح ادب میں ایک نئی فکر کو تحریک بننے کے مواقع فراہم ہوئے لیکن چھٹے دہے میں اس کے خلاف ہائی موڈرنزم کا آغاز ہوا اور اس نئے نظریے کے فروغ میں ساختیات نے اہم اور نمایاں رول ادا کیا۔ نئی تنقید کے تحت تخلیق جو خارجی رشتوں سے منقطع تصور کی جاتی تھی، کی نفی کے ساتھ ساختیات نے خارجی اور باطنی رشتوں کا احساس دلاتے ہوئے اسے Verbal I CON کی جڑوں سے آزاد بھی کیا۔

ساختیات نے لسانی کارکردگی ہی کو سب کچھ تسلیم کیا ہے۔ اس کی رو سے فنکار صرف ایک فاعل کی حیثیت رکھتا ہے جو قلم کے ساتھ بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے اور اس طرح تخلیق کا عمل خود کار ہو جاتا ہے اور تحریر بین المتنیت کے حوالے ہو جاتی ہے چونکہ لاشعور کی صفت باطنیت Mysticism اور پر اسراریت سے لاتعلق ہوتی ہے اس لئے ساختیات میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ساختیاتی مفکرین کا اہم اور بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے نفسیات کو بھی لسانی نظام فکر سے مربوط کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور جنسی خواہشات کی تکمیل کو بھی لسانی نظام کا حصہ ثابت کیا ہے۔

ساتویں دہائی کے آس پاس مغرب میں مابعد جدیدیت Post Modernism کا آغاز ہوتا ہے یہی دور پس ساختیات Post structuralism کا دور بھی ہے جس کی ابتدا دریدہ کے انقلاب آفریں مضمون سے ہوتی ہے۔

دریدہ تحریر کو گورکھ دھندا قرار دیتا ہے اور دنیا کا کھیل اس کے نزدیک آزاد کھیل ہے۔ اس کے خیال کو تقویت نیومکس پر تشریحی عمل کے نتیجے میں Fouts یا Trace کی نشاندہی، سے حاصل ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے علمبردار تخلیق کی معنویت کے انکار کے لئے معنی کے مستقل التوائی عمل یا ساخت شکنی کے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی معنی کی کوئی سطح نہیں ہوتی بلکہ معنی جس سطح پر ہوتے ہیں اسے بغائر مطالعہ کرنے پر نیچے کی طرف لڑھک جاتے ہیں اس طرح یہ مستقل عمل لامرکزیت کے نتیجے پر چھوڑ دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں ماہنامہ صریر، مئی ۱۹۹۹ء کا یہ اقتباس پیش کر دینا بھی ضروری ہے۔

ما بعد جدیدیت اور پس ساختیات کے نظریات میں کچھ تعلق ضرور دکھائی دیتا ہے مثلاً دال SIGNIFIER پر زور، سچائی کو تشکیک کی نگاہ سے دیکھنا اور اسے نسبی Relatine قرار دینا اور موضوع کو کئی حصوں میں تقسیم کردینا FRAGMENTATION OF THE SUBJECT لیکن ان میں کچھ اہم فرق بھی ہے مابعد جدیدیت عمومی طور پر دال کو ثقافت کی عمل داری میں لے جاتا ہے اور مدلولی SIGNIFIER کو نلکارہ بنانے میں زیادہ شدت دکھاتا ہے۔ یہ زبان کی اس صلاحیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ سماجی اور ثقافتی میدان میں معنی پر قابو رکھ سکتی ہے۔ مابعد جدیدیت نظریات کی منطقی حد تک سماجی عناصر کی فعالیت پر زور دیتا ہے اور لسانی مصرف (یعنی قرأت اور تفہیم) کو زیادہ اہمیت دیتا ہے کیوں کہ یہی مصرف Consumtion کی تھیوری کی منطقی تشریح کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتا ہے۔ چونکہ مابعد جدیدیت کی تھیوری کا اوّلین رشتہ ثقافتی میدان سے ہے اس لئے ادبی مطالعہ پر اس کا کوئی اثر ابھی تک نہیں ہوا ہے جسے اہمیت دی جائے۔

مابعد جدیدیت ان نظریاتی عناصر کا جو تقریباً پچھلے بیس سال سے قائم ہیں ایک انتہا پسند تنقیدی مطالعہ ہے جو ایسی تنقیدی تھیوری کے خواب دکھاتا ہے جو دنیا کی تفہیم کے لئے اس تھیوری کی جگہ لے سکے جو اب فرسودہ ہوچکی ہے۔" ترجمہ MODERN LITERARY THEORY Edward Arnold -LONDON -P. 200

اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مابعد جدیدیت سے خود مغربی فکر ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔ ادبی تعلق سے ڈسکورس کو لاانتہائی قرار دینے کا تصور مابعد جدیدیت سے پہلے ایٹم Attom کے نیوکلس میں Hod Rons اور بورکس Bourkes کی تفتیش سے گہرائی کے سائنٹفک اصول کی بنیاد پر قائم ہوچکا تھا نیوکلس کے اندر مزید آخری ذرہ ناپید تھا گویا مادّی وجود کی نفی کا مسئلہ واضح ہوچکا تھا گویا دریدہ کے "معنی کی لامرکزیت" کا نظریہ Trace کے اندر Fraee کی نشاندہی کررہا تھا جس کی وجہ سے ڈسکورس کے حدود کا تعین غیر ممکن قرار دیا جانے لگا تھا۔

دریدہ نے ثقافتی سطح پر Mtapy sics of presence کی نفی کے جواز کے لئے ساخت شکنی کا نظریہ پیش کیا۔ گویا تحریک ایک گورکھ دھندا ہے جس میں معنوی سطح پر شکاف معنی کو نیچے گرادیتا ہے اور یہ عمل مستقل صورت میں اس طرح رونما ہوتا ہے، کہ ساختیں ٹوٹتے ٹوٹتے معنی کو لامرکزیت کا شکار بنادیتی ہیں۔ لکھت اپنے باطن میں اترنے کا جو منظر پیش کرتی ہے وہ ایک طرح کا زوال ہے جو اندر ہی اندر بھٹکتا رہتا ہے۔ ساخت شکنی میں تحریر کو متکلم پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک طرح سے تہذیبی معاشرتی اور ثقافتی قدروں پر خط تنسیخ کھینچ کر ادبی کارناموں کی معنویت کے انکار کی غلط توجیہہ اس نظریے کی اساس ہے۔ جب کہ نئی تنقید معنی کی کثرت اور ساختیات کثرت معانی کی پیدائش کے تصور عطا کرتی ہے۔

مشرقی ادبیات بالخصوص عربی ادب میں معنی کی کثرت پر اصرار کا جواز مل جاتا ہے اور قرأت سے مفہوم کی تبدیلی کے لئے حالؔی کو پیش کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے غالب کے شعر:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

کے پہلے مصرعے میں انداز قرأت کی تبدیلی سے مفہوم کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے کسی جگہ "ہماری شاعری" میں موقع محل کے اعتبار سے شعر کے مفہوم کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے قاری کی عظمت کا اقرار ہوتا ہے۔ عربی کے اس شعر میں فن پارے کی خوبی اور قاری کی اہمیت کا اقرار اس انداز سے کیا گیا ہے۔

صَفَتْ وَصَفَتْ زجَا جَتُهاَ عَلَيهَا `` مَعْنىً رقٌ فِي ذَهْنٍ لَطِيفٍ

[شراب بھی صاف تھی اور گلاس بھی شفاف جس میں شراب اس طرح روشن تھی جیسے صاف ذہن میں معنی چمک اٹھتے ہیں۔"]

یعنی جب تخلیق میں کچھ ہوتا ہے تو کثرت معنی یا معنی کی کثرت پیدائش کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ عظیم تخلیق معنی کے تنوعات کی حامل ہوتی ہے تو وہ اس لئے کہ تخلیق صرف لاشعوری عمل نہیں ہوتی بلکہ اس کی خلیات کی ترتیب میں نسلی، لاشعور، اجتماعی شعور (اس اصطلاح کی تفصیلات زیر ترتیب اسی عنوان پر مبنی مضمون میں ملاحظہ کی جاسکیں گی) تحت الشعور اور شعور وغیرہ سبھی کا مشترکہ رول ہوتا ہے۔ اس طرح ذہن کے مختلف گوشے اپنی اپنی کارکردگی کے ساتھ لفظیات کی معنوی تہوں میں سانسیں لیتے رہتے ہیں۔

اس کا احساس خود فنکار کو نہیں ہوتا البتہ ناقد یا قاری اس کے الفاظ سے معنی تک پہنچتا ہے اس طرح مختلف قسم کے اصول نقد یا ذہن یا ناقد ایک ہی تخلیق سے مختلف قسم کے معانی اخذ کرسکتے ہیں یہاں پہنچ کر "لامرکزیت" کے بارے میں بھی سوچ لینا ضروری ہے لیکن اس طرح کہ اور تنقیدی رویوں کی چھوٹی موٹی قابل گرفت باتوں کا ذکر بھی ہوجائے۔

تصنیف یا تخلیق پر مصنف کی قومیت سرمایہ داری یا شخصیت پرستی کے رجحان کو طاقت ور بناتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ شخصیت ہوتی ہے تبھی عظیم فن پارے وجود میں آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عظیم فن پارے ہی عظیم شخصیت کے مظہر ہوتے ہیں۔ شخصیت کتنی بھی عظیم ہو جب تک وہ فنی اظہار سے ہماری ہوگی اس کی عظمت کا اقرار نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ اگرچہ شخصیت و فن کے باہمی تعلق کو کسی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا پھر بھی فن سے فنکار کے معیار و منصب کا پتہ چلتا ہے اور فنکار کے معیار کے معیار و منصب کا تعلق صرف تخلیقی عمل سے ہوتا ہے دیگر معاملات اور وظائف حیات سے نہیں۔

تخلیق اور تصنیف نہ مکمل طور پر خارجی دباؤ سے عاری ہوتی ہے اور نہ صرف باطنی کیفیات کا من عن عکس۔ کسی بھی فن پارہ کا تجزیہ ماحول یا خارجی اثرات سے فنکار

کی داخلی کیفیات کے تصادمات پر غور کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہاں تصادم کا لفظ فنکار کے حساس ذہن میں پنپنے والے احتجاجات کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہی احتجاجات عظیم تخلیق کا سبب بھی بنتے ہیں اس لئے تصنیف یا تخلیق کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خارج و باطن کے رشتوں میں مطابقت و ہم آہنگی کے بجائے ردِ عمل میں عدم مطابقت کے غیر محسوس کن عناصر کی تفتیش ضروری ہوتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہم توصیفی، شخصی بعض ہنگامی حالات یا مناظر قدرت وغیرہ کی مظہر تخلیقات کے بہت اندر تک نہ اترنے کی بنا پر فنکار کے ذہنی تلازمات کے سمجھنے سے قاصر رہ جائیں۔

فنکار کسی بھی تحریک کے اصولوں کو تخلیقی سطح پر زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتا۔ انفرادیت اور فنی اور ہیئتی مسائل کا اشتراک جو تنہا لیکھ قائم کرتا ہے وہ پابندیوں کے بجائے اس کی ذہنی و فکری آزادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ البتہ تفتیش و تنقید کے لئے ممکنہ اور قابل اعتبار پیمانوں کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ پیمانے جتنے متنوع اور ادبی ہوں گے تخلیق کی معنویت کے اتنے ہی زیادہ پہلو نمایاں ہونے میں آسانیاں ہوں گی۔

سائنس ایک حقیقت کے ان گنت پہلوؤں کے راز افشا کرتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ سائنسی انکشاف کو ادبی انکشاف کا پیمانہ بنایا جائے۔ علم النجوم، علم ریاضی، علم الارض، علم النباتات پھر مختلف مادّی اشیاء کا سائنسی علم اور ان سے حاصل شدہ حقائق یکساں نہیں ہو سکتے۔ تطبیق عناصر مختلف حقائق کے بعد ابھر بھی آئیں تو ضروری نہیں ہے کہ ادب پر بھی ان کو منطبق کیا جاسکے۔

مابعد جدیدیت کی تھیوری کسی شعبے کے لئے کار آمد ہوسکتی ہے مگر ثقافتی اور ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ہم دنیا کے کھیل کو آزاد کھیل تصور کرلیں تو "تنظیم" کا لفظ بے معنی ہو جائے گا۔ اور اس لفظ کو بے معنی قرار دینے کے لئے نیوکلس میں مادی وجود کا انکار زبردست دھوکا ثابت ہوگا۔ "موجود" سے "لاموجود" کی طرف بڑھنا مادّہ کی ایک حقیقت ہے لیکن خود مادّے کے وجود کے انکار کی دلیل نہیں۔ اگر ہم دریدہ کے نظریے کے مطابق مذاہب کا بھی مطالعہ کرنے لگیں تو روح اور "رب" کو بھی لایعنی تصور کرنا ہوگا۔ تحریر کو گورکھ دھندہ قرار دینے سے معنویت کی لامرکزیت، کا جواز ساخت شکنی پر منحصر ہے۔ ساخت شکنی، کے لئے ضروری ہے کہ ہم تحریر کے مجموعے کو ایٹم Attom کے مماثل قرار دیں جو الیکٹران، پروٹون، اور نیوٹرون اور ان کے ذیلی ذروں کا مجموعہ ہوتا ہے اگر ہم یہ ثابت کردیں تو تشریحی عمل میں تحریر کے الفاظ کو متذکرہ اجزاء کی طرح ثابت کرنا ضروری ہو جائے گا۔ مثلاً

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ان میں طاقتور الفاظ کون کون سے ہیں؟ اور کون سا لفظ مرکزی حیثیت کا حامل ہے جسے ہم نیوکلس کے ذیل میں رکھ سکیں۔ مان لیجئے ہم زندگی، گزرنے اور یاد، کو ذرہ کے مختلف اجزاء قرار دے کر لفظ خدا کو مرکزی، لفظ تسلیم کئے لیتے ہیں اب اس پر تشریحی عمل کیا جائے اور معنی کی انتہا کو Trace کی دریافت تک لے جائیں تو صرف لفظ کے معنی کی لامرکزیت، تک پہنچ سکتے ہیں اور اگر ہم پورے شعر کے معنی کو مرکزیت دے کر "ساخت شکنی" کے قانون پر عمل پیرا ہو جائیں تب الفاظ اور آہنگ پر کیا اثر پڑے گا؟ یعنی کچھ نہیں، اب اگر ہم بجائے تخلیق اور اس کی معنویت کے خود فنکار کے ذہن کے بارے میں سوچنے لگیں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ ذہن اور اس کے تمام اعمال "لایعنی ہیں"۔ میرے خیال میں لاتعینیت سے حقیقت کی طرف بڑھنے کا تصور اگر نیوکلس کے تشریحی عمل سے اخذ کیا جائے تو منطقی اور سائنسی اصولوں سے روحانیت اور ربوبیت کے بڑے دلائل فراہم ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ادبی سطح پر جہاں معنوی جستجو کا سفر آخری منزل تک پہنچتا ہے یا سائنسی زبان میں Trace کے مقام کی نشاندہی ہونے لگتی ہے ہمیں اس ساخت کو معنی کی آخری سطح قرار دینا چاہئے۔ نہ کہ اس سے بڑھنے کے جواز کو عدم مرکزیت پر محمول کرنا ادب میں گمراہیت کے مترادف ہے۔

جہاں تک تخلیق کے خودکار عمل کا تعلق ہے۔ اس کے لئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تخلیقی لمحات کے دوران ایسے لمحات بھی آتے ہیں جہاں شعور کی تمام گرفتیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں اور تخلیقی عمل خودکار عمل کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ مقام تخلیقی انہماک و انجذاب کی ایسی انتہائی منزل قرار دیا جاسکتا ہے جس میں شعور Concious نیم غفلت کا شکار ہو جاتا ہے اور ذہن کے اندرونی گوشے بیدار ہو کر تخلیق میں مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔ فنکار یا فاعل ایک طرح سے تخلیق سے نہیں بلکہ خارجی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ ذہنی بیداری کی آخری منزل میں پہنچ کر شعور کا خارج سے لاتعلق ہونا فنکار کی اہمیت کو فراموش کردینے کی دلیل نہیں بنتا۔ رقاصہ، موسیقار، معمار، مصور یا کسی بھی فن سے متعلق شخصیت کو معراج فن سے پہلے کی منازل طے کرنے کے بارے میں سوچئے۔ یہاں عدم تربیت، شعور کو بیدار رکھتی ہے اور انجذاب کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی لیکن آہستہ آہستہ شغف اور انہماک شعور پر غالب آنے لگتے ہیں اس طرح مختلف مدارج کے بعد ایک ایسا دور بھی آجاتا ہے کہ جب تخلیقی عمل خودکار عمل کے مترادف محسوس ہونے لگتا ہے۔

کائنات ایک مربوط اور مستحکم نظام کے ساتھ کسی فاعل پر دلالت کررہی ہے۔ یہاں کا آزاد کھیل دراصل زبردست اصول و ضوابط کی پابندی کے ساتھ عمل میں آرہا ہے۔ اگر ہم ہر شے کے نظم و ضبط کے حدود کو توڑ دیں یا منطقی جواز پیدا کر کے توڑنے کی کوشش کریں تو یہ ہمارا خود ساختہ نظریہ تو ہو سکتا ہے مگر اس کو سائنٹفک انداز فکر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جہاں تک دریدا کے نقطہ نظر کا سوال ہے اسے ہم حقائق کے خلاف ذہن کی کمزور سوچ کا نام دے سکتے ہیں۔ خارجی حالات و کوائف سے اکتاہٹ اور ذہنی و عملی مجبوریوں کی انتہائی کیفیت سے پیدا شدہ احتجاجات کا ردِ عمل زندگی کے نفی کی منطق کو منتج ہو گیا ہے۔ تخلیقی سطح پر زندگی سے فراریت کے عناصر کو سمیٹنا الگ بات ہے اور تنقیدی سطح پر معنویت کے انکار کے لئے اسے تھیوری بنانا دوسری بات۔ یہ تصوف اور مابعد جدیدیت میں نظریاتی مماثلت اور فرق کو دیکھنا شاید ایک ضرورت بن جائے گا۔ فی الحال یہ بحث ہمارا موضوع نہیں ہے اس لئے صرف اردو ادب میں رجحانات پر اجمالی گفتگو کر کے بات ختم کردی جائے گی۔

اردو میں مارکزم، مابعد جدیدیت کے تعلق سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک اور جدت پسند تحریک ضرور وجود میں آتی ہے۔ اگرچہ مغربی انتہا پسندی کے نمونے کم ہی دستیاب ہوں گے ہائی ماڈرنزم کو بھی تنقیدی سطح پر برتا گیا ہے لیکن مابعد جدیدیت کے نظریات ابھی تک اردو میں نہیں پھیل سکے ہیں۔ جس طرح ہم جدید اور جدید ترین کے الفاظ صرف نسلی اعتبار سے کرتے ہیں یعنی چھٹے دہے کے بعد والی نسل کو جدید، ساتویں دہے کی نسل کو جدید ترین اسی طرح اگر اس لحاظ سے کہ ۸۰ء کی نسل جدیدیت (مشترکہ نسلوں کے معنی میں) کے بعد کی نسل ہے لفظ جدیدیت کا استعمال کریں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن پوسٹ ماڈرنزم کے معنوں میں یہ لفظ استعمال کرنا قطعاً غیر مناسب ہے۔

رہا کسی نئے نام کی تجویز کا مسئلہ سو یہ بات قابل غور ہو سکتی ہے۔ لیکن نئی نسل کے غیر شعور ناقد یا سطحی ذہن رکھنے والے لوگ اس مسئلے میں نہ پڑیں تو زیادہ مناسب ہے۔ یوں رائج لفظ معنویت کے لحاظ سے میری نظر میں مناسب شناختی لفظ ہے۔

● P.O.GUNNAUR - 202522 DIST. BADAUN (U.P)

بقیہ صفحہ ۳۹ :وہ

اس کے دل میں خواہش ہوئی کہ اپنی محبوبہ کو وہ اپنے دوست کو بھی دکھلادے اور اپنی پسند اور خوش قسمتی کی داد لے۔ زید نے بکر کو متوجہ کر کے اپنی محبوبہ کی طرف اشارہ کیا کہ 'وہ' دیکھو میری محبوبہ جارہی ہے۔" مگر بدقسمتی سے اشارہ صحیح ترسیل نہ کر سکا اور قیامت ٹوٹ پڑی دراصل زید کی محبوبہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ تھی اور زید نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا بکر نے اس کی جگہ دوسری کو سمجھ لیا۔ بس کیا تھا۔ وہ چراغ پا ہو گیا، کیونکہ دونوں لڑکیوں میں ایک اس کی بہن تھی۔ بکر روز آنہ زید کے عشق کے قصے مزے لے لے کر سنا کرتا تھا اور کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھتا تھا۔ اب اپنی بہن کی بات آئی تو اس کے دماغ کا فیوز اڑنا یقینی تھا۔ مرنے مارنے کی نوبت آگئی۔

اس لئے اشارے کے طور پر وہ کا استعمال ذرا نازک ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ ویسے وہ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہ ضمیر ہے اور اسم کے بدلے آتا ہے۔ وہ کی معنی خیزی اور طلسم ریزی کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ 'وہ' واحد بھی ہے اور جمع بھی۔ جب کہ ضمیر کی پہلی اور دوسری قسموں کے واحد اور جمع کے الفاظ الگ الگ ہیں۔ میں کی جمع ہم اور تو کا تم ہے لیکن وہ کی جمع وہ ہی ہے۔ یعنی چت بھی مری اور پٹ بھی میری۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اور اوپر نیچے وہ ہی وہ۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اور اوپر نیچے وہ ہی وہ کہنا آپ مری فضول گوئی پر معمول نہ کریں کیونکہ 'وہ' معرفت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ وہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ وہ سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ سب کا پالنے والا ہے۔ وہی سب کو روزی دیتا ہے اور جب چاہتا ہے وہ مار دیتا ہے۔ کوئی خوشی ہو غم ہو ہم سب اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور 'وہ' ہر دم ہماری مدد فرماتا ہے۔

اب دیکھئے نا! یہاں پر 'وہ' کی مثال دینے میں مجھے کچھ پریشانی ہونے لگی تھی تو وہ سامنے آگیا اور اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور جب وہ ذات باری تعالیٰ سامنے آجائے تو دوسری سی بات کی گنجائش ہی کہاں! ●●

عالمی اردو قلم کار خواتین کا ادب

اور

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ

کے بعد

۲۰ رویں صدی کے اختتامیہ سال

۲۱ رویں صدی کی آمد آمد

اور

شاعر

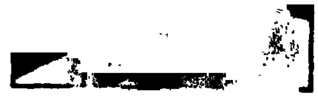
کی ۷۰ رویں سالگرہ

کے موقع پر

ایک اور خوب سیرت

اشاعت خاص

۲۰۰۰ء کے اوائل میں منظر عام پر آرہی ہے



شاهد کبیر

فطرت کے بنائے ہوئے باغات نہ کاٹو
صحرا کی حدیں، دشت کے جنگلات نہ کاٹو

پابند نہیں آپ کی مرضی کا ، کوئی فن
یہ کس نے کہا تھا کہ مرے ہاتھ نہ کاٹو

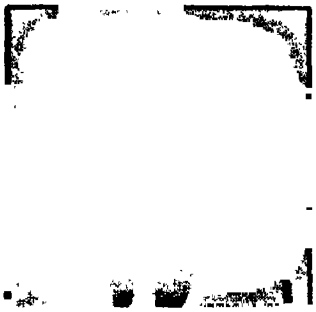
اے ہمنفسو! مجھ پہ برا وقت پڑا ہے
ممکن ہو تو کچھ روز مرے ساتھ نہ کاٹو

ہر شخص سے خود اپنی ہی روداد سنو گے
نادانوں کی بستی میں کبھی رات نہ کاٹو

سچ کہہ کے کٹا دیتے ہیں ہم لوگ زباں تک
وہ جھوٹ بھی بولیں تو کوئی بات نہ کاٹو

موسم کا مزا، تازہ ہواؤں میں ہے شاہد
چھتری کے تلے بیٹھ کے برسات نہ کاٹو

●B/12, FARAZ APRTT JAFAR NAGAR
NAGPUR-440013 (M.S)



فرید سحر اکبرآبادی

شعلۂ برق جو ساقی ترے تیور سے اُٹھا
رنگ اور نور کا طوفاں اسے ساغر سے اٹھا

ایک ذرہ بھی دم نزع نہ تھا ہاتھوں میں
بوجھ ذرّے کا نہ دنیا میں سکندر سے اٹھا

ضوفشاں اور ہوئی محفل ماہ و انجم
زلف کا سایہ جہاں حسن کے ساغر سے اٹھا

آخر اک روز تمنا ہوئی ان کی پوری
شوراک دن مرے ماتم کا مرے گھر سے اٹھا

مہر نے صبح زمستاں کو سلامی دی ہے
اَبر کی طرح دھواں دامن خاور سے اٹھا

ایک ہی رنگ ہے فطرت کے ہر اک جلوے میں
لطف نظّارہ بہ تفریق نہ منظر سے اٹھا

خیر مقدم ہے یہی آئینہ سازوں کا سحر
خود کو محروم نہ رکھ ہاتھ نہ پتھر سے اٹھا

●904 , S. CATALINA AVE ,18
LOS ANGELES CA 90006 (U.S.A)



آفتاب شمسی

شہر میں

ایک جم غفیر لوگوں
موجۂ تُندو تیز کے ما
کبھی چڑھتا کبھی اترتا ـ

انگنت مرد ، عورتیں ، ـ
انگنت جسم ، انگنت چہرـ
بھری سڑکوں پہ سب کے سب
راستے مختلف سہی سب ـ
سب کی منزل ہے جانی پہچا

صبح سے شام تک یہ جلتے سا ـ
پیٹ کی آگ کو بجھاتے
اور ہر صبح پھر وہی دوڑ
اپنے سینوں میں جلتا پاتے

SHARIB LODGE ,
HUSRO BAGH ROAD,
AMPUR-244901 (U.P)



انور خان
17/311 TEJISNAGAR
REYNOULDS ROAD, WADALA MUMBAI-400037

گیلا پن

اپنی جھونپڑی میں بیٹھا منوہر سمجھ نہیں پارہا کہ دکھ کہاں ہیں۔ جسم میں، روح میں یا پوری فضا میں۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ صبح سے سورج دیوتا کے درشن نہیں ہوئے بارش مسلسل ہو رہی ہے۔ جھونپڑی میں پانی جگہ جگہ سے ٹپک رہا ہے۔ پلنگ گھسیٹ کر اس نے بالکل بیچ میں کر دیا ہے تاکہ وہ پانی سے بچ سکیں اور نو سالہ اشیش چین کی نیند سو سکے۔ اشیش بار بار نیند سے اٹھ کر پوچھتا ہے بابا ماں ابھی تک نہیں آئی۔ منوہر اسے بہلا پھسلا کر پھر سلا دیتا ہے۔ اگرچہ وہ خود فکر مند ہے کہ رادھا ابھی تک کام پر سے نہیں لوٹی۔ ٹرینیں کئی گھنٹوں سے بند ہیں۔ کھڑکی کے بوسیدہ پٹوں میں اتنا خلا ہے کہ پانی میں ڈوبی ریل کی پٹریاں صاف نظر آتی ہے۔ سگنل بدلتے ہیں اور ریل کی پٹریوں اور پانی میں ان کے عکس بار بار جھلملاتے ہیں۔ سرخ، زرد ہرا۔

رادھا کا انتظار کرتے کرتے اسے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ رادھا شاید اب کبھی نہیں لوٹے گی۔ اس کے ذہن میں کنڈلی مارے سانپ جنہیں اس نے پچھلے دو سالوں میں بڑے جتن سے سلایا تھا پھر پھنکارنے لگتے ہیں۔ وہ رادھا کا دوسرا شوہر ہے اس سے تقریباً دس سال بڑا اس کی کنپٹی کے بال سفید ہو چکے۔ رادھا تیس بتیس سال کی ہے اس کا گدرایا ہوا صندلی جسم، اور سیاہ ہنستی ہوئی آنکھیں کسی بھی شخص کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ٹیکسٹائل ملیں بند ہو گئیں۔ وہ مل میں ڈائنگ ماسٹر تھا۔ اور عیش کر رہا تھا۔ دوسری شادی کیے اسے چار پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ یہ حادثہ پیش آیا اور اس کی گھریلوں زندگی کو درہم برہم کر گیا۔ اس نے دوسرا کام تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا بے کاری نے اسے بالکل ہی بے کار کر دیا۔ ذہن کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی جیسے بے مصرف ہو گیا۔ اس کا جسم سرد ہو گیا۔ زندگی اپنے مفاہیم کھو بیٹھی۔ تب اس کے دماغ میں سانپ کلبلانے لگے اور نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا کہ رادھا اسے ایک دن چھوڑ کر چلی جائے گی۔ کام پر سے لوٹنے میں اسے ذرا بھی دیر ہوتی تو وہ طرح طرح کے سوالات سے اسے پریشان کر دیتا۔ رادھا بھی الجھنے لگی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا اثر ان کی ازدواجی زندگی پر پڑنے لگا۔ ایک دن اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اسے بھروسہ نہیں تھا تو اس سے شادی ہی نہیں کرنی تھی۔ سویرے بھی جب اس نے کہا تھا کہ اسے اپنی سہیلی کے ساتھ کچھ شاپنگ کرنی ہے تو وہ اسے منع تو نہیں کر سکا تھا لیکن اس نے سوالات کی جھڑی باندھ دی تھی اور رادھا نے چڑ کر کہا تھا کہ منوہر کا رویہ اس کے لئے اتنا تکلیف دہ ہو گیا ہے کہ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے کہ کبھی گھر نہ لوٹے۔ اس بات نے منوہر کو اور پریشان کر دیا۔

دوپہر سے بارش شروع ہوئی تھی اور دو گھنٹوں میں اتنی بارش ہوئی تھی کہ ٹرینیں معطل ہو گئی تھیں۔ اسکول کے بچوں کو جلدی چھوڑ دیا گیا تھا اور بچوں کو واپس لوٹتے دیکھ کر وہ خود اسکول جا کر اشیش کو گھر لے آیا تھا۔ اشیش رادھا کے پہلے شوہر سے ہے لیکن وہ اسے بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہے۔ رادھا بھی اس بات کو سمجھتی ہے اور شاید اسی لئے منوہر کے تکلیف دہ رویہ کے باوجود اُس کا پورا خیال رکھتی ہے۔

اشیش جاگ گیا ہے۔ رات کے دس بج چکے ہیں۔ لیکن منوہر جب بھی اسے روٹی کھانے کے لئے اصرار کرتا ہے وہ انکار کر دیتا ہے کہ ماں کے ساتھ کھاؤں گا۔ اس کو جاگا ہوا دیکھ کر وہ بھی پھر اس سے منت کرتا ہے لیکن وہ پھر یہی جواب دیتا ہے لیکن اس بار اس کی آواز کچھ کمزور سی ہے۔ شاید اس کی بھوک جاگ اٹھی ہے۔ منوہر اٹھ کر پلاسٹک کا دستر خوان بچھاتا ہے اور اسے پچکارتے ہوئے زبردستی اٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیتا ہے۔ منوہر ٹی، وی کھولتا ہے کہ اشیش کا دھیان بٹ جائے۔ ساری شام اس نے ٹی وی نہیں کھولا کیونکہ بار بار بجلی چمک رہی تھی اور اسے ڈر تھا کہیں ٹی وی خراب نہ ہو جائے۔ لیکن اشیش کے لئے اس نے ہمت کر کے ٹی وی کھول ہی دیا۔

"بابا بارش رک گئی" اچانک اشیش نے خوشی سے کہا۔

"ہاں بیٹا۔" منوہر نے کھڑکیوں کے پٹ سے جھانکا۔ پٹریوں پر بوندیں گرنی بند ہو گئی تھیں

"اب ماں آ جائے گی نا"

"ہاں بیٹا"

اشیش اب پوری رغبت سے روٹی کھانے لگا۔ ٹی وی سیریل میں بھی اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

میں ذرا سلامت بھائی کے اسٹور پر دیکھتا ہوں۔ شاید رادھا کا فون آیا ہو۔"
منوہر نے کہا
"میں بھی چلوں گا بابا" اشیش نے کہا۔
"ٹھیک ہے تم کھانا کھالو پھر چلتے ہیں"
منوہر نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ پانی میں چمکتی پٹریاں صاف نظر آنے لگیں لیکن وہ اب بھی پانی میں ڈوبی تھیں۔ رادھا کہاں ہو گی؟ منوہر نے سوچا لیکن آگے سوچنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ بھگوان کرے اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔

اشیش روٹی کھا چکا تو سلامت بھائی کے اسٹور پر گئے۔ انہوں نے خود ہی بتایا کہ رادھا کا فون آیا تھا۔ وہ گھاٹ کوپر اسٹیشن پر ہے۔ گاڑیاں شروع ہوتے ہی آئے گی۔
منوہر کو کچھ تسلی ہوئی۔ اشیش بھی خوش ہو گیا۔
"بارش تو رک گئی ہے" اشیش نے کہا۔
ہاں بیٹا بارش تو رک گئی ہے" سلامت بھائی نے کہا "ایک آدھ گھنٹہ یوں ہی رکی رہی تو گاڑیاں چالو ہو جائیں گی۔
"بھگوان کرے بارش رک جائے، منوہر نے من ہی من میں پرارتھنا کی۔
"اچھا سلامت بھائی چلتا ہوں۔ سارا سامان پانی میں بھیگ رہا ہے"
"ٹی وی تو سنبھال کر رکھا ہے نا" سلامت بھائی بولے۔ پھر انہیں جیسے خود ہی یاد آیا ہاں تم نے تو ٹی وی کباڑ پر رکھا ہوا ہے وہاں پانی نہیں پہنچ سکتا اور تم نے وہاں چھت بھی پلاسٹک شیٹ سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ٹھہرو بچے کو سردی لگ رہی ہو گی چائے منگواتا ہوں مجھے بھی طلب لگ رہی ہے۔"
منوہر رک جاتا ہے۔ سلامت بھائی ملازم لڑکے سے چائے منگواتے ہیں۔ وہ چائے کا انتظار کر رہے ہیں تبھی ان کا پڑوسی بست دکان پر آیا۔
"ایک لادی پاؤ دینا سلامت بھائی۔"
"ابھی دیا، کا بات ہے بین بھائی بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"
کیا کرتا سلامت بھائی۔ دو گھنٹے سے پیدل چلتے چلتے اب پہنچا ہوں۔ پیر رہ گئے سوچا پاؤ لے لوں پتہ نہیں گھر پر کھانا بنا ہو نہ بنا ہو۔ دوبارہ دکان پر آنے کی تو ہمت نہیں ہو گی۔
"بڑی ہمت کی آپ نے" سلامت بھائی نے کہا۔
"تو اور کیا کرتا۔ گاڑیاں پتہ نہیں کب چالو ہوں"۔ بین نے کہا۔ منوہر کا دل ڈوب گیا۔ پتہ نہیں رادھا کہاں پھنسی ہو گی۔ کیا وہ بھی کسی سڑک پر تھکی ماندی چل رہی ہو گی؟
ملازم چائے لے آیا۔
"لو بیٹا اشیش، ذرا گرم گرم چائے سڑک لو، بدن کچھ تو گرم ہو گا۔ بارش نے تو ہڈیوں تک کو گیلا کر دیا۔ لو بھائی بین تم بھی دو گھونٹ لے ہی لو تاکہ جسم کچھ تو گرم ہو۔"

"نہیں سلامت بھائی" بین نے کہا "گھر پر سب بڑی بے چینی سے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ میں چلتا ہوں۔"
منوہر دوبارہ جھونپڑے میں آیا۔ ریل کی پٹریاں اب بھی پانی میں ڈوبی تھیں۔ اس نے اشیش کو کمبل "اڑھا دیا۔ سکڑ سمٹ کر وہ جلد ہی سو گیا۔
"ہو سکتا ہے وہ کسی کے ـــ" منوہر کے ذہن میں سانپ پھر پھنکارنے لگے۔ وہ جانتا تھا رادھا ایسی عورت نہیں لیکن وہ کیا کرے۔ خیالات آتے ہی تو بس آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے خیالات کو جھٹکتا اور بار بار خیالات اس کے ذہن سے چمٹ جاتے۔ ذرا دیر کو اونگھ جاتا تو الٹے سیدھے خواب پریشان کرنے لگتے ایک بار اس کی آنکھ لگی تو اس نے دیکھا کہ سینکڑوں عورتیں قطار در قطار دھیمے دھیمے تھکی ماندی چل رہی ہیں کبھی گھٹنوں پانی میں، کبھی کسی سنسان سڑک پر سے گزرتی ہوئیں۔ انہیں میں رادھا بھی ہے۔ اسے بس ایک ہی دھند ہے اپنے اشیش تک پہنچنے کی۔ پھر اس نے دیکھا رادھا ایک سمسان سڑک پر اکیلی چلی جا رہی ہے۔ اچانک چند غنڈے کہیں سے نمودار ہوتے ہیں اور رادھا کو دبوچ لیتے ہیں۔ گھبراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے اٹھ کر مٹکے سے پانی پیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا باش رکی ہوئی تھی۔ پانی اب پٹریوں سے کچھ نیچے لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا شاید صبح تک گاڑیاں شروع ہو جائیں۔ وہ پتہ نہیں کب تک پلنگ پر یوں ہی بیٹھا رہا۔ اسے لیٹتے ہوئے بھی ڈر محسوس ہو رہا تھا کہ شاید پھر آنکھ لگ جائے اور الٹے سیدھے خواب اسے پریشان کریں۔ لیکن پھر وہ لیٹے لیٹے ہی اونگھ گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ ریلوے پلیٹ فارم ہے اور بہت ساری عورتیں حیران پریشان سی کچھ بنچوں پر، کچھ فرش پر بیٹھی ہیں انہیں میں رادھا بھی ہے۔ اسے بڑی بھوک لگی ہے اور چہرہ ستا ہوا ہے۔ بار بار وہ اپنے پرس سے اشیش کی تصویر نکال کر دیکھتی ہے اور سوچتی ہے شاید گاڑیاں جلد ہی شروع ہوں۔ پھر اس نے دیکھا کوئی شخص رادھا کے پاس جاتا ہے۔ دونوں کچھ کہتے ہیں اور رادھا اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھر ہڑبڑا کر اٹھا۔

اس نے دیکھا اشیش گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اپنے ذہن میں بھٹکتے آوارہ خیالات کو سلا دے لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ پٹریاں اب صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اب گاڑیاں جلد شروع ہو جائیں گی۔ اس نے سوچا تبھی اس کے کانوں میں ایک سیٹی کی آواز آئی۔ لیکن یہ بھی تصور کا فریب ہی تھا۔ گاڑیاں چار کے بعد ہی شروع ہوتی ہیں۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کیا سلامت بھائی کا اسٹور کھلا ہو گا؟ یقیناً نہیں۔ پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ اس کا ذہن بالکل صاف ہو گیا۔ شوکتے ہوئے سانپ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ نیند اس پر غالب آ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ آنکھ کھلی تو ہر طرف اجالا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ پٹریوں پر پانی بہت ہی

(باقی صفحہ ۲۳ ، کالم ۱)

بہ خطِ شاعر



زاہدہ زیدی

جذبۂ بیکراں

لٹا دو — لٹا دو
یہ انکار و اقرار کا
نیم خفتہ خزانہ
اسے بڑھ کے، سمیٹے
تلاطم میں ڈبا دو
کوئی درد آگیں فسانہ

- - - - - -

مکاں — لامکاں ہے
زماں — بیکراں ہے
تماشا ہے —
اسی محو آرزو میں
تمہارے خد و خال کا
عکس موہوم
پرواز کا جذبۂ بیکرانہ
گھنی اور بے نور راہوں میں

— سوچو —

بتا دو گی کیا تم شبانہ

- - - -

لٹا دو — لٹا دو
بچی ہے جو اب جام میں
یہ شراب شبانہ
کہ انجام ہستی
فنا کے سمندر میں سے
ڈوب جانا

●AABSHAR-4, HIG, FLATS SIR
SAYED NAGAR, ALIGARH-2(U.P.)

رشیدہ عیاں

کاش کہ دل میں رہتے رہتے، میرا دل ہو جائے تو
جو بھی دیکھوں، تجھ سے دیکھوں، آنکھ کا تارا ہو جائے تو

کتنے موڑ ہیں، کتنے رستے، چلتے چلتے تھک سی گئی
بس میں اتنا چاہوں، کاش مری منزل ہو جائے تو

تجھے پیار ہی حسن و قبح، یا عیب و ہنر کا کیا مذکور
پیار کرے تو پھر اتنا کر، ماں کا دل ہو جائے تو

دنیا کے بے انت سمندر سے میری جیون کی ناؤ
کاش کہ تجھ تک آ پہنچے، میرا ساحل ہو جائے تو

تیری دھڑکن بھر یہ چاہوں اور نہ کچھ بھی دیکھوں میں
اے میری بینائی کاش ابھی زائل ہو جائے تو

آخر کیوں دلگیر عیاں تو کھوئی کھوئی رہتا ہے
کس نے تم کو تاکا اک تیر دل پر مائل ہو جائے تو

●88- GLENRIDGE AVE GLEN RIDGE,
NEWJERSEY -07028 (U.S.A.)



عذرا پروین

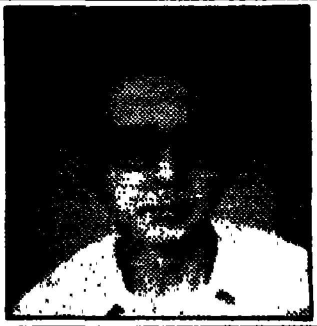
ہم اک ہوا کو دیکھتی ہوئی نظر ہیں لیکن
فراق و ہجر کے سب سلسلے صرف ہیں لب

میں اتنی نیند میں تا عمر صرف سسکی ہوں
مگر یہ آنسو مرے، میری نیند بھر ہیں بس

خرد کے منکشف اسرار میں کہیں جھلک جائیں
تمہارے نام کے حرف کے تب بہ سفر ہیں لب

نہ تم نہ میں نہ کوئی اور اپنا ہم راہی
نہ میرے سائے کے خود لکھے بھنور ہیں بس

●P.O. BOX No- 32, H.P.O. CHOWK,
LUCKNOW -3 (U.P.)



محمد حسن

D-7, MODEL TOWN, NEW DELHI - 110009

ناول شناسی

ناول کے تنقید نگار کے لئے میرے نزدیک ناول کو تین بار پڑھنا ضروری ہے، پہلے ایک عام پڑھنے والے کی طرح جب وہ بے اختیار ہو کر خود کو ناول نگار کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، اس کے فراہم کردہ پیچ و خم کے ساتھ لڑتا اور ٹھہرتا رہے اور واقعات کی گردش اور کرداروں کے بدلتے تیوروں کے ساتھ ساتھ رہے اس قرأت سے اس کا مقصد ناول کے مزاج سے ہم آہنگی فراہم کرنا ہے، اس رفاقت کے آخر میں البتہ یہ سوال ضرور ابھرے گا کہ اس پورے سفر میں اسے کیسا لگا؟ اس سوال کا جواب وہ خود اپنے طور پر فراہم کرے گا اور اگر اس سفر میں اسے لطف آیا ہو گا یا کچھ نادر کیفیات سے گذرا ہو گا تو اسے ناول کو دوسری بار پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو گی۔ اس بار پڑھتے وقت فرق یہ ہو گا کہ اسے ناول کی کہانی پہلے ہی سے معلوم ہو گی اور اس کے سبھی کرداروں سے بھی وہ اچھی طرح نہ سہی تو سرسری طور پر وہ ضرور واقف ہو گا مگر اس بار پڑھنے کا انداز مختلف ہو گا۔ میری مانئے کہ اس بار ناول کو نصف کے بعد سے شروع کیجئے یعنی وہ جو خلش ہر پڑھنے والے کے دل میں ہوتی ہے کہ "پھر کیا ہوا" وہ خلش باقی نہ رہے اب چونکہ یہ دوسری بار پڑھا جا رہا ہے اسلئے یوں بھی آپ کو علم ہے کہ واقعات آخر کس طرح انجام پذیر ہوئے ہیں۔

یوں بھی آخری نصف ہی ناول کے اٹھان کا حصہ ہوتا ہے یہیں جو مرکزی ٹکراؤ ابھرتا ہے جو ناول کا محور ہے اور اس محور کی معنویاتی اور فنی اہمیت اور مختلف کرداروں کے ذریعے مختلف قدروں کے ٹکراؤ ہی سے ناول کی عظمت اور اس کی بلاغت واضح ہوتی ہے جس کی بنا پر نقادوں کو اسے زندگی کا سب سے بھرپور ترجمان قرار دیا ہے۔ نصف آخر سے ناول کو پڑھنے سے ایک بات اور واضح ہو گی جن کرداروں کو ٹکراتے دکھایا گیا ہے وہ کیسے ہیں؟ کن قدروں کے علمبردار ہیں؟ اور کیا ان میں کسی قسم کی تبدیلی (ارتقا یا زوال) آیا ہے۔

مگر ان سب سے زیادہ اہم سوال اور میرے نزدیک تنہا سوال یہی رہتا ہے کہ ناول کے ختم کرنے پر کیا پڑھنے والا خود کو پہلے سے کسی قدر مختلف دنیا میں پاتا ہے یا نہیں۔ اگر پورا ناول پڑھنے کے بعد بھی وہ اپنی پرانی دنیا سے بندھا رہتا ہے، اسے آسمان پر کسی نئی روشنی کی جھلک اور زمین پر کسی نئی آگہی کی آہٹ نہیں ملتی تو اس میں قصور یا تو اس کا اپنا ہو گا یا (زیادہ تر) خود ناول نگار کا جو ناول کی کہانی، اس کے کردار اور اس کی فضا آفرینی کے باوجود اپنے عام پڑھنے والے کو ذہنی اور جذباتی طور پر کسی قسم کا ارتفاع بخشنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

اس ارتفاع سے ہرگز ہرگز کسی رومانی یا غیر حقیقی دھند میں لپٹ کر حقیقت کا ادراک و عرفان کھو بیٹھنا نہیں ہے اس سے خود فراموشی ہرگز مقصود نہیں ہے وہاں مراد ہے تو یہ ہے کہ ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی زندگی کی اس بھول بھلیاں میں ایک ربط و آہنگ کا عرفان ہوتا ہے اور جو ناول کے دوسرے کرداروں پر گزری ہے اس کی روشنی میں ہم بھی اپنے طور پر زندگی کی تعبیر و تشریح کرنے میں لگ جاتے ہیں لہذا ہر کامیاب ناول ایک نئی زندگی ہے، نئی زندگی کی بشارت یا اس کی نئی توجیہہ۔ ناول نگار آئینے کو نئے زاویے سے پکڑ کر پڑھنے والے کو زندگی کا ایک نیا رخ دکھاتا ہے، گویا اقبال کے لفظوں میں یزداں کی زبانی کہہ رہا ہو

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اب ناول کو الٹا پڑھئے یعنی پہلے والا حصہ بعد میں پڑھئے اور اس کا ربط کرداروں اور واقعات کا ربط۔ آخر سے ملا کر دیکھئے کہ ان میں تسلسل اور اثر آفرینی کا احساس باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اب آپ نے ناول سے پہچان تو فراہم کر لی مگر یہ پہچان پڑھنے والے اور ناول نگار کے درمیان کی پہچان ہے اس میں ابھی تنقیدی عنصر بہت کم ہے۔

اب تیسری بار ناول کو ذرا تنقید نگار کے نقطۂ نظر سے پڑھئے تو اک جداگانہ عالم نظروں کے سامنے آئے گا۔ اب کرداروں اور واقعات (اور ضمنی طور پر ہی سہی فضا آفرینی) کا باہمی ربط پورے ناول کے سیاق و سباق میں دیکھنا اور پرکھنا ہو گا۔

ایک زمانہ تھا جب کردار ذرا زیادہ مستقل مزاج ہوتے تھے یعنی اگر اچھے ہیں تو سراسر اچھے، تمام خوبیوں والے۔ دیکھنے میں خوبصورت، نیک اطوار اور

بہادر ایسے کہ ہزاروں میں ایک، صاحب حیثیت اور صاحب استعداد اتنے کہ گویا بے نظیر۔ اور گو مختلف آزمائشوں سے گزرے تھے۔ مگر کیا مجال کہ ماتھے پر شکن آجائے یا پلٹ ہمتی کہیں آس پاس سے بھی گزر جائے۔ اور آخر کار فتح مند ہو کر اور معشوقۂ خوش جمال کو جیت کر گھر واپس لوٹتے۔ جی ری۔ اسی کے ساتھ ان کی فتح مندی اور کامرانی کے نشانے بھی غیر معمولی تھے، بے دروازے کے قلعے تھے جن پر جنوں اور پریوں کے بادشاہ قابض تھے اور ان پر فتح پانے کے لئے انسانوں کی طرح کی عام جرأت مندی اور بہادری سے کہیں زیادہ روحانی اور غیر مادّی طاقتیں اور ترکیبیں درکار تھیں جن میں مختلف منتر اور وظائف ہی نہیں متعدد طلسمات کو کھولنا اور باطل کی قوتوں سے کسی نے کسی طور زیر کرنا بھی شامل تھا ان میں عمرو عیار اور ان کے عیاروں کے کارنامے بہت کام آتے تھے ہنساتے بھی جاتے تھے اور چپکے چپکے کام بھی کرتے جاتے تھے۔

داستانوں کے اس گنبد بے در کے بحران سے گزر کر جب ناول کے دور میں داخل ہوئے تو بھی غیر فطری عناصر کے علاوہ بعض روایتیں جوں کے توں ہمارے ادب میں در آئیں ان میں (۱) نہ تبدیل ہونے والے اچھے اور برے کردار (۲) داخلی اور نفسیاتی کے بجائے خارجی محرکات اور واقعات کی اولیت اور (۳) آخر کار بدی پر نیکی کی فتح کچھ بنیادی باتیں مشترک رہی ہیں انہی کے ساتھ ساخت کے سلسلے میں یہ خصوصیت قائم رہی کہ ضمنی روداد یا رودادیں آخر کار مرکزی روداد یا اصل پلاٹ میں مدغم ہو جاتی ہیں یا اس کا ناگزیر حصہ بن جاتی ہیں۔

مگر جب ناول کا عمل دخل بڑھا تو ان خصوصیات میں بھی بڑی تبدیلیاں ہوئیں اوّل تو اچھے اور برے کرداروں کا تصور ہی بدل گیا کوئی کردار نہ تو تمام و کمال اچھا رہا نہ پوری طرح برا اگر اچھا رہا بھی تو اس سے کم سے کم سب اچھائیاں یکجا نہیں رہیں۔ یعنی بیک وقت خوبصورت بھی ہو، دلیر اور سورما بھی ہو ہوشمند اور زیرک بھی ہو صاحب حیثیت بھی ہو اور یہی حالت ان کرداروں کی بھی ہوئی جنھیں برا کہا جاتا تھا۔ تھے تو وہ ولین مگر یہ ضروری نہیں رہا کہ سب خرابیاں ان میں یکجا ہوں یعنی بدصورت بھی ہوں چالاک بھی ہوں او کم ہمت بھی ہوں یہی صورت ہیروئن اور دیگر خاتون کرداروں کے ساتھ بھی پیش آئی۔

پھر یوں بھی ہوا کہ جو کردار بھی اچھا تھا وہ لازمی طور پر ہر حیثیت سے اچھا نہ تھا اس میں کچھ برائیاں بھی تھیں یا برائیوں کے نرغے سے نکل کر آیا تھا یعنی کرداروں میں ارتقاء کا ایک نیا عنصر داخل ہوا اس کی ایک اچھی مگر نامکمل سی مثال توبۃ النصوح کا ہیرو نصوح ہے جس کی زندگی دو حصوں میں منقسم ہے ایک توبہ سے قبل کی زندگی جو اس دور کی (طبقاتی) زندگی کی طرح کی ہے اور دوسری توبہ کے بعد کی زندگی جو زہد و تقویٰ کے اصول کے تحت گزاری جا رہی ہے گویا ارتقاء تو ہے خواہ کتنا ہی میکانکی اور آدرش وادی اور مثالی کیوں نہ ہو یہی صورت اور اس سے کہیں زیادہ جاذب نظر اور دلکش صورت کلیم کے ہاں ہے جس کی شخصیت زیادہ حقیقی ہے گو اس کا ارتقاء نذیر احمد نے اپنے معتقدات کے تحت مسخ کرلیا ہے۔ یہی صورت مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ پیش آئی ہے مرزا بھرپور کردار کی طرح پیش نہیں کیے گئے مگر یہ چند سطروں کا کردار ایسا تابناک ہے کہ مثالی بن گیا ہے۔

یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، کرداروں کی تابناکی اور کشش کبھی کبھی خود مصنف کے قبضہ قدرت سے نکل کر آزاد حیثیت اختیار کرلیتی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔ اس کا تشفی بخش جواب دینا مشکل ہے، وہ کسی الگ مضمون کا متقاضی ہے مگر اتنی بات طے ہے کہ ایسا ہوتا ضرور ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ توبۃ النصوح کا ہیرو خود نذیر احمد نے نصوح کو قرار دیا اور بالاعلان قرار دیا اور ہیرو کی آن بان شان سب کچھ چھین کر لے گئے میاں کلیم یا پھر مرزا ظاہر دار بیگ کہ ان میں انسانی زندگی کی ٹیڑھ بیڑھ نصوح سے کہیں زیادہ حقیقی ہے اور یہ حقیقی پن ہی کردار کو زندگی عطا کرتا ہے نصوح کی عینیت پسندی یا آدرش وادی ہوتا نہیں۔ اسی طرح فسانۂ آزاد ہے تو میاں آزاد کا افسانہ مگر ہیرو بن گئے خوجی جو نہ تین میں نہ تیرہ میں مگر فسانہ آزاد، آزاد سے کہیں زیادہ خوجی کا افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ گویا خود مصنف کے عندیے سے بغاوت کے مترادف ہے۔ اور کردار کی اس بنیادی عظمت کی دلیل ہے جو خود اس کے خالق پر بھی فتح حاصل کرلیتی ہے وجہ صرف یہ ہے کہ اسے زیادہ حقیقی اور زیادہ سچا ہونے کا افتخار حاصل ہے جس پر خود مصنف کا تصنع بھی غلبہ حاصل نہیں کرپاتا اور یہ سچائی فرضی نہیں، تاریخ اور وقت کے تقاضے سے عبارت ہے۔ مصنف کا ادّعا اس کی تلقین اور تعلیم کے سارے مفروضے انگر کنگھرو کی طرح بکھر کر رہ جاتے ہیں اور یہ انسانی کمزوریوں اور توانائیوں میں عندیے اپنے اردگرد کے منہدم شدہ ملبے پر قہقہہ زن اور فتح یاب ہوتا ہے۔ زندہ یہی رہتا ہے باقی سب مردہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور پہلو بھی ہے جو بظاہر تو مصوری سے متعلق ہے مگر اس کے اثرات ادب پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں قدیم مصوری میں رواج تھا کہ تصاویر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بنایا جاتا تھا خاص طور پر بازنطینی دور میں یہ عام بات تھی کہ تصویر کے ایک حصے میں ارضی تکالیف میں مبتلا کرداروں کو سخت اذیت میں گرفتار دکھایا جاتا تھا اور اسی تصویر کے اوپری حصے میں عالم ارواح میں ان کے احترام اور ان کے عیش و آرام کے ساتھ استقبال کا منظر پیش کیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم بعد کے دور میں مدھم ہوئی اور دونوں مناظر کو اس طرح مدغم کردیا گیا کہ ساوی اور تقدس مآب کرداروں کے چہروں کے گرد ایک نورانی ہالہ باقی رکھا گیا یہ روحانی تقدس گویا ان کے کردار کے غیر معمولی ہونے کا اشارہ یہ تھا۔ پھر یہ التزام بھی ختم ہو گیا اور یہ روحانی تقدس مصوروں نے صرف

چہرے کے نورانی ہونے اور چہرے کے نقوش کے نرم اور تعظیمی اظہار سے ادا کرنا شروع کر دیا۔

اس ارتقا کو اگر ناول کی سطح پر دیکھا جائے تو تین حصوں میں اسے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ داستان میں نشانہ کسی گنبدے بے در یا بے دروازے والے قلعے کی فتح یا غیر معمولی حیوانی یا جناتی طاقت رکھنے والے عناصر پر فتح یابی ہوتی تھی اور عام طور پر یہ طاغوتی طاقتیں مرئی ہوتی تھیں۔ نظر آنے والی اور پہچانی جانے والی ہوتی تھیں (یہ الگ بات ہے کہ ان کی شکلیں بدلتی رہتی تھیں) مگر ناول میں اس کے خلاف کوئی گنبد بے در یا کوئی ایسی خارجی، مرئی اور نظر آنے والی شے نہیں ہوتی جس پر فتح پانا ناول کا مقصد قرار پائے۔ اکثر جس کے لئے کشمکش اور جدوجہد دلچسپی کا باعث ہو، مثلاً پہلے کے ناولوں کو لیجئے امراؤ جان ادا میں کوئی مرئی کوئی خارجی قدر آویزش (یا پڑھنے والی دلچسپی) کا باعث نہیں ہے۔ اگر کوئی خلش ہے تو وہ معمول کے مطابق نسوانی کردار کی سی عزت اور مسرت حاصل کرنے کی ہے جو اب امراؤ جان کے اختیار سے باہر ہے۔

● داستان میں ٹکراؤ عام طور پر مرئی ہوتا ہے جو نظر آتا ہے، یا تو فوجیں لڑتی ہیں یا آسیب جن اور پریاں برسر پیکار ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی انسان بھی دست و گریباں ہوتے نظر آتے ہیں مگر ناول میں یہ پوری آویزش خارجی کے بجائے داخلی ہو کر رہ جاتی ہے مثلاً توبۃ النصوح میں نماز یا امراؤ جان ادا میں نسوانی کردار کے احترام کا مسئلہ جس کے لئے لڑائی تو یہاں بھی ہوتی ہے مگر وہ لڑائی نظر نہیں آتی میدان جنگ میں لڑی نہیں جاتی اقدار کی شکست و ریخت کی یہ جنگ بقول فیض گویا اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہتی ہے۔ (فیض کا شعر یہ ہے اور یہ ایک سے زیادہ معنوں میں داستان اور ناول کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

مقابل صف اعدا کیا جسے آغاز   وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

کیونکہ ناول میں اول تو صف اعدا ہی نظر نہیں آتی اور نظر آتی ہے تو وقتی طور پر نظر آ کر چھپ جاتی ہے۔ دوسرے جنگ کی نوعیت نظر آنے والی نہیں ہوتی تیسرے یہ جنگ لڑنے والوں کے مقاصد سے بلند تر سطح پر لڑی جاتی ہے۔)

اس جنگ کی نوعیت اور اس کے لڑے جانے کا طور طریقہ ہی ناول کو داستان سے الگ کرتا ہے۔ اور صرف داستان ہی سے کیوں؟ دراصل یہی ناول کی پہچان ہے، بنیادی کشمکش کی نوعیت کیا ہے؟ اور اسے کس قدر مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے؟ یہ لڑائی اب میدان جنگ میں فوجوں کے درمیان یا عمرو عیار اور امیر حمزہ کی حماقتوں کے ذریعے لیا ان کی ترکیبوں سے نہیں لڑی جاتی بلکہ ناول میں اس لڑائی کی نوعیت بھی بڑی حد تک غیر مرئی ہو جاتی ہے اور اس لڑائی کے وسیلے بھی اس قدر غیر مرئی۔ نظر نہ آنے والے یا خارج وجود سے عاری یا واقعات کے رد عمل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ان واقعات کا گہرا تعلق ہوتا ہے کرداروں سے اور یہ مسئلہ ڈرامے اور افسانوی ادب کے بارے میں آج سے نہیں ارسطو کے زمانے سے بنیادی رہا ہے کہ کردار کو اولیت حاصل ہے یا واقعات کو۔ سچ یہ ہے کہ واقعات اور کردار ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور دونوں کا رشتہ نہایت قریبی ہے۔ کردار کے اچھے یا برے، حقیقی یا غیر حقیقی، کھرے کھوٹے کا پردہ پلاٹ یعنی اس کے کردار کے افعال و اعمال ہی سے کھلتا ہے واقعات دراصل مختلف کرداروں کے عمل اور رد عمل ہی کا نام ہے۔ یہ اور بات ہے اور اس کا ذکر آگے آئے گا کہ کچھ واقعات اتفاقی یا حادثاتی بھی ہوتے ہیں ان میں بعض قدرتی بلکہ منطقی معلوم ہوتے ہیں اور بعض محض اتفاقی گو ان کے اثرات اور حقیقی اثرات کرداروں پر پڑتے ہیں مثلاً اسٹیفن زویگ کے مشہور ناول Beware of play میں پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے کی بنا پر ہیرو اور ہیروئن کے ایک دوسرے سے محبت کرنے کا پیغام نہ پہنچ پانا یا تقسیم ہند کے بعد کے دور کے ناولوں میں خود تقسیم ہندوستان کے عمل سے نہ صرف افراد کا متاثر ہونا بلکہ واقعات کے پورے سلسلے کا درہم برہم ہو جانا جو بظاہر کردار اور افراد حصہ کے عمل کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا مگر ان کی تقدیر اور بعد کے واقعات کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے، حد یہ ہے کہ ان کے کرداروں میں بھی نئی جہات پیدا کرتا ہے۔

یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ داستانوں کے برخلاف ناول کے کردار ہر وقت اور ہمہ وقت تغیر کی زد میں رہتے ہیں اور ان میں منطقی تبدیلیاں حالات کے زیر اثر پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ نہ تو تمام تر نیک ہوتے ہیں اور نہ یکسر بد کردار بلکہ حالات انہیں اپنے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں مثلاً آگ کا دریا کے ہیرو اور ہیروئن کمال اور چمپا جو ہر دور میں بدلتے ہوئے بھی چند خصوصیات برقرار رکھتے ہیں یا علیم مسرور کے ناول 'بہت دیر کر دی' کی ہیروئن جو طوائف ہوتے ہوئے بھی ذہنی اور جذباتی تبدیلیوں کے ایسے انقلابی عمل سے گزرتی ہے کہ اس کو کرائے پر حاصل کرنے والا ہیرو اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں کردار کو ڈھالتی بھی ہیں ان کی محرک بھی ہوتی ہیں اور ان کی خود اپنی پیدا کردہ بھی ہوتی ہیں ان میں ان کے نیک و بد ہونے کا راز بھی پوشیدہ ہے اور ناول کا پلاٹ انہی عناصر سے بنتا ہے۔ ایک عجیب و غریب استثنا یہ ہے کہ اردو کے دور حاضر میں لکھے ہوئے اکثر ناول تقسیم ہند کے حادثے سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں یا کم سے کم اس واقع کے گرد گھومتے ہیں ان میں سے اکثر ناول تو ایسے ہیں جنہیں اس واقعے کی جذباتی دستاویز کہا جاسکتا ہے لیکن ان کے ماورا ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس زبردست سانحے کو بھی عظیم تر تاریخی سچائی کے طور پر پیش کیا ہے جو نہ صرف تاریخ کو نئے سانچے میں ڈھالتی ہے (اور دراصل خود بھی اسی تاریخی حقیقت کا نتیجہ ہوتی ہے) بلکہ ایک وسیع تر معنویت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ یہی ناول

ایسے ہیں جو تاریخ نویسی کے جبر سے نکل کر آفاقی جہت اختیار کر لیتے ہیں مثلاً عبدالرحمٰن کا ناول "اداس نسلیں" جس میں ہیرو کا کٹا ہوا ہاتھ نہ صرف تقسیم ہندوستان کا اشاریہ ہے بلکہ اس سے آگے کی بعض بلیغ استعاراتی حقیقتوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہاں ایک بات پھر مصوری کے حوالے سے کہنے کی ہے۔ مصوری میں رنگ کے استعمال کے کم سے کم دو بہت واضح طریقے ہیں ایک یہ کہ اگر سیاہ رنگ کہیں استعمال کرنا ہے تو برش براہ راست سیاہ رنگ میں ڈبو کر پردۂ تصویر پر پوتتے چلے گئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سیاہ رنگ کئی رنگوں سے ملا کر ابھارنے کی کوشش کی جائے اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف زیریں رنگوں کی لہروں کی مدد سے جو سیاہ رنگ ابھرتا ہے اس میں ایک تحلی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دیکھنے والے کی نظر تہہ در تہہ اس سیاہ رنگ کی مختلف سطحوں میں دھنستی چلی جاتی ہے اور ان کے پیچھے چھپی ہوئی رنگارنگی سے نئی کیفیت کا لطف پاتی ہے۔

یہی تکنیک کچھ ناول میں بھی ہے۔ اناڑی ناول نگار مفرد کردار ہی استعمال نہیں کرتا بلکہ مفرد واقعات بھی اختیار کرتا ہے اور شخصیت اور واقعات کی تہہ در تہہ حیثیت سے بے خبر رہتا ہے، اسی بنا پر اس کے کردار تہہ داری سے محروم اور گہری جاذبیت سے خالی اور مختلف جہات سے عاری ہوتے ہیں۔

اتنا کچھ کہنے سننے کے بعد بھی بنیادی بات یہ ہے کہ ناول ختم کرتے وقت پڑھنے والا اپنے کو کسی قدر مختلف سطح پر پاتا ہے یا نہیں؟ اس کی نظر میں دنیا کی ہیئت کچھ تبدیل ہوئی یا نہیں؟ جو اپنے کو ایک دوسرے ماحول میں موجود پاتا ہے یا نہیں؟ اگر یہ کیفیت ناول پڑھنے کے بعد پیدا نہ ہو کہ ارد گرد کا ماحول کچھ اجنبی سا کچھ پر اسرار سا کچھ نامانوس سا لگنے لگے، جسے ابھی اور زیادہ گہرائی اور قربت سے جاننے پہچاننے کی ضرورت ہے تو سمجھئے کہ ناول نگار کا سارا افسوں بیکار گیا اور پڑھنے والے کا وہ وقت بھی ضائع ہوا جو اس ناول کے پڑھنے میں لگا۔ اس پرانی جانی پہچانی زندگی کو نرالا، انوکھا اور اچھوتا بنانے کا فن ہی تو ناول کا مقصد ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔

لیکن یہ کشمکش کا تصور، یہ نئی جمالیاتی سطح پر کمند ڈالنے کا ہنر محض ذاتی کاوش سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے، اس کے پیچھے کچھ تاریخ عوامل بھی کار فرما ہوتے ہیں اور جب تک ہمارا پورا معاشرہ ایک دور اور ایک زمرے سے دوسرے دور اور دوسرے تہذیبی زمرے میں داخل نہیں ہوتا اس وقت نہ تو ناول لکھا جاتا ہے نہ مقبول ہوتا ہے (کہ یہ دور داستانوں ہی کا ہوتا ہے) اور نہ اس میں وہ قوت اور توانائی آتی ہے جو ناول نگار کی نظر کو کرداروں کو پوری ژرف نگاری کے ساتھ دیکھنے دکھانے میں صرف ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس تہذیبی بلوغت کے عمل میں ناول نگار ہی نہیں اس کے پڑھنے والے بھی شامل ہوتے ہیں بلکہ پورا اس معاشرہ شریک ہوتا ہے البتہ ناول نگار کا کارنامہ یہ ہوتا ہے کو وہ معاشرے کو ڈھالنے والے مختلف عناصر کے ریشے ریشے کو اس ترتیب سے پیش کرتا ہے کہ ان بکھیرے ہوئے عوامل میں ایک ربط پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ربط محض بلیغ معنویت ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ایک گہرے جمالیاتی انبساط کا وسیلہ بھی بنتا ہے یہ گہرا جمالیاتی انبساط ہی دراصل تمام تخلیقی سرگرمیوں کا مقصد اور منتہی ہے مگر اس کی اپنی معنویت بھی ہے اور اپنا دائرہ کار بھی۔

ہر ناول کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اسی جمالیاتی کیف سے ہوتا ہے (یا ہونا چاہئے) جو اپنے پڑھنے والوں کو نئے اہتزاز، نئے ارتفاع اور نئی کیفیت بلکہ ایک نئے عرفان زیست سے فیض یاب کرتا ہے اور یہ عرفان جمالیاتی ہوتا ہے اور زندگی کو نئے معنی دیتا ہے۔ یہ چند الفاظ تشریح طلب ہیں مگر ان کی تشریح دراصل ناول کے فنی تقاضوں کی تشریح کے مترادف ہوگی اور ان جمالیاتی کیفیات کی تشریح الگ موضوع ہے۔ اسے کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھنا ہی مناسب ہے۔ ●●

بقیہ صفحہ ۱۸: گیلا پن

کم ہو چکا تھا۔ تب اس نے پٹریوں پر آتی ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ سنی۔ اشیش جاگ اٹھا۔

"بابا ٹرین" وہ خوشی سے چیخا۔

پھر ایک ٹرین ان کے جھونپڑے کے سامنے سے گزری۔ انسانوں کے اجسام کینچوؤں کی طرح دروازوں سے چپٹے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے کئی گاڑیاں گزریں۔ ہر گاڑی کے ساتھ دروازوں سے چپٹے کینچوؤں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ اچانک دروازے پر ایک دستک ہوئی "بابا، ماں آ گئی" لیٹے ہوئے اشیش نے لپک کر دروازہ کھولا۔

رادھا دروازے میں کھڑی تھی۔ رات بھر کی جاگی، تھکی ماندی، اس نے اشیش کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ تب ہی دونوں کی نظریں ملیں۔ رادھا خود کو ذہنی طور پر منوہر کے سوالات کے لئے تیار کرنے لگی۔ منوہر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تم بہت بھوکی ہو گی۔" منوہر نے کہا "آؤ میں نے ناشتہ بنا لیا ہے۔"

رادھا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اطمینان سے اس کے چہرے کی تھکن ماند پڑ گئی منوہر نے پلاسٹک کا دستر خوان بچھایا۔

دو گھنٹوں بعد دونوں جھونپڑے کا سامان ٹھیک ٹھاک کرنے لگے جو رات بارش کے سبب بے ترتیب ہو گیا تھا۔

"سو جاؤ" منوہر نے کہا "تم بہت تھکی ہوئی ہو"

"نہیں اب میں دوپہر میں سوؤں گی سارا سامان بکھرا ہوا ہے۔ ایسے میں کیسے نیند آئے گی"۔ ●●



نریش

وہ تیری چاہ تھی حسرت تھی یاد تھی کیا تھی
وہ اک کرن تھی مری رات کا اجالا تھی

نہ زندگی تھی نہ جینے کا اک وسیلہ تھی
شراب خود کو بھلانے کا اک بہانہ تھی

تمہاری یاد بہت دور تک رہی ہم راہ
پھر اس کے بعد نہ تم تھے نہ میں نہ دنیا تھی

تمہیں قریب سے دیکھیں یہ آرزو تھی بہت
خود اپنے آپ سے ملنے کی بھی تمنا تھی

سمجھ میں آیا کھلا راز جب یہ روزِ حساب
حیات کیا تھی قضا کا کوئی بقایا تھی

یہ بے رخی ہی مقدر تھی اے نریشؔ اگر
تو پھر وہ دعوتیں دیتی ہوئی نظر کیا تھی

●B.V.S.CHAIR PUNJAB UNIVERSITY
CHANDIGARH - 160014



شمیم انور

شل ہوئے ہاتھ تو کشتی کو ہوا لے جائے
بھیڑیا بچوں کو جس طرح اٹھا لے جائے

ذات میں اپنی وہ کچھ ایسی کشش رکھتا ہے
اپنے پیچھے مرا سایہ بھی لگا لے جائے

اور دھوکا نہیں کھانے کا سمندر سے کہو
خالی سب سیپیاں ساحل سے اٹھا لے جائے

خوب چوکس رہو اس شہر سے نووارد شہر
جاگتی آنکھوں سے کاجل بھی چرا لے جائے

اب کہاں کھیلیں گے بچے کہ جنوں کروں کا
منھی منھی مرا آنگن بھی چرا لے جائے

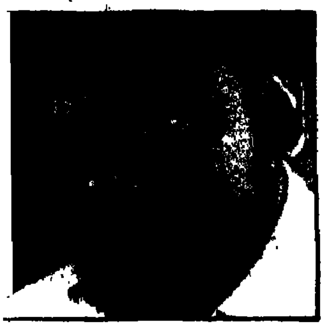
موج دریا کو ہے اس درجہ گھروندوں سے بیر
بس نہیں چلتا کہ ساحل بھی بہا لے جائے

دست و بازو پہ بھروسہ ہے تو ممکن ہی نہیں
جس طرف چاہے ہوا ناؤ بہا لے جائے

جب تلک اپنا تصرف ہے پتنگ اپنی ہے
کٹ چکی ہے تو جدھر چاہے ہوا لے جائے

ابن، آدم پہ تو لازم ہے گناہ آدم
فائدہ مفت میں شیطان اٹھا لے جائے

●I -203, PAHARPUR ROAD,
COLCUTTA-700024



خمار قریشی

معرکہ سر بھی کیا، شانوں پہ سر باقی
ابھی امکان کی دیوار میں در باقی

وہ جنوں ہو کہ خرد، اور خرد ہو کہ جنو
سر ادھر باقی ہے اور سر بھی ادھر باقی

بات ہی کل کی ہے سرسبز شجر باقی
آج کی بات ہے بس یادِ شجر باقی

دشت غربت کی ہوا راس بہت آئی
یہ خبر اڑ کے چلی آئی کہ گھر باقی

اڑتی رہتی ہیں مرے شہر میں افواہیں
ان سے منسوب مگر ایک خبر باقی

بے زباں لفظوں کی منہ بولتی تصویر بنا
میرے قبضے میں یہی وسعتِ ہنر باقی

IURESH CHOWK MOMIN
RA, GULBARGA (KARNATAKA)

علی حیدر ملک
A-2, BLOCK -N . NORTH NAZIM ABAD
KARACHI (PAK)

یوریکا

اُس کے مشغلے بھی عجیب تھے۔

جب وہ تنہا ہوتا تو اپنی کلائی پر بندھی گھڑی یا دیوار پر لگے گھڑیال پر اپنی نظریں ٹکا دیتا اور سوئیوں کی رفتار کو غور سے دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی کلائی کو کان کے برابر لا کر یا گھڑیال کے قریب جا کر ٹِک ٹِک کی آواز کو دھیان سے سننے لگتا۔

گھر یا دفتر سے باہر ہونے کی صورت میں وہ نظریں گھما کر کبھی ایک سمت میں دیکھتا کبھی دوسری سمت میں۔ کبھی نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف گھورنے لگتا اور کبھی نیچے زمین پر نظریں گاڑ دیتا۔

"یہ کیا ہے؟"۔۔۔وہ یہ سوال کرنا چاہتا مگر جانتا تھا کہ کوئی اس کے سوال کا جواب نہیں دے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا سوال سن کر لوگ اسے پاگل یا خبطی سمجھنے لگیں۔ پھر بھی وہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کیوں کہ سوال اسے ہمیشہ پریشان رکھتا۔ ہر وقت اس کے دماغ سے، دل سے، دل کی دھڑکن سے، جسم کے روئیں روئیں سے یہ سوال اٹھتا اور اس کے پورے وجود کو اپنے گھیرے میں لیتا ہوا محسوس ہوتا۔ کبھی کبھی تنہائی میں یہ سوال اس کے ہونٹوں پر بھی آ جاتا۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتا۔۔۔"کوئی سن تو نہیں رہا؟"

ہمیشہ تو نہیں پر کبھی کبھی اسے اپنے سوال کا جواب بھی مل جاتا۔

"یہ وہی چیز ہے جس نے تمہیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ تم اس کی قید سے باہر نہیں نکل سکتے"۔

"کیا یہ ٹھوس اور جامد ہے؟"

"نہیں یہ ٹھوس اور جامد نہیں۔ بس یوں سمجھو کہ تمام چیزوں میں حرکت اور تغیر اسی کی وجہ سے ہے"۔

یہ جواب بھی کہیں اور سے نہیں اس کی اپنی ذات کے پاتال سے آتا ہوا محسوس ہوتا۔

وہ اپنے دادا کو اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا حالانکہ اس نے انہیں کبھی دیکھا نہیں تھا کیوں کہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔ اپنے دادا سے اس کی محبت اور عقیدت محض سنی سنائی باتوں کی بناء پر تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ خاندان کے بزرگوں کے مطابق اس کی شکل اور آواز اپنے دادا سے بہت مشابہہ تھی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ وہ اپنے دادا کو دیکھے ان سے باتیں کرے۔ اکثر خواب میں اس نے انہیں دیکھا بھی تھا مگر خواب کے علاوہ جاگتی آنکھوں سے بھی وہ انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ میں پیچھے کی طرف سفر کر کے اپنے دادا جان خان بہادر عبدالرحیم خاں کو دیکھ سکوں؟۔ کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر؟" اس کے باطن میں یہ حسرت بھرا سوال گنبد کی صدا کے مانند گونجتا رہتا۔ "نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرنا ممکن نہیں۔"

وہ مایوس ہو کر سر جھکا لیتا۔

اپنے اکلوتے بیٹے کو اس نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اس کی تربیت بھی بڑی محنت اور تندہی سے کی تھی۔ بہت چاؤ سے ایک چاند سی بہو اپنے گھر لایا تھا۔ اس کا بیٹا اپنی بیوی کا دیوانہ تھا۔ ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی۔

"تمہارا لاڈلا جورو کا غلام بنتا جا رہا ہے اور تم اس بات سے بہت خوش ہوتے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے"۔ اس کی بیوی کبھی کبھی سخت لہجے میں اس سے شکایت کرتی۔

"اچھی بات کیوں نہیں ہے؟"۔ وہ بیوی سے پوچھتا۔

"تم خود تو کبھی ایسے نہیں تھے۔ آخر میں بھی تو تمہاری بیوی ہوں"۔

"اپنے اپنے نصیب کی بات ہے"

اس کے دل میں اکثر یہ خواہش انگڑائیاں لیتی کہ وہ اپنے چہیتے بیٹے اور حسین و جمیل بہو کی اولاد کو جوان ہوتا ہوا دیکھے۔ وہ یہ دیکھنے کا آرزومند تھا کہ اس کا پوتا اس کے بیٹے کے مقابلے میں کیسا لگتا ہے۔ ایک نسل کے بعد اس کا خون کیا روپ دھارتا ہے۔

"پوتے کی دلہن کیسی ہوتی؟ بہو کی طرح یا اس سے مختلف؟ پھر اس کے بچے..."

"تم کہاں پہنچ گئے؟۔ یہاں ہر چیز زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہے۔ جست لگا کر ایک دم آگے جانا ممکن نہیں"۔ کوئی اندر سے اس کے خیالوں کی زنجیر کو کاٹ دیتا

"آخر یہ کب سے ہے اور کب تک رہے گا۔ یعنی اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے؟"

"ہر چیز کی ابتدا بھی اسی سے ہے اور انتہا بھی اسی سے۔ بس اتنا ہی جاننا کافی ہے۔" کہیں سے یا شاید اس کے اندر سے آواز آتی۔

ایک دن وہ دفتر سے گھر پہنچا تو گھر کی ہر چیز اسی طرح تھی جس طرح کہ وہ چھوڑ کر گیا تھا پھر بھی کسی چیز کی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ریڈیو، ٹی وی، کیسٹ

(باقی صفحہ ۳۰ پر دیکھئے)

صابر زاھد

سر شک جگنو گہر کہکشاں شرارہ چراغ
دل ونظر کا ہمہ رنگ استعارہ چراغ

غبار دھند دھواں روشنی ہوا خوشبو
نئے سفر نئی سمتوں کا ہے اشارہ چراغ

لویں زبان سے سرکش ہوا کترتی ہے
سبھے ہے لذتِ جاں تاب کا خسارہ چراغ

اترتی رہتی ہیں خوش رنگ آیتیں دل پر
کہ طاق نائے میں لکھتا ہے گوشوارہ چراغ

اندھیرے کٹ گئے سر سے گذر گئی ہے ہواؔ
سنا ہے جب سے منوّر ہے آرہ آرہ چراغ

چھوؤں کہاں سے کہ سیماب تن اجالے ہیں
فریب دیتا ہے تقدیر کا ستارہ چراغ

نئے اجالے سخن کے سمیٹ لو زاہدؔ
بجھا تو پھر نہ جلے گا قطب نظارہ چراغ

●180- HUDCO COLONY
MALEGAON - 423203 (M.S)



خالد محمود

بے رنگ ہے بے فیض ہے یہ نام کا ادراک
آتا ہی نہیں کام تو کس کام کا ادراک

اپنی نہ کوئی شاخ نشیمن نہ بسیرا
ہم ایسے پرندوں کو کہاں شام کا ادراک

کہتے ہیں وہ نزدیک کی جاتی ہے مگر دور
گہرا ہے انہیں صنعت ایہام کا ادراک

رک جائیں تو رکنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے
چلنا ہو تو رکھتے نہیں اک گام کا ادراک

ہلکی سی کوئی ٹھیس ہو بھر آتے ہیں آنسو
آنکھوں کو نہیں ہے ابھی آلام کا ادراک

وہ دور بصر خوف سے کچھ بھی نہ کریں گے
رکھتے ہیں جو پہلو میں ہر انجام کا ادراک

ہر روز ہی اپنے لئے اک شام ہے خالدؔ
کس کو ہے یہاں ہم سے سوا شام کا ادراک

●URDU DEPARTMENT , JAMIA
MILLIA ISLAMIA NEW DELHI-110025



واجد قریشی

بند مٹھی کی داستاں سب کچھ
بعد اس کے تو بس دھواں سب کچھ

یہ نہ سوچا کہ ہے سماعت گنگ
اور سمجھا کیے اذاں سب کچھ

ان نگاہوں کے پار کچھ بھی نہیں
اور نگاہوں کے درمیاں سب کچھ

منزلوں کی خبر کسے کہ، یہاں
منزلوں کا ہے بس، نشاں سب کچھ

وہ چراتا رہا بدن ہر نور
اور ہوتا رہا بیاں سب کچھ

دشکیں دیں بنے محاذوں پر
کب رہا جان کا زیاں سب کچھ

DEPART MENT OF URDU,
ˆOVT GIRLS COLLEGE
JJAIN-456001 (M.P)

عبداللطیف اعظمی

349 - Zakir Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 11002[illegible]

تحقیق میں تاریخوں کی اہمیت

ایک نیا زاویۂ نگاہ

راقم الحروف نے اپنے مطالعے اور تحقیق کے دوران محسوس کیا ہے کہ اردو کے ممتاز دانشور اور نامور مصنف تاریخوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ زیادہ سے زیادہ سنین کا ذکر کر دیتے ہیں، وہ بھی بے دلی کے ساتھ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی واقعے کے منصفانہ تجزیے کے لیے یا صحیح پس منظر میں اسے سمجھنے کے لیے سال کے ۳۶۵ دنوں کو نظرانداز کر کے اور محض بارہ مہینوں پر اکتفا کر لینے سے علم و تحقیق کے ساتھ کیوں کر انصاف کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ قدرت نے ان ایام کو بے سمجھے یونہی بے مصرف بنایا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ مگر افسوس کہ یہ خاکسار اپنے ہم عصر محققین اور مصنفین کو سمجھانے سے قطعاً قاصر رہا۔ اس کے برعکس موقع بے موقع اس خیال کا بالعموم وہ مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تاریخوں کے ذکر سے کیا ہوتا ہے، صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ کس شخص نے کیا کارنامے انجام دئے ہیں۔ کب پیدا ہوا، کب وفات ہوئی، کہاں تعلیم و تربیت حاصل کی، کتنی کتابیں اور ان کی تاریخ اشاعت کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دانش وروں کی بھاری تعداد کے نزدیک یہ سب باتیں فروعی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ لوگوں کے ان ارشادات اور اعتراضات کے پیش نظر راقم الحروف نے بہت سی ایسی مثالیں جمع کی ہیں کہ محض تاریخوں سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض ممتاز دانشوروں اور نامور مصنفین نے کیسی کیسی فاش غلطیاں کی ہیں اور ان کو اس کا احساس تک نہیں۔ آج کی صحبت میں ان ہی مثالوں میں سے چند کو پہلی مرتبہ پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میرا مقصد صرف تاریخوں کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے، زیر بحث بزرگوں کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کرنا نہیں۔

(۱) **پروفیسر خواجہ احمد فاروقی** : پ : ۳۰؍اکتوبر ۱۹۱۷ء ۔ م : ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۵ء

موصوف کا اردو کے بزرگ ترین دانشوروں میں شمار ہوتا ہے۔ مالک رام صاحب نے اپنی کتاب: تذکرہ ماہ و سال میں ماہنامہ آجکل (نئی دہلی) بابت مارچ ۱۹۸۵ء کے حوالے سے موصوف کی تاریخ پیدائش ۳۰؍اکتوبر ۱۹۱۷ء بہ مقام بچھرایوں (یوپی) لکھی ہے (صفحہ ۱۴۶) موصوف نے اپنے ایک مضمون: "مولانا محمد علی" میں ایک جگہ لکھا ہے! "ٹھیک اس وقت جب مولانا محمد علی اپنا خطبہ (کانگریس) پڑھ رہے تھے، ترکی اسمبلی نے خلافت کو ختم کر دیا تھا۔"

(ہفتہ وار ہماری زبان بابت ۲۲؍دسمبر ۱۹۸۶ء (صفحہ ۲) اب آیئے تاریخوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں کہ مذکورہ بالا بیان میں کس قدر صداقت ہے؟

(۱) مولانائے مرحوم مولانا محمد علی نے اپنا خطبہ صدارت، اجلاس کانگریس منعقدہ کوکناڈا بتاریخ ۲۶؍دسمبر ۱۹۲۳ء میں پڑھا تھا۔ لیکن خلافت کے ختم کرنے کی اطلاع، ہندوستان میں ۱۰؍مارچ ۱۹۲۴ء کو پہنچی تھی۔ چنانچہ اردو کی مشہور اور موقر کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے فاضل مصنف سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں: "انگورہ میں حکومت قائم ہوتے ہی خلافت کے منصب کو توڑ دیا گیا اور شیخ الاسلام کے عہدے کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کی اطلاع ہندوستان میں ۱۰؍مارچ ۱۹۲۴ء کو پہنچی...." (مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء صفحہ ۴۶۷)

(۲) اسی طرح اردو کے مشہور صحافی اور ممتاز مصنف قاضی محمد عدیل عباسی (مرحوم) لکھتے ہیں: "۳؍مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا اور ترکی میں دیگر حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح ایک دنیوی حکومت رہ گئی۔" (تحریکِ خلافت مطبوعہ ۱۹۷۸ء۔ صفحہ ۲۵۴)

دیکھا آپ نے خواجہ احمد فاروقی ایسے ممتاز دانشور نے اتنی بڑی غلطی صرف اس لئے کی کہ وہ زیر بحث مسئلے کی تاریخ سے ناواقف تھے۔

(۲) **سید صباح الدین عبدالرحمن** : پ : ۱۹۱۱ء ۔ م : ۱۸؍نومبر ۱۹۸۷ء۔ (تذکرہ ماہ و سال۔ صفحہ ۲۳۸)

برصغیر ہند و پاک کے ممتاز اور تصنیفی اوارے، دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کے دیرینہ رفیق، مولانا شاہ معین الدین ندوی (مرحوم) کے بعد ناظم علمی اور موقر ماہنامہ معارف (اعظم گڈھ) کے مدیر اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ مگر ان تمام اعلیٰ عہدوں اور برصغیر ہند و پاک کی علمی و ادبی دنیا کے ممتاز مقام پر فائز ہونے کے باوجود محض تاریخوں سے ناواقفیت کی وجہ سے دو اہم اور فاش غلطیوں کے مرتکب ہوئے۔

علامہ اقبالؔ کے مجموعۂ کلام بانگ درا میں دو مختصر نظمیں: اسیری اور دریوزۂ خلافت مولانا محمد علی جوہر سے متعلق ہیں جو علی الترتیب حسب ذیل ہیں:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس کے بہرمند
شہپرِ زاغ و زغن در بندو صید نیست — ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اپنے ایک مضمون "زندہ رود" مطبوعہ: معارف بابت جنوری ۱۹۸۲ء میں لکھتے ہیں: (صفحات: ۵۔ ۴۴)
"مولانا محمد علی گرفتار ہو کر قید کیے گئے تو (علامہ اقبال نے) ایک نظم "اسیری" کے عنوان سے لکھی، اس کا آخری شعر ہے:
شہپرِ زاغ و زغن در بند قید و صید نیست — ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ است (اقتباس ختم)

لیکن نظم کی تخلیق اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی مولانا کی گرفتاری پر نہیں، بلکہ ان کی رہائی کے موقع پر کہی گئی تھی۔ اس کی تفصیل یوں ہے: مولانا محمد علی بیتول جیل سے ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے تو وہ سیدھے امرتسر کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس منعقد ہونے والے تھے۔ جب اخبارات سے یہ اطلاع علامہ اقبال کو ہوئی تو وہ علی برادران سے ملنے کے لیے اپنے دوست احباب کے ساتھ بذریعہ کار لاہور سے امرتسر کے لیے روانہ ہوئے اور راستے میں یہ نظم کہی اور مسلم لیگ کے اجلاس میں پڑھ کر سنائی۔ علامہ جب علی برادران سے بغلگیر ہو کر ملے تو سرگذشتِ اقبال کے فاضل مولف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وہاں پہنچ کر (یعنی امرتسر) جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران کے ساتھ بغلگیر ہوئے تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ اشک بار تھے۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے جو اسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے۔" (صفحات ۱۴۵۔۱۴۶)

اسی طرح علامہ اقبال کی دوسری نظم "دریوزۂ خلافت" کے بارے میں سید صباح الدین مرحوم لکھتے ہیں: "مولانا محمد علی خلافت کا وفد لے کر لندن گئے تھے۔ وہاں سے یہ وفد ناکام واپس آیا تو علامہ نے لکھا:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے — مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چنیں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی (معارف۔ جنوری ۱۹۸۲ء، صفحہ ۳۶)

مذکورہ بالا بیان کی صداقت کو پرکھنے کے لیے آیئے ایک سرسری نظر تاریخ کے صفحات پر ڈال لیں۔ یکم فروری ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی مرحوم کی سربراہی میں خلافت وفد لندن کے لئے روانہ ہوا اور اسی سال ۱۳ر اکتوبر کو واپس آیا۔ لہٰذا اگر مذکورہ بیان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کے بعد علامہ اقبال نے یہ نظم کہی ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی نظم تقریباً ایک سال پہلے اکتوبر ۱۹۱۹ء کو شائع ہو چکی تھی۔ کسی اور رسالے میں نہیں، خود معارف میں جس کے مرحوم اس وقت ایڈیٹر تھے۔ مگر کسی اور عنوان سے یعنی "پولیٹکل گداگری" کے عنوان سے اور تقریباً ایک ماہ کے وقفے سے یہی نظم اسی عنوان سے مدینہ (بجنور) مورخہ ۵ر نومبر ۱۹۱۹ء کے صفحہ اول پر شائع ہوئی۔ میرے خیال میں اس کی تھوڑی سی تفصیل پیش کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔ زیر بحث نظم کو معارف میں اشاعت کے لیے بھیجتے وقت علامہ اقبال مرحوم نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو جو خط بھیجا تھا، وہ حسب ذیل ہے:

لاہور ۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء

مخدومی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

دوسرے صفحے پر چند اشعار معارف کے لیے لکھتا ہوں۔ مدت سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ گذشتہ رات زکام کی وجہ سے سو نہ سکا۔ یہ تاثر ایک چھوٹی سی تضمین کی صورت میں منتقل ہو گیا۔ درد سر نے زیادہ شعر نہ لکھنے دئے اور نہ طبیعت پر زیادہ زور دے سکا۔ معلوم نہیں آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ واقعات صاف اور نمایاں ہیں۔ مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن کے شیعوں (حاشیہ میں درج ہے : "اشارہ ہز ہائی نس آغا خاں کی طرف ہے۔ مجلس خلافت کی بنیاد اسی طرح پڑی تھی۔ یعنی آغا خاں نے منشی مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم بیرسٹر کو آمادہ کیا اور انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھ کر آمادہ کیا۔" (اقبال نامہ حصہ اول۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ایم۔ اے۔ صفحات : ۱۰۵۔ ۱۰۷ ار نمبر ۱۷۔ ۴۹) کے اشارے پر ناچتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس کہ مفصل عرض نہیں کر سکتا کہ زمانہ نازک ہے۔ بہر حال اگر یہ اشعار آپ کو پسند نہ ہوں یا رسالہ معارف کے لیے آپ انھیں موزوں نہ تصور فرمائیں تو واپس بھیج دیجئے... اس خط کو پرائیوٹ تصور فرمایئے۔" اس کے بعد اشعار نقل کرنے کے بعد علامہ لکھتے ہیں: "عنوان ان اشعار کا آپ خود تجویز کرلیں۔ اصل فارسی شعر میں "دیگراں" کی جگہ "ناکساں" ہے۔ میں نے یہ لفظی تغیر ارادۃً کیا ہے۔"

مخلص محمد اقبال

علامہ کی اجازت کے مطابق سید صاحب مرحوم نے اس نظم کا عنوان "پولیٹیکل گداگری" رکھا اور علامہ کو اس کی اطلاع کردی۔ چنانچہ ۱۰ ار اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں علامہ لکھتے ہیں : "نوازش نامہ ملا۔ عنوان جو آپ نے تجویز فرمایا ہے۔ ٹھیک ہے۔" (حوالہ سابق صفحہ ۱۰۷) مگر جب ان اشعار کو بانگ درا میں شامل کیا گیا تو اس کا عنوان بدل کر: "دریوزۂ خلافت" کر دیا گیا۔

سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم، مجھ سے عمر میں تقریباً چھ سال بڑے تھے مگر علم وادب اور تصنیفی خدمات و تجربات کے پیش نظر میں ان کو اپنے بزرگوں میں شمار کرتا تھا۔ لیکن یہ ان کی عنایت تھی کہ ان سے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ مرحوم کے مضمون: "زندہ رود" (مطبوعہ معارف جنوری ۱۹۸۲ء) کے بعد اور اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے جب وہ دہلی تشریف لائے اور حسب معمول میرے غریب خانے کو عزت بخشی تو بڑے ادب کے ساتھ میں نے علامہ اقبال کی زیر بحث دونوں نظموں کے بارے میں وہ تفصیلات ان کی خدمت میں پیش کیں جو اوپر بیان کر چکا ہوں۔ انھوں نے بڑے صبر و ضبط کے ساتھ میری گزارشات سنیں اور آخر میں صرف اس قدر فرمایا کہ میں نے معارف میں جو کچھ لکھا ہے، اسے دوسرے لوگوں نے بھی بیان کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ نے پہلی مرتبہ یہ غلطی کی ہے۔ مگر آپ سے میری توقعات دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند تھیں۔

میرا خیال ہے کہ میرے مقصد کی وضاحت کے لیے مذکورہ بالا دو مثالیں بہت کافی ہیں۔ لیکن کیا مضائقہ ہے اگر ایک اور مثال پیش کردی جائے۔ میرے خیال میں یہ پچھلی دونوں مثالوں کے مقابلے زیادہ دلچسپ اور عبرت ناک ہے۔

(۳) اختر علی (ایک غیر معروف ادیب)

افسوس کہ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ شاید پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون : "احسان دانش کی شاعری پر ایک نظر" مطبوعہ "قومی زبان (کراچی) بابت مئی ۱۹۲۸ء میں لکھتے ہیں: "احسان دانش نے جس زمانے میں آنکھ کھولی، وہ آزاد، حالی اور شبلی کی وفات کا زمانہ تھا۔" (صفحہ ۵)

سیدھا سادا اور مناسب طریقہ یہ تھا کہ فاضل مضمون نگار اپنے مطالعے یا اپنی تحقیق کے مطابق احسان دانش مرحوم کی تاریخ پیدائش یا سال پیدائش لکھ دیتے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے ایک پیچیدہ اور لاطائل طریقہ اختیار کیا۔ یہ بھی گوارا کر لیا جاتا اگر تینوں بزرگوں کی تاریخ وفات ایک ہوتی اور ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ اس صورت حال کی وجہ سے حضرت احسان دانش کی پیدائش کا صحیح پتہ چلانا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ بہر حال صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تینوں بزرگوں کی تاریخ وفات یا سال وفات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مختصر تاریخ ادب اردو کے فاضل مولف پروفیسر سید اعجاز حسین مرحوم کے مطابق (۱) مولانا محمد حسین آزاد کا سنہ وفات ۱۹۱۰ء ہے (صفحہ ۱۱۰) (۲) مولانا الطاف حسین حالی کا ۱۹۱۴ء (صفحہ ۱۱۳) اور (۳) مولانا شبلی نعمانی کی تاریخ وفات ۱۹ ار نومبر ۱۹۱۴ء ہے (صفحہ ۲۵ے)

تذکرۂ ماہ و سال کے محترم مولف مالک رام صاحب کے مطابق (۱) مولانا آزاد کی تاریخ وفات ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء (صفحہ ۶۷) (۲) مولانا حالی کی تاریخ وفات یکم جنوری ۱۹۱۵ء (صفحہ ۱۲۵) اور (۳) شبلی نعمانی کی تاریخ وفات ۱۹ ار نومبر ۱۹۱۴ء ہے (صفحہ ۲۱۷)۔ ظاہر ہے ان اختلافات اور بین فرق کی

وجہ سے کوئی واضح اور یقینی نتیجہ نکالنا ممکن نہیں۔

آیئے لگے ہاتھوں حضرت احسان دانش کی ولادت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ خود احسان دانش نے اپنی آپ بیتی "جہانِ دانش" میں اپنی پیدائش کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ واقف نہیں تھے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا (لاہور) میں مرحوم کا سنہ پیدائش ۱۹۱۲ء درج ہے اور پاکستان اہل قلم کی ڈائرکٹری (اسلام آباد) میں ۱۹۱۵ء ہے۔ مختصر تاریخ ادب اردو (مولفہ سید اعجاز حسین) کے مطابق ان کا سال پیدائش ۱۹۱۴ء ہے۔ (صفحہ ۵۷۱) اور تذکرۂ ماہ و سال میں "اوراق" کے حوالے سے ۱۹۱۱ء لکھا ہے۔ (صفحہ ۱۷) گویا اگر پاکستان اہل قلم کی ڈائرکٹری کے سال پیدائش ۱۹۱۵ء کو صحیح مان لیا جائے تو احسان دانش ان تینوں بزرگوں کی وفات کے بہت بعد میں پیدا ہوئے تھے اور اگر ۱۹۱۴ء کو تسلیم کر لیا جائے تو مولانا محمد حسین آزاد کی وفات سے لگ بھگ چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ مگر چونکہ مولانا حالی اور مولانا شبلی کا سال وفات ۱۹۱۴ء ہے، اس لئے اس کا امکان ہے کہ شاید ان کی حیات میں پیدا ہوئے ہوں۔ لیکن اگر لاہور کی اردو انسائیکلو پیڈیا کا سنہ پیدائش ۱۹۱۲ء مان لیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تینوں بزرگوں کی وفات کے بعد حضرت احسان دانش پیدا ہوئے۔ جب صورت حال اتنی مختلف اور متضاد ہو تو ایسا مہمل جملہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ: "احسان دانش نے جس زمانے میں آنکھ کھولی تو وہ آزاد، حالی اور شبلی کی وفات کا زمانہ تھا۔" میرا قیاس ہے کہ اس کی وجہ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ قومی زبان (کراچی) کے فاضل مضمون نگار اختر علی صاحب ان تمام تاریخوں اور ان کے اختلافات سے بالکل ناواقف تھے اور اپنی سادہ لوحی میں ایک اچھا فقرہ سمجھ کر لکھ گئے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ ان تینوں مثالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اگر کوئی ادیب یا مصنف یادداشت اور تاریخوں سے کماحقہ واقف نہ ہو تو وہ بڑی سے بڑی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس شخص کو اپنی غلطی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سے تو اتنی بے تکلفی تھی کہ ان سے براہ راست ان کی اس فاش غلطی پر گذارش کرنے کا موقع مل گیا۔ اختر علی صاحب سے بہ عاجز بدقسمتی سے واقف نہیں، ورنہ ان کے ردعمل کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ خوش قسمتی سے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب دہلی ہی میں رہتے ہیں مگر سوء قسمت سے انھوں نے اپنے آپ کو دہلی کے ادبی گروپ سے اس قدر وابستہ کر لیا ہے کہ وہ ہر شخص کی رائے کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان سے کچھ عرض کرنے کی مجھے ہمت نہیں ہوتی۔ مگر اب جبکہ اپنے اس خیال کو میں نے قلم بند کر لیا ہے، اس لیے سوچ رہا ہوں کہ کسی نہ کسی شکل میں اپنے اس ناچیز خیال کو ان کے علم میں لانے کی کوشش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔ (عبداللطیف اعظمی صاحب کا یہ مقالہ ہم عصر اردو ادب نمبر (جلد اوّل میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ اس وقت تک خواجہ احمد فاروقی حیات تھے۔ ادارہ) ○○

بقیہ صفحہ ۲۵ / یوریکا

پلیئر سب خاموش تھے۔ آئرن، واشنگ مشین، پنکھے حرکت نہیں کر رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" ۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"پی ایم ٹی پھٹ گیا ہے۔ کئی گھنٹے سے بجلی نہیں ہے"۔

اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل سی گئیں۔

"یوریکا۔ یوریکا"۔ اس کے اندر سے ایک طویل آواز بلند ہوئی اور خوشی کی ایک لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ اندر ہی اندر مسکرایا۔

"جب سروں کے اوپر چمکنے والے سرخ گولے نے قدموں کے نیچے بچھے ہوئے سبز فرش کو روشنی کا بوسہ دیا تو یہ تھرکنے لگا اور اس طویل اور نہ ختم ہونے والے بوسے کی وجہ سے اب تک تھرک رہا ہے۔ تبھی سے اس نادیدہ سیل کا بھی آغاز ہوا جس کی حاکمیت ہر چیز پر قائم ہے اور جس کی مضبوط گرفت سے نکلنا کسی کے بس میں نہیں"۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔

"آخری سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟"۔ اس کے ذہن نے پھر ایک سوال کو جنم دیا۔

"اس وقت تک جب تک کہ اوپر چمکنے والا سرخ گولا پھٹ نہیں جاتا اور یہ سبز فرش اس کے بوسے سے محروم نہیں ہو جاتا"۔ جواب بھی ذہن کے غار سے آیا۔

"یوریکا۔ یوریکا" ۔ وہ زور زور سے چیخنے اور دھمال کرنے لگا۔ اس کی بیوی حیرت اور تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی! ●●



خالد بشیر

گلاب جسم ہے، خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسب نسب سے ہے

دیارِ خواب کے ہم شب گزیدہ لوگوں کے
دلوں میں خوف بہت ابتدائے شب سے ہے

ترے لئے ہیں شگفتہ مراسموں کے چمن
کسی سے رنج اگر ہے تیرے سبب سے ہے

کہاں بھٹک گئی ہے کونپلوں کی رُت تو بھی
نہال دل کو ترا انتظار کب سے ہے

شکایتیں بھی زیادہ اسی سے ہیں مجھ کو
قریب تر جو میرے دوستوں میں سب سے ہے

●SANAWAR, SRINAGAR, (KASHMIR)



عصمت مظفری

حسن کے اظہار میں تو حسن ہے اظہار کا
نغمہ سازی میں نہیں ہے کام کچھ بھی تار کا

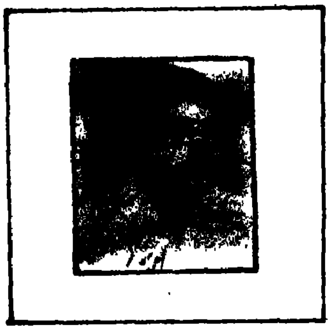
وہ فلک کی وسعتوں سے کیسے ہوگا باخبر
جس کے سر پر ایک بھاری بوجھ ہے دستار کا

محنتی سے پوچھئے ہوتا ہے کیا محنت کا پھل
قیمتی موتی سے ہے گھونگا سمندر پار کا

وہ جو تاجر کی طرح پھرتا تھا ہر بازار میں
اس کو پیغمبر بنا دیتا ہے گوشہ غار کا

چاند نے اک ایک کر کے تین تارے دے دیئے
زیست میں عصمت کی لایا نور سودا پیار کا

●13-7-74, YALLAMMA BAZAR
WARANGAL- 506012 (A.P.)



رفیق عادل

جم گئے اپنے بال و پر جیسے
سینۂ سنگ میں شرر جیسے

اک کنایہ طویل تر گویا
اک روداد مختصر جیسے

کوئی رنجش نہ گفتگو کوئی
مجھ سے آگے ہیں ہمسفر جیسے

اب کے بارش کہاں ہوئی ایسی
اشک بہتے ہیں رات بھر جیسے

کوئی سرحد نہیں ہے جذبوں کی
اور بدن اپنا بند گھر جیسے

کتنا تنہا، اداس ہے عادل
شام کا سرمئی شجر جیسے

●MADAR MOHALLA
FAIZPUR -425503 (M.S.)



ولی محمد چودھری

TARGET INDUSTRIES MOHALLA
KATKOI, AMROHA- 244221 (U.P)

کانچ کے ٹکڑے

میں اور ندیم بہت دیر سے ندیم کی نشست گاہ میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ندیم کے والدین دور کہیں گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ شادی اس نے کی نہیں تھی۔ تین کمروں کے مکان میں وہ تنہا رہتا تھا۔ مجید نام کا ایک ملازم تھا جسے وہ حمید بھائی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ اکثر دوست شام کو ندیم کے گھر ہی جمع ہوا کرتے تھے۔ اپریل کا پہلا ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا، ہوا بھی کچھ دھیمی ہوگئی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی نے ہیبت ناک صورت حال اختیار کر لی تو گھبرا کر ندیم گویا ہوا۔ کہنے لگا!

"کیا بات ہے میاں، آج اتنی گہری خاموشی کیوں؟"

میں نے جواب دیا "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے"

"کوئی نہ کوئی بات تو ہے۔ میں نے تمہیں اتنا مضمحل پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ندیم پیارے، آدمی جب بہت خوش رہتا ہے نہ، تو اس کا کبھی کبھی اداس رہنے کو چپ رہنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ سمجھو میں آج کل کچھ ایسی ہی کیفیت سے گذر رہا ہوں۔

"کیا اچھی فلاسفی میں لپیٹ کے جھوٹ بول رہے ہو۔ ابے جو شخص دوستوں میں بیٹھتے ہی چہکنے لگتا ہو، جس کے آنے سے محفل گل و گلزار ہو جائے، وہ یوں ہی اداس نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں یار، ہوا یوں کہ آج چھٹی کا دن تھا۔ دوپہر کو میں نے سوچا کہ بازار سے جا کر سبزی ہی لے آؤں، لہٰذا میں نے بیوی سے معلوم کیا کہ میں بازار جا رہا ہوں کوئی سبزی تو نہیں منگوانی؟۔ اس سے پہلے کہ بیوی کچھ کہتی میری بیٹی نے کہا۔"

"پاپا آپ بھنڈی لے کر آنا۔ بہت دنوں سے گھر میں بھنڈی نہیں بنی۔ میرا دل چاہ رہا ہے، بھنڈی کھانے کو۔"

میں نے میاں بچی کو ڈانٹ دیا کہ یہ بھنڈی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اتنی بیکار اور واہیات سبزی لاحول ولا قوۃ۔ میرا یہ کہنا تھا کہ بیوی تو آپے سے باہر ہوگئی اور مجھے جی بھر کے سنائیں۔ کہنے لگی۔

"تم بچی کی اتنی معمولی فرمائش پوری نہیں کر سکتے، پھر تم سے کسی اچھی چیز کی توقع تو کی ہی نہیں جاسکتی، اور جب آپ کو گھر میں اپنی ہی مرضی چلانی ہے تو پھر ہم لوگوں سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو آپ کا دل چاہے آپ وہ لے آئیں۔ بیوی بچے تو آپ کے کچھ ہیں ہی نہیں۔"

بس یار ندیم اسی وقت سے اپنا موڈ خراب ہے۔ میرے خیال سے تو دنیا کا کوئی بھی شریف آدمی بھنڈی جیسی پلید سبزی نہیں کھاتا ہوگا۔

"اف نوہ تو بھی بہت بھولا آدمی ہے۔ انتہائی معمولی بات سے اتنا ڈسٹرب ہو جاتا ہے کہ بس پوچھو ہی مت۔ دیکھ آج اپنے حمید بھائی نے بہت ہی شاندار چکن بنایا ہے۔ اپنا کپور کہہ کر گیا تھا کہ وہ باہر سے وہسکی کی بوتل لایا ہے۔ اب تک تو اسے آ جانا چاہئے تھا۔ اگر خود کہیں اٹک گیا تھا تو کم سے کم وہسکی تو دے جاتا۔ اب تو یہ بھنڈی سنڈی کا چکر چھوڑ، چکن کھا اور وہسکی پی۔ آج کی شام اپنی ہے پیارے۔

"کپور نے کتنے بجے آنے کو کہا تھا۔"

"سات بجے تک آنے کو کہہ گیا تھا۔ اب آٹھ بجنے والے ہیں ابھی تک نہیں آیا۔ مجھے ہفتہ دس دن تک بھی اگر وہسکی پینے کو نہ ملے تو بھی مجھے پرواہ نہیں۔ لیکن ایک بار اگر پینے کا موڈ بن چکا ہو تو پھر مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔ اس کپور کے بچے نے آج بور کر دیا۔

ندیم یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ کپور اپنے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل لئے ہوئے داخل ہوا تو ندیم اس پر ابل پڑا۔

"تو نے یار کمال کر دیا۔ ایک گھنٹے سے انتظار کر رہے ہیں۔ چکن تیار ہے، سلاد تیار ہے، ٹھنڈا پانی، سوڈا سب کچھ ہے پر وہسکی نہیں ہے۔۔۔ جناب غائب ہیں۔"

"لے بھئی لے وہسکی بھی آگئی۔"

کپور نے وہسکی کی بوتل ندیم کے ہاتھ میں دی اور کہنے لگا۔

"یاروں میں آتو وقت ہی پر جاتا، لیکن ہوا یہ کہ مسوری سے میری بیٹی آئی ہوئی ہے۔ اس کے اسکول کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ آتے ہی اس نے رٹ لگائی کہ پاپا میں بھنڈی کی سبزی کھاؤں گی۔ اب یہاں شام ہی سے سبزی منڈی بند ہو جاتی ہے۔ میں نے یار سارا شہر چھان مارا تب جا کر یہ بے

ز سی سو کھی ہوئی بھنڈیاں ملی ہیں۔ بچی کی فرمائش تھی، میں ٹال نہ سکا۔ اسی وجہ سے لیٹ ہو گیا۔ تم لوگ دھیرے دھیرے وہسکی پیو میں ابھی پانچ منٹ میں بھنڈیاں گھر دے کر آتا ہوں۔

کپور یہ کہہ کر چلا گیا۔ ندیم نے جلدی سے بوتل کھولی اور دو پیگ بنائے چیرس کیا اور ایک ہی جھٹکے میں گلاس آدھا کر دیا۔ میں نے کہا۔

"ندیم یہ کپور کی بیٹی بہت ہی ذہین ہے۔ مسوری میں Conrent میں پڑھتی ہے۔ اس کے باوجود یار اسے بھی بھنڈی پسند ہے وہ بھی بھنڈی کھانا چاہتی ہے۔ لعنت ہے اس بھنڈی پر یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔"

"ایسا ہے کہ بھنڈی کھانے کی چیز ہے یا نہیں اس پر بحث بعد میں کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ بھنڈی سے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟۔

جہاں تک مجھے یاد ہے بھنڈی تمہاری بھی پسندیدہ سبزی تھی۔ پھر یہ اچانک بھنڈی سے نفرت کیوں۔؟ بتاؤ آخر بات کیا ہے۔ دیکھو کوئی بہانہ مت بنانا شراب کی پوری بوتل اپنے پاس ہے۔ غم کسی بات کا ہے نہیں۔ بس جو کچھ بھی کہنا سنبھل کر اور سچ کہنا۔

"کیا مطلب تم ایک ہی پیگ میں مجھ سے اس لب و لہجے میں بات کرنے لگے۔"

"لب ولہجہ ٹھیک ہے، بس اب تم شروع ہو جاؤ۔"

"یار ندیم کیا بتاؤں لاؤ ایک پیگ اور دو۔"

"ایک کیا تو دو لے اور جلدی سے ناڈال کہ ہوا کیا تھا۔"

"یار ندیم جس وقت میری بچی نے بھنڈی کی فرمائش کی اور میں نے اسے ڈانٹا تو مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے اسے کیوں ڈانٹا۔ پھر میں نے غور کیا تو ایک واقعہ میرے ذہن میں ابھرنا شروع ہوا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ میں اور راجیو ایک ساحلی شہر میں تفریح کے لئے گئے تھے۔ ہم دونوں اس شہر میں شام ہونے تک پہنچ گئے تھے۔ نہا دھو کر ہم لوگوں نے چائے منگوائی اور بیرے سے پوچھا کہ یہاں رات بسر کرنے کے لئے بھی کچھ ملتا ہے یا نہیں۔ بیرا ہمارا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے ہمیں ایک Beach کا نام بتایا اور کہا۔

"صاحب فلاں Beach پر چلے جاؤ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

لہٰذا میں اور راجیو اس Beach پر پہنچ گئے۔ پورے Beach پر بہار آ رہی تھی۔ ملک کے کونے کونے کی لڑکیاں اور عورتیں وہاں موجود تھیں۔ نارتھ انڈین، ساؤتھ انڈین وغیرہ وغیرہ وغیرہ سب کچھ تھا۔ ہم دونوں نے اپنے لئے دو لڑکیوں کا انتخاب کیا۔

میں نے جس لڑکی کو پسند کیا تھا وہ ہندی بیلٹ کی معلوم ہوتی تھی۔ ان لڑکیوں کو ساتھ لے کر ہم اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ عیش و نشاط کی بساط بچھ گئی۔ میں نے بیرے کو چکن مٹن لانے کو کہا اور اس لڑکی سے جسے میں نے اپنے لئے منتخب کیا تھا معلوم کیا کہ وہ اپنی پسند کا اگر کچھ کھانا چاہے تو اس نے جواب دیا۔

"میں بھنڈی کھانا چاہتی ہوں، مزید اس نے کہا کہ ہر رات اسکا گاہک اسے چکن مٹن کے ساتھ ہی روندتا ہے۔ آپ پلیز میرے لئے بھنڈی منگوائیں۔"

میں نے بیرے کو آواز دی اور کہا کہ وہ ایک پلیٹ بھنڈی بھی لے کر آئے۔ بیرے نے کہا۔

صاحب ادھر بھنڈی نہیں ملتا۔ فش فرائی ملتا، بہت شاندار ڈش ہوتا صاحب بالکل میڈم کے جیسی لذت دیتا۔"

"شٹ اپ۔ بکواس مت کر یہ لے سو (۱۰۰) کا نوٹ اور ٹیکسی پکڑ کر پورا شہر چھان مار سمجھا۔ مجھے بھنڈی چاہئے۔

"OK سر ہم دیکھتا ہے۔ لیکن ملنا بہت مشکل ہوتا سر"۔

"بس اب تم جاؤ۔"

بیرا چلا گیا۔ میں اور راجیو وہسکی کے گلاس ہاتھ میں لے کر لڑکیوں سے باتیں کرنے لگے اور لطف اندوز ہونے لگے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد بیرا واپس آیا اور کہنے لگا۔

"صاحب بھنڈی مل گیا ہے۔ اس کے لئے ہم کو High way پر جانا پڑا وہاں پر ایک نارتھ انڈین کا ڈھابہ تھا وہاں سے ہم لایا ہے۔ بھنڈی پندرہ روپے کا ہے۔ ٹیکسی، کا بھاڑہ ڈھائی سو روپیا ہے اور اپنا بھی ڈیڑھ گھنٹے کا Labour ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم ایسا کرو سو (۱۰۰) روپے میں سے بچا ہی اپنے پاس رکھو اور ٹیکسی کا کرایا میرے بل میں داخل کرادو۔"

"Thankyou sir Thankyou ویری مچ۔"

میں اور راجیوں دو تین دن وہاں گزار کر واپس آ گئے۔ لیکن یار مجھے معلوم بھی نہیں ہوا کہ میرے اوپر بھنڈی کا آسیب سوار ہو چکا ہے۔

"اوہو تو یہ بات ہے۔ یہ لے چوتھا پیگ اور پانچویں پیگ کے بعد کھانا کھائیں گے سمجھے اس کے بعد یہ بھنڈی سنڈی کا بھوت خود بخود تمہارے سر سے اتر جائے گا۔

"یار کپور نہیں آیا۔"

"لیکن وہسکی بہت شاندار لایا ہے۔ جواب نہیں۔ کیا خیال ہے۔"

"ہاں وہسکی اچھی ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم دونوں نشے میں دھت ہو گئے۔ ندیم نے آواز لگائی۔

"حمید بھائی کھانا لگاؤ۔"

حمید بھائی نے کھانا لگایا۔ ہم دونوں نے کچھ کھانا کھایا کچھ ٹیبل پر اور کچھ اپنے کپڑوں پر گرایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ندیم بولا "یار یہ اپنا کپور وہسکی بہت شاندار لایا۔ گوڈ بلیس ہم۔

اچھا بھئی خدا حافظ کل ملیں گے۔

(باقی صفحہ ۷۳ پر دیکھئے)



شکیل اعظمی

آنکھ کان میں آجاتے ہیں
ہم پہچان میں آجاتے ہیں

ناموں میں خوشبو ہوتی ہے
چہرے دھیان میں آجاتے ہیں

کبھی کبھی ہم گھومتے پھرتے
قبرستان میں آجاتے ہیں

راتیں پیڑوں پر رہتی ہیں
دن گلدان میں آجاتے ہیں

راتوں کا پرچار نہیں ہے
دن اعلان میں آجاتے ہیں

اونٹوں کی مت مارگئی ہے
ریگستان میں آجاتے ہیں

پان کو منہ کھا جاتا ہے
پیسے پان میں آجاتے ہیں

گھر جاکر تم رام کے حصے
ہم رحمان میں آجاتے ہیں

ہم سادھو سنتوں سے شاعر
بس جل پان میں آجاتے ہیں

●5/1808, HIND STORES, SYADPURA,
MAIN ROAD, SURAT-345003 (GUJ)

مشتاق مہدی

ایک نظم تیرے نام

حرف و ساز کے ستارو......
میں افسوس کرتا ہوں
تم بازو والوں کے
مقابلے میں کتنے کمزور ہو
ڈر ڈر کے جیتے ہو
کسی بڑی اچانک آواز پہ
(وہ انسانی آواز ہو کہ دھماکہ)
چوہوں کی طرح بلوں میں
جا گھستے ہو
نفرتوں کا دیو زیر کرنے کے لئے
کرتے بھی کیا ہو
کافی خانوں میں
ہوٹلوں میں
اپنے ہی ہم منصب بھائیوں کی
بزرگوں کی
دھجیاں اڑا دیتے ہو
یا پھر ایک احتجاجی نظم
لکھ دیتے ہو
یا غم انگیز نئی دھن بنا دیتے ہو
یا کچھ نفرت انگیز اسٹروکس...
کاغذ پہ دے مارتے ہو
کرتے بھی کیا ہو تم
میرا خیال ہے تمہیں
یوگ بھی اپنانا چاہئے...!

●SURAFANGE RAINAWARI,
SRINAGAR- 190003



صدف جعفری

سرگوشی بہاروں ک

سرسبز زمیں دل
لمحوں کی تپش چھو
مرجھائی سی رہتی
سب خواب کھنڈر سے ا
آواز لگاتے
اور زخم لئے خوا
ہر گام پہ رکتی
کانٹوں کی چبھن تا
دکھ پر مرے ہنستی
میں درد سے بے
تکتی ہوں لہو ا
ہر اور ہے
شفقت بھی نہیں کو
نے نرم دلاسہ
ایسے میں مگر اب
زینے پہ تخیل
امید کے ہونٹوں
یہ کان مرے جو
سنتے ہی تو رہتے
سرگوشی بہاروں

26- ZAKARIA STREET
CALCATA-700073

نجمہ محمود

A/B-83, MEDICAL COLONY
A.M.U - ALI GARH (U.P)

وجود کے سوتے سے جدا

گھنے، قد آور درختوں سے گھری ہوئی ہلکے زرد رنگ کی وہ حویلی، سبک ،مدوّر ستون، لان پر گھاس کا سمندر، دو طرف آہنی گیٹ جن سے حویلی کے نیم دائروی برآمدے تک سرخ بجری کے دو راستے تھے جن کے دونوں طرف یوکلپٹس کے اونچے اونچے درخت۔۔۔ کیاریوں میں گلاب، بیلا اور موگرا مہک رہا تھا۔ وہ سب اسے ایک ڈریم لینڈ سا معلوم ہوا اور اس کے قدم بے اختیار اندر کی طرف اٹھ گئے۔

آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی، جیسے کہ خواب کی کیفیت میں ہو وہ برآمدے تک آئی۔ گملوں میں لگے ہوئے پام، بوگن ویلیا اور کروٹن کے شاداب پودوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس حویلی میں وہ کبھی رہا کرتی تھی۔ کیا پچھلے جنم میں؟ کسی نے خوب کہا ہے کہ پچھلے جنم کا تصور زندگی کو وسیع کرتا ہے۔ اس نے چند لمحوں میں حویلی کے پورے جغرافیہ کا اندازہ لگا لیا۔ اسے دھیرے دھیرے یاد آنے لگا ماضی بعید، ماقبل تاریخ، واقعات اس کے تصور میں ابھرنے لگے۔ اس کے شوہر کا قتل، اور جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سارے عالم میں بکھیرا جانا۔ وہ کانپ سی گئی۔ کس طرح وہ ہر سو ڈھونڈتی پھری تھی اپنے شوہر کے جسم کے ٹکڑوں کو اور پھر ان کو مجتمع کیا تھا اور یوں بچا لیا تھا اس کو۔۔۔۔ اسے اپنا نام بھی یاد آیا۔۔۔۔ آئسس !

لیکن اس سب سے اس حویلی کا کیا تعلق ہے؟ اسے الجھن ہوئی اندر چلوں؟ وہ آگے بڑھی کال بیل بجائی ایک معمّر خاتون نے دروازہ کھولا۔ سفید ساری بلاؤز میں ملبوس خاتون جن کے بال سلور گرے تھے۔ اور چہرہ روشن اور پر سکون۔۔۔

کیا مطلب کوئی نوکر چاکر نہیں ہے گھر میں خیر اسے کیا یہ خاتون خانہ کا پرسنل معاملہ تھا۔

"جی کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" کمرے میں ایک الوہی روشنی سی تھی۔

"لیکن کیوں؟" خاتون خانہ ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر حیران سی تھیں۔

"آپ قطعا میرے لئے اجنبی ہیں، میں نے پہلے کبھی آپ کو نہ دیکھا نہ ملی پھر آپ کیوں یہاں آنا چاہتی ہیں"؟

"وہ دراصل میں ادھر سے گذر رہی تھی آپ کی اتنی خوبصورت حویلی اور چمن زار دیکھا خود کو، روک نہ سکی ادھر آگئی اور اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں یہاں پہلے کبھی رہی ہوں اپنائیت سی لگ رہی ہے۔ آپ یہاں تنہا رہتی ہے؟"

"تنہا۔۔؟ یہ کون سا لفظ ہے؟" خاتون حیرت زدہ تھیں۔ "یہ آپ کس زمانہ کی، بات کر رہی ہیں؟ انسان خدا کے گھر سے تنہا آتا ہے اور تنہا ہی جاتا ہے لیکن اس دنیا میں وہ انسانوں کے ساتھ رہتا ہے اکیلا نہیں اور یہی تہذیب ہے جنت میں بھی وہ اکیلا نہیں تھا۔ آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں ابھی حال میں ہمارا عقد ہوا ہے وہ ستر کے ہیں اور میں پینسٹھ کی۔۔۔" خاتون خانہ سانس لینے کو رکیں پھر بولیں "میرے پہلے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور میرے موجودہ شوہر کی پہلی بیوی جوانی ہی میں گذر گئی تھیں بیوی کی یاد میں دوسری شادی نہیں کی جب قسمت میں تھی تب ہوئی"

وہ روانی سے بول رہی تھیں سفید لباس میں بے حد منفرد اور دلکش نظر آرہی تھیں چہرے پر نور، تقدیس، طمانیت، اک روشنی!

وہ چکرا سی گئی یا اللہ یہ میں کہاں آگئی، شوہر والی ہیں اور سفید ساری، اس بڑھاپے میں شادی، حیا چھو نہیں گئی ہے محترمہ کو جو اس عمر پر۔۔۔۔ مردوں کا کیا ہے وہ تو کسی بھی عمر میں شادی کر سکتے ہیں او جو شادی نہ بھی کریں تو بھی بغیر شادی کے ہی شادی شدہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن ان محترمہ کے شوہر کو کیا کنواری لڑکی نصیب نہیں ہوئی تھی جو بڑھیا سے کرلی اب چاہیں بھی تو اولاد نہ ہوگی۔۔۔۔

خیالات کے دھارے سے نکل کر وہ یوں گویا ہوئی۔۔۔

"جی ایسا ہے کہ مجھے لگ رہا ہے کہ میں کبھی اس حویلی میں رہا کرتی تھی لیکن وہ اس زمانہ کی بات ہے جب میری عمر کی خواتین کی دوسری شادی کا سرے سے کوئی تصور ہی نہ تھا۔ پچاس سال کی عمر پر میں بیوہ ہوئی تھی، میرے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی بیٹی بیاہ دی تھی وہ سسرال سدھاری، بیٹا شادی کے بعد بہو کو لے کر امریکہ چلا گیا، میں اکیلی رہ گئی۔ تنہا عورت کی حیثیت کیا۔ بس یہ حویلی تھی اور میں تھی تن و تنہا۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں اب کسی کی رفاقت حاصل کر سکتی ہوں کیوں کہ

میں اس سماج کی پروردہ تھی جس میں در پردہ بدکاری تو عموماً مستحسن اور عقد ثانی عیب سمجھا جاتا تھا، انتہائی رکیک حرکت گردانا جاتا تھا۔ تو خاتون میں مرتے دم تک تنہا رہی۔۔۔۔ "وہ سانس لینے کی کو رکی، اسکی نگاہوں سے کرب ہویدا تھا۔ خاتون خانہ کی نگاہوں میں ہمدردی کے آثار تھے اور چہرے پر حیرت۔۔۔۔

اس نے اپنی بات کا سلسلہ پھر سے جاری کیا۔

"میں یقیناً اسی جگہ مری تھی خاتون، آپ حیران کیوں ہو رہی ہیں بہن۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں کہ تنہائی کے زنداں میں اسیر میں نے اپنی بقیہ عمر بڑے دکھ میں بتائی جب، جب تنہائی مجھے ڈستی تھی اس حویلی کے در و دیوار مجھے کاٹنے کو دوڑتے تھے۔۔۔۔ "اس کی آواز رندھ گئی، آنسوؤں سے لبریز ہو گئی۔۔۔

خاتون خانہ نے کہا" آپ چائے پئیں گی؟"

"تکلف نہ کریں میں اب چلوں گی ورنہ اس حویلی کے اندر گذارے ہوئے اذیت ناک شب و روز شدت سے پریشان کریں گے۔۔۔"

"کیا کہا آپ نے؟ اس حویلی میں گذارے ہوئے آپ کے شب و روز؟"

خاتون خانہ نے جیسے چونک کر پوچھا۔

"جی مجھے یہی یاد پڑتا ہے سب کچھ ایسا ہی تھا بس فرق یہ تھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا اس مسکن میں"

"آپ مجھے حیرت زدہ کر رہی ہیں، میں اس حویلی میں نہ جانے کب سے رہ رہی ہوں پھر۔۔۔ یہ آپ۔۔۔ خیریت سے تو ہیں۔۔۔۔ چائے بنواؤں؟" خاتون خانہ کچھ گھبرا سی گئیں پھر انہوں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔

"پلیز ایک بات سنئے گا۔" غالباً انہوں نے اپنے شوہر کو آواز دی چند ہی لمحوں میں سفید چکن کے کرتے پائجامہ میں ملبوس ان کے شوہر کمرے میں داخل ہوئے چہرے پر الوہی روشنی اور سکون۔۔۔۔

"جی فرمایئے۔" لبوں پر شریفانہ تبسم، نگاہیں نیچی۔۔۔۔

"زحمت نہ ہو تو دو پیالی چائے بنا دیں، یہ صاحبہ ابھی آئی ہیں ان کو تنہا چھوڑنا مناسب نہ لگا تو آپ سے درخواست کی۔۔۔۔ رحیمن بوا ہوں تو ان سے بنوا دیں" خاتون خانہ کے چہرے پر اور لہجہ میں عاجزی تھی۔۔۔۔

وہ ہونق سی ان کو دیکھنے لگی عجیب ہیں یہ صاحبہ۔۔۔ شوہر سے چائے بنانے کو کہہ رہی ہیں۔ مجازی خدا کہ اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو شوہر کو ہوتا۔ شرم و حیا ان محترمہ نے لگتا ہے بیچ کھائی ہے۔ خیر بھئی یہ زن و شوہر کا پرسنل معاملہ تھا وہ دخل دینے والی کون۔۔۔؟؟

"مہمان کو گھر والے خود ہی اپنے ہاتھ سے کچھ پیش کریں یہی مستحسن ہے" خاتون خانہ کے شوہر کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ شگفتہ چہرہ، نگاہیں 'الحیاء والایمان' کے مصداق، مجسم شرافت اور انسانیت کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے وہ۔ !

حسرت بھری ایک سرد آہ اس کے لبوں تک آئی جس کو اس نے اندر ہی گھونٹ لیا۔ کیا یونہی کوئی آئیڈیل رفاقت اسے نہیں مل سکتی تھی جب وہ بیوہ ہوئی تھی اسی حویلی میں تنہائی اسے ڈستی تھی، در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے، حویلی بھائیں بھائیں کرتی تھی۔ کتنا ہو کا عالم ہوا کرتا تھا۔ اسی حویلی میں اب کتنی رونق اور زندگی ہے جب کہ فقط دو ہی متنفس ہیں۔ وہ خیالات کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہیں بہن آپ؟ خاتون خانہ نے عالم ستفسار کیا اسی وقت ان کے شوہر چائے لے کر انتہائی خود اعتمادی سے اندر داخل ہوئے عمدہ ٹی سیٹ، بہترین بسکٹ، ان کے چہرے پر قطعاً شرمساری نہیں تھی، بیگم نے انتہائی شکر گزار نگاہوں سے ان کو دیکھا، لگ رہا تھا انہیں اپنے شوہر کی شرافت، توازن اور عملی زندگی میں شرکت اور تعاون پر بڑا ناز ہے۔ ان کے شوہر کے لب متبسم ہوئے، اپنی شریک حیات کو خوش دیکھ کر وہ مسرور شاداں ہوئے۔ جھوٹی انا نام کی کوئی چیز ان میں نہ تھی شخصیت میں کوئی گرہ نہیں تھی دونوں ایک دوسرے کے صحیح معنٰی میں رفیق اور شریک حیات تھے!

آدم اور حوا۔۔۔جنت ارضی۔۔۔ ہم نوا، ہم نفس۔۔۔۔ روح کا رشتہ ۔۔۔اسے مرد و زن کے سچے اور مخلص رشتے کا پہلی بار ادراک ہوا۔ کاش ایسی زندگی ایسا کوئی ساتھ اسے بھی تب مل گیا ہوتا۔۔۔اسے یاد آیا اس کی ایک سہیلی بیس سال کی عمر میں دلہن بنی، بائیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی ایک بچے کی ماں تھی۔ پورے سماج نے انتہائی بے رحمی سے فتویٰ صادر کر دیا" ارے کوئی شادی تھوڑے ہی کرنی ہے"۔ اب شادی کیا کرے گی غریب"۔۔۔۔اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ کوئی خاتون انیس سال کی عمر میں بیوہ ہوئی اور ۹۰/ سال کی عمر میں بیوگی کی ہی حالت میں انتقال کیا۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص کی بیوی گذر جائے یا علیحدگی ہو جائے تو پورا سماج اس کی شادی کی فکر میں گھلنے لگتا ہے، ہمدردی کے سوتے بہنے لگتے ہیں۔

یہاں پر کچھ بھی عورت کے محسوسات کو ایک ذی روح کی حیثیت سے مد نظر رکھ کر نہیں ہوتا (قطع نظر ان متنفسوں کے جو جڑیں کاٹنے میں ماہر ہیں یوں سماج کے لئے ناسور) خیال کے دھارے میں بہتے ہوئے اس نے بڑی تکلیف سے سوچا۔ شادیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ گھروں کو ملازمائیں، باورچنیں، دھوبنیں اور آیائیں مل جائیں۔ لیٹر باکس، اولاد پیدا کرنے کی مشین۔۔۔ ایسا کیوں؟ بائیس سال کی جوان بیوہ کے لئے یہ کیوں کہ اب یہ کیا شادی کرے گی، گویا زندگی ختم۔۔۔ یہ سفاکی کیوں۔۔۔ یہ ناانصافی کس لئے؟ ستی تو مسلسل جاری ہے۔۔۔اسے یاد آئے حضورؐ کے وہ روشن الفاظ جو انہوں نے اُمّ سلمہ سے ان کے شوہر کے انتقال کے کچھ

عرصہ بعد کہے تھے (ان کو شادی کا پیغام دینے کے بعد)۔ اُمّ سلمہ نے جب کہا کہ میری عمر زیادہ ہے میں چند یتیم بچوں کی ماں ہوں اور میرا مزاج حاسدانہ ہے۔ آپ نے فرمایا عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں تم سے عمر میں بڑا ہوں۔ بچوں کی نگہداشت اللہ اور اس کا رسول کریں گے، رہا مزاج، تو میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہارے مزاج کی اس برائی کو دور کر دے۔ چنانچہ اُمّ سلمہ کی شادی، حضور سے ہوئی اور بہت بہتر رہی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو پچاس سال کی بیوہ ہوئی تھی، تو بھلا کس کو اس کا خیال آتا، کوئی اس کے بارے میں کیوں سوچتا۔۔۔ ویسے بھی یہاں کب کوئی کسی کے بارے میں سوچتا ہے، دنیا والوں کے نزدیک، اس کا عدم اور وجود برابر تھا، کتنا بے رحم معاشرہ ہے، کتنا رکیک، گرا ہوا، زوال پذیر۔۔۔ جو مرد و زن کو فقط جنس کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ جنس جو زوال آدم و حوا کا بنیادی سبب تھا۔ آدم و حوا کی قبل از گناہ والی رفاقت اور روحانی رشتے کو فراموش کر دیا نسل انساں نے، یونہی فرد تنہا رہ گیا۔۔۔ آدم و حوا۔۔۔ حوا اور آدم۔۔۔ کیا میں آدم کے وجود کا حصہ نہیں تھی جو مجھے اپنی تکمیل کیلئے اس کے وجود کی آرزو ہوتی جس کی رفاقت سے میری کربناک تنہائی دور ہوتی جو میری زندگی میں ہر پل کا شریک ہوتا، مجھے جینے کا حوصلہ دیتا، مجھے تحفظ دیتا، میرا حامی و مددگار ہوتا۔۔۔ کیونکر میں بن پتوار کی ناؤ کی طرح زندہ رہی، کیسے کاٹے پہاڑ جیسے شب و روز اس اجنبی دنیا میں، مخالف ہواؤں کا کیسے سامنا کیا؟ اس کے چہرے پر اندرون میں اٹھتے طوفان کا عکس تھا جن کو خاتون خانہ شدت سے محسوس کر رہی تھیں۔۔۔ ساکت، خاموش۔۔۔ وہ جو اس لمحے میں سوچ رہی تھی کہ آدم کی تنہائیوں کو دور کرنے کے لئے حوا کی پیدائش خود آدم کے وجود سے ہوئی تھی۔ حوا کا اپنا کوئی الگ وجود نہیں تھا وہ آدم کے وجود ہی کا حصہ تھیں۔ وہ وجود جس میں 'نور محمدی' رکھا گیا تھا جس کا منبع وجود مطلق کی ذات تھی!۔ تو پھر یہ سماج آدم کے وجود کے اس ناگزیر حصے کو اپنی اصل سے، اپنے ہی سوتے یا منبع سے جدا کیوں رہنے دیتا ہے؟ کیوں رفاقت حاصل نہیں ہونے دیتا؟ اسے ایک خود مکتفی وجود کیوں گردانے لگتا ہے۔ خود مکتفی تو آدم بھی جنت میں نہ رہ سکے۔ اور نہ ہی ان کی نسل کے لاکھوں آدم اس دنیا میں تنہا رہ پاتے ہیں نہ ہی ان کو اکیلا رہنے دیا جاتا ہے، ہر سو ان کے لئے ہمدردیوں کی یلغار ہوتی ہے آخر یہ کیوں سوچا جائے کہ دونوں فقط اس عمل کے لئے ہی قریب آئیں جو زوال آدم کا سبب تھا اور جب گناہ کی عمر گذر جائے تو پھر وجود کا حصہ اپنے منبع سے جدا رہے، اس کی یکجائی کا کوئی تصور ہی نہ ہو۔۔۔ آخر کیوں؟؟

"آپ کیا سوچ رہی ہیں خاتون۔۔۔؟ چائے لیں۔۔۔ لیجئے یہ بسکٹ۔۔۔ خاتون خانہ کے لہجے میں گہری ہمدردی تھی ساتھ ہی وہ تجسس میں بھی تھیں۔۔

"عجیب کشمکش میں ہوں۔۔۔ سب کچھ ایسا ہی تھا، کتنی اکیلی تھی میں اس حویلی میں، خاتون آپ یقیناً حیران ہو رہی ہونگی، میری عجیب و غریب باتیں سن کر۔۔۔ دراصل میں اس دنیا کے گورکھ دھندے کو سمجھ نہیں پائی۔ سوچتی ہوں آدم جو اگر جنت میں تنہا ہی رہتے بغیر رفیق حیات کے تو بہت اچھا ہوتا اور رہ سکتے تھے، بس وہ تو مرد تھے اور رہائش بھی جنت جیسی جگہ کی سب کچھ غلط ہو گیا۔ خاتون میں آپ کی شکر گذار ہوں کہ آپ نے اندر داخل ہونے کی اجازت دی اور میری بات سنی۔ اب مجھے اجازت دیں۔ میری باتیں سن کر تشویش اور الجھن میں نہ پڑیں خود کو حیران پریشان نہ کریں دنیا میں ہزار ہا اسرار ہیں کتنے ہی راز ہائے نہاں۔ اب میں چلتی ہوں، خدا آپ کی جوڑی بنائے رکھے۔ آمین۔۔۔ وہ حویلی سے باہر نکل آئی۔۔۔ اور اس نے آسمان کی طرف نظر کی مشرق کی طرف سے گھنا بادل اٹھ رہا تھا۔ ●●

بقیہ صفحہ ۳۳: کانچ کے ٹکڑے

"شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

صبح کو بیوی نے مجھے اٹھایا۔ بولیں۔

"اٹھئے صبح ہو گئی اور باتھ روم میں جایئے میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ گاؤں سے رات آپ کی والدہ تشریف لے آئیں ہیں۔ اگر وہ آپ کو نشے کی حالت میں دیکھ لیتیں تو شاید اسی وقت مر جاتیں۔ آپ کو تو نام کی تو شرم و حیا ہے ہی نہیں۔ جایئے باتھ روم میں جایئے اور ناشتہ کر کے اپنی والدہ سے ملئے۔ اتنے دنوں کے بعد آئیں ہیں وہ۔ آفس جانے سے پہلے کوئی سبزی یا بکرے کا گوشت لا کر دے دینا وہ پرہیزی کھانا کھاتی ہیں۔

میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد باتھ روم سے واپس آیا تو بیوی ناشتہ لگا چکی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر والدہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ سلام دعا کے بعد خیر خیریت کی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ مجھے آفس جانا ہے۔ آپ پرہیزی کھانا کھاتی ہیں۔ مجھے بتا دیں کہ میں آپ کے لئے کیا لا کر دوں۔ کوئی سبزی یا بکرے کا گوشت یا جو بھی آپ پسند فرمائیں۔ ماں نے کہا۔

"بیٹا میں پرہیزی کھانا کھاتے کھاتے تھک گئی ہوں۔ آج کل بازار میں ہری ہری لوک بھنڈیاں آ رہی ہوں گی۔ میرے لئے تو، تو پاؤ بھر بھنڈیاں لا دینا۔"

میرے ہاتھ میں دبا ہوا چائے کا گلاس فرش پر گر گیا اور ٹوٹ گیا۔ پاس ہی کھڑی ہوئی بیوی نے اک نگاہ غلط سے مجھے گھورا اور فرش پر بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کو چننا شروع کر دیا۔ ●●

خلیل دھنتیجوی

سایۂ مہربان میں ہم تھے ‌ ‌ ‌ ہر کڑی امتحان میں ہم تھے
ہم تو بس سود ہی میں کھتے رہے ‌ ‌ ‌ فصل جاں کے لگان میں ہم تھے
اب تو ہم اپنے شہر میں بھی نہیں ‌ ‌ ‌ کل تو سارے جہان میں ہم تھے
دشت ہوتا رہا سراب مگر ‌ ‌ ‌ اک ہرن کی تکان میں ہم تھے
ہاں خلیل اس فساد سے پہلے ‌ ‌ ‌ اپنے ذاتی مکان میں ہم تھے

SALIKA PRINTERS, YAKUTPURA VADODRA- 390006

محمد اظہار الحق یزدالی

ہر سلگتے زخم کا مرہم نہ بن ‌ ‌ ‌ یہ صدی شعلوں کی ہے شبنم نہ بن
ہے خودی کی آخر منزل خدا ‌ ‌ ‌ آدمی بن منکر آدم نہ بن
سادہ لوحی ہوچکی ماضی بعید ‌ ‌ ‌ پتھروں کا دور ہے ریشم نہ بن
زخم محرومی کو اشکوں سے نہ دھو ‌ ‌ ‌ یعنی پسپا فوج کا پرچم نہ بن
مورچہ پر مصلحت لے کر نہ جا ‌ ‌ ‌ آئینہ کے سامنے ضیغم نہ بن

M.O.I/C, B.M.H. DISPENSARI BEHIND TEHSIL ,NAGAUR- 3 (MS)

راشد ندیم

گر یہ آنکھیں تھیں تو خوابوں کی رسد بھی ہوتی ‌ ‌ ‌ آئینہ ہوتا تو آرائش قد بھی ہوتی
چلتے رہنا ہی مقدر تھا تو اے ہجر کے دشت ‌ ‌ ‌ راستے میں کوئی دیوار حسد بھی ہوتی
ہم کہاں تک تری موجوں سے بغاوت کرتے ‌ ‌ ‌ کچھ تو اے رات کے دریا تری حد بھی ہوتی
تم سفید آندھی سے لڑتے تو سبھی عالی جاہ ‌ ‌ ‌ کوچۂ یار میں صاحب کی لحد بھی ہوتی
کشتیاں اپنی جلانے پہ یقیں تو رکھئے ‌ ‌ ‌ آسمانوں سے فرشتوں کی مدد بھی ہوتی

KHOKRATALAB, KIRATPUR , DIST BIJNUIR (U.P)

آصف سرونجی

دل نے کہا یہ طرز دگر اب ترے بغیر ‌ ‌ ‌ دامن رہے گا اشکوں سے تراب ترے بغیر
خوابوں کی اس سرائے میں مدت کے بعد آج ‌ ‌ ‌ اک رات پھر رکوں گا مگر اب ترے بغیر
آنکھوں کے آئینوں پہ پڑی خاک مصلحت ‌ ‌ ‌ بنتا نہیں ہے عیب، ہنر اب ترے بغیر
میں تو سنور رہا ہوں مسائل کی دھوپ میں ‌ ‌ ‌ درپیش ہے یہ کیسا سفر اب ترے بغیر
آصف زمیں کی وسعت و رفعت پہ ہے نظر ‌ ‌ ‌ یہ دل ہے آسمان مگر اب ترے بغیر

PARMESHWAR MEDICAL STORE PUTLI GHAR, BHOPAL - 1 (M.P)

فدا حسین ضیاء

اگرچہ خار و خس کا یہ جہاں اک تنگ رستہ ہے ‌ ‌ ‌ بچا کر اپنے دامن کو گذر جانا ہی تقویٰ ہے
نئے فنکار کو سمجھاؤ فن کا کیا تقاضا ہے ‌ ‌ ‌ بچھڑ کر گود سے ماں کی کوئی بچہ بلکتا ہے
میں جب بھی نیند کی حالت میں ان کی بات کرتا ہوں ‌ ‌ ‌ سمجھتے ہیں سبھی مجھ میں کوئی آسیب رہتا ہے
کسی منظر نے دل سے درد کی خیرات مانگی تھی ‌ ‌ ‌ کوئی موتی یونہی نوک پلک سے کیسے گرتا ہے
مرے سائے کی لمبائی مرے قد سے بڑی ہوگی ‌ ‌ ‌ مجھے کیا میرے پیچھے سے اگر سورج نکلتا ہے

3/4, C-2nd , VESHVARIA NAGAR IRRIGATION COLONY, BELGAUM -1

تمنا مظفر پوری
At & P.O. GURARU MILLS
DIST. GAYA , 824118 (BIHAR)

وہ

ضمیر کی تیسری قسم 'وہ' ہے، جو غائب ہے۔ غائب سے مراد یہ ہے کہ جس کا ذکر تو ہو مگر وہ سامنے موجود نہ ہو۔ لہٰذا اسے طلسمی لفظ کہنا چاہئے۔ ویسے لفظ 'وہ' بڑا رومانی اور مسرت آفریں ہے۔ گفتگو کرنے والا اس کی لذت میں کھو جاتا ہے۔

لفظ 'وہ' کو طلسمی اس لئے کہنا پڑا کہ شخصیت تو موجود ہوتی نہیں مگر اس کا ذکر ہوتا ہے۔ یعنی دور رہ کر بھی وہ حاضر ہے اور دور کی چیز تو ہمیشہ اچھی ہوتی ہے آپ نے بھی سنا ہوگا "دور کے ڈھول سہانے" یہی وجہ ہے کہ کسی کی برائی پیٹھ پیچھے کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

وہ کی رومانیت کا مزا لینا ہے تو اپنی بیگم کی گفتگو چھپ کر سنئے۔ جب وہ اپنی پڑوسن یا کسی عزیز رشتہ دار خاص کر کسی سہیلی سے بات کر رہی ہوں۔ آپ کا ذکر جب آتا ہے تو وہ آپ کا نام نہیں لیتی بلکہ 'وہ' کہتی ہیں۔ وہ کہتے وقت ان کا چہرہ اور بھی حسین ہو جاتا ہے۔ (اگر پہلے سے کم حسین ہوں تو) گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی آجاتی ہے۔ ہونٹوں پر تبسم کھلنے لگتے ہیں اور پورے چہرے پر فخر کا ایک مسرت انگیز جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ آپ خود بھی وہ کہہ کر دیکھئے نا! کس طرح ہونٹ گول ہو جاتے ہیں، جیسے خوشی میں سیٹی بجا رہے ہوں۔

ذکر بالا میں 'وہ' تو اپنی بیوی کے آپ ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ایک اور 'وہ' ہے یعنی میاں بیوی اور 'وہ' یہ وہ تیسری ہستی ہوتی ہے۔ اپنی بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت، محبوبہ یا داشتہ، داشتہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شادی کے بعد بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کا وجود ایک خاص بات ہوگی، خاص شخصیت ہوگی، خاص رشتہ ہوگا مگر وہ بیوی نہیں ہو سکتی۔ لغت کی زبان میں ایسے رشتے کو رکھیل، رکھنی یا داشتہ کہتے ہیں۔ داشتہ کا رشتہ اچھا ہو یا نہ ہو مگر لفظ بہت اچھا ہے ساتھ ہی اہم بھی۔ اس کی اہمیت کا پتہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ اپنی داشتہ سے ملنے کے لئے اپنی بیوی سے طرح طرح کے بہانے بناتے ہیں۔ چھپ کر ملنے کی راہ نکالتے ہیں اور گھر سے نکلنے کے لئے موقع و تقریب چاہتے ہیں۔ اور تقریب پر ملاقات خرچ کی جائے۔ لہٰذا اس ملاقات پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اپنی دولت پانی کی طرح بہاتے ہیں بلکہ بعض حضرات اپنی بیوی کے زیورات بھی چرا کر بیچ دیتے ہیں یا 'وہ' تک پہنچا دیتے ہیں۔ آخر میں نوبت یہ آتی ہے کہ 'وہ' کی خاطر وہ خود کنگال اور دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔

داشتہ کی اہمیت اپنی منکوحہ سے بڑھ کر ہوتی ہے بلکہ ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس اہمیت کے متعلق رئیس امروہوی (مرحوم) نے ایک قطعہ کہا تھا اس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے آپ بھی سن لیجئے اور داشتہ کی اہمیت کا اندازہ کیجئے۔

بیوی می آید بہ گوشہ، داشتہ آید بہ کار

امید ہے آپ اس ایک مصرع کی گہرائی میں ڈوب گئے ہوں گے اور بیوی اور داشتہ کے فرق کو سمجھ گئے ہوں گے۔

ابھی ابھی میں نے میاں بیوی اور 'وہ' کا ذکر کیا ہے یہاں پر میاں بیوی اور وہ میں وہ کا تعلق شوہر سے ہے اور شوہر جناب کا تعلق باہر سے ہے یعنی ان کا برابر ہی باہر آنا جانا لگا رہتا ہے لہٰذا وہ اپنی 'وہ' سے باہر ہی ملتے ہیں اور اپنی وہ کو بہت دنوں تک راز میں رکھتے ہیں۔ ہاں جب پانی سر سے اونچا ہونے لگتا ہے اور گھر کی دولت اور خوشی اس میں ڈوبنے لگتی ہے تو معاملہ سامنے آتا ہے لیکن جب 'وہ' کا تعلق بیوی سے ہو تو معاملہ خطرناک بلکہ دفعہ ۳۰۲ کا بنتا ہے۔ اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد سے شوہر جیسا تعلق رکھے اور اس کا علم شوہر نامراد کو ہو جائے تو شوہر دو خون کا مرتکب ہوتا ہے یا کم از کم ایک قتل اور ایک طلاق کا مقدمہ اس پر چلتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کا کسی غیر مرد سے تعلق رکھنا برداشت نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اپنی بہن اور بیٹی کو بھی ایسا کرتے وہ دیکھ لے تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے مگر دفعہ ۳۰۲ کا مجرم نہیں ہو سکتا۔ لیکن رشتے کے زمرے میں آنے والا 'وہ' اگر بیوی سے تعلق رکھتا ہے تو وہ خطرناک ہوتا ہے۔ بلکہ پھانسی کا پھندا ہے۔

'وہ' کی طلسمی نوعیت کی ایک اور مثال پیش ہے۔ کبھی کبھی بلکہ اکثر ہی کہئے۔ وہ کا استعمال اشارہ کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اشارے کے طور پر اس کا استعمال متزلزل ہے۔ متزلزل کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ 'وہ' کا اشارہ کبھی کبھی صحیح تفہیم نہیں کرپاتا یا یوں کہئے کہ اشارہ کی صحیح ترسیل نہیں ہو پاتی ہے اور زلزلہ برپا ہو جاتا ہے جیسے زید اور بکر کے درمیان ہوا۔

قصہ یوں ہے کہ زید اور بکر جگری دوست تھے۔ یک جان دو قالب، دونوں ایک دوسرے کا ہر راز جانتے تھے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اتفاق سے زید کو نوجوانی کا ایک روگ لگ گیا اور وہ ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے عشق کی کہانی وہ اپنے دوست بکر کو خوب چٹخارے کے ساتھ سنایا کرتا تھا۔ وہ آج ایسے ملی، ایسے باتیں ہوئیں، ایسا ہوا اور ویسا ہوا۔ اتفاق کی بات ایک دن کالج سے واپسی پر راستے میں زید کی نظر اپنی محبوبہ پر پڑ گئی جو بازار سے لوٹ رہی

افتخار امام صدیقی

نیاخیال ستارہ

میرے لہو میں جرثوموں کی اک دنیا ہے
جیسے میں اپنی دنیا کا اک جرثومہ ہوں
مرا لہو میرے جسم کے اندر قیدی ہے
میں اپنی دنیا کے جسم کا قیدی ہوں
جرثوموں اور انسانوں میں کچھ فرق نہیں ہے

◆

اپنی گم ہوتی ہوئی عمر
اور ماہ وسال سے ٹوٹتے ہوئے جسم
کے باوجود
اپنے لافانی احساس کے کینوس پر
میں
تیرے نام کا عکس تخلیق کر رہا ہوں
اس یقین کے ساتھ
کہ
میرا احساس
اور تیرا نام
زبانوں، زمانوں
سفر کریں گے۔

◆

مجھے بوڑھا نہیں ہونا ہے ابھی
بعض لمحوں اور جذبوں کیلئے
وہ جو کھوئے نہیں گئے اب تک
کبھی بھلائے نہیں گئے مجھ سے
وہ جو وقت کی تہوں میں کہیں
گم نہیں ہوئے، تحلیل نہیں ہوئے

وہ لمحے، وہ جذبے کہیں نہ کہیں
ذہنوں میں فاصلوں میں زندہ ہیں
ماہ وسال سے ٹوٹتے ہوئے جسم میں
باقی ہیں ابھی، چھپے ہوئے ہیں کہیں

میں ان کی حرارتوں کو شدتوں کو
پھر سے محسوس کرنا چاہتا ہوں
میں ان کو جینا چاہتا ہوں

◆

یہ کیسا بے چین سمندر
مجھ میں
اک شور مچائے رہتا ہے
پیکر موج
بھنور طوفان
کناروں سے آگے
دور بہت دور
نکل جانے کی خواہش

بہت بے تاب سمندر
مجھ کو گم کر دے
یا
مجھ سے دور ہو جائے

اگنی روپ

اگنی!
میں تیرے
بہت سے روپ جانتا ہوں
وسیع اور لامتناہی روپ
کائنات کے اندر
اور باہر
تو
بغیر جسم والی ایک روح
لیکن میں
تیرے سارے مسکن جانتا ہوں
تیرے بہت سارے
ناموں سے بھی واقف ہوں
تیری پیدائش کے مرکز
اور تیرے سفر آغاز سے
آشنا ہوں۔
ہوا
مٹی
پانی
نور
جنت
دوزخ
تیری ابتدا
اور
انتہا
مجھ پر تیری
ایک ایک لو منکشف ہے۔

◆

سنو!
تمام سچ جی لینے سے
بہت سارے عذاب
خیال بھر رہ جاتے ہیں

◆

دنیا
میرے مزاج
میرے معیار
اور میری سطح کی بالکل نہیں
دنیا بے چاری

◆

میرے اعمال
میری سانسوں کے کاندھوں پر
سفر کر رہے ہیں
میرے اعمال کا بستہ
مگر بہت ہلکا پھلکا ہے
کسی پھول کے وزن سے بھی کم
کیوں کہ
اس میں سوائے عشق کے
اور کچھ بھی نہیں ہے۔

◆

نظمیں نہیں ہیں یہ
تم سے مکالمہ ہے صرف
مکالمہ
جو حرف بھی ہے
لفظ بھی
دنیا اور کائنات بھی
اگر تم چاہو تو

ہم عصر اردو ادب نمبر

[جلد اوّل]

کے متعلق ابتدائی اورفوری تاثرات کی چند جھلکیاں

(۸)

ہم عصر اردو ادب نمبر پر موصول ہو رہے مختصر وطویل خطوط کے لئے ہم پوری اردو دنیا کے شکر گزار ہیں کہ آج کے مواصلاتی ٹکنالوجی کے دور میں جب کہ لکھے ہوئے لفظ مر رہے ہیں۔ اور بولے اور سنے جانے والے لفظوں کی حکومت بڑھ رہی ہے، شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کی لکھے جانے والے لفظوں سے زبردست پزیرائی کی جارہی ہے۔ ہم بے حد شکر گزار ہیں ان بے شمار شاعر نوازوں کے بھی جن کے دلی جذبات ابھی شاعر کے صفحات پر رقم نہیں ہو سکے ہیں۔ خاص نمبر پر خطوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ اتنا طویل ہو جائے گا، ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ ابھی اور کتنی قسطیں آئیں گی یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ خطوں کی آمد برابر ہو رہی ہے اور پہلے سے موجود ذخیرے میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہمارے لئے ہر خط اور اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک حرف اہم ہے، قابل قدر ہے۔ طویل تجزیاتی و تنقیدی خطوں کی بھی اشاعت ہو گی مگر بتدریج کیوں کہ شاعر کے صفحات مختصر ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کی پذیرائی کے کچھ اور روپ بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی ہمیں بھی انتظار ہے کہ آزادی کے بعد اردو میں ہونے والے بڑے ادبی کاموں میں شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر کو کہاں رکھا جائے گا۔ ۶۳ سالہ رسالہ شاعر کے لئے کیا ہو گا۔ ڈیڑھ سو سالہ سیماب روایت کو اردو والے کس طور اپنا فخر بنائیں گے؟ اردو کے بڑے ادباء شعراء اور ثقہ حضرات ابھی ہم عصر اردو ادب نمبر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بعضوں کو دوسری جلد کا انتظار ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے متعلق ہو رہے مسلسل مکالمے کو جاری رکھیے، اسے روشن رکھیے۔ [الف۔ الف]

سید خورشید عالم

ہم عصر اردو ادب نمبر توقع کے مطابق بیحد عظیم الضخیم دونوں ہے۔ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ شاعر کے سامنے کوئی مثال بھی پیدا نہ ہو سکی جس کے سہارے اتنا بڑا کام کیا جاتا!! اس عرصہ میں خصوصی نمبر کے علاوہ، فکر و آگہی کے فروغ کے بقول شخصے چودہ طبق روشن کرنے والے شاعر کے ماہنامے ہر مہینہ آتے جارہے ہیں جن کو پڑھنا نہ صرف لازمی ہے بلکہ معلومات کے اعتبار سے ضروری بھی ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے یہ سوچ کر آپ نے لگاتار محنت، مطالعہ اور تدبیر کرتے ہوئے یہ ادبی صحیفہ ایک ایسے نکتے تک پہنچا دیا ہے جہاں ہم عصر اس کی دھول کو بھی نہیں پائیں گے۔ نثری حصہ کو میں نے توجہ سے دیکھا ہے۔ افسانہ، تنقید وغیرہ سب خاصے کی چیز ہیں۔ خصوصاً وہ بحث قابل مطالعہ ہے جدیدیت، مابعد جدیدیت سے مطابق ہے آپ جانتے ہیں یہ موضوع مجھ سے بہت قریب ہے۔

میری کتاب تنقید اور تقریظ سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا ٹیری ایگلٹن کی ادبی تھیوری میرے زیر مطالعے میں ان ہی دنوں رہ چکی ہے جب نارنگ صاحب اسے لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے۔ اصل بات یہ بھی ہے کہ ٹیڑی کی لٹریری تھیوری یوں اور قابل اعتنا نہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ شاعر اور ادیب کسی تھیوری کے تحت کبھی نہیں لکھتے۔ اس سے قطع نظر ساختیات کی اصطلاح فارسی اور عربی اجزاء کا کچھ انوکھا مرکب ہے۔ یہ لفظ انگریزی اصطلاح STRUCTURALISM کا صحیح ترجمہ نہیں۔ جب کہ ہمارے علم نحو میں لفظ کے لئے STRUCTURE کا لفظ اور جملہ دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ جملہ کی بناوٹ کے لئے ترکیب مستعمل ہے۔ (تنقید اور تقریظ ص۔ ۱۷)

بہر نوع یہ بحث تو ہمارے لئے اس وقت موضوع نہیں۔ میں فی الحال اس عظیم صحیفہ شاعر کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں نے مجبوراً اپنی کتاب کے حصوں کو نقل کرنا ہی چھوڑ دیا کہ آپ خود مطالعہ کریں گے۔

مبصرین نے اس خصوصی نمبر پر خاصے تبصرے کئے ہیں ایک تبصرہ شاعروں، ادیبوں کی ڈائرکٹری کے متعلق ہے۔ اسے میں جائز نہیں کہوں گا۔ یہ تو تمام دنیا کا دستور ہے اور ڈائرکٹری اسی انداز سے لکھی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ پورا اردو ادب نمبر لائق ستائش ہے کوئی ایک صفحہ بھی فضول نہیں۔

●HEIDER SIDE DR., CARBOROUGH
ONT. MIW IT 7 CANADA

صبا اکرام

عصری اردو ادب پر ترتیب دیا گیا، شاعر کا پہلا volume مجھے مل گیا تھا، اور اس کی خبر بھی میں نے کئی جگہ لکھوا دی تھی۔ کئی احباب ایک نظر دیکھنے آتے، اور کئی لوگ یہ پتہ کرنے آئے کہ اس میں ان کی کوئی چیز ہے کہ نہیں، تاکہ کسی تخلیق / تحریر کی اس میں موجودگی کی صورت میں پرچہ منگوانے کی سبیل کریں جس نے بھی پتہ کیا میں نے اکبر خان کا فون نمبر لکھوا دیا۔ 622041

یہ والیوم واقعی بڑا وقیع ہے۔ مقدار و معیار دونوں اعتبار سے! آپ نے تو اردو کی عالمی بستی شاعر کے صفحات میں بسا کر اس کی موجودگی کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ الگ الگ ملکوں کے ادبی دھاروں کو جوڑ کر آپ نے اردو ادب کا ایک عالمی MAIN STREAM بنادیا ہے۔ اور شمالی امریکہ سے لے کر بھارت کے تامل ناڈو کے علاقے تک کے شاعر و ادیب اس دھارے میں بہتے نظر آتے ہیں۔ انسان دوستی کا جذبہ ایک داخلی وحدت کی صورت میں سبھوں کو جوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ اس نمبر کے ہر ایک والیوم کو مستقبل میں ایک REFERENCE BOOK کی حیثیت حاصل ہو گی۔ ایسا اہم کام کرنے والے اردو کے مجاہد اب کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے کے دوسرے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔ کب تک آرہا ہے!!!

●C-102, GULSHAN-E-OMAR, MAIN
UNIVERSITY ROAD KARACHI -75290

ممتاز احمد خان

'ہم عصر اردو نمبر' دیکھا۔ خاصا اہم کام ہے۔ اس دور میں جب کہ ضخیم نمبر شائع کرنے کی راہ میں ان گنت کٹھنائیاں اور رکاوٹیں ہیں آپ نے یہ ہمالیائی کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔ آج اور آنے والے دور میں ناقدین اور محققین یقیناً اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ آپ کی مساعی کو دیکھ کر ماہنامہ "نگار" کے صہبا لکھنوی صاحب یاد آتے ہیں جنہوں نے اس میدان میں قابل ذکر کام کیا ہے۔

اور اب بھی ان کا جذبہ زندہ و توانا ہے جب کہ وہ جسمانی طور پر خاصے کمزور ہو گئے ہیں۔ آپ سے یہ امید کی جاتی رہے گی کہ آپ اس میدان میں ادب کی خدمت کے مزید جھنڈے گاڑیں۔

●1837 / 14, Dastagir Society F . B Area, Karachi - Pakistan

● پاکستان سے موصولہ اطلاعات کے مطابق محترم صہبا لکھنوی سخت علیل ہیں اور اردو کا روایت ساز ادبی رسالہ افکار بند ہو گیا۔ دونوں ہی اطلاعات پریشان کن ہیں۔ صہبا صاحب کی صحت یابی کے لئے ہم دعا گو ہیں۔ افکار کی عمر ساٹھ سال، کسی بھی ادبی رسالے کی یہ تاریخی عمر اپنے آپ میں ایک روایت ہے مگر اس روایت کی انفرادیت یہ ہے کہ تن تنہا ایک شخص نے ساٹھ سال تک کسی ادبی رسالے کو زندہ رکھا اب ایسی کوئی تاریخ شاید ہی بنے۔ حال ہی میں نکہت بریلوی کی مرتب کردہ کتاب "صہبا لکھنوی۔ شخصیت اور خدمات" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ افکار کا ٹرسٹ بھی ہے۔ اس کے ٹرسٹیز حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ وہ جلد از جلد 'افکار' کی اشاعت کو بحال کریں۔ صہبا صاحب اس کی اجازت دیں۔ حکومت پاکستان اپنے ملک کی اس تاریخ ساز روایت میں دلچسپی لے اور پوری اردو دنیا سے درخواست ہے کہ وہ صہبا لکھنوی صاحب کی صحت یابی کے لئے دعا فرمائیں اور انہیں خط لکھ کر رسالہ جاری رکھنے کی گذارش کریں۔[الف۔الف]

جمال اویسی

نمبر بہت سلیقہ اور محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ بات اب مشہور ہو چکی ہے کہ شاعر کا نمبر نہ صرف دیدہ زیب اور خوبصورت ہوتا ہے بلکہ مضامین اور مواد کے اعتبار سے بھی عہد آفرین ہوتا ہے۔ نثر سے شاعری کی طرف شاعری سے نثر کی طرف والا گوشہ پسند آیا۔ آل احمد سرور کی غزلیں تبرک کے طور پر پڑھیں۔ان کا ایک شعری مجموعہ خواب اور خلش میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ان کی شاعری پر لوگوں نے توجہ نہیں دی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کی غزلیں میکانکیت اور دماغ سوز کرتب بازی و اصطلاح بازی سے بوجھل ہیں۔ خاص کر

(۱) مگر کو تیر نے جس جا پچھاڑ باندھ دیا

(۲) کسی نے پیٹھ پر میری ہیں پہاڑ باندھ دیا

(۳) حمق نے ان کے پاؤں میں بے تاڑ باندھ دیا

(یہ مصرعہ ناموزوں ہے شاید سہو کتابت ہے)

مگر بھائی پوری غزل میں جو بھی پیکر ابھرتا ہے وہ کتنا غیر شعری اور بوجھل ہے۔اے دل اے دل والی غزل غنیمت ہے بلکہ کئی شعر اچھے ہیں۔ آپ نے نظم پر محمد حسن سے "اردو نظم کا زوال" لکھوالیا۔ اردو شاعری کا ماتم یا اردو ادب کا ماتم لکھواتے۔ انہیں اب نظم میں امکانات ہی نظر نہیں آرہے ہیں۔ ان کی باتوں سے بے چارے صلاح الدین پرویز، شفیق فاطمہ شعریٰ، زبیر رضوی، جمال اویسی وغیرہ کتنے خوفزدہ ہو جائیں گے انہیں پتہ نہیں کیا۔ میری نظر میں مقالے کی کوئی منطق ہی نہیں ہے۔ شروع تا آخر تاثراتی انداز بیان ہے۔ نظم کے سلسلے کے ٹھوس نکات نہیں ہیں۔ زبیر رضوی کے مرتب کردہ ذہن جدید کے جدید نظم نمبر میں اچھے مضامین شائع ہوئے تھے۔ نظم کے سلسلہ میں آپ کے پاس کوئی معروضی یا نظری مقالہ نہیں پہنچا جسے آپ چھاپتے اردو نظم کو زندہ رکھنا ہے تو نثری نظم کی اشاعت پر پابندی لگایئے۔ یک بیک نہیں دھیرے دھیرے اردو کے عروضی نظام سے جڑیے اور نئے تخلیق کاروں کو اس سے جڑنے کی نصیحت کیجئے ورنہ اردو شاعری کا جو بنیادی اور فطری آہنگ ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن وغیرہ نثری نظم کے حمایتیوں میں ہیں۔ نظم اگر موزوں نہیں ہے (یعنی عروضی نظام کے تابع نہیں ہے) تو نظم نہیں ہے۔ میں یہی مان کر چلتا ہوں۔

مذاکرے کا گوشہ پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ لوگوں نے ہم عصر اردو ادب نمبر (بشمول ترقی پسند و جدید ادب) کو بہت اچھی طرح، کھنگال کھنگال کر نہیں پڑھا ہے۔ کھنگال کر پڑھنا تو دور کی بات ہے سرسری واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ "ترقی پسندی سے جدیدیت اور نئی دانش وری سے لیکر "نئی نسل اور مابعد جدیدیت کے مسائل" تک شرکاء کا انداز شروع تا آخر تاثراتی ہے۔ علمی تنقیدی یا معروضی نہیں ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ہر تحریر سے مثالیں دوں مگر کہاں تک مثالیں پیش کروں؟

●MOH. FAIZULLAH KHAN DARBHNGA- (BIHAR)

خالد حسین خان

شاعر کا خاص نمبر دستیاب ہوا، خوبصورت ہے، خوب سیرت ہے، طباعت بھی اہل بصیرت کیلئے فردوس نظر ہے! ترتیب میں جدت، غزلوں میں شدت، مضامین میں حدت اور کوائف اردو تیز رفتار ادب میں ملاحت ہے!! اس بار سناں ادب میں کیا کچھ نہیں ہے؟ آپ کا یہ دعویٰ، تعلّی نہیں ،احوال واقعی ہے کہ اردو کا یہ واحد ادبی ماہنامہ ہے جو ہندوستان، پاکستان، انگلستان، عربستان، اور کرۂ ارض کے کونے کونے میں مشہور بھی ہے، مقبول بھی ہے اور محبوب بھی! اور کیوں نہ ہو، آپ سے برگزیدہ بزرگوں کی محنت ،جدوجہد ایثار اور اردو ادب سے لازوال عاشقی کا نتیجہ ہی تو ہے! تفصیلی تبصرہ علیحدہ مرسل کر رہا ہوں۔ ہندوپاک اور اردو کے دور دراز جزیروں اور نئی نئی بستیوں میں "شاعر" نہ صرف سرفہرست بلکہ میر کاروں کا کردار بھی بخوبی نبھا رہا ہے اور یہ افتخار یہ منزلت، یہ چاہت اور یہ عظمت "افتخار امام" بجا طور پر اردو قارئین کی جانب سے بلاخوف تردید حاصل ہے!! خدا آپکو سدا اسی طرح فعال، بیباک اور خدمت اردو کے لئے معروف عمل رکھے۔

●Dr.Khalid Husain khan ansar bulding, Budhana gate meerut -250002 U.P

آغا گل

"ہم عصر ادب "نمبر" موصول ہوا۔ اگر آپ یہ نہ شائع کرتے تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ یہ انتخاب ذاتی پسند و ناپسند پہ مبنی ہے۔ علاوہ ازیں میں Chronological افسانے لکھتا ہوں۔اس دور میں اور کوئی بھی ایسا نہیں لکھ رہا۔ مگر اس فقیر کا کوئی افسانہ شائع نہیں کیا۔

حتیٰ کہ تعارف میں نام بھی نہیں دیا گیا۔ بہر حال انتخاب مایوس کن ہے۔ لہذا جلد دوئم نہ شائع کیجئے۔

Gui House pinny Road
ƆUETTA (PAKISTAN)

بقیہ صفحہ ۴۵:مکتوبات

ادبی دنیا میں ہلچل مچادی۔ یہ نا سمجھئے گا کہ شاعر کے لئے یہ تعریفی کلمات میں اپنی کہانی کی اشاعت کے جواب میں لکھ رہی ہوں، میں سمجھتی ہوں کہ آپ کی فراغدلی ہے کہ آپ نے اسے شاعر میں جگہ دی ورنہ میں تو خود کو اس لائق ہی نہیں سمجھتی تھی کہ شاعر میں چھپوں۔

'BEVER VEIEN 3,LEI 19,0596,
'CLO, SNORWAY

زر سالانہ وقت پر بھجوا کر شاعر کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے میں اپنا تعاون دیجئے

مکتوبات

سمبر ۱۹۹۹ء

محمد صلاح الدین پرویز

تمہارا رسالہ ملا، اتنے بہت سارے دنوں کے بعد اپنی نظم دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یاد ہے یہ نظمیں تم ہی نے لکھوائی تھیں۔ جب تم علی گڑھ آئے تھے۔ ایک نظم اور وہ بھی اپنے یار کی نظم، اتنے دنوں کے بعد؟۔ یار یہ نظمیں بہت اچھی ہیں۔ ان میں کوئی اخلاق جمالیات وغیرہ کا چکر نہیں ہے۔ اپنی پچھلی محبتوں کی طرح ان نظموں کو ان ساری نظموں کو ویسے ہی چھپا ہو جیسے چھپایا کرتے تھے۔

●A-4, ZAKIR BAGH
OKHLA ROAD, NEW DELHI -25

مشتاق احمد نوری

آج ہی شاعر کا ستمبر ۹۹ کا شمارہ ملا۔ اپنی پسند کی ساری چیزیں پڑھ گیا۔ آپ کا اداریہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن آج کی نوجوان نسل صرف "فکر" کے گھوڑے پر سوار ہے اسے نہ فرصت ہے اور نہ ہی ضرورت کہ وہ "غور" بھی کرے یہی وجہ ہے کہ شاعری کے نام پر جو غزل سامنے آ رہی ہے وہ اخبار کی خبر کی طرح شام تک دم توڑ دیتی ہے۔ ہاں کچھ سنجیدہ حضرات آج بھی ایسے ہیں جن کی غزل مستقبل کی امانت بننے لائق ہے۔

شارق جمال صاحب کی گرفت عروض پر خوب ہے۔ بڑے اچھے لوگ ان کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ انہیں برابر چابک بدست امام کی طرح ہوشیار رہنا ہوگا تاکہ انجانے میں عروض کی ڈگر پر شاعر دھکہ کھانے سے بچا رہے۔ یہ صلاح الدین پرویز جو اپنے آپ سے مطمئن کب ہوں گے؟ انہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا اسلئے بہت چونکا دینے والی شاعری کرنے پر آمادہ ہیں تاکہ کاروانِ ادب کا ہر راہ گیر ان کی جانب مڑ مڑ کر دیکھے۔ لیکن اس سے ان کا کوئی پائندہ نہیں بن سکتا۔ نہ جانے کچھ لوگ اچھے خاصے شاعر ہو کر بھی "ڈھونگی کیوں بن جاتے ہیں؟ بھائی ادب کو زیر کرو ڈھونگ کرنے سے فائدہ؟ شروَن کمار ورما اور مدن چاولہ کی کہانیاں پسند آئیں۔ لیکن ورما نے تو موضوع کو چھیں لیا۔ یہ معاملہ تو اتنا گھس گیا ہے کہ اب دم نہیں رہا لیکن انہوں نے اپنے دم پر اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔ چاولہ کچھ سال قبل پٹنہ تشریف لائے تھے۔ میں نے بہار اردو اکادمی میں آنا فانا ایک شام ان کے نام منعقد کی تھی۔ اب تو ان کی تصاویر ہی یادگار کے طور پر رہ گئی ہیں۔ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ بھی خوب رہا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ آپ دور کی کوڑی لانے میں ماہر ہیں۔ ایک سے ایک اچھوتے انداز میں ادب پیش کرنے کا فن کوئی آپ سے سیکھے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ شمارہ تو مشترکہ شائع کرتے ہیں لیکن صفحوں کی اور رسالے کی ترتیب دو شمارہ الگ الگ جیسی ہوتی ہے گمان یہ گذرتا ہے کہ دو شمارے الگ الگ شائع کر کے ایک ساتھ نتھی کر دیئے گئے ہوں۔ اس سے نمبر کا حسن قدرے مجروح ہوتا ہے اس میں بھی اگر کوئی "فنکاری" ہے۔ تو وہ میری سمجھ سے باہر ہے [شاید یہ آپ کی مجبوری ہو] جو بھی ہو۔۔ آپ نے واقعی عالمی منظر نامہ پیش کر دیا اس سے اس بات کی جانکاری تو ہو ہی جاتی ہے کہ اردو زبان کس کس گوشے میں پھیلی ہے اور کیسے کیسے "کافروں" کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنائے ہوئے ہے۔

●37/60, OFFICERSE FLATS BEILEY ROAD, PATNA-1(BIHAR)

حفیظ آتش

شاعر کا تازہ شمارہ ملا۔ یوں تو شاعر سبھی لوگ توجہ سے پڑھتے ہیں۔ میں کچھ زیادہ ہی غور سے شاعر کو پڑھتا ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ پرچہ ایسا ہے جس سے عصر کا معیار طے ہوگا۔ پھر تم توجہ بھی بھرپور دیتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عصر اردو ادب نمبر جیسا معیاری نمبر تم نے شائع کیا ہے۔ ادھر میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ صلاح الدین پرویز صاحب اچھے شاعر ہونے کا اردو کے ہر رسالے میں ڈرامہ رچائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نظم آپ نے اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کی ہے۔ جیٹھ ساون، اساڑھ تک تو سمجھے مگر یہ سیکل کے ساتھ خود کاتتے بھیتر تک جانا کہاں تک درست ہے۔ یہ تمہاری ذہانت ہے کہ تم نے ایک ہی نظم چھاپی۔ دوسرا رسالہ ہوتا تو تمام نظمیں چھاپ کر شکریے کا خط الگ لکھتا۔ میں رسالے کا نام لینا نہیں چاہتا کہ تعلق بہر حال ان لوگوں سے بھی ہے۔ پرویز صاحب یہ کوئی نیا کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہندی میں لوگوں نے بہت کیا ہے بے شک تخلیق کار اپنی تخلیق کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔ مگر ایڈیٹر کی بھی اپنی کوئی ذمہ داری ہوتی ہے جس کو تم نے بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

●Bombay cloth Emporium
Bazar shafat pota Amroha (U.P)

حکیم منظور

شاعر کا ستمبر کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ حسب معمول مشمولات کے اعتبار سے جاندار اور متنوع۔ شروَن کمار ورما کی کہانی اچھی لگی۔ حصہ نظم کے کیا کہنے۔ ایک سے ایک بہتر تخلیق۔ صحافت میں داخل ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کام کس جگر سوزی کا معاملہ اور ماجرا ہے۔ آپ شاعر، کو کیسے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے، میں صرف آپ کے حوصلے اور آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔

زیر نظر شمارے میں شارق جمال صاحب نے میری غزلوں پر توجہ کرنے کی زحمت فرمائی ہے۔ شکر گزار ہوں میں ان کا۔ افسوس صرف یہ ہے کہ اشعار کی خوبی پر انہوں نے نظر نہیں فرمائی صرف 'فرضی' اور غیر حقیقی خامیوں کی نشاندہی پر زور قلم صرف کیا۔ "طمانیت" میں 'ی' مشدد ہے۔ اور میرے سامنے اس وقت دو لغات ہیں فرہنگ عامرہ اور فیروز لغات۔ دونوں میری تصدیق کرتے ہیں۔

URDU INTO ENGLISH STANDARD TWENTIETH CENTURY DICTIONARY

لفظ طمانیت کے معنے اس طرح لکھے گئے ہیں۔

TAMANIYYAT-PEACE OF MIND, CONFIDENCE

یعنی 'ی' تشدید کے ساتھ

شارق صاحب نے 'ی' کو غیر مشدد بنا کر اجتہاد کیا ہے مگر مجھ پر اس کا ستم کیوں ڈھایا ہے۔ اپنے ہی مزاج کو سند بنا کر اعتراض کرنا میرے خیال میں نامناسب رویہ ہے۔ یہاں تو لغت دیکھنے کی فرصت کسی کو نہیں (خود شارق صاحب کو بھی نہیں ورنہ وہ اعتراض نہ کرتے) اس لئے ان کے بے وجہ اعتراض سے لوگ گمراہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میری ناقص

رائے میں آپ کو کوئی قلمی کاوش چھاپنے سے پہلے اس پر خود بھی غور کرنا چاہئے۔

رہا سوال "اب صدائیں بھی دے کوئی' در کوئی کھلتا نہیں" کے مصرعے میں لفظ 'دے' میں 'ے' کے دبنے کا تو شارق صاحب نے خود علامہ سیماب کے اشعار سے ثابت کیا ہے۔ کہ ہندی الفاظ میں حروف علت تقطیع سے خارج کئے جاسکتے ہیں۔ دبا کر پڑھنے اور پھر سلامت و فصاحت پر توجہ کرنے کی بات نئی ہے۔ جو حرف وزن میں شامل نہیں، اسے دبا کر یا بالجبر، پڑھنا کیا معنی؟ شارق صاحب کہتے ہیں کہ مذکورہ مصرعہ میں لفظ دے سے لئے گرا کر قبل کے لفظ 'بھی' سے ملنے کے بعد یہ 'بھید' بن جاتا ہے۔ یہ اصول بھی 'ایجاد بندہ ہے' اس لحاظ سے سیماب صاحب کا مصرعہ "عالم نو جانے کس مخلوق سے آباد ہو"۔ عالم نو' جانکس 'مخلوق سے آباد ہو' بن جاتا ہے۔ یہ خوامخواں کی بحث ہے۔ رہی بات سلاست و فصاحت یا روانی کی تو یہ شارق صاحب ۔بتائیں کہ ۸۰ر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شعر پڑھنے سے اگر "بھی دے کوئی" "بھید کوئی' بن جاتا ہے، تو شعر پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور پھر قاری کی موزونیٔ طبع اور سلاست و فصاحت کے بارے میں اس کا معیار بھی تو ایک چیز ہے۔ ممکن ہے قاری کی طبیعت موزوں نہ ہو اور معیار بے معیار ہو؟ ویسے شاعر کے زیر نظر شمارے میں اس قسم کی 'فرضی خامیوں' والی غزلیں کئی ہیں۔ مزید مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شارق صاحب کے خط کا لب ولہجہ جارحانہ ہے خصوصاً دوسرے پیراگراف کے حوالے سے۔ مجھے برطانوی پارلیمان کا ایک واقعہ... بہر حال رہنے دیجئے!...

● 10- PRATAP PARK PRESS ENCLAVE
SRINAGAR -190001 (KASHMIR)

اظہار سلیم

آپ نے میری غزل کی پروف ریڈنگ نہیں فرمائی۔ یہ آپ کی غلطی ہے یا کمپیوٹر والے کی۔ شمارہ نمبر ۵ صفحہ ۴۲ر پر آپ نے پہلی مرتبہ میری غزل شائع فرمائی۔ اور اس غزل کے مطلع کے بعد پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں "ہے" زائد شائع کر دیا گیا۔ اور شارق صاحب نے میرے اسی مصرعہ کو لیکر تقطیع کی میزان پر رکھ دیا۔ شارق صاحب تصحیح فرمالیں۔ غزل کے ارکان ہیں۔

مفاعلیتن مفاعلیتن مفاعلیتن فعولن

صحیح مصرعہ: ہوائی سا فرشتوں سے با خبر رہنا ضروری

مجھے حیرت تو اس بات کی ہے کہ مجھے نئے لکھنے والوں کے ساتھ شائع کیا گیا۔ آپ کی ادبی بصیرت چہ معنی دارد؟

● 807,M.H.B. Colony,
MALEGAON - 423 203 (M.S.)

صابر زاہدؔ

ستمبر ۹۹ء کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ اس مرتبہ شعری حصہ کافی معیاری ہے صلاح الدین پرویز کی نظموں کے تعلق سے آپ کی رائے سے میں صد فی صد متفق ہوں کہ اخلاقی جمالیات ایسی فحاشی کو بنام ادب کبھی بھی قبولیت کا درجہ نہیں دے گی۔ ذہن پر نظم پڑھنے کے بعد فوری تاثر "کھجوراہو" کی برہنہ اعصاب شکن مورتیوں کا ابھرتا ہے۔ شاعری فنون لطیفہ کی ماں ہے۔ کیا کوئی ماں برسر محفل جوان بیٹوں بیٹیوں کو اپنے سامنے برہنہ کرنا پسند کرے گی؟ شاعر کے آئینہ آساشفاف بدن پر یہ نظم کوڑھ کا مکروہ دھبہ ہے۔ آپ نے یہ اچھا ہی کیا کہ موصوف کی باقی ماندہ نظمیں نہ چھاپ کر شاعر کے صفحات کو کوک شاستر ہونے سے بچالیا۔ اس قدر واشگاف برہنہ شعری اظہار کی مشرقی تہذیب وادب میں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ عرصہ بعد بخط شاعر عبداللہ کمال کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ مگر اب ان کی تخلیقی اڑان میں وہ پہلی سی آنچ کہاں جو آسمانوں کو اپنے پروں میں سمیٹے پگھلا دیا کرتی تھی مٹھی بھر غزلیں اس عنوان کے تحت آپ نے مقیم اثر بیاولی کو چھاپ کر دریا میں۔ کوزے کو بند کرنے کی کوشش کی ہے مگر تشنگی کچھ اور دو آتشہ ہو گئی ہے۔ نادرہ کار ہیروں کی یہ کان اب تک کہاں مستور تھی؟ بے شک اس کان کی نقاب کشائی کا کریڈٹ بھی شاعر کو جاتا ہے۔ غالبؔ کے لئے کہی گئی ان کی غزلوں پر حلقۂ سخنوراں میں مقامی سطح پر ایک اعتراض یہ ہے کہ غالب کے اشعار سے موصوف کی غزلیں معنوی اعتبار سے مربوط نہیں ہیں؟ پھر غالب کے اشعار کا جھومر غزلوں کی پیشانی پر سجانے کا معنوی جواز کیا ہے۔؟ یہ معترضین جانیں؟ ہاں اس ہیچمدان کو سخن فہمی کا تھوڑا بہت شعور ہے دعویٰ ہرگز نہیں؟ مقیم اثر کی چوتھی غزل میں درج ذیل دو مصرعوں میں بقدر ارکان آدھا رکن کم دکھائی دیتا ہے۔

نمبر 1 ہاتھ پیارے آقا دور ملتے ہیں
نمبر 2 بند مکاں ہے یہ اپنی خوش فہمی ہے

عروضیے کہہ سکتے ہیں کہ دونوں مصرعے خارج از بحر ہیں، میرا خیال ہے تسامح شاعر کا نہیں بلکہ نقل نویس۔ غلطی سرزد ہوئی ہوگی۔ شاعر کی بیاض شعر میں نویس ا مصرعے یوں درج ہیں۔

نمبر1 ہاتھ پیارے آقا دور مل جاتے ہیں
نمبر2 بند مکاں ہے یہ تو اپنی خوش فہمی ہے۔

بہر حال "دروغ برگردن راوی" آئندہ شمارے ! تصحیح فرمادیں تاکہ کوئی عروضی غلط فہمی راہ نہ پاسکے اور شا بھی عروض ناشناسی کے الزام سے بری ہو سکے؟

180- HUDCO COLONY MALEGAON,
:3203 (M.S.)

فاروق راهب

ستمبر ۹۹ء کا شمارہ مندرجات کے اعتبار سے معیار ہے (شاعر کا کوئی شمارہ غیر معیاری ہوتا ہی کہاں ہے!) ا تمام ترو حشتوں کے باوجود غزل آج بھی شاعری کی آ ہے۔ غزل کے سلسلے میں آپ کا ہر اداریہ فکر نو کی دعو. دے رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل کی جانب اب کم توجہ ! جارہی ہے اور غزل کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ! ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام ایک سوچی آ سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ کچھ رسالوں کی ورق گردا سے اس کا ثبوت بھی مل جاتا ہے۔ انگریزیت کا بھو. ناقدین پر ہمیشہ سے سوار رہا ہے۔ لہٰذا غزل کی جڑیں بھی انگریزی میں تلاشتے ہیں، جو انہیں ہرگز نہ ملے گی۔ بعض اصناف اپنی حدیں نہیں پھلانگتیں۔ ہر پودے کا قلم ہر ج نہیں لگایا جاسکتا۔ مگر اس کی خوشبوئیں کائناتی ہوتی ہیں ا اس کے پھل ساری دنیا چکھتی ہے! غزل آج بھی ار شاعری کی قابل فخر صنف ہے اور رہے گی بھی۔ غزل فضا کی یکسانیت کو ہموار و برقرار رکھنے میں نظم سے زیا یکسوئی اور جاں سوزی درکار ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے آج کا مشینی شاعر اس سے بے توجہی برت رہا ہے۔

اس لئے ان دنوں بہت زیادہ سطحی غزلیں بھی ک جارہی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی کوششیں رنگ لائیں گی اور اکیسویں صدی میں غزل کا نیا سورج طلوع ہو! فن شاعری سے متعلق علامہ شارق جمال کا تربیتی سلسلہ بہت خوب ہے۔ اس سے صرف نومشق ہی نہیں، کئی کہ مشق شعراء بھی مستفیض ہوں گے۔ بھائی حبیب ؟ اکثر و بیشتر اپنی گرانقدر آرا سے نواز کر اپنے محدود ہے قار ہونے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ یقیناً لائق صد ستائش ہیں؛

یوں کی روانی میں غلط راہوں کے امکانات
تے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی ان گنت خیالوں کی
،ان چاہے خیالات بھی باہر نکلنے کا راستہ بنا لیتے
رجب تجربوں اور مشاہدوں کی دھن سوار ہو!
ماج الدین پرویز کا مداح ہوں اور ان کی چیزیں
ھتا ہوں۔

●Shanti puri, motihari-845401

ـپ فیر ——

لدین پرویز کی غلاظت اور عفونت پھیلائی ہوئی
فکر گہرا صدمہ ہوا ہے۔ آپ بھی اپنے معیار
یں۔ ایسی فحش نظم چھاپنا آپ کے مزاج اور
ت کے بالکل خلاف ہے آئندہ سے پرہیز
م ایش کمار جی کا مکالمہ شاعری اور سچ بصیرت
،اور ان کے انگریزی اور اردو ادب کے وسیع تر
غمازی کرتا ہے آج سے پچاس برس پہلے
لج لدھیانہ میں وہ میرے انگریزی کے پروفیسر
ـ اردو شاعری کو محض خیالی ۔ تصوراتی اور
ں کا پلندہ سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ مکالمہ
نے والا ہے۔ میری محبتیں، عقیدتیں ان کی
ـائیں۔

●5/A, MAJOR SHIVDE SINGH
CIVIL LINES LUDHIANA - (PU

مار ورما ——

۹ء ملاء ایش کمار صاحب کا مضمون 'شاعری
ز ہوئے۔ صفحہ ۳۰ پر

ضا رانجھا کر دی تی میں آپے رانجھا ہوئی
ری سپنوں وچ ہیر و رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی

نے وارث شاہ سے منسوب کیا ہے۔ دراصل یہ
ں بلھے شاہ کی ایک کافی کے ہیں۔ یہ بلھے شاہ کی
کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ کافی سائیں
راغ (تصنیف۔ پروفیسر جنک راج پوری اور
ھنکاری مطبع: رادھا سوامی ست سنگھ ۔ بیاس
لہ۔ ضلع امرتسر) کے صفحہ ۱۸۱ پر درج ہے۔
، قصہ ہیر رانجھا لکھا تھا۔ یہ کافی ہیں یوں تو کچھ
روں نے قصہ ہیر رانجھا لکھا ہے، لیکن مشہور
ا ہی ہے اور ہے بھی عظیم ہر لحاظ سے۔
اصلی نام ہے۔

●GALI UNTHAN WALI,
CHOWK PRAGH DASS
AMRITSAR- 143003 (Punjab)

طہور منصوری نگاہ ——

آپ نے اداریئے میں غزل کے تعلق سے جن مسائل کا ذکر فرمایا ہے وہ غزل کے لئے دیگر مسائل سے زیادہ مہلک ہیں۔ یہ تو غزل کو تدریسی سطح پر ہی مار دینے کے مترادف ہے اور اگر ایسا ہو گیا تو یقین جانئے اردو کی ہلاکت پھر زیادہ دور نہیں رہ جائے گی۔ ہمارے مدرسین کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ غزل اردو کے بقا کی ضامن ہے اس کے تمام امور سے نہ صرف گہری واقفیت حاصل کریں بلکہ طلبا میں اس کی ترسیل بھی فرمائیں اردو شعری ادب سے عام لوگوں کی عدم دلچسپی کے پیچھے مغرب زدہ آزاد شاعری کا سب سے بڑا ہاتھ ہے غزل کی زندگی نہ صرف اردو شاعری کی زندگی ہے بلکہ یہ ایک خوبصورت زبان اور ایک روادار کلچر کی ترجمان اور نمائندہ ہے۔

علامہ شارق جمال سے آپ بڑا نیک کام لے رہے ہیں ان کے اس اقدام سے ہمارے غزل گو شعرا میں خصوصاً اور عام اردو داں طبقے میں عموماً بہت اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور فن کی باریکیوں کو سمجھنے اور برتنے کا سلیقہ بھی حاصل ہوگا۔ محترم شارق جمال سے اتنا ضرور عرض کروں گا کہ غزلوں کے بحر و اوزان کے علاوہ بھی دیگر عیوب شعری مثلاً ایطاء، تقدیم و تاخیر، غرابت لفظی، تکرار قبیح، حشو قبیح، شتر گربہ، تعقید لفظی و معنوی وغیرہ وغیرہ پر بھی توجہ فرمائیں اور شعرا خاص طور پر نووارد ان بساط سخن کی رہنمائی فرمائیں شمارے کے دیگر کالم بھی لائق مطالعہ ہیں۔

●P.O. BOX NO 30, REWA -486001 (M.P)

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ

شمس الرحمٰن فاروقی ——

"شاعر" کا شمارہ دو تا بعنوان "اردو ادب کا عالمی منظر نامہ" ملا بہت خوشی ہوئی۔ نہایت کارآمد اور معلوماتی اور ہمت افزا شمارہ ہے۔ اگرچہ تمام مشمولات ایک معیار کی نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے پورا شمارہ پڑھنے اور محفوظ کر لینے کے قابل ہے۔

●29C- HASTINGS RD
ALLAHABAD - 2100(U.P.)

محمود شیخ ——

'شاعر' کا خصوصی شمارہ اردو ادب کا عالمی منظر نامہ ذرا دیر سے دستیاب ہوا۔ اردو کی نئی بستیاں بے حد معلوماتی ہے۔ ذہن میں کئی سوال ابھر آئے۔ ایسا صرف اردو کے ساتھ ہی کیوں ہے؟ عربی، فارسی اور دیگر ہندوستانی زبانیں بھی کیا انحطاط کا شکار ہیں اگر نہیں تو کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ ہمارے یہاں کچھ سیاسی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں مگر پاکستان میں کیا دشواری ہے؟ ان سبھی سوالوں کے جوابات، سرمایہ دارانہ جمہوری نظم سیاست میں کہاں ہیں۔ اس پر بحث کی جانی چاہئے۔ مگر بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی جسارت 'شاعر' کے سوا کس میں ہے؟

●592- NAYA MOHALLA MIRZA GHALIB RD' JABAL PUR (M.P.)

شاهد اختر ——

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ موصول ہوا۔ جی خوش ہوا۔ کیا کیا غضب کر رہے ہیں آپ۔ اس کے پیچھے آپ کے صادق جذبے اور بے پناہ کاوش ہے۔ رشک آتا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

●P.O.BOX 1067,H. POST O. NAWAB GANJ. KANPUR -208002 (U.P)

مظہر الزماں خان ——

اردو ادب کا عالمی منظر نامہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ بلاشبہ آپ عالمی اردو ادب کی ایک دستاویز تیار کر رہے ہیں جس میں عالمی ادب کے فن کاروں کے دستخط ان کی اپنی شناخت ہیں۔ اس خوبصورت شمارے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

●H.NO.258,SPL,C.C.I.B., KACHIGUDA, HYDERABAD. 500027 (A.P.)

شاهده وسیم ——

ایک کے بعد ایک شاعر کے خوبصورت علمی معلوماتی، تخلیقی 'شمارے' واقعی شاعر کی یہ کروٹ اور انگڑائی لاجواب ہے۔ یا شاید پہلے میری ہی نظر جہالت کی رتوندی میں گرفتار تھی۔ مبارک ہو آپ کو اتنے کم وقفے ہیں اتنے عظیم شاہکار نکال لینے کی، قابل تعریف ہیں آپ۔ ظاہر ہے ان سب کا پلان بہت پہلے سے آپ کے ذہن میں ہوگا لیکن اتنی خاموشی سے بغیر تشہیر یا شور شرابے بردباری اور علمی کے ساتھ آپ اپنی سوچ کی تکمیل میں لگے رہے اور [illegible]

(باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھئے)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں ضروری ہیں

تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول)

مرتب: سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر زور مرحوم نے ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو، پنجہ گٹہ حیدر آباد میں ایک کتب خانہ ۱۹۳۳ء میں قائم کیا تھا۔ یہ قابل دید بھی ہے اور قابل ذکر بھی۔ ۱۹۴۳ء میں جب کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا پندرہ سو سے زیادہ قلمی نسخے (اور بارہ ہزار کے قریب مطبوعہ کتب و رسائل) جمع کئے جا چکے تھے۔ (اس کے بعد اب تک ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے یہ شاید کسی اگلی جلد میں درج ہو۔) ان میں سے ۲۷۵ کی تفصیل اس کتاب میں دی گئی ہے۔ ان میں سے ۷۵ کتابیں ایسی ہیں جو بالکل نادر ہیں یعنی کسی اور کتب خانے میں (۱۹۴۳ء تک) دستیاب نہیں ہوئیں۔ تقریباً پچاس مخطوطے ایسے ہیں جو خود مصنفوں کے مسودے یا ان کی دست خطی نقلیں ہیں۔ اور ان میں نصف ایسی کتابیں ہیں جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم نے "حرف آغاز" میں تحریر کیا ہے کہ اس تذکرے کی دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں، اور تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد علی الترتیب ۱۹۵۷ء ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں شائع کی گئیں۔ اس کے بعد تذکرۂ مخطوطات میں شامل کتابوں اور ان کے مصنفین کے بارے میں بہت سی نئی معلومات سامنے آئیں۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں بھی شائع ہوئیں جن سے پتہ چلا کہ ادارے کے مخطوطات کے دوسرے نسخے کن کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس لئے پہلی جلد پر نظر ثانی کی گئی اور ان کی نگرانی میں ڈاکٹر محمد علی اثر نے ترمیمات اور اضافوں کو (جو اصل عبارت کے بعد قوسین میں درج ہیں) متعارف کیا۔

مخطوطات کا یہ خزانہ مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ علوم قرآن، حدیث، فقہ، اور تصوف کے علاوہ پند و اصلاح، تبلیغ، مناجات، تاریخ و سیر و مناقب نبی و آل و اصحاب نبی، و دیگر بزرگان مذہب، سلاطین امرا کے حالات، دواوین، کلیات، بیاضیں، منظوم اور نثری قصے، طب وغیرہ وغیرہ کے عنوانات کے تحت ان کی تقسیم کی گئی ہے اور ان کی تفصیل دی گئی ہے۔

بے شمار مصنفین میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قلی قطب شاہ، غواصی، ولی، سراج، ناطق، یقین، میر سودا، درد، ناسخ، آبرو، سوز، نصیر، میر حسن، میر امن، اور واجد علی شاہ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

محققین کے لئے خاص طور پر اس کتاب کے فائدہ مند ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بڑی محنت سے کتاب کی ترتیب و اشاعت عمل میں لائی گئی ہے۔

ترمیم و اضافہ، محمد علی اثر ○ زیر نگرانی: مغنی تبسم ○ ضخامت: ۶۱۸ صفحات ○ قیمت: ۲۰۰ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۴۳ء (طبع اول) ۱۹۹۶ء طبع دوم ○ پتہ: سب رس کتاب گھر، ایوان اردو، پنجہ گٹہ، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے پی)
مبصر: محافظ حیدر

اردو افسانے کی روایت

ڈاکٹر حامد بیگ

مرزا حامد بیگ کی یہ کتاب بیسویں صدی کے افسانوں پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں راشد الخیری سے لے کر بلراج کومل تک بیشتر اہم افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے شامل ہیں۔ اس کے بعد بھی اس کا شکوہ بہر حال رہے گا کہ کئی اچھے افسانہ نگار اس میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ خاص کر ہندوستان کے ادیبوں کو یہ شکایت ہو سکتی ہے۔ اور بجا طور پر ہو سکتی ہے لیکن ظاہر ہے یہی کتاب ہندوستان سے شائع ہوتی تب کئی پاکستانی ادیب اس میں شامل ہونے سے رہ جاتے دراصل انتخابات کا یہ مقصد ہوتا بھی نہیں ہر انتخاب میں چند ادیب شامل ہونے سے رہ ہی جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے وحید انور کا انتخاب "کہانیاں" کہیں بہتر تھا لیکن وہ دو جلدوں میں تھا۔ اس انتخاب کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ کسی ادارے نے اس کی کفالت نہیں کی تھی۔ حامد بیگ کے انتخاب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ادیبوں اور ان کی تصانیف کے متعلق معلومات ہمیں مل جاتی ہیں۔ جو کسی اور کتاب میں اس طرح دستیاب نہیں ہیں۔ کتاب کے آغاز میں حامد بیگ کا لگ بھگ سوا سو صفحے کا مقدمہ ہے۔ مختلف عنوانات جیسے داستان گوئی کی روایت اور اردو افسانہ، اولین افسانہ نگار، بازگشت، رومان پسندی کی لہر، انگارے گروپ کا باغیانہ طن، ترقی پسند تحریک نفسیات کا ورود، لخت لخت آوازیں، اردو افسانہ آزادی کے بعد اور اردو افسانے کا نیا لحن۔ حامد بیگ نے افسانہ نگاروں کا ایک مبسوط جائزہ لیا ہے۔ اور افسانہ نگاروں، ان کی ترجیحات و مقاصد پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ کسی کام کو حرف آخر کہنا ممکن نہیں۔

اتنی ضخیم کتاب میں ظاہر ہے کہ اختلاف کے نکتے بھی اتنے ہی زیادہ ممکن ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ ایک عمدہ کتاب ہے اور حامد بیگ کی محنت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ ادارہ ادبیات پاکستان بھی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اس اہم اور ضروری کام کو انجام دے کر اس طرح کے دوسرے کام کرنے والوں کے لئے ایک ڈگر بنا دی جس سے دوسرے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔

ضخامت: ۱۱۰۸ صفحات ○ قیمت: ۵۰۰ روپے ○ مطبوعہ ۱۹۹۲ء ○ مبصر: انور خان

پھول جب کھلتے ہیں

شاہد کلیم

شاہد کلیم اردو ادب کا ایک مشہور معروف نام ہے۔ "پھول جب کھلتے ہیں" ان کی تازہ کتاب ہے جو ۱۰۵ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل ان کے دو اور شعری مجموعے 'زیر بار' اور 'موسم موسم روپ' منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اس کتاب میں "شاہد کلیم کی نظمیں" کے عنوان سے بلراج کومل کا پیش لفظ شامل ہے اور پیش گفت کے تحت

علیم اللہ حالی نے ان کی نظموں کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے اور ان کی زندگی کے خاکے کو بھی پیش کیا ہے پشت پر شمس الرحمٰن فاروقی اور فلیپ پر مظہر امام کی رائیں درج ہیں۔ مختصر نظم کی آج بھی وہی اہمیت اور افادیت ہے جو پہلے تھی۔ اس میں محسوسات اور خیالات کو پوری شدت امعیت اور ارتکاز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے یہی سبب ہے کہ یہ قاری کو چونکاتی بھی ہے اور دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ شاہد کلیم خاص کر مختصر نظم کے شاعر ہیں، ان کے اس مختصر نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے اور ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کسی مختصر نظم کو کامیاب بناتی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ "انہوں (شاہد کلیم) نے مختصر نظم کے صحرا میں بڑی حد تک ایک نئی راہ نکالی ہے"۔ ان کے یہاں موضوعات میں بھی تنوع ہے اور اسلوب میں بھی ایک بڑی تبدیلی نظر آتی ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے نہایت صفائی کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں محض لفظوں کا گورکھ دھندہ نہیں ہیں۔ معنی آفرینی ان کی نظموں کا خاص وصف ہے۔

بہ حیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب مجموعہ ہے۔

بلراج کومل نے اپنے پیش لفظ میں یوں لکھا ہے۔

"میں اپنا حرف ستائش شاہد کلیم کی روشن اور پر استفسار شعری حسیت کی نذر کرتا ہوں"۔

اچھی نظم کے قارئین اس مجموعے کو ضرور پڑھیں

ضخامت: ۱۲۸ صفحات ○ قیمت: سو روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۸ء ○ پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ○

مبصر: م.ق.خان

یادوں کے زخم (شاعری)

نور منیری

نور منیری کے مجموعۂ کلام "یادوں کے زخم" پڑھتے ہوئے واضح طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے عہد کی شاعری ہے بیان کی سطح پر تو غزل کی پرانی روایت کا گہرا اثر ہے، اندرون سطح پر یہ نئے ذہن اور نئے احساس کی ترجمان ہے۔ غزل کی روایت کے عرفان کے لحاظ سے تو یہ شاعر پرانا ہے، لیکن غزل کی مانوس زبان اور اس کے متعارف انداز ان میں اس نے جو کچھ کہا ہے وہ نیا ہے۔

نوری حیرت[illegible] ہوئے ۲۲ ایک دوسرے سے [illegible] الگ مفہوم والے، شعروں کے خالق نہیں ہیں بلکہ یہ مکمل غزلوں کے شاعر ہیں کیوں کہ ان کی غزلوں میں اندرونی ربط ہے، زندگی کی ترجمانی کا مربوط انداز ہے۔ ان کے اس مجموعے کی غزلیں بھی اسی انداز کی ہیں۔

یہ اچھی روایت ہے کہ اکثر اور بیشتر اچھی غزل کہنے والے اچھے نظم نگار نہیں ہوتے تھے۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ غزل اور نظم ان دونوں کا الگ الگ انداز رہا ہے۔ غزل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے اور نظم خیال کے تسلسل کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ دونوں اصناف دو مختلف ذہن اور مزاجی کیفیتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ چوں کہ ان دونوں کا انداز مختلف ہے اس لئے ان کی ساخت اور پرداخت کا عمل بھی مختلف انداز میں اپنا کام کرتا تھا۔ ذہن جب ایک خاص انداز کا عادی ہوتا تھا تو وہ دوسرے انداز کو اچھی طرح نہیں برت پاتا تھا کیوں کہ یہ دونوں انداز باہم مختلف ہیں، مگر غزل کی جس نئی روایت کی تشکیل ہوئی ہے اس میں یہ دوری باقی نہیں رہی۔ اس لئے آج کا نیا غزل گو جس طرح نئی غزل کہنے پر قادر ہے اس طرح اچھی نظم کہنے پر بھی اسے قدرت حاصل ہے۔

نور منیری کے اس مجموعے میں کئی نظمیں ایسی ہیں جنہیں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ میں یہاں ان کی صرف ایک نظم پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ نظم کا عنوان ہے "آواز کی داستاں"

کرب، چیخیں، شور
جیسے ایک قیامت کا سماں
پتھروں کے شہر میں
آواز کی یہ داستاں
روز دہراتی ہے خود کو
کون سنتا ہے یہاں
یہ پہاڑوں کی چٹانیں
ایک مدت سے سماعت کھو چکی ہیں
کیا کریں!!

یہ چھوٹی سی نظم جس میں ایک بھی غیر ضروری ٹکڑا شامل نہیں، کسی ٹکڑے یعنی مصرعے میں ایک بھی زائد لفظ نہیں، یہ ہماری زندگی اور ہمارے معاشرے کی کیسی سچی اور کڑوی حقیقت کی ترجمانی کررہی ہے۔ پتھروں کا شہر، پہاڑوں کی چٹانیں استعارے ہیں۔ مگر ان کا مفہوم روشن ہے۔ آپ کیا کہیں گے، مجھے معلوم نہیں، مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے بمبئی کی زندگی اور اس کی متحرک تصویر چھوٹے سے آئینے میں اتر آئی ہو، اور کسی شہر کی تخصیص کیا ہے یہ ہمارے پورے معاشرے کی تصویر ہے۔

میں نئی شاعری کے اس مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں، جس میں غزل کے نئے انداز اور نئے طرز کی جھلکیاں ملتی ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ نور کے یہاں یہ نیا انداز اس طرح فروغ پائے گا کہ وہ اپنی پہچان الگ بنا سکے۔

ضخامت: ۱۲۸ صفحات ○ قیمت: ۵۰ روپے ○ مطبوعہ: ۱۹۹۹ء ○ پتہ: ۹۴/۱۳۳۴، نجمے پارک، لوہگاؤں روڈ، پونے ۰۳۲–۴۱۱ ○

مبصر: انور قمر

اکیلی (شاعری)

شبنم عشائی

ہندوستان کی تازہ کار شاعرات میں سے ایک نام شبنم عشائی کا ہے اور ان کے تخلیقی اظہار کا اولین روپ اکیلی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شعری مجموعے کا نام ہی شاعرہ کی فکری اپج اور بابت کا خوب سیرت اعلامیہ ہے۔ مختصر وطویل ا۷ر نظموں میں زندگی کی جو واردات نت نئے تخلیقی تیوروں کے ساتھ رقم ہوئی ہے اس میں آگ ہے، چاندنی ہے، عشق اسلوب ہے، عشق آہنگ ہے۔ لفظ لفظ عشق اور عشق عشق لفظ کی فن کاری میں جو موسیقی ہے اس کا بڑا سبب شاعری کرنے کا عمل ہے۔ ہر نظم کی سطر بہ سطر تخلیقی ترتیب، آغاز، درمیان اور ابتدا، ہر نظم کی بافت میں مکانات چھپے ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں تجسس ہے، ڈرامہ ہے، ہر نظم ایک کہانی ہے، ہجر و وصال کی، انتظار و ملال کی۔ اس پوری شاعری میں ایک مسلسل اداسی پھیلی ہوئی ہے، جو کبھی مراقبہ کرتی ہے تو کبھی مکالمہ۔ کبھی شور کرتی ہے، کبھی ہنستی ہے تو کبھی قہقہے لگاتی ہے۔ یہ اداسی بجھی ہوئی نہیں بلکہ اس میں ایک طرح کی زرخیزی ہے جو شبنم عشائی کے وجود سے ابھر رہی ہے۔

ضخامت: ۹۶ صفحات ○ قیمت: پچاس روپے ○ مطبوعہ: جولائی ۱۹۹۳ء ○ پتہ: شبنم عشائی، تاپر، پٹن (کشمیر) مبصر: الف الف

زر سالانہ ارسال کرتے وقت اپنا
خریداری نمبر ضرور درج کیجئے

کتاب : زار

مشعل جاں (شعری مجموعہ O اردو،ہندی) ——

شاعر: مجروح سلطانپوری O ضخامت: ۱۳۶ صفحات O قیمت: دو سو پچاس روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O ناشر: مجروح اکاڈمی، او مکار، ایس وی روڈ، سانتا کروز، (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۴ O تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ، جے جے اسپتال، ممبئی ۴۰۰۰۰۳۔

سلام مچھلی شہری (شخصیت اور فن) ——

مصنف: ڈاکٹر عزیز اندوری O ضخامت: ۲۸۸ صفحات O قیمت: دو سو روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۸ء O پتہ: ساقی بک ڈپو، '۴۱۵۷A' اردو بازار دہلی۔۶

علی جواد زیدی (حیات، شخصیت اور فن) ——

مصنف: ڈاکٹر شیخ عبدالرحمٰن انصاری عزم O ضخامت: ۲۹۹ صفحات O قیمت: دو سو روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: B/C/10/ ۲۴۔۱۔۱۶ ، فرح کالونی سعید آباد، حیدر آباد، ۵۰۰۰۵۹ (اے، پی)

مظفر حنفی (ایک مطالعہ) ——

مرتبہ: فیروز مظفر O ضخامت: ۵۴۴ صفحات O قیمت: تین سو پچاس روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جگن ناتھ آزاد (فکر و فن) ——

مصنف: محمد منظور عالم O ضخامت: ۲۶۲ صفحات O قیمت: دو سو روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O ناشر: نہرو میموریل لٹریری سوسائٹی، دہلی O پتہ: انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایوینو، نئی دہلی۔

سنسکرت شعریات (تنقید و تحقیق) ——

مصنف: عنبر بہرائچی O ضخامت: ۳۳۰ صفحات O قیمت: ۱۷۵ روپے O مطبوعہ ۱۹۹۹ء O پتہ: ۵۹۰، نزد ایس جی پی جی آئی، رائے بریلی روڈ، لکھنؤ (یوپی)

محبت کا مسافر (شاعری) ——

شاعر: اکرام تبسم O ضخامت: ۱۲۸ صفحات O قیمت: ایک سو پچاس روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: دستاویز مطبوعات ،۵۔ اعجاز پلازہ پہلی منزل، ایونگ روڈ، نیلا گنبد، لاہور (پاکستان)

ایک عرض تمنا (پاکستان کا سفر نامہ) ——

مصنف: ظہیر انور O ضخامت: ۱۴۴ صفحات O قیمت: ۱۳۵ روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: شرجیل آرٹس، ۱۱۔ہری پوکر، فرسٹ لین۔کلکتہ۔۱۹

تجربات وحوادث (افسانے) ——

مصنفہ: عطیہ خان O ضخامت: ۱۷۶ صفحات O قیمت: اسّی روپے O مطبوعہ ۱۹۹۹ء O ناشر: رہبر کارنر، ۲۹۳۶۔۲ کلاں مسجد، ترکمان گیٹ دہلی۔۶ O پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اپنی مٹی (بچوں کی کہانیاں) ——

کہانی کار: مشتاق کریمی O ضخامت: ۷۴ صفحات O قیمت: ۲۰ر روپے O مطبوعہ: ستمبر ۹۹ء O پتہ: ۲۴۲۔ شنی پیٹھ، جلگاؤں (مہاراشٹر)

سکھی ساجن (کہہ مکرنیاں) ——

ترتیب کار: مناظر عاشق ہرگانوی O ضخامت: ۱۱۲ صفحات O قیمت: سو روپے O مطبوعہ: ۱۹۹۹ء O پتہ: مکتبہ کہسار، برہ پورہ، بھاگلپور ۔۸۱۲۰۰۱ (بہار)

کشت غزل نما (شاعری) ——

شاعر: حنیف ترین O ضخامت: ۱۲۰ صفحات O قیمت: ۱۵۰ روپے O مطبوعہ: جنوری ۹۹ء O پتہ: مکتبہ عارض، ۱۲۴۔ ماری پور، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۲

ادبی رسائل

ترسیل (سہ ماہی) ——

مدیر: ڈاکٹر یونس اگاسکر O معاون: انجم عباسی O ضخامت: ۱۴۴ صفحات O قیمت: بیس روپے O مطبوعہ جولائی تا ستمبر ۹۹ء O زر سالانہ: اسی روپے O پتہ: بی۔۲۱، بندوق والا بلڈنگ جیل روڈ (نارتھ) بمبئی ۴۰۰۰۰۹

آئندہ (ماہنامہ) ——

مدیر: محمود واجدہ معاون: اے خیام O ضخامت: ۱۶۰ صفحات O قیمت: ۱۵۰ روپے O مطبوعہ: جلد: ۵۴ شمارہ: ۱۵ O اگست، ستمبر، اکتوبر ۹۹ء O پتہ: ۱۰۶۔D، اسماء گارڈن، بلاک۔۱ میٹرو ول ۱۱۱، متصل اصفہانی روڈ، کراچی ۷۵۳۳۰ (پاکستان)

نیاورق (سہ ماہی) ——

مدیر: ساجد رشید ضخامت: ۲۴۰ صفحات O قیمت: فی شمارہ ۳۵ر روپے O زر سالانہ: ۱۴۰ روپے O مطبوعہ: جلد ۲ O شمارہ نمبر ۸ O جولائی تا نومبر ۹۹ء O رابطہ: پوسٹ بکس نمبر: ۵۰۳۰، چنچ بندر پوسٹ آفس، بمبئی ۴۰۰۰۰۹۔

جہات (سہ ماہی) ——

مدیر اعلیٰ: حامدی کاشمیری O ضخامت: ۱۸۰ صفحات O قیمت: فی شمارہ: پچاس روپے O زر سالانہ: ۱۸۰ روپے O مطبوعہ جلد ۲، شمارہ: ۶، جون ۹۹ء O پتہ: کمپیوٹر سٹی مارنج باغ، سری نگر۔۸ (کشمیر)

ارتقاء (علمی و ادبی کتابی سلسلہ) ——

ادارہ: راحت سعید، واحد بشیر، حسن عابد، محمد علی صدیقی O ضخامت: ۳۳۶ صفحات O قیمت: فی شمارہ پچاس روپے O پانچ شمارے: دو سو روپے O مطبوعہ: اگست ۹۹ء O پتہ: A/10، ولایت آباد نمبر۔۲، منگھو پیر روڈ، کراچی ۷۵۰۰ (پاکستان)

اردو دنیا (ماہانہ ادبی جریدہ) ——

ایران: ارشاد ہاشمی، جاوید خان O ضخامت: بیس صفحات: O قیمت: درج نہیں O مطبوعہ: نومبر ۱۹۹۹ء O پتہ: جاوید خان

ESCHOLL BRUCKER 5,
64283 DARMSTADT, GERMANY

تناظر (سہ ماہی) ——

مدیر اعزازی: قمر جمالی O ضخامت: ۱۵۲ صفحات O قیمت فی شمارہ ساٹھ روپے O زر سالانہ: دو سو روپے O مطبوعہ شمارہ نمبر ۳۰، ستمبر ۱۹۹۹ء O پتہ: C-11-7' اے، جی کالونی حیدر آباد ۵۰۰۰۴۵، (اے، پی)

امکان (سہ ماہی) ——

ایڈیٹر، یامین اختر فاروقی O ضخامت: ۱۶۴ صفحات O قیمت دس روپے فی شمارہ O مطبوعہ: شمارہ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۹ء O پتہ: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی ، اولڈ کسٹم ہاؤس ڈی۔ ڈی بلڈنگ، دوسرا منزلہ، شہید بھگت سنگھ مارگ بمبئی ۴۰۰۰۲۳

توازن (سہ ماہی) (گوشۂ سلطانہ مہر) ——

مدیر: عتیق احمد عتیق O ضخامت: ۱۶۴ صفحات O قیمت بیس روپے O زر سالانہ: ساٹھ روپے O مطبوعہ: سلسلہ نمبر ۳۳، مئی تا اگست ۹۹ء O پتہ: ۵۴۴۔ نیاپورہ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (مہاراشٹر)

محفل صنم (ماہنامہ) ——

مدیرہ: شہلا نواب O ضخامت: ۲۷ صفحات (جہازی سائز) O قیمت: فی شمارہ ۱۵ روپے O زر سالانہ: ۳۲۰ روپے O مطبوعہ: جلد ۱۱ شمارہ نمبر ۹ اکتوبر ۹۹ء O پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۷۸۱، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر ستیہ پال آنند نے جب اردو نظم کی دنیا میں باقاعدہ قدم رکھا تو خود مجھے شک تھا کہ پختہ عمر کا یہ عشق کتنی دیر تک چل سکے گا۔ انہوں نے تابڑ توڑ..... بازی بد کر جس طرح اردو نظم کی کشتِ خشک کی آبیاری کی، تو اس نے نہ صرف مجھ کو بلکہ بہتوں کو ششدر کر دیا ہے۔ ع لرزے ہے موج سے تیری رفتار دیکھ کر۔ جدید غزل کے سوئے ہوئے پانی میں جس طرح انہوں نے پے در پے کنکر پھینکے اور نظم کو لبیک کہا ہے، ان کا یہ مجاہدہ بھی دیدنی ہے..... انہوں نے اردو نظم کو معنیاتی اور موضوعاتی سطح پر وسعت دی ہے اور نئے زمین و آسمان کے امکانات روشن کئے ہیں۔ شاعری میں پٹری کا سفر آسان ہے۔ کانٹوں کو نکالنا اور آنے والوں کے لئے نئی راہیں استوار کرنا کسی بھی زمانے میں آسان نہیں رہا، تو اب تو اور بھی دقت طلب اور صبر آزما ہے، اس لئے پروفیسر ستیہ پال آنند کی وقعت ہم سب کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے۔

——— **پروفیسر گوپی چند نارنگ**

دست برگ • وقت لاوقت • آنے والی سحر بند کھڑکی ہے

اور لہو بولتا ہے

کے بعد چار سو سے کچھ زیادہ نظموں کے خالق

ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

[redacted]

شاعر کی خود نوشت "داستان میرے شعری سفر کی"

کے ساتھ، جو جدید اردو شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی ہے

دیدہ زیب طباعت، گیٹ اپ • سہ رنگ ڈسٹ کور

قیمت ——— ۲۰۰ روپئے

سیمانت پرکاشن ۹۲۲ کوچہ روہیلا، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

GD. NO. MH BY SOUTH - 518 ماہنامہ شاعر *Price Rs. 9/=*

THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY - 400 004.

] Years of Publication ❖ Publishing Date 27-28 ❖ December 1999 ❖ Tel. No. 382 99 04

Registererd with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 14482 / 57.

PRINTER PUBLISHER OWNER: NAZIR NOMAN SIDDIQUI AT AL-AMIN PRINTERS, 370/372 MOULANA AZAD ROAD, MUMBAI 400 004